دیوانِ غزل عاجز ایوانِ چراغاں ہے
اِک شعر نہیں لکھّا اِک شمع جلا دی ہے

کلیم عاجؔز کے شعری مجموعے

(1) وہ جو شاعری کا سبب ہوا
(2) جب فصلِ بہاراں آئی تھی
(3) کوچۂ جاناں جاناں
(4) پھر ایسا نظارہ نہیں ہوگا
(5) ہاں چھیڑو غزل عاجؔز

اس قدر سوز کہاں اور کسی ساز میں ہے
کون یہ نغمہ سرا میرؔ کے انداز میں ہے

پروفیسر کلیم عاجز
(1926 2015)

مرتب:
فاروق ارگلی

فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ

کتاب	:	کلیاتِ کلیم عاجز
شاعر	:	پروفیسر کلیم عاجز
مرتب	:	فاروق ارگلی
زیرِ اہتمام	:	(الحاج) محمد ناصر خان
کمپوزنگ	:	حمران اعظمی
صفحات	:	1048
سن اشاعت	:	2016ء
مطبع	:	ایس. ایف پرنٹرس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-2

KULLIYAT-E-KALIM AAJIZ

By: **Prof. Kalim 'Aajiz'**

(1926 –2015)

Compiled by **FAROOQ ARGALI**

Published by **MOHD. NASIR KHAN**

Published by

FARID BOOK DEPOT (PVT.) LTD.

Corp. Off. 2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2

Phones : 011- 23289786, 23289159, Fax : 011-23279998

E-mail : farid ex port@gmail.com, Website : www.faridex port.com

عرض ناشر

قارئین کرام اس روشن حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ادارہ فرید بک ڈپو (پرائیویٹ لمیٹڈ) کو قرآن کریم، تفاسیر، حدیث، فقہ، فتاویٰ، اسلامی تاریخ وتہذیب، تصوّف وروحانیت اور ہرقسم کی دینی کتب کی شاندار معیاری طباعت واشاعت کے لیے بین الاقوامی شہرت ومقبولیت حاصل ہے، اس کے ساتھ ہی اُردوزبان وادب کی ترویج وترقی بھی اس ادارے کا اہم نصب العین ہے، جس کی تکمیل کے لیے ادارے نے لاتعداد اہم علمی وادبی کتابوں کے علاوہ اُردوزبان کے گرانقدر شعری سرمایہ کے تحفظ اور بقا کے لیے عظیم شعراء کے کلیات، دیوان، انتخاب اور مجموعوں کی عصری معیار کے مطابق اشاعت کی ہے۔ شاعری کی طرف خصوصی توجہ اس لیے دی گئی کہ بالعموم اشاعتی اداروں نے اس جانب توجہ دینا کم کردیا ہے کہ کاروباری اعتبار سے یہ بہت سودمند نہیں ہے۔ ادارے نے اُردو کے فروغ و احیاء کے اپنے پرخلوص مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے غیرمنفعتی بنیادوں پر شعری ادب کی اہم ترین کتابیں بڑی تعداد میں شائع کی ہیں، جنھیں پوری اُردو دُنیا میں مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

حضرت کلیم عاجزؔ ہمارے عہد کے عظیم المرتبت غزل گوشاعر ہیں۔ ان کا کلام معجز نظام گزشتہ صدی کی اُردوشاعری کے بیش بہا خزانے میں گراں قدر اضافہ ہے۔ برصغیر ہندوپاک ہی نہیں ساری دُنیا میں حضرت کلیم عاجزؔ کی شاعری کے پرستار موجود ہیں، لیکن یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ ہمارے دَور کے اس عظیم ترین شاعر کے کلام کی ترویج واشاعت کی وسیع پیمانے پر کوشش نہیں کی گئی۔ اس ضرورت کو محترم ملّی وسیاسی رہنما **سیّد شہاب الدین** صاحب نے سب سے پہلے اُس وقت محسوس کیا تھا جب حضرت کلیم عاجزؔ باحیات تھے۔ سیّد صاحب نے خاص طور پر '**کلیاتِ کلیم عاجزؔ**' کی اشاعت کی خواہش ظاہر کی تھی۔ بدقسمتی سے ہم یہ خدمت اُس وقت انجام نہیں دے سکے۔ بہرحال اب پورے اہتمام کے ساتھ '**کلیاتِ کلیم عاجزؔ**' ہدیۂ ناظرین ہے، جو مرحوم شاعر کی پہلی برسی کے موقع پر دُنیائے اُردو کی جانب سے ایک عملی خراجِ عقیدت بھی ہے۔

یقین کامل ہے کہ دُنیا بھر کے اُردو حلقوں میں ہماری اس کوشش کو بھی پذیرائی حاصل ہوگی۔

(الحاج) محمد ناصر خان

فہرست

1 وہ جو شاعری کا سبب ہوا

ابتدائی دَور کی غزلیں:

غزلیں: ۱۹۵۲ءتا۱۹۷۲ء:

2 جب فصلِ بہاراں آئی تھی

غزلیں: ۱۹۵۰ء

جدید غزلیں: ۱۹۷۲ء تا ۱۹۸۹ء

3 کوچۂ جاناں جاناں

4 | پھر ایسا نظارہ نہیں ہوگا

غزلیں: ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۲ء

5 | ھاں چھیڑوں غزل عاجزؔ

غزلیات:

اضافہ شدہ غزلیں

(’وہ جو شاعری کا سبب ہوا‘ کی وہ غزلیں جن میں اشعار کا اضافہ کیا گیا)

آفتابِ سخن، آبروئے غزل
پروفیسر کلیم عاجؔز

فاروق ارگلی

15 فروری 2015ء کو عہد حاضر کے مایۂ ناز شاعر پدم شری پروفیسر کلیم عاجؔز دُنیائے فانی سے رخصت ہو گئے اور اس طرح دبستانِ عظیم آباد کا یہ آفتابِ سخن ہمیشہ کے لیے عدم کی پہنائیوں میں غروب ہو گیا۔ پوری اُردو دنیا میں مرحوم کا ماتم منایا گیا۔ شاید ہی کوئی بڑا دانشور یا اہلِ قلم ہو گا جس نے اس عہد آفریں شاعر کے انتقال پر اپنے رنج و غم کا اظہار زبانی یا تحریری طور پر نہ کیا ہو۔ یہ مضمون تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ 2009ء کی تحریر ہے۔ اس ناچیز کاوش کی ادبی حیثیت خواہ کچھ بھی ہو لیکن اسے جناب کلیم عاجؔز صاحب مرحوم و مغفور کی پسندیدگی اور حوصلہ افزائی کا اعزاز حاصل ہے۔ از سرِ نو اشاعت کے لیے تصحیح، ترمیم اور نظرِ ثانی کرتے ہوئے ''ہیں'' کی جگہ ''تھے'' لکھنے کی جرأت یوں نہیں کر سکا کہ کلیم عاجؔز تو ہمارے شعری ادب کے اُن تاریخ ساز تخلیق کاروں میں سے ہیں جو اپنے معجزانہ کلام اور لازوال علمی کارناموں میں زندۂ جاوید ہیں۔ پیش ہے دبستانِ عظیم آباد کے نابغہ شاعر کا یہ نامکمل اور مختصر تذکرہ بطور خراجِ عقیدت۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

غالبؔ نے جب یہ شعر کہا ہو گا تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بات ریختے تک ہی نہیں تھی بلکہ غالبؔ کے سامنے میرؔ کی وہ تمام خوبیاں بھی رہی ہوں گی جو میرؔ کو خدائے سخن کا درجہ عطا کرتی ہیں۔ سادہ، شفاف رواں دواں اسلوب میں عرفانِ حق، وارداتِ قلبی، معارفِ تصوف و طریقت اور دقیق فلسفیانہ نکات، غزل کی رعنائی اور نزاکت کو برقرار رکھتے ہوئے اس طرح بیان کر دینا کہ

بات سیدھی دلوں میں اتر جائے، یہ میرؔ کا ہی حصہ تھا۔ میرؔ کا یہ انداز عہدِ غالبؔ میں کسی کو نصیب نہ ہوا، ذوقؔ نے تو کہہ ہی دیا:

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

غالبؔ اپنے پُر شکوہ آہنگ، علوِ فکر اور فلسفیانہ گھن گرج سے لافانی ہوئے مگر ریختے میں میرؔ والا سوز و گداز اور گلاب کی پنکھڑیوں سی نزاکت انہیں بھی نصیب نہ ہوئی البتہ داغؔ کی شوخی اور مجازی حسن و عشق کی رنگیں بیانیوں میں کہیں کہیں میرؔ کا رنگ جھلکتا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔ امیرؔ مینائی کے یہاں بھی میرؔ کی رمق دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ ان کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ ان کے بعد کے تقریباً تمام ہی غزل گو شعراء نے میرؔ کے انداز و آہنگ کو چھو لینے کی کوشش کی، بہتوں نے یہ بھاری پتھر اُٹھانے کی ہمت کی مگر چوم کر چھوڑ دیا۔ اقبالؔ تو غالبؔ کی روشنی میں چمکے، آفاقی فلسفے اور اسلامی فکریات نے انہیں شاعرِ مشرق بنا دیا۔ ان کے یہاں تو خیر میرؔ والی بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ امیرؔ مینائی، فانیؔ بدایونی، حسرتؔ موہانی، جگرؔ مرادآبادی، اصغرؔ گونڈوی، فراقؔ گورکھپوری اور نوحؔ ناروی سے لے کر فیضؔ اور مجروحؔ تک اس عہد کی ساری غزلیہ شاعری کا کلاسیکی اور نو کلاسیکی سرمایہ کھنگال جایئے شاید ہی کوئی ایسا ملے جس نے شعوری یا غیر شعوری طور پر میرؔ کی رسی کا سرا تھامنے کی کوشش نہ کی ہو۔ غالبؔ اور مومنؔ کے بعد کے شعراء نے غزل کی رعنائیوں اور حسن جہاں تاب کو آفاقیت اور معنویت کی لامحدود بلندیوں سے ہمکنار کر دیا۔ غزل اردو شاعری کی آبرو بن گئی، مگر میرؔ جیسی سادگی و پرکاری، شعر کی شور انگیزی، روح کو نرما دینے والا سوز اور براہِ راست قلب و جگر پر وار کرنے والی نرم و نازک مگر تیکھی نشتریت زمانوں بعد دیکھنے کو کہیں ملتی ہے تو وہ ہمارے عہد کے شاعر کلیم عاجزؔ کے یہاں جو اس دور میں اُبھرے جب مشرق سے مغرب تک اردو غزل کی خیرگی چھائی ہوئی ہے، غزل گو شعراء کی ایک لامحدود کہکشاں افق تا افق سجی ہوئی ہے جس میں انگنت ایسے چاند ستارے بھی جگمگا رہے ہیں جن کی تنویریں لازوالیت سے بغلگیر ہیں اور اس لامتناہی کارواں میں میرؔ کے سوزِ دروں سے روشن جذب و اثر کی مشعل اٹھائے فرشتہ صورت برگزیدہ شاعر کلیم عاجزؔ دور سے نظر آتا ہے جس کی

عاجزانہ ضربِ کلیمی اپنی مدھم مگر دلگیر آواز میں پکار پکار کہہ رہی ہے ’’میر خدائے سخن ہیں تو کلیم عاجزؔ پیغمبرِ سخن ہونے کا مدعی ہے جو منکر ہو تو میزانِ محاکمہ و موازنہ موجود ہے پر یاد رکھیو:

یہ طرزِ خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا
جو ہم کہیں گے، کسی سے کہا نہ جائے گا

پروفیسر کلیم عاجزؔ کی شاعری اور ان کے شعری اسلوب پر علامہ جمیل مظہری نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

’’میرؔ کی پیروی کرتے ہوئے عاجزؔ کو ایک اور سلیقۂ فن بھی قدرت سے عطا ہوا ہے۔ میرؔ کی غزلیت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ عارفانہ اور فلسفیانہ افکار کو بڑے سلیقے کے ساتھ غزل کا پیرایہ دے دیتے ہیں۔ وہ فلسفہ و تصوف کے مضامین بھی بیان کرتے ہیں لیکن اس طرح کہ نہ فلسفہ کی ثقالت باقی رہتی ہے اور نہ تصوف کی عارفانہ خشکی، یہ سلیقہ انہیں حافظؔ سے نہیں (کیونکہ یہ سلیقہ خود حافظؔ میں موجود نہیں) عراقیؔ اور فغانیؔ سے ملا تھا۔ غالبؔ نے ہر چند میرؔ کی پیروی کی مگر یہ سلیقہ غالب کو نہ آتا تھا نہ آیا، غالبؔ کے مدرسۂ فکر کے عظیم نمائندے اقبال بھی اس سے ہمیشہ محروم رہے۔ یہ فنکارانہ چابک دستی اگر آئی تو کچھ داغؔ میں آئی، داغؔ کے بعد عظیم آباد کے ایک فنکار یگانہؔ چنگیزی ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں اگر کسی کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ نام کلیم عاجزؔ ہیں جو بڑے بڑے مسائل کو گھلا کر غزل کا میٹھا رس بنا دیتے ہیں، میں بڑی ذمہ داری سے اعلان کرتا ہوں کہ مجھے آج اس سلیقۂ فن میں کوئی ان کا شریک نظر نہیں آتا۔‘‘

علامہ جمیل مظہری کا یہ ادّعا محض ایک ہم عصر شاعر کی دلنوازی یا تحسین کا تحفہ نہیں، عصری ادب کے مقتدر ناقدین اس صداقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ کلیم عاجزؔ اس دور جدید کے منفرد، اوریجنل اور فطری سخنور ہیں۔ اردو غزل کے سب سے بڑے مخالف اور اردو ادب کے اہم ترین نقّاد پروفیسر کلیم الدین احمد جو ایک وحشی صنف شاعری قرار دے کر غزل کو سرے سے رد کرتے ہیں۔ ان کی تنقید کی دودھاری تلوار کی کاٹ سے اساتذہ سے لے کر متقدمین و معاصر شعراء میں سے کوئی

نہیں بچ سکا۔ وہی کلیم الدین احمد جو مغربی ادب وفلسفہ کی عینک سے اردو شاعری کو جانچتے پرکھتے تھے۔ کلیم عاجؔز کے کلام پر نظر پڑتے ہی تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی ان کی غزل دشمنی تھم سی گئی۔ کلیم کے کلام کا حسن اس سخت گیر نقاد کو مسحور کر گیا، فرماتے ہیں:

''ان کے شعروں میں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ دوراں بھی اور وہ غمِ جاناں کو غمِ دوراں بنا دیتے ہیں اور دونوں اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں کہے جاسکتے، وہ ہونے والے واقعات کی طرف کھلے یا چھپے طنزیہ اشارے کرتے ہیں۔ جو فوری طور پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ ہونے والے واقعات ہوں یا نجی واقعات ہوں، ان کے شعروں میں ایک قسم کا تسلسل پیدا کر دیتے ہیں۔

مری شاعری میں نہ رقصِ جام نہ مئے کی رنگ فشانیاں
وہی دکھ بھروں کی حکایتیں وہی دل جلوں کی کہانیاں
یہ جو آہ ونالہ و درد ہیں کسی بے وفا کی نشانیاں
یہی میرے دن کے رفیق ہیں، یہی میری رات کی رانیاں
کبھی آنسوؤں کو سکھا گئیں مرے سوزِ دل کی حرارتیں
کبھی دل کی ناؤ ڈبو گئیں مرے آنسوؤں کی روانیاں

پروفیسر کلیم الدین احمد کہتے ہیں: ''ان کی غزلوں میں دکھ بھروں کی حکایتیں اور دل جلوں کی کہانیاں ہیں۔ اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کی غزلوں میں اَنمل اور بے جوڑ باتیں نہ آنے پائیں۔'' آگے کہتے ہیں، ''کلیم کو بات کہنے کا سلیقہ ہے اور ان کی غزلوں میں ترتیب کا بھی خیال ہے۔ وہ ترتیب وخیال تو نہیں جو قطعہ بند غزل یا مسلسل غزل میں ہوتا ہے، لیکن ان کے جذبات وخیالات ایک ہی نہج پر بہتے ہیں اس لیے شعروں میں تسلسل سا پیدا ہو جاتا ہے۔

تجھے سنگدل یہ پتہ ہے کیا کہ دکھے دلوں کی صدا ہے کیا
کبھی چوٹ تو نے بھی کھائی ہے، کبھی تیرا دل بھی دکھا ہے کیا
تو رئیس شہرِ ستمگراں، میں گدائے کوچۂ عاشقاں
تو امیر ہے تو بتا مجھے، میں غریب ہوں تو برا ہے کیا

یہ کہاں سے آئی ہے سرخرو، ہے ہر ایک جھونکا لہولہو
کٹی جس میں گردنِ آرزو، یہ اسی چمن کی ہوا ہے کیا

کلیم الدین احمد کو کلیم عاجزؔ کی یہ غزل اس قدر پسند آئی کہ اپنی تحریر میں اسے کوٹ کرنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکے:

بڑی طلب تھی بڑا انتظار دیکھو تو
بہار لائی ہے کیسی بہار دیکھو تو
یہ کیا ہوا کہ سلامت نہیں کوئی دامن
چمن میں پھول کھلے ہیں کہ خار دیکھوتو
لہو دلوں کا چراغوں میں کل بھی جلتا تھا
اور آج بھی ہے وہی کاروبار دیکھو تو
یہاں ہر اک رسن ودار ہی دکھاتا ہے
عجیب شہر، عجب شہر یار دیکھو تو
نہ کوئی شانہ بچاہے نہ کوئی آئینہ
دراز دستیِ گیسوئے یار دیکھو تو
کسی سے پیار نہیں پھر بھی پیار ہے سب سے
وہ مستِ حسن ہے کیا ہوشیار دیکھو تو

کلیم الدین احمد کا تاثر یہ ہے کہ عاجزؔ کی غزلوں میں دل کی باتیں بھی ہیں اور سیاسی باتیں بھی اور سیاسی باتیں غزل کی زبان میں۔ان کے شعروں میں پھول بھی ہیں اور پتھر بھی اور پھول پتھر بن جاتے ہیں اور پتھر پھول بن جاتے ہیں اس کام کے لیے بھی سلیقے کی ضرورت ہے۔''

اردو ادب کی تاریخ میں، دلّی، لکھنؤ اور دکن کو اردو شعر و ادب کے اسکول قرار دیا گیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سرزمین بہار بھی شروع سے لے کر اب تک شعر وسخن کا نظریہ ساز اسکول نہ بھی رہی ہو مگر مرکز شعر وادب ضرور رہی ہے۔راسخؔ عظیم آبادی، شادؔ عظیم آبادی، مبارکؔ عظیم آبادی سے لے کر ڈاکٹر کلیم عاجزؔ تک زندہ رہنے والی شاعری تخلیق کرنے والوں کی ایک طویل

فہرست ہے جن میں خواجہ میر دردؔ کا رنگِ تصوف، غالبؔ کا فلسفیانہ آہنگ، ناسخؔ کی شوخیاں، آتشؔ کا سوز اور عصر جدید کے اساتذہ کی جدت طرازیاں خوب نمایاں ہو کر نظر آتی ہیں۔ بہار کی مردم خیز سرزمین نے ہی اردو شاعری کو کلیم عاجزؔ جیسا آفتاب صفت سخنور اس دور میں پیدا کیا جب اردو شعر و ادب کے کلجگ میں تخلیقی زوال کا عروج نصف النہار پر ہے۔ ایسے میں ہمیں کلیم عاجزؔ اتنی وسعتوں اور بلندیوں پر دِکھائی دیتے ہیں جہاں تک ان کا کوئی معاصر نہیں پہنچ سکا۔ اجمالاً بس یہی کہا جاسکتا ہے کلیم عاجزؔ قدیم فکریات اور بزرگوں کے رنگ و روایات اور عہد جدید کی تمام حسیات و مشاہدات کا ایسا علمی اور تخلیقی آمیزہ ہیں جس نے ان کے فن و شخصیت کو تاریخ ساز پیکر میں ڈھال کر زمانے کے سامنے ایستادہ کر دیا ہے جس کی بلندی، جس کا حسن اور جس کے فنی خدوخال کی موزونیت دنیائے ادب کو دعوت نظارہ دے رہی ہے۔ کلیم عاجزؔ کا پورا سرمایۂ کلام دیکھ جایئے میرؔ کا تتبع ان کے یہاں نمایاں ضرور ہے مگر اس پیکر سخن کے جلو میں اتنے رنگ چمکتے اور بولتے دکھائی دیتے ہیں کہ نگاہ ادراک ٹھہر نہیں پاتی کیوں کہ ان سب رنگوں اور آہنگو ں پر بھاری ہے خود ان کا اپنا رنگ جس میں اساطیر اور عصریات کا شعوری تال میل اور ان زخموں سے ٹپکتے ہوئے لہو کا رنگ شامل ہے جو ستم ظریفیِ روزگار اور حادثاتِ زمانہ نے دیے ہیں۔ کلیم عاجزؔ کا کلام ان کے لہولہو وجدان کی آواز ہے، ان کے شعروں میں میرؔ کا رنگ تو سوز و غم کے بہتے ہوئے دودھاروں کی طرح آن ملا ہے اس میں ان کی شاعرانہ ریاضت کا دخل نظر نہیں آتا، کلیم نے وہی کچھ بیان کر دیا ہے جو ان کے دل پر گزری، زمانے نے انہیں جو کچھ دیا وہی اپنے شعروں میں سجا کر لوٹا دیا۔ اپنی سرگزشت کی صورت میں:

ہمیں اچھا ہے بن جائیں سراپا سرگزشت اپنی
وگرنہ لوگ جو چاہیں گے افسانہ بنا دیں گے

کلیم الدین عاجزؔ اپنی شاعری کے آغاز اور اپنے عنفوانِ شباب سے ہی بڑے شاعروں میں شمار کیے جانے لگے تھے۔ بہار کی ایک نمائندہ علمی ادبی اور تہذیبی شخصیت اور مشہور آئی پی ایس پولیس آفیسر سیّد علی عباس کلیم عاجزؔ کی شاعری کے شروعاتی دَور کا ایک واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

1952ء میں پٹنے کی وہ ایک رنگین شام تھی۔ انجمن اسلامیہ ہال میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔

شوق مجھے بھی کھینچ کر وہاں لے گیا۔ پہنچا تو دیکھا ڈائس پر بہار کے سب ہی مشہور و معروف شعرا جلوہ افروز تھے۔ علامہ جمیل مظہری، پرویز شاہدی، پروفیسر عبدالمنان بیدلؔ، حافظ شمس الدین شمسؔ وغیرہ۔ قبل اس کے کہ استادوں کی باری آتی، صدر نے کلیم عاجؔز کا نام پکارا۔ پہلے کبھی یہ نام سنا نہیں تھا۔ سمجھا کہ نو واردانِ اقلیم سخن میں سے ہوگا کوئی طفل۔ دیکھا تو پتلا دُبلا، نحیف و زار، نازک سا ایک نوجوان نیچی نظریں کیے دبے پاؤں مائک پر آیا۔ لباس سے سادگی ٹپک رہی تھی اور چال سے شرافت، صورت پہ اُداسی چھائی تھی مگر تیور سے عزم و استقلال عیاں تھا۔ کچھ دیر چپ کھڑے رہنے کے بعد اس نے ترنم میں اپنی غزل شروع کی اور فضا میں ایک عجیب سے نغمگی چھا گئی۔ جہاں تک یاد آتا ہے وہ غزل یہ تھی:

مجھے اس کا کوئی گلہ نہیں کہ بہار نے مجھے کیا دیا
تری آرزو تو نکال دی ترا حوصلہ تو بڑھا دیا

گو ستم نے تیرے ہر اِک طرح مجھے نا اُمید بنا دیا
یہ مری وفا کا کمال ہے کہ نباہ کر کے دِکھا دیا

کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اِک چراغ جلا دیا

تجھے اب بھی میرے خلوص کا نہ یقین آئے تو کیا کروں
ترے گیسوؤں کو سنوار کے تجھے آئینہ بھی دِکھا دیا

یہ غریب عاجؔزِ بے وطن یہ غبارِ خاطرِ انجمن
یہ خراب جس کے لیے ہوا اُسی بے وفا نے بھلا دیا

غزل تمام ہوئی تو نہ پوچھئے سننے والوں کا کیا حال تھا۔ ہر دل میں بس ایک ہی خواہش تھی۔ کاش یہ نوجوان کچھ دیر اور غزل سرا رہتا۔ کاش اُس کی درد بھری پیاری پیاری آواز سنتے ہی رہتے۔ ''ایک اور، ایک اور'' کا شور ہوتا رہا۔ مجمع لاکھ چیخا پکارا، عاجؔز نو دو گیارہ ہو گئے۔ وہ گئے اور لگا ان کے ساتھ ہی ساتھ مشاعرے کی ساری رونق بھی چل دی۔ اپنے دل کا یہ حال تھا جو بہار کے رخصت ہونے کے بعد کسی چمن کا ہو۔'' (وہ جو شاعری کا سبب ہوا)

کلیم عاجزؔ ولادت 11 اکتوبر 1926ء کو بہار کے ایک گاؤں تیلہاڑا کے ایک معزز خاندان میں ہوئی جہاں علم دین و دنیا اور مسلم معاشرہ کی اعلیٰ تہذیب و روایات زندہ تھیں۔ کلیم پڑھنے لکھنے میں بچپن سے ہی بہت تیز تھے۔ مکتبی تعلیم کے دوران قرآن کریم اور اردو فارسی کی استعداد بہت جلد حاصل کرلی تھی۔ ان کی نسبی روایات میں دو دھارائیں تھیں۔ ان کا ننیہال صوفیاء اور علماء دین کا گھرانہ تھا جبکہ دادیہال دیہاتی زمینداروں، کاشتکاروں اور مرنے مارنے پر تیار غیرت مند بہادروں کا خاندان تھا جہاں سپہ گری، تلوار بازی اور بنوٹ وغیرہ کے فنون کو ہی اولیت حاصل تھی۔ کلیم کے نانا مکتب کے استاذ تھے۔ عربی و فارسی کے عالم، جن سے انہوں نے گلستاں بوستاں، رقعاتِ عزیزی وغیرہ فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ پڑھنے کا بے حد شوق تھا اس لئے ان کی معلومات اور زبان پر دسترس ہم عمر بچوں سے بہت زیادہ تھی۔ انہوں نے سات آٹھ سال کی عمر میں ہی قصص الانبیاء، مراۃ العروس، بنات النعش اور توبۃ النصوح جیسی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ کلیم عاجزؔ کے والد کلکتہ میں تجارت کرتے تھے۔ اگرچہ وہ پڑھے لکھے اور باذوق انسان تھے مگر اپنی خاندانی روایات کے تحت نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنے نانا، ماموؤں وغیرہ کی طرح مولوی یا صوفی بنیں چنانچہ انہیں کلکتہ بلوالیا گیا جہاں اسکول میں بھرتی کرانے کے ساتھ ساتھ اکھاڑے میں لے جاکر کسرت اور پہلوانی بھی سکھائی جانے لگی۔ کلکتہ میں اسکولی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہیں مطالعے کا موقع خوب ملا، طلسمِ ہوش ربا اور الف لیلیٰ سے لے کر انہوں نے اس زمانے میں گھر گھر مقبول قلمکاروں کو دل کھول کر پڑھا جن میں پریم چند، پنڈت سدرشن، خواجہ حسن نظامی، مرزا شفیع دہلوی، مرزا فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی اور اشرف صبوحی وغیرہ کی تحریریں اس دور کے مشہور رسالوں میں پڑھیں۔ اس وقت جوش ملیح آبادی کا رسالہ 'کلیم' اختر شیرانی، کارومان، شاہد احمد دہلوی کا 'ساقی' اردو اشرافیہ کے پسندیدہ رسالے تھے۔ کلیم اسکول اور کالج کی تعلیم میں ہمیشہ اوّل آتے رہے۔ تعلیم کی وجہ سے وہ کلکتہ میں رہے لیکن گاؤں سے بچھڑنے کا غم انہیں ہمیشہ ستاتا رہا۔ اسی اندرونی کرب کو بھلانے کے لئے سنیما اور تھیٹر میں دلچسپی بڑھی جن کے افسانوی اثرات نے ذہن میں رومانی جذبات جگا دیے۔ شاعری کی بنیاد اسی دور میں پڑی۔ مطالعہ غضب کا تھا۔ شاعری کا ذوق بڑھا تو تمام بڑی بڑی مثنویاں پڑھ ڈالیں۔ مصحفی،

انشاؔ، ناسخؔ، رندؔ، داغؔ اور امیرؔ مینائی سب کے کلام کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ تذکرۂ گلِ رعنا اور تذکرۂ نساخ وغیرہ شعراء کے مختلف تذکرے، ادب کی تاریخ، پورا ادبی منظر نامہ ذہن میں بس گیا۔ وہ شعر و ادب کی فضاؤں میں جوان ہوئے۔ مشاعروں اور ادبی جلسوں میں جانے کا شوق تبھی سے ہوا تھا۔

والد کے اچانک انتقال کا صدمہ کسی طرح برداشت کیا اور پھر پٹنہ آ گئے یہاں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا، پٹنہ سے گاؤں آنا جانا اور ماں و بہن بھائیوں سے ملنے کی آسانی تھی، 1944ء میں انہیں اپنے چھوٹے بھائی علیم کی موت کے جانکاہ صدمہ نے ہلا کر رکھ دیا۔ اب وہی غم زدہ ماں دو چھوٹے بھائیوں اور دو بہنوں کا سہارا تھے، وہ پٹنہ میں پڑھ رہے تھے، ان کی پیاری ماں اور چھوٹی بہن پٹنہ آئی تھیں، کچھ دن رہ کر واپس گاؤں کے لئے روانہ ہوئیں۔ یہ 26 اکتوبر 1946ء کا دن تھا وہ انہیں چھوڑنے اسٹیشن گئے تھے، لیکن وہ آخری ملاقات تھی کیونکہ 28 اکتوبر کو چھپرا اور تیلہاڑا پر ہندو مسلم فساد کا قہر ٹوٹا، کلیم سے ماں کا سایہ اور بہن کا پیار بے رحم قاتلوں نے لوٹ لیا، بہت سے قریبی بزرگ بھائی بہنیں ہمجولی موت کے منہ میں چلے گئے۔ شاعروں کو ان کی زندگی کے حادثات نے متاثر کیا ہے، زندگی کے دکھوں نے ان کی شاعری بن کر دنیا کو احساسِ غم کی لذت سے ہمکنار کیا ہے، لیکن اردو شاعری کی تاریخ میں کلیم عاجزؔ جیسا کوئی اور نظر نہیں آتا جس نے اپنوں کے خون کا دریا ڈوب کر پار کیا ہو، اپنے گاؤں کے کنویں کو ماؤں بہنوں اور بچوں کی لاشوں سے بھرا دیکھا ہو جو اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کے لئے خودکشی کر کے شہید ہوگئیں۔ تیلہاڑا کا کنواں گنجِ شہیداں بن گیا۔ علم و عرفان کی قوت نے سہارا نہ دیا ہوتا تو تبھی مر گئے ہوتے، غموں کا لاوا اشعار میں ڈھل کر پھوٹ پڑا:

دردمندِ عشق ہیں غم سے نہ گھبرائیں گے ہم
شاعری کرتے رہیں گے اور مر جائیں گے ہم
اب کے پھر برسات میں گنجِ شہیداں پر چلیں
آسماں روئے گا اور اپنی غزل گائیں گے ہم

انہوں نے میٹرک فرسٹ کلاس میں پاس کیا تھا، انھیں گولڈ میڈل ملا۔ شاعری اور تعلیم کی

دنیا میں کھو کر غموں کو بھلانے کی کوشش کی، بی اے کیا، اردو ادبیات میں ایم اے کیا، ''اُردو ادب کا ارتقا'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ گھر بسایا، دونوں بھائیوں اور بہن کی تربیت کی، دونوں بھائی پٹنہ میں ہیں، بہن امریکہ میں مقیم ہیں۔ چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں سب لائق اور تعلیم یافتہ، اہلیہ البتہ دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔ پٹنہ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو رہ کر سبکدوش ہوئے۔ لاتعداد طلبا کو علم و ادب کی دولت سے مالا مال کیا۔ ایک کامیاب زندگی گزاری، ساری دنیا میں عزت اور ناموری حاصل کی مگر وہ سارے غم جو روح کی گہرائیوں میں پیوست تھے۔ اشعار کا آبشار بن کر بہنے لگے، میرؔ اس اصلی غم کدۂ سخن میں کب آ بیٹھے خود کلیم عاجز بھی ٹھیک سے نہیں بتا سکتے۔ البتہ میرؔ کا غم ان کے تازہ لب و لہجے میں ڈھل گیا۔ میرؔ نے کہا تھا:

مستقل روتے ہی رہیے تو بجھے آتشِ دل
ایک دو اشک تو آگ اور بڑھا جاتے ہیں

جب 1976ء میں اُن کا پہلا مجموعۂ کلام شائع ہوا اُس وقت عظیم شاعر فراقؔ گورکھپوری نے اس طرح اپنا تاثر ظاہر کیا:

''اُن کا کلام مجھے اتنا پسند آیا کہ مجھے تکلیف سی ہونے لگی اور کلیم صاحب پر غصہ آنے لگا کہ کیوں وہ اتنا اچھا کہتے ہیں۔ ان کے اس جرم اور قصور کے لیے میں انھیں کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ اتنی ڈھلی ہوئی زبان، یہ گھلاوٹ اور لب و لہجے کا یہ جادو جو صرف انتہائے خلوص سے پیدا ہو سکتا ہے اس سے پہلے مجھے کبھی اس موجودہ صدی میں دیکھنے یا سننے کو نہیں ملا تھا، میں ان کا کلام سن کر خود اپنا کلام بھول گیا۔''

کلیم عاجؔز کی انتہائے غم یہ ہے کہ آنسو بہتے بہتے سلگنے لگے۔ یہاں وہ میرؔ کا پرچم اُٹھائے ہوئے اپنی انفرادیت کا اظہار کرتے ہیں:

اشک بھی اب سلگنے لگے ہیں
آگ دل کی بجھاتے بجھاتے

.......………...

وہ تو کہئے ہم نے رکھ لی آشیانے کے لیے
ورنہ اتنی آگ کافی تھی زمانے کے لیے

....

رسن و دار نہیں اہلِ جنوں کی منزل
ہم مسافر ہیں بہت دُور کے جانے والے

....

چھپا لیا ہے مشقت نے عیبِ عریانی
ہے گرد جسم پہ اس طرح پیرہن جیسے

....

جنابِ شیخ پر افسوس ہے ہم نے تو سمجھا تھا
حرم کے رہنے والے ایسے نامحرم نہیں ہوں گے

....

اُمید ایسی نہ تھی محفل کے اربابِ بصیرت سے
گناہِ شمع کو بھی جرمِ پروانہ بنا دیں گے

....

میخانے پر جب دیکھو تب بادل چھائے رہتے ہیں
جن کے گھر میں آگ لگی ہے اُن کے گھر برسات نہیں

....

اس قدر سوز کہاں اور کسی ساز میں ہے
کون یہ نغمہ سرا میرؔ کے انداز میں ہے

....

جنابِ شیخ اپنی فکر کیجے کہ اب یہ فرمانِ برہمن ہے
بتوں کو سجدہ نہیں کروگے تو بتکدے سے نکال دیں گے

....

پروفیسر کلیم عاجزؔ کے شعری مجموعے اردو کے شعری ادب کا قیمتی سرمایہ تسلیم کر لئے گئے ہیں، لیکن ان کی فکری صلاحیتیں صرف شاعری تک محدود نہیں رہیں، ان کی کتاب ''مجلسِ تنقید'' ادب کی مختلف جہتوں کا نہایت وقیع تنقیدی مطالعہ ہے۔ وہ ایک مسلمہ نثر نگار ہیں، ان کا سفرنامہ اور دو خودنوشت سوانحی کتابیں'' جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی اور ابھی سن لو مجھ سے، خوبصورت دل پذیر نثر نگاری کے ساتھ مصنف کے زورِ بیان اور قوت اظہار کو واضح کرتی ہیں، ان کتابوں میں اپنی زندگی کے حالات وسانحات کا ذکر انہوں نے بیحد جذباتی اسلوب میں کیا ہے، اندازِ بیان ناول کی طرح موثر اور دلچسپ ہے جس میں آنسو بھی ہیں اور مسرتوں کے پھول بھی لیکن ان کی بے پناہ بصیرتوں کے جوہر ان کے مجموعۂ مضامین 'میری زباں میر اقلم' میں کھلتے ہیں جو دو جلدوں میں ہیں۔ ان مضامین میں انہوں نے ادب اور زندگی کے ایسے پہلوؤں کو بھی چھوا ہے جن پر پہلی بار روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کی نثری ومنظوم نگارشات انہیں اس دور کا ایک ایسا شاعر، ایسا ناقد اور ایسا ادیب ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں جو نہ صرف صاحب فکر ونظر قلمکار ہے بلکہ وہ حیات و کائنات کے رموز سے بھی پوری طرح آگاہ ہے۔ کلیم عاجزؔ کے فن اور شخصیت پر متعدد تحقیقی و تنقیدی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے کلام اور فکریات کی تفہیم وتفسیر کا سلسلہ جاری ہے۔

کلیم عاجزؔ کی ایک اور خصوصیت جو ان کی شخصیت کو اردو شعراء کی صف میں نمایاں کرتی ہے وہ دین وشریعت کی سخت پابندی، درویشانہ سادگی وحق پرستی ہے۔ وہ یونیورسٹی کے پروفیسر رہے، انگریزی زبان وادب پر انہیں عبور حاصل ہے لیکن انہوں نے انگریزی لباس کبھی نہیں پہنا، لہو ولعب اور دنیاوی آلائشوں سے ہمیشہ دور رہ کر پاکیزہ زندگی گزاری ہے۔ ریاستی یا مرکزی ، کسی طرح کی سیاست سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ انہوں نے اپنا کوئی نظریاتی گروہ بنایا اور نہ خود کسی گروہ میں شامل ہوئے۔ اردو زبان اور علم وادب کا فروغ واصلاحِ معاشرہ ان کا نصب العین تھا۔ تبلیغی جماعت کے دعوتی مشن میں ہمیشہ سے سرگرم رہے۔ بہار تبلیغی جماعت کے امیر کی حیثیت سے تبلیغِ دین اور ملتِ اسلامیہ کی اصلاح میں پیش پیش رہے۔ بہار کے وزیر اعلیٰ مسٹر نتیش کمار کی خواہش پر انہوں نے بہار اردو مشاورتی کمیٹی کے چیئرمین کی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں، یہ عہدہ کابینہ کے وزیر کے مساوی بنا دیا گیا تھا۔ پروفیسر کلیم عاجزؔ اس پیرانہ سالی اور نقاہت کے

باوجود نوجوانوں کی طرح بہار میں اردو کی ترقی اور اپنی ریاست کی نوجوان نسل کی تعلیم و تربیت کے تئیں شروع سے ہی بہت سنجیدہ اور سرگرم رہے۔ یقیناً انھیں یہ ادراک تھا کہ بہار ہی شمالی ہند میں واحد ریاست ہے جہاں کی نوجوان اردو نسل کو آگے چل کر کاروانِ اردو کی قیادت کرنی ہے۔

نازشِ دبستانِ عظیم آباد، آفتابِ سخن، آبروئے غزل حضرت کلیم عاجزؔ مرحوم کی شاعرانہ عظمت کا سارا زمانہ معترف ہے۔ دنیائے ادب کے مقتدر ناقدین ان کے کلام کی اہمیت اور معنویت کو تسلیم کر چکے ہیں، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ صدی کے اس عظیم شاعر کی قدر و تفہیم کا حق ابھی اُس طرح ادا نہیں ہوسکا جس طرح ہونا چاہیے۔ اس کی بڑی وجہ اربابِ نقد و نظر کی عدم توجہ یا علمی تساہل نہیں بلکہ ایسے نادرِ روزگار شاعر کے کلام کی کم دستیابی کو سمجھا جانا چاہیے۔ کلیم عاجزؔ صاحب کی زندگی میں ان کی تمام تخلیقات پانچ خوبصورت مجموعوں میں شائع ہو چکی تھیں، لیکن ان کی اشاعت بوجوہ اُس وسیع پیمانے پر نہیں ہوسکی کہ ہر اہلِ ذوق قاری کی رسائی ممکن ہوتی۔ اس اہم ادبی ضرورت کو نامور ملّی رہنما سیّد شہاب الدین صاحب (سابق رکن پارلیمنٹ و سابق سربراہ کل ہند مسلم مجلس مشاورت) نے اپنے محترم دوست کلیم عاجزؔ صاحب کی حیات کے آخری برسوں میں ہی محسوس کرلیا تھا، کیونکہ موصوف نے 'کلیاتِ کلیم عاجزؔ' کی ترتیب و اشاعت کے لیے راقم اور ادارہ فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ کے روحِ رواں جناب محمد ناصر خان سے اپنی دلی خواہش کا اظہار فرمایا تھا۔ یہ حالات کی نامساعدت ہی تھی کہ سیّد صاحب کی حکم نما فرمائش کی تعمیل میں تاخیر ہوتی چلی گئی اور ہم اپنے عہد کے عظیم شاعر کی خوشنودی اور دُعاؤں سے محروم رہ گئے۔

زیرِ نظر 'کلیاتِ کلیم عاجزؔ' میں ان کے پانچوں شعری مجموعے شامل ہیں، چونکہ یہ سبھی مجموعے خود کلیم عاجزؔ صاحب مرحوم نے بنفس نفیس مرتب فرمائے تھے

اس لیے راقم نے کلیات کی تدوین میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ اُن میں کسی طرح کا تغیر وتبدل نہ ہو حتیٰ کہ شاعر نے اپنی شخصیت اور فن کے حوالے سے جتنا کچھ نثر میں بھی تحریر کیا ہے، وہ سب حرف بہ حرف شامل رہے۔ دراصل حضرت کلیم عاجؔز کی شاعری کی طرح اُن کا نثری اسلوب بھی منفرد خصوصیات کا حامل ہے۔ کلیات میں شامل یہ تحریریں نہ صرف اُن کی نابغۂ عصر شخصیت اور شاعری کی شرح وتفہیم میں رہنما ہیں بلکہ یہ اُن کے عہد کا ادبی وتہذیبی منظرنامہ بھی ہیں۔

اربابِ ادب واقف ہیں کہ دبستانِ عظیم آباد کے مشاہیر کے تذکروں پر مبنی راقم کے مضامین کا جو سلسلہ دہلی و پٹنہ سے شائع ہونے والے روزنامہ 'ہمارا سماج' میں جاری ہے اسے انٹرنیٹ پر ملک و بیرونِ ملک کے ہزارہا قارئین نے پسند کیا ہے۔ میں اسے اپنی ادبی وصحافتی زندگی کی سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہوں کہ 'کلیاتِ کلیم عاجؔز' کی صورت میں دبستانِ عظیم آباد کے اُفق سے طلوع ہونے والی خوبصورت شاعری کو موجودہ اور آنے والی نسلوں تک پہنچانے میں یہ ادنیٰ سی خدمت انجام دینے کا موقع ملا۔ اس جگہ میں محسنِ اُردو الحاج محمد ناصر خان صاحب کے تئیں اظہارِ ممنونیت لازمی خیال کرتا ہوں جن کے ادبی خلوص کے نتیجے میں ہمیشہ زندہ رہنے والا یہ شاہکار شعری مرقع منصۂ شہود پر آ سکا۔

یکم جنوری 2016ء　　　　　　　　25، گنیش پارک، رشید مارکیٹ، دہلی-51

کلرتصاویر

کلر تصاویر

کلرتصاویر

کلرتصاویر

کلرتصاویر

کلر تصاویر

کلر تصاویر

کلر تصاویر

اے اہلِ ادب آؤ یہ جاگیر سنبھالو

□ رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری

میں اپنی زندگی کی اہم خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے جناب کلیم عاجزؔ صاحب کا کلام خود ان کے منہ سے سننے کے موقعے ملے۔ اب تك لوگوں کی شاعری پڑھ کر یا سن کر پسندیدگی اور کبھی کبھی قدر شناسی کے جذبات میرے اندر پیدا ہوتے رہے لیکن جب میں نے کلیم عاجزؔ صاحب کا کلام سنا تو شاعر اور اس کے کلام پر مجھے ٹوٹ کر پیار آیا اور ہم آہنگی، محبت اور ناقابلِ برداشت خوشی کے جذبات میرے اندر پیدا ہوگئے۔ ان کا کلام مجھے اتنا پسند آیا کہ مجھے تکلیف سی ہونے لگی اور کلیم عاجزؔ صاحب پر غصہ آنے لگا کہ یہ کوں اتنا اچھا کہتے ہیں، ان کے اس جرم اور قصور کے لیے میں اُنہیں کبھی معاف نہیں کرسکتا، اتنی دُھلی ہوئی زبان، یہ گھلاوٹ، لب و لہجے کا یہ جادو جو صرف انتہائی خلوص سے پیدا ہوسکتا ہے، اس سے پہلے مجھے کبھی اس موجودہ صدی میں دیکھنے یا سننے کو نہیں ملا تھا، میں اُن کا کلام سن کر خود اپنا کلام بھول گیا۔

کلیم عاجزؔ صاحب اپنی شاعری اور اپنی آواز سے

ہزاروں لاکھوں سننے والوں کا من موہ لیتے ہیں، یہ ایک خطرناک خوبی ہے۔ رام سے راون نے جب لڑائی ٹھان لی تو یہی دُعا مانگی کہ مجھے رام کو دیکھ کر محبت نہ پیدا ہوجائے اس لیے کہ پھر میں ان سے کیسے لڑوں گا؟ کچھ ایسا ہی بسی کرن کلیم عاجزؔ صاحب کی شاعری میں پایا جاتا ہے، میں یہ جانتا ہوں کہ کلیم عاجزؔ صاحب کی شاعری میں ہمیں مولانا رومیؔ یا اقبالؔ، عرفیؔ یا مرزا بیدؔل کے دقائق نہیں ڈھونڈنا چاہیے، لیکن صبح کے سہانے پن میں، بھیرویں کی راگنی میں، چاندنی کے ناقابلِ بیان جادو میں،ایک بچّے میں، کرشن کی ربوبیت کی جھلک میں ہم دقائق نہیں ڈھونڈتے، گیتا کا فلسفہ نہیں ڈھونڈتے اور اس سے بھی کوئی بڑی چیز پالیتے ہیں، وہی بے نام جادو ہمیں کلیم عاجزؔ کی شاعری میں ملتا ہے۔ ٹھیٹھ آدمیت یا آدمیت کے ٹھیٹ پن کی بلاغت کلیم عاجزؔ کے شاعرانہ کردار میں نغمہ بن کر جھلک جایا کرتی ہے۔

میں یہ سطور سخت بیماری کی حالت میں بول کر لکھوا رہا ہوں، میں کلیم عاجزؔ صاحب کی شاعری پر کچھ بھی کہتے ہوئے اپنے آنسو مشکل سے روک پاتا ہوں۔ اس سے زیادہ میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔

کلکتہ

۱۶؍نومبر ۱۹۷۵ء

پہلا مجموعہ

وہ جو شاعری کا سبب ہُوا

اشاعت: اگست 1976ء

وہ جو شاعری کا سبب ہُوا وہ معاملہ بھی عجب ہُوا
میں غزل سناؤں ہوں اس لیے کہ زمانہ اُس کو بھلا نہ دے

انتساب

اپنی والدہ محترمہ

کے نام

جن کی شہادت کا غم

میرا سرمایۂ حیات ہے

تبصرہ

□ کلیم الدین احمد

پروفیسر کلیم الدین احمد — ماہرِ تعلیم، نقّاد اور محقق۔ پیدائش ستمبر ۱۹۰۸ء۔ صدر شعبۂ انگریزی پٹنہ یونیورسٹی، پرنسپل پٹنہ کالج، ڈین فیکلٹی آف آرٹس پٹنہ یونیورسٹی، ڈائریکٹر سرشتہ تعلیم بہار، ڈائریکٹر خدابخش اورینٹل لائبریری، چیئرمین اسکول ایگزامنیشن بورڈ بہار، ڈائریکٹر انگریزی اُردو ڈکشنری ترقی اُردو بورڈ (ہند)۔ اُردو شاعری کی تنقید کی دُنیا میں، جو بت خانۂ آذر تھی، بت شکن مشہور ہیں۔ ان کی تصنیفات 'اُردو شاعری پر ایک نظر'، 'اُردو تنقید پر ایک نظر'، 'فن داستان گوئی'، 'عملی تنقید' وغیرہ وغیرہ تنقید اور تحقیق کی دُنیا میں اب تک حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں مرکزی حکومت ہند کے عطیۂ غالب ایوارڈ کو ہم قدر شناسی کی ابتدا کہہ سکتے ہیں۔

غزل سے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے اُردو دُنیا واقف ہے۔ اس لیے اس کا اعادہ تحصیل حاصل ہے، لیکن کچھ احباب سمجھنے لگے ہیں کہ میرے خیالات میں تبدیلی ہوئی ہے۔ سرور صاحب کہتے ہیں: ''اُن کی مخالفت میں اگلی سی شدّت نہیں ہے۔'' اور کلیم عاجؔز بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ لکھتے ہیں: ''وہ یہ سمجھتے ہیں کہ غزل کے جس ہیئتی نقص نے نیم وحشی صنف شاعری کا فتویٰ ان سے دِلوایا ہے عہدِ حاضر میں وہ بہت حد تک اپنی اصلاح کر چکی ہے۔ مگر جب بات زبان سے نکل گئی ہے تو وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے، والا معاملہ درپیش ہے۔'' اس لیے میں یہ بات صاف کردوں کہ میری رائے جو تھی وہ ہے۔

مشکل یہ ہے کہ غزل کی وجہ سے جو ریزہ خیالی آ گئی ہے وہ تنقید کے لیے مضر ہے۔ جس طرح غزل کے ایک شعر یا ایک مصرع پر واہ! واہ! ہوتی ہے، اسی طرح تنقید کے کسی ایک جملے یا ایک مختصر ٹکڑے پر توجہ مرکوز ہو جاتی ہے، اور صرف اسی کی تعریف ہوتی ہے یا اس کے خلاف شدید ردِّ عمل ہوتا ہے۔ اب یہ کون کہے کہ تنقید غزل تو ہے نہیں کہ اس کے ایک جملے کو حاصلِ تنقید سمجھ لیا جائے۔ تنقید بھی شعر کی طرح ایک اکائی ہے لیکن کچھ پیچیدہ قسم کی اور اس کے اجزا کو الگ

نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے جہاں غزل کے صنفی نقائص کا مفصل تجزیہ کیا ہے، وہاں اس کے امکانات پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ غزل نظم بن سکتی ہے، غزل قطعہ بند ہوسکتی ہے، غزل مسلسل ہوسکتی ہے۔ میں نے یہ بھی کہا ہے کہ غزل میں خیالات و جذبات ایک مرکز کے گرد چکر کھاتے ہیں، اور میں نے یہ بھی کہا کہ بعض شعرا ایسے بھی ہیں جن کے خیالات ایک نہج پر بہتے ہیں اس لیے ان کی غزلوں میں اَنمل اور بے جوڑ باتیں نہیں ہوتی ہیں یا کم ہوتی ہیں۔

کلیم عاجؔز کی غزل میں نے پہلی بار پڑھی نہیں بلکہ سنی۔ ان کی آواز مترنم ہے اور پڑھنے کا ڈھنگ دلکش ہے۔ عموماً مجھے یہ بات اچھی نہیں معلوم ہوتی کہ مشاعرہ میں شاعر گویّا بن جائے اور تعریف شعر کی نہ ہو بلکہ ترنم کی ہو۔ شعر میں شاعر کا خونِ جگر صرف ہوتا ہے۔ شعر دماغ سوزی کا کام ہے اور اسے سمجھنے، اسے پورا پورا لطف حاصل کرنے کے لیے سامعین کو بھی غور وفکر، دماغ سوزی سے کام لینا ہوتا ہے اور ترنم اس میں حائل ہوتا ہے، لیکن کلیم عاجؔز کے شعروں کو سمجھنے میں کوئی دُشواری نہیں ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے شعروں میں ایک مخصوص سادگی ہے۔ ان کے الفاظ جانے پہچانے، ان کی ترکیبیں ایسی سیدھی سادی ہوتی ہیں کہ مفہوم فوراً ذہن نشین ہوجاتا ہے۔ یہ نہیں کہ ان کے اشعار سطحی ہوتے ہیں بلکہ الفاظ اور ترکیبوں اور معانی کے درمیان کوئی پردہ نہیں بلکہ یوں کہیے کہ ان کے الفاظ ایسے شفاف ہیں کہ معانی کو ایک نگاہِ غلط انداز بھی پالیتی ہے۔ اکثر ان کے شعروں میں لفظوں کا ایک تو سطحی مفہوم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا مفہوم بھی ہوتا ہے، دونوں بیک وقت سمجھ میں آجاتے ہیں۔ مبارکؔ عظیم آبادی کا ایک شعر ہے:

جو دل پہ گزرے کھنچے اُس کی صفحہ پر تصویر
قلم اُٹھے نہ مبارک خیال بندی پر

کلیم عاجؔز کا بھی یہی مسلک ہے کہ 'جو دل پہ گزرے کھنچے اس کی صفحہ پر تصویر'۔ ان کے شعروں میں 'غمِ جاناں' بھی ہے اور 'غمِ دوراں' بھی۔ اور وہ 'غمِ جاناں' کو 'غمِ دوراں' بناتے ہیں اور دونوں اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جاسکتے۔ وہ ہونے والے واقعات کی طرف کھلے یا چھپے اشعار، طنزیہ اشارے کرتے ہیں جو فوری طور پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور یہ ہونے والے واقعات ہوں یا نجی واقعات ہوں، ان کے شعروں میں ایک قسم کا تسلسل پیدا کردیتے ہیں۔

میری شاعری میں نہ رقص جام، نہ مئے کی رنگ فشانیاں
وہی دُکھ بھروں کی حکایتیں وہی دل جلوں کی کہانیاں
جو یہ آہ و نالہ و درد ہیں کسی بے وفا کی نشانیاں
یہی میرے دل کے رفیق ہیں یہی میری رات کی رانیاں
کبھی آنسوؤں کو سکھا گئیں میرے سوزِ دل کی حرارتیں
کبھی دل کی ناؤ ڈبو گئیں میرے آنسوؤں کی روانیاں

ان کی غزلوں میں 'دُکھ بھروں کی حکایتیں' اور 'دل جلوں کی کہانیاں' ہیں۔ اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کی غزلوں میں اَنمل اور بے جوڑ باتیں نہ آنے پائیں۔ اگر وہ تسلسل کی فنی ضرورت اور اہمیت کو سمجھیں تو وہ مسلسل غزلیں لکھ سکتے ہیں اور ان کی غزل دُکھ بھروں کی 'حکایت' اور دِل جلوں کی 'کہانی' بن سکتی ہے۔ 'حسنِ خیال' اور 'حسنِ تنظیم' میں کوئی بیر نہیں ہے۔ سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری، صرف شاعری ہی نہیں فن کا اہم نکتہ بھی ہے اور کلیم عاجزؔ اس نکتہ سے واقف ہیں لیکن وہ اس سے گریز کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

مانگنا جرم ہے فنکار سے ترتیبِ خیال
گیسوئے وقت جب آشفتہ بیانی مانگے

ذاکر صاحب کہتے تھے کہ غلام ربّانی تاباںؔ نے اپنی غزلوں کا مجموعہ شائع کیا تو اس میں ایک مقدمہ بھی تھا جس میں انھوں نے غزل کی حمایت کی تھی۔ میں نے کہا بھئی غزلیں کہتے ہو تو کہو لیکن غزل کی حمایت کیوں کرتے ہو۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمھارے دل میں چور ہے۔ 'کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے'۔ گیسوئے وقت آشفتہ بیانی مانگے یا نہ مانگے، ترتیبِ خیال فنکار کا فن ہے۔ کلیم عاجزؔ خود بھی یہی کہتے ہیں:

بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیمؔ
بات کہنے کا سلیقہ چاہیے

اور کلیم عاجزؔ کو بات کہنے کا سلیقہ اور اُن کی غزلوں میں ترتیبِ خیال بھی ہے۔ وہ ترتیبِ خیال تو نہیں جو قطعہ بند غزل یا مسلسل غزل میں ہوتا ہے، لیکن ان کے جذبات و خیالات ایک ہی نہج پر بہتے ہیں، اس لیے شعروں میں تسلسل سا پیدا ہو جاتا ہے:

تجھے سنگدل یہ پتہ ہے کیا کہ دُکھے دلوں کی صدا ہے کیا
کبھی چوٹ تو نے بھی کھائی ہے کبھی تیرا دل بھی دُکھا ہے کیا؟
تُو رئیسِ شہرِ ستمگراں میں گدائے کوچۂ عاشقاں
تُو اُمیر ہے تو بتا مجھے میں غریب ہوں تو برا ہے کیا
تُو جفا میں مست ہے روز و شب میں کفن بدوش غزل بلب
تیرے رعبِ حسن سے چُپ ہیں سب میں بھی چُپ رہوں تو مزا ہے کیا
یہ کہاں سے آئی ہے سرخ رُو، ہے ہر ایک جھونکا لہو لہو
کٹی جس میں گردنِ آرزو یہ اُسی چمن کی ہَوا ہے کیا

اور دیکھیے:

بڑی طلب تھی بڑا انتظار دیکھو تو — بہار لائی ہے کیسی بہار دیکھو تو
یہ کیا ہوا کہ سلامت نہیں کوئی دامن — چمن میں پھول کھلے ہیں کہ خار دیکھو تو
لہو دِلوں کا چراغوں میں کل بھی جلتا تھا — اور آج بھی ہے وہی کاروبار دیکھو تو
یہاں ہر اِک رسن و دار ہی دِکھاتا ہے — عجیب شہر عجب شہرِ یار دیکھو تو
نہ کوئی شانہ بچا ہے نہ کوئی آئینہ — دراز دستیِ گیسوئے یار دیکھو تو

کسی سے پیار نہیں پھر بھی پیار ہے سب سے
وہ مستِ حسن ہے کیا ہوشیار دیکھو تو

اُن کی غزلوں میں دل کی باتیں بھی ہیں اور سیاسی باتیں بھی، اور سیاسی باتیں غزل کی زبان میں ہیں۔ ان کے شعروں میں 'پھول' بھی ہیں اور 'پتھر' بھی۔ اور پھول پتھر بن جاتے ہیں اور پتھر پھول بن جاتے ہیں۔ اس کام کے لیے بھی سلیقے کی ضرورت ہے، اور وہ 'پابندیوں کا غم' لیں تو سلیقہ کی لَو اور تیز ہو سکتی ہے:

شرط سلیقہ ہے ہر اِک امر میں
عیب بھی کرنے ہوں ہنر چاہیے

۞۞

تجزیہ

❑ جمیل مظہری

علامہ سیّد کاظم علی جمیؔل مظہری — غالب ایوارڈ یافتہ عہد حاضر کے اہم ترین فلسفی شاعر۔ پیدائش مغل پورہ، پٹنہ ۱۹۰۵ء۔ پروفیسر پٹنہ یونیورسٹی۔ سابق ڈپٹی ڈائریکٹر شعبۂ نشر و اشاعت حکومتِ بہار۔ حال کے اعتبار سے مجسمۂ فکر و فلسفہ۔ قال کے اعتبار سے پیکرِ شعریت اور کلام میں تینوں کا حسین امتزاج۔ ہر صفِ سخن پر یکاں قدرت و مہارت۔ چھوٹی بڑی مطبوعہ نظموں اور ایک طویل مطبوعہ مثنوی 'آب و سراب' کے علاوہ دو شعری مجموعے 'نقشِ جمیل' اور 'فکرِ جمیل' منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

دبستانِ بہار میں اور خصوصیت کے ساتھ دبستانِ بہار کے شہر عظیم آباد میں بہتر سے بہتر غزل گو شعرا پیدا ہوئے جو اپنے طرزِ خاص کے لحاظ سے خود ایک امامِ فن تھے۔ راسؔخ کے بعد شاؔد کا نام خود بخود ذہن میں آتا ہے جن کو امامِ فن کہنا شاید اُن کی توہین ہو، اُنھیں پیغمبرِ فن کہیے یا میؔر و غالبؔ و انیسؔ کی طرح خدائے سخن کہیے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس خدائے سخن نے اپنے تغزّل کے کسی دَور میں میؔر کی پیروی نہیں کی۔ صوفی شاعر ہونے کی حیثیت سے اُنھوں نے دؔرد کے مدرسۂ فکر و فن کو پھر سے زندہ کیا۔ ابتدائے عشق میں اُنھوں نے آتؔش کے نقشِ قدم پر قدم رکھے تھے۔ سوز و گداز تغزّل کے اعتبار سے کہیں کہیں دؔرد کا لہجہ میؔر سے مشابہ ہو جاتا ہے، لیکن ایسی مشابہت کی مثال بھی شاؔد کے دیوان میں نہیں ملتی۔ اُن کے یہاں تغزّل اور تفلسف کا جو امتزاجِ شیریں ملتا ہے وہ اُن کا اپنا ہے، اس میں کوئی اُن کا شریک نہیں۔ شاؔد کہیں کہیں غالبؔ سے مشابہ نظر آتے ہیں، لیکن میؔر کے مزاجِ تغزّل کے منفعلانہ رجحان کی پرچھائیوں سے ان کے دیوان کے صفحات خالی ہیں۔

اُن کے دوسرے ہم عصر علاّمہ آزؔاد نے غالبؔ کے فکر و فن کی پیروی کی اور اس پیروی میں وہ اقباؔل و وحشتؔ کے ہم نوا رہے۔ میؔر کی پیروی کا کیا سوال؟ ہاں ان کے تیسرے ہم عصر اثؔر عظیم

آبادی میرؔ کی پیروی میں کوشاں رہے اور اس کوشش میں انھیں کہیں کہیں غیر معمولی کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن ان کا فلسفیانہ اور مفکرانہ ذہن اپنی ہمہ گیری کے لحاظ سے اتنا مضطرب رہا کہ وہ اپنی تصنیفات اور تخلیقات اور شاعری میں کسی ایک موضوع یا کسی ایک صنف نظم ونثر پر جم کر اپنا پورا زورِ طبع صرف نہ کر سکے۔ ان کا دیوان اُٹھا کر دیکھئے، کہیں وہ سوداؔ، کہیں مومنؔ کے ہم نوا نظر آتے ہیں، کہیں مصحفیؔ اور آتشؔ کے۔ اس لیے مجھے یہ کہنے میں تامّل نہیں کہ میرؔ کی پیروی پوری جمعیتِ خاطر کے ساتھ ان سے بھی نہ ہوسکی۔ ان کے بعد عظیم آباد کے چوتھے غزل گو مبارکؔ عظیم آبادی تھے جنھوں نے داغؔ کے شاگرد رشید اور شادؔ کے ہم عصر ہونے کی حیثیت سے دونوں کے رنگِ سخن کو سمو کر غزلیت کی ایک نئی راہ نکالی، جس کی زبان میں آتشؔ کی قلندرانہ سرمستی، داغ کی شوخی اور شادؔ کی گمبھیرتا ہے۔ لیکن میرؔ کے رنگِ سخن میں ڈوبا ہوا ایک شعر بھی اُن کے مجموعۂ کلام میں شاید نہ ملے۔ ان کے بعد شادؔ کے مایۂ ناز شاگردوں میں لاڈلے صاحب بیتابؔ، موجؔ اور علی باقر آبادؔ اپنی اپنی جگہ امامِ فن تھے، لیکن میرؔ کی باضابطہ پیروی کا رنگ اُن کے مجموعۂ کلام میں بھی نہیں ملتا۔

ان بزرگوں کے بعد بہار کیا سارے ہندوستان میں غالبؔ، اقبالؔ اور وحشتؔ کی پیروی کا دَور آتا ہے، جس نے بہارِ جدید کو اجتبیٰؔ رضوی اور پرویزؔ جیسے عظیم فنکار دیئے۔ لیکن اِن کے ذہنوں کے سانچے کچھ ایسے غیر منفعلا نہ تھے کہ میرؔ کے رنگ کے اشعار ان سے بھی نہ ڈھل سکے۔ غرض اس پوری روداد کا خلاصہ بلکہ نتیجہ یہ ہے کہ بہار کے کسی چھوٹے بڑے شاعر سے میرؔ کی تتبع کا حق ادا نہ ہوسکا اور میرؔ کی میراثِ سخن غالبؔ کی زبان سے چیختی رہی کہ:

یوں ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگن عشق

لیکن ایک مردِ میدان بھی اس کو اُٹھانے کو تیار نہ ہوا۔ انجم مان پوری نے دو چار غزلیں میرؔ کے انداز میں کہیں، لیکن ظرافت نگاری نے اُنھیں ایسی المیہ نگاری کی فرصت نہ دی۔

میرؔ کی عدم پیروی کے سوال کو بہار ہی تک کیوں محدود رکھا جائے۔ بہار سے باہر ہندوستان میں کون ایسا شاعر ہے جسے ہم باضابطہ پیرو میرؔ کہہ سکتے ہیں؟ شادؔ لکھنوی اپنے نام کے ساتھ پیرو ِمیرؔ لکھا کرتے تھے لیکن ان کا ایک شعر بھی میرؔ کے رنگ کا زبان زدِ خلائق نہ ہوسکا۔ لکھنؤ کے دوسرے بڑے شاعر جعفر علی خاں اثرؔ نے میرؔ کے تتبع میں بڑا زور صرف کیا لیکن بقولِ ذوقؔ:

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب

میرؔ کی یہ میراثِ خاص تو خالقِ نطق نے ایک ایسے نوجوان کے لیے وقف کر رکھی تھی جو اپنی افتادِ طبع ہی کے لحاظ سے نہیں، میرؔ کی خانگی، معاشرتی، سماجی اور ان کے عہد کے سیاسی حالات کی مشابہت کے اعتبار سے بھی میرؔ کے تأثر تغزّل کا حامل ہونے والا تھا۔

کلیم عاجزؔ گرچہ چار سال میرے اسٹوڈنٹ پٹنہ یونیورسٹی میں رہے، مگر اس زمانۂ طالب علمی سے قبل پہلی مرتبہ ۱۹۵۰ء میں منگل تالاب کے ایک محفلِ سخن میں دیکھا تھا، جہاں نواسنجانِ عظیم آباد اپنی نواسنجی سے بزم کو گرمیِ سخن بخش رہے تھے کہ دفعتاً اُن کے ہجوم سے ایک سہمے سہمے نوجوان نے بڑے سہمے سہمے انداز میں غزل سرائی شروع کی اور میرے کان کھڑے ہوگئے کہ میرؔ کی یہ آواز عظیم آباد کے ایک نوجوان کے گلے سے کیسے نکل رہی ہے اور اس کی نوجوانی نے میرؔ کے بڑھاپے کو کیسے اپنے اندر بھر لیا ہے۔

کلیم عاجزؔ اپنی کیفیاتِ تغزّل میں میرؔ کے فرماں بردار پیرو تو ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ اُن کے دائرۂ فکر و فن میں میرؔ کی تقلید کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ہمیں ان کی غزلوں میں تغزّل جدید کا پرتو بھی ملتا ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں نہ سہی، اُن کے اندازِ فکر میں بھرپور ندرت اور بھرپور جدّت ہے۔ اندازِ فکر میں جدّت اور اندازِ بیان میں قدامت کلیم عاجزؔ کے تغزّل کا مخصوص آرٹ ہے جو سینکڑوں شعرا کے ہزاروں اشعار کے ہجوم میں جانا اور پہچانا جا سکتا ہے۔ ان کی غزلوں میں ان کے عہد کے سماجی اور سیاسی تصوّرات بڑے سلیقۂ فن کے ساتھ اپنے کو نمایاں کرتے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ اپنی جگہ حرف بحرف صحیح ہے:

تجھے بھی ہم اے غمِ جاناں غزل کے سانچے میں ڈھال دیں گے

اُنھوں نے بلاشبہ غمِ زمانہ ہو یا غمِ روزگار، غمِ وطن ہو یا غمِ کائنات سب کو تغزّل کا نازک شبنمی پیرایۂ لطیف دیا ہے جس میں غزل کی فنّی نزاکت کا اس طرح احترام ملحوظ رکھا ہے کہ بے ساختہ عرفیؔ کا یہ شعر یاد آجاتا ہے:

در دلِ ما غمِ دُنیا غمِ معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

سلسلۂ بیان میں کلیم عاجزؔ کا ایک مصرع جب قلم کی زبان سے ٹپک ہی پڑا تو آیئے اس

غزل کے تین مطلعے آپ کو سنا کر خود بھی محفوظ ہوں اور آپ کو بھی محفوظ کروں:

حقیقتوں کا جلال دیں گے صداقتوں کا کمال دیں گے
تجھے بھی ہم اے غمِ زمانہ غزل کے سانچے میں ڈھال دیں گے
نہ بندۂ عقل و ہوش دیں گے نہ اہلِ فکروخیال دیں گے
تمھاری زلفوں کو جو درازی تمھارے آشفتہ حال دیں گے
یہ عقل والے اِسی طرح سے ہمیں فریبِ کمال دیں گے
جنوں کے دامن سے پھول چن کر خرد کے دامن میں ڈال دیں گے

آپ کہیں گے کہ اِن تینوں مطلعوں کے اندر جدیدیت کا آہنگ ہے۔ٹھیک ہے، لیکن ان کی تہہ میں ذرا اُتر کر دیکھیے تو میرؔ کی رُوحِ تغزّل ان میں بھی کارفرما نظر آئے گی۔اب رہی جدّتِ اسالیب کی بات، تو کلیم عاجزؔ کل تک نوجوان ہی تھے، بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے بعد جوشؔ کی رہنمائی میں اُردو شاعری نے جو اسلوب بدلا اور جدیدیت کے نئے امکانات سامنے آئے اُن سے اِن کا کچھ نہ کچھ متاثر ہونا لازمی تھا۔لیکن دوسرے نوجوان شعرا نے صرف اندازِ بیان میں جدّت پیدا کی، لیکن کلیم عاجزؔ کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے ترکیبِ خیال میں بھی ندرت آفرینی کے کرشمے دِکھائے۔

اب اِن اشعار کو آپ ندرتِ فکر نہ کہیں گے تو اور کیا کہیں گے؟

چھپا لیا ہے مشقت نے عیبِ عریانی ہے گرد جسم پہ اس طرح پیرہن جیسے

....

لہو دیں گے تو لیں گے پیار، موتی ہم نہیں لیں گے
ہمیں پھولوں کے بدلے پھول دو شبنم نہیں لیں گے

....

وہ تو کہیے ہم نے رکھ لی آشیانے کے لیے ورنہ اتنی آگ کافی تھی زمانے کے لیے

....

رَسن و دار نہیں اہلِ جنوں کی منزل ہم مسافر ہیں بہت دُور کے جانے والے

....

لیکن اِن جدّت طرازیوں کے باوصف ان کے ذوقِ سخن کا ذہنی جھکاؤ میرؔ ہی کے رنگِ تغزّل کی طرف اُن کی شاعری کے ہر دَور میں رہا، اور اب تو میرؔ کے رنگِ سخن میں ایسے اشعار کہنے

لگے ہیں کہ میؔر کے دیوان میں کوئی اُنھیں شامل کردے تو بڑے سے بڑے مدعیانِ فکر ونظر کو یقین ہوجائے کہ میؔر کے شعر ہیں۔اِن اشعار کی غمناک لجگی کو آپ کیا کہیں گے:

میں روؤں ہوں رونا مجھے بھائے ہے　　کسی کا بھلا اِس میں کیا جائے ہے
کوئی دیر سے ہاتھ پھیلائے ہے　　وہ نامہرباں آئے ہے جائے ہے
دل آئے ہے پھر دِل میں درد آئے ہے　　یونہی بات میں بات بڑھ جائے گی
خموشی میں ہر بات بن جائے ہے　　جو بولو ہے دیوانہ کہلائے ہے

....

موسمِ گل کی کچھ باتیں ہیں کلیم تم سے کون کہے
تم تو بس سنتے ہی عاجؔز دیوانے ہوجاؤ ہو

....

پتھر کی طرح تیری ہر اِک بات لگے ہے　　دل توڑ کے ناصح تجھے کیا ہاتھ لگے ہے
ہم نے جو دیا ہے وہ ہمیں جان رہے ہیں　　سرمایۂ غم مفت کہاں ہات لگے ہے
ہاں رہیو الگ صحبتِ اربابِ خرد سے　　وہ بزم ہے یہ دن بھی جہاں رات لگے ہے

....

کیا جانے تمھیں کیا کہے ہے کیا نہ کہے ہے　　ہم کو تو جو دیکھے ہے سو دیوانہ کہے ہے
چھیڑے ہے کوئی تذکرۂ اہلِ وفا جب　　منہ پھیر کے کچھ شمع سے پروانہ کہے ہے
کب تک سنیں عاجؔز سے غمِ دل کی حکایت　　کمبخت ہمیشہ یہی افسانہ کہے ہے

....

ان اشعار کو پڑھیے اور انصاف سے کہیے کہ میؔر کے رنگِ سخن میں ایسی کامیابی کسی دَور میں کسی کو نصیب ہوئی؟ اگر آج کسی کے تغزّل میں اِس رنگ کی ہلکی سی پرچھائیں بھی ہو تو میری لاعلمی کو اُس نام سے محروم نہ رکھیے۔

کلیم عاجؔز کا دماغ میؔر کی کیفیاتِ سخن سے اتنا مسحور ہوا کہ اُنھیں میؔر کے عہد کی پرانی زبان بھی اچھی لگنے لگی۔ناسؔخ نے اس قدیمی لب و لہجے میں تصرفات کیے اور اُن کے قصیدہ پسند سامع نے اُردو کی لسانیاتی ترکیبوں میں مقامی بھاشاؤں کی خوش آہنگی سے زیادہ فارسی کی بلند آہنگی کو پسند کیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ زبان کا لب ولہجہ بدلنے لگا۔اِسے بدلنا کہیے یا بگڑنا۔کچھ لوگ کلیم عاجؔز کی زبان کی اس قدامت پسندی پر ناک بھنوں چڑھاتے ہیں۔یہ اپنا اپنا لسانیاتی ذوق ہے۔جب

ذہن بدلتے ہیں تو اُس کے ساتھ حواسِ خمسہ کا مزاج بھی بدلنے لگتا ہے۔ میؔر سے پہلے اُردو شعرا معشوق کے لیے پریتم اور سجن استعمال کرتے تھے اور آئینے کی جگہ آرسی بولتے تھے، لیکن جوں جوں فارسیت کا غلبہ اُن کے ذہنوں پر بڑھتا گیا اُنھیں مقامی بھاشاؤں کے رسیلے الفاظ پھیکے لگنے لگے۔ ناسؔخ نے زبان کے ڈھانچے میں واضح تبدیلیاں کیں۔ ’جاؤ ہو، کھاؤ ہو‘ کی جگہ ’جاتے ہو، کھاتے ہو‘ اُنھیں پسند آیا۔ ’کبھو‘ کو ’کبھی‘ بنادینے میں اُنھیں کیا مزہ ملا، یہ اُن کا لسانیاتی ذوق ہی جانے۔ بہرحال مجھے تو زبان میں اپنے عزیز کلیم عاجؔز کا قدامت پسندانہ رنگ جو پسند آیا تو میں نے بھی غیر ارادی طور پر اپنی بعض غزلوں میں عاجؔز کی جرأت کی اس طرح پیروی کی جیسے بوڑھے مصحؔفی نے اپنے عہد کے نوجوان ناسؔخ کی خیال مندانہ روش کی پیروی کی تھی۔ صفؔی کا مصرع پہلے میں نے یوں سنا تھا:

ذرا جاگتے رہیو اے ہم صفیرو!

پھر اُن کے صحیفۃ الغزل میں جب یہی مصرع یوں نظر آیا:

ذرا جاگتے رہنا اے ہم صفیرو!

تو مصرع کی لطافت میری نظر میں کم ہوگئی۔ یوں غور کیجیے تو ’جاؤ ہو، کھاؤ ہو‘ کی جگہ ’جاتے ہو، کھاتے ہو‘ کی ترکیبِ لفظی ٹائم بھی زیادہ لیتی ہے اور اسپیس بھی، اور اس پابندی کی وجہ سے کسی فکر کو عروض کے دائرہ میں اَٹانا ہو تو خواہ مخواہ کی دشواری بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

میں اپنی غزل میں جس کا پہلا مصرع یہ تھا:

آذری بھی حیراں ہے یار کیا بناتے ہو

یہ کہنا چاہتا تھا کہ:

سَو بُتوں کو توڑتے ہو اِک خدا بناتے ہو

لیکن مصرع کسی طرح موزوں نہیں ہو رہا تھا۔ دفعتاً عاجؔز کا انداز یاد آیا اور میں نے زمین بدل کر شعر کو یوں کردیا:

آذری بھی حیراں ہے یار کیا بناؤ ہو
سو بُتوں کو توڑو ہو اِک خدا بناؤ ہو

اور زندگی میں پہلی مرتبہ پوری کی پوری غزل اسی زبان میں لکھی۔

میؔر کی پیروی میں عاجؔز کو ایک اور سلیقۂ فن بھی قدرت کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ میؔر کی غزلیت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ عارفانہ اور فلسفیانہ افکار کو بھی بڑے سلیقے کے ساتھ غزل کا پیرایہ دے دیتے ہیں۔ وہ فلسفہ اور تصوف کے مضامین بھی بیان کرتے ہیں، لیکن اس طرح کہ نہ فلسفہ کی ثقالت باقی رہتی ہے نہ تصوف کی عارفانہ خشکی۔ یہ سلیقہ اُنھیں حافظؔ سے نہیں (کیونکہ یہ سلیقہ خود حافظؔ میں موجود نہیں) عراقیؔ اور فغانیؔ سے ملا تھا۔ غالبؔ نے ہر چند پیروی کی مگر یہ سلیقہ غالبؔ کو نہ آنا تھا، نہ آیا۔ غالبؔ کے مدرسۂ فکر کے عظیم ترین نمائندے اقبال بھی اس سے ہمیشہ محروم رہے۔ یہ فنکارا چابک دستی اگر آئی تو کچھ داغؔ میں آئی اور داغؔ کے بعد عظیم آبادی کے ایک فنکار یگانؔہ چنگیزی ہیں۔ بیسویں صدی کے آخر نصف کے غزل گویوں میں اگر کسی کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ نام کلیم عاجؔز ہے، جو بڑے سے بڑے مسائل کو بھی گھلا کر غزل کا میٹھا رس بنا دیتے ہیں اور بڑی ذمہ داری سے یہ اعلان کرتا ہوں کہ مجھے آج اس سلیقۂ فن میں کوئی اُن کا شریک نظر نہیں آتا۔
ملاحظہ ہوں سلیقۂ فکر و فن کی چند مثالیں:

اُمید ایسی نہ تھی محفل کے اربابِ بصیرت سے گناہِ شمع کو بھی جرمِ پروانہ بنا دیں گے

....

سنے گا کون میری چاک دامانی کا افسانہ یہاں سب اپنے اپنے پیرہن کی بات کرتے ہیں

....

سب آئینے سب آئینہ خانے اُنھیں سے ہیں
میں سنگ و خشت کیسے کہوں سنگ و خشت کو

....

رسن و دار نہیں اہلِ جنوں کی منزل ہم مسافر ہیں بہت دُور کے جانے والے

....

نہ کوئی شانہ بچا ہے نہ کوئی آئینہ دراز دستیِ گیسوئے یار دیکھو تو

....

عاجؔز کے ذہن کا سانچہ مذہبی ہے فلسفیانہ نہیں۔ اس لیے عموماً ان کے یہاں فکری بغاوت نہیں ملتی، لیکن شاعر شاعر ہے، کہاں تک مذہبی زنجیر اُسے اسیر رکھ سکتی ہے۔ چنانچہ کبھی کبھی اس تسلط سے کاندھا جھٹکتے نظر آتے ہیں:

فتوائے شیخ یا دعائے برہمن یہ بھی دیوانہ پن وہ بھی دیوانہ پن

....

ہمارا ذکر کیا اب تو جنابِ شیخ صاحب بھی
اُسی کافر کی زلفِ پُرشکن کی بات کرتے ہیں

…………………

جنابِ شیخ پر افسوس ہے ہم نے تو سمجھا تھا
حرم کے رہنے والے ایسے نامحرم نہیں ہوں گے

حرم کے رہنے والوں کو نامحرم وہی کہہ سکتے ہیں جو اہلِ طریقت ہوں۔ کلیم صاحب سلّمہٗ وضعاً اہلِ شریعت ہیں لیکن طبعاً اور مزاجاً اہلِ طریقت ہیں۔

سوئے اتفاق سے کلیم عاجزؔ کا پورا مجموعۂ کلام میرے سامنے موجود نہیں ہے، اس لیے انتخاب کا جو حق ہے وہ اس مقالے میں ادا نہیں کرسکتا۔ پھر بھی اپنے حافظے کی جھولی سے اِن جواہرات کی ایک مٹھی کاغذ پر بکھیر دیتا ہوں، اِنھیں چنئے اور پرکھیے اور انصاف سے کہیے کہ ایسی ستھری غزل کہنے والے ہندوستان اور پاکستان میں کتنے ہیں جن پر انیسؔ کا یہ مصرع صادق آسکے:

لفظ مغلق نہ ہو گنجلک نہ ہو تعقید نہ ہو

اب عاجزؔ کے چند اشعار سنیے ایسے شاعر کی زبان سے جو ایسا کہنے سے خود بھی عاجز ہو:

مناسب ہے سمیٹو دامنِ دستِ دُعا عاجزؔ زباں ہی بے اثر ہے ہاتھ پھیلانے سے کیا ہوگا

…………………

آرزو دامن ہی پھیلاتی رہی فصلِ گل آتی رہی جاتی رہی
دوست میرے حال پر روتے رہے مجھ کو رہ رہ کر ہنسی آتی رہی

…………………

ساون کی گھٹا آ گئی میخانے کے نزدیک ہونٹوں سے مگر فاصلۂ جام بہت ہے
ہنسنے کا تو موقع نہیں آ بیٹھ کے رولیں یہ فرصتِ غم بھی دلِ ناکام بہت ہے

…………………

سخت دُشوار ہے پابندیِ آدابِ جنوں جس کو بننا ہو سمجھ بوجھ کے دیوانہ بنے
پیرہن سرخ نہیں ہے تو کفن سرخ سہی کوئی جوڑا تو گدا کے لیے شاہانہ بنے

…………………

خدا کا شکر ہے احساں فراموشی نہیں آتی ہمیشہ آپ کے بخشے ہوئے غم یاد آئیں گے
بہت یاد آئے گی بے التفاتی چشمِ ساقی کی یہ شیشے یہ سبو یہ جام تو کم یاد آئیں گے

…………………

ہمیں اچھا ہے بن جائیں سراپا سرگزشت اپنی
وگرنہ لوگ جو چاہیں گے افسانہ بنادیں گے
نہ جانے کتنے دل بن جائیں گے اِک دل کے ٹکڑے سے
وہ توڑیں آئینہ ہم آئینہ خانہ بنادیں گے

…………………

تمھاری طرح زُلفوں میں شکن ڈالے نہیں ہیں ہم
کہیں گے بات سیدھی پیچ وخم والے نہیں ہیں ہم
گلوں کی طرح ہم نے عمر کانٹوں میں بسر کی ہے
ہیں اہلِ ناز لیکن ناز کے پالے نہیں ہیں ہم

…………………

پائے خرد سے وقت کی زنجیر کیا کھلے — آگے بڑھ اے جنوں! کہ کوئی راستہ کھلے
ہم بھی کچھ اپنے دل کی گرہ کھولنے کو ہیں — کس کس کا آج دیکھئے بندِ قبا کھلے

…………………

سب نے دامن چاک رکھا ہے بقدرِ احتیاج — ہم کو دیوانوں میں بھی کوئی نہ دیوانہ ملا
ہم تو خیر آشفتہ ساماں ہیں ہمارا کیا سوال — وہ تو سنوریں جن کو آئینہ ملا شانہ ملا

…………………

جدا جب تک تری زلفوں سے پیچ وخم نہیں ہوں گے
ستم دُنیا میں بڑھتے ہی رہیں گے کم نہیں ہوں گے
اگر بڑھتا رہا یوں ہی یہ سودائے ستم گاری
تمھیں رُسوا سرِ بازار ہوگے ہم نہیں ہوں گے

…………………

اورآخر میں عاجزؔ کا یہ شعر جواُن کے جذبۂ سخن آفرینی کا لبِّ لباب ہے:

لے جارہا ہوں درد میں ڈوبی ہوئی غزل
بے درد کے لیے کوئی سوغات چاہیے

کون یہ نغمہ سرا میرؔ کے انداز میں ہے

□ کنھیّا لال کپُور

بہار کی مردم خیز سرزمین سے ایک غزل گو ساون کی گھٹا کی طرح اُٹھا ہے اور آناً فاناً آسمانِ ادب پر چھا گیا ہے، وہ غزل نہیں کہتا جادو جگاتا ہے۔ شاعری نہیں ساحری کرتا ہے۔ وہ جب کبھی نغمہ سرا ہوتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے کسی بسیط و عریض ویرانے میں کوئی زخمی فرشتہ فریاد کر رہا ہے، سسکیاں بھر رہا ہے۔ اُس کی غزلیں پڑھنے یا سننے کے بعد بے اختیار فراقؔ گورکھپوری کا یہ عرز بان پر آجاتا ہے:

غزلیں کب کہتا ہوں یارو میں غم کو لوریاں دیتا ہوں
کچھ رات گئے سوجاتا ہوں جب غم کو نیند آجاتی ہے

اس غزل گو کا نام کلیم عاجزؔ ہے۔

آج سے تیس برس پہلے وہ ایک ایسے اندوہ ناک المیہ سے دوچار ہوا، جس نے اُس سے ہمیشہ کے لیے شادمانی چھین لی۔ چنانچہ اُس دن سے وہ اپنے ارمانوں کی لاش اُٹھائے اپنے غم کو شعروں کے سانچے میں ڈھال رہا ہے۔ یہ غم اُس کی والدہ ماجدہ اور بہن کی شہادت کا غم ہے جو اُس کی رگ و پے میں اس طرح سرایت کر گیا ہے کہ دنیا اُس کی آنکھوں میں اندھیری ہوگئی ہے۔ ہر چند اُس نے کوشش کی کہ اس غم کے زہر کو بھگوان شنکر کی طرح حلق سے نیچے اُتار لے اور نیل کنٹھ کہلائے لیکن وہ نیل کنٹھ نہ بن سکا۔ آج بھی جب وہ اپنی غزل کسی مجلس میں پڑھتا ہے اور مجلس میں ہی کیوں تنہائی میں بھی گنگناتا ہے، اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے، اُس کے کان بجنے لگتے ہیں اور تیلہاڑہ کے کنویں سے جو اُس کی والدہ اور بہن کی آخری آرام گاہ ہے کوئی اُس سے سرگوشی کے انداز میں پوچھتا ہے۔ کلیم! ہمیں کیوں قتل کیا گیا؟ کیا ہمارا گناہ صرف اتنا تھا کہ ہم مسلمان تھے؟ کیا نیک اور شریف مسلمان ہونا جرم ہے۔ کلیم! آسمانوں

پرخدایہ سب کچھ کیسے دیکھتا رہا۔انسان کا خون کیوں سفید ہوگیا۔کیوں؟ کیوں؟؟ کیوں؟؟؟''

کلیم عاجزؔ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔اُس کے دل میں ایک ہُوک سی اُٹھتی ہے اور وہ لہو کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے:

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کیے
آشیاں اُجڑا کیا، ہم ناتواں دیکھا کیے

اسی غم کی بدولت اُس کی شاعری دیپک راگ بن گئی ہے،اُسے جو بھی سنتا یا پڑھتا ہے سلگتا ہے اور کلیم عاجزؔ کی طرح انسان کی ازلی بے بسی اور دیوتاؤں کی مسلّمہ بے رُخی پہ کلیجہ مسوس کے رہ جاتا ہے۔

آج سے باون سال پہلے جب 'بانگِ درا' شائع ہوئی تھی،اُس کے دیباچے میں سر عبدالقادر نے اقبالؔ کے اسلوبِ بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا: اگر میں مسئلہ تناسخ کا قائل ہوتا تو کہتا غالبؔ کی رُوح اقبالؔ میں حلول کرگئی ہے۔میری رائے میں سر عبدالقادر نے یہ چونکا دینے والا فقرہ لکھ کر غالبؔ اور اقبالؔ دونوں سے بے انصافی کی تھی۔کیونکہ آہنگ غالبؔ اور آہنگِ اقبالؔ میں کوئی چیز مشترک نہیں۔غالبؔ کا کوئی شعر یا مصرعہ 'بانگِ درا' یا 'بالِ جبرئیل' میں شامل کرلیا جائے تو وہ اجنبی لگے گا۔اقبالؔ کا انداز خطیبانہ ہے،اُس میں مغربی موسیقی کا جوش وخروش ہے۔ غالبؔ کا لب ولہجہ سوز وگداز کا مظہر ہے۔اقبالؔ کہتے ہیں:

میری فغاں سے رستخیز کعبہ وسومنات ہیں

غالبؔ فرماتے ہیں:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

شیخ عبدالقادر کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اب کچھ نقاد یہ کہہ رہے ہیں کہ کلیم عاجزؔ کی غزلوں میں خدائے سخن میر تقی میرؔ دوبارہ زندہ ہوگئے ہیں۔اس قول کا اطلاق شاید اُن کی ساری شاعری پر نہ ہوتا ہو لیکن ان غزلوں پر ضرور ہوتا ہے جو انھوں نے پچھلے دِنوں کہی ہیں اور اس قول میں بہت حد تک صداقت ہے۔میرؔ کے انداز کو اپنانے کی غالبؔ سے فراقؔ تک ہر شاعر نے کوشش کی ہے۔مثال کے طور پر غالبؔ نے کم از کم ایک غزل میرؔ کے رنگ میں کہی جس کا مطلع ہے:

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں اپنی کرکے یاد شرما جائے ہے مجھ سے

فراقؔ نے بھی اپنی چند غزلوں میں میرؔ کے انداز کا کامیاب تتبع کیا ہے، خاص کر اپنی اس غزل میں:

فرقت کی غمگیں راتوں کو یاد میں تیری رولیں ہیں
تاروں کو جب نیند آئے ہے ہم بھی گھڑی بھر سولیں ہیں

لیکن کلیم عاجؔز دورِ جدید کے پہلے شاعر ہیں جنھیں میرؔ کا انداز نصیب ہوا ہے۔ ان کی غزلوں کے تیور نہ صرف میرؔ کی بہترین غزلوں کی یاد دلاتے ہیں، بلکہ ہمیں اُس سوز و گداز سے بھی روشناس کراتے ہیں جو میرؔ کا خاص حصہ تھا۔ مثال کے طور پر ان کی یہ غزل ملاحظہ فرمایئے:

بیاں جب کلیؔم اپنی حالت کرے ہے — غزل کیا پڑھے ہے قیامت کرے ہے
بھلا آدمی تھا پہ نادان نکلا — سنا ہے کسی سے محبّت کرے ہے
کبھی شاعری اس کو کرنی نہ آتی — اُسی بے وفا کی بدولت کرے ہے
چھری پر چھری کھائے جائے ہے کب سے — اور اب تک جئے ہے کرامت کرے ہے
کرے ہے عداوت بھی وہ اِس ادا سے — لگے ہے کہ جیسے محبّت کرے ہے
یہ فتنے جو ہر اِک طرف اُٹھ رہے ہیں — وہی بیٹھا بیٹھا شرارت کرے ہے

قبا ایک دن چاک اس کی بھی ہوگی
جنوں کب کسی کی رعایت کرے ہے

کلیم عاجؔز کا یہ دعویٰ تعلّی نہیں حقیقت پر مبنی ہے کہ:

یہ طرزِ خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا
جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا

ثبوت کے طور پر اُن کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن پر میرؔ کے نشتروں کا گمان ہوتا ہے:

رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں
چلنا ذرا آیا ہے تو اترائے چلو ہو

....

ترے غم میں تماشا بن گئے ہم — جو دیکھے ہے ہمیں دیکھا کرے ہے

....

اِک درد ہے جو شام سے اُٹھے ہے سحر تک
اِک سوز ہے جو صبح سے تا شام رہے ہے

....

گزر رہے ہیں کچھ اس طرح دن مصیبت کے
کسی کی جیسے شبِ انتظار گزرے ہے

....

لگے ہے پھول سننے میں ہر اِک شعر　　　سمجھ لینے پہ انگارہ لگے ہے

....

بغیر اس بے وفا سے جی لگائے　　　جو سچ پوچھو تو دل کس کا لگے ہے

....

کبھی اُس طرف جائیو اے صبا تو　　　مرا جس طرف آشیانہ پڑے ہے

....

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ　　　تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

....

کلیم عاجؔز روایت اور انفرادیت کا ایک محیرالعقول امتزاج ہیں، اُن کے خوں میں اُن تمام شعرا کا سلیقہ پایا جاتا ہے جو ولؔی سے لے کر اقباؔل تک ہوئے ہیں لیکن اِس کے باوجود اُن کا اپنا رنگ ہے، اپنی آرزو ہے۔ وہ کسی دوسرے کے نہیں اپنے دماغ سے سوچتے ہیں اور ان کے سوچنے کا ڈھنگ اتنا انفرادی ہے کہ ان کی غزل ہزاروں غزلوں کے ہجوم میں پہچانی جاتی ہے۔ اکثر ایک سُبک اور لطیف طنز ان کے اشعار کی دلکشی کو دوبالا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر:

نہ وہ محفل جمی ساقی نہ پھر وہ دورِ جام آیا
ترے ہاتھوں میں جب سے میکدہ کا انتظام آیا

....

نکلے ہم بے آبرو ہی آبروئے میکدہ
ویسے کہنے کو جو چاہے پیرِ میخانہ کہے

....

یہ پکار سارے چمن میں تھی وہ سحر ہوئی وہ سحر ہوئی
مرے آشیاں سے دُھواں اُٹھا تو مجھے بھی اس کی خبر ہوئی

بعض اوقات طنز اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ شعر شعر نہیں رہتا تازیانہ بن جاتا ہے۔ جیسے:

اِس چمن میں کیا یہی دستور ہے
پھول کے تم مستحق، پتھر کے ہم

....

جلتا ہے چراغوں میں خوں تیرے شہیدوں کا
ہولی کی بچی دولت ، دیوالی میں کام آئی

ایک جدید انگریزی نقّاد کے نزدیک اعلیٰ شاعری میں تین خصوصیات کا ہونا ضروری ہے وہ ہیں موسیقیت ،معنویت اور اشاریت۔ اِن تینوں میں سے اشاریت کا ہونا ازبس لازمی ہے۔ ذوقؔ کا ایک شعر ہے:

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پُل بنا ، چاہ بنا ، مسجد و تالاب بنا

یہ شعر چونکہ اشاریت سے خالی ہے اس لیے اسے ایک عمدہ شعر نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے برعکس غالبؔ کے اس شعر کو لیجیے:

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی   کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

اُس شعر میں جو اشاریت ہے اس کی وجہ سے یہ سحر حلال کا نمونہ بن گیا ہے۔

کلیم عاجزؔ کے اکثر اشعار ان تینوں کسوٹیوں پر پورے اُترتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ان میں موسیقیت ،معنویت اور اشاریت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

مثال کے طور پر کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

وہ تو کہیے ہم نے رکھ لی آشیانے کے لیے
ورنہ اتنی آگ کافی تھی زمانے کے لیے

....

سازِ دل سے ٹوٹنے کے بعد بھی   ہلکی ہلکی سی صدا آتی رہی

....

دُور سے ہی وہ گزر جاتے ہیں منہ پھیرے ہوئے
اُن سے بھی دیکھی نہیں جاتی پریشانی مری

....

کوئی مشکل نہ تھی تعمیرِ نشیمن لیکن   پاس تھا خانۂ صیّاد کی ویرانی کا

....

میخانے پر جب دیکھو تب بادل چھائے رہتے ہیں
جن کے گھر میں آگ لگی ہے اُن کے گھر برسات نہیں

....

ہم جو گلشن میں تھے بہار نہ تھی جب بہار آئی آشیاں نہ رہا
غم گراں جب نہ تھا گراں تھا مجھے جب گراں ہوگیا گراں نہ رہا

....

مزا یہ ہے لیے بھی جا رہے ہیں جانبِ مقتل
تسلّی بھی دیئے جاتے ہیں سمجھائے بھی جاتے ہیں

....

خدا جانے کس کس پہ الزام آتا
اگر ہم بیاں اپنی روداد کرتے

کلیم عاجؔز کی شاعری پر بہترین تبصرہ اُن کی اپنی غزلوں میں ملتا ہے۔ اُن کے نزدیک اُن کی شاعری ’’چند آہوں کا مرقع ہے‘‘ ایک غزل میں انھوں نے کھلے بندوں اعتراف کیا ہے:

مری شاعری میں نہ رقص جام نہ مئے کی رنگ فشانیاں
وہی دُکھ بھروں کی حکایتیں وہی دل جلوں کی کہانیاں

اسی طرح ایک غزل کا مطلع ہے:

اس قدر سوز کہاں اور کسی ساز میں ہے
کون یہ نغمہ سرا میؔر کے انداز میں ہے

ایک غزل گو کے لیے سب سے اہم مسئلہ زبان کا ہوتا ہے۔ نظم کی اپنی زبان ہے غزل کی اپنی، غزل کی زبان جتنی سلیس اور ڈھلی ہوئی ہوگی، اُتنا ہی غزل کا جادو سر پر چڑھ کر بولے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ ثقیل اور غیر مانوس ہوگی، غزل گو طلسم باندھنے میں ناکام رہے گا۔ کلیم عاجؔز کی زبان سے کماحقہٗ واقف ہیں۔ انھوں نے اکثر و بیشتر غزلیں اُس زبان میں لکھی ہیں جسے ’روز مرّہ‘ کہا جاتا ہے اور جس میں خاص و عام اہلِ زبان تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ گھلاوٹ اور گداز پن کی طرح اُنھوں نے وہ الفاظ استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جنھیں کچھ اساتذہ نے متروک قرار دیا ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے ایک مرتبہ کہا تھا: آرکسٹرا کی مدد سے کسی بھی دُھن کو پیش کرنا عظیم آرٹ نہیں کہلاتا، مزا تو تب ہے جب صرف ایک ساز کی مدد سے کوئی ایسی دُھن پیش کی جائے جسے سن کر سامع مبہوت رہ جائے، کلیم عاجؔز کے کلام کی سلاست اس بات کی شاہد ہے کہ اُنھیں

صرف ایک ساز کی مدد سے دُھن پیش کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔عام طور پر وہ بھاری بھرکم تراکیب یا فارسی کے مشکل الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ وہ اس نکتے سے بخوبی واقف ہیں کہ غزل اس نازک آبگینے کی طرح ہے، جسے ایک سخت یا نامناسب لفظ بھی ناقابلِ تلافی ٹھیس پہنچا سکتا ہے۔ ایک روایتی توضیح کے مطابق غزل کے معنی عورتوں سے گفتگو کرنا ہیں۔ظاہر ہے گفتگو کرتے وقت بڑی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے کیونکہ ایک ذراسی لغزش سارے مزے کو کرکرا کرسکتی ہے۔ایک اچھی غزل میں وہی فرق ہوتا ہے جو ایک اچھی اور بُری گفتگو میں ہوتا ہے۔اچھی گفتگو کا تقاضا ہے نہ صرف موضوع بلکہ لب ولہجہ نہایت شائستہ ہو۔سوقیانہ پن سے احتراز کیا جائے اور طنز و مزاح کی مقدار آٹے میں نمک کے برابر ہو۔اگر مختصر ترین الفاظ میں اچھی غزل کی تعریف کرنا مقصود ہوتو کہا جاسکتا ہے ایسی غزل جس کا ہر شعر دل میں نشتر کی طرح اُترتا چلا جائے۔

کلیم عاجؔز نے غزل کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ بلاشبہ اُن کا شمار اُن شعرا میں کیا جاسکتا ہے۔جو وقتاً فوقتاً عروسِ غزل کو سنوارنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور جنھیں زمانۂ حال سے کہیں زیادہ زمانۂ مستقبل کا شاعر کہا جاتا ہے۔کلیم عاجؔز نے ایک نئے دبستان کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اس نے نہ صرف اپنے ہم عصروں کے لیے نئی راہیں کھولی ہیں۔ بلکہ یہ بشارت بھی دی ہے:

نہ ساتھ دیں گی یہ دَم توڑتی ہوئی شمعیں
نئے چراغ جلاؤ کہ روشنی کم ہے

تعارف

□ سیّد علی عبّاس

سیّدعلی عباس آئی پی ایس، ریٹائرڈ ڈی آئی جی پولیس، اسکاٹ لینڈ یارڈلندن کے تربیت یافتہ۔ بہار کے ایک مشہوراورقدیم تہذیبی مرکز کھجوامیں ۱۹۱۱ء میں پیداہوئے۔ پولیس کے اعلیٰ کمان کی نازک ذمہ داریوں میں ہمیشہ محصوررہنے کے باوجود زمانۂ تعلیم سے اس وقت تک شعروادب کی چولی سےدامن کی طرح وابستہ ہیں۔ ہر زمانے میں ادب وشاعری کی خدمت اور محبت میں مجنوں بنے رہے۔ ۱۹۶۹ء میں غالبؔ کلب قائم کرکے شعرو سخن کی مثالی محفلیں سجائیں اور ۱۹۷۱ء میں انیسؔ سنیچری کے موقع پر میر انیسؔ کےفن پر ایک جامع، دلکش اور دیدہ زیب کتاب شائع کرکے خوش ذوقی کے ساتھ خوش سلیقگی کا بھی ایک نمونہ پیش کیا۔ زندگی کے تجربات افسانوی پیرائے میں اکثر لکھتےاور ریڈیو پرسناتے رہے ہیں۔اس وقت 'بزمِ کاف' کے ذمہ دارِ اعلیٰ ہیں۔

میں نے ۱۹۵۲ء میں کلیم عاجؔز کو پہلی بار دیکھا اور سنا اور ویسی ہی حیرت و مسرت ہوئی جو ایک نجومی کو ہوتی ہے جب وہ اپنی دُوربین میں اچانک ایک ایسے انوکھے انجان سیّارے کو آسمان کی خلاؤں میں گردش کرتے دیکھتا ہے جس کے بارے میں نہ اُس نے کبھی پڑھا تھا نہ سنا تھا۔

پٹنے کی وہ ایک رنگین شام تھی۔ انجمن اسلامیہ ہال میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔شوق مجھے بھی کھینچ کر وہاں لے گیا۔ پہنچا تو دیکھا ڈائس پر بہار کے سب ہی مشہور و معروف شعرا جلوہ افروز تھے۔علاّمہ جمیلؔ مظہری، پرویزؔ شاہدی، پروفیسر عبدالمنان بیدلؔ، حافظ شمس الدین شمسؔ وغیرہ۔

قبل اس کے کہ استادوں کی باری آئے صدر نے کلیم عاجؔز کا نام پکارا۔ پہلے کبھی یہ نام سنا نہیں تھا۔ سمجھا کہ نو واردانِ اقلیمِ سخن میں سے ہوگا کوئی طفل۔ دیکھا تو پتلا دُبلا، نحیف و نزار، نازک سا ایک نوجوان نیچی نظریں کیے دبے پاؤں مائک پر آیا۔ لباس سے سادگی ٹپک رہی تھی اور چال سے شرافت۔ صورت پہ اُداسی چھائی تھی مگر تیور سے عزم و استقلال عیاں تھا۔ کچھ دیر چپ کھڑے رہنے کے بعد اس نے ترنم میں اپنی غزل شروع کی اور فضا میں ایک عجیب سی نغمگی چھا گئی۔ جہاں تک یاد آتا ہے وہ غزل یہ تھی:

مجھے اس کا کوئی گلہ نہیں کہ بہار نے مجھے کیا دیا
تری آرزو تو نکال دی ترا حوصلہ تو بڑھا دیا

گو ستم نے تیرے ہر اِک طرح مجھے نااُمید بنادیا
یہ میری وفا کا کمال ہے کہ نباہ کرکے دِکھا دیا

کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اِک چراغ جلا دیا

تجھے اب بھی میرے خلوص کا نہ یقین آئے تو کیا کروں
ترے گیسوؤں کو سنوار کے تجھے آئینہ بھی دِکھا دیا

یہ غریب عاجزؔ بے وطن یہ غبار خاطرِ انجمن
یہ خراب جس کے لیے ہوا اُسی بے وفا نے بھلا دیا

غزل تمام ہوئی تو نہ پوچھیے سننے والوں کا کیا حال تھا۔ ہر دل میں بس ایک ہی خواہش تھی، کاش یہ نوجوان کچھ دیر اور غزل سرا رہتا۔ کاش اُس کی درد بھری پیاری پیاری آواز سنتے ہی رہتے۔'ایک اور! ایک اور!' کا شور ہوتا رہا۔ مجمع لاکھ چیخا پکارا، عاجزؔ نو دو گیارہ ہو گیا۔ وہ گئے اور لگا اُن کے ساتھ ہی ساتھ مشاعرے کی ساری رونق بھی چل دی۔ اپنے دل کا یہ حال تھا جو بہار کے رخصت ہونے کے بعد کسی چمن کا ہو۔

مشاعرہ ختم ہونے پر میں یہ جاننے کے لیے بےقرار رہا کہ آخر تھا یہ کون انجان شاعر جو دل کے ہر تار کو یوں جھنجھوڑ کر چل دیا۔ ایک دوست سے جو کلیم صاحب کو بہت قریب سے جانتا تھا، میں نے پوچھا "بھئی یہ کلیم آخر ہیں کون؟ یہ بلا کا درد کہاں سے آیا ظالم کی آواز میں جو اچھی خاصی شام میں بیٹھے بٹھائے سب کو رُلا گیا؟" بولا "آپ نہیں جانتے اُنھیں؟ ارے یہ پٹنہ ضلع کی اُسی مشہور بستی تیلہاڑہ کے ہیں جو کبھی بڑی ہنستی بولتی جیتی جاگتی بستی ہوتی تھی۔ ۱۹۴۶ء کے فسادات میں ایک دن ناگہاں یوں اُجڑی کہ دَم توڑتے توڑتے تشدد و بربریت کی تواریخ کا ایک نہایت ہی دردناک باب لکھ گئی۔ ٹھیک عید کے دن سات آٹھ سو باشندے اس کے تہہِ تیغ ہوئے۔ اُن میں سے بیس بائیں تو بہت ہی قریبی رشتہ دار کلیم کے تھے جو سورج ڈھلتے ڈھلتے راہیِ ملک عدم ہوئے!! شہید ہونے والوں میں اُن کی والدہ ماجدہ بھی تھیں اور چھوٹی بہن بھی۔

اُس قیامت کے دن ایک طرف تو تیلہاڑہ میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اور دوسری طرف کنویں بھر رہے تھے اُن معصوم بے بس عورتوں کی لاشوں سے جنھیں بلائے ناگہانی سے بچ نکلنے کا کوئی اور راستہ نظر نہ آیا اور وہ اُن میں کود پڑیں۔'' یہ سب سننے کے بعد کوئی دقت نہ رہی کلیم عاجؔز کی وہ سہمی سہمی سی صورت، اُن کا درد بھرا لہجہ اور ان کی غزلوں کی رنگت سمجھنے میں۔ تعجب مگر ہمیشہ ہی اس بات پر رہا اور آج بھی ہے کہ ایسا دُکھتا دل سینے میں رکھتے ہوئے کوئی غزل خواں کیسے ہوسکتا ہے! خود کلیم کہتے ہیں:

غزل جو سنتا ہے میری عاجؔز وہ مجھ کو حیرت سے دیکھتا ہے
کہ دل پہ گزری ہے کیا قیامت مگر جبیں پر شکن نہیں ہے

کمسنی ہی میں عاجؔز کا سینہ زخموں سے چھلنی ہوا۔ شباب آیا تو 'روز ایک زخم تازہ تھا زخم کہن کے ساتھ'! پھر بھی ان کے کلام میں تلخی، نہ لب پہ شکایت، نہ زبان پر کبھی بددُعا آئی، بلکہ جنھوں نے ظلم ڈھائے اور ان کی دُنیا کو تاریک و تاراج کر دیا اُنھیں کو سمجھنے اور پیار سے سمجھانے کی آج تک مسلسل کوشش کرتے رہے ہیں۔ کلیم کی ایک غزل کے چند اشعار سنیے تو سمجھ میں آئے گا کہ یہ کس دل گردے کا بنا ہوا انسان ہے۔ کہتے ہیں:

مرا حال پوچھ کے ہم نشیں مرے سوزِ دل کو ہوا نہ دے
بس یہی دُعا میں کروں ہوا کہ یہ غم کسی کو خدا نہ دے
یہ جو زخمِ دل کو پکائے ہم، لیے پھر رہے ہیں چھپائے ہم
کوئی ناشناسِ مزاجِ غم کہیں ہاتھ اس کو لگا نہ دے
تو جہاں سے آج ہے نکتہ چیں کبھی مدّتوں میں رہا وہیں
میں گدائے راہ گزر نہیں مجھے دُور ہی سے صدا نہ دے
وہ جو شاعری کا سبب ہوا وہ معاملہ بھی عجب ہوا
میں غزل سناؤں ہوں اس لیے کہ زمانہ اس کو بھلا نہ دے

عاجؔز کی غزلوں کو غور و تحقیق سے پڑھیے اور ان کی زندگی کے کچھ حالات جاننے کی کوشش کیجیے تو آسانی سے سمجھ میں آ جائے گا کہ وہ ہوا کا کون سا جھونکا تھا جس نے ان کی زندگی کا رُخ پلٹ دیا اور ساتھ ہی ساتھ ان کے لب و لہجے میں وہ درد بھر دیا کہ جو بھی ان کی غزل اُن سے سنتا ہے اس

کی آنکھوں میں آنسو بھر آتا ہے۔ان پر جو ستم ٹوٹے ان کا ردّعمل کیا ہوا خود کلیم ہی بتلاتے ہیں:

مجھ کو تو فصلِ گل یہی شغل سپرد کر گئی — صحنِ چمن کی خاک اُڑا ماتمِ آشیانہ کر

....

جہاں غم ملا اُٹھایا پھر اُسے غزل میں ڈھلا — یہی دردِ سر خریدا یہی روگ ہم نے پالا

....

جو قطرے لہو کے نہ آنکھوں سے ڈھلکے — بنے ہیں وہ اشعار میری غزل کے

....

وہی سمجھتے ہیں مجھ کو جو مجھ کو سنتے ہیں — میری غزل میں میری زندگی مجسم ہے

....

بیس بائیس برسوں سے میں کلیم عاجؔز کو سنتا چلا آیا ہوں۔ اِدھر دو چار برسوں میں جب سے کلیم نے میؔر کے طرزِ کلام کو اپنایا اور میؔر کی زبان میں اظہارِ جذبات کرنے لگے ہیں ان کی غزلوں کی دلکشی دوبالا ہوگئی ہے۔کلیم کی غزلوں میں میں نے نشتر بھی پائے اور مرہم بھی، پھول بھی ہیں کانٹے بھی، مثنوی بھی ہے اور مرثیہ بھی۔

کلیم جب اپنے مخصوص ترنم میں اپنی غزل سناتے ہیں تو سننے والوں پر کچھ ویسی ہی کیفیت طاری ہوتی ہے جیسی جوشؔ کے دل میں پپیہے کی 'پی کہاں' سن کر ہوا کی۔ جوشؔ اس کیفیت کی یوں تصویر کھینچتے ہیں:

پپیہا جب تڑپتا ہے ہوا میں 'پی کہاں' کہہ کر — ہماری رُوح سوزِ عشق سے اس طرح جلتی ہے

تلاشِ تربتِ عاشق میں جیسے نازنیں کوئی — بلا کی دُھوپ میں پتھر پہ ننگے پاؤں چلتی ہے

میں نے دیکھا ہے کلیم بالعموم غزل کہتے ہیں، کسی بڑے حادثے، کسی المناک سانحے، کسی ظلم ناروا، یا کسی دل ہلا دینے والے واقعے کے زیر اثر۔سیاسی طوفان، سماجی ہیجان، دُنیا کے ستم، انصاف کا خون اور انسانیت کی کمی دیکھ کر وہ تلملا اُٹھتے ہیں اور اپنے دل کی دھڑکنوں کا جب کوئی علاج نظر نہیں آتا تو غزل کہنے بیٹھ جاتے ہیں تاکہ کسی طرح تو رات کٹے! اور غزل بھی اس انوکھے انداز کی ہوتی ہے کہ سمجھنے والوں کے لیے مرثیہ ہو جاتی ہے، مگر اوچھی نظر رکھنے والوں کے لیے محض عشقیہ شاعری جس میں میؔر صاحب کی غزلوں کی طرح صرف رونا گانا ہے اور کچھ نہیں، اب اُن کی ۱۹۷۲ء کی کہی ہوئی ایک سادہ سی غزل کے چند اشعار پر غور فرمائیے جو عقل و فہم رکھنے والوں کے لیے کس درجہ معنی خیز ہیں، مگر طفلِ مکتب یا پیرِ نابالغ کے لیے شاید مضحکہ خیز ہوں:

کس ناز کس انداز سے تم ہائے چلو ہو — روز ایک غزل ہم سے کہلوائے چلو ہو
رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں — چلنا ذرا آیا ہے تو اِترائے چلو ہو
مئے میں کوئی خامی ہے نہ ساغر میں کوئی کھوٹ — پینا نہیں آئے ہے تو چھلکائے چلو ہو
ہم کچھ نہیں کہتے ہیں کوئی کچھ نہیں کہتا — تم کیا ہو تمھیں سب سے کہلوائے چلو ہو

اکثر کلیم عاجزؔ کی جذبات و محسوسات سے لبریز غزلیں اُن کی زبانی سن کر میرے دل پر ویسا ہی اثر ہوا جو نیم شب کے سناٹے اور بھیانک تاریکی میں پڑوس کی جھونپڑی سے ایک نوجوان کی اچانک موت پر اُس کی کمسن بے سہارا بیوہ کی گریہ وزاری سن کر ہو۔ اکثر ان کا ترنم ایسا لگا 'جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم' یہی انوکھی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے آج ان کے 'نغموں کی ہر اِک جا شہرت ہے نالوں کا تمام افسانہ ہے'۔

کلیم کا فکر و فن کچھ بالکل ہی جداگانہ ہے۔ نہ اُنھوں نے کسی کی نقل کی، نہ اُن کی نقل کوئی کرسکتا ہے۔ اُن کی اپنی ہی ایک ٹھاٹ ہے۔ اپنا ہی انداز۔ اپنی دُھن اور اپنا مزاج۔ باتوں باتوں میں بے دھڑک دُنیا کی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کر ڈالتے ہیں۔ بغیر شمشیر و سپر ظالموں پر وار کر بیٹھتے ہیں، مگر ان کے وار میں نہ غیظ و غضب ہوتا ہے نہ کسی کو زخمی کرنے کا کبھی ارادہ رکھتے ہیں۔ ایک ستمگر کو بھری محفل میں ستمگر کہہ کر ہی ان کے دل کو تسلّی ہو جاتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک ظالم کو یہ بتلا کہ ظلم کرنا بری بات ہے، خدا سے ڈرنا چاہیے، وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ ایک دشمن کو بھی کسی طرح کی اذیت پہنچانا ان کی شریعت میں گناہ ہے۔ 'وفاداری بشرطِ استواری' آپ کا ایمان ہے۔ وہ کانٹوں سے صرف نباہ ہی کرنے کے قائل نہیں بلکہ ہر حال میں ان کے لیے 'خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر' ہیں۔ تب ہی تو ڈٹ کر کہتے ہیں:

بازی وفا کی ہار کے پیارے نہ جائیں گے — کیا دن ترے ستم کے گزارے نہ جائیں گے
دریائے غم میں پانی اگرچہ ڈباؤ ہے — ہم ڈوبنے کے ڈر سے کنارے نہ جائیں گے

اس قدر ستم زدہ انسان پھر بھی ایسا وفا شعار، اس درجہ وضعدار، اتنا خوددار، اتنا بیباک اور ایسا محبِّ وطن آجکل کی دُنیا میں ڈھونڈنے سے بھی کہاں ملتا ہے؟ اسی وجہ سے میری نظر میں ان کی عزّت کچھ اور سوا ہے۔ کلیم صرف ایک اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک قابلِ قدر انسان ہیں۔

کلیم جو غزل کہتے ہیں وہ محض شاعری ہی نہیں ہوتی۔ اس میں مقصد ہوتا ہے، مطلب ہوتا

ہے، سبق ہوتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ لطفِ غزل کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ ان کی غزلیں ذی فہم وذی ہوش کے لیے بانگِ درا سے کچھ کم نہیں۔ ہاں ان کے کلام کا لباس واعظ کا لبادہ نہیں ہوتا، غزل کا شبنمی پیراہن ہوتا ہے۔ غور کیجیے تو ان کی غزلوں میں آپ کو تواریخ بھی ملے گی اور فلسفہ بھی۔ حال پر تبصرہ بھی اور مستقبل کا جائزہ بھی۔ دُکھے دلوں کی پکار بھی پایئے گا اور باغی کی للکار بھی۔

کلیم کی غزلوں میں آپ 'گل وبلبل' تو پائیں گے اور 'سرو وسمن' بھی۔ 'گیسو وشانہ' کا بھی ذکر ملے گا اور 'بہار وخزاں' کا بھی تذکرہ۔ مگر ان کے 'گل وبلبل'، 'بہار وخزاں'، 'گیسو وشانہ'، 'ساغر و ساقی' کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ پورے طور سے لطف اندوز ہونے کے لیے آپ کو ان کی غزلوں کی تہہ تک پہنچنا ہوگا جس طرح موتی نکالنے کے لیے سمندر کی تہہ تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔ مگر ان کی غزلوں کو سمجھنے کے لیے اتنی کاوش اور دماغ پر زور دینے کی بھی ضرورت نہیں جتنا کہ آجکل کے موڈرن آرٹ یا جدید شاعری کو سمجھنے کے لیے ہوتی ہے اس لیے کہ ان کی غزلوں میں بڑی سادگی ہوتی ہے، الفاظ بہت عام فہم ہوتے ہیں۔ ہلکے پھلکے اشاروں میں بڑی سے بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔ میں نے تو ان کی غزلوں میں وہی دلکشی اور سادگی پائی جو میرؔ کے کلام میں ہے۔ میرؔا کے بھجن میں ہے، یا کبیرؔ کے دوہوں میں ہے۔

خوش وضع، خوش خصال، خوش کلام، خوش گلو، ایک نہیں کئی اوصاف ہیں جنھوں نے کلیمؔ کو ہر دل عزیز بناڈالا۔ بہار کے لیے یہ باعثِ فخر ہے کہ اِس پرآشوب دَور میں جبکہ اُردو کی بقا کا مسئلہ درپیش ہے، یہیں کا ایک نوجوان گوشۂ تنہائی میں بیٹھا گیسوئے اُردو کو سنوارتا رہا ہے اور ہر ممکن کوشش کررہا ہے کہ اُس کی موت کا دن ٹل جائے۔ چمنستانِ اُردو کے گل بوٹوں کو یہ شخص اپنے خونِ جگر سے سینچ رہا ہے تاکہ اُن میں جان اور جان کے ساتھ رنگ وبو باقی رہ جائے۔ کلیمؔ کا انکسار ان کے منہ پر ہاتھ نہ دھر دیتا تو علّامہ اقبالؔ کی طرح کلیمؔ بھی برسرِ عام سو بار کہے ہوتے:

باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں

فراقؔ صاحب نے ایک جگہ فرمایا تھا:

آنے والی نسلیں تم پر ناز کریں گی ہم عصرو
اُن کو جب معلوم یہ ہوگا تم نے فراق کو دیکھا تھا

کلیمؔ وہ ہیں کہ آج شعر وسخن کے دلدادہ فخریہ کہتے سنائی دیتے ہیں 'ہم نے بھی کلیمؔ کو سنا ہے'۔

اس خراجِ تحسین پر کلیمؔ جتنا بھی مغرور ہوں کم ہے۔ پر طبیعت کچھ ایسی پائی ہے کہ نہ مشاعروں میں واہ واہ سننے کے خواہاں ہوتے ہیں نہ گفتگو میں اپنی تعریف سننا پسند کرتے ہیں۔ اسی انکسار کا نتیجہ ہے کہ شاید کبھی اُنھوں نے سوچا بھی نہیں کہ ان کا کلام اب شائع ہونا چاہیے یا سوچا بھی ہو تو اپنوں سے بھی اس خواہش کا اظہار نہ کیا۔ وہ اگر میں پیچھے نہ پڑتا اور میرے عزیز دوست فخرالدین وینک صاحب نے زور نہ لگایا ہوتا تو لوگوں کے مسلسل اصرار کے باوجود کلیمؔ شاید آج بھی اپنا کلام شائع کرانے پر آمادہ نہیں ہوتے اور ان کا دیوان ان کے ذہن ہی میں بند پڑا رہ جاتا۔ اس ڈر سے کہ اُردو ادب کی جھولی کو جن لعل و گہر سے کلیمؔ نے بھرا ہے وہ کہیں کھو نہ جائیں، میں نے بڑی مشکلوں سے ان کی غزلوں کو اکٹھا کرایا، تا کہ قدر دانوں کے لیے یہ خزانہ ہمیشہ کے لیے محفوظ رہ جائے —— اور وہ جو شاعری کا سبب ہوا زمانہ اس کو بھلا نہ دے۔

جس آگ میں کلیمؔ بیسوں برس سے جلتے بھنتے رہے ہیں اور تپ کر کندن بنے ہیں اُسے مدّ نظر رکھتے ہوئے وہ اپنے دیوان کا نام 'آتشِ گل' یا 'آتش نمرود' رکھ سکتے تھے، مگر اُنھوں نے وہ نام رکھا ہے جو وضاحت پسند طبیعتوں کو بھی مطمئن کر دے۔ کلیمؔ نے اپنے غم کو کبھی غم نہیں سمجھا بلکہ ایک نایاب عطیہ سمجھا جسے وقت اور زمانے نے انھیں پیش کیا اور انھوں نے اسے سینے سے لگائے رکھا ہے۔ اب اسے ان کی حب الوطنی کہیے یا دیوانہ پن، آپ کو اختیار ہے۔ کلیمؔ مگر اس خیال پر تکیہ کیے مست رہتے ہیں: 'میں تیری بلا سے اُجڑ گیا ترا حوصلہ تو نکل گیا' اور جو کبھی کسی 'ناشناسِ مزاجِ غم' نے ان کی آنکھوں کو نم پا کر چٹکی لی تو جھڑک دیا یہ کہہ کر:

میں چاک دامن جو پھر رہا ہوں یہ میرا دیوانہ پن نہیں ہے

یوں تو کلیمؔ کا اب دیوان ہی آپ کے سامنے ہے، پھر بھی ان کے چند اشعار کی طرف آپ کی توجہ دِلاؤں تو آپ بھی کلیمؔ کا مزاج، ان کا دِل، ان کا درد، ان کا مقصدِ زندگی ان کا فلسفۂ حیات کچھ زیادہ آسانی سے سمجھ پائیں گے۔ میرے لیے کلیمؔ کے اشعار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا کوئی چبھتا ہوا شعر میں نے جب بھی سنا 'میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے' اور میری طرح بہتوں نے یہی محسوس کیا ہوگا۔

اب چند اشعار کلیمؔ کے ملاحظہ فرمایئے جو اُن کے ذہنی کرب اور قلبی کشمکش کے غماز ہیں:

یہ پکار سارے چمن میں تھی وہ سحر ہوئی، وہ سحر ہوئی
مرے آشیاں سے دُھواں اُٹھا تو مجھے بھی اس کی خبر ہوئی

مجھے کیا اگر ترے دوش سے تری زلف کا بہ کمر ہوئی
کہ میں ایسا خانہ خراب ہوں کبھی چھاؤں میں نہ بسر ہوئی

....

اس چمن میں کیا یہی دستور ہے — پھول کے تم مستحق پتھر کے ہم

....

دوستوں کا کرم معاذ اللہ — شکوۂ جورِ دشمناں نہ رہا

....

اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ — رستے میں خواہ دوست کہ دشمن کا گھر ملے

....

میں نگاہِ باغباں میں کوئی اور ہو گیا ہوں — ابھی چار دن ہوئے ہیں کہ جلا ہے آشیانہ
تجھے اے غمِ محبت اِدھر آ گلے لگا لوں — نہ ترا کہیں گزر ہے نہ مرا کہیں ٹھکانہ

....

محبت ایسی دُنیا ہے کہ جس میں — گلستاں کم ہیں ویرانے بہت ہیں
مری جیسی کہانی کم سنوگے — گل و بلبل کے افسانے بہت ہیں

....

رہے گا سلسلہ دار و رسن کا — جہاں دوچار دیوانے رہیں گے
خرد زنجیر پہناتی رہے گی — جو دیوانے ہیں دیوانے رہیں گے

....

بڑے خوش نصیب آپ ہیں کہ ابھی تک — محبت سے پہلو بچائے ہوئے ہیں
کسی دن تو ہاتھ آئے گا اُن کا دامن — جو دیوانہ ہم کو بنائے ہوئے ہیں

....

کلیمؔ کا تعارف تو ہو چکا، اب آخر میں اتنا بتلا دینا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کو شائع کرانے کی ساری کوششیں ہماری بے سود ہوتیں اگر چند ایسے ذی فہم اور تجربہ کار لوگوں کا ہمیں تعاون حاصل نہ ہوتا جن کے ٹھوس قدم اور قابلِ قدر مشوروں نے مشعلِ راہ کا کام کیا۔ اُن کے خلوص اور اُن کے عزم واستقلال کا میں دل سے معترف اور مداح ہوں۔ یہ مجموعۂ کلام اُردو ادب کی شاہراہ پر ایک نمایاں سنگ میل ہوگا اور اُردو ادب کے خزانوں میں ایک انمول اضافہ۔

بیانِ شاعر

ادا کیونکر کریں گے چند آنسو دِل کا افسانہ

□ کلیم عاجؔز

اس طرف چند برسوں سے مختلف حلقوں کے احباب اور بزرگوں کا بے حد اصرار ہے کہ میں جو بکواس بیس بائیس سال سے کررہا ہوں اُسے مجموعے کی شکل میں ترتیب دے کر شائع کردوں۔ ۱۹۶۰ء تک میں اس معاملے میں غیر جانب دار رہا۔ جب کسی ادارے یا رسالے کی طرف سے اصرار ہوا تو کوئی چیز اشاعت کے لیے دے دی۔ دس بارہ سال سے پھر وہ کیفیتِ مزاج عود کر آئی جو ابتدائے شعور سے تھی، جو اپنا خاندانی مزاج ہے، بلکہ اِسے ہنرمندانِ بہار کا مخصوص مزاج کہنا چاہیے۔ یعنی شہرت سے گریز، نام ونمود سے پرہیز، اس موضوع پر اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں کافی تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ چنانچہ دس بارہ سال سے غالباً میری کوئی غزل پرچے یا رسالے میں شائع نہیں ہوئی، اِلّا یہ کہ ریڈیو سے نقل حاصل کر لی گئی اور چھاپ دی گئی، یا مشاعرہ میں یاروں نے غزل نوٹ کی اور چھپوا دی۔ ایسا ہوا اور ایک دو بار میں نے دوستوں اور عزیزوں سے سخت ناراضگی کا اظہار بھی کیا۔ ایک وجہ تو یہ ہے جو مجموعے کی اشاعت میں اب تک سدِّ راہ رہی۔

ایک دوسری وجہ بھی ہے، لیکن اُسے کیا بتاؤں اور بتاؤں تو کون تسلیم کرے۔ یہ کون مانے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ دوسروں کے لیے نہیں، اپنے لیے کہتا ہوں۔ سنانا مقصود کم ہے، گنگنانا اصل مقصود ہے۔ کون مانے کہ جو کچھ کہا ہے یا جو کچھ کہتا رہا ہوں وہ ایک خاموش خود کلامی ہے۔ یہ دل بہلانے کے لیے دل سے باتیں ہیں۔ کوئی تاش سے دل بہلاتا ہے، کوئی ساز سے، کوئی نغمہ سے، کوئی تصویروں سے، کوئی ریڈیو سے، کوئی سنیما سے۔ میں بھی ساز و نغمہ سے خوب قریب رہا۔ تصویریں کھینچیں اور کھنچوائیں۔ سنیما کے ساتھ دیوانگی کی حد تک وابستگی تھی، لیکن ستائیس

سال پہلے ایک صبح ایسی آئی جس نے پچھلی شاموں کو ایک خوابِ فراموش بنادیا:

ایک سویرا ایسا آیا اپنے ہوئے پرائے
اس کے آگے کیا پوچھو ہو آگے کہا نہ جائے

اُس صبح کے بعد ساز ونغمہ کی پھر کوئی شام نہ آئی۔ پھر کوئی محفل آراستہ نہیں ہوئی:

نہ وہ محفل سجی ساقی نہ پھر وہ دَورِ جام آیا
ترے ہاتھوں میں جب سے میکدے کا انتظام آیا

اس کے بعد سے ایک سوگوار تنہائی کا احساس کبھی ختم نہ ہوا۔ دو تین سال کے بعد اس دُکھ بھری تنہائی سے گھبرا کر خدا جانے کیا بہانہ ہوا کہ میں نے یہ خود کلامی شروع کی۔ یہ سوگوار تنہائی پھر کبھی انجمن میں تبدیل نہ ہوسکی۔ میری شاعری اُس سوگوار تنہائی کو ایک مونس، ایک ہم نوا دینے کی ناکام کوشش ہے۔ گرچہ میں بظاہر ہر وقت انجمن میں ہوں، شب کے چند گھنٹے کی نیند کے سوا میں کبھی تنہا نہیں رہتا، بھیڑ بھاڑ ہی میں رہتا ہوں، لیکن اس بھیڑ بھاڑ میں، شور وغل میں، ہنگاموں میں، مشاغل کی کثرت میں، کسی وقت نہ تھکنے والی اور نہ ستانے والی مستقل متحرک اور باعمل زندگی میں میرا دل ہمیشہ تنہا رہتا ہے۔ میں خود کو اس عالمِ ہاو ہو کا فرد نہیں سمجھتا، میں کسی اور انجمن سے نکلا ہوا یا نکالا ہوا خانہ برباد محسوس ہوتا ہوں جو اِس محشرِ واردات وحادثات میں ہر وقت خود فراموش نظر آتا ہے:

ترا درد اتنا بڑا حادثہ ہے کہ ہر حادثہ بھول جانا پڑے ہے

جانی پہچانی صورتوں کے درمیان بھی اجنبی اجنبی سا لگتا ہوں:

بچی ہوئی ہے محبت کی آبرو ہم سے
ہم اس زمانے میں اگلے زمانے والے ہیں

رُوح کی اسی تنہائی کا ردّعمل میرے اشعار یا غزلیں ہیں۔ ان سے جو لطف میں لیتا ہوں، جو روشنی، جو قوت وتوانائی میں حاصل کرتا ہوں وہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں:

دھوپ کہیں جب دھوپ نہیں ہو رات کہیں جب رات نہیں
دیوانوں کی بات سمجھنا سب کے بس کی بات نہیں

پھر مجموعے کی اشاعت اور تشہیر کا کیا حاصل؟ اور اس کے لیے دردِ سر کیوں مول لیا جائے؟ حال تو

یہ تھا کہ ایک پرزہ پر لکھا اور پھینک دیا۔کبھی کسی ڈائری پر لکھ لیا،کبھی کسی کتاب پر،کبھی کسی کاپی پر۔ مشاعروں کی شرکت بھی کسی حد تک ناپسند ہے،خاص خاص حالات میں شریک ہوتا ہوں۔لوگ مجھے مشاعرے میں پڑھتے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں،میں تو مشاعروں میں بھی خود کو تنہا ہی محسوس کرتا ہوں۔جس طرح تنہا ملاّح دریا میں پتوار چلاتا ہوا گیت گاتا ہوا گزر جاتا ہے،میں بھی جذبات کے سمندر میں دل کی کشتی کو غزل کے پتوار سے کھیتا ہوا نکل جاتا ہوں۔

کبھی یہ بھی سوچتا ہوں کہ شاعری زندگی کی امانت ہے،فرد ختم ہو جاتا ہے زندگی ختم نہیں ہوتی،تو میں حیات کی اس امانت کو اپنے وجود کے ساتھ کیوں فنا کردوں؟اِسے بیشک دوسروں کو سونپ دینا چاہیے،لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ چبھن پیدا ہوتی رہی کہ میؔر نے:

مجھ کو شاعر نہ کہو میؔر کہ صاحب میں نے　　　درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

کہہ کر اِس خطرے سے بچنے کے لیے 'ذکرِ میؔر' لکھ دیا۔اقبالؔ بہت کچھ کہہ گزرنے کے باوجود یہ گلہ کر گئے:

آشنائے من زمن بیگانہ رفت　　　از خمستانم تہی پیمانہ رفت

کم نظر بیتابیِ جانم نہ دید　　　آشکارم دید پنہانم نہ دید

تو بیتابیِ جاں کی کچھ جھلک دِکھانی بھی ضروری ہے۔'ذکرِ میؔر' لکھنے کی میؔر کو جو فرصت تھی وہ ہمیں کہاں نصیب؟جس طرح 'ذکرِ میؔر' کے بغیر میؔر کی صحیح پہچان اور اُس کے فن کی عظمت تک رسائی نہیں ہوسکی،اِسی طرح کلیؔم کی بکواس کی صحیح لذت آشنائی کے لیے ذکرِ کلیؔم کی بھی ضرورت ہے،لیکن اس کے لیے نہ قلم میں بھرپور صلاحیت،نہ اُمنگوں میں سکت،نہ قلب میں طاقت۔اتنا کہہ کر گزر جانا:

بکنے بھی دو عاجؔز کو جو بولے ہے بکے ہے

دیوانہ ہے دیوانے سے کیا بات کرو ہو

مشاعروں میں آسان ہو تو ہو،سیاہ وسفید کی دُنیا میں مشکل ہے،اور پھر میؔر نے نے 'ذکرِ میؔر' بھی اپنے کلام کے فہم کے لیے ناکافی سمجھا اور جب چند نہایت باذوق حضرات میؔر کی خدمت میں اشتیاقِ کلام لے کر آئے اور سنانے کی درخواست پیش کی تو میؔر نے بہت اصرار کے بعد جواب دیا کہ ''میاں!تم ہمارا کلام نہیں سمجھ سکتے۔'' تو ان بے چاروں نے عرض کیا کہ ''حضرت! عرفؔی،خاقانی،نظامی،قاآنؔی کا کلام سمجھتے ہیں،آپ کا کلام کیوں نہیں سمجھ سکتے؟'' میؔر نے کہا

''ان شاعروں کی فرہنگیں اور شرحیں ہیں، میرے کلام کی شرحیں اور فرہنگیں جامع مسجد کی سیڑھیاں ہیں جہاں نادرشاہ کی تلوار چمکتی رہی اور جب شہر بھر سے سرخیاں بڑھ کر جامع مسجد کی سیڑھیوں تک آگئیں تب نیام میں گئی۔ اُن سیڑھیوں کو مستقل مسکن بناؤ تو میرا کلام سمجھو گے۔'' تو میرؔ صاحب کے زمانے میں تو جامع مسجد کی سیڑھیاں تھیں اور اب تک ہیں۔ میں ستائیس سال پہلے کے تیلہاڑہ کی سنگی مسجد کی سیڑھیاں، عید گاہ کی محرابیں، پیر یوسف ابدال کا قبہ، پانکڑ کا درخت، برگد کی چھاؤں، سنگرہار کی ٹہنیاں، اُونچی چہاردیواری کے اندر گھرے ہوئے امرود اور شریفے اور جامن کے درخت کہاں سے لاؤں؟ ان کی نازک شاخوں میں نازک جھولے اور اُن پر جھولنے والوں کی آبشار جیسی ہنسی کی کھنکھناہٹ ایک دن ہمیشہ کے لیے فضا میں گم ہوگئی۔ جن کی صورتیں ایک دن خاک میں مل جانے کے بعد پھر کبھی لالہ وگل میں نمایاں نہ ہوسکیں۔ میں یہ سب کہاں سے لاؤں جہاں اپنے کلام کے سننے والوں کو جانے کی ترغیب دے سکوں؟

جی میں ہے کہ روییے شاخِ سیاہ دار میں — دونوں ہاتھ ڈال کر گردنِ بہار میں
ہم رہے تو کیا رہے ہم ہیں کس شمار میں — قافلے کا قافلہ لٹ گیا بہار میں

بہرحال، تو مجموعے کی اشاعت کے سلسلے میں مجھے بھی کچھ لکھنا تھا، اور یہ 'کچھ' بھی اتنا ہے کہ اس کے لیے ایک مستقل کتاب چاہیے۔ میرے دل کی تہوں میں لامتناہی سلسلۂ داستان ہے، جس کے تمام مناظر اور ہر منظر کے تمام اجزا میرے دل کے نگارخانے میں متحرک تصویروں کی طرح آویزاں ہیں۔ یہ تصویریں چلتی پھرتی ہیں، آپس میں ملتی جلتی ہیں، باتیں کرتی ہیں، میں ان کی آوازیں سنتا ہوں، ان کی سرسراہٹیں محسوس کرتا ہوں۔ یہی میرے ہم نشیں ہیں، میری ہم جلیس ہیں اور ہم نوا ہیں:

یہ جو آہ و نالہ و درد ہیں کسی بے وفا کی نشانیاں
یہی میرے دن کے رفیق ہیں یہی میری رات کی رانیاں

یہ مجھ سے کبھی جدا نہیں ہوتیں۔ خلوت وجلوت میں ہمیشہ ساتھ رہتی ہیں۔ ان کی قربت سے مجھے تقویت ہے، مجھے ڈھارس ہے، سہارا ہے۔ انھی کی رفتار و گفتار، اشاروں اور کنایوں کو میں اپنے اشعار میں منتقل کرتا ہوں۔ اپنے روزانہ کے تجربات اور مشاہدات سے ان کا رشتہ جوڑتا رہتا ہوں۔ یہ میرے معلّمین بھی ہیں اور معاون بھی۔ یہ تجربوں اور مشاہدوں کی ترتیب اور ترکیب

اور تنظیم وتزئین میں میری مدد کرتی ہیں۔ روزانہ کے محشرِ واقعات میں منطقی ربط پیدا کرتی ہیں۔ یہی میری رہبری اور رہنمائی کرتی ہیں۔

میں اپنی والدہ کی لکھائی ہوئی ایک یادداشت کے مطابق ۱۱/اکتوبر ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوا۔ اوسط درجے کا کھاتا پیتا خوش حال گھر تھا۔ میری نسلی روایت میں دو دھارائیں ہیں۔ میری نانیہال صوفیوں اور مولویوں کا خاندان ہے۔ میرا اکبر علی میرے پرنانا کے دولڑکے مولوی امیرالدین اور مولوی ضمیرالدین، یہ خاندان ہی اپنی خصوصیاتِ مزاج کے اعتبار سے منفرد تھا۔ منسکر مزاجی، وسیع المشربی، مرنجامرنجی، گوشہ گیری، بےلوثی، خاموشی کم گوئی یہ میں نے اپنی نانیہال کے ہر فرد میں دیکھی۔ میری پرورش نانیہال ہی میں ہوئی۔ میری دادھیال دیہاتی زمینداروں اور کاشتکاروں کا خاندان تھے۔ اس خاندان کا ہرفرد سپہ گری میں ممتاز، تلوار باز اور لٹھیت تھا۔ جوانمردی اور ہر وقت مارنے مرنے پر تلے رہنے میں مشہور۔ میرے دادا شیخ بدر الحسن اور اُن کے بڑے بھائی شیخ سخاوت حسین پورے علاقے میں ایک طلسماتی حیثیت رکھتے تھے۔ میں نے اپنے بچپن میں جو روایات اُن دونوں کی سنیں وہ واقعی طلسماتی ہی تھیں، جنوں اور بھوتوں سے کشتیوں کی روایات عام تھیں، ہزاروں دُشمنوں کے مجمع میں دونوں بھائی تلواریں سونت کر گھس جاتے تو مجمع کا پتہ نہ رہتا تھا۔ میں نے دونوں میں سے کسی کو نہ دیکھا۔ اپنے والد کو دیکھا جو میری نانیہال یعنی اپنی سسرال میں رہ گئے۔ بدن، ہاتھ اور صحت وتوانائی کے اعتبار سے واقعی ایسے ہی باپ کی اولاد معلوم ہوتے تھے۔ بہت خوش رُو اور طاقتور۔ میں اپنی نانیہال تیلہاڑہ میں جو پٹنہ کے نواح میں قدیم شرفا کی ایک بہت ہی اہم اور ممتاز بستی تھی، پیدا ہوا اور پلا۔ میری ابتدائی معلّمہ میری والدہ تھیں۔ میرے نانا مولوی ضمیرالدین نے ابتدائی تعلیمی ذمہ داری سنبھالی۔ مولوی صاحب اُس علاقے کے باعزّت صاحبِ علموں میں تھے اور علاقے کے ہندو مسلم شرفا کے لڑکے ان کے یہاں مفت تعلیم حاصل کرتے تھے۔ علم کے ساتھ تہذیب، شائستگی، آدابِ نشست و برخاست، آدابِ گفتگو، معاملات اور تعلقات کا گہوارہ ان کی ذات تھی۔ دُور تک چوکی، اس پر چٹائی اور چاندنی کا فرش، ایک کنارے پر مولوی صاحب مصلّیٰ بچھائے دیوار سے ٹیک لگائے آنکھ بند کیے بیٹھے ہیں اور چوکی پر دونوں طرف طلبا کی قطار ہے جس میں اُردو کے قاعدہ سے مثنوی یوسف زلیخا، انشائے خلیفہ، سکندرنامہ اور بہارِ دانش کے طالب علم ہوتے۔ کسی لڑکے نے کسی کتاب کا ایک لفظ غلط پڑھا اور

مولوی صاحب نے آنکھ بند ہی کیے ہوئے زور سے ڈانٹا ”کیا پڑھ رہا ہے دیکھ کے پڑھ!“ حالانکہ بیچارہ دیکھ کرہی پڑھ رہا تھا،مگر کوئی کتاب نہ تھی جو مولوی صاحب کو لفظ بلفظ یاد نہ ہو۔

میں سات سال کی عمر میں مکتب میں بیٹھا۔ میرے نانا مولوی ضمیرالدین صاحب جس طرح اور طلبا کو پڑھاتے بالکل اُسی طرح مجھے بھی انہی طلبا کے درمیان بٹھایا گیا، کسی پہلو سے کوئی امتیاز نہ تھا۔ یہ بات کسی فخر اور امتیاز کے جذبے سے نہیں کہی جارہی ہے، لیکن اظہارِ امر واقعہ ہے کہ میری ذہانت اور میرا حافظہ عجیب وغریب تھا۔ کسی سبق کو دوبار سمجھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ساتویں سال میں قاعدہ بغدادی سے سروع کرکے پارۂ عم، اُردو کی ابتدائی کتابیں، آمدنامہ، نسخہ تعلیمہ، رقعاتِ عزیزی، گلستاں، بوستاں اور یوسف زلیخا پر پہنچا تو میرا دسواں سال شروع ہورہا تھا۔ اور اس تین سال کی مدّت میں نصاب کی فارسی کتابوں کے ساتھ نانا کے چھوٹے سے ذاتی کتب خانے کی اکثر کتابیں مطالعہ میں آچکی تھیں۔ قصص الانبیاء جو بہت بڑے تقطیع پر تھی، کئی بار پڑھ چکا تھا۔ مرأۃ العروس، بنات النعش، ابن الوقت اور توبتہ النصوح ایک ہی جلد میں تھیں اور یہ کتابیں بھی اپنی بڑی بہن کے ساتھ راتوں کو ساتھ بیٹھ کر کئی بار پڑھ چکا تھا۔ یہیں مجھے اپنے نانا ہی کے قلم سے نقل کیا ہوا صوبہ بہار میں لکھا ہوا مشہور ناول ’فسانۂ خورشیدی‘ ملا، جسے ہم بھائی بہن نے ایک درجن بار پڑھا ہوگا۔

میرے والد جو کلکتہ میں تجارت کرتے تھے، مجھے کلکتہ بلانے پر مصر تھے اور میں گھر چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔ گھر سے مجھے کس قدر محبت تھی اس کا ہلکا سا نقشہ آئندہ آئے گا۔ میں دسویں سال کلکتہ گیا۔ والد صاحب اپنی خاندانی روایات کے بڑی حد تک حامل تھے۔ وہ کہتے ”کلیم کو صرف مولوی یا صوفی نہیں بننا ہے، اِسے پہلوان بھی بننا ہے۔“ چنانچہ اُسی عمر میں اُنھوں نے کلکتہ کے دو مشہور پشاوری پہلوان دوستوں کے مجھے حوالے کیا۔ محمد نواب پہلوان اور فیروز پہلوان جو چھوٹے گاما کے عزیز تھے، گوسوامی جی کے اکھاڑے میں یہ دونوں حضرات کلکتہ کے تمام پہلوانوں کے گرو تھے۔ روزانہ صبح اکھاڑے میں مجھے لے جایا جاتا۔ کبھی نواب پہلوان کبھی فیروز پہلوان مجھے زور کراتے۔ زور کیا کراتے، کچھ ڈنڈ بیٹھک کے بعد اکھاڑے میں لے کر کودتے اور مٹّی پر دیر تک خود گرتے اور مجھے گراتے۔ والد صاحب کو اس پہلوانی کی نسبت سے کھانے اور کھلانے کا جنون تھا اور مجھے اس کے برعکس ہمیشہ کھانے کی زیادتی سے نفرت تھی۔ چاروں وقت گھی، دودھ

اور میوہ جات کی بھر مار رہتی اور مجھے اِن تینوں چیزوں سے غایت بے رغبتی۔ گھی نظر بچا کر اُ گالدان میں ڈال دیتا، دُودھ کچھ پیتا، کچھ چپکے سے چوکی یا الماری کے اندر چھپا دیتا جو بعد میں ملازمین کی ضیافت کا سامان بنتا۔ کبھی والد صاحب دیکھ لیتے تو ایسی پٹائی ہوتی کہ میں اب تک نہیں بھول سکا ہوں۔ وہ چند باتوں سے بے حد خفا ہوتے۔ جھوٹ سے اُنھیں سخت عداوت تھی، کھانے کے متعلق میں اکثر جھوٹ بولنے پر مجبور ہوتا اور وہ مجھے پیٹنے پر مجبور ہوتے۔ وہ حصولِ علم کے اتنے شوقین نہ تھے جتنے حصولِ صحت اور طاقت کے۔ کلکتہ کی رہائش میرے لیے عذابِ جان تھی۔ ویسے والد صاحب اور معاملات میں بے حد شفیق اور مہربان، بالخصوص کھلانے اور پہنانے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ کھانے سے مجھے کبھی رغبت نہ رہی لیکن کپڑوں کا شوق مجھے اُنھوں نے ہی بخشا۔ خوش پوشی ابتدائے زندگی سے میرے ساتھ رہی۔

کلکتہ کے قیام، گھر کی دُوری اور والد صاحب کی سخت اصول پرستی نے ردّعمل کے طور پر مجھ میں دو چیزیں پیدا کر دیں — مطالعہ اور تماش بینی۔ مطالعہ کی ابتدا تو مکتب کی تعلیم کے دوران گھر ہی میں ہوگئی تھی۔ کلکتہ میں اس کے لیے مزید راستے کھل گئے۔ میں ذہین تھا مگر ترتیب کے ساتھ تعلیم میرے مزاج کے خلاف تھی۔ والد صاحب نے انگریزی اور حساب کے لیے ایک اسکول کے ماسٹر پنڈت ترپاٹھی کو مقرر کیا تھا جو بڑی محنت سے پڑھاتے، لیکن انگریزی اور حساب کے معاملے میں شروع سے بدشوق رہا۔ گرچہ آئندہ اسکول کے امتحانات میں دونوں میں بہت اُونچے نمبر لاتا رہا مگر ابتدا میں پنڈت جی بھی مجھے خوب پیٹتے، وہ بات بات پر کان بہت اینٹھتے تھے، مگر پھر بھی انگریزی اور حساب کی تعلیم کی طرف میرا شوق منتقل نہ ہوا۔ اُردو رسالوں اور کتابوں کا شوق نہیں جنون تھا۔ میں سوچتا ہوں تو یقین ہوتا ہے کہ میری عمر کا شوقینِ اُردو کلکتہ کے غدار شہر میں بھی شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۷ء تک تین سال میں دس سے تیرہ سال کی عمر تک صبح اُٹھنے سے رات کے گیارہ بجے تک مستقل چھپ چھپ کر میں مطالعہ ہی میں مشغول رہتا۔ اُس زمانے کے تمام اچھے رسالوں کے ماہانہ اور تمام خاص نمبر میرے مطالعہ سے نہ بچے۔ 'عالمگیر' لاہور، حکیم یوسف حسین صاحب کا 'نیرنگِ خیال' لاہور، میاں بشیر الدین کا رسالہ 'ہمایوں'، 'ساقی' دہلی، 'ادبی دُنیا' دہلی، جوشؔ ملیح آبادی کا حسین رسالہ 'کلیم'، اخترؔ شیرانی کا رسالہ 'رومان'۔ اُس زمانے میں میرے محبوب افسانہ نگار پریم چند، ایم اسلم، پنڈت سدرشن تھے۔ دوسرے لکھنے

والوں میں خواجہ حسن نظامی، اشرف صبوحی، مرزا محمد شفیع دہلوی، ظفر قریشی، نا کارہ حیدرآبادی، تمکین کاظمی، امین سلونوی، نسیم انہونوی، شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی، ملاّ رموزی، مرزا فرحت اللہ بیگ وغیرہ اور نہ جانے کتنے تھے جن کا نام مجھے اب چند برسوں سے یاد نہیں رہا۔ سعید احمد تاجر کتب سندر یہ پٹی کلکتہ سے سینکڑوں روپے کی کتابیں خریدیں۔'الف لیلیٰ'، 'داستانِ امیر حمزہ'، 'طلسم ہوش رُبا' کی ساتوں جلدیں، 'ایرج نامہ'، 'تورج نامہ' وغیرہ۔ مجھے یاد ہے کہ 'طلسم ہوش رُبا' کی اوّل سے چوتھی جلدیں تو میں نے ایک بار ہی پڑھیں، لیکن پانچویں، چھٹی اور ساتویں جلدیں یاد نہیں کتنی بار پڑھیں۔ پہلی چاروں جلدوں کے مصنف غالباً منشی محمد حسین جاہؔ تھے۔ میں یہ تمام باتیں اس وقت آج سے تقریباً پینتیس چھتیس سال پہلے کی یادداشت کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ پانچویں، چھٹی اور ساتویں جلدوں کے مصنف منشی احمد حسین قمرؔ تھے۔ جاہؔ سے زیادہ تخلیقی فنکاری قمرؔ میں تھی۔ اس لیے قمرؔ کی واقعہ نگاری میں زیادہ پیچیدگی اور شگفتگی تھی۔ داستان کے دوران نظموں، غزلوں اور قطعات ورُباعیات کا استعمال بھی زیادہ برمحل اور خوش ذوقی کی بنیاد پر تھا۔ انہی داستانوں میں مجھے لکھنؤ کے اساتذۂ سخن سے آشنائی ہوئی، اور اسی ذریعے سے میری توجہ اُردو شاعری کے مطالعے کی طرف ہوئی۔ خیرالدولہ قبولؔ اور آفتاب الدولہ قلقؔ کی مثنویاں، جلالؔ، خلیلؔ، تعشقؔ وغیرہ کی غزلیں اُردو شاعری کی طرف متوجہ کرنے لگیں اور میں نے تمام دیوان خریدے۔ مصحفیؔ، انشاؔ، ناسخؔ، رِندؔ، صباؔ، خواجہ وزیرؔ۔ پھر اِن کے ساتھ داغؔ اور امیرؔ کے تمام مجموعے۔ پھر 'تذکرہ گلِ رعنا'، 'تذکرہ نساخ' اور خدا جانے کون کون سی کتابیں نظموں اور نثر کی۔ منشی تیرتھ رام فیروزآبادی کے بے شمار انگریزی ناول کے اُردو ترجمے۔ یہ تمام دیوان، رسالے، کتابیں تین سال (۱۹۳۴ء سے ۳۶-۱۹۳۷ء) میرے مطالعے میں آئیں۔ مطالعے کے مشاغل دُوریِ وطن کی تپش، گھر کی محبت اور ماں کی محبت کے سوز میں کچھ کمی کر دیتے تھے، مگر ان سے بھی تشفی نہ ہوتی تھی اور میں ماں کی جدائی اور گھر کی دُوری کے غم کو کبھی کبھی آنسوؤں کے وسیلے سے کم کرنے پر مجبور ہوتا تھا۔ والد کے ملازمین بھی مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ مجھ پر ترس کھا کر مجھے تماش بینی کی طرف راغب کررہے تھے، چنانچہ اُنہی کے ذریعے میں کلکتہ کی دو مشہور تھیٹریکل کمپنیوں سے روشناس ہوا۔ الفریڈ تھیٹر اور الفنسٹن تھیٹر۔ یہ دونوں کمپنیاں بہت بڑے پارسی تاجر سر جہانگیر جی رستم جی کی تھیں اور میرے خیال میں ہندوستان کی تمام تھیٹریکل

کمپنیوں میں اُس زمانے میں ممتاز تھیں۔ اسی الفنسٹن تھیٹر میں مجھے ایک شب ۱۹۳۶ء میں اُردو دُنیا بلکہ ہندوستان کے سب سے ممتاز ڈرامہ نگار آغا حشر کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ الفنسٹن تھیٹر کے سائبان میں ایک بہت بڑا گروہ خوش پوش بوڑھوں اور جوانوں کا کسی کے گرد جمع تھا، میں بھی کسی طرح حلقے کے اندر داخل ہو کر بالکل اگلے دائرہ میں آ گیا۔ دیکھا ایک حسین شخص تقریباً ساٹھ سال کی عمر، سرخ و سپید رنگ، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، داڑھی منڈی ہوئی، سر پر سیاہ و سفید بال، سیاہ فریم کی عینک، بادامی ریشمی قمیص جس میں سونے کے بٹن کے ساتھ نازک طلائی زنجیر مع جھالر لٹک رہی تھی، سیاہ گرم کوٹ اور سفید شلوار کا ریشمی گلابی ازار بند جھول رہا تھا۔ پاؤں میں بادامی پینٹ کی سلیپر، ہاتھ میں کوئی کھلی کتاب تھی اور مسکرا کر کچھ شعر پڑھ رہے تھے۔ ایک شعر مجھے اب تک اس طرح یاد ہے:

ستارے ہیں کہ چھینٹیں بادۂ احمر کی اُڑتی ہیں
کہاں سے اے قمرؔ تو نے یہ جامِ آتشیں پایا

میں نے بھی سلام کیا اور جواب کے ساتھ میری طرف وہ خصوصی طور سے متوجہ ہوئے۔ توجہ کی، میرے خیال میں ایک وجہ تو میری وضع ہوگی جو کلکتہ میں اُس وقت بہت ممتاز تھی۔ گیا کی ترشی سلی اور ڈھلی ہوئی پلّے کی سفید ٹوپی، سیاہ شیروانی، لٹھّے کا خالتہ پاجامہ اور سیاہ پٹنٹ کا پمپ، عمر تو میری گیارہ سال تھی مگر کشتی کی واجبی محنت سے ہی قد و قامت اور بدن خاصا نکل آیا تھا۔ میں حشرؔ کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ اُن کے ڈرامے اُن کی ادبی اور شاعرانہ شخصیت کا پرتو ہیں۔ الفنسٹن اور الفریڈ تھیٹریکل کمپنیوں میں اُس دَور کے ڈراموں کا ادبی معیار قابلِ رشک تھا۔ بالخصوص آغا حشرؔ کے ڈرامے 'وِیر بالک'، 'پریمی بالک'، 'دھرمی بالک'، 'بھارتی بالک'۔ یہ چار ڈرامے ہندوستان کی سودیشی تحریک کی ڈرامائی تصویریں تھے جن میں آغا حشرؔ کی فنّی، ادبی اور شاعرانہ صلاحیتیں عروج پر تھیں۔ پھر اُن کے ساتھ 'بھکت سورداس'، 'بلوا منگل'، 'آنکھ کا نشہ' اور اُن کا آخری اسٹیج ڈرامہ 'دل کی پیاس' جو ۱۹۳۷ء میں پہلی مرتبہ کھیلا گیا، جو دو سال تک مستقل کھیلا جاتا رہا۔ کلکتہ کی ادبی فضا میں آگ لگا گیا۔ ان ڈراموں اور ان کے ساتھ منشی محی الدین نازاںؔ لکھنوی، منشی شاہجہاں شمسؔ لکھنوی، منشی نرائن پرشاد بیتابؔ، منشی رحمت علی رحمتؔ بنارسی کے اُردو ڈراموں کی ادبی توانائیاں اور ساتھ ساتھ اس دَور کے اسٹیج ایکٹروں، محمد نواب کشمیری، محمد آغا جانی

بیدلؔ کشمیری، منشی عزیزالحسن دلؔ لکھنوی، مسٹر محمد خلیق مستحسنؔ، ماسٹر غلام حیدر، ماسٹر موہن، مسٹر منی لال لکھپتی، مسٹر سہراب جی کیر ووالا، مسٹر کاؤس جی پٹنھکی، مسٹر دادا بھائی سرکاری، یہ تماش بینی سے تعلق رکھنے والی شخصیتیں تھیں۔ یہ اسٹیج کے بہروپئے کردار کے اعتبار سے اتنے بلند، نفاست، لیاقت، متانت، شرافت، تہذیب، شائستگی اور ساتھ ساتھ علمی صلاحیت، ادبی ذوق کے اتنے اُونچے مقام پر نظر آتے تھے کہ مجھے اِس دَور میں خانقاہوں، تعلیم گاہوں اور تہذیبی اداروں کے نمایاں افراد بھی اس مقام پر نظر نہیں آتے۔ میں شب کو تھیٹر میں ان شخصیتوں کو مختلف بہروپ میں دیکھتا اور صبح اُن کی کشش مجھے تھیٹر کی عمارت کے سامنے لے جاتی اور میں دیر تک عمارت سے اُن لوگوں کے برآمد ہونے کا منتظر رہتا۔ اپنی اصل شکل وصورت میں یہ بالکل مختلف نظر آتے۔ سنجیدہ، خاموش، وضع قطع کے بےتکلف، تصنع اور بناوٹ سے منزلوں دُور۔ اِن میں کے اکثر مجھے پہچان گئے تھے، وہ مجھ سے بڑی محبت اور شفقت سے مخاطب ہوتے، اور کبھی نواب کشمیری کہتے کہ بیٹا! تھیٹر نہ دیکھا کرو اور ہم گنہگاروں سے دُور رہو۔ تو آج میری نگاہوں میں وہ بہروپئے اصل، اور آجکل کے اصل بہروپئے نظر آتے ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں ذرا پس وپیش نہیں کہ ادب اور شاعری کے ذوق کا بہت بڑا حصہ مجھے تھیٹریکل ڈراموں سے ملا اور طبیعت کی نفاست، وضع کی متانت، خیال کی سنجیدگی اور دل کے گداز کا ایک خاصا حصہ ان بہروپیوں سے حاصل ہوا۔

میرے مزاج اور طبیعت کی تشکیل اور تزئین میں کلکتہ کا بڑا دخل ہے۔ مطالعے کا وافر سامان ابتدا میں وہیں حاصل ہوا۔ مطالعے کے ذریعے جو مواد حاصل ہوتا تھا اُسے مزاج میں اور رُوح میں جذب کر لینے کی صلاحیت تماش بینی اور دُنیائے تماشہ کی ان بدنام شخصیتوں سے روابط اور تعلق کی بنا پر پیدا ہوئی اور پھر اس میں جلا اور آراستگی کلکتہ ہی کے شعروادب کی فضا میں میسر ہوئی۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تین سال کلکتہ کی ادبی اور شاعرانہ فضا سے قربت اور ہم آہنگی کا دَور ہے۔ اسلامیہ کالج، کلکتہ کا ادبی مرکز تھا۔ زکریا اسٹریٹ، کولوٹولہ اسٹریٹ، ویلسلی اسٹریٹ، پارک سرکس اور ہوڑہ اس ادبی مرکز کی شاخیں تھیں۔ کلکتہ کے دو حلقے تھے۔ علّامہ وحشتؔ کلکتوی کا حلقہ اور منشی آرزوؔ لکھنوی کا حلقہ۔ جمیلؔ مظہری، عباس علی خاں بیخودؔ، آصفؔ بنارسی، واصفؔ بنارسی وغیرہ حضرت وحشتؔ کے شاگردوں میں اور جرمؔ محمد آبادی، جوالؔ سندیلوی وغیرہ حضرت آرزوؔ و

کے حلقہ بگوشوں میں تھے، اور ایک تیسرا حلقہ عظیم آبادی تھا۔ پرویزؔ شاہدی، ہُدہُد و عظیم آبادی وغیرہ۔ اور ایک چوتھا حلقہ جو اِن تینوں حلقوں کو نمایاں کرتا تھا، محمودؔ طرزی، مسعودؔ صابری، ظفر تبریزی، عنایتؔ دہلوی وغیرہ پر مشتمل تھا۔ یہ صحافی بھی تھے، ادیب تھی اور شاعر بھی۔ میں ان حلقوں سے متعارف پہلی بار غالباً ۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۷ء کے ایک مشاعرہ اور کانفرنس میں ہوا۔ غالباً علّامہ جمیلؔ مظہری کے زیر انتظام یہ کانفرنس ہوئی تھی۔ نواب سلیم اللہ خاں ڈھاکہ، سر عبدالرحیم، شیر بنگال فضل الحق، مولانا شوکت علی، خواجہ حسن نظامی، پنڈت سدرشن، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، مولانا حسرتؔ موہانی اور کلکتہ کے تمام اساتذہ اور شعرا کو پہلی باریہیں سننے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اور مشاعرہ سے پہلی شناسائی اور آ گاہی اسی میں نصیب ہوئی اور پھر یہ سلسلہ چلا۔ مختصر یہ کہ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۹ء تک دسویں سال سے پندرہویں سال تک جب میں نے پہلی بار اسکول کے نویں درجے میں قدم رکھا تو چھ سال کی مدّت میں اتنا کچھ میں نے دیکھ لیا تھا، سن لیا تھا، محسوس کر لیا تھا، دل میں بھر لیا تھا اور طبیعت اور مزاج میں اُتار لیا تھا جو شاید ایک عمر گزار کر بھی اکثر حاصل نہیں ہوتا۔ یہ سرمایہ علم کے اعتبار سے تو کچھ خاص نہ تھا، لیکن طبیعت اور مزاج کی تشکیل اور تربیت کے اعتبار سے بہت کچھ تھا۔ اس چار پانچ سال میں باہر کی دُنیا سے علم، تجربہ اور مشاہدہ کی شکل میں جو کچھ ملتا رہا گھر کے ماحول میں ماں بہنوں، بزرگوں، رشتہ مندوں کے جھرمٹ میں جب طبیعت پھول کی طرح کھلی ہوئی ہوتی، مزاج اور فطرت کا سانچہ کھلا ہوا اور کشادہ ہوتا، تو ان معلومات، تجربوں اور مشاہدوں کو سانچوں میں ڈھلنے کا موقع ملتا۔ وہ زندگی کی قدروں میں تبدیل ہوتے، رُوح میں سرایت کرتے اور رگ و پے میں لہو بن کر دَوڑنے لگتے۔

جب ۱۹۳۹ء میں اسکول میں داخل ہوا، تو کلاس کے ساتھیوں میں مجھے اجنبی پن سا محسوس ہوتا۔ نہ مجھے اُن کی گفتگو میں مزہ آتا، نہ اُن کے مشاغل اور عادات و اطوار میں کشش معلوم ہوتی۔ میں کلاس میں سب سے پیچھے گوشے میں بیٹھتا، تاکہ ماسٹر صاحب کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ اور کلاس سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرے میں تنہا رہتا۔ نہ میری کسی سے کوئی خاص دوستی، نہ مراسم نہ تعلقات۔ بس واجبی واجبی صاحب سلامت۔ وضع قطع، رکھ رکھاؤ، نشست و برخاست، ہر لحاظ سے میں کچھ الگ تھلگ نظر آتا۔ پڑھنے کی طرف کچھ خاص میلان نہ تھا، لیکن حافظے اور ذہن کی تیزی اور ذوق کی لطافت اور کسی حد تک پختگی امتحانات میں کام آجاتی۔ اسکول کے

ریکارڈ میں ہے کہ پہلے سال یعنی نویں درجہ کے امتحانات میں مجھے اسکول میں تیسری جگہ ملی۔ دسویں کلاس میں دوسرا مقام اور انٹرنس میں اپنے اسکول میں اوّل اور پورے صوبے میں پانچویں پوزیشن تھی۔ بچپن کی تعلیم، ابتدائی زندگی کے شوقِ مطالعہ اور کلکتہ کے ادبی، شعری اور ڈرامائی ماحول نے جہاں ادبی ذوق اور شعری میلان کی خاموش چنگاریاں مجھے بخشیں، وہیں زندگی کی بنیادی قدروں سے والہانہ محبت بھی عطا کی۔ دل میں ایسا گداز، طبیعت میں ایسی رقت پیدا کردی، جو اُس دَور میں بھی عجیب وغریب چیز معلوم ہوتی تھی۔ اور آج کا کیا پوچھنا، طبیعت ذرا سی بات پر کھل اُٹھتی اور ذرا سی بات پر بھر آتی۔ مجھے گانے اور دوسروں کی غزلیں گنگنانے کا بھی بے حد شوق تھا، لیکن حال یہ تھا کہ کوئی گیت یا کوئی غزل ابھی لحن سے شروع کی اور آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کے قطرے گرنے لگتے۔ میں نے اس عجیب وغریب کیفیت کا بزرگوں سے اور اپنی قرابت کے خاندانی صوفیوں سے بھی ذکر کیا، لیکن کہیں سے کوئی خاص تشفی بخش جواب نہیں مل سکا۔ اپنے قریب کی تمام شخصیتوں سے اور اُن شخصیتوں کے ماحول سے ایسی والہانہ محبت اور شیفتگی مجھ میں پیدا ہوگئی کہ اس کی مثال شاید مجھے کبھی کبھی افسانوں اور داستانوں میں ملتی ہے، اپنے دَور کے افسانوں میں نہیں ملتی۔ میرے گھر میں نانا جان، والدہ، بڑی اور چھوٹی بہنیں، چھوٹے بھائی تھے۔ جب میں اسکول کے لیے گھر سے کلکتہ یا پٹنہ روانہ ہونے والا ہوتا تو ہفتہ بھر پہلے سے ہی مارے دہشت اور ہول کے میری طبیعت خراب ہوجایا کرتی۔ کبھی بخار آجاتا، کبھی دست آنے لگتے۔ کبھی اختلاج اور رونے کا دَورہ پڑجاتا۔ کبھی ایسی بات ہوتی کہ مجبوری مجھے ایک حد تک زبردستی کھٹولی پر سوار کر کے اسٹیشن روانہ کیا جاتا جو گھر سے تین میل کی مسافت پر تھا۔ جب گھر سے مجھے لے جایا جاتا، تو ماں اور بہنوں بھائیوں کو دیکھ کر روتا، کمرے کو دیکھتا، صحن کو دیکھتا، سائبان کو دیکھتا، طاق اور الماریوں کو، روشن دانوں کو حسرت سے دیکھتا۔ ہر قدم پر سوچتا کہ میری نظر اس دروازے پر آخری بار پڑ رہی ہے، اس دہلیز کو میں آخری بار دیکھ رہا ہوں، اس دہلیز پر میرا یہ آخری قدم ہے۔ جب دروازے سے نکلتا تو اپنی ماں اور بہنوں کو دیکھتا اور دہاڑیں مار کر روتا، میری بہنیں بھی رونے لگتیں۔ اسی طرح گلی راستے کو دیکھتا ہوا روانہ ہوتا۔ محلے اور بستی کے لوگ بھی مجھے دیکھتے تو ہمدردی کرتے، تعجب کرتے اور تسلّی بھی دیتے۔ ایک کھٹولی پر میں ہوتا، دوسری پر میرے نانا جان، جو مجھے اسٹیشن تک چھوڑنے آتے۔ جب ریل آتی، مجھے ملازمین

ریل پر پر سوار کرتے۔ نانا جان کھٹولی پر ہی بیٹھے رہتے اور اُن کے ہونٹ ضبطِ گریہ میں تھرانے لگتے اور میں بے تحاشہ رونے لگتا۔ اسی عالمِ اضطراب میں کلکتہ یا پٹنہ پہنچتا تو ہفتوں اور مہینوں گزر جاتے تب کہیں طبیعت قابو میں آتی۔

جی نہ چاہے تھا جدا ہو کے کہیں جانے کو
ہم نے معشوق بنا رکھا تھا میخانے کو

زندگیوں سے پیار اور شیفتگی کی یہ بھونڈی اور الہڑ لکیریں، یہ بے ترتیب اور غیر منظّم نقوش ہی میری طبیعت، میرے مزاج میلان کی جان اور رُوح بن گئے۔ انہی سے میری زندگی کا پہلے ڈھانچہ تیار ہوا، پھر اس پر گوشت پوست آئے، پھر یہ ٹھوس اور مضبوط ہوئے، پھر انہی سے رنگ اور روغن آیا، لباس آیا، پوشاک آئی۔ پھر انہی سے زندگی کی ساری آرائشیں اور زیبائشیں، رونقیں اور رعنائیاں آئیں، اور میری آئندہ کی اس وقت تک کی زندگی انہی کے سنوار اور بناؤ کا دوسرا نام ہے۔ محبت اور پیار، شیفتگی اور وارفتگی یہی میری زندگی کا واحد تصور ہیں۔ یہی میری زندگی کا سب سے اُونچا آدرش ہیں، یہی فلسفہ بھی اور یہی حقیقت ہیں۔ جس فضا اور ماحول میں محبت کرنا میں نے سیکھا اس ماحول میں محبت کی پچھلی داستانیں بھی تھیں اور موجودہ متحرک تصویریں بھی۔ میرے نانا دو بھائی تھے— مولوی امیر الدین بڑے اور چھوٹے میرے نانا مولوی ضمیر الدین۔ میں نے انھیں ان کے بڑھاپے میں دیکھا اور ان کے لڑکپن اور جوانی کی داستانیں سنیں۔ ایسے افسانے کہ دونوں بھائی ایک مکتب میں پڑھتے تھے۔ دونوں ایک ساتھ بیٹھتے، ایک ساتھ اُٹھتے، ایک ساتھ چلتے، ایک ساتھ سوتے، ایک ساتھ کھاتے۔ سردیوں میں دونوں کے سروں پر دوشالے ہوتے مگر دونوں اپنے اپنے دوشالوں کے پلّوؤں سے ایک دوسرے کو ڈھاپنے کی کبھی ناکام کبھی کامیاب کوششیں کرتے ہوئے دیکھے جاتے۔ گھر سے الگ الگ رکابیوں میں کھانا آتا، مگر دونوں بھائی پہلے ایک رکابی کا کھانا ختم کرتے پھر دوسری رکابی میں ہاتھ لگاتے۔ مولوی صاحب قمچیاں مارتے کہ دونوں اپنی اپنی رکابیوں میں کیوں نہیں کھاتے۔ یہ قمچیاں کھاتے مگر کھانا الگ نہیں کھاتے۔ قمچیاں کھاتے تو کھانا چھوڑ دیتے اور خاموش روتے اور آنسو بہاتے۔ جب قمچیاں رُک جاتیں تو پھر اُسی طرح کھانا شروع کرتے۔ مولوی صاحب نے اُکتا کر انھیں اپنی اپنی حالت پر چھوڑ دیا۔ دونوں نے شادیاں کیں لیکن دونوں بھائی صرف شب کو چند گھنٹوں کے

لیے جدا ہوتے۔ ورنہ زندگی کے تمام معاملات میں دونوں ایک مشین کے دو بازو یا ایک ترازو کے دو پلڑے کی طرح رہتے۔ میں نے اپنے بچپن میں ان کا بڑھاپا دیکھا۔ مولوی امیر الدین زیادہ تر کلکتہ میں قیام کرتے تھے، تجارت بھی تھی اور درس و تدریس بھی۔ اور میرے نانا مولوی ضمیر الدین مستقل اپنے گھر پر ہی رہتے، سال میں ایک دو بار بڑے بھائی گھر آتے۔ اسٹیشن میرے گاؤں سے تین میل دُوری پر تھا۔ مولوی ضمیر الدین گاڑی آنے سے دو تین گھنٹہ پہلے ہی سے بستی سے باہر آدھ میل دُور لاٹھی ٹیکتے ہوئے جاتے اور اسٹیشن سے آنے والی راہ پر ٹکٹکی لگائے کسی درخت کے سائے میں بیٹھے رہتے۔ دُور سے مولوی امیر الدین صاحب کی کھٹولی کہاروں کے کندھوں پر نظر آتی اور یہ اُٹھ کر بے تحاشہ کھٹولی کی طرف آگے استقبال کے لیے لپکتے۔ مولوی امیر الدین اپنے چھوٹے بھائی کو 'مولوی صاحب' کہا کرتے اور یہ 'بھیّا' کہتے۔ دُور ہی سے چلاّتے ''السلام علیکم بھیّا!'' اور وہ کہتے ''وعلیکم السلام مولوی صاحب۔'' اور سواری سے اُتر جاتے اور دونوں کے بوڑھے چہروں پر آنکھیں جوان ہوجاتیں اور اُن میں وہ چمک اور ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ رقص کرتی نظر آتی اور چہرے یوں کھل اُٹھتے جس طرح دو محبوب کی ملاقات پر چہروں کا عالم ہوا کرتا تھا۔ مولوی امیر الدین گھر آتے اور سامان میں سے ایک بقچہ نکالتے۔ ''لیجیے مولوی صاحب یہ آپ کے لیے دو کُرتے، اپنے ہاتھ سے سی کر لایا ہوں۔ یہ لیجیے یہ دو پائجامے ہیں اور لیجیے یہ دو ٹوپیاں ہیں۔'' مولوی صاحب کھڑے کھڑے سلام کرتے جاتے اور بھیّا بھیّا کہتے جاتے۔ اور پھر صبح آتی، دن آتے، شام آتی، رات آتی اور دونوں اُسی طرح دیکھے جاتے جس کی تصویر مکتب والے واقعہ میں دِکھائی گئی ہے۔ تمام دن اور رات کے بہت زیادہ حصّے تک دونوں کی باتوں کا سلسلہ ختم نہ ہوتا، اُسی طرح بیٹھنا، اُسی طرح ساتھ کھانا، اُسی طرح آس پاس پلنگ پر سونا۔ جب مولوی امیر الدین رخصت ہوتے تو اُسی طرح دُور تک پہنچانے جاتے۔ مولوی امیر الدین کھٹولی پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیتے، مولوی ضمیر الدین تھراتے ہوئے ہونٹوں سے سلام کہتے اور کھٹولی روانہ ہوجاتی، مولوی ضمیر الدین دیر تک کھٹولی کو دیکھا کرتے پھر کچھ دیر خاموش سر جھکائے کھڑے رہتے اور آہستہ آہستہ بہت تھکے ہوئے نڈھال مسافر کی طرح واپس ہوتے۔

میں کلکتہ میں آٹھویں درجے میں تھا کہ مولوی امیر الدین سڑک عبور کرتے ہوئے کسی

گاڑی سے ٹکرا کر گرے، کولہا ٹوٹ گیا، بیہوش ہو گئے، اسپتال گئے، کولہے پر تختہ لگا کر بنڈج کیا گیا۔ مولوی امیر الدین کو ہوش آیا تو مجھے مخاطب کر کے کہا ’’مولوی صاحب کو خبر نہ کرنا۔‘‘ ایک ماہ ذی فراش رہے، کسی طرح لیٹے لیٹے خط لکھتے رہے۔ آخری دِنوں میں معذور ہو گئے تو مجھ سے کہتے کہ ’’مولوی صاحب کو خبر نہ کرنا۔‘‘ حالت زیادہ خراب ہوئی۔ عالمِ نزع میں بھی دو ایک بار کہا ’’مولوی صاحب کو مت خبر کرنا۔‘‘ اسّی سال کی عمر میں کلکتہ میں انتقال ہوا۔ خبر کیسے نہ کی جاتی۔ مولوی صاحب کو خبر ہوئی، باہر مردان خانے کے صحن میں مولوی صاحب عصا تھامے کھڑے تھے۔ خبر سنتے ہی گرے اور بیہوش ہو گئے۔ گود میں اُٹھا کر لایا گیا۔ مفلوج ہو گئے تھے۔ چند دن بیمار رہے پھر یہ بھی رخصت ہو گئے۔

میرے ایک چچا تھے سیّد کبیر الدین۔ موسیٰ بنی کے علاقے میں جنگل کے داروغہ تھے۔ بہت کم سخن آدمی۔ میری چچی بڑی ہنس مکھ اور بہت خوبصورت تھی، تیلہاڑہ میں ہی چند روز بیمار ہوئیں اور یک بیک چل بسیں۔ موسیٰ بنی خبر کی گئی، کبیر چچا آئے۔ مجھے یاد ہے غالبًا اسٹیشن سے سائیکل یا کھٹولی پر آئے۔ دروازے میں قدم رکھا ہی تھا کہ انھیں دیکھ کر ان کے گھر والوں نے مرحومہ کی یاد میں زور سے چیخ کر رونا شروع کیا۔ کبیر چچا نے فوراً ڈانٹ کر سب کو خاموش کیا، جس گھر میں چچی کا انتقال ہوا تھا، سیدھے اُس کمرے میں گئے۔ اُسی پلنگ پر بیٹھ گئے، چند منٹ بعد لیٹ گئے۔ اور دوسرے یا تیسرے دن مر کر اُٹھے۔ میرے پڑوس میں ایک مولوی حبّو صاحب تھے، خوبصورت گورے چٹے آدمی۔ سفید داڑھی، سفید زلف، جہاں دیدہ، سرد و گرم چشیدہ۔ ان کے چھوٹے بیٹے کو استسقا کا مرض ہوا۔ علاج ہوتا رہا، مرض بڑھتا رہا۔ آخر دنوں میں بڑے تحمل اور ضبط سے بیٹے کے سرہانے بیٹھے رہتے، ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہتے۔ بچے کا انتقال ہو گیا، صحن میں ٹہلتے رہے، جنازہ تیار ہوتا رہا، ساتھ قبرستان گئے، قبر کے کنارے کھڑے رہے، تسبیح پڑھتے رہے۔ مٹی ڈالی جانے لگی، ہجوم تھا، کسی کی نظر پڑی کہ قبر کے کنارے کھڑے یک بیک مولوی حبّو صاحب کہاں غائب ہو گئے۔ غل ہوا کہ قبر میں گر گئے ہیں۔ بہت کافی مٹی ڈالی جا چکی تھی، نکالا گیا، لیکن چند دن بعد ہی دوسری قبر بغل ہی میں تیار کرنی پڑی۔

میرے والد بڑے خوش رُو آدمی، تنومند، قوی ہیکل، خوش وضع، خوش پوشاک، جامہ زیب، معمولی پڑھے لکھے مگر تہذیب، شرافت، دینداری، انسان دوستی کی تصویر۔ بظاہر مزاج میں بڑی

سختی اور درشتی۔ کبھی غصہ ہوتا، تو بڑے بڑے تندرست جوانوں کو ایک طمانچے میں قلابازیاں کھلا دیتے۔ مجھے ایک بار ایک طمانچہ رسید کیا تو میں سائبان سے نیچے گر کر بیہوش ہوگیا۔ لیکن بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی۔ کم سخن، کم آمیز۔ اپنے بچوں سے بھی بالکل لیے دیئے رہتے۔ کبھی بے تکلف نہ ہوتے۔ بیٹوں کو بیٹا کہہ کر شاید ہی پکارا ہو، میاں کہتے یا بابو۔ بیٹیوں کو بی بی کہتے۔ محمودہ بی بی، سعیدہ بی بی، رشیدہ بی بی۔ بڑی بہن محمودہ کو دو بچے ہوئے لیکن کبھی گود میں لے کر پیار کرتے نہ دیکھا۔ بہت پیار آیا تو ہاتھ میں پکڑی ہوئی نازک چھڑی سے ذرا مسکرا کر چھو دیا۔ مگر قلب کے اتنے کمزور کہ ذرا گھر میں کوئی بیمار ہوا اور دن رات سرہانے کرسی پر بیٹھے رہتے۔ نہ کھاتے نہ پیتے، خاموشی سے کچھ پڑھتے رہتے اور پھونکتے رہتے۔ میرے بڑے بھائی سلیم احمد مرحوم کو دِق کی بیماری ہوئی۔ کئی سال بیمار رہے، بیٹے کے آخر وقت میں بیٹے اور باپ یعنی مریض اور تیماردار کے قویٰ میں بہت کم فرق رہ گیا۔ وہ بھی گل گئے، یہ بھی گھل گئے۔ دل چھلنی مگر جبیں پرشکن نہیں۔ بھائی کی آخری ساعتوں میں دیکھا کہ سرہانے بیٹھے اپنی اُنگلیوں سے بیٹے کے سر میں کنگھا کر رہے ہیں۔ بیٹے پر تقریباً نزع کا عالم ہے، بیٹے نے آنکھیں اُوپر اُٹھائیں اور کہا ''ابا بہت نیند آرہی ہے، سوجاؤں؟'' باپ نے کہا ''سو رہو نا بیٹا، کیوں تکلیف اُٹھاتے ہو۔'' بیٹے نے آنکھیں بند کرلیں اور ہمیشہ کے لیے سوگئے۔ حقہ پیتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے، ہم سب کو الگ کمرے میں کردیا۔ لوگ آئے، تجہیز و تکفین ہوئی۔ مہینوں تک صرف حقہ رہا اور وہ رہے۔ بہت اصرار پر کبھی دو چار لقمے حلق میں اُتار لیا۔ گرچہ اس کے بعد کئی سال زندہ رہے، مگر کلیجہ چھلنی ہوگیا، جگر میں زخم ہوگیا، انتقال کر گئے۔

اِن شخصیتوں کی چھاؤں میں، ان محبت کرنے والوں اور محبت پر جان چھڑکنے والوں کے سائے میں میرے شعور نے آنکھیں کھولیں اور اِنہی سے میں نے بھی محبت کرنا اور محبت پر جان چھڑکنا سیکھا اور ایسا سبق سیکھا کہ کبھی نہ بھولا۔ محبت کے اتھاہ سمندر میں یہ شخصیتیں، ان شخصیتوں کا ماحول اور ماحول کے تمام اجزا چھوٹی چھوٹی کشتیاں تھیں جو اس سمندر کی موجوں پر ہچکولے اُٹھتے رہتے ہیں۔ انہی موجوں سے ان کشتیوں کے ٹکرانے کی ہلکی ہلکی صدائے بازگشت میری زندگی کے تجربوں سے گھل مل کر تلخ و شیریں گیتوں کی تخلیق کرتی ہے۔

جب میں اسکول سے چھٹیوں میں گھر آتا تو فتوحہ اسٹیشن کو جہاں سے میرے گھر کے

اسٹیشن کو جانے والی مارٹن کمپنی کی چھوٹی لائن شروع ہوتی اپنی جنتِ ارضی کا دروازہ سمجھتا تھا۔ یہیں سے نئی کیفیات، نئی اُمنگوں اور نئی خوشیوں کی آہٹیں دل میں گونجنی شروع ہو جاتیں۔ فتوحہ اسٹیشن پر موسیٰ میاں کی چھوٹی سی چائے کی دُکان میں چھوٹے سے ٹیبل کے گرد چند چھوٹی چھوٹی کرسیاں لگی رہتیں۔ ہم لوگ چھوٹی لائن کا سفر شروع کرنے سے پہلے موسیٰ میاں کے یہاں دو ایک خستہ قلچے اور چائے پی کر اُس لذتِ زندگی کا آغاز کرتے ہوا اُس جنتِ ارضی میں ڈھیر کے ڈھیر پڑی تھی اور جو ہمیں سیروں بلکہ منوں کے وزن سے تُل کر ملنے والی ہوتی۔ موسیٰ میاں کی شستہ اور شائستہ بذلہ سنجی اور حاضر جوابی علاقے میں ضرب المثل تھی۔ جو اُن کے خستہ قلچوں اور شیریں اور لذیذ چائے سے مل کر نئی چاشنی پیدا کر دیتی۔ ایک بار ہمارے ساتھ سفر کرنے والوں میں ہمارے جوار کے ایک نئے داماد تھے۔ نئی صورت دیکھ کر موسیٰ میاں نے پوچھا، عزیزم آپ کا دولت خانہ کہاں ہے؟ وہ بھی منچلے اور چست گفتگو کرنے والے تھے۔ اپنے خیال میں دولت خانہ کی رعایت سے معنویت پیدا کرنے کی کوشش میں جواب دیا: ''غریب کا دولت خانہ بہار بینک ہے۔''

موسیٰ میاں نے برجستہ کہا ''اچھا وہ جہاں منی رکھی جاتی ہے۔''

ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ میں اُس وقت تو نہ سمجھ سکا۔ اس فقرے اور لفظ 'منی' کی دوہری معنویت کا اندازہ بعد میں ہوا۔ اس کے بعد جب دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیتیں سامنے آئیں، رعایتِ لفظی اور ایہام کی صنعتوں سے باخبری ہوئی تو حیرت ہوئی۔ 'گلزارِ نسیم' میں جو الفاظ اتنے اہتمام سے آئے ہیں اِن دیہاتی خوش گویوں کے سامنے کتنا پیش پا افتادہ تھے۔

جب اپنے گاؤں کے اسٹیشن سے کھٹولی پر گھر کی طرف روانہ ہوتا تو ہر قدم پر دل کوئی اُمنگوں کی چاپ محسوس ہوتی، کان ہواؤں میں نئے گیتوں کے زیر و بم سنتے اور آنکھیں تاڑ، برگد، پیپل، کھجور، آم اور مہوؤں کے گزرتے ہوئے سایوں میں نئی راحتوں کے خواب دیکھتیں۔ دروازے پر میری ماں اور چھوٹی بہنیں کھڑی رہتیں۔ ماں بلائیں لیتی اور چھوٹی بہنیں ننھے ننھے آنچلوں میں اپنے ننھے ننھے ہاتھ چھپا کر مسکراتی ہوئی جھک جھک کر سلام کرتیں اور میں سب سے لپٹ جاتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ یہی تو جنت ہے۔ آنگن میں اُچھلتا اور کودتا اور چھوٹی بہنوں کے ساتھ ستون کی آڑ میں آنکھ مچولی کھیلتا۔ گھنٹے دو گھنٹے یوں گزر جاتے تو کچھ کھانے پینے کی طرف زبردستی متوجہ کیا جاتا۔ کھا پی کر فوراً گھر سے باہر نکلتا، بغل کے مکان میں عبدالعزیز چچا اور کبیر چچا

کی بیٹیاں ہاجرہ بہن، زینت بہن، عزیزہ بہن اور نفیسہ بہن ملتیں۔ اِن کی دُعاؤں اور مسکراہٹوں میں غوطہ لگا کر آگے بڑھتا تو رفو (رفیعہ) نانی کا مکان ملتا...... ''ارے کلیم! تیں تو بڑا لمبا ہو گیا ہے۔'' ''آداب رفو نانی! اور کہاں ہیں زبیدہ خالہ اور رقیہ خالہ؟'' اور دونوں آنچل سمیٹتی ہوئی مسکراتی ہوئی سامنے بیٹھ جاتیں، دو چار منٹ سلام کر کے آگے بڑھتا تو خدّو خالہ (خدیجہ) اور ظفیر خالو! ''سلام خالہ۔'' ...... ''خوش رہو بیٹا کیسے ہو بیٹا؟'' ...... ''ارے خدّو خالہ یہ سوکھا سوکھی خیریت خیر صلا، یہ جھوٹ موٹ بیٹا بیٹا، پہلے امرود کھلاؤ تازہ امرود توڑ۔'' ...... ''ارے کھا، کتنا امرود کھائے گا، وہ دیکھ شہیدی امرود اور یہ دیکھ سعیدی امرود۔'' وہاں سے آگے بڑھتا تو ایک بہت بڑا گھر دو منزلہ، اُسی میں واعظ نانا، اطہر نانا، اعظم نانا، ذکی نانا، شفیع نانا اور اُن کی بیویاں بڑی نانی، منجھلی نانی، سنجھلی نانی اور قسیمن نانی اور چندا نانی اور اُن کی بیٹیاں حسنیٰ خالہ اور درگاہن خالہ اور بانو خالہ اور ربانو خالہ ''سلام نانی...... سلام خالہ'' ...... ''ارے کلوا آیا (کلیم کا گھریلو نام کلوا پڑ گیا تھا) سلام دُعا چیخ پکار، ہنسی کھیل، اُچھل کود...... ''ارے کلوا تیں تو لمبا ہو گیا ہے اور دُبلا ہو گیا ہے...... ارے کلوا سنا ہے کہ تیں بائیسکوپ دیکھے ہے اور تھیٹر دیکھے ہے؟'' ...... ''جی نانی تم ہم کو کلوا کاہے کہتی ہو؟ دیکھو حسنیٰ خالہ ہم تو گورے چٹّے ہیں، ہم کو کلوا کاہے کہتی ہو حسنیٰ خالہ؟'' ...... ''ارے کلوا ہم تو سرو (شروع) سے تہکو کلوا کہتے آئے ہیں، اچھا تیں گورا کلوا سہی ہم تو کلوا ہی کہیں گے۔ ہم کو کلیم نا کہے آوے ہے۔'' ...... ''اچھا نانی گورا کلوا سہی...... اور دیکھو درگاہن خالہ تمھارے دانت کتنے بڑے ہیں اور باہر نکلے ہوئے ہیں...... تم تو ہم کو کلوا مت کہو۔'' ...... ''اچھا نگوڑے کوڑھے میرا دانت نکلا ہوا ہے؟...... بڑا بڑا دانت ہے؟...... اچھا تو تیں کلوا ہے کالا کلوا ہے کلوا کلوا کلوا......'' میں نے دانت نکال کر منہ چڑھایا اور بھاگ کر مردانے حصّے کی طرف نکل گیا۔ قسیمن نانی کے بڑے صاحبزادے سیّد شاہ بدرالدین عرف شاہ دمو، جنھیں ہم کبھی صرف شاہ صاحب کہتے، کبھی دمڑ شاہ۔ مجھ سے سِن میں کافی بڑے مگر بچپن سے دانت کاٹی دوستی، لنگوٹیا یاری...... ''ارے کلیم تم آ گئے؟'' ...... اِدھر سے میں دوڑا اُدھر سے شاہ صاحب...... ''ارے شاہ صاحب...... دمو ماموں...... دمڑ شاہ...... دمڑی کی بلبل ڈُکڑا اچھتائی......'' میں اُنھیں چڑھاتا ہوا گلے سے لپٹ جاتا......

''نالائق...... گدھا...... بیہودہ...... تو بیہودگی سے باز نہیں آتا......''

شاہ صاحب بے تحاشہ ہنستے ہوئے دیر تک لپٹے رہتے...... شاہ صاحب کے بال سیاہ اور

ایسے گھونگھریالے کہ اُن میں کنگھا کرنا دشوار ہوتا تھا۔ آنگن میں سنگرہار کے پھولوں کا درخت تھا، ہروقت پھول ٹپکتے رہتے تھے، میں پھول چننے لگا...... ''شاہ صاحب! آپ تو سگرہار کے پھولوں کے سائے میں رہتے ہیں...... پھولوں سے کھیلتے ہیں، پھولوں میں رہتے ہیں، پھول بنے ہوئے ہیں...... آیئے میں آپ کو واقعی پھول بنا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں''...... میں نے دَوڑ کر مٹھی بھر سنگرہار کے پھول شاہ صاحب کے گھونگھریالے بالوں میں ڈال دیئے...... ننھے ننھے سنگرہار کے پھول واقعی شاہ صاحب کے پیچیدہ وخمیدہ بالوں میں داخل ہوکر پھولوں کا گلدستہ بن گئے ...... اب شاہ صاحب خفا ہورہے ہیں اور بالوں کو جھاڑ رہے ہیں لیکن ننھے ننھے پھول بالوں سے نکلنے کے برخلاف اورحلقوں میں سمائے جاتے ہیں...... ''اُف کل ان کمبخت بالوں کو ضرور ترشوادوں گا''...... بال تو کبھی نہیں ترشے، مگر کچھ دِنوں بعد گردن ترش گئی۔

وہاں سے نکلا تو قاضی نذیر حسین صاحب عرف نجو نانا چھ فیٹ لمبے آدمی، گورے چٹّے دُبلے پتلے، سفید ململ کا کرتہ، سفید پاجامہ، سنہری لیس کی اُونچی ٹوپی، سلیم شاہی جوتا، سفید داڑھی، سفید زلف، دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے ڈالے تسبیح پڑھتے ہوئے چہل قدمی کررہے ہیں...... ''سلام علیکم نجو نانا''...... ''اہاہ آگئے ناتی!''...... ''ہاں نجو نانا، آج تو آپ بڑے اچھے لگ رہے ہیں''...... ''دیکھو کلیم! آج شام کو ہم تم سے بیٹھ کر ایک نعت سنیں گے، ایک غزل سنیں گے اور ایک گیت سنیں گے...... دیکھو تمھارے نصیر ماموں، بشیر ماموں اُدھر بیٹھے ہیں، تمھیں دیکھتے ہی باغ باغ ہوجائیں گے''...... میں نے پھاٹک کے اندر قدم رکھا تو گول بدن، ناٹے قد، سرخ وسفید رنگ کے قاضی نصیر حسین ماموں اوٹنگ خالتہ پاجامہ، ململ کا کرتہ، ترکی ٹوپی پہنے پان کھا رہے ہیں...... مجھے دیکھتے ہی ایسا ہنسے کہ پان کی گلوری منہ سے نکل پڑی اور سرخ پیک کے کچھ قطرے سفید کرتے پر بکھر گئے...... ''ارے میاں تم تو غضب کرتے ہو کلیم! اتنے اتنے دنوں پر آتے ہو۔ ابھی تو اسکول میں پڑھتے ہو، کالج میں جاؤ گے تو پھر پوچھو گے بھی نہیں''...... ''نصیر ماموں آپ کیا کہتے ہیں، میرا شہر میں جی لگے ہے؟ وہ تو قید خانہ ہے، قید کی زندگی گزارتے ہیں ...... نصیر ماموں! ہم شہر میں رہتے ہیں لیکن دل اور دھیان آپ ہی لوگ کے ساتھ رہتے ہیں۔ اور نصیر ماموں! جَے دن کے لیے ہم آئے ہیں وہ تو چٹکیوں میں گزر جائیں گے۔ اُس دن کا خیال آوے ہے جس دن شہر کو واپسی ہوگی، تو اِسی وقت سے دل دھڑکے ہے...... جب اِس پانکڑ کے

درخت کو، اس توری اور سیم کی لت چڑھی ہوئی دیواروں کو، آلو کے ان کھیتوں کو اور لاٹھا کے ڈول چلاتے ہوئے بخشو میاں اور جمعراتی میاں کو، آپ کے سائبان کو، ان چوکیوں پر دُور تک سفید چاندنی کے فرش کو ان گاؤ تکیوں کو دیکھتے ہوئے گزریں گے اور روئیں گے‘‘...... ’’ہاں کلیم، جب تم تیاہاڑہ سے جاتے ہو تو تمھاری حالت دیکھ کر ہم سب بے قرار ہوتے ہیں۔ خیر تم آج ہی آئے ہو، چھوڑو اِن باتوں کو۔ تم جب آتے ہو تو ہم لوگوں میں نئی زندگی آجاتی ہے...... آج ہم بھی تمھیں غزل اور گیت سنائیں گے اور تم سے بھی سنیں گے‘‘...... ’’ہاں نصیر ماموں آج ہم کو غالبؔ کی غزل سنائیں گے‘‘...... بھائی ظفر امام صاحب ہماری بستی کے سب سے حسین اور جامہ زیب جوان، نکلتا ہوا قد، چھریرا بدن، چوڑی چھاتی، بھرے بھرے بازو، لمبی گول گردن، چوڑی پیشانی، خوبصورت آنکھیں...... جو لباس پہن لیں کھل جائیں...... لنگی بنیائن میں بھی، قمیص پاجامے میں بھی، کرتہ اور چست مہری دار پاجامے میں بھی، ننگے سر بھی، کامدار دوپلّی ٹوپی کے ساتھ شیروانی میں بھی، کوٹ قمیص میں بھی، جس حال، جس لباس میں دیکھئے سینکڑوں میں ایک معلوم ہوں...... اور چہرہ کا یہ عالم کہ ہر وقت شگفتہ ہو رہے ہیں، باچھیں کھلی ہوئی ہیں، ایک کبھی نہ ختم ہونے والا تبسم جس کی سرحدیں کھلکھلاہٹ کی سرحدوں سے ملی ہوئی رہتی تھیں، مجھے دیکھتے ہی کھل اُٹھتے ...... ’’ارے میاں کلیم!...... دیکھو آج ہی نیا کرتہ پہنا ہے، تم تو مارے حسد کے جل گئے ہوگے؟‘‘ یہ اُن کا گویا تکیۂ کلام تھا لیکن صرف میرے ساتھ۔ وہ مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے اور میں بھی گویا جان چھڑکتا تھا، اس لیے وہ یہ جملہ اکثر استعمال کرتے...... ’’دیکھو یہ ٹوپی آج گیا سے سلوا کر اور دُھلوا کر منگائی ہے۔ تم تو دیکھتے ہی جل گئے ہوگے!‘‘...... ’’ارے بھیّا ہم تو بس جل کر خاک ہی ہوگئے‘‘...... ’’اچھا کلیم! بیٹھو سنو، غالبؔ کی ایک غزل سنو......‘‘ وہ شعر و سخن کے دلدادہ اور غالبؔ کی غزلوں کے رسیا تھے۔ غالبؔ کی شاعری سے آشنائی اور اس کی غزلوں سے پہلی جان پہچان مجھے ظفر امام بھائی ہی کی صحبتوں میں ہوئی اور اُسی دور میں مجھے غالبؔ کی اکثر غزلیں یاد ہوئیں۔ وہ گویا ’دیوانِ غالبؔ‘ کے حافظ تھے اور چست وچسپاں برمحل اور باموقع اشعار پڑھنے میں چونکا دینے کی حد تک مہارت رکھتے تھے...... ان کے بالکل بغل ہی میں ان کے پھوپھی زاد بھائی سیّد شاہ عبد الحفیظ صاحب کی مردانہ نشست گاہ تھی۔ حفیظ بھائی میانہ قد، چوڑا چکلا سینہ، پتلی کمر، کچی پکی گول ترشی ہوئی داڑھی، ہارمونیم سامنے رکھے بیٹھے ہوئے ہیں......

''اخاہ کلیم سلّمہٗ تم آ گئے؟ کب آئے ؟ آج ہی آئے کچھ کھاؤ گے؟ ......اچھا حلوہ منگاؤں...... جاؤ بیٹی شکیلہ امّی سے کہنا تشتری میں حلوہ دیجیے''......شکیلہ اور نور جہاں دونازک شرمیلی ننھی بچیاں یک زانو بیٹھی قرآن شریف کی سطروں پر شہادت کی انگلی رکھے جھوم جھوم کر سبق یاد کر رہی ہیں۔

''اچھا بیٹی نور جاہاں تم بھی جاؤ......سخیا! ارے سخیا !!''......''جی آیا''......''بیٹھ سخیا''......حفیظ بھائی نے ہارمونیم کھینچی، پتلی لمبی انگلیاں ہارمونیم کی پٹریوں پر دوڑنے لگیں......ہاں سخیا شروع کر......مرغ دل......''

سخیا دونوں ٹخنوں کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر اُکڑوں بیٹھ گیا۔ گردن دائیں مونڈھے کی طرف ذرا جھکا کر دردناک آواز میں غزل شروع کی:

مرغ دل مت رو یہاں آنسو بہانا ہے منع
ہم قفس کے قیدیوں کو آب و دانہ ہے منع

سماں بندھ گیا۔ اچھی آواز، سخیا بھی گاتے گاتے جھومنے لگا۔ حفیظ بھائی کا چہرہ بھی تمتما رہا ہے۔ سخیا نے ظفرؔ کی غزل ختم کی اور حفیظ بھائی نے غزل شروع کی۔ میں اس غزل کو انہی کی غزل سمجھتا رہا، اب تک تحقیق نہیں ہوسکی ہے کہ کس کی ہے:

آرزو ہے وفا کرے کوئی	ہم کو چاہے خدا کرے کوئی
عشق میں ہے ضرور رُسوائی	دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی
ہم تو بیٹھے سنا ہی کرتے ہیں	لاکھ گالی دیا کرے کوئی

غزل چل رہی ہے کہ معین الدین حیدر صاحب تشریف لائے......نواب صاحب ٹونک کے مصاحب سال میں ایک بار ٹونک سے گھر آتے......دُور ہی سے داد دیتے ہوئے آ رہے ہیں......سبحان اللہ شاہ صاحب !......غرل گانا اور چیز ہے، آپ تو مجسم غزل بن جاتے ہیں...... میں ٹونک میں رہتا ہوں، نواب کا دربار......امارت، نفاست، نزاکت ساون کی جھڑی کی طرح برستی ہے، لیکن سال میں ایک ماہ جو لطف، جو کیفیت، جو حسن طبیعت اور سادگی یہاں نصیب ہوتی ہے، وہ ٹونک کے گیارہ مہینوں میں کہاں؟''......معین الدین حیدر صاحب تیلہاڑہ کی خاک سے اُگنے اور نشو ونما پانے والے ٹونک کی درباری فضا میں جوانی سے آغازِ پیری تک وقت گزارنے والے ادب، شاعری اور زبان و بیان کے حسین اور رنگین ماحول میں پھولنے پھلنے والے جب

گفتگو کرتے تو تیلہاڑہ کی سادہ دیہاتی فضا میں رنگ و نور و نکہت کی بارش برسانے لگتے۔ میں اُن کی گفتگو سنتا تو سنتا رہ جاتا۔

بھائی عبدالحفیظ صاحب کی ذات ایک انجمن تھی اور ان کی نشست گاہ ایک سماجی ادارہ۔ وہ موسیقی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے، شعر و ادب کا بڑا ستھرا مذاق، مجلسی گفتگو کا بڑا اچھا ڈھنگ اور سماجی مسائل پر مباحثہ اور اس کے حل نکالنے میں طاق۔ مقامی سیاسیات کے بھی ماہر۔ خوش وضع اور خوش مذاقی تو خانہ زاد تھی۔ ہر دو چار روز پر کسی شاعر کا دیوان ذاتی کتب خانہ سے نکلوایا جاتا۔ معین الدین حیدر صاحب، ماسٹر یعقوب صاحب، مولانا عبدالصمد طپشؔ، شاہ عبدالحمید حمیدؔ اور بھائی ظفر امام صاحب کے درمیان ایک ایک شعر پڑھا جاتا اور اس کے معنی و مفہوم اور اسلوب پر خیال آرائی ہوتی۔ کبھی کبھی ساز و نغمہ کا دَور چل جاتا۔

ذرا اور آگے بڑھیے تو شاہ قمر العرب صاحب، فخر العرب صاحب، نجم العرب صاحب، عرب برادران۔ دل کے غنی، زبان کے شیریں، مزاج کے کشادہ، وضع کے سادہ، مسکرا کر باتیں کرنے والے، بہت جلد رُوٹھ جانے والے اور رُوٹھ کر بہت جلد من جانے والے۔ اور وہ بھائی شاہ عبدالحسیب صاحب پتلے دُبلے منہنی۔ کبھی اتنے سنجیدہ کہ ہنستا ہوا آدمی اُنھیں دیکھ کر اپنی ہنسی بھول جائے اور کبھی اتنے شگفتہ رُو کہ رونے والا ہنس دے...... خالتہ پاجامہ، بادامی شیروانی، ترکی ٹوپی اور سیاہ بوٹ، بائیں ہاتھ میں شیروانی کے دامن کا کونا پکڑے ہوئے تیلہاڑہ کی گلیوں میں نکلتے تو بے ساختہ میری زبان سے نکل جاتا کہ ''حسیب بھائی یہ پٹنیا ٹھسّہ ہے۔'' تو وہ بول اُٹھتے کہ ''میاں کلیم...... کل تم پھروگے چاک گریباں کیے ہوئے''...... سر سلطان کے بیٹے نجم الحسن صاحب کی شادی کا شاید آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے، جس میں اُس زمانے میں تین لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا اور پٹنہ کی آخری شاہانہ شادی تھی۔ ملک کے اکثر رؤسا، راجگان اور نوابان اور اُن کی منظورِ نظر گانے والیوں کا ہجوم ہوا تھا۔ حسیب بھائی اُس تقریب کی دو نقلیں کرتے۔ ایک تو گوہر جان طوائف کے طبلے کا کیریکچر جسے ہم لوگوں نے پچیسیوں بار دوپہر یا رات کے سنّاٹے میں کسی بند کمرے میں اُن سے سنا اور ہر بار نیا لطف آیا اور پھر گھنٹوں ہم لوگوں کو ہنسی ضبط کرنا دُشوار ہوتی۔ ہنستے ہنستے ہم لوگ ڈھیر ہو جاتے اور وہ کیریکچر کر کے خاموش بیٹھے رہتے۔ دوسری چیز مہاراجہ جے پور کی منظورِ نظر چھوٹی زہرا کے مجرے کی تصویر جس میں اُس نے فارسی کی یہ غزل

گا کر محفل کی محفل کو تصویرِ حیرت بنا کر چھوڑ دیا تھا:

ہر غنچہ بشگفت الاّ دلِ من

اے وادلِ من صد وادلِ من

بھائی حسیب صاحب اس سنجیدگی سے اُس کی غزل سرائی کی تصویر کھینچتے کہ واقعی ہم لوگوں پر بھی کیفیت طاری ہو جاتی اور یہ سب اُسی بادامی شیروانی اور سیاہ ٹوپی میں ہوتا۔ حسیب بھائی کی شیروانی کے ساتھ اپنے گاؤں کی صبح عید اور عیدگاہ کا منظر سامنے آجاتا...... میرے گھر کے بالکل سامنے عیدگاہ کے دروازے پر صبح عید کو طلوعِ آفتاب سے پہلے ظہیر الدین عرف تحدو حلال خور متقی، پاکباز، نمازی، لنگ باندھے لمبا کرتہ، سفید دوپلّی ٹوپی، لمبی داڑھی اپنے بھائی کے ساتھ نقارہ بجانا شروع کرتا۔ پہلے بچوں کا ہجوم ہوتا اور پھر شیروانیوں کی آمد شروع ہوتی۔ اور پھر جوق جوق مختلف لباسوں میں دوگانۂ عید ادا کرنے کو آنے والے خواجہ معشوقؔ لکھنوی کے اس شعر کا منظر بن جاتے

ہر طرف حشر میں جھنکار ہے زنجیروں کی

اُن کی زلفوں کے گرفتار چلے آتے ہیں

سفید شیروانی، سیاہ شیروانی، سرمئی شیروانی، زرد، نیلی، بادامی شیروانیاں، پاکڑ کے سائے میں عیدگاہ کے دروازے پر رنگ برنگ کی تتلیوں کا منظر بن جاتیں اور تھوڑی دیر کے لیے ایسا معلوم ہوتا کہ تیلہاڑہ کی دیہاتی فضا میں عظیم آباد قدیم کی گمشدہ روایت زندہ ہوگئی ہے...... اور عید کی ان چند گھڑیوں کی تصویر کے ساتھ محرم کے عشرۂ اوّل کے آخر تین دِنوں کا منظر بھی جوڑ دیا جائے، تو عظیم آباد کے محلّہ کیواں شکوہ اور تیلہاڑہ میں کوئی فرق شاید نہ رہ جائے...... یہ ہے نویں محرم کی دوپہر، یہ پیٹھیا کا میدان، اور سب سے آگے دیکھئے یہ ہے محلّہ کمرہ کی سپر اور تعزیہ۔ اور یہ ہیں اکھاڑے دار شاہ رضا خاں صاحب ساڑھے چھ فٹ کا قد آور سورما، ترکی ٹوپی، خالتہ پاجامہ، بادامی قمیص، سرخ وسفید چہرہ، ہاتھ میں تلوار اور کمر میں پٹکا۔ اور یہ ہیں رشید الدین خاں عرف نتھو خاں، میانہ قد، بالشت بھر سینہ اُبھرا ہوا، پہلوان صورت، رئیس طبیعت۔ اور یہ ہیں سیّد عبدالغنی اور محمد ظہور صاحبان، جسم اور چہرے سے بڑھاپے کا شباب ٹپک رہا، لیکن طبیعت کے پردے سے لڑکپن کی جوانی جھانک رہی ہے۔ لڑکے، جوان، بوڑھے، سب ایک آواز، ایک آہنگ۔ یونہی

رات کٹ جائے گی ہم صفیرو، میں آواز دوں گا تم آواز دینا۔ سب ایک آہنگ ہوکر نعرہ لگا رہے ہیں...... یاحسین...... یاحسین...... بولو بولو یارو...... بولو بولو کمرہ کے نوجوان!...... یاحسین...... یاحسین، حسین، حسین، حسین، حسین......اور یہ ہے ہمارے محلّہ عیدگاہ کی سپر......اور یہ امام حسین کا ڈنکا کون بجارہا ہے؟ ارے یہ تو ہمارے اعظم نانا ہیں، ڈاکٹر سیّد محمد اعظم...... سانولہ چہرہ، چھریرا بدن، بدن کے روئیں روئیں سے حوصلہ مندی اور بلند عزمی نمایاں...... گلے میں بڑا سا ڈنکا لٹکائے چوب ہاتھ میں لیے جوش کے ساتھ امام حسین کا ڈنکا بجارہے ہیں...... بجے ڈنکا اماموں کا...... بجے ڈنکا اماموں کا......آواز ڈنکے سے نکل رہی ہے......اور یہ سپر کون گھمارہا ہے؟ ارے یہ تو ہمارے اطہر نانا ہیں۔ سیّد شاہ اطہر حسین امام جامع مسجد۔ اور یہ سپر کی ڈور لیے کون ہیں؟...... یہ تو ہمارے واعظ نانا ہیں، سیّد واعظ الحق......اور یہ ہیں ہمارے شاہ صاحب......شاہ دمڑ صاحب۔ سیاہ گھونگھریالے زلف پر بادامی کشتی نما ٹوپی رکھے، سفید کینواس کا باٹا کا ٹینس شو، پان کھائے، کمر سے پٹکا باندھے، بجلی کی طرح کودرہے ہیں۔ اور یہ ہیں سیّد نظام الدین ان کے چھوٹے بھائی، گورے چٹّے، ہنس مکھ، سیاہ چھوٹی چھوٹی داڑھی، ہر وقت باچھیں کھلی ہوئی......اور یہ غلام حیدر شبیر۔ میانہ قد، چکیٹھا بند، گٹھے ہوئے شانے اور بازو......زرد سلک کی قمیص اور سفید شلوار جس سے نیلا ازار بند جھول رہا ہے......''ایں خانہ ہمہ آفتاب است' ایک پر ایک وضع دار اور جامہ زیب، سپر شمع ہے اور یہ سب پروانے ہیں...... سپر بھی شاندار، سپر پھیرنے اور گھمانے والے بھی شاندار...... تہذیب کے نمونے، حسن وضع کے مرقع، شرافت کی تصویر، شائستگی اور وضع داری کے علمبردار، کبھی سپر گھمارہے ہیں، کبھی ڈنکا بجارہے ہیں۔ اور یہ ہیں سیّد نجم الہدیٰ عرف نجہ بھائی۔ حاضر جواب، بذلہ سنج۔ اور یہ قاضی عین الحق اور یہ قاضی ریاض الحق اور قاضی سراج الحق۔ اور یہ ہیں ہم سب کے محلے کے چودھری جناب قاضی سیّد ظہور الحق۔ ناٹے قد کے آدمی، بڑے ظریف طبیعت اور کھرا مزاج۔ اور یہ ہیں ہمارے مولوی سیّد عابد حسین صاحب...... موٹے لٹھے کا لمبا کرتہ، عنابی رنگی ہوئی مارکین کی لنگی، بڑی گھنی زلف پر سفید دوپلّی ٹوپی، ہاتھ میں موٹا اور لمبا عصا، غور سے سب کو دیکھ رہے ہیں...... غلام حیدر شبیر سپر گھمارہے ہیں...... ذرا سا چال میں سستی نظر آتی ہے۔ مولوی عابد حسین صاحب وہیں گرجتے ہیں......'' کیا بے حیدروا...... خالی دیکھنے ہی کو پہلوان بنا ہے۔ اتنا دھیرے دھیرے سپر گھمارہا ہے۔ تین ہی من کے بوجھ میں دَم پھول

رہا ہے......اس بڑھاپے میں بھی پانچ من کی سپر پھول کی طرح گھما کر رکھ دیں......(اور قاضی ظہور الحق صاحب کو مخاطب کرکے) کیا بے ظہورواکاجی پچھاک، کاجی بنا پھرتا ہے (غالبًا قاضی صاحب سے سالے بہنوئی کا رشتہ ہوتا تھا) تو بھی کھڑا تماشہ دیکھ رہا ہے......حرام زادے سال بھر بیٹھ کر کھاتے ہو، تین دن پسینہ بہانے سے گھبراتے ہو؟''......اور قاضی ظہور صاحب بھی بڑھاپے میں جوانی کی چمک پیدا کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے چھمک کر آگے بڑھے......
''ابے سالے مولبی (مولوی) تو بڑا سورما ہے تو بدن کیوں نہیں ہلاتا، خالی زبان ہلاتا ہے؟''......
''تو مجھے کیا سمجھتا ہے رے کاجی پچھاک...... لے رے صفوا (قاضی عین الحق، قاضی ظہور کے بڑے لڑکے) میرا ڈنڈا تو تھام'......اور مولوی صاحب کمر بند کس کر واقعی سپر کو پھول کی طرح گھمانے لگے۔

خوش رُو خوش چہرہ بچے بھی۔ خوش پوش خوش لباس جوان بھی۔ خوش وضع خوش مزاج بوڑھے بھی۔ ایک آواز......حسن حسین۔حسن حسین۔حسن حسین...... بولو بولو یارو...... بولو بولو عید گاہ کے جوانو!......حسن حسین۔ یا حسین۔ یا حسین......تین دنوں تک محلے محلے دھوم......سبز پوش بچے گردن میں نارہ اور بادلے کی بدھیاں گلے میں ڈالے جن میں سنہری اور روپہلی کلابتوں سے بنے ہوئے حسین نازک بٹوے جھول رہے ہیں......ان بٹوؤں میں بن دُھنیا (دھنیا، گری، چھوہارہ اور دوسرے میوہ جات اور مغزیات کا مرکب) بھرا ہوا۔ اکھاڑے اکھاڑے کھچڑی اور پلاؤ پک رہے ہیں۔ توشے کی روٹیاں بن رہی ہیں اور تقسیم ہو رہی ہیں۔ دودھ اور شکر کے شربتوں کی سبیل مٹی کے کوزوں میں چل رہی ہے۔ مرثیے پڑھے جا رہے ہیں......اکھاڑے جمع ہوئے ہیں۔ کھلاڑیوں کی بھیڑ ہے...... بانے کے ہاتھ پھیرے جا رہے ہیں...... پٹے گھمائے جا رہے ہیں......گدکوں کی پھٹا پھٹ ہو رہی ہے...... نیزہ بازی کے جوہر دکھائے جا رہے ہیں......کبھی رستم خانی ٹھاٹ چل رہی ہے۔ کبھی علی مردانی پینترہ دِکھایا جا رہا ہے۔ اُستادوں میں ڈاکٹر محمد اعظم، قاضی سراج الحق، سیّد نجم الہدیٰ اور اللہ رکھو میاں تلوار اور ڈھال کے ہاتھ شپاشپ چلا رہے ہیں۔ اور کبھی ان سب کے اُستاد گھسو خلیفہ علاقے کے مانے ہوئے تلوریئے اور بنوٹیئے، ان چاروں سے بیک وقت چومکھی لڑ رہے ہیں......گھسو خلیفہ بوڑھے آدمی ستر بہتر سال کی عمر، بھاری کسرتی بدن، سر منڈا ہوا، گیروئے رنگ میں رنگا ہوا کرتہ اور لنگی اور دو پلّی ٹوپی، گھنی داڑھی، چاروں چہیتے

شاگردوں کے درمیان بجلی کی طرح کودرہے ہیں ...... ’’لے رے اعظم یہ کنپٹی کا ہاتھ سنبھال ...... اللہ رکھو دیکھ یہ منگ بھری کا ہاتھ چلا ......سر جو دیکھ بھنڈارا سنبھال ......نجو دیکھ رے یہ جنیو کا ہاتھ ہے۔ دیکھ اس کمر تراش سے بچ‘‘ ......مگر استاد کے ہاتھ سے کوئی نہ بچ پاتا، اُن کی تلوار کبھی کنپٹی، کبھی پیشانی، کبھی سینے، کبھی پیٹ، کبھی کمر سے چھوکر بجلی کی طرح اُڑ جاتی اور سب دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے...... سب میں تیز قاضی سراج الحق تھے اور اُنھیں استاد مانتے بھی تھے۔ اُن پر استاد اور زیادہ وار کرتے، کبھی کبھی تابڑ توڑ تین چار وار اُنہی پر کر جاتے۔ اور سراج باوجود تیزی، پھرتی اور مہارت کے اُستاد کی ضربوں سے نہ بچ پاتے، تو گھسو خلیفہ غایت جوش اور غصّے کی کیفیت سے مغلوب ہوکر تلوار پھینک کر دو ہتھڑ سراج کی پیٹھ پر مارتے اور پھر تلوار لے کر اُچک کر دُور جا کھڑے ہوتے۔

اکھاڑے ہوں یا مجلسیں، عیدین کے میلے ہوں یا گھر کی تقریبات، جن کو دیکھو قدیم کلاسیکل روایات کی تصویر بنا ہوا ہے۔ شائستگی، متانت، رکھ رکھاؤ کا دامن کسی موقع پر کسی ماحول میں ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ ایک سطح ہے جو معیاری ہے، وہ سطح ہر حال میں قائم رہتی ہے۔ کوئی پروگرام ہو، کوئی نظام ہو، کہیں بھی کسی پہلو سے بھی عامیانہ پن داخل نہیں ہوتا۔ وہ خاص تہذیبی قدریں جو نسلوں سے زندگی کے ہر گوشے اور زاویے میں گہرا رنگ اختیار کر چکی تھیں وہ کسی حال میں ہلکی نہیں ہوتیں۔ وقار کی ایک سطح ہے جو ایک ساں قائم ہے۔

یہ ہلکی پھلکی بے جوڑ منتشر جو تصویریں دِکھائی گئیں، یہی وہ ماحول تھا، یہی وہ جمی جمائی دُنیا تھی جہاں زندگی کے بیس سال گزارے تھے۔ کلکتہ اور پٹنہ کے دورانِ قیام میں جسم دوسرے مشاغل میں رہتا، لیکن دل انہی تصویروں میں کھیلتا اور نگاہیں انہی کو ہر طرف ڈھونڈتیں اور جب اس ماحول میں واپس آتا اور ان شخصیتوں کے جھرمٹ میں دن گزرتے تو ان میں میری شخصیت، میرے کردار، میرے خیال، تصوّرات اور نظریات کی نشو و نما ہوتی۔ اسی ماحول میں میرا دل بنتا، میری نگاہ بنتی، میری زبان بنتی، میری تمنّاؤں، آرزوؤں، حسرتوں کو رنگ اور آہنگ اختیار کرنے کا موقع ملتا۔

تیلہاڑہ کا قیام انہی خوش رنگ اور خوش آہنگ فضا میں تیزی سے گزرنے لگتا۔ اور جب گھر سے کلکتہ یا پٹنہ آنے کا وقت قریب ہوتا تو گھر آتے ہوئے خوشی، ترنگ اور گدگداہٹ والی کیفیتوں کی بجائے غم کی اور گداز قلب کی دھیمی دھیمی آنچ شروع ہو جاتی اور میں غروبِ آفتاب سے پہلے

بستی سے متصل ایک مردہ ندی پر دَورِ مغلیہ کے تعمیر کردہ ایک شکستہ پل پر بیٹھ جاتا اور دیر تک شام کی خاموش اور سکوت آفریں فضا میں اپنے وجود کو گم کر دیتا اور کبھی غالبؔ کی غزلیں 'دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے'......اور......'ابنِ مریم ہوا کرے کوئی'...... گنگنایا کرتا اور آنکھوں سے بے ساختہ قطرے ڈھلکنے لگتے۔ میں لحن اور ترنم کا بچپن سے دلدادہ رہا مگر یہ عجیب کیفیت میری رہی اور کبھی کبھی اب بھی ہوتی ہے کہ کوئی موسم ہو، کوئی مقام ہو، کوئی موقع اور محل ہو جہاں کوئی چیز ترنم سے شروع کی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے۔ شام جب بھیگ جاتی تو خاموش آہستہ آہستہ پُل سے اُتر کر اپنے مکان سے متصل قاضی نصیر حسین ماموں کے باہر مردان خانے میں چوکی کے فرش پر لیٹ جاتا اور نصیر ماموں ہلکے ہلکے ترنم کے ساتھ اکثر مستورات کے گیت گنگنانا شروع کر دیتے:

آج شہانی ہے رات، چندا تم اُگیو......آج شہانی......

سہرے پر اُگیو مکنے پر اُگیو......آج شہانی ہے......

اور پھر مجھ سے کہتے...... ''ہاں کلیم ذرا سناؤ...... چھا رہی کالی گھٹا''......اور میں ان کے اصرار پر ذرا اُونچی آواز میں گنگنانے لگتا:

چھا رہی ہے کالی گھٹا جیا مورا لہرائے ہے

توری کوئلیا باوری تو کیوں ملہار گائے ہے

تیرے پی پی کرنے سے مجھ کو بھی پی یاد آئے ہے

اور میری آواز سن کر اندر سے نجو نانا (قاضی نذیر حسین) اور بشیر ماموں بھی اور چمرو نانا بھی لپکے ہوئے چلے آتے، جنھوں نے تیلہاڑہ میں پہلی مرتبہ ڈاک خانہ قائم ہونے پر یہ شعر کہا تھا جو تیلہاڑہ میں سب کو یاد ہو گیا تھا:

یکم فروری روز منگل سُدی کھلا ڈاک خانہ تیلہاڑہ میں جی

اور مکان سے متصل پن گھٹ پر آلو کے کھیت پٹاتے ہوئے جمعراتی میاں بھی چلے آتے اور قریب ہی سے رام کھلاون پاسی اور بادشاہی میاں سبزی فروش بھی، اور یہ سب پھاٹک پر ایک پاؤں زمین پر اور ایک پاؤں دہلیز پر رکھے سنتے رہتے۔

اِنہی دنوں دھوپ چھاؤں، سرور اور خمار، خوشی اور ملال کی فضاؤں میں زندگی گزرتی رہی۔

میں نے میٹریکولیشن بڑی امتیازی شان سے پاس کیا……جس وقت یہ خبر پٹنہ سے تیلہاڑہ پہنچی، والد صاحب سائبان میں حقہ پی رہے تھے۔فوراً بلایا اور چلم اُتار کر دی کہ تازہ تمباکو رکھ کر ٹکیے رکھو اور چلم پھونکو۔ یہ نہ سمجھو کہ بڑی امتیازی شان سے ڈگری لی ہے تو کچھ بن گئے ہو……نہیں یہ نہ سمجھو، بلکہ یہ سمجھو کہ ابھی تو مجھے چلم بھی تیار کرنی نہیں آتی۔کچھ ہی دن بعد والد صاحب سدھار گئے، میں پٹنہ کالج میں داخلہ لے کر کلاس بھی نہ کرسکا تھا اور ان کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد ۱۹۴۴ء میں مجھ سے چھوٹے بھائی علیم احمد کو دِق کا عارضہ ہوا اور ڈھائی سال جان توڑ کر اور جی بیچ کر علاج اور تیمارداری کی گئی، لیکن ۱۹۴۶ء کے ستمبر میں اس کا بھی انتقال ہو گیا……میری حالت بہت بگڑ گئی……مزاج میں بے حد خشکی اور چڑ چڑا پن پیدا ہو گیا۔ میں سب کو ساتھ لے کر ایک کرائے کے چھوٹے سے مکان میں پٹنہ چلا آیا……والدہ میری حالت دیکھ کر اپنا غم بھول گئیں۔ وہ سمجھانے بیٹھ جاتیں……''ارے کلیم! یہ تم کو کیا ہوا جا رہا ہے؟ بال بڑھے جا رہے ہیں…… کپڑے تیرے میلے رہتے ہیں۔ ہر دَم غصہ، ہر دم چڑ چڑ…… بیٹا بھائی کا غم کس کو نہیں ہووے ہے، لیکن ایسا مت بن بیٹا……اب تو سارا بوجھ تمھیں کو لینا ہے بیٹا……معصوم بہن کو دیکھ…… چھوٹے بھائی کو دیکھ……ہم کو دیکھ……تم ہی ایسے رہو گے تو کیسے کیا ہوگا بیٹا……ہم تیرے بڑے بھائی کا گھاؤ لے کے بیٹھے ہیں، تیری بڑی بہن کو جیتے جی گاڑ کر بیٹھے ہیں، تیرے باپ کو اللہ میاں کے یہاں بھیج کر بیٹھے ہیں……علیم بھی گیا۔کیا تو بھی جانا چاہے ہے؟……ہم تو تجھکو دیکھ دیکھ کر سُن ہوئے جا رہے ہیں……اب ہمارا سِن پٹنہ رہنے کا ہے؟ ماں باپ کی ڈیوڑھی چھوڑ کر یہاں بیٹھے ہیں…… دیکھو بیٹا! بقرعید کے دن قریب آ رہے ہیں ہم کو گھر جانا ہے۔ ہم بقرعید میں کبھی گھر سے باہر نہیں رہے ہیں، سب کی طرف سے قربانی کرنی ہے……تم اپنے کو سنبھالو بیٹا تاکہ ہم کو ڈھارس رہے'' …… یہ باتیں اکتوبر ۱۹۴۶ء کے آخر عشرہ میں ہو رہی ہیں۔عیدالاضحیٰ کی چاند رات کو دو چار دن باقی تھے، وہ چاہ رہی تھیں کہ چاند نظر آنے سے پہلے وہ تیلہاڑہ چلی جائیں تاکہ وہاں پہنچ کر کچھ انتظام کرسکیں۔

میں اُن کے تیلہاڑہ واپس جانے کے ذکر سے بہت گھبرایا۔وہ بھی چلی جائیں گی۔میری بہن بُنّی بھی چلی جائے گی تو پٹنہ میں کیسے رہوں گا؟…… میں نے اِس دُنیا میں ہر چیز سے پیار کیا……اپنے گھر کے لوگوں سے، اپنے اڑوس پڑوس کے لوگوں سے، اپنی بستی سے، اپنے ماحول

سے، اپنے اِردگرد کی ہواؤں سے، اپنی روایات سے، تہذیب سے، زندگی کی جانی پہچانی قدروں سے، اپنے گھر کے درو دیوار سے، چھتوں سے، زمین سے، آسمان سے۔ لیکن ان تمام پیاروں میں ماں مجھے سب سے زیادہ پیاری تھی۔ ماں نے اب سے پہلے بیٹا کہہ کر مجھے شاید ہی کبھی پکارا ہو۔ وہ ہمیشہ کلیم کہا کیں......نہ سر پر ہاتھ رکھ کر پیار کیا، نہ آغوش میں بھینچا، نہ پیشانی چومی...... پیار کی وہ تمام علامات جو اِس رشتے میں دیکھی جاتی ہیں، ان علامات اور اسلوبِ اظہار سے میری ماں کے پیار کو دُور کا بھی سروکار نہ تھا۔ بڑی رکھ رکھاؤ کی خاتون، بڑا وقار، بڑی وضع داری، بڑا تحمل، بڑا تقدس، بہت الگ تھلگ، لیے دیئے رہنے کا انداز، لیکن ان تمام صفتوں میں وہ کشش، وہ شیرینی، وہ نرمی اور گھلاوٹ، وہ دل کو گھلا دینے والی محبت کی تاثیر کبھی بابو بھیّا نہ کہا، ہمیشہ 'تو' اور 'تیں' کہہ کر بات کرنے کا انداز اور ہم لوگ 'امّاں' یا 'اماں جی' کہا کرتے، لیکن ہماری ان بولی میں اور اُن کی اس پکار میں اور اس پُروقار رکھ رکھاؤ میں دونوں جانب وہ شیفتگی، فریفتگی اور جاں سپاری تھی، جو دیکھنے میں تو کم آتی ہے سننے میں آتی ہے۔ میں جب گھر سے پٹنہ یا کلکتہ جاتا تو ماں کے باندھے ہوئے امام ضامن کے پیسوں کو ویسے ہی بندھا ہوا جیب میں رکھے رہتا...... ''یہ امّاں کی آنچل کا کپڑا ہے اور اُنہی کے ہاتھ سے باندھا ہوا ہے'' ......میں اُسے دن میں دو ایک بار جیب سے نکالتا، دیکھتا، چومتا اور پھر رکھ دیتا۔ اُن کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھجوروں، نمک پاروں اور حلوہ کا کچھ حصہ یونہی رکھے رکھے سڑا دیتا، بعد میں پھینک دیتا اور امام ضامن کے پیسے گھر دوبارہ آنے کے وقت ہی خیرات کرتا...... یہ دیوانگی کی باتیں ہیں، بے عقلی کی باتیں، مگر یہی دیوانگی اور بے عقلی کی باتیں اب مجھے ہوشیار بنا رہی ہیں اور عقل سکھا رہی ہیں...... مجھے ماں سے جو محبت تھی وہ ایک یادگار محبت ہے۔ آج وہ مجھ سے جدا ہیں، ستائیس سال ان کی جدائی کو ہو گئے، لیکن میں آج بھی اُنھیں ویسے ہی دیکھ رہا ہوں، پہچان رہا ہوں، اُن کی آواز سن رہا ہوں، اُن کی قربت محسوس کر رہا ہوں۔ ان کی صورت اور سیرت کے تمام خدوخال میرے حواس، شعور اور تصوّر میں ویسے ہی زندہ اور تروتازہ ہیں جیسے وہ ستائیس سال پہلے تھے۔

۲۶/اکتوبر ۱۹۴۶ء کو آخروہ گھر واپس جانے کو تیار ہو گئیں، یہ ذیقعدہ کی ۲۹ تھی اور دوسرے دن سے بقر عید کی تاریخ شروع ہونے والی تھی اور وہ اس دن یعنی یکم ذی الحجہ کو گھر میں موجود رہنا چاہتی تھیں۔ ۲۶/اکتوبر ۱۹۴۶ء مطابق ۲۹/ذیقعدہ ۱۳۶۵ھ یہ میری زندگی کی ایک تاریخ ہے،

اس تاریخ سے آج تک کتنی تاریخیں آئیں اور گزر گئیں، آفتاب طلوع ہوئے اور غروب ہوئے، صبحیں آئیں اور شامیں ہوئیں، دن آئے اور گزرے، مہینے آئے اور چلے گئے۔ سال بدلے، موسم بدلے، زمانے بدلے اور صدیاں آئیں گی اور گزر جائیں گی، لیکن دل کے کیلنڈر پر تاریخ کا یہ صفحہ ستائیس سال سے ویسے ہی لٹک رہا ہے...... ۲۶ر کی صبح ہوئی اور وہ اور میری پیاری بہن بُنّی جانے کو تیار ہوئیں۔ تھراتے ہوئے ہاتھوں سے اُنھوں نے برقعہ پہنا...... وہ رو نہیں رہی تھیں لیکن آنکھوں میں چمکتا ہوا پانی، ہلکے ہلکے جنبش کرتے ہوئے ہونٹ، بار بار جھپکتی ہوئی پلکیں، لرزتی ہوئی اُنگلیاں اُس آتش فشاں کا پتہ دے رہی تھیں جسے ضبط وتحمل کے برف سے ڈھانکنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ وہ میرے ساتھ بگھی پر بیٹھیں۔ میرے ایک ہاتھ کی اُنگلی بہن نے تھامی دوسرے ہاتھ کی اُنگلی امّاں نے تھامی، جیسے اُنھیں ڈر ہو کہ اُن سے مجھے کوئی چھین لے گا...... دونوں بار بار میرا منہ دیکھتی تھیں اور گم سم تھیں، ہم لوگ پٹنہ جنکشن اسٹیشن پر آئے۔ پلیٹ فارم پر پہنچے...... یہاں دونوں میں سے کوئی بھی رونا ضبط نہ کر سکا۔ بہن زور سے رو پڑی، ماں پر بھی رقت طاری ہوئی حالانکہ رونے کی بظاہر کوئی خاص وجہ نہ تھی، لیکن انھیں ایک درجہ ملنے والا تھا، اللہ نے اُنھیں شہادت کے لیے قبول کیا تھا، وہ قتل گاہ کی طرف جاری تھیں، ان کے دل کے پردے اُٹھ گئے تھے، کثافت دُور ہو چکی تھی، لطافت اور رقت غالب تھی لیکن میں اُس وقت یہ سب کیا جانتا۔ مجھے ان کے جانے کا غم بیشک بہت تھا لیکن ایک حد تک رنج بھی تھا، یہ لوگ کیوں جا رہی ہیں، کیا قربانی یہاں نہیں ہو سکتی ہے؟ مجھے کیا خبر کہ مشیت نے کیا فیصلہ کیا ہے، یہ قربانی کرنے کو نہیں قربانی ہونے کو جا رہی ہیں...... لیکن اُس روز کے بعد سے اُس وقت کا منظر جس وقت یاد کرتا ہوں تو آنسو نہیں تھمتے، اور اس وقت بھی جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں دونوں صورتیں میرے سامنے ہیں، ستائیس سال بعد بھی ان میں سے کوئی بوڑھی نہیں ہوئیں، دونوں کے خط وخال وہی پیش نظر ہیں...... وہ صورتیں جو کیفیت دل میں اس وقت پیدا کر رہی ہیں اور ان آنسوؤں میں جو لذت مجھے مل رہی ہے، یہ میری زندگی یہی میری جان یہی میرا فن ہے۔ اسی کی رعنائی اور تازگی ہے۔ اس کی لذّت، اس کی قیمت میں ہی جانتا ہوں۔:

میرے غم کی قدر و قیمت کوئی میرے دل سے پوچھے
یہ چراغ وہ ہے جس سے میرے گھر میں ہے اُجالا

اسے کوئی خرید نہیں سکتا، اس کی قیمت کوئی دے نہیں سکتا، دے تب بھی لے نہیں سکتا۔ اسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ کوئی دولت، کوئی طاقت، کوئی سانحہ، کوئی انقلاب، کوئی حادثہ اس کی جگہ لے نہیں سکتا:

ترا درد اتنا بڑا حادثہ ہے
کہ ہر حادثہ بھول جانا پڑے ہے

گاڑی آئی اور روانہ ہوئی، دُور تک ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ماں کا نصف کھلا ہوا چہرہ کروٹ کے بل کھڑکی سے باہر تھا...... بہن دونوں ہتھیلیاں کھڑکی پر ٹیکے پوری گردن نکالے اِدھر دیکھ رہی تھی...... وہ دونوں ہی رو رہی تھیں اس لیے کہ اُنھیں پھر رونا نہیں تھا۔ میں خاموش...... کچھ غم کچھ غصہ میں خاموش تھا اس لیے مجھے پھر عمر بھر رونا تھا:

میرے لیے قیدِ سحر و شام نہیں ہے
روتا ہوں کہ رونے کے سوا کام نہیں ہے

۲۶؍اکتوبر کو وہ دونوں گئیں اور ۲۸؍کو خبر ملی کہ چھپرہ میں فساد ہو گیا ہے...... اور پھر وحشت ناک خبروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ آخر ۴؍نومبر کو کسی طرح سے یہ خبر آئی کہ تیلہاڑہ ۳؍نومبر سے محاصرے میں ہے، دس ہزار کے مسلح مجمع نے ۳؍کے سہ پہر سے حملہ کر دیا ہے۔ یہ خبر سننا تھا کہ شروع یادداشت سے ۲۶؍اکتوبر کی صبح تک کا منظر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا...... وہ تمام تصویریں جو شعور کے آئینہ خانہ میں آویزاں تھیں، وہ تمام جلوے، وہ تمام مناظر...... وہ کتابِ گل ولالہ و بیاضِ گلشن...... وہ گلیاں، وہ کوچے، وہ صحن، وہ مکانات، وہ خلوتیں، وہ انجمنیں، وہ تمام اہلِ انجمن، وہ تمام نسرین و یاسمن، وہ تمام نرگس و نسترن، وہ تمام گل بوٹے، وہ تمام شاخیں، وہ تمام ڈالیاں سنیما کے پردوں کی طرح تیزی سے سامنے آنے لگیں:

جانے اُس انجمنِ شوق کا کیا نقشہ ہے
نہ وہاں سے کوئی آتا ہے نہ ہم جاتے ہیں

دل میں پنکھے لگ گئے۔ میں اور میرے دو ایک عزیز ۴؍نومبر کی دوپہر سے رات گئے تک اور پھر ۵؍نومبر کی صبح سے سہ پہر تک مختلف آستانۂ ناز کی خاک چھانتے رہے۔ ۵؍ستمبر کی صبح سے بالخصوص ایک معزز ذمہ دار ڈاکٹر صاحب جو اُس وقت پورے صوبے کے نظم و نسق کے ذمہ دار

تھے، کے درِ دولت پر ایک پاؤں پر کھڑے رہے، کہاں کی بھوک اور کہاں کی پیاس۔ دل ہی کی حالت دگرگوں تھی، چہرے کا کیا پوچھنا...... بار بار درخواست پیش کر رہا ہوں ”حضور کوئی سامان کر دیجیے...... ایک دو ٹرک مل جائے تھوڑے سے محافظ...... کچھ مدد کیجیے“ ...... ”ارے میاں سوچنے دو...... کیا پریشان کر رکھا ہے...... میں کیا کر سکتا ہوں؟“ ان کے ملنے والے آتے رہے، مزاج پرسی ہوتی رہی، گھر کے حال احوال کہے اور سنے جاتے رہے۔ رات کے کھانے کی تفصیل، صبح کے ناشتے کی تفصیل، بچے کے ختنے کی بات، مفلر خریدنے اور گرم شیروانی سلوانے کی بات اور درزی کی سلائی بٹن کی قیمت کی بات اور فلاں صاحب کے یہاں رات کو ولیمے کی دعوت کی بات اور دسترخوان کی لمبی تفصیل مرغ مسلّم قورمہ، مچھلی کے کباب کی بات، وہ تمام باتیں جو ڈرائنگ روم میں کی جاتی ہیں کی جا رہی تھیں اور اُسی ڈرائنگ روم کے دروازے کے پاس کچھ بھوکے پیاسے غمزدے جن کے نہ دل ٹھکانے تھے نہ دماغ، ایک پاؤں پر کھڑے دیوانوں کی طرح منہ دیکھ رہے ہیں...... ”حضور!...... ڈاکٹر صاحب! بہت دیر ہو رہی ہے...... ڈاکٹر صاحب کچھ انتظام فرما دیجیے“ ...... ”ٹھہریئے صاحب...... آپ لوگ تو بالکل جان ہی کھا رہے ہیں۔ ٹھکانے سے بات بھی کرنے نہیں دیتے...... ہاں بھائی تو بریانی بڑی روغن دار تھی......ایں؟“ ...... ”کیا کہوں بھائی صاحب! دو بار صابن سے ہاتھ دھوئے مگر رومال دیکھئے (جیب سے رومال نکال کر) کتنا روغن رومال میں موجود ہے“ ...... ”حضور...... ڈاکٹر صاحب! اب تو دوپہر گزر رہی ہے، خدا جانے وہاں کیا عالم ہو رہا ہوگا، نہ جانے لوگ کس حال میں ہیں...... ذرا رحم فرمایئے ڈاکٹر صاحب“ ...... ”اوہ! ارے بھائی کوئی ہے؟ ذرا آئی جی صاحب کو ٹیلی فون پر بلاؤ...... ہاں جناب تو آپ نے خوب مرغ کی ٹانگ توڑی اور خوب بریانی اُڑائی...... (مہمان کے ساتھ کے بچے سے مخاطب ہو کر) میاں! آپ نے بھی خوب کھائی ہماری یاد نہیں آئی؟ برخوردار! تھوڑی ہمارے لیے بھی لے آتے ...... اچھا عزیزم خوش رہو، آئندہ ایسے موقعوں پر ہمیں نہ بھولنا...... ہاہاہاہا...... بڑا پیارا بچہ ہے...... اللہ حیات میں ترقی عطا فرمائے“ ...... دوپہر سے تین بج گئے، آئی جی صاحب سے فون پر بات ہوئی۔ ایک ٹرک اور چھ ملٹری کا انتظام ہوا...... ہم لوگ اُن کے بنگلے سے نکل کر ٹرک پر بیٹھ رہے ہیں کہ دو تین گاڑیاں اور ٹرک سامنے آ کر رُکیں۔ ان پر سے کچھ مسلم کچھ غیر مسلم لوگ اُترے۔ میرے ساتھیوں میں سے ایک صاحب اُدھر بڑھے......اور

ایک صاحب سے مخاطب ہوکر بے قراری سے پوچھا ’’کہاں سے آ رہے ہو محبوب صاحب؟‘‘ (محبوب احمد سابق لیفٹیننٹ آئی این اے، سبھاش بوس بریگیڈ)۔ ’’ہم لوگ تو تیلہاڑہ جا رہے ہیں، ایک ٹرک اور چھ ملٹری کا نظم ہوا ہے‘‘......محبوب صاحب نے ایک آہ کی ’’آہ! اب تیلہاڑہ میں کیا رکھا ہے؟ وہیں سے آ رہا ہوں۔ میرا اور میرے ساتھیوں کے کپڑے دیکھو (تمام خون کے داغ تھے) لاشوں کو ٹھکانے لگا کر آ رہا ہوں......بستی ختم ہوگئی......تمام مکانات جل گئے...... سب لوگ شہید ہوگئے۔‘‘

میرے ساتھ اور لوگوں کا کیا حال ہوا مجھے یاد نہیں، خود مجھے اپنے حال کی خبر نہیں۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ میں ایک دیوانگی کے عالم میں چیختا ہوا ڈاکٹر صاحب کے بنگلے کی طرف پھر واپس دوڑا...... ’’ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب!! ڈاکٹر صاحب!!! آیئے...... اپنے مہمانوں کو بھی ساتھ لایئے۔ اُن کے رومال کا روغن دیکھا......اِن کے دامنوں کا بھی روغن دیکھئے...... کچھ اور لوگ بھی دعوتوں سے آئے ہیں...... ڈاکٹر صاحب! اس دعوت میں شریک نہ ہونے کا آپ کو عمر بھر افسوس رہے گا۔ کیا دسترخوان تھا ڈاکٹر صاحب۔ اتنا وسیع دسترخوان کہاں بچھ سکتا ہے ڈاکٹر صاحب......سینکڑوں مرغ مسلّم ڈاکٹر صاحب!......ارے ڈاکٹر صاحب آپ کی اداؤں پر تو برات کی برات قربان ہوگئی......ڈاکٹر صاحب! اب اپنی شیروانی بڑے ناز سے پہنئے گا اور پہن کر آئینے میں ذرا اپنی سج دھج دیکھئے گا جس کا ہر ٹانکہ ایک سسکتا ہوا دل ہے، جس کا ہر بخیہ ایک روتی ہوئی آنکھ ہے......اس کی تراش خراش میں کتنی صراحی دار گردنوں کا خم شامل کیا گیا ہے، اس کا ایک ایک دھاگا کتنی شہ رگوں سے بنایا گیا ہے...... ڈاکٹر صاحب! یہ شیروانی پہننے سے زیادہ کسی آئینہ خانے میں سجانے کے قابل ہے، کہ قیامت تک زیارت گہِ خاص وعام رہے۔‘‘

دوسرے دن ملٹری ٹرک سے کچھ بچے کھچے زخمیوں کا قافلہ آیا۔ ڈاکٹر اعظم صاحب، قاضی سراج الحق صاحب پھلکیت تھے، بہت کم زخمی تھے۔ قاضی نصیر حسین صاحب کا سرخ وسفید گول بدن پہچانا نہیں جاتا تھا......اور لوگ؟ چند زخمی بزرگ اور جوان...... کچھ بے حد زخمی مستورات، دو ایک نیم مُردہ بچیاں......اور لوگ؟

محفل محفل ڈھونڈ رہے ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے ہم

اپنی پھٹی ہوئی آنکھوں، دھونکتے ہوئے سینے کے ساتھ کیمپوں میں......اسپتال میں مارا مارا

پھرتا رہا...... زخمیوں پر دیوانہ وار گرتا رہا، دوڑتا رہا...... آواز دیتا رہا...... ''اماں !...... اماں !!...... بنّی !...... رشیدہ !!'' کہیں کہیں کوئی پہچانی صورت نظر آجاتی ...... ''کون درگاہن خالہ؟'' ...... خون میں لتھڑی ہوئی۔ ''ہاں کلیم میں ہوں'' ...... ''اور حسنیٰ خالہ؟...... چندا نانی؟ قسیمن نانی؟ اور بتاؤ درگاہن خالہ...... میری امّاں؟...... اور بُنّی ؟...... رشیدہ؟ ...... کوئی نہیں؟ کوئی نہیں؟ کوئی نہیں؟...... کوئی نہیں؟''

مجھے یاد نہیں کیمپ اسپتال سے مجھے کون لایا۔ دو روز تک نیم بیہوشی کے عالم میں رہا۔ تیسرے روز کیمپ میں بات چل رہی تھی...... کہ امّت بو بو (میری ماں کا نام) اور بُنّی رشیدہ کہیں کمرے میں چھپی ہوئی ہیں، پوشیدہ ہیں۔ تیسرے ہی روز میں اور میرے بہنوئی اکرام الحق مرحوم ایک ٹرک پر کچھ مدراسی فوجیوں کے ساتھ تیلہاڑہ بستی گئے۔ ٹرک پر کچھ نرم گدے، کچھ برتنوں میں دُودھ شکر رکھ لیے گئے۔

بستی میں سب سے پہلے سنگی جامع مسجد ملتی ہے...... آبادی سے کنارے ایک بلند مقام پر بہت دُور سے نظر آتی ہے...... دُور ہی سے ایسا معلوم ہوا کہ مسجد کچھ کہہ رہی ہے۔ اُس کا ایک حزن جلال آمیز، ایک اندوہ وقار آمیز، ایک پُرشکوہ افسردگی ...... مسجد کا انداز ایک تھکے ہوئے زخموں سے چور جھومتے ہوئے مجاہد کا سا تھا۔ جنگ میں سینہ سپر ہوکر لڑا ہوا مجاہد، ساتھیوں کی لاشوں کے درمیان تلوار ٹیکے گر کر مرنے پر آمادہ نہیں ...... مسجد کا دروازہ سینے کے زخم کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اور وہ تمام علامات اور نشانیاں اس کے درودیوار سے نمایاں ہو رہی تھیں جو سہ روزہ تصادم اور کشمکش کی زندہ تصویریں تھیں۔

۵؍نومبر مطابق ۱۰؍ذی الحجہ جس وقت دوگانۂ عید الاضحیٰ پڑھی جاتی ہے، نو بجے صبح اُس حادثۂ عظیم کا اختتام ہوا جسے اِس دُنیا میں صبح و شام یاد کرنے والا شاید میرے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے...... جیسے جیسے ہم لوگ مسجد کے قریب گئے، ایسا معلوم ہوا جیسے مسجد پکار رہی ہو:

''آنے والو سنبھل کر آئیو۔ دیکھ کر آئیو...... یہ وادیِ مقدس ہے...... اپنے جوتے اُتار کر آؤ...... احترام سے آؤ...... سر جھکائے ہوئے آؤ، سلام کرتے ہوئے آؤ...... بلکہ نہ آؤ۔

آہستہ خرام بلکہ مخرام زیرِ قدمت ہزار جانست

کیوں آتے ہو؟...... کیا دیکھنا چاہتے ہو؟ اب کیا دیکھو گے...... کون تمھیں دِکھائے گا، کون تمھیں بتائے گا...... وہیں کھڑے رہو...... وہیں سے سنو...... میں بتاؤں گی۔

ہوشیاروں کو نہیں معلوم رازِ فصلِ گل
مجھ سے پوچھو میں اسی موسم میں دیوانہ بنا

میری پتھر کی دیواروں میں شرارے رقصاں ہیں...... میرے پتھریلے سینے میں دھڑکتا ہوا دل ہے۔ یہ محرابیں ابرو ہیں، یہ طاق آنکھیں ہیں...... میں تمھیں وہ زبان دوں گی جو تم آئندہ بولو گے، وہ خیال دوں گی جو تم آئندہ سوچو گے، میں جو کہوں گی وہ تم سمجھو گے پھر تم اوروں کو سمجھا لینا۔ لیکن تم بھی کیا سمجھو گے اور کتنا سمجھاؤ گے:

ادا کیونکر کریں گے چند آنسو دل کا افسانہ　　　　بہت دشوار ہے جتنا سمجھنا اتنا سمجھانا

میں نے تین دن، تین راتیں، تین صبحیں، تین شامیں تڑپتے اور کراہتے گزاری ہیں...... ان کراہوں کو تم سمجھو گے، ان سے تم استعارے بناؤ گے...... میں کبھی تنہا نہیں رہی تھی۔ میرا پہلو ہمیشہ آباد رہا تھا...... لیکن تین دنوں تک میرے قریب کوئی نہ آسکا...... اس بلندی سے میری دیواریں پکارتی رہیں۔ میرے مینارے چیختے رہے...... لیکن تین دنوں تک میری مجلس گرمانے والے اور ہی گرمیِ بازار میں مصروف تھے۔ میرے ہم نشیں تین روز تک ایک ایسی عبادت، ایک ایسی نماز میں مشغول رہے جس نے اُنھیں تمام عبادتوں اور نمازوں سے ہمیشہ کے لیے فارغ کردیا۔ تین روز تک میدانِ وفا گرم رہا۔ تین روز تک گردن و سر میں راز و نیاز ہوتے رہے۔ دیکھو...... بالکل میرے قریب ہی سے سرحدِ عشق شروع ہوتی ہے، یہیں سے امتحان گاہِ وفا کی راہ نکلتی ہے...... دیکھو میرے دروازے سے ہی دیکھتے چلو، تصویریں لیتے چلو اور اپنے دل کے آئینہ خانے کو سجاتے چلو...... دیکھو ٹھیک چوکھٹ کے قریب شاہ عبدالحفیظ ہیں، وہی جو ہمیشہ میرے سامنے اگلی صف میں رہا کرتا تھا۔ اس وقت بھی اُسے صفِ اوّلیں ہی میں پاؤ گے...... وہ بھاگتا ہوا میری آغوش میں آرہا تھا، چوکھٹ پر قدم رکھا ہی تھا کہ شمشیرِ نازِ معشوقانہ کرتی ہوئی پیشانی چوم گئی۔ وہیں چار زانو بیٹھ گیا اور جھومتا رہا...... اور اس کے قریب ہی معین الدین حیدر ہیں۔ یہ دونوں دیوانے ساتھ ساتھ رہے اور ساتھ ساتھ ہیں...... ذرا اور آگے بڑھو تو دیوار سے متصل میرا امام سیّد اطہر حسین ہے اور اس کے بالکل قریب ہی اس کا بڑا بھائی واعظ الحق۔ تم ان دونوں کی محبت بھی جانتے تھے، محبت ہی کے لیے جان دے دی...... یہ سب کشتگانِ عشق ہیں، مر کر زندہ ہوگئے ہیں...... آگے بڑھو...... ذرا سنبھل کر بڑھیو، ورنہ کتنے سروں سے ٹکراؤ گے، کتنے بازوؤں

سے ٹھوکر کھاؤ گے، کتنے گیسوؤں سے اُلجھو گے، کتنے سینوں پر تمھارا پاؤں پڑ جائے گا...... دیکھو یہ کون ہیں؟ ......داروغہ محمد یوسف۔ دفتر کے باہر کبھی وردی نہ پہنی، کھدّر اوڑھنا، کھدّر بچھونا۔ کھدّر کا پاجامہ کھدّر کا کرتہ، کھدّر کی ٹوپی، کھدّر کا کوٹ، بانس کی چھڑی، کبھی پیشانی پر بل نہ تھا، ریٹائرڈ ہو کر گھر بسنے آئے تھے، بستے ہی گھر بھر کو اُجڑوا گئے۔ دیکھو اسی کھدّر میں لپٹے پڑے ہیں، کھدّر ہی کا کفن ملا۔ ایسے وضع دار لوگ کم ہوں گے......اور دوسرے کھدّر پوش کو پہچانو...... پہچانتے ہو؟ ......نہیں پہچانتے۔ ارے میاں ذرا چہرے سے ان کی کھدّر کی آستین ہٹاؤ...... یہ ہمیشہ چہرے پر یوں ہی آستین رکھ کر سوئے تھے، آخری نیند میں بھی اُسی انداز سے پڑے ہیں...... ارے یہ ہیں تمھارے مفتی عبدالحفیظ نانا...... کم گفتار، تیز رفتار، کھدّر کی شیروانی، کھدّر کی پچّخ ٹوپی، ٹوٹی چپّل ...... یہ ہمیشہ سب سے پہلے مسجد میں آتے اور سب سے آخر میں جاتے تھے...... میرا بڑا پرانا یار تھا مگر بڑا بے وفا نکلا......دو بات بھی نہ کی، رُوٹھا پڑا ہے......دیکھو یہ تمھارے محمد و نانا ہیں...... اِس عمر میں شہادت لکھی تھی ......اور یہ دیکھو تمھارے ظہور نانا ہیں......اور ان کی بغل میں دیکھو وہی ہیں جو قاضی صاحب کو پیار سے 'کاجی پھچاک' کہا کرتے تھے، مر کر بھی پیار کا ثبوت دیا، بغل بغل ہی میں دونوں پڑے ہیں ...... یہ سب عاشقانِ ناز تھے......اِس عمر میں بھی ان کے شوق کا عالم کیا بتاؤں، قاتل کی تلوار سے یوں لپک لپک کر گلے مل رہے تھے جیسے کوئی محبوب ملتا ہے:

لپٹ لپٹ کے گلے مل رہے تھے خنجر سے

بڑے غضب کا کلیجہ تھا مرنے والوں کا

میں دیکھتی رہی اور تلوار کی قسمت پر رشک کرتی رہی۔ یہ سب میرے محبوب تھے...... میرے عاشقانِ ناز تھے...... میں نے انھیں شعورِ عشق دیا تھا، ان کے جذبۂ شوق کی پرورش اور نشو و نما میری آغوشِ تربیت میں ہوئی تھی ...... یہ میری خلوت و جلوت کے راز دار تھے اور میرے بڑے ناز بردار......اور یہ دیکھو یہ قمر العرب ہیں...... کم گو، کم سخن، کم آواز ......اس کی سیاہ داڑھی پر ترکی ٹوپی مجھے بڑی پیاری لگتی تھی......اور ان کی بغل میں دیکھو......نہیں پہچانتے؟ ارے میاں تم تو بڑے طوطا چشم ہو، صبح و شام کے اپنے ہم نشیں کو نہیں پہچانتے؟ کیا ذرا کروٹ پڑے رہنے سے، چہرہ ذرا اوجھل کرنے سے پردہ داری ہو گئی؟ ارے پاؤں کی طرف دیکھو۔ کیا سفید کینواس کا باٹا شو نہیں پہچانتے؟ ارے سر دیکھو...... سنگر ہار کے پھول اور گھنگھریالے بال!...... بس تڑپ

گئے نا، نیم بسمل ہو گئے نا؟...... شاہ دمو...... شاہ بدرالدین...... دمڑ شاہ۔ اِک اِک میاں کے تین تین نام...... جو نام بھی لو...... یا کوئی نام نہ لو۔ اب ان کو صرف سنگر ہار کے پھولوں والے کہا کرو...... یہ لونڈا بھی میرا عاشقِ زار ہی تھا، پھدکتا ہوا ہر جمعہ کو میرے پاس آتا تھا۔ یہ سب میرے چشم و ابرو کے دلدادہ تھے۔ زندہ بھی میرے قریب رہے اور جان بھی میرے آستانۂ ناز پر ہی دی...... بڑے وضع دار تھے، وفا پر مٹنے والے...... قاتل کی تلوار تو تین روز سے پیچھا کرتی تھی لیکن آخری سجدہ تو اُنھیں میرے ہی قدموں پر کرنا تھا، تیغِ قاتل کو بھی اِن کی نازبرداری کرنی پڑی...... تین روز تک انتظار کرنا ہی پڑا...... یہ سب میرے قدموں میں پڑے ہیں۔ اِن کی عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ گیا۔

اچھا اب ذرا آگے بڑھو...... مگر...... سہمے سہمے بڑھو، دل کو تھامے بڑھو...... ہوش کھونا نہیں لڑکھڑانا نہیں...... دیکھو اس مکان کو پہچانتے ہو؟...... وہ مرد بذلہ سنج، حاضر جواب، زندہ دل، مجلس آرا، صاحبِ کیف و حال ماسٹر یعقوب۔ وہ ستّر سال کا بوڑھا جس نے سر دیا مگر کسی کے ہاتھ پر ہاتھ نہیں دیا۔ پورے کنبے کے ساتھ...... جان دے دی مگر آہ نہ کی...... آگے بڑھو، سرسری اس جہان سے مت گزرو۔ یہاں ہر قدم پر اِک جہانِ دیگر ملے گا...... آگے بڑھو...... دیکھو یہ کیا ہے......؟ پہچانتے ہو یہ کس رشکِ مسیحا کا مکان ہے؟ آہ مکان کہاں ہے:

غبارِ کارواں سے کارواں کو ہم نے پہچانا
جہاں تھی شمع روشن اُڑ رہی ہے خاکِ پروانہ

درودیوار سے بھی نہ پہچان سکو گے۔ لیکن پہچاننے کی کوشش کرو...... دیکھو سخیا کی آواز آ رہی ہے:

مرغ دل مت رو یہاں آنسو بہانا ہے منع

اور وہ دیکھو ایک سریلی آواز اور گونجی:

آرزو ہے وفا کرے کوئی　　　ہم کو چاہے خدا کرے کوئی

آہ حفیظؔ بھائی...... ہاں...... دیکھو یہ وہی مکان ہے جس میں تمھاری اکثر شامیں گزرتی تھیں...... سخیا کی آواز، بہادر شاہ کی غزلیں، شاعرانہ مباحثے، علمی مذاکرے، ماسٹر یعقوب صاحب کے چٹکلے، معین الدین حیدر کے لطیفے...... یہی وہ مکان ہے جس میں تین روز تک بیسویں صدی کے کربلا کا میدان گرم رہا...... تمام بستی کے لوگ جمع تھے۔ بوڑھے، جوان، بچے، بچیاں...... کنواری

دوشیزائیں، جوان بیبیاں، بوڑھی عورتیں، کچھ بستی کے تلور یئے بھی تھے اور بنوٹئے بھی، لڑنتئے بھی، بیمار بھی، قوی بھی، ناتواں بھی، رِند بلاخوار بھی اور زاہدِ شب زندہ دار بھی، اپنے اعمال پر ناز کرنے والے بھی اور بے عملی پر رونے والے بھی، یہاں سب ایک ہو گئے تھے...... تین دن تک بے آب ودانہ...... دوسرے دن سے تو واقعی نہ دانہ تھا نہ پانی...... کربلا میں اہلِ بیتِ امام پر تین روز تک دانہ پانی بند تھا...... وہ محرم الحرام کے عشرۂ اوّل کے آخری تین دن تھے اور یہاں ذی الحجہ کے عشرۂ اوّل کے آخری تین دن۔ وہاں بھی یزید کا حکم تھا کہ...... ''بشر پئیں جواں پئیں چرند پئیں پرند پئیں، کتےّ بھی گر پئیں تو نہ تم منع کیجیو، اِک فاطمہ کے لال کو پانی نہ دیجیو'' ...... یہاں بھی تلواروں اور برچھیوں کی باندھ باندھ دی گئی تھی۔ پہلے دن تو کچھ بچا کھچا چلا۔ اُسی شام سے فاقہ شروع ہوا اور تین دن تک اُسی تشنگی اور گرسنگی کے عالم میں بہادروں نے تلواروں کو ہاتھوں پر روکا، گولیوں کو سینے پر لیا، ڈھیر ہو گئے لیکن سیر نہیں ہوئے، ٹوٹ گئے لیکن مڑے نہیں ...... اِسی مکان میں تمھارا حسیب ...... ارے وہی...... ''شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے، ترکی ٹوپی، سیاہ بوٹ، شیروانی کا بٹن ہاتھ میں تھامے ہوئے!'' ...... جب پیٹ میں بھالا لگا تو بھالے کی لکڑی ہاتھوں سے پکڑی اور زور سے بولے...... ''بھیّا (شاہ عبدالحفیظ) بھاگ جایئے بھیّا...... نکل جایئے بھیّا...... مجھ کو یہیں چھوڑیئے بھیّا...... السلام علیکم...... اور تمھارے حفیظ بھائی کی وہ نازک کمسن بچیاں شکیلہ، نور جہاں ...... یاد ہیں؟ تمھیں تشتری میں امّاں سے مانگ کر حلوا کھلایا کرتی تھیں؟ وہ اور اُن کی ہم عمر نہ جانے کتنی بچیاں ...... آخر دن جب سارے محاذ ٹوٹ گئے، دیواریں گرا دی گئیں، چاروں طرف آگ لگا دی گئی، بچاؤ کی کوئی صورت نہ رہی تو کمسن بچیاں اپنی ماؤں کے اشارے پر تیمّم کر کے قطار سے رحلوں پر قرآن رکھ کر بیٹھ گئیں اور جھوم جھوم کر تلاوت کرنے لگیں...... کمسن آنکھوں کی ننھی بوندوں کو دوپٹے سے پونچھنے کی ضرورت نہ تھی، تلواروں والے اور برچھوں والے آئے اور ایک سلسلہ سے...... اور قرآن پڑھنے والیاں مالکِ قرآن کے آگے قرآن پر ہی ہمیشہ کے لیے سجدہ ریز ہو گئیں...... وہ تمھاری پھکیت لڑنتیہ سراج الحق...... بھوک پیاس میں تین روز ڈٹا رہا۔ جب آخری ہلّہ آیا ایک ضرب ایسی لگی کہ گرا...... لوگ تلواریں اور برچھے لے کر ٹوٹ پڑے...... سراج کی بیوی اور سراج کی بھاوج سراج پر یوں گر پڑیں کہ خود کو ترشوا دیا اور اُسے بچالیا:

اے عشق! مل سکیں گے نہ ہم جیسے سر پھرے
برسوں چراغ لے کے زمانہ اگر پھرے

چلو آگے بڑھو...... چلتے رہو...... وقت کم ہے، نمائش گاہ بڑی ہے۔ ٹھہرنے کا مقام کہیں نہیں۔ ٹھہروگے تو پاگل ہو جاؤگے۔ میں اِس بلند مقام سے اپنے میناروں کی نگاہوں سے سب دیکھتی رہی ہوں اور تڑپتی رہی ہوں اور کبھی جھومتی رہی ہوں۔ تڑپنا درد سے تھا اور جھومنا فخر سے...... میں پہلے پتھر نہ تھی، اب پتھر ہوگئی ہوں۔ میرے سینے پر سب نقش کالحجر ہے۔ موسم آئیں گے جائیں گے، طوفان آئیں گے گزر جائیں گے، نسلیں پیدا ہوں گی اور مٹ جائیں گی، لیکن میں اپنے سینے پر یہ موتی سجائے کھڑی رہوں گی۔ تم محبت سے دیکھو گے اور لوگ حیرت سے دیکھیں گے۔ کوئی نفرت سے دیکھے گا، لیکن محبت، حیرت، نفرت یہ موسمی پھول ہیں، فنا ہو جائیں گے۔ میرے سینے کے پھول لافانی ہیں...... آگے بڑھو، دیکھو یہ تمھارے ظفر امام بھائی کا مکان ہے۔ وہ وضع دار، خوش رُو، جامہ زیب غالبؔ کی مجسم غزل، غالبؔ کی غزل کا رسیا...... زخموں سے چور چور اپنی چہیتی کنواری ہنس مکھ بچی کو پکارتا پھرتا تھا...... وہ کہاں سے جواب دیتی...... دُور تھی...... اور جواب دیتی بھی تو کنویں سے آواز نکلنی مشکل تھی...... ہاں دیکھو ہر گھر میں کتنے کنویں ہیں...... ہر کنویں کے کنارے پر آواز دو...... مگر نہیں، ٹھہرو۔ یہ غلط بات ہے۔ تم سب کے محرم نہیں ہو اور وہاں پردے کا کوئی انتظام نہیں ہے...... اِن کنوؤں میں کتنی کنواریاں ہیں جن کے پاؤں کی چاپ سن کر ستارے اپنی آنکھیں بند کر لیتے تھے...... کتنی پردہ نشیں شریف زادیاں ہیں جنھیں دن کی دُھوپ اور رات کی چاندنی بھی شرما شرما کر دیکھتی تھی...... کتنی جوان بیویاں، کتنی ضعیف مائیں جن کے تقدس اور عصمت کے ذکر کے سامنے وقت عظمت اور احترام سے جھک جاتا تھا...... کتنی ہوں گی جن کی حسین چوٹیاں ان کا آخری وسیلۂ نجات بنیں۔ کتنوں نے اپنے آنچلوں کو گلے لگالیا...... اور کتنی بہادرنیں ایسی بھی تھیں جو خنجر لے کر کود پڑیں کہ ہم بھی نہیں اور تم بھی نہیں...... اور یہ سب قیامت تک ان کنوؤں میں اپنی خاموش انجمنیں آراستہ رکھیں گے...... ان میں زخموں کے چراغاں ہوں گے، آہوں کی قندیلیں روشن ہوں گی، ترشی ہوئی گردنوں کے فانوس جھومیں گے...... اس طرح یہ انجمن کی انجمن میدانِ حشر میں اپنے بنانے والے کے سامنے چلے گی اور ان کا بنانے والا اہلِ حشر والوں سے پکار کر کہے گا...... اِنھیں راستہ دو...... حوریں آؤ اور اپنی زلفوں سے

جاروب کشی کرو......فرشتو ان کے لیے اپنے پر بچھاؤ...... یہ وہ ہیں جنھوں نے جان بیچ کر آبرو خریدی ہے اور خریدی اس لیے کہ میرے سامنے یہی تحفہ لے کر آئیں......

اچھا اب کب تک غزل سنو گے۔ بہت اشعار کہہ دیئے، اب زندگی بھر ان طرحوں پر اشعار کہتے رہو گے...... ہاں اب مقطع سن لو...... ذرا آگے بڑھو......دیکھو وہ حضرتِ صدر امین کا مزارِ مبارک ہے...... دیکھو تمھیں زندہ رہنا ہے...... میں نے تمھیں اپنا راز دار بنایا ہے......میری بات تم سمجھ سکتے ہو تو سب نہیں سمجھ سکتے۔لیکن میری بات تمھاری زبان میں سب سمجھیں گے...... میں نے تمھیں محرمِ راز اسی لیے بنایا ہے کہ تم زبان بنو میں دل بنوں۔ میں تمھیں دل دیتی ہوں تم مجھے زبان دو گے......اس لیے تمھیں زندہ رہنا ہے......آگے بڑھو،کلیجہ سنبھال کر آگے بڑھو...... ہمت کر کے حوصلہ کر کے آگے بڑھو......دیکھو حضرت صدر امین کے پائینتی کنواں ہے......ارے میاں یہ کیا؟

موسمِ گل کی کچھ باتیں ہیں لیکن تم سے کون کہے
تم تو بس سنتے ہی عاجؔز دیوانے ہو جاؤ ہو

میں سمجھ رہی تھی کہ مقطع کے نام سے تم کچھ سمجھ گئے ہو...... لہجہ شناس ہو، رمز آگاہ ہو...... وجدان و عرفان کے بڑے ہو تو ہمت اور حوصلے کے بھی بڑے بنو......لڑکھڑاؤ نہیں،قدموں کو قابو میں رکھو......ارے میاں یہ تو راہِ محبت ہے......اس میں تو مقاماتِ سخت آتے ہی ہیں اور آئیں گے ہی......اگر ہمت ہارو گے تو یہ امانت کیسے سنبھالو گے جو میں تمھارے سپرد کر رہی ہوں۔تم ہی کو ایک دن یہ کہنا ہوگا:

اس انجمن میں ہم بھی عجب وضع دار ہیں
دل ہے لہولہان جبیں پر شکن نہیں

اور یوں بھی کہو گے:

غزل جو سنتا ہے میری عاجؔز وہ مجھ کو حیرت سے دیکھتا ہے
کہ دل پہ گزری ہے کیا قیامت مگر جبیں پر شکن نہیں ہے

قیامت گزر جائے تو گزر جائے مگر آگے بڑھو......ہاں تو مزار کے قریب وہ کنواں ہے...... تم اُدھر جا سکتے ہو......اُس کنویں کے لیے پردے کی کوئی ضرورت نہیں،تم اُن کے محرم ہو......کن

کے؟......وہی جن کو تم پکارا کرتے تھے؟ ''امّاں !......تم کہاں بیٹھی ہو امّاں !'' ......چلو بڑھو پھر آواز دو...... ''تم کہاں ہو امّاں ؟'' ...... پکارو ...... ''بُنّی کہاں ہو؟'' ...... پکارو ...... '''' رشیدہ کہاں ہو؟'' ......دیکھو آواز آ رہی ہے......''میں یہاں ہوں بیٹا'' ...... ''دیکھو آواز آ رہی ہے...... ''میں یہیں ہوں بھیّا'' ...... ''ہم لوگ یہیں ہیں بیٹا......قرآن پڑھ رہی ہوں بیٹا'' ...... ''ہم امّاں کے گلے سے لپٹے ہوئے ہیں بھیّا'' ...... ''ہم دونوں ایک ہی رشتے میں چھدے ہوئے ہیں بیٹا......بیٹا تمھیں یاد ہے؟......تم انٹرنس کا امتحان دینے والے تھے۔ پٹنہ میں پڑھ رہے تھے، تمھارا ٹسٹ ہونے والا تھا۔ میں ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوئی ......گھر میں صرف میں تھی اور یہی تمھاری بُنّی ، ایک ماما، ایک ملازم، ایک ماہ ٹائیفائڈ میں رہی لیکن تمھیں خبر نہیں دی۔ بُنّی سے خیریت لکھوادیا کرتی تھی۔ نہ جانے تمھیں کیسے خبر ہوگئی۔ تم راتوں رات پٹنہ سے تیلہاڑہ آئے۔ دو بجے رات میں تم پکار رہے تھے۔ میں اچھی ہو چکی تھی، کمزور تھی۔ ماما نے دروازہ کھولا۔ تم آ کر لپٹ گئے...... امّاں مجھے خبر تک نہ دی؟...... میں نے کہا بیٹا تو پڑھنے میں مشغول تھا، تجھے کیوں پریشان کرتی......مر بھی جاتی تو کوئی بات نہ تھی، تم آ کر مٹّی تو دے ہی دیتے...... بیٹا! اللہ نے میری بات سچ کردی اور تمھیں بھی بھیج دیا...... بیٹا دو مٹھی خاک اُٹھاؤ اور کنویں میں ڈال دو، تمھارا بھی ارمان نکل جائے...... بیٹا! تم اس تمنّا میں تھے کہ اپنی بُنّی کو دُلہن بناؤ گے، لیکن بیٹا پھر میں اکیلی ہو جاتی......تمھاری ننھی بُنّی میرے کلیجے سے لگی ہوئی ہے۔ تین دن کلیجے سے لگی رہی اور کلیجے سے لگی چلی آئی...... تین دن تک ہم تمھیں یاد کرتے رہے اور دُعا کرتے رہے کہ کہیں تم نہ آجاؤ......تم آجاتے تو مرنا بھی دوبھر ہو جاتا۔ اب تم آ گئے تو جی چاہتا ہے چھدے ہوئے سینے اور کٹی ہوئی گردن کے ساتھ اُٹھ کر تمھیں سینے سے لگا لوں، لیکن یہ آدابِ فنا کے خلاف ہے...... جاؤ بیٹا، میں تم سے دُور نہیں رہوں گی۔ زندگی میں جتنا قریب تھی مر کر اس سے قریب تر ہو گئی ہوں...... میں تمھارے خیالوں میں رہوں گی، نگاہوں میں رہوں گی۔ میرے خیال، میری یاد سے تمھارے دل کی بھٹی گرم رہے گی، تمھاری آنکھیں سیراب رہیں گی، تمھاری زبان خوش گفتار رہے گی......تم کم سخن تھے اب سخنور ہو جاؤ گے۔ میں تمھاری زبان سے بولوں گی، تم اپنے الفاظ میں میری آواز سن لینا، میں تمھارے اشعار میں اپنی پکار سن لوں گی ......اگر میں تمھارے سامنے مر جاتی اور تم مجھے دفن کر دیتے تو تمھاری محبت کا بڑا حصہ دفن ہو جاتا......لیکن میں تمھارے دل

کے اندر زندہ ہوں......تمھارے جذبات میں ایک لامحدود خزانہ بن کر چھپ گئی ہوں......تم اس خزانے سے ڈھیر کے ڈھیر لٹاتے رہو گے اور میں اضافہ کرتی رہوں گی......میری خاک اِس کنویں میں تمھاری آواز سنتی رہے گی، تمھارے نالۂ نیم شبی اور آہِ صبح گاہی سے میری خاک نم رہے گی۔ تم یہ کہو گے:

دردمندِ عشق ہیں غم سے نہ گھبرائیں گے ہم　　شاعری کرتے رہیں گے اور مر جائیں گے ہم
اب کے پھر برسات میں گنجِ شہیداں پر چلیں　　آسماں روئے گا اور اپنی غزل گائیں گے ہم

لوگ اِن الفاظ پر جھومیں گے اور میں اور میرے ساتھ یہ پوری انجمن ان رسمی الفاظ کے در پردہ حقیقت پر جھومتی رہے گی۔ اصل محفل تمھاری یہ ہے، اصل اہلِ ذوق، اصل مشتاقِ کلام، اصل سخن فہم اور اصل معنی شناس تو ہم ہوں گے، جو تم سے دُور رہ کر بھی بہت قریب ہوں گے...... جو لوگ تم سے قریب رہ کر بھی دُور ہوں گے اُن کو تم یوں کہو گے:

کس کے دل پہ کیا بیتی ہے کب سمجھے کب جانے لوگ
گھر بیٹھے سر دُھن لیتے ہیں سن سن کر افسانے لوگ
کوئی دیوانہ کہتا ہے کوئی شاعر کہتا ہے
اپنی اپنی بول رہے ہم کو بے پہچانے لوگ

اچھا بیٹا اب تم بتاؤ، میں تلاوت کر رہی ہوں......''

''سن لیا کلیم! دیکھ لیا کلیم!!......تم مجھے سنگی سمجھ رہے تھے......مجھے بے جان پتھر سمجھ رہے تھے۔ اِس پتھر کی کرامت دیکھی؟......تم کیا جانو تین دن تک میری پتھر کی دیواروں میں کیسی آگ لگ رہی تھی......میرے عاشقانِ جانباز ٹھنڈے ہو رہے تھے اور میں سلگتی چلی جاتی تھی:

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

کہ اُنھوں نے اپنے لہو سے میری دیواروں کو ٹھنڈا کیا اور اپنی اُکھڑی اُکھڑی سانسوں سے ہوا دے دے کر ہر طرف سے چنگاریاں سمیٹ کر میرے سینے میں جمع کر دیں۔ میں اُوپر سے ٹھنڈی ہوں مگر میرے سینے میں جوالا مکھی ہے......اچھا اب تم جاؤ اور ان گدّوں کو دُودھ سے بھرے برتن اور شکر لے جاؤ۔ اُن کے پاس لے جاؤ جنھیں ابھی گناہوں کی بھری بھری بوریاں سمیٹنے اور جمع کرنے کو زندہ رہنا ہے......''

○

میں تاریخ کا طالب علم نہیں ہوں، المناک حادثے اس سرزمین پر نہ جانے کتنے آئے ہوں گے، کتابوں میں پڑھنا اور بات ہے موجِ خون کا خود سر سے گزار دینا اور بات۔ مجھے اُس دن کے بعد پھر کچھ اس قسم کا احساس ہونے لگا کہ اس سے زیادہ المناک حادثہ نہ پہلے کبھی آیا، نہ اب آ سکتا ہے۔ فوری کیفیت تو مجھ پر ایک حد تک خود فراموشی کی تھی۔ زندگی کے تقاضے تو رُکتے نہیں، معمولات اپنے حال پر قائم رہے، لیکن میں ایک مشین کی طرح ان معمولات سے گزرتا رہا۔ نہ کسی غم سے غم، نہ کسی خوشی سے خوشی۔ میں خود اپنی زندگی کے حالات کا تجزیہ کرتا ہوں تو تین طرح کی کیفیات بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔ میرے احساس کی دُنیا ایک آبلے کی شکل اختیار کر گئی، ذرا سی ٹھیس سے یہ آبلہ پھوٹ بہتا۔ دوسرے مجھے دُنیا میں کسی خطرے کا خوف باقی نہ رہا۔ میرے اِرد گرد کوئی اور ہی فضا تھی۔ ہر شخص مستقبل سے ہراساں اور اسے ہر ممکن کوشش سے محفوظ بنانے کا ساعی اور آرزومند۔ چاہے محفوظ مستقبل کسی طرح حاصل ہو۔ گھر چھوڑنا ہو، وطن چھوڑنا ہو، اپنے پرائے چھوٹ جائیں مگر آئندہ زندگی ہر اعتبار سے محفوظ اور روشن ہو جائے۔ اور میں اپنے مستقبل سے بالکل مطمئن۔ ایسا معلوم ہو جیسے میرا کوئی مستقبل ہے ہی نہیں۔ میری زندگی میں دو ہی زمانے ہیں۔ میرا ماضی جو مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز، محبوب، حسین اور لذیذ ہے جس کی تمام تلخیاں شیرینی بن گئی ہیں۔ میرا ماضی ایک ایسی شراب ہے جس کے سرور کو کسی ترشی کا خوف نہیں۔ یہ ایک سرورِ جاوداں ہے، اس کی مستی اور سرشاری مجھ سے کبھی الگ نہیں ہوتی۔ دوسرا میرا حال جس میں ساری رنگینی، رعنائی، دلفریبی اور دلکشی لذت اور چاشنی میرے ماضی کے تعلق سے ہے، بس اس کے آگے کچھ نہیں۔ تیسری چیز جو میری زندگی میں ہوئی وہ ایک بے پایاں محبت، ایک اتھاہ پیار، اس کائنات میں سانس لینے والی ہر مخلوق سے۔ میں کسی کے چہرے کی افسردگی، کسی کی آنکھوں کے آنسو، کسی کی زلفوں کی برہمی، کسی کے ماتھے کی شکن، کسی کی چال کی خستگی، کسی کے حال کی آشفتگی سکون سے نہیں دیکھ سکتا۔ میرے احساس کے سمندر میں ایک تلاطم پیدا ہو جاتا ہے۔

میں نے میٹرک بہت اُونچے درجے میں پاس کیا تھا، لیکن آئندہ تعلیم کا کوئی میلان ہی مجھ

میں نہ رہا۔ تمام سہارے ختم ہوگئے، سوائے ایک چھوٹے بھائی کے جو خوش قسمتی سے میرے ہی ساتھ پٹنہ میں تھا، میرا کوئی اور اپنا رہا نہیں۔ برادری اور قرابت والے سب ترکِ وطن کر گئے۔ میری چھوٹی سی دُکان رزق کا وسیلہ ہوگئی۔ سال ہی دو سال بعد رشتہ مندوں، قرابت داروں، دوستوں اور واقف کاروں کے تقاضے پڑوسی ملک سے بظاہر بڑے دلنشیں اور دلکش انداز میں آنے لگے۔ شاندار مستقبل اور خوش آہنگ زندگی کی تصویروں پر تصویریں بھیجی جانے لگیں۔ بڑے بڑے عہدو پیمان، اُونچے اُونچے وعدوں، لمبی لمبی اُمیدوں کے حسین اور دل آویز خواب برسائے جانے لگے۔ مگر میں جن چنگاریوں سے لپٹا ہوا تھا، جس خاکستر پر پڑا ہوا تھا، جن کانٹوں کو اوڑھ رکھا تھا اُن کے مقابلے میں کسی جنتِ ارضی کی میری نگاہ میں کوئی قیمت، کوئی لذت باقی ہی نہیں تھی۔ میری جنت برباد ہوگئی تھی مگر وہ برباد شدہ جنت میرے تصور میں اپنے پورے شباب اور بھرپور حسن کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ اُس شیریں جنتِ تصور نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو فراموش کردیا تھا۔ میری جنت مجھ سے تیس میل دُور ویرانے میں لہلہا رہی ہے۔ میں جب کبھی میل یا ایکسپریس ٹرین سے کلکتہ یا اور کسی مقام کو جاتے ہوئے اپنے اس اسٹیشن سے گزرنے والا ہوتا جہاں سے میرے گاؤں کو مارٹن کمپنی کی چھوٹی لائن اب بھی جاتی ہے، تو کچھ دُور ہی سے میں سر آنکھوں پر کپڑا لپیٹ کر اپنی سیٹ پر پڑ جاتا اور زور سے برتھ کی لکڑی کو تھام لیتا۔ مجھے ڈر ہوتا کہ اگر چلتی ہوئی ٹرین کی کھڑکی سے فتوحہ چھوٹی لائن کے اسٹیشن کو اور ٹرین کو دیکھ لوں گا تو ٹرین سے کود جاؤں گا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک میں نے سفر کرتے ہوئے کبھی اس طرف رُخ بھی نہیں کیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس ویرانے پر جو اَب تک میرے تصور میں لہلہاتا ہوا گلزار ہے، میری نظر نہ پڑ جائے اور میرے خوابوں کا محل مسمار نہ ہو جائے۔ لیکن ۱۹۵۷ء میں گیارہ سال بعد ایک دن آیا اور میں نے ارادہ کیا کہ:

اب کے اس برسات میں گنجِ شہیداں پر چلیں
آسماں روئے گا اور اپنی غزل گائیں گے ہم

اور اُس دن میں فقیروں کی سی ایک جھولی گلے میں ڈالے اُس بستی میں پھر پہنچ گیا:

دُور تک جس میں کہیں سایۂ دیوار نہیں

جب میں اسٹیشن سے بستی کی طرف جا رہا تھا تو وہ سڑک، جو پہلے کچی مٹّی کی تھی، کولتار کی پختہ شاہراہ بن گئی تھی، ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی فاقہ کش کے لبوں پر گھی لگا ہو یا کسی قحبہ پیرزال

نے سرخیِ غازہ کے پردے میں اپنے چہرے کی نفرت انگیز جھریوں کو چھپایا ہو۔ اور پھر ایسا معلوم ہوا کہ کسی بے درد محبوب کی گلی کو مرنے والے جانبازوں نے اپنی خاک سے پاک کر دیا ہو:

ستارے بن کے میری خاک کے ذرّے چمکتے ہیں
زمیں اُن کی گلی کی آسماں معلوم ہوتی ہے

اور یہ تصور دیرپا ثابت ہوا اور مجھے اینٹ، پتھر، سیمنٹ اور کولتار کے اس ریختہ سے خون، ہڈیاں، آنسو، آنکھیں جھانکتی نظر آئیں اور میں سڑک کے کنارے کنارے کچی زمین پر چلنے لگا اور بے اختیار جی چاہنے لگا کہ پاؤں سے چلنے کے بجائے آنکھوں اور ہونٹوں سے راستہ طے کروں:

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید این جا

بستی کے لوگوں نے مجھے کم عمری میں دیکھا تھا، جوان ہو کر گیارہ بارہ سال بعد جو داخل ہوا تو اکثر لوگوں نے کوئی اجنبی سیّاح و مسافر سمجھا۔ جب میں اپنے گھر کے قریب پہنچا جس کا کچھ حصہ خاکستر ہونے سے بچ گیا تھا اور جس میں اُسی وقت سے پولیس چوکی قائم ہو گئی ہے، تو ایسا معلوم ہوا جیسے برسوں سے جس زخم پر انگار رکھا ہوا تھا، اس پر کسی نے مرہم رکھ دیا۔ میں بے اختیار صحن کی گھاس پر پڑ گیا اور اپنی چھاتی زمین سے لگا دی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے ساری کائنات کا سکون، ٹھنڈک اور خوشبو میرے سینے میں داخل ہو کر دل سے ہم آغوش ہو رہی ہے۔ میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میری ماں نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا ہو۔ برسوں کی تشنگی، برسوں کی تڑپ، برسوں کی جلن، یک بیک سیرابی، آسودگی اور سکون میں تبدیل ہو گئی۔ کرایہ دار پولیس چوکی کے کانسٹبل، حولدار اور تھانے دار میرے قریب جمع ہو گئے اور میری حالت سے متحیر کھڑے ہو گئے۔ میں نے جب گھاس سے اُٹھ کر یہ بتایا کہ میرا ہی نام کلیم ہے اور وہ میرے ہی کرایہ دار ہیں، پھر دس گیارہ سال پہلے کی کہانی انھیں معلوم ہو گئی۔ تھانے کا پورا اسٹاف بڑی محبت اور عقیدت سے پیش آیا اور آناً فاناً پوری بستی میں بجلی کی طرح بات دوڑ گئی کہ گیارہ سال بعد اس گاؤں میں ایک مسلمان آیا ہے اور اسی گاؤں کا ہے اور کوئی دوسرا نہیں کلیم آیا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے میرے نزدیک بوڑھوں، جوانوں، عورتوں اور بچوں بچیوں کا ہجوم ہو گیا۔ ہرنام سنگھ بزاز، نرائن ساؤ تیلی، سدھو سنار، مہابیر حلوائی، ماسٹر رمیش، شیونندن حجام، سومر دوسادھ،

انتو چمار، پرشادی سنار، منشی گوپال پرشاد پٹواری، گجادھر پانڈے اور بھتو پاسی کی بیوہ اور سُر جی تمبولن اور پرشادی سنار کی بیٹیاں جو میری پڑوسن تھیں، جن کے ساتھ میں کھیلا کرتا تھا، اور نہ جانے کون کون کتنے نئے لڑکے، کتنی نئی لڑکیاں اور رام کھلاون پرشاد کی بیوی جسے میں بھابھی کہا کرتا تھا، جوان لڑکیاں اور عورتیں گھونگھٹ ڈالے ایک آنکھ گھونگھٹ کے گوشے سے نکالے، کسی کی آنکھ ڈبڈبائی ہوئی، کسی کے ہونٹ پر ہلکا سا تبسم، کسی کے چہرے پر حیرت واستعجاب......این؟ کلیم ایلن ہیں؟ (کلیم آئے ہیں؟)......کلیم بابو ہتھِن؟ (کلیم بابو ہیں؟)......کلیم؟......کلیم...... ''کتھِن (کہاں) ہیں کلیم؟''......سر جی تمبولی ستر برس کی عمر دیکھنے میں پچاس سے بھی کم، گوری چٹی پست قد، بھیڑ کو چیرتی ہوئی بڑھ رہی ہے......''کتھِن ہیں کلیم؟''......''اِدھر ہیں سُر جی!''...... ''اوہو کلیم ہو؟......ہائے بیٹا......کیا ہو گیا بیٹا؟......یہ کیا ہو گیا بیٹا......یہ کیا ہو گیا بیٹا؟......سر جی تو تمری ماں کے ساتھ ہی مر گئی بیٹا......اب بستی میں تو کچھ نا ہے بیٹا......بستی تو ختم ہو گیلی بیٹا'' ......بھتوّ پاسی کی بڑھیا جورو......کبڑی جھکی جھکی آئی اور دُور سے میری بلائیں لیتی ہوئی بولی...... ''ہائے اُمتو جی (میری ماں اُمت الفاطمہ)......کوڑھین کے ہاتھو نہ پھوٹل......بیٹا تو کہاں ہے بیٹا؟''......''ہم تو پٹنہ میں ہیں میّا!''......''اور نسیم کہاں ہے؟''......''وہ بھی میرے ساتھ پٹنہ میں ہے''......''دُکھ سکھ گجر گیلی بیٹا......توں آ جا بیٹا۔ ہئیں (یہیں) رہ بیٹا''......''میرا بھی یہی جی چاہے ہے، دیکھو''......اور رام کھلاون کی ادھیڑ بیوی گھونگھٹ میں سے مسکراتی ہوئی بولی...... ''ہمرا چینھہ ہا کلیم؟ (ہم کو پہچانو ہو کلیم)''......''ہاں تم کو پہچانتے ہیں بھابھی''......''کب اے وا کلیم؟'' (کب آؤ گے کلیم)......''دیکھو کیا کہیں''......''اور ہم کو پہچانتے ہو کلیم؟''......پرشادی سنار کی جوان بیٹیاں......میری ہم دیوار تھیں، میرے یہاں سے آنا جانا......کبھی دیوار میں دروازہ نکال دیا جاتا اور شادیات میں دونوں گھر ایک ہو جاتے۔ میں بچپن میں اکثر ان کے ساتھ کھیلا کرتا......سیانی ہوئیں تو یہ بھی پردے میں رہنے لگی تھیں۔ کبھی کبھار سلام پرنام ہو جایا کرتا تھا۔ اب بالکل جوان تھیں......بستی سے ایک تہذیب کے مستقل ختم ہو جانے کی وجہ سے پردہ داری اس درجہ پر نہ تھی۔ گھونگھٹ نکالے دو تین لڑکیاں کھڑی تھیں......''ہم کو پہچانتے ہو کلیم؟''...... میل جول کی وجہ سے اُن کی زبان صاف تھی......''نہیں ہم تو نہیں پہچان رہے ہیں''...... ''ارے کلیم! ہم پرشادی سنار کی بیٹی ہیں نا!''......''اچھا ہیرا رانی! سونا رانی!! رُوپا رانی!!!''......

''ہاں...... ہاں...... ہاں......'' تینوں کی آنکھوں میں آنسو اور تینوں کے لبوں پر مسکراہٹ۔ غم اور خوشی کا میل......

آنکھ میں آنسو تبسم لب پہ تھا احباب کے
جب خوشی کی لَے میں غم کی راگنی گائی گئی

اور رام پرشاد مالی کا جوان بیٹا پہلوان کشتی گیر، جس کے ساتھ میں کبھی کبھی زور کیا کرتا تھا اور جس کے امرود کے باغ سے آدھ آدھ سیر شیریں امرود سعیدی اور شہیدی ایک ایک وقت کھا جاتا اور کھا کر دو دو روز بخار میں مبتلا رہتا۔ اور جو پھولوں کے گجرے اور ہار بنا کر لاتا اور میں کلائی میں گجرے باندھ کر اور گلے میں ہار ڈال کر اپنے مکان کے سامنے حضرت امام حسینؑ کے امام باڑے کے چبوترے پر شان سے بیٹھا کرتا...... دوڑا دوڑا گیا اور چند منٹ میں ملے جلے پھولوں کا ایک ہار بنا کر لایا۔ ''آج ہمرا ہاتھ سے ہار پہن لا کلیم بابو!''...... ''ضرور پہنیں گے رام کشن! لاؤ گلے میں ڈال دو''...... گلے میں ہار ڈال دیا اور سدھو سنار جو مجھ سے سِن میں کچھ چھوٹا تھا، ناٹک اور ڈرامے کا بڑا شوقین...... ناٹک پارٹی اس نے بنائی تھی۔ ہارمونیم بجاتا تھا۔ میں جب اسکول سے چھٹیوں میں گھر آتا تو کچھ ناٹک کے سوانگ کے تماشے دِکھاتا اور میں نے کچھ سوانگ کے کپڑے بھی لا کر دیئے تھے، جسے پہن کر جھوم جھوم کر آلہا اور اُودل کے گیت گاتا...... اِدھر ہار میرے گلے میں رام کشن نے ڈالا اور سدھو نے زور سے نعرہ لگایا ''کلیم بھیّا کی جے'' اور سارے بچوں اور بچیوں نے اور جوان لڑکوں اور لڑکیوں نے زور سے جے کہا...... اور پولیس کے سب انسپکٹر جو میرے مکان میں کرایہ دار تھا، نام مجھے یاد نہیں، جوان آدمی تھے، تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ میری بغل میں کھڑے ہو گئے...... ''کلیم صاحب! اور بھائیو اور بہنو!!'' میں نے آج تک پریم بھاؤ، محبت کا یہ درشیہ نہیں دیکھا تھا...... آج ایسا ہو رہا ہے تو کل ویسا کیوں ہوا؟......'' اور کیا کیا بولے مجھے یاد نہیں۔ میں تو بیٹھ گیا...... میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

ماسٹر رمیش جو مقامی ہائی اسکول میں ٹیچر تھے، بوڑھے ہو رہے تھے بول اُٹھے...... ''کیوں ہوا؟ یہ نہ پوچھئے داروغہ جی۔ وہ تو ہونی تھی ہوئی...... یہ پوچھئے کس نے کیا...... میں جانتا ہوں داروغہ جی کس نے کیا، آپ نہیں جانتے...... آج بھی وہ آپ کے قریب ہیں اور ہمارے قریب ہیں، ہم ہی میں ہیں...... یہاں پر نہیں ہیں لیکن یہیں ہیں...... انھوں نے اپنے جیسوں کو جمع کیا۔

ان کے جیسے بہت مل جاتے ہیں ......اور بہت مل جاتے ہیں......آج بھی ملتے ہیں اور ملتے رہیں گے......لیکن جیسے لوگ یہاں ابھی جمع ہیں، ایسے بہت کم ہیں اور بہت کم ملتے ہیں ......اور آگے اور بھی بہت کم ہوں گے......اور بہت کم ملیں گے......اور بڑی مشکل سے ملیں گے......اور کم ہوتے ہوتے پھر بالکل نہیں ملیں گے......اور پھر......ان چاندستاروں کو کوئی دیکھنے والا نہیں رہے گا......اور پھر یہ چاندستارے بھی نہیں ہوں گے......بس رہے نام بھگوان کا......'' تھوڑی دیر تک سنّاٹا رہا......

میری واپسی کا وقت قریب آرہا تھا۔ داروغہ جی کے ہاتھ میں بیس پچیس روپے دیئے کہ مٹھائی منگائیے اور بچوں کو بانٹئے......مٹھائی آئی، بچے اور بچیاں بڑی خوشی اور مسرت سے مٹھائی لینے لگیں۔

اس کے بعد میں آنے کو اُٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے میں دیکھا کہ رام کھلاون کی بیوی اور سونا رانی دو تھال لیے آرہی ہیں......'' پانی پی لو کلیم جی!''......'' ارے یہ کیا سونا رانی! یہ پانی پلانا ہے یا جان سے مارنا ہے؟ یہ تھال بھر مٹھائی؟ میں تو بیمار ہوں سونا رانی! مجھ سے تو نہیں کھایا جائے گا۔''

'' نا کھیوا تو جبردستی ٹھونس کے کھلائیو۔'' (نہ کھاؤ گے تو زبردستی ٹھونس کر کھلائیں گے) رام کھلاون کی بیوی بولی......مختصر یہ کہ وہ بھی ایک منظر تھا۔

میں واپس چلا آیا، اور اُس سال کے بعد تقریباً ہر سال اپنے دل کی بیٹری چارج کرنے کو ایک بار ضرور جاتا ہوں۔ پوری بستی کا طواف کر لیتا ہوں۔ جتنے گنج شہیداں ہیں، فاتحہ پڑھ لیتا ہوں اور سال بھر کے لیے آنسوؤں کا خزانہ جمع کر کے لے آتا ہوں۔

○

۴۷-۱۹۴۶ء کا انقلاب کوئی نیا انقلاب نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی اس سے چھوٹے بڑے بہت انقلابات آئے۔ ان کا ذکر تاریخوں میں ہے، کتابوں میں ہے، تقریروں میں ہے، تحریروں میں ہے، ادب اور شاعری میں ہے۔ اور یہ اس لیے ہے کہ پہلے اس کا ٹھکانا زندگیوں میں بنا اور ان زندگیوں سے ادب اور شاعری میں منتقل ہوا۔ ایسی زندگیاں کم ہوتی ہیں، لیکن ہوتی ہیں۔ یہ

کوئی عجوبہ چیز نہیں ہے۔ یہ قدرت کا ایک نظام ہے۔ یہ آئینِ فطرت ہے، ادب وشاعری آئینِ فطرت کے ماتحت ہیں۔ الگ نہیں ہیں۔ اس کائنات کے تمام خزانوں کو انسان کی زندگی ہی میں چھپایا گیا ہے۔ اسی خون سے سب کچھ برآمد ہوتا ہے، اسی سرچشمے سے سب کچھ نکلتا ہے۔ اس کائنات کی ساری روشنیاں اور تاریکیاں پہلے زندگی میں منتقل ہوتی ہیں، پھر وہاں سے شکل و صورت بدل کر ادب وشاعری کے بھیس میں سامنے آتی ہیں۔ اس انقلاب کا ایک مستقل ٹھکانا میری زندگی بھی بنا۔ ایک ایسی زندگی میں بھی ہوں۔ جب میں نے پہلے بھی کہا تھا:

مرے سننے والے مجھے دیکھتے ہیں
میں بے پردہ نکلا نقابِ سخن میں

وہ اپنے ہی آئینۂ شعر میں اپنی دُھندلی دُھندلی پرچھائیں دیکھ کر میں خود بھی کم اچنبھے میں نہیں آیا۔ جیسے جیسے اس پرچھائیں سے اُنس بڑھتا گیا اپنے کو اور زیادہ صاف اور واضح دیکھنے کی تمنّا بڑھتی گئی۔ پرچھائیں صاف ہوتی گئی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میرے لیے دُکھ بھری تنہائی سوہانِ روح تھی۔ میرے ہی الفاظ کے پردوں پر میری شبیہ کا دُھندلا دُھندلا عکس جب مجھے نظر آیا تو ایسا معلوم ہوا جیسے اس اندھیرے میں اس تنہائی میں کوئی میری بغل میں آ کر بیٹھ گیا۔ مجھے اپنی ہی آواز میں ایک ہم نشیں، ایک ہم نوا، ایک ہمراز مل گیا اور میں اپنے ہمراز، اپنے ہم نوا سے زیادہ سے زیادہ بے تکلف رہنے کے لیے بے قرار رہنے لگا۔ اور یہ بے قراری میرے فن سے گرد وغبار دُور کرنے لگی اور پرچھائیں کے خط وخال آہستہ آہستہ نمایاں ہونے لگے...... اور اب سچ کہتا ہوں کہ جب میں انجمن میں رہتا ہوں، بازاروں میں گھومتا ہوں، مشاغل میں گھرا رہتا ہوں تو اپنے ہم نشیں سے ملنے کے لیے بیتاب رہتا ہوں۔ اس تلاش میں رہتا ہوں کہ کوئی گوشہ میسر ہو، کیسی بھی ہو کوئی خلوت میسر ہو۔ گھر ہی میں کوئی تنہائی کی جگہ، ٹرین کے سفر میں اپنا برتھ، کلاس میں کوئی خالی پیریڈ، کچھ نہیں تو رِکشہ یا ٹرین پر چلتے ہوئے آنکھیں بند کر کے اپنے لیے خلوت حاصل کر لیتا ہوں اور پھر اپنے ہم نشیں کو آواز دیتا ہوں:

کلیمؔ آؤ کوئی غزل گنگناؤ زمانے کو نیند آ رہی ہے جگاؤ

وہ ستم نہ ڈھائے تو کیا کرے اُسے کیا خبر کہ وفا ہے کیا
تو اُسی کو پیار کرے ہے کیوں یہ کلیمؔ تجھ کو ہوا ہے کیا

شعروغزل میں ڈوبی ہوئی رات ہے میاں
تم کیوں کلیم روؤ ہو کیا بات ہے میاں

پھر سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ہم دونوں مل کر کبھی روتے ہیں، کبھی مسکراتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر قوت، زندگی، توانائی اور حوصلہ کا ایک دوسرے سے لین دین کرتے ہیں۔ مجھ سے میرے فن میں توانائی ہے اور میرے فن سے مجھ میں قوت ہے۔ میری عمر پچاس کو پہنچ رہی ہے، میری غذا بہت مختصر ہے جسے بعض لوگ غذا نہ ہونے کے برابر کہتے ہیں۔ میرا جسم ہمیشہ مشقت میں رہتا ہے۔ میں بہت کم سوتا ہوں۔ میرا اضطراب ہمیشہ پگھلائے رہتا ہے۔ میرا بدن لاغر ہے، لیکن میری عمر کے چند ہی لوگ نکلیں گے جو قوت میں، حوصلہ میں، عزم میں، ارادے میں، تحمل میں، برداشت میں، مشقت میں، ہمت میں مجھ سے قریب ہو سکیں گے۔ میری شاعری کی غمگینی، الم آفرینی، اس میں لہجے کا جو دھیما پن ہے، اس میں جو نازک نازک سے آبگینے کی پگھلنے کی کیفیت ہے، اس میں جو نرم نرم سے پھپھولوں کے پھوٹنے کا آہنگ ہے، اس میں جو زخموں کے رِسنے کی سی سرسراہٹ ہے، یہ مریضانہ نہیں ہیں۔ ان میں وہ صحت مندی ہے، ان میں جینے کا اور جلانے کا وہ حوصلہ ہے جو مجھے بڑی سے بڑی للکار والی شاعری میں بھی نظر نہیں آتا۔ اگر یہ میرا بڑا بول ہے تو مجھے معاف کر دیا جائے۔

میں نے شاید پہلے بھی عرض کیا ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں، اس شاعری کو فن کی حیثیت سے میں نے کبھی اختیار نہ کیا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں کسی دَور میں بھی یہ بات نہ آئی کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے دوسروں کے سامنے فنِ شاعری کی حیثیت سے مجھے پیش کرنا ہے۔ اسے تلوانا ہے، پرکھوانا ہے، کسوٹی پر کسوانا ہے، اس کی قدر و قیمت لگوانا ہے، اس کا بھاؤ پوچھنا ہے۔ یہ چیز کبھی جنس کی حیثیت سے بازار میں جائے گی یہ شان و گمان میں نہ تھا۔ جیسا میں نے عرض کیا کہ برسوں کی تلاش اور نامعلوم اور نامحسوس جستجو نے ایک شکل اختیار کی، مجھے ایک ہمدم و ہمراز دیا۔ میری غزل کا میرے لیے اصل اور حقیقی موضوع یہی ہے۔ غزلیں کہنے والا کلیم غزلوں میں چھپے ہوئے کلیم سے باتیں کرتا ہے۔ دو جگری دوستوں میں بلا تکلف اور بلا تصنع گفتگو، وہ بات جو کسی سے نہ کہی جا سکتی ہو۔ وہ گفتگو جس میں دلوں کا راز ہو، سیدھی اور سادی۔ صبح کی بات شام دہرائی جاتی ہے۔ شام کی بات صبح کو سنائی جاتی ہے۔ سنو کلیم! آج یہ بات ہوئی، آج کا یہ قصہ

ہے، دیکھو یہ آج کی کہانی ہے۔ ہر بات نئی ہے، ہر قصہ تازہ ہے، ہر کہانی انوکھی ہے، ہر سرگزشت نرالی ہے۔ روز کی باتیں ہیں۔فرسودہ باتیں، پامال باتیں نظر آتی ہوں، لیکن دونوں کلیم کے مابین کہی اور سنی ہوئی باتیں ہرصبح کی کرن کی طرح نئی اور ہر شام کی شفق کی طرح تازہ ہیں۔زندگی کبھی پرانی نہیں ہوتی۔ ہر گام نیا طور، نئی برقِ تجلی اور شعر ہیں، ہر گام کے نئے طور اور نئی برقِ تجلی کی آب وتاب ہے۔اس شاعری میں تجربے مستعار نہیں ہیں، برائے بیت نہیں ہیں، نئی زندگی کے نئے تجربے ہیں۔ روزانہ کے تجربوں کو نئی دُلہن کی طرح ان حسین نرم و نازک ملبوسات سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ان کسوٹی پر پرکھے ہوئے، جانچے ہوئے، مانے ہوئے زیورات سے سجایا جاتا ہے۔ان موتیوں سے، ان جواہرات سے، ان لعل و گہر سے سنوارا بنایا جاتا ہے جن کی رنگینی اور رعنائی، قدر و قیمت، آب وتاب، حسن اور تازگی ہمیشہ کے لیے تسلیم کرلی گئی ہے۔ حسن ان ملبوسات، ان زیورات، ان جواہرات کے سلیقۂ استعمال میں ہے۔

میں اپنے شعر میں اپنے تجربات، اپنے محسوسات کو پہلے اپنے دل کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ کہنے والا کلیم سننے والے کلیم سے مخاطب ہوتا ہے۔ دونوں میں بحثیں ہوتی ہیں، حجتیں ہوتی ہیں، جھگڑے ہوتے ہیں۔ جب تک حجتیں، بحثیں، جھگڑے ہوتے رہتے ہیں دونوں کی پیشانیوں پر شکنیں دُور ہو جاتی ہیں، بل نکل جاتے ہیں، کجی ختم ہو جاتی ہے، دونوں کے چہرے کھل اُٹھتے ہیں۔ پھر دونوں ہم آواز ہوکر گنگنانے لگتے ہیں، جھومنے لگتے ہیں۔ جب تک یہ سب ہو نہیں لیتا، شعر نہیں ہوتا۔ کبھی یہ مقام بہت جلد آتا ہے، کبھی دیر میں آتا ہے، کبھی بہت دیر میں آتا ہے۔ کبھی تو ایسا ہوا ہے کہ دونوں کے جھگڑوں نے میری نماز بھی خراب کردی۔ کھانے کا مزہ کرکرا کردیا۔ نہ کھانے کا وقت دونوں کی بحثیں رُکتی ہیں، نہ چلنے پھرنے کے وقت، نہ خلوت میں نہ انجمن میں۔ مسجد میں نہ میکدہ میں، ان اُن کے جھگڑے کے لیے کوئی جگہ کی شرط ہے نہ ان کے ملنے کے لیے کسی مقام کی قید۔ میں نے قلم لے کر کبھی شاعری نہ کی۔ سیمابؔ اکبرآبادی کی طرح کھانا کھاکر، حقہ لے کر، ٹیبل کرسی پر بیٹھ کر فکرِ شعر کبھی نہ کیا۔ کسی حادثے نے، کسی تجربے نے، کسی خیال نے، کسی یاد نے دل کے تاروں کو چھیڑا اور کام شروع ہوگیا۔ جب کارخانہ چل پڑا تو کبھی نہیں رُکتا۔ کبھی ایسا ہوا کہ تین چار شعر پے در پے چلتے پھرتے ہوگئے۔ کبھی ایک مصرعہ آیا اور دوسرا مصرع گھنٹوں گزر گئے، دن گزر گئے پتہ ہی نہیں۔ جس طرح کوئی بازیگر ایک برتن میں

مختلف سنگریزے شیشے کے ٹکڑے رکھ کر بجاتا ہے۔ الفاظ، تجربہ، خیال، جذبات آپس میں گڈ مڈ ہو کر بجتے رہتے ہیں۔ ان کی کوئی متعین آواز نہیں ہوتی، بس ایک جھمیلا ہوتا ہے۔ اچانک ایک آواز یکسو ہو جاتی ہے۔ ایک خاص آہنگ پیدا ہو جاتا ہے اور مصرع یا شعر مکمل ہو جاتا ہے...... کبھی ایسا بھی ہوتا ہے...... ایک خاص آہنگ، ایک خاص آواز پیدا ہو جانے کے بعد بھی کچھ نامحسوس قسم کی کمی کا احساس رہتا ہے۔ اس وقت مختلف الفاظ کے ملے ہوئے ٹکڑوں پر فکر کی قینچی چلتی رہتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد ایک ٹکڑا، ایک لفظ، ایک جملہ ٹھیک بیٹھ گیا۔

میری شاعری کی دُنیا میں الفاظ کے علاوہ کوئی چیز مستعار نہیں۔ میں بیس برس پہلے تک مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اب مطالعہ بھی نہیں کرتا۔ زندگی تجربات، حادثات کا سلسلہ ہوتی ہے۔ میں زندگی پر گہری نگاہ رکھتا ہوں۔ یہ بات نہیں ہے کہ پچیس سال پہلے ایک حادثے نے دل کا رُخ موڑ دیا، اب دل اسی راہ پر ناک کی سیدھ پر چلا جا رہا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ اس حادثے نے مجھے چلنا سکھایا، ایک سلیقۂ رفتار دیا۔ مستقل طور پر قدم اُٹھانے کا ایک ڈھنگ دیا۔ رفتار کا یہ سلیقہ، چلنے کا یہ ڈھنگ میرا اپنا ہے، جس میں میرا کوئی شریک نہیں، نہ میں کسی کو شریک سمجھتا ہوں۔ میرؔ کو بھی چلنے کا ایک ڈھنگ ملا۔ ایک اندازِ رفتار ملا۔ اس رفتار سے وہ ۸۰-۹۰ سال کی زندگی میں نہ جانے کتنے نئے راستوں پر چلے۔ کتنی شاہراہیں، کتنی پگڈنڈیاں ان کے قدموں کے نیچے آئیں مگر وہ ہر شاہراہ پر، ہر راستے پر، ہر پگڈنڈی پر، اپنی مخصوص رفتار سے چلتے رہے اور ہر راہ ان کی رفتار کی گل تراشی سے رشک گلزار بنتی گئی۔ مجھے بھی چلنے کا ایک ٹوٹا پھوٹا ڈھنگ وقت نے بخشا۔ یہ چال میری اپنی ہے۔ میں روزانہ کتنی شاہراہوں پر چلتا ہوں۔ زندگی کی رواں دواں ندی تیزی سے گزر رہی ہے اور کتنے نشیب و فراز سے اُسے گزرنا اور اُبھرنا پڑتا ہے۔ کتنی چٹانوں سے اُسے ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ کتنے موڑ سے اُسے مڑنا پڑتا ہے۔ مگر اس کی رفتار کی ایک خاص شان ہے جو نہیں بدلتی۔ میری زندگی نو بہ نو، تازہ بہ تازہ اور محسوسات سے روزانہ گزرتی ہے...... انھیں اپنی آغوش میں سمیٹتی ہوئی اور اپنے سانچے میں ڈھالتی ہوئی آگے بڑھتی ہے:

گل کاریوں سے باز نہ آئے جنوں کہ ہم
جس راہ پر چلے اسی رفتار سے چلے

....

مدت ہوئی اِک حادثۂ دل کو، پر اب بھی
پہنچے ہے وہیں بات جہاں سے بھی چلے ہے

بات ہر جگہ سے چلتی ہے، ہر روز چلتی ہے، ہر صبح چلتی ہے، ہر شام چلتی ہے۔اس ہر جگہ، ہر روز، ہر صبح اور ہر شام چلنے والی نئی نئی تازہ بتازہ باتوں کو اس سانچے میں ڈھال دینا، یہ میرے لیے بڑی مشقت کا کام ہے، مگر برسوں کی چال نے اب یہ بات بڑی حد تک آسان کردی ہے۔

میں نے غزل کی قدیم اصطلاحوں کو، ترکیبوں کو، الفاظ کو دیکھا تو ان میں وقت کا ساتھ دینے کی بھرپور صلاحیت ہے۔ میں نے ان پر نئی دُنیا کے نئے تجربات اور نئی زندگی کے نئے تقاضوں کا بوجھ رکھنا شروع کیا۔ پہلے پہل ان کے قدم ڈگمگائے، کبھی کبھی یہ گر بھی گئے، مگر آہستہ آہستہ ان میں نیا دَم خم پیدا ہونے لگا۔ان کے چہروں پر نئی تازگی اور نئی شگفتگی آنی شروع ہوئی۔ ان کے جسموں میں نئی لچک اور ان کی آنکھوں میں نئی معنویت بیدار ہونے لگی۔آہستہ آہستہ وہ میری زندگی سے پورے طور پر ہم آہنگ ہوگئے۔ مجھے اس بات پر ضرور فخر ہے کہ برسوں کی مشق اور خونِ جگر چھڑکنے کے بعد میں نے غزل کی قدیم تکنیک اور اس کی قدیم اصطلاحات، قدیم استعاروں میں جذبۂ زندگی کی نئی معنویت سمو کر انھیں نئے زمانے کے ساتھ پوری توانائی، حسن اور تاثر کے ساتھ سفر کرنے پر آمادہ کر دیا ہے۔اب جبکہ یہ بھرپور طریقہ سے نئے زمانے سے آشنا اور اس کے علمبردار بن کر بڑھ رہی ہیں تو نئی زندگی کی بہت سی نئی آوازیں، نئی اصطلاحیں حیرت سے انھیں دیکھ رہی ہیں اور ان کے چہروں کچھ غیرت اور کچھ ندامت کے پسینے آ رہے ہیں اور کچھ انہی کے جھنڈوں کے نیچے آ کر ان کے قدم بہ قدم، شانہ بہ شانہ، چلنے کی کوشش اور اس کوشش میں کچھ کامیابی پر فخر کرنے لگی ہیں۔ یہ کوئی بڑا کارنامہ نہ ہو، لیکن بہرحال مجھے اپنی اس حقیر کوشش پر اطمینان اور سرور حاصل ہے۔میں قدیم وضع داری کا رسیا ہوں۔ مجھے ان میں جو حسن نظر آتا ہے کہیں نظر نہیں آتا۔ میرا یہ اعتماد ہے کہ وہ پسِ پشت افتادہ قدریں بھرپور کشش، تاثیر، حسن اور جمال کے ساتھ نمایاں ہوں گی۔سوٹ، ٹائی، شرٹ اور پینٹ کے کھچاکھچ ماحول میں بھی میں نے آج تک کرتہ، پائجامہ، شیروانی، ٹوپی کی وضع نہیں بدلی۔کبھی سوٹ نہ پہنا، کبھی ٹائی نہ لگائی، درانحالیکہ اُردو کے ساتھ انگریزی زبان و ادب کا بھی برابر ساتھ رہا اور الحمدللہ میں بہت سے مستقل سوٹ پہننے والوں اور ٹائی لگانے والوں سے اچھی انگریزی لکھ اور بول سکتا ہوں۔ اس کے باوجود مجھے اپنی وضع کے حسن اور اس کی کشش میں کوئی فرق نظر نہ آیا بلکہ اس کے حسن نے

ہر حسن کا چہرہ زرد کر دیا۔ میں جب پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں آیا تو سبھوں نے مجھے وضع کی تبدیلی کا پرزور مشورہ دیا، مگر الحمدللہ شیروانی سوٹ سے تو نہ بدلی، سوٹ شیروانی سے بدل گیا۔

مشاعروں سے دلچسپی بہت کم ہے اور بہت کم جاتا ہوں، مگر عوام سے اس کم آمیزی کے باوجود عوام وخواص میری رُوحِ غزل اور مزاجِ غزل سے آشنا اور ہم آہنگ ہوگئے ہیں۔ جب میں ایسی غزل پڑھتا ہوں:

کس ناز کس انداز سے تم ہائے چلو ہو　　روز ایک غزل ہم سے کہلوائے چلو ہو
دن ایک ستم، ایک ستم رات کرو ہو　　وہ دوست ہو دشمن کو بھی تم مات کرو ہو

تو میرے سننے والوں کا چہرہ غزل کے ظاہری چلتے پھرتے انداز کے باوجود بے حد سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ الفاظ اور اصطلاحات کے پردے ان کی نظروں کو نہیں روک سکتے۔ وہ نظریں پردے چاک کر کے دُور چھپی ہوئی اپنے قریب کی دُنیا کی مجسم متحرک تصویریں دیکھنے لگتی ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے:

رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں
چلنا ذرا آیا ہے تو اِترائے چلو ہو

والی غزل پٹنہ ہی کے ایک مشاعرے میں پڑھی تو پٹنہ ہی میں رہنے والے پٹنہ یونیورسٹی ہی کے ایک جواں اُستاد نے جو گرچہ مجھ سے عمر میں جونیئر ہیں مگر ملازمت میں سینئر ہیں، میری داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا ''ہائے کلیم صاحب! کی بھی تو کس سے آشنائی کی'' اور اپنی دانست میں یہ سمجھے کہ نہایت ہی برجستہ اور شاعرانہ برمحل فقرہ چست کیا ہے۔ میں نے اُن کی منڈی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا ''برادرم! بہت جلد آپ سے بھی آشنائی ہو جانے والی ہے۔ آخر کب تک کھنچے رہوگے کب تک تنی رہے گی؟'' ...... اور کبھی ایسا ہوا کہ دہلی کلاتھ ملس کے شاندار مشاعرہ میں پچھلے سال یہ غزل پڑھتے ہوئے:

یہ رنگ اشکوں کا جو لال لال ہے پیارے
بتا رہا ہے کہ کیا دل کا حال ہے پیارے

جب یہ شعر پڑھا:

وہی تو عمر مرے دردِ دل کی بھی ہوگی
ترے شباب کا یہ کون سال ہے پیارے؟

تو سب سے پیچھے عوامی درجے میں بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے اُٹھ کر زور سے چلّا کر کہا ''عاجز صاحب یہ ستائیسواں سال ہے'' ......اور میں نے جی میں کہا کہ کمی نہیں غالبؔ......فن کار اور فن شناس میں گہرا رابطہ ہے۔ مگر یہ رابطہ فن کو پست بھی کرتا ہے اور بلند بھی۔ یہ فن کو بگاڑتا بھی ہے اور سنوارتا بھی ہے۔ کہنے والا اگر سننے والے کے ذوق کا اندھا بن کر اتباع کرتا ہے تو فن کی سطح آہستہ آہستہ پست ہو جاتی ہے اس لیے کہ سننے والا ہمیشہ اس بات کا آرزومند ہوتا ہے کہ اسے فکر نہ کرنی پڑے اور فکر سے ذوق پر جلا ہوتی ہے، ورنہ زنگ آلود ہوتے ہوتے بالکل کند ہو جاتا ہے اور اگر فن کار سننے والوں کو اندھا سمجھ کر آگے بڑھنا چاہتا ہے تو خود فن کار کی شاخِ فکر ناتراشیدہ ہوتی جاتی ہے۔ فن کار اور فن شناس دونوں ایک دوسرے کے ذوق کی تراش خراش کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے معلم اور متعلّم ہیں۔ یہ رابطہ بڑا نازک ہے...... میں سننے والوں کے ذوق سے بے نیاز اور بے پرواہ نہیں رہا لیکن میں ان کی طرف کھنچا نہیں بلکہ اُنھیں اپنی طرف کھینچنے کی ہمیشہ کوشش جاری رکھی اور یہ کوشش کامیاب ہے۔ وہ اب آسانی سے سمجھنے لگے ہیں کہ میرے اشعار میں لفظوں کا ایک تو سطحی مفہوم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ایک دوسرا مفہوم بھی ہوتا ہے۔ وہ سمجھنے لگے کہ سادگی، صفائی اور سہلِ ممتنع میں بھی تہہ داری اور گہرائی ہوتی ہے۔ وہ یہ ماننے پر مجبور ہوئے کہ قدامت میں بھی جدّت ہوسکتی ہے۔ وہ اعتراف کرنے لگے کہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کو الگ الگ خانوں میں رکھنے کی ضرورت نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کا بدل بھی ہوسکتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کا عکس، پرتو اور ترجمان بھی ہو سکتے ہیں۔ جن الفاظ سے انگرکھا، شیروانی اور مرزئی بن سکتی ہے، ان ہی الفاظ سے بش شرٹ اور پینٹ بھی بن سکتا ہے۔ یہ جھونپڑے کے خس و خاشاک بھی بن سکتے ہیں اور محلوں کے سنگ وخشت بھی۔ یہ چٹائی اور بوریہ بھی بن سکتے ہیں اور مخملی گدّے اور اطلسی چادر بھی۔ یہ جامِ سفال بھی بن سکتے ہیں اور جامِ جم بھی۔ الفاظ زمان اور مکان کے پابند بھی ہیں اور زمان و مکان بھی الفاظ کے پابند بن سکتے ہیں۔ وقت الفاظ کی طنابیں کھینچ سکتا ہے اور الفاظ وقت کی طنابیں بھی کھینچ سکتے ہیں:

تم میرے فکروفن کا اگر حوصلہ بڑھاؤ
دُنیا میں کھینچ لاؤں فضائے بہشت کو

یہ افہام و تفہیم بڑا دردِ سر ہے، مگر دردِ سر ہی صندل بھی لگواتا ہے۔ اس کاروبارِ شاعری کے لیے خونِ

جگر کی ضرورت ہے، مگر یہ خونِ جگر سرخی و شگفتگیِ فن بھی بنتا ہے۔ میں نے سرخی و شگفتگیِ فن کے لیے صرف خونِ جگر میں بخالت نہیں کی۔

میں ایک لحاظ سے کنگال ہوں، لیکن دوسرے اعتبار سے صاحبِ مال بھی ہوں:

اس غریبی میں بھی چلتے ہیں سر اُونچا کر کے
ہم بھی اے دوست کا ہدار ہیں اپنے گھر کے

میں مٹا ہوا ہوں مگر اس مٹنے میں بھی ایک آن بان ہے۔ ایک وضع ہے، ایک شان ہے:

سنا ہے خاک بھی ہو کے ہم لاجواب ہوئے
اگر یہ سچ ہے تو اچھا ہوا ہم خراب ہوئے

الفاظ کی بات آ گئی تو یہ بات عرض کر دوں کہ میری زندگی میں خیال، بات اور شعر میں کوئی بعد یا فرق نہیں ہے۔ میں جس طرح جن الفاظ میں سوچتا ہوں ان ہی الفاظ میں باتیں کرتا ہوں اور جن الفاظ میں باتیں کرتا ہوں ان ہی لفظوں میں شعر کہتا ہوں۔ فرق صرف ترتیب اور ترکیب کا ہوتا ہے۔ اس ترکیب اور ترتیب کو میں نے کتابوں سے حاصل نہیں کیا ہے۔ یہ میرا اپنا ہے اور کسی کے مشورے سے بھی نہیں اپنایا گیا ہے۔ یہ میرؔ کی پیروی نہیں، میں پیرو کسی کا نہیں۔ میں نے میرؔ کو کالج کا لکچرر بننے کے بعد اچھی طرح جانا اور پہچانا اور سمجھا اور یہ بات ۱۹۶۶ء کے بعد کی ہے۔ اس سے قبل میں میرؔ کے چند اشعار جانتا تھا۔ کچھ حالات سے واقفیت تھی۔ میرے کالج کے دورانِ تعلیم بی اے آنرس یا ایم اے کے نصاب میں میرؔ شامل نہیں تھے۔ میں نے ابتدا میں عرض کیا ہے کہ میری شناسائی ابتدا ہی سے بھائی ظفر امام صاحب کے ذریعہ غالبؔ سے ہوئی۔ مجھے غالبؔ کے صدہا اشعار اُس وقت بھی یاد تھے اور اب بھی ہیں۔ غالبؔ میرا دل پسند شاعر تھا۔ ہر موقع اور محل پر غالبؔ کے اشعار پڑھتا۔ جب غالبؔ فلم آئی اور میں نے پہلے پہل غالبؔ فلم دیکھی تو دورانِ تماشہ فلم کم دیکھا، رویا زیادہ۔ فلم دیکھنے کے دوران میں اس قدر رویا کہ سر میں درد ہونے لگا اور واپس آ کر رات بھر روتا رہا...... اس قدر قربت اور وابستگی کے باوجود میری شاعری کی دُنیا میں غالبؔ کسی جھروکے سے جھانکتے بھی نظر نہیں آتے۔ آپ آسانی سے کہہ دیں گے کہ غالبؔ کی پیروی آسان نہیں۔ حالانکہ واقعتاً تاریخی اعتبار سے یہ غلط ہے۔ اگر پیروی میرے مزاج میں ہوتی تو میں بہ آسانی غالبؔ کی پیروی کر سکتا تھا، لیکن اتباع میری خمیرِ فطرت کے خلاف

ہے۔ میؔر سے کسی قدر جو مشابہت ہے، یہ مشابہت فن سے نہیں، زندگی سے آئی ہے، جس کا شعوری احساس بہت بعد میں مجھے ہوا تو میں نے عرض کیا کہ جو میرے خیال کی زبان ہے وہی میری گفتگو کی اور جو میری گفتگو کی زبان ہے وہی میرے اشعار کی زبان ہے اور میرے خیال اور میری بول چال مستعار نہیں۔ مجھے اب اس کا احساس ہے کہ میرے طلبا میرے کلاس میں مجھ سے اس لیے بھی خوش رہتے ہیں کہ میرے اشعار ہی کی زبان میرے لکچروں میں انھیں ملتی ہے۔ میرے بزرگ پروفیسر اخترؔ قادری نے بڑے اعتماد سے اس کی تاویل کی ہے کہ میؔر کی زبان دراصل بہاری مگدھی زبان ہے اور ایک رشتہ یوں ملتا ہے کہ میؔر کے پہلے استاد جنھیں واقعی میؔر نے اُستاد مانا ہے اور بڑی عظمت، محبت اور احترام سے 'ذکرِ میؔر' میں جگہ دی ہے وہ مرزا جعفر علی خاں حسرؔت عظیم آبادی ہیں۔

تعمیر آرٹ کا بنیادی مقصد ہے۔ انسانیت کے گھاؤ دیکھے نہیں جاتے۔ میں نے اپنے گھاؤ کے آئینہ میں دُنیا کے گھاؤ دیکھے، دونوں کی ہم آہنگی نے مجھے رُلایا۔ اگر مجھے گھاؤ نہ لگتے تو شاید مجھے دُنیا کے گھاؤ نظر نہیں آتے۔ مجھے اپنے گھاؤ سے پیار ہے، لیکن دُنیا کے گھاؤ سے دُکھ ہے۔ جی چاہتا ہے سارے گھاؤ مجھے لگ جائیں، دُنیا کا چہرہ صاف ستھرا ہو کر نکھر آئے:

مرے دل کو ہے جنوں سے بڑی اعتقاد مندی
ترے سامنے اِسی نے مجھے جرأتِ سخن دی

یہی احساس، فن ہے، لیکن یہ احساس، فن کیسے بنتا ہے اور کیسے بنا، یہ مجھے پتہ نہیں۔ اگر اپنا ہی زخم شعر بن سکتا تو ۱۹۴۶ء کے بعد میں فوراً شعر کہنے لگتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ درمیان میں پانچ چھ سال کا وقفہ ہے۔ اِس زخم نے مجھے آنکھیں عطا کیں اور وہ نظریں بخشیں جن سے میں اوروں کے زخم دیکھنے کے قابل ہوا اور زخموں نے آپس میں رابطہ پیدا کیا اور یہ فن کے لیے راستہ بنا۔ اِسی ترتیب کا نام غمِ دل اور غمِ دوراں کا امتزاج، غمِ جاں اور غمِ جاناں کا اشتراک، غمِ عشق اور غمِ روزگار کا اتحاد ہے۔ بغیر اس امتزاج، اشتراک اور اتحاد کے دیرپا فن وجود میں نہیں آ سکتا۔ یہ باتیں میں ایک سخن شناس اور سخن فہم کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں، شاعر کی حیثیت سے نہیں۔ جب میں شعر کہتا ہوں تو مجھے یہ سب کچھ یاد نہیں رہتا۔ شعر کہتے ہوئے نہ میرے ذہن میں کوئی مقصد رہتا ہے، نہ موضوع، نہ کوئی منزل۔ بس ایک کشمکش رہتی ہے، ایک کرب رہتا ہے، ایک خوشگوار

کرب۔ ایک تڑپ رہتی ہے، ایک خوش آہنگ تڑپ۔ دل کے جوڑوں میں ایک اینٹھن رہتی ہے، ایک پرسرور اینٹھن ،اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ۔شعر کہنے کے بعد شاعر کو ایک اضطراب رہتا ہے، ایک ناقابلِ ضبط تقاضہ ہوتا ہے شعر سنانے کا۔ میری ساری کیفیتیں اور ساری لذتیں شعر کہنے میں ہیں ۔ ایک غزل کہتا ہوں اور ہفتوں بلکہ کبھی کبھی مہینوں گنگناتا رہتا ہوں، لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی اور سن نہ لے۔ اس دوشیزۂ فن پر کسی کی نگاہ نہ پڑ جائے۔ میں تنہا اس سے لذت لینا چاہتا ہوں اور اسے تنہا پیار کرنا چاہتا ہوں، اگر کسی مشاعرہ میں یا ریڈیو پر غزل پڑھ لی تو پھر اُس غزل سے پیار کی گرمی اور لذتّ کی چاشنی کم ہوجاتی ہے۔ اسی لیے رفتہ رفتہ اشاعت و طباعت سے دل پھر گیا۔ میں اس کیفیت کی تشریح وتوجیہ کچھ نہیں کرسکتا۔ کوئی اِسے اچھا کہے یا برا کہے، اسے ہوشیاری کہے یا دیوانہ پن کہے۔ اور اب جبکہ یہ اچھا یا برا، ہوشیاری یا دیوانہ پن سب کے سامنے آرہا ہے تو میں اِن سطور میں اُس ہوشیاری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا جو سب یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ اہلِ ذوق میری غلطیوں سے چشم پوشی کرلیں یا میری اصلاح فرمادیں جن کی آئندہ ایڈیشن میں تلافی کی جائے گی۔ میں نے کوئی بڑا فن نہیں پیش کیا ہے۔ نہ میں نے کوئی انقلابی قدم اُٹھایا ہے۔ یہ تو پامالیوں کی وہ سرگزشت ہے جو ازل سے اس وقت تک ہوتی آئی ہے اور قیامت تک ہوتی رہے گی۔ یہ تو اُس کراہ کی صدائے بازگشت ہے جو انسان کے دل سے پہلی بار نکلی ہوگی اور یہ آواز اُس وقت تک سنائی دے گی جب تک انسان اور اس کا دل اور دل پر چوٹ لگنے کا سلسلہ اس کائنات میں باقی رہے گا۔ یہ آواز کبھی پرانی نہیں ہوتی اور کبھی پرانی نہیں ہوگی ۔میرا فن بھی اسی سلسلۂ آواز کی ایک کڑی ہے۔ میں نے اسے نئے رنگوں سے نہیں سجایا ہے جن کے پرانے ہوجانے کا خطرہ ہو۔ ہاں ایک بات عرض کروں گا۔ لوگ دل کی باتوں کو بہت زیادہ دماغی باتوں سے آراستہ کرکے اور تہہ دار بنا کر پیش کرنے کے عادی ہوتے جارہے ہیں ۔ میں دل اور دماغ کو علیحدہ علیحدہ کارفرما اور عامل نہیں مانتا۔ دونوں کا عمل متوازی چلتا ہے، اس لیے انھیں متوازن ہی رہنا چاہیے اور یہ توازن فطری ہے۔ بغیر دونوں کے اشتراکِ عمل کے فن پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ میں ''نکتۂ چند بہ پیچیدہ بیانے'' کا بالکل قائل نہیں۔ میں دونوں میں کسی کو حاکم ومحکوم، غالب ومغلوب نہیں سمجھتا۔ یہ دونوں ہنس مکھ ساتھی ہیں۔ ایک دوسرے کے فرماں بردار، ایک دوسرے کے یار، ایک دوسرے کے حال آشنا، رمز شناس، معاون و مددگار ہیں۔ دونوں

ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے شانہ سے شانہ ملائے قدم بہ قدم چلتے ہیں۔ کوئی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش نہیں کرتا۔ میرے یہاں دونوں کی ہم آہنگی ہم مزاجی مقدم ہے۔

میں نے چبا کر بھی بات نہیں کی ہے، دل کھول کر رکھ دیا ہے اور 'دل' والوں کے سامنے رکھا ہے، 'دماغ' والوں کے سامنے نہیں۔ اور یقین سے رکھا ہے، اعتماد سے رکھا ہے۔ اُسی اعتماد سے جس اعتماد سے میرؔ صاحب کہتے ہیں کہ:

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا
کہتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دُھنیے گا

میں جانتا ہوں لوگ مجمع میں سر نہ دُھنیں گے، محفلوں میں گردنیں کج کیے رہیں گے، لیکن جب وہ تنہائیوں میں، خلوتوں میں گنگنائیں گے یا کتاب کھولیں گے تو سر دُھنیں گے۔ زبان ہم آہنگ نہ ہو دل ہم آہنگ ہوگا۔ میرے دوست بھی ہیں اور دشمن بھی، لیکن مجھے یقین ہے کہ میری باتوں کا دشمن کوئی نہیں ہے۔ میرے مخالف بھی ہیں اور موافق بھی، لیکن اُس آواز کا کوئی دشمن نہیں ہے، جو ان الفاظ اور حروف کے پردے میں چھپی ہوئی ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ سب کے دل کا چور ہے اور سب کی دُکھتی ہوئی رگ ہے۔ یہ صدائے دردِ حیات ہے، اِس درد میں سب مبتلا ہیں۔ میں سب کے چہروں سے گزر کر دل کے اندر اُتر کر دیکھ چکا ہوں۔ مجھ سے کسی کا دل چھپا ہوا نہیں ہے۔ مجھے وہ مسکراہٹیں کیا دھوکا دیں گی جن کا سرچشمہ خشک ہو چکا ہے، وہ عارض ولب کیا فریب دیں گے جو سرخیِ غازہ کے رہینِ منّت ہیں، یا کراماتِ بادۂ احمر کے احسان مند ہیں، اس لیے میں ڈرتے ڈرتے اور سہمتے سہمتے اپنے پڑھنے والوں کے سامنے نہیں آرہا ہوں، بلکہ میں تو للکارتا ہوا آرہا ہوں کہ چھوڑیئے ان جھوٹی مسکراہٹوں کو اور پونچھیے اس بازاری سرخیِ غازہ کو......اور:

دیکھیے میری غزل میں کبھی صورت اپنی
یہ وہ آئینہ ہے جو آپ نے کم دیکھا ہے

❁❁

مقدمہ اشاعتِ سوم

□ کلیم عاجزؔ

سلگنا اور شے ہے جل کے مرجانے سے کیا ہوگا
جو ہم سے ہو رہا ہے کام پروانے سے کیا ہوگا

بات سامنے کی ہے اور بہت سوں کے تجربے کی ہے اور ایک دُنیا بغیر تجربے کی بھی اس منزل سے گزرتی ہے۔ کتنے پیاسے، کتنے آسودہ ایسے ہیں جنھیں اپنی تشنگی اور ناآسودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ کسی کے دل کی پکار سن لیتے ہیں تو اُنھیں یاد آ جاتا ہے کہ یہ تو میری ہی آواز ہے:

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

حالانکہ لذّت تقریر میں نہیں ہوتی، لذّت دل میں ہوتی ہے جسے تقریر نمایاں کر دیتی ہے۔ تمام فنون اور تمام شعر و ادب کا یہی کام ہے۔ پھول کی پتّی سے ہیرے کا جگر کٹ جاتا ہے مگر مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر ہوتا ہے۔ حالانکہ مردِ ناداں اور مردِ دانا کے دل کی ساخت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ فن کا کام احساس پیدا کرنا نہیں، احساس کو بیدار کرنا ہے۔ جو دل احساس سے محروم ہیں اس کی پیدائش کا کیا سوال ہے۔

'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کا یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔ پہلا ایڈیشن نایاب ہے۔ دوسرا بھی دستیاب نہیں۔ اگر میخانے میں یہ آواز گونجتی رہی تو پیمانے آتے رہیں گے، ہاتھوں ہاتھ لبوں تک پہنچتے رہیں گے اور ساقی سے مخاطب ہو کر کہا جاتا رہے گا:

یہ جام تو واللہ غضب کر گیا ساقی
ایسی تو کبھی تو نے پلائی ہی نہیں تھی

اپنی شاعری کے دورِ آغاز میں جب یہ شعر کہا:

یہ کشش اظہارِ غم میں ہے کبھی جانا نہیں
وہ بھی سر دُھننے لگے ہیں جن کا افسانہ نہیں

تو واقعی یہی تجربہ تھا۔ آسودگانِ ساحل بھی ہم طوفان آشنا ستم رسیدوں سے ہم آہنگ ہو رہے تھے لیکن پھر تو یہ حال ہو گیا:

یہ قصہ ہے میرا مگر بیش و کم
یہی آپ سب کا فسانہ بھی ہے

اب تو سمندر کے طوفان نے ساحل کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اب تمام سمندر ہی سمندر ہے۔

اس ایڈیشن میں سولہ غزلوں کا اضافہ ہے۔ بعض غزلوں میں کچھ اشعار بھی حال میں اضافہ کیے گئے ہیں۔

میں نے جو کچھ کہا ہے اُسے آپ یا تمام احباب تاثیر سے لبریز کہتے ہیں۔ میں اُسے تاثیر نہیں کہتا، تاثیر تو ہر اُس آواز میں ہوتی ہے جو دل سے نکلتی ہے۔ اس میں کچھ اور بھی ہے۔ اس میں ایک پکار ہے، ایسی پکار جس کے سب منتظر ہوں۔ جیسے کسی قافلے کے لوگ منتشر ہو گئے ہوں، سب کو تنہائی کا احساس ہو، لیکن تنہا کیسے ہوئے، کہاں سے ہوئے، کیوں ہوئے، یہ احساس نہ ہو۔ اس منتشر قافلے کو یکجا کر کے قافلہ بنانے کی ایک پکار ہے جسے میں نے شاید غیر شعوری طور پر تیس سال پہلے کہا تھا:

جمع ہونے تو دو اُجڑے ہوئے میخواروں کو
پھر بنالیں گے کوئی بزمِ خرابات نئی

یہ پکار بعد میں شعوری ہو گئی اور پکار جاری ہے۔ دیکھئے یہ میخوار کب اکٹھے ہوتے ہیں اور نئی بزمِ خرابات کب بنتی ہے، اُس وقت تک:

ہے مشورہ دوستوں کو میرا کہ کم نہ ہو گرمیِ تمنّا
چراغ خلوت ہی میں جلاؤ اگر کوئی انجمن نہیں ہے

دُعا

رات جی کھول کے پھر میں نے دُعا مانگی ہے
اور اِک چیز بڑی بیش بہا مانگی ہے

اور وہ چیز نہ دولت نہ مکان ہے نہ محل
تاج مانگا ہے نہ دستار و قبا مانگی ہے

نہ تو قدموں کے تلے فرشِ گہر مانگا ہے
اور نہ سر پہ کلہِ بالِ ہما مانگی ہے

نہ شریکِ سفر و زادِ سفر مانگا ہے
نہ صدائے جرس و بانگِ درا مانگی ہے

نہ سکندر کی طرح فتح کا پرچم مانگا
اور نہ مانندِ خضر عمرِ بقا مانگی ہے

نہ کوئی عہدہ نہ کرسی نہ لقب مانگا ہے
نہ کسی خدمتِ قومی کی جزا مانگی ہے

نہ تو مہمانِ خصوصی کا شرف مانگا ہے
اور نہ محفل میں کہیں صدر کی جا مانگی ہے

میکدہ مانگا نہ ساقی نہ گلستاں نہ بہار
جام و ساغر نہ مئے ہوش رُبا مانگی ہے

نہ تو منظر کوئی شاداب و حسیں مانگا ہے
نہ صحت بخش کوئی آب و ہوا مانگی ہے

محفلِ عیش نہ سامانِ طرب مانگا ہے
چاندنی رات نہ گھنگھور گھٹا مانگی ہے

بانسری مانگی نہ طاؤس نہ بربط نہ رباب
نہ کوئی مطربۂ شیریں نوا مانگی ہے

چین کی نیند نہ آرام کا پہلو مانگا
بختِ بیدار نہ تقدیرِ رسا مانگی ہے

نہ تو اشکوں کی فراوانی سے مانگی ہے نجات
اور نہ اپنے مرضِ دل کی شفا مانگی ہے

نہ غزل کے لیے آہنگ نیا مانگا ہے
نہ ترنم کی نئی طرزِ ادا مانگی ہے

سن کے حیران ہوئے جاتے ہیں اربابِ چمن
آخرش کون سی پاگل نے دُعا مانگی ہے

آ، ترے کان میں کہہ دوں اے نسیمِ سحری
سب سے پیاری مجھے کیا چیز ہے کیا مانگی ہے

وہ سراپائے ستم جس کا میں دیوانہ ہوں
اُس کی زلفوں کے لیے بوئے وفا مانگی ہے

''حادثۂ بیت المقدس کے چند دن بعد حضرت مولانا منّت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار واڑیسہ نے فرمائش کی تھی کہ ایک نظم اس حادثۂ جانکاہ پر لکھیں، یہ نظم اس دَور میں مقتدر اُردو اخبارات او رہفتہ وار رسالوں میں چھپی اور اس کی دو ہزار نقلیں مطبع میں چھاپ کر مدینہ منورہ لے جائی گئیں اور وہاں روضۂ اقدس پر تمام تقسیم کی گئیں، ہزاروں لوگوں کی زبانوں پر اس کے متفرق اشعار ہیں، میری تمام نعتیں اسی طرح کی مخصوص حادثہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں جومختلف زمانے میں ملت اسلامیہ پر گزرے۔''

زخم کھائے ہوئے سر تا بہ قدم آئے ہیں
ہانپتے کانپتے یاشاہِ امم آئے ہیں

سرنگوں آئے ہیں بادیدۂ نم آئے ہیں
آبرو باختہ دل سوختہ ہم آئے ہیں

کھو کے بازار میں سب اپنا بھرم آئے ہیں
شرم کہتے ہوئے آتی ہے کہ ہم آئے ہیں

آپ کے سامنے جس حال سے ہم آئے ہیں
ایسے مجرم کسی دربار میں کم آئے ہیں

شرق سے غرب کہیں کوئی ٹھکانہ نہ ملا
ٹھوکریں کھا کے ہر اِک سمت سے ہم آئے ہیں

گرچہ بے سوز ہیں بے ساز ہیں بے ساماں ہیں
پھر بھی خالی نہیں سرکار میں ہم آئے ہیں

لے کے اُردن کے جوانانِ بنی ہاشم کا
حوصلہ آئے ہیں دم آئے ہیں خم آئے ہیں

لے کے ہم پیشکشِ خدمتِ عالی کے لیے
تحفۂ خونِ شہیدانِ حرم آئے ہیں

بیتِ مقدس کے غریب الوطنوں کا لے کر
جگر سوختۂ و دیدۂ نم آئے ہیں

مختصر یہ ہے کہ اس سینۂ سوزاں میں لیے
وقت کا سب سے دہکتا ہوا غم آئے ہیں

یہ غم ایسا ہے کہ پھر غم نہ کوئی یاد رہا
یوں تو ہر دَور میں رنج آئے ہیں غم آئے ہیں

آپ کے سایۂ دامن سے جو ہم دُور ہوئے
ٹوٹ کر چار طرف اہلِ ستم آئے ہیں

اور یہ کہتے ہیں کہ تم لوگ اِسی قابل ہو
بہت آئیں گے مصائب ابھی کم آئے ہیں

اِک نگاہِ غلط انداز کے سائل بن کر
مجرمانِ اُمم یا شاہِ اُمم آئے ہیں

اب تو اس در سے نہ سر اُٹھے گا انشاء اللہ
جان دے دیں گے یہیں سوچ کے ہم آئے ہیں

ابتدائی دَور کی غزلیں

خوشی بیکار غم ہے بے نتیجہ کون سمجھے گا؟
جو سمجھا ہے تجھے ہم نے اے دُنیا، کون سمجھے گا؟
یہاں جیب وگریباں ہی میں عزّت سمجھی جاتی ہے
ہماری چاک دامانی کا رُتبہ کون سمجھے گا؟
ہمیں تو ہم زبانِ میکدہ ہیں ہم نہ سمجھیں گے
تو ساقی گفتگوئے جام و مینا کون سمجھے گا؟
گرادی اپنی قیمت ہم نے اپنی ہی نگاہوں میں
بُرا ہم خود ہی سمجھیں گے تو اچھا کون سمجھے گا؟
تم اہلِ انجمن میں جس کو چاہو بے وفا کہہ دو
تمھاری انجمن ہے تم کو جھوٹا کون سمجھے گا؟
یہ زُلفیں کس طرح سلجھائیں ہم نے ہم سمجھتے ہیں
کسے سمجھانے جائیں، یہ بکھیڑا کون سمجھے گا؟
غنیمت ہے ابھی ہم ہیں سنا لیجیے غزل عاجزؔ
ہمارے بعد اُردوئے معلیٰ کون سمجھے گا؟

دِل زمانہ ہوا شاداب نہیں شاد نہیں
کب بہار آئی تھی اِس باغ میں کچھ یاد نہیں
یہ نشیمن نہ گلستاں کا پتہ چلتا ہے
اَب کوئی خاک نہیں ایسی جو برباد نہیں
جو تمھارے لیے بے نام ونشاں ہو کے رہا
میں وہی ننگِ زمانہ ہوں، تمھیں یاد نہیں؟
اِس زمانے میں بھی یہ ظرف ہمارا دیکھو
غم وہ رکھتے ہیں جو شرمندۂ فریاد نہیں
ظلم اَب بھی وہی کرتے ہو جو کرتے آئے
تم ستمگر ہی فقط ہو ستم ایجاد نہیں
سب ہی ممنونِ کرم اے غمِ دوراں نکلے
کون گھر فیضِ قدم سے ترا آباد نہیں
کرلی اِس فن میں بھی گلچیں نے مہارت پیدا
سن رہے تھے کہ چمن میں کوئی صیّاد نہیں

شام ایسی نہ اَب ایسی سحر مانگ رہی ہے　　دُنیا نئی دُنیا کی خبر مانگ رہی ہے
معلوم نہیں ، تم کو پتہ ہے کہ نہیں ہے　　کچھ تم سے زمانے کی نظر مانگ رہی ہے
شبنم سے فقط کام چلا ہے نہ چلے گا　　پھولوں کی زباں خونِ جگر مانگ رہی ہے
افسوس کہ تعمیر کی فرصت نہیں مجھ کو　　پھر خانہ خرابی مرا گھر مانگ رہی ہے

اک شور ہے میں نے تمھیں پہچان لیا ہے
ہر آنکھ مرا ذوقِ نظر مانگ رہی ہے

کرتا نہیں جب اِن سے کوئی پیار، کیا کریں　　دامن سے بھی نہ اُلجھیں اگر خار، کیا کریں؟
احباب خدمتِ رَسن و دار کیا کریں　　دیوانوں کا یہ کام ہے ہُشیار کیا کریں
ہم خود ہی التفات کے قابل نہیں رہے　　تیری شکایت اے نگہِ یار کیا کریں
دُنیا بغیرِ عشق ہمیں ناپسند ہے　　یوسف نہیں تو مصر کا بازار کیا کریں
آواز دے رہے ہیں تقاضے نئے نئے　　اَب گفتگوئے کاکُل و رُخسار کیا کریں

ہم نے تو مہرباں لبِ فریاد سی لیے
زنجیر سے نکلتی ہے جھنکار کیا کریں

قائم ہے سُرورِ مئے گلفام ہمارا　　کیا غم ہے اگر ٹوٹ گیا جام ہمارا
اتنا بھی کسی دوست کا دُشمن نہ ہو کوئی　　تکلیف ہے اُن کے لیے آرام ہمارا
پھولوں سے محبت ہے تقاضائے محبت　　کانٹوں سے اُلجھنا تو نہیں کام ہمارا
بھولے سے کوئی نامِ وفا کا نہیں لیتا　　دُنیا کو ابھی یاد ہے انجام ہمارا
غیر آکے بنے ہیں سببِ رونق محفل　　اَب آپ کی محفل میں ہے کیا کام ہمارا

موسم کے بدلتے ہی بدل جاتی ہیں آنکھیں
یارانِ چمن بھول گئے نام ہمارا

ایسی بہار آئی کہ اَب کے بہار میں
سایہ نہیں کسی شجرِ سایہ دار میں

کیا ہوگی اے جنوں تری خاطر بہار میں
اِک پیرہن تھا وہ بھی نہیں اختیار میں

کیوں روشنی نہ ہو چمنِ روزگار میں
بیٹھا ہوں گھر کو آگ لگا کر بہار میں

تُو اَے کرن اُمید کی ہے کس دیار میں
اَب تو سحر سے شام ہوئی انتظار میں

کیا کیا نہ فصلِ گل کی تمنّا خزاں میں تھی
کرتے ہیں اَب خزاں کی تمنّا بہار میں

ہیں ایک ہی چمن میں مگر فرق ہے بہت
اُن کی بہار اور ہماری بہار میں

عاجزؔ یہ تم نے کیا غزل بے مزہ پڑھی
اِک شعر میں نہیں صفتِ زُلفِ یار میں

اِنقلاباتِ چمن کا ترجماں بنتا رہا
شعر جو کہتے رہے ہم داستاں بنتا رہا

خونِ دل سے نقشِ معنی و بیاں بنتا رہا
اِک چمن مٹتا رہا، اِک گلستاں بنتا رہا

دشتِ غربت میں غبارِ دشت کا احساں نہ پوچھ
ہم جہاں جاتے رہے اِک سائباں بنتا رہا

کم نہیں ہے آبِ حیواں سے محبت کی شراب
دل یہ مئے پیتا رہا اور نوجواں بنتا رہا

کچھ نہ کچھ اہلِ جنوں ہر دَور میں باقی رہے
اِک اگر لُٹتا رہا اِک کارواں بنتا رہا

کیفیت کس درد کی تجھ سے کہوں اے ہم نشیں
روز ہی اِک درد دِل کا میہماں بنتا رہا

کوئی عاجزؔ کا شریکِ سوزِ غم بنتا نہیں
یوں تو جو آتا رہا وہ مہرباں بنتا رہا

اَب محفلِ سخن میں بھی لطفِ سخن نہیں
دل انجمن نہیں تو کہیں انجمن نہیں

سودا نہیں جنوں نہیں دیوانہ پن نہیں
جینا ہے گر یہی تو یہ جینے کا فن نہیں

غیروں کی انجمن تو ہے غیروں کی انجمن
اَب میری انجمن بھی مری انجمن نہیں

بے پردگی تو یہ ہے کہ سینہ ہے غم سے چاک
پردہ یہ ہے کہ چاک کہیں پیرہن نہیں

اِس غم کدے میں ہم بھی عجب وضع دار ہیں
دل ہے لہو لہان جبیں پر شکن نہیں

راحت سے احتیاط مصیبت سے ارتباط
عاجزؔ یہ اور کیا ہے جو دیوانہ پن نہیں

دل دے چکے ہیں عہدِ وفا کر چکے ہیں ہم
پہلے ہی اپنے حق میں بُرا کر چکے ہیں ہم

وہ انجمن اَب اہلِ ستم کی ہے جلوہ گاہ
روشن جہاں چراغِ وفا کر چکے ہیں ہم

معلوم ہے جو قدرِ وَفا اُن کے دل میں ہے
سَو بار اُن سے عرضِ وفا کر چکے ہیں ہم

دُنیائے عشق وادیِ پُرخار ہی سہی
اَب تو جنوں کو برہنہ پا کر چکے ہیں ہم

ہاں شوق سے حوالۂ دار و رَسن کرو
اَے دوست اَب تو جرمِ وفا کر چکے ہیں ہم

کس کس جگہ بیاضِ وطن سے مٹاؤ گے
ہر ہر ورق پہ مہرِ وفا کر چکے ہیں ہم

وہ محوِ ناز ہیں قدرِ نیاز کون کرے — اِدھر یہ شرم کہ دامن دراز کون کرے
ہمیں بھی راز بہارِ چمن کا ہے معلوم — سوال یہ ہے کہ افشائے راز کون کرے
اِسی لیے خلشِ زخمِ دل گوارا ہے — کہ منّتِ کرمِ چارہ ساز کون کرے
رہا نہ جب ہوس و عشق کا کوئی معیار — تو جرأتِ گنہِ امتیاز کون کرے
ہر ایک سمت ہے ہنگامۂ جنوں برپا
خرد سے بیٹھ کے راز و نیاز کون کرے

نہ پوچھ کیوں گلۂ دوستاں نہیں ہوتا — یہ درد وہ ہے جو مجھ سے بیاں نہیں ہوتا
روِش روِش پہ چمن کی کچھ ایسا عالم ہے — کہ امتیازِ بہار و خزاں نہیں ہوتا
اُس انجمن میں تلاشِ رفیقِ غم ہے مجھے — جہاں کسی کا کوئی راز داں نہیں ہوتا
قفس میں سب ہے میسر پہ کیا کروں صیّاد — نظر سے دُور کبھی آشیاں نہیں ہوتا
میری وفا کا زمانے میں دیکھ کر انجام — کسی کو حوصلۂ امتحاں نہیں ہوتا
یہ دھوم آپ کی زنجیر کی نہیں ہوتی
ہمارا پاؤں اگر درمیاں نہیں ہوتا

بنا کے لالہ و گُل کا مزار گزری ہے — جہاں جہاں سے نسیمِ بہار گزری ہے
یہ کس کا نقشِ قدم ہے پتہ نہیں چلتا — خزاں گئی ہے کہ فصلِ بہار گزری ہے
وہ رات اہلِ گلستاں کبھی نہ بھولیں گے — جو زیرِ سایۂ زُلفِ بہار گزری ہے
نشانِ قافلۂ رنگ و بُو نہیں ملتا — صبا تلاش میں دیوانہ وار گزری ہے
غزل کے بھیس میں کس کس مقام سے عاجزؔ
حکایتِ رُخ و گیسوئے یار گزری ہے

ہم غریبوں پہ تو الزام ہے بیجا تیرا
اَب تو اغیار بھی کرنے لگے شکوا تیرا

کھیل معلوم ہے سب اے ستم آرا تیرا
بیٹھے ہم دیکھتے رہتے ہیں تماشا تیرا

بے زباں جیتے ہیں بے نام ونشاں مرتے ہیں
ہم تو رکھتے ہیں ہر اِک حال میں پردا تیرا

عافیت جھوٹی تسلّی سے نہیں ہوسکتی
زخم دل پر کبھی ٹھہرا نہیں پھاہا تیرا

جوشِ وحشت میں بھی رکھتے ہیں گریباں محفوظ
یہ ہوا چاک تو کھل جائے گا پردا تیرا

پہلے اتنا ہوسِ جوشِ جنوں عام نہ تھا
اَب تو بازار میں بِکنے لگا سودا تیرا

رِند کرتے ہیں شکایت تو غلط کرتے ہیں
میکدہ تیرا ہے ، مَے تیری ہے ، مینا تیرا

وہ چاہے، کوئی بلا سے نہ چاہے، پیا چاہے
اُسی کو کہیے سُہاگن جِسے پیا چاہے

کسے مجال ہے ، مسند کہ بوریا چاہے
وہ دینے والا ہے دے جس کو دیا چاہے

وہ محترم نہ رہے گا کسی کی نظروں میں
تری نظر جسے بے آبرو کیا چاہے

یہ دَور وہ ہے شرافت سنبھل نہیں سکتی
گریباں چاک ہو دامن اگر سِیا چاہے

گزر کے مرحلۂ دار سے بھی دیکھ لیا
یہ کام سہل ہے ہمّت اگر کیا چاہے

یوں تو ساقی جام بر کف ہے سبو بر دوش ہے
کون جانے زہر ہے یا بادۂ سر جوش ہے

ہائے اربابِ نظر کی بے کسی بے چارگی
آنکھ سب کچھ دیکھتی ہے اور زباں خاموش ہے

خیریت جیب و گریباں کی نہ ہم سے پوچھئے
کس کو اس دَورِ جنوں میں پیرہن کا ہوش ہے

کیا قیامت ڈھائے گی جب تا کمر آ جائیگی
تیری زُلفِ فتنہ پرَور جو ابھی تا دوش ہے

اَب چمن میں کوئی ہنسنے بولنے والا نہیں
جو کلی ہے وہ مرے دل کی طرح خاموش ہے

وقت کے در پر بھی ہے بہت کچھ وقت کے در سے آگے بھی
شام وسحر کے ساتھ بھی چلئے شام وسحر سے آگے بھی

دار و رَسن کی ریشہ دوانی گردن و سر تک رہتی ہے
اہلِ جنوں کا پاؤں رہا ہے گردن و سر سے آگے بھی

میرے گھر کو آگ لگا کر ہمسایوں کو ہنسنے دو
شعلے بڑھ کر جا پہنچے میرے گھر سے آگے بھی

عشق نے راہِ وفا سمجھائی ، سمجھانے کے بعد کہا
وقت پڑا تو جانا ہوگا راہ گزر سے آگے بھی

آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں اس سے دھوکا کھائیں کیا
دل تو عاجزؔ دیکھ رہا ہے حدِّ نظر سے آگے بھی

غزلیں

۱۹۵۲ء تا ۱۹۷۲ء

(پہلی غزل)

خوشی ہے کیا کسی آوارۂ وطن کے لیے
بہار آئی تو آیا کرے چمن کے لیے

نہ لالہ وگل ونسریں نہ نسترن کے لیے
مٹے ہیں ہم کسی غارت گرِ چمن کے لیے

کبھی جو گوشۂ خلوت میں شمع ہاتھ آئی
لپٹ کے رو لیے یارانِ انجمن کے لیے

ہم اُن سے شکوۂ بیداد کیا کریں عاجؔز
یہاں تو پاسِ وفا قفل ہے دہن کے لیے

جدا دیوانہ پن اب ایسے دیوانے سے کیا ہوگا
مجھے کیوں لوگ سمجھاتے ہیں سمجھانے سے کیا ہوگا

سلگنا اور شئے ہے جل کے مرجانے سے کیا ہوگا
جو ہم سے ہو رہا ہے کام، پروانے سے کیا ہوگا

مرا قاتل اُنھیں کہتے ہیں سب اور ٹھیک کہتے ہیں
قسم سو بار وہ کھائیں قسم کھانے سے کیا ہوگا

مناسب ہے سمیٹو دامنِ دستِ دُعا عاجؔز
زباں ہی بے اثر ہے ہاتھ پھیلانے سے کیا ہوگا

کچھ انتہائے سلسلۂ غم نہیں ہے آج
ہر ظلم آخریں ستم اوّلیں ہے آج

میرے مذاقِ غم پہ ہر اِک نکتہ چیں ہے آج
اُن کی طرف نگاہ کسی کی نہیں ہے آج

بدنام کررہی ہے مجھے میری بندگی
ہر سنگِ آستاں پہ نشانِ جبیں ہے آج

درماں کہاں کہ پُرسشِ غم بھی نہ کرسکی
اتنی بھی اُس نگاہ کو فرصت نہیں ہے آج

پردہ حریمِ ناز کا اپنے بچایئے
فریاد کا مزاج بہت آتشیں ہے آج

انکار کررہے ہیں وہ اُسی جرمِ قتل سے
جس کی گواہ ہر شکنِ آستیں ہے آج

زنجیر اپنا ہاتھ بڑھاتی ہی رہ گئی
دیوانۂ بہار کہیں سے کہیں ہے آج

عاجؔز مری فغاں پہ ہر اِک یوں خموش ہے
جیسے کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں ہے آج

چمن اپنا لُٹا کر بلبلِ ناشاد نکلی ہے
مبارک باد تیری آرزُو صیّاد نکلی ہے!

خدا رکھے سلامت تیری چشمِ بے مروّت کو
بڑی بے درد نکلی ہے بڑی جلاّد نکلی ہے

نکل کر دل سے آہوں نے کہیں رُتبہ نہیں پایا
چمن سے جب بھی نکلی بوئے گل برباد نکلی ہے

لبِ بام آکے تم بھی دیکھ تو لو کیا تماشہ ہے
فغاں کی دوش پر لاشِ دلِ برباد نکلی ہے

پریشاں ہو کے جانِ زار کیا نکلی ہے سینے سے
کسی بیداد گر کی حسرتِ بیداد نکلی ہے

ستم کو بھی کرم ہائے نہاں کہنا ہی پڑتا ہے
کبھی نامہرباں کو مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

بنائے زندگی دو چار تنکوں پر سہی لیکن
اُنھی تنکوں کو آخر آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

بھلا ہم اور تجھ کو نازبردارِ عدو کہتے؟
مگر اے بے نیازِ دوستاں! کہنا ہی پڑتا ہے

مری آہ و فغاں کو نالۂ بلبل سے کیا نسبت
مگر اِک ہم وطن کو ہم زباں کہنا ہی پڑتا ہے

محبت خانۂ صیّاد سے بھی ہو ہی جاتی ہے
قفس کو بھی کسی دن آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

بتوں سے اتنا دیرینہ تعلق باوجود اُس کے
ہوا جو کچھ سرِ کوئے بتاں کہنا ہی پڑتا ہے

ہر اِک محفل میں جاکر ہم غزل کہتے نہیں لیکن
جہاں وہ شوخ ہوتا ہے وہاں کہنا ہی پڑتا ہے

یہ مانا عشق میں ضبطِ فغاں کی شرط لازم ہے
اُلجھتا ہے جو دل دردِ نہاں کہنا ہی پڑتا ہے

محبت بھی کیے جاتے ہیں غم کھائے بھی جاتے ہیں
گنہ کرتے بھی جاتے ہیں سزا پائے بھی جاتے ہیں

جفا کرتے بھی ہیں عُذرِ جفا لائے بھی جاتے ہیں
لہو پیتے بھی جاتے ہیں قسم کھائے بھی جاتے ہیں

اِسی نے تم کو چمکایا ہمیں برباد کر ڈالا
وفا پر ناز بھی کرتے ہیں پچھتائے بھی جاتے ہیں

وہی ہر صبح اُمیدیں وہی ہر شام مایوسی
کھلے بھی جارہے ہیں پھول مرجھائے بھی جاتے ہیں

مزا یہ ہے لیے بھی جارہے ہیں جانبِ مقتل
تسلّی بھی دیئے جاتے ہیں سمجھائے بھی جاتے ہیں

پڑے ہیں اس بُتِ کافر کے سنگِ آستاں ہوکر
مگر پامال بھی ہوتے ہیں ٹھکرائے بھی جاتے ہیں

زندگی مائلِ فریاد و فغاں آج بھی ہے
کل بھی تھا سینے پہ اِک سنگِ گراں آج بھی ہے

دلِ افسردہ کو پہلو میں لیے بیٹھے ہیں
بزم میں مجمعِ خستہ جگراں آج بھی ہے

تلخیِ کوہ کنی کل بھی مرا حصہ تھا
جامِ شیریں بہ نصیبِ دگراں آج بھی ہے

زخمِ دل کے نہیں آثار بظاہر لیکن
چارہ گر سے گلۂ دردِ نہاں آج بھی ہے

آج بھی گرم ہے بازار جفا کاروں کا
کل بھی آراستہ تھی اُن کی دُکاں آج بھی ہے

گوشۂ امن نہیں آج بھی بلبل کو نصیب
چشمِ صیّاد بہر سُو نگراں آج بھی ہے

آج بھی زخمِ رگِ گُل سے ٹپکتا ہے لہو
خوں میں ڈوبی ہوئی کانٹوں کی زباں آج بھی ہے

زندگی چونک کے بیدار ہوئی ہے لیکن
چشم و دل پر اثرِ خوابِ گراں آج بھی ہے

اِس طرف جنسِ وفا کی وہی اَرزانی ہے
اُس طرف اِک نگہِ لطف گراں آج بھی ہے

حیف کیوں قسمتِ شاعر پہ نہ آئے عاجزؔ
کل بھی کمبخت رہا مرثیہ خواں آج بھی ہے

جہاں فریاد بھی گوشِ نزاکت پر گراں گزرے
ہم ایسی بے کسی کی زندگی سے مہرباں گزرے

اسیروں سے ذرا ہٹ کر نسیمِ گلستاں گزرے
کہیں ایسا نہ ہو دل پر ملالِ آشیاں گزرے

مبارک برق تجھ کو لالہ و گل کی نگہبانی
کہ اب تو گلستاں سے دردمندِ گلستاں گزرے

وطن سے بے کسی یوں لے کے نکلی ہے غریبوں کو
کہ جیسے کارواں کے بعد گردِ کارواں گزرے

کچھ اپنی زندگی نالوں میں کچھ فریاد میں گزری
جو باقی رہ گئی اندیشۂ بیداد میں گزری

خزاں کا دَور گزرا خانہ بربادی کے ماتم میں
بہارِ گل بہارِ آشیاں کی یاد میں گزری

لہو جتنا رگوں میں تھا وفا کے جوش میں نکلا
زباں میں جتنی طاقت تھی ستم کی داد میں گزری

گزارا بندگیِ باغباں میں دَورِ آزادی
اسیری پیرویٔ خاطرِ صیّاد میں گزری

نتیجہ کچھ نہ تھا عاجزؔ ہماری سعیٔ وکوشش کا
خموشی میں جو گزری تھی وہی فریاد میں گزری

رنج خزاں میں شوق بہارِ چمن میں ہے
دیوانہ آج تک اُسی دیوانہ پن میں ہے

کھینچی ہے بیکسی نے یہاں ایک آہ سرد
سہمی ہوئی سی شمع وہاں انجمن میں ہے

آتی ہے صاف صاف جھلک زخم وداغ کی
دل اور بے حجاب نقابِ سخن میں ہے

کچھ آستینِ برق میں ہے خاکِ آشیاں
کچھ دامنِ ہوائے بہارِ چمن میں ہے

ہر ناوکِ ستم یہ بتاتا ہے صاف صاف
اَب زور کتنا بازوئے ناوک فگن میں ہے

جلنے دے جل رہا ہے دلِ بے زباں اگر
تو خوش تو ہے کہ شمع تیری انجمن میں ہے

آتی ہے پھر زباں پہ میری گفتگوئے حق
پھر ایک شور عالمِ دار ورَسن میں ہے

عاجزؔ کروں گا پیش میں کیا اہلِ بزم کو
بس اِک متاعِ غم مری جیبِ سخن میں ہے

غریب الوطن کا رہا کیا وطن میں — بہار آرہی ہے تو آئے چمن میں
ہر اِک پھول خندہ بلب ہے چمن میں — میں کیا کہہ گیا اپنے دیوانہ پن میں
نہ اشکوں نے موقع دیا گفتگو کا — زباں رہ گئی آرزوئے سخن میں
کبھی ہم غریبوں کی خلوت میں آتی — بڑی دھوم ہے شمع کی انجمن میں
مرے سننے والے مجھے دیکھتے ہیں — میں بے پردہ نکلا نقابِ سخن میں

اِدھر میں سناتا رہا دردِ پنہاں
اُدھر شمع روتی رہی انجمن میں

کلیجہ تھام لو ، رُودادِ غم ہم کو سُنانے دو
تمھیں دُکھا ہوا دل ہم دکھاتے ہیں دِکھانے دو

اسی کے دم سے تھوڑی روشنی ہے خانۂ دل میں
بجھاتے کیوں ہو شمعِ آرزو کو جھلملانے دو

یہ بجلی اِس دل خوابیدہ کو اِک تازیانہ ہے
مری محرومیوں پر آسماں کو مسکرانے دو

اُسی سے تم کسی کی زُلف کی رُوداد سُن لینا
اُدھر دیکھو وہ دیوانہ چلا آتا ہے آنے دو

سنا ہے عشق کی معراج پنہاں ہے شہادت میں
چھری لاؤ ہمیں بھی اپنی قسمت آزمانے دو

نہ داغ آئے گا اپنے دامنِ حسنِ طبیعت پر
وفا پر میری جو تہمت لگاتے ہیں لگانے دو

زمانہ صبر کرلیتا ہے عاجزؔ ہم بھی کرلیں گے
خلِش دل کی مٹا لینے کو دو آنسو بہانے دو

دردکب دل میں ، مہرباں نہ رہا ہاں مگر قابلِ بیاں نہ رہا
ہم جوگلشن میں تھے بہار نہ تھی جب بہار آئی آشیاں نہ رہا
غم گراں جب نہ تھا گراں تھا مجھے جب گراں ہوگیا گراں نہ رہا
دوستوں کا کرم معاذ اللہ شکوۂ جورِ دُشمناں نہ رہا
بجلیوں کو دُعائیں دیتا ہوں
دوش پر بارِ آشیاں نہ رہا

بہ ایں قیدِخموشی بھی غزل خواں ہمہ تن ہم ہیں
نہ پابندِ زباں ہم ہیں نہ مجبورِسخن ہم ہیں
گلستاں میں شریکِ صحبتِ اہلِ چمن ہم ہیں
بس اتنی بات پر کیوں قابلِ دار ورَسن ہم ہیں
جوابِ ظلم دیتی جارہی ہے اپنی مظلومی
اُدھر تلوار رنگیں ہے اِدھر رنگیں کفن ہم ہیں
خزاں سے کب کی بنیادِ گلستاں گرچکی ہوتی
مگر یہ خیریت ہے زیرِ دیوارِ چمن ہم ہیں
نشیمن پھونک کر سمجھیں کہ سب کچھ پھونک ڈالا ہے
حجابِ گل میں بیٹھے بجلیوں پر خندہ زن ہم ہیں
اگر چہ بزم میں ہم بھی ہیں لیکن فرق کتنا ہے
وقارِ انجمن تم ہو ، وبالِ انجمن ہم ہیں

جب صبا آئی اِدھر ذکرِ بہار آ ہی گیا — یاد ہم کو انقلابِ روزگار آ ہی گیا

کس لیے اب جبر کی تکلیف فرماتے ہیں آپ — بندہ پرور میں تو زیرِ اختیار آ ہی گیا

لالہ و گل پر جو گزری ہے گزرنے دیجیے — آپ کو تو مہرباں لطفِ بہار آ ہی گیا

دہر میں رسمِ وفا بدنام ہوکر ہی رہی — ہم بچاتے ہی رہے دامن غبار آ ہی گیا

ہنس کے بولے اب تجھے زنجیر کی حاجت نہیں — اُن کو میری بے بسی کا اعتبار آ ہی گیا

شکوہ سنجی اپنی عادت میں نہیں داخل مگر
دل دُکھا تو لب پہ حرفِ ناگوار آ ہی گیا

میں کیا سناؤں حالِ دل اب قابلِ بیاں نہیں
زخم کدھر کدھر نہیں درد کہاں کہاں نہیں

یہ اور بات ہے کہ میں زحمت کشِ فغاں نہیں
پہلے بھی بے زباں نہ تھا آج بھی بے زباں نہیں

بلبلِ نامراد کا جی نہ لگے تو کیا کرے
اب وہ چمن نہیں چمن آشیاں آشیاں نہیں

اپنے ستم کا اور کچھ معیار کیجیے بلند
دار و رَسن میں اب کوئی لذّتِ امتحاں نہیں

وہ دن اگر گزر گئے یہ بھی گزر ہی جائیں گے
عیش بھی جاوداں نہ تھا رنج بھی جاوداں نہیں

اپنے کلام کا مجھے عاجؔز سُرور کیوں نہ ہو
خود میرا فیضِ کسب ہے بخششِ دیگراں نہیں

سمن میں رنگ، نہ بُو یاسمن میں آئی ہے — یہ کیسی فصلِ بہاراں چمن میں آئی ہے
ہر اِک سر میں ہے سودائے امتحاں یارب — کشش کہاں سے یہ دار و رَسن میں آئی ہے
عزیز کیوں نہ ہو خاکِ رہِ وطن مجھ کو — یہ میرے ساتھ مرے پیرہن میں آئی ہے
وہ نامُراد مری بے زباں وفا تو نہیں — جو بن کے شمع تری انجمن میں آئی ہے
خبر دو بزمِ خرد کے تماش بینوں کو — بہار پھر مرے دیوانہ پن میں آئی ہے
متاعِ درد ہر اِک شخص کو نصیب نہیں
یہ چیز حصّہٴ اہلِ سخن میں آئی ہے

دھڑکتا جاتا ہے دل مسکرانے والوں کا — اُٹھا نہیں ہے ابھی اعتبار نالوں کا
یہ مختصر سی ہے روداد صبحِ میخانہ — زمیں پہ ڈھیر تھا ٹوٹے ہوئے پیالوں کا
یہ خوف ہے کہ صبا لڑکھڑا کے گر نہ پڑے — پیام لے کے چلی ہے شکستہ حالوں کا
نہ آئیں اہلِ خرد وادیِ جنوں کی طرف — یہاں گزر نہیں دامن بچانے والوں کا
لپٹ لپٹ کے گلے مل رہے تھے خنجر سے
بڑے غضب کا کلیجہ تھا مرنے والوں کا

چمن میں برق کو پا کر مزاج داں میں نے — اُسی کو سونپ دی تقدیرِ آشیاں میں نے
جو اُس نے حال دلِ زخم خوردہ کا پوچھا — دِکھا دی خون میں ڈوبی ہوئی زباں میں نے
پہاڑ ٹوٹ پڑا غیرتِ اسیری پر — نگاہ کی تھی ذرا سوئے آشیاں میں نے
ہر ایک حلقہٴ زنجیر دم بخود کیوں ہے — یہ کس کی زُلف کی چھیڑی ہے داستاں میں نے
یہ ذکر برق و نشیمن نہیں ہے بے معنیٰ
چھپائی ہے اِنھیں پردوں میں داستاں میں نے

مزاجِ عشق ہم رنگِ مزاجِ حسن تو کر دے
غلامِ آرزُو بن جا نہ ترکِ آرزو کر دے

دلِ بیتاب تو بھی دھڑکنیں اپنی سُنا دینا
نگاہِ شوق جب آغاز رسمِ گفتگو کر دے

سن اے ہمدم میں ایسی خواہشِ درماں سے باز آیا
مرے زخموں کو جو منّت پذیرِ چارہ جو کر دے

وہ پندارِ خودی جو بے خودی پر حرف لاتا ہو
اُسے اے دل سپردِ آتشِ جام و سبو کر دے

بھلا کیا واسطہ اُس کو ہوس کی تلخ کامی سے
جسے تیری نظر لذّت شناسِ آرزو کر دے

مرے اشکوں کا ہے اِک خاص اندازِ بیاں لیکن
کہیں برہم نہ تجھ کو یہ طریقِ گفتگو کر دے

مرا یہ حوصلہ تھا تو ہی خنجر آزما ہوتا
تجھے یہ فکر ہے میری چھری میرا گلو کر دے

غزل گوں میں کچھ لطفِ غزل خوانی رہے عاجزؔ
صدائے ساز میں آمیزشِ سوزِ گلو کر دے

جو سبب بن گیا محفل کی پریشانی کا
وہ فسانہ تھا مری سوختہ سامانی کا

آئینہ دار ہے سوزِ غمِ پنہانی کا
قطرہ قطرہ مری بھیگی ہوئی پیشانی کا

دنگ ہیں پُرسشِ احوال کو آنے والے
مجھ کو دیکھیں کہ تماشہ مری ویرانی کا

اپنی صورت پہ جو سکتے کا سماں طاری ہے
آئینہ پر بھی وہ عالم نہیں حیرانی کا

کوئی مشکل نہ تھی تعمیرِ نشیمن لیکن
پاس تھا خانۂ صیّاد کی ویرانی کا

باخبر خوب تقاضائے سلاسل سے ہیں
اے جنوں وقت تو ہو سلسلہ جنبانی کا

ہم تو اُس وقت سے مشہور ہیں آشفتہ خیال
زُلف نے خواب نہ دیکھا تھا پریشانی کا

چند آہوں کا مرقّع ہے کلامِ عاجزؔ
ڈال رکھا ہے نقاب اس پہ غزل خوانی کا

نہ پوچھو آج کیا کیا ناز ہے حسنِ خود آرا کو
اِنھی آنکھوں سے ہم نے برہنہ دیکھا ہے دُنیا کو

غلط الزام دینا ہے سلوکِ خارِ صحرا کو
گلوں نے کون سا آرام پہنچایا کفِ پا کو

اگر دُنیا ہمیں آتی ہے سمجھانے کو آنے دو
کہ ہم اچھی طرح سمجھے ہوئے بیٹھے ہیں دُنیا کو

نیازِ عاشقی اب اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا
بجا کہنے لگا ہوں آپ کے ہر نازِ بیجا کو

بظاہر حاصلِ زخمِ جگر کچھ ہے تو اتنا ہے
اِک اچھا مشغلہ ہاتھ آ گیا ہے چارہ فرما کو

مرے جوشِ جنوں کے پاؤں پھیلانے کا وقت آیا
خردمندوں سے کہہ دو اب سمیٹیں اپنی دُنیا کو

وہ تماشائے جنوں وہ رقص مستانہ نہیں
جب سے تیری انجمن میں تیرا دیوانہ نہیں

یہ کشش اظہارِ غم میں ہے کبھی جانا نہیں
وہ بھی سَر دُھننے لگے ہیں جن کا افسانہ نہیں

وہ نگاہیں ہیں نہ وہ تیور نہ وہ انداز ہے
دو ہی دن میں تم تو یوں بدلے کہ پہچانا نہیں

کوئی گلشن بھی نہ تھا میرے گلستاں کا جواب
اب سُنا ہے اُس سے بڑھ کر کوئی ویرانہ نہیں

امتحاں گاہِ وفا سے گرچہ گزرے اور بھی
ہم نے اوروں کی طرح دامن تو گردانا نہیں

مجھ کو ساقی تیرا حالِ میکدہ معلوم ہے
کل مئے و مینا نہیں تھے آج پیمانہ نہیں

مجھ کو یارانِ طریقت کی ہے رُسوائی کا پاس
ورنہ کس کعبے کے پردے میں صنم خانہ نہیں

اُن کو اَب معلوم ہوتی ہے وفاداروں کی قدر
جل رہی ہے شمع لیکن رقصِ پروانہ نہیں

میکشوں کے چشم ولب سے جو نمایاں ہو سکے
اُس سے بڑھ کر مستند رودادِ میخانہ نہیں

مجھ کو وہ غم ملا جس غم کی ہے ہر بات نئی
جس کا ماحول نیا جس کی روایات نئی

وصلِ لیلیٰ کی دُعاؤں کا کہاں وقت رہا
اب تو ایجاد ہوئی طرزِ مناجات نئی

رسم گریہ کی بہت عام ہوئی جاتی تھی
میری آنکھوں کو عنایت ہوئی برسات نئی

اُن نگاہوں کا میں احسان نہ مانوں کیونکر
جو مجھے بخش گئیں شورشِ جذبات نئی

جن سے وصفِ لب ودنداں ہی کیا کرتے تھے
جھلملائیں اُنھیں حرفوں میں حکایات نئی

باغباں کچھ متفکر سا نظر آتا ہے
ہو نہ ہو باغ میں پھوٹی ہے کوئی بات نئی

جمع ہونے تو دو اُجڑے ہوئے میخواروں کو
پھر بنالیں گے کوئی بزمِ خرابات نئی

کہتے ہیں مساوات اسی کو تو ستم ہے
اُتنی ہی خوشی اُن کو ہے جتنا مجھے غم ہے

جو کچھ مجھے تکلیف ہے جو کچھ مجھے غم ہے
سب آپ کی بخشش ہے عنایت ہے کرم ہے

کیفیتِ دل چارہ گروں کو نہیں معلوم
ہم جانتے ہیں درد زیادہ ہے کہ کم ہے

ساقی ترے میخانے سے کتنے گئے پیاسے
سچ کہنا تجھے ساغر و مینا کی قسم ہے

وقت آجائے تو شمشیر کی آجاتی ہے تیزی
غفلت میں نہ رہنا کہ یہ شاعر کا قلم ہے

ہر ایک طرف شام کے آثار ہیں عاجزؔ
بڑھنا ہے تو بڑھ جا کہ اندھیرا ابھی کم ہے

سنبھلنے ہی نہیں دیتا غمِ یارانِ میخانہ — کہاں کی مے کشی کیسی صُراحی کیسا پیمانہ
غبارِ کارواں سے کارواں کو ہم نے پہچانا — جہاں تھی شمعِ محفل اُڑ رہی ہے خاکِ پروانہ
ادا کیونکر کریں گے چند آنسو دل کا افسانہ — بہت دُشوار ہے جتنا سمجھنا اتنا سمجھانا
مجھے تشنہ لبوں کی یاد مئے پینے نہیں دیتی — اُٹھاتا جارہا ہوں ٹوٹتا جاتا ہے پیمانہ

شکستِ جام کو ساقی شکستِ دل سے کیا نسبت
ترا اِک آئینہ ٹوٹا ، ہمارا آئینہ خانہ

دیکھ کر ہنستے ہیں سب آشفتہ سامانی مری — اِک تماشہ بن گئی ہے چاک دامانی مری
باغباں نغموں کو میرے اجنبی سمجھا کیا — لالہ و گل نے مگر آواز پہچانی مری
دُور ہی سے وہ گزر جاتے ہیں منہ پھیرے ہوئے — اُن سے بھی دیکھی نہیں جاتی پریشانی مری
اُن پہ تو سوزِ وفا کا کچھ اثر ہوتا نہیں — پھونک ڈالے گی مجھی کو شعلہ سامانی مری

اُن کے سلجھانے میں جب دِقّت تمھیں محسوس ہو
اپنی زُلفوں کو دِکھا دینا پریشانی مری

وہ کسی کی انجمن ہو وہ کسی کی بادشاہی — یہی بانکپن رہے گا یہی اپنی کج کُلاہی
تیرے نکھرے عارضوں میں تیرے سنورے گیسوؤں میں — مری صبح کی چمک ہے مری شام کی سیاہی
تجھے گر یقین نہ آئے تو میں آئینہ دِکھا دوں — ترا حسن دے رہا ہے مرے عشق کی گواہی
جو تمھارے عہد میں ہے کسی دَور میں نہیں تھی — یہ خرد کی تیز دستی یہ جنوں کی بے پناہی

مرے حق میں دوستوں کا یہی فیصلہ ہے عاجزؔ
کہ گناہ سے ہے بڑھ کر تیرا جرمِ بے گناہی

سوز پروانے کو دینے والے گئے شمع کا قلب گرمانے والے گئے
تھے وہی باعثِ رونقِ انجمن جو تری انجمن سے نکالے گئے

میکدے میں اب اہلِ ہوس رہ گئے دوسروں کی خبر لینے والے گئے
مجھ کو محرومِ جام وسُبو دیکھ کر بادہ خواروں میں ساغر اُچھالے گئے

ہم پہ ایسی خطاؤں کا الزام ہے جن سے کوئی تعلق ہمارا نہیں
آگ تھی دُشمنوں کی لگائی ہوئی ہم تو ناحق مصیبت میں ڈالے گئے

عشق آساں بھی ہے اور مشکل بھی ہے پھول بھی ہیں گلستاں میں کانٹے بھی ہیں
تیرے دیوانے دیوانہ پن میں رہے ہوشیار اپنا دامن بچالے گئے

اہلِ عشق اب کہاں اہلِ دل اب کہاں ہُو کا عالم محبت کی دُنیا میں ہے
اس قدر بھاؤ بازار کا گرگیا لوگ اپنی دُکانیں اُٹھالے گئے

ستم سازیوں میں جو بے باک نکلے وہ اب جرم سے پاک ہونے چلے ہیں
چھری گردنِ آرزُو پر چلاکر لہو اپنے دامن سے دھونے چلے ہیں

خوشی سے تو پھولے سماتے نہیں ہیں دِکھانے کو پلکیں بھگونے چلے ہیں
جنھیں مسکرانے سے فرصت نہیں تھی مرے حال پر آج رونے چلے ہیں

ہوس تو زمانے میں بدنام ہی تھی محبّت بھی دُنیا میں برباد نکلی
جنھیں ہم نے پھولوں کی مانند رکھا وہی ہم کو کانٹے چبھونے چلے ہیں

مری بے بسی کس قدر معتبر ہے نہ فریاد کا غم نہ آہوں کا ڈر ہے
مجھے ہر طرح پابہ زنجیر کرکے وہ اب پاؤں پھیلا کے سونے چلے ہیں

آرزُو دامن ہی پھیلاتی رہی — فصلِ گل آتی رہی جاتی رہی
ہوشیاری کا تقاضا تھا کچھ اور — بے خودی کچھ اور سمجھاتی رہی
شمع و پروانہ کا جو انجام ہو — آپ کی محفل تو گرماتی رہی
دوست میرے حال پر روتے رہے — مجھ کو رہ رہ کر ہنسی آتی رہی
انجمن والوں کو شمعِ انجمن — درد کا مفہوم سمجھاتی رہی
سازِ دل سے ٹوٹنے کے بعد بھی — ہلکی ہلکی سی صدا آتی رہی

میں رہا ہر چند سرگرمِ فغاں
نیند کے ماروں کو نیند آتی رہی

امتحانِ شوق میں ثابت قدم ہوتا نہیں
عشق جب تک واقفِ آدابِ غم ہوتا نہیں

اُن کی خاطر سے کبھی ہم مسکرا اُٹھے تو کیا
مسکرا لینے سے دل کا درد کم ہوتا نہیں

جو ستم ہم پر ہے اُس کی نوعیت کچھ اور ہے
ورنہ کس پر آج دُنیا میں ستم ہوتا نہیں

تم جہاں ہو بزم بھی ہے شمع بھی پروانہ بھی
ہم جہاں ہوتے ہیں یہ ساماں بہم ہوتا نہیں

رات بھر ہوتی ہیں کیا کیا انجمن آرائیاں
شمع کا کوئی شریکِ صبحِ غم ہوتا نہیں

مانگتا ہے ہم سے ساقی قطرے قطرے کا حساب
غیر سے کوئی حسابِ بیش و کم ہوتا نہیں

متاعِ غم کہاں اہلِ ہوس کے سینوں میں یہ شئے ملے گی تو ہم بوریہ نشینوں میں
وہ اور ہوں گے جنھیں شوقِ خودنمائی ہے یہاں تو عمر ہی گزری ہے نکتہ چینوں میں
سمجھ رہے ہیں کہ دریائے غم بھی ہے پایاب وہ چند لوگ جو بیٹھے رہے سفینوں میں
نثار ہوگئے دار و رَسن پہ اہلِ جنوں یہ بندگانِ خرد تھے تماش بینوں میں
نہ آفریب میں رنگیں قباؤں کے عاجزؔ
چھری چھپائے ہوئے ہیں یہ آستینوں میں

ستم ساز گرچہ یہاں اور بھی ہیں مرے مہرباں! مہرباں اور بھی ہیں
چمن ہے تو جورِ خزاں اور بھی ہیں زمیں چاہیے آسماں اور بھی ہیں
اکیلی نہیں ہے تو اے شمعِ محفل ترے چند ہم داستاں اور بھی ہیں
چراغ سرِ رہ گزر تیز رکھیو مسافر پسِ کارواں اور بھی ہیں
ستم کردیا التجائے وفا نے سنا ہے وہ اب بدگماں اور بھی ہیں
یہی سوچ کر کچھ تسلّی ہے دل کو
مری طرح بے خانماں اور بھی ہیں

وہ بے درد ہیں کیوں نہ بیداد کرتے مجھے شرم آتی ہے فریاد کرتے
ہر اِک ظلم کی اِک الگ نوعیت تھی کسے بھول جاتے کسے یاد کرتے
قفس بھی نہ ہوتا تو ہم بے کسی میں نہ جانے کہاں وقت برباد کرتے
ہمیں کو خبر جب ہماری نہیں ہے اُنھیں کیا پڑی تھی کہ وہ یاد کرتے
خدا جانے کس کس پہ الزام آتا اگر ہم بیاں اپنی روداد کرتے
نہ پوچھا کبھی حالِ دل تم نے ورنہ
وہ قصّہ سُناتے کہ تم یاد کرتے

اگر بہارِ چمن تم اسی کو کہتے ہو تو اس طرح کی بہارِ چمن سے کیا ہوگا
مرے جنوں پہ ابھی اہلِ ہوش ہنستے ہیں سمجھ رہے ہیں کہ دیوانہ پن سے کیا ہوگا
بجھے ہوئے ہیں دلِ اہلِ انجمن کے چراغ بس ایک شمع سرِ انجمن سے کیا ہوگا
جو دل بُتوں کی اداؤں سے رام ہو نہ سکا بھلا وہ شعبدۂ برہمن سے کیا ہوگا
ضرور فیصلہ کیجے جنوں کی قسمت کا
مگر یہ فیصلہ دار و رَسن سے کیا ہوگا

کالے بادل جب لہرائے آنکھوں میں آنسو بھر آئے
دل پر کیا کیا دَور نہ آئے کس کو روئے کس کو گائے
پھول کھلے، کھل کر مُرجھائے رہ گئے ہم دامن پھیلائے
ہم تو دیوانے کہلائے کون تیری زُلفیں سُلجھائے
میرا لہو اُن کے کام آئے کس کی دولت کون لُٹائے
اپنی دولت زخم اور آنسو
پھول چُنے موتی بکھرائے

غم وراحت سے بیگانے بہت ہیں ہمارے جیسے دیوانے بہت ہیں
محبت ایسی دُنیا ہے کہ جس میں گلستاں کم ہیں ویرانے بہت ہیں
برہمن ہم سے بگڑا ہے تو بگڑے خدا رکھے صنم خانے بہت ہیں
مبارک خمُ کے خمُ اہلِ ہوس کو مجھے دوچار پیمانے بہت ہیں
قفس میں رنجِ تنہا نہ ہوگا وہاں بھی جانے پہچانے بہت ہیں
مری جیسی کہانی کم سنو گے
گُل وبلبل کے افسانے بہت ہیں

نہ خوشی یاد رہی مجھ کو نہ غم یاد رہا　　ہاں ترا سلسلۂ حسنِ کرم یاد رہا
نہ مجھے جام رہا یاد نہ جم یاد رہا　　کچھ نہ ساقی تری آنکھوں کی قسم یاد رہا
کچھ تمھیں سے نہیں وعدہ شکنی کا شکوہ　　کس کو اس دَور میں پیمانِ کرم یاد رہا
ہم تو دیوانگیِ عشق میں سب بھول گئے　　شیخ کیوں کر تجھے آدابِ حرم یاد رہا
شکریہ ہے کہ میں احسانِ فراموش نہیں　　عمر بھر آپ کا بخشا ہوا غم یاد رہا
کیا خبر بے خودیِ شوق کہاں لے جاتی
خیرت ہے کہ ترا نقشِ قدم یاد رہا

نہ وہ محفل جمی ساقی نہ پھر وہ دَورِ جام آیا　　ترے ہاتھوں میں جب سے میکدہ کا انتظام آیا
چمن کے ساتھ احسانِ رفاقت کچھ نہ کام آیا　　نہ غنچوں نے کبھی پوچھا نہ پھولوں کا سلام آیا
وفاداروں میں گرچہ اور لوگوں کا بھی نام آیا　　ہمیں آگے رہے جب آزمائش کا مقام آیا
الگ بیٹھے ہیں جو آدابِ مئے نوشی سے واقف تھے　　جسے پینا نہیں آتا اُسی کے ہاتھ جام آیا
بہت تعریف اُن کی، اُن کی محفل کی ہوئی لیکن　　نہ شمعِ بزم یاد آئی نہ پروانوں کا نام آیا
بھرم کھل جائے گا عاجزؔ تری نغمہ سرائی کا
اگر اَربابِ فن کے سامنے تیرا کلام آیا

کیوں نہ آمادہ ہو وہ مجھ کو مٹانے کے لیے　　میری بربادی میں راحت ہے زمانے کے لیے
ہم کسے ڈھونڈھیں شریکِ غم بنانے کے لیے　　پھول ہنسنے کو ہیں غنچے مسکرانے کے لیے
وہ تو کہیے ہم نے رکھ لی آشیانے کے لیے　　ورنہ اتنی آگ کافی تھی زمانے کے لیے
بڑھ کے خود کانٹوں پہ رکھ دیں ہم نے اپنی انگلیاں
اُس سراپا ناز کا دامن بچانے کے لیے

آبرو کھوتے نہ میخانے میں ہم — آ گئے ساقی کے بہکانے ہیں ہم
چن لیے اَوروں نے گلہائے مراد — رہ گئے دامن ہی پھیلانے میں ہم
بھولتے جاتے ہیں تعلیمِ جنوں — آپ کی زُلفوں کو سلجھانے میں ہم
بن گئے نقش و نگارِ آئینہ — دوستوں کے آئینہ خانے میں ہم
اپنے زخموں سے چراغاں کر گئے — تیری محفل تیرے کاشانے میں ہم

آزماتے ہیں برہمن کا خلوص
چند دن رہ کر صنم خانے میں ہم

نہ ہو فرق اور کوئی یہی فرق کم نہیں ہے — مجھے کچھ خوشی نہیں ہے تجھے کوئی غم نہیں ہے
اُسے ہوگئی جو سیری تو سمجھ رہا ہے ساقی — کہ کسی کو میکدے میں غمِ بیش وکم نہیں ہے
یہ تو شرطِ دوستی ہے کہ نباہ کر رہا ہوں — مجھے ورنہ برہمن سے ہوسِ صنم نہیں ہے

اُنھیں انجمن مبارک مجھے فکر و فن مبارک
وہاں روشنی بہت ہے تو یہاں بھی کم نہیں ہے

نہ ہوں گے بادہ کش تو بادۂ گلفام کیا ہوگا — یہ شیشہ یہ صراحی یہ سبو یہ جام کیا ہوگا
ہمارا حال اے ساقی ہوا جو کچھ کہ ہونا تھا — تری محفل اگر اُجڑی ترا انجام کیا ہوگا
ہمیں تو رنگِ گلشن دیکھ کر افسوس ہوتا ہے — سحر ہی کا یہ عالم ہے تو وقتِ شام کیا ہوگا
زمانہ جانتا ہے کس کا دامن چاک کتنا ہے — ترے بدنام کرنے سے کوئی بدنام کیا ہوگا

تمھارے چاہنے والے مبارک ہوں تمھیں لیکن
جو ہم نے کر دیا وہ دوسروں سے کام کیا ہوگا

مری مستی کے افسانے رہیں گے
جہاں گردش میں پیمانے رہیں گے

نکالے جائیں گے اہلِ محبّت
اب اِس محفل میں بیگانے رہیں گے

یہی اندازِ مئے نوشی رہے گا
تو یہ شیشے نہ پیمانے رہیں گے

رہے گا سلسلہ دار و رَسن کا
جہاں دوچار دیوانے رہیں گے

جنھیں گلشن میں ٹھکرایا گیا ہے
اُنھی پھولوں کے افسانے رہیں گے

خرد زنجیر پہناتی رہے گی
جو دیوانے ہیں دیوانے رہیں گے

تجھے کیا اگر ترے واسطے کوئی زندگی سے گزر گیا
تری زُلف اور سنورگئی ترا حسن اور نکھر گیا

تری قدر و قیمتِ حسن کی تجھے کون دے کے خبر گیا
نہ تری نگاہ اُدھر اُٹھی نہ ترا خیال اُدھر گیا

کوئی طنز میرے خیال پر کوئی میرے حال پہ کر گیا
میں نگاہ نیچی کیے ہوئے تری انجمن سے گزر گیا

مجھے دل کے حال کا غم نہیں مگر اس کا غم تو ضرور ہے
کہ اُسی نے توڑا یہ آئینہ جو اِس آئینے میں سنور گیا

اُنھیں ناز اپنے جمال پر مجھے فخر اپنے کمال پر
وہ ستم کی حد سے نکل گئے میں وفا کی حد سے گزر گیا

قفس میں لالہ وسرو سمن کی بات کرتے ہیں
کہاں بیٹھے ہوئے کس انجمن کی بات کرتے ہیں

زمانہ سرحدِ دیر وحرم سے بڑھ گیا آگے
مگر ہم ہیں کہ شیخ و برہمن کی بات کرتے ہیں

جنوں کو عقل کا پابند کرنے کی ہدایت ہے
اب اہلِ ہوش بھی دیوانہ پن کی بات کرتے ہیں

سنے گا کون میری چاک دامانی کا افسانہ
یہاں سب اپنے اپنے پیرہن کی بات کرتے ہیں

ہمارا ذکر کیا اب تو جنابِ شیخ صاحب بھی
اسی کافر کی زُلفِ پُرشکن کی بات کرتے ہیں

یہ اربابِ خرد یہ زُلف و رُخ سے کھیلنے والے
ہمارے سامنے دار ورَسن کی بات کرتے ہیں

حقیقتوں کا جلال دیں گے صداقتوں کا جمال دیں گے
تجھے بھی ہم اے غمِ زمانہ غزل کے سانچے میں ڈھال دیں گے

تپش پتنگوں کو بخش دیں گے لہو چراغوں میں ڈھال دیں گے
ہم اُن کی محفل میں رہ گئے ہیں تو اُن کی محفل سنبھال دیں گے

نہ بندۂ عقل و ہوش دیں گے نہ اہلِ فکر و خیال دیں گے
تمھاری زُلفوں کو جو درازی تمھارے آشفتہ حال دیں گے

یہ عقل والے اسی طرح سے ہمیں فریبِ کمال دیں گے
جنوں کے دامن سے پھول چُن کر خرد کے دامن میں ڈال دیں گے

ہماری آشفتگی سلامت سُلجھ ہی جائے گی زُلفِ دوراں
جو پیچ وخم رہ گیا ہے باقی وہ پیچ وخم بھی نکال دیں گے

جنابِ شیخ اپنی کیجے کہ اب یہ فرمانِ برہمن ہے
بُتوں کو سجدہ نہیں کروگے تو بُت کدے سے نکال دیں گے

دیکھ لی آہ کی تاثیر اثر ہونے تک
شب کو جو حال تھا باقی ہے سحر ہونے تک

انقلابات ابھی دیکھئے لائے کیا کیا
دوش سے زُلف تری تا بہ کمر ہونے تک

رقص پروانے کا اے شمع تماشا ہی سہی
نہ رہے گا یہ تماشا بھی سحر ہونے تک

اور ہے آج تری راہ گزر کا عالم
اور عالم تھا تری راہ گزر ہونے تک

بزم میں ہم تپش سوزِ وفا کوئی نہیں
شمع نے ساتھ دیا وہ بھی سحر ہونے تک

اب تو ہے دل کو فراغت ہی فراغت حاصل
تھا غمِ نوعِ دگر ، نوعِ دگر ہونے تک

مجھ کو رونے سے نہ کر منع کہ مجبوری ہے
صبر ہوتا تو ہے اے دوست مگر ہونے تک

نہ ضمیر شمس و قمر میں ہے نہ مزاج برق و شرر میں ہے
وہ تپاک جو مرے دل میں ہے وہ تپش جو میرے جگر میں ہے

مرے عزم میں ہے وہ چاندنی مرے شوق میں ہے وہ روشنی
جو نہ چشمِ راہنما میں ہے نہ چراغِ راہ گزر میں ہے

مرے نالہ میں ہے وہ دلکشی مری آہ میں ہے وہ سادگی
جو پیام خندۂ صبح میں نہ خرامِ بادِ سحر میں ہے

ابھی غنچہ و گل و لالہ میں نہ وہ تازگی نہ وہ رنگ و بُو
نہیں تیرے خواب و خیال میں جو بہار میری نظر میں ہے

شبِ تار میں بھی جنوں مرا کئی منزلوں سے گزر گیا
ترے عقل و ہوش کا قافلہ ابھی انتظارِ سحر میں ہے

جو سنا رہا ہے غزل تمھیں یہ وہی کلیم ہے مہرباں
جو گروہِ اہلِ کمال میں نہ شمار اہلِ ہنر میں ہے

مجھے اس کا کوئی گلہ نہیں کہ بہار نے مجھے کیا دیا
تری آرزو تو نکال دی ترا حوصلہ تو بڑھا دیا
گو ستم نے تیرے ہر اِک طرح مجھے نا امید بنا دیا
یہ میری وفا کا کمال ہے کہ نباہ کر کے دکھا دیا
کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اِک چراغ جلا دیا
تجھے اب بھی میرے خلوص کا نہ یقین آئے تو کیا کروں
ترے گیسوؤں کو سنوار کر تجھے آئینہ بھی دکھا دیا
مری شاعری میں ترے سوا کوئی ماجرا ہے نہ مدّعا
جو تری نظر کا فسانہ تھا وہ مری غزل نے سنا دیا
یہ غریب عاجؔز بے وطن یہ غبارِ خاطرِ انجمن
یہ خراب جس کے لیے ہوا اُسی بے وفا نے بھلا دیا

یہ ہنسی خوشی کا موسم یہ بہار کا زمانہ
ترے واسطے حقیقت مرے واسطے فسانہ
نہ سنبھل سکے گی تجھ سے تری زُلف تا بہ شانہ
میں ابھی سے دیکھتا ہوں جو دکھائے گا زمانہ
جو تری زباں سے نکلا وہی بن گیا فسانہ
مرے دل کی دھڑکنوں سے رہا بے خبر زمانہ
مری خانماں خرابی کا جہاں میں ہے فسانہ
یہ وہ حادثہ ہے جس کو نہ بھلا سکا زمانہ
میں نگاہِ باغباں میں کوئی اور ہو گیا ہوں
ابھی چار دن ہوئے ہیں کہ جلا ہے آشیانہ
تجھے اے غمِ محبت اِدھر آ گلے لگا لوں
نہ ترا کہیں گزر ہے نہ مرا کہیں ٹھکانہ
میں ہوں وہ غریب عاجؔز کہ گلوں کی انجمن میں
مرے پیرہن کے ٹکڑوں کا بنا ہے شامیانہ

سب فصلِ بہاری کے سائے میں پلے ساقی — اِک ہم ہیں کہ گلشن میں پھولے نہ پھلے ساقی
جب رِند صراحی سے ملتے ہوں گلے ساقی — ہم تشنہ لبوں کا بھی کچھ ذکر چلے ساقی
یادِ شہدا میں بھی اِک شمع جلے ساقی — جب شامِ گزر جائے جب رات ڈھلے ساقی
وہ شیشے وہ پیمانے جو زینتِ محفل تھے — کچھ ٹوٹ چکے ساقی کچھ ٹوٹ چلے ساقی
ایسا کسی محفل میں اندھیر نہیں دیکھا
شمشیر تو چل جائے ساغر نہ چلے ساقی

بلا سے ہم تری محفل سے اشکبار چلے — تو خوش تو ہے کہ ترے دل کا بوجھ اُتار چلے
وفا پرست مبارک ہو سوئے دار چلے — ستم کا چلتا تھا جس طرح کاروبار چلے
کہاں تک اَب مئے ومینا کے منتظر بیٹھیں — یہ کہہ دو پیرِ مغاں سے کہ بادہ خوار چلے
دُعا گزارِ چمن کچھ قفس نصیب بھی ہیں — ذرا اِدھر سے بھی ہوتی ہوئی بہار چلے
چمن میں لائے تھے دامانِ آرزو عاجزؔ
چمن سے لے کے گریبانِ تار تار چلے

یہ آنسو بے سبب جاری نہیں ہے — مجھے رونے کی بیماری نہیں ہے
نہ پوچھو زخم ہائے دل کا عالم — چمن میں ایسی گل کاری نہیں ہے
بہت دُشوار سمجھانا ہے غم کا — سمجھ لینے میں دُشواری نہیں ہے
غزل ہی گنگنانے دو کہ مجھ کو — مزاجِ تلخ گفتاری نہیں ہے
چمن میں کیوں چلوں کانٹوں سے بچ کر — یہ آئینِ وفاداری نہیں ہے
وہ آئیں قتل کو جس روز چاہیں
یہاں کس روز تیاری نہیں ہے

میرے لیے قیدِ سحر و شام نہیں ہے
جلتا ہوں کہ جلنے کے سوا کام نہیں ہے

اِس دَور میں ارزاں مئے گلفام نہیں ہے
پینے کی اجازت ہے مگر عام نہیں ہے

پوری نہ ہوئی راحتِ منزل کی تمنّا
ہم جیسے مسافر کے لیے شام نہیں ہے

بخشی ہے تری اِک نگہِ خاص نے مجھ کو
وہ درد کی دولت جو بہت عام نہیں ہے

مرکر بھی دکھادیں گے ترے چاہنے والے
مرنا کوئی جینے سے بڑا کام نہیں ہے

دُنیا میں بُرے ہم سے زیادہ بھی ہیں عاجزؔ
ہاں ہم سے زیادہ کوئی بدنام نہیں ہے

ترے عارضوں کی سُرخی تری زُلف کو شکن دی
ترے حسن کا سبب ہے میرا ذوقِ خوش پسندی

میں ہوں جس نے رنگ و نکہت کی خبر چمن چمن دی
کہیں انجمن سجائی کہیں شمع انجمن دی

مرے دل کو ہے جنوں سے بڑی اعتقادمندی
ترے رُوبرو اِسی نے مجھے جرأتِ سخن دی

ترا التفات ہو یا تیرا وعدۂ کرم ہو
وہ ستم کا پیش خیمہ یہ جفا کی پیش بندی

یہ ہے میری وضع داری کہ نباہ کررہا ہوں
تجھے عادتِ تغافل مجھے خوئے دردمندی

مجھے موسمِ بہاراں سے رہے گی یہ شکایت
کہ وہ مستحق نہیں تھا جسے دولتِ چمن دی

ترے لب پہ شکوۂ غم تجھے کیا ہوا ہے عاجزؔ
کہاں دعوئے محبت کہاں عافیت پسندی؟

ہم ہیں بکھرے ہوئے جلوؤں کو سجانے والے
گیسوؤں والوں سے کچھ کم نہیں شانے والے

ترک ہم رسم و رہِ عام جو کر بیٹھے ہیں
انگلیاں ہم پہ اُٹھاتے ہیں زمانے والے

ایک دیوانہ بنا فصلِ بہاراں میں اگر
سینکڑوں بن گئے زنجیر بنانے والے

رسن و دار نہیں اہلِ جنوں کی منزل
ہم مسافر ہیں بہت دُور کے جانے والے

کس سے دُہرائیں فسانۂ غمِ دل کا عاجزؔ
سننے والوں سے زیادہ ہیں سُنانے والے

جہاں غم ملا اُٹھایا پھر اُسے غزل میں ڈھالا
یہی درد سر خریدا یہی روگ ہم نے پالا

تیرے ہاتھ سے ملی ہے مجھے آنسوؤں کی مالا
تری زُلف ہو دو گونہ ترا حسن ہو دوبالا

میں ہرے بھرے چمن میں وہ شکستہ شاخِ گل ہوں
نہ خزاں نے جس کو تھاما نہ بہار نے سنبھالا

مرے غم کی قدر و قیمت کوئی میرے دل سے پوچھے
یہ چراغ وہ ہے جس سے مرے گھر میں ہے اُجالا

جہاں حسن و عشق ہوں گے یہی دُھوپ چھاؤں ہوگی
کبھی تیری بات اُونچی کبھی میرا بول بالا

تجھے انجمن مبارک مجھے فکر و فن مبارک
یہی میرا تختِ زرّیں یہی میری مرگ چھالا

جو قطرے لہو کے نہ آنکھوں سے ڈھلکے
بنے ہیں وہ اشعار میری غزل کے

نہ پوچھو مرے دیدۂ و دل کا عالم
گھٹا جیسا اُمڈے سبو جیسے چھلکے

مقدر نے چھنوائی ہے خاک ورنہ
کبھی ہم بھی تھے رہنے والے محل کے

کہاں تک ابھی جائے گی کون جانے
تری زُلف و رُخسار سے بات چل کے

بہت ٹھوکریں لگ رہی ہیں گلوں کو
سنبھل کے اے بادِ بہاری سنبھل کے

غم اور بھی گرچہ اے غمِ یار بہت ہیں
اب بھی تری زُلفوں کے گرفتار بہت ہیں
دو دن بھی نہ گزرے ہیں کہ گزری ہے قیامت
پھر منتظر شوخیِ رفتار بہت ہیں
اِک گل بھی ہمارے لیے گلشن میں نہیں ہے
دامن سے اُلجھنے کے لیے خار بہت ہیں
ہم سا کوئی پابندِ وفا بھی نہیں ہوگا
ہم چند کہ ہم لوگ گنہگار بہت ہیں
اشکوں کا نہ ہونا تو کوئی بات نہیں ہے
غم کے لیے پیرایۂ اظہار بہت ہیں
ہم لوگ غمِ عشق کے منکر نہیں لیکن
اِس غم کے علاوہ بھی تو آزار بہت ہیں

میخانے میں قحطِ مئے گلفام پڑا ہے
شیشہ کہیں پھینکا ہے کہیں جام پڑا ہے
اِس ناز کے قربان اِس انداز کے صدقے
گھر بیٹھے ہو اور شہر میں کہرام پڑا ہے
تم صاحبِ دستار و قبا جب سے ہوئے ہو
دیوانہ اُسی دن سے مرا نام پڑا ہے
سمجھے ہے محبت کو نہ مانے ہے وفا کو
کس آفتِ جاں سے بخدا کام پڑا ہے
عاجزؔ کہ جسے چین نہ تھا بسترِ گل پر
اَب چھوڑ کے سب راحت و آرام پڑا ہے

تنگ آ کے روز روز کے اصرار سے چلے
لو ہم تمھارے سایۂ دیوار سے چلے
گلکاریوں سے باز نہ آئے جنوں کی ہم
جس راہ پر چلے اِسی رفتار سے چلے
اہلِ خرد بھی ساتھ ہمارے چلے، مگر
بچ بچ کے سرحدِ رسن و دار سے چلے
ایسا بھی کوئی قافلہ دیکھا ہے آپ نے؟
جو موسمِ بہار میں گلزار سے چلے
اُس کام کے لیے وہ کریں اہتمام کیوں
جو کام اُن کی شوخیِ رفتار سے چلے

اب کون ہمیں سمجھے اب کون ہمیں جانے
جب پھاڑ چکے دامن جب ہو چکے دیوانے

سب آپ کے اپنے ہیں میرے لیے بیگانے
خم ہوں کہ مئے و مینا شیشے ہوں کہ پیمانے

کیا ہوگا محبّت کا انجام خدا جانے
تم عشق کے دُشمن ہو ہم حسن کے دیوانے

اِس فصل بہاری میں دل ٹوٹ گئے جتنے
اتنے کسی موسم میں ٹوٹے نہیں پیمانے

عقل کی دوستی سے کنارا کرے
حوصلہ ہوتو کہنا ہمارا کرے

عشق میں موت کا نام ہے زندگی
جس کو جینا ہو مرنا گوارا کرے

اِس سے بڑھ کر کوئی رہنما ہی نہیں
چل اُدھر جس طرف دل اشارا کرے

موج طوفاں سے ملنے چلا ہے جنوں
عقل ساحل پہ بیٹھی نظارا کرے

آگے آگے زمانے کے ہم جائیں گے
راستہ وقت خالی ہمارا کرے

چین کی نیند غافل نہ کردے ہمیں
درد اُٹھ اُٹھ کے دل کو پکارا کرے

ماہ انجم مبارک تجھے اے فلک
کون اِن ٹھیکروں پہ گزارا کرے

فکر و فن میرا دُنیا کو آئینہ ہے
اپنی زُلفیں اِسی میں سنوارا کرے

نہ پوچھ شوق پہ کس کشمکش کا عالم ہے
کہ آرزوئیں زیادہ ہیں زندگی کم ہے
جگر کے زخم ہمیشہ کھلے ہی رہتے ہیں
نہ کوئی وقت ہے اِن کے لیے نہ موسم ہے
وہ اور ہیں جنھیں برسات کی تمنّا ہے
یہاں تو آنسوؤں کی رات دن جھما جھم ہے
وہی سمجھتے ہیں مجھ کو جو مجھ کو سنتے ہیں
مری غزل میں مری زندگی مجسّم ہے
غزل جو حضرتِ عاجزؔ سنایا کرتے ہیں
وہ شاعری تو نہیں شاعری کا ماتم ہے

مجھ پہ جو کچھ گزر گئی اُس کا تو غم ذرا نہ کر
آنکھوں میں اپنی سر دے زُلفوں میں اپنی شانہ کر
مرے لیے نہ کوئی غم اے ستمِ زمانہ کر
میں تو خراب ہو چکا اپنا کہیں ٹھکانہ کر
مجھ کو تو فصل گل یہی شغل سپرد کر گئی
صحنِ چمن کی خاک اُڑا ماتمِ آشیانہ کر
لالہ و گل پہ باغباں تہمتِ سرکشی نہ رکھ
میں ہوں چمن کا راز داں مجھ سے نہ یہ بہانہ کر
درد سے اے دلِ حزیں ضبط کی تاب اب نہیں
آہوں کی راہ کھول دے آنسوؤں کو روانہ کر

رائیگاں سب فصلِ گل کی گلشن آرائی گئی
اور اُلجھی جس قدر یہ زُلف سُلجھائی گئی
انجمن کی انجمن بن کر تماشائی گئی
تیرے دیوانے کو جب زنجیر پہنائی گئی
وہ جہاں پہنچے وہاں تک میری رُسوائی گئی
بات خود پھیلی نہیں ہے بلکہ پھیلائی گئی
گرچہ میں خاموش تھا لیکن زبانِ اشک سے
بارہا دل کی کہانی اُن سے دہرائی گئی
جان دینا ہی پڑی شرحِ وفا کے واسطے
بات نازک تھی بڑی مشکل سے سمجھائی گئی
آنکھ میں آنسو تبسّم لب پہ تھا احباب کے
جب خوشی کے لئے میں غم کی راگنی گائی گئی

کوئی محفل ہے نہ کوئی انجمن میرے لیے
وادیِ غربت سے کیا کم ہے وطن میرے لیے

میں اسیرِ حلقۂ دامِ وفا ہو ہی چکا
اب نہ ڈالو اپنی زُلفوں میں شکن میرے لیے

باغباں تقسیم یوں کرتا ہے انعامِ بہار
پھول اپنے واسطے خارِ چمن میرے لیے

میرا گلشن سے نکلنا حادثہ کچھ کم نہ تھا
چاک کرڈالے گلوں نے پیرہن میرے لیے

پیشوائی کو نہیں بہرِ تماشاہی سہی
اُٹھ تو جاتی ہے نگاہِ انجمن میرے لیے

کس قدر کل تک رہی اہلِ وفا سے بے نیاز
آج کیوں روتی ہے شمعِ انجمن میرے لیے

ہوشیاروں کے لیے کچھ بات کرلیتاہوں میں
ورنہ کافی تھا مرا دیوانہ پن میرے لیے

اب کسی کو ہم غریبوں کا خیال آتا نہیں
مدّتیں گزریں کوئی پُرسانِ حال آتا نہیں

دوستوں سے بھی محبت دُشمنوں سے بھی وفا
ہم کو اس کے ماسوا کوئی کمال آتا نہیں

خشک ہوجاتے ہیں جب آنسوتو آتا ہے لہو
غم وہ دولت ہے کبھی جس پر زوال آتا نہیں

ہم فقیروں کے یہاں بٹتی ہے خیراتِ وفا
کون پھیلائے ہوئے دستِ سوال آتا نہیں؟

اُن کے گلشن سے کبھی جاتی نہیں فصلِ بہار
اور یہاں پھولوں کا موسم کوئی سال آتا نہیں

ہم تو اس دَورِ جفامیں بھی ہیں اتنے وضع دار
خواب میں بھی بے وفائی کا خیال آتا نہیں

کیسے کیسے سُرخ رُو آتے ہیں تیری بزم میں
ہاں مرے جیسا کوئی آشفتہ حال آتا نہیں

وہ محفل جو اپنی سجائی ہوئی تھی گزر اَب وہاں بھی ہمارا نہیں ہے
کبھی گل ہمارے گلستاں ہمارا، کبھی آشیاں بھی ہمارا نہیں ہے

کہیں سوزشِ دل کی روداد کس کو سنائیں تپِ غم کی فریاد کس کو
بجز شمعِ محفل تری انجمن میں کوئی ہم زباں بھی ہمارا نہیں ہے

محبّت تو ہے اپنی فطرت میں داخل کیے جارہے ہیں کیے جائیں گے ہم
مگر آپ قدرِ محبّت کریں گے یہ وہم و گماں بھی ہمارا نہیں ہے

بھٹکتے ہیں یوں بے سہارے کہ جیسے مسافر بھٹکتا ہے تاریکیوں میں
کوئی شمع منزل ہماری نہیں ہے کوئی کارواں بھی ہمارا نہیں ہے

یہی بے نیازی یہی بے رُخی ہے تو ہم سے بھی دُشوار اَب بندگی ہے
اگر تیری محفل ہماری نہیں ہے ترا آستاں بھی ہمارا نہیں ہے

بھرم اپنے نالوں کا رکھیں گے کب تک کسی کے تغافل کو الزام دے کر
حقیقت تو یہ ہے کہ اے ہمصفیرو! وہ جوشِ فغاں بھی ہمارا نہیں ہے

حرم والے یا دَیر والے ہوئے
ہیں سب ایک سانچے میں ڈھالے ہوئے

ستم ہے کہ میرے اُچھالے ہوئے
مجھی کو بُرا کہنے والے ہوئے

وہی آج ساقی کے ہاتھوں میں ہیں
جو ساغر تھے میرے اُچھالے ہوئے

نہ آئے خرد کے جو معیار پر
وہ دار و رَسن کے حوالے ہوئے

بُتوں سے جو منسوب ہیں شعبدے
وہ ہیں برہمن کے نکالے ہوئے

ہمیں اِس ہوس کے زمانے میں ہیں
محبت کی دُنیا سنبھالے ہوئے

یہی بیکسی تھی تمام شب اِسی بیکسی میں سحر ہوئی
نہ کبھی چمن میں گزر ہوا نہ کبھی گلوں میں بسر ہوئی

یہ پکار سارے چمن میں تھی وہ سحر ہوئی وہ سحر ہوئی
مرے آشیاں سے دُھواں اُٹھا تو مجھے بھی اس کی خبر ہوئی

مجھے کیا اگر ترے دوش سے تری زُلف تابہ کمر ہوئی
کہ میں ایسا خانہ خراب ہوں کبھی چھاؤں میں نہ بسر ہوئی

تجھے فخر اپنے ستم پہ ہے کہ عصائے راہنما بنا
مجھے ناز اپنی وفا پہ ہے کہ چراغِ راہگزر ہوئی

میں تری بلا سے اُجڑ گیا ترا حوصلہ تو نکل گیا
یہ بڑی خوشی کا مقام ہے کہ یہ عید بھی ترے گھر ہوئی

میکدہ بند ہے دَور چلتا نہیں — دیکھیں کب تک یہ موسم بدلتا نہیں
کام اپنی وفا سے نکلتا نہیں — اب یہ سکّہ زمانے میں چلتا نہیں
جس پہ گرتے ہیں پروانۂ آرزُو — وہ چراغ اُن کی محفل میں جلتا نہیں
اِک زمانہ ہوا فصلِ گل آچکی — دیدہ و دل سے کانٹا نکلتا نہیں

وہ ہمیں وضع داری سکھانے چلے
جن سے اپنا ہی دامن سنبھلتا نہیں

قائم ہے سُرورِ مئے گلفام ہمارا کیا غم ہے اگر ٹوٹ گیا جام ہمارا
اتنا بھی کسی دوست کا دُشمن نہ ہو کوئی تکلیف ہے اُن کے لیے آرام ہمارا
پھولوں سے محبت ہے تقاضائے طبیعت کانٹوں سے اُلجھنا تو نہیں کام ہمارا
بھولے سے کوئی نامِ وفا کا نہیں لیتا دُنیا کو ابھی یاد ہے انجام ہمارا
غیر آ کے بنے ہیں سبب رونقِ محفل اب آپ کی محفل میں ہے کیا کام ہمارا
موسم کے بدلتے ہی بدل جاتی ہیں آنکھیں
یارانِ چمن بھول گئے نام ہمارا

زُلف جو آج تا بہ شانہ ہے کل کہاں ہوگی کیا ٹھکانہ ہے
شام بھی آنسو صبح بھی آنسو کیا یہی گردشِ زمانہ ہے
ہم ہی شکوہ ترا نہیں کرتے اب تو گھر گھر یہی فسانہ ہے
میری وحشت کا ہے سبب کچھ اور
موسمِ گل تو اِک بہانہ ہے

کچھ سجے ہیں زُلف میں کچھ گلوئے یار میں پھول جس قدر کِھلے موسم بہار میں
ہم رہے تو کیا رہے ہم ہیں کس شمار میں قافلے کا قافلہ لُٹ گیا بہار میں
جی میں ہے کہ روئیے شاخِ سایہ دار میں دونوں ہاتھ ڈال کے گردنِ بہار میں
دو ہی سلسلے تو ہیں میری سرگزشت کے اِک کڑی خزاں میں ہے دوسری بہار میں
دامنِ چمن تو ہے دُور کا معاملہ
اپنا پیرہن نہیں اپنے اختیار میں

رنگ آنسوؤں کا میرے جس دن سے شہابی ہے
صبح اُن کی بسنتی ہے شام اُن کی گلابی ہے

میخانے سے باہر تک جھنکار چلی آئی
یہ کس کا سُبو ٹوٹا یہ کون شرابی ہے؟

بے کیفیِ صہبا میں ساقی کی خطا نکلی
ہم نے تو یہ سمجھا تھا موسم کی خرابی ہے

کیفیتِ غم پوچھو ہم اہلِ طبیعت سے
مئے ہوگی اُسی گھر میں جس گھر میں گلابی ہے

آسان ہے اب کتنی رسم و رہِ میخانہ
دو گھونٹ بھی پی لی ہے جس نے وہ شرابی ہے

اُن کے متعلق جو باتیں ہیں مرے دل میں
چپ رہیے تو بیجا ہے کہیے تو خرابی ہے

ہنسیں گے مجھ پر وہی کہ جن کو شعورِ حالِ چمن نہیں ہے
میں چاک دامن جو پھر رہا ہوں یہ میرا دیوانہ پن نہیں ہے

خموش میں اس لیے نہیں ہوں کہ دولتِ فکروفن نہیں ہے
بہت سخن ہائے گفتنی ہیں مگر مجالِ سخن نہیں ہے

ہے مشورہ دوستوں کو میرا کہ کم نہ ہو گرمیِ تمنّا
چراغ خلوت ہی میں جلاؤ اگر کوئی انجمن نہیں ہے

زمانہ آنے تو دو جنوں کا ضرور کچھ دھجیاں اُڑیں گی
قبائے رنگیں تو ہے کسی کی اگر مرا پیرہن نہیں ہے

ستم ہے، اہلِ حرم ابھی تک مغالطے میں پڑے ہوئے ہیں؟
وہ شیخ اِس دَور میں کہاں ہے جو بندۂ برہمن نہیں ہے

غزل جو سنتا ہے میری عاجزؔ وہ مجھ کو حیرت سے دیکھتا ہے
کہ دل پہ گزری ہے کیا قیامت مگر جبیں پر شکن نہیں ہے

دِن مرا ساز بنے رات غزل بن جائے
میرا مجموعۂ حالات غزل بن جائے

اپنی پلکوں کے ستارے جو میں شامل کر دوں
رم جھماتی ہوئی برسات غزل بن جائے

حسن تنظیم ہو ساقی کا مرا حسن خیال
پھر تو یہ بزمِ خرابات غزل بن جائے

عشق کے ہاتھ کی مٹّی بھی ہے سونا اے دوست
میں جو بھیجوں وہی سوغات غزل بن جائے

قصّۂ دار ورَسن ہو کہ بیانِ قد و زُلف
میں ہوں شاعر مری ہر بات غزل بن جائے

لالہ و گل کی تمنّا کرکے ہم
بیٹھے ہیں اشکوں سے دامن بھر کے ہم

اِس چمن میں کیا یہی دستور ہے
پھول کے تم مستحق پتھر کے ہم

اب تو کوئی پوچھنے والا نہیں
تھے کبھی چشم و چراغ اِس گھر کے ہم

ایک دن مرنا تو ہے سب کو مگر
جی رہے ہیں رات دن مَر مَر کے ہم

اتنا رُسوا کوئی دُشمن بھی نہیں
جتنے رُسوا ہیں محبت کرکے ہم

ہمارے ہونٹوں تک آئے ترانہ! مشکل ہے
یہ وہ چمن ہے جہاں مسکرانا مشکل ہے

نہ پوچھ کس لیے آنکھوں میں آ گئے آنسو
سبب ضرور ہے لیکن بتانا مشکل ہے

بہار میں بھی گلستاں کا کیا کہوں احوال
ہیں اتنے کانٹے کہ دامن بچانا مشکل ہے

گدازِ شمع یہاں ہے نہ سوزِ پروانہ
اِس انجمن میں ہمارا ٹھکانا مشکل ہے

غمِ حیات کا مارا ہوا ہے دل اے دوست
غزل تو ہوگی مگر عاشقانہ؟ مشکل ہے

کچھ حال نہ پوچھو عاجزؔ کا کمبخت عجب دیوانہ ہے
ہنسنا ہے تو ہنستے رہنا ہے رونا ہے تو روتے جانا ہے

نغموں کی ہر اِک جا شہرت ہے نالوں کا تمام افسانہ ہے
جس باغ میں ہم جا پہنچے ہیں پھولوں نے ہمیں پہچانا ہے

سنتے ہیں وفا کے رستے میں منزل نہ مسافر خانہ ہے؟
کیا جانے کہاں تک پہنچے ہیں کیا جانے کہاں تک جانا ہے

زنجیر جنوں کا تحفہ ہے ، زنجیر سے کیا گھبرانا ہے
ہم ہاتھ بڑھائے بیٹھے ہیں پہنائے جسے پہنانا ہے

پہلو میں ہمارے دل کیسا دل پر تو قیامت بیت گئی
مُرجھایا ہوا اِک غنچہ ہے ٹوٹا ہوا اِک پیمانہ ہے

وہی زندہ رہنے کا فن جانتے ہیں — جو آدابِ دار و رَسن جانتے ہیں
بہار اِن کو کس درجہ مہنگی پڑی ہے — گل و لالہ و نسترن جانتے ہیں
حقیقت فراموش ہم کو نہ سمجھو — کہاں چاک ہے پیرہن، جانتے ہیں
پریشانیاں میری مجھ سے زیادہ — ترے گیسوئے پُرشکن جانتے ہیں
خرد کھیل سمجھی ہے دیوانہ پن کو — جو کرتے ہیں دیوانہ پن جانتے ہیں
عجب درد ہے دردِ بے خانمائی — ہم آوارگانِ وطن جانتے ہیں

چراغ سرِ رہگزر ہم کو سمجھو
نہ منزل نہ ہم انجمن جانتے ہیں

اب کے جو بہار آئی بے بادہ و جام آئی — اِک بوند بھی مئے لب تک صبح آئی نہ شام آئی
کس پیاس کے مارے کو بادِ مئے و جام آئی — بھیگی ہوئی اشکوں سے میخانے کی شام آئی
جلتا ہے چراغوں میں خوں تیرے شہیدوں کا — ہولی کی بچی دولت دیوالی میں کام آئی
دیوانے کے قدموں میں جھکنا پڑا دُنیا کو — جب وقتِ جنوں آیا کچھ عقل نہ کام آئی

میرے حرمِ فن میں لیلائے غزل عاجؔز
نشتر بقلم آئی آتش بکلام آئی

دوست ہیں آشفتہ گوئی کو غزل جانے ہوئے
شاعروں میں ہوگئے ہم جب سے دیوانے ہوئے

عقل کے جتنے کرشمے تھے سب افسانے ہوئے
ہم تو ہیں اے عشق تجھ کو پیشوا مانے ہوئے

اب نگاہِ شیخ ملتی ہے نہ چشمِ برہمن
بھر گئے دیر و حرم خالی جو میخانے ہوئے

دیکھیں اب کے امتحاں میں سرخ رو ہوتا ہے کون
وہ بھی کچھ سوچے ہوئے ہیں ہم بھی کچھ ٹھانے ہوئے

تو نے پھر شاید پکارا ہے فرازِ دار سے
اے جنوں ہم ہیں تری آواز پہچانے ہوئے

بوالہوس محلوں میں ہیں بیخواب اور تیرے فقیر
سو رہے ہیں چادرِ آسودگی تانے ہوئے

فصلِ گل عاجؔز قفس میں آتے ہی آتے رہی
ہم یہاں بیٹھے تھے کیا کیا مّنتیں مانے ہوئے

اب تو اشکوں کی جھڑی دن رات ہے ہم کو ہر موسم بھری برسات ہے
روز اک تحفہ ہے اک سوغات ہے اے غمِ دوراں تری کیا بات ہے
زلفِ جاناں کی سیاہی مات ہے اللہ اللہ کیا اندھیری رات ہے
ان کی آنکھوں کا اشارا ہی نہیں ورنہ مرجانا بھی کوئی بات ہے؟
کچھ نہیں رکھتے محبّت کے سوا ہم غریبوں کی یہی اوقات ہے

جھومتے ہیں سب مرے اشعار پر
میرے دل میں سب کے دل کی بات ہے

ہم کو زنجیر پہننے میں کوئی عار نہیں یوں بھی دیوانہ ہی سب کہتے ہیں ہشیار نہیں
قید خانہ کی بظاہر کوئی دیوار نہیں ہم گرفتار ہیں ایسے کہ گرفتار نہیں
پھونک ڈالا ہے گلستاں کا گلستاں جس نے کون کہتا ہے ترا شعلۂ رخسار نہیں
غم کے بازار میں اشکوں کی بڑی آمد ہے ایک قطرے کا مگر کوئی خریدار نہیں
ایسی حالت میں بھی دل ہے کہ جیے جاتا ہے کون سا درد نہیں کون سا آزار نہیں
کروٹیں لیتی ہیں سینے میں کچھ ایسی باتیں جن کے سننے کو زمانہ بھی تیار نہیں

بات کہنے کا یہ انداز ہے مشکل عاجزؔ
ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں

کتنا دُکھ کتنی جفا کتنا ستم دیکھا ہے ہم نے اِس عمر میں اِک عمر کا غم دیکھا ہے
زُلف بل کھائی نہ تھی تا بہ کمر آئی نہ تھی وہ زمانہ بھی ترے سر کی قسم دیکھا ہے
ایک مدّت سے مری صبحِ مسرّت گم ہے تو نے رستے میں کہیں اے شبِ غم دیکھا ہے؟

زخمِ دل مانگتے ہیں اور دُعا دیتے ہیں　　ہم سا سائل کوئی اے اہلِ کرم دیکھا ہے؟
دیکھئے میری غزل میں کبھی صورت اپنی　　یہ وہ آئینہ ہے جو آپ نے کم دیکھا ہے
کیسے سمجھے کوئی دُکھ درد ہمارا عاجزؔ
ہم نے جو دیکھا ہے اَوروں نے وہ غم دیکھا ہے؟

دردمندِ عشق ہیں غم سے نہ گھبرائیں گے ہم　　شاعری کرتے رہیں گے اور مرجائیں گے ہم
ہم تو دیوانے ہیں ہم کو مصلحت سے کیا غرض　　اپنی چادر سے بھی باہر پاؤں پھیلائیں گے ہم
عشق کی بربادیاں قسمت سے ہوتی ہیں نصیب　　جس قدر بگڑیں گے اتنا ہی سنور جائیں گے ہم
ہوشیاروں کو مبارک تیری محفل اے خرد　　صبح آئیں گے ترے در پر نہ شام آئیں گے ہم
اپنے آنسو ہی جوابِ پرسشِ احوال ہیں　　خود نہیں سمجھے تو کیا اَوروں کو سمجھائیں گے ہم
اب کے پھر برسات میں گنجِ شہیداں پر چلیں
آسماں روئے گا اور اپنی غزل گائیں گے ہم

اے پیرِ مغاں تشنہ لبی عام بہت ہے　　تو نے تو کہا تھا مئے گلفام بہت ہے
ساون کی گھٹا آ گئی میخانے کے نزدیک　　ہونٹوں سے مگر فاصلۂ جام بہت ہے
خلوت میں غریبوں کو اُجالا نہیں دیکھا　　محفل میں تو اے شمع ترا نام بہت ہے
غم ہے تو کوئی لطف نہیں بسترِ گل پر　　جی خوش ہے تو کانٹوں پہ بھی آرام بہت ہے
جلتا ہے چراغوں میں لہو اہلِ وفا کا　　سنتے ہیں کہ رنگین تری شام بہت ہے
ہنسنے کا تو موقع نہیں، آ، بیٹھ کے رولیں　　یہ فرصتِ غم بھی دلِ ناکام بہت ہے
عاجزؔ ہوسِ جشنِ چراغاں نہیں ہم کو
اِک شمع ہی جل جائے سرِ شام بہت ہے

کیا حالِ بیاں کیجیے سب حال ہے آئینہ ‏ اشکوں سے بھرا دامن زخموں سے بھرا سینہ
یہ فصلِ گل ولالہ گزری چلی جاتی ہے ‏ بے شیشہ و بے ساغر بے بادہ و بے مینا
وہ انجمن آرائی یہ غربت و تنہائی ‏ بخشا تو بہت بخشا چھینا تو بہت چھینا
دُنیا میں غریبوں کو دو کام ہی آتے ہیں ‏ جینے کے لیے مرنا ، مرنے کے لیے جینا
سنتے ہیں کہ اب جو بھی پیتا ہے بہکتا ہے ‏ ہم تک ہی رہا قائم آدابِ مئے و مینا

اِس دَور میں اے عاجزؔ کیا ذکر محبت کا
اِک دفترِ گم گشتہ اِک قصّۂ پارینہ

یوں تو ملنے کو بہت پیر و جواں ملتے ہیں ‏ جو محبت سے ملیں ایسے کہاں ملتے ہیں
ڈھونڈھنے والوں کو ہم بھی وہیں مل جائیں گے ‏ اُن کی زُلفوں کے گرفتار جہاں ملتے ہیں
پھول اشکوں کے جو ملتے ہیں مرے دامن میں ‏ ایسے گل صحنِ گلستاں میں کہاں ملتے ہیں
اب تو یہ حال زمانے کا ہے اللہ اللہ ‏ دوست بھی ملتے ہیں تو دشمنِ جاں ملتے ہیں
بے مشقت کبھی آرام نہیں ملتا ہے ‏ گل بھی ملتے ہیں تو کانٹوں میں نہاں ملتے ہیں

یاد آجاتی ہے اربابِ وطن کی عاجزؔ
غم کے مارے ہوئے دو چار جہاں ملتے ہیں

کس درجہ گراں بادۂ گلفام لیا ہے ‏ سو جام دیئے ہیں اگر اِک جام لیا ہے
غربت میں وطن کا جو کبھی نام لیا ہے ‏ وہ چوٹ لگی ہے کہ جگر تھام لیا ہے
کانٹوں کا زمانہ ہو کہ پھولوں کا ہو موسم ‏ ہم نے کسی کروٹ بھی نہ آرام لیا ہے
دُنیا اِنھیں بیکار سمجھتی ہے تو سمجھے ‏ ہم نے تو اِن اشکوں سے بڑا کام لیا ہے

احسان ہے دل پر ترا اے دردِ محبت
تو نے مرا گرتا ہوا گھر تھام لیا ہے

آج جیسی بنی کل اس سے جدا گانہ بنے　　　ایک زنجیر ہمارے لیے روزانہ بنے
ہم تو محفل سے نکالے گئے دیوانہ بنے　　　کون اب آپ کی زُلفوں کے لیے شانہ بنے
منصبِ ساقی گری بھی ہے ولایت کا مقام　　　صاحبِ دل بنے تب صاحبِ میخانہ بنے
سخت دُشوار ہے پابندیِ آدابِ جنوں　　　جس کو بننا ہو سمجھ بوجھ کے دیوانہ بنے
زندگی کام کی بنتی نہیں بے سوزِ جگر　　　شمع بننے کی تمنّا ہو تو پروانہ بنے

پیرہن سُرخ نہیں ہے تو کفن سُرخ سہی
کوئی جوڑا تو گدا کے لیے شاہانہ بنے!

وہی کہیں گے جو ہوگا ہمیں بجا معلوم　　　بھلا کسی کو ہو معلوم یا بُرا معلوم
اُلجھ کے پیچ و خمِ روزگار میں دیکھا　　　تری ہی زُلف کا ہوتا ہے سلسلہ معلوم
زباں سے حضرتِ ناصح کو کیا بتائیں ہم　　　یہ دل کی چوٹ ہے کھائے تو ہو مزا معلوم
ہے اور کون جو پھولوں کو روندتا گزرے؟　　　مجھے تو ہوتا ہے اُن کا ہی نقشِ پا معلوم
نکل کے انجمنِ عشق سے کہاں جاؤں؟　　　مجھے تو ہے بس اسی گھر کا راستہ معلوم

اِدھر آ، اے غمِ دوراں، کہ اِس زمانے میں
تو ہی تو ہوتا ہے اِک صورت آشنا معلوم

تم تو بیدرد ہو بے تابیِ غم کیا جانو　　　اہلِ دل پر جو گزرتے ہیں ستم کیا جانو
شمع کیوں جلتی ہے سرتا بقدم کیا جانو　　　ہائے کیا چیز ہے مجبوریِ غم کیا جانو
تم سے ناحق ہے مجھے چشمِ وفا کی اُمید　　　تم بھلا شیوۂ اربابِ کرم کیا جانو
چند اشکوں سے اداحقِ بیاں کیا ہوگا　　　کس قدر طول ہے افسانۂ غم کیا جانو

رسن و دار کو خاکِ کفِ پا بھی نہ ملی
کس جگہ اہلِ جنوں کا ہے قدم کیا جانو

رونا آتا ہے تو آجاتے ہیں گانے کے لیے
ہم کو آساں ہے جو مشکل ہے زمانے کے لیے

اپنا دل سینۂ اشعار میں رکھ دیتے ہیں
کچھ حقیقت بھی ضروری ہے فسانے کے لیے

بیکسی ایسی بھی ہو جاتی ہے ؟ اللہ اللہ
کوئی دشمن بھی نہیں دوست بنانے کے لیے

جان دینے کا ذریعہ تھی محبت پہلے
اب تو اِک کھیل ہے دُنیا کو دِکھانے کے لیے

اے جنوں ان کو نہ کر فکر کہ ہشیاروں کو
عقل ہی کافی ہے دیوانہ بنانے کے لیے

ہم کو شاعر نہ کہو ایک فقیر آیا ہے
دل کے دروازے پہ آواز لگانے کے لیے

گرچہ ہیں گردشِ تقدیر کے مارے ہوئے ہم
شکر اس کا ہے کہ ہمّت نہیں ہارے ہوئے ہم

نظر آتا نہیں پہچاننے والا کوئی
اجنبی شہر میں اے دوست تمھارے ہوئے ہم

گرچہ دُنیا نے کیا بے سر و ساماں ہم کو
اپنے نغموں سے ہیں دُنیا کو سنوارے ہوئے ہم

غم پہ اس واسطے بنیادِ سخن رکھی ہے
تم سے نزدیک اسی غم کے سہارے ہوئے ہم

عقل کیا کہنا تری انجمن آرائی کا
کیا کہیں کیوں تیری محفل سے کنارے ہوئے ہم

رسم و آدابِ محبت کوئی سیکھے ہم سے
زندگی ہیں اسی کوچے میں گزارے ہوئے ہم

جو سوز و ساز کا رکھتے رہے بھرم ، نہ رہے
غزل کو کون سنبھالے کہ اہلِ غم نہ رہے

رہے تو دونوں چمن میں ، مگر بہم نہ رہے
خزاں میں تم نہ رہے، فصلِ گل میں ہم نہ رہے

کسی کا مجھ سے زیادہ نہیں ہے حق ساقی
مرے سُبو میں کسی کے سُبو سے کم نہ رہے

کوئی سلیقے سے دیکھے تو پی کے چلّو میں
وہ لطف آئے کہ اَرمانِ جامِ جم نہ رہے

نمودِ حسن نہیں حسن آشنا کے بغیر
جو تم رہے بھی تو کیا تم رہے کہ ہم نہ رہے

حیات کشمکشِ آرزُو میں ہے اے دوست — وہ دن نہ آئے کہ زُلفوں میں پیچ وخم نہ رہے
عجیب لطف ہے کروٹ بدلتے رہنے میں — خدا کرے کبھی اِس دل میں دردکم نہ رہے

سُنا ہے رہتا ہے یاروں کا جمگھٹا عاجزؔ
ہزار حیف کہ اُس انجمن میں ہم نہ رہے

گونجتا ہے مرا نغمۂ فکر وفن — میکدہ میکدہ انجمن انجمن
فتوئے شیخ یا دعوئے برہمن — وہ بھی دیوانہ پن یہ بھی دیوانہ پن
تھک گیا عقل کی بخیہ کاری کا فن — چاک ہی چاک ہے پیرہن پیرہن
کوئی اہلِ جنوں کا نہیں ہم سخن — سب یہاں شیخ ہیں سب یہاں برہمن
لُٹ گیا آتے آتے قریبِ چمن — کاروانِ گل و لالہ و نسترن
اَب سبھی ہیں مقاماتِ دار و رَسن — دَیر ہو یا حرم ، دشت ہو یا چمن
مجھ سے چاہیں تو اہلِ خرد مانگ لیں — تھوڑی آشفتگی تھوڑا دیوانہ پن

خونِ عاجزؔ سے یوں سُرخ ہے وہ چھری
جیسے ہاتھوں میں مہندی لگائے دُلہن

ہم چلے اب کاروبارِ آئینہ خانہ چلے — ہاں لگے آنکھوں میں سُرمہ زلف میں شانہ چلے
رسم جو چلتی رہی ہے بے حجابانہ چلے — مئے نہیں تو آنسوؤں کا دَور پیمانہ چلے
گر یہ چاہو ہو چھری گردن پہ روزانہ چلے — چلیو تب اُس راستے پر جس پہ دیوانہ چلے
تشنہ کامو! گرم آہوں میں دُھواں اتنا تو ہو — اِک گھٹا کالی اُٹھے اور سوئے میخانہ چلے
وقت کو تیار کرنا ہی پڑا خونیں کفن — وہ گدا ہم ہیں کہ خلعت لے کے شاہانہ چلے
ہر قدح آشام سے ممکن نہیں یہ اہتمام — بات ہُشیاری کی بولے چال مستانہ چلے
عقل کے پیچھے زمانہ ٹھوکریں کھاتا ہوا — یوں چلا جائے ہے جیسے کوئی دیوانہ چلے

شمع و پروانہ میں کچھ سرگوشیاں ہونے لگیں
ہم جو محفل سے سُنا کر اپنا افسانہ چلے

ہم کو تو بے سوال ملے بے طلب ملے
ہم وہ نہیں ہیں ساقی کہ جب مانگیں تب ملے

فریاد ہی میں عہدِ بہاراں گزر گیا
ایسے کھلے کہ پھر نہ کبھی لب سے لب ملے

ہم یہ سمجھ رہے تھے ہمیں بدنصیب ہیں
دیکھا تو میکدے میں بہت تشنہ لب ملے

کس نے وفا کا ہم کو وفا سے دیا جواب؟
اِس راستے میں لُوٹنے والے ہی سب ملے

ملتے ہیں سب کسی نہ کسی مدعا کے ساتھ
ارمان ہی رہا کہ کوئی بے سبب ملے

رکھا کہاں ہے عشق نے عاجؔز کو ہوش میں
مت چھیڑیو اگر کہیں وہ بے اَدب ملے

میں فقیرِ خانہ بدوش ہوں مرا انجمن میں گزر نہیں
نہ دِکھاؤ خوابِ محل اُسے جسے جھونپڑے کی خبر نہیں

مرا درد کون سا درد ہے کہ قرار شام و سحر نہیں
مرے دُشمنوں کو ہے سب پتہ میرے دوستوں کو خبر نہیں

مرے دردِ عشق کا ساتھ دے کسی بوالہوس کا جگر نہیں
یہ تمام عمر کی راہ ہے گھڑی دو گھڑی کا سفر نہیں

مجھے عشق اگر نہ اُبھارتا تری زُلف کون سنوارتا
یہ ہنر ہے میری نگاہ کا ترے آئینے کا ہنر نہیں

تری داستاں کو بھی رنگ دوں ترے آستاں کو بھی رنگ دوں
مرے پاس خونِ جگر تو ہے مگر اتنا خونِ جگر نہیں

آنسوؤں کی مئے بنی زخموں کا پیمانہ بنا
سینکڑوں میخانے اُجڑے ایک میخانہ بنا

ہوشیاروں کو نہیں معلوم رازِ فصلِ گُل
مجھ سے پوچھو میں اِسی موسم میں دیوانہ بنا

شاخِ گل کی چھاؤں میں گلچیں ہے اب آرام سے
دشمنِ خانہ ہی آخر صاحبِ خانہ بنا

بیچ میں کچھ جھونپڑے اہلِ محبت کے بنے
اِک طرف کعبہ بنا اِک سمت بُت خانہ بنا

بے تامّل کود پڑتے ہیں وفا کی آگ میں
ہم ہیں اُس مٹّی سے جس مٹّی سے پروانہ بنا

مئے کشوں کی قدر کر ساقی کہ اِن کے واسطے
سنگ سے شیشہ بنا، شیشے سے پیمانہ بنا

ہم تو شاعر ہیں ہمارا درد چھپ سکتا نہیں
جو غزل میں کہہ دیا ہم نے وہ افسانہ بنا

اِس غریبی میں بھی چلتے ہیں سر اُونچا کر کے
ہم بھی اے دوست کُلہ دار ہیں اپنے گھر کے

دن بسر کر کے مشقت کی کڑی دُھوپ میں ہم
رات کو سوتے ہیں ہاتھ اپنا سرہانے دھر کے

ایک چلّو بھی نہ اپنے لیے باقی رکھا
غیروں کو بخش دیئے ساغر و مینا بھر کے

ہم کو بااِیں ہمہ پہچان رہی ہے دُنیا
تاج گو اَوروں کے سر پر ہیں ہمارے سر کے

تم نے دیکھی ہی نہیں ہمّتِ مردانِ وفا
زندگی ہے تو دِکھا دیں گے کسی دن مَر کے

تم تو مصروفِ چراغاں تھے تمھیں کیا معلوم؟
اِس دیوالی میں دِیئے بجھ گئے کتنے گھر کے

کیا کہیں پاسِ محبت نہیں اُٹھنے دیتا
یہ نہ سمجھو کہ بھکاری ہیں تمھارے در کے

غمِ جاں بھی غمِ جاناں بھی غمِ دوراں بھی
ایک دل کے لیے سامان ہیں دُنیا بھر کے

جس جگہ بیٹھنا دُکھ درد ہی گانا ہم کو
اور آتا ہی نہیں کوئی فسانہ ہم کو

کل ہر اِک زُلف سمجھتی رہی شانہ ہم کو
آج آئینہ دکھاتا ہے زمانہ ہم کو

عقل پھرتی ہے لیے خانہ بہ خانہ ہم کو
عشق اب تو ہی بتا کوئی ٹھکانہ ہم کو

یہ اسیری ہے سنورنے کا بہانہ ہم کو
طوق آئینہ ہے زنجیر ہے شانہ ہم کو

جادۂ غم کے مسافر کا نہ پوچھو احوال
دُور سے آئے ہیں اور دُور ہے جانا ہم کو

ایک کانٹا سا کوئی دل میں چبھو دیتا ہے
یاد جب آتا ہے پھولوں کا زمانہ ہم کو

دل تو سو چاک ہے دامن بھی کہیں چاک نہ ہو
اے جنوں دیکھ ! تماشہ نہ بنانا ہم کو

زہرِ غم سے نہیں انکار کہ پینا ہے یہی
ہم غریبوں کا تو مرنا یہی جینا ہے یہی

درد کو اس لیے سینے سے لگا رکھا ہے
زندگی ایک انگوٹھی ہے نگینہ ہے یہی

ہم بھی چُلّو میں لہو دل کا لیے بیٹھے ہیں
ہر طرف شور ہے فصل مئے و مینا ہے یہی

کتنی مدّت ہوئی آنسو نہیں تھمتے اپنے
اب یہ برسات نہ جائے گی قرینہ ہے یہی

شہر میں ہر درو دیوار پہ روشن ہیں چراغ
میرا گھر جس میں جلا تھا وہ مہینہ ہے یہی

ناز کیوں کر نہ کریں دولتِ خود داری پر
ہم نے اے وقت ترے ہاتھ سے چھینا ہے یہی

ہم تو مزدُورِ محبت ہیں غزل کہتے ہیں
ایک فنکار کے ماتھے کا پسینہ ہے یہی

بول اُٹھے سب کیوں کُھلا کیوں کر کُھلا — ہم غریبوں کا جہاں بستر کُھلا
خانہ ویرانی کو سب کچھ سونپ کر — چھوڑ آئے ہیں ہم اپنا گھر کُھلا
چادرِ اوقات کی تنگی نہ پوچھ — پاؤں جب ہم نے چھپایا سَر کُھلا
تجربوں کا سلسلہ ہے زندگی — ہر قدم پر اِک نیا دفتر کُھلا
دُشمنوں کی کیا خصوصیت کہ اَب — دوست بھی رکھنے لگے خنجر کھلا
راہ میخانے کی اُن پر بند ہے — جن پہ رازِ بادۂ و ساغر کُھلا
گرچہ پانی تھا شہیدوں کا لہو — رنگ کتنا تیرے دامن پر کُھلا
شاعری فنکار کی شمشیر ہے — اکثر اِس تلوار کا جوہر کُھلا

لوگ کہتے ہیں کہ عاجزؔ کی غزل
پھول پوشیدہ ہے اور پتھر کُھلا

اشعار میں سجا کے بنا کے سنوار کے — کہیے تو ہم بھی زخم دِکھائیں بہار کے
پیغام ہیں رسن کے تقاضے ہیں دار کے — فرصت کہاں کہ لطف اُٹھائیں بہار کے
ہر گل یہ کہہ رہا ہے چمن میں پکار کے — سائے سے دُور دُور ہی رہیو بہار کے
ہم کو وفا کا درس نہ دو ہم تو بیٹھے ہیں — اِک عمر رسم و راہِ وفا میں گزار کے
بادہ گسار و وقتِ تکلف نہیں ہے اَب — بھر لو سبو کو طاق سے مینا اُتار کے
اے باغباں یہ فرقِ مراتب روا نہیں — کانٹوں کو بھی سنوار گلوں کو سنوار کے

عاجزؔ غمِ شکستِ محبت ہے عارضی
ہم نے یہ کھیل بارہا جیتا ہے ہار کے

دل سے اِک پل بھی جدا ہو یہ گوارا ہی نہیں
ہم کو اَب درد سے بڑھ کر کوئی پیارا ہی نہیں

تیرے غم نے کیا یہ حال خوشی ہے اِس کی
رنج اس کا ہے کہ یہ حال ہمارا ہی نہیں

ہم جو مرتے ہیں محبت میں تو مرنے دیجے
اس میں مرنے کے علاوہ کوئی چارا ہی نہیں

یہ تو اِک فرض تھا اے گیسوئے دوراں اپنا
ہم نے اُجرت کے لیے تجھ کو سنوارا ہی نہیں

ایسا کچھ لطف ملا عشق کی مزدُوری میں
درد کا بوجھ کبھی سر سے اُتارا ہی نہیں

خوب آگاہ تقاضائے جنوں سے ہم ہیں
کیا بتائیں ابھی موسم کا اشارا ہی نہیں

شرم ہوگی تو خود آئے گی پلٹ کر عاجزؔ
ہم نے جاتی ہوئی دُنیا کو پکارا ہی نہیں

ہم نے بے فائدہ چھیڑی غم ایّام کی بات
کون بیکار یہاں ہے کہ سنے کام کی بات

شمع کی طرح کھڑا سوچ رہا ہے شاعر
صبح کی بات سُنائے کہ کہے شام کی بات

ہم غریبوں کو تو عادت ہے جفا سہنے کی
ڈھونڈھ ہی لیتے ہیں تکلیف میں آرام کی بات

دُھوپ میں خاک اُڑا لیتے ہیں سائے کے لیے
پیاس لگتی ہے تو کرتے ہیں مئے و جام کی بات

اب تو ہر سمت اندھیرا ہی نظر آتا ہے
خوب پھیلی ہے تری زُلفِ سیہ فام کی بات

صبح کے وقت جو کلیوں نے چٹک کر کہہ دی
بات چھوٹی سی ہے لیکن ہے بڑے کام کی بات

کوئی کہہ دے کہ محبت میں بُرائی کیا ہے
یہ نہ تو کفر کی ہے بات نہ اِسلام کی بات

گرچہ احباب نے سر جوڑ کے ڈھونڈھا عاجزؔ
نہ ملی میری غزل میں روشِ عام کی بات

اے عشق ! مل سکیں گے نہ ہم جیسے سر پھرے
برسوں چراغ لے کے زمانہ اگر پھرے

ہوجائیں خاک ہم تو یقیں ہے کہ حشر تک
سر پر یہ خاک اُٹھائے نسیمِ سحر پھرے

وہ درد مند ہیں کہ گئے جس چمن میں ہم
پھولوں کو بانٹتے ہوئے خونِ جگر پھرے

آساں نہیں ہے وضعِ جنوں کا نباہنا
تھک تھک کے راستے سے بہت ہمسفر پھرے

اِس طرح آئی دل میں تری بھولی بھٹکی یاد
جیسے بہت دِنوں پہ کوئی اپنے گھر پھرے

یہ سمندر ہے کنارے ہی کنارے جاؤ
عشق ہر شخص کے بس کا نہیں پیارے جاؤ

یوں تو مقتل میں تماشائی بہت آتے ہیں
آؤ اس وقت کہ جس وقت پکارے جاؤ

دل کی بازی لگے پھر جان کی بازی لگ جائے
عشق میں ہار کے بیٹھو نہیں ، ہارے جاؤ

کام بن جائے اگر زُلفِ جنوں بن جائے
اس لیے اس کو سنوارو کہ سنوارے جاؤ

کوئی رستہ کوئی منزل اِسے دُشوار نہیں
جس جگہ چاہو محبت کے سہارے جاؤ

ہم تو مٹّی سے اُگائیں گے محبت کے گلاب
تم اگر توڑنے جاتے ہو ستارے جاؤ

ڈوبنا ہوگا اگر ڈوبنا تقدیر میں ہے
چاہے کشتی پہ رہو چاہے کنارے جاؤ

تم ہی سوچو بھلا یہ شوق کوئی شوق ہوا
آج اونچائی پہ بیٹھو کل اُتارے جاؤ

مَوت سے کھیل کے کرتے ہو محبت عاجزؔ
مجھ کو ڈر ہے کہیں بے موت نہ مارے جاؤ

ہیں بت کدے میں غریب اور بے وطن جیسے — اگرچہ رہتے ہیں کہتا ہے برہمن جیسے
شبابِ لالہ و گل اِک ہَوا کا جھونکا تھا — بہار آ کے گزر جائے دفعتاً جیسے
بغیر مَے عجب احوالِ میکدہ ہے آج — چراغ سے رہے محروم انجمن جیسے
ملا نہ اہلِ جنوں کا مزاج داں کوئی — تمام لوگ ملے شیخ و برہمن جیسے
چھپالیا ہے مشقت نے عیبِ عریانی — ہے گرد جسم پہ اس طرح پیرہن جیسے
اب اہلِ ہوش کو ہے شوقِ چاک دامانی — یہ کاروبارِ جنوں بھی ہے کوئی فن جیسے

غزل سُنی تو وہ بولے کہ تم تو اے عاجزؔ
ہو خوش کلام بھی ایسے ہی کم سخن جیسے

مقدّر میں اگر بدنام ہی ہونا ہے ہولیں گے
جو آئے جس کے جی میں بول لے ہم کچھ نہ بولیں گے

اگر چاہے گا جی اپنا تو خود آزاد ہولیں گے
یہ اہلِ ہوش کیا دیوانوں کی زنجیر کھولیں گے

وہ سوداگر ہیں تو سوداگری ہم کو بھی آتی ہے
وفا کو وہ جو پرکھیں گے کرم کو ہم بھی تولیں گے

ہمیں تو اے خرد دار و رسن کی سمت جانا ہے
اگر موقع ملے گا تیرے کوچے سے بھی ہولیں گے

متاعِ درد سے ہے انجمن کی انجمن خالی
یہ شئے ہم بانٹتے ہیں اہلِ محفل سے کہو لیں گے؟

کچھ اہلِ عشق نے اِک کارواں اپنا بنایا ہے
وہی پہنچیں گے منزل تک جو اِن کے ساتھ ہولیں گے

چلیں ہنس بول لیں کچھ دیر بزمِ دوست میں عاجزؔ
اگر اُمڈے گا دل، جا کر کسی گوشے میں رولیں گے

دل میں نہ ہو گداز تو بولی میں کچھ نہیں
لفظوں کے ساتھ آنکھ مچولی میں کچھ نہیں
کچھ ہم نے دلگی کے بہانے تراشے ہیں
ورنہ بسنت کچھ نہیں ہولی میں کچھ نہیں
دیوانے شہرِ دار و رَسن کو نکل گئے
اَب آہوانِ دشت کی ٹولی میں کچھ نہیں
کچھ ٹھیکرے دیارِ محبت کی یادگار
اِن کے سوا کلیمؔ کی جھولی میں کچھ نہیں

موسم سب آتے ہیں لیکن موسم میں وہ بات نہیں
نکھری نکھری شام نہیں اَب مہکی مہکی رات نہیں

ایسے بھی کچھ لوگ ہیں جن کی بنتی کوئی بات نہیں
مرنے کی توفیق نہیں ہے جینے کی اوقات نہیں

دُھوپ کہیں جب دُھوپ نہیں ہو رات کہیں جب رات نہیں
دیوانوں کی بات سمجھنا سب کے بس کے بات نہیں

میخانے پر جب دیکھو تب بادل چھائے رہتے ہیں
جن کے گھر میں آگ لگی ہے اُن کے گھر برسات نہیں

دل کا کیا احوال سناؤں چپ ہی رہنے دے ہمدم
چپ رہنے میں جو لذّت ہے کہنے میں وہ بات نہیں

پونجی تو افراط ہے لیکن کیسے بانٹوں کیسے دوں
درد کوئی تحفہ نہیں پیارے دُکھ کوئی سوغات نہیں

بچ کر چلنے والے عاجزؔ عشق میں ہارا کرتے ہیں
جس نے بڑھ کر داؤں لگایا اس کی بازی مات نہیں

آشنا غم سے ملا راحت سے بیگانہ ملا
دل بھی ہم کو خوبیِ قسمت سے دیوانہ ملا

بلبل و گل شمع و پروانہ کو ہم پر رشک ہے
درد جو ہم کو ملا سب سے جداگانہ ملا

ہم نے ساقی کو بھی دیکھا پیرِ میخانہ کو بھی
کوئی بھی اِن میں نہ راز آگاہِ میخانہ ملا

سب نے دامن چاک رکھا ہے بقدرِ احتیاج
ہم کو دیوانوں میں بھی کوئی نہ دیوانہ ملا

ہم تو خیر آشفتہ ساماں ہیں ہمارا کیا سوال
وہ تو سنوریں جن کو آئینہ ملا شانہ ملا

کیا قیامت ہے کہ اے عاجزؔ ہمیں اِس دَور میں
طبع شاہانہ ملی ، منصب فقیرانہ ملا

پائے خرد سے وقت کی زنجیر کیا کھلے
آگے بڑھ اے جنوں کہ کوئی راستہ کھلے

کس حال میں ہیں لالہ وہ نسرین ونسترن
کچھ کہہ کہ فصلِ گل کا بھرم اے صبا کھلے

زنجیرِ مصلحت کو بھی لازم ہے توڑنا
یوں دست و پا کھلے بھی تو کیا دست و پا کھلے

ہم بھی کچھ اپنے دل کی گرہ کھولنے کو ہیں
کس کس کا آج دیکھئے بندِ قبا کھلے

قیمت میں رند خونِ جگر لے کے آئے ہیں
ساقی کہاں ہے ؟ اَب تو درِ میکدہ کھلے

محفل سے اُٹھ کے رونقِ محفل کہاں گئی
کھل اے زبانِ شمع ! کہ کچھ ماجرا کھلے

ہے انتہا پہ روشنیِ عقل اے جنوں
وقت آ گیا کہ اَب تری زُلفِ دوتا کھلے

دُنیا سمجھ رہی ہے بڑے مہرباں ہیں وہ
کب دیکھیں بے وفا کا فریبِ وفا کھلے

عاجزؔ چھری پہ اُن کی کھلایوں مرا لہو
جیسے دُلہن کے ہاتھ پہ رنگِ حنا کھلے

جب سے جوانی آئی اُن کی آ بیٹھے بہکانے لوگ
کل تک اپنے لوگ ہمیں تھے آج ہیں ہم بیگانے لوگ

اپنا لہو بھر کر لوگوں کو بانٹ گئے پیمانے لوگ
دُنیا بھر کو یاد رہیں گے ہم جیسے دیوانے لوگ

اب وہ کہاں اخلاص کی شمعیں اب وہ کہاں پروانے لوگ
بیگانی بیگانی محفل انجانے انجانے لوگ

کس پر کیا کیا بیت گئی ہے کب سمجھے کب جانے لوگ
گھر بیٹھے سَر دُھن لیتے ہیں سن سن کر افسانے لوگ

جرمِ جنوں ثابت کرنے کو موسم کی کچھ شرط نہیں
جب چاہیں تب آ جاتے ہیں زنجیریں پہنانے لوگ

کوئی دیوانہ کہتا ہے کوئی شاعر کہتا ہے
اپنی اپنی بول رہے ہیں ہم کو بے پہچانے لوگ

باغ میں صبح و شام آنا جانا رہا لالہ و گل سے ملنا ملانا رہا
جس زمانے کی یہ بات ہے دوستو اَب وہ موسم نہ اَب وہ زمانہ رہا

ہم غزل گائیں تو رقص کر ساقیا کہ سلامت ترا بادہ خانہ رہا
مئے تو جام و صراحی میں بھرپور ہے خوں ہماری رگوں میں رہا نہ رہا

کون اے عشق تیرا پُجاری بنے بزم میں کوئی اہلِ وفا نہ رہا
ایک گوشے میں ہم رہ گئے ہیں یہاں سو ہمارا بھی اب کیا ٹھکانہ رہا

یہ تو سچ ہے کہ سرمایۂ آبرو آج چند آنسوؤں کے سوا نہ رہا
طنز سے جن پہ تم ہنس رہے ہو گلو! کل اِنھیں جیب و دامن میں کیا نہ رہا

یوں تو کہنے کو ہم چاک داماں بھی ہیں زُلف برہم کی صورت پریشاں بھی ہیں
جب سے سر پھوڑ لینے کی عادت گئی تب سے دیوانگی میں مزا نہ رہا

عقل بے چاری لرزہ براندام ہے ہمتِ عشق چل اب ترا کام ہے
منزلِ دار پر لوگ یوں رُک گئے جیسے آگے کوئی راستہ نہ رہا

گرچہ عاجزؔ ہیں ہم اور نادار ہیں محفلِ شادؔ کے رِند خوددار ہیں
یہ خدا ساز چلّو سلامت رہے جام کی کیا شکایت رہا نہ رہا

اَوروں کا دُکھ درد اپنا کر نکلے ٹھوکر کھانے ہم
سب سے دیوانہ تھا مجنوں اُس سے بھی دیوانے ہم

گلشن گلشن آئے گئے لیکن نہ گئے پہچانے ہم
کس گل کے ہیں بلبل ہم کس شمع کے ہیں پروانے ہم

وہ جو سب میں ناکارے ہیں ہم کو سب سے پیارے ہیں
محفل محفل ڈھونڈھ رہے ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے ہم

خون کے پیاسے دل میں ٹھنڈک سوزِ محبت سے ہوگی
دُنیا پانی مانگ رہی ہے آگ چلے بھڑکانے ہم

اب تک ہُشیاروں نے ہم کو زنجیریں پہنائی ہیں
اب جائیں گے ہُشیاروں کو زنجیریں پہنانے ہم

خواب میں ہم کو عشق نے اپنا شیش محل دکھلایا ہے
رستے سے گرچہ نہیں واقف منزل ہیں پہچانے ہم

عاجزؔ یہ البیلی باتیں بے سمجھی کی بات نہیں
خود سمجھا ہے تب نکلے ہیں دُنیا کو سمجھانے ہم

گلوں کے سر تو ہمارے ہی فکروفن سے اُٹھے | بہار ساتھ اُٹھے گی جو ہم چمن سے اُٹھے
جو کم نگاہ و تہی ذوق و تنگ دامن تھے | سنا ہے بھر کے وہ جھولیاں چمن سے اُٹھے
حدودِ دَیر و حرم سے نکال دو اِن کو | جو فتنے اُٹھے اِنھی شیخ و برہمن سے اُٹھے
رہے گا رنگ جماکر لہو شہیدوں کا | یہ داغ وہ نہیں جو اُن کے پیرہن سے اُٹھے
اس انتظار میں بیٹھی ہے وقت کی شیریں | کہ کوہ کن کوئی پھر خاکِ کوہکن سے اُٹھے

کلیجہ خون کیا جن کی انجمن کے لیے
کلیجہ تھام کے ہم اُن کی انجمن سے اُٹھے

جو خود سے نہ انگڑائی لے کر اُٹھا | اُسے وقت کی دے گی ٹھوکر اُٹھا
مزہ پیاس کا زندگی بھر اُٹھا | سبو ہاتھ میں لے نہ ساغر اُٹھا
یہ احساس بھی مت رکھ ستمگر اُٹھا | میں گردن جھکاؤں تو خنجر اُٹھا
ہے چپ بیٹھنا شرطِ محفل اگر | یہ بندہ تو اے بندہ پرور اُٹھا
کہاں فرصتِ خوابِ شیریں ہمیں | اُٹھا فصلِ گل اپنا بستر اُٹھا
اَب اِک جوئے خوں اُن سے اُٹھتی نہیں | جن آنکھوں سے پہلے سمندر اُٹھا
نہ اُٹھتے تری بزم سے جیتے جی | یہ غم کیا کہیں ہم سے کیونکر اُٹھا
جسے زخمِ دل ہم دِکھانے گئے | وہی ہاتھ میں لیکے پتھر اُٹھا
شکایت کا حاصل یہاں کچھ نہیں | جو غم بھی اُٹھا مسکراکر اُٹھا

نہ عاجؔز کی سُنیو غزل دوستو
جو سننے کو بیٹھا وہ روکر اُٹھا

آ جاتی ہے اُسی بتِ پیماں شکن کی بات　　خلوت کی بات کیجیے یا انجمن کی بات
آساں ہو کچھ تو سختیٔ زنجیر اے جنوں　　ہاں چھیڑ اُن کی زلفِ شکن در شکن کی بات
بیٹھا ہوا ہر ایک ملاتا ہے ہاں میں ہاں　　جو تیری بات ہے وہ تیری انجمن کی بات
ہم سے زیادہ کس کا بیاں ہوگا معتبر　　ہم نے زبانِ گل سے سُنی ہے چمن کی بات
اس کی تو دھجیّاں ہی اُڑا دیں بہار نے　　اب پیرہن کہاں کہ کریں پیرہن کی بات
اِک دُھوم ہے کہ شمع ہے یوں انجمن ہے یوں　　کس شمع کی یہ بات ہے کس انجمن کی بات

فرصت کہاں کہ بات کسی کی سُنے کوئی
اور وہ بھی میرے جیسے غریب الوطن کی بات

جب کبھی عالمِ مستی میں غزل کہتے ہیں　　آج کہہ دیتے ہیں ہم لوگ جو کل کہتے ہیں
اِک نئی شاعری آغازِ قدم کرتی ہے　　اہلِ دل جب غمِ دل پہلے پہل کہتے ہیں
ہاتھ رکھے کوئی اور اس کا بھٹکنا دیکھے　　دل اِسے کہتے ہیں یا زخمِ بغل کہتے ہیں
دردمندانِ محبت کا نہ دل توڑ اے دوست!　　تاج محلوں کا اِسے تاج محل کہتے ہیں
مرنا جینا ہو محبت کے لیے اِس کے سوا　　اور کیا ہے کہ جسے حسنِ عمل کہتے ہیں

آزمانا ہو تو آ بازو و دل کی قوّت
تو بھی شمشیر اُٹھا ہم بھی غزل کہتے ہیں

ہاتھ میں جام لیے دوش پہ مینا رکھے　　ساقی اَب آئے بہت ہم کو نہ پیاسا رکھے
دل اُسی کا ہے وہ برباد کرے یا رکھے　　جس طرح چاہے چمن کو چمن آرا رکھے

ہم نشیں اور ہیں کچھ تو ادب اُن کا رکھے   درد پہلو میں بہت پاؤں نہ پھیلا رکھے
راہ میں فرش ہیں اربابِ چمن کی آنکھیں   دیکھ کر بادِ بہاری قدم اپنا رکھے
دوسرا کون ہے بازارِ وفا میں ہم سا   جنس نایاب بھی دے دام بھی سستا رکھے
دیکھ لے آج کہ اب تک کسی قابل ہم ہیں   کل خدا جانے زمانہ ہمیں کیسا رکھے
دل ہی کمبخت ٹھکانے نہیں رہتا عاجزؔ
کس توقع پہ کوئی دل میں تمنّا رکھے

کیا ہنسیں اب ہنسی کا نہیں نام تک   صبح بیٹھے تو روتے رہے شام تک
پہلے اُٹھتی تھیں ہم پر فقط اُنگلیاں   اب تو سنتے ہیں گلیوں میں دشنام تک
ہرطرف اُن کی زُلفوں کے ہیں تذکرے   شام سے صبح تک، صبح سے شام تک
فاصلے ہیں بہت مرحلے ہیں بہت   تشنگی سے خمُ و شیشہ و جام تک
اب بھی کوئی وفادار کہتا ہمیں   سہہ گئے بے وفائی کا الزام تک
کر نہ سکیے محبت تو مرجایئے
زندگی کام کی ہے اِسی کام تک

اپنے دل کی بات شاعر بے حجابانہ کہے   چاہے پتھر کوئی مارے چاہے دیوانہ کہے
ہم کو ساقی ہوش سے کہتا ہے بیگانہ کہے   چپ نہیں رہنے کے ہم بے رازِ میخانہ کہے
کس نے سلجھائیں یہ زُلفیں کیا یہ دیوانہ کہے   خود ترا آئینہ بولے خود ترا شانہ کہے
نکلے ہم بے آبرو ہی آبروئے میکدہ   ویسے کہنے کو جو چاہے پیرِ میخانہ کہے
ہم بھی گزرے ہیں غمِ جاناں کی منزل سے مگر
اب کسے فرصت کہ بیٹھے اور یہ افسانہ کہے

مجرم ہیں ہمیں اُن کے گنہگار ہمیں ہیں
وقت آئے تو مرنے کو بھی تیار ہمیں ہیں

پھولوں کے لیے سینہ ہمارا ہی سپر ہے
اِس صحنِ چمن کے در و دیوار ہمیں ہیں

مشہور جو اِک قافلۂ اہلِ جنوں ہے
اُس قافلے کے قافلہ سالار ہمیں ہیں

جھک جانے کی عادت ہے یہ بات اور ہے ورنہ
کھنچ جائیں تو پھر وقت کی تلوار ہمیں ہیں

آئے تو ہیں بازار میں کچھ اہلِ وفا اور
اب بھی سببِ گرمیٔ بازار ہمیں ہیں

جس شمع سے ہے انجمنِ یار کی رونق
وہ شمع سرِ انجمنِ یار ہمیں ہیں

مقدّر نے اُٹھایا اُٹھ تو اُس محفل سے آئے ہیں
ہمیں جانے ہیں کیسے آئے ہیں کس دل سے آئے ہیں

فسانہ لیلیٰٔ غم کا لیے محمل سے آئے ہیں
یہ آنسو آنکھ سے آئے نہیں ہیں دل سے آئے ہیں

خدا رکھے غموں کو حسرتوں کو آرزوؤں کو
چلیں محفل میں کیا؟ باہر کہاں محفل سے آئے ہیں

گلی سے ایک اپنے مہرباں کے آئے ہیں لیکن
یہ حالت ہے کہ جیسے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

غزل میں یہ سلیقہ گفتگو کا سہل مت جانو
یہاں تک ہم جو آئے ہیں بڑی مشکل سے آئے ہیں

بہکی بہکی بات اپنی منتشر بیاں اپنا
ہم ہیں جس جگہ بیٹھے دل نہیں وہاں اپنا

اُن کی بزم سے مقتل ! صحن سے مکاں اپنا
اِک قدم یہاں اپنا اِک قدم وہاں اپنا

آستین و دامن سے رُک نہیں سکے آنسو
دیکھئے ٹھہرتا ہے قافلہ کہاں اپنا

تم ہو یا زمانہ ہو ہم تو یہ سمجھتے ہیں
تم بھی مہرباں اپنے وہ بھی مہرباں اپنا

وہ ستم پہ بھی منصف ہم وفا پہ بھی مجرم
دوست اِک جہاں اُن کا دشمن اِک جہاں اپنا

عقل و عشق کی دُنیا اپنی دیکھی بھالی ہے
راستہ گزرتا ہے اِن کے درمیاں اپنا

مری شاعری میں نہ رقصِ جام نہ مئے کی رنگ فشانیاں
وہی دُکھ بھروں کی حکایتیں وہی دِل جلوں کی کہانیاں

یہ جو آہ و نالہ و درد ہیں کسی بے وفا کی نشانیاں
یہی میرے دن کے رفیق ہیں یہی میری رات کی روانیاں

یہ مری زباں پہ غزل نہیں میں سنا رہا ہوں کہانیاں
کہ کسی کے عہدِ شباب پر مٹیں کیسی کیسی جوانیاں

کبھی آنسوؤں کو سکھا گئیں مرے سوزِ دل کی حرارتیں
کبھی دل کی ناؤ ڈبو گئیں مرے آنسوؤں کی روانیاں

ابھی اس کو اس کی خبر کہاں کہ قدم کہاں ہے نظر کہاں
ابھی مصلحت کا گزر کہاں کہ نئی نئی ہیں جوانیاں

یہ مرا بیاں ، یہ گفتگو ہے ، یہ مرا نچوڑا ہوا لہو ہے
ابھی سن لو مجھ سے کہ پھر کہو نہ سکو گے ایسی کہانیاں

ہر چوٹ پہ پوچھے ہے 'بتا یاد رہے گی'؟ ہم کو یہ زمانے کی ادا یاد رہے گی
دن رات کے آنسو سحر و شام کی آہیں اِس باغ کی یہ آب و ہَوا یاد رہے گی
کس دھوم سے بڑھتی ہوئی پہنچی ہے کہاں تک دُنیا کو تری زُلفِ رسا یاد رہے گی
کرتے رہیں گے تم سے محبت بھی وفا بھی گو تم کو محبت نہ وفا یاد رہے گی
کس بات کا تو قول وقسم لے ہے برہمن ہر بات بُتوں کی بخدا یاد رہے گی
چلتے گئے ہم پھول بناتے گئے چھالے صحرا کو مری لغزشِ پا یاد رہے گی
جس بزم میں تم جاؤ گے اُس بزم کو عاجزؔ
یہ گفتگوئے بے سروپا یاد رہے گی

جھیل کر کشمکشِ دَیر و حرم جاتے ہیں چین سے شیخ و برہمن رہیں ہم جاتے ہیں
جان جاتی ہے تبھی عشق کے غم جاتے ہیں یہ جب آتے ہیں کسی گھر میں تو کم جاتے ہیں
ساتھ کوئی نہیں جس راہ میں ہم جاتے ہیں بیٹھ جاتے ہیں جو دو چار قدم جاتے ہیں
جانے کیا انجمنِ ہوش کا اب نقشہ ہے نہ وہاں سے کوئی آتا ہے نہ ہم جاتے ہیں
اِک نہ اِک رہتی ہے اُفتاد سرِ میخانہ اہلِ دیر آتے ہیں جب اہلِ حرم جاتے ہیں
تو ہی اے گردشِ ایّام ہے سب سے آگے
تجھ سے آگے کوئی جاتا ہے تو ہم جاتے ہیں

ہمیں ہیں آئینہ، آئینہ ساز، آئینہ گر، دیکھو اُدھر کیا دیکھتے ہو، اُس طرف کیا ہے؟ اِدھر دیکھو
وہ زُلفیں جن کو شانوں تک رسا ہونا نہ آتا تھا اُنھیں پہنچا دیا میرے ہُنر نے تا کمر، دیکھو
تمھیں چاہا تمھارے جور کو بیداد کو چاہا مرا اَرمان دیکھو، حوصلہ دیکھو، جگر دیکھو
اگر یہ دیکھنا چاہو قیامت کس کو کہتے ہیں اُٹھو محفل سے باہر آؤ اپنی رہ گزر دیکھو

سنا ہے تم کو ہم سے بیوفائی کی شکایت ہے! ذرا آنکھیں ملاؤ ہم سے منہ پھیرو اِدھر دیکھو

اُسی فنکار کی کاریگری ہے کارسازی ہے
مرا زخمِ جگر کیا دیکھو ہو اپنی نظر دیکھو

کیا جانے تمھیں کیا کہے ہے کیا نہ کہے ہے ہم کو تو جو دیکھے ہے سو دیوانہ کہے ہے
اُڑ اُڑ کے یہ خاکسترِ پروانہ کہے ہے کر کے بھی دکھائے ہے جو دیوانہ کہے ہے
جو توڑنے والے ہیں کہاں اُن کو یہ معلوم ٹوٹے ہے تو کیا ٹوٹ کے پیمانہ کہے ہے
سوچوں ہوں تو میں سوچ کے رہ جاؤں ہوں حیراں کیا تم کہو ہو کیا دلِ دیوانہ کہے ہے
چھیڑے ہے کوئی تذکرۂ اہلِ وفا جب منہ پھیر کے کچھ شمع سے پروانہ کہے ہے
بے وجہ خفا ہوتے ہو باتوں سے ہماری ہم کیا کہیں ہیں جو تمھیں دُنیا نہ کہے ہے
نغموں کو میرے سن کے ہے بلبل کا جگر چاک دیوانہ ہی سمجھے ہے جو دیوانہ کہے ہے

کب تک سنیں عاجزؔ سے غمِ دل کی حکایت
کمبخت ہمیشہ یہی افسانہ کہے ہے

زخموں میں جب ٹیس اُٹھے ہے تم ہی تو یاد آؤ ہو ہم تم کو پہچان رہے ہیں منہ پھیرے کیا جاؤ ہو
اتنا کیوں سنورو ہو اتنا زُلفیں کیوں سلجھاؤ ہو پیارے ہم سب جانے ہیں تم کیا ہو کیا کہلاؤ ہو
بھولے بسرے ارمانوں کو چھیڑو ہو اُکساؤ ہو تم تو اور اے ٹھنڈی آہو دل میں آگ لگاؤ ہو
زنجیریں کیا ہاتھ آئی ہیں مچلو ہو اِتراؤ ہو جب چاہو ہو کھولو ہو جب چاہو پہناؤ ہو
منزل جانی پہچانی ہے رستہ جانا بوجھا ہے کاہے ایسی چال چلو ہو جس سے ٹھوکر کھاؤ ہو
دریا میں طوفان اُٹھا ہے دریا والے جھیلیں گے تم تو دُور کھڑے ہو پیارے تم کاہے گھبراؤ ہو
میری غزل پر کیوں رکھو ہو تلخ کلامی کا الزام میں تو چپ رہنا چاہوں ہوں تم ہی منہ کھلواؤ ہو

موسمِ گل کی کچھ باتیں ہیں لیکن تم سے کون کہے
تم تو بس سنتے ہی عاجزؔ دیوانے ہو جاؤ ہو

وقت جب قول کے بندوں سے عمل مانگے ہے
کوئی دُبکے ہے کہیں، کوئی کہیں بھاگے ہے
چین کی راہ نہ پیچھے نہ تیرے آگے ہے
بیٹھ جا عشق کے سائے میں کہاں بھاگے ہے
اِن کے امکانِ رسائی سے یہ شئے آگے ہے
اہلِ بازار سے کیا جنسِ وفا مانگے ہے
کچھ نہ کچھ ہو غمِ جاں ہو کہ غمِ جاناں ہو
درد کی چوٹ لگے ہے تو یہ دل جاگے ہے
منزلِ دار و رَسن عشق کی منزل نہ سمجھ
یہ مقام اُس سے بہت آگے بہت آگے ہے
کب سے ہوں نغمہ بلب بزم کے سنّاٹے میں
کیا سُنے ہے کوئی آواز؟ کوئی جاگے ہے؟
جب کہیں قافلۂ اہلِ خرابات چلا
دیکھا عاجزؔ کو لیے سازِ غزل آگے ہے

ہاں دیکھ ذرا کیا ترے قدموں کے تلے ہے
ٹھوکر بھی وہ کھائے جو اترا کے چلے ہے
کیا دل ہے کہ آرام سے اِک سانس نہ لے ہے
محفل سے جو نکلے ہے تو خلوت میں جلے ہے
بھولی ہوئی یاد آکے کلیجے کو ملے ہے
جب شام گزر جائے ہے جب رات ڈھلے ہے
سکھ چھینے ہے اور چھین کے بیدرد زمانہ
یوں چین سے سوئے ہے کہ کروٹ بھی نہ لے ہے
کس طرح کوئی دُھوپ میں پگھلے ہے جلے ہے
یہ بات وہ کیا جانے جو سائے میں پلے ہے
غافل نہ کبھی بیٹھیو اِس بزم میں رندو!
ساغر یہاں ٹھہرے ہے تو شمشیر چلے ہے

گزر جائیں گے جب دن گزرے عالم یاد آئیں گے
ہمیں تم یاد آ ؤ گے تمھیں ہم یاد آئیں گے
محبت میں جو کچھ ہم کر گئے کس نے کیا ہوگا؟
جہاں سب بھول جاؤ گے وہاں ہم یاد آئیں گے
پھر ایسا آئینہ شاید ترے آگے نہ آئے گا
بہت ہم تجھ کو اے گیسوئے برہم یاد آئیں گے
خدا کا شکر ہے احساں فراموشی نہیں آتی
ہمیشہ آپ کے بخشے ہوئے غم یاد آئیں گے

بہت یاد آئے گی بے التفاتی چشمِ ساقی کی یہ شیشے یہ سبو یہ جام تو کم یاد آئیں گے

پھر اپنے سازِ دل پر ہم نے چھیڑی ہے غزل سن لو
یہ دُھن یاد آئے گی یہ سُر یہ سرگم یاد آئیں گے

یہ شب انھیں زُلفوں کی کرامات لگے ہے سنتے تھے غزل میں یہ وہی رات لگے ہے
پتھر کی طرح تیری ہر اِک بات لگے ہے دل توڑ کے ناصح تجھے کیا ہات لگے ہے
مرنا تو بہت سہل سی اِک بات لگے ہے جینا ہی محبت میں کرامات لگے ہے
ہم نے جو دیا ہے وہ ہمیں جان رہے ہیں سرمایۂ غم مفت کہاں ہات لگے ہے
آرام کہاں اہلِ وفا کو کسی کروٹ اِک آگ ہے سینے میں جو دن رات لگے ہے
اَوروں سے محبت بھی تعلّق بھی وفا بھی ہم سے تو کبھی کی نہ ملاقات لگے ہے
ہم دونوں میں ہے بس اسی اِک بات کی تکرار وہ دن کہے ہیں اور یہاں رات لگے ہے

وہ جانیں جو تعریف کیا کرتے ہیں عاجزؔ
ہم کو تو غزل تیری خرافات لگے ہے

پڑھنے کو غزل عاجزؔ محفل میں جب آئے ہے
اپنے بھی وہ روئے ہے ہم کو بھی رُلائے ہے

کیا کھیل محبت بھی کھیلے ہے کھلائے ہے
ہارے ہے سو جیتے ہے کھوئے ہے سو پائے ہے

جب سے ترے دیوانے نکلے تری محفل سے
کیا حال ہے محفل کا دیکھا نہیں جائے ہے

شاعر تو نہیں عاجزؔ سائل ہے محبت کا
کشکولِ غزل لے کر آواز لگائے ہے

میرے ہی لہو پر گزر اوقات کرو ہو
مجھ سے ہی امیروں کی طرح بات کرو ہو

دن ایک ستم ، ایک ستم رات کرو ہو
وہ دوست ہو دُشمن کو بھی تم مات کرو ہو

ہم خاک نشیں تم سخن آرائے سرِ بام
پاس آکے ملو دُور سے کیا بات کرو ہو

ہم کو جو ملا ہے وہ تمھیں سے تو ملا ہے
ہم اور بھلادیں تمھیں ؟ کیا بات کرو ہو

یوں تو کبھی منہ پھیر کے دیکھو بھی نہیں ہو
جب وقت پڑے ہے تو مدارات کرو ہو

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

بکنے بھی دو عاجزؔ کو جو بولے ہے بکے ہے
دیوانہ ہے ، دیوانے سے کیا بات کرو ہو

مرا حال پوچھ کے ہم نشیں مرے سوزِ دل کو ہوا نہ دے
بس یہی دُعا میں کروں ہوں اَب کہ یہ غم کسی کو خدا نہ دے

یہ جو زخمِ دل کو پکائے ہم لیے پھر رہے ہیں چھپائے ہم
کوئی ناشناس مزاجِ غم کہیں ہاتھ اِس کو لگا نہ دے

تو جہاں سے آج ہے نکتہ چیں کبھی مدتوں میں رہا ہوں ہیں
میں گدائے راہ گزر نہیں مجھے دور ہی سے صدا نہ دے

تب و تاب عشق کا ہے کرم کہ جمی ہے محفلِ چشم نم
ذرا دیکھو اے ہوائے غم یہ چراغ کوئی بجھا نہ دے

وہ جو شاعری کا سبب ہوا وہ معاملہ بھی عجب ہوا
میں غزل سناؤں ہوں اس لیے کہ زمانہ اُس کو بھلا نہ دے

نہ اہلِ بُت کدہ چاہیں نہ اربابِ حرم چاہیں
زمانے میں جسے کوئی نہ چاہے اُس کو ہم چاہیں

ہم ایسے سیر چشم اَوروں سے کیا چشمِ کرم چاہیں
خدا توفیق دے تو بس تجھی کو اے صنم چاہیں

ستم کرلیں جہاں تک تیرے اربابِ ستم چاہیں
جو تو چاہے ہے ہم سے اے زمانہ کیسے ہم چاہیں

یہ ممکن ہے کہ ہم اُن کو بہت چاہیں وہ کم چاہیں
یہ مشکل ہے کہ وہ اوروں کو چاہیں اُن کو ہم چاہیں

جنوں جب چاہتا ہے راہ پیدا کر ہی لیتا ہے
وہ ڈالیں گیسوؤں میں اپنے جتنا پیچ وخم چاہیں

بہت دیکھا ہے دل اہلِ کرم کا ہم فقیروں نے
فقیروں کا بھی دل دیکھیں اگر اہلِ کرم چاہیں

ابھی تو جس طرح وہ چاہتے ہیں دن گزرتے ہیں
وہ دن آئے کہ دن ہم یوں گزاریں جیسے ہم چاہیں

وہ جانِ آرزو عاجزؔ ہے اتنا آرزو دشمن
کہ مرنے بھی نہ دے ہم کو اگر مرنا بھی ہم چاہیں

کلیمؔ آئے بھی اپنا ہنر دِکھا بھی گئے
الاپ بھی گئے رو بھی گئے، رُلا بھی گئے

غزل بھی پڑھ گئے محفل کو سنسنا بھی گئے
اِک آگ لائے بھی، لے بھی گئے، لگا بھی گئے

وہ چوٹ کھائی جگر پر کہ تلملا بھی گئے
مگر تھے وضع کے پابند مسکرا بھی گئے

سنا گئے کسی پردہ نشیں کا افسانہ
وہ شوخ پردہ نشیں کون ہے بتا بھی گئے

وفا شعاروں کو کیا پوچھو ہو ! زمانہ ہوا
وہ چھوڑ بھی گئے بستی کو گھر جلا بھی گئے

زمانہ دنگ ہے عاجزؔ کہ اِس زمانے میں
جو کہہ رہے تھے وہی کر کے ہم دکھا بھی گئے

نظر کو آئینہ دل کو ترا شانہ بنادیں گے
تجھے ہم کیا سے کیا اے زلفِ جانانہ بنادیں گے

ہمیں اچھا ہے بن جائیں سراپا سرگذشت اپنی
نہیں تو لوگ جو چاہیں گے افسانہ بنادیں گے

اُمید ایسی نہ تھی محفل کے اربابِ بصیرت سے
گناہِ شمع کو بھی جرمِ پروانہ بنادیں گے

ہمیں تو فکر دل سازی کی ہے، دل ہے تو دُنیا ہے
صنم پہلے بنادیں پھر صنم خانہ بنادیں گے

نہ اتنا چھیڑ کر اے وقت دیوانہ بنا ہم کو
ہوئے دیوانے ہم تو سب کو دیوانہ بنادیں گے

نہ جانے کتنے دل بن جائیں گے اِک دل کے ٹکڑے سے
وہ توڑیں آئینہ ، ہم آئینہ خانہ بنادیں گے

غرض کسی سے نہ اے دوستو کبھو رکھیو
بس اپنے ہاتھ یہاں اپنی آبرو رکھیو

زمانہ سنگ سہی آئینے کی خو رکھیو
جو دل میں رکھیو وہی سب کے رُو برو رکھیو

رفو گرانِ خرد کے نہ جائیو نزدیک
بلا سے پیرہنِ چاک بے رفو رکھیو

نہ کیجیو کہیں توہین اپنے چلّو کی
کسی سے مت ہوسِ ساغر و سبو رکھیو

چراغ گھر میں میسر نہیں رہے نہ سہی
جلائے دل میں مگر شمعِ آرزو رکھیو

نہ جانے کون اِسے توڑ پھوڑ کر رکھ دے
بہت سنبھال کے اِس بزم میں سبو رکھیو

زبانِ درد بہت کم سمجھنے والے ہیں
یہاں نہ ہر کس و ناکس سے گفتگو رکھیو

اُڑا نہ دیجیو سب غم کی رنگ رلیوں میں
بچا کے دل کے پیالے میں کچھ لہو رکھیو

ہر ایک ظرف برابر نہیں ہے اے بلبل
جو آگ سینے میں رکھوں ہوں میں نہ تو رکھیو

یہی بچائے گی شمشیرِ وقت سے عاجزؔ
ہماری بات قریبِ رگِ گلو رکھیو

منہ فقیروں سے نہ پھیرا چاہیے
یہ تو پوچھا چاہیے کیا چاہیے
چاہ کا معیار اُونچا چاہیے
جو نہ چاہیں اُن کو چاہا چاہیے
کون چاہے ہے کسی کو بے غرض
چاہنے والوں سے بھاگا چاہیے
ہم تو کچھ چاہے ہیں تم چاہو ہو کچھ
وقت کیا چاہے ہے دیکھا چاہیے
چاہتے ہیں تیرے ہی دامن کی خیر
ہم ہیں دیوانے ہمیں کیا چاہیے
بے رُخی بھی ناز بھی انداز بھی
چاہیے لیکن نہ اتنا چاہیے
ہم جو کہنا چاہتے ہیں کیا کہیں
آپ کہہ لیجیے جو کہنا چاہیے
بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیمؔ
بات کہنے کا سلیقہ چاہیے

ترے گیسوؤں میں تو شانہ پڑے ہے
ہمارے ہی پیچھے زمانہ پڑے ہے
طبیعت کو قابو میں لانا پڑے ہے
اُٹھے ہے کہاں غم ، اُٹھانا پڑے ہے
کبھی ایسا بھی ہووے ہے روتے روتے
جگر تھام کر مسکرانا پڑے ہے
یہ کیسی فضائے چمن ہوگئی ہے
گلوں سے بھی دامن بچانا پڑے ہے
کبھی اُس طرف جائیو اے صبا تو
مرا جس طرح آشیانہ پڑے ہے
عجب حادثہ زندگی ہے کہ اِس میں
ہر اِک حادثہ بھول جانا پڑے ہے
ہمیں جب لگے ہے جھڑی آنسوؤں کی
وہی مئے کشی کا زمانہ پڑے ہے
سپاہی سے شاعر بنے، دیکھنا ہے
ہمیں بھیس اب کیا بنانا پڑے ہے

اس قدر سوز کہاں اور کسی ساز میں ہے
کون یہ نغمہ سرا میرؔ کے انداز میں ہے؟

اُس سے کہہ دو جو بہت مست مئے ناز میں ہے
اُس کی آنکھوں میں ہے جادو، مری آواز میں ہے

بے نیازی پہ بھی دل بندگیٔ ناز میں ہے
ہائے کیا سحر تری چشم فسوں ساز میں ہے

خم ہر اِک صبح نیا زلفِ شکن ساز میں ہے
روز اِک تازہ تکلف مرے اعزاز میں ہے

میں محبت نہ چھپاؤں تو عداوت نہ چھپا
نہ یہی راز میں اب ہے نہ وہی راز میں ہے

پہلے سب کچھ مرے خلوت کدۂ شوق میں تھا
اب تو جو کچھ ہے تری انجمنِ ناز میں ہے

ہے جو سرمایہ مری ساری غزل گوئی میں
وہ تری ایک نگاہِ غلط انداز میں ہے

ایک مدّت ہوئی اُس حادثۂ دل کو کلیمؔ
آج تک دل کا تڑپنا اُسی انداز میں ہے

اب بھی حاصل ہے اِنھیں حاصلِ ارماں ہونا
کیسے دیکھوں تری زلفوں کا پریشاں ہونا

میں تری چشمِ فسوں گر کو نہ دوں گا الزام
اپنی قسمت ہی میں تھا چاک گریباں ہونا

ایسا بے درد کوئی سارے زمانے میں نہیں
جس کو آتا ہے میرے درد کا درماں ہونا

اپنی حالت پہ یہ اکثر میری کیفیت ہے
آئینہ دیکھنا اور دیکھ کے حیراں ہونا

ہر طرف حکم ہے اشکوں کے ستارے لاؤ
طے ہوا ہے کسی محفل میں چراغاں ہونا

کون عاجؔز صلۂ تشنہ دہانی مانگے
یہ جہاں آگ اُسے دیتا ہے جو پانی مانگے

دل بھی گردن بھی ہتھیلی پہ لیے پھرتا ہوں
جانے کب کس کا لہو تیری جوانی مانگے

توڑیئے مصلحتِ وقت کی دیواروں کو
راہ جس وقت طبیعت کی روانی مانگے

مانگنا جُرم ہے فنکار سے ترتیبِ خیال
گیسوئے وقت جب آشفتہ بیانی مانگے

ساقی تو چاہے تو وہ دَور بھی آ سکتا ہے
کہ ملے جامِ شراب اُس کو جو پانی مانگے

کس کا سینہ ہے جو زخموں سے نہیں ہے معمور
کیا کوئی تجھ سے محبت کی نشانی مانگے

دل تو دے ہی چکا اب ہے یہ ارادہ اپنا
جان بھی دے دوں جو وہ دشمنِ جانی مانگے

ہیں مرے شیشۂ صہبائے سخن میں دونوں
نئی مانگے کوئی مجھ سے کہ پُرانی مانگے

وہ تو بے درد ہے ایسا کہ بتائے نہ بنے
دل وہ کم بخت کہ بے اس سے لگائے نہ بنے

عالم ایسا نہیں دیکھا کسی میخانے کا
سامنے جام ہو اور ہاتھ بڑھائے نہ بنے

حسن خود ساز بہت، عشق خود آگاہ بہت
ان سے مانے نہ بنے ہم سے منائے نہ بنے

ہائے وہ بات کہ دل تڑپے بتانے کے لیے
اور بتانے کو جو بیٹھو تو بتائے نہ بنے

کیا ستم ہے کہ وہ ظالم بھی ہے محبوب بھی ہے
یاد کرتے نہ بنے اور بھلائے نہ بنے

یوں اٹھائے ہوئے ہیں دل پہ ترے غم کا پہاڑ
کہ اب پھول بھی رکھ دو تو اٹھائے نہ بنے

لوگ ایسے کہ لگانے کو ہیں نشتر تیار
زخم ایسا کہ ذرا ہاتھ لگائے نہ بنے

تھامتے ہیں نہیں ہم وقت کا دامن عاجؔز
ہم اگر تھام لیں دامن تو چھڑائے نہ بنے

ترکِ وفا ستم ہے محبت سرشت کو
دوزخ میں کیسے چھوڑ کے جائے بہشت کو

پہنچا ہوں میکدے میں یہ احساں اُنھیں کا ہے
بھولوں گا اہلِ کعبہ نہ اہلِ کنشت کو

ہر راہ دیر و کعبہ سے آئی ہے میکدہ
ہر راہ میکدے سے گئی ہے بہشت کو

تم میرے فکر و فن کا اگر حوصلہ بڑھاؤ
دُنیا میں کھینچ لاؤں فضائے بہشت کو

سب آئینے سب آئینہ خانے انھیں سے ہیں
میں سنگ وخشت کیسے کہوں سنگ وخشت کو

غم کی آگ بڑی البیلی کیسے کوئی بجھائے
اندر ہڈّی ہڈّی سلگے باہر نظر نہ آئے

ایک سویرا ایسا آیا اپنے ہوئے پرائے
اِس کے آگے کیا پوچھو ہو آگے کہا نہ جائے

گھاؤ چُنے چھاتی پر کوئی، موتی کوئی سجائے
کوئی لہو کے آنسو روئے بنسی کوئی بجائے

یادوں کا جھونکا آتے ہی آنسو پاؤں بڑھائے
جیسے ایک مسافر آئے ایک مسافر جائے

درد کا اِک سنسار پکارے کھینچے اور بلائے
لوگ کہے ہیں ٹھہرو ٹھہرو ٹھہرا کیسے جائے

کیسے کیسے دُکھ نہیں جھیلے کیا کیا چوٹ نہ کھائے
پھر بھی پیار نہ چھوٹا ہم سے عادت بُری بلائے

عاجزؔ کی ہیں اُلٹی باتیں کون اُسے سمجھائے
دُھوپ کو پاگل کہے اندھیرا دن کو رات بتائے

وقت کم ہے گفتگو پھیلائیں کیا
چیر کر رکھ دیں جگر سمجھائیں کیا

زُلف و رُخ کی انجمن میں کیا نہیں
باہر آدابِ غزل سے جائیں کیا

تم بھی کج رفتار ہم بھی کج کلاہ
تم نہ باز آئے تو ہم باز آئیں کیا

دوست کہتے ہیں چلو بہلاؤ دل
دل ہی پہلو میں نہیں بہلائیں کیا

بے وفا جیسی ہے دُنیا تم بھی ہو　　ہم بھی دُنیا کی طرح ہوجائیں کیا

زندگی کی کتنی باتیں چھوڑ دیں
شاعری بھی چھوڑ دیں مرجائیں کیا؟

زخمِ دل کا وہ نظارا ہے کہ جی جانے ہے　　اتنا احسان تمھارا ہے کہ جی جانے ہے

دیکھنا پھر کہیں زُلفیں نہ پریشاں ہوجائیں　　اتنا مشکل سے سنوارا ہے کہ جی جانے ہے

یہ حسیں دَور جسے موسمِ گُل کہتے ہیں　　ایسا رو رو کے گزارا ہے کہ جی جانے ہے

مہرباں حال پہ ہیں آپ ہمارے جب سے　　تب سے وہ حال ہمارا ہے کہ جی جانے ہے

گرچہ جی جان کا دُشمن ہے وہ ظالم پھر بھی　　ایسا جی جان سے پیارا ہے کہ جی جانے ہے

کبھی گزرے ہیں چمن سے تو گلوں نے عاجزؔ
اس محبت سے پکارا ہے کہ جی جانے ہے

اُنھیں فریاد نازیبا لگے ہے　　ستم کرتے بہت اچھا لگے ہے

خدا اِس بزم میں حافظ ہے دل کا　　یہاں ہر روز اِک چرکا لگے ہے

اُنھیں اپنے بھی لگتے ہیں پرائے　　پرایا بھی ہمیں اپنا لگے ہے

بغیر اُس بے وفا سے جی لگائے　　جو سچ پوچھو تو جی کس کا لگے ہے

محبت دل لگی جانو ہو پیارے　　وہی جانے ہے دل جس کا لگے ہے

اُٹھا آگے سے ساقی جام و مینا　　دل اچھا ہو تو سب اچھا لگے ہے

ذرا دیکھ آئینہ میری وفا کا　　کہ تو کیسا تھا اب کیسا لگے ہے

غزل سن کر مری کہنے لگے وہ　　مجھے یہ شخص دیوانہ لگے ہے

ضرور آیا کرو جلسے میں عاجزؔ
نہ آؤ ہو تو سنّاٹا لگے ہے

منہ شرم سے غربت میں دِکھائے نہ بنے ہے | پوچھے ہے کوئی گھر تو بتائے نہ بنے ہے
بیتابیِ دل سے کبھی بن جائے ہے ایسی | بیٹھے نہ بنے ہے کہیں جائے نہ بنے ہے
بے صبر نہیں ہوں مگر آئے ہے وہ جب یاد | سچ یہ ہے کہ بے اشک بہائے نہ بنے ہے
دل تھام کے کروٹ پہ لیے جاؤں ہوں کروٹ | وہ آگ لگی ہے کہ بجھائے نہ بنے ہے
ناصح یہ غمِ عشق ہے کچھ کھیل نہیں ہے | یوں تھامے ہے دامن کہ چھڑائے نہ بنے ہے
تم دوست ہو کیسے کہ دُکھاؤ ہو دلِ دوست | دُشمن کا بھی دل ہم سے دُکھائے نہ بنے ہے
اِک تم ہو کہ جو چاہو ہو تم کر کے رہو ہو | اِک ہم ہیں کہ کچھ ہم سے بنائے نہ بنے ہے

آرام سے چھپ جائے ہے پردے میں غزل کے
وہ آگ جو سینے میں چھپائے نہ بنے ہے

بہار آ بھی جا، لو لگائے ہوئے ہیں | بہت دن ہمیں مسکرائے ہوئے ہیں
غزل کا وہی ساز اُٹھائے ہوئے ہیں | کلیجے پہ جو چوٹ کھائے ہوئے ہیں
خدا درد والوں کو آباد رکھے | کہ جاگے ہوئے ہیں جگائے ہوئے ہیں
بڑے خوش نصیب آپ ہیں کہ ابھی تک | محبت سے پہلو بچائے ہوئے ہیں
جلائے ہیں اتنے چراغ آنسوؤں کے | ترے بام و دَر جگمگائے ہوئے ہیں
کسی دن تو ہاتھ آئے گا اُن کا دامن | جو دیوانہ ہم کو بنائے ہوئے ہیں
ہمیں چین سے بیٹھنے کیا کہو ہو | بڑا بوجھ دل پر اُٹھائے ہوئے ہیں

ذرا کوئی سمجھا کے عاجزؔ سے کہتا
یہ کیا حال اپنا بنائے ہوئے ہیں

جدا جب تک تری زُلفوں سے پیچ وخم نہیں ہوں گے
ستم دنیا میں بڑھتے ہی رہیں گے کم نہیں ہوں گے

دلاسے اُن کے جو درد آشنائے غم نہیں ہوں گے
نمک ہی ہوں گے دل کے زخم پر مرہم نہیں ہوں گے

بتانِ فتنہ گر اِس سرزمیں پر کم نہیں ہوں گے
تمھارے جیسے لیکن فتنۂ عالم نہیں ہوں گے

اگر بڑھتا رہا یوں ہی یہ سودائے ستمگاری
تمھیں رُسوا سرِ بازار ہوگے ہم نہیں ہوں گے

جنابِ شیخ پر افسوس ہے ہم نے تو سمجھا تھا
حرم کے رہنے والے ایسے نامحرم نہیں ہوں گے

اِدھر آؤ تمھاری زُلف ہم آراستہ کردیں
جو گیسو ہم سنواریں گے کبھی برہم نہیں ہوں گے

اگرچہ عشق میں مرنے کا خطرہ ہی زیادہ ہے
مگر مرنے کے ڈر سے مرنے والے کم نہیں ہوں گے

نہیں کوئی درد آشنائے دلِ من
بس اپنے ہی آنسو بس اپنا ہی دامن

مبارک تمھیں سیرِ گلزار و گلشن
فقیروں کا تو کوئی گھر ہے نہ آنگن

کوئی اِس طرح بھی بدلتا ہے چتون
تمھیں دوست تھے کل، تمھیں آج دشمن

گنہگار ہم، تم بڑے پاک دامن؟
ملاؤ تو آنکھیں اُٹھاؤ تو گردن

حسیں کیا ہوئے تم قیامت ہوئے ہو
جفا ڈیوڑھی ڈیوڑھی ستم آنگن آنگن

زمانے کو نیند آرہی ہے جگاؤ کلیؔم آؤ کوئی غزل گنگناؤ
ذرا دل کے زخموں سے پردہ اُٹھاؤ غضب کا اندھیرا ہے شمعیں جلاؤ
وہ بولے کہاں زخمِ دل ہے دِکھاؤ کہو کیا کہیں کیا بتائیں بتاؤ؟
یہاں سب کرو دل نہ ہرگز لگاؤ ہم اِس دھوکے میں آچکے تم نہ آؤ
وہ کہتے ہیں ہر چوٹ پر مسکراؤ وفا یاد رکھو ستم بھول جاؤ
کہاں ہو تم اے فصلِ گل کی ہَواؤ اِدھر بھی تو گزرو یہاں بھی تو آؤ
ترنم سے ہے گرم فریادِ عاجؔز
بڑی تیز ہے آنچ دامن بچاؤ

بڑی طلب تھی بڑا انتظار دیکھو تو بہار لائی ہے کیسی بہار دیکھو تو
یہ کیا ہوا کہ سلامت نہیں کوئی دامن چمن میں پھول کھلے ہیں کہ خار دیکھو تو
لہو دِلوں کا چراغوں میں کل بھی جلتا تھا اور آج بھی ہے وہی کاروبار دیکھو تو
یہاں ہر اِک رسن و دار ہی دِکھاتا ہے عجیب شہر عجب شہر یار دیکھو تو
نہ کوئی شانہ بچا ہے نہ کوئی آئینہ دراز دستیٔ گیسوئے یار دیکھو تو
کسی سے پیار نہیں پھر بھی پیار ہے سب سے وہ مستِ حسن ہے کیا ہوشیار دیکھو تو
وہ چپ بھی بیٹھے ہے تو ایسا بن کے بیٹھے ہے ہر اِک ادا یہ کہے ہے پکار، ’دیکھو تو‘
ابھی تو خون کا سیندور ہی لگایا ہے ابھی کرے ہے وہ کیا کیا سنگار دیکھو تو
ادا ہمیں نے سکھائی نظر ہمیں نے دی ہمیں سے آنکھ چراؤ ہو یار، دیکھو تو
اسیر کرکے ہمیں کیا پھرے ہے اِتراتا
گلے میں ڈالے وہ پھولوں کا ہار، دیکھو تو

فن میں نہ معجزہ نہ کرامات چاہیے دل کو لگے بس ایسی کوئی بات چاہیے
جو چاہتے ہیں کرتے ہیں جب چاہتے ہیں وہ دن چاہیے نہ اُن کے لیے رات چاہیے
دیوانہ دے رہا ہے سبق اہلِ ہوش کو کیا بات اُنھیں نہ چاہیے کیا بات چاہیے
ہم کو کسی کی کم سخنی سے گلہ نہیں لیکن کبھی تو پُرسشِ حالات چاہیے
ہر ایک بات اُس بتِ کافر ادا میں ہے لیکن وہ بات ہی نہیں جو بات چاہیے
لے جا رہا ہوں درد میں ڈوبی ہوئی غزل
بے درد کے لیے کوئی سوغات چاہیے

وہ ستم نہ ڈھائے تو کیا کرے اُسے کیا خبر کہ وفا ہے کیا
تو اُسی کو پیار کرے ہے کیوں یہ کلیم تجھ کو ہوا ہے کیا؟
تجھے سنگ دل یہ پتہ ہے کیا کہ دُکھے دِلوں کی صدا ہے کیا
کبھی چوٹ تونے بھی کھائی ہے کبھی تیرا دل بھی دُکھا ہے کیا؟
تو رئیسِ شہرِ ستمگراں میں گدائے کوچۂ عاشقاں
تو امیر ہے تو بتا مجھے میں غریب ہوں تو بُرا ہے کیا؟
تو جفا میں مست ہے روز وشب میں کفن بدوش وغزل بلب
تیرے رُعبِ حسن سے چپ ہیں سب میں بھی چپ رہوں تو مزا ہے کیا؟
یہ کہاں سے آئی ہے سُرخ رو ہے ہر ایک جھونکا لہولہو
کٹی جس میں گردنِ آرزو یہ اُسی چمن کی ہَوا ہے کیا؟
ابھی تیرا دَورِ شباب ہے ابھی کیا حساب و کتاب ہے
ابھی کیا نہ ہوگا جہان میں ابھی اِس جہاں میں ہوا ہے کیا؟
یہی ہم نوا یہی ہم سخن یہی ہم نشاں یہی ہم وطن
میری شاعری ہی بتائے گی میرا نام کیا ہے پتہ ہے کیا؟

تم گل تھے ہم نکھار ابھی کل کی بات ہے
ہم سے تھی سب بہار ابھی کل کی بات ہے

بیگانہ سمجھو ، غیر کہو ، اجنبی کہو
اپنوں میں تھا شمار ابھی کل کی بات ہے

آج اپنے پاس سے ہمیں رکھتے ہو دُور دُور
ہم بن نہ تھا قرار ابھی کل کی بات ہے

اِترا رہے ہو آج پہن کر نئی قبا
دامن تھا تار تار ابھی کل کی بات ہے

آج اس قدر غرور یہ انداز یہ مزاج
پھرتے تھے میر خوار ابھی کل کی بات ہے

انجان بن کے پوچھتے ہو ہے یہ کب کی بات
کل کی ہے بات یار، ابھی کل کی بات ہے

کیا دوسروں کے چاکِ قبا و رفو کی بات
اپنے سوا نہ کیجیو عاجزؔ کسو کی بات

کرتے رہو غزل میں جگر کے لہو کی بات
اِس سُرخ رو سے بڑھ کے ہے کس سُرخ رو کی بات

کرنے کی باتیں دل میں بہت ہیں پڑی ہوئی
حسرت کی بات، شوق کی بات، آرزو کی بات

ہو میکشی کی بات جہاں تم بھی چھیڑ دو
اپنے شکستہ ساغر و جام و سبو کی بات

دل ہی میں ہے ہرے بھرے پھولوں کا اِک چمن
جاؤ ہو ڈھونڈھنے کو کہاں رنگ و بو کی بات

ملنے کی پھر ہوس ہے ذرا کوئی جا کہو
اُس شوخ کی چھری سے ہمارے گلو کی بات

وہ بچا جائیں گے دامن کیا یہ آساں کام ہے
دل کے سو ٹکڑے ہیں ہر ٹکڑے پہ اُن کا نام ہے

روشنی کی دھوم ہے لیکن اندھیرا عام ہے
صبح بھی ایسی نظر آتی ہے گویا شام ہے

چاند ہے یہ چاندنی کرنا ہی اس کا کام ہے
ساتھ لے جاؤ غزل میری جہاں تک شام ہے

ہر غزل میں اس ستمگر کے لیے پیغام ہے
ہم تو کہتے جائیں گے کہنا ہمارا کام ہے

تھوڑی تکلیفِ رسن پھر تھوڑی سی تکلیفِ دار
اِس کے بعد اے دوستو آرام ہی آرام ہے

اپنی ہی بستی میں ہم سے اپنی ہی بستی کے لوگ
پوچھتے ہیں کون سی بستی کے ہو؟ کیا نام ہے؟

تو میری طرح غمِ دل کہے تیری طرح وہ بھی ہنسا کرے
کسی بے وفا پہ او بے وفا! ترا دل بھی آئے خدا کرے

تو نہ توڑ زخموں کا سلسلہ یہ وہ دل نہیں کہ گلہ کرے
تیرے آستانۂ ناز سے جو ملا کیا ہے ملا کرے

کوئی نکتہ چیں ہے ہوا کرے کوئی محتسب ہے رہا کرے
یہ ہے دَورِ میکدۂ غزل یہ غزل کا دَور چلا کرے

اُسے مشق گاہِ ستمگری نہ ملے گا میرے سوا کوئی
جو ہے میرا دشمنِ زندگی مری زندگی کی دُعا کرے

یہ رُخِ نگار یہ چشم ولب ہے مرے لہو کی بہار سب
جو کرے مجھ سے وفا طلب میرا حق تو پہلے ادا کرے

نہ کلیمؔ کی کبھی مانیو کبھی دل نہ اُس کا بڑھائیو
جو کرو ہو تم سو کیا کرو وہ غزل کہے ہے کہا کرے

رقیبوں میں رہے یا دوستوں کے درمیاں پہنچے
کہیں بھی چین سے رہنے نہ پائے ہم جہاں پہنچے

قفس کو سادہ لوحی میں سمجھ کر آشیاں پہنچے
کہا صیّاد نے کس طنز سے ’کہیے کہاں پہنچے‘؟

غلط بدنامیوں سے منہ چھپانے کو جہاں پہنچے
ہمیں بدنام و رُسوا کرنے والے بھی وہاں پہنچے

چمن میں یاد کرکے اپنے ویرانے کو روتا ہوں
وہاں غم اس قدر پہنچے نہ تھے جتنے یہاں پہنچے

نہ ٹوٹا سلسلہ شیخ و برہمن کی عنایت کا
اگر یہ مہرباں رخصت ہوئے وہ مہرباں پہنچے

سنا ہے لوگ فن سے صاحبِ فن تک پہنچتے ہیں
مگر ہم تک ہمارے ڈھونڈھنے والے کہاں پہنچے؟

اس ناز اِس انداز سے تم ہائے چلو ہو ‌ ‌ روز ایک غزل ہم سے کہلوائے چلو ہو
رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں ‌ ‌ چلنا ذرا آیا ہے تو اِترائے چلو ہو
دیوانۂ گل قیدیٔ زنجیر ہیں اور تم ‌ ‌ کیا ٹھاٹ سے گلشن کی ہوا کھائے چلو ہو
مئے میں کوئی خامی ہے نہ ساغر میں کوئی کھوٹ ‌ ‌ پینا نہیں آئے ہے تو چھلکائے چلو ہو
ہم کچھ نہیں کہتے ہیں کوئی کچھ نہیں کہتا ‌ ‌ تم کیا ہو تمھیں سب سے کہلوائے چلو ہو
زُلفوں کی تو فطرت ہی ہے لیکن مرے پیارے ‌ ‌ زُلفوں سے زیادہ تمھیں بل کھائے چلو ہو

وہ شوخ ستمگر تو ستم ڈھائے چلے ہے
تم ہو کہ کلیمؔ اپنی غزل گائے چلو ہو

نہ جانے کہاں جی ڈبوئے رہے ہیں ‌ ‌ کلیمؔ آجکل کھوئے کھوئے رہے ہیں
خودی بھی نہیں بے خودی بھی نہیں ہے ‌ ‌ نہ جاگے رہے ہیں نہ سوئے رہے ہیں
جو اشعار نکلے ہیں اِن کی زباں سے ‌ ‌ اِنھیں کے لہو میں ڈبوئے رہے ہیں
سمیٹے رہے ہیں یہی درد سب کا ‌ ‌ یہ تڑپے ہیں اور لوگ سوئے رہے ہیں

بلائے تو کیا کوئی ان کو بلائے
جہاں جائے ہیں روئے روئے رہے ہیں

یہ کون اپنی الاپے ملہار گزرے ہے؟ ‌ ‌ کہ جس کی تان کلیجے کے پار گزرے ہے
ستم رسیدوں پہ جو حالِ زار گزرے ہے ‌ ‌ کبھی وہ تیری نگاہوں سے پار گزرے ہے؟
پڑاؤ ہے نہ کوئی آنسوؤں کی منزل ہے ‌ ‌ یہ قافلہ یوں ہی لیل و نہار گزرے ہے
گزر رہے ہیں کچھ اس طرح دن مصیبت کے ‌ ‌ کسی کی جیسے شبِ انتظار گزرے ہے

چھری گلے پہ چلے ہے کچھ اس ادا کے ساتھ
چمن میں جیسے نسیمِ بہار گزرے ہے

وہ غزل اُنھیں کو سُنائے گا وہ چھری اِسی پہ چلائیں گے
نہ کلیمؔ اُن کو بھلائے گا نہ کلیمؔ کو وہ بھلائیں گے
چھری اُن کی ناز کرے نہ کیوں بھلا ناز کیوں نہ اُٹھائیں گے
ہم اُسی سے ہوں گے خفا اگر تو گلے سے کس کو لگائیں گے
وہ اِن آنسوؤں کو سنگار لیں ہم اُنھیں کی زُلف سجائیں گے
یہ ستارے ٹانک کے اور بھی اُنھیں چار چاند لگائیں گے
ہم اِسی گلی کی ہیں خاک سے یہیں خاک اپنی ملائیں گے
نہ بلائے آپ کے آئے ہیں نہ نکالے آپ کے جائیں گے
وہ تو بدگمان ہیں بے سبب ہم اُنھیں پہ اپنا لُٹا کے سب
جب اُنھیں نہ اپنا بنا سکے تو اَب اور کس کو بنائیں گے
ہم اگرچہ بزم سے دُور ہیں ہمیں رنگ ہیں ہمیں نور ہیں
ہم اگر نہ دیں گے لہو اُنھیں وہ چراغ کیسے جلائیں گے؟

کس غضب کا لیے ہم دردِ نہاں بیٹھے ہیں
دل نے تڑپا کے اُٹھایا ہے جہاں بیٹھے ہیں
سچ تو یہ ہے جو مسلماں بھی یہاں بیٹھے ہیں
کشتۂ غمزہ و اندازِ بُتاں بیٹھے ہیں
بیٹھ کر پاس بھی اللہ رے دِلوں کی دُوری
ہم کہاں بیٹھے ہوئے ہیں وہ کہاں بیٹھے ہیں
تم بھی اچھا ہے بچائے ہوئے دامن اُٹھ جاؤ
آج ہم سوختہ دل شعلہ بجاں بیٹھے ہیں
سر پھر آشفتہ مزاجوں نے اُٹھا رکھا ہے
آئیں اہلِ رَسن و دار کہاں بیٹھے ہیں
نالۂ درد نہیں نغمۂ پُرسوز نہیں
بے زبانوں کی طرح اہلِ زباں بیٹھے ہیں
اپنا دل کھول کے رکھ دیجیو تب اُٹھیو عاجزؔ
لوگ سننے کو حدیثِ دگراں بیٹھے ہیں

یوں ہی ہر سال غم تازہ کرے ہے ۔۔۔ بہار آئی ، جہاں آیا کرے ہے
شکایت اس کی عاجزؔ کیا کرے ہے ۔۔۔ غزل کہہ لے ہے بس اتنا کرے ہے
ترے غم میں تماشہ بن گئے ہم ۔۔۔ جو دیکھے ہے ہمیں دیکھا کرے ہے
نہ جانے دل کو یہ کیا ہوگیا ہے ۔۔۔ جو کہیئے اُس کا ٹھیک اُلٹا کرے ہے
کوئی چاہے نہ چاہے یہ محبت ۔۔۔ جسے چاہے ہے دیوانہ کرے ہے
یہ کیجیو اعتبار اس کے سخن کا ۔۔۔ وہ ظالم کیا کہے ہے کیا کرے ہے
وفا کرنا پڑے اُس کو تو جانے ۔۔۔ وفاداروں کا جی کیسا کرے ہے

غزل کہنے دو عاجزؔ کو ، نہ روکو
یونہیں رودھوکے جی ہلکا کرے ہے

واللہ کس غضب کے ہو ہنس مکھ دِکھائے جاؤ ۔۔۔ ہم آہ آہ کرتے ہیں تم مسکرائے جاؤ
ہم تو غزل کے پھول کھلاتے ہی جائیں گے ۔۔۔ تم جانتے ہو زخم لگانا لگائے جاؤ
فنکار تو ستم کے ہو، ہم شاعرِ وفا ۔۔۔ ہم اپنی گائے جائیں ،تم اپنی سنائے جاؤ
اربابِ غم کے جلتے بدن سے رہو الگ ۔۔۔ ہم دھوپ دھوپ جاتے ہیں تم سائے سائے جاؤ
میرے فسانے پر ہے تمھارا ہی اختیار ۔۔۔ جو بات چاہو اپنی طرف سے ملائے جاؤ
اپنوں کو ہم تو غیر تمھارے لیے بنائیں ۔۔۔ اور تم ہمارے غیر کو اپنا بنائے جاؤ
دیوانے کرہی دیں گے کسی روز چاک چاک ۔۔۔ جب تک بچائے جاسکو دامن بچائے جاؤ
ہم ہیں اگر تو خونِ جگر کی کمی نہیں ۔۔۔ جتنے چراغ بزم میں چاہو جلائے جاؤ

وہ سن کے اَن سنی جو کرے ہے کیا کرے
تم اے کلیمؔ اپنی غزل گنگنائے جاؤ

جب دَور میں شیشہ رہے ہے جام رہے ہے
کیا جانے کہاں گردشِ ایّام رہے ہے

میخانے سے باہر ہے وہی صبح وہی شام
میخانے میں یہ صبح نہ یہ شام رہے ہے

مستی میں وہ ہوجائے ہے آسان سے آسان
مشکل سے بھی مشکل جو کوئی کام رہے ہے

اِک درد ہے جو شام سے اُٹھے ہے سحر تک
اِک سوز ہے جو صبح سے تا شام رہے ہے

بدکار بہت لوگ زمانے میں رہے ہیں
پکڑا وہی جائے ہے جو بدنام رہے ہے

تم بھی نہیں سمجھو تو بڑا ظلم ہے پیارے
ہر شعر میں دل کا کوئی پیغام رہے ہے

یہ دیوانے کبھی پابندیوں کا غم نہیں لیں گے
گریباں چاک جب تک کر نہ لیں گے دَم نہیں لیں گے

لہو دیں گے تو لیں گے پیارے، موتی ہم نہیں لیں گے
ہمیں پھولوں کے بدلے پھول دو شبنم نہیں لیں گے

یہ غم کس نے دیا ہے پوچھ مت اے ہم نشیں ہم سے
زمانہ لے رہا ہے نام اُس کا ہم نہیں لیں گے

محبت کرنے والے بھی عجب خوددار ہوتے ہیں
جگر پر زخم لیں گے زخم پر مرہم نہیں لیں گے

غمِ دل ہی کے ماروں کو غمِ ایّام بھی دے دو
غم اتنا لینے والے کیا اب اتنا غم نہیں لیں گے

سنوارے جارہے ہیں ہم اُلجھتی جاتی ہیں زلفیں
تم اپنے ذمہ لو اب یہ بکھیڑا ہم نہیں لیں گے

شکایت اُن سے کرنا گو مصیبت مول لینا ہے
مگر عاجزؔ غزل ہم بے سنائے دَم نہیں لیں گے

ذرا تلخیوں کا مزا لو تو جانیں | ہماری طرح دل لگا لو تو جانیں
پہاڑوں کو ہم نے اُٹھایا ہے دل پر | تم اِک کنکری بھی اُٹھا لو تو جانیں
ستم سہتے جاؤں وفا کرتے جاؤ | دُعائیں دو اور بددُعا لو تو جانیں
تڑپتا ہوں دل اُمڈے آتے ہوں آنسو | اور اُس حال میں مسکرا لو تو جانیں
یہاں دل پہ ہر روز جیسی لگے ہے | تم اِک چوٹ بھی ایسی کھا لو تو جانیں
ہمیں کو جب اپنا بنایا نہ تم نے | کسی کو بھی اپنا بنا لو تو جانیں
سنا ہے ہمیں بے وفا تم کہو ہو | ذرا ہم سے آنکھیں ملا لو تو جانیں

غزل تم پہ عاجزؔ نے جیسی کہی ہے
کسی اور سے کہلوا لو تو جانیں

بلاتے کیوں ہو عاجزؔ کو بلانا کیا مزا دے ہے
غزل کمبخت کچھ ایسی پڑھے ہے دل ہلا دے ہے

محبت کیا بلا ہے چین لینا ہی بھلا دے ہے
ذرا بھی آنکھ جھپکے ہے تو بیتابی جگا دے ہے

ترے ہاتھوں کی سرخی خود ثبوت اس بات کا دے ہے
کہ جو کہہ دے ہے دیوانہ وہ کر کے بھی دِکھا دے ہے

غضب کی فتنہ سازی آئے ہے اُس آفتِ جاں کو
شرارت خود کرے ہے اور ہمیں تہمت لگا دے ہے

مری بربادیوں کا ڈال کر الزام دُنیا پر
وہ ظالم اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر مسکرا دے ہے

اب انسانوں کی بستی کا یہ عالم ہے کہ مت پوچھو
لگے ہے آگ اِک گھر میں تو ہمسایہ ہوا دے ہے

کلیجہ تھام کر سنتے ہیں لیکن سن ہی لیتے ہیں
مرے یاروں کو میرے غم کی تلخی بھی مزا دے ہے

کوئی کتنا ہی چلے پردا کیے　　عشق کب چھوڑے ہے بے رُسوا کیے
اپنا افسانہ معمہ ہی رہا ہے　　بات کیا تھی لوگ کیا سمجھا کیے
آرزو دَم بھی نہ لینے پائی تھی　　نااُمیدی آگئی پیچھا کیے
بڑھنے والے کا قدم بڑھتا گیا　　روکنے والے بہت روکا کیے
بے وفائی پر بھی اتنا سرخ رُو　　ہم تو اُس کافر کا منہ دیکھا کیے

تم جب آؤ ہو غزل پڑھنے کلیمؔ
جاؤ ہو محفل میں سنّاٹا کیے

یہ طرزِ خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا　　جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا
غزل میں کون نئی چاشنی چکھائے گا　　اگر کلیمؔ نہ ہوگا مزا نہ آئے گا
چمن میں غنچے کی مانند ہے دلِ شاعر　　یہ ہے اُداس تو پھر کون مسکرائے گا
اب اُس کی شبنمی باتیں فریب کیا دیں گی　　وہی لگا کے گیا ہے وہ کیا بجھائے گا
خزاں کے دَور میں خنجر اُٹھا لیا جس نے　　بہار آئی تو ساغر وہی اُٹھائے گا

عروسِ دار و رسن پر شباب ہے جب تک
مرے مزاج سے دیوانہ پن نہ جائے گا

بیاں جب کلیمؔ اپنی حالت کرے ہے　　غزل کیا پڑھے ہے قیامت کرے ہے
بھلا آدمی تھا یہ نادان نکلا　　سنا ہے کسی سے محبت کرے ہے
کبھی شاعری اِس کو کرنی نہ آتی　　اُسی بے وفا کی بدولت کرے ہے
چھری پر چھری کھائے جائے ہے کب سے　　اور اب تک جئے ہے کرامت کرے ہے
کرے ہے عداوت بھی وہ اِس ادا سے　　لگے ہے کہ جیسے محبت کرے ہے

یہ فتنے جو ہر اِک طرف اُٹھ رہے ہیں　　وہی بیٹھا بیٹھا شرارت کرے ہے

قبا ایک دن چاک اُس کی بھی ہوگی
جنوں کب کسی کی رعایت کرے ہے

اِسے ہر خار وگل پیارا لگے ہے　　یہ دل کمبخت آوارا لگے ہے

سخن عاجؔز کا کیوں پیارا لگے ہے　　یہ کوئی درد کا مارا لگے ہے

کھلائے ہیں وہ گل زخموں نے اِس کے　　حسیں جن سے چمن سارا لگے ہے

لگے ہے پھول سننے میں ہر اِک شعر　　سمجھ لینے پہ انگارا لگے ہے

یہ ہے لوٹا ہوا اُس سنگ دل کا　　جو دیکھے میں بہت پیارا لگے ہے

تم آخر بدگماں عاجؔز سے کیوں ہو
وہ بیچارا تو بیچارا لگے ہے

ہلو نہ دُکھے گا تو گزرا نہیں ہوگا　　ہم سا بھی کوئی درد کا مارا نہیں ہوگا

ہر شعر ہے تصویر مرے زخمِ جگر کی　　ہاں دیکھ کہ پھر ایسا نظارا نہیں ہوگا

تو سب کی سنے ہے کبھی میری بھی غزل سن　　پھر ایسا خوش اسلوب دوبارا نہیں ہوگا

جس درد سے ہم تجھ کو دیا کرتے ہیں آواز　　بلبل نے بھی یوں گل کو پکارا نہیں ہوگا

کل ہوگی اگر آج پریشاں نہیں ہوگی　　وہ زلف جسے ہم نے سنوارا نہیں ہوگا

شمشیر کبھی وقت کی چل ہی نہیں سکتی　　جب تک تری چتون کا اشارا نہیں ہوگا

جب ترکِ تعلق کا ستم جھیل چکے ہم　　پھر کون سا غم ہے جو گوارا نہیں ہوگا

دُنیا میں مری جان کے دشمن تو بہت ہیں　　تم جیسے ہو ایسا کوئی پیارا نہیں ہوگا

ہم کو کوئی اُمید زمانے سے نہیں ہے
جو تیرا ہوا ہے وہ ہمارا نہیں ہوگا

دوسرا مجموعہ
جب فصلِ بہاراں آئی تھی
جب فصلِ بہاراں آئی تھی
اشاعت: اکتوبر 1990ء
جب فصلِ بہاراں آئی تھی گلشن میں انھیں ایّام سے ہم
یادوں میں لُٹاتے پھرتے ہیں کچھ پھول غزل کے نام سے ہم

انتساب

اُن باذوق اہلِ دل کے نام
جو یہ کہتے ہیں
اگر کلیمؔ نہ ہوگا مزا نہ آئے گا

مُقدّمہ

کرتے رہو کلیمؔ اشاروں میں گفتگو

□ کلیم عاجزؔ

دس بارہ سال پہلے جب 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کی اشاعت ہو رہی تھی، اُس وقت بھی دیباچہ لکھنے کے وقت میں یہ بات سوچنے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اس کے بعد سے اِس وقت تک برابر کوشش کرتا رہا ہوں، اب بھی کر رہا ہوں۔ اور سوچنے کی کوشش کسی مفکر، کسی مدبّر، کسی فلسفی، کسی حکیم، کسی دانائے راز کی طرح خلوت میں، تنہائی میں، گوشے میں، مراقبہ میں نہیں کی۔ کہیں دامنِ کوہ میں، کسی آبِ شیریں کی جوئے رواں کے کنارے بیٹھ کر، پھولوں کے کُنج میں، کسی وادیِ پُر فضا کی آغوش میں بھی نہیں کی۔ جنگل، ویرانے صحرا کی خاموش پُرسکون فضا میں بھی نہیں کی۔ اس لیے کہ اِن سب میں کسی ایک کا قربْ بھی مجھے میسر نہیں آتا۔ گھر چھوٹا، ایسی خلوت اور تنہائی کہاں نصیب! مراقبہ کی فرصت کہاں، دامنِ کوہ پر دسترس کہاں، جوئے آبِ شیریں میسر کہاں۔ کسی وادیِ پُر فضا تک گزر کہاں۔ جنگل، ویرانے، صحرا تک جانے کا نظم انتظام اور فراغت کہاں۔ تو سوچنے کے لیے ان کے علاوہ تمام جگہیں استعمال ہوتی ہیں۔ کلاس کے بعد وقفے میں بھی، راہ پر چلتے ہوئے سر جھکا کر بھی، چائے پیتے ہوئے ناشتہ دان کے قریب بھی، کھانا کھاتے ہوئے دسترخوان پر بھی، دوستوں سے باتیں کرتے ہوئے اور دوستوں کی باتیں سنتے ہوئے بھی اور اپنے تمام انفرادی اور اجتماعی مشاغل کے دوران بھی سوچنے کا، سمجھنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ میرے تمام اعضا مشغول اور منہمک رہتے ہیں اس کے باوجود دل اپنی ڈیوٹی پر مستعد اور دماغ اپنے کام میں مگن رہتا ہے۔ بجلی کی چمک کی طرح سوچ اور فکر کے دروازے کھلے رہتے ہیں بند ہوتے رہتے ہیں، کھلتے رہتے ہیں بند ہوتے رہتے ہیں۔ جھونکے آتے ہیں گزر جاتے ہیں،

تتلیاں سامنے آتی ہیں اُڑ جاتی ہیں، خوشبو آتی ہے، بدبو آتی ہے روانہ ہو جاتی ہے۔ اسی رواں دواں عالم میں کوئی چیز گرفت میں آ گئی اور کبھی گرفت میں آئی ہوئی چیز اُڑ گئی اور کبھی سوچ میں ایسا انہماک ہوتا ہے کہ:

بہکی بہکی بات اپنی، منتشر بیاں اپنا
ہم ہیں جس جگہ بیٹھے دل نہیں وہاں اپنا

باتیں ہو رہی ہیں اور اہم باتیں ہو رہی ہیں، اور باتیں کرنے والا صرف مجھی سے مخاطب ہے اور میں 'جی ہاں'، 'بالکل ٹھیک'، 'صحیح کہہ رہے ہیں'، 'واقعی؟'، 'ہاں' وغیرہ وغیرہ میں پوری بات گزار دیتا ہوں۔ نہ کچھ سن سکتا ہوں نہ سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن خدا کتنے مہربان، کتنے پردہ دار اور پردہ پوش ہیں کہ الحمدللہ کوئی بات بگڑتی نہیں کام سب ہو جاتا ہے۔ باتیں کرنے والا مطمئن اور آسودہ اُٹھتا ہے کہ گفتگو کامیاب اور مکمل رہی اور الحمدللہ اسی گمشدگی اور بے خودی میں کام سب ہو جاتا ہے، کبھی وعدہ خلافی نہیں ہوئی۔ نظم و نسق میں کبھی فرق نہیں آیا۔ کبھی وقت سے بے وقت نہیں ہوا۔ وعدے کی پابندی، وقت کی پابندی، اصول اور ضابطے کی پابندی میں تغیر نہیں ہو۔ ایک زمانہ تھا جب کام کم تھے تو سوچنے کی جگہیں بھی تھیں۔ وہ سب جگہیں تھیں جن کا اُوپر ذکر آیا۔ پھولوں کا کنج بھی، دامنِ کوہ بھی، کنارِ آب جو بھی، آغوشِ صحرا بھی، گوشۂ سبزہ زار بھی، سایۂ شاخِ گل بھی:

بہاریں سیر گاہیں چاندنی راتیں ملاقاتیں
ہمیں اب تک یہی خوابِ پریشاں یاد آتے ہیں

گھر بھی پھیلا بکھرا ہوا۔ تنہا دالان میں پڑا سوچ رہا ہوں۔ شب کو مکان کے وسیع صحن میں تنہا چارپائی ڈالے چاند سے محوِ گفتگو ہوں۔ ندی کے پُل پر آبِ رواں سے مصروفِ راز و نیاز۔ اتنا سوچا کہ عمر بھر کی سوچ سے آزاد ہو گیا۔ گرچہ وہ دن سوچنے کے نہیں تھے، گتھیاں سلجھانے کے نہیں تھے۔ جب دن آئے تو سوچ فکر کے سامان اور اسباب نہیں رہے۔ اسباب اور سامان، ماحول اور فضا تھی تو سوچ فکر کی چیزیں نہ تھیں، ضرورتیں نہ تھیں۔ اب ضرورتیں آئیں، چیزیں پیدا ہوئیں تو کیا کروں؟ وہی چلتے دوڑتے، اُٹھتے بیٹھتے، کاٹتے کوٹتے، پیستے دلتے، کھاتے پیتے، بولتے چالتے، ملتے ملاتے، کودتے پھاندتے، چھانتے نچوڑتے، ہانپتے کانپتے سب کام کر لو۔ سوچ بھی لو، سمجھ بھی لو، غور فکر بھی کر لو، شاعری بھی کر لو، مضمون بھی گڑھ لو، دل سے بھی باتیں کر لو، دماغ

سے بھی پوچھ گچھ کرلو، رو بھی لو، آنسو بہا بھی لو، ہنس بھی لو مسکرا بھی لو:

مری طرح اِک دن کوئی جی کر جینا ہے کیا مشکل دیکھے

جی ہاں تو اسی عالمِ تگ ودو میں سوچ بچار کا کام بھی اور افہام و تفہیم کا کام بھی چلتا رہتا ہے اور ہزاروں سوچنے سمجھنے کے مسائل میں ایک اہم مسئلہ سوچنے کا یہ بھی تھا اور ہے جس کی طرف میں نے ابتدا میں اشارہ کیا کہ دس بارہ سال سے میں یہ بھی سوچ رہا ہوں، سوچنے کی اور سمجھنے کی کوشش کرر ہا ہوں کہ آخر شاعری سے میرا کیا تعلق ہے؟ تعلق ہے بھی یا نہیں۔ نہیں ہے تو پھر یہ سب کیا کھ گاڑ ہے؟ اور تعلق ہے تو کس نوعیت کا ہے؟ کس سطح کا ہے؟ کتنے وزن کا ہے؟ کتنی مقدار کا ہے؟ مضبوط ہے یا کمزور ہے؟ بنیادی ہے یا سطحی ہے؟ وقتی ہنگامی ہے یا دائمی ہے؟ فطری یا کسبی ہے؟ اور اس دس بارہ سال کے اس رواروی سوچ بچار، فکر و غور کے بعد بھی یہ بات نہیں ہے کہ میں سوچنے سمجھنے میں کامیاب ہو گیا ہوں، مطمئن اور آسودہ ہو گیا ہوں۔ سمجھ گیا ہوں اور سمجھ سکتا ہوں لیکن یہ بات بھی نہیں ہے کہ:

اب بھی اُسی جگہ ہیں چلے تھے جہاں سے ہم

ایسا سمجھنا اور ایسا کہنا غلط انکسار ہے، قانونِ ارتقا کی ضد ہے، انسانی فطرت کی تحقیر ہے۔ بس سفر جاری ہے، قدم آگے پیچھے ہوتے ہیں، گرتے ہیں لیکن سنبھلتے ہیں۔ گمراہ ہوتے ہیں پھر راہ پر آتے ہیں، کھوتے ہیں پاتے ہیں لیکن چلے جارہے ہیں گرچہ ہر قدم سے دُوریِ منزل کا احساس بڑھ جاتا ہے لیکن شرطِ سفر پورا کرنے کا اطمینا بھی زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ سفر جاری رہے گا یہ اعتماد بھی ہوتا ہے اور منزل کو پالیں گے اس کا یقین بھی ہوتا ہے۔

تو یہ سوچنا کہ شاعری سے میرا تعلق ہے یا نہیں ہے اور ہے تو کس نوعیت کا ہے، اس لیے ہوا کہ میرے مطالعے میں یہ بات آتی ہے کہ شاعری اور شاعر، فن اور فنکار کے درمیان عموماً بہت گہرا اور نہایت استوار رشتہ ہوتا ہے۔ رشتہ کہیے یا تعلق۔ اسی تعلق سے فن میں قوت، توانائی اثر اور دیرپائی آتی ہے۔ بڑا فنکار وہی ہے جس کے یہاں یہ تعلق بہت واضح ہو۔ اور جیسا میں نے کہا تعلق کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ آدمی میں بھی ایک ہی رشتے مختلف نوعیت کے وزن، مقدار، رنگ اور آہنگ کے ہوتے ہیں۔ مثلاً میاں بیوی میں بھی تعلق اور رشتے ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ اس تعلق میں مختلف سرزمین، مختلف آب وہوا، مختلف نظریات اور مختلف روایات کارفرما ہوتے

ہیں۔اس میں مشرق اور مغرب، جنوب اور شمال کا بھی فرق ہوتا ہے۔اسی طرح فن اور فنکار میں بھی رشتے اور تعلق مختلف ہوتے ہیں۔شیکسپیئر، کیٹس، شیلی کی بات کیوں کریں۔حافظؔ، سعدیؔ، عرفیؔ کی بات کیوں کریں۔ہم اُردو ہی کی بات کیوں نہ کریں۔اُردو کے چند بڑے فنکاروں میں یہ نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ہر فنکار کا تعلق اپنے فن سے مختلف نوعیت کا ہے۔مثلاً میرؔ کو لیجیے۔ تو میرؔ کی وابستگی، میرؔ کا رشتہ، میرؔ کا تعلق فن سے ایسے ہی نظر آتا ہے جیسے ایک مخلص، ایک عادی، ایک دیرینہ شرابی کا تعلق شراب سے ہو۔شراب اس کی زندگی بن جاتی ہے، اس کی بقائے حیات کا سبب، اس کی تشنگیِ فطرت کی سیرابی کا سامان، اس کی رُوح کی طلب، اس کے دل کا ارمان، اس کی عقل کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔شراب اس کی غذا، اُس کا لباس، اس کی نیند، اس کی راحت، اس کا خواب، اس کی حقیقت سب کچھ بن جاتی ہے۔اُس کی محبوب بن جاتی ہے۔وہ اس کا عاشق ہے، اس کا دلدادہ ہے، اس کا دیوانہ ہے، وارفتہ ہے، فریفتہ ہے۔اس کی دُنیا، اس کی عاقبت سب کچھ ہے۔اس کی کیفیت کبھی جدا نہیں ہوتی۔اس کا سرور کبھی نہیں جاتا، اس کا نشہ کبھی خمار نہیں بنتا بس ایک جاوداں مستی، ایک غیر فانی سرشاری ہے:

دلِ پُرخوں کی اِک گلابی سے   عمر بھر ہم رہے شرابی سے

....

یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں
اب دو تو جام خالی ہی دو میں نشے میں ہوں
مستی سے درہمی ہے میری گفتگو کے بیچ
جو چاہو تم بھی مجھ کو کہو میں نشے میں ہوں

یہ عشق، یہ وابستگی اور فریفتگی وہ ہے جس کی ترجمانی کے لیے اُردو فارسی شاعری میں مجنوں کی ذات ایک علامت بن گئی:

مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ   کیا دِوانے نے موت پائی ہے

....

کیا سہل جی سے ہاتھ اُٹھا بیٹھتے ہیں آہ   یہ عشق پیش گاہیں الٰہی کہاں کے لوگ

....

کچھ نیک و بد یہ عشق میں مجھ کو نظر نہیں   اس میں مجھے بُرا کہو چاہے بھلا کہو

....

عاشق جی ہی لے گئی آخر   یہ بلا کوئی ناگہانی تھی

سلگنا، جلنا مرنا، یہ روز کا دُھندا ہو جاتا ہے۔ یہی معاش اور یہی معاشرت بن جاتا ہے۔ یہی زندگی، یہی فطرت، یہی عادت، یہی سرمایۂ حیات، یہی حاصلِ حیات اور یہی ذوق ولطفِ حیات بن جاتا ہے:

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے   یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

کوچۂ عشق سے باہر قدم اُٹھانا یوں ہو جاتا ہے جیسے زندگی سے ہی گزر رہے ہیں:

یوں اُٹھے آہ اس گلی سے ہم   جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

………………

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم   سو اُس عہد کو ہم وفا کر چلے
وہ کیا چیز تھی آہ جس کے لیے   ہر اِک چیز سے دل اُٹھا کر چلے

………………

اُس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر جینا اور اُسی کی گردن میں بانہیں ڈالے گزر جاتے ہیں۔ اور جاتے جاتے میؔر صاحب اپنے اِکلوتے بیٹے میر کلّو عرؔش کو وصیت کر جاتے ہیں کہ ہماری پونجی عشق کی افتادگی اور زبان کی سادگی ہے۔ اُنھیں کو عمر بھر کلیجے سے لگائے ہم زندہ رہے اور اسی کی ہم آغوش میں ہم مر رہے ہیں۔ تم بھی میری اس پونجی کو گلے سے لگائے جان دے دیجیو۔ بڑے باپ نے جو کہا بڑے باپ کے بڑے بیٹے نے بھی وہی کر کے دکھا دیا۔ جس طرح باپ تاج و تخت والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوا گزر گیا بیٹا بھی فقر وفاقہ، غیرت وحمیت کی موت مر گیا:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم   سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیاباں و کہسار و راغ آفریدی   خیاباں و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم   من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

میؔر کی طبیعت میں شدّت سے یہ احساس زندہ تھا لیکن اس کے اظہار کے لیے وہ زبان نہیں جو اقبالؔ نے اختیار کی۔ اس پر گفتگو آگے آئے گی۔ اس تخلیقی احساس کو بھی میؔر نے غزل کا نرم شیریں انداز بخش دیا ہے ورنہ وہ اقبالؔ سے کہیں زیادہ اِس احساس کی شدّت سے گرم تھے۔ گرم نہیں بالکل آگ تھے۔ اِس آگ کی لپک ان کی شخصیت میں زیادہ نظر آتی ہے فن میں کم، کہیں کہیں یہ لپک نمایاں ہے:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

....

برسوں لگی رہی ہیں جب مہرومہ کی آنکھیں تب ہم سا کوئی صاحب صاحبِ نظر بنے ہے

....

اقبالؔ نے پہلے شعر کا گویا ترجمہ اپنے انداز میں کردیا۔ اگر میرؔ کا شعر فارسی میں ہوتا تو ہم اقبالؔ کے شعر کو میرؔ کے شعر کا ترجمہ ہی کہتے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

میرؔ کے فن میں اسی شدّتِ احساس اور عظمتِ انسانی کے اس گرم اور تپتے ہوئے تصوّر کی مہین نازک نرم اور دھیمی عکاسیاں بکھری پڑی ہیں:

وہ کیا چیز تھی آپ جس کے لیے ہر اِک چیز سے دل اُٹھا کر چلے

....

ہم غریبوں سے بے ادائی کیا آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

....

وجہِ بے گانگی نہیں معلوم تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

....

چمن میں ہم بھی فریادی رہے ہیں سنا ہوگا کبھی شیون ہمارا

....

ہم خستہ دل ہیں تم سے بھی نازک مزاج تر

تیوری چڑھائی تم نے کہ یاں جی نکل گیا

موضوع مستقل میرؔ نہیں ہیں ورنہ بہت تفصیل سے گفتگو ہوسکتی ہے کہ میرؔ کے فن نے میرؔ کی شخصیت کو کتنا عظیم بنا دیا ہے۔ اِس عظمت کی آنچ فن سے بھی زیادہ ان کی شخصیت میں نمایاں تھی۔ شاعری جز ویست از پیغمبری کا نظریہ اُن کی شخصیت کے روئیں روئیں سے اپنا پرتو ڈال رہا تھا۔ ایسی مستی مجھے کسی اُردو شاعر کے یہاں نظر نہیں آئی۔ اُردو شاعری کی تاریخ چاہے جتنی طویل یا مختصر ہو، غالبؔ تو میرؔ کے گردِ کارواں نظر آتے ہیں۔ غالبؔ کے یہاں جو اعترافِ میرؔ ہے وہ صرف فن کی نسبت سے نہیں شخصیت کی جہت سے بھی ہے، ورنہ غالبؔ اور کسی کا اعتراف عظمت؟ جو یہ کہنے میں بھی نہیں چوکتے کہ:

قیامت ہے کہ ہووے وہ عدو کا ہم سفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

وہ غالبؔ اور یہ کہے کہ: سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

بلکہ یہاں تک کہہ دے: آپ بے بہرہ ہیں جو معتقدِ میرؔ نہیں

غالبؔ کا تعلق اور رشتہ فن کے ساتھ ویسا ہی ہے جو کسی سیانے انسان کا کھلونے سے ہوتا ہے۔یقین مانئے غالبؔ کے تصوّر میں فن کا مرتبہ کھلونے سے زیادہ نہیں ہے، وہ خود کو فن سے زیادہ عظیم سمجھتے ہیں اس لیے کہ وہ بچّے نہیں ہیں سیانے ہیں۔بچہ کھلونوں سے کھیلتا ہے تو اسے توڑ بھی دیتا ہے۔غالبؔ کھلونا دے کر بہلائے نہیں گئے ہیں بلکہ دوسروں کو بہلانے کے لیے ان کے ہاتھ میں کھلونا دیا گیا ہے:

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اِک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک اِک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے
عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

تیسرے شعر نے اوپر کے دونوں شعروں کا مقام وزن اور بھرم بھی کھول دیا۔بس غالبؔ عاشق ہیں لیکن مقصدِ عشق و معشوق فریبی ہے۔ساری دُنیا کو انھوں نے خوب نچایا اور اب تک نچا رہے ہیں، جس طرح کٹھ پتلیاں نچانے والا کرتا ہے۔غالبؔ کی بے پناہ ذہانت انھیں شاعر نہیں بنا سکتی۔وہ ایسے حکیم اور دانا ہیں کہ اگلے پچھلے انسانوں کی نفسیات کھلی کتاب کی طرح ہر وقت ان کے سامنے رہتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ وہ وقت سے پہلے پیدا ہوئے۔اگر غالبؔ اس زمانے میں ہوتے تو عالمگیر سیاست داں ان کا لوہا مانتے۔اُن کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرتے، اُن سے سبق پڑھتے اور عالم کو پڑھاتے۔اُن سے سیکھتے اور دُنیا کو سکھاتے۔اب بھی مردہ غالبؔ کے زندہ کلام سے کسبِ فیض کر کے بہت سے نام نہاد غالبؔ شناس کما کھا رہے ہیں۔

تو غالبؔ کا تعلق شاعری سے وہی ہے جو ایک شہسوار کا اپنے گھوڑے سے ہوتا ہے۔جب چاہیں دُلکی چلائیں جس وقت چاہیں قدم چلائیں، جب چاہیں چھڑکت چلائیں، جب چاہیں سَرپٹ دوڑا دیں۔اور لطف کی بات یہ ہے کہ:

نہ شود گردِ نمایاں ز رمِ توسنِ ما

گھوڑا اُچھل رہا ہے، دوڑ رہا ہے، بھاگ رہا ہے لیکن گرد نہیں اُڑتی۔ غالبؔ نے شاعری سے کبھی پیار نہیں کیا۔ پیار اُن کے یہاں ایک شغل ہے، اس کی حیثیت بھی ایک کھلونے کی ہے، جب جی چاہا کھیل لیا جب جی چاہا توڑ دیا یا پھینک دیا:

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار　　　کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

غالبؔ محبت میں سر پھوڑنا نہیں چاہتے۔ یہ حماقت تو مجنوں کر گیا:

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دِل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

ہر سنگِ آستاں پر جا کر غالبؔ یہی کہیں گے اور سر سلامت ہی لے جائیں گے۔ وہ بڑے ماہر سیاست داں ہیں۔ اور سیاست کی مہارت کا ثبوت یہ ہے کہ سیاست داں کسی پر اعتبار نہیں کرتا۔ لہٰذا غالبؔ 'سیاستِ درباں' سے بھی ڈر جاتے ہیں اور درِ یار سے بغیر التجا کیے واپس چلے آتے ہیں۔ میں غالبؔ کی فنّی عظمت سے انکار نہیں کر رہا ہوں، اس کا لوہا مانتا ہوں کہ غالبؔ جیسا فنکار کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔ اسی فنکاری کی چکا چوند سے بعضوں کی نظر میں 'دیوانِ غالبؔ' ہندوستان کی الہامی کتابوں کی صف میں نظر آتی ہے۔ میرا موضوع صرف یہ عرض کرنا ہے کہ شاعری کو غالبؔ کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ وہ شاعری کو چھ ماہی وظیفہ ہر ماہی وظیفہ میں تبدیل کرنے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ بادشاہ کے تیور پر ہلکا کا شبہ ہوتا ہے تو معذرت نامہ لکھنے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ ہر وقت موقع مصلحت کے اعتبار سے شاعری کے کان اینٹھتے ہیں۔ لگام بھی کستے ہیں، کبھی ڈھیلی کرتے ہیں، کبھی بالکل چھوڑ دیتے ہیں۔

غالبؔ کے سینکڑوں اشعار ہیں جو زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ اُن کی فہرست بنائیے اور تجزیہ کیجیے تو تقریباً ہر شعر بہ استثنائے چند آپ کی اور ہماری کسی دماغی کیفیت کو، کسی نفسیات کو، کسی فطرت کو بے نقاب کرتا ہے اور ہم اپنی عادات اور خصائل کی تصویر دیکھ کر اُچھل پڑتے ہیں یا پھر یہ کہ غالبؔ کے اس دعوے کی تصدیق دیکھتے ہیں کہ:

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

بس غالبؔ کا جادو ان کے اندازِ بیان میں ہے۔ لہجہ میں نہیں ہے۔ اندازِ بیان کا تعلق دماغ اور

ذہانت سے ہے۔ لہجہ کا تعلق انسان کے دل سے اس کی روح سے اس کی اندرونی کیفیت سے ہے۔ میرؔ کے یہاں لہجے کی اہمیت ہے۔ غالبؔ کے یہاں اندازِ بیان کی۔ ذوقؔ اور داغؔ جیسے کمتر درجہ کے شاعر کے یہاں بھی آپ کو لہجے کی گرمی مل جائے گی۔ غالبؔ کے یہاں ملے گی بھی تو اندازِ بیان کی آمیزش کے ساتھ مثلاً:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

یا

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے — اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

وغیرہ قسم کے شعر میں زبان اور محاورے کی خوبی کے ساتھ لہجے کا حسن بھی ہے۔ لیکن غالبؔ کے نہایت با محاورہ زبان زد اشعار پڑھ کر بھی کلیجہ دھک سے نہیں ہوتا۔ بلکہ ہلکا سا احساس کاریگری اور فنکاری کا ہوتا ہے اور دماغ کے راستے سے دل تک بات پہنچتی ہے۔ مثلاً:

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن — خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

یہ وہ اشعار ہیں جن میں ہماری نفسیات کو نہیں چھیڑا گیا ہے، ہمارے احساسات پر ضرب لگائی گئی ہے۔ لیکن یہ ضرب براہِ راست دل کے تاروں کو نہیں چھیڑتی۔ ہمیں پہلے صناعی متوجہ کرتی ہے پھر خیال ہم تک پہنچتا ہے۔ بات وہی ہے جو غالبؔ کہہ چکے ہیں کہ:

سخن سادہ دلم رانہ فریبد غالبؔ

اِن سادہ اشعار میں بھی وہ بے اختیاری نہیں ہے جو مستی اور سرشاری سے پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ پُرکاری ہے جو ہوشیاری سے وجود میں آتی ہے۔ غالبؔ کے وہ اشعار یعنی اس قسم کے اشعار:

رات کے وقت مئے پیئے ساتھ رقیب کو لیے
آئیں وہ یاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں

یا

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

یا

اور لے آئیں گے بازار سے گر ٹوٹ گیا — جامِ جم سے تو میرا جامِ سفال اچھا ہے

اس قسم کے سینکڑوں اشعار جو ہماری زبانوں پر ہیں اور وقت موقع اور محل کے لحاظ سے باہر نکل پڑتے ہیں یہ سب اس حقیقت کی نقاب کشائی کرتے ہیں کہ غالبؔ کا تعلق اس کے فن سے کس نوعیت کا ہے ہم غالبؔ کی فنکاری کے سو فیصد قائل ہو جاتے ہیں لیکن ہم غالبؔ کو ڈھونڈھتے ہیں، ان کے تیور دیکھنا چاہتے ہیں، اُن کا چہرہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کا اصلی چہرہ جو کبھی نہیں بدلتا۔ غالبؔ کا وہ اصلی چہرہ ہمیں ان کی شاعری میں نظر نہیں آتا۔ وہ بھیس بدل بدل کر بہروپ بنا بنا کر آتے ہیں۔ ان کا ہر بہروپ ہمیں متحیر کر دیتا ہے، وہ ایک ماہر اداکار ہیں، وہ ایک مجلسی آدمی ہیں اور پوری مجلس کو اپنی خوش طبعی سے، بذلہ سنجی سے نغز گفتاری سے اُٹھاتے ہیں، بٹھاتے ہیں، نچاتے ہیں، دوڑاتے ہیں، ہنساتے ہیں۔ لیکن ہمیں کام کا نہیں بناتے۔ وہ ہمیں ہر چیز سے بے اعتماد، مشکوک، بدگماں اور متزلزل رکھتے ہیں، ہمیں جمنے نہیں دیتے۔ سائنٹفک نظریہ ارتقا یہی ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ تشکیک سے مشین بن سکتی ہے اور بنتی ہے کردار نہیں بن سکتا۔ اور بغیر کردار کے انسان کا تصوّر مکمل نہیں ہوسکتا۔ ہمیں غالبؔ کے فن میں کوئی پُر اعتماد کردار نہیں ملتا۔ جیسا ہمیں میرؔ کے یہاں ملتا ہے، اور یہ اسی لیے ہے کہ غالبؔ نے کبھی محبت نہیں کی۔ غالبؔ محبت کر ہی نہیں سکتے۔ نہ ہمیں غالبؔ کے فن میں محبت کا صحت مند اور اعلیٰ تصوّر ملتا ہے نہ غالبؔ کی شخصیت میں۔ زندگی بھر ایک اقرار محبت کا ملتا ہے۔ لیکن اس ستم پیشہ ڈومنی کو بھی غالبؔ نے مار ہی دیا۔ خود نہیں مرے، وہ مر نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ مر کے زندہ ہونے کا تصوّر ہی نہیں رکھتے۔ ان کے یہاں موت وجود کے خاتمے کا نام ہے اس لیے وہ کسی کے مرنے کا غم بھی نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جسے خود نہیں مرنا ہو۔ اس لیے ان کی شاعری غم کی اُس خوبصورتی حسن اور تاثیر سے خالی ہے جو سارے آرٹ کی جان اور روح ہے۔ وقت کو دھوکہ دے کر چال کے ساتھ دامن بچا کر نکل جانے کا گُر تو بتاتے ہیں، وقت کے ساتھ سینہ سپر ہو کر معرکہ آرا ہونے کی جرأت نہیں دیتے۔ یہ جرأت کوئی مجنوں دے سکتا ہے۔ غالبؔ بڑے ہوشیار ہیں۔ اسی لیے میں نے کہا کہ میرؔ کا تعلق شاعری سے شراب کا ہے، مستی اور سرشاری کا ہے۔ غالبؔ کا تعلق ماہر کھلونا ساز کا ہے، خود نگاہی اور ہوشیاری کا ہے۔ اقبالؔ کا تعلق شاعری سے سپاہی اور تلوار کا ہے، جاں نثار اور جاں سپاری کا ہے اور کسی حد تک وہ میرؔ و غالبؔ کا امتزاج میں۔ میرؔ صاحب دُنیا کی طرف پشت کر کے چلتے ہیں، وہ دنیا کے خطرے سے بے نیاز اور بے پروا ہیں۔ اُنھیں کوئی پشت سے

حملہ کر کے ختم کر سکتا ہے لیکن میرؔ کا استغنا اور وقار کسی کو حملے کی جرأت ہی نہیں دیتا۔ دُشمن بھی سرنگوں ہو جاتا ہے۔ غالبؔ دُنیا کی طرف پشت کرتے ہی نہیں۔ وہ دُنیا کی طرف دیکھتے ہوئے اُلٹے پاؤں چلتے ہیں اور حملہ کرنے والوں کو داؤں بتا دیتے ہیں یا خالی دیتے ہیں یا وار بچا لیتے ہیں۔ اقبالؔ آگے چلتے ہیں مگر پیچھے سے بھی چوکنّا رہتے ہیں۔ اُن پر حملہ ہو جاتا ہے۔ زخم کھا جاتے ہیں گر بھی جاتے ہیں مگر سنبھل کر مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ یہی مردانگی اقبالؔ کی بنیادی خصوصیت ہے۔ وہ نسانی لطافت و نزاکت کو اپنی شاعری کے قریب پھٹکنے ہی نہیں دیتے۔ ان کا فن نسائیات کے خلاف ایک باشعور جہاد ہے۔ یہ وقت کا تقاضہ تھا ایک نہایت اہم تقاضہ تھا، اُردو شاعری پر خصوصیت کے ساتھ بلکہ ایشیائی ادب و شعر پر نسائیت کا نہایت غیر صحت مند غلبہ ہو گیا تھا۔ نسائیت کے خلاف اس جہاد کا آغاز حالیؔ نے کیا۔ مگر وہ اسبابِ جہاد سے محروم تھے۔ ان کے یہاں جہاد کی اِسپرٹ بھی نہیں تھی، صرف ردِّ عمل ہے۔ اقبالؔ کے یہاں ردِّعمل نہیں ایک باضابطہ باشعور پوری تیاری کے ساتھ، پوری قوت توانائی پوری فکر پوری بیداری کے ساتھ اعلانِ جنگ ہے۔ اس اعلانِ جنگ نے واقعی میدانِ جنگ کو تھرّا دیا۔ دُشمن پسپا ہو نہ ہو شکست کھائے نہ کھائے اُس کی یلغاری طاقت یقیناً ختم ہو گئی۔ اس کا آفینس ختم ہو گیا۔ میدان سے اس کے پاؤں نہیں اُکھڑے لیکن مزید آگے بڑھ بھی نہیں سکے۔ اقبالؔ نے وقت کی بہت اہم پکار سُن لی اور اُس پر لبیک کہہ کر آتشِ نمرود میں کود پڑے۔ انھوں نے انسانی تاریخ کی اس دائمی حقیقت کو ثابت کر دیا کہ:

شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

وہ طاؤس و رباب کی ضرورت، اہمیت، زندگی کے ساتھ ان کے ربط و تعلق سے انکار نہیں کرتے۔ یہ انکار نہ ان کے یہاں قولی ہے نہ عملی۔ ہاں قول و عمل دونوں اعتبار سے انھوں نے طاؤس و رباب کو اُن کا صحیح مقام عطا کیا، موزوں، مناسب اور متوازن مقام۔ اسی توازن سے زندگی میں حسن بھی رہتا ہے اور توانائی بھی رہتی ہے۔ لطافت و نزاکت بھی رہتی ہے، صحت و قوت بھی۔ شمشیر کو فن سے علاحدہ کر دیا گیا تھا۔ اِسے کرختگی، سختی اور خشکی کی علامت سمجھا جانے لگا تھا۔ اقبالؔ نے اس کے پیچ و خم، اس کی لچک و مہک سے فن کو پہلی بار روشناس کرایا۔ انھوں نے ثابت کیا کہ یہ فولاد کی طرح سخت بھی ہو سکتی ہے اور ریشم کی طرح نرم بھی۔ یہ سیل تیز و تند بھی ہے اور جوئے نغمہ خواں بھی۔ یہ قاہر و جبّار بھی ہے اور قدّوس و غفّار بھی۔ یہ رونق بزم بھی ہے اور زینتِ رزم بھی۔

اس میں خصوصیتِ فاروقی بھی ہے اور صفتِ صدیقی بھی۔ یہ شمشیر ہی نہیں شاخِ گل بھی ہے۔

یہ تینوں سربراہانِ شعروسخن، فکروفن اپنے اپنے وقت کے امام ہیں۔ حالات اور تقاضے کی پیداوار ہیں۔ میرؔ کے عہد میں کوئی غالبؔ نہیں ہوسکتا تھا۔ اور غالبؔ کے دَور میں کوئی اقبالؔ نہیں ہوسکتا تھا۔ شمعِ عشق نے اپنی آخری بھڑک اور پھڑک میرؔ کے یہاں دِکھائی۔ آخری سنبھالا لیا اور بجھ گئی۔ گویا میرؔ شامِ فراق، صحبتِ شب کی جلی ہوئی شمع ہیں۔ شمعِ عشق بجھی اور عقل کا سویرا ہوا۔ غالبؔ کے یہاں صرف عقل کی مجلس آراستہ ہوئی۔ وہ دَورِ عقل وہوش تھا۔ عشق کا گزر غالبؔ کے یہاں زیبِ داستاں کے لیے ہے جس طرح پچھلے اسٹیج ڈراموں میں کامک کے سین۔ وہ اصل ڈرامے کو تیاری کا وقفہ دیتے تھے۔ اسی طرح غالبؔ کے یہاں عشق کا وجود، عقل کی روشنی اس کے فوکس کو اور تیز کرنے کے لیے ہے۔ غالبؔ کا دور شیشہ بازی کا دَور ہے۔ یہ تہذیبِ نو کی پہلی بیداری کی انگڑائی ہے۔ غالبؔ ہی کی فکر نے فکر سرسیّد کو وجود بخشا اور پھر وہ سب ہوا جن کی پیشین گوئی غالبؔ نے کی تھی کہ:

میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

وہی گلشنِ ناآفریدہ سرزمینِ مشرق پر لہلہاتا ہوا اُگا اور ایک طوفان کھڑا ہوا۔ یہ طوفان کتنی تیزی سے اُٹھا، اس کے نقوش اکبرؔ کے یہاں دیکھئے۔ اور ایشیا میں مغرب سے مشرق تک، جنوب سے شمال تک شیشہ بازی کے کارخانے کھل گئے۔ کتابیں پڑھ کر لوگ باپ کو خبطی سمجھنے لگے۔ میاں بیوی دونوں مہذب بننے لگے۔ بیوی حجاب اٹھاتی گئیں میاں غصہ تھوکنے لگے۔ ترقی کی راہیں زیرِ آسماں نکلنے لگیں۔ میاں مسجد سے نکلنے لگے۔ بیویاں حرم سے نکلنے لگیں۔ سر پہ کُٹ، پاؤں میں بُٹ، جیب میں کاغذ کی گھڑی چلنے لگی۔ لوگ کیک کھانے لگے، سیویوں کا مزا بھولنے لگے۔ عمر ہوٹلوں میں کٹنے لگی اور موت اسپتالوں میں آنے لگی۔ صحنِ گلشن سے بادِ بہار مایوس واپس آنے لگی اس لیے کہ پورے گلشن میں ایک سر بھی آمادۂ سودا نہ رہا۔ ایسی صورتِ حال میں کہ کارگہہ شیشہ گری قدم قدم پر کھلنے لگی، شاعرِ مشرق کو آدابِ جنوں سیکھنا ہی پڑا اور کہنا پڑا کہ:

نہ کر خاراشگافوں سے تقاضہ شیشہ بازی کا

یہ سطریں میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ کے فن سے بحث کی نہیں ہیں بلکہ صرف اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہیں کہ ہر فنکار کا تعلق اس کے فن کے ساتھ مختلف نوعیت کا ہے اور ہوتا ہے۔ انفرادیت

صرف فنکار کے لہجے اور اندازِ بیان سے وجود میں نہیں آتی۔ اس کے تجربات کے مزاج اور نوعیت سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ یہ تجربات کی نوعیت شاعر کے اندروں میں ردِّعمل پیدا کرتی ہے۔ یہ ردِّعمل فن کے ساتھ اس کا تعلق متعین کرتا ہے۔ ربط جتنا واضح، جتنا گہرا ہوگا اس کے فن میں اسی کے بقدر تاثیر اور توانائی پیدا ہوگی۔ یہی چیز عمومیت سے اسے الگ کرے گی اور عام مشابہت میں انفرادیت کا رنگ بھر دے گی۔ یہی داخلی ربط و تعلق سننے والے کی زبان سے یہ کہلواتا ہے کہ یہ فلاں شاعر کا رنگ ہے، یہ فلاں شاعر کا لہجہ ہے، کسی دوسرے کا نہیں ہوسکتا۔ جس طرح ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ عربی ہے، یہ ایرانی ہے، یہ افغانی ہے، یہ افریقی ہے، یہ مصری ہے، یہ ہندوستانی ہے بلکہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بنگالی ہے، یہ آسامی ہے، یہ نیپالی ہے، یہ پنجابی ہے، یہ سرحدی ہے، یہ مدراسی ہے۔ سرزمین کی خصوصیت انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔ اس کا رنگ، اس کا آہنگ بن جاتی ہے۔ اس کی آواز اس کے خدوخال بن جاتی ہے۔ آسامی آسام کی سرزمین ہی کا ہوسکتا ہے بنگالی نہیں ہوسکتا۔ پنجابی مدراسی نہیں ہوسکتا۔ پنجابی مدراسی نہیں ہوسکتا۔ یہ رشتہ اٹوٹ ہوتا ہے۔ اسی طرح فن کا تعلق فنکار سے جب اٹوٹ ہو جاتا ہے تو دونوں میں ایک خون دوڑتا ہے۔ ایک دھڑکن اور نبض کی ایک رفتار بن جاتی ہے۔ دونوں کے خدوخال ایک ہو جاتے ہیں۔ رنگ بھی ایک ہو جاتا ہے، بُو بھی ایک ہو جاتی ہے۔

○

میں نے سب سے پہلی نثری کتاب، مکتب کی نصابی کتابوں کے علاوہ، قصص الانبیا پڑھی جب میں آٹھ سال کا تھا اور سب سے پہلی ادبی کتاب 'فسانۂ خورشیدی' پڑھی، سب سے پہلی نظم 'نورنامہ' جو گھر میں ہر جمعرات کو بعد نماز عشاء خوشبو جلا کر تکیے پر رکھ کر اجتماعی طور پر گھر کا کوئی نوجوان لڑکا یا لڑکی پڑھتی تھی اور ساتھ ساتھ بچّے بھی رہتے تھے۔ میری بڑی بہن محمودہ مرحومہ پڑھتی تھیں اور میں بھی کتاب دیکھ کر آواز میں آواز ملا کر پڑھتا تھا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ سب سے پہلا دیوان میں نے کس کا پڑھا۔ شاید وہ امیرؔ مینائی کا 'صنم خانۂ عشق' تھا۔ میری عمر دس سال تھی اور مکتب میں فارسی کی اونچی کتابیں، انشائے خلیفہ یوسف زُلیخا وغیرہ سبقاً سبقاً اپنے نانا سے پڑھتا تھا۔ میرے خاندان میں گھر میں کوئی شاعر نہ تھا۔ نانا اور ان کے بڑے بھائی یعنی میرے

بڑے نانا بڑے پائے کے فارسی داں تھے۔لیکن جہاں تک مجھے علم ہے وہ شاعر نہ تھے۔میری والدہ کے نانیہالی بزرگوں میں سیّد شاہ محمد نسیم داغؔ کے جیّد شاگرد اور جانشیں تھے۔نواب ڈھاکہ کے استاد تھے۔ بہت پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ میں ان کا نام سنتا تھا، شعر نہیں سنا تھا۔اُن کے چھوٹے بھائیوں حکیم سیّد شاہ ظہیر احسن اور حکیم سیّد شاہ محمد بشیر اکبری کا ذکر میری سوانح ''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی'' میں ہے۔ یہ شاعر باضابطہ نہیں تھے مگر موزوں طبع تھے اور ضرورت اور تقاضے پر فی البدیہہ کہہ دیا کرتے۔مکتبی تعلیم کے دوران ہی میں شعر گنگنانے لگا تھا۔سب سے ابتدائی دَور میں جو میں شعر گنگنایا کرتا تھا، ان میں جو میرے حافظے میں موجود ہیں وہ یہ ہیں:

مسیحا بن کے بیماروں کو کس پر چھوڑ جاتے ہو تسلّی بھی دیئے جاتے ہو دل کو توڑ جاتے ہو

....

شہید ناز کی قسمت میں دُہری مار رکھی ہے کلیجے پر ہے پتھر حلق پر تلوار رکھی ہے

....

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ گھس جانے کے بعد
سرخ رُو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد

یہ اشعار کن کے ہیں شاید اس وقت بھی مجھے معلوم نہ تھا، دوسروں کی زبان سے سن کر مجھے یاد ہو گئے تھے۔مکتب کے دور میں اور بھی بہت اشعار ہر وقت کی گنگناہٹ کے لیے تھے مگر یاد نہیں۔تیلہاڑہ میں شعر وسخن کا کوئی چرچا خاص نہیں تھا۔مولانا عبدالصمد صاحب طپشؔ باضابطہ شاعر تھے۔ بدرؔ آروی مرحوم کے شاگرد تھے۔اُن کی تحریک سے اور معین الدین حیدر صاحب کی تائید اور ترغیب سے کبھی کبھی شاہ عبدالحفیظ صاحب کے یہاں کوئی نشست ہو جاتی تھی۔ شاہ عبدالحفیظ صاحب بھی کچھ کہہ لیتے تھے۔معین الدین حیدر صاحب بھی کچھ اور لوگ دوسروں کی غزلیں پڑھتے تھے یا یونہی تُک بندی کر لیا کرتے تھے۔ مجھے سننے، گنگنانے اور پڑھنے کا شوق تھا۔شعر کہنے کا بالکل شوق نہ تھا۔اُنھیں مجلسوں میں غالباً دوبار طرحی نشستیں ہوئیں اور مجھے وہ دونوں طرحی مصرعے یاد ہیں۔پہلی بار کسی کا مصرع تھا''حباب پھوٹ کے روئے جو تم نہا کے چلے'' کس کا مصرع تھا مجھے یاد نہیں۔دوسری بار ذوقؔ دہلوی کا مصرع تھا''وقت پیری شباب کی باتیں'' مجھے یاد ہے کہ میں نے ہر زمین پر دو دو، چار چار اشعار کہے تھے، پڑھا نہیں۔یاد پہلے بھی نہ تھے اس وقت بھی یاد نہیں۔ دسویں سال یعنی ۱۹۳۴ء میں کلکتہ آ گیا تھا اور آیا جایا کرتا تھا۔یہاں اُردو

رسالوں اور کتابوں کے وسیع مطالعہ کا سامان اور موقع پیدا ہوا۔ کتابیں خریدی گئیں پڑھنے کو لی گئیں، رسالے خوب پڑھے گئے۔ 'نیرنگِ خیال'، 'عالمگیر' وغیرہ میں مطبوعہ غزلیں، رباعیاں خوب یاد ہوئیں اور گنگنائی جانے لگیں۔ امجدؔ حیدرآبادی کی رُباعیاں اُسی دَور سے ذہن میں محفوظ ہیں:

دنیا کی طرف اب جو نہیں دیکھتے ہیں　　ہم زیست کا انجام قریں دیکھتے ہیں
پیری میں نقاہت سے جھکی ہے جو کمر　　مرقد کے لیے اپنی زمیں دیکھتے ہیں

....

کیا بات دمِ اشک فشانی کہیے　　کیا عہدِ گذشتہ کی کہانی کہیے
سر پر دمِ پیری نہیں یہ موئے سپید　　کفنائی ہوئی لاشِ جوانی کہیے

....

اس دَور ہی کے حافظے میں محفوظ چیزیں سنانے لگوں تو ایک چھوٹی سی کتاب ہو جائے۔ میرے بڑے نانا مولوی امیر الدین شاعر نہ تھے مگر شاعری کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے مطالعہ میں ہر وقت نثری اور نظمی تخلیقات رہتیں۔ دراصل مطالعہ کا شوق مجھے انھیں سے حاصل ہوا۔ وہ کلکتہ میں والد کے کاروبار کے انچارج، ذمّہ دار اور مہتمم تھے۔ بس دن بھر صرف کتابیں پڑھا کرتے۔ ملازمین کام کرتے۔ میرا شوقِ مطالعۂ نثر و نظم تیزی سے بڑھنے لگا۔ تقریباً تمام قدیم داستانیں اور تمام اساتذہ کے دیوان پڑھ ڈالے۔ دو سال میں سینکڑوں بڑی چھوٹی پرانی تصنیفات، سینکڑوں نئے ناول اور انگریزی کے تراجم اور سینکڑوں اہم رسالے مطالعہ سے گزر گئے۔ میرے بڑے نانا کبھی ٹوکتے میاں شعر کیوں نہیں کہتے صرف گنگناتے ہو۔ غالباً ۱۹۳۵ء کی بات ہے میں نے ایک باضابطہ اور مکمل غزل کہی اور انھیں پیش کی۔ غزل کا کوئی شعر یاد نہیں۔ ایک مصرع اور مکمل مقطع ذہن میں محفوظ ہے۔

مصرع یہ ہے:　　سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ دل کا ماجرا کیا ہے
اور مقطع:　　تھی فرمائش بزرگوں کی تو کہہ دی یہ غزل عاجزؔ
وگرنہ شاعری کا تجربہ ہم کو بھلا کیا ہے

ممکن ہے اور بھی کوئی غزل کہی ہو۔ مگر غزل کہنے کی خواہش تقاضہ اور شوق کبھی نہیں ہوا۔ میں اب سمجھتا ہوں کہ شاید میرا موضوعِ شعر و سخن کچھ خاص ہونے والا تھا۔ اس لیے اس دور کا رسمی انداز شاعری اختیار کرنے کا تقاضہ دل میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہ عجیب بات تھی۔ اشعار پڑھنے کا بہت

شوق، مجموعوں کے مطالعہ کا بہت شوق، شعر گنگنانے کا بہت شوق، شعر کہنے کی قدرت مگر شعر کہنے کا مطلق شوق نہیں ۔ فرمائشوں پر اشعار کہہ لیے کہہ دیئے۔ مگر اسی طرح جس طرح کوئی بیگار کا کام کرے، پیچھا چھڑانے کے لیے کوئی ڈیوٹی کرے۔

پٹنہ آکر ۱۹۳۸ء میں باضابطہ اسکول کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ ماسٹر نظام الدین بلخی ہیڈ مولوی پٹنہ ہائی اسکول سے کچھ دنوں ٹیوشن پڑھا۔ وہ جغرافیہ بہت اچھا پڑھاتے تھے۔ شعر گوئی اور شعر خوانی میں مست رہتے تھے۔ شاگردوں کو بھی اشعار سنانے کے لیے استعمال کرتے، مگر اُن کی صحبت میں بھی شعر تخلیق کرنے کی لذّت سے آشنائی نہیں ہوئی۔ شعر موزوں کر دیئے، اشعار کہہ دیئے، یوں پھینک دیئے جس طرح کوئی ردّی چیز ٹوکری میں پھینک دی جائے۔ یا دوسروں کو یوں دے دیئے جس طرح خیرات بانٹی جائے۔

انہی آغازِ تعلیم کے دِنوں میرے ایک عزیز یعنی قریبی رشتہ مند نظام الدین ماموں پٹنہ کالج کے طالب العلم تھے۔ نثر کا شوق تھا، شعر بھی کہنا چاہتے تھے۔ کہتے بھی تھے مگر موزوں اور خوش کلام نہیں تھے۔ پٹنہ کالج بزم ادب کے سالانہ جلسوں میں نثری مقابلوں میں شرکت کرتے۔ دو بار انھوں نے مقابلے کی طرح پر غزل لکھوائی، مقابلے میں شامل ہوئے اور اوّل انعام لائے۔ ایک بار کا طرحی مصرع مجھے یاد ہے:

شکن بستر کی کہتی ہے کہ دَم نکلا ہے مشکل سے

یاد رہ جانے کی ایک وجہ اور ہے وہ یہ کہ غزل میں نے اُنھیں لکھ کر دی۔ وہ رمنہ روڈ ایک مکان میں رہتے تھے۔ وہیں پروفیسر عبدالمنان بیدلؔ صاحب کے یہاں ایک اور کہنہ مشق شاعر رہتے تھے۔ پٹنہ کے ارباب شعر وادب کے ذہن میں ان کا نام ہوگا اس لیے میں نام نہیں لوں گا، نظام الدین ماموں نے وہ غزل انھیں دکھا دی کہ میں نے انعامی مقابلے کے لیے لکھی ہے۔ انھوں نے اس میں سے دو شعر کاٹ دیئے کہ یہ اچھے شعر نہیں ہیں۔ اور خود وہ دونوں اشعار مشاعرے میں ہلکی تبدیلی کر کے پڑھ دیئے۔ ممکن ہے توارُد ہوا ہو، مگر ایسی صورت میں ایک نومشق کا لحاظ کر کے خود اپنی غزل سے وہ دونوں اشعار نکال دینے چاہیے تھے۔

اسی دوران بی اِن کالج بزم اُردو کا سالانہ جلسہ ہوا۔ انعامی مقابلوں میں اقبالؔ پر ایک نظم بھی لکھنا تھا۔ پٹنہ میں اُس دَور میں مجھ سے شعر لکھوانے کے ایک زبردست اور مؤثر محرک میرے

ایک رشتہ مند بڑے بھائی کے ساتھی، دوست اور ہم سبق محلّہ پیر بہوڑ کے رہنے والے عبدالخلاق تھے جو اَب کراچی میں رہتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر وہ لیلی کاٹیج میں میرے کمرے میں دھرنا دیتے کہ تمھیں غزل لکھنی ہے یا نظم کہنی ہے اور مقابلے میں شریک ہونا ہے۔ میں انھیں ٹالنے کی بہت کوشش کرتا۔ مگر وہ ایسا جمتے کہ کھانا ناشتہ میرے ساتھ ہی کرکے اپنی ضد پوری ہی کرکے رہتے۔ اُن کا یہی شوق اُن کی یہی ہابی تھی۔ غزل یا نظم مجھ سے لکھوا کر، مقابلے میں پڑھوا کر اور انعام لیتے ہوئے دیکھ کر وہ خوشی سے پھول جاتے۔ اور کئی روز اس کے تذکرے اور اسی کی مسرّت کے اظہار میں گزر جاتے اور اس کے برعکس مجھے کوفت ہوتی، شرمندگی ہوتی، گرانی ہوتی۔ بہرحال بی این کالج کے مقابلے کے لیے مجھ سے اقبالؔ پر نظم لکھوائی گئی جو مسدّس کے چھ سات بند پر مشتمل تھی۔ مجھے اس وقت بہت حافظے پُرزور دینے سے پہلے بند کا شعر اور اس بند کی ٹیپ یاد آرہی ہے:

اقبالؔ اے مفکرِ عالی خیالِ ہند — اے فلسفی اے شاعرِ شیریں مقالِ ہند
تیرے ہی دَم کی روشنی اِس انجمن میں تھی — وہ گُل تھا تُو کہ بُوتری سارے چمن میں تھی

پروفیسر سیّد حسن صاحب صدر شعبۂ اُردو تھے۔ شیروانی پاجامہ ٹوپی میں وہ مقابلے کی تقریب کی نظامت کررہے تھے۔ مجھے اوّل انعام ملا جو خاصہ بڑا کپ تھا۔ اُس دَور میں کپ ملا کرتے تھے۔ اب تو دو چار روپئے کی کتابوں پر ٹرخا دیا جاتا ہے۔

دوسرا واقعہ مجھے یہ یاد ہے کہ انہی دِنوں (یعنی ۱۹۳۸ء-۱۹۳۹ء) پٹنہ کالج بزم ادب کے سالانہ جلسے میں مقابلے کے ایک مصرع طرح پر فی البدیہہ شعر کہنا تھا۔ عبدالخلاق بھائی میرے سر پر سوار ہوگئے۔ میں نے منہ بنایا، کراہنے کی کوشش کی۔ کروٹ تکلیف سے لی کہ طبیعت بہت مضمحل ہے، مگر وہ کسی قیمت پر اپنے ارادے سے باز آنے پر تیار نہ تھے۔ آخر الٹی میٹم دے ہی دیا کہ نہ جاؤ گے تو پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ چنانچہ سہ پہر کو وہ آئے اور ہم دونوں سینیٹ ہال کے اندر داخل ہوئے جہاں بیٹھ کر فی البدیہہ غزل کہنی تھی، مصرع طرح غالبؔ کی غزل کا تھا:

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

پورے ہال میں صرف پانچ چھ اہلِ مقابلہ تھے، صوبے کے مختلف کالجوں سے آئے تھے۔ ایک لڑکے شہاب الدین تھے جن سے میری دُور کی رشتہ داری بھی تھی۔ مجھ سے عمر میں پانچ چھ سال بڑے

تھے اور پٹنہ کالج میں بی اے کے طالب العلم تھے۔ وہ شاعر کی حقیقت سے کالج میں مشہور بھی تھے۔ اب وہ کراچی میں فراغت کی ریٹائرز زندگی گزارر ہے ہیں۔ میرے بہت چاہنے والے ہیں اور بے حد مدّ اح ہیں۔ تو جناب ہم سب نے بیٹھ کر فی البدیہہ غزل کہی۔ فوراً شام کو مشاعرہ ہوا۔ شہاب الدین کو اوّل انعام ملا اور مجھے دوسرا۔ مگر ہر جگہ بات چلی کہ غزل کلیمؔ کی اچھی تھی مگر چونکہ شہاب الدین پٹنہ کالج کے طالب العلم تھے اس لیے ان کی لاج رکھی گئی۔ بہر حال مجھے اس سے غرض نہیں ہے، ایک تاریخی بات عرض کرنی تھی۔ وہ غزل اچھی خاصی مشہور ہوئی۔ شاید کسی اخبار میں شائع بھی ہوئی۔ شائع شدہ غزل کا نقشہ کہ کالم میں کہاں پر غزل تھی اور کتنی جگہ اُسے ملی تھی میری نگاہوں میں ہے مگر پوری غزل یاد نہیں ہے۔ غالبًا دس گیارہ اشعار تھے۔ ایک مطلع ایک شعر اور مقطع یاد ہے۔ اور یاد رہنے کی ایک وجہ خاص یہ ہے کہ موضع ڈیانواں کے مولوی انوار صاحب ایک لیڈر نما مجذوب مجھ سے بہت مانوس تھے۔ کہیں سڑک پر میں نظر آ جاتا تو بڑے تپاک اور توجہ سے ملتے، دعا دیتے۔ دو مرتبہ فتوحہ سے لائٹ ریلوے پر اِنٹر کلاس کے ڈبّے میں تیلہاڑہ جاتے ہوئے اور وہ ڈیانواں کا سفر کرتے ہوئے ہم دونوں ملے اور دونوں بار انھوں نے اور مسافروں کی موجودگی سے بے نیاز کچھ مجھے سنانے کو کہا، کچھ خود لذّت لینے کو یہ مکمل غزل جھوم جھوم کر ہلکے لحن سے پڑھی۔ پہلا مطلع ایک شعر اور مقطع آپ بھی سن لیں:

یوں تو دُنیا میں اور کیا نہ ہوا — ہاں جو اپنا تھا مدّعا نہ ہوا

بام پر وہ جو بے نقاب آئے — سر اُٹھانے کا حوصلہ نہ ہوا

اب تو ہم دَیر کو چلے عاجزؔ — بُت تو ہوں گے اگر خدا نہ ہوا

میرے خیال میں میری زندگی کے آٹھ نو سال گزر چکے ہوں گے جب میں نے پہلا شعر کہا ہوگا۔ واقعی پہلا شعر اور اُس دن کو ۱۹۴۲ء تک پہنچنے میں بھی آٹھ نو سال گزر چکے ہوں گے جب میں بالکل بھول گیا کہ میں نے کبھی شعر کہا ہوگا۔ اُس آٹھ نو سال کی مختصر تفصیل حافظے کی مدد سے پچھلے چند صفحات میں گزری۔ ہوسکتا ہے تفصیل اور بھی طویل ہو۔ دلچسپ ہو۔ اہلِ تحقیق اور تنقید کے لیے مفید ہو، کام کی ہو۔ اتنا دماغ نہیں دل نہیں کہ مراقبہ کروں اور دونوں کے پوشیدہ گوشوں کا حافظے کی روشنی میں جائزہ لوں۔ کاش اس کا موقع ملتا! اپنی تلاش میں نہیں کرسکتا۔ ہاں بغیر تلاش کے جو کچھ جیب میں ہے سامنے رکھ دوں گا۔ اور وہ بھی اتنا ہے کہ مجھے نکالنے کی فرصت

نہیں اور شاید زمانے کو اُن کے چننے، سمیٹنے، گوندھنے، مرتب کرنے کی بھی فرصت نہ ہو۔ اور پھر یہ کہ مجھے فرصت مل بھی جائے اور میں یہ مشقت جھیل بھی لوں، یہ دردِ سَر مول بھی لے لوں، ماتھے کا پسینہ بہاؤں، دل کا رس نکالوں، دماغ کو نچوڑوں، آنکھوں کو عرق عرق، انگلیوں کو لہولہو کروں تو اِن سب کا حاصل کچھ واہ واہ، کچھ ماشاءاللہ، کچھ سبحان اللہ کے الفاظ کے سوا اور کیا ہے؟ کچھ گرمیِ محفل، کچھ ہنگامۂ بزم، کچھ لطفِ صحبت، کچھ ذکرِ خیر، کچھ مذاکرے، کچھ مباحثے، کچھ چائے، کچھ شربت اُس کے بعد سب کچھ اُسی سمت روانہ جس سمت سب کچھ پہلے بھی گیا۔ میرؔ کا بھی گیا، غالبؔ کا بھی گیا، اقبالؔ کا بھی گیا، جگرؔ اور فراقؔ کا بھی گیا۔ ویسے تو سب کچھ اُسی سمت جانا ہی ہے۔ جاتا ہی رہا اور جاتا ہی رہے گا۔ ہمارا بھی جائے گا، ہم بھی جائیں گے، سب کا جائے گا اور سب جائیں گے۔ تو پھر کیا ضرورت ہے؟ کھیت میں گیہوں پیدا ہوتا ہے، چاول اُپجتا ہے، سبزیاں اُگتی ہیں، پھل لگتے ہیں، جانور بھی کھاتے ہیں، انسان بھی کھاتے ہیں، غریب بھی، امیر بھی، شاعر بھی، سامعین بھی، فنکار بھی، غیر فنکار بھی، آہ آہ کرنے والے بھی، واہ واہ کرنے والے بھی،، کھانا اور مرجانا ہی ہے تو کھاؤ، مرجاؤ۔ کیا ضرورت ہے شاعری کی؟ کیا ضرورت ہے فن کی؟ کیا ضرورت ہے دردِ جگر کی؟ دردِ دِل کی سوزِ جگر کی؟ راتوں کو اُٹھ کر رونے کی؟ بیقرار رہنے کی؟ آہ آہ کرنے کی؟:

واللہ کس غضب کے ہو ہنس مکھ دکھائے جاؤ ہم آہ آہ کرتے ہیں تم مسکرائے جاؤ

....

دل تھام کے کروٹ پہ لیے جاؤں ہوں کروٹ وہ آگ لگی ہے کہ بجھائے نہ بنے ہے

....

اُس کو بُجھانا کیوں نہیں آتا جس کو لگانا آئے ہے

دل تھامے کروٹ لے لے کر تڑپوں ہوں اور سوچوں ہوں

چنانچہ میں نے اکثر یہ بات سوچی اور سوچ کر فیصلہ کیا قلم رکھ دوں، فکر چھوڑ دوں سلسلۂ دردِ محبت توڑ دوں۔ شادؔ نے پہلے ہی مشورہ دیا تھا:

یہاں نہ نشو ونما کا حاصل نہ کوئی ثمرہ ہے رنگ و بُو کا

ہنسو گے خود اس چمن پہ غنچو زمانہ آلے ذرا نمو کا

۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۲ء تک سولہ سترہ سال گزرے۔ ساٹن کی لنگی، جاپانی کریپ کی گنجی، ولایتی

ململ کا کُرتا، انگلش لٹھّے کا پاجامہ، وارنش کا جوتا، جاپانی سِلک یا انگلش سرج کی شیروانی، عُنّابی ترکی یا سیاہ مخمل کی ٹوپی، جیب میں گھڑی، آنکھوں میں فراغت کی چمک، ہونٹوں پر فرحت کی مسکراہٹ —— یہ وقت تھا شاعری کا، مستی کا، مسرت کا، سرشاری کا، داغؔ کی طرح کسی معشوق سے چھیڑ چھاڑ کا، محفل آرائی کا، ساز و آواز کا، بادہ و مینا کا، رنگ و نکہت کا، بادِ بہاری کا، عروسِ گل کی سواری کا۔ اُس وقت بادِ بہاری کھڑی بھی تھی، ساون کی جھڑی بھی تھی۔ جامن کے، بیر کے، سنگر ہار کے درخت بھی تھے، شاخوں میں جھولے بھی تھے، اپنے گھر ہی کے سہی، بستی اور محلّے کے ہی سہی تاج و تخت تھے۔ امیر حمزہ کی داستان بھی تھی، خلیفہ ہارون رشید کی کہانی بھی تھی، وزیر جعفر اور خواجہ مسرور کی صحبت بھی تھی، پانکڑ کا سایہ بھی تھا۔ عید، شب برأت اور محرم کا سرمایہ بھی تھا۔ جھومر بھی تھا، گیت بھی تھے۔ سامنے کھیتوں میں ہریالی بھی تھی، اُفق پر شفق کی لالی بھی تھی۔ ہارمونیم، بینجو، وائلن، غفور خاں کی گندھاری اساوری، بھیروی شام کلیان۔ رات کی رانی کی خوشبو۔ سخیا کی مہین آواز، ظفرؔ کی غزل۔ یہ سب کچھ تھا۔ اس وقت شاعری چولھے بھاڑ میں تھی، ردّی کے ٹوکرے میں تھی۔ آج یہ سب کچھ نہیں تو شاعری گلے پڑی ہے کیا لینے کو؟

تیرے آستاں کو بھی رنگ دوں تیری داستاں کو بھی رنگ دوں
میرے پاس خونِ جگر تو ہے مگر اتنا خونِ جگر نہیں

تو میں نے جو پہلی غزل لکھی تھی جس کا صرف ایک مصرع حافظے میں محفوظ رہا:

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ دل کا ماجرا کیا ہے

یہ آواز اَڑتالیس سال پہلے میرے دل سے غیر شعوری طور پر نکلی تھی اور آج اتنی مدّت گزر جانے کے بعد شعور کی بلوغت کے بعد بھی دل سے یہی پوچھ رہا ہوں کہ تیرا ماجرا کیا ہے؟ یہی مجھے سوچنا ہے اور سمجھنا ہے۔ شاعر ہونے کی صفت کی موجودگی میں شاعری سے گویا نفرت، لیکن تیلیا ہاڑہ کے پُل پر بیٹھ کر تنہائی میں اشعار گنگنانا اور گنگناتے ہوئے آنکھوں سے آنسو کے قطروں کا نکل جانا۔ گھر سے جدا ہو کر دُور کے سفر پر جانے کے قریب دنوں میں نجّو نانا کے بنگلہ پر ان کے اور ان کے صاحبزدگان نصیر ماموں اور شبیر ماموں اور چمرو ماموں کے اصرار پر پلنگ کی پائینتی پر بیٹھے ہوئے ملہار گانا، سب کا دم بخود ہو کر سننا، جمعراتی اور بادشاہی سبزی فروش کا کنویں سے پٹونی کا کام چھوڑ کر بنگلے کے پھاٹک پر کھنچ آنا اور پھر میرا ملہار ختم کر کے مسکرانا اور نصیر ماموں کو یوں ہنستے ہوئے

کہ بھر منہ پان کے قطرے سفید کُرتے پر گرنے لگیں کہنا کہ میاں کلیم تم جاؤ گے تو پھر گیت اور ملہار کون سنائے گا۔ اور میرا جواب دینا کہ پھر میں آؤں گا تو سناؤں گا۔ اور اُس دن کا پھر کبھی نہ آنا۔ یہ سب پہلے کون جانتا تھا۔ بے چارے دل نے بجا کہا، صحیح کہا، سچ کہا:

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ دل کا ماجرا کیا ہے

شاعری سے آٹھ سال صبح وشام کی رفاقت رہی۔ پڑھنے سے محبت رہی، کہنے سے عداوت رہی لیکن عداوت کے باوجود شاعری سے قربت رہی، رفاقت رہی، دوست کہلواتے رہے، بزرگ اور مہربان غزلیں لکھواتے رہے، اپنی دلچسپی کا سامان مہیّا فرماتے رہے۔ پڑھ کر، سن کر سر دُھنتے رہے، مسکراتے رہے۔ میری گرانی اور بدمزگی کو خیال میں نہ لاتے رہے۔ سمجھتے رہے کہ آج بدشوقی ہے کل شوق اُبھر آئے گا پھر مجلس گرم ہوا کرے گی۔ یہاں تک کہ میں نے شاندار طریقے پر میٹرک پاس کرلیا۔ پٹنہ کالج میں اعزاز کے ساتھ داخلہ ہوگیا اور اس اعزاز پر بیٹا مغرور نہ ہوجائے میرے باپ نے اپنے ملنے والوں کے سامنے مجھ سے اپنا حقہ تازہ کروایا۔ چلم پر تمبا کو رکھوا کر ٹکیا سجانے کو کہا۔ پھر ایک ٹکیے کو ماچس سے سلگا کر چلم منہ سے اتنی دیر پھنکوایا کہ چلم کے ٹکیے بھی لہکنے لگے اور چہرہ بھی دہکنے لگا۔ اور میرے باپ نے مجھ سے چلم لیتے ہوئے یہ کہا کہ میاں کلیم یہ نہ سمجھو کہ میں تو میٹرک پاس کرگیا اور پورے صوبے میں پانچویں پوزیشن حاصل کی۔ بلکہ یہ سمجھو کہ مجھے تو ابھی تک حقہ بھرنا اور چلم تیار کرنا بھی نہیں آتا۔ اور یہ بات میرے باپ نے سچ کہی، گرچہ میرا باپ نہ ماہرِ نفسیات تھا، نہ فلسفی تھا، نہ زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ مگر باپ تھا اور بہترین باپ تھا اور میری خوب ٹھکائی اور پٹائی کرتا تھا۔ چنانچہ اسی کے بعد میرا باپ بیمار پڑا اور اس کا یہ نالائق بیٹا کالج چھوڑ کر اور اشعار کہلوانے والے دوستوں کو چھوڑ کر رسالوں، کتابوں، داستانوں کو چھوڑ کر سب کچھ ترک کر کے اس کی تیمارداری میں لگ گیا یہاں تک کہ وہ قبر میں چلا گیا۔ اور پھر آٹھ برس تک نہ کلیم کو کلیم یاد رہا، نہ کالج یاد رہا نہ شاعری نہ شاعری کے سامان، نہ کتابیں، نہ رسالے یاد رہے، نہ شعر کہنا یاد رہا۔ بھائی بیمار ہوا اور تین سال اُس کو لیے لیے پھرا اور اُسے بھی زیرِ زمیں پہنچایا۔ ۱۶؍اگست ۱۹۴۶ء کو اُسے دفن کیا۔ آنسو بھی نہ سوکھنے پائے تھے کہ تین ماہ کے اندر اندر:

ہم رہے تو کیا رہے ہم ہیں کس شمار میں
قافلے کا قافلہ لُٹ گیا بہار میں

اور لُٹا تو ایسا لُٹا کہ:

غبارِ کارواں سے کارواں کو ہم نے پہچانا
جہاں تھی شمع روشن اُڑ رہی تھی خاکِ پروانہ

وہ خاکِ پروانہ شاید میں ہی تھا۔ یہ خاکِ پروانہ واقعی اُڑتی رہی۔ شمع کی تلاش میں نہیں، لٹے ہوئے کارواں کی جستجو میں نہیں۔ شمع تو بجھ چکی، کارواں تو لٹ چکا، سوال یہ تھا کہ خاکسترِ پروانہ جائے کہاں؟ کیا اس کا مقدر، اس کا مقصود بھی یہی تھا کہ ہوا کے دوش پر اُڑتی رہتی اور پھر تلوؤں کے نیچے والی خاک کا حصہ بن کر کارواں اور چراغِ کارواں کو بھی اپنے ساتھ دفن کرے؟ پھر یہ بات کیسے ہوتی:

اُڑ اُڑکر یہ خاکسترِ پروانہ کہتی ہے
کرکے بھی دِکھا دے ہے جو دیوانہ کہے ہے

دیوانہ کیا کہتا ہے؟ دیوانے کو کیا کہنا تھا؟

اُسی سے تم کسی کی زُلف کی روداد سن لینا
اُدھر دیکھو وہ دیوانہ چلا آتا ہے آنے دو

یہ سفر آٹھ سال میں طے ہوا۔ مقتل سے محفل تک پہنچنے میں آٹھ سال لگ گئے۔ چھ سات سال تک خوب سبق پڑھایا گیا۔ دیکھو تنہائیوں میں گنگنایا یوں جاتا ہے۔ بے سبب آنسو بہایا یوں جاتا ہے، اور پھر آنسو پونچھ کر مسکرایا یوں جاتا ہے۔ وقت نے ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک تو کچھ سوچنے ہی نہیں دیا، کسی طرف دیکھنے ہی نہیں دیا بس مسلسل تیر تھے جو دل کو چھیدتے رہے۔ جس طرح ماں دودھ پیتے بچّے کو سینے سے سٹائے بھاگی پھرتی ہو۔ میں دل کو بچانے کے لیے اِس کروٹ بیٹھتا رہا، اُس کروٹ لیٹتا رہا۔ اُکڑوں ہوتا، اوندھ جاتا مگر چوٹ مسلسل آتی رہی، زخم پے درپے لگتے رہے، اِس سوراخ کو تھاما تو اُدھر سے لہو نکلا، اِدھر دبایا تو اُدھر سے خون کی دھار نکلی۔ آخر یہ حال ہوا کہ حال بتانے کے قابل نہ رہا:

مجھ سے نہ پوچھ حالِ دل اب قابلِ بیاں نہیں
زخم کدھر کدھر نہیں درد کہاں کہاں نہیں

اور پھر ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک سوائے سوچنے اور خلا میں دیکھنے کے کوئی کام ہی نہ رہا۔ بس بیٹھے

ہیں تو بیٹھے ہیں، کھڑے ہیں تو کھڑے ہیں:

غربت میں وطن کا جو کبھی نام لیا ہے
وہ چوٹ لگی ہے کہ جگر تھام لیا ہے

اور نام تو بار بار آتا رہا۔محفلوں میں، خلوتوں میں وہی تذکرے تھے۔کہاں کا پڑھنا، کہاں کا مطالعہ، کیسی شاعری اور کیسا دھندا۔ ذہن کے گوشے میں کہیں احساس بھی نہ تھا کہ کبھی شاعری سے عملی یا ذہنی تعلق بھی رہا ہے۔جتنی کتابیں تھیں جل کر خاک ہوئیں یا سڑگل کر پھینک دی گئیں یا کہیں چولھے میں جھونک دی گئی ہوں گی۔گھر والے رہے نہ گھر کا اثاثہ رہا، ہاں داغِ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی شمع کی طرح گھر رہ گیا۔وہی میری شاعری کا شامیانہ، کا خانہ اور سرچشمہ بنا، اسی نے حقیقت کو افسانہ بن جانے سے بچایا، وہی روایات کا امین، وہی میری لائبریری میرا دارالمطالعہ بلکہ میرا مدرسہ، میری جائے مراقبہ، مری شاعری کا گدام اور اسٹور روم بنا:

اب کے پھر برسات میں گنجِ شہیداں پر چلیں
آسماں روئے گا اور اپنی غزل گائیں گے ہم

وہی میرا کلاس روم، میرا کالج، میری یونیورسٹی، اسی نے مجھے ڈگری دی، مجھے آنر دیا۔سالوں سال سے میں سبق لے رہا ہوں، ہر سال امتحان دے رہا ہوں اور ہر سال ڈگری لے رہا ہوں، پینتیس سال ہو گئے بس پڑھے جا رہا ہوں۔امتحان دیئے جا رہا ہوں، ڈگریاں لیے جا رہا ہوں، اس کے علاوہ نہ کوئی میرا اسکول، نہ اس کے علاوہ میرا کوئی استاد، نہ میرا کوئی نصاب ہے۔حالانکہ تمام نصاب تبدیل ہو رہے ہیں، ہوتے رہے ہیں۔دکن اسکول، دہلی اسکول، لکھنؤ اسکول، عظیم آباد اسکول، پھر میؔر اسکول، غالبؔ اسکول، ناسخؔ اسکول، آتشؔ اسکول، شاؔد اسکول، داغؔ اسکول، اقبالؔ اسکول، ترقی پسند اسکول، جدیدیت اسکول اور خدا جانے کتنے کتنے کیا کیا اسکول۔دبستان بدلتے رہے، حلقے بدلتے رہے، نصاب بدلتے رہے، نظریے بدلتے رہے اور لوگ جوق در جوق ایک نصاب سے دوسرے نصاب میں، ایک رنگ سے دوسرے رنگ میں جاتے رہے۔میرے بہت سے معاصرین اور سینئر ساتھی قدیم سے جدید اسکول میں آئے، پھر جدیدیت میں آ گئے۔لیکن:

نکل کے انجمنِ عشق سے کہاں جاؤں
مجھے تو ہے بس اسی گھر کا راستہ معلوم

مجھے تو آج تک نہ کوئی دوسرا راستہ نظر آیا، نہ کوئی دوسری منزل، نہ کوئی دوسری چال آئی، نہ کبھی توشۂ سفر بدلا، نہ اندازِ سفر بدلا، نہ ارادۂ سفر بدلا، نہ سامانِ سفر۔ 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کی پہلی غزل لیجیے اور 'جب فصلِ بہاراں آئی تھی' کی آخری غزل اُٹھائیے۔ آپ کو ایسا لگے گا کہ مصوّر نے قلم اُٹھایا ہے اور اس کے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے۔ اُس نے تصویر بنانے کی کوشش کی ہے اور جتنا بنایا ہے سب جانا پہچانا نظر آتا ہے۔ پاؤں کے ناخن سے پیشانی کے بال تک جتنا بھی بنا ہے سب کچھ پہچانے ہوئے محبوب کے کفِ دست و کفِ پا، زانو و کمر، شانے و بازو، زُلف و دوش، خدوخال، چشم و ابرو، لب و عارض ہیں لیکن ان سب میں ابھی کیا کیا اضافہ ہوگا۔ ایک ایک عضو سے ابھی کیا کیا جلوے اُبھریں گے۔ انگلیاں اور ان کے پور، چٹکی اور تو ندی، انگلیوں کے خم اور لچک، کلائیاں اور کہنیاں، ساق اور ایڑی، شکم اور سینہ، گردن اور ٹھوڑی اور چہرے کی لامحدود دُنیا سے ابھی کیا کیا جادو جاگیں گے، کیسے کیسے رنگ نکھریں گے نہیں کہا جا سکتا۔ نہ بنانے والے کو خبر ہے، نہ دیکھنے والوں کو اندازہ، بس بنانے کا عمل جاری ہے۔ اس پیکر کے آگے پیچھے، اَغل بغل، اوپر نیچے کیسی زمین ہے، کیسا آسمان ہے، کیسی ہوا ہے، کیسی دُھوپ ہے۔ کیسی ٹھنڈک ہے، کیسی گرمی ہے۔ گرمی کب سردی بن جاتی ہے، سردی کب گرمی بن جاتی ہے۔ کب خزاں ہے، کب بہار آتی ہے، ہوا تیز ہے یا دھیمی۔ ان باتوں کی طرف مصوّر کا دھیان ہی نہیں۔ لوگ کیا کہہ رہے ہیں، تماش بین کیا سوچ رہے ہیں، زمانہ کیا کہہ رہا ہے، دنیا کیا چاہ رہی ہے۔ عالم کیا تقاضہ کر رہا ہے۔ آسمان کی گردش کیا ہے، زمین کی چال کیا ہے۔ مصور ان تمام باتوں سے بے نیاز ہے:

کب دیکھئے تیار ہو ہم خونِ جگر سے
اِک شوخ کی تصویر بنانے میں لگے ہیں

ابتدا سے ایک ہی اُٹھان ہے، ایک رفتار ہے اور ایک ہی منزل ہے۔ راستہ بنا ہوا نہیں ہے، بنتا جا رہا ہے۔ منزل کا تعین ہے مگر راستہ خود بنانا پڑ رہا ہے۔ لوگ شاید اس بات کو نہ مانیں وہ تسلیم نہ کریں اور کہہ اُٹھیں کہ راستہ بھی تو بنا ہوا ہے۔ وہی میرؔ و مومنؔ والا راستہ، کلاسیکل راستہ، لیکن یہ ان کا مغالطہ ہے اور چشمِ باریک میں کمی کی علامت ہے۔ راستہ بنا ہوا نہیں ہے، یہی دھوکہ بعضوں کو شادؔ عظیم آبادی کے کلام پر بھی ہوا تھا۔ شادؔ کے یہاں بھی منزل متعین تھی۔ راستہ خود ان کا تعمیر

کردہ ہے۔ میں نے بھی راستہ الگ بنایا ہے۔ یہ شادؔ کا راستہ بھی نہیں ہے۔ راستہ سب مٹّی کا، اینٹ کا، کنکریٹ کا، کولتار کا ہی بنتا ہے۔ مگر پٹنہ کی سڑکیں کچھ اور ہیں، دہلی کی کچھ اور، کراچی کی کچھ اور، جدّہ کی کچھ اور، شکاگو اور واشنگٹن کی کچھ اور۔ شاعری کا راستہ الفاظ سے ہی بنتا ہے۔ اینٹ اور مٹّی، کنکریٹ اور کولتار سیمنٹ اور بالو کی کمی بیشی اور فرق آمیزش کے علاوہ راستہ کوٹنے کے اوزار اور مشین کے فرق سے بھی تعمیر میں فرق ہوتا ہے۔ زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ منزل کے فرق سے بھی راستہ کا فرق پیدا ہوتا ہے۔ میدان کے راستے کچھ اور نوعیت کے ہوتے ہیں ریگستان کے کچھ اور۔ کہاں جانا ہے۔ یہ بھی راستے کے فرق کو بتاتا ہے۔ میری جو منزل ہے وہ منزل کسی اور شاعر کی نہیں۔ اور منزل سے میرا جو ربط ہے کسی اور کا نہیں۔ سڑک سب ہی کہی جاتی ہے۔ کوئی سیدھی جاتی ہے، کوئی گھومتی ہوئی جاتی ہے، کوئی اُٹھتی گرتی ہوئی جاتی ہے، کوئی پیچ وخم کھاتی ہوئی جاتی ہے کوئی دُھوپ ہی دُھوپ میں گزرتی ہوئی، کوئی سائے ہی سائے جاتی ہے۔ کوئی چکنی ہوتی ہے، کوئی کھردری، کوئی سیاہ، کوئی سفید، کوئی سُرخ، کوئی سطحِ زمین کے برابر، کوئی اونچی۔ سب سڑک ہی کہی جاتی ہے۔ منزل سے ملانے والی سڑک میں بھی بناتا ہوا جارہا ہوں:

گزرا ہوں کہیں اور گزرنا ہے کہیں اور
صحرا کو مری لغزشِ پا یاد رہے گی

یہ اس لیے ہوتا ہے کہ میں خود نہیں گزرتا مجھے گزارا جاتا ہے۔ میں خود نہیں چلتا چلایا جاتا ہوں۔ شاعری سے میرا تعلق نہ شراب کا ہے، نہ خمار کا نشہ، نہ کھلونے کا نہ تلوار کا۔ شاعری سے میرا تعلق ہے دوست کا، محبوب کا، یار کا، ہم نشیں وہمراز کا، مونس وغمگسار کا، رفیق کا، شریکِ حال کا، شریک کار کا، آ گاہِ رموز کا، واقفِ اسرار کا۔ مجھے ہر زمانے میں سکھانے پڑھانے والے، بتانے چلانے والے، سنانے دِکھانے والے کی ضرورت رہی اور میں مان کر چلنے والا رہا۔ جس کی مانی اسی کی مانتا رہا۔ کسی دوسرے کی نہیں مانی۔ منوانے والے بہت آئے، اپنی اپنی چمک دکھانے والے۔ بہکانے والے بہت آئے۔ کلکتہ میں رہا، پٹنہ میں رہا، ہجوم میں رہا، بھیڑ میں رہا، طوفانوں میں رہا، سیلابوں میں رہا۔ کتنے ہجوم میں گم ہو گئے، بھیڑ میں کھو گئے، طوفانوں میں اُڑ گئے، سیلابوں میں بہہ گئے۔ بزرگوں کی آنکھوں نے خیالوں نے خوابوں نے اشاروں نے ان کی خوشبوؤں نے

ایسا مست رکھا، سنبھالے رکھا۔ اُن کی محبت نے، روحانیت نے، ارادت نے، عقیدت نے ایسا تندرست رکھا، ایسا توانا رکھا کہ طوفانِ بادِ نسیم بن گئے، سیلاب جوئے نغمہ خواں بن گئے۔ بجائے تخریب کے تعمیر کر گئے۔ اخبار، رسالے، کتابیں، ساز، موسیقی، تھیٹر، سینما آج کل تخریب کے اسباب ہیں، سامان ہیں، اڈّے ہیں۔ بزرگوں کی چشم وابرو نے ایسا درس دیا، ایسا پروان چڑھایا، ایسا سانچے میں ڈھالا کہ یہ تخریب کے سامان اور برائیوں کے اڈّے میرے سنوار بناؤ کے آلے بن گئے، میرے رکھوالے بن گئے۔ وقت نے سب چھین لیا۔ محبت والے روحانیت والے، ارادت وعقیدت والے، چشم وابرو کے سائے میں پروان چڑھانے والے، نشو ونما بخشنے والے یک بیک سب چلے گئے، سب جدا ہو گئے چھوڑ گئے، دفن ہو گئے قتل گاہ میں، قبرستان میں، چیخنے کو، پکارنے کو، رونے کو، آواز دینے کو، گریباں چاک کرنے کو، خاک اُڑانے کو، زندگی بھر جستجو کرنے کو، ڈھونڈھنے کو، کائنات کے گوشے گوشے میں جھانکنے کو میری ذات تنہا رہ گئی۔ قریب تھا کہ چیختے، چلاّتے، پکارتے، روتے خاک اُڑاتے میں بھی دیوانہ ہو کر ہو کر ہوش کھو بیٹھتا، سب کچھ بھول جاتا، خود کو بھی فراموش کر جاتا کہ کسی گوشے سے کسی کنج سے نکل کر لالہ وگل کی طرح کسی زمین سے نمایاں ہو کر یا بارانِ رحمت کے کسی قطرے میں ٹپک کر شاعری نے مسکرا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ کہاں جا رہے ہو؟ کیا خاک اُڑا رہے ہو؟ آؤ میرے ساتھ آؤ۔ آؤ میری بغل میں ہاتھ دو۔ میرے شانے کا سہارا لو۔ آؤ میں راستہ دِکھاتی ہوں، منزل بتاتی ہوں۔ بزرگوں کی، سرپرستوں کی، دردوالوں کی۔ نگاہوں نے جو دیا۔ وہ سب ضائع ہو جاتا، برباد ہو جاتا اگر اس سرمائے کو استعمال کرنے کا وسیلہ وذریعہ مجھے نہیں ملتا۔ پھر یہ شکایت رہ جاتی کہ دینے والوں نے حفاظت کا سامان کیوں نہ کیا، حفاظت کا سامان نہ تھا تو دیا کیوں۔ اپنے ساتھ سمیٹ کر لے جاتے۔ شاعری اس سرمائے کی امانت دار بن گئی۔ ان بزرگوں، دردمندوں، عاشقوں، چاک دِلوں کی زندہ جاوید روح بن کر میری حیات میں سما گئی۔ یہ میری سب کچھ ہے اور میرے بچے کھچے لٹے پٹے سرمائے کی محافظ ونگہبان بھی ہے۔ میں ان جانے والوں کی کمی شدّت سے محسوس کرتا ہوں تو اس کی بغل میں آجاتا ہوں پھر میری روح اسی سرشاری اور مستی سے گداز اور سوز سے آشنا ہو جاتی ہے جو اُن کی صحبتوں میں، آغوش میں، سائے میں، مجھے نصیب ہو جاتا تھا اور اس سرشاری اور مستی میں بلا وجہ رو دیتا تھا اور رونے کے بعد ایک عالمِ سرور میں ہلکا پھلکا ہو کر اُٹھتا تھا۔

پینتیس سال سے شاعری میرے درد کا مداوا، میرے زخموں کا مرہم، میری حیات کی رونق، میرے حضر کی رفیق، میرے سفر کی شریک، میرے راستے کی روشنی، میری شب تاریک کی چاندنی، میری منزل کی قندیل، میرے دشمن کے مقابلے میں ہتھیار بن کر میرے ساتھ ہے۔ مجھے کہاں جانا ہے وہاں پہنچا دیتی ہے، جہاں نہیں جانا ہے وہاں سے روک دیتی ہے۔ میرا قلم کیسے چلے بتا دیتی ہے۔ کیا لکھے سمجھا دیتی ہے۔ کیا دیکھنا ہے دِکھا دیتی ہے۔ تصویر میں کیا کیا رنگ چاہیے منگا دیتی ہے۔ پینتیس سال سے اس وقت تک میری شاعری نے مجھے دھوکا نہ دیا۔ نقل واصل رُوپ بہروپ کھڑا کھوٹا سب سمجھا دیتی ہے جتنا کہنا ہے اُس سے فاضل نہیں کہنے دیتی ہے۔ رنگ ڈھنگ آہنگ سب کچھ یہی دیتی ہے۔ کہیں جانے کی کسی طرف دیکھنے کی مجھے ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ شاعری بالکل میری ماں بن گئی ہے۔ اس کی آغوش میں مجھے ہفت اقلیم میں سے کسی چیز کی احتیاج نہیں رہتی۔ میں غنی سیر اور آسودہ ہو جاتا ہوں۔ سیراب وشگفتہ ہو جاتا ہوں۔ میری ماں کی بیقرار روح میری شاعری میں سما گئی ہے۔ آپ سمجھ گئے؟ شاعری سے میرا تعلق کیا ہے، کیسا ہے، کس نوعیت کا ہے۔

خدا نے خدا کے دین نے، مذہب نے جن جن کا احترام لازمی قرار دیا ہے اُن کے بعد کسی کا احترام میری نگاہ میں ہے تو وہ میری شاعری ہے۔ میری نگاہ میں میری شاعری کی بڑی اہمیت، بڑی عظمت ہے۔ جب میں کیفِ شاعری میں ہوتا ہوں تو دُنیا کی ہر چیز ہیچ ہو جاتی ہے، ہر لذّت فراموش ہو جاتی ہے، ہر نشہ اُتر جاتا ہے اور شاعری کا نشہ چڑھ جاتا ہے۔

کچھ احباب کا تقاضہ ہے کہ شاعری کا سبب تو سمجھا چکے۔ مناسب ہے اور ضروری ہے کہ اپنے اس دوسرے مجموعے کے دیباچے میں اپنی شاعری بھی سمجھاؤ۔ یہ تو سمجھتے ہیں کہ تم نے شاعری میں اپنا دُکھ درد چھپایا ہے لیکن جو چھپایا ہے اُسے کھول کر دکھاؤ۔ کیا ایسا ہے کہ جس طرح میرؔ کی دلّی لٹی تو وہ اپنی لٹی ہوئی دلّی کو لیے پھرتے ہیں:

دل وہ نگر نہیں جو پھر آباد ہو سکے　　پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اُجاڑ کے

……………

دل کی بربادی کا کیا مذکور ہے　　یہ نگر سو مرتبہ لُوٹا گیا

……………

دیدنی ہے شکستگی دل کی　　کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

……………

اب خرابہ ہوا جہاں آباد ‏ پہلے یاں ہر قدم پہ اِک گھر تھا

....

سرسری تم جہاں سے گزرے ‏ ہر قدم یاں جہانِ دیگر تھا

....

جہاں اب خارزاریں ہوگئی ہیں ‏ وہیں اکثر بہاریں ہوگئی ہیں

....

لٹا جاتا ہے شہرِ عشق کے گرد ‏ مزاریں ہی مزاریں ہوگئی ہیں

....

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے ‏ جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

....

مرثیے دل کے بہت کہہ دیئے ہیں اُس نے
شہر دلّی میں ہے سب پاس نشانی اس کی

یہ سب دلّی کی داستان ہے، کچھ دُھوپ میں کچھ چھاؤں میں، کچھ کہی ہوئی کچھ بے کہی ہوئی ہے، تم بھی کہتے ہو:

غبارِ کارواں سے کارواں کو ہم نے پہچانا ‏ جہاں تھی شمع روشن اُڑ رہی ہے خاک پروانہ
مجھے تشنہ لبوں کی یاد مئے پینے نہیں دیتی ‏ اُٹھاتا جارہا ہوں ٹوٹتا جاتا ہے پیمانہ

....

کوئی گلشن ہی نہ تھا میرے گلشن کا جواب ‏ اب یہ سنتے ہیں کہ ایسا کوئی ویرانہ نہیں
ایسا بھی کوئی قافلہ دیکھا ہے آپ نے ‏ جو موسم بہار میں گلزار سے چلے؟

....

شکستِ جام کو ساقی شکستِ دل سے کیا نسبت
ترا اِک آئینہ ٹوٹا ہمارا آئینہ خانہ

....

زہرِ غم سے نہیں انکار کہ پینا ہے یہی ‏ ہم غریبوں کا تو مرنا یہی جینا ہے یہی
شہر میں ہر در و دیوار پہ روشن ہیں چراغ ‏ مرا گھر جس میں جلا تھا وہ مہینہ ہے یہی

....

ایسی بہار آئی کہ اب کے بہار میں ‏ سایہ نہیں کسی شجرِ سایہ دار میں
ہیں ایک ہی چمن میں مگر فرق ہے بہت ‏ اُن کی بہار اور ہماری بہار میں

....

جدا دیوانہ پن اب ایسے دیوانے سے کیا ہوگا
مجھے کیوں لوگ سمجھاتے ہیں سمجھانے سے کیا ہوگا
سلگنا اور شئے ہے جل کے مرجانے سے کیا ہوگا
جو ہم سے ہورہا ہے کام پروانے سے کیا ہوگا

....

وہ تو کہیے ہم نے رکھ لی آشیانے کے لیے
ورنہ اتنی آگ کافی تھی زمانے کے لیے
بڑھ کے خود کانٹوں پہ رکھ دیں ہم نے اپنی انگلیاں
اُس سراپا ناز کا دامن بچانے کے لیے

....

پھول کھلے کھل کر مُرجھائے
رہ گئے ہم دامن پھیلائے
میرا لہو اُن کے کام آئے
کس کی دولت کون لٹائے

....

میں نگاہِ باغباں میں کوئی اور ہوگیا ہوں
ابھی چار دن ہوئے ہیں کہ جلا ہے آشیانہ
تجھے اے غمِ محبت اِدھر آ گلے لگالوں
نہ ترا کہیں گزر ہے نہ مرا کہیں ٹھکانہ

....

یہ سب تیلہاڑہ ہے.... یہ سب نوحۂ وطن ہے.... یہ سب غمِ خانماں خرابی ہے.... یہ سب آمد قصۂ آمدِ فصلِ بہاری ہے.... یہ سب داستانِ جشنِ آزادی ہے۔ یہ سب تاریخ کا ایک ورق ہے جس سے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ نئے آفتاب کی نئی کرن کا فسانہ ہے۔ ایک نئے سورج کی کرن جس کی سُرخی اب تک سفیدی سے نہیں بدلی ہے۔ ہم بہت دیر سے اُفق کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ چالیس سال ہونے والے ہیں دائرہ اب تک سُرخ ہے۔ نہ سورج بلند ہوتا ہے نہ ڈوبتا ہے۔

لیکن کیا سب کچھ یہی ہے؟ بس ایک ہی قصہ ہے؟ ایک ہی داستان ہے؟ نہیں صاحب نئی نئی کہانیاں ہیں۔ کہانی شروع تو اسی طرح ہوتی ہے جو آپ نے اوپر پڑھی۔ شکستہ آتش دیدہ، درودیوار خاک وخون آلودہ، چہرے خاکستر آلودہ لاشیں....اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ دیر تک یہی منظر چھایا رہا پھر نظر آگے بڑھی تو دوسرا منظر تھا۔ ہڈّیاں چن کر دیوار کھڑی کی جارہی تھی، خون کی پچکاری ہورہی تھی۔ لب ورخسار سے نقوش بنائے جارہے تھے۔ اشکوں سے رنگ سازی ہورہی تھی، خونِ ناب سے شیشے لبالب تھے، نئی بہار کی چھاؤں میں زخموں کے پیالے چھلک رہے تھے، لاشوں پر نئے شیش محل اور قیصر باغ تعمیر ہورہے تھے:

آنسوؤں کی مئے بنی زخموں کا پیمانہ بنا
سینکڑوں میخانے اُجڑے ایک میخانہ بنا
شاخِ گل کی چھاؤں میں گلچیں ہے اب آرام سے
دشمنِ خانہ ہی آخر صاحبِ خانہ بنا

ہوشیاروں کو نہیں معلوم رازِ فصلِ گل مجھ سے پوچھو میں اسی موسم میں دیوانہ بنا
میکشوں کی قدر کر ساقی کہ ان کے واسطے سنگ سے شیشہ بنا شیشے سے پیمانہ بنا
ہم تو شاعر ہیں ہمارا درد چھپ سکتا نہیں جو غزل میں کہہ دیا ہم نے وہ افسانہ بنا

یہ غزل ۲۶/جنوری ۱۹۶۱ء کو پہلی بار لال قلعہ کے جشنِ آزادی کے مشاعرے میں پڑھی گئی اور پورے ہندوستان میں 'لال قلعہ' کے نام سے مشہور ہوگئی۔ اور بہت سالوں تک اکثر مشاعروں میں اصرار سے فرمائشیں ہوتی رہی کہ 'لال قلعہ' سنائیے۔ ہاں سنائیے:

آنسوؤں کی مئے بنی زخموں کا پیمانہ بنا

اس طرح بات زخموں سے چل کر تلوار تک اور گنگا سے گزرتی ہوئی گنگوتری تک پہنچتی ہے۔ شراب کا نشہ دِلوں کو مجہول، نگاہوں کو مخذوف اور ذہنوں کو ماؤف کر دیتا ہے۔ درد کا نشہ ان تینوں کی پوشیدہ طاقتوں کو مہمیز لگا کر ان کی قوّتِ کارکردگی کو اور تیز کر دیتا ہے۔ درد بیداری کی علامت ہے، سکون خواب ہے۔ درد تیز بینی کا ثبوت ہے، بلند آگہی کا ثبوت ہے۔ درد ہی سے وہ روشنی پیدا ہوتی ہے جو پسِ پردہ کو پیش پردہ کر دیتی ہے، درد ہی سے گفتار میں سلیقہ، باتوں میں حلاوت اور اشعار میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ درد ہی ہر طرح کی برہنگی کو لباس اور سادگی کو تمام زیورات اور لوازمات سے آراستہ کر دیتا ہے۔ درد ہی سے پھٹے چیتھڑوں میں سنوار اور خاک آلودگی میں وقار پیدا ہو جاتا ہے۔ درد ایسا سکہ ہے جس سے دُنیا کی ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔ سلطنتیں اس کے سامنے حقیر اور سلطانی فقیر نظر آتی ہے، درد ہی وہ جست ہے جس سے زمین خلا اور آسمان کی تمام مسافتیں چشم زدن میں طے ہوتی ہیں، دُوریاں قُربت میں اور دُشمنیاں محبت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ درد ہی سے جینے کا سلیقہ اور مرنے کا انداز نصیب ہوتا ہے، درد ہی سے پیار زندہ ہوتا ہے۔ یہ میں فلسفہ نہیں بگھار رہا ہوں، شاعری نہیں کر رہا ہوں اپنی برسوں کی زندگی کا نچوڑ اور تقریباً نصف صدی کے محسوسات، تجربات اور مشاہدات کا خلاصہ پیش کر رہا ہوں۔ درد نے مجھے شاعری دی اور شاعری نے درد دیا۔ شاعری اگر سچی ہو، دل سے نکلی ہوئی ہو تو یہ خود شاعر کی زندگی میں محبت کے جنریٹر کا کام کرتی ہے۔ دل میں شاعری کا چراغ جلتا ہے تو رگ رگ میں درد کے قمقمے جگمگانے لگتے ہیں۔ درد سے صدف میں گہر کی آبرو بڑھ جاتی ہے۔ خزف موتی بن جاتے ہیں۔ سامنے کے ٹھیکرے شاعری کی ٹھوکر سے سونا بن کر چمکنے لگتے ہیں، درد سے بے جان الفاظ زندہ اور توانا اور تندرست بن جاتے

ہیں ۔الفاظ میں تہہ داری اور گہرائی پیدا ہوجاتی ہے۔درد شاعری پیدا کرنے کی مشین ہے۔درد ایک ایسا رہنما ہے جس کے پیچھے آنکھ بند کر کے چلا جا سکتا ہے۔یہ ٹھیک راستے،سیدھے اور مختصر ترین راستے سے گزار کر صحیح منزل تک پہنچاتا ہے۔میں نے یہی کیا ہے اس کی رہنمائی میں دور کی مسافتیں اور دیر کی راہیں جلد طے کر لی ہیں:

کس مشکل سے چل کر عاجزؔ اس منزل تک پہنچے ہیں
عقل کا دامن چھوٹ گیا تو درد کا دامن تھام چلے

میں نے شاعری کا اصل سفر یہاں سے شروع کیا:

غریب الوطن کا رہا کیا وطن میں　　　بہار آرہی ہے تو آئے چمن میں

دوسری ہی چھلانگ میں یہاں پہنچا:

جدا دیوانہ پن اب ایسے دیوانے سے کیا ہوگا
مجھے کیوں لوگ سمجھاتے ہیں سمجھانے سے کیا ہوگا

تیسری چھلانگ میں یہاں تھا:

کہلواتا ہے جو دورِ جہاں کہنا ہی پڑتا ہے
کبھی نامہرباں کو مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

اُس کے بعد کی چھلانگ یہاں پہنچاتی ہے:

دن ایک ستم ایک ستم رات کرو ہو
وہ دوست ہو دُشمن کو بھی تم مات کرو ہو

آپ دیکھ رہے ہیں؟ پہلے آنکھوں پر رومال ہے اور رونا ہے۔اس کے بعد رومال ہٹ جاتا ہے ۔کیا چیز گئی اور کیا حاصل ہوا اُس کا احساس جاگ اُٹھا ہے۔اس کے بعد کس نے چھینا اور عطا کیا،اس کی پہچان آجاتی ہے،اس کا پتہ چل جاتا ہے اور آخر میں اس کے سامنے آکر براہِ راست دوٹوک بالمشافہ گفتگو شروع ہوجاتی ہے۔یہ گفتگو جاری ہے اور جاری رہے گی۔

میں وہیں پہنچ گیا جہاں اقبالؔ بالِ جبرئیل کی غزلوں میں پہنچے ہیں۔اقبالؔ خدا سے مخاطب ہیں،میں خدا کے بندے سے مخاطب ہوں۔اقبالؔ خدا سے خدا کے بندوں کی وکالت کر رہے ہیں، میں خدا کے بندے سے اپنی وکالت کر رہا ہوں۔اقبالؔ ساری خدائی کے مال کو اپنا مال سمجھ رہے

ہیں۔ میں اپنے مال کو ساری خدائی کا مال سمجھ رہا ہوں۔ اقبالؔ جگ بیتی کو آپ بیتی بنا رہے ہیں، میں آپ بیتی کو جگ بیتی بنا رہا ہوں۔ اقبالؔ خود نہیں لٹے ہیں ان کا قافلہ لٹا ہے۔ میں خود بھی لٹا ہوں اور میرا قافلہ بھی۔ اقبالؔ کے کارواں کو لوٹنے والے خود اقبالؔ کے اہلِ کارواں ہیں۔ مجھے اور میرے قافلے کو لوٹنے والا رہزن ہے۔ اقبالؔ رہزن کی مدافعت کر رہے ہیں، میں نے اپنے رہزن کا دامن پکڑ رکھا ہے۔ اقبالؔ فریادی ہیں، میں فریادی نہیں مدعی ہوں۔ اقبالؔ کی جنگ اِن ڈائریکٹ ہے میری لڑائی ڈائریکٹ ہے۔ اقبالؔ چور کی طرف اشارہ کر رہے ہیں میں نے چور کی کلائی پکڑ لی ہے:

ہم کو جو ملا ہے وہ تمھیں سے تو ملا ہے — اور ہم بھلا دیں تمھیں کیا بات کرو ہو
یوں تو کبھی منہ پھیر کے دیکھو بھی نہیں ہو — جب وقت پڑے ہے تو مدارات کرو ہو
دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ — تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

تو مختصر یہ ہے کہ میری شاعری غزل کے اصل مفہوم تک پہنچ گئی ہے۔ وہ مفہوم جو بہت بنیادی اور قدیم ہے یعنی 'گفتگو با معشوق کردن' میں چلتے چلتے یہاں پہنچا ہوں۔ میں نے کوئی تکلف نہیں کیا ہے، کوئی تاویل نہیں کی ہے، بس سیدھے محبوب کے حرم سرا میں پہنچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا ہوں۔ زمانہ ہم دونوں کے سروں سے گزر رہا ہے یا یہ کہ ہم دونوں زمانے کے ساتھ ساتھ سرپٹ دوڑ رہے ہیں، وہ اپنا کام کیے جا رہا ہے، میں اپنا عمل کرتا جا رہا ہوں:

کل کہتے رہے ہیں وہی کل کہتے رہیں گے — ہر دَور میں ہم اُن پہ غزل کہتے رہیں گے
وہ باتیں بناتے رہیں گے اور ہم اُن سے — کیا قول ہے کیا ان کا عمل کہتے رہیں گے
ہر صبح کو آئے گی کوئی تازہ قیامت — ہر شام کو ہم تازہ غزل کہتے رہیں گے
ہر ایک قدم پر ہم اُس آوارہ قدم کو — ہاں دیکھ کے چل دیکھ کے چل کہتے رہیں گے

ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے ہیں۔ اُس کے ہاتھ میں عمل کی تلوار ہے میرے ہاتھ میں غزل کی تلوار ہے۔ تلوار سے تلوار ٹکرا رہی ہے، عمل سے غزل لڑ رہی ہے:

آزمانا ہے تو آبازو و دل کی قوّت
تو بھی شمشیر اُٹھا ہم بھی غزل کہتے ہیں

وہ بھی شوخ میں بھی گستاخ، وہ بھی بیدار میں بھی ہوشیار، اُسے اس کی خوشی کہ اس کی تلوار کے لیے ایک گردن مل گئی۔ مجھے اس کی خوشی کہ میری گردن کو اُس کی تلوار مل گئی:

اُسے مشق گاہِ ستم گری نہ ملے گا میرے سوا کوئی
جو ہے میرا دشمنِ زندگی مری زندگی کی دُعا کرے

وہ میری گردن پر اپنی تلوار آزماتا ہے۔ میں لہو سے اس کے لیے نقش ونگار بناتا ہوں:

کب دیکھئے تیار ہو ہم خونِ جگر سے اِک شوخ کی تصویر بنانے میں لگے ہیں

میں کوئی بڑائی نہیں کرتا اظہارِ اَمرِ واقعہ کرتا ہوں کہ میری کم علمی کو اس بات کا علم اب تک حاصل نہیں ہوسکا ہے کہ اُردو یا فارسی شاعری میں کوئی ایسا انسان گزرا ہو جس نے صبح وشام، روز و شب، ماہ بہ ماہ، سال بہ سال، زمانے کے قدم بہ قدم، شانہ بہ شانہ ایک ہاتھ میں دستِ محبوب اور دوسرے ہاتھ میں سفینۂ غزل لیے ہوئے بغیر ٹھہراؤ کے بے تکان دُھوپ اور سایہ میں بغیر سانس لیے یوں سفر کیا ہو:

کیا دل ہے کہ آرام سے اِک سانس نہ لے ہے
محفل سے جو نکلے ہے تو خلوت میں جلے ہے

جس نے پورے سفر میں ہر گرمی اور ہر سردی میں، ہر سکھاڑ اور ہر برسات میں، ہر قید میں اور ہر آزادی میں، ہر مجبوری میں اور ہر مایوسی میں غزل کے اصولوں کو، ضابطوں کو، تغزل کی شرطوں کو اور نزاکتوں کو اُس کے ماحول کو اور فضا کو اس کی زبان کو اور طرزِ بیان کو اس کے اشاروں کو علامتوں کو ابتدا سے انتہا تک تنکے سے شہتیر تک اُس کے چوکھٹے کو یوں دانتوں سے پکڑ رکھا ہو جس طرح کوئی ڈوبنے والا باہر کی رسّی کو دانتوں سے پکڑ رکھے۔ میرؔ جگت استاد ہیں اور جگت استاد رہیں گے۔ اُن کی سادگی میں معنویت، گہرائی اور تہہ داری اُن کی اپنی ہے۔ وہ اس لہجے اور انداز کے خالق ہیں۔ یہ فصل پہلی بار انھوں نے اُپجائی، اُردو دُنیا اس لہجے سے محروم تھی۔ میرؔ نے یہ محرومیت دُور کردی۔ درد اور سوز سے ہم آہنگی کے باوجود درد کا افسوں جو میرؔ کے یہاں ہے میں وہاں تک نہیں پہنچ سکتا اور کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ دریا جو کوزے میں بند ہے، سمندر جو قطرے میں پوشیدہ ہے وہ صرف میرؔ ہی کا حصہ ہے۔ لیکن میرا ایک منصوبہ ہے، ایک پلاننگ ہے، وہ منصوبہ اور پلاننگ میرؔ کے یہاں نہیں۔ میرؔ کے یہاں درد کی صورت میں ان کے عہد کی صدائے بازگشت ہے جیسے گنبد پر ضرب لگاؤ تو پورا گنبد گونجتا ہے، میرؔ کے دل پر چوٹ پڑتی ہے تو پوری زندگی گونجتی ہے۔ میرے یہاں صدائے بازگشت نہیں ہے۔ میں شاید سمجھا نہ سکوں، یوں سمجھئے کہ صدائے بازگشت کو ٹیپ کیا

جائے پھراس کی ایڈیٹنگ کی جائے اوراُسے کسی خاص ترتیب میں ڈھال کرایک مقصد کے لیے استعمال کیاجائے یایوں سمجھئے کہ اسٹیم کوکسی خاص پروسیس سے گزارکراس میں اوردوسرےاجزاشامل کر کےکسی خاص دواکےطور پراستعمال ہومیرے یہاں یہ پروسیس ہے۔اور یہ پروسیس اوراسٹیم دونوں آگے پیچھےنہیں ہیں۔میں اپنے دل میں درد کی صدائے بازگشت کوایک خاص تہذیب، تنظیم اورترتیب کےساتھ پیش کرتا ہوں اس کاتعلق ریاض،کسب اورکوشش سےنہیں ہے۔دل میں احساس کی مشین کے ساتھ یہ مشین لگی ہوئی ہےاور دونوں مشینیں بیک وقت کام کرتی ہیں۔میرے یہاں چوٹ،زخم،درد یہ صرف حالات کاردِّعمل نہیں ہیں۔میرؔ کی طرح بے پناہ تحمل ہی نہیں اس میں للکاربھی ہے۔آوازِشکست نہیں ہے بلکہ شکست نہ کھانے کا تیوربھی ہے۔درد ہی نہیں درد کی درماں بنادینے کاخاموش آہنگ بھی ہے:

چھری جن کے ہاتھوں سےکھاناپڑے ہے	غزل بھی اُنھیں کو سُنانا پڑے ہے
طبیعت کو قابو میں لانا پڑے ہے	اُٹھے ہے کہاں غم اُٹھانا پڑے ہے
خبر ہے کہ ہیں دُشمنِ جان و دل وہ	مگر دل اُنھیں سے لگانا پڑے ہے

یہ'پڑے ہے' کسی مجبوری اور بےبسی کی ترجمانی نہیں ہے، سمجھوتے کی کیفیت نہیں ہے۔ مجھےاپنا شعر یااشعار یادنہیں آرہے ہیں۔بس یہ سمجھئے کہ اقبالؔ جوکہہ رہے ہیں'یہ مشکل ہےتواس مشکل کوآساں کر کےچھوڑوں گا' درپردہ یہ تیورہے۔اقبالؔ اس تیورکااعلان کرر ہے ہیں۔میرے یہاں اعلان نہیں ہے۔غزل اُسی کوسنانا پڑے ہےاس لیےنہیں کہ سنانے پرمجبور ہیں۔نوکر ہیں، وظیفہ خوار ہیں،محکوم ہیں بلکہ یہ دکھانے کے لیے کہ دیکھوتم کیا کرر ہے ہواور ہم کیا کرر ہے ہیں۔ اپنی عادت دیکھواور ہماری وضع دیکھو،اپنا پیمانہ دیکھواور ہماراظرف دیکھو۔غزل سنانے کے لیے کوئی خارجی دباؤنہیں ہے بلکہ دلی تقاضا ہے تاکہ وہ اپنا بھاؤدیکھ لےاور ہماراوزن دیکھ لے۔ ایمرجنسی کےآخری دَور کی ایک غزل سنیے جومندرجہ بالا نکتے کوسمجھا دے گی:

یہ ستم کی محفلِ ناز ہے کلیمؔ اُس کو اور سجائے جا
وہ دکھائیں رقصِ ستمگری تو غزل کا ساز بجائے جا
جواکڑ کےناز سے جائے ہےاُسے پیار سے یہ بتائے جا
کہ بلندیوں کی ہے آرزوتو دِلوں میں پہلے سمائے جا

وہ جو زخم دیں سو قبول ہے ترے واسطے وہی پھول ہے
یہی اہلِ دل کا اصول ہے وہ رُلائے جائیں تو گائے جا
ترا سیدھا سادا بیان ہے تری ٹوٹی پھوٹی زبان ہے
تیرے پاس ہیں یہی ٹھیکرے تو محل اُنھیں سے بنائے جا
کوئی لاکھ زہرہ جبین ہے جسے چاہیں ہم وہ حسین ہے
کلیم اُس سراپا غرور کو ذرا آئینہ تو دکھائے جا

غزل کیوں سنانا پڑے ہے، واضح ہے۔ میؔر کے یہاں یہی منصوبہ اور یہی پلاننگ نہیں ہے۔ پوری غزل پڑھ جایئے پوری اسکیم واضح ہو جائے گی۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ درد کو سوز کو ایک خاص منصوبے کے ماتحت تہذیب دے کر ایک توانائی بنایا گیا ہے۔ جس طرح منہ زور بے قابو دریا کو ڈیم کے ذریعہ ہائڈرو الیکٹرک پاور کا ایک خزانہ بنایا جاتا ہے۔ اِس پلاننگ کے نقوش آپ کو دورِ ابتدا ہی کے آخری حصے میں نظر آنے لگیں گے:

دردمند عشق ہیں غم سے نہ گھبرائیں گے ہم
شاعری کرتے رہیں گے اور مر جائیں گے ہم
اب کے پھر برسات میں گنجِ شہیداں پر چلیں
آسماں روئے گا اور اپنی غزل گائیں گے ہم

درد اور سوز کے پہلو بہ پہلو یہ دَم خم آپ کو اُردو غزل میں نہ ملے گا۔ یہ ایک نیا میلان ہے جو فطرت کی سنگلاخ سرزمین سے خود بہ خود اُبھرا ہے اس میں شعور اور لاشعور دونوں کو دخل ہے، شاید فطرت کی سنگلاخیت سے پھوٹ کر نکلنے والا یہی چشمہ ہے جس نے ۱۹۴۷ء کی غارتگری کے بعد جلی کھری ہوئی دُھواں اُٹھاتی ہوئی بنجر زمین میں ایک سرسبز شاداب نخلستان کا خواب دکھا کر ہر مطالبے، لالچ اور تحریک کے باوجود مجھے ہجرت سے روک دیا۔ مستقبل کے اس سرسبز شاداب نخلستان کی جھلکیاں ان ابتدائی دَور کے اشعار میں بھی دیکھئے:

عشق ہر شخص کے بس کا نہیں پیارے جاؤ — یہ سمندر ہے کنارے ہی کنارے جاؤ
یوں تو مقتل میں تماشائی بہت آتے ہیں — آؤ اِس وقت کے جس وقت پکارے جاؤ
دل کی بازی لگے پھر جان کی بازی لگ جائے — عشق میں ہار کے بیٹھو نہیں ہارے جاؤ

چھری جن کے ہاتھوں سے کھانا پڑے ہے
غزل بھی اُنھیں کو سُنانا پڑے ہے

اس شعر کا رشتہ اِن مندرجہ بالا اشعار سے کیا ہے، سامنے رکھ کر ملا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ تو ایک ہی قبیلے کے ہیں۔ ایک باپ کے چند بیٹوں میں کسی کو سوٹ پہنا دیا جائے، کسی کو دھوتی مرزئی، کسی کو انگرکھا پاجامہ، تو دور سے وہ الگ الگ خاندان کے معلوم ہوں گے۔ قریب آ کر خدوخال کا بغور معائنہ کیجیے گا تو صاف معلوم ہوگا کہ رُوپ ایک ہی ہے جسے مختلف بہروپ میں پیش کیا گیا ہے۔

تقریباً ۲۸ سال قبل آل انڈیا ریڈیو رانچی کے مشاعرے میں ایک غزل میں نے پڑھی۔ صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم فرمارہے تھے۔ فراقؔ صاحب بھی تھے، ساغرؔ نظامی وغیرہ بھی۔ اتنی پرانی غزل سنیے تمام اشعار یاد نہیں ہیں:

ہم نے بے فائدہ چھیڑی غمِ ایام کی بات
کون بے کار یہاں ہے کہ سنے کام کی بات

شمع کی طرح کھڑا سوچ رہا ہے شاعر
صبح کی بات سنائے کہ کہے شام کی بات

دُھوپ میں خاک اُڑا لیتے ہیں سائے کے لیے
پیاس لگتی ہے تو کرتے ہیں مئے و جام کی بات

ہم غریبوں کو تو عادت ہے جفا سہنے کی
ڈھونڈھ ہی لیتے ہیں تکلیف میں آرام کی بات

تم ہی کہہ دو کہ محبت میں بُرائی کیا ہے
یہ نہ تو کفر کی ہے بات نہ اسلام کی بات

صبح کے وقت جو کلیوں نے چٹک کر کہہ دی
بات چھوٹی سی ہے لیکن ہے بڑے کام کی بات

بات بہت اونچی نہ سہی لیکن نئی بات تھی۔ بات کا بتنگڑ نہ تھی مختصر اور چھنٹی چھنٹائی بات تھی۔ دور کی تھی لیکن مانوس تھی، اور فراقؔ صاحب آنکھ پھاڑ پھاڑ کر محبت آمیز لہجے میں، واہ واہ نہیں بلکہ ہونٹوں کو گول دائرہ بنا کر 'وہ وہ وہ' کر رہے تھے۔ اور آخر میں پڑھنے بیٹھے تو مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے اپنی وہی مشہور غزل پڑھی:

میرؔ کی کوئی غزل گاؤ کہ کچھ رات کٹے

میں نے شاعری کو اختیار کیا اور شاعری نے مجھے اختیار کیا۔ بلکہ یوں کہیے کہ شاعری نے مجھے اختیار میں لے لیا اور میں نے خود کو اُس کے اختیار میں دے دیا۔ رفتہ رفتہ شاعری مجھ سے

مانوس ہوئی تو میں نے بھی اُسے آمادہ کرلیا کہ وہ بھی میرے اختیار میں آجائے۔ دونوں کو یہ صلح منظور ہوگی۔ وقت کی دُکھ بھری آواز کو ظاہر کرنے کے لیے شاعری مجھے استعمال کرتی ہے۔ میں اس کے بس میں چلا جاتا ہوں وہ میرے دل کو توڑ مروڑ کر نچوڑ کر وقت کی آواز میں میرا لہو شامل کر کے اُسے رنگین بنا دیتی ہے اتنا کام شاعری کرتی ہے اس کے بعد میری باری آتی ہے۔ میں شاعری کو استعمال کرتا ہوں کبھی اسے اپنی تلوار بناتا ہوں اور حملہ کرتا ہوں:

تجھے کیا اگر تیرے واسطے کوئی زندگی سے گزر گیا
تری زُلف اور سنور گئی تیرا حسن اور نکھر گیا

……..………

تجھے سنگ دل یہ پتہ ہے کیا کہ دُکھے دِلوں کی صدا ہے کیا؟
کبھی چوٹ تو نے بھی کھائی ہے کبھی تیرا دل بھی دُکھا ہے کیا؟
تو امام شہرِ ستمگراں میں گدائے کوچۂ عاشقاں
تو امیر ہے تو بتا مجھے میں غریب ہوں تو بُرا ہے کیا؟
تو جفا میں مست ہے روز و شب میں کفن بدوش و غزل بہ لب
تیرے رُعبِ حسن سے چپ ہیں سب میں بھی چپ رہوں تو مزا ہے کیا؟
ابھی تیرا عہد شباب ہے ابھی کیا حساب و کتاب ہے
ابھی کیا نہ ہوگا جہان میں ابھی اس جہاں میں ہوا ہے کیا

کبھی میں اسے شاخِ گل بنا لیتا ہوں اس سے بھی کام تلوار ہی کا لینا چاہتا ہوں مگر اس کا زخم پہلے نظر نہیں آتا:

میرے پیارے اور مرے زلف پریشاں والے
تجھ کو سمجھاتے رہے چاک گریباں والے
اِن سے مت کھینچو کہ نازک ہے بہت ان کا مزاج
یہ غمِ دل، غمِ دوراں، غمِ جاناں والے

……..………

شانے کا بہت خونِ جگر جائے ہے پیارے — تب زُلف کہیں تا بہ کمر جائے ہے پیارے
جس دن کوئی غم مجھ پہ گزر جائے ہے پیارے — چہرہ ترا اس روز نکھر جائے ہے پیارے
اِک گھر بھی سلامت نہیں اب شہرِ وفا میں — تو آگ لگانے کو کدھر جائے ہے پیارے

کبھی میں شاعری کو اپنی بانسری بناتا ہوں تاکہ اپنا درد عام کروں۔ عالم کو اس درد سے ہم آہنگ کروں۔ اس کی لذّت سے آشنا کروں اور پھر اس درد کا طلب گار بناؤں:

یہ آنسو بے سبب جاری نہیں ہے | مجھے رونے کی بیماری نہیں ہے
بہت دُشوار سمجھانا ہے غم کا | سمجھ لینے میں دُشواری نہیں ہے
وہ آنکھیں پھیر لیں میں کیسے پھیروں | محبت ہے اداکاری نہیں ہے
چمن میں کیوں چلوں کانٹوں سے بچ کر | یہ آئینِ وفاداری نہیں ہے
میں اُن سے پیار کرنا کیسے چھوڑوں | مجھے کیا زندگی پیاری نہیں ہے

....

زخمِ دل کا وہ نظارا ہے کہ جی جانے ہے | اتنا احسان تمھارا ہے کہ جی جانے ہے
دیکھنا پھر کہیں زُلفیں نہ پریشاں ہو جائیں | اتنی مشکل سے سنوارا ہے کہ جی جانے ہے
یہ حسیں دَور جسے موسمِ گل کہتے ہیں | ایسا رو رو کے گزارا ہے کہ جی جانے ہے
مہرباں حال پہ ہیں آپ ہمارے جب سے | تب سے وہ حال ہمارا ہے کہ جی جانے ہے
گرچہ جی جان کا دشمن ہے وہ ظالم پھر بھی | ایسا جی جان سے پیارا ہے کہ جی جانے ہے

شاعری مجھ پر قابض، میں شاعری پر قابض۔ میں شاعری کا کھلونا، شاعری میرا کھلونا۔ شاعری کی نگاہ میں مَیں عظیم و مقدس، شاعری میری نگاہ میں عظیم و مقدس۔ وہ میری جانِ جاناں، میں اس کا جانِ جہاں۔ شاعری نے سب کچھ میرے قدموں پر ڈال دیا، میں نے سب کچھ شاعری کے قدموں پر ڈال دیا۔ دین و مذہب کے بعد میری نگاہ میں شاعری کا مرتبہ سب سے بڑا ہے۔ اس کا مرتبہ، اس کی عظمت میری نگاہ میں کسی دن، کسی رات، کسی وقت، کسی گھڑی، کسی لمحہ کم نہیں ہوئی۔ میں گزشتہ واقعات یاد کرتا ہوں سوچتا ہوں تو متحیر ہو جاتا ہوں۔ ایسا کسی اور نے کبھی کیا ہوگا؟ کم از کم پینتیس سال کی شاعری، شاعر اور مشاعروں کی تاریخ میرے سامنے ہے۔ مجھے ایک مثال بھی ایسی نہ ملی۔ کیسی مثال؟ سنیے۔ تیس اور پینتیس سال کے دوران کا پانچ سالہ وقفہ ایسا ہے جو میری شاعری کے ابتدائی دور کے شوقِ مشاعرہ کا دور ہے یعنی میں مشاعروں میں شریک ہونے کا خواہش مند اور متمنی رہتا تھا۔ لوگ آتے تھے، اشتیاق سے مدعو کرتے تھے۔ سفر خرچ پیشگی دے دیتے تھے۔ صوبے کے اندر کم از کم تین بار اور صوبے کے باہر ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے دعوت دی گئی۔ اخراجات پیشگی ادا کردیئے گئے۔ منزل پر اسٹیشن آ کر قیام گاہ پر لے جانے

کا حسبِ دستور وعدہ ہوا۔ میں اسٹیشن پر پہنچا کسی وجہ سے غلط فہمی سے یا کسی اور وقتی صورتِ حال کے سبب یا قصداً یالا پروائی سے اسٹیشن پر کوئی شخص لینے کو نہیں آیا۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا پھر سواری کر کے اپنے کسی عزیز یا دوست کے یہاں پہنچ گیا۔ وہیں قیام ہوا۔ لوگوں کو علم ہوا۔ آئے عذر کرنے لگے، معذرت کرنے لگے۔ میں نے پیشگی ادا کردہ پوری رقم نکال کر واپس کی اور کسی شرط پر بھی مشاعرہ میں شریک نہیں ہوا۔ یہ سب واقعات غالباً ۱۹۶۰ء کے پہلے کے ہیں کہ اس کے بعد تو مشاعرہ کا شوق ہی جاتا رہا۔ تو انہی برسوں میں ایک سال پٹنہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا عام جلسہ ہوا۔ شری کرشنا پوری میں کئی کیلومیٹر کے حلقے میں خیمے اور پنڈال۔ بنائے گئے۔ رضا نقوی واہیؔ صاحب کئی بار تشریف لائے کہ کانفرنس کے آخری دن مشاعرہ ہے تمھیں شریک ہونا ہے۔ گورنمنٹ کی طرف سے اتنا معاوضہ ملے گا اور گاڑی آکر لے جائے گی۔ میں نے معذرت کی کہ خالص مشاعرہ میں شرکت کرتا ہوں۔ جلسہ وغیرہ کے ضمن میں ہونے والے مشاعروں میں شرکت مجھے پسند نہیں مگر اصرار بہت رہا۔ اُسی مشاعرے میں باہر سے آنے والے شعرا میں خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم بھی تھے۔ وہ مجھے مانتے تھے۔ مشاعرے کے روز وہ ملنے آئے اور شرکت پر اصرار کیا۔ میں آمادہ ہو گیا۔ شام کو گاڑی آئی۔ مشاعرہ گاہ میں پہنچا۔ دیکھا مشاعرہ گاہ کانگریس کے شرکائے جلسہ سے بھرا ہوا ہے۔ کھدر پوش حضرات کے ہجوم میں اور لوگ بھی جانے پہچانے ہیں۔ شعرا بھی ہیں۔ صورت آشنا سامعین بھی ہیں۔ مقامی شعرا بھی ہیں، غیر مقامی بھی مگر اکثریت کھادی پوشوں کی ہے۔ پان بھی چل رہا ہے، سگریٹ بھی اور کہیں کہیں کھینی بھی۔ زور زور سے باتیں ہو رہی ہیں، شعر بھی سن رہے ہیں، داد بھی دے رہے ہیں، قہقہے بھی لگا رہے ہیں۔ پاؤں پر پاؤں رکھے ہوئے، تلوے پر ہاتھ بھی پھیر رہے ہیں۔ شعرا آ رہے ہیں، غزل نظم پڑھ رہے ہیں، داد لے رہے ہیں۔ جھک جھک کے سلام کر رہے ہیں اور غزل یا نظم پڑھ کر اُٹھتے ہیں۔ مطلوبہ نذرانے کی رقم بھی مل رہی ہے۔ دستخط کر رہے ہیں اور رقم لے کر کنارے بیٹھ رہے ہیں۔ اس طرح سلسلہ چل رہا ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ مجھے باندھ کر پیٹا جائے گا۔ میں ہمیشہ مشاعروں میں اسٹیج پر سب سے پیچھے بیٹھتا ہوں۔ چنانچہ میرے پیچھے خیمے کی قنات تھی۔ میں نے جس وقت لوگ شعر سننے اور داد دینے میں مصروف تھے، قنات کا پردہ پیچھے سے اٹھایا اور وہاں سے بھاگا تو پاپیادہ چار پانچ میل کی مسافت بہت تیز رفتاری سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس طرح طے کیا جیسے پیچھے

پکڑنے والے لوگ آرہے ہیں اور مجھے قید کرنے والے ہیں۔ تقریباً دو گھنٹے میں پسینہ پسینہ گھر پہنچا اور نیم جان بستر پر یہ کہتا ہوا گر گیا کہ جان بچی اور لاکھوں پائے، خیر سے بدھو گھر کو آئے۔

دوبار پٹنہ جشن آزادی کے مشاعرے میں بزرگوں کے اصرار سے شریک ہوا۔ پہلی بار دیکھا کہ ہر شاعر مشاعرے میں غزل یا نظم پڑھ کر اُٹھ جاتا ہے۔ کنارے ایک طرف دوسرے خیمے میں جاتا ہے پھر واپس نہیں آتا۔ چند بار ایسا ہوا تو میں نے کسی سے پوچھا بھئی یہ حضرات پڑھ کر کہاں چلے جاتے ہیں کہ پھر واپس نہیں آتے۔ انھوں نے کہا بغل کے خیمہ میں کاؤنٹر کھلا ہوا ہے، اپنی غزل یا نظم پیش کرتے ہیں، وہاں سے نذرانہ کی رقم لے کر اُدھر سے ہی روانہ ہو جاتے ہیں۔ مجھے افسوس ہوا۔ خیر میں نے غزل تو پڑھ دی، کچھ دیر بیٹھا پھر اُٹھ کر دوسری طرف سے گھر چلا آیا۔ پیمنٹ والے خیمے میں نہیں گیا۔ دوسری مرتبہ دعوت آئی تو میں نے پچھلی بار کی ترتیب کا ذکر کر کے انکار کر دیا کہ میں ایسے مشاعرے میں شریک نہیں ہوتا مگر دعوت دینے والوں نے کہا کہ نہیں اس سال ایسا نہیں ہوگا بلکہ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد سب کو ایک ساتھ نذرانے کی رقم ادا کی جائے گی۔ خیر تو مشاعرہ ہوا، شکریہ ہوا، اس کے بعد سب لوگ اُٹھے۔ ایک طرف کچھ لوگ تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ دیکھا تو ایک طرف خیمے میں قطار سے تمام شعرا کھڑے ہو رہے ہیں جس طرح ٹکٹ کے کاؤنٹر پر کیو بناتے ہیں اور رقم یکے بعد دیگرے دی جا رہی ہے۔ مجھے ایسی کراہیت معلوم ہوئی کہ میں قطار کی طرف گیا بھی نہیں، سیدھے گھر واپس آ گیا۔ دو تین دن بعد معلوم ہوا کہ میرے نام پر رقم بھی کسی صاحب نے لے لی۔

گوپی ناتھ امنؔ صاحب کے زیر نظامت لال قلعہ کا مشاعرۂ جشن جمہوریت میں نے ایک قاعدے کا مشاعرہ دیکھا۔ امنؔ صاحب اصرار سے مجھے بلاتے اور میں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۲ء تک شریک ہوتا رہا۔ ان کی نظم کی فرمائش کبھی پوری نہیں کی۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ غزل ہی پڑھوں گا۔ ایک سال بغیر فرمائش نظم پڑھ دی وہ بھی عرض کروں گا۔ پہلے غزلیں سن لیجیے تاکہ میری خاص خاص غزلوں کا پس منظر بھی آپ کو معلوم ہو جائے۔ ۱۹۶۰ء میں پہلی غزل یہ پڑھی:

میرے لیے قیدِ سحر و شام نہیں ہے — جلتا ہوں کہ جلنے کے سوا کام نہیں ہے
اِس دور میں ارزاں مئے گلفام نہیں ہے — پینے کی اجازت ہے مگر عام نہیں ہے
پوری نہ ہوئی راحتِ منزل کی تمنّا — ہم جیسے مسافر کے لیے شام نہیں ہے

بخشی ہے تری اِک نظرِ خاص نے مجھ کو — وہ درد کی دولت جو بہت عام نہیں ہے
مرکز بھی دکھا دیں گے ترے چاہنے والے — مرنا کوئی جینے سے بڑا کام نہیں ہے

دنیا میں بُرے ہم سے زیادہ بھی ہیں عاجزؔ
ہاں ہم سے زیادہ کوئی بدنام نہیں ہے

لال قلعہ کے جشن جمہوریہ کے مشاعرے میں تین باتیں عام طور سے دیکھی بولی اور مانی جاتی تھیں۔عوام میں ساحرؔ لدھیانوی کی چیزیں خواہ قطعات ہوں، کوئی نظم ہو یا غزل ہو، مطالبات میں بڑا ہنگامہ ہوتا۔فلاں چیز سنائیے، نظم سنائیے اور جب وہ سنانے کو اٹھتے تو پورا پنڈال تالیوں سے گونج جاتا۔مگر دادِ تحسین میں وہ شور نہ ہوتا ہے۔فلمی تعلق کی وجہ سے ان کی مقبولیت عوام میں قابلِ رشک تھی جو کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔نہ کیفیؔ کو، نہ شکیلؔ کو، نہ مجروحؔ کو، نہ سردارؔ جعفری کو۔ گیتوں کے سبب سے وہ بہت زیادہ مقبول اور ہر دل عزیز تھے جو مشاعروں میں ہر اعتبار سے انھیں ممتاز کردیتی اور خواص میں میری غزلیں بہت مقبول تھیں۔اسٹیج کے شعرا اور اسٹیج کے بالکل سامنے کے اہلِ ذوق خواص کو میری غزلیں، میری وضع، میرا انداز زیادہ پسند تھا۔غزل کا آہنگ، اس کے مخصوص اشارے، خاموشی سے اٹھنا، سر جھکا کر، آنکھیں بند کر کے بغیر دائیں بائیں متوجہ ہوئے، بغیر سلام یا آداب عرض ایک سُر سے ہلکے ترنم کے ساتھ غزل ختم کر کے سب شعرا کے پیچھے جا کر بیٹھ جانا اور مکرر مطالبے پر سر جھکا کر معذرت کر لینا۔یہ باتیں اس ماحول میں نمایاں انفرادیت رکھتی تھیں۔غزلوں کے آہنگ کے ساتھ یہ باتیں بھی پسندیدگی کا سبب تھیں اور تیسری بات یہ کہ عوام وخواص دونوں میں دلاور فگارؔ کی مزاحیہ نظمیں ایک ساں مقبول تھیں۔

۱۹۶۱ء کے مشاعرے میں یہ غزل پڑھی جس نے لال قلعہ کے مشاعرے میں میری انفرادیت مکمل طور پر نمایاں کر دی اور یہ غزل ہی 'لال قلعہ' کے نام سے مشہور ہوگئی (غزل مضمون کے آغاز میں دی ہوئی ہے)

لال قلعہ میں پڑھی ہوئی غزلیں جو مجھے یاد ہیں۔۱۹۶۱ء کی غزل مجھے یاد نہیں ہے اور مجموعہ دیکھ کر بتانا یا لکھنا مناسب نہیں۔۱۹۶۳ء کی یہ غزل ہے:

زہرِ غم سے نہیں انکار کہ پینا ہے یہی — ہم غریبوں کا تو مرنا یہی جینا ہے یہی
درد کو اس لیے سینے سے لگا رکھا ہے — زندگی ایک انگوٹھی ہے نگینہ ہے یہی

کتنی مدّت ہوئی آنسو نہیں تھمتے اپنے — اب یہ برسات نہ جائے گی قرینہ ہے یہی
ہم بھی چلّو میں لہو دل کا لیے بیٹھے ہیں — شور سنتے ہیں کہ فصلِ مئے و مینا ہے یہی
شہر میں ہر در و دیوار پہ روشن ہیں چراغ — میرا گھر جس میں جلا تھا وہ مہینہ ہے یہی
ناز کیوں کر نہ کریں دولتِ خودداری پر — ہم نے اے وقت ترے ہاتھ سے چھینا ہے یہی

(گوپی ناتھ امن صاحب کے نظم کے تقاضے پر)

ہم تو مزدورِ محبت ہیں غزل کہتے ہیں
ایک فنکار کے ماتھے کا پسینہ ہے یہی

ایک ایک شعر لال قلعہ اور جشنِ آزادی کے مشاعرے، موضوع اور ماحول سے ہم آہنگ ہو گیا۔ غزل دو بار پڑھوائی گئی اور کئی سال تک 'آنسوؤں کی مئے بنی زخموں کا پیمانہ بنا' والی غزل اور یہ غزل لال قلعہ کے مشاعروں میں کئی سال تک دوبارہ تقاضہ کر کے سنی گئی۔ اور تقاضہ کرنے والوں میں پیش پیش عرشؔ ملسیانی اور روشؔ صاحب مرحوم رہتے تھے۔

اس کے بعد کی جو غزلیں مجھے یاد ہیں کہ لال قلعہ کے مشاعرے میں خواص کے درمیان بیحد پسند کی جاتی رہیں۔ دُہرائی جاتی گئیں اور ذکروں میں آتی رہیں وہ یہ ہیں:

دنیا ڈوب چلی تو ڈوبے دورِ مئے گلفام چلے
ساقی ہاں پیمانہ چھلکے، جام چلے ہاں جام چلے
پیرِ مغاں کی بے مہری پر پھینک کے ہم بھی جام چلے
ساغر کی محتاجی کیسی چلّو سے جب کام چلے
مئے پہنچے تو سب تک پہنچے دَور چلے تو عام چلے
چل ساقی وہ چال کہ جس سے میخانے کا نام چلے
دل کہتا ہے فصل جنوں کے آنے میں کچھ دیر نہیں
اب یہ ہوا چلنے ہی کو ہے صبح چلے یا شام چلے

اس کے بعد غالباً یہ غزل پڑھی تھی:

ہر التجا پہ کہے ہے خدا سے جا کہیے — کوئی کہو کہ کوئی یوں کہے تو کیا کہیے
جب اُس کو پیار کیا ہے جب اُس کو چاہا ہے — وہ بے وفا سہی کیا اُس کو بے وفا کہیے

سجی ہے خنجر و شمشیر و دار سے محفل | یہاں غزل نہیں کہیے تو اور کیا کہیے
جفا شعار ، عدو دوست ، آشنا دُشمن | ہم اُس کو کیا نہیں کہہ سکتے پھر بھی کیا کہیے

کرے ہے وار اس ادا سے کہ جی یہ چاہے ہے
ہر ایک وار پہ قاتل کو مرحبا کہیے

بعد کے دو سال میں یہ دو غزلیں پڑھی:

تم جانو تمھیں کیا کہے ہے کیا نہ کہے ہے | ہم کو جو دیکھے ہے سو دیوانہ کہے ہے
اُڑ اُڑ کے یہ خاکسترِ پروانہ کہے ہے | کر کے بھی دکھا دے ہے جو دیوانہ کہے ہے
جو توڑنے والے ہیں کہاں ان کو یہ معلوم | ٹوٹے ہے تو کیا ٹوٹ کے پیمانے کہے ہے
سوچوں ہوں تو میں سوچ کے رہ جاؤں ہوں حیراں | کیا تم کہو ہو کیا دلِ دیوانہ کہے ہے
چھیڑے ہے کوئی تذکرۂ اہلِ وفا جب | منہ پھیر کے کچھ شمع سے پروانہ کہے ہے

نغموں کو میرے سن کے ہے بلبل کا جگر چاک
دیوانہ ہی سمجھے ہے جو دیوانہ کہے ہے

……..……….

یہ شب انھیں زُلفوں کی کرامات لگے ہے | سنتے تھے غزل میں یہ وہی رات لگے ہے
پتھر کی طرح تیری ہر اِک بات لگے ہے | دل توڑ کے ناصح تجھے کیا ہات لگے ہے
ہم دونوں میں ہے بس اسی اِک بات پہ تکرار | وہ دن کہے ہے اور ہمیں رات لگے ہے
ہم نے جو دیا ہے وہ ہمیں جان رہے ہیں | سرمایۂ غم مفت کہاں ہات لگے ہے
اوروں سے محبت بھی تعلق بھی وفا بھی | ہم سے تو کبھی کی نہ ملاقات لگے ہے

آرام کہاں اہلِ وفا کو کسی کروٹ
اِک آگ ہے سینے میں جو دن رات لگے ہے

اور آخر میں یہ غزل بھی جو آپ سب کی زبان پر ہے گرچہ یہ لال قلعہ میں پڑھی جانے والی آخری غزل نہیں ہے:

دن ایک ستم ایک ستم رات کرو ہو | وہ دوست ہو دشمن کو بھی تم مات کرو ہو
ہم خاک نشیں تم سخن آرائے سرِبام | پاس آ کے ملو دُور سے کیا بات کرو ہو

یوں تو کبھی منہ پھیر کے دیکھو بھی نہیں ہو جب وقت پڑے ہے تو مدارات کرو ہو
ہم کو جو ملا ہے وہ تمھیں سے تو ملا ہے ہم اور بھلا دیں تمھیں؟ کیا بات کرو ہو
دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو
بکنے بھی دو عاجؔز کو جو بولے ہے بکے ہے
دیوانہ ہے دیوانے سے کیا بات کرو ہو

لال قلعہ کا مشاعرہ پنڈت گوپی ناتھ امؔن صاحب کے دورِ نظامت ہی میں آہستہ آہستہ سنجیدہ اور پسندیدہ ماحول کھونے لگا۔ امؔن صاحب کی نگاہ شعرا اور سامعین دونوں کے انتخاب میں بہت تیز اور چوکنّا تھی۔ اُن کے قویٰ کا اضمحلال بتدریج اُن کی گرفت ڈھیلی کرنے لگا اور پھر شعرا میں بھی اور سامعین میں بھی غیر سنجیدہ اور غیر پسندیدہ عناصر داخل ہونے لگے۔ دو تین مشاعرے بے دِلی سے پڑھ کر تقریباً ۱۹۷۲ء میں لال قلعہ کا مشاعرہ بالکل ترک کیا۔ آخری مشاعرہ جو میں نے کنور مہندر سنگھ بیدی کی نظامت میں پڑھا اُس میں جشنِ آزادی کے عنوان سے وہ نظم پڑھی جس پر گرفت کا پچاس فیصد مجھے خطرہ تھا۔ ویسے تو یہ خطرہ مجھے اپنی غزلوں کے پڑھنے کے وقت بھی درپیش رہا اور ہمیشہ پیشِ نظر رہا، اور امریکہ کے اکثر مشاعروں میں غزلیں سن کر پرانے سمجھدار باذوق پکار اُٹھتے تھے۔ ’عاجؔز صاحب آپ اب تک باہر کیسے ہیں؟‘‘ چنانچہ واشنگٹن کے گذشتہ مشاعرے میں جو دسمبر ۱۹۸۴ء میں ہوا میں نے احمد فراز صاحب کے سامنے غالبؔ کا یہ شعر پڑھ ہی دیا:

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

اور اس کے بعد اپنا ایک شعر یاد آ گیا:

ہم تو سر کو تلہتّی پر رکھے رکھے پھرتے ہیں
اور بات اِس شہرِ ستم کا قاتل قاتل جانے ہے

۱۹۶۶ء میں سفرِ حج پیش آیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد یہ سفر ہوا تھا اس لیے حجازِ مقدس میں بہت سے ایسے احباب اور بزرگوں سے ملاقات ہوئی جن سے ملنے کو آنکھیں ترستی تھیں۔ اُن ملاقاتوں سے دل کی کیفیت میں ایک اور انقلاب آیا۔ اُردو کے مروّجہ اندازِ بیان اپنی گھریلو بول چال کی زبان کی شمولیت میرے جذبات، خیالات اور کیفیات سے زیادہ ہم آہنگ معلوم ہوئی۔

اور میں نے یہ غزل جدّہ ہی میں ہندوستانی سفارت خانے کے مشاعرے میں سُنائی:

تم جانو تمھیں کیا کہے ہے کیا نہ کہے ہے
ہم کو تو جو دیکھے ہے سو دیوانہ کہے ہے

جدّہ سفارت خانہ کا مشاعرہ تین نشستوں میں ختم ہوا۔ پہلی نشست آٹھ بجے سے دس بجے شب تک چلی۔ میں نے تکان کا اظہار کیا تو صدر مشاعرہ مسٹر انور علی گورنر سعودی عرب ریز رو بینک بادلِ ناخواستہ اُٹھے چہرے پر مایوسی کے اثرات تھے۔ میں نے ایک گھنٹہ اور بیٹھنے کا وعدہ کیا۔ وہ بہت خوش ہوکر بیٹھے۔ گیارہ بجے مشاعرہ ختم ہوا۔ انورؔ صاحب ہال سے نکل گئے۔ کچھ اور لوگ گئے۔ قریب کے لوگ بیٹھے رہے۔ دس منٹ کے اندر انورؔ صاحب اور ان کے ساتھ نکلنے والے حضرات پورے مجمع کی صورت میں پھر ہال میں آئے اور ایک گھنٹہ وقت کی اور درخواست کی اور پھر مشاعرہ ایک بجے شب میں ختم ہوا۔ ہندوستانی سفیر جناب مدحت کاملؔ قدوائی نے مسکرا کر کہا:

''ہم سب سمجھے ہیں تم کیا بولو ہو اور کا ہے بولو ہو''

اُن کا جملہ یاد رہ گیا۔ مصرع موزوں نہیں تھا، لیکن ایک راستہ اور ایک اشارہ تھا۔ حج سے واپس آیا تو دہلی کلاتھ ملس کے مشاعرے کا دعوت نامہ، دو تین رجسٹرڈ یاد دہانیاں اور دو ٹیلی گرام رکھے ہوئے تھے۔ دہلی کلاتھ ملس کا یہ پہلا دعوت نامہ تھا۔ میں شریک ہوا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کی وجہ سے پاکستانی شعرا شریک نہیں تھے۔ دہلی کلاتھ ملس کا مشاعرہ ایک خاص اور منفرد شان و شوکت ،انتظام اور اہتمام، نظم وضبط اور حسن و ذوق کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ ہندوستان کے منتخب شعرا پندرہ یا اٹھارہ کی تعداد میں شاندار اسٹیج پر جس کے تین طرف ٹیلی ویژن کے کیمرے اور لائٹ لگے ہوئے تھے۔ سامنے اسٹیج کے نیچے فوم کے گدّوں کا فرش جس پر اہتمام سے دہلی، میرٹھ، مراد آباد، مظفر نگر سہارن پور کے منتخب، صاحبِ ذوق، سخن شناس سامعین کو خصوصی دعوت دے کر بلا کر بٹھایا جاتا تھا۔ دہلی یونیورسٹی کے اُردو فارسی کے اساتذہ، نقّاد اور مصنّفین بھی رہتے تھے۔ اُس کے بعد ہزاروں کی تعداد میں صوفے اور گدّے دار کُرسیاں جن پر دہلی کے معزّزین، وزرا اور ممبرانِ پارلیمنٹ، ہائی کورٹ کے جج اور سرکاری اونچے افسران۔ منتخب مجمع تقریباً دس ہزار کا ہوتا تھا۔ اسٹیج پر پندرہ یا بیس شعرا، بمبئی، لکھنؤ، حیدر آباد اور دہلی کے اور درمیان میں صدر مشاعرہ۔ خواہ صدر جمہور یہ وزیر اعظم یا نائب صدر جمہوریہ۔

دائرے میں بیٹھے ہوئے شعرامیں سب سے آگے فراقؔ صاحب، پھراُن کے بعد بمبئی دہلی کے شعرا۔کیفیؔ اعظمی،علی سردارؔ جعفری، جاں نثار اخترؔ، اخترالایمانؔ ،سکندرعلی وجدؔ،شاذتمکنتؔ،جگن ناتھ آزادؔ، ساغرؔنظامی،نشورؔواحدی، مجروحؔ سلطان پوری،عرشؔ ملسیانی،مخدومؔ محی الدین۔اور حلقے کے دوسرے کنارے پر عرشؔ ملسیانی کے والد جوشؔ ملسیانی اور دوشعرا صباؔ افغانی اور ایازؔ جھانسوی۔شنکرؔ اورشادؔ دہلوی، مالکان دہلی کلاتھ ملس جوبیخودؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔دونوں شاعر تھے،دونوں صاحبِ دیوان تھے۔انھیں دونوں کے نام پر دہلی کلاتھ مل نے ایک ٹرسٹ قائم کیا تھا۔ اُسی کے تحت ہرسال یہ مشاعرہ ہوا کرتا ہے۔اِن دونوں مرحوم شعراشنکرؔ اورشادؔ دہلوی کے دیوان سے ایک ایک غزل پڑھنے کے لیےعموماً صباؔ افغانی کو بمبئی سے اورایازؔ جھانسوی کوجھانسی سے بلایا جاتا تھا۔ان کی آواز بھی اچھی تھی۔ ہاں، بیکلؔ اُتساہی بھی مدعوئین شعرامیں ہوتے تھے۔وہ گیت کار کی حیثیت سے ہندی داں سامعین کی رعایت سے بلائے جاتے تھےاوراب بھی بلائے جاتے ہوں گے۔تو میں نے پہلے دن دہلی کلاتھ ملس کے مشاعرے کا یہی منظر دیکھا۔شعراسب میرے شناسا تھے جولال قلعہ کےمشاعرے میں بھی ہوا کرتے تھے۔فراقؔ صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۲ءیا ۱۹۵۳ءمیں گیا کالج کے مشاعرے میں ہوئی۔ جہاں غالبؔ کےمصرع طرح پرمشاعرہ تھا:

''کون جیتا ہےتری زُلف کےسرہونے تک''

میں نےغزل پڑھی۔ پوری غزل پہلے مجموعے میں ہے سن لیجیے:

دیکھ لی آپ کی تاثیراثر ہونے تک — شب کو جوحال تھاباقی ہےسحرہونےتک

انقلابات ابھی دیکھئے لائے کیا کیا — دوش سے زُلف تری تابہ کمرہونے تک

اور ہے آج تری راہ گزر کا عالم — اور عالم تھا تری راہ گزر ہونے تک

پوری غزل ہندوستان کی آزادی کی روح اور جسم کےتضاد کی تصویر ہے۔میں نے غزل شروع کی تو فراقؔ صاحب اپنی گول گول بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔جب تیسرے شعر پر پہنچا:

اور ہے آج تری راہ گزر کا عالم
اور عالم تھا تری راہ گزر ہونے تک

تو فراقؔ صاحب گاؤتکیہ کی ٹیک چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ ہاں جی'اور عالم تھا تری راہ گزر ہونے تک'، 'جیتے رہو'اُس کے بعدسر جھکا کر کچھ مغموم ہوگئے۔دوسری ملاقات بی۔ اِن۔ کالج پٹنہ کے سالانہ

جلسہ میں ہوئی۔ اور میں نے غزل پڑھی تھی:

کہلواتا ہے جو دورِ جہاں کہنا ہی پڑتا ہے
کبھی نامہرباں کو مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

جب یہ شعر پڑھا:

بھلا ہم اور تجھ کو ناز بردارِ عدو کہتے؟
مگر اے بے نیازِ دوستاں کہنا ہی پڑتا ہے

تو فراقؔ صاحب جو ہمیشہ شوخ رہتے ہیں۔ بہت سنجیدہ ہوگئے اور دو تین بار دہرایا:

"مگر اے بے نیازِ دوستاں کہنا ہی پڑتا ہے"

اس کے بعد لال قلعہ کے مشاعروں میں فراقؔ صاحب موجود رہے، آنکھیں پھاڑ کر سنتے رہے۔ رانچی کے مشاعرے میں ہونٹوں کو سکوڑ کر 'وہ وہ' کرتے رہے مگر کچھ بولے نہیں ۱۹۶۶ء میں دہلی کلاتھ ملس کے مشاعرے میں جب میں نے غزل پڑھی تو وہ بالکل میری بغل ہی میں حلقے کی دائیں طرف سب سے آگے بیٹھے تھے اور میں دائرے کے عقب میں سب کی پشت پر چھپ کر بیٹھا تھا۔ میرا نام پکارا گیا تو میں اُٹھ کر آیا۔ تو میں نے وہ غزل پڑھی جو جدّہ سے آنے کے بعد مدحت کامل قدوائی کے جملے سے متاثر ہو کر اور ۱۹۶۵ء کی جنگ کے پس منظر اور بعد کے پیش منظر کو سامنے رکھ کر لکھی تھی۔ صدارت کی کُرسی پر غالبًا نائب صدر جمہوریہ تھے:

زخموں میں جب ٹیس اُٹھے ہے تم ہی تو یاد آؤ ہو
ہم تم کو پہچان رہے ہیں منہ پھیرے کیا جاؤ ہو
اتنا کیوں سنورو ہو اتنا زُلفیں کیوں سلجھاؤ ہو
پیارے ہم سب جانے ہیں تم کیا ہو کیا کہلاؤ ہو
بھولے بسرے ارمانوں کو چھیڑو ہو اُکساؤ ہو
تم تو اور اے ٹھنڈی آہو دل میں آگ لگاؤ ہو
زنجیریں کیا ہاتھ آئی ہیں مچلو ہو اِتراؤ ہو
جب چاہو ہو کھولو ہو جب چاہو ہو پہناؤ ہو

مجمع یہ نئی زبان سن کر کچھ گومگو میں تھا۔ شاید حیرت میں تھا۔ کہیں کہیں سے آواز تعریف و

تحسین کی آجاتی تھی ورنہ عام طور سے مجمع خاموش تھا۔ اور میں تو آنکھ بند کر کے پڑھتا ہوں۔ کبھی کبھی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ فراقؔ صاحب ہتھیلی پر اپنی ٹھوڑی رکھے ہوئے آنکھیں پھاڑ کر خاموش مجھے دیکھ رہے تھے۔ جب میں مقطع پڑھ کر اُٹھنے لگا:

موسمِ گل کی کچھ باتیں ہیں لیکن تم سے کون کہے
تم تو بس سنتے ہی عاجزؔ دیوانے ہوجاؤ ہو

تو فراقؔ صاحب چونک گئے۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا 'میاں پھر پڑھو'، 'ہاں میاں پھر پڑھو' اور پوری غزل مجھ سے پھر پڑھوائی۔ دوسری بار مجمع نے بھی دل کھول کر تعریف کی۔ اس کے بعد دہلی کلاتھ ملس کے مشاعرے میرے اعتبار سے یادگار ہیں کہ میں نے ہمیشہ زمانے کی نبض اپنی غزلوں میں منتقل کی اور جوش اور اعتماد سے غزلیں پڑھیں دوٹوک پڑھیں اور براہِ راست مخاطب کر کے پڑھیں۔

میرے دونوں مجموعوں میں کوئی غزل ایسی نہیں جس کا تاریخی پس منظر نہ ہو، جس میں میری شخصیت نہ ہو۔ میرے اپنے تجربات نہ ہوں، میرے دل کی دھڑکنیں نہ ہوں۔ میں نے شاعری محض شاعری کے لیے کبھی کی ہی نہیں۔ میں نے شاعری کو کارِ بے کاراں کبھی سمجھا ہی نہیں۔ شاعری میری زندگی میں کسی اور راستے سے آئی ہی نہیں۔ فن کے راستے سے نہیں آئی۔ فکر کے راستے سے نہیں آئی۔ کسب اور ریاض کے راستے سے نہیں۔ مجلسوں، محفلوں اور دوستوں کی صحبتوں کے راستے سے نہیں، کسی ارادے اور منصوبے کے راستے سے نہیں۔ دماغ کی کسی شاخ سے نہیں پھوٹی۔ یہ دل کے سر چشمے سے پھوٹی:

غزلوں کے پردے میں بیٹھے میرؔ تقی فرماتے ہیں
دل ٹوٹے ہے تب ہونٹوں پہ گیت سہانا آئے ہے

اس لیے:

بازاروں سے مول منگا کر رنگ تو سب بھر لیتے ہیں
کم ہیں جن کو خونِ جگر سے پھول بنانا آئے ہے

ابتدا میرؔ کے اس شعر کا ماحول اور میرا ماحول ایک رہا:

جب یاد تجھے کیجیے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

میرے پہلے دورِ شاعری میں ایسا ہی ہوا:

غربت میں وطن کا جو کبھی نام لیا ہے
وہ چوٹ لگی ہے کہ جگر تھام لیا ہے

رفتہ رفتہ اپنا وطن اور دوسروں کا وطن اپنی سرحدیں توڑ گیا اور میرؔ کے اس شعر کی دُنیا میرے دل میں زندہ ہوگئی:

شاید کسی کے دل کو لگی اُس گلی میں چوٹ
میری بغل میں شیشۂ دِل چور ہوگیا

میرؔ کے اشعار میں نے قصداً اب حوالے میں پیش کیے ہیں۔ اِن اشعار کو یا میرؔ کے اشعار میں نے سنے بھی نہیں تھے۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ اُردو کے تمام شعرا میرے مطالعہ میں رہے۔ غالبؔ تک کو خوب پڑھا۔لیکن میرؔ کے ایک آدھ شعر کے علاوہ:

جو اس شور سے میرؔ سوتا رہے گا　　　تو ہم سایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مجھے میرؔ کے اشعار سے واقفیت بھی نہ تھی۔سبب کیا تھا میں نہیں کہہ سکتا۔۱۹۶۶ء میں جب پڑھانے لگا تو میرؔ سے آشنائی پیدا کرنی پڑی اور اخترؔ صاحب نے یہ سمجھ کر مزاج میرؔ سے مشابہ ہے مجھے ایم اے کے کلاسوں میں میرؔ اور آتشؔ ہی پڑھانے کو دیا جب پڑھانے لگا اور ذکرِ میرؔ پڑھا تو معلوم ہوا کہ ہاں۔ سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا:

جب معلوم ہوا تب اپنی شاعری میں ۱۹۶۸ء کے بعد میری زبان پر میرؔ کا نام آنے لگا:

تری محفل میں کس کی آنکھ ہے جو نم نہیں پیارے
غزل گوئی ہماری میرؔ سے کچھ کم نہیں پیارے

……………

ہمیں یہ دیکھ کے کہتے ہیں آج کل والے　　　وہ آگئے روشِ میرؔ کی غزل والے

……………

غزلوں کے پردے میں بیٹھے میرؔ تقی فرماتے ہیں
دل ٹوٹے ہے تب ہونٹوں پر گیت سہانا آئے ہے

……………

دلّی میں بہار آئی عاجزؔ افسوس جنابِ میرؔ نہیں
جب زخم رہا مرہم نہ رہا مرہم ہے تو زخمِ دل نہ رہا

میرؔ کی شاعری میں مجھے ایک ہم آواز ملا۔ پھر میں نے میرؔ کو پڑھا اور اس کے بعد میرؔ کی عظمت اتنی بڑھ گئی کہ غالبؔ کی عظمت کا خواب ٹوٹ گیا، تو آپ میرؔ کو پڑھیں گے تو دہلی سے لکھنؤ آنے کے پہلے بھی ان کی غزلوں میں ایسے اشعار ملیں گے جو میریت سے ہم آہنگ نظر نہیں آتے۔ اور لکھنؤ آنے کے بعد تو کلیات کا بیشتر حصہ آہنگِ میرؔ سے بہت دُور ہے۔ اسی لیے ''بلندش بغایت بلند اور پستش بغایت پست'' کا تاریخی جملہ اُن کی شاعری پر ہمیشہ کے لیے چست ہو گیا۔ سبب یہ ہے کہ میرؔ کو ضرورتاً یا رسماً کچھ نہ کچھ ماحول سے متاثر ہونا پڑا۔ میرا تاثر ماحول سے بالکل قائم نہیں ہوا۔ میرا ماحول کچھ دنوں تک صرف تیلہاڑہ رہا اور بجا رہا اور درست رہا اور واضح رہا۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء میں میں نے پہلی مرتبہ پٹنہ کالج کے بی اے لکچر تھیٹر ہال میں غزل پڑھی:

جہاں فریاد بھی گوشِ نزاکت پر گراں گزرے
ہم ایسی بے کسی کی زندگی سے مہرباں گزرے
مبارک برق تجھ کو لالہ و گل کی نگہبانی
کہ اب تو گلستاں سے دردمندِ گلستاں گزرے

سامنے اخترؔ اورینوی صاحب بیٹھے تھے۔ انھوں نے جھک کر پروفیسر نواب کریم صاحب سے پوچھا ''یہ چنگاریاں کہاں سے نکل رہی ہیں؟'' نواب کریم صاحب نے کہا۔ ''تیلہاڑہ کی سرزمین سے نکل رہی ہے۔'' یہ واقعہ مجھ سے نواب کریم صاحب نے دُہرایا۔

تو میرا ماحول بنیادی حیثیت سے اور مرکزی حیثیت سے تیلہاڑہ ہی رہا۔ چاہے میں دلّی میں رہوں پٹنہ میں رہوں، کلکتہ میں رہوں مجھے ماحول کی کوئی خبر نہیں۔ دوسرے کیا کہہ رہے ہیں، کیا سوچ رہے ہیں، کس طرح سوچ رہے ہیں، کس طرح کہہ رہے ہیں۔ میں نے ایک ہی طرح سوچا، ایک ہی طرح اب تک سوچتا ہوں، ایک ہی طرح اب تک کہتا ہوں۔ اسی لیے پٹنہ ہو یا کلکتہ، دہلی ہو یا بمبئی، لکھنؤ ہو یا مدراس، ہندوستان ہو یا پاکستان، امریکہ ہو یا کناڈا۔ میری آواز کسی سے نہیں ملتی، میرا لہجہ کسی سے نہیں ملتا، آہنگ کسی سے نہیں ملتا۔ موضوع و مواد کسی سے نہیں ملتا۔ اُسلوب و طرز ادا کسی سے نہیں ملتا۔ اسی لیے آپ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۷ء تک کی تمام غزلیں ایک ایک کر کے پڑھ جایئے۔ کوئی ایک شعر بھی آپ ایسا نہیں نکال سکتے جو میرے آہنگ موضوع مواد یا اسلوب سے الگ ہو۔ میں نے الگ ہو کر رسماً کوئی شعر کہا ہی نہیں۔ اسی لیے کلیم الدین

احمد مرحوم کو بھی ان کے اعتراضات یا اعتراض کا جواب کہیں ملا تو میری غزلوں ہی میں ملا۔ اقبالؔ کی 'بالِ جبرئیل' کی غزلوں کو مستثنیٰ کر کے جو ایک موضوع پر لکھی گئی ہیں کسی اُردو غزل گو کے دیوان کے اشعار میں یہ سطح، یہ ربطِ خیال اور حقیقت اور رومان کی یہ ہم آہنگی نہیں ملے گی۔ فراقؔ ہوں یا فیضؔ، حسرتؔ ہوں یا جگرؔ یہ حضرات بڑے شاعر ہیں۔ یہ حضرات اپنے اپنے مخصوص مزاج میں مست ہیں اور اپنے اپنے مخصوص رومانی طلسمات میں خراماں یہ سب اپنے اپنے مخصوص تجربات میں سچّے اپنے اپنے مخصوص مشاہدات میں مخلص اور اظہار و بیان میں کھرے ہیں۔ میرا کوئی مخصوص مزاج فن نہیں، میرا کوئی رومانی طلسم نہیں۔ میں کوئی خواب نہیں دیکھتا۔ میں نے کوئی رومانی دُنیا تعمیر نہیں کی ہے جسے برپا کرنے کا خواب اپنے فن میں دیکھوں۔ میں کبھی زمین سے ایک اِنچ اوپر پرواز نہیں کرتا۔ میرے تلوے زمین میں دَھنسے ہوئے ہیں۔ میری انکھیں اس زمین میں پیوست ہیں۔ میرے خیالات، میرے تجربات، میرے مشاہدات سب کچھ اس حقیقی زمین اور اس حقیقی زمین سے اُبھرنے والی حقیقی زندگیوں کے ساتھ دست گریباں ہیں۔ جو کچھ زمین سے اُبھر رہا ہے، جو کچھ اُگ رہا ہے، جو کچھ پیدا ہو رہا ہے وہ میرے فکر وفن کے جال میں اسیر ہو رہا ہے۔ کوئی رومانی طلسم بنا کر زندگی کو وہاں تک پہنچانے کا خواب دیکھنا آسان ہے۔ لیکن زندگی کی بدرنگیوں کو، بدبوؤں کو، بدعنوانیوں کو بدمعاشیوں کو بداعمالیوں کو نقوش میں تبدیل کرنا کہ اُن بدرنگیوں کو بھرپور دیکھا بھی جا سکے سمجھا بھی جا سکے، کراہیت بھی محسوس کی جا سکے اس کے باوجود اس میں ایسی کشش ہو کہ اُس سے بھاگا نہ جا سکے فرار اختیار نہ کیا جا سکے بلکہ اُس کے قریب آ کر اُسے گلے سے لگایا جا سکے کلیجے سے ساٹا جا سکے اس کا بوسہ لیا جا سکے۔ جیسے کسی کا بچّہ، کسی کا باپ، کسی کا بھائی، کسی کی بیوی، کسی کا شوہر زخمی ہو جائے لہولہان ہو جائے زخموں سے لہو سے لت پت ہو جائے مکروہ ہو جائے، دہشت انگیز ہو جائے، خوفناک ہو جائے، لوگ دیکھ کے خوفزدہ ہو کر بھاگنے لگیں، ناک پر رومال رکھ کر کنارے ہونے لگیں۔ آنکھیں نیچی کر کے الگ ہونے لگیں۔ اُس وقت اس زخمی کا باپ، بیٹا، بھائی، شوہر، بیوی ہائے بیٹا، ہائے ابّا، ہائے بھیّا، ہائے میری جان کہہ کر اس زخمی سے لپٹ جائے، اُس کے زخموں سے اپنے گال رگڑنے لگے، اُسے اپنی گود میں اُٹھائے۔ میرؔ نے یہی کیا اور میں نے یہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالبؔ کا کام، اقبالؔ کا کام، فیضؔ و فراقؔ کا کام، حسرت و جگرؔ کا کام آسان ہے میرؔ کا کام آسان نہیں۔ اس لیے کلیمؔ کا کام

بھی آسان نہیں ہے۔ تھانے دار کا کام، کوتوال کا کام، امیر صاحب، رئیس صاحب، وزیر صاحب، بادشاہ صاحب کا کام آسان ہے۔ ’’لے جاؤ اس زخمی کو اس کو اسپتال میں داخل کرو۔ اس کی مرہم پٹّی کرو، دوا دارو کرو، کھانے پینے کا انتظام کرو آرام و راحت کا سامان کرو۔‘‘ یہ کام آسان ہے خود بیٹھ کر لہو صاف کرنا، زخمیوں کو دھونا مرہم پٹی کرنا، گود میں لے کر بیٹھنا، چمچی سے پیار اور رحمت اور محبت کا پیکر بن کر دوا دودھ حلق میں ڈالنا، ٹہلانا، لوریاں دینا، اپنے بہتے ہوئے آنسو پونچھتے جانا، سسکیوں کو دَبائے جانا درد انگیز مسکراہٹوں سے تشفی دینا، یہ کام مشکل ہے۔ میؔر نے یہی مشکل کام کیا ہے۔ میں بھی یہی مشکل کام کر رہا ہوں یا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میؔر بڑے جی دار تھے، بڑے صاحبِ ظرف تھے، بڑے خوددار تھے۔ مجبوری ہی میں سہی، بہکاوے ہی میں سہی، دباؤ اور اصرار سے ہی سہی لکھنؤ آ گئے۔ اور پورب کے رہنے والوں پر اپنی بود و باش کی للکار سنانے کے باوجود لکھنؤ میں رہ گئے۔ آصف الدولہ کے استاد بن گئے۔ کعبہ پیچھے ہو گیا کلیسا آگے ہو گیا۔ ایمان انھیں روکتا رہا لیکن کفر بھی کھینچتا رہا۔ اس کھینچ تان میں ’ساعدِ سیمیں‘ اور ’عطار کے لونڈے‘ کی قسمت کی بات بھی اکثر کر گئے۔ یہ نہیں کہ مجھے نہ کسی ’لکھنؤ‘ کی قسم کا کوئی شہر ملا نہ آصف الدولہ قسم کا کوئی بادشاہ۔ ملا لیکن میں نے قبول نہیں کیا۔ بڑے پیغامات آئے، بڑے بڑے تقاضے آئے، کراچی چلے آؤ۔ بہترین دُکان بہترین مکان تمھارے لیے تیار ہے۔ دوست ہیں، احباب ہیں۔ پڑوسی ہیں، بستی والے ہیں۔ اپنے ہیں، بیگانے ہیں، قرابت دار ہیں، رشتہ مند ہیں، عافیت ہے، حفاظت ہے، آ جاؤ دن عید ہے، رات شبِ براًت ہے۔ وہاں کیا رکھا ہے؟ آگ ہے، خون ہے، چوٹ ہے، زخم ہے۔ میں نے کہا آگ لگ چکی، چوٹ آ چکی، زخم کھا چکا، پیرہن جل چکا، دامن چاک ہو چکا۔ اب رہا کیا کہ بچانے کو جاؤں۔ یہ آگ اسی زمین کی، زخم یہیں کی تلوار کی، چوٹ یہیں کے پتھر کی۔ اس کا علاج یہیں ہے، اس کا مرہم یہیں ہے۔ یہ چوٹ، یہ زخم، یہ داغ، یہ جلن، یہ خلش، یہ تپش، یہ آہ، یہ کراہ، یہ آنسو وہاں کون سمجھے گا۔ نہ سمجھے گا تو مال کون پہچانے گا، نہ پہچانے گا تو کون خریدے گا، نہ خریدے گا تو کاروبارِ زندگی کیسے چلے گا:

غزل جو سنتا ہے میری عاجزؔ وہ مجھ کو حیرت سے دیکھتا ہے
کہ دل پہ گزری ہے کیا قیامت مگر جبیں پر شکن نہیں ہے

یہ وہاں کون دیکھے گا کون سمجھے گا۔ اور فرض کر لو کہ میں سمجھا بھی دوں، لوگ سمجھ بھی جائیں تو لوگ

کہیں گے لاؤ مرہم رکھ دیں، آؤ دوا لگا دیں، آؤ پٹی باندھ دیں، آؤ انجکشن دے دیں، نیند کی ٹکیہ دے دیں، آرام سے سو رہو۔ زخم بھر جائیں گے، چوٹ اچھا ہو جائے گا، درد مٹ جائے گا۔ خلش جاتی رہے گی، جلن ختم ہو جائے گی، ٹھنڈک پڑ جائے گی، آنسو بند ہو جائیں گے، مسکراہٹ آ جائے گی۔ دل شگفتہ ہو جائے گا۔ تو ہائے کلیم ایسا ہو جائے گا؟ سب کچھ کھو دے گا، زخم بھی، چوٹ بھی درد بھی، سوز بھی، تپش بھی، خلش بھی، آنسو بھی، آہیں بھی، کراہیں بھی۔ ایسا مفلس ہو جائے گا، ایسا کنگال ہو جائے گا، تو یہاں والے کیا کہیں گے؟ یہ تیلہاڑہ (تیلہاڑہ کی غم انگیز اور دردناک داستان، کلیم عاجز کی کتاب 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' میں پڑھیے) والے کیا کہیں گے؟ یہ سنگی مسجد والے کیا کہیں گے؟ پیر یوسف ابدال کیا کہیں گے؟ شاہ عبدالحفیظ کیا کہیں گے؟ شاہ اطہر حسین، واعظ نانا، مفتی عبدالحفیظ نانا، دمو ماموں، حسیب بھائی، قاضی ظہور نانا، نجو نانا، بشیر ماموں، شفیع نانا، ذکی نانا، قیمن نانی، چندا نانی، رقیہ خالہ، شکیلہ جہاں آرا کیا کہیں گی؟ امّاں کیا کہیں گی؟ بنّی کیا کہے گی؟ ہائے کلیم نے سب کھو دیا، سب پھینک دیا۔ ساری امانت کھا گیا۔ ساری پونجی ہڑپ کر گیا۔ ہم نے بھوکے رہ کر، پیاسے رہ کر، جل بھن کر، چوٹ کھا کر، زخم کھا کر، لہو دے کر، آنسو دے کر، جان دے کر اپنی پونجی اس کے حوالے کی۔ جان دی اس لیے کہ جان سے زیادہ ایمان عزیز تھا، گھر دوار دیا اس لیے کہ وقار زیادہ عزیز تھا۔ خاک دُھول سے زیادہ اصول محبوب اور پیارا تھا۔ راحت سے زیادہ عزّت پیاری تھی۔ دولت سے زیادہ شرافت و عصمت پیاری تھی۔ تو ہم نے اسے یہ سب بچا کر دیا۔ ایمان دیا، وقار دیا اصول دیا، عزّت، شرافت یہ سب امانت اُسے سونپی۔ کلیم نے سب بیچ دیا؟ ہمارے لہو کی سُرخی ہمارے آنسوؤں کی گرمی بچوں کا رونا، بچیوں کا بلکنا، کمسنوں کی سسکیاں، بوڑھوں بوڑھیوں کی دعائیں، جوانوں کے حوصلے، لڑکیوں کی دلیریاں، کنواریوں کی جی داریاں، بیاہتاؤں کی بے مثال بہادریاں اور پھر ان سب کی مظلومیت، معصومیت، بے گناہیاں، مظلومیتوں، معصومیتوں، بے گناہوں کا انجام۔ نہ ان کی کوئی یادگار، نہ ان کی کوئی تاریخ، نہ کہانی نہ گیت۔ اتنا بڑا سرمایہ، اتنی بڑی کائنات، اتنی بڑی دولت، اتنا بڑا خزانہ، درد و غم کا ایسا اتھاہ سمندر اس کے حوالے کیا گیا۔ اُس سمندر کا پانی پلاؤ، قیامت تک آنے والے درد والوں، مظلوموں کی پیاس بجھاؤ۔ اتنی بڑی مہم، اتنا بڑا منصب، درد و غم کی اتنی بڑی شہنشاہی، اتنی بڑی سلطنت اس نے گدّوں پر چار کروٹوں کے لیے، دسترخواں پر

چند لقموں کے لیے، کپڑوں کے چند جوڑوں کے لیے دن رات کے چند گھنٹوں کے آرام کے لیے غیر معتبر فانی زندگی کے لیے تھوڑے ایاّم کو خطروں، مشقتوں سے بچانے کے لیے کلیم نے فروخت کردیا؟ سنگی مسجد سے الگ ہوگیا، تیاہاڑہ سے دور ہوگیا۔ آگ، خون، زخم، بھٹک، سوز، تپش کے گلزار ابراہیمی سے نکل کر وقتی پھولوں، مخملوں، گدوں کی نقلی جنتِ شدّاد میں چلا گیا؟ فکر مندی کے تخلیقی گہوارے سے نکل کر بے فکری کے تقلیدی پنجرے میں چلا گیا؟ کلیم نے یہ سب سوچا اور فیصلہ کیا کہ اِس آگ، اِس خاک وخون کے ملبے میں زندگی ہے۔ اس سے باہر موت ہے۔ یہ ملک سمندر ہے۔ یہاں کودنا حیاتِ جاوداں ہے، ساحل پر موت ہے اور پھر اس نے قطعی فیصلہ کرلیا:

دردمندِ عشق ہیں غم سے نہ گھبرائیں گے ہم
شاعری کرتے رہیں گے اور مرجائیں گے ہم
ہوشیاروں کو مبارک تیری محفل اے خرد
صبح آئیں گے ترے در پر نہ شام آئیں گے ہم
اب کے پھر برسات میں گنجِ شہیداں پر چلیں
آسماں روئے گا اور اپنی غزل گائیں گے ہم

دل کا یہ فیصلہ ہوا۔ یہ فیصلہ بہت مشکل تھا۔ لوگ بے بلائے گئے، بے سہارے گئے، بے زادِ راہ گئے، بے توشہ وسامان گئے۔ میرے لیے بلاوے تھے۔ سامنے، پیچھے، دائیں بائیں سہارے تھے۔ بلکہ ریڈ کارپیٹ استقبال کا سامان تھا۔ ایک بہت اچھی بڑی ریڈیو کی دُکان کراچی کے سب سے نفیس بازار فریر روڈ پر دو خوبصورت فلیٹ کے ساتھ میرے کلکتہ کے مکان کے تبادلہ میں میرے دوستوں اور عزیزوں نے طے کرلیا تھا۔ لیکن دل کا یہ فیصلہ ہوا۔ خاکستر میں رہو، خطرات میں رہو، بے پناہی میں رہو، کسمپرسی میں رہو، غربت میں رہو مگر ان چہروں کے قریب رہو، اُن زلفوں کی خوشبو کے قریب رہو۔ اُن کی زخموں کی آنچ کے قریب رہو۔ اُن سے مشغولِ ارتباط رہو، محوِ گفتگو رہو۔ وہ دفن نہیں ہیں، تنہا قبروں میں نہیں ہیں، خلوتوں میں نہیں ہیں، انجمنوں میں ہیں، گلشنوں میں ہیں، نغمہ میں ہیں، گیتوں میں ہیں۔ اُنھیں دیکھو، انھیں سنو، انھیں چھوؤ۔ صرف تمھیں کو یہ حق دیا گیا ہے، سب نے مل کر دیا ہے، متفق ہو کر دیا ہے۔ انھیں کو سوچو، اُنھیں کی باتیں کرو:

ہوئے تھے چاک کیا کیا جیب وداماں یاد آتے ہیں
ہمیں پھر آج ایّامِ بہاراں یاد آتے ہیں
جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی جہاں نغمے ہی نغمے تھے
وہ گلشن اور وہ یارانِ غزل خواں یاد آتے ہیں
دل اپنا اُلجھا اُلجھا ہے طبیعت بکھری بکھری ہے
نہ جانے کس کے گیسوئے پریشاں یاد آتے ہیں
میرے سینے میں دل کا کوئی حصہ ٹوٹ جاتا ہے
جب آغازِ وفا کے عہدو پیماں یاد آتے ہیں
بہاریں سیرگاہیں چاندنی راتیں ملاقاتیں
ہمیں اب تک یہی خوابِ پریشاں یاد آتے ہیں
کہاں ہم اور کہاں یہ طرز و اندازِ سخن عاجز
غزل کہتے ہیں جب ہم، ان کے احساں یاد آتے ہیں

اس فیصلے کو تقریباً چالیس سال ہوگئے۔ چہرے کی آنکھیں بند کرکے دل کی آنکھیں کھول کر کانٹوں سے سخت جھاڑیوں سے سنگریزوں سے بھری ہوئی اس دنیا میں سخت جھونکوں میں، تند ہواؤں میں طوفانوں میں، سیلابوں میں غزلوں کے پرچم اُڑاتا ہوا، چراغ جلاتا ہوا، آنسوؤں سے چراغاں کرتا ہوا، گرتا ہوا، اُٹھتا ہوا، تھکتا ہوا، تازہ دَم ہوتا ہوا، حوصلے اور عزم سے مسکراتا ہوا، گنگناتا ہوا چل رہا ہوں۔ اوپر سے اُولے گرے، نیچے سے زلزلے آئے، سامنے سے برچھیاں آئیں، پیچھے سے چھریاں لگیں، اپنوں نے ستایا، غیروں نے رُلایا۔ وقت نے لڑکھڑایا، حادثوں نے تھرتھرایا، دُشمنوں نے ہوش اُڑایا دوستوں نے دیوانہ بنایا مگر کلیمؔ اپنی غزل خوانی سے باز نہ آیا:

جہاں غم ملا اُٹھایا پھر اُسے غزل میں ڈھالا
یہی دردِ سر خریدا یہی روگ ہم نے پالا
ترے ہاتھ سے ملی ہے مجھے آنسوؤں کی مالا
تیری زُلف ہو دوگونہ تیرا حسن ہو دوبالا
یہ سماں اُسے دکھاؤں صبا جا اُسے بلالا
نہ بہار ہے نہ ساقی نہ شراب ہے نہ پیالا

مرے درد کی حقیقت کوئی میرے دل سے پوچھے
یہ چراغ وہ ہے جس سے میرے گھر میں ہے اُجالا
اُسے انجمن مبارک مجھے فکر و فن مبارک
یہی میرا تختِ زرّیں یہی میری مرگ چھالا

حافظؔ شیرازی فرماتے ہیں:

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحیِ مئے ناب و سفینۂ غزل است

میں نے خلل سے کنارے کشی نہیں کی، گوشے میں بیٹھ کر مئے ناب کی صراحی اور سفینۂ غزل لے کر دل نہ بہلایا بلکہ وہ کام کیا جو مجھے بے حد پسند آیا۔ بہت مرغوب اور بہت محبوب نظر آیا، جو کبھی کبھی درد کے مارے انسان دوست کرتے آئے اور آتشِ نمرود کو گلزارِ ابراہیم بناتے آئے:

شاعر تو نہیں عاجزؔ سائل ہے محبت کا
کشکولِ غزل لے کر آواز لگائے ہے
اَوروں کا دُکھ درد اپنا کر نکلے ٹھوکر کھانے ہم
سب سے دیوانہ تھا مجنوں اُس سے بھی دیوانے ہم
گلشن گلشن آئے گئے لیکن نہ گئے پہچانے ہم
کس گل کے ہیں بلبل ہم کس شمع کے ہیں پروانے ہم
خون کے پیاسے دل میں ٹھنڈک سوزِ محبت سے ہوگی
دُنیا پانی مانگ رہی ہے آگ چلے بھڑکانے ہم

....

وہ غزل اُنھیں کو سنائے گا وہ چھری اسی پہ چلائیں گے
نہ کلیمؔ ان کو بھلائے گا نہ کلیمؔ کو وہ بھلائیں گے
چھری اُن کی ناز کرے نہ کیوں بھلا ناز کیوں نہ اُٹھائیں گے
ہم اُسی سے ہوں گے خفا اگر تو گلے سے کس کو لگائیں گے
وہ ان آنسوؤں کو سنگار لیں ہم اُنھیں کی زُلف سجائیں گے
یہ ستارے ٹانک کے اور بھی اُنھیں چار چاند لگائیں گے

ہم اسی گلی کی ہیں خاک سے یہیں خاک اپنی ملائیں گے
نہ بُلائے آپ کے آئے ہیں نہ نکالے آپ کے جائیں گے

کیا یہ آسان کام ہے؟ کیا ہر شخص کے کرنے کا ہے؟ نہیں مگر میں نے یہی کرنے کی ٹھانی اور جگ گزر گئے کرر ہا ہوں:

رہے گا اُن کو دیوانوں پہ غصہ ہم اُس غصّے پہ دیوانے رہیں گے
بدل سکتا نہیں ہم کو زمانہ جو ٹھانا ہے وہی ٹھانے رہیں گے

.......………..

تمھاری طرح زلفوں میں شکن ڈالے نہیں ہیں ہم
کہیں گے بات سیدھی پیچ وخم والے نہیں ہیں ہم
گلوں کی طرح ہم نے عمر کانٹوں میں بسر کی ہے
ہیں اہلِ ناز لیکن ناز کے پالے نہیں ہیں ہم
ہماری وضع پہ شمشیر والوں کو بھی حیرت ہے
بھرے ہیں زخم سے لیکن سپر ڈالے نہیں ہیں ہم

یہ آسان نہیں ہے۔ باتیں سب بناتے ہیں۔ کوئی لندن جا کر باتیں بناتا ہے کوئی بیروت اور لبنان جا کر ہوائیاں اُڑاتا ہے۔ ہم تو میدان میں اُتر کر تیور سے تیور ملا کر کہتے ہیں:

آزمانا ہے تو آ بازو و دل کی قوت
تو بھی شمشیر اُٹھا ہم بھی غزل کہتے ہیں

.......………..

ہم تو سر کو تلہتّی پر رکھے رکھے پھرتے ہیں
اور یہ بات اس شہرِ ستم کا قاتل قاتل جانے ہے

اس موضوع پر اور اپنے منصب پر اور اپنی شاعری کے مقصد پر یہ میں نے اشارے کر دیئے۔ دونوں مجموعوں کی ورق گردانی کیجیے، ایک شاہراہ ملے گی۔ کشمیر کی شاہراہ، جموں کی پہاڑیوں سے نکلنے کے بعد سرسبز وادیوں کی شاہراہ، سری نگر تک دو رویہ ہرے بھرے بلند و بالا سرو قد درخت، اُن کے پیچھے لہلہاتے ہوئے زعفران کے کھیت، ان کے پیچھے سرسبز پہاڑوں کی سرسبز ترائیاں، اُن کے درمیان سے گزرتی ہوئی سیدھی کبھی مڑتی ہوئی بل کھاتی ہوئی سڑک، سو بار بھی ہزار بار

بھی اس منظر کو دیکھتے ہوئے گزر یئے تو سڑک اور متصل منظر نیا معلوم ہوگا۔ اِن درختوں، لہلہاتے ہوئے کھیتوں، سرسبز وادیوں، ان کے درمیان چھوٹے بڑے مکانات، کسانوں کے، زمینداروں کے، کاشتکاروں کے۔ ان سب کو سمجھانے کے لیے، ان کے حسن اور حسن کے پسِ پردہ معنویت اور تاثر کو سمجھانے کے لیے کسی گائڈ کی، کسی رہنما کی، کسی تاریخ داں کی، کسی ماہر موسمیات کی، کسی دانائے نباتات کی ضرورت نہیں۔ بس گزر جائیے اور گزرتے رہیے، دیکھتے ہوئے، سمجھتے ہوئے، لذّت لیتے ہوئے، جھومتے ہوئے پیمانہ بہ پیمانہ، سبو بہ سبو، جرعہ بہ جرعہ، شیشہ بہ شیشہ پیتے ہوئے۔ اُس میکدۂ غم سے میخانۂ الم سے خم خانۂ درد ہے جس سے میں چالیس سال سے پیتا ہوا گزر رہا ہوں۔ نہ تھکا ہوں نہ آسودہ ہوا ہوں:

یہ طرزِ خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا　　جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا
غزل میں کون نئی چاشنی چکھائے گا　　اگر کلیمؔ نہ ہوگا مزا نہ آئے گا
غموں کے بوجھ سے کانپے گا تھرائے گا　　مگر مزاج جو پوچھو گے مسکرائے گا
زمانہ لاکھ اُسے تڑپائے گا رُلائے گا　　وہ مرثیہ نہ کہے گا غزل ہی گائے گا
کوئی نہ درد جہاں کو غزل بنائے گا　　یہ بوجھ اسی پہ پڑا ہے یہی اُٹھائے

جیسا کہ میں نے اس دیباچہ میں شاید کہیں کہا ہے کہ میری شاعری کو عموماً تین دَور میں تقسیم کیا جا سکتا: (۱) زخم خوردہ ہونے کا دَور (۲) زخم دینے والوں کی پہچان اور (۳) تیسرا دَور جس میں زخم دینے والے ایک شخصیت میں سمٹ آتے ہیں اور پھر مستقلاً وہی شخصیت تنہا میری غزلوں کا محبوب بن جاتی ہے۔ اس شخصیت میں علامات کی ایک پوری دنیا سما گئی ہے۔ یہ بڑی بھرپور اور جامع شخصیت ہے۔ غزل کے روایتی محبوب کی تمام نئی پُرانی خصوصیتیں اس میں زندہ ہوگئی ہیں۔ مری غزل کا محبوب رسمی یا روایتی پرانی اور فرسودہ محبوب نہیں ہے۔ زندہ ہے، توانا ہے، تمام صفات سے آراستہ ہے، پیراستہ ہے۔ اس کے اعمال، حرکات، ادائیں، باتیں، سینکڑوں سال پرانے پٹے پٹائے، جانے بوجھے، لکھے لکھائے نہیں تازہ بہ تازہ ہیں۔ افسانے کہانیاں نہیں ہیں سچائیاں اور حقیقتیں ہیں۔ وہ خود کہانی کار ہے، افسانہ ساز ہے اس کی اداؤں میں کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ اس کے غمزے، اشارے، رفتار و گفتار میں افسانے پیدا ہوتے ہیں۔ اُس کی ادائیں پُرانی تصویریں نہیں ہیں متحرک حقیقتیں ہیں۔ وہ شاعر کے تخیل کے ہاتھ میں بے جان آلہ نہیں ہے۔ بڑا باشعور

ہے، تجربہ کار ہے، ٹھوس ہے، ہشیار ہے، چالاک ہے، دانش مند ہے، ماہر ہے مدبّر ہے۔ صاحبِ اختیار ہے۔ واقعی وہ جدھر دیکھتا ہے زمانہ اُدھر ہی دیکھتا ہے۔ جدھر مڑتا ہے وقت اُدھر ہی مڑ جاتا ہے۔ جدھر اشارہ کرتا ہے کاروانِ وقت اُدھر ہی چل پڑتا ہے۔ مجھے اس کے سمجھنے میں، اُس کا پیچھا کرنے میں، اس کی اداؤں، غمزوں، اشاروں کو جاننے بوجھنے میں، اس کی تہہ تک پہنچنے میں اپنے وجود کی تمام قوتوں کو صرف کرنا پڑتا ہے۔ وہ مجھے ہوا کھلاتا ہے، چلاتا ہے، نچاتا ہے، دِق کرتا ہے، توڑتا ہے، اینٹھتا ہے لیکن بہ ایں ہمہ مجھ سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا ہے۔ ہم دونوں ماہر کھلاڑی ہیں۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ طاقتور ہے۔ شکار شکاری سے زیادہ توانا ہے لیکن وہ میری گرفت سے باہر نہیں جاسکتا۔ میں اس کا اسیر ہوں وہ میرا گرفتار ہے۔ یہ برسوں کے معرکے کے بعد ہوا ہے، آسانی سے نہیں ہوا ہے۔ بہرحال وہ صید ہی ہے صیاد سے بچ نہیں سکتا۔ آخر وہ گرفتار ہوا۔ اُسے شکست کھانی ہی پڑی:

تجھ سا کوئی جلاّد نہ دیکھا کیسے کیسے قاتل دیکھے
تجھ کو کوئی تجھ سا مل جائے قاتل تڑپے قاتل دیکھے

....

دیا ہے دل تو کیا گردن نہ دیں گے اگر قاتل وہ دلبر ہے تو کیا ہے
نکل آئے گا کوئی کوہ کن بھی کلیجہ اُس کا پتھر ہے تو کیا ہے

....

یہ آخری دَور میری شاعری کا تقریباً بیس سال سے شروع ہوا ہے۔ اندازاً ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۸ء تک پہلا دَور ہے۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۷ء تک دوسرا دَور اور تیسرا دَور ۱۹۶۸ء سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۷۱ء سے اسی دَور کے شباب کا آغاز ہوتا ہے اور یہ دور علیٰ حالہٖ جاری ہے۔

۱۹۴۶ء کے فسادات میں اپنا پورا خاندان، پورا اثاثہ اور پوری جمی جمائی معیشت کھوئی۔ ۱۹۶۴ء اور ۱۹۷۹ء کے فسادات جمشید پور میں بہت سے دوستوں اور عزیزوں کو کھویا۔ ۱۹۷۱ء کے حادثہ مشرق میں اپنے بہنوئی اور دوسرے عزیزوں کے ساتھ ایک خواب کھودیا۔ ۱۹۷۱ء کی اس غزل میں آپ کو ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۸ء کے بعد تیسرا گریز ملے گا:

رقیبوں میں رہے یا دوستوں کے درمیاں پہنچے
کہیں بھی چین سے رہنے نہ پائے ہم جہاں پہنچے

قفس کو سادہ لوحی میں سمجھ کر آشیاں پہنچے
کہا صیّاد نے کس طنز سے 'کہیے کہاں پہنچے'
غلط بدنامیوں سے منہ چھپانے کو جہاں پہنچے
ہمیں بدنام و رُسوا کرنے والے بھی وہاں پہنچے
نہ ٹوٹا سلسلہ شیخ و برہمن کی عنایت کا
اگر یہ مہرباں رخصت ہوئے وہ مہرباں پہنچے
سنا ہے لوگ فن سے صاحبِ فن تک پہنچتے ہیں
مگر ہم تک ہمارے ڈھونڈھنے والے کہاں پہنچے

اِس گریز کے بعد آیئے غزل شروع ہوتی ہے جس میں غزل کی قدیم اور جدید تکنیک کا شباب ہے۔ یہ غزلیں غزلیں ہیں۔محبوب سے جی کھول کر مخاطبت ہے۔ برسوں کی تمنّاؤں، کوششوں، آرزوؤں اور دُعاؤں کے بعد یہ محبوب ملا ہے۔جس کی تعریف میں نے اُوپر کی سطروں کی ہے۔جس طرح اقبالؔ محبوب سے مخاطب ہوکر ساری کہانیاں کہتے ہیں میں بھی وہ سب کچھ کہہ جاتا ہوں جو کہنے کی ہیں، اپنا درد بھی اُس کی بیدردی بھی، اپنا حال بھی، اس کا چونچال بھی۔ اپنی وفا گزاری بھی اس کی ستم گاری بھی۔اپنی خلوت کی روداد بھی، اس کی انجمن کی بیداد بھی، اس کی رفتار بھی گفتار بھی۔اس کا راستہ بھی اس کا طرزِ خرام بھی، اس کا گھر بھی پس منظر بھی، اس کی جولانگاہ بھی۔وہ کیا کیا کررہا ہے میں کیا کیا کررہا ہوں۔میں کیا چاہتا ہوں وہ کیا چاہتا ہے۔اُس کا کیا کیا منصوبہ ہے، کیا کیا پروگرام ہے، پروگرام پر عمل درآمد کس طرح ہے، یہ سب آپ کو اِن غزلوں میں 'وہ'، 'اُن'، 'اُس'، 'تم'، 'تو' اِن ضمائر کا استعمال گہری معنویت کے ساتھ ہوا ہے۔ یہ اتنے صاف اور واضح اشارے ہیں کہ سرِّ دلبراں اور حدیثِ دیگراں کا فرق مٹ جاتا ہے۔جو سرِّ دلبراں ہے، وہ حدیث دیگراں بھی ہے اور حدیثِ دیگراں میں سرِّ دلبراں کی بھی بھرپور پرچھائیاں ہیں۔ یہ کبھی میرؔ کا معشوق بن جاتا ہے جس کا پتہ آج تک نہیں چل سکا۔اور یہ مومنؔ کا معشوق بھی ہے جس کا پتہ نشان سب کو معلوم ہے۔ان غزلوں میں میرؔ کی گہری داخلیت بھی ہے اور آتشؔ کی گنگا جمنی خارجیت بھی۔ان میں بھرپور پردہ داری بھی ہے اور لطیف پردہ دری بھی۔اس محبوب نے تمام مردہ علامتوں کو زندہ کر دیا اور تمام علامتوں میں تندرست اور توانا زندگی پیدا ہوگئی۔اور ایسی تازگی

جس پر بہار رہی بہار رہے اور کچھ دِنوں تک کیا بلکہ آئندہ صدیوں تک بہار کا تسلط رہے گا اس لیے کہ اگر غزل زندہ رہی تو اس دور کے لیے اس کا مؤثر ترین ترجمان بننا مقدّر ہے۔ اس میں دردِ دل بھی کہا گیا ہے اور دردِ جہاں بھی۔ اس میں غمِ جاں بھی ہے اور غمِ روزگار بھی۔ میں نے غزل میں کئی لہجے استعمال کیے ہیں۔ کبھی یہ دوٹوک اور بالمشافہ ہے، آمنے سامنے کی صاف صاف گفتگو۔ مگر یہ سامنے کی گفتگو جلی کٹی نہیں ہے۔ شیریں، نرمی، لطافت، نزاکت، پیار، دردمندی، افسانویت اور حقیقت، طنز اور سوز سب کا مجموعہ ہے۔ کبھی بالکل نزدیک سے سامنے بیٹھ کر گفتگو کرتا ہوں:

زُلفوں کو میسر تھا پہلے آئینہ نہ شانہ یاد کرو
کیا ہم پہ ہنسو ہو تم پیارے اپنا تو زمانہ یاد کرو

اور کبھی 'دور' سے آتا ہوں اور دُور سے بات کرتا ہوں۔ یوں کہ مخاطبت اسی سے رہتی ہے مگر رُخ دوسری طرف رہتا ہے:

ہم زخمِ جگر ان کو دکھانے میں لگے ہیں
وہ زُلف میں آئینے میں شانے میں لگے ہیں

ہاں تو آپ کو 'نئی غزلوں' کا وِیڈیو دکھاتا چلوں جو ۱۹۷۱ء کے حادثۂ مشرق کے دوران یا بعد شروع ہوتا ہے۔ گریز آپ نے اوپر ملاحظہ فرمایا اب آپ فلمیں دیکھیں:

بلاتے کیوں ہو عاجزؔ کو بلانا کیا مزا دے ہے
غزل کمبخت کچھ ایسی پڑھے ہے دل ہلا دے ہے
ترے ہاتھوں کی سُرخی خود ثبوت اس بات کا دے ہے
کہ جو کہہ دے ہے دیوانہ وہ کرکے بھی دِکھا دے ہے
غضب کی فتنہ سازی آئے ہے اس آفتِ جاں کو
شرارت خود کرے ہے اور ہمیں تہمت لگا دے ہے
مری بربادیوں کا ڈال کر الزام اوروں پر
وہ ظالم اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر مسکرا دے ہے
اب انسانوں کی بستی کا یہ عالم ہے کہ مت پوچھو
لگے ہے آگ اِک گھر میں تو ہم سایہ ہوا دے ہے

اِس غزل میں آپ دیکھیں گے کہ میرؔ کی اتھاہ داخلیت سے غزل شروع ہوتی ہے اور ناگزیر جذبات کی محاکاتی تصویرکشی کے ذریعے آتشؔ کی گنگا جمنی خارجیت پر پہنچتی ہے۔ اور میرؔ و آتشؔ کے امتزاج کے ساتھ ایک تاریخی حقیقت کی پردہ کشائی پر ختم ہو جاتی ہے۔ بالکل اُنھیں دِنوں کی جن دنوں میں اور جن حالات کی غزلیہ ترجمانی کے لیے یہ غزل لکھی گئی۔ بالکل انھیں دنوں کی یہ غزل ملاحظہ کیجیے جس میں مخاطبت دوٹوک ہے، براہِ راست ہے لیکن کوئی بات استعارے کی دُھوپ چھاؤں سے باہر نہیں آتی۔ حقیقتوں پر استعاروں کی ایسی چلمن ہے جس میں چلمن کا حسن بھی نمایاں ہے اور چلمن والے کا حسن بھی:

واللہ کس غضب کے ہو ہنس مکھ دِکھائے جاؤ — ہم آہ آہ کرتے ہیں تم مسکرائے جاؤ
ہم تو غزل کے پھول کھلاتے ہی جائیں گے — تم جانتے ہو زخم لگانا ، لگائے جاؤ
اربابِ غم کے جلتے بدن سے رہو الگ — ہم دُھوپ دُھوپ جاتے ہیں تم سائے سائے جاؤ
ہم ہیں اگر تو خونِ جگر کی کمی نہیں — جتنے چراغ بزم میں چاہو جلائے جاؤ
میرے فسانے پر ہے تمھارا ہی اختیار — جو بات چاہو اپنی طرف سے ملائے جاؤ
دیوانے کر ہی دیں گے کسی روز چاک چاک — جب تک بچائے جاسکو دامن بچائے جاؤ

وہ سن کے اَن سُنی جو کرے ہے کیا کرے
تم اے کلیمؔ اپنی غزل گنگنائے جاؤ

اور اسی تسلسل سے ۱۹۷۲ء کی وہ ہنگامہ آرا غزل بھی پڑھیے:

وہ ستم نہ ڈھائے تو کیا کرے اسے کیا خبر کہ وفا ہے کیا
تُو اسی کو پیار کرے ہے کیوں یہ کلیمؔ تجھ کو ہوا ہے کیا
تجھے سنگ دل یہ پتا ہے کیا کہ دُکھے دِلوں کی صدا ہے کیا؟
کبھی چوٹ تو نے بھی کھائی ہے کبھی تیرا دل بھی دُکھا ہے کیا؟

جو نہ صرف یہ کہ تصوراتی طور پر سامنے بٹھا کر لکھی گئی بلکہ واقعاتی طور پر دہلی میں سامنے بیٹھ کر پڑھی گئی اور حال یہ ہوا کہ:

میرے اشعار وہ سُن سُن کے مزے لیتا رہا
میں اُسی سے ہوں مخاطب وہ یہ سمجھا بھی نہیں

اِس غزل کا یہ شعر پڑھیے:

ابھی تیرا عہد شباب ہے ابھی کیا حساب و کتاب ہے
ابھی کیا نہ ہوگا جہان میں ابھی اس جہاں میں ہوا ہے کیا

اور ۱۹۷۲ء سے ۷۷-۱۹۷۶ء کے تاریخی اوراق کو دوبارہ اُٹھا کر دیکھئے اور فیصلہ کیجیے کہ یہ پیشین گوئی کتنی صحیح اور واقعاتی ثابت ہوئی۔

مجھے سیاست سے کوئی تعلق نہیں، کوئی سروکار نہیں، کوئی دلچسپی نہیں بلکہ بغض ہے، عناد ہے، بلکہ نفرت ہے۔ کبھی دلچسپی نہیں رہی نہ جلسوں سے، نہ جلوس سے، نہ اسٹیج سے، نہ تقریر سے، نعروں سے نہ مینی فیسٹو سے، نہ تجاویز سے، سیاسی شخصیتوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ موجودہ سماج اور موجودہ سوسائٹی کی بہت سی نقل و حرکت سے، منصوبوں سے، پروگراموں سے بھی مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ موجودہ عوامی زندگی کے نوع بہ نوع تحریکوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ میری خاموش زندگی شاید اسی کا نتیجہ ہے یا یہ کہ میری خاموش زندگی ہی کے نتائج یہ غیر دلچسپیاں ہیں۔ ہاں مجھے دو چیزوں سے بے حد دلچسپی رہی ہمیشہ رہی اور اب بھی ہے۔ ایک انسان اور دوسری چیز ادب و شعر۔ اِن دو دلچسپیوں نے تمام دوسری دلچسپیوں کو بیرونِ بزم کر دیا۔ یا یوں کہیے کہ یہ دو دلچسپیاں تمام دوسری دلچسپیوں کا بدل بن گئیں۔ یا ان سب میں ضم ہوگئیں۔ انسانوں سے گہرا پیار گویا میری زندگی، میری فطرت، افتادِ طبیعت، میری نہادِ مزاج، میرے میلانِ دل ودماغ کا واحد مرکز اس وقت سے رہا جب سے میں نے دُنیا کو دیکھنا شروع کیا۔ اُس وقت بھی اور آج بھی اور درمیان زندگی کا تمام وقفہ یوں گزار کر میں کسی لمحہ اِن دونوں سے جدا نہ ہوا۔ میری انتہائی خلوت نشینی بھی اِن دونوں کے رابطہ سے خالی نہیں رہی۔ میرا وجود کبھی تنہا نہیں رہا۔ یا تو میں انھیں سوچتا رہا۔ سمجھتا رہا محسوس کرتا رہا یا دیکھتا رہا۔ اسی لیے کسی دور، کسی زمانے میں میری شاعری انسانوں سے الگ ہو کر ایک لمحہ بھی سانس نہ لے سکی:

کیا دل ہے کہ آرام سے اِک سانس نہ لے ہے
محفل سے جو نکلے ہے تو خلوت میں جلے ہے

انسانوں سے تعلق اور محبت نے مجھے ادب دیا اور شعروادب نے مجھے انسانوں سے ربط و محبت دیا۔ انھیں دنوں کے باہم ربط و تعلق کی گرم بازاری میری غزل نگاری ہے۔ اس لیے سیاست

سے بالکل بے تعلقی بلکہ نفرت کے باوجود لوگ کہتے ہیں کہ تمھاری غزلوں میں سو فیصد سیاست ہے۔ واللہ عالم وہ کیا کہتے ہیں، کیا سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہی ہے جو میں نے مندرجہ بالا سطور میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ آپ کوئی غزل لے لیں، کسی غزل کا کوئی شعر لے لیں۔ زمانے اور عہد کی اہم حقیقتیں کروٹیں لیتی نظر آئیں گی۔ میں فلسفہ نہیں جانتا، خیال آفرینی، مضمون آفرینی میں نہیں جانتا۔ مجھے یہ کام آتے ہی نہیں۔ میں جہاں رہا، جس حال میں رہا، جس مشغلے میں رہا، تنہا رہا، مجمع میں رہا، خلوت میں، انجمن میں، کوچہ و بازار میں، محفلِ طرب، بزمِ غم، جہاں بھی رہا میری انگلیاں نبضِ زمانہ پر رہیں اور میرے کان دلِ زمانہ کی دھڑکنوں پر لگے رہے۔ میں یہ نہیں جانتا کہ شاعری کسی اور چیز کا نام بھی ہے۔ علمی طور پر مجھے دلّی کی شاعری لکھنؤ کی شاعری سے واقفیت ہے مگر عملی طور پر میں نے اب تک یہی دیکھا کہ:

دل ٹوٹے ہے تب ہونٹوں پر گیت سہانا آئے ہے

بچپن سے 'خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ' سنتے آئے، سنتے رہے، سمجھ میں کم آتا رہا۔ لیکن سمجھ میں آیا تو خوب آیا اور ایسا آیا کہ دل میں گرہ بن کر رہ گیا۔ عموماً خنجر جس پر چلتا ہے تو خنجر چلانے والے سے نفرت ہو جاتی ہے لیکن یہاں معاملہ برعکس رہا:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اس سادگی پر مر جانا واقعی ہوتا ہے۔ یہ بات اب سمجھ میں آئی۔ اور سمجھ میں آئی تو نتیجہ یہ ہوا:

بنا ہی لیتے ہیں اس کو بھی محبوبِ غزل عاجزؔ
ہم اہلِ درد تو قاتل کو بھی قاتل نہیں کہتے

'کہتے' ضرورتِ شعری کے سبب لانا پڑا ورنہ 'قاتل' کہتے تو ضرور ہیں اور خوب کہتے ہیں اور ہر وقت کہتے ہیں اور برابر کہتے ہیں۔ مگر قاتل سمجھے نہیں۔ سمجھتے تو پیار کیسے کرتے اور پیار نہ کرتے تو غزل کیسے ہوتی۔ یہ تو پوری کتاب کھول کر پڑھیے۔ خوب قاتل کہا گیا ہے مگر پیار بھی خوب کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے اور کیا جاتا رہے گا۔ جب تک شاعری سے توبہ کرنے کی ضرورت نہ آ پڑے، جس کا امکان کم ہے۔ دیکھا تو یہی گیا کہ قتل کا کام جتنا بڑھتا رہا اسی اعتبار سے کاروبارِ محبت بھی بڑھتا گیا۔ اشیائے محبت کی درآمدگی اور برآمدگی بھی بڑھتی رہی اور غزل میں ان پر نئے لیبل لگتے

رہے۔ کتنا قاتل کہا گیا ہے اور کس کس انداز سے کہا ہے یہ تو کتاب کا مطالعہ کرتے رہیں اور دیکھتے جائیں اور جمع کرتے جائیں۔ اس وقت جو میرے حافظے میں جو اشعار آ رہے ہیں اُنھیں کو لکھتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں:

میرا قاتل انھیں کہتے ہیں سب اور ٹھیک کہتے ہیں
قسم سو بار وہ کھائیں قسم کھانے سے کیا ہوگا

....

ہم اہلِ کاکل و رخسار کو معشوق کہتے ہیں — جسے معشوق کہتے ہیں وہی قاتل ہے کیا کہیے

....

نہ جانے دل ترا بیدرد اس قدر کیوں ہے — تو دیکھنے میں تو اتنا حسیں لگے ہے میاں

....

یہ تیرا شہر ہے یا قاتلوں کی بستی ہے — لہو میں سُرخ ہر اِک آستیں لگے ہے میاں

....

جانے کہ نہ جانے اور کوئی ہم تو اُسے جانے ہیں جس نے
قاتل کا ہمیشہ کام کیا اور نام کبھی قاتل نہ رہا

....

کسی کے منہ میں زباں ہے نہ سینے میں دل ہے — یہ کس حسینۂ قاتل ادا کی محفل ہے

....

جہاں میں جتنے معشوقِ پری پیکر بھی گزرے ہیں
وہ سب قاتل ہی تھے لیکن مرے قاتل کا کیا کہنا

....

محبت میں بچے گی جان کیوں کر — حسیں جو ہوں گے کیا قاتل نہ ہوں گے

....

تجھ سا کوئی جلاّد نہ دیکھا — کیسے کیسے قاتل دیکھے

....

تجھ کو کوئی تجھ سا مل جائے — قاتل تڑپے قاتل دیکھے

....

حافظہ خراب ہو گیا اب شعر یاد نہیں آ رہے ہیں۔ عموماً قاتل کے ساتھ چھری، خنجر، تلوار، شمشیر کے الفاظ بھی آتے ہیں مگر میں نے اس سے گریز کیا ہے اس لیے کہ ان الفاظ کی شمولیت سے میرے اشاروں کی معنویت میں کمی اور سمیت آجاتی اور واقعیت کے خلاف ہوتا۔ میں نے

اشاریت اور واقعیت کا بھرپور امتزاج رکھا ہے۔

دیباچے کے آخر میں دو تین غزلیں موقع اور محل کے بعض اشاروں کے ساتھ دے دوں۔ شاید ۱۹۷۷ء کے ابتدائی دِنوں میں، شاید مارچ کی کسی تاریخ میں دہلی کلاتھ ملس کا مشاعرہ ہوا جس کی صدارت شنکر دَیال شرما صاحب صدر آل انڈیا کانگریس کمیٹی فرما رہے تھے۔ میں نے یہ غزل پڑھی۔ جو عالم مجمع کا ہوا۔ بیان کیا کروں بس غزل کے چند اشعار سن لیجیے:

گیسو ترے کسی سے سنوارے نہ جائیں   جب تک ہم اہلِ درد پکارے نہ جائیں گے

کیا دن ترے ستم کے گزارے نہ جائیں گے   بازی وفا کی ہار کے پیارے نہ جائیں گے

بے روشنی کیے یہ ستارے نہ جائیں گے   ٹھہرے ہوئے ہیں پلکوں پہ آنسو اسی لیے

دریائے غم میں پانی اگرچہ ڈباؤ ہے
ہم ڈوبنے کے ڈر سے کنارے نہ جائیں گے

غزل کا یہ شعر جب میں نے پڑھا تو سامعین میں اکثر مقامات پر لوگ جوش میں کھڑے ہو گئے:

یہ شہسوارِ وقت ہیں اتنا نشہ میں چور
گر جائیں گے اگر یہ اُتارے نہ جائیں گے

اور مقطع پڑھا:

کرتے رہو کلیمؔ اشاروں میں گفتگو
جب تک غزل رہے گی اشارے نہ جائیں گے

شنکر دیال شرما صاحب صدر کانگریس نہایت شائستہ آدمی تھے۔ وہیں ان سے گفتگو ہوئی اور بہت شستہ اُردو میں۔ دوسرے روز ان کے گھر پر دعوت تھی اور پُرتکلف دعوت تھی۔ ان کے چہرے سے مسکراہٹوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ 'اشاروں میں گفتگو' کو وہ خوب سمجھ گئے تھے، جس کے نتیجے میں وہ مجھ پر مہربان تھے۔ اور گھر پر نہایت اصرار سے ایک یا دو غزلیں مجھ سے سنیں مگر غزل کے مخصوص اشاروں کے متعلق مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ اگر کرتے تو بات صاف بھی ہو سکتی تھی اور موقع محل کے اعتبار سے تاویل کی گنجائش بھی تھی۔ وہ کیوں نہ سمجھیں گے۔ اچھے اُردو داں صاحب ذوق تھے۔ پرانی تہذیب کی یادگار تھے۔ جب ایک غیر اُردو داں گورنر مسٹر دیوکانت بروا اپنی گورنری کے دوران پٹنہ کے ایک مشاعرے کی صدارت کرتے ہوئے میرے اس شعر پر جھوم گئے:

اب انسانوں کی بستی کا یہ عالم ہے کہ مت پوچھو
لگے ہے آگ اِک گھر میں تو ہمسایہ ہوا دے ہے

یہ وہ زمانہ تھا جب مشرق میں آگ بھڑک رہی تھی۔ تو مسٹر بروا گاؤ تکیہ کی ٹیک سے سیدھے اُٹھ بیٹھے اور مسکراتے ہوئے زور سے بول اُٹھے۔ ''کلیم صاحب! Satire کرتے ہیں! ایں Satire کرتے ہیں؟''

۱۹۷۷ء کے بعد تین سال اور کچھ مہینوں کا وقفہ ہے۔ ۱۹۸۱ء کے شروع مہینے کی تاریخ یاد کیجیے اور اُس پس منظر میں یہ غزل سن لیجیے:

پھر آرہے ہیں وہ، فضا گرمائی جائے گی — پھر زُلف کھولی جائے گی لہرائی جائے گی
ہوگی ہر اِک جگہ لب و عارض کی گفتگو — پھر اُن کے عاشقوں میں غزل گائی جائے گی
دیوانے لائے جائیں گے زنداں میں دُھوم سے — زنجیر اہتمام سے پہنائی جائے گی
کیا کیا شرابِ خونِ جگر کا چلے گا دَور — پی جائے گی کہیں، کہیں چھلکائی جائے گی
ہر روز تازہ زخم لگایا بھی جائے گا — روز اِک غزل بھی ہم سے کہلوائی جائے گی
صد سالہ دورِ چرخ گزر جائے گا مگر — اُن کے شباب کی نہ توانائی جائے گی
اے شمع میرا درد سمجھ میں تب آئے گا — جب تو بھی انجمن سے نکلوائی جائے گی

جب دوست سن کے میری غزل جائیں گے کلیمؔ
بجتی ہوئی خیالوں میں شہنائی جائے گی

میں نے شاعری کب شروع کی، کیسے شروع کی، کیوں شروع کی، یا یوں کہیے کہ شاعری کب میری زندگی میں آئی کیسے آئی کیوں آئی، اُس پر کچھ تفصیلی اشارے 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کے دیباچے میں دیئے گئے ہیں۔ میری شاعری کیا ہے اس پر کچھ باتیں اِس دیباچے میں ہیں۔ اِس روشنی میں بالاستعیاب ایک ایک شعر پڑھا جائے گا اور ملک کی تاریخ میں اس کے حوالے اور دلیلیں ڈھونڈھی جائیں گی تو شاید حیرت ہوگی کہ یہ سب کیسے ہوسکا۔ میری سمجھ میں بھی نہیں آتا میں کہ نہ کوئی فلسفی نہ لیڈر، نہ حکیم نہ دانا، نہ مفکّر نہ دنیاوی اعتبار سے کوئی انجینئر کوئی ماہر تعمیرات۔ میں کہ ایک مزدور، ایک جفاکش منتشر الخیال، منتشر الاعمال، منتشر الحال، منتشر الاوقات جن کی زندگی میں معمولات میں، مشغولیات میں، رہائش میں رکھ رکھاؤ میں، کوئی ترتیب نہیں، تنظیم نہیں، کوئی

پلاننگ نہیں، منصوبہ بندی نہیں۔ جس سے گھر کا حال پوچھو تو بتا نہ سکے۔ کون چیزیں کہاں ہیں؟ بچے کیا پڑھ رہے ہیں؟ تمھارا بجٹ کیا ہے؟ تمھارا روزانہ ماہانہ خرچ کیا ہے؟ تمھارے رشتہ مند قرابت مند کہاں ہیں؟ کون کون ہیں؟ کچھ نہ بتا سکے۔ بستر بے ترتیب، کپڑے اِدھر اُدھر، کتابیں، قلم، پنسل، کاغذ، بیگ، چپل، جوتے، ٹوپی سب بے جگہ، بے قرینہ، منتشر۔ اپنے ہاتھ سے بستر درست کرنا، کپڑے دھونا، کپڑے استری کرنا۔ نہ کھانے کا وقت صحیح، نہ ناشتے کا، نہ سونے کا بس لے دے کر ایک چیز ہے جو ہمیشہ پیشِ نظر رہتی ہے کہ گھر سے باہر نکلو تو بے قرینہ نظر نہ آؤ۔ نہ چہرے سے نہ لباس سے، نہ گفتگو سے نہ خیال سے، نہ انداز سے نہ نگاہ سے۔ دوسرے یہ کہ جو کام ہو وقت پر کرلو۔ اور تیسرے یہ کہ جو وعدہ کرلو جان دے کر پورا کرو۔ تو ایسا بے ترتیب بے قرینہ انسان شاعری میں ایسا منصوبہ کیسے بنا سکا؟ ایسا منصوبہ کو ڈٹ کر اپنے محبوب سے کہہ سکے:

میں نے جو بنایا ہے الفاظ کے موتی سے
یہ تاج محل پیارے میرا نہیں تیرا ہے

جو اپنی شخصیت کو کچھ نہیں بنا سکا وہ الفاظ سے غزلوں کا تاج محل کیسے بنا سکا۔ میرے پاس اس کا جواب نہیں ہے۔ کوئی جواب دے سکے تو دے تاکہ میں بھی جان لوں۔ میرے لوگ دیں گے۔ کاش میرے سامنے کوئی دیتا۔ مجھے اپنے اس سوال کا جواب کچھ کچھ اپنی اس غزل میں نظر آتا ہے:

مری لَے سے وہ لَے مِلائیں گے کیا — جو روئے نہیں ہیں وہ گائیں گے کیا
خزاں میں نہ آیا تڑپنا جنھیں — بہاروں میں وہ مسکرائیں گے کیا
جنھیں چوٹ دل کی لگی ہی نہیں — مرا دردِ دل آزمائیں گے کیا
جنھوں نے اُجاڑا نہیں اپنا گھر — وہ اوروں کی بستی بسائیں گے کیا

رونے کی مشق ہے اسی لیے گانا بھی آتا ہے۔ بہت تڑپتا رہتا ہوں اس لیے غزلوں کے کنج میں مسکرانا آ گیا ہے۔ اپنے کو اُجاڑنے ہی سے بستیاں بسائی جاتی ہیں۔ بے گھر ہوا ہوں اس لیے تاج محل بنا سکا ہوں، تو چلئے جناب:

سنا ہے خاک بھی ہم ہو کے لاجواب ہوئے
اگر یہ سچ ہے تو اچھا ہوا خراب ہوئے

○

جہاں تک مذہبی اور تاریخی شہادتیں مہیّا ہیں اور جہاں تک میں نے غور کیا ہے۔ اِس کائنات میں سب سے عظیم تخلیقی اور تعمیری توانائی محبت ہے۔ انسان کے لیے اس سے بڑھ کے کیا اس کے برابر کوئی معلم، مدرس، مفکّر، معاون، مشفق دوست، معین و مددگار، مونس و غمخوار خدا نے پیدا ہی نہیں کیا۔ اس سے بڑھ کر نہ کوئی طاقت پیدا ہوئی نہ توانائی۔ اس سے بڑھ کر نہ کوئی علم آیا نہ فن نہ ہنر۔ اس سے بڑھ کر نہ کوئی روشنی آئی نہ کوئی جمال آیا نہ حسن نہ کشش نہ تاثیر، اس سے بڑھ کر نہ کوئی لذّت آئی نہ چاشنی نہ ذائقہ نہ مٹھاس نہ نمکینی۔ اس سے بڑھ کر نہ کوئی سرور آیا نہ نشہ۔ اس سے بڑھ کر نہ کوئی نغمہ نہ گیت۔ اس سے بڑھ کر نہ کوئی جوش نہ جوانی نہ شباب۔ اس سے بڑھ کر نہ کوئی رہبر نہ رہنما نہ چراغ نہ نشانِ منزل نہ اس سے بڑھ کر کوئی سادگی نہ پُرکاری۔ اس سے بڑھ کر نہ بلندی ہے نہ گہرائی نہ وسعت ہے نہ پہنائی، اس سے بڑھ کر نہ غرض نہ جوہر نہ قدر و قیمت نہ شان نہ شوکت نہ جاہ نہ جلال نہ عزّت نہ کمال نہ ایسا کوئی قلم پیدا ہوا نہ تلوار نہ اس سے بڑھ کر کوئی تقویٰ ہے نہ طہارت نہ بزرگی نہ ریاضت۔ اس سے بڑھ کر نہ کوئی عمل ہے نہ ایمان، اس سے بڑھ کر نہ کوئی عہد ہے نہ پیمان، نہ سرمایہ ہے نہ سامان، اس سے بڑھ کر نہ کوئی حکومت ہے نہ سلطنت نہ مال ہے نہ دولت اس سے بڑھ کر نہ کوئی لباس ہے نہ پوشاک نہ سواری نہ چابک نہ فتراک۔

اب سوچ لو سمجھ لو کہ یہ گئی تو انسان کے پاس کیا رہا اور کس برتے پر انسان رہنے کا دعویٰ۔ تو میں یہی دیکھتا ہوں کہ جب انسان میں یہ خوش بخت محبت تھی تو انسان کچھ نہ رکھ کر بھی نعمت تھا اور اب انسان اس کے علاوہ سب کچھ رکھ کر بھی زحمت ہے اور اس زحمت کا احساس مجھے قدم قدم پر ہوتا ہے۔ میں نے پہلے کئی بار لکھا ہے کہ زمانے کے ستم نے مجھے ناقابلِ تلافی غم دیا۔ اس غم نے محبت کے سرچشمے کی باریک سی دھار میرے دل میں بھی جاری کردی۔ اس ہلکی سی سیرابی نے میری زندگی کو ایک مستقل تشنگی میں تبدیل کردیا ہے اور اب میں کوزہ کوزہ، چلّو چلّو، گاگر گاگر، کنواں کنواں، نہر نہر، ندی ندی، دریا دریا، سمندر سمندر اس تشنگی کو رفع کرنے کے لیے آوارہ آوارہ مارا مارا پھرتا ہوں مگر سمندر سے مجھے کبھی شبنم ملتا ہے کبھی وہ بھی نہیں ملتا اور میں تڑپ جاتا ہوں، ٹوٹ جاتا ہوں، بکھر جاتا ہوں اور پھر سمٹ کر کھڑا ہو جاتا ہوں اور تلاش میں چل پڑتا ہوں:

تیرے درد ہی کا سہارا تو ہے
کہ گرتے ہیں ہم پھر سنبھلتے ہیں ہم

میں نے اپنی دُنیا سمیٹ لی ہے، محدود نہیں کرلی ہے۔ محبت نے کائنات کو سمیٹ لیا ہے اور میں نے محبت کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا ہے:

زُلف و رُخ کی انجمن میں کیا نہیں
باہر آدابِ غزل سے جائیں کیا

میں نے دیکھا کہ اس کے باہر اور کچھ نہیں۔ اگر اور کچھ کی تمنّا کرتا ہوں تو وہ بھی نہیں ملے گا اور یہ بھی جائے گی۔ اوروں کا ٹھکانہ اوروں کے پاس ہے لیکن اس کا ٹھکانہ شاید اور کہیں نہیں:

تجھے اے غمِ محبت اِدھر آ گلے لگالوں
نہ ترا کہیں گزر ہے نہ مرا کہیں ٹھکانہ

میں ابھی تک اِسے انسانوں میں تلاش کررہا ہوں۔ انسانوں سے الگ تو یہ تمام ہے، انسانوں سے باہر تو یہ پھیلی ہوئی بکھری ہوئی ڈھیروں کے ڈھیر پڑی ہے، ذرّے ذرّے میں تنکے تنکے میں، قطرے قطرے میں۔ مٹّی مٹّی میں، ہَوا ہَوا میں، شعلے شعلے میں، چنگاری چنگاری میں، گھاس میں، پات میں، پھل میں، پھول میں، کانٹوں میں۔ لیکن اس طرح بکھری پھیلی رہنے سے انسانوں کا کیا بھلا ہے؟ میں اُسے انسانوں کی باتوں میں تلاش کرتا ہوں، خیالوں میں ڈھونڈھتا ہوں، تحریروں میں، تقریروں میں، شاعری میں ادب میں۔ پہلے باتوں میں بھی تھی، خیالوں میں بھی تحریروں، تقریروں، ادب وشاعری اور انسان کے ہر عمل میں اس کی جھلیاں ہلکی یا وزنی نظر آتی تھیں۔ اُنھیں جھلکیوں نے مجھے پالا سنوارا، جوان کیا، توانا کیا، آباد کیا، پھر برباد کیا۔ یہ آبادی بربادی سب محبت ہی کے لیے تھی۔ اب بہت دِنوں سے یہ باتوں میں نہیں ملتی۔ تقریروں میں، تحریروں میں، شاعری میں، ادب میں نہیں ملتی گرچہ باتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ تقریریں بہت، تحریریں بہت، شاعری بہت، ادب بہت بڑھ گیا ہے۔ جلسے بہت، جلوس بہت، ڈھول باجا بہت، گانا بجانا، ناچ رنگ بہت غزلیں بہت، کتابیں بہت، رسالے بہت، مضامین بہت، افسانے بہت، کہانیاں بہت:

کہانیاں تو بہاروں کی خوب سنتے ہیں
ہوا بہار کی اب تک چلی نہیں پیارے

باتیں کیا بتاؤں ٹھوس حقیقتیں سنیے۔ یہ حقیقتیں زبانی نہیں تحریری بیان کررہا ہوں۔ اخبار یا رسالے یا میگزین میں نہیں کتاب میں لکھ رہا ہوں۔ اور کسی دوسرے کی کتاب میں نہیں اپنی کتاب ہیں۔ لوگ پہلے مجھ سے اس لیے خفا تھے:

احباب کو ہماری اسی بات سے ہے رنج
کمبخت نے وفا کا یہاں نام کیوں لیا

رنج اِس بات کا ہوتا رہا کہ میں نے محبت کی بات کیوں کی اور ذرا سلیقے سے کیوں کی۔ ذرا پیار ذرا تاثیر کے لہجے میں کیوں کی۔ اور کی تھی تو کچھ لوگوں نے پسند کیوں کی۔ ناپسند کیوں نہ کیا، ٹھکرایا کیوں نہیں۔ گلے سے کیوں لگایا۔ پڑھ کے سر کیوں دُھنا، روئے کیوں۔ پسند کرنے والے اور پسند پر ناراض ہونے والے دونوں میرے سامنے اغل بغل ہیں۔ میرے دل میں یہ شناخت تھی، پہچان تھی، تمیز تھی، نگاہوں میں تھی، خیالوں میں تھی۔ زبان پر نہ تھی قلم پر نہ تھی۔ جی چاہتا ہے اب زبان پر بھی آجائے، قلم پر بھی آجائے۔ میں نے پہلے چین کب لیا کہ اب نہ لوں گا۔ پہلے کب معتوب نہ تھا کہ اب ہوں گا۔ دنیا پہلے خنجر در آستیں تھی۔ اب شمشیر برہنہ ہوجائے گی۔ کاٹ پہلے بھی چلتی تھی اب بھی چلے گی، پہلے پس پردہ تھی اب پیش پردہ ہوگی۔ مرنا یوں بھی تھا مرنا یوں بھی ہوگا۔ لیکن مارنے مرنے والے سامنے تو آجائیں گے۔

میں تین چار ماہ سے امریکہ میں ہوں۔ یہاں عموماً تنہائی ہے۔ بھیڑ بھاڑ دفتروں میں ہے۔ بینکوں میں ہے، بازاروں میں ہے، اسٹیشنوں پر ہے، ایئرپورٹ پر ہے۔ گھر سنّاٹے رہتے ہیں۔ دن ہو یا رات گھروں میں زندگی نظر نہیں آتی۔ باہر سے درودیوار سنسان نظر آتے ہیں۔ روشنی نکلنے سے پہلے گھر خالی ہوجاتے ہیں اور روشنی رہنے تک خالی رہتے ہیں۔ تمام آبادیاں گھر کی بازاروں میں منتقل ہوجاتی ہیں۔ گھر یہاں ہوٹل ہیں یا سرائے۔ کھانا کھاؤ اور سورہو۔ اسی دُنیا میں تین چار ماہ سے ہوں۔ ہندوستان میں سوچنے کی فرصت مجھے نہیں ملتی۔ یہاں سوچنے سے فرصت نہیں ملتی۔ کتابیں پڑھنے کا دیکھنے کا موقع ہندوستان میں نہیں ملتا۔ کچھ ملتا ہے نئی کتابیں دو چار ورق دیکھ کر طبیعت اُکتانے لگتی ہے۔ کوئی پرانی کتاب اٹھالی۔ کوئی پرانا ناول، کوئی پرانا رسالہ 'عالمگیر'، 'نیرنگِ خیال'، 'ہمایوں'، 'ساقی'، 'کلیم'، 'ادبی دنیا'، 'شاعر' کا پرانا فائل، 'آج کل' کا پرانا فائل 'ندیم' تھوڑی دیر دیکھا، کچھ نئے پھول مل گئے، کچھ پُرانے افسردہ پھولوں پر نئی شگفتگی

آ گئی۔ کچھ نئی باتیں سیکھ لیں ۔ کچھ سیکھی ہوئی باتیں تازہ ہوگئیں۔ کچھ نہ کچھ نفع ہو جاتا۔ کوئی نشست نفع سے خالی نہیں رہتی۔ اب رسالوں کے نئے انبار میں اکادمی اور انجمنوں کے امدادی پروگرام کے تحت چھپی ہوئی کتابوں کے پہاڑوں جیسے ڈھیر میں، کہیں کہیں کچھ چنگاری کچھ شعلے مل جاتے ہیں۔ کچھ رنگ کچھ خوشبو کی مدھم سرسراہٹ محسوس ہو جاتی ہے ورنہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سیلاب کے آئے ہوئے پانی میں ڈوب رہا ہوں جس سے جلد نہیں نکلا تو دَم گھٹ جائے گا۔ ناچار جو پڑھا ہوا ہے، دیکھا ہوا ہے، سنا ہوا ہے، جانا ہوا ہے، سمجھا ہوا ہے، پرکھا اور تولا ہوا ہے اُنھیں کو اُلٹو پلٹو دیکھو سونگھو، سکّہ کھانٹی ہے چاندی اصلی ہے، سونا کھرا ہے زیور کم بنے گا لیکن بڑھیا بنے گا۔ ہاتھ، پاؤں، گلا، سر، سب میں پہنا نہ جاسکے گا۔ چلو کان کا ایک پھول ہی سہی، ناک کی ایک کیل ہی سہی، اصلی سونا بدن سے مَس ہوگا تو کچھ طاقت میں اضافہ ہی ہوگا۔ نقلی زیوروں سے بدن میں نئے نئے امراض کے جراثیم کیوں داخل کرو۔ چنانچہ یہی ہوتا رہا۔

یہاں امریکہ میں تین چار ماہ سے ہوں، تنہائی سے گھبرا کر کتابیں ڈھونڈتا ہوں۔ اس ملک میں مشاعروں کی دھوم دھام ہے۔ آئے دن ہندو پاکستان سے شعرا کی نئی پرانی کھیپ آیا کرتی ہے۔ ٹکٹ لگتے ہیں، ریڈیو ٹی.وی پر اعلان ہوتے ہیں، پمفلٹ چھپتے ہیں، اخباروں میں اشتہار آتے ہیں، دُھوم دھام سے مشاعرے ہوتے ہیں۔ ہر شخص اُردو کا سُورما، زبان کا ماہر، شاعری کا رسیا بنا پھرتا ہے۔ گھروں میں کتاب ڈھونڈھو تو انگریزی کے باتصویر اشتہار، سائنس اور ٹیکنالوجی کے درسی اور نصابی کتابوں سے الماریاں بھری ہیں۔ کہیں کوئی کتاب ملی، سرورق اُلٹا ایک صفحہ پڑھا پھینکنے کی ہمّت نہیں ہوئی جہاں سے اٹھائی تھی وہیں رکھ دی۔ دو ایک نئے شاعروں اور ادیبوں کے یہاں واقعی اُردو کتابوں، رسالوں، مجموعوں، سفرناموں سے کئی کئی الماریاں سجی ہوئی ملیں۔ بڑی خوشی ہوئی۔ دو ایک دن رہنا تھا۔ اُلٹ پلٹ کر چند بڑے نامور ہندو پاک کے رسالے دیکھے۔ سفرنامے دیکھے، کچھ مجموعے دیکھے۔ جتنا وقت میسّر تھا سخاوت اور دریا دِلی کے ساتھ لگایا، وقت ضرور گزر گیا۔ اُٹھا تو جھولی کا جائزہ لیا۔ جتنا وقت لگایا تھا، جتنے سوال کیے تھے جتنی آواز لگائی تھی، جتنی بھیک مانگی تھی، جتنا ہاتھ پھیلایا تھا۔ اس کا عشرِ عشیر بھی نہ ملا۔ اس طرح کی کمائی سے انسان کیسے زندہ رہ سکتا ہے؟ زندہ رہ سکتا ہے تو کس لیے؟ یہ سوال ہے اور اس کا جواب چاہیے۔

جواب کون دے؟ جواب وہی دے سکتا ہے جس کے ذہن میں، شعور میں کبھی ایسا سوال آیا ہو۔ ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اِس دور میں سوالات ذہن میں پیدا نہیں ہوتے۔ یہ ماس اسکیل پروڈکشن کا دَور ہے یعنی کثیر مقدار میں اجتماعی پیداوار۔ اسی طرح اب خیالات تصورات نظریات معتقدات سوالات جوابات سب اجتماعی ہیں۔ اب کوئی تنہا بیٹھ کر سوچتا ہی نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ تنہا بیٹھ کر سوچنے کا موقع ہی انسانوں سے چھین لیا گیا ہے۔ کثیر تعداد میں مال کی پیداوار یہ بنیادی طور پر انسانوں کی زندگی کا موضوع اور مقصد ہے۔ اس کے لیے جن آلات و ذرائع اور وسائل کی ضرورت ہے حسبِ پسند، حسبِ استعداد ہر شخص استعمال کر رہا ہے۔ علم و ادب، شاعری بھی آلات و ذرائع وسائل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں جنھیں اُسی بنیادی اور مرکزی مقصد کے لیے انسان استعمال کر رہا ہے۔ اب یہ ذہن نہ رہا، یہ تصور نہیں رہا، یہ عقیدہ نہیں رہا، یہ حقیقت پیشِ نظر نہیں رہی کہ علم و ادب اور شاعری بذات خود انسان کے اعلیٰ مقاصد زندگی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علم کے بغیر زندگی کیا؟ اور ادب کے بغیر زندگی کیا؟ بات عجیب لگے گی لیکن بات عجیب ہے نہیں۔ شاعری بھی مقصدِ زندگی میں شمار ہو سکتی ہے؟ ادب بھی مقصدِ زندگی میں شمار ہو سکتا ہے؟ جی ہاں ہو سکتا نہیں مقصدِ زندگی رہا ہے۔ آج سے پچاس سال پہلے تک زندگیوں کے پس منظر میں یہ بات میں اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ادب و شاعری عام طور سے زندگی کی بہترین قدروں اور بہترین مقاصد میں شمار ہوتی تھی۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ درجے کی تعلیم تک میں ان کا شمار نصاب کی ضروری اہم اور بنیادی کلیدوں میں تھا جن سے زندگی کے پوشیدہ دروازے کھلتے تھے۔ آج بھی ادب و شاعری نصاب میں ہیں مگر اب ان کی حیثیت ذرائع حصول معیشت کی ہے۔ ہم اس لیے پڑھتے ہیں یا پڑھنے والوں میں نام رکھتے ہیں کہ ہم اس سے روٹی کمائیں گے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ارادوں اور نیتوں کا اثر انسان کے نتائجِ اعمال پر پڑتا ہے۔ علم و ادب کی شاعری کی بڑی بڑی ڈگریاں رکھنے والوں کی زندگیاں بھی اِن تینوں کی روح سے خالی ہیں۔ جس طرح ڈھول خالی رہتا ہے۔ پچاس سال قبل تک میں نے عام طور سے پڑھے لکھے لوگوں میں، عالموں میں، زاہدوں میں، واعظوں میں، مولویوں میں، مکتب کے استادوں میں ادب و شاعری کے پیکر اور روح دونوں کو زندہ کو زندہ اور متحرک دیکھا۔ وہ شاعر کہے نہیں جاتے تھے اور نہ شاعر تھے اور نہ کبھی اپنے متعلق اُنھیں دھوکا تھا کہ وہ شاعر ہیں لیکن بیٹھ جاتے تو ایسا کچھ کہہ

دیتے اور اس طرح بے ساختہ اور قلم برداشتہ لکھ دیتے اور کہہ دیتے کہ میں اپنے بچپن کی وجہ سے حیران رہ جاتا تھا۔ لیکن اس دور کے لوگوں کو ذرا بھی تعجب اور حیرت نہیں ہوتی تھی کیونکہ اُن کی زندگیوں میں یہ چیزیں رَچی بسی ہوئی تھیں۔ وہ ان چیزوں کو زندگی کی شائستگی، روح کی بالیدگی، انسانیت اور آدمیت کی خوبصورتی کا ایسا ہی جزو سمجھتے تھے جس طرح جسم کے لیے صحت اور توانائی کو سمجھتے تھے۔ اُن کے جسم آج کل والوں کی طرح ورزش اور ڈنڈ بیٹھک اور دیوانوں کی طرح میدانوں میں دوڑ نہ لگانے کے باوجود اتنے صحت مند تھے کہ جب کبھی مظاہرے کا موقع آجاتا تو دُنیا دنگ رہ جاتی۔ ان کے چہرے روزانہ سینکڑوں روپے سے خریدے ہوئے مختلف قسم کے شیونگ سیٹ، صابون اور برش روغن اور لوشن وغیرہ کے بغیر ایسے دلربا اور دلکش ہوتے تھے کہ دیکھنے والے مفتون اور مرعوب ہوجاتے۔ اور موٹے جھوٹے گھر کے ترشے اور سلے ہوئے صاف ستھرے پاک اور طاہر کپڑوں میں ایسے وضع دار نظر آتے کہ لوگ محبت کرنے پر مجبور ہوجاتے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کی زندگیاں ان تمام صفات کی روح سے آراستہ و پیراستہ تھیں جن کا ہم صرف ڈھول بجاتے پھرتے ہیں اور وہ بھی ایسی آواز سے جو بھونڈی بھی ہے اور بے سُری بھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج آپ کتاب اُٹھالیں، رسالے اُٹھالیں اخبارات اٹھالیں ان میں وہی چیزیں ملی گی جن سے ہمارے دل آشنا، ہمارے کان آشنا، ہماری آنکھیں آشنا، ہماری خواہشیں، ہماری تمنّائیں، آرزوئیں آشنا ہیں جو ہم دن رات گلیوں میں، سڑکوں پر دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، بولتے ہیں۔ گویا ادب، شاعری ہمارے کیمرے فوٹو ہیں۔ ادب، شاعری، صحافت اب زیادہ سے زیادہ یہی کام کرتی ہے۔ حالانکہ یہ کام ادب، شاعری، صحافت کا نہیں ہے۔ ان کا کام ہمارے ذہن وفکر، خیال، احساسات، تخیل اور تصوّر کے بند دروازوں کو کھولنا، ہمارے اندر چھپی ہوئی گرد آلود خوبصورتیوں کو نمایاں کرنا، خاکستر آلود چنگاریوں کو روشن کرنا، ہمیں چونکانا، ہلکے ہلکے جھنجھوڑنا، بیدار کرنا۔ ہماری سطح پر ایسی سیڑھیاں لگانا جن سے ہم اوپر کی طرف قدم بڑھاسکیں۔ نئی بلندیوں کو ہمارے سامنے لانا۔ انسانی زندگی میں یا کائنات کی کسی چیز میں دو ہی قوتیں ہیں۔ یا بلند ہونا یا گرنا۔ آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا۔ کائنات میں ٹھہراؤ نہیں ہے ٹھہراؤ موت کا نام ہے۔ اگر بلندیاں ہمارے سامنے نہیں آئیں گی اور ان بلندیوں پر چڑھنے کے لیے ہمارے سامنے سیڑھیاں نہیں آئیں گی تو لامحالہ ہم نیچے کی طرف چلیں گے۔ گذشتہ چالیس برسوں سے ہم نیچے ہی جارہے

ہیں۔ کیونکہ بلندیاں ہم سے اُوجھل ہوگئی ہیں، زینے معدوم ہوگئے ہیں۔ ہم میں قوت ہے اِنرجی ہے۔ ہم کسی مقام پر ٹھہر نہیں سکتے۔ آگے راستہ نظر نہیں آئے گا تو فطری طور پر ہم مڑیں گے اور پھر پیچھے کی طرف چلیں گے۔ اِسی وقت ادب اور شاعری انسانی زندگی میں شمع لے کر داخل ہوتی ہے۔ آگے کے اندھیروں کو روشن کرتی ہے۔ موہوم راستوں کو ہلکی وضاحت سے ہم آہنگ کر کے ہمیں ترغیب دیتی ہے ہمّت دلاتی ہے سہارا دیتی ہے چمکارتی ہے پیٹھ ٹھونکتی ہے:

میں حیرت وحسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

یہ کب ہوگا؟ جب شاعر، ادیب، افسانہ نگار کے دل میں شمع محبت روشن ہوگی۔ ایک نا قابلِ بیان اضطراب ایک دائمی کرب، ایک ہمہ گیر درد سے اس کا دل آشنا ہوجائے گا۔ اس آتش کدۂ دل کو سارے سمندر مل کر بھی نہیں بجھا سکتے۔ اِس کا ایندھن اس کا وجود ہے۔ اِسی ایندھن میں وہ تپتا ہے اسی میں پگھلتا ہے اور اسی کے بعد شاعری اور ادب کے سانچے میں اپنے پورے وجود کے ساتھ ڈھلتا ہے۔ جو لہو اس کے دل کے شریانوں میں ہے وہی اس کے فن کی رگوں میں دوڑنے لگتا ہے:

ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

یہ راستہ دکھانے والا ادب، چراغ ہاتھ میں لے کر آگے آگے چلنے والی شاعری کیا اِن نقلی آشفتہ موکوچہ گردوں کے بس کی ہے؟ جو مشاعروں میں ایک جرعۂ مئے کے لیے ایک صدائے تحسین، ایک تالی کے لیے مرتے ہیں اور ایسی شاعری کرتے ہیں:

مجھ کو تو تیرے جسم کی خوشبو بھلی لگے

یا

بھڑک اُٹھے نہ کہیں شعلۂ ہوس دل میں
تم اتنے پاس نہ آؤ بہت اندھیرا ہے

دیکھو، خوبصورت مگر بے جان الفاظ کا بوجھ لیے ہوئے شاعری کہاں گری ہے۔ پہلے انسان یہاں پہنچا ہے پھر شاعری کے لیے یہ سطح آئی ہے۔ اِن کے پاس وہ سوز ابدی کہاں جو مقصودِ ہنر ہے۔ انھیں تو بس ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کافی ہے۔ بات سامنے آگئی ہے تو چپ رہنے کا جی نہیں چاہتا گرچہ میں جانتا ہوں کہ چپ نہ رہنے کی صورت میں کیا ہونے والا ہے۔ کبھی تو یہ وقت آنا

چاہیے کہ بات دوٹوک کہہ دی جائے؟ آج سے تیس سال قبل شاعری کے ابتدائی دَور میں شاید گیا کالج کے ایک طرحی مشاعرے میں شادؔ کے مصرع پر میں نے بھی غزل لکھ کر پڑھی تھی۔ استاذی جمیل مظہری مرحوم بھی شریکِ مشاعرہ تھے۔ پوری غزل سن کر جمیل صاحب نے فرمایا: تم نے اپنے لیے بالکل الگ راہ نکالی، تو میں نے مطلع پڑھا تھا:

وہی کہیں گے جو ہوگا ہمیں بجا معلوم
بھلا کسی کو ہو معلوم یا بُرا معلوم

زندگی کے کسی موڑ پر اور شاعری کی کسی منزل پر وضاحت کے ساتھ ہو یا ایمائیت کے ساتھ دُھوپ کی طرح یا چھاؤں کی طرح تیز لہجے میں یا نرم لہجے میں بات میں نے دوٹوک ہی کہی ہے۔ تکلف سے کہی ہو لیکن رعایت سے کبھی نہیں کہی۔ ترقی پسند تحریک بیشک حالات کے اعتبار سے ایک موزوں، مناسب اور مفید تحریک تھی اور کسی حد تک واقعی اور فطری اور ضرورت کے مطابق۔ گرچہ یہ تحریک اس سرزمین سے نہیں پھوٹی تھی اور زندگی کے اندر سے نہیں نکلی تھی، مگر زندگی سے ہم آہنگ تھی۔ وقت کی پکار تھی۔ اس لیے اس پکار نے پریم چند کو بھی اور حسرتؔ موہانی کو بھی اور ان سے پہلے اقبالؔ کو بھی متوجہ کرلیا تھا۔ بات چلی اور اٹھائی گئی چلائی گئی لیکن چونکہ اس تحریک پر سایہ ایک ایسی تحریک کا تھا جو فیضانِ سماوی سے محروم تھی اور فطرت کے سرودِ ازلی سے نامحرم تھی۔ اس لیے جلد ہی اس کا زرق برق لبادہ اُترنے لگا اور اس کی بدخوارگی اور بدہیئتی آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی گئی، اور پھر منٹو اور عصمت چغتائی جیسے کم نظر، کم سواد علمبردار سامنے آگئے اور انھوں نے اپنا اصلی اور کھلا ہوا مال بازار میں پیش کردیا۔ انھیں فنّی سلیقہ نہ تھا اور یہ اچھے سیلس مین اور وسیع النظر کاروباری بھی نہ تھے اور یہ سب اس لیے کہ یہ فطرت کے رازداں نہ تھے اور فطرت کی رازداری سے محروم اس لیے تھے کہ فیضان سماوی سے محروم تھے۔ یہ نیت کے پاک اور عمل کے سچے بھی نہیں تھے۔ انھیں اس کا سلیقہ نہ تھا کہ انسانیت کی برائیوں کی تعمیری اور صحت مند پردہ کشائی کس طرح کی جاتی ہے اور سلیقہ اس لیے نہیں تھا کہ یہ اُن برائیوں کو برائیاں نہیں سمجھتے تھے بلکہ انھیں زندگی کا صحت مند حصہ سمجھتے تھے اس لیے اس کی پیشکش لذّت اور چاشنی کے ساتھ کرتے تھے کہ یہ برائیاں سوسائٹی سے جائیں نہیں، دُور نہ ہوں بلکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اِن کی لذتوں سے آشنا ہوں اور یہی کاروبار چل پڑے اور اسی مال کی کھپت بازار میں بڑھ جائے اور یہاں تک

بڑھے کہ اور کوئی مال بازار میں رہے ہی نہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ انسان کی جبلّی فطری تقاضوں کے مابین صحت مند توازن پیدا کر کے زندگی کی صحیح خوبصورت اور بابرکت ارتقا کا دروازہ کیسے کھولا جا سکتا ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ خیر اور شر، بیماری اور صحت مندی تخریب اور تعمیر یہ دو متوازی پہاڑ جو انسان کی زندگی میں فطری طور پر شامل ہیں اِن میں توازن پیدا کر کے ترک و انتخاب کے مناسب اور موزوں عمل سے گزر کر کس طرح اس کائنات میں انسانی زندگی کو شرافت، عزّت اور بلند مقامی تک پہنچایا جا سکتا ہے جو اس کا اصل مقدر ہے۔ وہ اس مقدر کے خلاف سمت قدم اٹھاتے ہیں اس لیے کہ یہ آرام طلب اور عیش کوش ہیں اور کام مجاہدے اور قربانی کا ہے۔ مجاہدے اور قربانی کا تصوّر ان کے شعور کے دُور دراز تنگ و تاریک کسی گوشے میں نہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ زندگی اب تک کن کن مقامات سے گزری ہے۔ تاریخِ انسانی میں ایسے مقامات کب کب آئے ہیں۔ انسان کب اونچا گیا ہے اور اس کے بلند ہونے میں کن کن اسباب و عوامل کو دخل رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اپنے موقف کا دفاع اور حمایت سمجھ سے زیادہ منطقی استدلال سے کریں گے اور سند اور دلیل کے لیے ہندوستان ہی نہیں یورپ اور امریکہ تک کو کھینچ لائیں گے اور مجھے کچھ تعجب نہ ہوگا کہ یہ خاندان، یہ نسل وہیں سے تو پھیلی ہے۔ وہ اپنے بھاری بھرکم اسلاف اور پیش رووٗں کا ذکر کیوں نہ کریں گے۔ وہ شاید نہیں جانتے یا جان کر انجان بنتے ہیں کہ میں جو کہہ رہا ہوں اُن کی دلیلیں اتنی ہیں جتنے آسمان میں تارے ہوں گے اور آج نہیں، اس صدی میں نہیں، کئی صدیوں اور کئی ہزار سالوں کی کائناتی اور انسانی تاریخ میں انھیں ستاروں کی طرح پھیلی اور بکھری ہوئی ہیں۔

تو بہرحال یہ چند سطریں بازار بھاؤ کے متعلق صاف صاف اس لیے لکھ دیں کہ آپ جان لیں کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔ کن مشکلوں میں، کن ارادوں کے ساتھ کھڑا ہوں۔ میری راہ کتنی دُشوار، رکاوٹیں کتنی سنگین اور چپ و راست، پیش و پس کتنے کانٹے، کتنی چھریاں، کتنے نیزے، برچھیاں، تلواریں بدن کو چھیدنے، ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کو نشانہ لگائے کھینچی ہوئی تیار کھڑی ہیں:

کھڑے ہیں ناخنوں کو تیز کر کے ہر طرف کانٹے
گلستاں میں ہمارے پیرہن کی آزمائش ہے

اور میرے پاس کچھ نہیں۔ نہ سامان نہ اسباب نہ وسائل نہ مال نہ فنڈ نہ گروہ نہ حلقہ نہ پارٹی:

اس طرف تنہا بندۂ عاجزؔ　　　اور مقابل میں اِک خدائی ہے

بس میں ہوں میرا ٹوٹا پھوٹا دل، میری سیدھی سادی زبان، میری نرم نرم آہیں، میرے گرم گرم آنسو۔ میری چوکی، چوکی پر معمول بستر، بکھرے ہوئے کاغذ، ہاتھ میں قلم، فرش پر نگاہ اور عرش پر تصوّر۔ ہاں میری بغل میں ایک دولت ہے، ایک طاقت ہے، ایک نور ہے، ایک آبِ حیات ہے، ایک چراغ ہے۔ میرا ایک دوست ہے جو سیاہی میں، سفیدی میں، اندھیرے میں، اُجالے میں، جلوت میں، غم میں، خوشی میں، خواب میں، بیداری میں، امن میں، خطرے میں، ہر وقت میرے ساتھ میرے شانے پر سر رکھے میرے سینے سے چمٹا ہوا رہتا ہے۔ یہ وہی ہے جس کی تعریف سے میں نے اس دیباچے کا آغاز کیا ہے۔ وہ میرا شفیق مشفق میرا دوست، میرا ہتھیار، میرا مددگار، حمایتی، میری زندگی کی توانائیوں کا منبع اور سرچشمہ 'محبت' ہے:

تجھے اے غمِ محبت اِدھر آ گلے لگا لوں
نہ ترا کہیں گزر ہے نہ مرا کہیں ٹھکانہ

یہ غزل تیس سال پہلے کی ہے۔ میرے پہلے مجموعے کے ابتدائی حصّے میں موجود ہے۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ میرے لیے نشانِ منزل، چراغِ راہ، میری طرزِ رفتار، سب کچھ مشیت نے، قدرت نے بہت پہلے ہی متعین کر دیا تھا۔ اب میں بے خوف ہوں، بے ہراس ہوں، بے پروا ہوں۔ میں نے محبت کو بہت کچھ کھو کر پایا ہے۔ پہلے جو کھویا اس کا غم تھا اب جو حاصل کیا اس کا اعتماد اور اطمینان ہے۔ یہ محبت جو میرے دل میں چھپی بیٹھی ہے، یہ اپنی خوراک بھی چھپی چھپی حاصل کر لیتی ہے۔ بس جہاں کسی بندۂ خدا پر مصیبت آتی ہے اس کی رفتارِ نبض تیز ہو جاتی ہے، اس کا دورانِ خون بڑھ جاتا ہے، اُس کا جوش اُبھر آتا ہے، اس کی نسیں کھنچ جاتی ہیں، اُس کی انگڑائی بلند ہو جاتی ہے، اُس کی آنکھیں سُرخ ہو جاتی ہیں، اُس کا چہرہ گلنار ہو جاتا ہے۔ یہ زہرہ کی طرح ہونٹوں سے بانسری لگائے، پاؤں میں گھنگھرو باندھے چھم سے میری غزلوں میں کود جاتی ہے۔ اپنے رقص سے مجھے گرما دیتی ہے۔ پھر مجھے اور کچھ نہ چاہیے۔

بھاگل پور سے ٹیلی فون آیا تو اس گستاخ محبت نے ریسیور میرے ہاتھ سے چھین کر خود اپنے کان سے لگا لیا اور سننے لگی۔ دیکھا تو چہرہ تمتما گیا۔ پہلے تو آستین چڑھا کر کھڑی ہو گئی اور بول اُٹھی:

چند دن سے تھے نہایت ہی پس و پیش میں ہم
چپ ہی رہ جائیں کہ اظہارِ خیالات کریں؟

پھر یہی سوچا کہ چپ رہنے کا اب وقت نہیں
ہم نشیں آ ذرا دِل کھول کے کچھ بات کریں

اور خوب خوب بات کی۔ پھول جیسے ہونٹوں سے، انگاروں جیسے بتیس اشعار ٹپک پڑے جس سے پوری فضا گرم ہوگئی۔ لیجیے آپ بھی گرما جایئے:

ہم نشیں یاد ہے تجھ کو کہ ترے یار تھے ہم — تیری ہی زُلفوں میں صدیوں سے گرفتار تھے ہم
سایۂ گل تھے ترے چاہنے والوں کے لیے — ترے دُشمن کے لیے برہنہ تلوار تھے ہم
تو اگر شمع تھا ہم تیرے لیے تھے فانوس — تو مکیں تھا تو مکاں کے درودیوار تھے ہم

وید و قرآن کا اِک ساتھ نکالا تھا جلوس
قشقہ ماتھے پہ لگانے کو بھی تیار تھے ہم

نرم و نازک حسین ہونٹوں سے ٹھوس حقیقتیں، سچی تاریخ، پچھلی پانچ صدیوں کی تاریخ، پندرہویں صدی سے بیسویں صدی کے اوائل تک کی تاریخِ دہلی، اکبرآباد، آگرہ، فتح پورسیکری پھر ۱۸۵۷ء پٹنہ، کانپور کی تاریخ اور پھر دہلی اور خلافت موومنٹ، آگے سنیے:

حسن تھا حسن پرستی کا یہ ماحول نہ تھا — ایسا ماحول تجھے پہلے پہل ہم نے دیا
تجھ میں پیدا کیا ہم نے نیا احساسِ جمال — تیری زلفوں میں نئے طرز سے بل ہم نے دیا
ہم نے تعمیر کیا تیرے لیے لال قلعہ — تیرے ماتھے کے لیے تاج محل ہم نے دیا

بات کرنے کو دی اُردوئے معلّٰی ہم نے
گنگنانے کے لیے سازِ غزل ہم نے دیا

آج سے چھ سو سات سو سال پہلے کے ہندوستان کو اپنی نگاہوں میں لایئے اور پھر اقبالؔ کے اُس قطعہ کو پیشِ نظر رکھئے:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

اور دیکھئے کہ بند کے چار اشعار میں پہلے دو اشعار کیا نقشہ دِکھا رہے ہیں؟ ہمایوں، اکبر، شیر شاہ سوری اور جہانگیر کے عہد کو یاد کیجیے جو تاریکیوں کو روشن کرنے اور سفال کو ایاغ بنانے میں گزرے۔ کہساروں کو توڑ کر شالیمار، جنگلوں کو چیر کر شاہراہ، چوکیاں اور ڈاک سرائے اور مسافر خانے،

با غنچے اور چمن، نسرین ونسترن، گلاب اور لالہ، خونیں کفن، انصاف کا گھنٹہ اور سونے کی زنجیر، دھوبن کا دعویٰ اور جہانگیر کا سینہ اور تیر۔

بعد کے دو اشعار کے لیے بس جمنا کے کنارے کنارے چلے جایئے۔ کچھ مت کہیے۔ بس دیکھ کر چلے آیئے اور خلوت میں بیٹھ کر غالبؔ کے خطوط نکالیے۔ رتن ناتھ سرشار کا 'فسانۂ آزاد'، دَیا شنکر نسیم کی 'گلزارِ نسیم'، چکبست کا دیوان، فراقؔ کی رُباعیاں 'رُوپ رنگ' نکالیے اور تھک جایئے تو کسی شامِ غزل میں چلے جایئے۔ اختری بائی، پنکج ملک، غلام علی، گولکی داس اور رفیع سے غزلیں سنیے۔ نہ سنیے تو بازار چلے جایئے، ہزاروں ریکارڈ، ہزاروں ویڈیو، ہزاروں کیسٹ خرید لایئے جو ہندوستان، پاکستان، یوروپ، امریکہ، کناڈا اور عرب میں گھر گھر بج رہے ہیں اور سن کر اقبالؔ کا ترانہ دُہرا رہے ہیں کہ:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

آگے سنیے اور ذرا کلیجہ تھام کے سنیے کیونکہ یہ نازنیں کہتے کہتے خود سسک رہی ہے:

زندگی گزری تجھے خونِ جگر دیتے ہوئے اور تری زلفوں کو اشکوں کے گہر دیتے ہوئے
تیری محفل میں صراحی کے لیے خم کے لیے گردنیں دیتے ہوئے کاسۂ سر دیتے ہوئے

شبہ ہو تو جایئے بہار سے پنجاب تک سینکڑوں ہزاروں کنویں کھود ڈالیے، ندیوں اور نہروں کی تہہ میں اُتر جایئے اور اُتر کر اُن کارخانوں کو، فیکٹریوں کو دیکھ لیجیے جہاں سے خم وصراحی، جام ومینا، بادہ وساغر، شراب وکباب محفلوں میں سپلائی ہوتے ہیں۔ کارخانہ جاری ہے۔ پروڈکشن ابھی تک ہو رہا ہے، سپلائی بند نہیں ہے:

آنسوؤں کی مئے بنی زخموں کا پیمانہ بنا سینکڑوں میخانے اُجڑے ایک میخانہ بنا
شاخِ گل کی چھاؤں میں گلچیں ہے اب آرام سے دشمنِ خانہ ہی آخر صاحبِ خانہ بنا

پرانی شاعری ٹپک پڑی۔ یہ شاعر بھی ملک کا بہت بڑا اسپلائرر ہا ہے۔ تو خیر اور کتنا سناؤں۔ بتیس اشعار کی نظم سمجھانے میں کم از کم اتنے ہی صفحات لگ جائیں گے۔ آپ بھی گھبرا جائیں گے۔ نظم چھپ چکی ہے دیکھ لیجیے ورنہ نظموں کے مجموعے کا انتظام کیجیے۔ تو جناب اس نازک اندام کو یہ طرزِ گفتار بھی آتی ہے؟ پھر دیکھا کہ چہرے سے تمتماہٹ ختم ہوگئی۔ اُس جگہ ایک پُر وقار ہلکی افسردگی نے لے لی۔ پھر اس نیک بخت نے آنکھیں اُٹھائیں تو ایسا لگا کہ درد کا ایک سمندر آنکھوں میں

لہریں لے رہا ہے۔ پھر دیکھا کہ اس نازنین نے کسوت سے ایک نازک سی بانسری نکالی۔ اپنے نازک پنکھڑی جیسے ہونٹوں سے لگائی اور وہ آنکھوں میں لہراتا ہوا درد کا سمند رنغمۂ پرسوز بنکر بانسری سے بہنے لگا۔ سنیے آپ بھی سنیے۔ اور صرف سنیے نہیں گنگنائیے۔ یہ شاعری صرف سننے کی نہیں خود گنگنانے کی ہے اور میؔر کی طرح دل پرخوں کی اک گلابی سے عمر بھر شرابی کی طرح رہنے کی ہے۔

سنیے نغمہ بلند ہو رہا ہے:

عمر بھر پیار کیا جس کو وہ پیارا نہ ہوا
ہم تو اس کے ہوئے لیکن وہ ہمارا نہ ہوا

کاروبارِ دل و جاں راس نہ آیا ہم کو
کوئی سودا نہ ہوا جس میں خسارا نہ ہوا

کتنا زخموں کے چراغوں سے سجایا دِل کو
پھر بھی کمبخت کسی آنکھ کا تارا نہ ہوا

جیسی اس یارِ ستمگر سے نباہی ہم نے
ایسی یاری کا کسی اور کو یارانہ ہوا

میں نے تاریخ کا اِک ایک ورق دیکھ لیا
کوئی بھی میری طرح درد کا مارا نہ ہوا

غمِ جاناں میں گزرتی نہیں کیا کیا پھر بھی
غمِ جاناں کے بغیر اپنا گزارانہ ہوا

دردوالوں میں تیری بات کی شہرت ہے کلیم
لوگ کہتے ہیں کہ ایسا سخن آرا نہ ہوا

ہم نشیں ہی کا یہ دوسرا رُخ ہے۔ وہ طرزِ شکایت ہے، یہ اندازِ محبت ہے۔ اُس میں بغاوت کی گرمی ہے، اِس میں فدائیت کی نرمی ہے۔ وہ رزم ہے، یہ بزم ہے۔ وہ سیل تیز وتند ہے، یہ جوئے نغمہ خواں ہے۔ میں اپنے اِس نرم گرم ساتھی کے مل جانے کے بعد کسی دوسرے ہمدرد، مونس، غمگسار و مددگار کا محتاج بالکل نہ رہا۔ میں آسودہ بھی ہوں اور مطمئن بھی، نہ کسی سے التفات نہ امید کرم:

ہم ایسے سیر چشم اوروں سے کیا چشم کرم چاہیں
خدا توفیق دے تو بس تجھی کو اے صنم چاہیں

میں کم آمیز ہوں مگر گوشہ نشیں نہیں۔ میں بزم میں بھی جاتا ہوں، بازار سے بھی گزرتا ہوں۔ مسجد بھی پہنچتا ہوں اور میخانے ہو کر بھی نکلتا ہوں۔ میں کم آمیز ہوں مگر گوشہ نشیں نہیں۔ صحرا نورد ہوں صحرا نشیں نہیں۔ کم سخن ہوں مگر کم نگاہ نہیں۔ ملتا سب سے ہوں، سنتا سب کی ہوں، کرتا وہی ہوں جو دل کہتا ہے اور مجھے ہر جگہ سے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ دیدۂ بینا ہو تو درسِ محبت یا درسِ عبرت ہر جگہ ہے۔ مجھے بے مانگے ملتا ہے۔ آج مانگنے کا رواج بہت ہے۔ مانگنے کا مزاج ہے مانگنے کا ماحول

ہے۔اس سرزمین ہند میں اس ملک میں مانگنا سرشت ہے۔ مانگنا یہاں کی فطرت میں داخل ہے۔ یہاں لوگ دریا سے، سمندر سے، درخت سے، پتھر سے، مٹّی سے، پانی سے، آگ سے، ہوا سے، سورج سے، چاند سے، آدمی سے، جانور سے، پاخانہ سے، پیشاب سے یہاں تک کہ شرمگاہ سے بھی مانگتے ہیں اور پوجتے ہیں۔ یہی مانگنا ہماری فطرت میں بھی داخل ہوگیا ہے۔اب مسلمان بھی مانگ چانگ کر ہی کھانا چاہتا ہے۔ جو کچھ سب مانگتے ہیں ہم بھی مانگنے لگے ہیں اور جس جس نوعیت سے مانگتے ہیں، جس جس پہلو سے مانگتے ہیں ہم بھی ان نوعیّتوں سے اور پہلوؤں سے مانگتے ہیں۔ حالانکہ ہم مانگنے والے کبھی نہیں تھے۔ہم تو ہمیشہ دینے والے تھے۔ بہر حال یہ موضوع دوسرا ہے۔مگر یہاں اقبالؔ کے چند شعر لکھ دینے کو جی چاہتا ہے کہ مانگنے کی اصل چیز کیا ہے:

ہمّت ہے اگر تو مانگ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شانِ بے نیازی
یہ فقر نصیب ہو تو مومن — بے تیغ وسپہ ہے مرد غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری — اللہ سے مانگ یہ فقیری

مجھے درد ملا، سوز ملا، آنسو ملے۔ میں چاہتا ہوں:

میں تو جلتا ہوں تم بھی جلو دوستو — شمع کے واسطے انجمن چاہیے
اپنے ٹھنڈے دِلوں کے لیے مانگ کر — مجھ سے لے جاؤ جتنی جلن چاہیے

شاعری کا مزاج، موضوع، مقصد سب بدل گیا۔اس کی اُڑان، اس کی جست، اس کی پرواز سب ختم ہوگئی۔ اس کی تیزی، اس کی کاٹ، اِس کی تراش سب جاتی رہی۔ نتیجہ یہی ہے جو اس ماہ کے شمارے 'زبان وادب' میں دیکھا۔کوئی مضمون ایسا نہیں جس میں کوئی وزن ہو، کوئی تیور ہو، کوئی لہجہ ہو، کوئی آہنگ ہو، کوئی کہنے کی بات ہو، کوئی سلیقہ ہو۔بس کا تا اور لے دوڑے والا انداز ہے۔ اکادمی جس اُردو زبان وادب کے نام پر لاکھوں کروڑوں کی کھپت کرتی ہے وہ بھی زبان وادب کا کوئی معیار پیش کرنے کے قابل نہیں۔ بہر حال یہ بھی میرے موضوع سے الگ ہے۔ میں آج تیس سال سے گرتا پڑتا بے یار ومددگار ایک عَلم اٹھائے ایک جھنڈا لیے ایک آواز لیے چل رہا ہوں:

یہ کون اپنی الاپے ملہار گزرے ہے — کہ جس کی تان کلیجے کے پار گزرے ہے

میں چاہتا ہوں کہ یہ الاپ، یہ ملہار سب کے نہیں تو کچھ کے دِلوں سے نکلنے لگے۔ درد کی پکار چل

جائے یہ خیریت کی بات ہے:

اوروں کا دُکھ درد اپنا کر نکلے ٹھوکر کھانے ہم
سب سے دیوانہ تھا مجنوں اُس سے بھی دیوانے ہم
خون کے پیاسے دل میں ٹھنڈک سوزِ محبت سے ہوگی
دُنیا پانی مانگ رہی ہے آگ چلے بھڑکانے ہم
اب تک ہشیاروں نے ہم کو زنجیریں پہنچائی ہیں
اب جائیں گے ہشیاروں کو زنجیریں پہنانے ہم
خواب میں ہم کو عشق نے اپنا شیش محل دکھلایا ہے
رستے سے گرچہ نہیں واقف منزل ہیں پہچانے ہم

اب رستے سے بھی تھوڑی تھوڑی واقفیت ہوچکی ہے۔ میں جانتا ہوں یہ کام آسان نہیں۔ بہت مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔ مشکل ہوا کرے:

وہ کام تو ہم کرتے ہی نہیں جو کام بہت مشکل نہ رہا

یہ دیوانہ پن ہے مگر دیوانہ پن کے بغیر دنیا میں کوئی بڑا کام ہوا نہیں۔ عقلمندی اور ہشیاری، چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے۔ منزل ہی نہیں تو چراغِ راہ کس کام کا۔ عقل کی تقدیر میں حضوری نہیں اسی لیے میں کہتا ہوں کہ:

مجھ سے چاہیں تو اہلِ خرد مانگ لیں
تھوڑی آشفتگی تھوڑا دیوانہ پن

یقین اور اعتماد بہت بڑی قوت ہے۔ اسی اعتماد اور قوت نے مجھے تیس سال سے کھڑا کر رکھا ہے۔ سیلاب اور طوفان مجھے ڈھکیلتے ہیں۔ لڑکھڑا دیتے ہیں۔ ڈگمگا دیتے ہیں مگر گرا نہیں سکتے:

دل کو تھامے یہ کون آتا ہے   لڑکھڑاتا ہے ڈگمگاتا ہے
پیار میں دل بھی ٹوٹ جاتا ہے   ہائے بے چارے کو خبر ہی نہ تھی
کس قدر بوجھ دل اُٹھاتا ہے   اُن کا غم جاں کا غم جہاں کا غم

اور اس عالم میں بھی اپنی منزل وہی ہے، موضوع وہی ہے، عزم وہی ہے، ارادہ وہی ہے۔ یقین اور اعتماد وہی ہے:

میرا دل بھی ہے آئینہ در آئینہ تیری صورت غزل در غزل ہی سہی
تجھ کو کو اپنا بنا کر ہی چھوڑیں گے ہم گر نہیں آج پیارے تو کل ہی سہی

آج کی شاعری، آج کا ادب اپنا رُخ، اپنی سمت فراموش کر رہا ہے۔ فراموش ہو جائے گا اگر اس کے سامنے للکار نہیں آئی، چیلنج نہیں آیا۔ میری ٹوٹی پھوٹی سیدھی سادی شاعری اپنی سرشت اپنے مزاج میں وہی چیلنج رکھتی ہے:

ہاں دیکھ ذرا کیا ترے قدموں کے تلے ہے ٹھوکر بھی وہ کھائے ہے جو اِترا کے چلے ہے

....

ہر ایک قدم پہ ہم اُس آوارہ قدم کو ہاں دیکھ کے چل دیکھ کے چل کہتے رہیں گے

....

ہر اِک قدم پہ تجھے آئینہ دکھاؤں گا کہ میرے پاس غزل کی کمی نہیں پیارے

....

اپنے پہلے مجموعے کے دیباچے میں شاعری کا پس منظر آ گیا تھا۔ اِس مجموعے میں شاعری کے کچھ فکری فنّی بنیادوں کی طرف اشارے ہیں۔ شاعری میں اشارے ہی کیے جاسکتے ہیں۔ مقالہ نگار ہوتا، مؤرّخ ہوتا تو میں آپ کو بتاتا کہ پینتالیس سال پہلے میرا ایک سفر شروع ہوا۔ کتنے جُگ بیت گئے۔ سفر ختم نہیں ہو رہا ہے۔ کمر بند نہیں کھل رہا ہے۔ کتنے تماشے ہو رہے ہیں، یہ سب تماشے بالائے بام ہیں۔ ترقیاں، ایجادیں، آسائشیں، فراوانیاں، عمارتیں، گاڑیاں، لباس، کھانے، اسٹیج اور روشنیاں، تقریریں اور آوازیں، انتخابات اور حکمرانیاں، جمہوریت اور سلطانیاں، وعدے اور حوصلہ افزائیاں، مارکیٹ، بازاریں اور ایمان فروشیاں، بے پردہ دوستیاں، باپردہ دشمنیاں، نئے نئے عہدے، نئی نئی کرسیاں، انجمنیں، اکاڈمیاں، بناوٹیں اور صنّاعیاں، منافقتیں اور ریاکاریاں، غازے اور سرخیاں، جھاڑ فانوس، چراغاں، قمقمے اور مرکریاں:

سروں پر قمقمے ہوں گے دِلوں میں غم تو کیا ہوگا
اندھیرا اور بڑھتا ہی رہے گا کم تو کیا ہوگا

یہ سب تماشے لب بام ہیں، زیرِ بام کیا ہو رہا ہے؟ خوب خبر ہے، خوب پتہ ہے، مگر ہم دوسروں سے منافقتیں کرتے کرتے خود سے بھی منافقت کرنے لگے ہیں:

تماشے بکھرے ہوئے زیر بام اتنے ہیں
کہ میں نے دیکھنا بالائے بام چھوڑ دیا

میری منزل دُور سے دُور، راستہ دراز سے دراز ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی اُٹھے، سامنے آئے، ہمّت ہو تو بتائے کہ سفر تو ختم ہو گیا۔ کیا واقعی ختم ہو گیا؟ ذرا چہرہ تو دکھاؤ، آنکھیں تو ملاؤ۔ دیکھو ہونٹ پھڑ پھڑائے، دیکھو آنکھیں ڈبڈبائیں، دیکھو چہرہ سُرخ ہوا۔ دیکھو چیخ نکلی۔ اِدھر سے راوڑکیلا بولا اُدھر سے جمشید پور، اِدھر سے بہار شریف، اُدھر سے علی گڑھ، اِدھر سے احمد آباد اُدھر سے مراد آباد، اِدھر سے بھیونڈی اُدھر سے میرٹھ، اِدھر سے بھاگل پور۔ اُف یہ تو دبستان کھل گیا:

پکار جب ہوئی ہے کوئی تشنہ کام آئے
شمار کر نہ سکا کوئی اتنے نام آئے

ہزاروں آنچل، ہزاروں ننھی ہتھیلیاں، ہزاروں دستِ حنائی، ہزاروں دست، محنت کش، ہزاروں ماں کے لال، ہزاروں باپ کے لاڈلے، ہزاروں میاں کی چہیتیاں، ہزاروں گود کی روشنیاں، کھیتوں سے ندیوں سے مٹّی جھاڑتی ہوئی بلند ہوئیں۔ ہم بھی ہیں، ہم بھی ہیں، ہم بھی ہیں۔ واللہ کہ ہم مجرم نہ تھے، ہم نے کسی کو ستایا نہ تھا، ہم نے کسی کو دھوکا نہ دیا تھا۔ ہم نے کسی کی زمین غصب نہیں کی تھی۔ ہم نے بغاوت نہیں کی تھی۔ ہم نے ملک دُشمنی نہیں کی تھی۔ ہم تو مٹّی کھودتے تھے، آدھا پیٹ کھاتے تھے، کھلاتے تھے۔ شکر کرتے تھے۔ ہم نہ موٹر میں گھومتے تھے نہ اسمگلنگ کرتے تھے۔ نشہ نہ پیتے تھے نہ پلاتے تھے، نہ بیچتے تھے نہ خریدتے تھے۔ ہم تو بھالو باسا میں رہتے تھے۔ پھٹا پرانا برقعہ اوڑھ کر نکلتے تھے۔ دامن میں پھٹے جھولے میں ترکاریاں، سبزیاں خرید کر لاتے تھے۔ گھر آ کر برقعہ اُتار کر مسالہ پیستے تھے، چولھا پھونکتے تھے، جل جل کر کھانا پکاتے تھے۔ ٹفن ڈبّہ میں دو ایک چپاتیاں بھنجیا دے کر میاں کو کارخانے رُخصت کرتے تھے، ہم کو بسوں میں سوار کیا گیا، بچوں کو گود میں ساٹ کر بھاگے۔ سانس بھی نہیں لیا تھا کہ ہمیں بم سے اُڑا دیا گیا۔ ہم کو نہ ترکی سے غرض نہ پاکستان سے مطلب، نہ بابری مسجد سے سروکار۔ ہم تو اللہ میاں کے گنہگار تھے اور کسی کے خطاوار نہ تھے:

اے خیرِ آسمان و زمیں خیرِ بحر و بر — اے خیرِ کُل جن و ملک خیرِ کُل بشر
اے چشمۂ حیات مسیحائے کائنات — بیماروں کے حکیم مریضوں کے چارہ گر
اپنی بساط ہی نہیں تعریف کیا کریں — بعد از خدا بزرگ توئی قصۂ مختصر
ہم کیا ہمارا منہ کیا ہماری زبان کیا — بولیں کیا؟ ہم تو پھوڑنے آئے ہیں اپنا سر

یہ سر کہ جس کا مول نہ تھا تاجِ قیصری | ہوتا ہے اب فروخت بہت سستے دام پر
اور سستے دام کی بھی ضرورت نہیں رہی | بے دام ہی تراش لیے جاتے ہیں یہ سر
گردن بریدہ پیرہن و جسم سوختہ | یوں بھی ہم آئے کوچہ و بازار میں نظر
محفل اُجاڑ شمع فسردہ فضا خموش | بکھری ہوئی پتنگوں کی لاشیں اِدھر اُدھر

کیا کیا گزر رہی ہے وہ کیا عرض ہم کریں
ہوگی ضرور حضرتِ والا کو سب خبر

تو بھائی میرا تو سفر ختم نہیں ہوا۔ آپ کا ہو گیا تو بیٹھو صدارت کرو، وزارت بناؤ، اخبار نکالو، تقریریں کرو، موٹر پر گھومو، مشاعرہ سنو اور واہ کرو۔ ہم تو گھر گھر گلی گلی پکارتے پھر رہے ہیں کہ:

کج کلاہی فقط کام آتی نہیں | کچھ طبیعت میں بھی بانکپن چاہیے
ہم تو جلتے ہیں تم بھی جلو دوستو | شمع کے واسطے انجمن چاہیے
اپنے ٹھنڈے دِلوں کے لیے مانگ کر | ہم سے لے جاؤ جتنی جلن چاہیے

کیونکہ

جلنے کا کام دل کو سکھایا اسی لیے | یہ کام آ گیا تو بڑا کام آ گیا

یہ بڑا کام آنے تک یہ سب بڑے کام کرنے ہیں:

اس کے سوا اوروں کو سن کر خود کو رُسوا مت کرنا
دل کی ہر ایک دھڑکن کہہ دے گی کیا کرنا کیا مت کرنا
مشعلِ جاں روشن کرنے میں شام سویرا مت کرنا
جلنے کا جب وقت آ جائے کوئی بہانہ مت کرنا
خونِ تمنّا سے مت ڈرنا ترکِ تمنّا مت کرنا
گھر میں اندھیرا ہو تو بلا سے شہر اندھیرا مت کرنا

اگر یہ سب کچھ نہیں ہو سکے تو پھر:

مرے طرزِ سخن کی نقل اے محفل نشیں مت کر
کہ یہ دریائے آتش سے گزر جانے کی باتیں ہیں

۞۞

دیباچہ

یہ طرز خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا
جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا

غزل میں کون نئی چاشنی چکھائے گا
اگر کلیمؔ نہ ہوگا مزا نہ آئے گا

کوئی نہ دردِ جہاں کو غزل بنائے گا
یہ بوجھ اُسی پہ پڑا ہے وہی اُٹھائے گا

غموں کے بوجھ سے کانپے گا تھرتھرائے گا
مگر مزاج جو پوچھو گے مسکرائے گا

زمانہ لاکھ اُسے تڑپائے گا رُلائے گا
وہ مرثیہ نہ کہے گا غزل ہی گائے گا

اُسی نے دل کو جلایا ہے روشنی کے لیے
جو دل جلا نہ سکا شمع کیا جلائے گا

غزلیں

۱۹۵۰ء

مرے دل پہ جو گزرنی تھی گزر گئی بلا سے
تجھے کیا ملا ستمگر مرے خونِ مدعا سے

نہیں رنج آشیاں میں کوئی رنج ماسوا سے
یہ چراغِ گل ہوا ہے اُسی باغ کی ہوا سے

کبھی منّتیں وفا کی کبھی دُشمنی وفا سے
مجھے واسطہ رہا ہے تری ایک اِک ادا سے

تجھے دیکھ ہی چکا تھا تری انجمن بھی دیکھی
کوئی آشنا نہیں ہے دلِ درد آشنا سے

وہی شمع جل رہی ہے تری محفلِ طرب میں
جسے روشنی ملی ہے مری آتشِ وفا سے

کسے فصلِ گل کہے ہیں مجھے کچھ خبر نہیں ہے
میں چمن کی وہ کلی ہوں جو نہ کھل سکی صبا سے

تری راہبر ہوس ہے مری رہنما محبت
ترا نقش پا الگ ہے مرے نقش ہائے پا سے

ابھی تو سب کیا ان کا ہمارے نام آتا ہے
اب اس کے بعد دیکھیں کس کے سر الزام آتا ہے

وفا کی رہ گزر سے دُور ہی رہتے تو اچھا تھا
جو اس کوچے سے آتا ہے بہت بدنام آتا ہے

غنیمت ہے کہ ہم نے دوستی کی آبرو رکھ لی
وگرنہ کون دُنیا میں کسی کے کام آتا ہے

خموشی آپ کی اچھی نہیں اے مہرباں سنیے
کچھ اپنی بات کہیے کچھ ہماری داستاں سنیے
بھرم کھل جائے سارا آمدِ فصلِ بہاری کا
اگر ہم سے ہماری سرگزشتِ آشیاں سنیے
ہم ان کے واسطے سب سے بُرائی لے کے بیٹھے ہیں
وہ اُلٹے اور ہمیں سے ہو رہے ہیں بدگماں سنیے

کل جو چپ تھے آج منہ آنے لگے
ناسمجھ بھی ہم کو سمجھانے لگے

عذر کیا کیا مہرباں لانے لگے
جب مجھے زنجیر پہنانے لگے

پہلے ہم تنہا تھے غم کی راہ میں
رفتہ رفتہ ہم سفر آنے لگے

اپنی بربادی کا جب آیا خیال
آپ کے احساں بھی یاد آنے لگے

روئے اب اور کس کے سامنے
دوستوں کو جب ہنسی آنے لگے

ان سے پھر تجدیدِ غم ہونے لگی
پھر پیام آنے لگے جانے لگے

دوستوں نے ہنس کے جب پوچھا مزاج
اشکِ غم بے اختیار آنے لگے

آئینے ہر قدم رہ گئے
دیکھنے والے کم رہ گئے

بھول کر رسم و راہِ جنوں
اُن کی محفل میں ہم رہ گئے

لُٹ گیا کاروانِ بہار
خاک اُڑانے کو ہم رہ گئے

خونِ قلب و جگر میں کہاں
اب تو آنسو بھی کم رہ گئے

ناز سے فرصت تجھے اے فتنہ گر ملتی نہیں پہلے دِل ملتا نہیں تھا اب نظر ملتی نہیں
وہ ہمارے پاس رہ کر بھی کچھ اتنا دُور ہیں ایک دل کو دوسرے دل کی خبر ملتی نہیں
تیرے میخانے کا اے ساقی عجب دستور ہے مئے بھری رکھی ہے شیشوں میں مگر ملتی نہیں

دیکھئے انجامِ اہلِ کارواں ہوتا ہے کیا
راہبر اتنے ہیں لیکن رہ گزر ملتی نہیں

زباں خاموش دل میں جوش وطوفاں لے کے آیا ہوں
بھڑکتی آتشِ غم زیرِ داماں لے کے آیا ہوں

چمن سے لوگ گلہائے تمنّا لے کے آتے ہوں
مگر میں ہوں کہ خالی جیب وداماں لے کے آیا ہوں

ذرا دیکھوں تو کب تک شمع میرا ساتھ دیتی ہے
کہ میں بھی انجمن میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں

بڑے آرام سے اب بے کسی میں نیند آئے گی
وطن سے چادرِ شامِ غریباں لے کے آیا ہوں

تری تیغِ ستم کی داستاں اب اور چمکے گی
جبیں پر سُرخیِ خونِ شہیداں لے کے آیا ہوں

چمن میں اب کہاں دورِ مئے گلفام باقی ہے اب ایسی صبح باقی ہے نہ ایسی شام باقی ہے
وفا کا نام روشن ہو چکا دُشنام باقی ہے ہم اپنا کام کر آئے تمھارا کام باقی ہے
جنوں کی بزم اربابِ جنوں سے ہوگئی خالی ترے دیوانے سے دیوانہ پن کا نام باقی ہے

زمانہ ہوگیا ساقی کا اندازِ نظر بدلے
مگر کچھ سادہ لوحوں کو اُمیدِ جام باقی ہے

کہاں نصیب وہ کیفیتِ دوام ابھی
کہ مئے کشی ہے بقیدِ سبو و جام ابھی

حواس و ہوش کو کہیے مرا سلام ابھی
جنوں کو عقل سے لینا ہے انتقام ابھی

نہ جاسکے گی وہاں تک نگاہِ عام ابھی
مرا مذاق بہت ہے بلند بام ابھی

کچھ اور لیجیے دار و رسن سے کام ابھی
جنوں کا جوش ہے پھیلا ہوا تمام ابھی

خوشی کہاں کہ خوشی کا نہیں مقام ابھی
نہ میری صبح ابھی ہے نہ میری شام ابھی

اسی طرح سے ہے بے ربطیِ کلام ابھی
فغاں بھی آئی ہے لب پر تو ناتمام ابھی

ہے اہلِ ہوش کا کچھ اور ہی پیام ابھی
مگر مجھے تو ہے دیوانہ پن سے کام ابھی

جہاں میں آنے کو آئے تو انقلاب بہت
بدل سکی نہ سحر سے ہماری شام ابھی

اسی کو حاصلِ عمرِ وفا بنانا ہے
جو اِک خلش سی ہے دل میں برائے نام ابھی

یہاں تو دن کو بھی تاریکیاں برستی ہیں
ہماری صبح سے اچھی ہے ان کی شام ابھی

شانۂ دستِ شوق سے زلفِ جنوں سنوار کر
غیرتِ گلشنِ اِرم محفلِ روزگار کر

بیٹھا ہے نااُمید کیوں حوصلہ اختیار کر
خونِ رگِ خزاں نچوڑ پیدا نئی بہار کر

فکر کو وہ شباب دے فن کو وہ آب وتاب دے
نورِ جبینِ شام سے صبح کو شرم سار کر

یہ تو تجھے قدم قدم دے گی فریب رنگ رنگ
عقل زمانہ ساز ہے اس کا نہ اعتبار کر

داد رسی و حق رسی اہلِ جنوں کا فرض ہے
خاروں کو بخش پیرہن جامۂ گل اُتار کر

شوقِ کلام ہے اگر حکمتِ فن سے کام لے
روندی ہوئی جو راہ ہو اس کو نہ اختیار کر

ساقی کی بارگاہ میں تشنہ لبوں کی ہے طلب
ہم بھی اُمیدوار ہیں کہہ دے کوئی پکار کر

اے دل وہ دن قریب ہے رسم ورہ جنوں ہو عام
وقت سے دُور کچھ نہیں وقت کا انتظار کر

یہ جو آئی ہے سوئے میکدہ یہ عجب ہوائے بہار ہے
نہ وہ اودی اودی گھٹائیں ہیں نہ وہ دھیمی دھیمی پھوار ہے

یہ مرا وسیلۂ گفتگو کہ غزل میں جس کا شمار ہے
کسی دردمند کی ہے صدا کسی دل دُکھے کی پکار ہے

یہ قدم قدم پہ جو گرد ہے یہ روش روش جو غبار ہے
یہ خصوصیت جو خزاں کی تھی اب اس کا نام بہار ہے

نہ کروں وفا تو میں کیا کروں کہ وفا تو میرا شعار ہے
وہی پھول مجھ کو پسند ہے جو چمن کی آنکھ میں خار ہے

میرے زخم دل کو نہ چھیڑیئے میرے داغِ دل سے نہ کھیلئے
بڑی آرزو کا چمن ہے یہ بڑی منّتوں کی بہار ہے

یہ کلیم عاجزِؔ مضمحل یہ شکستہ حال و شکستہ دل
جسے خاک اُڑانی ہے مستقل یہ وہی غریبِ دیار ہے

اصولِ مئے کشی بدلا مزاجِ آرزو بدلا
مگر ساقی نہ تیری انجمن بدلی نہ تو بدلا

ہم اپنی بزم میں بھی اجنبی معلوم ہوتے ہیں
گلہ غیروں کا کیا کیجے جب اپنوں کا لہو بدلا

غریبی میں بھی اکثر دیکھنے والوں نے دیکھا ہے
کہ ہم نے جام جم سے بھی نہ مٹّی کا سبو بدلا

ترے میخانے میں ہے ظرف والوں کی کمی ساقی
یہاں دوگھونٹ جس نے پی اسی کا رنگِ رُو بدلا

غزل میں شکوہ سنجی اپنی عادت تو نہ تھی عاجزؔ
مگر ہم نے بہ مجبوری طریقِ گفتگو بدلا

ہم بنے رُسوا تو وہ سامانِ رُسوائی بنے — کچھ تماشا بن کے نکلے کچھ تماشائی بنے
کون میرا غمگسارِ رنجِ تنہائی بنے — شمع وگل تو آپ کی محفل کی رعنائی بنے
ہم ہی اس گلشن میں وجہِ گلشن آرائی بنے — پھول کی خوشبو بنے شاخوں کی انگڑائی بنے
اس چمن میں واقفِ ذوقِ خلش کوئی نہ تھا — ہم ہی پہلے موسمِ گل کے تمنّائی بنے

رفتہ رفتہ بزم سے رخصت ہوئے اہلِ جنوں
اب تری زلفِ سیہ کا کون سودائی بنے

ہم کو تو خیر پہنچنا تھا جہاں تک پہنچے — جو ہمیں روک رہے تھے وہ کہاں تک پہنچے
فصلِ گل تک رہے یا دورِ خزاں تک پہنچے — بات جب نکلی ہے منہ سے تو جہاں تک پہنچے
میرے اشعار میں ہے حُسن معانی کی تلاش — لوگ اب تک نہ میرے دردِ نہاں تک پہنچے
مجھ کو رہنے دو مرے درد کی لذّت میں خموش — یہ وہ افسانہ نہیں ہے جو زباں تک پہنچے
تیری زُلفوں کی گھنی چھاؤں کسے ملتی ہے — کس کی تقدیر رسا ہے کہ وہاں تک پہنچے
منزلِ دار ورسن بھی ہے رُخ وزُلف کے بعد — دیکھئے شوق ہمیں لے کے کہاں تک پہنچے
ترجماں اپنا بنایا ہے مجھے رندوں نے — کاش آواز مری پیرِ مغاں تک پہنچے

آپ کے مشغلۂ شعر وسخن سے عاجزؔ
کام تو کچھ نہ ہوا نام جہاں تک پہنچے

بہار میں بھی حسرتوں کو پالتے ہی رہ گئے — ہم اپنے دل کا حوصلہ نکالتے ہی رہ گئے
جواب بن نہ پڑسکا تیری نگاہ ناز کا — کچھ ایسی چوٹ تھی کہ ہم سنبھالتے ہی رہ گئے
سحر کا کون ذکر ہے کہ اب تو شام ہوچلی — وہ گیسوؤں کا پیچ وخم نکالتے ہی رہ گئے

حریفِ شعلۂ جفا یہی نیازمند تھا
سب اپنا اپنا پیرہن سنبھالتے ہی رہ گئے

کبھی ہم نے ہنستے ہنستے شبِ غم تمام کردی　　کبھی رونے کو جو بیٹھے تو سحر سے شام کردی
مری شاعری نے تجھ کو کیا روشناسِ عالم　　جو نظر مجھے ملی تھی وہی میں نے عام کردی
بھلا اور کیا وہ دیتے صلۂ وفا گزاری　　فقط اِک متاعِ غم تھی جو ہمارے نام کردی
میرے دل نے تو بہت کچھ ترے درد کو چھپایا　　مرے آنسوؤں نے لیکن یہ خبر تمام کردی
تجھے عہد نو سنادوں ترا مختصر فسانہ
کہیں تو نے صبح کردی کہیں تو نے شام کردی

محبت دل میں رکھ کر ضبط کی شرطِ گراں رکھ دی
ستمگر تو نے کس آفت میں جانِ ناتواں رکھ دی
اسی سے تم سمجھ لو لوگ تم کو کیا سمجھتے ہیں
تمھارے سامنے ہم نے تمھاری داستاں رکھ دی
اسیروں کی طرف سے مطمئن صیّاد بیٹھا ہے
نہ جانے کس جگہ قسمت نے تاثیرِ فغاں رکھ دی
سنانے کے لیے قصّہ چمن کی خشک سالی کا
ہمارے آبلوں کے منہ میں کانٹوں نے زباں رکھ دی
زمانہ لاکھ بدلے وضع خودداری نہ بدلیں گے
جہاں اِک بار رکھ دی ہم نے پیشانی وہاں رکھ دی
گلہ ہے کارواں کو اے امیرِ کارواں تجھ سے
کہ تو نے اور بھی اُلجھا کے راہِ کارواں رکھ دی
مری بیتاب آنکھیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں گلشن میں
صبا تو نے کہاں لے جا کے خاکِ آشیاں رکھ دی
وہی انصاف کردیں ہم نے اہلِ ذوق کے آگے
کہانی شمع کی رکھ دی اور اپنی داستاں رکھ دی

سنا ہے خاک بھی ہم ہو کے لاجواب ہوئے
اگر یہ سچ ہے تو اچھا ہوا خراب ہوئے

دو چار دن ہی میں کیا کیا نہ انقلاب ہوئے
وہ تم سے آپ ہوئے آپ سے جناب ہوئے

ہمارا حال نہ پوچھو کہ ہم پہ دُنیا میں
کرم تو کچھ نہ ہوئے ظلم بے حساب ہوئے

ستم ہے وہ ہمیں بے ننگ و نام کہتے ہیں
کہ جن کے واسطے ہم خانماں خراب ہوئے

جنابِ عشق کا دستور ہی نرالا ہے
وہ کامیاب نہ ہوں گے جو کامیاب ہوئے

انھیں چھپا نہ سکا پردۂ کرم اُن کا
وہ اس نقاب میں کچھ اور بے نقاب ہوئے

ہمارا فیض سنورنے ہی پر نہیں موقوف
اُلجھ کے بھی تری زُلفوں کا پیچ و تاب ہوئے

مرغانِ قفس بیٹھے ہیں تولے ہوئے پر آج
گلشن سے کچھ اُڑتی ہوئی آئی ہے خبر آج

قاتل نے بڑی شان سے باندھی ہے کمر آج
ہاں دیکھنا ہے حوصلہ والوں کا جگر آج

دیوانے ہیں ہر سمت اُٹھائے ہوئے سر آج
کچھ رنگِ جنوں اور ہی آتا ہے نظر آج

ٹھہری ہوئی ہے تجھ پر زمانے کی نظر آج
کل مرنے سے اے دل کہیں اچھا ہے کہ مر آج

یہ کیسی بہارِ چمن آئی کہ چمن میں
ویرانہ ہی ویرانہ ہے تاحدِّ نظر آج

بزمِ رسن و دار ہو یا خانۂ زنجیر
جائیں گے اسی سمت طلب ہوگی جدھر آج

افسردگیِ گل ہی نہیں رحم کے قابل
کانٹے بھی ہیں گلشن میں جھکائے ہوئے سر آج

دل ہے مرا یا آپ کا نقشِ کفِ پا ہے
اِک آئینہ رکھا ہے سرِ راہ گزر آج

ہر ظلم ناروا کو روا کرچکے ہیں ہم
ظالم تجھے خبر بھی ہے کیا کرچکے ہیں ہم
دل دے چکے ہیں عہدِ وفا کرچکے ہیں ہم
پہلے ہی اپنے حق میں بُرا کرچکے ہیں ہم
وہ انجمن اب اہلِ ستم کی ہے جلوہ گاہ
روشن جہاں چراغِ وفا کرچکے ہیں ہم
معلوم ہے جو قدرِ وفا اُن کے دل میں ہے
سوبار ان سے عرضِ وفا کرچکے ہیں ہم
دنیائے عشق وادیِ پُرخار ہی سہی
اب تو جنوں کو برہنہ پا کرچکے ہیں ہم
ہاں شوق سے حوالۂ دار و رَسن کرو
اے دوست اب تو جرمِ وفا کرچکے ہیں ہم
کس کس جگہ بیاض وطن سے مٹاؤ گے
ہر ہر ورق پہ مہرِ وفا کرچکے ہیں ہم

جو زُلف آراستہ ہے اب اُسے برہم بھی دیکھا ہے
یہ عالم بھی تیرا دیکھیں گے وہ عالم بھی دیکھا ہے
چمن میں دیکھتے ہیں خندۂ گل کا تماشہ بھی
سحر کے وقت ہم نے گریۂ شبنم بھی دیکھا ہے
جو اس میخانے میں اِک ایک ساغر کو ترستے ہیں
اُنھیں کو بے نیازِ فکرِ بیش و کم بھی دیکھا ہے

بیکسی ہے اور دل ناشاد ہے — اب انھیں دونوں سے گھر آباد ہے
اب اُنھیں کی فکر میں صیّاد ہے — جن کے نغموں سے چمن آباد ہے
جو مجھے برباد کرکے شاد ہے — اس ستمگر کو مبارکباد ہے
تم نے جو چاہا وہی ہوکر رہا — یہ ہماری مختصر روداد ہے
ہم نے تم سے رکھ کے امیدِ کرم — وہ سبق سیکھا کہ اب تک یاد ہے

بے بسی بن کر نہ ٹپکے آنکھ سے
دل میں جو اِک حسرتِ فریاد ہے

وقت کے دَر پر بھی ہے بہت کچھ وقت کے در سے آگے بھی
شام وسحر کے ساتھ بھی چلیئے شام وسحر سے آگے بھی

عقل وخرد کے ہنگاموں میں شوق کا دامن چھوٹ نہ جائے
شوق بشر کو لے جاتا ہے عقل بشر سے آگے بھی

دار و رَسن کی ریشہ دوانی گردن وسرتک رہتی ہے
اہلِ جنوں کا پاؤں رہا ہے گردن وسر سے آگے بھی

میرے گھر کو آگ لگاکر ہمسایوں کو ہنسنے دو
شعلے بڑھ کر جاپہنچیں گے میرے گھر سے آگے بھی

عشق نے راہِ وفا سمجھائی ، سمجھانے کے بعد کہا
وقت پڑا تو جانا ہوگا راہ گزر سے آگے بھی

شاعر فکر ونظر کا مالک دل کا سلطاں گھر کا فقیر
دُنیا کا پامال قدم بھی دُنیا بھر سے آگے بھی

آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں اس سے دھوکا کھائیں کیا
دل تو عاجؔز دیکھ رہا ہے حدِّ نظر سے آگے بھی

چھیڑو نہ ہم کو تنگ ہیں دردِ جگر سے ہم
کردیں گے شام رونے جو بیٹھے سحر سے ہم

دُشوارئ حیات سے ممکن نہیں گریز
سر ہے تو سر چھپائیں کہاں دردِ سر سے ہم

تم کو جو بے وفا نہ کہیں اور کیا کہیں
سنتے تو آرہے ہیں یہی عمر بھر سے ہم

اب درد روزگار ہمیں مارے یا کھپائے
درماں طلب نہ ہوں گے کبھی چارہ گر سے ہم

لب سی دیئے ہیں مصلحتِ وقت نے تو کیا
لیتے رہیں گے کام زباں کا نظر سے ہم

دار و رسن تو کوئی نیا مرحلہ نہیں
گزرے ہر ایک دور میں اس رہ گزر سے ہم

نکلا نہ ہوگا یوں کسی محفل سے غیر بھی
اس طرح سے نکالے گئے اپنے گھر سے ہم

مری صبحِ غم بلا سے کبھی شام تک نہ پہنچے
مجھے ڈر یہ ہے بُرائی ترے نام تک نہ پہنچے

مرے پاس کیا وہ آتے مرا درد کیا مٹاتے
مرا حال دیکھنے کو لبِ بام تک نہ پہنچے

ہو کسی کا مجھ پہ احساں یہ نہیں پسند مجھ کو
تری صبح کی تجلّی مری شام تک نہ پہنچے

تری بے رُخی پہ ظالم مرا جی یہ چاہتا ہے
کہ وفا کا میرے لب پر کبھی نام تک نہ پہنچے

میں فغانِ بے اثر کا کبھی معترف نہیں ہوں
وہ صدا ہی کیا جو اُن کے در و بام تک نہ پہنچے

وہ صنم بگڑ کے مجھ سے مرا کیا بگاڑ لے گا
کبھی راز کھول دوں میں تو سلام تک نہ پہنچے

مجھے لذّتِ اسیری کا سبق پڑھا رہے ہیں
جو نکل کے آشیاں سے کبھی دام تک نہ پہنچے

اُنھیں مہرباں سمجھ لیں مجھے کیا غرض پڑی ہے
وہ کرم کا ہاتھ ہی کیا جو عوام تک نہ پہنچے

ہوئے فیض میکدہ سے سبھی فیضیاب لیکن
جو غریب تشنہ لب تھے وہی جام تک نہ پہنچے

جسے میں نے جگمگایا اسی انجمن میں ساقی
مرا ذکر تک نہ آئے مرا نام تک نہ پہنچے

تمھیں یاد ہی نہ آؤں یہ ہے اور بات ورنہ
میں نہیں ہوں دور اتنا کہ سلام تک نہ پہنچے

وہ تشنہ کام ہی جائے جو تشنہ کام آئے
نہ جانے کب تری محفل میں دورِ جام آئے

دُعا یہ ہے کوئی ساقی خوش انتظام آئے
شراب آئے جنوں کی خرد کا جام آئے

خدا کرے کبھی دامن نہ چاک ہو اپنا
ملے وہ عقل جو دیوانگی میں کام آئے

پہنچ کے منزلِ دار و رسن پہ دَم لے لوں
نہ جانے راہ میں کیا کیا ابھی مقام آئے

پکار جب ہوئی ہے کوئی تشنہ کام آئے
شمار کر نہ سکا کوئی اتنے نام آئے

ہم آ گئے جو کبھی بزمِ ہوشیاراں میں
ہوا یہ شور کہ دیوانوں کے امام آئے

ہم ان خموش وطن دوستوں میں ہیں عاجزؔ
نہ جن کا ذکر کہیں ہو نہ جن کا نام آئے

اُمید کیا تھی وہ کیا احتمال کر بیٹھے
جو دوست تھے انھیں دُشمن خیال کر بیٹھے

یہی خطا ہے کہ ہم عرضِ حال کر بیٹھے
ذرا سی بات کا کتنا ملال کر بیٹھے

بنے ہوئے تھے لڑکپن میں کس قدر معصوم
شباب آتے ہی کیا کیا کمال کر بیٹھے

اس انجمن میں وہ اب بے تکلفی نہ رہی
یہاں جو بیٹھے وہ دامن سنبھال کر بیٹھے

بس ایک مسئلہ دار و رسن کا باقی تھا
یہ کام بھی تیرے آشفتہ حال کر بیٹھے

خوشی کیا چیز ہوتی ہے کسی دن غم سے پوچھیں گے
مزا مرہم کا اپنے زخم بے مرہم سے پوچھیں گے

کہاں اب جا بسے وہ شانے والے آئینے والے
پتہ ان کا کسی کے گیسوئے برہم سے پوچھیں گے

ہمارے غم سے تو واقف چمن کا پتہ پتہ ہے
اُسے کیا غم ہے وہ روتی ہے کیوں شبنم سے پوچھیں گے

جو داستانِ وفا ناتمام لے کے گئے　　وہ سرفروش حیاتِ دوام لے کے گئے
بچا کے لے گئے تکلیفِ خار سے دامن　　جو دور ہی سے گلوں کا سلام لے کے گئے
جو میکدہ سے بظاہر چلے گئے محروم　　وہی تو کیفِ مئے لالہ فام لے کے گئے
جہاں میں قدر شناسِ وفا کی کوئی نہ ملا
ہم اپنا دردِ محبت تمام لے کے گئے

محکوم حسن گردشِ ایّام ہوگئی　　گیسو کسی نے کھول دیئے شام ہوگئی
بخشی کلی کلی کو نگاہ بہار نے　　وہ زندگی جو موت کا پیغام ہوگئی
جاگے بھی لوگ دُورِ صبوحی بھی چل گیا　　اب نیند اپنی ٹوٹی ہے جب شام ہوگئی
دو چار پھول کھل کے گلستاں میں رہ گئے　　اب کے برس بہار بھی ناکام ہوگئی
اندھیر کر دیا ہے ہوس نے زمانے میں
روشن کرو چراغ کہ اب شام ہوگئی

جو حال ہے اس بزم کا ایسا نہ کہیں ہے　　آئینہ کہیں زُلف کہیں شانہ کہیں ہے
اب رقصِ محبت کا تماشا نہ کہیں ہے　　پروانہ کہیں ہے پرِ پروانہ کہیں ہے
پھیلا چلا جائے ہے بہت عقل کا دامن　　پوچھو تو جنوں سے کوئی دیوانہ کہیں ہے؟
دل کا کچھ الگ رنگ ہے چہرے کا الگ رنگ　　افسانہ کہیں سُرخیٔ افسانہ کہیں ہے
بھرتے ہیں کلیمؔ اپنا لہو اپنی غزل میں
مئے ایسی کہیں ہے نہ یہ پیمانہ کہیں ہے

جدید غزلیں

۱۹۷۲ء تا ۱۹۸۹ء

ستم کتنا ہی رُخ بدلے وفا کی خو نہ بدلیں گے
وہ ترکش اپنا خالی کردیں ہم پہلو نہ بدلیں گے

مزاج باغبانی باغباں کا گر نہ بدلے گا
چمن والے بھی اپنا رنگ اپنی بو نہ بدلیں گے

جنوں والوں کی شوریدہ مزاجی بھی نہ بدلے گی
وہ جب تک طرز و انداز خم گیسو نہ بدلیں گے

غموں کی ترجمانی ہو رہی ہے ہوتی جائے گی
یہ زخمِ دل نہیں ہیں پھول ہیں خوشبو نہ بدلیں گے

ترا بخشا ہوا سرمایۂ غم اتنا پیارا ہے
کہ جامِ جم سے بھی ہم ایک بوند آنسو نہ بدلیں گے

انھیں کے گیت زمانے میں گائے جائیں گے
جو چوٹ کھائیں گے اور مسکرائے جائیں گے

ہمیشہ دُھوپ میں جائے گا کاروانِ جنوں
جو ہوشیار ہیں وہ سائے سائے جائیں گے

کہیں بھی اہلِ وفا چین پا نہیں سکتے
جہاں چراغ رہیں گے جلائے جائیں گے

نکالا جائے گا رندوں کو میکدہ سے بھی
یہاں بھی شیخ و برہمن بلائے جائیں گے

دیارِ دار و رسن ہو کہ کوچۂ قاتل
جہاں بھی درد ترا لے کے جائے جائیں گے

وہ توڑے جائیں ستم سے دِلوں کے آئینے
ہم اُن سے آئینہ خانہ بنائے جائیں گے

بدلتے جائیں گے زخموں کو استعاروں میں
غزل کہیں گے اور ان کو سنائے جائیں گے

قلم کی نوک پر اب تولی جائے گی شمشیر
ہم آزمائیں گے وہ وہ آزمائے جائیں گے

یہی اصول چلا آرہا ہے محفل کا
جو آج بیٹھے ہیں کل وہ اٹھائے جائیں گے

وہ تم سے آپ بنے آپ سے جناب بنے
نہ جانے اور ابھی کیا کیا بنائے جائیں گے

جو حادثے مجھے شاعر بنا گئے عاجزؔ
وہ یاد آئیں گے جتنا بھلائے جائیں گے

غزل کا ہے نہ گائیں گے زباں کیوں بند کرلیں گے
ابھی تو جی رہے ہیں موت آئے گی تو مرلیں گے

چمن میں ہم بھی جینے کا کوئی سامان کرلیں گے
وہ پھولوں سے بھریں گے جیب ہم کانٹوں سے بھرلیں گے

ابھی رہنے دو اُن کے سامنے غزلوں کا مجموعہ
اُٹھالیں گے اس آئینے کو ہم جب وہ سنور لیں گے

بہت اونچا ہمارے عشق کا معیار ہے لیکن
وہ اوپر اُٹھ سکے تو ہم بھی کچھ نیچے اُتر لیں گے

جو اپنے حال سے بھی بے خبر معلوم ہوتے ہیں
یہی دیوانے اِک دن ہوش والوں کی خبر لیں گے

بہت رات آچکی محفل ابھی تک سونی سونی ہے
وہ کہتے تھے کہ ہم تو شام ہوتے ہیں سنور لیں گے

یہی بشاش ہونا ہے یہی رنجور ہوجانا
کسی محبوب کا نزدیک ہونا دور ہوجانا

وہی ہم پر ہوا جو میرؔ صاحب پر ہوا ہوگا
اچانک چوٹ لگنا دل کا چکنا چور ہوجانا

اب آخر کار اس کا تجربہ بھی ہوگیا ہم کو
سنا کرتے تھے دل کے زخم کا ناسور ہوجانا

یہ سب بس ایک کافر کی اداؤں کا کرشمہ ہے
غزل گو میرا بن جانا مرا مشہور ہوجانا

وہ محفل وہ چمن وہ پھول وہ شبنم نہیں پیارے
جو سچ پوچھو غزل کہنے کا یہ موسم نہیں پیارے

کسی گلشن میں یہ چھڑکاؤ کا عالم نہیں پیارے
تمام آنسو ہی آنسو ہیں کہیں شبنم نہیں پیارے

کرشموں سے تمھارے بے خبر بھی ہم نہیں پیارے
حرم سے دور جو بیٹھے ہیں نا محرم نہیں پیارے

تری محفل میں کس کی آنکھ ہے جو نم نہیں پیارے
غزل گوئی ہماری میرؔ سے کچھ کم نہیں پیارے

ادھر آ ہم دِکھاتے ہیں غزل کا آئینہ تجھ کو
یہ کس نے کہہ دیا گیسو ترے برہم نہیں پیارے

قیامت میں بھی ہوگا ایک ہی کے حسن کا جلوا
قیامت سے ترا عہدِ جوانی کم نہیں پیارے

چمن سے دونوں کا رشتہ ہے لیکن فرق کتنا ہے
خزاں میں تم نہیں تھے فصلِ گل میں ہم نہیں پیارے

چھپایا ہے جسے ہم نے غزل خوانی کے پردے میں
بہت ڈھونڈھا کہیں اس زخم کا مرہم نہیں پیارے

خوشی کی بزم بھی اندوہگیں لگے ہے میاں
لگے ہے دل تو کہیں دل نہیں لگے ہے میاں

ہر ایک رنگ بدلتا ہے آسماں کی طرح
یہ سرزمیں تو عجب سرزمیں لگے ہے میاں

یہ تیری بزم ہے آرام دل یہیں ہے مگر
جگر کو چوٹ بھی اکثر یہیں لگے ہے میاں

گیا جو چپکے سے خنجر چبھو کے پہلو میں
ادھر تو آ، تو وہی ہم نشیں لگے ہے میاں

یہ تیرا شہر ہے یا قاتلوں کی بستی ہے
لہو میں سُرخ ہر اِک آستیں لگے ہے میاں

نہ جانے دل ترا بے درد اِس قدر کیوں ہے
تو دیکھنے میں تو اتنا حسیں لگے ہے میاں

لہو لگے ہے خدائی کا دل بنانے میں
دِلوں کو توڑنے میں کچھ نہیں لگے ہے میاں

قریب رہ کے بھی دوری دِلوں میں اتنی ہے
کہ میں لگوں ہوں کہیں تو کہیں لگے ہے میاں

فریب گیسوئے رخسار سے بچے رہیو
حسین وہ نہیں ہے جو حسیں لگے ہے میاں

کلیمؔ یوں تو لگے ہے تو باؤلا جیسا
ترا کلام مگر دلنشیں لگے ہے میاں

نہ ہوں کیوں شعر اپنے ہلکے پھلکے غزل کہتے ہیں ہم جھرمٹ میں گل کے
ہوئے ہم ایسے پانی جن سے گھل کے وہ سب زخمِ جگر ہیں عہدِ گل کے
جو شائستہ نہ تھے اِک برگِ گل کے وہ مالک ہیں چمن میں جزو کل کے
بڑے چرچے ہیں اس بازارِ گل کے جہاں کانٹے بکیں پھولوں میں تل کے
کہی جاتی نہ ہو جو بات کھل کے اُسے پردوں میں کہیے شمع و گل کے
چمن کا حسن لوٹا جس نے کھل کے وہی سائے میں ہے اب شاخ گل کے
چمن آئینۂ بادِ بہاری چمن کا آئینہ چہرے ہیں گل کے
غزل میں چاہیے وہ بات عاجزؔ
جو پنہاں ایک تبسّم میں ہے گل کے

توڑا پھوڑا ہے دل دیکھے دُنیا عشق کا حاصل دیکھے
کیا تھے ہم اور ہوگئے کیا ہم دیکھے ساری محفل دیکھے
کون یہاں ہے زخم سے خالی بسمل کو کیا بسمل دیکھے
صورت پر سب دیوانے ہیں کون اس کافر کا دِل دیکھے
تجھ سا کوئی جلاّد نہ دیکھا کیسے کیسے قاتل دیکھے
دُنیا کا دستور عجب ہے شمع جلے اور محفل دیکھے
تجھ کو کوئی تجھ سا مل جائے قاتل تڑپے قاتل دیکھے
میری طرح اِک دن کوئی جی کر جینا ہے کیا مشکل دیکھے
جس کو بہت ہو عقل کا دعویٰ ہم دیوانوں سے مل دیکھے
راہِ وفا پر چلنے والا راہ نہ دیکھے منزل دیکھے
اپنے کرشمے تم مت دیکھو
دیکھ رہی ہے محفل دیکھے

زُلفیں سنورانے کا جہاں کام آ گیا بے ساختہ لبوں پہ مرا نام آ گیا
راہِ وفا میں لطف ہر اِک گام آ گیا تہمت کبھی لگی کبھی الزام آ گیا
زخموں سے جوئے خون کی روانی تھمی نہ تھی ان کی نظر کا پھر کوئی پیغام آ گیا
یوں خونِ دل میں ڈوب کے نکلی صدائے دل جیسے کوئی چھلکتا ہوا جام آ گیا
یہ بھی تو اِک ربط و تعلق کی بات ہے میں جب تڑپ اُٹھا انھیں آرام آ گیا
جلنے کا کام دِل کو سکھایا اسی لیے یہ کام آ گیا تو بڑا کام آ گیا

کل چھیڑ دی کلیمؔ نے اس درد سے غزل
بے اختیار وہ بھی لبِ بام آ گیا

تلخیاں اس میں بہت کچھ ہیں مزا کچھ بھی نہیں زندگی دردِ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
شمع خاموش بھی رہتے ہوئے خاموش کہاں اس طرح کہہ دیا سب کچھ کہ کہا کچھ بھی نہیں
ہم گدایانِ محبت کا یہی سب کچھ ہے گرچہ دنیا یہی کہتی ہے وفا کچھ بھی نہیں
یہ نیا طرزِ کرم ہے ترا اے فصلِ بہار لے لیا پاس میں جو کچھ تھا دیا کچھ بھی نہیں
ہم کو معلوم نہ تھا پہلے یہ آئین جہاں اس کو دیتے ہیں سزا جس کی خطا کچھ بھی نہیں

وہی آہیں وہی آنسو کے دو قطرے عاجزؔ
کیا تری شاعری میں ان کے سوا کچھ بھی نہیں

دُلہن کی مانگ میں موتی سجا کر دائیاں نکلیں سنہری دُھوپ گھر میں آ گئی پرچھائیاں نکلیں
اُٹھی پلکوں کی نازک انگلیوں پر نیند کی چلمن نگاہیں آنکھوں سے لیتی ہوئی انگڑائیاں نکلیں
بگولے اپنے سر پر خاک اُڑا کر ہو گئے رخصت تھرکتی گنگناتی ، جھومتی پروائیاں نکلیں

براتِ عاشقاں سجنے لگی پھر شاخِ آہو پر
لبوں پر وقت کے بجتی ہوئی شہنائیاں نکلیں

وقت نے ہم کو تھکایا تو ہر اِک منزل میں　　بیٹھنے ہی نہ دیا درد نے اُٹھ کر دل میں
ہم ساجی دار نہیں کوئی تیرے بسمل میں　　جان دے دی ہے مگر درد لیے ہیں دل میں
ہمیں جلتے بھی ہیں خاموش پگھلتے بھی ہیں　　ہمیں پروانہ ہمیں شمع ہیں اس محفل میں
آئینہ کا ہے کو وہ دیکھے کہ اب تو سُرخی　　رُخِ قاتل سے زیادہ ہے کفِ قاتل میں
جب پکارا گیا ہے کوئی جواں مردِ وفا؟　　ہم اکیلے ہی نظر آئے بھری محفل میں
ہائے بیچارگیِ اہلِ وفا کیا کہیے　　دُشمنِ دل ہے وہ بے درد مگر ہے دل میں
نہ تو چھوڑے ہی بنے ہے نہ سنوارے عاجؔز
اُن کی زُلفوں نے ہمیں ڈال دیا مشکل میں

اس کی فکر نہ کیجیو عاجؔز کون یہاں کیا بولے ہے
کرنے والا کام کرے ہے بولنے والا بولے ہے
بنسی تو اِک لکڑی ٹھہری لکڑی بھی بھلا کیا بولے ہے
بنسی کے پردے میں پیارے کرشن کنہیا بولے ہے
گھر کی باتیں گھر کے باہر بھیدی گھر کا بولے ہے
دِل تو ہے خاموش بچارا لیکن چہرا بولے ہے
وقت آئے تو اہلِ چمن بھی اہلِ زباں بن جاتے ہیں
ڈالی ڈالی جو بیتی ہے پتّا پتّا بولے ہے
اب تک شعر و غزل میں ان کی گونج رہی ہیں آوازیں
صحرا سے مجنوں بولے ہے شہر سے لیلا بولے ہے
ہم نے سسک کر دم توڑا ہے جس قاتل کے پاؤں تلے
آج اُسی کے سر پر چڑھ کر خون ہمارا بولے ہے

فکر آئینہ دِکھائے فن کرے شانے کی بات
گرم ہے پھر اُن کی زلفوں کے بکھر جانے کی بات
فصلِ گل میں بھی نہیں چلتی ہے میخانے کی بات
یہ تو اے پیرِ مغاں ہے ڈوب مرجانے کی بات
آنسوؤں کا کچھ نمک ہے کچھ ہنسی کی چاشنی
اس لیے اچھی لگے ہے سب کو دیوانے کی بات
کودنے والا پرائی آگ میں کوئی نہیں
شمع تک پروانہ ہی لے جائے پروانے کی بات
شیخ خود ہی اب خدا ہیں برہمن خود دیوتا
کیا حرم کی بات کہیے کیا صنم خانے کی بات
آج اُڑاتے ہیں ہنسی لیکن وہ دن نزدیک ہے
پیرہن والوں کو یاد آئے گی دیوانے کی بات
میکدہ کے درد سے خالی ہیں اہلِ میکدہ
سب یہاں کرتے ہیں اپنے اپنے پیمانے کی بات
شاعری سینہ خراشی کا عمل ہے اے کلیمؔ
لوگ اسے سمجھے ہوئے ہیں دل کے بہلانے کی بات

ایسا ہو تو پھر کیسے کسی دل کی لگی جائے خاموش رہا جائے نہ کچھ بات کہی جائے
کون اپنی غزل گاتا ہوا ان کی گلی جائے مری طرح جو سر سے کفن باندھے وہی جائے
سینے کی جلن جائے نہ آنکھوں کی نمی جائے یہ فصلِ بہاراں ہے تو گلشن سے چلی جائے
بلبل تجھے رونا ہے تو یوں رو کہ چمن میں
کلیوں کی چٹک جائے نہ پھولوں کی ہنسی جائے

جو کچھ اور چاہو مری جاں کہو
مگر مجھ کو اپنا غزل خواں کہو

بھلا اور کس کے لیے میں ہوا
بہار آتے ہی چاک داماں کہو

لہو کس کا ہے جس کے چھڑکاؤ سے
شگفتہ ہے صحن گلستاں کہوں

مرا زخم ہے کس کے گھر کا چراغ
مرا درد ہے کس کا درماں کہوں

جگر کتنے شانوں کا خوں کر چکی
تمھاری یہ زُلفِ پریشاں کہو

یہ ہر سال کس کس کا گھر پھونک کر
مناتے ہو جشنِ چراغاں کہو

قیامت بلانے کو تم پھر کہاں
چلے ہو خراماں خراماں کہو

اگر چہ مری جاں کے دُشمن ہو تم
کہو اور کسے جانِ جاناں کہو

چھری کھینچو ہو خنجر تانتے ہو
تمھارے دوست ہیں! پہچانتے ہو

ہمیں تم بے وفا گردانتے ہو
نہ جانے کس کا کہنا مانتے ہو

نمونہ بن چکے ہم ، جانتے ہو
ہمیں اب کیا پھٹکتے چھانتے ہو

محبت میں ملے ہیں زخم کیا کیا
یہ ہم جانے ہیں تم کیا جانتے ہو

وفا اِک چیز شہرِ حسن میں تھی
تم اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟

غزل میری تمھاری آبرو ہے
بھلائی کا بُرا کیوں مانتے ہو

ابھی تک گیسوؤں کا ہے وہی حال
سنا تھا تم سنورنا جانتے ہو

بہت ہو سُرخیِ دامن پہ نازاں
یہ کس کا ہے لہو پہچانتے ہو؟

کلیؔم اس رونے دھونے کا جہاں میں
کوئی حاصل نہیں ہے جانتے ہو

دنیا ڈوب چلی تو ڈوبے دورِ مئے گلفام چلے
ساقی ! ہاں پیمانہ چھلکے جام چلے ہاں جام چلے

عشق کا ہم ارباب ہوس کو پہنچانے پیغام چلے
لینے کو رُسوائی نکلے کھانے کو دُشنام چلے

پیرِ مغاں کی بے مہری پر پھینک کے ہم بھی جام چلے
ساغر کی محتاجی کیسی چلّو سے جب کام چلے

مئے پہنچے تو سب تک پہنچے دور چلے تو عام چلے
چل ساقی وہ چال کہ جس سے میخانے کا نام چلے

تم چاہو شمشیر چلاؤ یا چاہو تو جام چلے
ہم تو پیارے درِ محبت کا دے کر پیغام چلے

دل کہتا ہے فصلِ جنوں کے آنے میں کچھ دیر نہیں
اب یہ ہوا چلنے ہی کو ہے صبح چلے یا شام چلے

گردن و سر کی بات نہ نکلے دار و رسن کا ذکر سہی
کام جنوں کا چلتا جائے چاہے جس کا نام چلے

کس مشکل سے چل کر عاجزؔ اس منزل تک پہنچے ہیں
عقل کا دامن چھوٹ چلا تو عشق کا دامن تھا چلے

میں روؤں ہوں رونا مجھے بھائے ہے
کسی کا بھلا اس میں کیا جائے ہے

دل آئے ہے پھر دل میں درد آئے ہے
یوں ہی بات میں بات بڑھ جائے ہے

کوئی دیر سے ہاتھ پھیلائے ہے
وہ نامہرباں آئے ہے جائے ہے

محبت میں دل جائے گر جائے ہے
جو کھوئے نہیں ہے وہ کیا پائے ہے

جنوں سب اشارے میں کہہ جائے ہے
مگر عقل کو کب سمجھ آئے ہے

پکاروں ہوں لیکن نہ باز آئے ہے
یہ دُنیا کہاں ڈوبنے جائے ہے

خموشی میں ہر بات بن جائے ہے
جو بولے ہے دیوانہ کہلائے ہے

قیامت جہاں آئے گی آئے گی
یہاں صبح آئے ہے شام آئے ہے

جنوں ختم دار و رسن پر نہیں
یہ رستہ بہت دور تک جائے ہے

اُنھیں زُلفوں کا افسانہ کہیں گے — بلا سے لوگ دیوانہ کہیں گے
ہر اِک شعر اپنا اِک آئینہ ہوگا — غزل کو آئینہ خانہ کہیں گے
جو ہم کہتے ہیں ساقی کل وہ سننا — سبو و جام و پیمانہ کہیں گے
صدا ہوگی فقیروں سی ہماری — مگر ہم بات شاہانہ کہیں گے
ہنسیں گے تم پہ تم ہو میرِ محفل — ہمیں کیا شمع و پروانہ کہیں گے؟
ہمیں میخانے کی چشم و زباں ہیں — ہمیں رودادِ میخانہ کہیں گے
ستم روز اِک نیا ہونے دو، ہم بھی — نیا مضمون روزانہ کہیں گے

کہانی سب کی جب کہہ لیں گے عاجزؔ
تو کچھ اپنا بھی افسانہ کہیں گے

یہ غزل جو مطربِ خوش نوا تو سنا رہا ہے ستار پر
مرا دھیان سن کے چلا گیا کسی دل دُکھے کی پکار پر
مجھے جب یہ حکم دیا گیا کہ گزر کروں خس و خار پر
تو زمانہ اس کا گواہ ہے کہ چمن تھا اپنی بہار پر
کوئی عہد ہو کوئی دَور ہو سر اُٹھیں گے مری پکار پر
کہ غزل کی دل کشی منحصر نہ خزاں پہ ہے نہ بہار پر
تجھے سیر کی ہے ہوس تو آ کہ یہی تو سیر کا وقت ہے
مرا درد بھی ہے شباب پر مرا زخم بھی ہے نکھار پر
کوئی میری نقل نہ کر سکا کوئی پیار پر نہ یوں مر سکا
جسے شاعری کا ہو حوصلہ وہ غزل کہے مرے پیار پر

بہاروں میں نکلوایا گیا ہوں　　خزاں آئی تو بلوایا گیا ہوں
ہوئیں اکثر پریشاں اُن کی زُلفیں　　میں اکثر یاد فرمایا گیا ہوں
یہ محفل اپنی ہی محفل ہے لیکن　　مسافر کی طرح آیا گیا ہوں
اب آیا ساغر و مینا اب آیا　　یہی کہہ کہہ کے بہلایا گیا ہوں
کمی آئی نہیں دیوانہ پن میں　　بہت زنجیر پہنایا گیا ہوں
مرا دِل پھول ہے میری غزل پھول　　مگر کانٹوں میں تُلوایا گیا ہوں
لگایا یا داؤں پر بازیگروں نے
کبھی کھویا کبھی پایا گیا ہوں

ستم ہیں آب وگل پر آب وگل کے　　چمن لوٹا چمن والوں نے مل کے
کلیجہ رہ گیا پھولوں کا ہِل کے　　نہ جانے کیا کہا غنچے نے کِھل کے
جگر خستہ ہیں خود ہی پھول کِھل کے　　یہ کیا مرہم بنیں گے زخمِ دل کے
زباں کے موم ہیں پتھر ہیں دل کے　　بڑا صدمہ ہوا یاروں سے مل کے
لباس فن بنا لیتے ہیں مل کے　　میرے چاکِ قبا سے چاک دل کے
طبیعت پھول ہو جائے گی کِھل کے　　ذرا دیکھو تو دیوانوں سے مل کے
سنانے سننے جو بیٹھے ہیں مل کے　　یہ سب مارے ہوئے ہیں دردِ دل کے
ہم اے عاجزؔ غزل کہتے نہیں ہیں
پھپھولے پھوڑتے رہتے ہیں دل کے

چوٹ لگتی رہی اشک بہتے رہے　　میٹھے میٹھے ہم اشعار کہتے رہے
اپنی کچھ بات اپنی غزل میں نہیں　　کہلواتے رہے تم سو کہتے رہے
لوگ ان کے ستم سُن کے حیران ہیں　　کیا کلیجہ تھا اُن کا جو سہتے رہے
دل بہت لُوٹا توڑا جلایا گیا　　اس مکاں میں جو رہتے تھے رہتے رہے
ہم ہمیشہ چلے سوئے دار ورسن
لوگ رستہ بدلنے کو کہتے رہے

یہ یہاں والے ہیں صرف اور نہ وہاں والے ہیں
در دِ دل والے جو ہیں دونوں جہاں والے ہیں
کھیلنا کھیل محبت کا کوئی کھیل نہیں
دل و جاں ہارنے والے دل و جاں والے ہیں
وہ کریں یاد اسے جس کو نہ کوئی یاد کرے
یعنی بے نام و نشاں نام ونشاں والے ہیں
شمع ہی پر نہیں محفل کی کہانی موقوف
ہم سے بھی پوچھو میاں ہم بھی زباں والے ہیں
کوئی پوچھے تو ذرا دیر و حرم والوں سے
جو کہیں والے نہیں ہیں وہ کہاں والے ہیں
شعر کہنا ہے تو خاموش تڑپنا سیکھو
وہ غزل والے ہیں جو دردِ نہاں والے ہیں

بچھڑ کر پھر جو میخانے گئے ہم — بڑی مشکل سے پہچانے گئے ہم
لگا کر لائے کوئی زخم تازہ — جہاں اس دل کو بہلانے گئے ہم
پریشاں حال ہوکر خود ہی آئے — جب ان زُلفوں کو سلجھانے گئے ہم
منا کر لائے تھے دل کو جہاں سے — وہیں تنگ آ کے پہنچائے گئے ہم
تو خود تھی خانہ برباد اے محبت — ترے گھر کیوں خدا خانے گئے ہم
تو اے دل آ گیا تیرا گیا کیا — ترے چلتے اے دیوانے گئے ہم

نہ آیا ہوش عاجزؔ کو نہ آیا
کئی بار اس کو سمجھانے گئے ہم

چلچلاتی دُھوپ میں بھی دل جلے چلتے رہے — راہ تھی دُشوار لیکن قافلے چلتے رہے
بڑھ چلا اتنی ہی تیزی سے محبت کا گناہ — جتنی تیزی سے سزا کے فیصلے چلتے رہے
دشت میں اہلِ جنوں کا جمگھٹا بڑھتا رہا — شہر میں دار و رسن کے سلسلے چلتے رہے
نااُمیدی روکنے کو بارہا آتی رہی — جھومتے لہراتے لیکن من چلے چلتے رہے
جستجوئے گل میں ہم بڑھتے رہے دیوانہ وار — کانٹے چپکے چپکے قدموں کے تلے چلتے رہے
قتل کرنے کی مشقت سے بھی قاتل بچ گئے — پاؤں پھیلائے رہیں چھریاں گلے چلتے رہے

اس سفر میں بھی نہ چھوٹی نقش آرائی کلیمؔ
حج میں بھی شعروسخن کے مشغلے چلتے رہے

شدید درد ہے لیکن چھپاتے پھرتے ہیں — میاں کلیمؔ غزل گنگناتے پھرتے ہیں
خزاں پہ ڈال رہے ہیں بہار کا پردا — جگر میں زخم لیے مسکراتے پھرتے ہیں
بڑا جنون تھا حضرت کو دل لگانے کا — لگی ہے چوٹ تو کیا تلملاتے پھرتے ہیں

ذرا سا خون دل ان کے سخن کی پونجی ہے ذرا سے رنگ پہ کیا رنگ لاتے پھرتے ہیں
ہمیشہ چھیڑتے پھرتے ہیں راگنی بے وقت ہمیشہ بے سُری ڈفلی بجاتے پھرتے ہیں
بچھاتے پھرتے ہیں اوروں کے راستے میں پھول اور اپنے واسطے پتھر اٹھاتے پھرتے ہیں
بہت کہا کہ محبت کا کھیل مت کھیلو
مگر یہ جان کی بازی لگاتے پھرتے ہیں

اب دیکھئے کون آگے نکلتا ہے اثر میں جادو میری آواز میں ہے اُن کی نظر میں
زخموں نے وہ گلزار کھلایا ہے جگر میں جچتی نہیں اب کوئی بہار اپنی نظر میں
گھر ان کو دِیا آگ لگادی میرے گھر میں دو کام زمانے نے کیے ایک نظر میں
جس دن سے زمانے کو نظر ہم نے عطا کی اس دن سے کھٹکتے ہیں زمانے کی نظر میں
آواز بھی اب دینے پہ دیتے نہیں آواز کیا بے خبری پھیل گئی اہلِ خبر میں
جی خوش ہے تو ہے شام بھی آباد سحر بھی
جی خوش نہیں تو شام میں کچھ ہے نہ سحر میں

گلوں سے راہ رکھیو رسم رکھیو رابطہ رکھیو مگر اِن بے وفاؤں سے نہ اُمیدِ وفا رکھیو
کچھ اندازِ خرد رکھیو جنوں کی کچھ ادا رکھیو نظر ہوشیار رکھیو دل کو دیوانہ بنا رکھیو
نہ جانے کون کیسی پیتا ہے اور کتنی پیتا ہے تم اپنی مئے الگ اور اپنا پیمانہ جدا رکھیو
اُسے لُوٹیں گے سب لیکن اِسے کوئی نہ لوٹے گا نہ رکھیو جیب میں کچھ دِل میں لیکن حوصلا رکھیو
محبت زخم کھاتے رہنے ہی کا نام ہے پیارے لگائے تیر جو دل پر اُسی سے دِل لگا رکھیو
نہ جانے کون کتنی پیاس میں کس وقت آ جائے ہمیشہ اپنے میخانے کا دروازہ کھلا رکھیو
یہی شاعر کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے پیارے شکستہ ساز رکھیو درد میں ڈوبی صدا رکھیو
اندھیرے اور ہوں گے روشنی لوگ اور مانگیں گے
چراغِ فکر و فن جتنے جلا سکیو جلا رکھیو

یاد بھی ہوں گے نہ ہم شیشے کو پیمانے کو
اِک زمانہ ہوا چھوڑے ہوئے میخانے کو

اب تو آتا ہی نہیں ہے کوئی سمجھانے کو
پہلے دیوانہ کیے دیتے تھے دیوانے کو

جی نہ چاہے تھا جدا ہو کے کہیں جانے کو
ہم نے معشوق بنا رکھا تھا میخانے کو

شہر میں رہنے نہ دے ہے کوئی دیوانے کو
سب لیے جاتے ہیں صحرا اُسے پہنچانے کو

کوئی دل بن کے رہا ہے کوئی آنکھیں بن کر
ہم نے شیشے کو بھلایا ہے نہ پیمانے کو

نئے اُسلوب سے ڈھالا ہے غزل میں ہم نے
آپ کے گیسوؤ رخسار کے افسانے کو

کرو گے عشق تو ڈوبو گے پیارے — یہ دریا ہے، کنارے ہی کنارے
میرے احوال پر روتے ہیں سارے — ہنسو ہو تم بڑے ظالم ہو پیارے
جو سب سے دور ہیں سب سے کنارے — وہی ہیں چاہنے والے تمھارے
یہ دن آیا ہے کس مشکل سے پیارے — پھر وہو تم جو زُلفوں کو سنوارے
تمھاری بے رُخی سے کیا مریں گے — مرے جاتے ہیں ہم غیرت کے مارے
دل اب قابو سے باہر جا رہا ہے — کوئی اس جانے والے کو پکارے

تڑپ ہر شعر میں رہتی ہے عاجزؔ
یہ کیسا درد ہے دل میں تمھارے

تیرے گیسو جب سے سنوارے گئے ہیں
بہت لوگ بے موت مارے گئے ہیں

دل و جان و ایمان وارے گئے ہیں
جہاں بندہ پرور ہمارے گئے ہیں

وہ جن کے لہو سے سنوارے گئے ہیں
وہی دل کو تھامے کنارے گئے ہیں

کہیں ٹمٹماتا دِیا بھی نہ پہنچا
کسی گھر میں سب چاند تارے گئے ہیں

کہیں تاج ماتھے پہ رکھا گیا ہے
کہیں پیرہن تک اُتارے گئے ہیں

محبت کا دَم بھرنے والے بہت تھے
ہمیں آئے ہیں جب پکارے گئے ہیں

غزل کہو کہ یہ حال اب غزل کے قابل ہے
پکا پکا ہے کلیجہ دُکھا دُکھا دل ہے

اگر چہ تلخ ہے صبر آزما ہے مشکل ہے
بڑا مزا مجھے اس زندگی میں حاصل ہے

کسی کے منہ میں زباں ہے نہ سینے میں دل ہے
یہ کس حسینۂ کافر ادا کی محفل ہے

جہاں بھی چلیو ہتھیلی پہ سَر لیے چلیو
کہ شہر کی جو گلی ہے وہ کوئے قاتل ہے

ہم اپنے اشکوں کے اب قمقمے نہیں دیں گے
تمھیں چراغ جلاؤ تمھاری محفل ہے

جو کر گزرنا بھی آسان ہے تمھارے لیے
ہمارے واسطے وہ سوچنا بھی مشکل ہے

مری غزل کو مری جاں فقط غزل نہ سمجھ
اِک آئینہ ہے جو ہر دَم ترے مقابل ہے

کبھی ان کی بزم میں آ گئے تو غزل انھیں کو سنا گئے
ہمیں پیار اب بھی انھیں سے ہے جو ہمارے دل کو دکھا گئے

بس انھیں کے گیسوئے مشکبو کی روش روش پہ ہے گفتگو
یہ بہار آئی ہے باغ میں کہ بہار بن کے وہ آ گئے

انھیں چشم و لب کا فسوں رہا نہ خرد رہی نہ جنوں رہا
ابھی آئے تھے ہی وہ بزم میں کہ تمام بزم پہ چھا گئے

چھری جب سے ہاتھوں میں آئی ہے کوئی رائی ہے نہ دہائی ہے
اِدھر ایک ہاتھ لگا گئے اُدھر ایک ہاتھ لگا گئے

کوئی ہم سے کا ہے خلاف ہے کہ حساب اپنا تو صاف ہے
جو ہم اس گلی میں کمائے تھے سب اسی گلی میں لٹا گئے

قدم آگے شیخ بڑھایئے اب اُسے خدا بھی بنایئے
نئے دُور کے نئے برہمن نیا اِک صنم تو بنا گئے

گو بہت صاحبِ دستار و گریباں ہوں گے
چند ہی لوگ مگر ہوں گے جو انساں ہوں گے

گر یہی لطف و کرم ہائے بہاراں ہوں گے
آج جو باغ ہیں کل وہ بھی بیاباں ہوں گے

آج تک وقت نے اِک حال میں رکھا کس کو
جو پریشاں نہ ہوئے ہیں وہ پریشاں ہوں گے

پیرہن سی تو دِیا وقت نے دیوانوں کا
پھر بہار آئے گی پھر چاک گریباں ہوں گے

زندہ ہو جائیں اگر عشق میں مرنے والے
پھر وہی آرزو ہوگی وہی ارماں ہوں گے

موسم گل کی نہ دیکھی کبھی صورت عاجزؔ
ہم بھلا کون سے برتے پہ غزل خواں ہوں گے

ہر التجا پہ کہے ہے خدا سے جا کہیے
کوئی کہو کہ کوئی یوں کہے تو کیا کہیے

جب اس کو پیار کیا ہے جب اس کو چاہا ہے
وہ بے وفا سہی کیا اُس کو بے وفا کہیے

سجی ہے خنجر و شمشیر ودار سے محفل
یہاں غزل نہیں کہیے تو اور کیا کہیے

جفا پرست عدو دوست آشنا دُشمن
ہم اس کو کیا نہیں کہہ سکتے پھر بھی کیا کہیے

مری نظر میں تو دونوں کا ایک عالم ہے
ترا کرم کسے کہیے کسے جفا کہیے

کرے ہے وار اِس ادا سے کہ جی یہ چاہے ہے
ہر ایک وار پہ قاتل کو مرحبا کہیے

بدلتی جاتی ہے تیزی سے بھیس یوں دنیا
کہ آشنا کو بھی مشکل ہے آشنا کہیے

شاعری کام ہے پیارے بڑی مشکل والا
درد والا وہی بنتا ہے جو ہو دل والا

لائقِ زخم محبت ہے وہی دِل والا
رقص کرنا جسے منظور ہو بسمل والا

شمع و گل والا صبا والا عنادل والا
مجھ کو ہر کام ملا ہے بڑی مشکل والا

فیصلہ ہے یہی دستار و قبا والوں کا
درد سے چاک گریباں ہی رہے دل والا

شمع کو دیکھ کے پروانہ سا ہو جاتا ہوں
میں ہوں شاید کسی اُجڑی ہوئی محفل والا

لوگ آمین کہیں میں یہ دُعا کرتا ہوں
کسی دل کو نہ لگے گھاؤ میرے دل والا

کیا مزا ہے غم دل میں کہ جہاں جاتا ہوں
لوگ کہتے ہیں پڑھو شعرِ غمِ دل والا

گائے جا درد سے ہاں گائے جا صحرا والے
سو رہا ہے بڑے آرام سے محمل والا

یہ تو سنتا ہوں کہ آئے ہو مسیحا بن کر
لیکن انداز ہے پیارے وہی قاتل والا

شمع سر دُھننے لگی میں جو غزل پڑھنے لگا
دُکھے دل والے کو سمجھے ہے دُکھے دل والا

غزلیں بھی کہیں پُرغم کتنی اس پر بھی علاجِ غم نہ ہوا
دولت تو بٹی ڈھیروں ڈھیروں لیکن یہ خزانہ کم نہ ہوا
کس شام نہ بھیگیں یہ پلکیں کس صبح یہ دامن نم نہ ہوا
بجلی بھی تڑپ کر تھمتی ہے اس دل کا تڑپنا کم نہ ہوا
عالم میں حسیں آئے کیا کیا لیکن، یہ کبھی عالم نہ ہوا
جس روز سنور کر تم نکلے اس روز کہاں ماتم نہ ہوا
کہنے کو بہاریں آئیں بہت پھولوں کا بھی کھلنا کم نہ ہوا
اشکوں کا کوئی دامن نہ بنا زخموں کا کوئی مرہم نہ ہوا
موسم نے تو بدلے رنگ بہت بازارِ جنوں برہم نہ ہوا
زنجیروں کی یورش بڑھتی گئی دیوانوں کا جمگھٹ کم نہ ہوا
رنگیں ہے ہمیشہ صحنِ چمن رنگین مزاجوں کے دَم سے
کرتے ہیں لہو سے گلکاری پھولوں کا اگر موسم نہ ہوا
دل اپنا نہ تھا آئینہ تھا لیکن تھی عجب قسمت اُس کی
اچھا تھا تو سب منہ دیکھتے تھے ٹوٹا تو کسی کو غم نہ ہوا
اربابِ غزل سے اے عاجزؔ اربابِ ستم بھی عاجز ہیں
تلوار نے منتر خوب پڑھا اشعار کا جادو کم نہ ہوا

تجھے کلیم کوئی کیسے خوش کلام کہے — جو دن کو رات بتائے سحر کو شام کہے
پیئے بغیر کہو تو یہ تشنہ کام کہے — وہ رازِ مئے جو صراحی کہے نہ جام کہے
نہ جانے رُوٹھ کے بیٹھا ہے دل کا چین کہاں — ملے تو اُس کو ہمارا کوئی سلام کہے
کہوں جو برہمن و شیخ سے حقیقتِ عشق — خدا خدا یہ پکارے وہ رام رام کہے
میں غم کی راگنی بے وقت بھی اگر چھیڑوں
زبانِ وقت مجھے وقت کا امام کہے

جنابِ حضرت والا یہ کیا کرنے کو کہتے ہیں
ستم کرتے ہیں خود ہم سے وفا کرنے کو کہتے ہیں

وہ اَوروں کو تو سب اچھا بُرا کرنے کو کہتے ہیں
ہمیں سے کاہے ترکِ مُدعا کرنے کو کہتے ہیں؟

مروّت میں جو کچھ ہم نے کیا کس نے کیا ہوگا
کوئی اب ان سے پوچھے اور کیا کرنے کو کہتے ہیں

یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں 'ابھی موقع نہیں آیا'
ہم اُن سے جب کوئی وعدہ وفا کرنے کو کہتے ہیں

ہمارے ہی گلے کا خوں بہا اُن کے پسینے پر
ہمیں کو وہ ادائے خوں بہا کرنے کو کہتے ہیں

بنا کر مالکِ آئینہ و شانہ رقیبوں کو
وہ زُلف اپنی ہمیں آراستہ کرنے کو کہتے ہیں

غرور اتنا جب اپنے سُرخ رُو ہونے پہ ہے اُن کو
تو چھپتے کیوں ہیں جب ہم سامنا کرنے کو کہتے ہیں

محبت جن کو دیوانے سے تھی اُڑ کر چلے آئے
چمن سے پھول تو آئے نہیں پتھر چلے آئے

درِ میخانہ پر جب وقت کے قاتل نے للکارا
ہمیں مستی میں چھلکاتے ہوئے ساغر چلے آئے

اُنھیں بازو پہ اپنے ناز ہے ہم کو قلم پر ہے
وہ شمشیر آئے لے کر ہم غزل لے کر چلے آئے

مری فریاد کی گرمی نے چھُپنا کر دیا مشکل
ستمگر جتنے تھے پردے میں سب باہر چلے آئے

خزاں میں دُور یہ مجمع رہا کرتا تھا گلشن سے
بہار آتے ہی سب پھولوں کے سوداگر چلے آئے

کلیم اب محفلِ یاراں سے اتنا ہی تعلق ہے
گئے اور شمع سے کچھ حالِ دل کہہ کر چلے آئے

کچھ سبب ہے کہ ملنے سے معذور ہیں ورنہ وہ دُور اتنے نہ ہم دُور ہیں
وہ بہت نشۂ حسن میں چوُر ہیں ہم بھی کچھ وضع داری سے مجبور ہیں
سنگ ریزے بھی کہتے ہیں ہم طور ہیں کل جو گمنام تھے آج مشہور ہیں
ہم تو بس آدمی ہیں فرشتہ نہیں وہ یہ بے شک سمجھتے ہیں ہم حور ہیں
ہیں تو دُنیا میں اہلِ ستم اور بھی حسن والے تو نورٌ علیٰ نور ہیں
وہ رہیں صاحب ملکِ دار و رسن ہم بھی اپنے زمانے کے منصور ہیں

درد سازی کا ہے کارخانہ غزل
ہم اُسی کارخانے کے مزدُور ہیں

جب فصلِ بہاراں آئی تھی گلشن میں اُنھیں ایّام سے ہم
یاروں میں لٹاتے پھرتے ہیں کچھ پھول غزل کے نام سے ہم
اِک شوخ کا بسمل کہتے ہیں مشہور ہیں اب اس نام سے ہم
فن ہم سے تڑپنے کا سیکھو واقف ہیں بہت اس کام سے ہم
کھولے ہوئے ہیں غزلوں کی دُکاں ٹوٹے ہوئے دل کے نام سے ہم
چھلکائیں گے کتنے جام ابھی اس ایک شکستہ جام سے ہم
بجھنے کا خیال آتا ہی نہیں روشن جو ہوئے اِک شام سے ہم
تکلیف سلگنے ہی تک تھی جلتے ہیں بڑے آرام سے ہم
اِک دن یہ ہے کتنی حسرت سے ذکر مئے و مینا کرتے ہیں
اِک دن تھے کہ کھیلا کرتے تھے ساغر سے سبو سے جام سے ہم
چھائی ہے گھٹا شمشیروں کی زخموں کے پھواریں پڑتی ہیں
کہتے ہیں لہو کے پیمانے ارزاں ہیں مئے گلفام سے ہم
آج اپنے جھروکے پر بیٹھے پتھر ہمیں مارو ہو پیارے
کل پھول اُچھالا کرتے تھے اُس بام سے تم اِس بام سے ہم

بدلی سی اپنی آنکھوں میں چھائی ہوئی سی ہے
بھولی ہوئی سی یاد پھر آئی ہوئی سی ہے

مت ہاتھ رکھ سلگتے کلیجے پہ ہم نشیں
یہ آگ دیکھنے میں بجھائی ہوئی سی ہے

لیتا ہوں سانس بھی تو ٹپکتا ہے تن بدن
رگ رگ میں ایک نوک سمائی ہوئی سی ہے

بے ساختہ کہے ہے جو دیکھے ہے زخمِ دل
یہ چوٹ تو اُنھیں کی لگائی ہوئی سی ہے

مدّت ہوئی جلائی گئی شاخِ آشیاں
اب تک اسی طرح سے جلائی ہوئی سی ہے

جوان کی بات ہے وہی میری غزل کی بات
لیکن ذرا یہ بات بنائی ہوئی سی ہے

چھیڑی غزل جو تم نے تو ایسا لگا کلیمؔ
خوشبو کسی کی زُلف کی آئی ہوئی سی ہے

گراں ہیں تول میں قیمت میں ہلکے
یہ اہلِ جیب و دامن آج کل کے

چمن والے ہیں نازک آج کل کے
چل اے بادِ بہاری ہلکے ہلکے

کٹھن رستے بھی ہوں معلوم ہلکے
یہ بات آتی نہیں نازوں میں پل کے

چلے ہے کون اب اتنا سنبھل کے
کہ ٹھوکر کھائے اور ساغر نہ چھلکے

ہمیں تم صورتیں کیا کیا بدل کے
چھپتے رہتے ہیں پردے میں غزل کے

یہ جھگڑے آج بھی باقی ہیں کل کے
کہ ہم ہیں جھونپڑے کے تم محل کے

سناتے رہ گئے دردِ جگر ہم
وہ ظالم سوگیا کروٹ بدل کے

بنے ہیں کیا انوکھے سُرخ رو وہ
لہو میرے جگر کا منہ پہ مل کے

چلائے جاؤ تم شمشیر ہم بھی
دیکھائیں گے تمھیں جوہر غزل کے

سرو شمشیر تک پہنچی ہے عاجزؔ
کسی کے چشم ولب سے بات چل کے

مسندیں چھوڑ کر بالا خانوں کے بیچ　　کون آئے گا ہم بے ٹھکانوں کے بیچ
پھولوں کے درمیاں باغبانوں کے بیچ　　ہم لٹے اپنے ہی مہربانوں کے بیچ
گیسوؤں والے کیا ہم سے اترائے ہے　　ہم بھی رہتے تھے آئینہ خانوں کے بیچ
جن میں ہر شب براتیں اُترتی رہیں　　خاک اُڑتی ہے اب ان مکانوں کے بیچ
جن سے تھی پھول کی ڈالیوں میں لچک　　لگ گئی آگ انھیں آشیانوں کے بیچ

کارواں تلملاتا رہا دُھوپ میں
جام چلتے رہے شامیانوں کے بیچ

بے محل کون پڑھ کر گیا یہ غزل　　کس نے یہ آہ کھینچی ترانوں کے بیچ
بات کرنے کا اُس کو سلیقہ نہیں　　کون لایا اُسے خوش بیانوں کے بیچ
گرچہ ہے ہوش والوں کی فہرست میں　　چاہیے نام اس کا دیوانوں کے بیچ
سنگریزوں کو موتی سمجھتا ہے یہ　　چھوڑ دو اس کو اپنے خزانوں کے بیچ
بزم رنگین و نازک کے لائق نہیں　　اس کو مت لاؤ آئینہ خانوں کے بیچ

تم کلیم اپنے اندازِ گفتار سے
آج رُسوا ہوئے قدر دانوں کے بیچ

کس کی چشم کرم آج کل ہوگئی　　دل سے جو بات نکلی غزل ہوگئی
درد کی ہم نشیں ہم بغل ہوگئی　　زندگی تیری مشکل تو حل ہوگئی
رفتہ رفتہ جو میری غزل ہوگئی　　وہ کہانی تو ضربُ المثل ہوگئی
اب قیامت کی کوئی ضرورت نہیں　　کل جو ہونے کو ہے وہ تو کل ہوگئی
غم کو بھی مل گئیں رنگ و رعنائیاں　　شاعری آنسوؤں کا بدل ہوگئی

وہ ادا اب تو اُن سے بھی ممکن نہیں　　جو ادا اُن کی پہلے پہل ہوگئی
استعاروں کا رنگیں نقاب اوڑھ کر　　اُن کی شمشیر میری غزل ہوگئی
جام ومینا کا اس دور میں ذکر کیا
اب تو یہ گفتگو بے محل ہوگئی

شعروغزل میں ڈوبی ہوئی رات ہے میاں　　تم کیوں کلیم روؤ ہو کیا بات ہے میاں
دل ٹوٹنے کا سلسلہ دن رات ہے میاں　　اس دور میں یہ کون نئی بات ہے میاں
ناراضگی کے ساتھ لوچاہے خوشی سے لو　　دردِ جگر ہی وقت کی سوغات ہے میاں
کچھ کہہ نہیں سکو تو غزل کہہ لیا کرو　　سو بات کی بس ایک یہی بات ہے میاں
لائے خدا ہی اس بتِ کافر کو راہ پر　　یہ میرے ہات ہے نہ تیرے ہات ہے میاں
دینے لگیں گے زخم تو دیتے ہی جائیں گے　　وہ ہیں بڑے، بڑوں کی بڑی بات ہے میاں
کچھ اور آنسوؤں کے سوا دیتے ہی نہیں　　ان حسن والوں کی یہی اوقات ہے میاں
ان گیسوؤں کے ہم تو پرانے اسیر ہیں　　تیری تو دو دِنوں کی ملاقات ہے میاں
پھولوں سے کام لیتے ہو پتھر کا اے کلیم
یہ شاعری نہیں ہے کرامات ہے میاں

وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں ماجرائے دل ہے کیا؟ کہیے
میں کہہ دیتا انھیں لیکن بھری محفل ہے کیا کہیے
کسی بےدرد کے کہنے میں اب تک دل ہے کیا کہیے
لہو ہوتا ہے ہو کمبخت اسی قابل ہے کیا کہیے
سنا کرتے ہیں ہم بیٹھے ہوئے جو کچھ وہ کہتے ہیں
سخن سازی انھیں آسان ہمیں مشکل ہے کیا کہیے

تیری صورت کو جو بھی دیکھتا ہے پھول کہتا ہے
مگر سینے میں پتھر ہے ترے یا دل ہے کیا کہیے

بہت کچھ درد دکھ محفل کا ہم کہنے کو رکھتے ہیں
مگر اِک بے مروّت صاحب محفل ہے کیا کہیے

ہم اہلِ گیسوئے رخسار کو معشوق کہتے ہیں
جسے معشوق کہتے ہیں وہی قاتل ہے کیا کہیے

تغزّل بھی ہو عاجزؔ زندگی کی ترجمانی بھی
غزل اس طرح کہنا کس قدر مشکل ہے کیا کہیے

آئینے آئیں گے بکھرتے جائیں گے
حسن والوں کے رُخ و گیسو سنورتے جائیں گے

کیسے کیسے موسم آئیں گے گزرتے جائیں گے
گل کترتے آئے ہیں ہم گل کرتے جائیں گے

اہلِ خنجر اپنا خنجر تیز کرتے جائیں گے
مرنے والے مرتے ہی آئے ہیں مرتے جائیں گے

زندگی اور غم کا رشتہ پھول اور شبنم کا ہے
اشک بہتے جائیں گے چہرے نکھرتے جائیں گے

دن گزرتے جائیں گے غم اُن کا بڑھتا جائے گا
زخم جتنا بھرتے جائیں گے اُبھرتے جائیں گے

یہ سلیقہ ہے اگر تو حسن والوں ہی میں ہے
ظلم کرتے جائیں گے دل میں اُترتے جائیں گے

درد کے صحرا میں اِک کٹیا ہے میرا فن کلیمؔ
غم کے مارے آتے جائیں گے ٹھہرتے جائیں گے

درد کی باتیں دل کی زباں سے ہم نہ کہیں تو کون کہے
حالتِ جاں اس جانِ جہاں سے ہم نہ کہیں تو کون کہے

آنکھ سے آنسو بن کے ڈھلے ہیں بزم میں بن کر شمع جلے ہیں
ہم ہیں واقف رازِ نہاں سے ہم نہ کہیں تو کون کہے

اشکوں کے دن درد کی راتیں نالۂ شام اور آہِ سحر
کیا کیا ملا ہے شہرِ بتاں سے ہم نہ کہیں تو کون کہے

فصلِ گل آئی شاخیں جھومیں کلیاں چٹکیں پھول کھلے
کتنا لہو نکلا رگِ جاں سے ہم نہ کہیں تو کون کہے

کیا تھے ہم اور ہو گئے کیا ہم کیا تھے وہ اور ہو گئے کیا
بات کہاں پہنچی ہے کہاں سے ہم نہ کہیں تو کون کہے

دو دِلوں میں دو جداگانہ اُبھار آ ہی گیا
اُن کو غصّہ آ گیا تو ہم کو پیار آ ہی گیا

بزم میں بے شک ہماری کیا ضرورت رہ گئی
اب سنورنا تجھ کو اے گیسوئے یار آ ہی گیا

درد آخر بن گیا سامانِ لطفِ زندگی
بے قراری تھی بہت لیکن قرار آ ہی گیا

تم تو وہ ہو جس کو دُنیا بے وفا کہتی رہی
دل مگر دیوانہ تھا دیوانہ وار آ ہی گیا

حسنِ سرکش کا بھی اِک دن ٹوٹ جاتا ہے غرور
مشکلوں سے آیا لیکن اعتبار آ ہی گیا

بے زبانی میں تھے ہم مشہور لیکن کیا کریں
دل دکھا تو لب پہ حرفِ ناگوار آ ہی گیا

وہ درد والے جو ناقابلِ خیال گئے
وہی چھپائے ہوئے گدڑیوں میں لال گئے

جو تم پہ مرگئے اپنی بلا تو ٹال گئے
بچے ہوؤں کو بڑی کشمکش میں ڈال گئے

خراجِ دار و رسن کا حساب ہے بے باق
جو پچھلے سال بچے تھے وہ اب کے سال گئے

تھکے تھکے سے وہ آوارگانِ شہرِ جنوں
جو گرتے گرتے بھی کتنوں کے گھر سنبھال گئے

تری چھری بھی عجب نسخۂ مجرب ہے
جو زرد زرد تھے چہرے وہ لال لال گئے

ہمارا آئینہ خانہ ہی چوُر چوُر ہوا
بچا کے گیسوؤں والے تو بال بال گئے

وفا نے فخر سے گردن بلند کرلی ہے
وہ کس کا سر تھا جو تم کاٹ کر اُچھال گئے؟

جنھیں اہلِ شہرِ ستمگراں نہیں یاد کرتے دعاؤں میں
میرا گھر بھی تھا کبھی دوستو انھیں مرنے والوں کے گاؤں میں

انھیں دُشمنی ہے وفاؤں سے میری عمر گزری وفاؤں میں
میرا دل اِک ایسا چراغ ہے کہ جلا کیا ہے ہواؤں میں

یہ غبار کیسا بدن پہ ہے یہ پھپھولے کیسے ہیں پاؤں میں
مرے حال کی انھیں کیا خبر جو کھڑے ہیں پھولوں کی چھاؤں میں

انھیں کیوں نہ جانِ غزل کہوں کیسے بھولوں دعاؤں میں
مجھے شاعری جو سکھا گئی اِک ادا تھی اُن کی اداؤں میں

غزل اُن کے سامنے چھیڑیئے کبھی داد اُن سے بھی لیجیے
یہ خطا اگر ہے تو کیجیے کہ مزا ہے ایسی خطاؤں میں

میٹھی میٹھی بات تمھاری محفل محفل جانے ہے
لیکن تم بے درد ہو کتنے میرا ہی دل جانے ہے

ہم نے کیا کیا نقش بنائے شمعیں جلائی ہیں کیا کیا
رستہ رستہ یاد کرے ہے منزل منزل جانے ہے

ہم تو سر کو تلہتی پر رکھے رکھے پھرتے ہیں
اور یہ بات اس شہر ستم کا قاتل قاتل جانے ہے

تم تو جوانی کی مستی میں کھیل سے پتھر پھینک گئے
جس کو چوٹ لگی ہے پیارے اس کا ہی دل جانے ہے

جیسے جان نکالو ہو تم ایسا ماہر کوئی نہیں
گردن کاٹ کے رکھ دینا تو ہر اِک قاتل جانے ہے

تم نہیں جانو ہو مت جانو شہر کے رہنے والے تو
ہم کو یوں جانیں ہیں جیسے شمع کو محفل جانے ہے

میرے دل میں درد بھرا ہے اتنا ہی تم جانو ہو
دل میں کیسے درد بھرے ہے درد بھرا دل جانے ہے

پیرہن تک کسی کا سلامت نہیں
اُن کو بننے سنورنے سے فرصت نہیں

اعترافِ کرم ہے شکایت نہیں
کون غم ہے جو اُن کی بدولت نہیں

اب کوئی ذکر کوئی روایت نہیں
جس کے پردے میں وہ فتنہ قامت نہیں

ان کی چشم فسوں ساز کے دَور میں
کون افسانہ ہے جو حقیقت نہیں

مُردے اُٹھتے نہیں اپنی قبروں سے کیوں
کیا جوانی کسی کی قیامت نہیں

گیسوئے زندگی میں وہ اُلجھاؤ ہے
ہم غریبوں کو مرنے کی فرصت نہیں

اچھی صورت تھی جب آئینہ ہی نہ تھا
آئینہ ہے تو اب اچھی صورت نہیں

تم کو جو کچھ غزل میں سناتے ہیں ہم
یہ محبت ہے پیارے عداوت نہیں

رونے نہ دیجیے گا تو گایا نہ جائے گا
درد اتنا تیز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

اب پیار کے فریب میں آیا نہ جائے گا
گھر ہی کہاں رہا کہ جلایا نہ جائے گا

کہتے ہیں کس ادا سے چھری پونچھتے ہوئے
کیا ہوگا وہ لہو جو بہایا نہ جائے گا

اُن کی وہ بات کہہ دوں اگر سب کے سامنے
سر میرے مہرباں سے اٹھایا نہ جائے گا

ہر دَور میں ہماری غزل گائی جائے گی
جیسی بھی دُھوپ آئے یہ سایا نہ جائے گا

ہم کو دعائیں دو کہ تمھاری اداؤں پر
ہم نے جو کہہ دیا وہ بھلایا نہ جائے گا

اب تو یہ چاک پیرہنی کا زمانہ ہے
دامن بچاؤ گے تو بچایا نہ جائے گا

پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ دل سے نہ کھیلئے
دل ٹوٹ جائے گا تو بنایا نہ جائے گا

آیا ہے کتنی منتوں سے موسمِ بہار
اب روٹھا تو کسی سے منایا نہ جائے گا

تڑپانا ہے تو خود بھی تڑپتے رہو کلیمؔ
جاگا نہ جائے گا تو جگایا نہ جائے گا

کلیمؔ حال تو اپنا سناؤ کیسا ہے
ہے درد کم کہ بہت دل کا گھاؤ کیسا ہے

بچی کہ ٹوٹ کے کشتیِ دل بھی ڈوب گئی
اب آنسوؤں کی ندی کا بہاؤ کیسا ہے

جہانِ حسن میں اب اس کی مانگ ہے کہ نہیں
وفا کا اِن دنوں بازار بھاؤ کیسا ہے

جنابِ شیخ ہیں آؤ بھگت کہ جاؤ بھگت
صنم کدوں میں بتوں کا سبھاؤ کیسا ہے

ہے وضع کیسی نئے قتل کرنے والوں کی
پرانے قاتلوں کا رکھ رکھاؤ کیسا ہے

یہ دیر دیر سے یا جلد جلد ملتے ہیں
گلے کے ساتھ چھری کا لگاؤ کیسا ہے

اکیلے سیر کرو ہو غموں کے پھولوں کی
چمن ہمیں بھی تو اپنا دِکھاؤ کیسا ہے

زباں وہی ہے جو ہم لوگ بولتے ہیں مگر
یہ اتنا سوزِ سخن میں بتاؤ کیسا ہے

سنا ہے درد کا سرمایہ اب دِلوں میں نہیں
تمھارے پاس اگر ہے دکھاؤ کیسا ہے

زلفوں کو میسر تھا پہلے آئینہ نہ شانہ یاد کرو
کیا ہم پہ ہنسو ہو تم پیارے اپنا تو زمانہ یاد کرو
اِک دَور ہمارا گزرا ہے اِک دَور تمھارا گزرا ہے
ہم اپنی کہانی یاد کریں اپنا فسانہ یاد کرو
پہلے تو اکیلے ہی بیٹھے سلجھانے کی کوشش کرتے تھے
جب اور الجھتی تھیں زلفیں تب ہم کو بلانا یاد کرو
موتی میرے اشکوں کے لے کر ہر شام سجانا بالوں میں
پھر مرے لہو سے ماتھے پر سیندور لگانا یاد کرو
تم سے ہے پُرانا رشتۂ غم جب ہوتا تھا تم کو شوقِ ستم
ہم ہی کو بناتے تھے پیارے تیروں کا نشانہ یاد کرو
اس دل میں تمھیں تو رہتے تھے تم ہی تو سنورتے بنتے تھے
تم ہی نے تو پیارے توڑا ہے یہ آئینہ خانہ یاد کرو

سینے کے زخم پاؤں کے چھالے کہاں گئے
اے حسن تیرے چاہنے والے کہاں گئے؟
شانوں کو چھین چھین کے پھینکا گیا کہاں
آئینے توڑ پھوڑ کے ڈالے کہاں گئے؟
خلوت میں روشنی ہے نہ محفل میں روشنی
اہلِ وفا چراغِ وفا لے کہاں گئے؟
بت خانے میں بھی ڈھیر ہیں ٹکڑے حرم میں بھی
جام و سبو کہاں تھے اچھالے کہاں گئے
آنکھوں سے آنسوؤں کو ملی خاک میں جگہ
پالے کہاں گئے تھے نکالے کہاں گئے
بربادِ روزگار ہمارا ہی نام ہے
آئیں تماشہ دیکھنے والے کہاں گئے؟
چھپتے گئے دِلوں میں وہ بن کر غزل کے بول
میں ڈھونڈھتا رہا میرے نالے کہاں گئے
اُٹھتے ہوؤں کو سب نے سہارا دیا کلیمؔ
گرتے ہوئے غریب سنبھالے کہاں گئے

غمِ دل ہی غمِ دوراں غمِ جانانہ بنتا ہے
یہی غم شعر بنتا ہے یہی افسانہ بنتا ہے

اِسی سے گرمیِ دار و رسن ہے انقلابوں میں
بہاروں میں یہی زُلف و قد جانانہ بنتا ہے

سروں کے خم صراحی گردنوں کی جام زخموں کے
مہیّا جب یہ ہو لیتے ہیں تب میخانہ بنتا ہے

بگڑتا کیا ہے پروانے کا جل کر خاک ہونے میں
کہ پھر پروانے ہی کی خاک سے پروانہ بنتا ہے

نگاہ کم سے میری چاک دامانی کو مت دیکھو
ہزاروں ہوشیاروں میں کوئی دیوانہ بنتا ہے

خریدا جا نہیں سکتا ہے ساقی ظرف رندوں کا
بہت شیشے پگھلتے ہیں تو اِک پیمانہ بنتا ہے

میرے ہی دونوں ہاتھ آتے ہیں کام اُن کے سنورنے میں
دکھاتا ہے کوئی آئینہ کوئی شانہ بنتا ہے

بڑا سرمایہ ہے سب کچھ لٹا دینا محبت میں
فقیرانہ لباس آتے ہیں دل شاہانہ بنتا ہے

منظور ہو محفل کا گر رنگ بدل دینا — اِک اچھے مغنّی کو عاجزؔ کی غزل دینا
جو آج دیا پیارے وہ درد نہ کل دینا — ہر روز کوئی تازہ مضمون غزل دینا
ہم اہلِ محبت کو مت تاج محل دینا — رونے کو لہو دینا گانے کو غزل دینا
یہ وضع وفاداری عاجزؔ نہ بدل دینا — وہ زخم تجھے دیں گے تو اُن کو غزل دینا
دیوانے پہ اتنا بھی احسان بہت ہوگا — جب موسمِ گل آئے زنجیر بدل دینا
یہ اہلِ خرد آخر کیوں ڈوبنے جاتے ہیں — آواز ذرا ان کو اے اہلِ غزل دینا

بھولے ہیں نہ بھولیں گے ان کی وہ ادا عاجزؔ
دل پہلے پہل لینا غم پہلے پہل دینا

ان کی زلفوں میں جتنی شکن چاہیے — ہم کو اتنا ہی دیوانہ پن چاہیے
چاہیے ان کو رنگیں قبا اور ہمیں — چاک کرنے کو اِک پیرہن چاہیے
یہ بھی ہے ایک سامانِ دل بستگی — کچھ تماشائے دار و رسن چاہیے
میرے جیسے مسافر بہت آئیں گے — ان کے جیسا حسیں راہزن چاہیے
قتل کرنے ہی کا اِک سلیقہ سہی — کچھ تو مشہور ہونے کو فن چاہیے
آج کل سب کا بدلا ہوا بھیس ہے — شیخ ڈھونڈھو اگر برہمن چاہیے
دل کا ایک ایک قطرہ لہو دے دیا — اور کیا اے بہارِ چمن چاہیے
ہم تو جلتے ہیں تم بھی جلو دوستو — شمع کے واسطے انجمن چاہیے
اپنے ٹھنڈے دِلوں کے لیے مانگ کر — ہم سے لے جاؤ جتنی جلن چاہیے
کج کلاہی فقط کام آتی نہیں — کچھ طبیعت میں بھی بانکپن چاہیے

کہنے والے پہ گذرے سو گذرا کرے
سننے والوں کو لطفِ سخن چاہیے

ہوئے تھے چاک کیا کیا جیب وداماں یاد آتے ہیں
ہمیں پھر آج ایام بہاراں یاد آتے ہیں

جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی جہاں نغمے ہی نغمے تھے
وہ گلشن اور وہ یارانِ غزل خواں یاد آتے ہیں

دل اپنا اُلجھا اُلجھا ہے طبیعت بکھری بکھری ہے
نہ جانے کس کے گیسوئے پریشاں یاد آتے ہیں

کبھی دن کو لہو کی نقش کاری یاد آتی ہے
کبھی راتوں کو زخموں کے چراغاں یاد آتے ہیں

بھرا رہتا تھا گھر جن سے وہ یاد آتے ہیں گھر والے
جو گھر کو کر گئے خالی وہ مہماں یاد آتے ہیں

میرے سینے میں دل کا کوئی حصّہ ٹوٹ جاتا ہے
جب آغازِ وفا کے عہد و پیماں یاد آتے ہیں

بہاریں سیر گاہیں چاندنی راتیں ملاقاتیں
ہمیں اب تک یہی خوابِ پریشاں یاد آتے ہیں

کہاں ہم اور کہاں یہ طرز وانداِزِ سخن عاجؔز
غزل کہتے ہیں جب ہم اُن کے احساں یاد آتے ہیں

کچھ دیر بھی دُکھ درد بھلانے نہیں دیتا ۔۔۔ کمبخت غمِ دل کہیں جانے نہیں دیتا
چپ رہیے تو جذبات سے گھٹتا ہے کلیجہ ۔۔۔ کچھ کہیے تو غم بات بنانے نہیں دیتا
فریاد کی کیا دے گا اجازت دلِ خود دار ۔۔۔ چپ بیٹھ کے آنسو بھی بہانے نہیں دیتا
ہاں پھولوں پہ چل پیارے مگر اس کو دعا دے ۔۔۔ کانٹے جو تیری راہ میں آنے نہیں دیتا
اللہ کرے اس کا کلیجہ رہے ٹھنڈا ۔۔۔ جو آگ میرے دل کی بجھانے نہیں دیتا

تو زخم دیئے جاتا ہے اور خون ہمارا
دھبّہ تیری شمشیر پہ آنے نہیں دیتا

ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کچھ رونا گانا آئے ہے
لوگ یہ سمجھے ہیں کہ ہم کو بات بنانا آئے ہے

چال بھی ویسی بن جائے ہے جیسا زمانہ آئے ہے
زلف کمر تک جب پہنچے ہے خود بل کھانا آئے ہے

غزلوں کے پردے میں بیٹھے میرؔ تقی فرماتے ہیں
دِل ٹوٹے ہے تب ہونٹوں پر گیت سہانا آئے ہے

بازاروں سے مول منگا کر رنگ تو سب بھر لیتے ہیں
کم ہیں جن کو خونِ جگر سے پھول بنانا آئے ہے

ہم نے جس کو پیار دیا ہے تن من دَھن سب وار دیا ہے
اور ہمیں کچھ آئے نہ آئے دل تو لگانا آئے ہے

شاعر ہی تو دنیا بھر کا درد سمیٹے رہتے ہیں
مال اسی کے گھر جائے ہے جس کو لٹانا آئے ہے

دل تھامے کروٹ لے لے کر تڑپوں ہوں اور سوچوں ہوں
اس کو بجھانا کیوں نہیں آتا جس کو لگانا آئے ہے

تمھاری طرح زلفوں میں شکن ڈالے نہیں ہیں ہم
کہیں گے بات سیدھی پیچ وخم والے نہیں ہیں ہم
گلوں کی طرح ہم نے عمر کانٹوں میں گزاری ہے
ہیں اہلِ ناز لیکن ناز کے پالے نہیں ہیں ہم
کلاہ کج ہمیشہ اپنی پیشانی پہ رہتی ہے
اگرچہ تاج و دستار و قبا والے نہیں ہیں ہم
ہماری وضع پر شمشیر والوں کو بھی حیرت ہے
بھرے ہیں زخم سے لیکن سپر ڈالے نہیں ہیں ہم
ہمیں سے عشق کا معیار اونچا ہے زمانے میں
حسیں وہ کیا ہے جس کے چاہنے والے نہیں ہیں ہم
اسی محفل ہی پر کیا منحصر ہے کوئی محفل ہو
چراغوں میں کہاں اپنا لہو ڈھالے نہیں ہیں ہم
جنوں پیشہ تو اپنی ابتدائے زندگی سے ہیں
مگر آشفتہ گیسو آج کل والے نہیں ہیں ہم
تمھیں شعلہ بیاں شعلہ دہن ہو ایسا مت سمجھو
زباں کھولیں تو کم آتش کے پرکالے نہیں ہیں ہم
خمِ میخانہ ہیں ہم ظرف والوں ہی سے ملتے ہیں
ہراِک کے ہاتھ میں آجائیں وہ پیالے نہیں ہیں ہم
یہ شیخ و برہمن ہم سے بگڑ کر کیا بنالیں گے
خدا والے ہیں ہم دیر وحرم والے نہیں ہیں ہم

نہیں کہنا اگر چہ ہے بہت مشکل نہیں کہتے
کچھ ایسے درد والے ہیں جو دردِ دل نہیں کہتے

بنا ہی لیتے ہیں اس کو بھی محبوبِ غزل اپنا
ہم اہلِ درد تو قاتل کو بھی قاتل نہیں کہتے

کچھ ایسا حال کرڈالا ہے بیچارے کا زخموں نے
سنا ہے چارہ گر اب میرے دل کو دل نہیں کہتے

وہ زلفِ برہم جاناں ہوں یا زلفِ زمانہ ہو
کسی مشکل کو ہم اہلِ جنوں مشکل نہیں کہتے

نگاہیں سب سے مل سکتی ہیں دل سب سے نہیں ملتا
ہر اِک محفل نشیں کو صاحبِ محفل نہیں کہتے

کسے معلوم کیا کیا بولتے ہیں بولنے والے
وہ باتیں ہم نہیں سنتے جو اہلِ دل نہیں کہتے

بُرا مت مانو یہ تو تجربے کی بات ہے پیارے
جو اہلِ حسن ہیں ہم ان کو اہلِ دل نہیں کہتے

یہ مہمل شرط آخر کیوں لگا رکھی ہے عاجزؔ نے
غزل، جس وقت تک دکھتا نہیں ہے دل نہیں کہتے

اہلِ غزل ہیں ہم کو یہی کام چاہیے
چھیڑ اس حسین سے سحر و شام چاہیے

وہ کافرِ حسیں ہے ستمگر تو کیا کریں
دل کے لیے کوئی تو دل آرام چاہیے

ہر طاق و بام دَر کے لیے چاہیے چراغ
اور ہر چراغ ان کو سرِ شام چاہیے

ہے روز تازہ گردن و سر کا مطالبہ
ہر شب نئی صراحی نیا جام چاہیے

بسمل تڑپ رہے ہیں تماشائے رقص ہے
زُلفیں بکھیرے کوئی سرِ بام چاہیے

مقتل میں بزمِ شعر و غزل بھی سجا کرے
قاتل کو تھوڑی دیر تو آرام چاہیے

ہم ہی نکل گئے تو کہو گے بُرا کسے
آخر کوئی تو شہر میں بدنام چاہیے

دل کے شدید درد کی آواز ہے کلیمؔ
سننا مری غزل کو جگر تھام چاہیے

کاش اب بھی ذرا چین پاتے　　عمر گزری غزل گاتے گاتے
پیاسی نظریں اگر ہم اٹھاتے　　کتنے جام و سبو ٹوٹ جاتے
غم سے دیوانے گر بن نہ جاتے　　تم خدا جانے کیا کیا بناتے
سب جفا سب ستم بھول جاتے　　تم بلاتے تو کیا ہم نہ آتے
تم ہو جلاّد بھی دل رُبا بھی　　جان جاتی اگر دل بچاتے
کیا کہیں دِل کے زخموں کا عالم　　تم اگر دیکھتے ہم دکھاتے
کہتے رہیو ہماری کہانی　　دل یہ کہتا گیا جاتے جاتے
اشک بھی اب سُلگنے لگے ہیں　　آگ دل کی بجھاتے بجھاتے
غم نے گانا بجانا سکھایا
جان دے دیں گے گاتے بجاتے

جب تک مذاق غم ہو غم دل سے کھیلئے　　تھک جایئے تو خنجر قاتل سے کھیلئے
آسانیوں سے کیجیے ترکِ تعلقات　　دُشواریوں کو چھیڑیئے مشکل سے کھیلئے
پھر فتح یا شکست کا کیجیے گا فیصلہ　　کچھ دیر اپنے مدِّ مقابل سے کھیلئے
ہر روز رکھئے ایک نئے راستے پہ پاؤں　　ہر شب نئے تصوّرِ منزل سے کھیلئے
اہلِ جنوں کو وصل سے بڑھ کر فراق ہے　　لیلیٰ نہیں تو پردۂ محمل سے کھیلئے
مرنے کا کھیل اہلِ تماشہ بھی دیکھ لیں
جب تک نہ ڈوب جایئے ساحل سے کھیلئے

کوئے قاتل ہے مگر جانے کو جی چاہے ہے
اب تو کچھ فیصلہ کر جانے کو جی چاہے ہے

لوگ اپنے درودیوار سے ہوشیار ہیں
آج دیوانے کا گھر جانے کو جی چاہے ہے

درد ایسا ہے کہ جی چاہے ہے زندہ رہیے
زندگی ایسی کہ مرجانے کو جی چاہے ہے

دل کو زخموں کے سوا کچھ نہ دیا پھولوں نے
اب تو کانٹوں میں اُتر جانے کو جی چاہے ہے

چھاؤں وعدوں کی ہے بس دھوکا ہی دھوکا اے دل
مت ٹھہر گرچہ ٹھہر جانے کو جی چاہے ہے

زندگی میں ہے وہ اُلجھن کہ پریشاں ہوکر
زلف کی کی طرح بکھر جانے کو جی چاہے ہے

قتل کرنے کی ادا بھی حسیں قاتل بھی حسیں
نہ بھی مرنا ہوتو مرجانے کو جی چاہے ہے

جی یہ چاہے ہے کہ پوچھوں کبھی ان زُلفوں سے
کیا تمھارا بھی سنور جانے کو جی چاہے ہے

رسن و دار اِدھر کاکل و رُخسار اُدھر
دل بتا ترا کدھر جانے کو جی چاہے ہے

غزل میں سسکیاں دل کی سنا دینا ہی آتا ہے
ہمیں رونا ہی آتا ہے رلا دینا ہی آتا ہے

وفا کیا ہے وفا کرکے دکھا دینا ہی آتا ہے
ہمیں تو زخم لینا اور دُعا دینا ہی آتا ہے

جہاں سے چوٹ آئے جیسے آئے جس قدر آئے
تڑپنا اور تڑپ کر مسکرا دینا ہی آتا ہے

تمھیں جو بے وفائی آتی ہے ہم کو نہیں آتی
ہمیں تو شرم سے گردن جھکا دینا ہی آتا ہے

ہم اِک ایسے انوکھے تشنہ لب اس میکدے میں
جسے پینا نہیں آتا پلا دینا ہی آتا ہے

بتادو کس طرح بچ بچ کے چلتے ہیں محبت میں
ہمیں تو جان کی بازی لگا دینا ہی آتا ہے

زباں شاعر کی اپنے وقت کا آئینہ ہوتی ہے
اسے تو سب کھرا کھوٹا دکھا دینا ہی آتا ہے

لہو دے کر چراغِ درد روشن کردیا ہم نے
بجھادیں گر ہواؤں کو بجھا دینا ہی آتا ہے

بہار آتے ہی ہم بھی شاعری کرنے لگے عاجزؔ
بہاروں کو تو دیوانہ بنا دینا ہی آتا ہے

تیری گھنی زُلفوں کا سایہ بھی گھنیرا ہے
جلتے ہیں دِیے جتنے اُتنا ہی اندھیرا ہے

کیا لوٹ کے لے لے گا گر وقت لٹیرا ہے
ہم خاک نشینوں کا خیمہ ہے نہ ڈیرا ہے

یہ کیسی کرن پھوٹی یہ کیسا سویرا ہے
اِک گھر میں اُجالا ہے سو گھر میں اندھیرا ہے

چپ بیٹھے ہیں ہم جب تک تب تک ہی اندھیرا ہے
ہم بھیرویں گر اپنی چھیڑیں تو سویرا ہے

تو فرق نہ کر پیارے یہ عقل کا پھیرا ہے
زنجیر بھی تیری ہے دیوانہ بھی تیرا ہے

تو کاہے پریشاں ہے گیسوئے پریشاں میں
آ میں انھیں سلجھادوں یہ کام تو میرا ہے

میں نے جو بنایا ہے اشعار کے موتی ہے
یہ تاج محل پیارے میرا نہیں تیرا ہے

چھری جن کے ہاتھوں سے کھانا پڑے ہے
غزل بھی اُنھیں کو سنانا پڑے ہے

طبیعت کو قابو میں لانا پڑے ہے
اُٹھے ہے کہاں غم اُٹھانا پڑے ہے

خبر ہے کہ ہیں دُشمنِ جان و دل وہ
مگر دل اُنھیں سے لگانا پڑے ہے

عجب چیز ہے کاروبارِ محبت
کمانا پڑے ہے لٹانا پڑے ہے

نہ آ درد مندوں کی محفل میں پیارے
یہاں عمر بھر دل جلانا پڑے ہے

ہمیں جب لگے ہے جھڑی آنسوؤں کی
وہی فصلِ گل کا زمانہ پڑے ہے

بس اِک بات ان کی چھپانے کی خاطر
ہمیں بات کیا کیا بنانا پڑے ہے

کچھ آساں نہیں منصبِ سُرخ روئی
کئی بار مقتل میں جانا پڑے ہے

وہ پوچھے ہیں جب خیریت سے ہو عاجزؔ
جگر تھام کر مسکرانا پڑے ہے

کچھ تو ہم مشرب ہے عاجزؔ کچھ جدا گانہ بھی ہے
چاک پیراہن نہیں ہے گرچہ دیوانہ بھی ہے

سامنے آئینہ بھی ہے ہاتھ میں شانہ بھی ہے
ہم سنورتے کیوں نہیں ہیں یہ اِک افسانہ بھی ہے

شاعری بھی ہے تعارف بھی ہے افسانہ بھی ہے
جس نے ہم کو سن لیا ہے اس نے پہچانا بھی ہے

کوئی ہم سا ترجمانِ دردِ جانانہ بھی ہے؟
یوں تو قمری بھی ہے، بلبل بھی ہے پروانہ بھی ہے

شمع نے کس حُسن کس خوبی سے سمجھا دی یہ بات
جو بہت ناداں ہے محفل میں وہی دانا بھی ہے

سادگی کہہ لو وفا کہہ لو رواداری کہو
جس نے لوٹا ہے اسی سے اپنا یارانہ بھی ہے

سیر کرتے ہیں یہیں آوارہ پھرتے ہیں یہیں
دل وہ بستی ہے کہ گلشن بھی ہے ویرانہ بھی ہے

پا بہ گل ہو کر کسی منزل پہ رہ سکتے نہیں
ہم تو بادِ صبح ہیں، آنا بھی ہے جانا بھی ہے

لالہ رُخوں نہ زہرہ جمالوں کو چاہیے
اپنے ہی خوابوں اپنے خیالوں کو چاہیے

ویران ہی سہی مگر اپنا ہے میکدہ
کچھ بھی نہیں تو ٹوٹے پیالوں کو چاہیے

چاہیں گے ہم انھیں جو نہیں چاہتے ہمیں
سب چاہتے ہیں چاہنے والوں کو چاہیے

سچ تو یہ ہے کہ چاہ کے قابل یہی ہیں لوگ
خستہ دِلوں کو سوختہ حالوں کو چاہیے

جو کچھ تماشہ ہے لبِ ساحل انھیں سے ہے
دریائے غم میں ڈوبنے والوں کو چاہیے

گرچہ یہ ظلمتوں کی پرستش کا دَور ہے
اپنا تو کام ہے کہ اُجالوں کو چاہیے

زخم ہر صبح دو درد ہر شام دو — ہاں یہی ہے محبت کا انعام دو
بزم میں دَور میرے لہو کا چلے — خمُ پہ خمُ بھر کے دو جام پر جام دو
دل دیا غم لیا چاک دامن ہوئے — کام سب کر چکے لاؤ انعام دو
پھر دوبارہ جلایا نہیں جاسکے — ایسا اِک گھر جو ہو بے درو بام دو
یہ پرانی ادا ہی سہی خوب ہے — خود شرارت کرو ہم کو الزام دو
جو مقدّر میں ہونا ہے ہو جائے گا — تم جو سوچے ہوئے ہو وہ انجام دو
دُشمنی کو چھپائے گی کیا دوستی — زہر پھر زہر ہے چاہے جو نام دو

اتنی غزلیں تو اس سے کہلوا چکے
اب تو کمبخت عاجزؔ کو آرام دو

لہو جاری ہے اور جاری رہا ہے — یہ دل جیسا ہے ایسا ہی رہا ہے
الگ بیٹھا جو آنسو پی رہا ہے — کبھی اس بزم کا ساقی رہا ہے
وہ چاکِ پیرہن جو سی رہا ہے — کبھی معیارِ خوش پوشی رہا ہے
گراں ہے وہ بھی رنگیں دامنوں کو — لہو دل میں جو کچھ باقی رہا ہے
ہم ایسے چاک پیراہن رہے ہیں — کہ اِک عالم تماشائی رہا ہے
نہ بدلا رنگِ میخانہ نہ بدلا — وہی جو پی رہا تھا پی رہا ہے
نہ پھول اے دوست اُس کی دوستی پر — تعلّق ہم سے بھی کافی رہا ہے
وہ اب بھی ایسے لگتے ہیں کہ جیسے — شباب اُن پر ابھی آ ہی رہا ہے

ہوئے جو اُن کے بسمل مر گئے سب
کلیمؔ آخر تو کیسے جی رہا ہے

ہمیں یہ دیکھ کے کہتے ہیں آج کل والے
وہ آگئے روشِ میرؔ کی غزل والے

جگر کا خون نہ دیتے اگر غزل والے
تو یارتم بھی نہ کہلاتے پھول پھل والے

یہ درد والے یہ دل والے یہ غزل والے
یہی ہیں تیری گلی کی چہل پہل والے

یہ دیکھ کر کبھی ملتے نہیں غزل والے
کہ لوگ جھونپڑے والے ہیں یا محل والے

قلم لیے ہیں نئی شان سے غزل والے
نصیب جس کو بدلوانا ہے بدلوالے

ہمارے حال پہ او ابروؤں پہ بل والے
تو اپنی زلفوں کا تو پیچ وخم نکل والے

یہ بات ہم سے جو چاہے جہاں کہلوالے
ڈبونے والے یہی ہیں اَغَل بغل والے

خزاں بھی دیکھی تھی فصلِ بہار بھی دیکھی
ہیں آج والے بھی ویسے ہی جیسے کل والے

یہ بات اب تو زمانے کو ہوچکی معلوم
کہ تم ہو دار ورسن والے ہم غزل والے

یہ حق کلیمؔ کے محبوب ہی کو حاصل ہے
کہ روز زخم دے روز اِک غزل کہلوالے

بہت سنبھال کے رکھا ہے بوریا ہم نے
کبھی تو جھونپڑے میں آئیں گے محل والے

فصل گل کو سارا پیراہن دِیا
آستیں دی جیب دی دامن دِیا

زخم اس نے دل سے تا گردن دیا
پھول ہم نے جس کو بھر دامن دیا

شاخِ گل پر دُھوپ جب آنے لگی
دھجیوں سے شامیانہ تن دیا

اس لیے ہم خانماں برباد ہیں
بے گھروں کو ہم نے گھر آنگن دیا

عمر بھر ٹھنڈی پھواروں میں رہے
جس نے میری آنکھوں کو ساون دیا

کیا بتائیں چھین کر کیا کیا ہنر
وقت نے ہم کو غزل کا فن دیا

کیا حسیں سودا کیا اِک شوخ سے
ہتھکڑی لے کر اُسے کنگن دیا

میرؔ کے بعد اِک نئے انداز سے
غم کو عاجزؔ نے سہانا پن دیا

آنکھوں میں کہیں آنسو نہ رہے سینے میں کسی کے دل نہ رہا
ہیں شہر میں قاتل ہی قاتل سنتے ہیں کوئی بسمل نہ رہا

مت کہیے کہ اب مجنوں نہ رہا لیلیٰ نہ رہی محمل نہ رہا
کہیے کہ لہو کا کھیل ہے یہ اور اتنا لہو فاضل نہ رہا

محرومیِ اہلِ محفل کا کب ذکر سرِ محفل نہ رہا
پہلے تو یہ غم تھا دل نہ رہا اب غم ہے کہ دردِ دل نہ رہا

کیا اہلِ خرد کیا اہلِ جنوں بے ساز ہیں سب بے سوز ہیں سب
بستی بھی کسی لائق نہ رہی صحرا بھی کسی قابل نہ رہا

جانے کہ نہ جانے اور کوئی ہم تو اسے جانے ہیں جس نے
قاتل کا ہمیشہ کام کیا اور نام کبھی قاتل نہ رہا

دہلی میں بہار آئی عاجؔز افسوس جنابِ میؔر نہیں
جب زخم رہا مرہم نہ رہا مرہم ہے تو زخمِ دل نہ رہا

کل کہتے رہے ہیں وہی کل کہتے رہیں گے
ہر دَور میں ہم اُن پہ غزل کہتے رہیں گے

ہر صبح کو کہتے رہیں گے صبحِ قیامت
ہر شام کو ہم شامِ غزل کہتے رہیں گے

وہ باتیں بناتے رہیں گے اور ہم اُن سے
کیا قول ہے کیا ان کا عمل کہتے رہیں گے

چھپ چھپ کے جو کرتے رہیں گے اہلِ سیاست
کھل کر سرِ بزم اہلِ غزل کہتے رہیں گے

وہ ہم کو بدلنے کو کہے جائے گا اور ہم
یہ شیوۂ گفتار بدل! کہتے رہیں گے

ہر ایک قدم پر ہم اس آوارہ قدم کو
ہاں دیکھ کے چل دیکھ کے چل کہتے رہیں گے

دل گرچہ ہے ٹوٹی ہوئی پھوٹی ہوئی کُٹیا
اس کُٹیا کو ہم تاج محل کہتے رہیں گے

گردن زدنی کہتے رہیں گے اسے کچھ لوگ
ہم لوگ غزل گو ہیں غزل کہتے رہیں گے

دل جگر ہوں گے لہو جان کے لالے ہوں گے — کیا نہیں ہوگا جہاں گیسوؤں والے ہوں گے
کیف و مستی میں وہی سب سے نرالے ہوں گے — جن کی تقدیر میں ٹوٹے ہوئے پیالے ہوں گے
وہ جو چاہیں گے تو ہر سمت اُجالے ہوں گے — شہر میں ڈھونڈھ بہت آنسوؤں والے ہوں گے
بچ بھی جائیں گے اگر آج ہم اِک قاتل سے — کل کسی دوسرے قاتل کے حوالے ہوں گے
کیا بتاؤں کہ زمانہ میں اندھیرا کیوں ہے — ان کی زلفوں نے پر و بال نکالے ہوں گے
کیا مرے دل کی طرح بھی کوئی ٹوٹا ہوگا؟ — ساقی تو نے تو بہت جام اچھالے ہوں گے
پھر غزل ایسی نہ پھر ایسا تغزّل ہوگا — کون ہم جیسے تجھے چاہنے والے ہوں گے

کل وہی ہوں گے جو دُنیا کو سنبھالیں گے کلیؔم
آج کے دَور میں جو دل کو سنبھالے ہوں گے

وہ غزل سرائی سے تھک گیا اسے بزم میں نہ بلایئے
کسی اور کلیم کو ڈھونڈھیے کوئی اور شمع جلایئے

یہ ستم ہے کیسا بتایئے کہ خوشی کی بزم سجایئے
پھر اسے یہ کہہ کے بلایئے ہمیں اِک غزل تو سنایئے

وہ کہے کہ وعدہ نبھایئے تو ہزاروں باتیں بنایئے
کبھی یہ سوال اٹھایئے کبھی وہ سوال اٹھایئے

وہ ہے کون مجرمِ جرم خوں میں ابھی بتاتا ہوں آیئے
ذرا ہاتھ ادھر تو بڑھایئے ذرا آستیں تو دِکھایئے

نہ لگی کسی کی بجھایئے نہ کسی کا درد مٹایئے
یونہی چارہ ساز بنے ہوئے یہاں آیئے وہاں جایئے

مجھے کیا خبر مجھے کیا پتہ یہ کسی نے پہلے نہیں کہا
وہ ہے بے مروّت و بے وفا کبھی اس سے دل نہ لگایئے

سبب سمجھا تو حیراں ہوگئے ہم — کہ آخر کیوں غزل خواں ہوگئے ہم
ہوئے جس روز رنگیں پیرہن وہ — اُسی دن چاک داماں ہوگئے ہم
بڑا کام آ گیا جلنا ہمارا — چراغِ بزمِ جاناں ہوگئے ہم
اُٹھے یوں زخم آلودہ چمن سے — کہ جیسے گل بداماں ہوگئے ہم
بڑے دانا تھے لیکن کیا بتائیں — محبت کرکے ناداں ہوگئے ہم
تمام آبادیاں تھیں تجھ سے اے دل — ترے جاتے ہی ویراں ہوگئے ہم
نہ برہم ہم سے رہ او زُلف والے — تری خاطر پریشاں ہوگئے ہم
کلیم اس بارے میں تم کیا کہو ہو — سنا ہے میرؔ دوراں ہوگئے ہم
لگاتا ہے ہر اِک قیمت ہماری — خریداری کا ساماں ہوگئے ہم

یہی کچھ آہیں کچھ نالے کچھ آنسو
اُنھیں سے اہلِ دیواں ہوگئے ہم

وقت کا ہے یہ تقاضہ تجھے چپ رہنا ہے — دل یہ کہتا ہے ، مجھے روز غزل کہنا ہے
دردمندانِ محبت کا یہی کہنا ہے — ہم نے زخموں کو بھی زیور کی طرح پہنا ہے
دو گھڑی بیٹھ کے کہہ سن لیں جو کچھ کہنا ہے — نہ ہمیں رہنا ہے پیارے نہ تمھیں رہنا ہے
تم جو چاہو سو کہو جی میں جو آئے سو کرو — ہم کو تو پیارے جو کرنا ہے وہی کہنا ہے
دیر ہے یار کے مائل بہ کرم ہونے میں — کون جانے کہ ابھی کتنا ستم سہنا ہے
بوریا کاندھے پہ ہر وقت اُٹھائے رکھیو — کس کو معلوم ہے کس وقت کہاں رہنا ہے

درد سے لوٹیے اور خوب غزل کہیے کلیمؔ
آپ شاعر ہیں بھلا آپ کا کیا کہنا ہے

زخموں کو یوں بدن پہ لیا جامہ ہوگیا
سر سے کفن لپیٹا تو عمّامہ ہوگیا

خنجر تھا ایک آلۂ قتل ان کے ہاتھ میں
میں نے جب انگلیوں میں لیا خامہ ہوگیا

سب لوگ ان کی زہر فشانی پہ تھے خموش
میں نے زبان کھولی تو ہنگامہ ہوگیا

مہندی کے واسطے وہ لہو مانگتے ہیں روز
دل دینا ان کو جان کا بیع نامہ ہوگیا

صحرا میں جب بھی اُٹھا بگولہ غبار کا
دیوانے کے بدن پر نیا جامہ ہوگیا

اس طرح میرے ساتھ ملی ہے مری غزل
ہر شعر زندگی کا سفر نامہ ہوگیا

اب کیا کلام کیجیے اس دَور میں کلیمؔ
ہر مبتدی تو وقت کا علامہ ہوگیا

درد کی گفتگو بے محل ہی سہی
ہم تو کہتے رہیں گے غزل ہی سہی

عمر صدسالہ بھی بیچ کر لیجیے
درد کی اِک گھڑی ایک پل ہی سہی

قتل گہہ تک پہنچنا بہرحال ہے
پاؤں گر تھک گئے سر کے بل ہی سہی

زندگی ہم کو تنہا گوارہ نہیں
کوئی مہماں تو آئے اَجل ہی سہی

دوست تم کو بنا کر ہی چھوڑیں گے ہم
گر نہیں آج پیارے تو کل ہی سہی

میرا دل بھی ہے آئینہ در آئینہ
ان کی صورت غزل در غزل ہی سہی

مجھ کو صحرا کے جھونکوں میں ہے عافیت
گلستاں کی ہوا معتدل ہی سہی

کچھ اثر ہے تو ابرو پہ بل ہی سہی
میری غزلوں کا ردِّ عمل ہی سہی

کچھ تو سمجھو ہمیں، کچھ تو مانو ہمیں
ہم نشیں ہی سہی ہم بغل ہی سہی

دیر میں رہ کے عاجزؔ مجھے فخر ہے
میں مسلماں تو ہوں بے عمل ہی سہی

کسوٹی دیکھتے ہیں جیسے کندن دیکھنے والے
مجھے پہچان لیتے ہیں میرا فن دیکھنے والے

بہت ہیں شاعری میں رنگ وروغن دیکھنے والے
ادھر آئیں جو ہیں بے ساختہ پن دیکھنے والے

تو اے دِل چاک اپنا چاکِ دِل کس کو دکھائے گا
یہاں جتنے ہیں سب ہیں چاکِ دامن دیکھنے والے

ہوئی رُسوائی جب دیروحرم کے رہنے والوں کی
تماشہ تھے یہی شیخ و برہمن دیکھنے والے

لہو اتنا نکلنے پر بھی اتنا سرخرو کیوں ہے
مرا منہ دیکھتے ہیں اپنا دامن دیکھنے والے

بہاروں کی نظرمیں پھول اور کانٹے برابر ہیں
محبت کیا کریں گے دوست دشمن دیکھنے والے

نئی صبحِ بہاراں سے توقع ان کو کیا کیا تھی
اب آنکھیں مَل رہے ہیں رنگ گلشن دیکھنےوالے

اداؤں سے ارادوں کو چھپایا جا نہیں سکتا
تجھے بھی دیکھ لیں گے تری چلمن دیکھنے والے

بتا ایسی ٹھِک تونے کسی پھوڑے میں دیکھی تھی؟
او میرے دل پہ رکھ کر ہاتھ دھڑکن دیکھنے والے

جنابِ میرؔ اپنے رونے کو بوچھار کہتے تھے
مرے اشکوں کو بھی کہتے ہیں ساون دیکھنے والے

میری محبوبۂ فن کو نہ ہرگز دیکھ پائیں گے
کمر پتلی صُراحی دار گردن دیکھنے والے

بھری بزم میں گیت گانا بھی ہے
اکیلے میں آنسو بہانا بھی ہے

عجب کشمکش میں ہے یہ زندگی
تڑپنا بھی ہے مسکرانا بھی ہے

محبت ہے دل خون کرنے کا کام
یہی دل لگی کا بہانا بھی ہے

وہ ہے دشمنِ دین و ایماں مگر
اسی پر تو ایمان لانا بھی ہے

نہ پوچھ اس کا طرزِ تعلق نہ پوچھ
عداوت بھی ہے دوستانا بھی ہے

گلہ اس کا جاکر کریں تو کہاں
جدھر وہ اُدھر ہی زمانا بھی ہے

بہت تیز ہے اس کا تیرِ نظر
بڑا بے تکلف نشانا بھی ہے

میرا دل ہے ہر دَور کا آئینہ
نیا زخم بھی ہے پرانا بھی ہے

یہ قصّہ ہے میرا مگر بیش و کم
یہی آپ سب کا فسانا بھی ہے

کلیم آؤ محفل میں چھیڑو غزل
جو کچھ دیکھتے ہو دکھانا بھی ہے

مرا دم رہے جب تک یہ ہماہمی رہے گی
نہ مرا گلا رہے گا نہ تری چھری رہے گی

جو ستم رہا رہے گا جو وفا رہی رہے گی
نہ اُدھر کمی رہے گی نہ اِدھر کمی رہے گی

تری مہربانیوں سے کئی بار مرچکا ہوں
ابھی اور بھی مروں گا جو یہ زندگی رہے گی

کبھی آپ زخم دیں گے کبھی ہم غزل کہیں گے
جہاں آپ ہم رہیں گے یہی دل لگی رہے گی

وہ کسی کی انجمن ہو کوئی شمعِ انجمن ہو
جسے ہم لہو نہ دیں گے وہ بجھی بجھی رہے گی

تو سجا بنا کے زُلفیں یوں اکڑ کے کیا چلے ہے
نہ بنی رہی کسی کی نہ تری بنی رہے گی

جہاں تم رہوگے پیارے وہاں دردِ دل رہے گا
جہاں دردِ دل رہے گا وہاں شاعری رہے گی

یہ تو عام میکدہ ہے ترا گھر نہیں ہے ساقی
وہ سبو اٹھا ہی لے گا جسے تشنگی رہے گی

غمِ دل غمِ زمانہ گلے مل گئے ہیں عاجزؔ
جو غزل بھی میں کہوں گا بڑی چاشنی رہے گی

وہ اب بھی جدھر کرتے ہیں نظر میخانے ہی بنتے جاتے ہیں
سب ہوش ہی کھوتے جاتے ہیں دیوانے ہی بنتے جاتے ہیں

مئے سازی کا کچھ احساس نہیں تشنہ دہنوں کا پاس نہیں
شیشے ہی پگھلتے رہتے ہیں پیمانے ہی بنتے جاتے ہیں

ساون کی گھٹا چھاتی ہی نہیں اب فصلِ بہار آتی ہی نہیں
تخلیق غزل ہی ہوتی ہے، افسانے ہی بنتے جاتے ہیں

اربابِ خرد کا کیا کہنا گل میں ہیں گلستانوں میں نہیں
ہم اہلِ جنوں رہتے ہیں جہاں ویرانے ہی بنتے جاتے ہیں

یہ طرز ہے کیا یہ طور ہے کیا یہ عہد ہے کیا یہ دَور ہے کیا
میخوار بگڑتے جاتے ہیں میخانے ہی بنتے جاتے ہیں

کیا پوچھو ہو حالت عاجزؔ کی اب ہوگی بُری گت عاجزؔ کی
ہم جتنا انھیں سمجھاتے ہیں دیوانے ہی بنتے جاتے ہیں

شانے کا بہت خونِ جگر جائے ہے پیارے — تب زُلف کہیں تا بہ کمر جائے ہے پیارے
جس دن کوئی غم مجھ پہ گزر جائے ہے پیارے — چہرہ ترا اس روز نکھر جائے ہے پیارے
بڑھ جائے ہے جس دن میری آشفتگیِ حال — اس دن تری زُلف اور سنور جائے ہے پیارے
اِک گھر بھی سلامت نہیں اب شہرِ وفا میں — تو آگ لگانے کو کدھر جائے ہے پیارے
رہنے دے جفاؤں کی کڑی دُھوپ میں مجھ کو — سائے میں تو ہر شخص ٹھہر جائے ہے پیارے
وہ بات ذرا سی جسے کہتے ہیں غمِ دل — سمجھانے میں اِک عمر گزر جائے ہے پیارے

ہر چند کوئی نام نہیں میری غزل میں
تیری ہی طرف سب کی نظر جائے ہے پیارے

شاعر کے بغیر اس دنیا کا سانچے میں اترنا مشکل ہے
جب تک نہ ہو آگے آئینہ زُلفوں کا سنورنا مشکل ہے
بے جان ہوائے صحن چمن بے کیف سزائے دار و رسن
ہوشیاروں کو جینا مشکل ہے دیوانوں کو مرنا مشکل ہے
اب پیار سے ہم کو مت روکو یہ پیار وہ دریا ہے پیارے
اِک بار جو اس میں ڈوب گیا پھر اس کا اُبھرنا مشکل ہے
اے اہلِ دیار دار و رسن کاہے کو پکارو ہو ہم کو
ہم دور کے جانے والوں کا رستے میں ٹھہرنا مشکل ہے
ہم جس میں ہمیشہ رہتے ہیں دہکی ہوئی غزلیں کہتے ہیں
اُس درد کی بھٹّی سے ہو کر اَوروں کو گزرنا مشکل ہے
اِک دن جو گریباں چاک ہوئے اُس دن سے گریباں چاک ہیں ہم
یہ نشّۂ دردِ دل ہے میاں یہ نشّہ اُترنا مشکل ہے
لیتے جو بہت ہیں نامِ وفا کیا جانیں وہ سرانجامِ وفا
جن کے لیے کہنا آسان ہے ان کے لیے کرنا مشکل ہے

کیا غم ہے اگر شکوۂ غم عام ہے پیارے
تو دل کو دُکھا تیرا یہی کام ہے پیارے
تیرے ہی تبسم کا سحر نام ہے پیارے
تو کھول دے گیسو تو ابھی شام ہے پیارے
اس وقت ترا جانِ جہاں نام ہے پیارے
جو کام تو کر دے وہ بڑا کام ہے پیارے
جب پیار کیا چین سے کیا کام ہے پیارے
اس میں تو تڑپنے ہی میں آرام ہے پیارے
چھوٹی ہے نہ چھوٹے گی کبھی پیار کی عادت
میں خوب سمجھتا ہوں جو انجام ہے پیارے
اے کاش مری بات سمجھ میں تری آئے
میری جو غزل ہے مرا پیغام ہے پیارے

میں ہوں جہاں سوفکر ہیں سورنج ہیں سود رد　　تو ہے جہاں آرام ہی آرام ہے پیارے
گو میں نے کبھی اپنی زباں پر نہیں لایا　　سب جان رہے ہیں ترا کیا نام ہے پیارے
ہم دل کو لگا کر بھی کھٹکتے ہیں دِلوں میں　　تو دل کو دُکھا کر بھی دل آرام ہے پیارے
کہتا ہوں غزل اور رہا کرتا ہوں سرشار
میرا یہی شیشہ ہے یہی جام ہے پیارے

ہے نظر سب کی عرب کیسے عجم کیسے ہیں　　کوئی آئینہ نہیں دیکھتا ہم کیسے ہیں
غمِ مجنوں غمِ فرہاد کا لیتے ہیں جو نام　　اُن کو معلوم نہیں آج کے غم کیسے ہیں
میرے احوال سنو اور پھر اندازہ کرو　　شہر کے اہلِ وفا اہلِ کرم کیسے ہیں
برہمن دیکھ مرے خونِ وفا کی تاثیر　　کل صنم کیسے تھے اور آج صنم کیسے ہیں
وقت کے آئینہ خانے میں ہے چھپنا دُشوار　　سب کو معلوم ہے تم کیسے ہو ہم کیسے ہیں
تلخ ہیں میرے خیالات زباں شیریں ہے　　سخت حیرت ہے کہ یہ دونوں بہم کیسے ہیں
تم تو پھولوں پہ خراماں ہو تمھیں کیا معلوم　　وہ جو انگاروں پر رکھتے ہیں قدم کیسے ہیں
ہم نے اَوروں سے زیادہ لہو چھڑکا ہے کلیؔم
ہم گلستاں میں کسی اور سے کم کیسے ہیں

ظالم وقت نے عاجؔز ہم کو اتنا پیسا کوٹا ہے　　آنکھیں بھی ہیں بھیگی بھیگی دل بھی ٹوٹا ٹوٹا ہے
تازہ اشکوں کا آنکھوں سے پھر جھرنا کیوں پھوٹا ہے　　شاید عاجؔز دل کی ندی کا باندھ کہیں سے ٹوٹا ہے
تھوڑی جدائی سے بھی کسی کی دل پہ بڑا غم ٹوٹا ہے　　ہاتھ بہت دن تک کانپے ہیں جب کوئی دامن چھوٹا ہے
دل میں جو سامان بھرا تھا سب ٹوٹا سب پھوٹا ہے　　دردنے ہم کو چور کیا ہے پیارے نے ہم کو لوٹا ہے
عشق و محبت کی دُنیا میں بات بنانا مشکل ہے
دل کی کسوٹی کہہ دیتی ہے کیا سچّا کیا جھوٹا ہے

گزر کرنا یہاں آساں نہیں ہے ۔۔۔ یہ دُنیا کوچۂ جاناں نہیں ہے
محبت پر جسے ایماں نہیں ہے ۔۔۔ فرشتہ ہو تو ہو انساں نہیں ہے
یہی دیتا ہے جینے کا سلیقہ ۔۔۔ دلِ ناداں دلِ ناداں نہیں ہے
دلِ پُردرد و چشمِ نم سلامت ۔۔۔ یہ ساماں ہے تو کم ساماں نہیں ہے
کہیں گے اور مکرر ہم کہیں گے ۔۔۔ وفا تجھ میں نہیں ہے ہاں نہیں ہے
ہر اِک مشکل کا حل دیوانگی ہے ۔۔۔ مگر دیوانگی آساں نہیں ہے
چمن میں گل ہی کم ہیں رنج یہ ہے ۔۔۔ ملالِ تنگیِ داماں نہیں ہے

کلیمؔ آخر نکالا جائے ہے کیوں؟
یہ اہلِ خانہ ہے مہماں نہیں ہے

دمِ شمشیر پر سر ہے تو کیا ہے ۔۔۔ یہی اپنا مقدر ہے تو کیا ہے
اسے پھولوں کا پیراہن مبارک ۔۔۔ یہاں کانٹوں کا بستر ہے تو کیا ہے
گزرتی رہتی ہے ہر دن قیامت ۔۔۔ اگر اِک روزِ محشر ہے تو کیا ہے
دِیا ہے دل تو کیا گردن نہ دیں گے؟ ۔۔۔ اگر قاتل ہے وہ دلبر تو کیا ہے
یہ ثابت ہے کہ اہلِ ظرف ہم ہیں ۔۔۔ شراب اس کو میسر ہے تو کیا ہے
حرم والوں کے تیور کہہ رہے ہیں ۔۔۔ کہ وہ کافر ستمگر ہے تو کیا ہے
نکل آئے گا کوئی کوہکن بھی ۔۔۔ کلیجہ اس کا پتھر ہے تو کیا ہے
سبھی شکوہ بلب ہیں انجمن میں ۔۔۔ یہ بندہ بندہ پرور ہے تو کیا ہے

بہت ہوں گے کلیمؔ اس مشغلے میں
تمھارا ہاتھ دل پر ہے تو کیا ہے

بہار و باغ کے کس راز کا محرم نہیں نکلا
قبائے گل سے میرا چاک دامن کم نہیں نکلا

غزل کالے کے اس انداز سے پرچم نہیں نکلا
ہم اہلِ غم کے ایسا کوئی اہلِ غم نہیں نکلا

لہو شانے کی زخمی انگلیوں سے کم نہیں نکلا
مگر اب تک تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں نکلا

حرم میں آ کے یہ کمبخت نامحرم نہیں نکلا
لہو نکلا بہت آنکھوں سے دل سے غم نہیں نکلا

تجھے ہر دَور میں ہم رونے والوں نے سنوارا ہے
تو کب اشکوں کے گھنگھرو باندھ کر چھم چھم نہیں نکلا

تری تلوار نے تو کچھ کمی باقی نہیں رکھی
مگر وہ سخت جاں ہم ہیں کہ اب تک دم نہیں نکلا

میرے زخمِ جگر کو دیکھنے والے بہت نکلے
کوئی زخموں پہ رکھنے کے لیے مرہم نہیں نکلا

چھلکا دیا تو بادۂ گلفام کیوں لیا
پینے کا جب شعور نہ تھا جام کیوں لیا

ہم اہلِ دل کی بزم میں تم شمع کیوں بنے
بے درد ہو تو درد کا یہ کام کیوں لیا

تم ہی نے پیارے چوٹ بھی کس کر لگائی ہے
پھر تم ہی پوچھتے ہو کہ دل تھام کیوں لیا

اہلِ ہوس کو مجھ سے اس بات کا ہے رنج
کمبخت نے وفا کا یہاں نام کیوں لیا

اس کے عوض بھی کوئی غزل کہہ کے دیجیے
کانٹوں پہ بھی وہ کہتے ہیں آرام کیوں لیا

غم ٹوٹنے کا ہوتا نہ چھن جانے کا ملال
چلّو تو اپنے ہاتھ میں تھا جام کیوں لیا

تھی دوستی تو خاک نشیں ہم کو چھوڑ کر
تم نے مقامِ اپنا سرِ بام کیوں لیا

پہلے تو شاعری کا بڑا شوق تھا کلیؔم
اب سوچتے ہیں ہم کہ یہ الزام کیوں لیا

اے کاش کلیؔم آتا اِک گیت سنا جاتا
جی اپنا بہل جاتا کمبخت کا کیا جاتا

یہ فن اُسے آتا ہے یہ فن ہی دِکھا جاتا
کچھ دیر ترنم سے رو دھو کے چلا جاتا

اپنے تو وہ جانے ہے ہم کو بھی بتا جاتا
کیا چیز ہے دل آنا دل کیسے ہے آجاتا

پوچھو ہو جو تم ہم سے رونے کا سبب پیارے
ہم کا ہے نہیں کہتے گر ہم سے کہا جاتا

گزری ہے جو کچھ ہم پر گر تم پہ گزر جاتی
تم ہم سے اگر کہتے ہم سے نہ سنا جاتا

دل ہے نہ زباں باقی کیوں رکھی ہے جاں باقی
زخم اتنے لگائے تھے اِک اور لگا جاتا

ہوتی ہے غزل عاجؔز جب درد کا افسانہ
کہتے بھی نہیں بنتا چُپ بھی نہ رہا جاتا

یہ رنگ اشکوں کا جو لال لال ہے پیارے
بتا رہا ہے کہ کیا دل کا حال ہے پیارے

سجا ہوا جو تیرا بال بال ہے پیارے
زمانہ اور بھی آشفتہ حال ہے پیارے

اب اور چاہیے سامان کیا غزل کے لیے
میں خوش بیان ہوں تو خوش جمال ہے پیارے

خبر نہ تھی کہ میری اتنی قدر و قیمت ہے
مجھے مٹا کے تو کتنا نہال ہے پیارے

وہی تو عمر میرے درد دل کی بھی ہوگی
تیرے شباب کا یہ کون سال ہے پیارے؟

سنا ہے جلتے ہی رہنا ہے زندگی دل کی
تو صبح و شام کا پھر کیا سوال ہے پیارے

میرے علاوہ بھی ہیں تجھ کو چاہنے والے
یہ واقعہ نہیں تیرا خیال ہے پیارے

فضائے چرخ پہ اُڑنا کوئی بڑائی نہیں
کسی کے دل میں اُترنا کمال ہے پیارے

نہ جانے کیا کیا سکھاتے پڑھاتے رہتے ہیں
وہ لوگ جن سے تیری بول چال ہے پیارے

ابھی کلیؔم کو پہچانتا نہیں کوئی
یہ اپنے وقت کی گدڑی میں لال ہے پیارے

کچھ اور ہم اے غنچہ دہن چاہتے نہیں — دو پھول چاہتے ہیں چمن چاہتے نہیں
ہے احتیاط اس لیے اظہارِ درد میں — ہم آپ کی جبیں پہ شکن چاہتے نہیں
ورنہ ہمیں ان اہلِ ہوس میں نہ جانیو — جو امتحانِ دارورسن چاہتے نہیں
پیالے میں کچھ تو چاہیے دو گھونٹ ہی سہی — ہم تشنہ کام گنگ و جمن چاہتے نہیں
شیریں زباں ہیں آپ تو کیا فائدہ ہمیں — ہم پیار چاہتے ہیں سخن چاہتے نہیں
مشکل نہیں ہے اور حسینوں کو چاہنا — لیکن یہ ہم اے مشفقِ من چاہتے نہیں
یہ کاروبارِ درد عجب کاروبار ہے — فن دے رہے ہیں قیمتِ فن چاہتے نہیں

خونِ جگر سے چاہیے سنوری ہوئی غزل
مہندی بغیر لوگ دُلہن چاہتے نہیں

تو جب سے ساقیِ خوش انتظام ہے پیارے — نہ میرے پاس سبو ہے نہ جام ہے پیارے
دل وجگر کے ہیں قندیل آنسوؤں کے چراغ — تری گلی میں بڑا اہتمام ہے پیارے
ترے زمانے سے پہلے تھا اس کا نام لہو — اب اس کا نام مئے لالہ فام ہے پیارے
خزاں کا دَور تری بے رُخی کو کہتے ہیں — بہار تیری توجہ کا نام ہے پیارے
مخاطبت تو ہے لیکن مزا نہیں آتا — میں زیرِ بام تو بالائے بام ہے پیارے
یہ دور وہ ہے کہ ہر راہزن کے قامت پر — لباسِ خضر علیہ السلام ہے پیارے
میں کیسے کہہ دوں کہ اب زخمِ دل نہ دے مجھ کو — ابھی تو میری غزل ناتمام ہے پیارے

زمانہ دادِ سخن دے یہ آرزو ہی نہیں
کلیمؔ کو تو تجھی سے کلام ہے پیارے

ڈگمگاتا ہے لڑکھڑاتا ہے ۔۔۔ دل کو تھامے یہ کون آتا ہے
ہائے بیچارے کو خبر ہی نہ تھی ۔۔۔ پیار میں دل بھی ٹوٹ جاتا ہے
اُن کا غم جاں کا غم جہاں کا غم ۔۔۔ کس قدر بوجھ دل اُٹھاتا ہے
رات دن صبح شام کا رونا ۔۔۔ اتنا آنسو کہاں سے آتا ہے
آدمی دانا ہے نہ دیوانہ ۔۔۔ وقت جو چاہے سو بناتا ہے
شہر خالی ہوا نہ قاتل سے ۔۔۔ ایک جاتا ہے ایک آتا ہے
جان دے دیتے ہیں محبت میں ۔۔۔ بس یہی کام ہم کو آتا ہے
جو بھی سنتا ہے سرگزشتِ کلیؔم
داستاں اپنی بھول جاتا ہے

بڑے خلوص سے محفل میں جام آیا ہے ۔۔۔ کہ آج دُور سے اِک تشنہ کام آیا ہے
چلو سخنورو بزمِ مشاعرہ کہ وہاں ۔۔۔ کلیم عاجؔزِ شیریں کلام آیا ہے
جہاں جہاں بھی وہ پہنچا جہاں جہاں بھی گیا ۔۔۔ غزل کا جادو جگاکر تمام آیا ہے
تمام شہر کے پیاسوں کو دو خبر کہ وہ آج ۔۔۔ غزل میں لے کے محبت کا جام آیا ہے
قفس میں چھوڑ کے آئے ہیں جن کو اہلِ چمن ۔۔۔ اُنھی کا لے کے پیام و سلام آیا ہے
جگر پہ چوٹ جنھیں ہر قدم پہ لگتی ہے ۔۔۔ اُنھیں شکستہ دِلوں کا امام آیا ہے

(ق)

تمام لالۂ وگل خوب جانتے ہیں اُسے ۔۔۔ اُسی کا خونِ جگر سب کے کام آیا ہے
مگر اُٹھاکے جو تاریخ گلستاں دیکھو ۔۔۔ نہ ذکر ہے نہ کہیں اُس کا نام آیا ہے
وہی کلیؔم سنانے غزل کے پردے میں ۔۔۔ حکایتِ ستم صبح و شام آیا ہے
غلط ہی کہتے ہیں لیکن یہ لوگ کہتے ہیں
جنابِ میؔر کا قائم مقام آیا ہے

موسمِ گل ، ہمیں جب یاد آیا　　جتنا غم بھولے تھے سب یاد آیا
اُن سے ملنا ہمیں یاد آیا　　شعر یاد آئے ادب یاد آیا
دل بھی ہوتا ہے لہو، یاد نہ تھا　　جب لہو ہوگیا تب یاد آیا
دُشمنی ایسی نہ کرتا دُشمن　　وہ مرا دوست تھا اب یاد آیا
دیکھیں یاد آئے سحر تک کیا کیا　　آج وہ اوّلِ شب یاد آیا
اس کا منظورِ نظر تھا کم بخت　　دل بھی یاد آیا وہ جب یاد آیا
نہ گریباں ہے نہ دامن ہے نہ جیب　　ہائے پھولوں کو میں کب یاد آیا
تم نہ تھے یاد تو کچھ یاد نہ تھا　　تم جو یاد آئے تو سب یاد آیا
جب بھی ہم بیٹھے غزل کہنے کو　　شاعری کا وہ سبب یاد آیا

جس کا یاد آنا غضب ہے عاجزؔ
پھر وہی ہائے غضب یاد آیا

مری لَے سے لَے وہ ملائیں گے کیا　　جو روئے نہیں ہیں وہ گائیں گے کیا
خزاں میں تڑپنا نہ آیا جنھیں　　بہاروں میں وہ مسکرائیں گے کیا
جنھیں چوٹ دل پر لگی ہی نہیں　　مرا دردِ دل آزمائیں گے کیا
جنھوں نے اُجاڑا نہیں اپنا گھر　　وہ اَوروں کی بستی بسائیں گے کیا
ہم اہلِ وفا ہیں وہ اہلِ ستم　　وہ ہم سے نگاہیں ملائیں گے کیا
محبت ہی جب درمیاں میں نہیں　　وہ آئیں گے کیا ہم بلائیں گے کیا

اگر ہم نہ دیں اپنا خونِ جگر
وہ ہاتھوں میں منہدی لگائیں گے کیا

نہ پوچھ کیوں میرے لب پر ہنسی نہیں پیارے
یہ زندگی ہے کوئی دل لگی نہیں پیارے

حکایتیں تو بہاروں کی خوب سنتے ہیں
ہوا بہار کی اب تک چلی نہیں پیارے

چراغ کی تو ہر اِک حال میں ضرورت ہے
کہ چاندنی تو کبھی ہے کبھی نہیں پیارے

تعلقات تو اب ہیں برائے نام مگر
تکلّفات میں کوئی کمی نہیں پیارے

ترے سوا میں کسی اور پر غزل لکھوں
کبھی نہیں مرے پیارے کبھی نہیں پیارے

اسی لیے تو زمانہ بھی انتشار میں ہے
کہ تیری زُلف ابھی تک سجی نہیں پیارے

ہر اِک قدم پہ تجھے آئینہ دکھاؤں گا
کہ میرے پاس غزل کی کمی نہیں پیارے

میں جامہ پوش نہیں چاک پیرہن ہی سہی
یہ بات قابلِ شرمندگی نہیں پیارے

یہ آدمیوں کا شہر اور اتنا سناٹا
کہ دور دور کہیں آدمی نہیں پیارے

کلیمؔ کب کا تری بزم سے نکل جاتا
یہ کیا کرے کہ نکلنے کا جی نہیں پیارے

جوانی میں تھا کیا اس شوخ کا عالم نہ بھولیں گے
زمانہ بھول جائے بھول جائے ہم نہ بھولیں گے

دیا ہے تم نے غم ایسی ادا سے اس سلیقے سے
کہ سب کچھ بھول جائیں گے تمھارا غم نہ بھولیں گے

یہی تاریخ کہتی ہے یہی حالات کہتے ہیں
عداوت تم نہ بھولوگے محبت ہم نہ بھولیں گے

بھلا ہم کیسے بھولیں گے ترے گیسوئے برہم کو
مگر ہم کو بھی تیرے گیسوئے برہم نہ بھولیں گے

ترے آنے پہ جو گزری قیامت یاد ہے سب کو
ترا جانا جو برپا کرگیا ماتم نہ بھولیں گے

غم آگے ہے غم پیچھے غم دائیں ہے غم بائیں
ایسے میں کہاں جائیں آ کوئی غزل گائیں

دونوں ہیں ہنر والے دکھلائیں ہنر آئیں
وہ اپنی چھری کھینچیں ہم اپنی غزل گائیں

افسانۂ غم اپنا گر ہم کبھی دہرائیں
پتھر کے جگر والے دل تھام کے رہ جائیں

اللہ کرے پوری ان کی یہ تمنّائیں
ہم اور پریشاں ہوں وہ اور سنور جائیں

گل ان کے چمن ان کا ہاں سیر کریں آئیں
رنگت بھی وہی لوٹیں خوشبو وہی لے جائیں

جن کو یہاں رہنا ہے ہر حال میں جلنا ہے
جو شمع نہیں بنتے محفل سے نکل جائیں

راتیں ہوں بسر یونہی دن یوں ہی گزر جائیں
زُلف اپنی وہ اُلجھائیں ہم بیٹھ کے سلجھائیں

یہ ستم کی محفلِ ناز ہے کلیؔم اس کو اور سجائے جا
وہ دِکھائیں رقصِ ستمگری تو غزل کا ساز بجائے جا

جو اکڑ کے شان سے جائے ہے پیار سے یہ بتائے جا
کہ بلندیوں کی ہے آرزو تو دِلوں میں پہلے سمائے جا

وہ جو زخم دیں سو قبول ہے تیرے واسطے وہی پھول ہے
یہی اہلِ دل کا اصول ہے وہ رلائے جائیں تو گائے جا

تیرا سیدھا سادہ بیان ہے تیری ٹوٹی پھوٹی زبان ہے
تیرے پاس ہیں یہی ٹھیکرے تو محل انھیں سے بنائے جا

وہ جفا شعار و ستم ادا تو سخن طراز و غزل سرا
وہ تمام کانٹے اُگائیں گے تو تمام پھول کھلائے جا

کوئی لاکھ زہرہ جبین ہے جسے چاہیں ہم وہ حسین ہے
کلیؔم اُس سراپا غرور کو ذرا آئینہ تو دکھائے جا

جگہ دل میں خالی کدھر ہے میاں ۔۔۔ تمام اس کا زخمِ نظر ہے میاں
جہاں تک کہ ہم کو خبر ہے میاں ۔۔۔ وہ فتنہ بڑا فتنہ گر ہے میاں
وہ بیٹھا ہوا اپنے گھر ہے میاں ۔۔۔ زمانہ اِدھر سے اُدھر ہے میاں
یہاں جس کی گردن پہ سر ہے میاں ۔۔۔ چھری اس کے پیشِ نظر ہے میاں
جو کل درد والوں سے آباد تھی ۔۔۔ بتا اب وہ بستی کدھر ہے میاں
اسے خوشبوؤں کا مکاں مت سمجھ ۔۔۔ محبت تو کانٹوں کا گھر ہے میاں
رُلاوے بھی ہے گدگداوے بھی ہے ۔۔۔ عجب چیز دردِ جگر ہے میاں
اُسے اپنے دامن سے مت پونچھیو ۔۔۔ یہ آنسو نہیں ہے شرر ہے میاں

محبت ہے رستہ مسافر ہے دِل
غزل اس کی گردِ سفر ہے میاں

جب تک ہم اہلِ درد پکارے نہ جائیں گے ۔۔۔ گیسو ترے کسی سے سنوارے نہ جائیں گے
بازیٔ وفا کی ہار کے پیارے نہ جائیں گے ۔۔۔ کیا دن ترے ستم کے گزارے نہ جائیں گے
ٹھہرے ہوئے ہیں پلکوں پہ آنسو اسی لیے ۔۔۔ بے روشنی کیے یہ ستارے نہ جائیں گے
دریائے غم میں پانی اگرچہ ڈباؤ ہے ۔۔۔ ہم ڈوبنے کے ڈر سے کنارے نہ جائیں گے
یہ شہسوارِ وقت ہیں اتنا نشے میں چور ۔۔۔ گر جائیں گے اگر یہ اُتارے نہ جائیں گے
پوچھے نہیں ہے آج جنھیں کوئی دیکھنا ۔۔۔ کل یہ کہاں کہاں سے پکارے نہ جائیں گے

کرتے رہو کلیمؔ اشاروں میں گفتگو
جب تک غزل رہے گی اشارے نہ جائیں گے

میرے پیارے او مرے زُلف پریشاں والے
تجھ کو سمجھاتے رہے چاک گریباں والے

اُن سے مت کھنچو کہ نازک ہے بہت اُن کا مزاج
یہ غمِ دل ، غمِ دوراں ، غمِ جاناں والے

یہ جو کہہ دیتے ہیں اکثر وہی ہو جاتا ہے
یہ شکستہ دل و احوالِ پریشاں والے

جیب و دامن پہ نہ کر ناز کہ اِس گلشن میں
کبھی محروم چلے جاتے ہیں داماں والے

تنکے والے تہہِ دریا سے اُبھر آتے ہیں
ڈوب جاتے ہیں بھنور میں کبھی طوفاں والے

وقت نے لوٗٹ لیا لوٹنے والوں کو کبھی
ہوگئے بے سروساماں سروساماں والے

رنگ ایسا کبھی موسم کا بدل جاتا ہے
گلستاں والوں پہ ہنستے ہیں بیاباں والے

چارہ فرما کبھی بیمار بھی ہو جاتے ہیں
درد والے کبھی بن جاتے ہیں درماں والے

شہر کے شہر کی ہے بھیڑ کبھی اور کبھی
ساتھ جاناں کے نہیں کوچۂ جاناں والے

سن کے فرمانے لگے کیا یہ انھیں کی ہے غزل
وہ جو پٹنہ میں ہیں اِک چاک گریباں والے

زخموں کے نئے پھول کھلانے کے لیے آ
پھر موسمِ گل یاد دلانے کے لیے آ

مستی لیے آنکھوں میں بکھیرے ہوئے زُلفیں
آ پھر مجھے دیوانہ بنانے کے لیے آ

اب لطف اسی میں ہے مزا ہے تو اسی میں
آ اے مرے محبوب ستانے کے لیے آ

آ رکھ دہن زخم پہ پھر انگلیاں اپنی
دل بانسری تیری ہے بجانے کے لیے آ

ہاں کچھ بھی تو دیرینہ محبت کا بھرم رکھ
دل سے نہ آ دُنیا کو دِکھانے کے لیے آ

مانا کہ مرے گھر سے عداوت ہی تجھے ہے
رہنے کو نہ آ آگ لگانے کے لیے آ

پیارے تیری صورت سے بھی اچھی ہے جو تصویر
میں نے تجھے رکھی ہے دِکھانے کے لیے آ

آشفتہ کہے ہے کوئی دیوانہ کہے ہے
میں کون ہوں دُنیا کو بتانے کے لیے آ

کچھ روز سے ہم شہر میں رُسوا نہ ہوئے ہیں
آ پھر کوئی الزام لگانے کے لیے آ

اب کے جو وہ آجائے تو عاجؔز سے لے کر
محفل میں غزل اپنی سنانے کے لیے آ

پھر وہ غارت گرِ جان و جگر و دل آیا
لو مبارک ہو مبارک ہو کہ قاتل آیا

چھوٹ کر جس کے مظالم سے بمشکل آیا
اسی ظالم پہ مرا ٹوٹ کے پھر دل آیا

ہو کے بسمل جو گیا ہونے کو بسمل آیا
یہ سلیقہ تجھے کیوں کر مرے قاتل آیا

درد پہنچانے کا جب کام ہوا اُس کے سپرد
مری تقدیر میں بھی درد بھرا دل آیا

تو جو آیا تو پھر آباد ہوئی بزمِ غزل
میرا اندازِ سخن بھی تیرے شامل آیا

پھر آ رہے ہیں وہ فضا گرمائی جائے گی
پھر زُلف کھولی جائے گی لہرائی جائے گی

ہوگی ہر اِک طرف لب و عارض کی گفتگو
پھر اُن کے عاشقوں میں غزل گائی جائے گی

دیوانے لائے جائیں گے زنداں میں دھوم سے
زنجیر اہتمام سے پہنائی جائے گی

کیا کیا شرابِ خونِ جگر کا چلے گا دَور
پی جائے گی کہیں، کہیں چھلکائی جائے گی

روزانہ دل پہ زخم لگایا بھی جائے گا
روز اِک غزل بھی ہم سے کہلوائی جائے گی

کیا کیا نہ اپنا جاچکا کیا کیا نہ جائے گا
اُن کی بہت بہت تو اِک انگڑائی جائے گی

صدسالہ دورِ چرخ گزر جائے گا مگر
اُن کے شباب کی نہ توانائی جائے گی

اُن سے ہے اتنا پیار تو کچھ بات ہے ضرور
لیکن وہ بات ہم سے نہ سمجھائی جائے گی

اے شمع میرا درد سمجھ میں تب آئے گا
جب تو بھی انجمن سے نکلوائی جائے گی

جب لوگ سن کے میری غزل جائیں گے کلیمؔ
بجتی ہوئی خیالوں میں شہنائی جائے گی

ہم زخمِ جگر ان کو دِکھانے میں لگے ہیں
وہ زُلف میں آئینے میں شانے میں لگے ہیں

ہم خانماں برباد چمن چھوڑ کے سب کام
کانٹوں سے رگِ گل کو بچانے میں لگے ہیں

گنتی تو نہیں یاد مگر یاد ہے اتنا
سب زخم بہاروں کے زمانے میں لگے ہیں

پیارے وہی ٹکڑے ہیں مرے شیشۂ دل کے
جو آج تیرے آئینہ خانے میں لگے ہیں

جس روز سے تو آئی ہے اے فصلِ بہاراں
ہم تیری کہانی ہی سنانے میں لگے ہیں

کب دیکھئے تیار ہو ہم خونِ جگر سے
اِک شوخ کی تصویر بنانے میں لگے ہیں

الزام سے کیا ڈریئے کہ ہم اہلِ وفا پر
الزام تو ہر اِک زمانے میں لگے ہیں

دیوانۂ گل کون بنے موسمِ گل میں
سب لوگ تو زنجیر بنانے میں لگے ہیں

غزل سے چاک دل کی بخیہ کاری کون جانے ہے؟
جو ہم جانے ہیں ایسی وضع داری کون جانے ہے؟

ہے کتنی مہرباں فصلِ بہاری کون جانے ہے؟
چمن میں کیسے گزرے ہے ہماری کون جانے ہے؟

چلی آتی ہے بس رونے کی فرمائش پہ فرمائش
کہاں جائے گی اشکوں کی سواری کون جانے ہے؟

لگیں گے کس دُلہن کی مانگ میں سیندور کیا کہیے
کہاں ہوگی لہو سے لالہ کاری کون جانے ہے؟

رگِ گل کس طرح دیتی ہے پھانسی کون سمجھے گا
بنے ہے شاخِ گل کیسے کٹاری کون جانے ہے؟

کسی بے درد سے ہم نے وفا کا کھیل کھیلا تھا
وہ بازی کس نے جیتی کس نے ہاری کون جانے ہے؟

ہم اُن زُلفوں کے زنجیری ہیں یہ تو سب سمجھتے ہیں
مگر زنجیر ہلکی ہے کہ بھاری کون جانے ہے؟

اس آشوبِ جہاں میں سب منائیں خیریت اپنی
کب آ جائے گی پیارے کس کی باری کون جانے ہے؟

ابھی ہم خاک پر بیٹھے ہیں لیکن وقت آنے دو
زمانہ دیکھ لے گا شہسواری کون جانے ہے؟

غزل ہی کو گلے لپٹا کے رولیتے ہیں ہم عاجؔز
کہاں غم لے کے جائیں غمگساری کون جانے ہے

مری ہر غزل کے رُباب سے یہ نکل رہی ہے صدائے دل
تو کسی کا دل نہ دُکھائیو کوئی جتنا تیرا دُکھائے دل
اُسے کیا سلیقۂ گفتگو جو پھرے ہے اپنا بچائے دل
وہ کلیمؔ جیسی غزل کہے جو کلیمؔ جیسا بنائے دل
بڑی ٹوٹیں دل پہ مصیبتیں بہت آئی دل پہ بلائے دل
مگر اب تک اپنی زبان سے کبھی یہ نہ نکلا کہ ہائے دل
وہی میرا دشمنِ جان و دل جو گیا ہلا کے بنائے دل
اسی دُشمنِ دل و جان کو میری ہر غزل ہے دعائے دل
جو بلائے ہے مجھے بزم میں جو سنے ہے میری نوائے دل
وہ کہے ہے جھوم کے شوق میں کوئی کاش ہم سے لگائے دل
مجھے جس حسین سے پیار ہے مرا پہلا پہلا جو یار ہے
اُسے سب ملا ہے بجائے دل یہاں کچھ نہیں ہے سوائے دل
تمام اہلِ درد سے جا کہو کہ سنو ہماری غزل سنو
ہمیں دردِ دل کے مریض ہیں ہمیں بانٹتے ہیں دوائے دل

یہ تو نہیں کہ خونِ تمنّا نہ کر سکے
ہاں جتنا چاہتے تھے وہ اُتنا نہ کر سکے
ہم سے زیادہ کس نے کیا احترامِ حسن؟
لیکن وقارِ عشق کو رُسوا نہ کر سکے
اُن کے حضور پیشکشِ ہدیۂ وفا
جو اُن کا حق تھا اس سے زیادہ نہ کر سکے
کرتے رہے امید تو ان سے تمام عمر
یہ اور بات ہے کہ بھروسا نہ کر سکے
اِک ہم وطن سے ہم وطنی کا معاملہ
جیسا وہ کر رہے ہیں ہم ایسا نہ کر سکے
ہم بھی تو وضع دار ہیں وہ بے وفا سہی
دل دے کے واپسی کا تقاضا نہ کر سکے
یہ سوچ کر ہے ان کو ہماری غزل پسند
وہ پیار کیا کرے گا جو شکوا نہ کر سکے

کہاں ہے صحن کہاں بامِ دور نہیں جانا
جلا کچھ ایسا کہ پھر ہم نے گھر نہیں جانا

وفا پہ مرتے ہی رہنا ٹھہر نہیں جانا
کچھ اور اس کے سوا عمر بھر نہیں جانا

قصور اُس کا ہے قاتل نے گر نہیں جانا
چھری کو ہم نے چھری سر کو سر نہیں جانا

خودی کی موت ہے یہ دیکھ مر نہیں جانا
جدھر چلے ہے زمانہ اُدھر نہیں جانا

گئے چمن میں تو کانٹے پکار کر بولے
بچا کے جیب و گریباں گزر نہیں جانا

سلیقہ آ ہی گیا میرے شیشۂ دل کو
غموں سے ٹوٹنا لیکن بکھر نہیں جانا

میں جس کا درد لیے جس کے ساتھ ساتھ رہا
اُسی نے مجھ کو شریکِ سفر نہیں جانا

مت بُرا اُس کو کہو گرچہ وہ اچھا بھی نہیں
وہ نہ ہوتا تو غزل میں کبھی کہتا بھی نہیں

جانتے تھے وہ ستمگر ہے مگر کیا کیجے
دل لگانے کے لیے اور کوئی تھا بھی نہیں

وہی ہوگا جو ہوا ہے جو ہوا کرتا ہے
میں نے اس پیار کا انجام تو سوچا بھی نہیں

ہائے کیا دل ہے کہ لینے کے لیے جاتا ہے
اس سے پیمانِ وفا جس کا بھروسہ بھی نہیں

کیا کرشمہ ہے کہ پامال ہیں سب خاک نشیں
اور وہ کہتا ہے کہ میں بام سے اترا بھی نہیں

جیسا بے درد ہے وہ پھر بھی ہے جیسا محبوب
ایسا کوئی نہ ہوا اور کوئی ہوگا بھی نہیں

تحفہ زخموں کا مجھے بھیج دیا کرتا ہے
مجھ سے ملتا نہیں لیکن مجھے بھولا بھی نہیں

مرے اشعار وہ سن سن کے مزے لیتا رہا
میں اسی سے ہوں مخاطب وہ یہ سمجھا بھی نہیں

مرے وہ دوست مجھے دادِ سخن کیا دیں گے
جن کے دل کا کوئی حصہ ذرا ٹوٹا بھی نہیں

مجھ کو بننا پڑا شاعر کہ میں اپنا غمِ دل
ضبط بھی کر نہ سکا پھوٹ کے رویا بھی نہیں

میں اسی کے واسطے پامال ہوا خاک ہوا
اور اُس نے کبھی منہ پھیر کے دیکھا بھی نہیں

شاعری جیسی ہو عاجزؔ کی بھلی ہو کہ بُری
آدمی اچھا ہے لیکن بہت اچھا بھی نہیں

اِس کے سوا اَوروں کی سن کر خود کو رُسوا مت کرنا
دل کی ہر اِک دھڑکن کہہ دے گی کیا کرنا کیا مت کرنا

مشعلِ جاں روشن کرنے میں شام سویرا مت کرنا
جلنے کا جب وقت آ جائے کوئی بہانہ مت کرنا

خونِ تمنّا سے مت ڈرنا ترکِ تمنّا مت کرنا
گھر میں اندھیرا ہو تو بلا سے شہر اندھیرا مت کرنا

اُن سے محبت کرنا لیکن حد سے زیادہ مت کرنا
ہم نے جیسا حال کیا ہے اپنا ، ایسا مت کرنا

ہم نہ رُکے گو شہر کے سارے لوگ ہمیں سمجھاتے رہے
عشق کی منڈی میں مت جانا درد کا سودا مت کرنا

آخر میں یہ بات بھی کہہ دیں تم ہو نازک لوگ میاں
شعر ہمارے پڑھتے رہنا کام ہمارا مت کرنا

ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا اِک دن دھوکا کھاؤ گے
سب کو تم عاجزؔ نے سمجھنا سب پہ بھروسا مت کرنا

وہ جس پہ تیرا مسلسل عتاب ہے پیارے
یہی وہ عاجزِ خانہ خراب ہے پیارے

اسی لیے تو بہرحال چاہتا ہوں تجھے
سنا ہے عشق بھی کارِ ثواب ہے پیارے

یہ میں بتاؤں گا ، میرا لہو بھرا دل ہے
کہ تیرے ہاتھ میں جام شراب ہے پیارے

غموں نے بیچا غموں نے مجھے خرید لیا
یہ میری زیست کا لبّ لباب ہے پیارے

چمن میں نام ہے تاریخ فصلِ گل جس کا
وہ تیرا قصّہ عہدِ شباب ہے پیارے

سنبھال کر مرا مجموعۂ غزل رکھنا
اسی میں تیرا حساب و کتاب ہے پیارے

کلیمؔ کو تیرے غم نے بنا دیا عاجزؔ
یہ میرا نام نہیں ہے خطاب ہے پیارے

نغمہ خواں بھی ہوں ترا شکوہ سرا بھی تیرا
میں گر اچھا بھی ہوں تیرا ہوں بُرا بھی تیرا

تجھے معلوم ہے یہ ہاں تجھے معلوم ہے یہ
ترا دیوانہ ہوں دیوانہ رہا بھی تیرا

شہر میں جتنے جفا کار ہیں سب تیرے ہیں
اور یہ کمبخت گنہگارِ وفا بھی تیرا

فرشِ گل پر او نزاکت سے گزرنے والے!
اسی گلشن میں ہے اِک آبلہ پا بھی تیرا

مجھ کو کیا عذر ہے جو تجھ کو پسند آ جائے
خونِ دل بھی ہے ترا رنگِ حنا بھی تیرا

ایک آفت تھا، نہیں بلکہ قیامت کہیے
حسن کا دَور جو آیا بھی گیا بھی تیرا

آ پھر اِک بار کہ آباد ہو پھر بزمِ غزل
پیار بھی تجھ کو کروں اور گلہ بھی تیرا

مرے اشعار کے سانچے میں اُتر آیا ہے
حسنِ لہجہ بھی ترا حسنِ ادا بھی تیرا

پیرہن والے ذرا فصلِ جنوں آنے دے
چاک ہو جائے گا دامانِ قبا بھی تیرا

تیرے ابرو پہ مگر بل نہیں آیا عاجؔز
دل کچل بھی گیا ٹوٹا بھی جلا بھی تیرا

اُن کے سب غم دُور ہوئے
اور ہم چکنا چور ہوئے

درد سے جب بھرپور ہوئے
تب شاعر مشہور ہوئے

ہنسنے کا تھا شوق بہت
رونے پر مجبور ہوئے

پچھلے جتنے قاتل تھے
سب منصف مامور ہوئے

اِک آئینہ بننے میں
کتنے شیشے چوُر ہوئے

جتنا چمن کا پاس کیا
پھولوں سے ہم دُور ہوئے

اب تو ہمیں ہیں سنگ گراں
سارے پتھر دُور ہوئے

عاجؔز تم کس برتے پر
میرِ غزل مشہور ہوئے

سجایا ہے سلیقے سے لہو ہر دل کا کیا کہنا
ترا اے دوست کیا کہنا تری محفل کا کیا کہنا

اب اس کے حال کا کیا کہنا مستقبل کا کیا کہنا
سراپا درد بن کر رہ گیا ہے دل کا کیا کہنا

یہ دل آباد جب ہوگا تو کیا عالم رہا ہوگا؟
جو حال اب بھی ہے اِس اُجڑی ہوئی محفل کا کیا کہنا

جہاں میں جتنے معشوقِ پری پیکر بھی گزرے ہیں
وہ سب قاتل ہی تھے لیکن مرے قاتل کا کیا کہنا

غزل کیا خوب ہے کہتے ہیں سب اور ہم یہ کہتے ہیں
کہ جس دل سے یہ نکلی ہے غزل اُس دل کا کیا کہنا

جہاں ہم ہوں گے عاجؔز محفلِ شعر و غزل ہوگی
چراغ ایسا رہے تو گرمیِ محفل کا کیا کہنا

سروں پہ قہقہے ہوں گے دِلوں میں غم تو کیا ہوگا؟
اندھیرا اور بڑھتا ہی رہے گا کم تو کیا ہوگا

ہمیں تو جانتے ہیں سب کہ یہ آشفتہ ساماں ہے
تمھاری زُلف یوں ہی رہ گئی برہم تو کیا ہوگا

بہت ترکِ تعلق کا تقاضہ کرتے رہتے ہو
کسی دن کر گئے ترکِ تعلق ہم تو کیا ہوگا

خرد خوش ہے کہ دیوانوں کو زنجیروں میں رکھا ہے
اگر جوشِ جنوں کا آ گیا موسم تو کیا ہوگا

ہمیں اے صاحبِ محفل نہ اُٹھوا اپنی محفل سے
ہمارے اُٹھتے ہی محفل ہوئی برہم تو کیا ہوگا

وفا اِک عمر سے ہم کر رہے ہیں کیا ہوا اب تک؟
وفا گر عمر بھر کرتے رہیں گے ہم تو کیا ہوگا؟

غلط کہ قتل کا قاتل نے کام چھوڑ دیا
یہ اور بات ہے ، اندازِ عام چھوڑ دیا
تماشے بکھرے ہوئے زیرِ بام اتنے ہیں
کہ ہم نے دیکھنا بالائے بام چھوڑ دیا
بچالیا ہمیں چلّو نے ہر تکلّف سے
صراحی چھوڑی، سبو چھوڑا جام چھوڑ دیا
جب انتخاب کا اِن دونوں میں سوال آیا
تو ہم نے کام لیا اور نام چھوڑ دیا
فسانہ درد کا جب بھی سنانے کو بیٹھے
تمام کر نہ سکے ناتمام چھوڑ دیا
کبھی کلیؔم نے مستی میں چھیڑ دی جو غزل
گلوں نے بادِ صبا سے کلام چھوڑ دیا

کہہ دو کلیؔم سے کہ اُسے آنا چاہیے
محفل اُداس ہے کوئی دیوانہ چاہیے
چھیڑا ہے پھر ستم کا نیا ساز وقت نے
تازہ غزل پھر اُس سے کہلوانا چاہیے
اب ایسے بادہ نوش کی ہے وقت کو تلاش
جو چڑھ کے دار پر کہے پیمانہ چاہیے
ساقی سے بھیک مانگتے ہو کیا شراب کی
اے دوست کچھ تو جرأتِ رندانہ چاہیے
سامانِ زندگی جو فقیرانہ ہے تو ہو
تیور ہر ایک حال میں شاہانہ چاہیے
اہلِ جنوں سے بڑھ کے کوئی محترم نہیں
دامن ہے چاک اگر تو نہ شرمانا چاہیے
برہم ہیں میرے طرزِ سخن سے کچھ اہلِ بزم
اور کہہ رہے ہیں اِس کو نکلوانا چاہیے
دیکھو مجھے اگر ہو حقیقت کی جستجو
میری غزل سنو اگر افسانہ چاہیے
بیباک جس طرح تو ہے پٹنہ میں اے کلیؔم
ایسا ہر ایک شہر میں دیوانہ چاہیے

وہ جن پہ وقت کا غصہ ہے عتاب بھی ہے
اُنھیں میں آپ کا یہ خانماں خراب بھی ہے

مری غزل مرے محبوب کا جواب بھی ہے
وہ اس میں پردہ نشیں بھی ہے بے نقاب بھی ہے

لبوں پہ نغمہ بھی ہے لب پہ آہ آہ بھی ہے
ہمارا حال تو اچھا بھی ہے خراب بھی ہے

ہمارے قتل سے قاتل کو تجربہ یہ ہوا
لہولہو بھی ہے مہندی بھی ہے شراب بھی ہے

ہم اپنا طرزِ عمل سوچتے ہی رہتے ہیں
وہ کافر اپنے ارادوں میں کامیاب بھی ہے

یہی کلیمؔ جو اُن کی نظر میں کچھ بھی نہیں
یہی کلیمؔ زمانے میں انتخاب بھی ہے

محبت کا سورج ہیں ڈھلتے ہیں ہم
اب آ جایئے ورنہ چلتے ہیں ہم

زمانے سے کانٹوں پہ چلتے ہیں ہم
نہ رستہ نہ منزل بدلتے ہیں ہم

سوئے قتل گہہ جب نکلتے ہیں ہم
شرابی چلے ویسے چلتے ہیں ہم

ستم کی انگیٹھی پہ پلتے ہیں ہم
یہ کروٹ وہ کروٹ بدلتے ہیں ہم

غزل میں پگھلتے ہیں ڈھلتے ہیں ہم
مزا سب کو آتا ہے جلتے ہیں ہم

چلاتے ہیں وہ تیر جس سمت سے
اُسی سمت کروٹ بدلتے ہیں ہم

یہ کمبخت دل گرچہ آوارہ ہے
اِسی کے اشاروں پہ چلتے ہیں ہم

ترے درد ہی کا سہارا تو ہے
کہ گرتے ہیں ہم پھر سنبھلتے ہیں ہم

گزرتا ہے جس طرح بدلی سے چاند
یوں ہی ڈوبتے ہیں نکلتے ہیں ہم

غزل ہے ہمارا کھلونا کلیمؔ
غموں میں اسی سے بہلتے ہیں ہم

حال اپنا کبھی کھلنے نہ دیا یاروں پر
سبزہ و گل پہ گزرتی ہے کہ انگاروں پر

باندھ دیتے ہیں رسن کھینچتے ہیں داروں پر
کیا ستم ہے تری زُلفوں کے گرفتاروں پر

اسی دُنیا میں چلا لیتے ہیں انگاروں پر
یہ بھی اِک طرح کی رحمت ہے گنہگاروں پر

آج ہے سب سے بڑا جرم مسلماں ہونا
ہر طرف شہر میں لکھا ہے یہ دیواروں پر

بڑھ کے خود ہاتھ میں زنجیر پہن لیتے ہیں
سر کو خود دوڑ کے رکھ دیتے ہیں تلواروں پر

چارہ ساز اِن کا نہ دمساز کوئی اِن کا کلیمؔ
بس خدا فضل کرے عشق کے بیماروں پر

یکتا رہے ہیں اور ہزاروں میں رہے ہیں
ہم خاک نشیں شاہ سواروں میں رہے ہیں

اے اہلِ چمن پوچھ لو ہر شاخِ چمن سے
ہم کون ہیں اور کیسی بہاروں میں رہے ہیں

جو شکر ستم کے سوا کچھ بھی نہیں سنتا
اس شوخ کے ہم شکوہ گزاروں میں رہے ہیں

اے گیسوئے دوراں تجھے کیا یاد نہیں ہے
اِک عمر تیرے آئینہ داروں میں رہے ہیں

کیا ابروؤں پہ ڈال کے بل دیکھ رہا ہے
اے دوست! کبھی ہم تیرے یاروں میں رہے ہیں

اُن کے لیے تڑپے کبھی اِن کے لیے تڑپے
ہم زندگی بھر درد کے ماروں میں رہے ہیں

شاہوں میں ملیں گے نہ جنابوں میں ملیں گے
اچھے بھی ہمیں خانہ خرابوں میں ملیں گے

اس دور کے جتنے بھی شہیدانِ وفا ہیں
وہ سب مری غزلوں کے نقابوں میں ملیں گے

مل جائیں گے ہم شمع بکف راہِ وفا میں
افسانے نہیں ہیں کہ کتابوں میں ملیں گے

زندہ ہیں تو جاگیں گے جگائیں گے تمھیں ہم
مرجائیں گے اے دوست تو خوابوں میں ملیں گے

ہر حال میں اپنی روشِ خاص رہے گی
کانٹا بھی بنیں گے تو گلابوں میں ملیں گے

جس شہر میں بھی ہوں گے ہم اربابِ محبت
دُکھ میں نظر آئیں گے عتابوں میں ملیں گے

چہروں کو اگر غور سے دیکھو گے تو اکثر
آنسو بھی تبسّم کے نقابوں میں ملیں گے

ہم درد کے ماروں کو بھلانا نہیں ممکن
روکو گے خیالوں سے تو خوابوں میں ملیں گے

ہم کشتۂ شمشیر ستم کا ہے یہ اعزاز
محشر میں حسینوں کے حسابوں میں ملیں گے

دِلوں تک درد کا پیغام پہنچانے نہیں آتا
بہت دن ہوگئے عاجزؔ غزل گانے نہیں آتا

اسی کے پاس تو سوز و گدازِ دل کا پرچم ہے
بغل ہی میں چھپا رکھتا ہے لہرانے نہیں آتا

فسانہ چھیڑ کر اشکوں کا دَور جام و مینا میں
ہنسی اپنی بھری محفل میں اُڑوانے نہیں آتا

شرابِ خونِ دل کا رنگ کیا ہے ذائقہ کیا ہے
اکیلے بیٹھ کے پیتا ہے چھلکانے نہیں آتا

سنا تو ہے کہ یہ پہلے پہل ایجاد اسی کی ہے
دِکھانے کو مگر زخموں کے پیمانے نہیں آتا

محبت کیا بلا ہے چوٹ دل پر کیسے لگتی ہے
سمجھتا ہے مگر کمبخت سمجھانے نہیں آتا

اسے دیوانگی کہتے ہیں خودداری نہیں کہتے
لیے پھرتا ہے دامن چاک سلوانے نہیں آتا

اب آئندہ سے ہم کہتے ہیں مت بلواؤ عاجزؔ کو
وہ دل کو چھیدنے آتا ہے بہلانے نہیں آتا

تغیّر کا وہ دن اب کیوں خدا جانے نہیں آتا
جو غم آتا ہے رہنے آتا ہے جانے نہیں آتا

دیا تھا خمُ جسے دو بوند ٹپکانے نہیں آتا
میں جس کے کام آیا میرے کام آنے نہیں آتا

صبا تُو اِس چمن میں رنگ و بُو کی جستجو مت کر
یہاں کا موسمِ گل پھول برسانے نہیں آتا

محبت تک رسائی خود ہی ہو جائے تو ہو جائے
کوئی لینے نہیں آتا ہے لے جانے نہیں آتا

اب ایسا کوئی دن آتا نہیں جس دن کوئی قاتل
بھنویں کھینچے نہیں آتا چھری تانے نہیں آتا

مرے چُلّو میں کچھ ہے یا نہیں ہے تم کو کیا مطلب
تمھارے سامنے تو ہاتھ پھیلانے نہیں آتا

نکل جاؤں گا میں تو شہر میں کہتے پھرو گے تم
مری زُلفِ پریشاں کوئی سلجھانے نہیں آتا

جنوں کے جوش میں کیا کیا نہ بکتے رہتے ہو عاجزؔ
تعجب ہے کوئی زنجیر پہنانے نہیں آتا

گر نہ عہدِ وفا کیے ہوتے
ہم بھی آرام سے جیۓ ہوتے

کاش کرتے نہ ہم گناہِ عشق
اور سارے گنہ کیے ہوتے

تیز لگتی نہ اس قدر مئے غم
تھوڑی تھوڑی اگر پیۓ ہوتے

دل ذرا دیر تو ٹھہر جاتا
کچھ تو آرام لے لیے ہوتے

شاعری کر کے کیوں ہوئے بدنام
چپکے چپکے ہی رو لیے ہوتے

ضبطِ غم ہی سہی کیا تو کچھ
غم نہ ہوتا تو کیا کیے ہوتے

ہم میں کوئی ہنر اگر ہوتا
لوگ بیزار کس لیے ہوتے

شہر میں رہنے سے تو اچھا تھا
کسی صحرا میں گھر لیے ہوتے

کچھ تو وعدوں کی شرم رکھ لیتا
گر کسی اور سے کیے ہوتے

ایک کیا گر ہزار گھر ہوتا
لوگوں نے سب جلا دیۓ ہوتے

غم کی عزت غزل نے رکھ لی کلیمؔ
ورنہ ہونٹوں پہ مرثیے ہوتے

فکر جب صاحبِ ارادہ تھی — یہ زمیں کس قدر کشادہ تھی؟
چاند میں کل چمک زیادہ تھی — کیا کسی کی وہ شامِ وعدہ تھی؟
جب یہ تہذیب بے لبادہ تھی — کتنی معصوم کتنی سادہ تھی
دوستی کم تھی یا زیادہ تھی — بے تکلف تھی بے ارادہ تھی
اس لیے سب میں معتبر ہم تھے — دعویٰ کم تھا سند زیادہ تھی
اپنے عزمِ بلند کے آگے — کامیابی سپر نہادہ تھی
ہائے کیا شاعری کا دَور تھا وہ — طبع رنگیں زبان سادہ تھی
بات کم بات کرنے والے کم — بات میں چاشنی زیادہ تھی
جس کا دل تھا وفا سے تھا معمور — جس کی آغوش تھی کشادہ تھی

فرش سے عرش پہلے دُور نہ تھا
زندگی گرچہ پاپیادہ تھی

ہر چند غم و درد کی قیمت بھی بہت تھی — لینا ہی پڑا دل کو ضرورت بھی بہت تھی
ظالم تھا وہ اور ظلم کی عادت بھی بہت تھی — مجبور تھے ہم اُس سے محبت بھی بہت تھی
گو ترکِ تعلق میں سہولت بھی بہت تھی — لیکن نہ ہوا ہم سے کہ غیرت بھی بہت تھی
اُس بُت کے ستم سہہ کے دِکھا ہی دیا ہم نے — گو اپنی طبیعت میں بغاوت بھی بہت تھی
یوں ہی نہیں مشہورِ زمانہ مرا قاتل — اُس شخص کو اِس فن میں مہارت بھی بہت تھی
واقف ہی نہ تھا رمزِ محبت سے وہ ورنہ — دل کے لیے تھوڑی سی عنایت بھی بہت تھی
اِک عمر کے بعد آئی ہے تاثیرِ سخن میں — منزل تھی کٹھن اور مسافت بھی بہت تھی
کیا دَورِ غزل تھا کہ لہو دل میں بہت تھا — اور دل کو لہو کرنے کی فرصت بھی بہت تھی
ہر شام سناتے تھے حسینوں کو غزل ہم — جب مال بہت تھا تو سخاوت بھی بہت تھی

بلوا کے ہم عاجزؔ کو پشیماں بھی بہت ہیں
کیا کیجیے کمبخت کی شہرت بھی بہت تھی

وہ دوست تو نہ تھا ہاں آشنا تھا، وہ بھی گیا
وفا تو کب گئی اِک بے وفا تھا ، وہ بھی گیا

خوشی جو دیتے تھے وہ لوگ تو گئے کب کے
وہ شخص جو مجھے غم دے رہا تھا ، وہ بھی گیا

کہاں ملے ہے سلیقہ کا کوئی ظالم بھی
وہ دل شکن تھا مگر دل رُبا تھا ، وہ بھی گیا

وہی کیا کوئی بھی منزل سے روشناس نہیں
مگر حسین سا اِک رہنما تھا ، وہ بھی گیا

خدا کے واسطے اب بولو کس کو ٹوکو گے
وہی تو شہر میں قاتل رہا تھا ، وہ بھی گیا

نکالو ڈھونڈھ کے معشوق مہرباں کوئی
وہ گو ستم تھا غضب تھا بلا تھا ، وہ بھی گیا

نہ جانے اب مری غزلوں کا رنگ کیا ہوگا
جو میرے دل کو لہو کر رہا تھا ، وہ بھی گیا

جس پر بھی جوانی آتی ہے اور تھوڑا جمال آجاتا ہے
مت پوچھو ستم گاری میں اُسے کس درجہ کمال آجاتا ہے

محفل میں اگر پڑھنے کو غزل عاجزؔ کسی سال آجاتا ہے
کچھ تھام کے دل رہ جاتے ہیں کچھ لوگوں کو حال آجاتا ہے

ہم بھی نہ کریں کیوں ترکِ وفا ، اکثر یہ خیال آجاتا ہے
پھر وضع کی بات آجاتی ہے غیرت کا سوال آجاتا ہے

اشکوں کے مسافر صف باندھے خاموش گزرنے لگتے ہیں
پھر خواب کہاں ان آنکھوں میں جب ان کا خیال آجاتا ہے

جب کوئی نیا گل کھلتا ہے شاعر کا کلیجہ ہلتا ہے
دُنیا کو غزل مل جاتی ہے اور دل پہ وبال آجاتا ہے

اب فصلِ بہاراں آئے گی اب فصل بہاراں آئے گی
اِک سال گزر جاتا ہے یونہی اور دوسرا سال آجاتا ہے

گو وہ مرا غم جانے ہے　　کمسن ہے کم جانے ہے
اُس الھڑ کا الھڑپن　　عالم عالم جانے ہے
شوقِ سخن ہے اس کو بہت　　طرزِ سخن کم جانے ہے
اُس کے حریمِ ناز کی بات　　ہر نامحرم جانے ہے
اپنے ہی آنگن میں کرنا　　چھم چھم چھم چھم جانے ہے
فرمانا جانے ہے بہت　　شرمانا کم جانے ہے
کام علاجِ دل ہے مگر　　زخم نہ مرہم جانے ہے

دُنیا اُس کو باایں ہمہ
ابنِ مریم جانے ہے

جب تک تو کلیمؔ اپنی غزل گائے نہیں ہے　　ہم کیا کریں ہم کو تو مزا آئے نہیں ہے
ہر چند ترا درد سنا جائے نہیں ہے　　لیکن بے سنے بھی تو رہا جائے نہیں ہے
تم آؤ تو رنگ آئے بہار آئے غزل آئے　　تم آؤ نہیں ہو تو کوئی آئے نہیں ہے

آرام طلب ہوگئے ہم میرؔ کی مانند　　جب تک نہ اُٹھے درد اُٹھا جائے نہیں ہے
اب صبر ہی اِک ہمدم دیرینہ ہے اپنا　　وہ بھی کبھی آئے ہے کبھی آئے نہیں ہے
اللہ رے نظر اُس کی کہ بس ایک نظر میں　　کیا کیا سر عالم پہ گزر جائے نہیں ہے
بیٹھا ہے ڈھٹائی سے سرِ بزم وہ قاتل　　آئینہ دِکھاؤں ہوں تو شرمائے نہیں ہے
میں کہتا ہوں دامن پہ کلائی پہ لہو دیکھ　　وہ بولے ہے مجھ کو تو نظر آئے نہیں ہے

چین آئے ہے اس کو نہ مجھے آئے ہے عاجزؔ
جب تک وہ غزل مجھ سے کہلوائے نہیں ہے

ہے اِنھیں دوناموں سے ہرایک افسانے کا نام
ایک تیرا نام ہے اِک تیرے دیوانے کا نام

تجھ سے روشن ہے چراغ محفلِ دار ورسن
مجھ سے بھی اس دَور میں زندہ ہے پروانے کا نام

تیری زُلف وچشم ولب کا نام ہے میری غزل
تیرا اندازِ سخن میرے غزل گانے کا نام

چل اسی انداز سے ہاں چل اِسی انداز سے
شوخیٔ بادِ صبا ہے تیرے اِٹھلانے کا نام

موجِ خوشبوئے غزل بے رنگیٔ روئے غزل
اِک ترے آنے کا ہے نام اِک ترے جانے کا نام

زندۂ جاوید میری شاعری نے کردیا
نام تیرے گیسوؤں کا اور مرے شانے کا نام

پھول توڑے کوئی پتھر ہم کو مارا جائے ہے
تونے اتنا کردیا بدنام دیوانے کا نام

ہم ہیں عاجزؔ آبروئے بزمِ یارانِ غزل
اب اسی آئینے سے ہے آئینہ خانے کا نام

غزل کس کی ہے؟ یہ انداز بے باکانہ کس کا ہے؟
اِسے محفل میں لایا کون یہ دیوانہ کس کا ہے؟

یہ کس کو مل گئی بوتل شرابِ میرؔ وآتشؔ کی
خرد کے دور میں یہ نعرۂ مستانہ کس کا ہے؟

یہ پھر سے داستانِ عشق رنگیں کس نے کردی ہے
لہو کا بارگاہِ حسن میں نذرانہ کس کا ہے؟

کلیجہ کس کا جلتا ہے یہ کیسی آنچ آتی ہے
یہ کس کا ہے غمِ جاں یہ غمِ جانانہ کس کا ہے؟

یہ کیا شئے ٹوٹنے کی مستقل جھنکار آتی ہے
یہ دل کس کا ہے دل سے شغلِ بے دردانہ کس کا ہے؟

ستم ڈھایا ہے کس کا فرصنم کی زلف برہم نے
شکستہ آئینہ ٹوٹا ہوا یہ شانہ کس کا ہے؟

لہو کی مئے سبو ٹوٹے دِلوں کے، جام زخموں کے
یہ کس قاتل نے کھلوایا ہے یہ میخانہ کس کا ہے؟

لہو روتے ہی رہنا ہے؟ غزل گاتے ہی رہنا ہے؟
سزا یہ کس نے دی کیا جرم ہے جرمانہ کس کا ہے؟

غزل کے آئینے میں زندگی کس کی جھلکتی ہے؟
غزل خواں سے کوئی پوچھو کہ یہ افسانہ کس کا ہے؟

جی کیا فرمایا؟ عاجزؔ ہند سے تشریف لائے ہیں؟
وہی تو میں کہوں یہ طرزِ درویشانہ کس کا ہے؟

سبوئے کہنہ میں صہبائے تازہ اور کس کی ہے
یہ رشک جامِ جم ٹوٹا ہوا پیمانہ کس کا ہے؟

اُسی نے ابتدا کی ہے اسی پر انتہا ہوگی
فقیری میں بھی ایسا لہجۂ شاہانہ کس کا ہے؟

وہ خفا ہو تو خفا ہو شکوۂ ہجراں چلے
ہاں چلے چھیڑ اُس شہِ خوباں سے عاجزؔ ہاں چلے

رنگ محفل دیکھ کر ہم جھاڑ کر داماں چلے
بے ہنر مسند پہ آ بیٹھے ہنر منداں چلے

چلتی آئی ہے یہی رسم و رہِ دوراں چلے
اہلِ جاناں کے گلے پر خنجرِ جاناں چلے

کاروبارِ میکدہ مشکل ہو یا آساں چلے
دورِ مئے رُک جائے تو دورِ شرابِ جاں چلے

جب پکارے جائیں گے آ جائیں گے یہ کہہ کے ہم
کوچۂ قاتل سے نکلے کوچۂ جاناں چلے

آ کے بیٹھے تھے کہ پھر اُٹھنے لگا دردِ جنوں
ہم نے پھر زنجیر پہنی اور پھر زنداں چلے

ہم خود افسانہ بنے تب تو نے افسانہ لکھا
تجھ سے بھی ہم تیز تر اے گردشِ دوراں چلے

جس گلی جس شہر سے آئی دل و جاں کی طلب
لیکے ہم اپنا شکستہ دل شکستہ جاں چلے

سب کو ہے معلوم غم کھاتے ہیں آنسو پیتے ہیں
اپنا توشہ لے چلے ہم جس کے گھر مہماں چلے

کہنا چاہا تو شرم آئی ہے
کیا کہیں کس کی بے وفائی ہے

کب گلے پر چھری چلائی ہے
تلہتھی آج تک حنائی ہے

چوٹ کس نے کب ایسی کھائی ہے
جیسی اس شوخ نے لگائی ہے

ڈوب کر ہی سمجھ میں آئی ہے
ہائے کیا چیز آشنائی ہے

کچھ خبر بھی نہ ہونے پائی ہے
فصلِ گل کب گئی کب آئی ہے

جس نے یہ شاعری سکھائی ہے
ایک ظالم کی خوش ادائی ہے

ہے تو قاتل کی ہر ادا مشہور
سب سے مشہور دل ربائی ہے

ہم تو ہیں قربتوں کے مارے ہوئے
لوگ سمجھے غمِ جدائی ہے

یہ اُسی نے محل بنایا ہے
دل کی دیوار جس نے ڈھائی ہے

سب تو اچھے ہی ہیں زمانے میں
ہم بُرے ہیں تو کیا بُرائی ہے

میرؔ کی یاد آ گئی عاجزؔ
تم نے ایسی غزل سنائی ہے

جگر کے چاک دل کے خاک ہو جانے کی باتیں ہیں
یہ دیوانہ ہے جیسا ویسی دیوانے کی باتیں ہیں

شکستہ جام کی گم گشتہ پیمانے کی باتیں ہیں
کبھی میخانہ تھا اب صرف میخانے کی باتیں ہیں

یہ دل سے نکلی ہیں دل میں اُتر جانے کی باتیں ہیں
سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی باتیں ہیں

ہے درد اتنا کہ جب ہم چھیڑتے ہیں سرگزشت اپنی
تو سننے والے کہتے ہیں یہ افسانے کی باتیں ہیں

برہمن سُن کہ ہم محراب و منبر کی نہیں کہتے
صنم خانے میں کہتے ہیں صنم خانے کی باتیں ہیں

مرے طرزِ بیاں کی نقل اے محفل نشیں مت کر
کہ یہ دریائے آتش سے گزر جانے کی باتیں ہیں

اِنھیں تنہائیوں میں گنگناؤ بزم میں گاؤ
یہ اس دَورِ خرد میں ایک دیوانے کی باتیں ہیں

انھیں پردوں میں کیا کیا بات کہہ جاتے ہو تم عاجزؔ
وہی زُلفوں کی باتیں ہیں وہی شانے کی باتیں ہیں

گونگے کو بنایا شیریں زباں یہ کارِ نمایاں خوب کیا
جیسے بھی کیا جس نے بھی کیا عاجزؔ کو غزل خواں خوب کیا

وہ درد دِیا ہم کو جس کا کوئی نہیں درماں خوب کیا
اے جانِ جہاں اے جانِ زمانہ خوب کیا ہاں خوب کیا

زخموں کے جلائے خوب دیئے اشکوں کو فروزاں خوب کیا
جس سال بہارِ گل آئی ہم نے بھی چراغاں خوب کیا

جس حال میں بھی رکھا ہم کو ممتاز ہی رکھا قسمت نے
پہلے سروساماں خوب دیا پھر بے سروماں خوب کیا

گر ہم بھی نکالے ہی جاتے یہ بات کہاں پیدا ہوتی
رکھا بھی ہمیں رُسوا بھی کیا اے کوچۂ جاناں خوب کیا

پردے میں جنوں کے ہم کیا کیا افسانے سناتے رہتے ہیں
رہنے جو دیا تو نے ہم کو یوں چاک گریباں خوب کیا

کلیمؔ آنسوؤں کو چھپائیں گے کیا
چھپائیں گے تو منہ دِکھائیں گے کیا

غم و درد سے دل بچائیں گے کیا
کمائی نہ ہوگی تو کھائیں گے کیا

مگر یاد رکھیں مری ایک بات
یوں ہی جان کھوکر وہ پائیں گے کیا

یہ عشق و محبت ہیں بیکار سب
یہ دھندے اُنھیں کام آئیں گے کیا

غم و درد کو پوچھتا کون ہے
یہ کھوٹے ہیں سکّے چلائیں گے کیا

یہ مانا کہ دل اُن کا ہے اِک چراغ
لہو اب کہاں ہے جلائیں گے کیا

نہ دامن سلامت ہے اُن کا نہ جیب
چمن میں گئے بھی تو لائیں گے کیا

کہاں وہ بچارے کہاں شاعری
غزل کیا کہیں گے سنائیں گے کیا

مجھے اُن کا سب بھید معلوم ہے
مرے سامنے سر اُٹھائیں گے کیا

جہاں بھی منعقد بزمِ غزل خوانی ہوئی ہوگی
نہ ہوں گے ہم تو یاروں کو پشیمانی ہوئی ہوگی

چمن میں جب ہماری چاک دامانی ہوئی ہوگی
بڑا جلسہ ہوا ہوگا غزل خوانی ہوئی ہوگی

مرے اشکوں کا افسانہ جہاں بھی چھڑ گیا ہوگا
نہ جانے کس ہی کس کی آبرو پانی ہوئی ہوگی

اِک ایسے آدمی پر کیا ستم ایسا بھی ہوتا ہے
مری رُوداد سن کر سب کو حیرانی ہوئی ہوگی

سجے ہیں اب بھی دسترخوانِ خوں پر جام زخموں کے
تکلف سے مرے قاتل کی مہمانی ہوئی ہوگی

ہمیں تو دل لہو کرنا پڑا، وہ اور ہی ہوں گے
جنھیں اہلِ غزل بننے میں آسانی ہوئی ہوگی

خزاں میں سُرخیِ گل دیکھ کر ہوتا ہے اندازہ
بہاروں میں لہو کی کیا فراوانی ہوئی ہوگی

وہ شہرِ دار ہو یا کوئے جاناں ہو کہ مقتل ہو
جہاں ہم آ گئے ہوں گے غزل خوانی ہوئی ہوگی

محبت اور وفا کی یہ انوکھی داستاں عاجزؔ
وہی سمجھیں گے جن سے ایسی نادانی ہوئی ہوگی

عاجزؔ یہ کسی اور کا چہرا ہے کہ تم ہو؟ اس دَور کے غم کا کوئی پتلا ہے کہ تم ہو؟
یہ آبلہ ہے زخم ہے پھوڑا ہے کہ تم ہو؟ ٹوٹا ہوا بکھرا ہوا شیشہ ہے کہ تم ہو؟
شہرِ دل برباد کا نقشہ ہے کہ تم ہو؟ خود میرؔ ہیں یا میرؔ کا چربا ہے کہ تم ہو؟
تم ہو کہ کرشمہ ہے شہیدوں کے لہوں کا؟ اس دورِ ستم کا کوئی تحفہ ہے کہ تم ہو؟
کچھ ہم نے بہت درد بھرے شعر سنے ہیں اشعار تو سن کر یہی لگتا ہے کہ تم ہو؟
"دن ایک ستم ایک ستم رات کرو ہو"
یہ میرؔ ہیں؟ یہ میرؔ کا مصرع ہے کہ تم ہو؟

عاجزؔ ابھی یہ طرز یہ لہجہ ہے کہ تم ہو یعنی روشِ میرؔ ابھی تازہ ہے کہ تم ہو
پھر سن کے غزل کوئی نہ تھامے گا کلیجہ لفظوں سے ابھی درد کا رشتہ ہے کہ تم ہو
ہر چند کہ مجمع ہے حریفوں کا پس و پیش شہناز غزل کو یہ بھروسہ ہے کہ تم ہو
پھر پوچھنے والا کوئی ہوگا کہ نہ ہوگا فی الحال مزاجِ غزل اچھا ہے کہ تم ہو
چھپ رہنے کا ہے درد کو موقع کہ غزل ہے اور درد کا اس دَور میں چرچا ہے کہ تم ہو
کون اتنی سخاوت سے لہو دے گا جگر کا لیلائے تغزل ابھی زندہ ہے کہ تم ہو
اِس دَور میں ہے بلبلِ بستانِ غزل کون؟
پھولوں کا یہ خاموش اشارا ہے کہ تم ہو
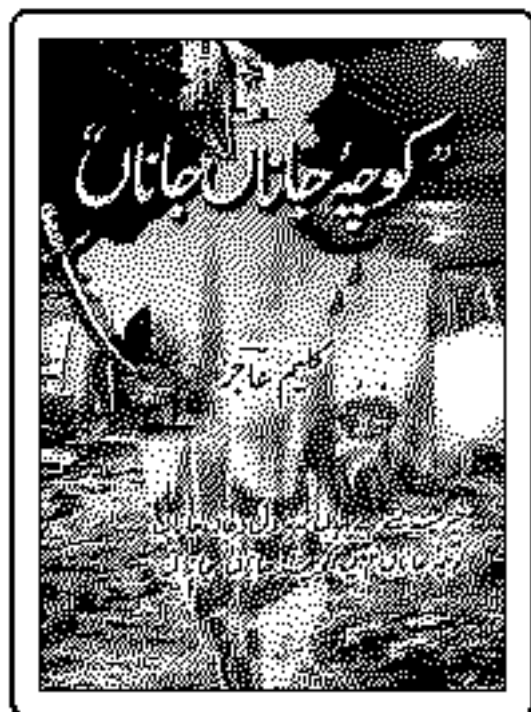
تیسرا مجموعہ
کوچۂ جاناں جاناں
کلیم عاجز
کوچۂ جاناں جاناں
اشاعت: [illegible] 2002ء
خیریت ہے یہاں مرشدِ دل و جانِ جاناں
کوچۂ جاناں نہیں کوچۂ جاناں جاناں

میں اپنے اس مجموعۂ نظم

کوچۂ جاناں جاناں

کا انتساب اپنے وطن ہندوستان سے کرتا ہوں
جو میرا کوچۂ جاناں ہے، جس کی صرف ایک خصوصیت
پوری توانائی اور صحت مندی سے باقی ہے کہ:

شہر خالی ہوا نہ قاتل سے
ایک جاتا ہے ایک آتا ہے

کلیم احمد عاجؔز

❁

اس مجموعۂ نظم میں نعتیں اوّل پیش کرر ہاہوں کہ آغاز بہرحال ان سے ہونا چاہیے اس لیے نہیں کہ موجبِ برکت ورحمت ہیں بلکہ اس لیے کہ حیات اور کائنات میں جو کچھ برکت اور رحمت ہے وہ اسی ذات عالی والا صفات کا صدقہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بات ضرور سلیقہ سے کہنا آیا مگر کام سلیقہ سے کرنا نہ آیا۔ 'کسی' نے محض اپنے فضل سے کچھ سلیقہ کی بات مرے کسی کام میں پیدا فرمادی تو اس کا کرم ہے۔ جتنے مجموعۂ نثر و نظم کے اس وقت تک شائع ہوئے اس کی پلاننگ اور منصوبہ بندی، ترتیب تصحیح وغیرہ کا کوئی نظم ہم سے نہ ہوسکا کہ اس کا سلیقہ ہی نہیں اور سلیقے والے متوجہ بھی نہیں ہوئے۔ نظموں کی تاریخِ تخلیق کہیں نہیں ہے جس سے ترتیب میں آسانی ہو، تو ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکے۔ زندگی ایسی بے ترتیب کہ اس اہم کام کے لیے موقع نہ مل سکا اور ہم اس کے لیے موقع نکال نہیں سکے کہ:

دن کہیں، رات کہیں، صبح کہیں، شام کہیں

جو ہے جس حال میں ہے حاضر ہے۔ اندازاً کوشش کی گئی ہے کہ ایک نظم کے بعد دوسری نظم وہی آئے جو اس کے بعد کہی گئی ہو لیکن ایسا ہوا یہ کہنے کے قابل ہم نہیں ہیں۔ قطرۂ خونِ جگر سب میں ہے یہ بات اعتماد سے کہہ دیتے ہیں۔ لہٰذا:

قطرۂ خونِ جگر سے کی تواضع آپ کی
سامنے مہمان کے جو تھا میسر رکھ دیا

کلیم احمد عاجزؔ

نعتوں کے مجموعہ کا مختصر پیش لفظ

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیؔد و بایزیؔد ایں جا

خدا جانے کتنے سال ہوئے — تیس، چالیس، پچاس سال — جب میں نے یہ شعر پڑھا یا سنا اور تقریباً یہ شعر زندگی کے ہم نشینوں میں بن گیا ہے۔ اکثر دل میں آ جاتا ہے، زبان سے بھی جاری ہو جاتا ہے، اور اب تو وظیفہ جیسی چیز تقریباً بن گیا ہے۔ بچپن میں تقریبات کے خاتمے پر یا آغاز میں، شادیات میں یا کسی بزرگ کی گھر میں تشریف آوری ہوئی۔ حضرت سیّد شاہ محسن ابوالعلائی خانقاہ ابوالعلائیہ دانا پور، یا سیّد شاہ بشیر اکبری جو حضرت شاہ اکبر دانا پوری خانقاہ ابوالعلائیہ کے سجادہ نشیں کے بھانجے ہیں اور مری والدہ کے سمدھی بھی ہوئے، گھر آ گئے تو اکتسابِ فیض کے لیے یا نزولِ برکت کے لیے میلاد شریف کی محفلیں ہو جایا کرتی تھیں۔ ربیع الاوّل اور ربیع الثانی یا شعبان المکرّم کے مہینوں میں اہتمام سے یہ مجلسیں ہوتی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی تو گھر میں کوئی لیتا ہی نہیں تھا بس مستورات نبی صاحب کہا کرتی تھیں اور مرد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرتے تھے۔ ۱۲ رویں ربیع الاوّل کو ہمارے گاؤں میں قاضی نظیر الحسن نانا کے یہاں موئے مبارک کی زیارت ہوتی تھی۔ صبح سے آس پاس کے مضافات سے بیل گاڑی، ٹم ٹم اور پیدل والوں کا ہجوم دکھن، پورب، پچھّم سے مکان کے سامنے میدان میں کھیتوں میں مقیم ہو جاتا۔ صبح نو بجے سے زیارت شروع ہوتی، ظہر کے وقت تک مجمع ختم ہو جاتا۔ کوئی میلا نہیں لگتا جیسا اب پھلواری شریف میں لگتا ہے۔ کوئی دُکان یا کوئی کھیل کود کا سلسلہ بالکل نہیں۔ لوگ خاموش بیٹھے رہتے، اپنی ضروریات کے لیے بھی کم ہی کہیں نکلتے۔ پھر گاؤں ختم ہوا تو پٹنہ میں دو مقامات موئے مبارک کی زیارت کے تھے۔ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف اور خانقاہ عمادیہ منگل

تالاب۔ اس کے علاوہ خانقاہ ابوالعلائیہ سے خاندانی لگاؤ اور تعلقات تھے، حضرت شاہ محسن صاحب تیلہاڑہ بھی میرے یہاں تشریف لاتے اور پٹنہ بھی میرے گھر تشریف لاتے۔ ۱۴؍رجب کو اہتمام سے ہم لوگوں کا قیام دانا پور میں ہوتا۔ بچپن میں خانقاہ اسلام پور سے ہمارے اسلاف مرید تھے۔ وہاں اہتمام سے شاید ۱۳-۱۴-۱۵؍محرم سالانہ عرس میں ہم سب کی حاضری ہوا کرتی تھی۔ مختصر یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قلبی و رُوحانی تعلقات نے ہم لوگوں کے جسموں اور اعضائے جسم کو بھی اپنی محبت میں ڈھال رکھا تھا۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب سجادہ نشیں خانقاہ اسلام پور کی، جن سے میرے نانا مولوی ضمیر الدین مرحوم اور میری والدہ مرید تھیں، اکثر میرے یہاں تشریف آوری ضرور ہوجاتی۔ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یادوں کا سایہ ہم نے بچپن سے اپنے گھر میں بہت صاف، مؤثر اور نمایاں دیکھا۔ پٹنہ میں جب باضابطہ تجارت اور ملازمت کے سلسلے میں قیام ہوگیا تو یہاں بھی ذکر و فکر کی مجلسیں ہوا کرتی تھیں۔ حضرت شاہ محسن صاحب اور حضرت شاہ غلام حسنین صاحب عرف شاہ گلو خلف حضرت مولانا شاہ سلیمان صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے۔ کبھی میرے گھر باقر گنج تشریف لے آتے اور چند لوگوں کے درمیان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر فرماتے اور روتے اور ہم سبھوں کو رُلاتے۔ کبھی ملک العلماء حضرت مولانا ظفرالدین صاحب جانشیں حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی بھی تشریف لاتے مگر بہت صاف خیالی اور کشادہ دِلی کی باتیں کرتے۔ قرآن شریف کا درس بھی کسی کسی دن تشریف آوری کا موضوع ہوتا۔

بچپن اسی ماحول میں گزرا، نوعمری نوجوانی اس میں گزری، اب اس بڑھاپے کا کیا کیا جائے کیسا گزر رہا ہے۔ اس کی داستان دوسرے بیان کریں تو کریں، ہم کیا کریں:

کیا کہیں کچھ نہ کہتے بنے ہے
سر پہ لٹکی ہے شمشیر صاحب

یہ جہاں اب نہیں ہے۔ پہلی مرتبہ جب اللہ نے کرم فرما کر اپنے گھر کے سفر کی سعادت عطا فرمائی اس کا کچھ حال تو ''یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ'' میں اجمالاً یا تفصیلاً تحریر ہے۔ یہ حاضری ۱۹۶۵ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد گذشتہ پینتیس سال میں اللہ نے کتنی بار گوشالی کے لیے بلایا اس کی گنتی بھی یاد نہیں ہے۔ ابھی چند ماہ پہلے بھی حاضری ہوئی۔ ہزاروں وقتوں کی نمازیں بیت اللہ کے

سامنے اور روضۂ اقدس مدینہ منورہ میں پڑھیں۔ بیت اللہ میں تو ہمّت کر کے سیہ پوش کعبہ کو دیکھ لیا کرتا تھا لیکن ایسا لگتا تھا اور ایسا لگتا ہے کہ اب تک میری ناپاک نگاہیں اس قابل نہیں ہیں۔ لیکن بہرحال ارادہ کے ساتھ، نیت کے ساتھ، ثواب کی اُمید میں ارادتاً دیکھ لیا کرتا ہوں اور کبھی کنکھیوں سے بھی۔ صبح سے ظہر کا وقت ہو جاتا اور مغرب سے عشا کا وقت ہو جاتا۔ تلاوت، ذکر اور دعا کے علاوہ نہ کوئی شغل رہا، نہ عمل رہا۔ آج تک کعبہ کی سرزمین سے کبھی پیٹھ نہ لگائی۔ کبھی پاؤں نہ پھیلایا شاید دیوار یا ستون سے اڑ کر بھی نہیں بیٹھا۔ ایسی جرأت کی ہمّت نہیں ہوتی تھی، ممکن ہے تکان میں کبھی پشت دیوار سے لگ گئی ہو، ورنہ دو زانو، یک زانو یا چار زانو نشست کے علاوہ کوئی اور نشست نہ بیت اللہ کے سامنے کبھی ہوئی نہ روضۂ اقدس میں۔ اور روضۂ اقدس کا احوال کیا بیان کروں۔ ’یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ‘ میں تھوڑا حال ہے اور جذبیؔ کی شکایت کا ذکر بھی ہے کہ میاں تم نے تو مجھے روضۂ اقدس کے قریب چھوڑ ہی دیا۔ میں اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھے رکھے سرنگوں چند قدم روضۂ اقدس کی طرف چلا پھر میرا ہاتھ اُن کے کندھے سے اُتر کر میرے سینے پر بندھ گیا پھر رونے کے سوا مجھے کچھ یاد نہیں۔ روضۂ اقدس کے قریب ترین جو ستون ہے اس سے آگے بڑھنے کی ہمّت محسوس کبھی نہیں ہوئی۔ سینے پر ہاتھ باندھے میں نے ستون سے اپنا سر ٹیک دیا۔ آنکھوں نے برسنا شروع کیا، تھک گیا تو اسی طرح لڑکھڑاتا واپس ہوا۔ مختصر یہ کہ پینتیس سال سے آ رہا ہوں جا رہا ہوں، آج تک کسی دن، کسی رات، کسی صبح، کسی شام میری نظر مقدس جالیوں کی طرف نہ اُٹھ سکی۔ نہ ان سے قریب ہو کر گزرنے کی کبھی ہمت ہوئی۔ پولیس کے دھکا دینے پر گزرنا بھی ہوا تو کسی گزرنے والے کی بغل کی آڑ لے لی۔ اور ایسا لگتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہیں ڈانٹ نہ دیں کہ اس نالائق کو یہاں کیوں آنے دیا۔ یہ لکھنے کو میں نے لکھ دیا۔ قلم تھرتھرایا نہیں مگر مرا جسم گزرتے ہوئے تھرتھر کانپتا ہے اور پاؤں قابو سے باہر ہو جاتے ہیں:

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؔ و بایزیدؔ ایں جا

تو لکھنے کا یہ مقصد ہے کہ ایسے شخص سے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزارِ مبارک کے قریب سے گزرنے کی بھی تھرّاتے ہوئے ہمت نہیں کرسکتا، نعت شریف لکھنے کی جرأت کیا کرسکتا ہے۔
میرے رشتے کے ایک نانا شاہ نذیر احسن نسیمؔ ہلسوی عظیم آبادی شاگردِ داغؔ دہلوی کا شعر ہے:

نہ لکھوں نعت جب تک لطف پیدا ہو نہیں سکتا
مگر یہ حوصلہ وہ ہے جو پورا ہو نہیں سکتا

حوصلہ پورا ہوا یا نہیں ہوا، یہ کون بتائے۔ مگر نعتیہ ایک غزل کا پہلا شعر ہے:

اس حسن کا عالم میں آیا نہ نظر کوئی
دیکھا ہے نہ دیکھیں گے تجھ سا بھی بشر کوئی

حسن کا کیا عالم انھوں نے دیکھا وہ جانیں۔ یہ مشاہدۂ حسن نعت میں سب کا علی قدر مراتب ہے۔ میرے دل میں اُن کے حسن کی جو تصویر ہے، اُن کی محبت کی جو تصویر ہے وہ اقبالؔ کے اس مصرع سے ملتی جلتی ہے:

حسابِ من زچشمِ اونہاں گیر

اے اللہ! میرا حساب جب حشر میں تو لینے لگے تو میرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر نہ ہونے دے کہیں وہ کہہ نہ بیٹھیں کہ یہ نالائق ایسا نکلا؟ بس اس سے آگے میرا قدم نہیں بڑھتا اور کبھی نہ بڑھ سکے گا، یہاں تک بڑھتا ہے اور شاید یہیں تک رہے گا:

ہم نہ جانے ہیں کوئی اور سہارا کہیو
جب کبھی چوٹ لگی اُن کو پکارا کہیو

بس یہیں کھڑا ہوں۔ آنکھ بند ہے پکار رہا ہوں۔ کبھی میاہاڑہ سے پکارا:

اندھیری شب میں نہیں صبح کے اُجالے میں
لٹا ہے اُن کے غلاموں کا قافلہ کہیو

کبھی فلسطین میں آگ لگی تو پکارا:

اُن سے اے بادِ صبا حال ہمارا کہیو
غم سے تڑپے ہے کوئی درد کا مارا کہیو

فلسطین میں جب اسرائیلی تلوار نوجوانانِ بنی ہاشم پہ چلی تو پکارا:

زخم کھائے ہوئے سر تا بہ قدم آئے ہیں
ہانپتے کانپتے اے شاہِ امم آئے ہیں

مشرقی پاکستان ٹوٹ رہا تھا تو عرض کیا:

اے بادِ صبا کہیو ان سے وہ جن کی کملیا کالی ہے
اب ان کے غلاموں کے گھر کی دیوار اُلٹنے والی ہے

براہِ راست مخاطب ہونے کی گستاخی بھی کرنے کی تو ہمّت نہیں ہوتی، ہائے کیا بیچارگیِ محبت ہے۔ ہمیشہ کہا اے بادِ صبا تُو تو ضرور حاضر ہوتی ہے سنا دے غم سے تڑپے ہے کوئی درد کا مارا کہیو۔ اور ایسا کہتے ہوئے بھی کانپ جاتا ہوں کہ وہ بادِ صبا جو 'وہاں' حاضر ہوتی ہے اس سے بھی ہم کلام ہونے کی ہمّت تجھے کیوں ہوئی:

نسبت خود بہ سگت کردم و بس منفعلم
کہ ایں نسبت بہ سگ کوئے تو شد بے ادبی

میں حضرت جامیؔ سے بہت پیچھے ہوں۔ وہ تو اس کتّے سے اپنی نسبت پیدا کر رہے ہیں جو 'ان' کے کوچہ میں رہتا ہے۔ میں ہزار ہا ہزار ہا میل دُور سے جانے والی بادِ صبا سے مخاطب ہوتے کانپتا ہوں، تھرتھراتا ہوں۔

سفرِ حج کی پہلی سعادت ۱۹۶۵ء میں نصب ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بپتا سننے والے کے سامنے بپتا کہنے والا پہنچ گیا۔ خدا سے تو کہتا ہی رہا، جہاں رہا وہاں کہا، گھر میں کہا، راہ چلتے کہا اور کہتا ہوں، سجدوں میں کہا اور کہتا رہتا ہوں۔ وہ تو بادشاہ، مالک، آقا، مولا ہے، اس سے تو ہر وقت کہتا ہوں مگر ایک ایسے غمگسار کے قریب پہنچنے پر جو غمگساری میں بے مثال و بے عدیل ہے۔ باپ ماں نہ رہے، استاد بزرگ نہ رہے، نانا دادا نہیں رہے تو اتنے دِنوں بعد غمگساروں کے غمگسار، ہمدردوں کے ہمدرد، مہربانوں کے مہربان کے آگے پہنچا تو برسوں کے بعد پھوٹ کے رویا:

نہ غمگسار نہ ہمدم کوئی رہا، کہیو
بس اُن کے نام کا باقی ہے آسرا کہیو

ہم تو نہ کہہ سکے آنسوؤں نے کہا ہوگا۔ تڑپتے ہوئے دھڑ کتے ہوئے دل نے کہا ہوگا۔ سسکیوں نے کہا ہوگا، تھرتھراتے ہوئے جسم نے کہا ہوگا۔ وہاں سب نے ساتھ دیا، کسی نے بے وفائی نہیں کی۔ اپنی وفائیں بھی کہیں، مظلومی بھی کہی، دوسروں کے ستم بھی کہے، بہت کچھ کہا ہوگا۔ اشعار لکھنے کو نہ کہے تھے، وہاں بھی نہیں لکھے۔ راہ میں بھی نہیں لکھے۔ واپس آنے پر مسٹر مظفر گیلانی مرحوم نے نعت کی مجلس اپنے گھر میں منعقد کی تو حافظے سے چند شعر جو نکل سکے وہ پڑھ

دیئے بس چلا تو چلا۔ پھر جب گیا، جب بھی حاضری ہوئی، قدموں سے دُور سامنے بیٹھ کر کہا عرض کیا، رویا، جو یا د رہا سمیٹ کر رکھ لیا۔ بس یہی سلسلہ تقریباً ہر سفر میں رہا، دو سفر میں تو ایسا ہوا کہ جو کہا وہ بعد میں جتنا یاد آیا لکھا اور وہ کاغذ اِدھر اُدھر ہو گیا۔ برادرم حسن عسکری طارق جو مدینہ منورہ میں میرے میزبان، ہم نشیں، ہم خیال، ہم قدم سب کچھ ہیں۔ کچھ رازدار ہیں، کچھ راز کشا ہیں، کچھ پردہ پوش ہیں، کچھ پردہ دار ہیں۔ پردہ پوشی، پردہ داری سب کچھ محبت ہی کے اشارے سے ہوتی ہے۔ کبھی میں سمجھ پاتا ہوں کبھی نہیں سمجھتا۔ مگر اُن پر بھرپور اعتبار رہے۔ ان کو کاغذات کہیں مل جاتے ہیں بس وہ مالِ غنیمت سمجھ کر اس کی نقلیں کرا لیتے ہیں، کچھ اپنے لیے رکھ لیتے ہیں، کچھ نہایت باوقار باادب باملاحظہ ہشیار احباب کو تقسیم کر دیتے ہیں اور ہمیں بھی بھیج دیتے ہیں:

مدینہ جب بھی گئے بس یہ کام کر کے چلے

اور

بس اِک سخن، بس ایک توجہ، بس اِک نظر

یہ دونوں نعتیہ نظمیں انھیں کی توجہ سے ہم تک واپس پہنچیں۔ ورنہ ہم تو آنسوؤں کے ساتھ مدینہ منورہ کی خاکِ پاک میں انھیں ملا کے چلے آئے تھے۔

حادثۂ فلسطین کے بعد جو چند دردناک اشعار میں نے کہے وہ بھائی غلام سرور صاحب نے مجھ سے لے لیے اور انجمن اسلامیہ ہال میں یومِ فلسطین کے روز اپنے اخبار 'سنگم' کے صفحہ اوّل میں پورے صفحے پر خطِ جلی میں شائع کر دیئے، جسے کشن گنج پورنیہ کے ایک مالک مطبع نے (ان کا نام نامی اس وقت یاد نہیں آرہا ہے) شائع کرنے کی اور حج کے مجمع میں مدینہ منورہ میں اصحابِ درد کو تقسیم کرنے کی اجازت طلب کی جو میں نے دے دی۔ انھوں نے کئی ہزار کی تعداد میں بڑی تقطیع پر اسے شائع کیا۔ بیت اللہ اور روضۂ اقدس میں دردمندوں کو تقسیم کیا پھر تو حجازِ مقدس میں دھوم ہو گئی اور کئی سال تک وہاں کی حاضری کے موقع پر آشنا ناآشنا سب آتے رہے اور چند اشعار میری زبان سے سننے کی متقاضی رہے۔ جس حد تک ضبط نے ساتھ دیا سنا کر خاموش ہو رہا۔

سقوطِ مشرقی پاکستان (۱۹۷۱ء) کے موقع پر میں اپنی کیفیت کیا بیان کروں۔ ایک شخص جس کی زندگی انفرادی، اجتماعی، ملّی حادثات کو اپنے سینے پر لینے اور دل کے دروازے ان کے لیے کھول دینے اور تا زندگی اس کی خلش کو آنسوؤں کی راہ سے نکالنے کے لیے وقف کر دی ہو۔ اس

کا کیا حال ہوگا، کوئی گوشہ اسے نہیں ملتا تھا کہ جہاں وہ روکے، اس فرض کو نہ پورا کرتا ہو جو اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عائد کر دی ہے۔ پٹنہ کی گلیوں میں بھی اس غم کے اثرات نمایاں تھے۔ غیر لوگ مٹھائیاں بانٹ رہے تھے اور مسلمانوں کے چہروں پر ہوائیاں تھی:

اے بادِ صبا کہیو ان سے وہ جن کی کملیا کالی ہے
اب تو اُن کے غلاموں کے گھر کی دیوار اُلٹنے والی ہے

چند ہی اشعار ہیں انھیں پڑھ جایئے۔ جو مناظر ان اشعار میں ہیں وہ تقریباً پورے پٹنہ کی فضا پر طاری تھے۔

صبا کملی والے سے پیغام کہیو

یہ نعت حادثہ مراد آباد کے دوران لکھی گئی۔ جب نمازِ عید کو جانے والے مَردوں، بچوں پر گولیوں کی بارش کی گئی۔ نمازیوں کے عید کے پیرہن خونی کفن بن گئے۔ اسی دوران سیّد شہاب الدین ایم پی نے دہلی میں ایک سیرت کانفرنس منعقد کی اور مجھے بہت اصرار سے بلایا کہ ایک نعت پڑھ دو، میں گیا۔ اس حادثے کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ درمیانِ جلسہ جب میں نے اس نعت کے اشعار ت پڑھے تو سامعین کی نشستوں سے بہت سے بزرگ صورت معزز اصحاب کود کر اسٹیج پر چلے آئے اور مجھ سے معانقہ کرنے لگے جن میں خواجہ حسن نظامی ثانی نظامی، سجادہ نشیں خانقاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ بھی تھے اور اخلاق الرحمٰن قدوائی صاحب گورنر بہار بھی تھے۔ اس نعت کی یاد ایسی قدوائی صاحب کو رہی کہ چند سال بعد جب وہ واشنگٹن امریکہ تشریف لائے تو علی گڑھ یونین کے مشاعرے میں اس کی فرمائش کرنے لگے مگر وہ نعت پوری اس وقت مجھے یاد نہ آسکی۔ ہر نعت کے پہلے میں چند لفظوں یا سطروں میں اس نعت شریف کی وجہِ نزول اور وقتِ نزول واضح کر دوں گا۔

یہ پہلی فریاد ہے جو آستانۂ نبوی پر ۱۹۶۵ء میں اوّلین سفرِ حج کے موقع پر سلام کے بعد پڑھی گئی، بڑی مشکلوں سے پڑھی گئی مگر پڑھی گئی۔ ۱۹۴۶ء کے جانکاہ فساد کا مختصر خلاصہ ہے۔ ۳۰ر نومبر مطابق ۱۰ر ذی الحجہ بقرعید کے دن صبح ۹ بجے تیلہاڑہ کی قتل گاہ مکمل کر دی گئی۔ بسمل تڑپتے رہے قاتل رخصت ہو گئے:

اندھیری شب میں نہیں صبح کے اُجالے میں
لٹا ہے اُن کے غلاموں کا قافلہ کہیو

ادب سے پہلے سلام ان کو اے صبا کہیو
پھر اس کے بعد غریبوں کا ماجرا کہیو
کمی نہ کیجیو کچھ اس میں اپنی جانب سے
گزر رہی ہے جو ہم پر ذرا ذرا کہیو
نہ غمگسار نہ ہمدم کوئی رہا ، کہیو
بس ان کے نام کا باقی ہے آسرا کہیو
برائے نام ہی نسبت جو اُن سے رکھتے ہیں
اِس ایک جرم کی کیا کیا ملی سزا کہیو
دو ایک حادثہ ہوتا تو صبر کر لیتے
بندھا ہوا ہے مصائب کا سلسلہ کہیو
اندھیری شب میں نہیں صبح کے اُجالے میں
لٹا ہے ان کے غلاموں کا قافلہ کہیو
بڑی تڑپ ہے حضوری کے واسطے لیکن
کیا ہے بند مقدر نے راستہ کہیو

۱۹۶۴ء میں جمشید پور کے فسادات کے بعد لکھی گئی

پہلی شہادت شمیمؔ مرحوم کی ٹھیک رسم نکاح کے ادا ہونے کے بعد ہوئی۔ اس واقعہ کی مختصر تفصیل 'ابھی سن لو مجھ سے' میں ہے۔ بڑا دردناک واقعہ ہے۔ بھائی جمشید پور میں شہید ہوا۔ دونوں واقعات کی ہلکی دلدوز تصویریں 'ابھی سن لو مجھ سے' میں دیکھی جاسکتی ہیں:
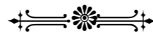
ضبط فریاد کا غم اب نہیں سہنے والے
ہم تو بے پھوڑے سَر اپنا نہیں رہنے والے

اشک آنکھوں سے ہیں بے ساختہ بہنے والے
آج کچھ درد ہیں سرکار سے کہنے والے

مانگتے پھرتے ہیں ہر شاخ سے اب چھاؤں کی بھیک
آپ کے سایۂ دیوار میں رہنے والے

ہند کے نامہ سیاہوں کی خبر ہے کہ نہیں
گنبدِ سبز مدینہ کے او رہنے والے

بیچ بازار میں ساکھ اپنی گنوا بیٹھے ہم
نقد والے رہے سرکار نہ لہنے والے

بے سر و بے سپر و بے کس و بے خانۂ و دَر
ہائے کیا کیا ہمیں کہتے نہیں کہنے والے

نگہ کج کی بھی کل تاب نہیں ہوتی تھی
اب تو تلوار بھی سہہ لیتے ہیں سہنے والے

اُٹھ کہ ماتم ہے بہت اُمت مرحومہ میں
آگے آگے صفِ محشر میں او رہنے والے

ذکراور نامِ عظمت اوراحترام تو گھر میں گونجا ہی کرتا تھا۔ میلادوں میں سیرت کے جلسوں میں سنا ہی جاتا تھا۔ مولود کی مٹھائیاں بٹتی تھیں۔ اُن مٹھائیاں کا تقدس نیت سے بہت بڑھ جاتا تھا۔ مٹھائیاں چاٹ چاٹ کر کھائی جاتی تھیں۔ عظمت، احترام، محبت اور شیفتگی ووارفتگی کے باوجود ہم ان سے بہت دُور نظر آتے تھے۔ جیسے غریبوں کے بادشاہ سلامت یا دیہاتیوں کے لیے کلکٹر صاحب۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت ایسی عظمت اور بلندی کا تصور لیے آتی تھی کہ ہم کسی اور دنیا کے اور وہ کسی اور دُنیا کے نظر آتے تھے۔ نعتیں کہیں سنتا بھی تھا تو سر جھکا کر اور آپؐ کا نام کان میں آتے ہی شہادت کی انگلیوں کے پور آنکھوں سے لگ جاتے تھے، اور پھر ہونٹوں سے لگا کر چوم لیے جاتے تھے۔ ۱۹۴۶ء کے بعد یہ تصور تھوڑا بہت تبدیل ہونے لگا۔ جب دعائیں کرتا اور وسیلے کی بات آ جاتی تو ایسا لگتا کہ شاید وہ قریب ہورہے ہیں۔ اور جب ۱۹۶۴ء میں پہلی نعت لکھی اور ۱۹۶۶ء میں آرام گاہ سے کچھ دُور روتے ہوئے پڑھی تو ایسا لگا کہ وہ سن رہے ہیں، پھر تو اتنا پھیرا ہوا کہ دُوری اور قربت کی شناخت نہ رہی۔ ایسا معلوم ہوا کہ میں پڑھ رہا ہوں اور وہ سماعت فرما رہے ہیں اور رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی ہے کہ جب حاضری کے لیے روانگی ہوتی تو ساٹھ سال پہلے تک کلکتہ سے یا پٹنہ سے تیلہاڑہ ہوتے ہوئے پورے وجود کی وہ کیفیت ہوتی کہ آنکھیں کہیں ہوتیں نظر کہیں۔ سامنے کی چیزیں نظر نہ آتیں۔ بستی کا منظر، گھر کی دیواریں، گھر والوں کے چہرے نظروں کے سامنے آجاتے، اسی طرح پٹنہ سے دلّی اور دلّی سے جدہ پہنچنے تک نہ دل ٹھکانے رہتا، نہ آنکھیں، نہ کان، نہ ہاتھ پاؤں۔ سب مضطرب اور بیقرار رہتے۔ جدّہ پہنچنے پر دل ٹھکانے آتا کہ اب آ گئے، وہاں سے سرنگوں چند گھنٹے کی مسافت طے ہوجاتی۔ اب نعت کے اشعار کہتے یہی لگتا ہے کہ سارے بزرگ ختم ہوگئے یا پس منظر میں چلے گئے اور سب کی جگہ ایک نے لے لی اور وہ ایک ذات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ جو بات آپؐ کی نسبت کہنی ہوتی، یوں ہی کہی جاتی جیسے بچوں کو ابّا امّاں یاد آتی ہیں۔ ان کی گود میں منہ ڈال کر

رونا، شکایت کرنا۔ ماں باپ آقا اور مالک کی طرح ہوتے ہیں۔ اب آقا اور مالک آپ کی ذاتِ مبارک ہے:

ہم تو ہیں غلاموں میں دوڑے چلے جاتے ہیں
جب حکم یہ آتا ہے سرکار بلاتے ہیں

یہ قربت کی وہ علامت ہے جس کے آگے تمام دُوریاں مسافت کی اور بلندی مرتبت کی نزدیک ہوجاتی ہیں، درمیان میں کچھ حائل نہیں رہتا، اِدھر حکم ہوا اُدھر تعمیل ہوئی۔ اِدھر آواز آئی پکار ہوئی اور حاضری ہوگئی۔ دائیں بائیں آگے پیچھے کوئی نظر نہیں آتا۔ بس دُھن آپ کا کھاتے ہیں، گن آپ کا گاتے ہیں۔

پچیس تیس سال پہلے جس کے تصور میں بھی امکان نہ تھا کہ کبھی حاضری ہوگی اس کے لیے اب سال کٹنا دُشوار ہوجاتا ہے۔ نومبر میں زیارت سے واپسی ہوئی اور جون میں بلاوا کا ویزا موجود:

رُکتے نہیں گو ٹھوکر ایام کی کھاتے ہیں
گرتے چلے جاتے ہیں اُٹھتے چلے جاتے ہیں

رمضان المبارک میں حرم سے آتے ہوئے بیٹھ گیا۔ اٹھا نہیں گیا۔ سینے میں تکلیف، لوگ لے گئے مدینہ منورہ کے فہد اسپتال میں داخل کردیا گیا، عربی ماہرِ قلب ڈاکٹر اُسامہ بار بار آتے ہیں۔ تم کیسے آگئے؟ تمھارا تو فوراً Byp ass ہونا چاہیے، رات دن لگے ہوئے ہیں، دس دن کے بعد دہلی سرکاری اسپتال کے نام خط دیا فوراً دہلی روانہ ہوجاؤ۔ ایئرپورٹ سے سیدھا اسپتال جاؤ، بائی پاس کراؤ، تمھیں تو فوراً ایڈمٹ کرلیا جائے گا۔ میں جدّہ آگیا۔ اور پھر مکہ چلا گیا۔ کیا واقعی چلا جاؤں؟ مکہ میں ڈاکٹر مسعود احمد نے دیکھا، انجیو گرافی کیا پھر اِنجیو پلاسٹک کردیا۔ بیس دن بعد جدّہ آکر پھر مدینہ منوّرہ چلا گیا۔ ڈاکٹر اُسامہ دیکھ کر حیران! تم گئے نہیں؟ میں نے کہا: حضور حکم جانے کا نہیں ہے، کن کا حکم نہیں ہے؟ جنھوں نے بلایا ہے۔ وہ مسکرا کر چپ ہوگئے:

ہم تو ہیں غلاموں میں دوڑے چلے جاتے ہیں
جب حکم یہ آتا ہے سرکار بلاتے ہیں

جو بھی اشعار نعت کے لکھے ہیں یہی کیفیت، نہ کچھ کہنا نہ سننا۔ بس حاضری، فریاد، گریہ، اور واپسی:

مجرم ہیں ندامت سے کچھ کہہ نہیں پاتے ہیں
دل کانپتا جاتا ہے آنسو بہے جاتے ہیں

سچی معصوموں جیسی بات، سن بوڑھوں کا، باتیں بچوں کی۔ سوال یہ ہے کہ بچہ جوان ہوا ہی نہیں بوڑھا کیسے ہوجائے۔ وقت چلتے چلتے رُک گیا ہے موسم بدلتا ہی نہیں:

جس روز سے تو آئی ہے اے فصلِ بہاراں
ہم تیری ہی کہانی سنانے میں لگے ہیں

یہ تو پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ دل تو یہی کہتا ہے کہ وہ یہی چاہتے ہیں۔ اگر کچھ اور چاہتے تو اتنی بار سر مارا اور مارا کرتا ہوں کبھی تو کچھ بات دل میں ڈالتے۔ شاید وہ یہی رونا گانا پسند فرماتے ہیں۔ رونے والا رونے والوں کو ہی چاہتا ہے:

کل بھی غمِ اُمت تھا اب بھی غمِ اُمت ہے
دُکھ کل بھی اُٹھاتے تھے دُکھ اب بھی اُٹھاتے ہیں

غالباً ۱۹۶۶ء کی حاضری کے بعد ۱۹۷۸ء سے جو تقریباً ہر سال مسلسل سفر کا سلسلہ شروع ہوا اُسی دَور کی دوسری تیسری نعتِ شریف ہے:

ہم تو ہیں غلاموں میں دوڑے ہوئے جاتے ہیں
جب حکم یہ آتا ہے سرکار بلاتے ہیں

رُکتے نہیں گو ٹھوکر ایّام کی کھاتے ہیں
گرتے چلے جاتے ہیں اُٹھتے چلے جاتے ہیں

ہم اور کس جانب کب آنکھ اٹھاتے ہیں
دَھن آپ کا کھاتے ہیں گُن آپ کا گاتے ہیں

مجرم ہیں ندامت سے کچھ کہہ بھی نہیں پاتے ہیں
دل کانپتا جاتا ہے آنسو بہے جاتے ہیں

خونِ جگر و دل سے اشعار کے پردے پر
ہم کیا کیا مدینے کی تصویر بناتے ہیں

کل بھی غمِ اُمت تھا اب بھی غمِ امت ہے
دُکھ کل بھی اٹھاتے تھے دُکھ اب بھی اٹھاتے ہیں

یہ نعت بھی حادثۂ فلسطین ہی کے دوران لکھوائی گئی تھی۔ حضرت امیرِ شریعت مولانا منّت اللہ رحمانی صاحب نے مولانا قاضی مجاہد الاسلام کی معرفت یہ حکم فرمایا، انجمن اسلامیہ ہال میں مسئلہ فلسطین سے متعلق ایک جلسہ ہورہا ہے۔ تمھیں چند نعتیہ اشعار پڑھنا ہے، میں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ یہ اشعار جلسے میں پڑھے اور صبح پٹنہ کے تمام اُردو اخبارات میں یہ اشعار 'نالۂ نیم شبی' کی سُرخی کے ساتھ شائع ہوئے۔ یہ سُرخی میں نے نہیں دی تھی۔ یہ اہلِ صحافت کا عطیہ ہے اور مجھے یہ عنوان پسند آیا۔ اور اکثر اوائل سحر میں یہ اشعار دُعا میں پڑھے گئے۔ اور تقریباً ہر صاحبِ ذوق کے زبان زد ہوگئے۔ اس کے اور بھی اشعار ہوں گے اور ہیں جو کئی ائمہ مساجد کو یاد ہیں۔ دریاپور پٹنہ کے ایک سابق امام جو مونگیر کے رہنے والے ہیں انھوں نے تخلیہ میں مجھے اور اشعار اس کے سنائے تھے، میں اُن سے لکھ کر مانگ نہ سکا اور وہ لکھ کر دے نہ سکے، یہ ان کی ملکیت تھی وہ مجھے کیوں دینے لگے۔ میں نے مانگنے میں بھی سبقت اور استقامت نہیں کی، قصور میرا ہے:

اُن سے اے بادِ صبا حال ہمارا کہیو
غم سے تڑپے ہے کوئی درد کا مارا کہیو

ایک بھی واقعہ مت چھوڑیو سارا کہیو
کہہ کے اِک بار نہ چپ رہیو دوبارا کہیو

ہم نہ جانے ہیں کوئی اور سہارا کہیو
جب کبھی چوٹ لگی اُن کو پکارا، کہیو

کل بھی ہم کون سا سرخاب کا پر رکھتے تھے
آج کیوں ہم سے کرے ہیں وہ کنارا کہیو

سب کی نظروں سے گرے جاتے ہیں ہم اُن کے لیے
کیسے دیکھے ہیں وہ بیٹھے یہ نظارا کہیو

چارہ ساز اپنا جسے لوگ کہا کرتے تھے
اب وہی لوگ اُسے کہتے ہیں بے چارا کہیو

آج آشفتہ و آوارہ پھرے ہے جس نے
شاہدِ وقت کی زُلفوں کو سنوارا کہیو

جب بھی سیلابِ بلا پوچھے ہے رستہ اپنا
وقت کردے ہے اسی سمت اشارا کہیو

کل بھی تھا آج بھی ہے کل بھی رہے گا عاجزؔ
نام ان کا ہمیں جی جان سے پیارا کہیو

کس عالم میں یہ نعتیہ فریاد لکھی گئی۔ وہ شدید درد آمیز ضرب دل کو جس وقت لگی کیا حال طبیعت کا ہوگا، وہ تو بیان نہیں ہوسکتا۔ بیت المقدس کو مکمل نذرِ آتش کرنے کا ناپاک اور اندوہناک ارادہ اور عمل اس وقت واقعی ہمارے علم میں ہے کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے ایک چیخ اُٹھی۔ میں اس وقت جمشید پور میں تھا۔ مسلمان غائت صدمہ میں گھروں سے باہر سڑکوں پر نکل آئے۔ ایمانی غیرت اور ملی حمیت اس وقت بھی جو تھی اب مسلمانوں میں نظر نہیں آتی۔ وہ جو میرؔ کا شعر ہے کہ:

شاید کسی کے دل کو لگی اُس گلی میں چوٹ
میری بغل میں شیشۂ دل چور ہوگیا

ایسا ہی چور ہوتے ہوئے دل میں نے اس دن جمشید پور میں دیکھا۔ پھر اسلامی غیرت دار اور جان سپار نوجوانوں پر تقریباً نہتے نوجوانوں پر جس حیوانیت کے ساتھ بارودی حملہ ہوا اس کا نقشہ جو اخباروں میں آیا وہ حقیقت سے کتنا کم ہوگا لیکن وہ گولیاں مسلمان اپنے سینوں پر محسوس کر رہے تھے۔ وہ کیفیت مجھے تو یاد نہیں مگر اس کا ایک ہلکا اثر ہم نے طالبان کے حملے کے دوران محسوس کیا کہ دعا کے لیے ہاتھ اُٹھتے تھے تو گرنا نہیں چاہتے تھے۔ اور آنسو جو اُبلتے تھے تو بند ہونا نہیں چاہتے۔ اس کیفیت کو یا ان کیفیات کو تیس چالیس سال بعد بھی اپنے ان اشعار میں پڑھتے وقت شدت سے محسوس کرتا ہوں، سامنے کے سیدھے سادھے الفاظ میں کیفیات سچائی کے ساتھ رَچ بس گئی ہیں۔ یہ مرثیہ نہیں ہے، ماتم نہیں ہے، غم کی شدت کا اظہار ہے۔ مرثیہ میں الفاظ مددگار ہوتے ہیں، اس نظم میں الفاظ جذبات اور کیفیات کی مدد نہیں کرتے، جذبات اور کیفیات الفاظ کو زندگی سے بھرپور کردیتے ہیں۔ پندرہ بیس سال ہوئے میں نے کراچی میں ٹی وی پر حکیم یوسف حسن خاں ایڈیٹر 'نیرنگ خیال' کا انٹرویو دیکھا جو اپنے بسترِ پیری اور علالت پر لیٹے لیٹے دے رہے تھے۔ لاہور جامع مسجد کا نقشہ جہاں حکیم الامت علامہ اقبالؒ اپنی نظم پڑھ رہے تھے، لوگ غور سے سن رہے تھے اور متاثر تھے۔ اقبالؔ جب اس شعر پر پہنچے:

حضور نذر کو اِک آبگینہ لایا ہوں
وہ شئے ہے اس میں کہ جنت میں بھی نہیں ملتی

تو سامعین کے ابرو کھینچ گئیں اور بعض لوگ بول اُٹھے۔ علامہ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ کوئی ایسی چیز بھی ہے کہ وہ جنت میں نہیں ملتی؟ اقبالؔ جنت کی توہین کر گئے اور کلمۂ کفر بول گئے؟ لیکن جب اقبالؔ نے اس کے بعد کا آخری شعر پڑھا:

چھپی ہے آپ کی اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

تو حکیم یوسف حسن خان نے پیری اور علالت کے باوجود اپنے بستر پر زور سے کروٹ لی اور فرمانے لگے کہ مسجد کے حاضرین سامعین فرش پر لوٹنے لگے اور اتنی زور سے آہ کی کہ شیروانی کے بٹن ٹوٹ کر ٹپاٹپ سنگیں فرش مسجد پر گرنے لگے۔ کئی منٹ کسی کو ہوش نہیں رہا۔ میں ٹی وی پر یہ انٹرویو دیکھ رہا تھا اور مجھے اپنی اس نظم کے اشعار یاد آ رہے تھے اور سوچ رہا تھا کہ کون سامعین تھے؟ وہ کون قاری تھے؟ وہ کس دنیا کے لوگ تھے؟ وہ دنیا کہاں گئی؟ اُس دنیا کے وہ لوگ کہاں گئے؟ وہ سینہ چاکانِ چمن کس وادی میں کھو گئے؟ کس جنگل میں گم ہو گئے؟ انھوں نے کس سمندر میں ڈوب کر خودکشی کر لی؟ کون غیرت دار لوگ تھے وہ جو آج کی دُنیا میں زندہ رہنا نہیں چاہتے تھے؟ آج کی بیماری لگنے سے پہلے ہی وہ صحت مند رخصت ہو گئے۔ یہ دنیا بیماروں کی، مریضوں کی، ذی فراشوں کی، اپاہجوں کی، فالج زدوں کی، گم کردہ حواسوں کی ہے۔ اللہ ہمیں صحت عطا فرمائے۔ آمین۔

التماس دربارگاہِ رسالت

زخم کھائے ہوئے سرتابہ قدم آئے ہیں
ہانپتے کانپتے یاشاہِ اُمم آئے ہیں

آپ کے سامنے جس حال سے ہم آئے ہیں
ایسے مجرم کسی دربار میں کم آئے ہیں

کھو کے بازار میں سب اپنا بھرم آئے ہیں
شرم کہتے ہوئے آتی ہے کہ ہم آئے ہیں

سرنگوں آئے ہیں بادیدہ نم آئے ہیں
آبرو باختہ دل سوختہ ہم آئے ہیں

عالَم عالَم میں کہیں کوئی سہارا نہ ملا
ٹھوکریں کھا کے ہر اِک سمت کی ہم آئے ہیں

گرچہ بے سوز ہیں بے ساز ہیں بے ساماں ہیں
ہاتھ خالی نہیں سرکار میں ہم آئے ہیں

لے کے اُردن کے جوانانِ بنی ہاشم کا
حوصلہ آئے ہیں دم آئے ہیں خم آئے ہیں

لے کے ہم پیشکشِ خدمتِ عالی کے لیے
تحفۂ خونِ شہیدانِ حرم آئے ہیں

بیتِ مقدس کے غریب الوطنوں کا لے کر
جگرِ سوختہ و دیدۂ نم آئے ہیں

مختصر یہ ہے کہ اس سینۂ سوزاں میں لیے
وقت کا سب سے دہکتا ہوا غم، آئے ہیں

یہ غم ایسا ہے کہ پھر غم نہ کوئی یاد رہا
یوں تو ہر دَور میں رنج آئے ہیں غم آئے ہیں

آپ کے سایۂ دامن سے جو ہم دُور ہوئے
ٹوٹ کر چاروں طرف اہلِ ستم آئے ہیں

اور یہ کہتے ہیں کہ تم لوگ اسی قابل ہو
اور آئیں گے مصائب ابھی کم آئے ہیں

اِک نگاہ غلط انداز کے سائل بن کر
مجرمانِ اُمم اے شاہِ اُمم آئے ہیں

اب تو اِس دَر سے نہ سر اُٹھے گا انشاء اللہ
جان دے دیں گے یہیں سوچ کے ہم آئے ہیں

میرا سفرِ حجاز برائے حج پہلی بار ۱۹۶۵ء میں ہوا۔ دوسرا سفر ۱۹۷۸ء میں، اس کے بعد سفرِ امریکہ اور کناڈا کا آغاز ہوا۔ تقریباً ہر سال اور کبھی ایک سال کے وقفہ سے ہوتا رہا۔ اور میں نے امریکہ اور کناڈا کے ہر سفر میں واپسی براہ حجازِ مقدس کی نیت کی۔ ویزا اپنے ملک سے ہی لینا پڑتا ہے۔ قانوناً اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں ہے۔ شاید طلب یا نیت کی برکت کہ یہ مشکل کبھی امریکہ سے، کبھی کناڈا سے حل ہوئی۔ امریکہ میں سعودی عرب سفارت خانے میں گیا تو سفارت میں کوئی نہ کوئی ایسے بزرگ اور دوست مل گئے، وہ پاکستان کے ہوں یا ہندوستان کے، جو مجھے شعر و ادب کی نسبت سے کہیں دیکھ چکے تھے اور سن چکے تھے۔ کہیں کوئی صاحب مجھے کسی کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹیبل سے کھڑے ہو گئے۔ ''ارے کلیم عاجزؔ صاحب! آپ یہاں کیسے تشریف لے آئے۔ آیئے تشریف رکھئے۔ میں نے آپ کو کراچی یونیورسٹی کے مشاعرے میں کئی بار دیکھا۔ میرا نام محبوب عالم ہے۔ میں آپ کے پٹنہ کے بہت قریب فتوحہ کے بہت بغل میں صفی پور کا رہنے والا ہوں۔'' چلئے کام بن گیا۔ وہیں بیٹھا رہا اور چند گھنٹے میں عمرہ کا ویزا حاصل کر کے واپس ہوا۔

ایک بار کناڈا کے سفارت خانۂ حجاز میں ایک صاحب مل گئے جو کراچی ڈویژن کے اوّلین کمشنر مسٹر ہاشم رضا کے چھوٹے بھائی تھے اور کراچی میں ہاشم رضا صاحب میری شاعری کے عاشق۔ کئی مضامین بھی انھوں نے کراچی میگزین میں میری شاعری کے متعلق لکھے۔ ان کے بھائی عابد رضا صاحب کناڈا میں مل گئے اور مجھے عمرہ کا ویزا مل گیا۔ کبھی پٹنہ کے اسد حسین جوشکاگو یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں، سعودی سفیر اُن کے دوست تھے۔ ان کے وسیلے سے یہ آسانی مل گیا۔ اور اب تو واشنگٹن کے سعودی ایمبسی میں میرے ایک دوست مسٹر مدثر صدیقی قانونی مشیر ہیں۔ میں امریکہ میں جہاں رہوں ان کو پاسپورٹ بھیج دیتا ہوں، وہ ویزا لگوا کر رجسٹری سے پاسپورٹ میرے یہاں بھیج دیتے ہیں۔ اس طرح تقریباً ہر سال مجھے حاضری اور ماہ ڈیڑھ ماہ

قیام کی سعادت نصیب ہوجاتی ہے۔ اور تقریباً ہر سفر میں حاضری کے کسی نہ کسی موقع سے چند اشعار بے اختیار ہو جاتے ہیں، جو درود وسلام کے دوران روضۂ مقدّس سے دُور کہیں کھڑے ہو کر حضرت جامیؒ کے اوّلین چند اشعار پڑھ کر اپنی عرضداشت پیش کر دیتا ہوں:

مرحبا سیّدِ مکی مدنی العربی
دل و جان باد فدائت چہ عجب خوش لقبی
من بے دل بہ جمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمالِ سب بہ ایں بوالعجبی
نسبت خود بہ سگت کردم و بس منفعلم
کہ ایں نسبت بہ سگ کوئے تو شد بے ادبی

اور اس کے بعد میں شروع ہو جاتا۔ پیشانی کسی ستون سے لگی ہوتی ہے۔ ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے ہیں، آنسوؤں کا قافلہ صف باندھے گزر رہا ہے اور سسکیوں میں ڈوبے ہوئے الفاظ نکل رہے ہیں۔ یہ نعت بھی کسی حاضری کے موقع پر ہوئی:

نثار ٹوٹے ہوئے دل کا جام کرنے کو
کلیم آ ہی گیا پھر سلام کرنے کو

حضور یہ بے ادب بے شعور بے غیرت
کرے ہے صبح گناہوں میں شام کرنے کو

مگر بنا کے بڑی ہوشیاری سے بہروپ
چلا ہے تقویٰ گزاروں میں نام کرنے کو

سوائے اپنے گناہوں پہ رونے دھونے کے
اب اس کے پاس نہیں کوئی کام کرنے کو

اسی لیے تو یہ کمبخت خانماں برباد
بہانہ ڈھونڈا کرے ہے سلام کرنے کو

کرم نے آپ کے بلوالیا ہے ورنہ یہاں
کوئی نہ چاہتا اس کے قیام کرنے کو

سمجھنے والی نگاہوں نے چُن لیا ہے اُسے
منافقوں کی صفوں کا امام کرنے کو

اب آستانے پہ حاضر ہی ہوگیا تو اُسے
قبول کیجیے قیدِ دوام کرنے کو

ملازموں کو بلا کر سپرد کردیں اُسے
سگِ غلامِ غلامِ غلام کرنے کو

حج میں تو حاضری دورانِ حج ہوتی ہے۔ عمرہ کے ویزا میں پندرہ بیس دن کے قیام کی گنجائش ہوتی ہے اور صرف مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی اجازت رہتی ہے اور کہیں قدم نہیں نکال سکتے۔ دو قسم کے اجازت نامے اور ہوتے ہیں — ویزٹ ویزا یا تجارتی ویزا۔ عمرہ کے ویزا میں قیام بھی کم اور مقام سفر بھی معین۔ خلوت کا تقاضا زیادہ قیام کا اور متبرک اور تاریخی مقامات کی حاضری کی تمنّا۔ مثلاً 'طائف' جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریباً سو کیلو میٹر کا سفر تنہا فرمایا۔ اور کیا سفر ہوگا وہ ایسی دُشوار گزار خطرناک اور نازک گھاٹیاں ذرا پاؤں پھسلے تو ہزاروں فٹ کی خوفناک گہرائیاں منہ کھولے ہوئے، حیرت ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کس مشقت سے سفر فرمایا ہوگا۔ آج سعودی عرب بے پناہ قوتِ خرچ اور تعمیری وسائل، سال ہا سال کوششوں کے بعد پختہ راستے بنانے میں کامیاب ہوا ہے مگر اب بھی خطرات سے سابقہ ہوجاتا ہے۔ گاڑیاں پھسل پڑتی ہیں۔ تقریباً سو کیلو میٹر کی دُوری زمینی سطح کی نہیں ہے وہ تو بہت کم ہوگی مگر طائف پہنچنے کے لیے پیچ در پیچ پہاڑیوں، گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ مکہ مکرمہ کی حدود میں داخل ہوتے ہی بہت اونچی پہاڑی کی چوٹی پر بنے ہوئے ایک بلند مینار کا اوپری روشن حصہ نظر آتا ہے جو طائف شہر ہے مگر وہاں تک پہنچنے میں اب بھی بہت تیز رفتار کار کو پونے دو گھنٹے لگتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ جانے کتنے دِنوں میں ان خوفناک گھاٹیوں کو کس مشقت سے عبور فرمایا ہوگا۔ ایک بار حضرت مولانا الیاس صاحبؒ بانی تبلیغی تحریک نظام الدین کسے چند علما کی جماعت کے ساتھ میوات کا سفر کر رہے تھے۔ میوات کے راستوں میں بھی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں آتی ہیں۔ حضرت مولانا الیاس صاحبؒ جسمانی طور پر بہت کمزور، لاغر اور مستقل بیمار رہنے کے باوجود اپنی روحانی طاقت سے اتنا تیز چلتے تھے کہ مولانا کسی پہاڑی کو آگے آگے طے کر لیتے اور دوسرے کنارے پر پہنچ کر رومال بچھا کر دو رکعت نمازِ شکرانے کی پڑھ لیتے تب دوسرے علما ساتھی ان کے پاس پہنچتے۔ سفر کے آخر میں اسی طرح ایک پہاڑ عبور کر کے مولانا دو رکعت پڑھ کر فارغ ہوئے تھے کہ دوسرے

علما ساتھی پسینے پسینے ہانپتے ہوئے پہنچے کہ مولانا ہم تو پریشان ہوگئے، بہت تھک گئے۔مولانا الیاسؒ نے فرمایا کہ اب کچھ اندازہ آپ کو ہوا ہوگا۔حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سو سال قبل مکہ مکرمہ سے ساٹھ میل دُور طائف کا سفر تنہا پہاڑیوں کی خوفناک گھاٹیوں کا کیسے کیا ہوگا؟

راوی کہتا ہے کہ یہ سن کر تمام علماء رفیق کا پسینہ خشک ہوگیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مشقتوں کو یاد کرکے رونے لگے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم طائف تشریف لے گئے۔وہاں کے تین قبیلے کے سرداروں سے دین کی گفتگو فرمائی۔تینوں نے ذلت آمیز رویہ اختیار کیا۔ذلیل کیا اور شہر سے فوراً واپس نکل جانے کا حکم دیا۔جوان اور چھوٹے لڑکوں کو پیچھے لگا دیا کہ اینٹ پتھر برسائیں، تالیاں پیٹیں، توہین آمیز باتیں کریں۔حضور سرکارِ عالی صلی اللہ علیہ وسلم طنز وطعن برداشت کرتے ہیں، تالیاں سنتے رہے، اینٹ پتھر کھاتے رہے، آگے بڑھتے رہے، گھٹنوں کے زخموں کی شدید تکلیف سے گرتے رہے اور مشرکین آپ کو اُٹھا کے چلاتے رہے اور پتھر مارتے رہے۔ یہاں تک کہ شدید تکلیف سے بیہوش ہوکر گر گئے تو مشرکین واپس ہوئے۔آپ کو زخم آلودہ اور خون آلودہ دیکھ کر قریب کے باغ سے ایک شخص آیا۔آپؐ کو بٹھایا، باغ سے دوڑ کر ایک گلاس کوئی پھل کا رَس نکال کر لایا۔آپ کے ہونٹ مبارک سے گلاس لگا دیا۔آپ نے چشم مبارک ذرا کھولی۔گلاس لبوں سے لگانے والے کو دیکھا اور چند گھونٹ نوش فرمائے پھر آہستہ آہستہ فرمایا تم کون ہو؟ اُس شخص نے جواب دیا۔میں اس باغ کے مالک کا نوکر ہوں، میں یمینی عیسائی ہوں آپ ذرا مسکرائے اور فرمایا آہ تم ہمارے بھائی حضرت یونس علیہ السلام کے شہر کے ہو؟ وہ شخص حیرت زدہ ہوکر کھڑا ہوگیا، کہنے لگا خود میرے شہر میں اب حضرت یونس علیہ السلام کو جاننے والے نہیں ہے۔تم اتنے دُور دراز علاقے میں ان کو جانتے ہو اور انھیں اپنا بھائی کہتے ہو۔کیا تم کوئی نبی ہو۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہاہاں اور اپنا نام نامی ارشاد فرمایا۔وہ شخص وہیں پر ایمان لے آیا۔آپ نے دعا دی اور فرمایا اللہ اس باغ کو ہمیشہ قائم رکھے۔چنانچہ وہ باغ اب تک موجود ہے، اور اس مٹّی کے تودے کو جس کے سہارے آپ کو بٹھایا گیا تھا کرسی نما چبوترہ بنا دیا گیا ہے۔ میں نے وہ باغ بھی دیکھا اور اس چبوترے کی زیارت بھی کی ہے۔وہاں پر ایک چھوٹی سی مسجد بنا دی گئی ہے وضو اور استنجے کا بھی نظام ہے۔

تو یہ مختصر بات ویزے کے سلسلہ میں آئی کہ مقدس مقامات کی زیارت عمرہ پر نہیں ہوسکتی۔تو

جناب ہماری نظر ہمارے شہر کے ایک بزرگ ڈاکٹر کی طرف گئی جو پٹنہ ہی کے ہیں اور تقریباً پینتالیس سال سے حجازِ مقدس میں قیام پذیر ہیں اور سعودی شہریت رکھنے کا شرف حاصل ہے۔ جناب ڈاکٹر ظفیر احمد صاحب بہار شریف سلیم پور کے قدیم باشندے اب مقیم پٹنہ اور مستقل سعودی شہری۔ حضرت شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارن پوری کے اہم خلیفہ اور حضرت شیخ الحدیث کے تعلیمی اور تبلیغی مشن کو پوری قوت سے زندہ رکھنے والے۔ حضرت شیخ کے متعلق اور دینی اُمور کی نسبت سے درجنوں پر وقار تالیفات کے مالک۔ میرے بہت مہربان شفیق اور سرپرست۔ میں نے ان سے رجوع کیا تو فوراً زحمت کی اور اپنی وکالت سے میرے لیے وِزٹ ویزا حکومت سعودی عرب سے حاصل کر کے مجھے بھیجا اور کئی سال تک بھیجتے رہے اور اب بھی بھیجتے رہتے ہیں اور میں رمضان المبارک میں جاتا ہوں۔ کئی بار تو پورے رمضان المبارک پھر شوال اور پھر ذیقعدہ وہیں گزار کر حج کی سعادت حاصل کر کے واپس ہوا۔ اب صرف رمضان المبارک اور بعد کے کچھ ایام گزار کر واپس آجاتا ہوں۔ یہ نعت شریف، وِزٹ ویزا پر پہلے سفر کے دوران لکھی گئی:

دُھوپ کی تیزی کب جائے گی بادل کس دن چھائیں گے
کالی کملی والے اپنی کملی کب لہرائیں گے

جو کچھ رونا گانا ہوگا اب وہیں روئیں گائیں گے
لوگ جہاں جاتے ہیں جائیں ہم تو مدینہ جائیں گے

اِس گھر میں جو کچھ کھویا ہے اُس گھر سے سب پائیں گے
پاؤں یہاں پھیلائے ہوئے ہیں ہاتھ وہیں پھیلائیں گے

اُن کے کرم کا کیا کہنا ہے وہ جو کرم فرمائیں گے
جتنے قطرے اشکوں کے ہیں سب موتی بن جائیں گے

دن کو مدینے کی گلیوں میں گیت اُنھیں کا گائیں گے
رات کو اُن کی چوکھٹ پر ہم سر رکھ کر سو جائیں گے

اس نعت فریاد کا ذکر پیش لفظ میں آیا ہے۔ مجھے وہ چند دِنوں کا منظر اب بھی یاد ہے ۔جیسے جیسے سقوطِ مشرقی پاکستان کی خبریں آ رہی تھیں، پٹنہ کے برادرانِ وطن نوجوان اور جوان بی این کالج یعنی میرے گھر کے سامنے سڑکوں پر ناچتے پھرا کرتے تھے۔میں مسجد جانے کو نکلتا تو ایسا لگتا جیسے سب میری آنکھوں میں جھانک رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں اور ذلت سے مسکرا رہے ہیں ۔ کہاں ہیں اقبالؔ؟ بلایئے ،جیسے اقبالؔ کا شعر پڑھ رہے ہوں اور ہنس رہے ہوں:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کرتا بخاکِ کاشغر

ایسی شکست اور شرمندگی کا ماحول تھا، اور میں بس دو ماہ پہلے ہی دیکھ آیا تھا۔میں نومبر ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان اپنی بہن سے مل کر واپس آیا تھا۔اور دیکھ آیا تھا کہ صرف ایک چھاؤنی یعنی مشرقی پاکستان کے سرحدی شہر جیشو پور کے کنٹومنٹ میں میلوں تک گولہ بارود سے بھرے ٹرک تیار کھڑے تھے کہ کب اِن کے استعمال کی ضرورت پڑ جائے۔لیکن وہ ضرورت کے وقت استعمال نہ ہوسکے، پٹنہ میں لوگ تھالیوں میں مٹھائیاں لیے ایک دوسرے کے منہ میں ڈالتے پھرتے تھے:

اے بادِ صبا کہیو اُن سے وہ جن کی کملیا کالی ہے
اب اُن کے غلاموں کے گھر کی دیوار اُلٹنے والی ہے

اور دیوار اُلٹ گئی:

کی محمدؐ سے وفا تونے ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

وفا نہ ہوئی تو لوح و قلم کا رُخ دوسری طرف ہوگیا:
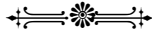
یہ بات صبا کہیو ان سے وہ جن کی کملیا کالی ہے
اب ان کے غلاموں کے گھر کی دیوار اُلٹنے والی ہے

کہیو کہ انھوں نے اپنی نظر کیوں ہم سے الگ فرمالی ہے
ہم نے تو اُنھیں کی زُلفوں کی زنجیر گلے میں ڈالی ہے

کہیو کہ دِلوں پر چھائی ہوئی ہر سمت شکستہ حالی ہے
دن بھی ہے بڑا سُونا سُونا اور رات بھی کالی کالی ہے

کہیو کہ ستم نے تیروں کی بوچھار ہمیں پر ڈالی ہے
ہر شام نیا ہنگامہ ہے ہر صبح نئی پامالی ہے

کہیو کہ یہ صورتِ حال ہے اب ہم منہ کو چھپائے پھرتے ہیں
چہرے تو ہیں گردن پر لیکن چہروں پہ کہاں اب لالی ہے

کہیو کہ وہی تو ساقی ہیں کہیو کہ وہ یہ بھی جانے ہیں
رِندوں کو لگی ہے پیاس بہت اور سب کا پیالہ خالی ہے

غالباً یہی ایک نعت ہے جو میں نے پٹنہ میں لکھی۔ اور شاید نعت کے موضوع پر میری پہلی کوشش ہے۔ وطن میں بے وطنی کا احساس اس نعت کا مرکزی موضوع ہے۔ وطن میں سب کچھ کھودینے کے بعد اور کچھ باقی نہ رہنے کے باوجود یہاں قیام کا سبب ہے خودداری، وضع داری اور پرانی فطری وابستگی اُس گاؤں کے ساتھ اور ایسے لوگوں سے رشتہ تعلق اور محبت جن کے درمیان میری ٹھوس مضبوط شخصیت کی تعمیر ہوئی۔ وہ ماحول اور اس ماحول کی شخصیتیں جن کا پرتو مری تنہا شخصیت ہے۔ سب کچھ اس گاؤں کی چھوٹی سی سرزمین میں دفن ہوکر جاوداں ہوگیا ہے۔ سب کچھ خطروں کے سپرد کرنے کے بعد، اور بظاہر اپنا مستقبل غیر محفوظ سمجھنے کے بعد بھی اس کو چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ اور پچپن برس سے اس تعلق کو فطری وضع داری، دردمندی اور محبت کی گہری حرارت کے ساتھ قائم رکھ رہا ہوں۔ اسے ایک ایسا چراغ بنا دیا ہے جس کی روشنی میری شخصیت میں بھی ہے اور میرے فن میں بھی ہے۔ ورنہ:

وہیں لے چل کلیمؔ اپنا سفینہ　　ہم ایسے بے گھروں کا گھر مدینہ
یہاں مرنا سوارت ہے نہ جینا　　مدینہ چل مدینہ چل مدینہ

حقیقت تو یہی ہے، مگر حقیقت اور جذبات میں لڑائی بھی ایک بڑی مہم ہے جسے سر کرنے میں لگا ہوا ہوں۔

انگوٹھی دل ہے اور اس کا نگینہ　　مدینہ ہے مدینہ ہے مدینہ
اسی کی ہے چمک سینہ بہ سینہ　　اندھیری رات کا جگنو مدینہ
وہی تو سب ہے مرنا ہو کہ جینا　　مدینہ آج بھی کل بھی مدینہ
وہیں لے چل کلیمؔ اپنا سفینہ　　ہم ایسے بے گھروں کا گھر مدینہ
یہاں مرنا سوارت ہے نہ جینا　　مدینہ چل مدینہ چل مدینہ
سفر ہوتا بہ خم پھرتا بہ مینا　　یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ

کہا جاتا ہے کعبہ جن کے گھر کو
ہے ان کے گھر کا دروازہ مدینہ

مجھے تاریخ دن کبھی یاد نہیں رہتا، واقعہ یاد رہتا ہے، میرے متعلق تحقیق کرنے والوں کو (اگر توفیق ہوئی) قدم قدم پر بڑی دُشواری ہوگی، ان دشواریوں کو حل کرنے کا ہنر اور استعداد پرانوں کو تھی، محقق تاریخ داں بھی ہوتا ہے۔ الفاظ و بیان میں، اشاروں اور سیاق وسباق کے وسیلے سے بہت سی گمشدہ باتوں تک ان کی رسائی ہو جاتی تھی۔ اس نعتیہ نظم کا اشارہ پیش لفظ میں آیا ہے۔ مراد آباد میں عید کی نماز میں مشغول اور عید کی نماز میں جاتے ہوئے صبحِ عید کی مسرور کیفیت میں غرق جوانوں، بوڑھوں اور بچوں پر گولیوں کی بارش ہوئی۔ عیدگاہ میدانِ کربلا بن گیا۔ شہیدوں کے تڑپنے کا منظر کربلا کے میدان کا نقشہ بن گیا۔ ہم لوگ دُور کی بات سنتے ہیں اور تڑپ جاتے ہیں۔ وہاں موجود دیکھنے والوں کو کیا نظر آیا ہوگا اور کیا محسوس ہوا ہوگا۔ ہم میں کہاں وہ حقیقت نگاری کی استعداد ہے۔ یہ ضرور دیکھا کہ ان سادہ صاف اور سچے اشعار کو سن کر دادِ تحسین کا شور تو نہ اُٹھا مگر نظم ختم ہوتے ہی درجنوں شیروانی پوش، عبا پوش اور سوٹ بوٹ والے جلسے کے اصول اور ضابطہ کو توڑتے ہوئے اسٹیج پر چھلانگ کر مجھ سے معانقہ کرنے لگے:

بارگاہِ رسالت میں

مراد آباد کے فساد سے متاثر ہو کر جو ٹھیک عید کے دن رونما ہوا تھا

مدینہ پہنچ کر سرِ عام کہیو
صبا کملی والے سے پیغام کہیو
طبیعت اندھیروں سے اُکتا گئی ہے
بہت دن سے ہے شام ہی شام کہیو

خزاں بھی گزاری بہاریں بھی دیکھیں
ملا کوئی کروٹ نہ آرام کہیو

ہمیں پھول بانٹیں ہمیں زخم کھائیں
وہ آغاز تھا اور یہ انجام کہیو

ہمیں شہریارانِ شہر ستم سے
وفا کا جو ملتا ہے انعام کہیو

چراغاں محبت کا ہو تو کہاں ہو
کہ گھر ہوگئے بے درو بام کہیو

یہاں میکدہ کہتے ہیں قتل گہہ کو
لہو سے بھرے جاتے ہیں جام کہیو

''بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے''
محرم کا اب عید ہے نام کہیو

یہ اشعار ان سے نہایت ادب سے
نگاہیں جھکاکر اور دل تھام کہیو

وہ خود ہی نہ دریافت فرمائیں جب تک
تخلص نہ ان سے مرا نام کہیو

وہ پوچھیں کہ ہے کون کمبخت عاجزؔ
تلہاڑے کا ہے ایک بدنام کہیو

زمانے سے روتا سسکتا پھرے ہے
کبھی چین لے ہے نہ آرام کہیو

مسجد نبوی کے سائبان میں ذکر و تلاوت جاری تھی۔ میں تو دیر تک بیٹھتا ہوں، کبھی کبھی ایک نشست سات سات آٹھ آٹھ گھنٹے کی ہو جاتی۔ رمضان المبارک میں تہجد یا نمازِ فجر کے وقت حاضری ہوتی تو قیام گاہ جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آرام کی چنداں پروا نہیں ہوتی۔ آرام کچھ لینے کا بدن کو تقاضہ بھی ہوتا تو بدن کو سرزنش کرتا کہ تھوڑا اور جھیل تھوڑا اور دُکھ تھوڑا اور اکڑ۔ آخر کیا کمائی لے کر جائے گا۔ تو ظہر کے بعد بھی نہ جاتا۔ عصر سے پہلے جا کر کچھ سامان مختصر افطاری کا، کبھی کھجور، کبھی دَہی کا ڈبّہ لانے کو جاتا، ورنہ وہیں بیٹھا رہتا۔ قافلے آتے جاتے، ترکیوں کے قافلے، ملیشیا کے قافلے، انڈونیشیا کے قافلے، کبھی ایرانیوں کے قافلے، حبشیوں کے قافلے، پاکستانیوں کے جُھنڈ، افغانوں اور پشتوں کے گروہ۔ بس آ رہے ہیں جا رہے ہیں۔ نظروں کے سامنے سارے جہاں کا نقشہ پھر جاتا۔ کبھی بدّوؤں کے جمگھٹے آ جاتے، مست سرشار، بھری بھری آنکھیں، جھومتے ہوئے جسم! ایسا معلوم ہوتا جیسے سب کچھ ان کے باوا کا ہے اور ان کے باوا کا تو ہے ہی۔ کیا ہمارے آپ کے باوا کا ہے۔ واقعی سب کچھ ان کے باوا کا ہی ہے۔ اور اس ملکیت کی مستی سے ہی ان کی مستی اور سرشاری ان کے جسم کے روئیں روئیں سے ٹپکتی تھی۔ یاد دلاؤں وہ واقعہ جو میں نے اپنے سفرنامۂ حجاز میں مختصر لکھا ہے۔ ایک ہندوستانی حاجی اپنا سامان ایک بدّو قلی کے سر پر لیے آ رہا تھا۔ منزل پر پہنچ کر حاجی نے قلی سے مزدوری دریافت کی تو حاجی صاحب کو وہ اجرت زیادہ لگی تو انھوں نے کم دینے کا اظہار کیا۔ قلی نے انکار کیا، دوسری بار پھر ہندوستانی حاجی صاحب نے کم دینے کا اظہار کیا تو اس قلی نے بہت زور سے ہندوستانی حاجی صاحب کو ڈانٹ دیا۔ حاجی صاحب کو تھوڑا سکتہ ہوا پھر وہ مسکرائے اور بڑے جذبے سے کہا ہاں بھائی۔ ڈانٹ لو، ہاں بھائی ڈانٹ لو۔ تم نہ ڈانٹو گے تو کون ڈانٹے گا۔ اللہ کا گھر بھی تمھاری زمین پر اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آرام گاہ بھی تمھاری ہی زمین پر ہے۔ ہمارے پاس کیا ہے بھائی۔ میں

شاید وہیں تھا، مرا جی چاہا کہ میں ناچنے لگوں اور ہندوستانی حاجی صاحب سے لپٹ جاؤں کہ بھائی کیا بات تم نے کہہ دی! —— تو مسجد نبوی میں سائبان میں بیٹھا میں ان آتے جاتے قافلوں دیکھ رہا تھا۔ متفرق خصوصیات، مختلف انفرادیت، مختلف ساخت اور پرداخت کے لوگ —— تو اسی وقت یہ تین چار شعر سائبان میں بیٹھے بیٹھے نکل گئے۔
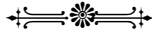
نعت

ہر دم ہجوم قافلۂ میکشاں رہے ۔۔۔ آباد یوں ہی محفلِ پیر مغاں رہے
جائے جہاں نظر جہاں ٹھہرے جہاں رہے ۔۔۔ بس کارواں ہی کارواں ہی کارواں رہے
جس کا نہ کوئی گھر نہ کوئی سائباں رہے ۔۔۔ اس آستانے پر نہ رہے تو کہاں رہے

ہم تشنہ کام آتے ہیں سیراب جاتے ہیں
ساقی خدا کرے تیری اونچی دُکاں رہے

حادثۂ حرم (۱۹۷۹ء)

کھو کے بازار میں سب اپنا بھرم آئے ہیں ۔۔۔ شرم کہتے ہوئے آتی ہے کہ ہم آئے ہیں
کس قدر دل پہ لیے شدّتِ غم آئے ہیں ۔۔۔ گرچہ اللہ کا گھر دیکھ کے ہم آئے ہیں
اپنی اُمیدوں تمنّاؤں کی گردن پر لیے ۔۔۔ اپنی ہی، دوست کی شمشیرِ ستم آئے ہیں
کل تو اغیار سے دُکھ پائے ہوئے آتے تھے ۔۔۔ آج اپنوں کے ستائے ہوئے ہم آئے ہیں
ہائے کیا عرض کریں دیکھ کے کن آنکھوں سے ۔۔۔ چھلنی چھلنی درودیوارِ حرم آئے ہیں
آپ اپنے لب و رخسار جہاں رکھتے تھے ۔۔۔ ان پہ زخموں کے نشاں دیکھ کے ہم آئے ہیں
خلیل اللہ سے بھی کہیے کہ دیکھیں وہ جگہ ۔۔۔ جس جگہ چھوڑ کے وہ نقشِ قدم آئے ہیں

کتنے دامن کی خدا جانے ضرورت ہوگی
بہت آنے کو ہیں آنسو ابھی کم آئے ہیں

ایک سال کی بات ہے۔حسبِ معمول سالانہ ویزا آتا تھا سو آ گیا۔میں نے رمضان المبارک سے کچھ قبل دہلی کا سفر کیا،شمس الرّب صاحب جنرل منیجر ہمدرد ٹرسٹ دہلی کے مہمان خانے میں ٹھہرا۔ بڑا گہرا ربط ان سے تھا۔ وہ میرے معتقد، میں ان کا مداح ۔ ویزا سفارت سے لگوا کر پاسپورٹ شمس الرّب کے حوالہ کیا۔ آپ کسی ایئر لائنس سے کسی دن کا ٹکٹ خرید لیجیے۔ ابھی رمضان شروع ہونے کو چند دن باقی ہیں،سیٹ مل جائے گی ۔ان کے تعلقات وسیع تھے،اُمید تھی کہ اُن کے ذریعے یہ مسئلہ اور آسانی سے حل ہوجائے گا۔انھوں نے ایک ماتحت افسر کو ایئر لائنس میں بھیجا،سعودیہ ایئر لائنس،کویت ،گلف،ایئر انڈیا جس میں بھی سیٹ ملے ریزرو کرالو،وہ گئے ۔ اور شام شام تک واپس آئے کہ کسی ایئر لائنس میں کوئی سیٹ رمضان کے ختم تک نہیں ہے۔ایسا لگا کہ جیسے دل بیٹھ گیا۔ ویزا جیسی مشکل چیز وہ بھی حل ہوگئی۔ٹکٹ جیسی آسان چیز پانچ چھ کمپنیاں ہیں کسی میں تو سیٹ مل سکتی ہے،مگر خیال اور ہے حقیقت کچھ اور ہے۔شمس الرّب صاحب بھی اپنے تعلقات اور آشنائی میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اس انتظار میں کہ کسی ایئر لائن میں شاید مل جائے ،میں مستقل وہاں پڑا رہا۔روزانہ وہ کسی ذمہ دار آفیسر کو بھیجتے اور روزانہ شام تک مایوس کن ہی خبر آتی ۔ آٹھ دس دن گزر گئے ۔ بچارے شمس الرّب صاحب بھی افسوس اور شرمندگی میں کہ باوجود اثرات اور تعلقات ان کی کوششیں بھی رائیگاں جارہی ہیں ۔عید کے بعد ویزا بالکل بند ہوجاتا ہے،میرا ویزا دو ماہ کا تھا،ذیقعدہ تک میں قیام کرسکتا تھا۔ اگر رمضان میں سیٹ نہیں ملی تو ویزا رائیگاں ہوجائے گا،میں نڈھال رہنے لگا۔کوشش اور دوڑ دھوپ جاری رہی مگر اُمید کی کوئی کرن مستقبل میں نکلتی نظر نہیں آ رہی تھی ۔

شمس الرّب صاحب ایک دن سہ پہر کو کوشش میں روانہ ہوئے۔ شام شام تک ان کی واپسی نہیں ہوئی ۔ ٹیلی فون سے خبر آئی کہ کوئی صورت حصولِ ٹکٹ کی نظر نہیں آتی۔شام کے بعد

حسبِ معمول وہ واپس چلے آئے۔ ہم دونوں نے کھانا تناول کیا، وہ اندر سونے گئے۔ میں مہمان خانے میں مسہری پر لیٹ گیا۔ سینے پر منوں بوجھ تھا اور ہر طرف سنّاٹا اور تاریکی ہی تاریکی نظر آ رہی تھی۔ میں بستر پر کروٹ بدلتا رہا۔ دھیان اُدھر ہی گیا۔ رمضان المبارک کا ماحول شروع ہو گیا ہوگا۔ معمول وہاں چراغاں کا اور دنوں بھی رہتا تھا، رمضان میں تو روشنیوں کا سیلاب ٹوٹ پڑتا تھا، اور شام کو افطار کے لیے دسترخوان عصر کے پہلے سے لگنے شروع ہو جاتے۔ حرم کے اندر اور باہر ہزار ہا ہزار دسترخوان بچھ جاتے اور روزہ داروں کو خوشامد کر کے لے جانے کے لیے حرم سے باہر دُور تک گروہ کے گروہ پھیلے رہتے۔ ان تصورات نے آبدیدہ کر دیا۔ میں کروٹ لیتا رہا کہ ایک مصرعہ آیا اور پھر دوسرا مصرع آ گیا:

یہ کہا کلیؔم سے ایک شب، یہ کسی نے لہجۂ راز میں
تجھے پھر ہے دعوتِ حاضری، قدمِ امیرِ حجاز میں

میں اُٹھ بیٹھا اور شعر گنگنانے لگا، گنگناتے گنگناتے بارہ بج گئے، نیند آنکھوں سے اُڑ گئی۔ بارہ بجے شب کے بعد دوسرا شعر ہو گیا:

نہ ہو مشکلات سے تنگ دل، تو جہانِ شعبدہ باز میں
ترا راستہ ہے کھلا ہوا، نہ اُلجھ نشیب و فراز میں

فکرِ شعر چل رہی تھی کہ اندر شمس الربّ صاحب کے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی زور سے بجی۔ شمس الربّ صاحب کے اُٹھنے کی آواز آئی۔ اور پھر پانچ منٹ بعد وہ کچھ نیند اور کچھ خوشی کی مستی میں دوڑ کر باہر آئے۔ کلیم صاحب، کلیم صاحب! جلد تیار ہو جایئے ابھی کویت ایئر لائنس سے میرے دوست نے فون کیا ہے کہ ایک خاتون عمرہ کے لیے جا رہی ہیں، میں ٹکٹ ان کو اور ان کے ایک محرم کو دے چکا ہوں۔ لیکن محرم ان کے علیل ہو گئے ہیں۔ وہ خاتون ٹکٹ لے کر تنہا جائے گی تو جدہ ایئرپورٹ پر محرم نہ ہونے کی وجہ سے روک لی جائے گی۔ وہ بہت پریشان ہیں، آپ کے دوست محرم بن کر چلے جائیں، بس جدہ ایئرپورٹ تک ان کو ساتھ رہنا ہوگا۔ پھر وہ آزاد ہیں۔ چلیئے چلیئے کوئی مذائقہ نہیں، اللہ نے راستہ نکالا ہے۔ چنانچہ ہم لوگ ایئرپورٹ پہنچے، شمس الربّ صاحب نے سیکوریٹی گیٹ تک ساتھ دیا پھر دعا کی درخواست کر کے وہیں رُک گئے اور میں اندر چلا آیا اور وہ نعت جو دہلی میں شروع ہوئی تھی حجازِ مقدس تک پہنچتے پہنچتے مکمل ہو گئی۔ ہاں یہ کہہ

دوں کہ میں ایئر لائنس پہنچا تو وہ خاتون، میرے ایک دوست کی سالی اور دوسرے ایک دوست کی بیوی نکلیں وہ ہزاری باغ کی تھیں:
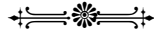
یہ کہا کلیمؔ سے ایک شب، یہ کسی نے لہجۂ راز میں
تجھے پھر ہے دعوتِ حاضری، قدمِ امیرِ حجاز میں
نہ ہو مشکلات سے تنگ دل، تو جہانِ شعبدہ باز میں
تیرا راستہ ہے کھلا ہوا، نہ اُلجھ نشیب و فراز میں
مجھے اس کا ہوش ذرا نہیں، میں ہوں ناز میں کہ نیاز میں
مرا دل تو مست دوام ہے، تری آرزوئے دراز میں
ترا عکس ناز و نیاز ہے، میرے ناز میرے نیاز میں
تو ہی دل میں دل کے گداز میں، تو ہی سوز میں تو ہی ساز میں
میرا درد چین نہ دے مجھے، میں یونہی رہوں تگ و تاز میں
بہ ادب گذارشِ بندہ ہے، یہ حضورِ بندہ نواز میں
تو ہے کائنات کا غزنوی، مری رات دن ہے دُعا یہی
میرے دل کو بھی وہ نظر ملے، جو نظر تھی چشمِ ایاز میں
مرا سجدہ، میری عبادتیں، تیرے عشق کی ہیں کرامتیں
نہ لگاتا دل میں تو آگ اگر، مرا دل نہ لگتا نماز میں
یہ سفر جو سال بہ سال ہے، تیرا لطف و فضل وکمال ہے
جو میرے گناہوں کا حال ہے، وہ معاملہ نہیں راز میں
تیرے گمرہانِ فغاں بلب، ہیں تباہ حال واماں طلب
اُسی سائے کی ہے تلاش اب، جو ہے تیری زلفِ دراز میں
یہ کلیمؔ چین نہ پائے گا، تو بلائے گا یہ پھر آئے گا
کوئی تازہ نعت سنائے گا، تیرے آستانۂ ناز میں

یہ نعتِ شریف جمشید پور کے دوسرے دردناک فساد ۱۹۷۹ء کے بعد لکھی گئی:

مدینہ جب بھی گئے بس یہ کام کرکے چلے
سحر سے رونے کو بیٹھے تو شام کرکے چلے

تھا ایک ہاتھ کلیجے پہ ایک آنکھوں پر
دل و نگاہ کا برہم نظام کرکے چلے

نگاہ پلکوں سے باہر نہیں گئی پھر بھی
زیارتِ درودیوار و بام کرکے چلے

بڑے سلیقے سے اشکوں نے ترجمانی کی
زباں کھلی نہیں لیکن کلام کرکے چلے

ذرا جو موقع دیا بیقراریِ دل نے
تو یہ گزارشِ احوالِ عام کرکے چلے

کہ ہم فقیرانِ خانماں برداد
سلام کرنے کو آئے سلام کرکے چلے

نثار حضرتِ اقدس کے آستانے پر
شراب اشکوں کی اور دل کا جام کرکے چلے

بکھر بکھر گئے ہم، ریزہ ریزہ ہوگئے ہم
جب اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو تھام کرکے چلے

حضورؐ! رہ گئے کوڑی کے تین ہی ہم تو
نہ خادموں نہ غلاموں میں نام کرکے چلے

جب احتساب کیا اپنا تب ہوا معلوم
کہ ضائع سب عملِ صبح و شام کرکے چلے

شکستہ دل ہے یوں ہی کاروانِ اہلِ حرم
ہے کون اس کا؟ یہ کس کو امام کرکے چلے؟

پکار چاروں طرف ہے کہ پھر نگاہِ کرم
ارادہ کرکے اُٹھے اہتمام کرکے چلے

اُٹھے نسیم سحر پھر ریاضِ طیبہ سے
علاجِ تشنگیِ خاص و عام کرکے چلے

ہیں طالبانِ کرم دُور دُور پھیلے ہوئے
دراز دامنِ فیضانِ عام کرکے چلے

حضورؐ پھر یہ سکھا دیجے اپنی اُمت کو
نگاہ جانبِ بیت الحرام کرکے چلے

کہاں یہ پھول بنے اور کہاں بنے فولاد
کہاں پہ سجدہ کہاں پر قیام کرکے چلے

یہ راہِ عشق ہے منزل اُسی کو ملتی ہے
جو اپنے آپ کو بے ننگ و نام کرکے چلے

اشارہ دیکھ کے بیٹھے اشارا پاکے اُٹھے
چلے تو آپ کے دامن کو تھام کرکے چلے

قلندرانہ روش طرزِ بے نیازانہ
نہ بندوبست نہ کچھ انتظام کرکے چلے

ہر ایک گام پہ نقشِ قدم بناتے ہوئے
ہر ایک نقش کو نقشِ دوام کرکے چلے

''بہ مصطفیٰ بہ رسانِ خویش را کہ دیں ہمہ اوست''
یہ درس دے کے یہ حجت تمام کرکے چلے

اور آپ کا یہ کلیمؔ آپ کا غلامِ غلام
''سحر سے رونے کو بیٹھے تو شام کرکے چلے''

انسان کی ضرورتیں ہیں کھانے کی، کپڑے کی، مکان کی، سواری کی۔ وہ ہر شخص کی کسی نہ کسی طرح پوری ہورہی ہیں۔ ضرورتوں کا معیار بڑھنے سے چاہتوں کی سرحد شروع ہوجاتی ہے، اور چاہتیں کوئی رکاوٹ نہیں چاہتیں، وہ تمام رکاوٹوں کو توڑ دینا چاہتی ہیں۔ میری زندگی میں ضرورتیں ہر وقت ہیں، ہر لمحہ ہیں، ہر گھڑی ہیں۔ ضرورتوں کا احساس تو شعور کی آمد آمد سے پیدا ہوجاتا ہے۔ ایک وقت تھا جب ضرورتوں کے ساتھ کچھ معیار بڑھانے کا ذوق بھی تھا، بس ذوق تھا، دیوانگی نہ تھی، لیکن وقت کے ساتھ ذوق بھی کم ہونے لگا، چاہتیں کم ہونے لگیں۔ اب میری حیات کے محل سرا میں کھڑکیاں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔ چاہتیں اندر آنے نہیں پاتیں، دروازے بند، روشن دان بند۔ اب سارے آمدورفت کے راستے تقریباً بند ہوگئے ہیں، بس ایک صدر دروازہ ضرورتوں کا کھلا ہوا ہے۔ اس دروازے سے ضرورتیں داخل ہورہی ہیں اور کسی نہ کسی معیار سے پوری ہوکر باہر نکل رہی ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ میرے پاس ایسی باتوں کے خزانے بڑھنے لگے جن سے حیات بنتی ہے، سنورتی ہے۔ ان باتوں میں ایک اہم بات یادیں ہیں۔ زندگی کہاں کہاں سے گزر جاتی ہے ان کا تعین انسان کے بس میں نہیں۔ تو جہاں جہاں سے بھی زندگی گزرے اس دورِ سفر میں جو واقعات سامنے آتے ہیں ان میں وہ واقعات جن سے حیات بنتی، سنورتی ہے اکثر و بیشتر جمع ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی یادیں میرے یہاں اسٹاک کی اسٹاک پڑی ہیں، کبھی کبھی کام آجاتی ہیں۔ کبھی کبھی یادیں ہی راحت و آرام کا سبب بن جاتی ہیں۔ یادوں کا محفوظ رہنا یا رکھنا تخلیقی قوتوں کو بڑھاتا ہے۔ جن کی زندگی میں یادوں کا خزانہ نہیں ہے وہ کچھ پیدا نہیں کرسکتے۔ پیدا نہیں کرسکتے تو کچھ دے نہیں سکتے۔ جب دینے کے لیے کچھ نہیں ہے تو پھر لینے کی آرزو اور عادت بڑھتی ہے۔ یہ دَور کچھ اسی قسم کا ہے۔ جب پیدا کرنا مشکل، دینا دُشوار اور لینا آسان ہونے لگتا ہے۔ میری تمام تخلیقات یادوں ہی کا صدقہ ہیں۔ وہ خود یہ صدقہ نکالتی ہیں، کب کتنا نکالنا ہے یادیں جانتی ہیں۔ اس میں بخالت نہیں کرتیں اور خواہ مخواہ اضافہ بھی نہیں کرتیں۔

میرٹھ میں واقعہ گزرا۔ بہت سے میرٹھ میں ہی ہوں گے جو بھلا چکے ہوں گے۔ جو دُور ہیں انھیں تو کچھ بھی یاد نہ ہوگا، مجھے یاد ہے۔ جو کچھ خبریں آئیں، خونی انقلاب آئے وہ دل میں نقش ہیں۔ وہ مناظر تصویروں کی طرح آویزاں ہیں، جب واقعات یادیں نہیں بنی تھیں تو واقعات ہی تھے، واقعات دل کا جو حال کرتی ہیں وہ دل والے سمجھتے ہیں، تو اس وقت واقعات رگ وپے میں جاری وساری تھے، اور اپنی نعت کا جو شعر ہے:

ہم نہ جانے ہیں کوئی اور سہارا، کہیو
جب کبھی چوٹ لگی ان کو پکارا، کہیو

تو چوٹ لگی تو پکار بڑھنے لگی۔ راتوں کو، دنوں کو، بیقراریوں کی زبان سے، آنسوؤں کی زبان سے، پکاروں کا سلسلہ بندھا، سامنے حاضر ہوکر فریاد کرنے کی تڑپ بڑھنے لگی۔ ویزا کی کارروائی کے دن گزرتے گئے۔ ویزا نہیں آرہا ہے۔ خطوط جدّہ سے آئے کہ کوشش ہو رہی ہے۔ جیسے ہی ویزا حاصل ہوگا سفارت خانے میں بھی اور تمھارے پاس بھی فیکس کر دیا جائے گا۔ فیکس نہیں آرہا ہے۔ کیسے کیسے خیالات ہیں آرہے ہیں، جارہے ہیں:

خیالِ وصل کو اب آرزو جھولا جھلاتی ہے
قریب آنا دلِ مایوس کے پھر دُور ہوجانا

بیقرار ہوکر ایک شاگرد کو مستقل دہلی بھیج دیا کہ تم سفارت خانے میں روزانہ پتہ لگاتے رہو، جس وقت آئے فوراً پاسپورٹ پر ویزا لگا کر مجھے خبر دو۔ وہ بیچارہ دہلی میں بیٹھا ہے۔ کوئی پتہ ملتا ہی نہیں، تمام سکوت اور مایوسی ہے، وقت گزرتا جاتا ہے۔ رمضان المبارک بھی شروع ہوگیا۔ کہیں سے کوئی خبر نہیں، کوئی اطلاع نہیں، کوئی پیام نہیں، آواز نہیں۔ ناامیدی، سنّاٹا، مایوسی، دروازہ کا پردہ بھی نہیں ہلتا، کسی پاؤں کی چاپ نہیں، کوئی دستک نہیں۔ تاریکی، گھٹاٹوپ اندھیرا کہ یک بیک کرن پھوٹی۔ مگدھ ایکسپریس سے ہانپتا کانپتا میرا شاگرد دہلی سے بارہ بجے کے قریب آیا، آج ہی دہلی روانہ ہونا ہے۔ ویزا تاخیر سے پہنچا۔ ایک ہفتہ کے اندر جدّہ پہنچ جانا ہے۔ ٹکٹ اتفاق سے مل گیا۔ پرسوں ہی فلائٹ ہے۔ آج ہی جیسے ہو روانہ ہونا ہے، کل کسی وقت تک پہنچ جانا ہے۔ اب کیا ہوگا ڑی میں چند گھنٹے باقی ہیں، سامان تیار کرنا اور پھر روانگی لیکن ریزرویشن نہیں، کیا ہوگا؟ ہم نے تین جوانوں کو تیار کیا، میرے ساتھ چلو۔ تم لوگوں کے درمیان کچھ نہ کچھ آرام

مجھے مل جائے گا۔ تیاریاں کرتے کرتے اور نوجوانوں کو تیار ہوتے ہوتے شام ہوگئی۔ مگدھ ایکسپریس کا وقت گزر گیا۔ چار بجے صبح نارتھ ایسٹ ایکسپریس گزرتی ہے۔ آسام سے آتی ہے، اس کے ڈبے میں داخل ہونا ہی ممکن نہیں، جگہ کی دستیابی کا کیا سوال؟

ہرچہ باداباد ما کشتی درآب انداختیم

دو بجے بھور کو ہم لوگ اسٹیشن روانہ ہوگئے، ٹھیک وقت پر گاڑی آئی۔ ہم لوگ جہاں کھڑے تھے اسی ڈبےّ سے کچھ لوگ اُترنے لگے اور ہم لوگ اسی بوگی میں داخل ہوگئے۔ سامنے کنڈکٹر کھڑا تھا، ہم نے کہا ہم لوگ چار آدمی بہت ارجنٹ ضرورت سے دہلی جارہے ہیں۔ ریزرویشن نہیں ہے، براہِ کرم ہمیں کسی طرح جانے کی اجازت دے دیجیے۔ اس نے نگاہیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا، پھر بولا، آیئے آیئے ابھی چار برتھ خالی ہوا ہے، آپ کو الاٹ کردیتا ہوں۔ ہائے بیچارے مجروحؔ سلطان پوری کی غزل کا ایک مطلع ہی تو سچا شعر ہے باقی یوں ہی:

مجھے سہل ہوگئیں مشکلیں وہ ہوا کے رُخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

چنانچہ ہاتھ میں کسی کا ہاتھ آ گیا، مشکلیں سہل ہوگئیں، ہوا کے رُخ بدل گئے اور راہ میں چراغ جل گئے چنانچہ:

ریلا اِک آیا اور بہالے گیا مجھے
جس طرح موجِ بحر پہ تنکے کا ہو سفر

شام دہلی پہنچے صبح فلائٹ ملی۔ سہ پہر کو جدّہ حاضری ہوگئی۔ شام کو عمرہ کیا اور پھر جو شام آئی تو جنھیں پکارا کرتے تھے ان کا آستانہ سامنے تھا:

کیا واقعی یہ معجزۂ زندگی ہوا؟
کیا واقعی ہم آ گئے اس آستانے پر؟

پہلی بار حاضری ہوئی تھی تو جیپ سے اُترتے ہوئے کرتے کا دامن کسی کیل سے اُلجھا تو دامن سے گریبان تک چاک ہوگیا۔ میں گرا اور آلودہ خاک ہوگیا:

اِسی دُنیا میں چلا لیتے ہیں انگاروں پر
یہ بھی اِک طرح کی رحمت ہے گنہگاروں پر

پھر کتنے سفر ہوئے، پھر وضو یا تیمّم کی ضرورت نہیں ہوئی۔ وہ ٹھوکر یاد رہی اور ہمیشہ اور ہر وقت یاد رہتی ہے۔ اس وقت گر کر رویا نہیں تھا، اب مستقل یہ شغلِ گریہ جاری ہے۔ دُور ہی سے مونڈھے جھک جاتے ہیں اور سرنگوں ہو جاتا ہے۔ آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور فریادی کے ہاتھ اُٹھ جاتے ہیں۔ چنانچہ:

پہنچے وہاں تو ہوش ٹھکانے نہیں رہے — وہ درد اُٹھا کہ رہ گئے ہم دل کو تھام کر
جن کے لیے کراہتے رہتے تھے رات دن — جن کو پکارتے رہے ہر شام ہر سحر
جن کو حکایتِ شہدا بھیجتے رہے — پہنچائی جن کو خوشبوئے خونِ دل و جگر
جس کی تلاش آنسوؤں کے آئینہ میں تھی — دیکھا تو سامنے تھا وہی مرکزِ نظر

تو پھر:

خود کو سنبھالتے ہوئے دل تھامتے ہوئے — دو گام چل کے ہاتھ اٹھایا برہنہ سر
اس آستاں سے آنکھ برابر نہ ہو سکی — نیچی نگاہ کر کے پکارا بچشمِ تر

اسی طرح پہلے بھی پکارتا رہا اور آج تک یہی کیفیت ہے، میں نہیں جانتا جالی کیسی ہے، کیسی ہوتی ہے۔ اس جالی کے نیچے زمین کا فرش کیسا ہے۔ اس فرش تک میرے پاؤں کبھی نہیں پہنچے۔ میری آنکھ کبھی اوپر نہیں آئی، اور آنکھوں سے آنسوؤں کی روانی کبھی نہیں تھمتی۔ بولی ہچکیوں کے سہارے نکلتی ہیں، بے سہارے کبھی بول بھی نہیں سکتے تو پھر شروع ہوا:

اے خیر آسمان و زمیں، خیر بحر و بر
اے خیرِ کل جن و ملک خیرِ کل بشر

دو تین شعر کے بعد یہ بول بھی آگے بڑھ نہ سکے:

اپنی بساط ہی نہیں تعریف کیا کریں
"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"

اور پھر میرٹھ کا درد اُبھر آیا:

یہ سر کہ جس کا مول نہ تھا تاجِ قیصری
ہوتا ہے اب فروخت بہت سستے دام پر

اور سستے دام کی بھی ضرورت نہ رہی
بے دام ہی تراش لیے جاتے ہیں یہ سَر

اور پھر میرٹھ کا منظر۔ نہ جانے کتنے نوجوانوں کو ٹرک میں بھر کر ندی کنارے لے جایا گیا، گولیاں سینوں میں اُتار دی گئیں، سر تراش لیے گئے، لاشیں منتشر چھوڑ دی گئیں:

گردن بریدہ پیرہن و جسم سوختہ
یوں بھی ہم آئے کوچہ و بازار میں نظر
محفل اُجاڑ، شمع فسردہ، فضا خموش
بکھری ہوئی پتنگوں کی لاشیں زمین پر

وہ تو جانتے ہی ہوں گے، مگر ہم جو لے کے گئے تھے واپس کیا لاتے اور کیسے لاتے اور کاہے کو لاتے، جو تھا اُجھل دیا:

کیا کیا گزری ہے وہ کیا عرض ہم کریں
ہوگی ضرور حضرتِ والا کو سب خبر

تو حضور آخر یہ کب تک ہوگا:

کہیو کہ انھوں نے اپنی نظر کیوں ہم سے الگ فرمالی ہے؟
ہم نے تو انھیں کی زُلفوں کی زنجیر گلے میں ڈالی ہے

بے شک ڈالی ہے مگر زنجیر ڈھیلی ہوگئی ہے حضورؐ! ذرا کمزور ہوگئی ہے حضورؐ، اِسے ذرا پھر مضبوط کر دیجیے اپنے مبارک ہاتھوں سے، اسے ذرا اور کس دیجیے:

ہم سرنگوں ہیں اور معافی کے خواستگار
بس اِک سخن! بس ایک توجہ! بس اِک نظر

یہ نعت یا فریاد وہیں کہی گئی، وہیں پڑھی گئی اور وہیں چھوڑی گئی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اسے کاغذ پر منتقل کر کے کہاں رکھا، کسے دیا مجھے یاد نہیں۔ دو چار ماہ بعد شہر 'گیا' کے میرے ایک دوست اور ریلوے افسر قیوم اثر صاحب سفرِ حج میں تشریف لے گئے، ان کو کسی صاحب نے دیا کہ یہ کلیم عاجز نے لکھے تھے۔ چھوڑ کر چلے گئے، آپ تحفہ ان کا ان کو پہنچا دیجیے:

انھوں نے وہیں اس کی بہت سی فوٹو کاپیاں بنوائیں۔ اپنے عزیزوں دوستوں کو فوٹو کاپیاں

پہنچائیں۔نوادہ کے مولا ناضیاءالحسن صاحب کوایک نقل دی،سنبھال کرنوادہ لائے۔اورایک نقل مجھے بھیج دی،گویامیرا کلام انھیں کا عطیہ ہے۔
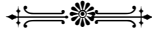
میں عاجز گدائے سرِ خاکِ رہ گزر
ناقابلِ توجہ و ناقابلِ نظر
میں اِک خطا گداز خطاوارسربسر
میں اِک شکستہ حال،شکستہ دل وجگر
بیکاروبے وقارمیں اِک شخص بےکمال
بےقدر،بےسواد،بےاعمال،بےہنر
میں ایک کم بساط،کم آمیز،کم سخن
خانہ خراب ہی نہیں خانہ خراب تر
لیکن چراغِ شوقِ فروزاں ضرور تھا
ہر چند فرش پر تھا تصور تھا عرش پر

وہ وادیِ مقدس طیبہ وہ ارضِ پاک
آنکھیں اُدھر،خیال اُدھر،آرزور اُدھر
اُس آفتابِ نور کی شاید کوئی کرن
آجائے اِس طرف بھی اندھیروں کو چیر کر
پھر سوچتا کہ درگہہِ عالی مقام میں
ایسے ذلیل، ایسے کمینے کا کیا گزر
لیکن کسی سخی کو نوازش کی کیا کمی
کس کو پکار لیں وہ فقیروں کو کیا خبر
ریلا اِک آیا اور بہا لے گیا ہمیں
جس طرح موجِ بحر پہ تنکے کا ہوسفر

کیا واقعی یہ معجزۂ زندگی ہوا
کیا واقعی ہم آگئے اُس آستانے پر
پہنچا وہاں تو ہوش ٹھکانے نہیں رہے
وہ درد اُٹھا کہ رہ گئے ہم دل کو تھام کر
جن کے لیے کراہتے رہتے تھے رات دن
جن کو پکارتے رہے ہر شام ہر سحر
جن کو حکایتِ شہدا بھیجتے رہے
پہنچائی جن کو خوشبوئے خونِ دل وجگر
جس کی تلاش آنسوؤں کے آئینہ میں تھی
دیکھا تو سامنے تھا وہی مرکزِ نظر

ہم پر وہی تھی خوف ومحبت کی کیفیت
جو کیفیت ہو آقا کے آگے غلام پر
خود کو سنبھالتے ہوئے دل تھامتے ہوئے
دوگام چل کے ہاتھ اٹھایا برہنہ سر

اس آستاں سے آنکھ برابر نہ ہوسکی	نیچی نگاہ کرکے پکارا بچشمِ تر

اے خیر آسمان و زمیں، خیر بحروبر	اے خیرِ کلِّ جنّ و ملک خیرِ کل بشر
اے چشمۂ حیات مسیحائے کائنات	بیماروں کے طبیب مریضوں کے چارہ گر
اے رہنمائے قافلۂ اہلِ عرش وفرش	اے مہر و ماہِ منزل و قندیلِ رہگذر

اپنی بساط ہی نہیں تعریف کیا کریں	''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر''
ہم کیا ہمارا منہ کیا ہماری زبان کیا	بولیں کیا؟ ہم تو چھوڑنے آئے ہیں اپنا سر
یہ سر کہ جس کا مول نہ تھا تاجِ قیصری	ہوتا ہے اب فروخت بہت سستے دام پر
اور سستے دام کی بھی ضرورت نہ رہی	بے دام ہی تراش لیے جاتے ہیں یہ سَر
گردن بریدہ پیرہن و جسم سوختہ	یوں بھی ہم آئے کوچہ و بازار میں نظر
محفل اُجاڑ، شمع فسردہ، فضا خموش	بکھری ہوئی پتنگوں کی لاشیں زمین پر

کیا کیا گزری ہے وہ کیا عرض ہم کریں	ہوگی ضرور حضرتِ والا کو سب خبر
ہم کو تو چاہیے تھا کہ سر پھوڑتے یہاں	جس کے لیے بنے ہیں یہ دیوار و بام ودر
کیا جانے عقلِ ملتِ بیضا کو کیا ہوا	کمبخت سر پٹکتی پھرے ہے اِدھر اُدھر

لیکن حضور! یہ تو ہمیشہ ہوا کیا	ہم چاک پیرہن رہے اور آپ بخیہ گر
ہم نے ہمیشہ آپ کو ناراض ہی کیا	اور آپ نے ہمیشہ کیا ہم سے درگزر

ربِّ کریم آپ کا اور آپ بھی کریم
اب درمیان دونوں کریموں کے ہے یہ سر
ہم سرنگوں ہیں اور معافی کے خواستگار
بس اِک سخن، بس ایک توجہ، بس اِک نظر

اشعار یا غزل یا نعت شریف لکھنے کا کوئی معمول تو کبھی نہیں رہا، نہ کسی خاص وقت کا تعین نہ کسی موقع محل کی تلاش، نہ تنہائی کی جستجو نہ کسی ماحول اور فضا کی محتاجی، سنا کہ مولانا سیمابؔ اکبر آبادی شب کے کھانے سے فارغ ہو کر ٹیبل کرسی پر بیٹھتے، حقّہ تیار کر کے سامنے رکھ دیا جاتا۔ سیمابؔ صاحب قلم کاغذ لے کر بیٹھتے، حقّہ کے کش لیتے جاتے اپنی موزونیِ طبع کو دعوت دے کر بلاتے، تخیل کی چھاؤنی میں اشعار کہتے جاتے۔ سونے سے پہلے غزل مکمل کر لیتے۔ جوشؔ صاحب کے متعلق سنا کہ آفتاب نکلنے سے پہلے مئے ناب کی صراحی لے کر بیٹھتے۔ جام اٹھاتے جاتے، پے در پے چند گھونٹ کے بعد شاعری کی سبز پری سامنے رقص کرنے لگتی اور جوشؔ صاحب تصویر بناتے جاتے۔ ہمیں تو کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا۔ فی البدیہہ غزل بھی کہہ دی لیکن وہ غزل اپنی نہیں رہی۔ شاہ علی صاحب ایک بار میری دُکان میں تشریف لائے، ایک مصرع بولے۔ وہ سامنے کرسی پر تھے۔ میں نیچے چوکی کے فرش پر۔ بولے، دو چار شعر لکھ لوگے۔ میں نے کہا تھوڑی دیر تشریف رکھیے۔ اور چند منٹ میں پانچ چھ شعر کی غزل مکمل کر کے انھیں دے دی۔ ایسا اتفاق اور بھی ہوا لیکن وہ غزل یا وہ غزلیں میرے پاس نہیں رہیں۔ مجھے یاد رہیں، پھر فراموش ہو گئیں۔ ہاں سونے کے لیے بستر پر گیا، کوئی واقعہ یاد آ گیا یا کچھ یادیں سامنے رقص کرنے لگیں، لیٹے لیٹے کروٹیں لینے لگا، آنسو نکلتے رہے اور اشعار حافظے کی سلیٹ پر نقش ہوتے رہے۔

نعت شریف تو عموماً یوں ہوئی کہ سلام کے لیے حاضر ہوا۔ وہ تو عجیب موقع ہوتا۔ میں اس قدر بے قابو کبھی نہیں ہوتا ہوں جیسا اس وقت ہوتا ہوں۔ تھک جاتا ہوں تو مشکل سے ضبط کرتا ہوں۔ سینے پر ہاتھ باندھے ہوئے کھڑا رہتا ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہوں۔ ’’کیا حال ہے رے، کیا حال ہے رے‘‘ اور پھر سارا دُکھڑا یاد آنے لگتا:

اُن نے کچھ اس طرح سے پوچھا مزاج
عمر بھر کے رنج و غم یاد آ گئے

چشم نم جائے قیام پر واپس آیا اور جو کچھ کہنا ہوا، لکھتا گیا۔ کبھی سنایا کبھی نہیں سنایا۔

لیکن ابھی آٹھ دس سال پہلے مدینہ منورہ سے واپسی ہونے لگی، تو آخری سلام کو حاضر ہوا۔ اور اس عالمِ گریہ کی کیفیت میں واپس ہوا۔ تو یہ کیفیت بہت دیر تک اور بہت دُور تک طاری رہی۔ بس کے دوسرے مسافر بھی دو ایک میری حالت سے متاثر ہوتے گئے، اور اسی کیفیت میں مجھے اپنی غزل کا مطلع یاد آیا جو میں نے اپنی بہن اور بھانجیوں کو پہلے سفر میں کراچی چھوڑتے ہوئے ٹرین ہی پر لکھا تھا، شدّت سے وہ مطلع مجھے یاد آیا۔ اور ایسا لگا کہ یہ مطلع تو میں نے پیشگی یہیں کے لیے لکھا تھا۔ چنانچہ جدّہ پہنچتے پہنچتے چار پانچ ایسے اشعار کا اضافہ ہے جو بالکل اس کیفیت کی ہو بہو ترجمانی کرتے ہیں جو مدینہ منورہ چھوڑتے ہوئے اس سفر میں شدّت سے طاری رہی۔ جدّہ پہنچے تو کچھ احباب ملنے تشریف لائے جن میں مسٹر محمد رفیع بھی تھے جو پاکستانی ہیں، جدّہ ایئرپورٹ پر انجینئر ہیں۔ اقبالؔ اور اقبالیات کے ماہر ہیں۔ شاعر نہیں ہیں مگر وہ سب ہیں جو ایک اچھا شاعر بنانے کے اسباب ہوتے ہیں۔ دوسرے روز اصرار سے اپنے یہاں دعوت دی، میں نے قبول کرلی۔ دوسری شام حاضر ہوا، ایئرپورٹ کے دوسرے پاکستانی احباب بھی تھے، بیشتر انجینئر تھے، اور کچھ ایڈمنسٹریٹر تھے، کھانے کے بعد انجینئر صاحب نے کہا کہ دو ایک تبرک مجھے لکھ دیجیے، میں نے وہی پانچ چھ شعر پڑھ دیئے، نہیں کہہ سکتا محفل کا کیا حال تھا، سب پر گریہ طاری تھا، عزیز صاحب تو سسکیاں لے کر رو رہے تھے، یہ سب پاکستانی حضرات انجینئر تھے اور تقریباً سب کے سب جوان تھے۔ دو ایک صاحبان کی زبان پر یہ مصرع تھا، اس مصرع کی تکرار تھی اور پہلو بدل بدل کر سسکیوں میں بار بار اُسے دُہرا رہے تھے:

یہ کس جانِ جہانِ درد کی محفل سے آئے ہیں

اس مجمع میں پٹنہ کے میرے ایک عزیز سعید اختر بھی تھے، وہ بھی کمپیوٹر انجینئر تھے۔ کسی حد تک وہ کلیم پرست ہیں، میری شاعری سے بہت متاثر ہیں۔ مگر وہ مجھ سے چھوٹے ہیں، گفتگو میں پاسِ ادب رکھتے ہیں۔ میرا نام نہیں لیتے مگر وہ بھی اس وقت جوشِ جذبات میں پاسِ ادب بھول گئے۔ اور بار بار بولے کلیم صاحب کیا ٹکڑا آپ نے استعمال کیا ہے:

'جانِ جہانِ درد' اُف دل ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ محفل برخواست ہوئی۔ تو وہ کیفیت جو اس دعوتِ طعام میں آنے کے وقت احباب کی تھی بالکل ختم ہو چکی تھی۔ اس نعت کے بالکل سیدھے

سادے حقیقی اور سچّے جذبات نے سیدھے سادے الفاظ کے سہارے اس ماحول کا رنگ بہت دیر تک بدل دیا۔ احباب رخصت ہو رہے ہیں مگر سب کے چہرے سنجیدہ، زبان خاموش، بے تکلفی رخصت ہو گئی تھی۔ اور تقریباً سب لوگ یہ محسوس کر رہے تھے اس جانِ جہان درد کی محفل سے ہم شاید پہلے دُور تھے، اب قریب ہو گئے ہیں۔ وہ شاید قریب رہنا چاہتے تھے۔ اس لیے رسمی سلام اور مصافحہ کے بعد بھیگے پلکوں سے ہی رخصت ہوئے۔
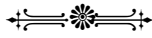
مقدر نے اُٹھایا اُٹھ، تو اس محفل سے آئے ہیں
ہمیں جانے ہیں کیسے آئے ہیں کس دل سے آئے ہیں

غمِ محمل نشیں میں ڈوب کر محمل سے آئے ہیں
یہ آنسو آنکھ سے آئے نہیں ہیں دل سے آئے ہیں

سسکتے سسکیاں لیتے بڑی مشکل سے آئے ہیں
یہ کس جانِ جہانِ درد کی محفل سے آئے ہیں

کسی محفل میں جی لگتا نہیں بس دل یہ چاہے ہے
اُسی محفل میں واپس جائیں جس محفل سے آئے ہیں

پکار اُٹھے ہیں سب سن کر یہ نعتِ سرورِ عالم
یہ چند اشعار ہی آئے ہیں لیکن دِل سے آئے ہیں

جو چھانے کے کام کا نہ ہو، بچھانے کے کام کا نہ ہو، واقعی وہ کیا کہہ سکتا ہے؟ اور ہم نے بھی کیا کہا ہے؟ پڑھنا لکھنا کچھ نہیں نام محمد فاضل؟ نعتوں کے مجموعوں پر کبھی نظر پڑ جاتی ہے تو شرم آنے لگتی ہے کہ ہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرنے والوں میں کہیں پیچھے کہیں دُور ہی شمار کر لیے جاتے ہیں لیکن کیسے شمار کر لیے جاتے ہیں اور کہیں بات بنادی جا سکتی ہے، اُس دربار میں بات کون بنا سکتا ہے۔ میں واقعی چھانے یا بچھانے کسی کام کا نہیں، مختصر شاید پندرہ سولہ چیزیں کہیں مگر زندگی میں رونے گانے کے سوا کسی کام کا نہ رہا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربارِ عالی میں رونے گانے کے سوا کبھی کچھ کام کی بات کہہ کے نہ آیا:

نہ کچھ کرنا، نہ کچھ بننا، نہ ہونا ہم کو آتا ہے
اکیلے بیٹھ کر کونے میں رونا ہم کو آتا ہے

اور شاعری میں تو دو ایک بات نیچے اوپر کی بھی کہیں کہیں کہہ دی ہے جو شاید جانچنے پرکھنے والوں کو کچھ پسند آ جائے لیکن یہ جو میں نے لہو لگا کر شہیدوں میں ملنے کی کوشش کی اور نعت گویوں کی صف میں لوگ مجھے بھی بٹھا گئے یہ تو بے ادبی بھی ہوئی اور بے غیرتی بھی، کتنی بار ہمّت کی آج کچھ عرض کروں گا مگر جب وقت آیا تو جیسے کوڑی کے تین۔ کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے تھے، ویسے ہی رہے، آنکھ ملتے ہوئے گئے، ہاتھ ملتے ہوئے آئے۔

شاید تین چار سال پہلے رخصتی کے وقت یہ اشعار مسجدِ نبوی ہی میں بیٹھ کر کہے۔ اس وقت بھائی خالد قدوائی صاحب اور شاید پاکستانی انجینئر سمیع احمد صاحب مسجدِ نبوی میں معتکف تھے۔ رمضان کی انتیسویں شب میں یہ اشعار میں نے کہے اور تیسویں کی صبح جب تمام معتکف حضرات رخصت ہو رہے تھے اور خالد قدوائی صاحب اور سمیع احمد صاحب بھی مکہ مکرمہ سے واپسی کے لیے سامان باندھ کر بیٹھے تھے، میں بھی ان کے پاس بیٹھا تھا کہ میں نے جیب سے پرزہ نکالا اور حجرۂ مبارک کی طرف رُخ کر کے پڑھنے لگا اور جو کام بہت سستا ہے یعنی رونے والا کام وہ بھی ان

اشعار کے ساتھ شروع ہوگیا۔ سب بستر باندھے جانے کو بیٹھے تھے۔ شعر کہنے والا اور شعر اس وقت پڑھنے والا ایک کلیم عاجؔز تھا مگر تمام سننے والے اس قافلے میں آ گئے:

کرنے گداگریِ درِ پاک آئے تھے
اب یہ گداگرانِ درِ پاک جاتے ہیں

گداگرانِ درِ پاک کا پورا قافلہ بیان میں شریک ہوگیا۔ اَغل بغل تو خالد بھائی، سمیع صاحب، ڈاکٹر ظفیر صاحب، کمال احمد صاحب چند ہی تھے مگر اُردو سمجھنے والے جو گداگرانِ درِ پاک اس وقت قریب تھے سب ہی قافلے میں داخل ہوگئے۔ جذبات میرے تھے مگر شریک جذبات سبھی ہوگئے۔ میرے دل کی بات سب کے دل میں چھپی تھی۔ ظاہر میں نے کر دی اور ظاہر کرتے ہوئے جس کیفیت ولذّت میں اس وقت میں تھا سب ہی اس کیفیت اور لذّت سے آشنا ہوگئے۔ اور اشعار کے ختم پر سب نے رومال نکالا، آنکھیں صاف کیں۔ دل گیر آئے نہ تھے مگر دل گیر اُٹھے۔ اور دیکھنے والے بولے نہیں مگر مجھے ایسا لگا کہ لوگ یہی سمجھ رہے ہیں کہ واقعی یہ گداگرانِ درِ پاک ہیں اللہ ہمیں بھی ان میں شمار کر لے۔
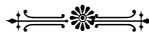
بیمارِ عشق اے نبیِ پاکؐ جاتے ہیں
ہم اہلِ کاروانِ جگر چاک جاتے ہیں

شاید کہ حکم ہوگیا بستر اُٹھاؤ جاؤ
بستر اُٹھائے اے شہِ لولاک جاتے ہیں

اتنے دِنوں رہے پہ تسلّی کہاں ہوئی
نمناک چشم آئے تھے نمناک جاتے ہیں

اشکوں میں ڈھل کے درد کی خوشبو میں ڈوب کے
پہنے ہوئے جدائی کی پوشاک جاتے ہیں

جب حکم ہی ہے پھانکو جدائی کی خاک جاؤ
اچھا تو پھانکنے کے لیے خاک جاتے ہیں

چھانے کے کام کے نہ بچھانے کے کام کے
ہم تو ہیں واقعی خس و خاشاک جاتے ہیں

کرنے گداگریِ درِ پاک آئے تھے
اب یہ گداگرانِ درِ پاک جاتے ہیں

اے کاش کوئی کہہ دے ہمیں دیکھ کر کلیم
دیکھو یہ خادمانِ شہِ پاک جاتے ہیں

کرتے رہو کلیؔم جگر کے لہو کی بات
اس سُرخ رُو سے بڑھ کے ہے کس سُرخ رو کی بات

میں کہہ نہیں سکتا یہ خونِ جگر کیا بلا ہے، مریض مرض کو سمجھ نہیں سکتا۔ اور اب معالج بھی ایسے نہ رہے کہ مریض کو کچھ بتا سکیں۔ ہم نے کسی معالج کی طرف رجوع بھی نہیں کیا اور کوئی دردمند معالج میری طرف رجوع بھی نہیں ہوا۔ میؔر صاحب کے والد ایک معالج تھے جو میؔر صاحب کو ملے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر ایک دن کہا کہ بیٹا یہ کیسی حرارت ہے جو تیری سانسوں سے نکلتی ہے، اور کیسی چنگاری ہے جو تیری آنکھوں میں چمکتی ہے۔ اور اس کے بعد یہ کہا کہ بیٹا عشق کر، اور آگے کیا کہا یاد نہیں۔ میؔر صاحب کے متعلق پڑھا کہ ایک دوست ان سے ملنے اُن کے گھر آئے۔ بیٹھے بیٹھے اُٹھ کر پچھواڑے کی کھڑکی کھول دی اور بے ساختہ بول اُٹھے آہ میؔر صاحب! آپ کے پائین کیسا گلزار کھلا ہوا ہے۔ میؔر صاحب بولے اچھا میرے پائین میں کوئی باغ بھی ہے؟ ان کے دوست حیرت سے بول اُٹھے، میؔر صاحب آپ اتنے دِنوں سے یہاں رہ رہے ہیں، یہ بھی خبر نہیں کہ آپ کے گھر کے پیچھے چمن کھلا ہوا ہے؟ میؔر صاحب بولے بھئی اپنے دل کے چمن کی سیر سے فرصت ہی کہاں ملتی کہ کسی باغ کی سیر کریں۔ اور دل کے چمن میں مگن رہتے ہوئے ۷۰ برس تک اس چمن کی سیر کراتے رہے اس کے باوجود یہ کہہ گئے کہ:

کام دُنیا میں تھے بہت پر میؔر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

۷۰ برس میں بھی وہ گلزارِ دل کی کہانی ختم نہ ہوئی، کام بہت باقی تھے کہ وہ شتابی سے فارغ ہو گئے اور آنکھیں بند کیے ہی اس قسم کے شعر بھی کہہ گئے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہِ شیشہ گری کا

………………

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

……..…………

موت اِک زندگی کا وقفہ ہے　　　یعنی آگے چلیں گے دَم لے کر

……..…………

ہم نے بھی جگر کے لہو کا کام غیر شعوری طور پر دس بارہ سال کی عمر میں شروع کیا تھا، اور اب کہتے ہوئے ساٹھ پینسٹھ سال ہو گئے۔ بیس بائیس برس تو صرف جگر سے جوئے خوں یوں بہا کہ کوئی درد انگیز نغمہ کہیں سنا تو آنکھوں سے قطرے ٹپکنے لگے۔ تنہائی میں کوئی اچھا شعر گنگنایا تو زبان سے اشعار نکلنے لگے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور میں بھی حیران کہ یہ آخر کیا ہے! دل ہشاش بشاش ہے، نہ کوئی صدمہ ہے نہ کوئی غم ہے۔ باتیں کر رہا ہوں، باتیں سن رہا ہوں اور آنکھوں سے لڑیاں نکل رہی ہیں۔ ہاں ایک بات سمجھ میں آتی ہے، یعنی اب آتی ہے اور تقریباً بیس بائیس سال پہلے میں کراچی بہن اور بھانجیوں سے ملنے گیا اور واپس ہوا تو امرتسر اسٹیشن پر روتے ہوئے غزل کہی جس میں یہ شعر بھی ہے:

تھوڑی جدائی سے بھی کسی کی، دل پہ بڑا غم ٹوٹا ہے
ہاتھ بہت دن تک کانپے ہیں جب کوئی دامن چھوٹا ہے

تو اب سمجھا کہ ساٹھ پینسٹھ سال پہلے بھی جب دو چار روز کے لیے بھی کسی تقاضے پر اپنے پرنانیہال ہلسہ یا دوسری نانیہال اسلام پور یا کسی ضرورت سے پٹنہ وغیرہ آنا ضروری ہو جاتا تھا تو میں تڑپ کر روتا تھا۔ ماں، بہن، بھائی اور گھر کے آنگن اُسارے اور دالان اور کھنڈر اور امرود اور چنبیلی کے درختوں کے لیے۔ تو جناب وہ دور ختم ہوا۔ اور بائیس تیئیس سال کی عمر میں جس کی پریکٹس اور جس کی مشق میں دس بارہ سال کی عمر سے رکھا، اس کے عملی اظہار کی ضرورت سامنے آ گئی۔ اور وہ عملی اظہار ۱۹۵۰ء سے شروع ہو کر ۲۰۰۲ء تقریباً باون سال سے جاری وساری ہے، یوں کہ پائین باغ کے گلزار کو کھڑکی کھول کر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ آنکھیں بند کیے ہوں۔ فصلِ بہاراں آ رہی ہے، ہم دامن پھیلا رہے ہیں اور فصلِ بہاراں بے نیازانہ جاری ہے۔ تو جناب ایک ہی داستاں جو پچپن سال پہلے شروع ہوئی، کہنا شروع کیا ہے تو کہے جا رہا ہوں اور لوگ انگشت بہ لب سن رہے ہیں، سنتے جا رہے ہیں۔ نہ مری زبان رُکتی ہے نہ سننے والوں کو آسودگی ہوتی ہے۔

اس قدر تاثیرِ غم میں ہے کبھی جانا نہیں
وہ بھی سر دھننے لگے ہیں جن کا افسانہ نہیں (۱۹۵۲ء)

کہنے والا اپنی ادا سے کہے جا رہا ہے۔ سننے والے اپنے انداز سے سنتے جا رہے ہیں۔ نہ کہنے والا رُکتا ہے نہ سننے والے روکنا چاہتے ہیں:

کہنے والے پہ گذرے سو گذرا کرے
سننے والوں کو لطفِ سخن چاہیے (۱۹۶۲ء)

اور کہہ کیا رہا ہوں:

کرتے رہو کلیمؔ جگر کے لہو کی بات
اس سرخ رُو سے بڑھ کے ہے کس سرخ رُو کی بات
کہنے کی باتیں دل میں بہت ہیں پڑی ہوئی
حسرت کی بات شوق کی بات آرزو کی بات
دل میں ہے ہرے بھرے پھولوں کا اک چمن
جاؤ ہو ڈھونڈنے کو کہاں رنگ و بو کی بات (۱۹۶۲ء)

۱۹۶۲ء میں بہار شریف میں ایک آل انڈیا مشاعرے کے دوران جگن ناتھ آزادؔ، معین احسن جذبیؔ، بیکلؔ اُتساہی وغیرہ شعرا کے درمیان غلام سرورؔ صاحب اور اخترؔ اورینوی صاحب مرحوم کی تقریروں کے بعد مشاعرہ کے شباب میں یہ غزل پڑھی تو مشاعرہ کا ایک ایک فرد اِن اشعار کو دُہراتا رہا اور عرصہ تک دہراتا رہا تو جناب:

غزل میں پگھلتے ہیں ڈھلتے ہیں ہم
مزا سب کو آتا ہے جلتے ہیں ہم

ایسا جلنا کوئی دکھائے تب تو مزا آئے۔ اب تو لوگ سگریٹ کا دُھواں کھینچ کر غزل شروع کرتے ہیں۔ نہ پگھلتے ہیں، نہ جلتے ہیں، نہ ڈھلتے ہیں تو مزا کیا خاک آئے۔ عمر گزری لیکن ابھی تک یہی حال ہے:

کیا مزا ہے غمِ دل میں کہ جہاں جاتا ہوں لوگ کہتے ہیں، پڑھو شعرِ غمِ دل والا

....

غزل میں کون نئی چاشنی چکھائے گا اگر کلیمؔ نہ ہوگا مزا نہ آئے گا

۱۹۸۶ء میں عمرہ کے لیے حجاز پاک گیا۔ مدینہ منورہ میں میرے ایک دوست انجینئر احتشام الدین نے دعوت دی۔ ہم لوگوں کے چند مشترک دوست اور بھی تھے۔ طعام سے فراغت کے بعد کچھ دورِ غزل خوانی شروع ہوا تو دوستوں میں کچھ شعرا بھی تھے۔غزلیں پڑھی گئیں۔میں نے ایک غزل شروع کی:

یہ طرزِ خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا
جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا

ظاہر ہے کہ مجمع کا رنگ تو بدلے ہی گا، خوب بدلا:

منظور ہو محفل کا گر رنگ بدل دینا
اِک اچھے مغنّی کو عاجزؔ کی غزل دینا

کوئی اچھا مغنّی نہ ہو تو کلیمؔ سے بھی خوب چل جائے گا۔تو جناب میں نے یہ طرز خاص والا مطلع پڑھ کر محفل کا رنگ بدلا۔اور دوسرا مطلع پڑھا:

غزل میں کون نئ چاشنی چکھائے گا
اگر کلیمؔ نہ ہوگا مزا نہ آئے گا

تو قبل اس کے کہ اور لوگ داد و تحسین شروع کریں۔ ہمارے میزبان احتشام الدین صاحب کا چھ سات سال کا لڑکا جو میرے آگے بیٹھا ہوا تھا بے اختیار اپنے گھٹنے پر کھڑا ہو کر واہ واہ، واہ واہ کہتے ہوئے زور سے تالیاں بجانے لگا، کیا چیز اس میں پیوست ہوئی، کون سی بجلی اس چھوٹے بچے کے رگوں میں کود گئی؟ کوئی جواب نہیں دے سکتا۔کوئی سمجھا نہیں سکتا۔کسی کی زبان سے کوئی چیز ضرور اُچھلتی ہے اور کسی کے دل میں اتر جاتی ہے۔ یہ سب ماجرائے عقل نہیں ماجرائے دل ہے، وہ دل جس کا خون ارزاں ہوتا ہے، بے تحاشہ جوئے خون جاری ہوتا ہے، ہوتا رہتا ہے لیکن کم نہیں ہوتا:

رات دن صبح و شام کا رونا   اتنا آنسو کہاں سے آتا ہے

میں کہتا ہوں شعر سننے والوں میں دو چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں—فہم اور تاثر۔شعر سے بھرپور ہم آہنگی کے لیے ان دونوں کی ضرورت ہے۔لیکن اگر فہم نہ بھی ہو تو تاثر کام کر جاتا ہے۔ یہ اچھے شعر کی بہترین علامت ہے۔ وہ لڑکا سمجھ نہ سکا ہوگا، مگر شعر میں تاثیر کی جو بجلی ہے وہ اس لڑکے میں سرایت کر گئی۔ چند ماہ پہلے میں شکاگو کی ایک مسجد میں بیٹھا تھا۔ایک پرانے بزرگ قسم

کے صاحب مجھ سے اُٹھ کر ملے۔ میں نے پوچھا آپ کا دولت خانہ؟ وہ بولے دہلی، میں نے میرؔ کا ذکر چھیڑ دیا کہ اہا آپ میرؔ صاحب کے شہر کے ہیں اور دو تین اشعار میرؔ کے پڑھے۔ وہ بولے جی ہاں۔ اور پھر بے ساختہ ایک شعر پڑھ گئے:

آہ جو ہمدمی سی کرتی ہے وہ بھی اب کچھ کمی سی کرتی ہے

میرا سر ایک جھٹکے سے اوپر اُٹھ گیا اور میں نے حیرت سے ان کا منہ دیکھتے ہوئے واہ کہہ دیا، گرچہ شعر سمجھا نہیں۔ پھر فوراً معنی سمجھ میں آئے، اور میں نے ان سے کہا حضور میں اپنے کو میرؔ کا ماہر سمجھ رہا تھا مگر آپ نے میرؔ کا ایسا شعر سنا دیا جو میرے علم میں نہ تھا۔ ایسا شعر سنایا کہ میں اس کی کیفیت میں کچھ دیر کھو گیا۔ یہ وہی تاثر کی بجلی تھی جو شعر کے ساتھ دل میں اُتر گئی گرچہ شعر بعد میں سمجھا، میں نے ان بزرگ کے ذوق کی داد دی کہ امریکہ کے شکاگو شہر میں بھی ایسے لوگ ملے کہ ان کے ذوق کا مجھے معترف ہونا پڑا۔

تو جناب واقعی یہ جگر کا لہو کیا بلا ہے۔ پچاس سال ہو گئے، کہے جا رہا ہوں۔ رٹے جا رہا ہوں:

ہم ہیں اگر تو خونِ جگر کی کمی نہیں
جتنے چراغ بزم میں چاہو جلائے جاؤ

آپ جانتے ہیں نصف صدی سے کیسے کیسے چراغ آئے ہیں۔ ان سب میں خونِ جگر رواں دواں ہے۔ ہماری وفاداری مشتبہ ہونے کی بات چلائی گئی، اب تک چلائی جاتی رہی ہے۔ بات کا رنگ آہنگ مختلف دور میں مختلف تھا اور مختلف ہے اور شاید مختلف رہے گا:

اُسے مشق گاہِ ستمگری نہ ملے گا میرے سوا کوئی
جو ہے میرا دُشمنِ زندگی مری زندگی کی دُعا کرے
یہ رُخ نگار، یہ چشم ولب ہے میرے لہو کی بہار سب
جو کرے ہے مجھ سے وفا طلب مرا حق تو پہلے ادا کرے

گذشتہ پچاس سال سے ہندوستان میں جتنی کشمکش چل رہی ہے اُس کا ماخذ اور سرچشمہ ہمارے اور ان کے درمیان آویزش ہے۔ ہندوستانی سیاست کی تاریخ گذشتہ پچاس سال سے صرف ایک کروٹ پر ہے۔ ۱۹۴۶ء کے بہار سے لے کر ۲۰۰۲ء کے گجرات تک گونا گوں افسانے ہیں اور سارے افسانے اسی ایک افسانے سے نکلتے ہیں۔ یعنی مسلمان اور ملک کا برسرِ اقتدار طبقہ:

سارے پتھر دُور ہوئے   ہم ہی رہے اِک سنگِ گراں

اب راستے میں ہمارے علاوہ کوئی سنگِ گراں نہیں ہے۔

ہے اُنھیں دو ناموں سے ہر ایک افسانے کا نام
ایک تیرا نام ہے اِک تیرے دیوانے کا نام
تجھ سے روشن ہے چراغِ محفلِ دار و رَسن
مجھ سے بھی اس دَور میں زندہ ہے پروانے کا نام
چل اِسی انداز سے ہاں چل اسی انداز سے
شوخیِ بادِ صبا ہے تیرے اِٹھلانے کا نام
تیری زُلف وچشم ولب کا نام ہے میری غزل
تیرے گھنگھرو کی صدا میرے غزل گانے کا نام
زندۂ جاوید میری شاعری نے کردیا
نام تیرے گیسوؤں کا اور میرے شانے کا نام
وہ تو کہیے ہم نے شامل کردیا خونِ جگر
ورنہ مئے کا نام کچھ رہتا نہ میخانے کا نام
پھول توڑے کوئی پتھر ہم کو مارا جائے ہے
تو نے کتنا کردیا بدنام دیوانے کا نام

اس میں سب آ گیا، بہار سے گجرات تک سبھی آ گیا، کشمیر بھی آ گیا، افغانستان بھی آ گیا، ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا واقعہ بھی آ گیا، انسدادِ دہشت گردی کا نعرہ اور عمل بھی آ گیا، پارلیمنٹ کا واقعہ، کلکتہ کا واقعہ:

غضب کی فتنہ سازی آئے ہے اس آفتِ جاں کو
شرارت خود کرے ہے اور ہمیں تہمت لگا دے ہے

گذشتہ پچاس پچپن سال میں خونِ جگر کی جلوہ آرائیاں دیکھنا چاہیں تو دونوں مجموعے کھولیں، ڈھونڈھیں، تماشہ نظر آئے گا، سب بھولا یاد آ جائے گا، سب دُھندلی تصویریں تر وتازہ ہو جائیں گی، تمام آوازیں اُبھر آئیں گی اور آپ حیران ہوں گے کہ شاعری بھی چاند سورج تک اتنی سچی ہو سکتی ہے۔ چند جلوے دیکھ چکے چند اور دیکھ لیجیے۔ یہ حافظے سے ہے، کتاب آپ کے پاس ہے؟ نہیں ہے منگوائیے۔ اس لیے کہ چوٹ ابھی تیرے دل کو لگی نہیں پیارے اگر لگے:

یاد آئے تب کلیؔم کا مجموعۂ کلام — اور حکم ہو کہ لاؤ گراں جس قدر ملے
اور جب پڑھو تو دل کی ہو کچھ ایسی کیفیت — صحرا میں جیسے پھول کی خوشبوئے تر ملے
جس طرح رندِ تشنہ دہن کو ملے شراب — جیسے کسی فقیر کو لال و گہر ملے
بے تاب ہو کے نکلو حریمِ غرور سے — اور پوچھو اس سے جو بھی سرِ رہ گزر ملے
للہ تم کلیؔم کا مجھ کو پتہ بتاؤ — میں بھی چلوں جہاں بھی وہ آشفتہ سر ملے

میں کہاں سے پہنچ گیا، خونِ جگر کے دو چار جلوۂ گریزاں آپ کو دِکھانا چاہ رہا تھا تا کہ آپ جانیں کہ یہ وہ بلا ہے جسے خدا نے ہمارے پیچھے لگا دیا ہے۔ جب تک ہم ہیں یہ بلا ہمارے ساتھ رہے گی۔ اپنا کوئی شعر یاد نہیں آ رہا ہے۔ ہوگا ضرور، ڈھونڈھنا آپ کا کام، اس لیے غالبؔ کا شعر لکھ رہا ہوں:

آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

تو یہ بلا دیکھئے کیسی لپٹی ہے:

محفل سے اُٹھ کے رونقِ محفل کہاں گئی — کھُل اے زبانِ شمع کہ کچھ ماجرا کھلے
عاجزؔ چھری پہ ان کی کھلا یوں مرا لہو — جیسے دُلہن کے ہاتھ پہ رنگ حنا کھلے

(جمشید پور، ۱۹۶۴ء)

چھری ان کی ناز کرے نہ کیوں بھلا ناز کیوں نہ اُٹھائیں گے
ہم اُسی سے ہوں گے خفا اگر، تو گلے سے کس کو لگائیں گے
ہم اسی زمیں کی ہیں خاک سے، یہیں خاک اپنی ملائیں گے
نہ بلائے آپ کے آئے ہیں نہ نکالے آپ کے جائیں گے
ہم اگر چہ بزم سے دُور ہیں، ہمیں رنگ ہیں ہمیں نور ہیں
ہم اگر نہ دیں گے جگر کا خوں، وہ چراغ کیسے جلائیں گے

(راوڑکیلا، ۱۹۷۹ء)

زخموں سے جوئے خوں کی روانی تھمی نہ تھی
اُن کی نظر کا پھر کوئی پیغام آ گیا

یوں خونِ دل میں ڈوب کے نکلی میری غزل
جیسے کوئی چھلکتا ہوا جام آ گیا

(جمشید پور، ۱۹۷۹ء)

میں نے یہ چند سطریں ابھی اس لیے لکھیں کہ اپنے نظموں کے مجموعہ کا کچھ مختصر تعارف کردوں، پھر سوچا یہ تحصیل حاصل ہے۔ جو تعارف غزلوں کا ہے وہی نظموں کا بھی ہے۔ غزل اشارے ہیں نظم تفصیل ہے۔ نظم کسی خاص موضوع پر ہیں، مگر موضوع کی تکنیک اس میں استعمال نہیں کی گئی ہے، بس خونِ جگر کو محدود نہ کرکے پھیلا دیا گیا ہے۔ غزل میں آپ تشبیہیں دیکھتے ہیں نظم میں آپ مکمل تصویریں دیکھتے ہیں۔ جن الفاظ — چراغ، شمع، درد، لہو — سے غزلوں کا طلسم کھلتا ہے اُنھیں کلیدی الفاظ سے نظموں کا طلسم بھی ٹوٹے گا۔ جشنِ آزادی پر جو نظمیں ہیں یا جشنِ بہاراں، مسافر، بلاعنوان، کہانی، دُعا، ہم نشیں، جاناں یہ سب پھیلا ہوا سیلابِ خون ہے۔ خونِ جگر کی کارفرمائیاں یہاں بھی ہیں۔ آپ غزل کا کوئی شعر پڑھ کر آنکھ بند کرلیں گے تو تصور میں ایک مکمل افسانہ یا کہانی کا نقشہ آ جائے گا۔ نظموں میں آنکھیں بند کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ واقعات آپ کے سامنے ہوں گے اور الفاظ کے چوکھٹے میں صاف تصویریں آویزاں ہوں گی۔ جس طرح غزلوں میں آپ کلیمؔ کو دیکھیں گے۔ غزلوں میں آپ چونکتے ہیں:

سن کے غزل سب چونک کے بولے، ایں کس کی آواز ہے یہ
کس کو ایسی چوٹ لگی ہے، یہ کس کا دل ٹوٹا ہے؟

نظموں میں آپ چونکیں گے نہیں، زینہ بہ زینہ آپ تصویر کی تکمیلیت کی طرف بڑھتے جائیں گے اور پھر دیکھیں گے کہ موضوع ایک پھریرا ہے، ایک جھنڈا ہے جو کلیمؔ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ موضوع خارجی ہوگا مگر باطن اس کا کلیمؔ ہی ہوگا۔ جدا ہوں گے تو نہ کلیمؔ رہے گا نہ موضوع، مگر یہ حادثہ کبھی نہ ہوگا۔ جس طرح بعض لوگ یہ بول اُٹھتے ہیں کہ یہ شعر یا یہ غزل کلیمؔ ہی کی ہوسکتی ہے کسی دوسرے کی نہیں، اسی طرح کوئی نظم پڑھ کر بھی جو مزاج آشنا ہوں گے یہی کہہ دیں گے یہ تو کلیم عاجزؔ کی نظم معلوم ہوتی ہے۔ کلیم عاجزؔ کا ایک اسٹینڈرڈ ہے بہت نمایاں بالکل بولتا ہوا۔ وہ رنگ آہنگ کسی کا نہیں ہوسکتا۔ ہندوستان، پاکستان، پوری اُردو دُنیا کو سامنے اکٹھا کرکے دیکھئے۔ پورے جُھنڈ میں کوئی ایک چیز عجیب انداز سے کلبلاتی تڑپتی کہتی اور پکارتی نظر آئے گی، یہ طرزِ

خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا۔ کل ہی ایک عزیز دہلی سے ملنے آئے، جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں۔ بولے میں ایک سیمینار میں مضمون پڑھ رہا تھا جو اس مصرع پر ختم ہوا:

ہمیں کو شرم بہت آئی روبرو جو ہوئے

سامنے ڈاکٹر محمد حسن بیٹھے ہوئے تھے چونک کر بولے، پھر پڑھیے۔ میں نے دوبارہ پڑھا تو بولے پہلا مصرع کیا ہے؟ میں نے کہا:

پرانی دوستی جن سے تھی وہ عدو جو ہوئے
ہمیں کو شرم بہت آئی رُوبرو جو ہوئے

پھر پوچھا کن کا شعر ہے، میں نے کہا کلیم عاجزؔ کا۔ وہ سر ہلا کر سرنگوں ہو گئے اور سرنگوں ہو کر پھر سر ہلانے لگے۔ کھانے کے ٹیبل پر پھر شعر پڑھوایا۔ تو آواز سنتے ہی صاحبِ آواز کو لوگ پہچان لیتے ہیں:

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے (میرؔ)

جس طرح میری غزلوں میں نہ انتشارِ خیال ہے، نہ انتشارِ رفتار ہے، نہ انتشارِ اُسلوب ہے۔ نظموں میں وہی ہم آہنگی اور بھرپور ربط و تسلسل ملے گا۔ اس لیے کہ کوئی نظم چاہے خارجی موضوع پر ہو یا داخلی تجربات کا بیان ہو اس میں تجربے، فکر اور جذبات کے علاوہ کسی مضمون آفرینی کا کوئی دخل نہیں، کوئی عمل نہیں ہے۔ نہ بات کو بڑھا کر کہنے کی کوشش ہے نہ پھیلانے کی۔ نہ مبالغہ ہے، نہ رنگ آمیزی ہے، نہ صناعی ہے۔ صناعی جو فکری طور پر بے ساختگی سے داخل ہوتی ہے اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔

اب ہم اور کچھ نہ لکھیں گے۔ چونکہ ہر نظم کے ساتھ اس کا پس منظر اور شانِ نزول دے دیا گیا ہے، اس لیے مقدمہ کی چنداں ضرورت نہیں۔ اب رہا فنّی جائزہ سو آپ کا کام ہے ہمارا نہیں۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ غزلوں کی طرح کوئی نظم بھی ایسی نہیں ہے کہ میرؔ کے اس شعر کا مصداق نہیں ہو:

کس نے سن شعرِ میرؔ یہ نہ کہا
کہیو پھر ہائے کیا کہا صاحب

(کلیم احمد عاجزؔ)

خط

۱۹۴۲ء سے جو مصائب اور حادثات کا سلسلہ شروع ہوا، جس کا نقطۂ عروج ۱۹۴۶ء کے فسادات ہیں، وہ سب زمان و مکان سے گزر کر آئینہ خانۂ دل میں متحرک بولتی ہوئی تصویروں کی طرح آویزاں ہوئے۔ کئی سال تو اسی آئینہ خانہ میں گزرے، مجھے باہر کی دنیا کی گویا کوئی خبر نہ رہی۔ مشین کی طرح دُنیا کی احتیاج کے لیے نقل و حرکت کرتا رہا مگر اس طرح جس طرح نیند میں کوئی چلتا پھرتا ہو۔ کئی سال کے بعد یہ بیخودی یا خود فراموشی کم ہوئی۔ اور اس آئینہ خانے کی دنیا اشعار میں منتقل ہونے لگی تو اس وقت بھی خود فراموشی کا وقفہ وقفہ سے دورہ ہوتا، وہ یوں کہ غزل کہتا تو مہینوں تک غزلیں کہتا رہتا اور پھر میرا آئینہ خانۂ دِل مجھے باہر کی دُنیا سے کھینچ کر اندر لے آتا اور میں پھر عالم نیم خود فراموشی میں چلا جاتا اور غزل گوئی بھول جاتا۔ یہ دور میری ابتدائی غزل گوئی سے تین چار سال کے عرصے تک ہے یعنی ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۴ء تک۔ اسی دوران میرے خاندان میں ایک شخص کا اضافہ ہوا اور معین الدین احمد عرف کجوؔ میرے ہم زُلف بنے۔ اس شخص نے بھی میری داخلی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کیا۔ اس کی حیثیت عزیز، دوست، ہمراز، ہم نشیں کی تھی، اس کا ذوق بھی بلا کا تھا، میرے درد نے اسے بھی دردمند کردیا۔ یہ کبھی کبھی مجھے چھیڑتا اور میں اشعار کی شکل میں پھٹ پڑتا۔ چند ماہ کے ایک دورۂ نیم بے خودی میں اس کا ایک مکتوب مجھے ملا۔ خاموش کیوں ہو، میرے بھائی جان کچھ لکھو، کچھ کہو، کچھ ذبح کرو، کچھ نیم بسمل بناؤ، کچھ مردہ کرو، کچھ زندہ کرو۔ یہ مکتوب جس وقت ملا میں اپنی معصوم مگر اندوہ گیں ماضی میں شدّت سے کھویا ہوا تھا۔ یہ میرا ماضی قریب تھا۔ جب ٹوٹ کر غموں کے سیلاب نے مجھے ڈبو دیا تھا۔ میں اکثر کرسی یا بستر پر لیٹا اپنے ماضی قریب میں پہنچ جاتا۔ کیا کیا ارمان تھے، کیا گلدستے سجائے جاتے تھے، کیا کیا نقشے تیار ہوتے تھے، کیا کیا خوشبوؤں کے محل بنتے تھے، کیا کیا رنگوں کے قوس وقزح اُبھرتے

تھے، نغموں کی براتیں اُترتی تھیں، سازوں کے جلوس نکلتے تھے، شادیانے بجتے تھے، ترانے جھڑتے تھے، ہوائیں رقص کرتی تھیں، شاخیں جھومتی تھیں، بلبلیں گاتی تھیں، غنچے چٹکتے تھے، پھول کھلتے تھے۔ یکایک:

بہاروں میں جو منصوبے تھے دل کے
سب آخر رہ گئے مٹّی میں مل کے

دل سے آہ نکلتی تھی اور آنسوؤں کے مسافر صف باندھے گزرنے لگتے تھے:

اشکوں کے مسافر صف باندھے خاموش گزرنے لگتے ہیں
پھر خواب کہاں اِن آنکھوں میں جب ان کا خیال آجاتا تھا

اسی عالم میں عزیز کجو کا خط ملا اور کمسنی کی معصوم گمشدہ تمناؤں میں دل ڈوب کر اُبھرا۔ اور نومشقی کی معصوم زبان میں چار بند میں یہ کہانی بے ساختہ قلم سے نکل گئی اور میں نے کجو سلّمہٗ کو بھیج دی۔ سنا جس دن میرا یہ مظلوم خط ملا، کجو مرحوم بھی دفتر نہیں گئے۔ بستر پر پڑے رہے، میرے جذبات کے آئینے میں اپنے دل کا نقشہ دیکھتے رہے:

دیوانہ ہی سمجھے ہے جو دیوانہ کہے ہے

کجو مرحوم کا مختصر مگر دل دوز ذکر 'ابھی سن لو مجھ سے' اس بے اختیار قلم سے ٹپک پڑا ہے۔ وہ ایک چنگاری ہے تو شعلہ کیسا ہوگا؟

خط

تیرے لکھنے پہ پھر چھیڑی ہے شرحِ آرزو میں نے
اگرچہ ترک کر رکھی تھی رسمِ گفتگو میں نے
نہ سمجھا تھا زمانے کو محبت کا عدو میں نے
بچائی کیسی کیسی مشکلوں سے آبرو میں نے
کبھی دریائے غم اُمڈا ڈبونے کے لیے مجھ کو
کبھی آنسو نہیں ملتا ہے رونے کے لیے مجھ کو

تمنّاؤں نے رکھا عمر بھر اندوہ گیں مجھ کو
نہ راس آئی جہانِ آرزو کی سرزمیں مجھ کو
محبت نے نہ دُنیا ہی مجھے بخشی نہ دیں مجھ کو
یہ دو روتی ہوئی آنکھیں ملیں اور آستیں مجھ کو

ملالِ بے پروبالی غمِ بے دست و پائی ہے
یہی دو چیز اپنی زندگی بھر کی کمائی ہے

گلوں نے کِھل کے تازہ کر دیا زخمِ کہن اپنا
کیا کانٹوں نے مل کر ٹکڑے ٹکڑے پیرہن اپنا
بتاؤں حال کیا اے ہمصفیرانِ چمن اپنا
بہار آتے ہی رخصت ہوگیا سب بانکپن اپنا

نہ اب وہ بزم باقی ہے نہ اب وہ ساز باقی ہے
فقط اِک درد میں ڈوبی ہوئی آواز باقی ہے

یہی مصرع ہے شرحِ مختصر اپنے فسانے کی
بہار آئی مگر حسرت نہ نکلی مسکرانے کی
ہوائے گل نے کچھ ایسی ہوا بدلی زمانے کی
کہ پہچانی نہیں جاتی ہے صورت آشیانے کی

وہ جیب رنگ و بواب ہر طرف سے چاک نکلے گی
بہت ڈھونڈھو تو شاید ایک مٹھّی خاک نکلے گی

”سنا رہا ہوں الیکشن کے.....“

یہ نظم بھی ابتدائے دورِ شاعری کی ہے اور عموماً تمام نظموں کی طرح بے ساختہ بے اختیار کسی خاص واقعہ سے شدید طور پر متاثر ہوکر وجود میں آ گئی ہے۔ شدید تاثر مجھے دو صورتوں میں ہوتا ہے۔ درد کی تیز کسک کی آواز جو کسی کو سنائی نہ دے مگر تیزی سے محسوس ہو یا ہجوم غم کے اندھیروں میں قدرت کی طرف سے مسرّت اور بشارت کی چمک جو راز داروں کو نظر آئے اور کسی کو نہیں۔

میونسپل کارپوریشن کے وجود میں آنے کے بعد پہلے الیکشن کی گرما گرمی تھی، الیکشن یا سیاست میرے لیے بے کشش اور بے مزہ چیزیں ہیں۔ اس طرف توجہ اور التفات کیا نظر بھی نہیں جاتی ،مگر الیکشن کے نہایت ناخوشگوار اور نہایت ہی ناسازگار ماحول میں میرے ایک عزیز بزرگ نے وسائل اور وسیلے اور سرمایہ اور سامان کے بالکل فقدان نہیں تو بالکل نامعتبر اور ناپائدار ہونے کے باوجود مسیحائی اور شرافت، خلوص اور خدمت کو برپا کرنے کے لیے کمر ہمّت کس لی۔ اپنوں اور غیروں دونوں کی مخالفت کی فضا میں پرچۂ نامزدگی داخل کر دیا اور سنجیدگی و وقار کے ساتھ جتنی محنت ہوسکی جائز طریقے پر اسے انجام دیا۔ اُن کی مخالفت میں نہایت ہی نازیبا طریقے پر ان کے دوستوں اور دُشمنوں دونوں نے مل کر انھیں شکست دینے کی کوشش میں اپنا زور صرف کیا کہ الیکشن میں کوئی ایسا شخص منتخب نہ ہو جو ہمارے بازار اور سوداگری میں رُکاوٹ پیدا کرے۔ الیکشن کا دن اور سیّد احسن الظفر جو پٹنہ سیٹی میں رہتے تھے اور میری بیوی کے چچا تھے، جن کا تفصیلی ذکر میری کتاب ’ابھی سن لو مجھ سے‘ میں آیا ہے، دو ایک ووٹ ڈالنے کے بعد مراکز کا سرسری جائزہ لے کر اپنے گھر واپس چلے گئے۔ شام کو ووٹوں کا شمار میرے جائے قیام کے سامنے ہی ضلع مجسٹریٹ کے دفتر میں شروع ہوا۔ میں بھی نمازِ عشا وغیرہ سے فارغ ہوکر سو گیا۔ مجھے نہ الیکشن میں حصہ لینا تھا نہ رائے شماری کی خبر تھی۔ میں سو گیا۔ شاید نصف شب گزرے بھی دو گھنٹے ہو چکے ہوں گے دو تین بجے شب کا عمل ہوگا کہ تیز نعروں کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں اُٹھ کر کمرے سے باہر بالکنی پر آیا تو ایک بڑا جلوس روشنیوں اور جھنڈوں کے درمیان گزر رہا تھا۔ درمیان میں ایک فٹن

تھی جس پر دو ایک دوستوں کے درمیان احسن الظفر اپنی سیاہ شیروانی اور سیاہ ٹوپی اور سفید چہرے کے ساتھ سرنگوں شرمائے شرمائے بیٹھے تھے اور فتن کے ساتھ ساتھ غلام سرور صاحب اپنی چست شیروانی، بکھرے ہوئے بال اور چمکتی ہوئی آنکھوں، کامرانی اور مسرّت سے چھکتے ہوئے چہرے کے ساتھ اپنی پتلی انگلیاں ہوا میں بار بار حرکت دیتے ہوئے نعرے کی آواز بلند کر رہے تھے:

حق کی فتح زندہ باد ـــ سچائی کی کامیابی زندہ باد

اور اہلِ جلوس ان کی آواز کے ساتھ ساتھ پوری قوّت سے اپنی آواز بلند کر رہے تھے، جلوس گزرتا رہا، اور زندگی میں شاید پہلی اور آخری مرتبہ انتخاب کی ایک خوشی کی لہر محسوس کی۔ میں پھر سو نہ سکا اسی وقت یہ چند اشعار موزوں کر کے صبح ہوتے ہی میں نے احسن چچا کو بھیج دی۔ انھوں نے اسی وقت اُردو اخباروں کو روانہ کر دی اور دوسرے روز جلی حرفوں میں اسی سُرخی کے ساتھ شائع ہوئی۔ نظم میں فنّی پختگی نہیں ہے لیکن سچائی کا جوش، حق کی فتح یابی کی مسرّت، باطل کو للکار، سازشوں کی رُسوائی، مایوسیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اُمیدوں کی کرن کا طلوع اور مستقبل کی بشارتوں کے اُمڈے ہوئے جذبات کی سچی اور سادہ تصویر کشی ہے۔

سنا رہا ہوں الیکشن کے خواب کی تعمیر

گمان و وہم کا پردہ بہ آب و تاب اُٹھا ـــ جنوں کی صبح ہوئی عقل کا حجاب اُٹھا
اُفق کے بسترِ راحت سے لے کر انگڑائی ـــ ستم کشوں کے مقدر کا افتاب اُٹھا
اُلجھ اُلجھ کے گری اُس طرف کہن سالی ـــ اور اِس طرف سے اکڑتا ہوا شباب اُٹھا
اگرچہ سخت رہا امتحانِ دار و رسن ـــ جنوں کا جوش بہرحال کامیاب اُٹھا
جو بات ذہن میں آئی نہ تھی وہ بات ہوئی ـــ جو آج تک نہ اُٹھا تھا وہ انقلاب اُٹھا
کوئی یہ اہلِ خرد سے پکار کر کہہ دے ـــ فریب وعدۂ فردائے آں جناب اُٹھا
کچھ اس طرح ہوئی پیرِ مغاں کی رُسوائی ـــ غریب بزم سے بادیدۂ پُر آب اُٹھا
تو مجھ سے لے ورقِ ہوش کا سبق ساقی ـــ اب اپنے نشۂ پندار کی کتاب اُٹھا

اب انجمن میں نئے بادہ خوار آئے ہیں
پرانے خم اُٹھا شیشہ اُٹھا شراب اُٹھا

حاجیوں کو مبارکباد

مجھے یاد نہیں کہ یہ نظم ٹھیک کس سال یا کس دور میں لکھی گئی، قیاس ہے کہ یہ بھی ابتدائی دَور کی ہے۔ میرا پہلا سفر حج ۱۹۶۵ء میں ہوا، کم از کم اس سے دس سال پیشتر کی ہے۔ یہ یاد ہے کہ حجاج کرام کا ایک چھوٹا سا قافلہ الحاج عبدالمنان صاحب بیدلؔ مرحوم کی امارت میں حج سے واپس آیا تھا۔ پروفیسر موصوف نے اس سے پہلے کئی سفر حج بیت اللہ کا کیا تھا۔ اور اکثر سفر میں وہ بہار کے حاجیوں کے امیر الحج رہے، میں نے اس قافلۂ حجاج کا استقبال کیا تھا۔ پہلے بھی انفرادی طور پر حج سے واپس آنے والے بزرگوں کے استقبال کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ مگر حج سے واپس ہونے والی ایک پوری جماعت کی پیشوائی اور ان کی اجتماعی دعا میں شرکت کی سعادتِ خاص اسی موقع سے حاصل ہوئی۔ اور گریہ طاری ہوا۔ بزرگوں کی صحبت، خاندانی روایت اور خانقاہوں کی قربت کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت گہرا ذہنی، قلبی اور روحانی تعلق رہا، دیہات میں میلاد شریف کی محفلیں، ربیع الاوّل اور رجب کے موقعوں پر گھر کی ایک خصوصی روایت رہی ہے جس کا تفصیلی تذکرہ 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' میں ہے۔ تو استقبال کے وقت دعاؤں میں مجھ پر رقت طاری ہوئی، میں گھر واپس آیا اور اپنی کیفیتِ قلبی ان چند اشعار میں منتقل کر کے محترم پروفیسر عبدالمنان بیدلؔ صاحب کی خدمت میں بھجوا دی۔ انھوں نے کسی اخبار میں شائع کر دیا اور گلے مل کر بہت دُعائیں دیں۔

حاجیوں کو مبارک باد

فارغِ حج ہو کے جو تشریف گھر لائے ہو تم
جانتے ہو کس کو ہم سفر لائے ہو تم

یہ تمھاری سرخروئی کی دلیلِ صاف ہے
زُلف و پیشانی پہ جو گردِ سفر لائے ہو تم

آنسوؤں کے چند قطرے سے لے گئے تھے کل وہاں
موتیوں سے آج دامن اپنا بھر لائے ہو تم

وہ عقیدت جو تمھیں لے کر گئی دیوانہ وار
اپنے شامل اس عقیدت کا ثمر لائے ہو تم

وہ جگہ گونجی جہاں تکبیر کی پہلی صدا
اس کی گلیوں کی صدائے معتبر لائے ہو تم

جس کے پھولوں پر خزاں کی چھاؤں پڑ سکتی نہیں
اس چمن کی نکہت بادِ سحر لائے ہو تم

جس نے چوما ہے کفِ پائے پیمبر بارہا
اپنے دامن پر وہ خاکِ رہ گزر لائے ہو تم

گرم جن کے نالۂ شب سے ہے صحرائے حجاز
ان شتربانوں کی فریادِ سحر لائے ہو تم

اضطرابِ شوق پہلے سے زیادہ ہوگیا
چشم نم لے کر گئے تھے چشم تر لائے ہو تم

پھونک دیتا ہے جو باطل کے خس و خاشاک کو
اپنی سانسوں میں چھپا کر وہ شرر لائے ہو تم

اُس نگاہِ پاک بیں کا مرتبہ کیا پوچھنا
جس میں عکسِ روضۂ خیرالبشر لائے ہو تم

بس یہی جی چاہتا ہے عمر بھر سنتا رہوں
کس قدر دلچسپ رودادِ سفر لائے ہو تم

بندۂ عاجزؔ بھی تم سے ہے طلبگارِ دُعا
مہرباں اپنی دعاؤں میں اثر لائے ہو تم

عید

اس نظم کا کوئی باطنی محرک نہیں بلکہ ابتدائی دَور کی نظم ہے۔ ریڈیو والوں کی فرمائش پر لکھی گئی اور ریڈیو پر پڑھی گئی۔ ۱۹۵۱ء یا ۱۹۵۲ء کی بات ہے، رفیع الدین بلخی صاحب زندہ اور صحت مند تھے۔ روزانہ صبح کی نماز سے فارغ ہوکر شب خوابی کا پاجامہ اور کمر سے کچھ نیچے تک کی قمیص پہنے ہوئے، بٹن کھلا ہوا اور قمیص کا کالر دونوں طرف پھیلا ہوا، پیشانی کا بال جھٹکتے ہوئے، سبزی باغ اپنے مکان سے لان کے میدان میں ہوا خوری کو نکلتے۔ میں مسجد سے واپس آکر اپنے مکان کے سامنے فٹ پاتھ پر ٹہلا کرتا۔ اگر اس وقت وہ گزرتے تو میرے پاس قریب آکر ایک پاؤں فٹ پاتھ پر اور ایک پاؤں میرے مکان کے چبوترے پر رکھ کر دو چار باتیں ضرور کر لیتے اور ہوا خوری کو نکل جاتے۔ نظم ریڈیو سے نشر ہوئی اور دوسری صبح کو بلخی صاحب حسبِ دستور لان کی طرف جاتے ہوئے میری طرف سے گزرے۔ میں بھی چہل قدمی میں مشغول تھا۔ پکار کر کہا عاجزؔ صاحب عید پر نظم خوب ہے مگر نظم نہیں ہے، یہ تو غزل ہے، غزل مسلسل ہے۔ عید کی نہیں عید کی تیاریاں کرنے والوں کی تصویریں ہیں۔ آپ نے یہ نظم تحت اللفظ پڑھ دی۔ کل ہی مشورہ ہوا۔ ایوب صاحب، جعفر امام صاحب، قاضی سعید صاحب سب لوگ آج ہمارے یہاں جمع ہو رہے ہیں، ہم آپ سے یہ نظم نما غزل مسلسل ترنم سے سننا چاہ رہے ہیں۔

میں غزل لکھوں، نظم لکھوں، میں پہلے اپنے خیال کو، تجربے کو، مشاہدے کو ایک جگہ جمع کرتا ہوں، انھیں جوڑ توڑ کر ایک مکمل پیکر بناتا ہوں پھر پیکر کی مناسبت سے انھیں الفاظ کا پیرہن عطا کرتا ہوں۔ جب تک خاکہ مکمل نہ ہو جائے میں قلم نہیں اٹھاتا۔

شام کو رفیع الدین بلخی صاحب ایڈوکیٹ کے یہاں سب جمع ہوئے۔ ان حضرات کے علاوہ جمیل صاحب اور سیّد محمد اجتبیٰ رضوی صاحب بھی تھے۔ لہک کر پڑھی گئی اور چہک کر سنی گئی۔

اور جب مجلس جمتی ہے تو ایک دو پر کب قناعت ہوتی ہے۔ غزلوں کی فرمائشیں ہوئیں۔ تین چار غزلوں کا دَور چلا اور آخر غزل پڑھتے ہوئے جب میں نے یہ مقطع پڑھ کر:

چند اشکوں کا مرقع ہے کلامِ عاجزؔ
ڈال رکھا ہے نقاب اس پر غزل خوانی کا

یہ کہا کہ 'نقاب' شاید مؤنث ہے، لے کر میں کیا کروں، مجبور ہوگیا۔ مضمون بدلنا چاہتا نہیں تھا، تو قبل اس کے کہ جمیل مظہری صاحب یا اجتبیٰ رضوی صاحب کچھ بولیں بلخی صاحب برجستہ بول اُٹھے کہ نہیں صاحب نقاب مؤنث نہیں ہے مذکر ہے۔ غالبؔ کا مصرع سن لیجیے:

''زُلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا''

کیا لوگ تھے، کیا ذوق تھا، کیا علم تھا، کیا خلوص تھا، کیا محبت تھی۔ میں تو اب شعر کہتے ہوئے روتا ہوں۔

عید

عید آئی گرمِ بزمِ آرزو ہونے لگی
حسرتِ پنہاں میں تحریکِ نمو ہونے لگی

ہر رگ و پے میں لہو انگڑائیاں لینے لگا
تیز پھر رفتارِ نبضِ آرزو ہونے لگی

دامن و جیبِ خرد کی دھجیاں اُڑنے لگیں
عصمتِ پندار غرقِ رنگ و بو ہونے لگی

منتشر ہونے لگی تاریکیِ شامِ فراق
جلوہ گر تنویرِ صبحِ آرزو ہونے لگی

انقلاب آنے لگا دنیائے ذہن و فکر میں
عقل والوں میں جنوں کی گفتگو ہونے لگی

صبح سے اہلِ چمن آراستہ ہونے لگے
عطر میں ڈوبی قبا زیبِ گلو ہونے لگی

طرۂ پُر پیچ و خم کے پیچ و خم کھلنے لگے
آئینہ میں صاف زُلفِ مشک بو ہونے لگی

سال بھر کے رُوٹھنے والے گلے ملنے لگے
یعنی پھر تجدیدِ رسمِ آرزو ہونے لگی

شیشۂ دل سے کدورت کے نشاں مٹنے لگے
چاک سینہ کے لیے فکرِ رفو ہونے لگی

دُشمنوں سے بھی سلوکِ دوستی ہونے لگا
دل بڑھا اتنا کہ تعظیمِ عدو ہونے لگی

جشنِ بہاراں-۱

شاید ۱۹۵۷ء کا موسمِ سرما تھا، پٹنہ یونیورسٹی کی طرف سے جشنِ آزادی کی تقریب تھی، وائس چانسلر اور تمام کالجوں کے پرنسپل، تمام شعبوں کے اساتذہ موجود تھے۔ سربراہانِ حکومت سے بھی کچھ لوگ مہمان خوصی تھے۔ تقریریں ہوئی پھر مشاعرہ ہوا۔ غزلیں پڑھی گئیں۔ مجھ سے کہا گیا۔ میں نے بغیر تمہید یہ نظم پڑھ دی، چند ہی دن پہلے لکھی تھی۔ ۱۹۴۶ء کے فسادات، خون ریزیوں، جاں سوزیوں کو گیارہ سال ہو گئے تھے، میں ۱۹۴۶ء کے بعد اپنی بستی کی طرف رُخ بھی نہ کر سکا تھا، اس گلشنِ بے خار کو دیکھنے کی ہمّت ہی نہیں تھی کہ اب وہاں کا کیا نقشہ ہوگا؟ وہ نقشہ دیکھا جاسکے گا! لیکن ۱۹۵۷ء کی سردیوں میں سوئٹر پہن کر اور گلے میں فقیروں کا سا جھولا لٹکا کر راجہ بھرتھری بن کر اپنی پرانی راجدھانی میں پہنچ گیا۔ جو دیکھا، دل پر جو کچھ گزرا، آنکھوں میں جو نقشہ اترا اُسے غزل میں کہہ کر غزل ہی جیسے اہتمام کے ساتھ بے ساختہ گویا قلم برداشتہ لکھ گیا۔ اس کے چار حصّے ہیں۔ شاعر کا دل شاعر سے کچھ کہلوانا چاہتا ہے اور بڑی چیز کہلوانا چاہتا ہے، ایسی چیز جو زبان و بیان کی حدود میں بڑی مشکل سے آتی ہے۔ دلبراں در حدیثِ دیگراں بہت مشکل اور پیچید منزل ہے۔ شاعر کا دل شاعر کا حال بھی بیان کر رہا ہے۔ اس کی کیفیت، اس کی کشمکش اور منزل کی دشواریوں کی طرف اشارہ بھی کرر ہا ہے اور صفائی سے بیان کرنے کی ترغیب بھی دے رہا ہے۔ شاعر گونگا بن جاتا ہے، تو شاعر کا دل خود سراپا بیان ہو کر آگے بڑھتا ہے اور غزل کے دستور کے خلاف غمِ جاناں کا پردہ چاک کر کے غمِ جاناں کی تان میں غمِ دوراں سنانے لگتا ہے۔ گیارہ سال پہلے کی شبستانِ محبت کو غارت گریِ فصلِ بہار نے کس حال کو پہنچایا۔ دوسرے حصّے میں دوروزہ ۴-۵ر نومبر کی ڈرامائی تصویر ہے۔ حادثۂ موسمِ گل، تجدیدِ روایاتِ قدیم، ناوک اہرمن اور سینۂ یزدان ان اصطلاحوں میں ایک دنیائے واردات چھپا دیتا ہے۔ تیسرے حصّے میں

غارت گریِ بہار کے دوران کا منظر اور غارت گری کے بعد بچے ہوئے قافلۂ خانہ بدوشاں کس حال میں رخصت ہوا اور کیا منظر چھوڑ گیا۔ چوتھے حصّے میں تیلہاڑہ کے ماضی اور حال کی تفسیر ہے۔سامعین کے ردِّعمل سے بے پرواحالات اور سامنے کی کیفیات سے بے نیاز، مدہوش یا سرشاری جو عالم کہیے پوری نظم، نظم کی کیفیت میں گم ہوکر میں پڑھتا چلا گیا:

میں تو سب کہہ گیا اب آپ جنابِ عاجؔز
نظم اِک تازہ پئے جشنِ بہاراں کہیے

اب آگے شاعر کیا کہے، اتنا کچھ کہہ جانے کے بعد دل کا یہ طنز شاعر کو ہوش میں لا دیتا ہے اور یہ خود کلامی ختم ہوتی ہے۔

نظم ختم کرنے کے بعد ڈائس سے نیچے اُترا تو پروفیسر میمونہ جعفری، کامریڈ علی اشرف کی بیوی جو پٹنہ وِمنس کالج میں پڑھاتی تھیں اور پٹنہ یونیورسٹی میں بھی کلاس لینے کو آتی تھیں شعبۂ اُردو میں وہ واحد خاتون لکچرر تھیں، اپنی چھ سات سالہ بچی کا ہاتھ پکڑے میرے پاس آئیں، بچی سے کہا سلام کرو اور مجھ سے کہا کلیم عاجؔز صاحب آپ کی نظم میں اتنے استعارے کنائے، علامات اور اشارے ہیں، اتنے محاکاتی لوازمات ہیں، اتنے دروبست ہیں کہ میں سمجھتی ہوں آپ کوئی کہانی کہنا چاہتے ہیں مگر کہانی کا پہلو بہت مبہم ہے۔کیا واقعی آپ کوئی کہانی کہنا چاہتے تھے؟ اور یہ نظم اس کہانی کا پس منظر ہے یا پیش منظر ہے؟ اگر ایسا ہے تو آپ کو کچھ وضاحت کرنی چاہیے تھی، کچھ تمہیدی حصہ آنا چاہیے تھا۔میں نے کہا آپ نے سارا صحیح سمجھا ہے لیکن میں وضاحت کرتا تو پھر نظم پڑھنے کی سرشاری سے محرومی ہوجاتی اور میں کہانی ہی کہنے لگتا۔شاعری کا دامن چھوٹ جاتا اور میں شاعر ہوں کہانی کار نہیں ہوں، کہانی بنانے کے لیے اشارے موجود ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو کوئی دن، کوئی وقت مقرر کریں تو اس طلسمِ زبان وبیان کی کنجی آپ کو دے دوں۔ بولیں میں ضرور آپ سے اس سلسلے میں ملاقات کروں گی اور اپنی تشفی حاصل کروں گی۔مگر وہ کچھ دنوں بعد ہی علی گڑھ چلی گئیں، اپنے شوہر ہی کے ساتھ وہاں لکچرر ہوئیں۔اور پھر کبھی پٹنہ نہیں آئیں۔۱۹۵۷ء کے بعد اب اس نظم کی اشاعت کے وقت وہ یاد آئیں، ان کا ذکر بھی کیا اور ان کے ساتھ اوروں کے لیے بھی نظم کے اشاروں کی طرف کچھ اشارے کردوں۔

جنھوں نے 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' پڑھا ہوگا، جنھوں نے 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' پڑھی

ہوگی اُنھیں یاد ہوگا کہ ۱۹۴۸ء سے پہلے بہار میں ایک گاؤں تھا، شاید ویسا گاؤں کوئی اور ہو، اگر تھا یا ہے تو کوئی بتائے، کوئی دکھائے۔ میں تو اپنی کتابوں میں، اپنی غزلوں میں، اپنی نظموں میں صاف یا اشاروں میں کہہ چکا اور ۵۰ سال سے کہہ رہا ہوں اور اب بھی ایسا لگتا ہے کہ ابھی شروع ہی کیا ہے۔ اگر کوئی ایسا تھا تو اس گاؤں والے آئیں۔ اس گاؤں کی تاریخ جاننے والے آئیں، بتائیں، دکھائیں۔ کوئی نہیں آئے گا، ایسا گاؤں ہوتا تو ایسا گاؤں لاوارث نہ مر جاتا، کوئی وارث ضرور چھوڑ جاتا، اب گاؤں کی وراثت مکانات ہیں، سڑکیں ہیں، روشنیاں ہیں، دُکانیں ہیں، سب اپنی اپنی بات کہتے ہیں۔ مکان، مکان کی بات کرتا ہے، دُکان، دُکان کی بات کرتی ہے، سڑکیں سڑکوں کی بات کرتی ہیں، گاؤں کی بات کوئی نہیں کرتا، اس لیے کہ ایسا گاؤں کوئی تھا ہی نہیں۔ گاؤں کو ہرا بھرا صحن گلستاں بنا کر پھر اُسے ’شعلہ شعلہ‘ ہونے کا منظر دکھائے:

شعلہ شعلہ جو ہوا صحنِ گلستاں کہیے

کچھ کھپریل، کچھ پختہ، کچھ مٹّی، کچھ اینٹ کی چہار دیواریوں کے اندر ایسی زندگیاں، ایسی حسین، ایسی دلکش دلنواز زندگیاں، محبت سے بھرپور، نشۂ عشق سے چور، مٹّی چونے اور اینٹ کے اندر بسی ہوئی ایسی جنت، ایسی خوشبو، ایسی معصوم رعنائی، درد اور بے لوثی کے ایسے دھیمے نرم چراغ اور پھر ان شبستانوں کے یک بیک بجھ جانے کا منظر پیش کرے۔ آخر ہے تو کوئی پیش کیوں نہیں کرتا، آخر ایسے اندھے، بہرے، گونگے لوگ کیوں ہو گئے، نہیں اندھے بہرے گونگے لوگ نہیں ہیں، بڑے روشن چشم، تیز گوش اور اہلِ زبان لوگ ہیں مگر کریں تو کیا کریں، نگاہوں میں کوئی منظر ہی نہیں، کانوں میں کوئی صدا ہی نہیں، زبانوں میں کوئی قابلِ اظہار بات ہی نہیں آپ کو:

یاد تو ہوگی وہ تجدیدِ روایاتِ قدیم
ناوکِ اہرمن و سینۂ یزداں! کہیے؟

گلے ملنے والے گلے کاٹ گئے، سینے سے سٹنے والے برچھی کھونپ گئے، بغل گرم کرنے والے بغل میں خنجر چبھو گئے، احسان منداحسان فراموشی کر گئے، غلام آقا کو لوٹ گئے، بندے خداوندوں کے سر چڑھ بیٹھے جنھوں نے چھنگلیوں کے پور بھی نہ دیکھے تھے وہ آنچل اُتارنے پر تیار ہو گئے تو پھر:

آپ شاعر ہیں وہ منظر تو نہ بھولے ہوں گے
رسنِ زلف و رگِ گردنِ خوباں؟ کہیے

تو آنچل والوں نے آنچل کمر سے لپیٹ لیے اور چاقو نکال کر پہلے سامنے والے کے سینے پر مارا اور پھر وہی چاقو کھینچ کر اپنے سینے میں اُتار لیا، اور کچھ آنچل والوں نے اپنے جوڑے کھولے اور کنویں کے کنارے کھڑے ہوکر چوٹیاں گردن میں حائل کر کے اس جنونی قوّت سے کھینچی کہ زبان باہر نکل آئی اور جسم کنویں کے اندر۔ اور آخر کے پانچ اشعار میں گاؤں کا ماضی اور حال:

وہ کتابِ گل و لالہ وہ بیاضِ گلشن　　اب اُسے ’مجموعۂ اوراقِ پریشاں‘ کہیے

رنگ و بو کا وہ مکاں وہ درو دیوارِ چمن　　مدتوں سے انھیں محرومِ چراغاں کہیے

آہ وہ سیر گہہ سروقدانِ گلشن　　اب انھیں خواب گہہ خارِ مغیلاں کہیے

جہاں پھولوں کی روشیں نرم سبزے کے فرش تھے وہاں بڑے بڑے جھاڑ اُگ گئے، ان پر کانٹیں جاگتے ہیں اور تھک کر سو جاتے ہیں:

وہ شجر ہائے خمیدہ لبِ جو و سرِ چاہ
اب اُنھیں ماتمیِ گنجِ شہیداں کہیے

آیئے ’جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی‘ کے اقتباس میں ان اشعار کی تشریح اور نثری تصویر دیکھیے۔ رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ اس نظم کے چار حصّے ہیں۔ یہ ترتیب کسی اسکیم یا منصوبہ بندی کے نتیجے میں بالکل نہیں بہت سی نظمیں اس مجموعے میں ہیں۔ ’مسافر‘، ’کہانی‘، دل‘، ’مولودِ اقبال‘، ’ہم نشیں‘، ’بلا عنوان‘، ’سائبان‘، ’یومِ شاد‘، ’بوسنیا‘ وغیرہ وغیرہ اور اکثر چھوٹی بڑی نظمیں بغیر کسی اسکیم کے ڈھلی ڈھلائی، مختلف مناظر اور ماحول، محاکاتی اور ڈرامائی ترتیب، تنظیم اور بند و بست کے ساتھ عموماً بے ساختہ وجود میں آئیں۔ سب اشعار ہو گئے تو کبھی کبھی دو ایک اشعار کی ترتیب بدل کر ایک مستقل پیکر میں ڈھال دیا گیا، جیسے میری اکثر غزلیں ڈرامائی ہیں اور تقریباً تمام غزلیں کوئی کوئی مستقل موضوع کے پیکر میں خود بخود ڈھل گئی ہیں۔ چونکہ میری فکر مجتمع ہے، میری زندگی میں نہ انتشارِ خیال ہے، نہ انتشارِ فکر، نہ انتشارِ عمل۔ شاعری نظم یا غزل یا نثر، ان کا موضوع متعین تو نہیں مگر مقصد متعین ہے۔ زندگی جس محور اور جس مرکز پر گھوم رہی ہے فن بھی اُس محور اور مرکز کا پابند ہے۔ یہ پابندی شعوری نہیں اور وقتی یا ہنگامی نہیں مستقل اور دوامی ہے، اس لیے میری فطرت میں تخلیقی مشین بھی کمپیوٹر کی طرح آزاد اور خودکار رہے۔ میرا کمپیوٹر میرا دل ہے۔ دل نے مجھے سنوارا اور بنایا ہے اور میں نے دل کو سنوار بنا کر خود مختار کر دیا ہے۔ اس قدر خود مختار ہے کہ میرے

احساسات کی دنیا بھی بہت مزین اور مرتب ہے یعنی میری آنکھیں، میرے کان اور جو بھی اعضا ہیں اپنے مشاہدے میں لگے ہیں۔ انھیں کے ذریعے احساسات میں برقی رو داخل ہو رہی ہے مگران احساسات پر دل کا کنٹرول ہے وہ اپنے کام کی چیزیں حفاظت سے خود ہی رکھ لیتا ہے اور تخلیقی مشین میں انھیں ڈال کرفن کے پیکر گڑھتا رہتا ہے۔ یہ بات لوگوں کو عجیب لگے گی۔ کیا کیا جائے واقعی عجیب ہے۔ تقریباً پینتالیس سال کے ادبی و شعری سفر میں مجھے اپنے ہمنوا و شریکِ سفر دل نے نہ مجھے کبھی دھوکا دیا اور نہ دل پر میرے اعتماد میں کبھی بھی ذرا سی کمی ہوئی ہو۔ یہ پینتالیس سال کا سفر معمولی سفر نہیں ہے۔ میرے ساتھ کے مسافروں کو بہت ٹھوکریں لگیں، کچھ ڈگمگا کر الگ ہو گئے، کسی کا رُخ مڑ گیا، کوئی پیچھے کو مراجعت کر گئے، کوئی بیمار ہو گئے لیکن میرے سفر کی روداد میرے فنِ نظم و نثر میں وضاحت سے موجود ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ فلاں مقام پر ٹھوکر لگی ہے اور قدم لڑ کھڑایا ہے یا ذرا سا بھی رُخ بدلا ہے یا رفتار میں سستی آئی ہے یا اعتماد کے لہجے میں کچھ کمی آئی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔

تو اس نظم میں چار حصّے ہیں، نظم لکھنے کے ارادے کے بعد زندگی کے محور پر جو زلزلہ سا آیا ہے، سمندر میں جو طوفان آیا ہے، تو میرا ہم نشیں تیار ہو کر کھڑا ہو گیا:

دل نے مجھ سے کہا سوزشِ پنہاں کہیے
کچھ تو رودادِ چراغِ تہہ داماں کہیے

یہ نظم ۱۹۵۷ء میں لکھی گئی۔ چھتیس سال بعد ۱۹۹۳ء میں ایک نظم 'جاناں' لکھی گئی اس کا ایک شعر ہے:

تو نے مدّت ہوئی اِک درد کا بخشا تھا چراغ
وہ چراغ اب بھی لیے ہوں تہہِ داماں جاناں

یہ کمپیوٹر بول رہا ہے، اور یہ کمپیوٹر، یہ دل کلیم عاجزؔ کی پوری داخلی تصویر پیش کر دیتا ہے۔ پوری تصویر اس اعتبار سے جو اس نظم کے لیے ضروری ہے وہ اس میں نہیں ورنہ پوری تصویر تو پینتالیس سال کی فنّی کوششوں کے بعد بھی اتنی غزلوں نظموں اور نثری کتابوں کے باوجود تیار نہیں ہو سکی ہے:

کب دیکھئے تیار ہو، ہم خونِ جگر سے
اِک شوخ کی تصویر بنانے میں لگے ہے

کلیم عاجزؔ کی زندگی کے ایک پہلو کی متحرک تصویر چھ شعروں میں ہے۔ نظم میں جو باتیں آ رہی

ہیں یا نظم وغزل میں جو باتیں آتی رہی ہیں یا آئندہ آنے والی ہیں اُن باتوں کے کہنے والے کی یہ ایک مختصر سی یک پہلو تصویر ہے۔ فن میں جو باتیں آگے آ رہی ہیں ان باتوں کے خالق کی یہ تصویر ہونی ہی چاہیے ورنہ باتوں میں جان نہیں آ سکتی۔ میر تقی میرؔ کے یہاں غزلوں کے انفرادی اشعار میں میرؔ کی تصویر بکھری ہوئی ہیں۔

دل سمجھ رہا ہے کہ 'جشنِ بہاراں' پر نظم لکھنا ہے لیکن شاعر غزل کا ہے۔ ''گر نہیں فکرِ منظّم تو پریشاں کہیے''، نظم نہیں کہہ سکتے تو غزل ہی کہہ ڈالو۔ دوسرا بند گویا بات کی تمہید ہے کہ کہنا کیا ہے:

چھیڑیئے قصّہ غارت گریِ فصلِ بہار
سرگزشتِ چمنِ سوختہ ساماں کہیے

آگے جو بات آنے والی ہے وہ گویا غارت گریِ فصلِ بہار کا قصہ ہوگا۔ دل نے اشارہ کیا، لیکن کمبخت کا اشارہ ابھی صاف اور واضح نہیں ''بہ زبانِ غمِ دوراں''، نہیں بات ''بہ زبانِ غمِ جاناں'' ہی کہنی پڑے گی:

بجھ گئے کتنے شبستانِ محبت کے چراغ
محفلیں کتنی ہوئیں شہرِ خموشاں کہیے

آ گئی۔ زبان غزل ہی کی آ گئی۔ ''شبستانِ محبت'' کلیم عاجزؔ کا گھر، ڈاکٹر محمد اعظم کا گھر، شاہ عبدالحفیظ کا گھر، ظفر امام کا گھر، قمر ایوب کا گھر یہ سب ''شبستانِ محبت'' تھے یعنی شبستانوں کی سرسری تصویریں تیس سال اور پینتیس سال بعد 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کے دیباچے میں اور پھر 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' میں آنے والی تھیں۔ بغیر ارادہ کے اس نظم 'جشنِ بہاراں' میں ان کی بنیاد پڑ گئی، بنیادوں پر تیس پینتیس سال بعد عمارتیں کھڑی ہوئیں:

آپ خاموش اگر مصلحتِ وقت سے ہیں
میں ہی دہراتا چلوں قصّہ دوراں؟ کہیے

بڑے شاعر بنتے ہیں۔ گونگے ہی کیوں نہ رہے:

ہر ایک ظرف برابر نہیں ہے اے بلبل
جو بات سینے میں رکھوں ہوں میں، نہ تُو رکھیو

تو کہاں ہے وہ ظرف نکالو۔ یہ ڈانٹ کلیمؔ کو پڑی ہے۔ لیکن یہ ڈانٹ کلیمؔ کو نہیں ہے، ڈانٹ تو اس

کو پڑ رہی ہے جو تخریب کاری اور بربادی کا الزام دوسروں پر ڈال کر ''خود منہ پر ہاتھ رکھ کر مسکرا دے ہے'' دوسرے نہ دیکھیں مگر ہاتھ کے پیچھے لب مسکرار ہے ہیں۔ دل تو یہ دیکھ لیتا ہے وہ خوب جانتا ہے:

یہ فتنے جو ہر اِک طرف اُٹھ رہے ہیں　　وہی بیٹھا بیٹھا شرارت کرے ہے

....

یہ پُرانی ادا ہی سہی خوب ہے　　خود شرارت کرو ہم کو الزام دو

....

برعکس نہند نام زنگی کافور۔ دل کو یہ آرٹ معلوم ہے۔ پھر دل شروع کر دیتا ہے:

یاد ہے آپ کو وہ حادثۂ موسمِ گل
شعلہ شعلہ جو ہوا صحن گلستاں، کہیے

غزل میں یوں کہا جاتا ہے:

یہ پکار سارے چمن میں تھی وہ سحر ہوئی وہ سحر ہوئی
میرے آشیاں سے دُھواں اُٹھا تو مجھے بھی اس کی خبر ہوئی

....

یاد تو ہوگی وہ تجدیدِ روایاتِ قدیم
ناوکِ اہرمن و سینۂ یزداں؟ کہیے

غزل میں یہ بات یوں کہی گئی:

خنجر جو اُٹھائے ہیں شمشیر جو تانے ہیں
سب ساتھ کے کھیلے ہیں سب دوست پرانے ہیں

(جب فصلِ بہاراں آئی تھی)

پرانی دوستی جن سے تھی وہ عدو جو ہوئے
ہمیں کو شرم بہت آئی روبرو جو ہوئے

(جب فصلِ بہاراں آئی تھی)

پھر کہتا ہے:

آپ کو یاد تو ہوگا وہ تماشہ یعنی
رقصِ شمشیر بہ ہنگامِ بہاراں؟ کہیے

”آخری گھڑی جب آ ہی گئی تو پھر اب کیا تکلف ہے؟ جب اس نے بلایا ہے پھر کیسی فراموشی۔ کنواریوں اور بیاہتاؤں نے رحل نکالی، قرآن کھولا، بڑی بوڑھیوں نے صفحہ نکالا اور حکم دیا زور سے پڑھو۔ اور پھول جیسی قمریوں اور طوطیوں جیسی آواز میں دوپٹہ آخری بار سر پر ڈال کر جھوم جھوم کر پڑھنا شروع کیا: وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ ...... اور رقصِ شمشیر شروع ہوا۔ شپاشپ شپاشپ شپاشپ شپاشپ اور قرآن پڑھنے والیوں کے سر قرآن والے کے سامنے قرآن پر سجدے میں گر گئے۔“

(اقتباس دیباچہ ’وہ جو شاعری کا سبب ہوا‘)

یاد ہیں آپ کو وہ منظرِ صبحِ وطن
جن کی تقدیر میں تھی شامِ غریباں؟ کہیے

آزادی آئے گی، اپنا گھر سجے گا، باجہ بجے گا، جلسہ ہوگا، غزل خوانی ہوگی۔ لیکن صبحِ وطن شامِ غریباں لیتی آئی۔ جو بچ سکے وہ لہو بھری آنکھوں سے اپنی خاکستر شدہ در و دیوار کو بادیدۂ حسرت دیکھتے ہوئے قسمت کے اشارے پر بے دیار و بے وطن ہونے کو نکل پڑے۔ نہ کوئی راحلہ وزادِ سفر، نہ کوئی منزل بس ٹوٹا پھوٹا راستہ۔ غزل کا شعر یوں ہوتا ہے:

ایسا بھی کوئی قافلہ دیکھا آپ نے؟
جو موسمِ بہار میں گلزار سے چلے؟

(وہ جو شاعری کا سبب ہوا)

مبارک برق تجھ کو لالہ و گل کی نگہبانی
کہ اب تو گلستاں سے دردمندِ گلستاں گزرے

....

یاد ہیں آپ کو وہ ہر روشِ گلشن پر
پھول روندے ہوئے مسلی ہوئی کلیاں؟ کہیے

سیّد اطہر حسین، سیّد محمد واعظ الحق، قاضی ظہور الحق، قاضی بشیر حسین، معین الدین، شاہ عبدالحفیظ، شاہ عبدالحسیب، قمر ایوب، نجم ایوب، درجنوں بچے بچیاں، عبدالرزاق، محمد طفیل، شکیلہ جہاں آرا، کیا نام لوں:

اب آگے نہ مجھ سے کہا جائے ہے
مری دونوں آنکھیں ہی بھرائیاں

(نظم سائبان)

آپ شاعر ہیں وہ منظر تو نہ بھولے ہوں گے
رسنِ زُلف و رگِ گردنِ خوباں؟ کہیے

جن غیرت دار کمسنوں نے دُشمن کی تلوار حلق پر اور خنجر سینے پر کھانا گوارہ نہ کیا، دوڑ کر کنویں کے منڈیر پر آئیں، چوٹیاں کھولیں، اور نازک گردنوں میں لپیٹ کر ایک مجنونانہ طاقت کے ساتھ زور سے کھینچا، زبان باہر اور جسم کنویں کے اندر۔ اس کے بعد میرا گاؤں تیاہاڑہ، کلیم عاجزؔ کی بستی، امرود کے باغوں، جامن کے درختوں، سنگرہار کے پھولوں کی بستی:

وہ کتابِ گل و لالہ، وہ بیاضِ گلشن
جن کو مجموعۂ اوراقِ پریشاں کہیے

یوں لٹی، یوں جلی، یوں بکھری، یوں گری جیسے 'مرقعہ غالبؔ' کو، 'مثنوی سحرالبیان' کو، 'گلزارِنسیم' کو، 'داستانِ بکاؤلی' کو پُرزے پُرزے کر کے بھٹی میں جھونک دیا جائے:

آہ وہ سیرگہہِ سروقدانِ گلشن
اب جنھیں خواب گہہِ خارِ مغیلاں کہیے

ہر مکان میں چھوٹا بڑا پائیں باغ جسے دیہاتوں میں کھنڈر کہتے ہیں۔ ہرے بھرے سبزے، بیلے چنبیلی کی روشیں، امرودوں اور جامنوں کے درخت، سنگرہار کے پیڑ، جن پر گاؤں کی شہزادیاں ننگے پاؤں سنگرہار کے پھول سسور سسور کر (بہار کا محاورہ ہے) ایک دوسرے کے بالوں پر ڈالتیں۔ امرود کی شاخوں پر جھولے ڈالتیں اور بہن بھائی مل کر جھولا جھولتیں:

مرے گاؤں کے وہ بغیچے وہ پُل — وہ تالاب وہ ندّیاں کھائیاں
وہ منڈوے وہ بارات وہ رتجگے — وہ ڈیوڑھی اسارے وہ انگنائیاں
وہ انگنائیوں میں چمیلی کے پھول — بہاریں جسے دیکھ شرمائیاں
وہ جھولا اِک امرود کی شاخ پر — وہ جھولے پہ بیٹھی بہن بھائیاں

(نظم 'سائبان')

گیارہ سال بعد ۱۹۵۷ء میں گیا تو بڑے بڑے جھاڑ اُگ رہے تھے کانٹے سر اٹھائے کھڑے تھے:

آخری بند کے یہ پانچ شعر۔ ہر شعر کا پہلا مصرع گاؤں کے مٹنے برباد ہونے سے پہلے کا منظر پیش کرتا ہے۔ اور دوسرا منظر جب یہ گاؤں خرابہ ہو گیا۔

۱. کتابِ گل و لالہ — غنچے جیسے بچے بچّیاں، پھول جیسے نوجوان، شاداب شاخوں جیسے خوش مزاج تجربہ کار مرد۔

۲. رنگ و بو کا وہ مکان — لوبان اگربتّیوں سے خوشبودار کمرے، سنگر ہار کے پھولوں میں بسی ہوئی اور خوشبودار ناریل کے تیل میں سجی ہوئی زُلفیں، بچوں کی کلیلیں، جوانوں کی دھیمی باتیں، مردوں کی سنجیدہ گفتگوئیں، شام کو ہر طرف دو دو چار چار لالٹین کی رومانی زردی مائل روشنی۔

۳. آہ وہ سیر گہہِ سر وقدانِ گلشن — دن کو ظہر کے بعد کھانے سے فارغ ہو کر مکان کے اندر چہار دیواری سی گھری ہوئی، چھوٹے سے سبزہ زار پر امرود کی اور بیر کی شاخوں پر جھولے اور ننگے پاؤں جھولے کو پینگیں دینے والی بہنیں بھاوجیں۔

۴. وہ شجر ہائے خمیدہ لبِ جو وسرِ چاہ — کٹھا رندی پر اور اکثر بڑے کنوؤں پر کنارے کنارے تاڑ اور کھجور کے جھولتے ہوئے درخت۔ کٹھار کی ندی، تمام کنویں گنجِ شہیداں بن گئے۔ درخت جھولنا بھول گئے، سبزے لہلہانا بھول گئے۔ پھر درخت بھی جدائی کے مرض میں غم البحر میں لاغر ہوتے ہوتے گر گئے۔ سبزہ زاروں میں کانٹے نکل آئے، جھاڑیاں اُگ گئیں۔ جھینگروں کے بول ختم ہو گئے۔

تین چار روز بعد پولیس اور فوج کے ٹرک پر جب ہم لوگ گاؤں دیکھنے گئے تو اس منظر کو 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' کے اقتباسات میں دیکھئے۔ شاید اُردو ادب کی کتابوں میں ایسے اقتباسات آپ کو نہ مل سکیں گے:

> ''کٹھا رندی پر پہنچے تو آگے پگڈنڈی تھی، ہم ٹرک سے اُتر گئے۔ ڈرائیور اور ایک ملٹری کو ٹرک پر چھوڑ کر ہم پگ ڈنڈی پر ہوئے۔ کٹھا رندی کے پانی کو دیکھا جس میں بارہا کمر تک اُترا کرتا تھا۔ اور دور سے ساتھیوں کو ندی میں تیرتے دیکھ کر غصّے اور کھسیانے پن سے بے بسی میں منہ چڑھایا کرتا تھا، ندی کے شفاف پانی پر کنارے

کنارے خم کھاتے ہوئے تار اور کھجور اور گولر کے درخت کا سایہ دُور تک پانی پر تیرتا تھا اور سائے کے بیچ دُھوپ سے چمکتا ہوا یوں نظر آتا تھا جیسے گھونگھٹ سے دیہاتی حسن کی چمکتی بیتاب سیماب دار آنکھیں جھانک رہی ہوں۔ لیکن آج کٹھارندی کے پانی اور کنارے کنارے کے منظر کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے پاؤں وزنی ہو گئے ہوں، کان میں سنسناہٹ آنکھوں میں تنتناہٹ ہونے لگی، کٹھار کا پانی ایسا لگ رہا تھا جیسے اچھی بھلی چمکدار آنکھیں یک بیک بے نور ہو گئی ہوں۔ نہ ان میں بہاؤ نظر آیا نہ چمک، کنارے تار، کھجور اور گولر کے درختوں کا سایہ یوں نظر آیا جیسے گوشت پوشت سے محروم ڈھانچے گدلے پانی کی سطح پر رقص کر رہے ہوں۔ اے کٹھارندی تجھے کیا ہو گیا؟ کیا تو ہمارا استقبال یوں ہی کرتی تھی؟ ہم آتے تھے تو تیرے بہاؤ میں تیزی آجاتی تھی۔ بلبلے اُٹھ کر ہماری طرف دیکھتے تھے، تیری سطح گنگنانے لگتی تھی، تیری موجیں جلد جلد کروٹیں بدلتی تھیں جیسے وہ ہم سے بغلگیر ہونے کو بیتاب ہوں۔ آج تو اس قدر بے جان کیوں ہے؟ اُداس کیوں ہے؟ بے نور کیوں ہے؟ تیرا چہرہ گرد آلود کیوں ہے؟ تو بوجھل کیوں ہے تیری موجیں کیوں نہیں اُٹھتیں۔''

ندی کی طرف سے آتی ہوئی تیز ہواؤں سے میرا دامن اُڑنے لگا۔ شپاشپ ہوائیں جسم سے ٹکراتی ہوئی گزرنے لگیں۔ ایسا معلوم ہوا جیسے ہوائیں مجھے لپیٹ رہی ہیں۔ سنسنا رہی ہیں، کانوں میں داخل ہو رہی ہیں، بول رہی ہیں، مدھم مگر صاف سسکیوں جیسی آواز۔

ہمیں پہچان...... اے وطن میں بے وطن پردیسی...... ہمیں پہچان...... ہم پانکڑ کی شاخوں سے آرہے ہیں، جامن کی ٹہنیوں سے آرہے ہیں...... سنگرہار کے پھولوں سے آرہے ہیں۔ امرود کی ڈالیوں سے آرہے ہیں، ہم بار بار تجھ سے مل چکے ہیں۔ کھیل چکے ہیں۔ اٹکھیلیاں کر چکے ہیں...... ہمیں پہچان...... ہمیں امرود کی ڈالیوں سے الگ کر دیا گیا، جامن کی ٹہنیوں سے دُور کر دیا گیا، پانکڑ کی شاخوں سے علاحدہ کر دیا گیا، سنگرہار کے پھولوں سے ہٹا دیا گیا ہے...... اب ہم وہاں نہیں ملیں گے، ہماری خوشبو چھین لی گئی...... ہماری نغمگی نچوڑ لی گئی...... ہماری گنگناہٹ

لوٹ لی گئی...... ہمارا شباب پامال کر دیا گیا...... سہاگ اجاڑ دیا گیا...... اے ہمارے بچپن کے ساتھی! ہم کو برباد کر دیا گیا......اے ہمیں سہاگن دیکھ کر جانے والے! یہ بیوہ ترا استقبال کرتی ہے......اپنی اُجڑی ہوئی پیشانی سے......اپنی بے سندور کی مانگ سے......اپنی بے چوڑیوں کی کلائیوں سے......اپنی بے مہندی کی ہتھیلیوں سے......اپنے پھٹے ہوئے آنچل سے......اپنی بکھری ہوئی لٹوں سے...... پیارے اب مانگ میں افشاں نہیں ہے...... اس ماتھے پر اب چمکیاں نہیں ہیں...... اے بے گھر کے گھر والے!...... اے بے دیس کے دیس والے!......آ پہلے اس خانماں برباد سے گلے مل لے......پھر ہم تجھے ملنے والے نہیں ہیں۔ اب ہم تجھ سے پانکڑ میں نہیں ملیں گے، سنگر ہار کے نیچے نہیں ملیں گے......اب ہمارا گھر یہی کٹھار کا گدلا پانی ہے......جس کے نیچے ہمارا لٹا ہوا سہاگ، ہماری پامال جوانی دفن ہے، ہم کچھ روز اسی کی سطح پر لوٹیں گے۔ تڑپیں گے، کراہیں گے۔ پھر ڈوب کر اسی مٹّی میں ملی ہوئی اپنی جوانی کی آغوش میں ہمیشہ کے لیے لپٹ کر مٹّی ہو جائیں گے......پھر:

ڈھونڈھو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
اب کے پھر برسات میں گنجِ شہیداں پر چلیں
آسماں روئے گا اور اپنی غزل گائیں گے ہم

جشن بہاراں (ایک طنزیہ نظم)

دل نے کل مجھ سے کہا سوزشِ پنہاں کہیے
کچھ تو روودادِ چراغِ تہہِ داماں کہیے

آستیں کیوں نہیں آنکھوں سے جدا ہوتی ہے
کہیے کہیے سببِ دیدۂ گریاں کہیے

قیس تو خیر غمِ عشق میں دیوانہ ہوا
آپ کس غم میں ہوئے چاک گریباں کہیے

واقعہ کیا ہے کہ حیران پھرا کرتے ہیں
کیوں رہا کرتے ہیں انگشت بدنداں کہیے

چند اشکوں کے سوا کچھ نہیں سرمایۂ شعر
لوگ کیوں آپ کو کہتے ہیں غزل خواں کہیے

رات دن روح میں بھٹّی سی سلگتی کیوں ہے
شعر کیوں آپ کے ہیں شعلہ بداماں کہیے

کچھ تو کہیے کہ خموشی ہے جنوں پر الزام
گر نہیں فکر منظّم تو پریشاں کہیے

پردہ ہائے غمِ جاناں کی ضرورت کیا ہے
غمِ دوراں بہ زبانِ غمِ دوراں کہیے

چھیڑیئے قصّۂ غارتگریِ فصلِ بہار
سرگذشتِ چمنِ سوختۂ ساماں کہیے

بجھ گئے کتنے شبستانِ محبت کے چراغ
محفلیں کتنی ہوئیں شہرِ خموشاں کہیے

نگہِ ساقیِ محفل کو مخاطب کرکے
شدّتِ تشنگیِ بادہ گساراں کہیے

آپ خاموش اگر مصلحت وقت سے ہیں
میں ہی دہراتا چلوں قصّۂ دوراں کہیے

یاد ہے آپ کو وہ حادثۂ موسمِ گل
شعلہ شعلہ جو ہوا صحنِ گلستاں کہیے؟

یاد تو ہوگی وہ تجدیدِ روایاتِ قدیم
ناوکِ اہرمن و سینۂ یزداں کہیے

آپ کو یاد تو ہوگا وہ تماشہ یعنی
رقصِ شمشیر بہ ہنگامِ بہاراں کہیے

یاد ہیں آپ کو وہ منظرِ صبحِ وطن
جن کی تقدیر میں تھی شامِ غریباں کہیے

یاد تو ہوگا وہ بے راحلہ وزادِ سفر
رخصتِ قافلۂ خانہ بدوشاں کہیے

یاد ہیں آپ کو اشکوں سے وہ بھیگے رخسار
گرد آلود وہ گیسوئے پریشاں کہیے

یاد ہیں آپ کو وہ ہر روشِ گلشن پر
پھول روندے ہوئے وہ مسلی ہوئی کلیاں کہیے

آپ شاعر ہیں وہ منظر تو نہ بھولے ہوں گے
رسنِ زُلف و رگِ گردنِ خوباں کہیے

وہ کتابِ گل و لالہ، وہ بیاضِ گلشن
جس کو مجموعۂ اوراقِ پریشاں کہیے

رنگ و بو کا وہ مکاں وہ درودیوارِ چمن
مدتوں سے جنھیں محرومِ چراغاں کہیے

آہ وہ سیر گہہِ سروقدانِ گلشن
اب جنھیں خواب گہہِ خارِ مغیلاں کہیے

وہ شجر ہائے خمیدہ لبِ جو و سرِ چاہ
اب انھیں ماتمیِ گنجِ شہیداں کہیے

میں تو سب کہہ چکا اب آپ جنابِ عاجزؔ
نظم ایک تازہ پئے جشنِ بہاراں کہیے

جشنِ بہاراں-۲

’جشنِ بہاراں‘ کے عنوان سے میری کئی نظمیں ہیں۔ کچھ نقلیں موجود ہیں کچھ ضائع ہوگئیں۔ یہ سب نظمیں فرمائشی ہیں۔ ۱۶؍جنوری اور ۱۴؍اگست کو یہ جشن منایا جاتا ہے اور جاتا رہا ہے۔ مجھے اکثر ان جلسوں اور مشاعروں میں شرکت کا موقع ملا۔ میں نے ایسے مواقع پر بیشتر غزلیں ہی پڑھیں۔ غزلوں میں تو ایسا موضوع ہے جسے سینکڑوں زاویوں اور ہزاروں پہلوؤں سے میں کہتا رہا ہوں اور کہتا رہتا ہوں اور ہر زاویہ، ہر پہلو پہلے کے زاویوں اور پہلوؤں سے مختلف ہوتا ہے، اور مجھے اس پر فخر ہے کہ میں نے ایک خاص موضوع کی اتنی تصویریں بنائی ہیں اور ایسی گونا گوں اور بوقلموں تصویریں بنائی ہیں کہ ہر تصویر اپنا الگ وجود، اپنا الگ رنگ، اپنی الگ کشش، اپنا الگ حسن اور اپنی الگ تاثیر رکھتی ہے۔ مگر کچھ ایسے مواقع بھی آئے کہ بے حد اصرار پر مجھے نظم ہی لکھنا پڑا۔ اور ہر نظم عام مشاعرے میں پڑھی گئی۔ پورے جوش اور پوری کیفیت اور قوت سے پڑھی گئی اور ہر نظم اپنا نقش بنا گئی۔ بہت پڑھوائی گئی اور شائع بھی ہوئی۔

شاید یہ نظم میرے تعلیمی دَور کے ابتدا کی ہے۔ ممکن ہے ۱۹۵۴ء ہو یا ۱۹۵۵ء، صدر شعبۂ اُردو استاذی ڈاکٹر اختر احمد اورینوی مرحوم کا اصرار رہا کہ کالج کی اس تقریب کے موقع پر تم نظم لکھو، حکم استادِ شعبہ کا تھا، تعمیل کرنی ہی تھی اور کی گئی، پڑھی گئی اور خوب مقبول ہوئی۔ اختر صاحب نے تعریف کے ساتھ نظم کی نقل مانگی، دی گئی اور انھوں نے کسی مقتدر رسالے یا اخبار میں شائع کرنے کو بھیج دی، شائع ہوئی۔ وہ رسالہ یا اخبار شعبہ میں منگوایا گیا اور پھر شعبہ میں مجھ سے پڑھوایا گیا۔

’جشنِ بہاراں‘ آزادی کی تشریف آوری کا نقشہ ہے جس میں آزادی کی دیوی کی ایک لفظی تصویر بنائی گئی۔ بہار کی دیوی کا کیا اشتیاق تھا! کیا انتظار تھا! کیا کیا امیدیں تھیں! کیا کیا آرزوئیں تھیں! کیا بے تابی تھی! کیا بیقراری تھی! بیقراروں کی، آرزومندوں کی، امیدواروں کی کیفیت کیا تھی۔ حسینۂ بہار آتی ہے۔ اس کا انداز دیکھو، اس کا تیور دیکھو، اس کی چتون دیکھو، اس کی ٹھاٹ دیکھو، اس کا رنگ دیکھو، آہنگ دیکھو، اس کی چال دیکھو۔ یہ انداز، یہ ناز، یہ تیور، یہ رنگ، یہ آہنگ،

یہ ٹھاٹ امیدواروں کا، چاہنے والوں کا، بیقراروں کا، کیا کھاٹ الٹ گئی۔ حسینۂ بہار نے چمن کا حال کیا کیا، ایک ایک لفظ میں ایک ایک منظر دیکھتے جاؤ اور پھر آنکھیں بند کرکے یہ شعر پڑھو:

کوئی بکھر گیا کوئی پامال ہوگیا
پھولوں کا ہر قدم پہ عجب حال ہوگیا

بکھرنے کی، پامالی کی کہانیاں کہتے جاؤ، داستانیں دہراتے جاؤ، کہتے کہتے تھک جاؤ گے، سنتے سنتے تھک جاؤ گے مگر کہانیاں ختم نہیں ہوں گی۔ میں نے تو یہ سوچا ہے اور یہی مجھ سے کہا گیا ہے کہ تم ہر نظم کے شانِ نزول کی طرف اشارے کردو۔ پڑھنے والے بقدرِ توفیق تجزیہ کرتے رہیں گے۔

جشنِ بہاراں

اے نازنینِ سروقد و سیم تن سلام — اے لالہ فام و لالہ رُخ و گل بدن سلام
اے یاسمیں قبا و سمن پیرہن سلام — اے نوعروسِ صبحِ بہارِ چمن سلام

ڈوبے ہوئے اُمید میں شام و سحر تھے ہم
کتنی خوشی کے ساتھ ترے منتظر تھے ہم

ہر پھول تھا نمونۂ قلبِ اُمیدوار — ہر شاخ تھی بنی ہوئی آغوشِ انتظار
بادِ صبا پیام یہ لاتی تھی بار بار — اب آئے گی اب آئے گی اب آئے گی بہار

پتّے نہیں گرے تھے گلستاں کی راہ میں
آنکھیں بچھی ہوئی تھیں تری جلوہ گاہ میں

آئی ادا و ناز سے یوں جانبِ چمن — جیسے تمام رات کی جاگی ہوئی دُلہن
ابرو پہ بل، جبین پہ ڈالے ہوئے شکن — زُلفوں میں پیچ و تاب نگاہوں میں بانکپن

ہونٹوں پہ پُرفریب تبسم کِھلا ہوا
جیسے شراب میں سمِ قاتل ملا ہوا

کچھ یوں دیا جواب تمنّا و آرزو — غنچوں کی پنکھڑیوں سے ٹپکنے لگا لہو
گفتار سے ہوا میں پریشاں تھے رنگ و بُو — رفتار سے نمودِ قیامت تھی چار سو

کوئی بکھر گیا کوئی پامال ہوگیا
پھولوں کا ہر قدم پہ عجب حال ہوگیا

جشنِ آزادی

کون سال تھا یاد نہیں۔ یہ یاد ہے کہ مسٹر داروغہ رائے یا داروغہ سنگھ بہار کے وزیر اعلیٰ تھے۔ اچھے اُردو داں تھے۔ اس نسل کی یادگار تھے جو فارسی اور اُردو زبان کو زندگی کی شائستگی کا ایک جزو سمجھتی تھی اور اس شائستگی کو زندگی کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ اب شائستگی کا مفہوم نئی نسل نہیں جانتی۔ داروغہ رائے جی، جہاں تک مجھے یاد ہے کہ کُرتہ پا جامہ یا کُرتہ دھوتی کے ساتھ ٹوپی کو سر سے جدا کرنا گوارہ نہیں کرتے تھے۔ وزیر اعلیٰ ہونے سے پہلے ململ کی خوبصورت دوپلیہ ٹوپی پہنتے تھے۔ پھر کھدر کی گاندھی ٹوپی پہننے لگے۔ میرے لڑکپن کے دور میں جسے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کا دور سمجھ لیجیے، گاؤں یا علاقے کے ہندو زمیندار کاشتکار کو تو چھوڑ یئے، بازار کے بنئے، سنار، کاہوری، حلوائی، تنبولی، بزاز--- انھیں بھی چھوڑ یئے، میری بستی میں ڈوم نہیں رہتے تھے لیکن دیوار اُٹھانے والے بیلدار اور دوسادھ اور جوتہ گانٹھنے والے چمار صرف باہر نکلنے کے وقت نہیں گھروں کی گلیاری میں بلکہ اپنے گھروں کے دروازوں میں جوتہ گانٹھتے ہوئے بھی میں نے کچھمن چمار اور سومرا اور امرتوا چمار کو بغیر ٹوپی کے نہیں دیکھا۔ امرتوا ہم سے دو تین چار سال بڑا تھا۔ اور کہاری بھی کرتا تھا۔ یکلنکر سرائے اسٹیشن سے مجھے ڈولی پر تیلہاڑہ لانے والے چار کہاروں میں وہ بھی تھا اور کہاری کرتے ہوئے یعنی میری کھٹولی کندھے پر رکھے ہوئے یکلنگر سرائے سے تیلہاڑہ آنے کے وقت بھی وہ بغیر ٹوپی کے کبھی نظر نہیں آیا۔ معاف کیجیے تو شری داروغہ رائے وزیر اعلیٰ بہار اُردو فارسی کا علم ہی نہیں اچھا ذوق رکھنے کی وجہ سے میری شاعری اور شاعری میں اپنے ملک کی آزادی کے دور میں اپنی قوم کی زیادتی اور مظالم پر تیز اور گہرا طنز برداشت ہی نہیں کرتے تھے، بے حد پسند کرتے تھے اور اپنے ہم عصر سیاسی ذمہ داروں کے سامنے میرے شعر دُہراتے اور انداز یوں ہوتا تھا کہ دیکھو کتنی سچی بات ہے:

ادا ہمیں نے سکھائی نظر ہمیں نے دی
ہمیں سے آنکھ چُراؤ ہو یار ، دیکھو تو

……..………

ذرا دیکھ آئینہ میری غزل کا
کہ تو کیسا تھا اب کیسا لگے ہے

اس قسم کے میرے اشعار وہ بے ساختہ پڑھتے ،دوستوں کی چٹکیاں لیتے اور مسکراتے۔

اپنی وزارت اور حکومت کے دوران اپنے شہر چھپرہ جاکر وہ شعر وسخن کی محفلیں آراستہ کرتے۔ مجھے بھی بلواتے اور اصرار سے میری تلخی آمیز شیریں باتیں سنتے۔انھوں نے ۱۵راگست کے دوران ایک مشاعرہ غالباً ’غالبؔ صدی‘ کی نسبت سے چھپرہ میں منعقد کیا،اور مجھے جشنِ آزادی کے موضوع پر اصرار سے نظم لکھوائی۔ یہ نظم میں نے لکھی، اور پہلے ان کے یہاں پڑھی اور شاید دوسرے یا تیسرے روز’لال قلعہ‘دہلی کے جشنِ آزادی کے مشاعرے میں پڑھی۔

لال قلعہ کا مشاعرۂ جشنِ آزادی ایک نہایت اہم اور پرشوکت مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اب بھی ہوتا ہے مگر نہ اس میں اہمیت اور شوکت وشان باقی ہے اور نہ سنجیدگی اور معیار باقی ہے، بیس سال ہوئے وہ مشاعرہ ترک کر چکا ہوں۔ اُس زمانے میں پنڈت گوپی ناتھ امنؔ دہلی حکومت میں ایک افسرِ اعلیٰ تھے۔ ہندوستان اور ہندوستان کی ادبی وشعری روایت کے نمونہ ہی نہیں اپنی ذات سے اس کے امین، محافظ اور مربّی بھی تھے، اس مشاعرہ کے ناظم اور مدارالہام تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کے اہم شعرا کا لال قلعہ کے مشاعرے میں اکٹھا ہونا،ان کی شخصیت کے اثرات کا ثبوت تھا۔

لال قلعہ کی یہ تقریبِ جشنِ آزادی سہ روزہ تقریب تھی،جس میں محفلِ ساز، محفلِ آواز اور بزمِ میکدہ اور آخر روز محفلِ مشاعرہ۔اس تقریب میں لال قلعہ کی دیواروں کے باغات کو اور سبزہ زار کو سجایا جاتا تھا اور ایسی سجاوٹ، ایسی آرائش اور ایسا چراغاں جو ہندوستان کی آٹھ سوسالہ بڑی کاوش سے بنائی تہذیبی تمدنی روایات کا آئینہ دار تھا۔درختوں کی پتیوں تک کو آراستہ کیا جاتا تھا۔ لیکن مجھے یہ تمام نظم، تمام انتظام اور یہ تمام حسنِ آراستگی اور اہتمام،تقریب اور ضیافت کسی بدخوارگی اور بدنمائی کو چھپانے کی کوشش نظر آتی ،اور اِسی موڈ اور اِسی نظریہ سے میں نے یہ نظم لکھی ۔

اِس میں پانچ بند ہیں۔ پہلے بند میں لال قلعہ اور اس کے ماحول کی آرائش کی تصویر ہے۔ دوسرے بند میں اُس ماحول کے سائے میں جو ساز و موسیقی اور محفلِ عیش و طرب آراستہ ہوتی تھی اس کا منظر ہے۔ تیرے بند میں ہندوستان کے مرکزی دارالحکومت کو دیکھا جاسکتا ہے اور چوتھے بند میں اس مرکزی دارالحکومت کے وہ صاحبانِ اقتدار ہیں جن کی نگرانی میں اس جشن کی اسکیمیں اور جشن کے بعد آئندہ سال کے جشن کی اسکیمیں بنتی ہیں اور آخری بند میں ان تمام تفصیلات کا نچوڑ، محاکمہ اور کھرا بے باک فیصلہ ہے۔

یہ یاد ہے کہ جواہر لعل نہرو جی کا انتقال ہو چکا تھا۔ میں نے جب لال قلعہ میں مشاعرہ پڑھنے کا آغاز ۱۹۶۱ء میں کیا تو اُس بار پنڈت جواہر لعل جی موجود تھے، مگر وہ مشاعرہ میں نہ تھے۔ اس سے قبل ایک آدھ سال وہ لال قلعہ کی تقریب میں شریک ہوئے تھے، میں کسی کو پہچانتا نہیں تھا۔ مدھم سا خیال ہے کہ شاید مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم و مغفور اپنی وضع خاص میں موجود تھے۔ اسٹیج پر پچیس تیس شعرا تھے۔ عرشؔ ملسیانی، جوشؔ ملسیانی، پنڈت تلوک چند محرومؔ، جگن ناتھ آزادؔ، علی سردارؔ جعفری، کیفیؔ اعظمی، ساغرؔ نظامی، روشؔ صدیقی، ساحرؔ لدھیانوی، بسملؔ سعیدی، قدیرؔ لکھنوی، سراجؔ لکھنوی، نشورؔ واحدی وغیرہ، میں نے پہلے غزل پھر یہ کہہ کر کہ 'جشنِ آزادی' کے موضوع پر نظم عرض کررہا ہوں، سامنے دیکھا تو میکدے والے خم و صراحی و جام والے بھی تھے۔ اور سامنے ہی رقص و سرود کی محفل اور دُھوم دھام والے بھی تھے۔ گیت گانے والی گوپیاں بھی تھیں اور بانسری بجانے والے کنہیا بھی۔ سرزمینِ شہرِ دہلی کے رُخ و زُلف خم بہ خم والے بھی اور ۱۹۴۷ء سے ثواب والوں کو کم کرکے زیادہ گنا کرانے والے بھی تھے۔ ہنستے ہوئے بُت اور چہکتے ہوئے صنم بھی سامنے تھے۔ جا بجا دَیرا اور قدم قدم پر رہنے والے برہمن بھی تھے، سفید ٹوپی اور شفاف پیرہن میں ایمان کو کفنائے ہوئے لوگ بھی تھے۔ اور سب سے آگے آگے مخملی صوفوں پر پیرانِ میکدہ اور امامانِ بادہ نوش بھی تھے، گندم نما جو فروش بھی تھے:

نہ کیجو اعتبار اُس کے سخن کا
وہ ظالم کیا کہے ہے کیا کرے ہے

کیا کہہ کر کیا کرنے والے سیاہ باطن سفید پوش بھی تھے اور سامنے ہی وہ تاجرانِ لالہ و گل بھی تھے جو وعدوں کے پھولوں میں وعدہ شکنی کی چھریاں چھپائے رکھتے ہیں۔ روز غزل لکھوانے والے

اور روز زخم دینے والے بھی:

اس ناز اس انداز سے تم ہائے چلو ہو
روز ایک غزل ہم سے کہلوائے چلو ہو

یہ سب سامنے تھے۔ اسٹیج پر شاید شری لال بہادر شاستری جی تھے۔ جنھوں نے پہلی بار ایک ہم وطن بہار کے شاعر سے یہ کلام سنا، مسکرائے مگر خاموش رہے داد نہ دی۔ نظامت کنور مہندر سنگھ بیدی کرر ہے تھے جو مجھ سے بہت زیادہ مانوس ہی نہیں میرے انداز سے بہت متاثر بھی تھے۔ صرف ایک سال پہلے مدراس میں میں پنجاب ایسوسی ایشن کے آل انڈیا مشاعرے میں میں نے اپنی سطح کی غزل پڑھی اور پذیرائی کم ہوئی تو غزل پڑھنے کے بعد چپکے سے میرے قریب آ کر کان میں کہا کہ عاجؔز صاحب اپنے معیار سے ذرا نیچے آیئے۔ میں نے:

ہم نے بے فائدہ چھیڑی غم ایام کی بات
کون بے کار یہاں ہے کہ سنے کام کی بات

آٹھ شعر کی غزل پڑھی تھی، جن کے اکثر شعروں پر ہلکی تحسین ہوئی ورنہ خاموشی۔ بیدؔی صاحب کو یہ نیا تجربہ ہوا۔ ورنہ لال قلعہ ہی کے پہلے مشاعروں میں جب وہ شریک رہے اور مجھے مائک کی طرف جاتے دیکھتے تو زور سے کہتے۔ ہاں عاجؔز صاحب مشاعرہ لوٹ لیجیے تو جب انھوں نے مجھے اپنے معیار سے نیچے آ کر غزل پڑھنے کو کہا تو میں نے سہل اسلوب اس سے بھی اونچے معیار کی غزل پڑھ دی:

میری مستی کے افسانے رہیں گے
جہاں گردش میں پیمانے رہیں گے
رہے گا ان کو دیوانوں پر غصہ
ہم اس غصّے پہ دیوانے رہیں گے
رہے گا سلسلہ دار و رسن کا
جہاں دوچار دیوانے رہیں گے

باہر سے کوئی صاحب دونوں ہاتھوں میں گلاب کی پتیاں لیے ہوئے آئے اور زور سے مجھ پر نچھاور کر دیا۔ تو وہی بیدی صاحب جب میں نظم پڑھ کر واپس ہوا تو پکار کر مسکراتے ہوئے کہا عاجز صاحب افسوس ہے پنڈت جواہر لعل نہرو نہیں رہے۔ اور میں سمجھ گیا۔

جشنِ آزادی

(یومِ جمہوریہ کے دن لال قلعہ دلّی میں پڑھی گئی)

یہ سرو ، یہ صنوبر و نسرین و نسترن　　یہ شاخ شاخ پہنے ہوئے سبز پیرہن
یہ جلوہ گاہِ رنگ و بو، یہ خانۂ چمن　　یہ خلوتِ بہار، یہ پھولوں کی انجمن
یہ راحتِ قلوب یہ آسائشِ نظر
سنوری ہوئی یہ شام یہ نکھری ہوئی سحر

یہ میکدہ، یہ خم، یہ صراحی، یہ مئے، یہ جام　　یہ رقص، یہ سرور، یہ محفل یہ دھوم دھام
یہ روشنی ، یہ کوچہ و بازار، صحن و بام　　یہ شمع ہر قدم پہ ، یہ قندیل گام گام
نغموں کا ارتعاش، یہ سازوں کی تھرتھری
یہ گوپیوں کے گیت کنہیا کی بانسری

یہ سرزمیں، یہ شہرِ رُخ و زلف خم بہ خم　　جس شہر میں گناہ زیادہ ثواب کم
یہ دَیر جابجا یہ برہمن قدم قدم　　ہنستے ہوئے یہ بت یہ چہکتے ہوئے صنم
یہ ٹوپیاں سفید یہ شفاف پیرہن
یہ جسم در لباس یہ ایمان در کفن

یارانِ میکدہ یہ امامانِ بادہ نوش　　یہ دشمنِ جنوں یہ پرستارِ عقل و ہوش
گندم نما یہ دوست یہ احبابِ جَوفروش　　باطن سیاہ کار بظاہر سفید پوش
یہ تاجرانِ لالہ و گل تیغ در بغل
دیتے ہیں زخم کرتے ہیں فرمائشِ غزل

یہ جشن یہ جلوس یہ جلسہ یہ جلوہ گاہ　　یہ شاعری، یہ داد، یہ تحسیں ، یہ واہ واہ
یہ پیار کے معاملے، یہ لطف کی نگاہ　　سب جھوٹ، سب مغالطہ، سب جرم سب گناہ
شاعر ہیں راز ہائے دروں جانتے ہیں ہم
دُنیا کو ہر لباس میں پہچانتے ہیں ہم

ایک تمثیلی نظم

یہ نظم، یہ قطعہ، یہ غزل نما میں نے کیوں لکھا؟ کب لکھا؟ کس ترغیب پر لکھا؟ کس اشارے پر لکھا؟ مجھے یاد نہیں۔ یہ تو ضرور ہے کہ ۱۹۶۰ء سے پہلے کی ہے کیونکہ اس نظم کے کچھ حصے جو مجھے یاد تھے وہ میں نے علی گڑھ یونین کے سالانہ جلسے میں ۱۹۶۲ء کے ماہ جنوری میں پڑھے تھے۔ پوری نظم یاد نہیں تھی، چند ہی شعر پڑھے اور میرا حافظہ بہت تیز تھا۔ یاد نہ رہنے کے یہ معنی ہیں کہ کسی خاص اہم موقع پر کسی خاص نیش، کسی خاص تیر کے ترازو ہونے کے فوراً ہی بعد بے ساختہ لکھا ہو پھر لکھ کر بھول گیا۔ جس کاغذ یا نوٹ بک پر یہ نظم تھی وہ بھی اوجھل ہوگئی۔ ابھی چند عزیزوں نے جب ترتیب کا کام شروع کیا تو انھیں ملی اور مجھے بھی یاد آئی۔ زخم کبھی کاری لگتا ہے تو لہو بلبلا کر نکلتا ہے اور پھر بند ہو جاتا ہے۔ کسی ایسی ہی کاری ضرب کے موقع پر احساسات نے، خیالات نے تیزی سے ردِّعمل کیا اور پھر دوسرے نئے پرانے زخم سامنے آ گئے۔ کسی نے محفل میں ٹوکا۔ یا کسی نے خلوت میں چٹکی لی۔ کسی نے آوازہ کسا، کسی نے طنز کی برچھی چلائی، کسی نے کچھ لکھا، کسی نے کوئی پیغام بھیجا۔ انھیں باتوں میں، انھیں حادثوں میں کوئی حادثہ ہوا، کوئی بات ہوئی۔ آتش فشاں کا ڈھکن اُٹھا اور لاوا تیزی سے پھوٹا اور سیلاب کی طرح بہہ نکلا۔ پھر ٹوکنے والا ڈر گیا، چٹکی لینے والا سہم گیا، آوازہ کسنے والا شرمندہ ہو گیا، طنز کرنے والا پشیماں ہو گیا۔ کہنے والے نے ندامت سے گردن جھکا لی، معذرت کر لی۔ شاید اس کی پشیمانی دیکھی نہ گئی، شرمندگی نے دل تڑپا دیا۔ کیا ہوا، بہر حال کچھ ہوا اور نظم کہہ کر کہیں پھینک دی۔ دو چار شعر زبان پر رہ گئے۔ ایک جگہ پڑھ دی تو وہ گرفت میں آ گئے۔ بقیہ اشعار دامن بچا کر نکل گئے کہیں چھپے رہے۔ پردہ نشیں کا راز پردے میں رہ گیا۔ پردہ چاک ہوا۔ اندرونِ پردہ اشعار ہی ملے اور کوئی نہ تھا۔ کسے دیا تھا؟ کس کی نذر کیا تھا؟ کسے بھیجا تھا؟ کس کا جواب تھا؟ اس پردے میں اور کچھ نہ ملا۔ بس یہی چند شعر تھے۔ مگر کوئی عناں گیر ضرور ہوا تھا۔ کون عناں گیر ہوا تھا؟ خدا جانے۔ اس کی یادگار ہی سہی یہ شعر رہ گئے، تو اب میں کیا کہوں یہ اشعار ہی بتائیں۔ انھیں سے پوچھا جائے۔ شاید آج نہ بتائیں ممکن ہے کبھی بتا دیں۔

ایک تمثیلی نظم

تم تو شہرِ ہوس آباد کے باشندے ہو
عشق کے خانہ خرابوں کا ارم کیا جانو

تم تو بے درد ہو بیتابیِ غم کیا جانو
کس مصیبت میں گرفتار ہیں ہم کیا جانو

ٹھوکریں کھا کے سنبھل جانا کسے کہتے ہیں
تم کہ ڈر ڈر کے اُٹھاتے ہو قدم کیا جانو

تم کہ اپنے ہی گریباں کی خبر رکھتے نہیں
پیرہن چاک ہوئے کس لیے ہم، کیا جانو

تم کہ ہر وقت محبت کا اُڑاتے ہو مذاق
کون رکھتا ہے محبت کا بھرم کیا جانو

رسن و دار کو خاکِ کفِ پا بھی نہ ملی
کس جگہ اہلِ جنوں کا ہے قدم کیا جانو

درد کس سینے میں رہتا ہے تمھیں کیا معلوم
کون رکھتا ہے گرہ میں یہ رقم کیا جانو

تم کہ محروم رہے دولتِ حق گوئی سے
ظلم کیا چیز ہے کیا سمجھو ستم کیا جانو

تم سے ناحق ہے مجھے چشمِ وفا کی اُمید
تم بھلا شیوۂ اربابِ کرم کیا جانو

تم کہ بخشی نہ گئی نعمتِ احساس تمھیں
سینۂ سوختہ و دیدۂ نم کیا جانو

تم کہ بیوپار میں ہو جھوٹی خوشی کے معروف
کس قدر بڑھ گئی درآمدِ غم کیا جانو

کون سی شئے ہے جسے سوزِ وفا کہتے ہیں
شمع کیوں جلتی ہے سرتا بہ قدم کیا جانو

برہمن دہر میں کرتا ہے پرستش کس کی
سجدے کرتا ہے کسے شیخِ حرم کیا جانو

کون کس درد میں آتا ہے تمھیں کیا معلوم
تم کو فکر اپنی ہے تم اوروں کا غم کیا جانو

ہم غزل گو ہیں مگر ہم نے غزل میں اپنی
کس ستمگر کو بنایا ہے صنم کیا جانو

کس ریاض اور مشقت سے کیا ہے ہم نے
غمِ دل اور غمِ دنیا کو بہم کیا جانو

کس طرح گیسوئے دوراں کو سجا کر ہم نے
زُلفِ محبوب کا بخشا جم وخم کیا جانو

تم رہِ سود وزیاں سے کبھی آگے نہ بڑھے
کون منزل ہے یہاں زیرِ قدم کیا جانو

یہ مئے تند غمِ دہر جسے کہتے ہیں
شِیر ہے، زہر ہے، امرت ہے کہ سم کیا جانو

ہم دبائے ہوئے پھرتے ہیں بغل میں جس کو
کوزۂ خاک ہے یا ساغرِ جم کیا جانو

خونِ دل سے گل وگلزار بنانے والے
اہلِ شمشیر ہیں یا اہلِ قلم کیا جانو

بس

۱۹۵۷ء میں جب میں بزمِ ادب پٹنہ سٹی کا جنرل سکریٹری تھا اور شاید سیّد سکندر اعظم اسسٹنٹ سکریٹری تھے جو اُن دنوں واشنگٹن (امریکہ) میں کسی عہدے پر ہیں۔ اس وقت جوائنٹ اسسٹنٹ سکریٹری مسٹر غوثی تھے۔ سکریٹری اور اسسٹنٹ سکریٹری کا باضابطہ الیکشن ہوتا ہے۔ مسٹر غوثی نامزد ہوئے تھے۔ وہ بچوں کا رسالہ بھی نکالتے تھے نام مجھے یاد نہیں۔ بہت دنوں وہ میرا پیچھا کرتا رہے کہ رسالہ کے لیے ایک نظم لکھ دو جو بچوں سے متعلق ہو۔ بھلا میرا کیا تجربہ، نہ میرا یہ میدان۔ بہت اصرار ہوا تو قلم اُٹھا کر ایک منظر کھینچ دیا جو ان دنوں بسوں کی کمی کی وجہ سے اسکول جاتے ہوئے بچوں کا بس پر سوار ہونے کا ہوا کرتا تھا، کچھ منظر ہے کچھ اپنے تخیل کی کارفرمائی ہے:

بس

اُٹھے صبح کو آنکھ ملتے ہوئے　　گئے لیٹنے رات ڈھلتے ہوئے
اٹھائی کتاب اور چلتے ہوئے　　نہا دھو کے کپڑے بدلتے ہوئے
سویرے کا جب تک کہ اسکول ہے
یہی اپنا ہر روز معمول ہے

گزرتا ہے اِک اِک منٹ اِک برس　　کھڑے ہیں سڑک پر کہ اب آئی بس
کہ اللہ بس اور باقی ہوس　　بس آئی تو رش اس قدر پیش و پس
بڑھے ہم بھی چڑھنے کو جب سب کے ساتھ
تو ہینڈل پہ تھا پاؤں پیڈل پہ ہاتھ

گزرتے ہیں مچھر جہاں پر سمیٹ　　پسنجر کی وہ بھیڑ وہ بس کا گیٹ
کسی کی ہے کہنی کسی کا ہے پیٹ　　کوئی ہوگیا چوٹ کھا کر فلیٹ
کھڑے ہوں کہاں پاؤں رکھیں کدھر
اندھیرا اُدھر ہے اندھیرا اِدھر

کھڑے کیوں ہیں؟ آگے بڑھے جائیے　　مگر حکم چیکر کا ہے 'آئیے'
کھسکتے کھسکتے چلے جائیے　　جہاں میں جہاں تک جگہ پائیے
ستاروں سے آگے جہاں اور ہیں
زمیں اور ہیں آسماں اور ہیں

جگؔر مرادآبادی

اس کائنات میں دو چیزیں بنیادی ہیں جو اس کی بقا اور ارتقا کی ضامن اور سبب ہیں۔ یہ دونوں چیزیں نکل جائیں یا نکل جاسکیں تو یہ پوری کائنات زمین، آسمان، چاند، ستارے سب پرانی دیوار کی طرح غیر متحرک، بے نور اور جامد ہو کر رہ جائیں — حسن اور اُس کی طلب۔ یہ دو قوتیں ذرّہ میں بھی ہیں اور آفتاب میں بھی اور اس پورے نظام کائنات اور اس کے تمام وجود، اور اس کی تمام مخلوق میں مختلف شکلوں میں اور مختلف وسیلۂ اظہار کے لباس میں ہر وقت موجود ہیں۔ حرکت کسی طلب ہی کے لیے کسی منزل ہی کے لیے ہے۔ یہ طلب کبھی آسودہ نہیں ہوتی، یہ منزل ملتی کبھی نہیں۔ تلاشِ حسن طلب حسن کا نتیجہ تخلیقِ حسن ہے۔ یہ تینوں شعوری طور پر زندگی میں موجود ہیں اور ہر شخص اپنی استعداد، اپنے ذوق اور وجدان کے اعتبار سے تلاشِ حسن، طلب حسن اور تخلیقِ حسن اظہار حسن میں مشغول ہے اور منہمک ہے۔ اسی کو خودی بھی کہا گیا ہے۔ خودی ان چاروں کا مجموعہ ہے۔ خودی ایک قوت ہے جو ہر شئے میں موجود ہے۔ اس کی نشو و نما کیسے ہوتی ہے اس کا اظہار کیسے ہوتا ہے۔ یہ متعین نہیں ہے مگر ہر باشعور انسان میں اس کا احساس موجود ہے اور بقدر استعداد وہ اس میں مشغول ہے۔ اسی کو جمیؔل مظہری نے کہا ہے:

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

جمیؔل صاحب نے اسے 'فریبِ پیہم' ضرورتِ شعری، اپنے ذوق، یا اپنے وجدان کے اعتبار سے کہا ہے۔ سرورِ خودی فریب نہیں حقیقت ہے۔ جمیؔل صاحب نے 'فریبِ پیہم' اس لیے کہا ہے کہ تشکیک ان کی شخصیت کا نمایاں جزو ہے، اسی لیے وہ اظہارِ خودی میں بھرپور کامیاب نہیں ہو سکے۔ بہر حال موضوع یہ فلسفہ نہیں ہے مجھے کہنا یہی ہے کہ فنونِ لطیفہ بالخصوص شعر و ادب

کامرکزی سرچشمہ یہی تلاشِ حسن، طلبِ حسن، تخلیقِ حسن اور اظہارِ حسن۔ شاعری کا کام تلاشِ حسن اور طلبِ حسن نہیں ہے۔ تلاش اور طلبِ حسن کی یہ دونوں منزلیں گزر چکتی ہیں، شاعری تخلیقِ حسن ہے اور اس میں اظہارِ حسن پوشیدہ ہے۔ اِسی سے یہ بات نکلتی ہے کہ خالقِ کائنات حسنِ مجسم ہے اور یہ پوری کائنات اظہارِ حسن یا نمائشِ حسن ہے:

دہر جز جلوۂ یکتائیِ محبوب نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

انسان کے اس مجسم حسن کے چہرے سے نقابِ حسن اُٹھانا ہے۔ نقاب اٹھانے کا سلسلہ ازل سے ابد تک ہوگا، پردے اُٹھتے جائیں گے۔ حسن کے نئے نئے جلوے نمایاں ہوتے رہیں گے۔ یہ کام، یہ کوشش قیامت تک ہوتی رہے گی لیکن حسن مجسم کبھی ظاہر نہ ہوگا:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

جتنی نمود ہو چکی ہے یا ہو رہی ہے یا ہوتی رہے گی وہ 'جمال' کی نہیں آرائشِ جمال کی ہے۔ جمال تو پردے سے باہر آ ہی نہیں سکتا، اس کے لیے تو ایک وقت مقرر ہے۔ یعنی خدا پرست بندوں یعنی اہلِ جنت کی سب سے قیمتی خواہش اور آخری خواہش ہوگی کہ آخر زندگی بھر جس کے لیے حیران و سرگرداں رہے، محبت میں جو کچھ کرنا تھا یا کر سکتے تھے کر گئے۔ آخر وہ ہے کیسا؟ اُسے دیکھنے کی طلب کا ایک طوفان ہوگا، اور وہ جمالِ مجسم اپنے جمالِ حقیقی سے مومنوں کی آنکھیں روشن فرمائے گا۔ تو حسن کی پردہ کشائی کا ایک نہایت اہم، نہایت لطیف اور نہایت پیچیدہ ذریعہ شاعری ہے، شاعری کا بنیادی موضوع تخلیقِ حسن اور اظہارِ حسن ہے، شاعر حسن کا بہترین طالب ہے اور وہ جس حد تک اس طلب میں کامیاب ہوتا ہے اس کا اظہار شعر میں ہوتا ہے:

درد ہا دادی و درمانی ہنوز
جاں زتن بُردی و در جانی ہنوز (خسروؔ دہلوی)

خسروؔ نے کسی نقاب کا ذرا سا گوشہ دیکھا ہے، طلب میں کچھ کامیاب ہوئے ہیں اور پھر کھو گئے جیسے موسیٰ علیہ السلام طلبِ حسن پر مصر رہے، اس کے جلوہ ہائے ہزار شیوہ سے کسی شیوے کی ایک کرن دیکھی اور ہوش کھو بیٹھے۔ خسروؔ نے اُتنا نہیں دیکھا مگر جتنا دیکھا تو بس خاک ہو کر رہ

گئے اور ایسی چاہت اور ایسے درد میں مبتلا ہوئے کہ اس کا درمان نصیب نہیں، بس درد تو اسی کے پاس ہے، طلبِ حسن ہی اس درد کا درماں ہے۔ تقاضہ کرتے جارہے ہیں، جان کھو چکے اور جان بنا کر اُسی محبوب کو لیے بیٹھے ہیں:

جان دے دی ہے مگر درد لیے ہیں دل میں

بات بڑھ رہی ہے، مشکل ہوگی، میں اسے الگ مضمون بنانا نہیں چاہتا، تو شاعری تخلیقِ حسن اور اظہارِ حسن کا نام ہے۔ شاعر صرف اپنی آنکھوں سے حسن نہیں دیکھتا، یا دیکھتا ہے تو اُسے بنیادِ تخلیق نہیں بناتا۔ شاعر تو اپنے احساس کے آئینے میں مشاہدۂ حسن کرتا ہے۔ باہر کا حسن ایک ہلکی تحریک ہوتی ہے جو شاعر کے احساس کو بیدار کرتی ہے۔ اس حسن کے ذریعے خواہ وہ نگاہ سے دیکھے، دل سے دیکھے، کان سے سنے، زبان سے دیکھے، چھو کر محسوس کرے، شاعر کے احساسِ حسن کی مشین متحرک ہو جاتی ہے۔ مشاہدہ نگاہوں سے بھی ہوتا ہے اور تمام حواسِ خمسہ کے ذریعے ایک منظر، ایک آواز، ایک خوشبو، ایک ذائقہ، ایک لمس احساس میں تخلیقِ حسن کی مشین رواں کردیتی ہے۔ میں نے ۱۹۴۶ء میں ایک منظر دیکھا اور اس نے مشین چالو کردی۔ اس منظر کے بعد مناظر کا دروازہ کھل گیا، اور کھلتا جارہا ہے اور مشین چل رہی ہے، کپڑا تھان کا تھان نکل رہا ہے اور جانتے ہیں سب سے بڑا حسن کیا ہے؟ سب سے بڑا حسن غم ہے۔ خوشی میں حسن کا استعمال ہوتا ہے، غم میں حسن کا نظارہ اور حسن کی تخلیق ہوتی ہے۔ حسن بہت بڑی توانائی ہے اور توانائی غم سے حاصل ہوتی ہے۔ حسن حقیقی کبھی حاصل نہیں ہوسکتا، ناکامی غم کا سبب ہے یہی غم تخلیقِ حسن کا بھی سبب ہے:

عالمِ سوز وساز میں وصل سے بڑھ کر ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذّتِ طلب

یہ لذّتِ طلب حیات وکائنات کا جوہر ہے۔ تو خیر بات یہاں بھی چھوڑ کر آگے نکلتا ہوں۔ شاعری میں بہت صنفیں ہیں اور ہر ایک صنفِ شاعری اپنی مخصوص صنف رکھتی ہے۔ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعہ، رُباعی۔ بات یوں مختصر کیجیے کہ یہ تمام اصنافِ سخن جو ہر بن کر غزل میں سما گئی ہیں۔ غزل سے قصیدے کے اجزا بھی تیار کیے جاسکتے ہیں، مثنوی، مرثیے اور قطعات کے بھی۔

اس لیے غزل ایک ایسی صنف ہے جو بہت آسان ہو کر بہت مشکل اور پیچیدہ ہے، غزل گو بہت ہو سکتے ہیں مگر سب کی غزل غزل نہیں۔ سب سے اہم صنف مجھے یہ محسوس ہوتی ہے کہ غزل یا غزل کا شعر وہ ہے جو خوب سمجھا جا سکے لیکن سمجھایا نہ جا سکے:

بہت دُشوار سمجھانا ہے غم کا　　سمجھ لینے میں دُشواری نہیں ہے　　(عاجؔز)

کسی کا مصرعہ:　　کی ایسی اِک نگاہ کے بس خاک ہو گئے

ارے بھائی کیا خاک ہو گئے؟ مزے میں چل رہے ہو، پھر رہے ہو، پہن رہے ہو، کھا رہے ہو، خاک کیا ہو گئے؟ لیکن واقعی کہنے والا خاک ہو گیا۔ لیکن اس کا خاک ہونا نظر نہیں آ رہا ہے:

ترا تو میؔر غم سے عجب حال ہو گیا

کیا عجیب حال ہوا، میؔر صاحب کبھی آدھے تھان کا پائجامہ اور آدھے تھان کی پگڑی باندھتے تھے۔ کبھی کبھی تلوار بھی کمر میں باندھتے تھے۔ یہ اس وقت بھی تھا جب عجب حال ہو چکا تھا۔ لیکن عجب حال کیا ہوا؟ لیکن عجب حال ہو گیا۔ میؔر صاحب خود بتا نہیں سکتے:

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

حالانکہ میؔر صاحب وفائے عہد کرنے کی بعد بھی پچاس ساٹھ سال زندہ رہے۔ لیکن تجھ بن نہ جینے کا عہدِ وفا واقعی میؔر نباہ گئے۔ اور جو پڑھتا ہے اس شعر کو کبھی غلط نہیں سمجھتا اور محسوس کر لیتا ہے کہ واقعی عہدِ وفا نباہ کر گئے:

وہ بولے کہاں زخمِ دل ہے دکھاؤ　　کہو کیا کہیں کیا بتائیں بتاؤ　　(عاجؔز)

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں

ارے کیوں نہیں بتلائیں صاحب؟ بتلایئے آپ سامنے کھڑے ہیں، بیٹھے ہیں، شعر پڑھ رہے ہیں کیوں نہیں بتلاتے۔ لیکن ہم اعتماد سے اور ایمان سے کہتے ہیں کہ ہاں غالبؔ سچ کہہ رہے ہیں اور جھومتے بھی ہیں۔ یہی خوبی غزل کا حسن بھی ہے۔ حسن کیا ہے، کہاں ہے بتاؤ، کوئی نہیں بتا سکتا۔ جس طرح:

محبت معنی والفاظ میں لائی نہیں جاتی
یہ وہ نازک حقیقت ہے کہ سمجھائی نہیں جاتی

غزل کی خوبی سمجھائی نہیں جاسکتی، غالبؔ کی غزلوں کی جو تشریح کر گئے، اشعار کے معنی بتا گئے ان سے غالبؔ کی شاعری کا مرتبہ نہیں بلند ہوتا۔ ان کی فنکاری کا مرتبہ بلند ہوتا ہے۔ شاعری اور فنکاری میں بہت بڑا فرق ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ غالبؔ فنکار سب سے بڑا ہے، میرؔ شاعر سب سے بڑا ہے۔ مغنّی غالبؔ کی یہی غزلیں گائے گا:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ابنِ مریم ہوا کرے کوئی　　میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

وغیرہ وغیرہ۔ یا پھر ایسی غزل گائے گا جن میں فنکاری اور شاعری کا امتزاج ہے:

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

لیکن اس کے آگے بس اسی شعر تک:

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پھر بہت ہمت کرے گا تو مقطع تک:

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگِ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اگر اس شعر کو شروع کرے گا تو منہ کا مزہ خراب ہو جائے گا:

پرتوِ خوُ سے ہے شبنم کی فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

اور اگر اس شعر کو شروع کرے گا تو پھر قے کر دینا ہوگا:

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

نقاد اور شارح سمجھا دے گا لیکن مغنی کو گانے میں دقت ہوگی، پیسہ لے کر گا دے گا۔ جیسے فیضؔ مرحوم یا فرازؔ یا دوسرے مشاعرے باز شعرا اپنی غزلیں پیسے دے کر یا پیسے کا کچھ بدل دے کر گویوں سے اپنی غزل گواتے ہیں۔

تو میں نے یہ سب باتیں اس لیے لکھیں کہ یہ نظم جو آگے آرہی ہے جگرؔ کی رحلت کے بعد لکھی گئی، اور لکھی گئی اس لیے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم جگرؔ کے معترف تھے، اور تعلقات بھی تھے۔ وہ پٹنہ راج بھون میں بہار کے گورنر تھے۔ انجمن اسلامیہ ہال میں جگرؔ مرحوم کا تعزیتی جلسہ تھا۔ اس جلسے کی دو یادگاریں یا دو نمایاں چیزیں تھیں — ایک ڈاکٹر ذاکر صاحب کی تقریر۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا کیا کہنا! اور دوسری چیز یہ نظم تھی۔ اجازت ہو تو میں بھی کہہ دوں کہ اس نظم کا کیا کہنا! اب اس نظم کے پس منظر اور میں نے جو اوپر باتیں عرض کیں اس کا پس منظر جس میں یہ نظم اور چمک سکتی ہے یہ عرض کروں کہ جگرؔ صاحب مرحوم کی زندگی میں تین نہایت سخت ترین مخالفانِ غزل موجود تھے۔ ایک تو کلیم الدین مرحوم جنھوں نے غزل کو ''نیم وحشی غزل'' لکھ کر فضا کو مسموم کر دیا تھا۔ اس قول کی صحت اور عدم صحت پر بحث کرنا نہیں ہے، وہ میں اکثر مقام پر کر چکا ہوں۔ اور کلیم صاحب بھی یہ جملہ لکھ کر زیادہ مطمئن نہ تھے، اور یہ کہتے کہ بھائی یہ تنقید غزل کا کوئی شعر یا مصرع نہیں ہے کہ اس کے ٹکڑے کو لیے پھرو۔ یہ کسی حد تک اعتراف تھا کہ کسی دور کے کسی صنفی نقش کی بنیاد پر پوری صنف کو نیم وحشی کہہ دیا جائے اور بات یہ تھی، اسی لیے اپنے پڑھنے کے زمانے میں جب میں بی.اے آنرس کر رہا تھا، اس جملے یا کلیم الدین صاحب کی مخالفتِ غزل پر ایک مضمون لکھا، رسالے میں چھپا۔ چونکہ مضمون مدلل تھا اس لیے کلیم کیمپ میں بڑے غیض و غضب کا اظہار ہوا۔ اور ان کے ایک پرستار جو گیا کالج میں صدر شعبۂ اُردو تھے، یونیورسٹی کی بزم اُردو میں شاعر کی حیثیت سے مجھے بہت اصرار سے بلوایا اور مشاعرے کے دوران یہ اعلان کر کے مجھے نہ بلایا کہ انھوں نے کلیم الدین احمد پر Damaging مضمون لکھا ہے۔ بات تو ختم ہوگئی۔ میں بے پڑھے واپس آ گیا۔ میرے ساتھ گئے ہوئے پٹنہ یونیورسٹی کے طلبا بہت مشتعل ہوئے کہ ہم لوگ جلسہ میں ہڑبونگ کریں گے۔ میں نے بہت روکا کہ یہ ذلت انھیں کی ہے، یہی رُسوا ہوں گے۔ چنانچہ وہ پشیماں ہوئے اور بہت دنوں بعد مجھ سے معذرت کے لیے بھی تشریف

لائے۔تو مخالفت کا پہلا سہرہ کلیم الدین احمد کے سر تھا، دوسرا سہرا عظمت اللہ خاں کے سر چڑھا۔ انھوں نے کہا کہ غزل گردن زدنی ہے،اس کی گردن ماردینی چاہیے۔یہ دونوں حضرات نقّاد تھے اور غیر شاعر تھے،تیسرے مشہور مخالف غزل کے نہیں بلکہ جگرؔ کے ڈاکٹر عندلیب شادانی صدر شعبۂ اُردو ڈھاکہ یونیورسٹی مشرقی پاکستان تھے۔وہ خود غزل کہتے تھے۔جگرؔ صاحب سے صنفی اختلاف نہیں فکری اختلاف رکھتے تھے۔شاید انھیں جگرؔ کی مقبولیت سے بغض تھا۔ وہ کہتے تھے جگرؔ کی غزلوں میں معیاری باتیں نہیں ہیں۔وہ اپنے مخصوص ترنّم کی وجہ سے ممتاز اور مقبول ہیں، یہی لکھتے بھی تھے، دونوں ایک دوسرے سے ناراض رہتے تھے۔جگرؔ صاحب کی ناراضگی ایک بار اس قدر بڑھی کہ شاید وہ بزمِ ادب پٹنہ یونیورسٹی ہی کے مشاعرے میں بلائے گئے تھے اور ڈاکٹر عندلیب شادانی بھی مدعو تھے۔جس وقت جگرؔ صاحب ہال میں پہنچے ڈاکٹر عندلیب شادانی ہلکے ترنّم سے اپنی غزل سنا رہے تھے،جگرؔ صاحب دروازے پر رُک گئے اور کہا یہ بدتمیز جب تک غزل پڑھے گا میں مشاعرے میں نہ بیٹھوں گا۔ بہرحال تو ان تینوں کی مخالفت کا بازار گرم تھا۔اسی دوران جگرؔ صاحب کی غزل گوئی اور غزل خوانی کا میدان بھی گرم تھا، اور پورے ہندوستان پاکستان میں جگرؔ صاحب کا طوطی بول رہا تھا اور حقیقت ہے کہ بہت اونچے معیار کی غزل گوئی نہ رہ کر بھی جگرؔ صاحب نے مجاز اور حقیقت کے درمیانی خط میں غزل کے اندر جو مستی اور سرشاری داخل کی وہ صرف جگرؔ صاحب ہی کا حصہ تھا۔اس کا اعتراف ان کے استاد اصغرؔ گونڈوی صاحب کو بھی تھا۔غزل میں مجاز اور حقیقت کی آمیزش کے ساتھ جو اسلوب اور انداز پیش کیا اور اس میں اپنے مخصوص ترنّم سے جو کیفیت سمودی وہ اعلیٰ تعلیم اور اوسط تعلیم دونوں حلقوں نے والہانہ طور پر قبول کی۔ اس دور میں غزل فراقؔ بھی لکھ رہے تھے اور جوشؔ کی نظمیں بھی مشاعروں میں تہلکہ پیدا کر رہی تھیں لیکن جگرؔ صاحب کا والہانہ پن اور ان کی ظاہری اور باطنی مستی ایک خاص چیز تھی ،اور کوئی غزل گو اس دور کا مشاعروں میں وہ سرشاری پیدا نہ کرسکتا تھا۔حالانکہ ساغرؔ نظامی کا دور بھی شباب پر تھا۔روشؔ صدیقی بھی نشۂ بے شراب کا مظاہرہ کر رہے تھے، جوشؔ بھی مشاعروں میں خوب پھولتے پھلتے تھے۔لیکن جگرؔ صاحب کی جو مخصوص لہک تھی وہ کہیں نہیں تھی۔مشاعروں میں داد تو جوشؔ کو زیادہ ملتی تھی، لیکن جگرؔ صاحب کی غزلوں کو سن کر مست ہو جانے والے اور جھومنے

والے زیادہ تھے۔ میں نے صرف ایک مشاعرے میں جگؔر صاحب کو دیکھا۔ بزمِ ادب پٹنہ یونیورسٹی کے سالانہ جلسہ میں وہ آئے تھے، میں بھی یونیورسٹی میں شاید آچکا تھا۔نہیں میں کالج میں پڑھ رہا تھا اور میری غزلیں بھی مشاعروں پر چھایا کرتی تھیں۔ میں نے بھی غزل پڑھی، چند دن پہلے شکیؔل بدایونی نے ریڈیو پر غزل پڑھی تھی 'سلام تک نہ پہنچے، کلام تک نہ پہنچے' پٹنہ میں تمام شعرا نے غزلیں اسی زمین پر لکھیں۔ استادوں نے بھی، جوان شاعروں نے بھی غزلیں لکھیں۔ میری غزل سب سے نکھری ہوئی تھی۔ ایک صاحب نے تمام غزلوں کو جو شاید چار پانچ تھیں، بغیر کسی کا نام دیئے ہوئے نواب جعفر علی خاں اثؔر لکھنوی کو بھیج دیا کہ مطلع، اشعار اور مقطع ہر اعتبار سے ان غزلوں کی صنف متعین کر دیجیے۔ ان کا جواب آیا۔ مختصر طور پر دو تین سطریں انھوں نے لکھا۔

"کیا بہ اعتبار مطلع کیا بہ اعتبار اشعار اور کیا بہ لحاظ مقطع یہ غزل سب سے اچھی ہے۔"

اور وہ غزل تھی میری۔ تو اُسی دوران مشاعرہ ہوا۔ میں نے وہی غزل پڑھی، بہت کامیاب رہی پھر کچھ دیر بعد جگؔر صاحب نے غزل شروع کی، پوری غزل یاد نہیں ایک شعر یہ تھا:

میرے ہم صفیر بلبل ترا مرا ساتھ ہی کیا
میں شریکِ دشت و دریا تو اسیرِ آشیانہ
میں یہ صاف کیوں نہ کہہ دوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں
ترا درد دردِ تنہا میرا غم غمِ زمانہ

پھر مقطع پڑھا:

میری زندگی تو گزری ترے ہجر کے سہارے
میری موت کو بھی پیارے کوئی چاہیے بہانہ

تو جو میں نے اوپر کہا کہ مشاعروں میں داد تو جوؔش کو زیادہ ملتی تھی کہ وہ وقت کی چیزیں پڑھتے تھے اور زور و بیان کے ساتھ پڑھتے مگر لوگ جھومتے تھے، جگؔر کی غزل پر زیادہ۔

تو جس وقت جگؔر صاحب یہ مقطع پڑھ رہے تھے ہجوم زیادہ تھا، کچھ لوگ کھڑے تھے۔ میرے قریب شاہ علی شطاری صاحب کھڑے تھے، ٹہل رہے تھے اور دونوں ہاتھ مل کر بیقراری میں کہہ رہے تھے کہ ہائے ظالم 'بہانہ' کہہ رہا ہے 'وصل' نہیں کہہ رہا ہے 'ہائے ظالم، کیا حسین پردہ داری ہے'۔

دوسرے دن ایوب صاحب ایڈوکیٹ صدر انجمن ترقی اُردو بہار کے یہاں دعوت تھی۔ جگرؔ صاحب بھی شیروانی پاجامہ میں اور میں بھی، جگرؔ صاحب نے مجھے دیکھ کر کہا ''آپ ہی نا 'پیام تک نہ پہنچے' والی غزل پڑھ رہے تھے؟ آپ کیا لکھنؤ سے آئے ہیں' ایوب صاحب نے کہا، نہیں میرے عزیز ہیں یہیں پٹنہ کالج میں پڑھتے ہیں۔

اِس نظم میں کہیں جگرؔ صاحب کا نام نہیں ہے لیکن اس وقت کے غزل کی مخالفت کا دور، ترقی پسند شاعری کا اُبھار، عظمت اللہ خاں کا غزل کی گردن زدنی کا مطالبہ اور عندلیبؔ شادانی کی مغربی شاعری کی صفات سے سجی ہوئی غزلیہ شاعری، اس ماحول میں عروسِ غزل کو اپنی پوری نکھار، پوری بہار، پوری سجاوٹ، پوری آرائش، پوری جھنکار کے ساتھ لیے جگرؔ صاحب مشاعروں میں الاپتے پھرتے تھے۔ اس کی آنکھوں کی مستی، زلفوں کی مہک سے خود بھی مست رہتے تھے، دوسروں کو بھی مست کرتے پھرتے تھے۔ یکایک عروسِ غزل کو بے یار و مددگار دُشمنوں کے ماحول میں بے سنگار چھوڑ گئے۔ اِس کی جوانی، اس کا شباب، اس کی مستی، اس کا آب و تاب، اُس کی شوخی، اس کا حجاب، اس کی آگ، اس کا سہاگ سب برباد ہوگیا، مگر جگرؔ صاحب کو سننے والے جو ہوں گے یا جو اُن کے شعری محاسن کے جاننے والے مزاج کے پہچاننے والے ہوں گے وہ اِس تلمیحی، رمزی اور علامتی اندازِ بیان میں جگرؔ صاحب کو پہچان لیں گے، جنھوں نے انھیں نہ سنا ہوگا یا ان کے کلام کا فہمی یا ذوقی مطالعہ نہ کیا ہوگا، یہ نظم انھیں جگرؔ کی بنیادی خصوصیاتِ شاعری سے آشنا کرکے جگرؔ صاحب کو شناخت کرادے گی۔ جگرؔ صاحب اپنے استادِ معنوی اصغرؔ گونڈوی کے رنگِ تغزل کو گود میں لیے ہوئے داغؔ کی محفل میں چلے آئے، داغؔ سے تھوڑی سی شوخی لی، بے ساختگی لی۔ اور اصغرؔ گونڈوی کی سنجیدگی اس میں ملادی۔ یہ رنگ جگرؔ ہی کا رہا اور کسی کا نہیں ہوسکتا۔

جگرؔ صاحب پر ان کی وفات کے بعد اور شعرا نے بھی نظمیں لکھی ہیں۔ کم از کم ایک نظم پیامؔ فتح پوری کی میں نے لال قلعہ کے مشاعرے میں سُنی۔ مجھے امید ہے جگرؔ صاحب کی روح مجھے زیادہ دعا دے گی کہ میں نے ان کی غزل کا پورا مزاج اور ماحول اس میں نچوڑ دیا ہے۔ یہ اشارے کسی اور طرف نہیں ہوسکتے:

ہر چند کوئی نام نہیں میری غزل میں
تیری ہی طرف سب کی نظر جائے ہے پیارے

جگرؔ مراد آبادی

(جگرؔ مراد آبادی کی موت پر)

تنویرِ فکر اُداس، تجلّیِ فن اُداس
زورِ بیاں اُداس، مذاقِ سخن اُداس

حدِّ نگاہ تک ہے چمن کا چمن اُداس
محفل اُداس، شمع اُداس، انجمن اُداس

بیٹھی ہوئی ہے بزمِ غزل کی دُلہن اُداس
رخسار اداس، زُلف شکن در شکن اُداس

پلکوں کا حسن، ابروؤں کا بانکپن اُداس
ماتھے کا چاند اُداس، جبیں کی کرن اُداس

آنکھیں خموش، ہونٹ فسردہ، دہن اُداس
سُرمے کی جوت اُداس، مسی کی پھبن اُداس

اے عشق تیری گرم زبانی خموش ہے
تخئیل کی شگفتہ بیانی خموش ہے

جذبات کی نکھرتی جوانی خموش ہے
اُمڈا ہوا شبابِ معانی خموش ہے

موجِ غزل کی زمزمہ خوانی خموش ہے
لہروں کو ہے سکوت روانی خموش ہے

ساحل جو کہہ رہا تھا کہانی خموش ہے
دریا کا بولتا ہوا پانی خموش ہے

کشتی پہ سازِ عشق بجاتا ہوا گیا
ملاح اپنا گیت سناتا ہوا گیا

ساقی نے چوم کر لبِ پیمانۂ غزل
کی ترکِ صحبتِ مئے و میخانۂ غزل

شمعِ غزل بجھی ، جلا پروانۂ غزل
اب ہم ہیں اور لذّتِ افسانۂ غزل

زلفِ سخن میں کون کرے شانۂ غزل
آئینہ توڑ کر گیا دیوانۂ غزل

اب کیا رہے گی حرمتِ کاشانۂ غزل
بے برہمن ہوا درِ بُت خانۂ غزل

جتنے غزل شکن ہیں جہاں میں پکار دو
آجاؤ اب کھلی ہوئی گردن ہے ماردو

مولانا ابوالکلام آزادؔ

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ انھیں تھوڑا بہت پڑھا، اُن کی دینی، ادبی اور صحافتی خدمات کے جائزہ کا بھی موقع نہ مل سکا۔ میں اپنے درد میں ایسا مبتلا ہوا کہ اور کسی سمت اور رُخ کا ہوش ہی نہیں رہا۔ جب دوبارہ تعلیمی دَور شروع ہوا، تو مولانا کی دینی، ادبی، صحافتی اور دعوتی زندگی پسِ پردہ چلی گئی تھی اور ان کی زندگی سیاست میں ڈھل چکی تھی۔ ان کی خطابت کا زور بھی میرے سامنے نہ آ سکا۔ جب وہ کلکتہ کے مومنٹ میدان میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں کی نمازِ عیدین کی امامت کر رہے تھے اور خطبہ کی دھوم مچ جاتی تھی، تو میں کم عمر تھا اور کلکتہ اسکول میں ابتدائی درجوں میں پڑھتے ہوئے وہاں مقیم رہ کر بھی میں اپنے محلے کی مسجد میں عیدین کی نماز اپنے بزرگوں کے ساتھ پڑھ لیتا تھا۔ ان کی امامت میں نماز ادا کرنے اور ان کی بے مثل خطابت سے آشنا ہونے کا شرف نہیں مل سکا۔ اور جب کسی حد تک اس قابل ہوا تو مسلم لیگ کی مخالفت کی وجہ سے مومنٹ میدان کی یادگار نمازِ عیدین کی خطابت اور امامت کی روایت ختم ہو چکی تھی اور مولانا آزادؔ سبحانی مرحوم ان کی جگہ لے چکے تھے۔

بی.اے. آنرس میں ان کے خطوط کا مجموعہ ’غبارِ خاطر‘ داخلِ نصاب تھا، اسی دوران ان کی معرکۃ الآرا کتاب ’تاریخِ دعوت وعزیمت‘ کچھ سرسری دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ دونوں کتابوں میں تقریر کا زور بہت حد تک تحریر میں جلوہ نما تھا۔ مجھے بہت مرعوب کیا مگر متاثر نہیں کیا۔ سیاست سے شغف اور لگاؤ نہ ہونے کی وجہ سے ان کی سیاسی عظمت اور بزرگی اور سیاست میں ان کی دانشوری و باریک بینی کا بھی اندازہ میں اس وقت نہ کر سکا تھا۔ بات سب اُس وقت کی ہو رہی ہے یعنی آج سے پینتیس سال پہلے کی۔ پھر تو انھیں کچھ سمجھا بھی، کچھ سوچا بھی، پڑھا بھی۔ ہاں

ان کا ایک واقعہ میرے ذہن میں زندہ تھا کہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے وقت جب دہلی کے فسادات اور قتل و غارت گری کے دوران مسلمان جامع مسجد میں پناہ گزیں تھے اور ہجرت کے لیے تیار تھے، مولانا جامع مسجد تشریف لائے تھے اور بہت کھل کر اور پوری دردمندی کے ساتھ پوری بصیرت سے مسلمانوں کو مخاطب کر کے تقریر کی تھی اور ہجرت سے باز رہنے کی پوری قوت سے تلقین کی تھی۔ ایمانی حرارت میں اپنی سیاسی حیثیت فراموش کر کے پورے دعوتی انداز سے مسلمانوں کو خطاب کیا تھا۔ اس کا مختصر اقتباس اخباروں میں پڑھا تھا اور اس وقت تک جو ناآشنائی مولانائے محترم سے تھی، وہ کسی حد تک ختم ہوکر ہم آہنگی کا پہلو اختیار کر چکی تھی۔ بس وہی ایک تاثر مولانا کا اس وقت میرے قلب پر تھا۔ اور جب وہ بسترِ مرگ پر تھے تو میں ان کے لیے دعائیں کر رہا تھا اور پھر آخر میں اخباروں میں جب ان کے انتقال کی خبر آئی اور خبر میں بسترِ مرگ کی آخری گھڑیوں کی جو مختصر لفظی تصویر اخبار میں تھی مولانا کے انتقال کے دوسری ہی صبح میں نے اپنے الفاظ میں منتقل کر دی۔ شاید صبحِ صادق کے وقت مولانا کا سفرِ آخرت ہوا، اور اس وقت اُن کے آس پاس، اِرد گرد، دائیں بائیں، پائنتیں اور سرہانے جو جو لوگ تھے، پنڈت جواہر لعل نہرو اور مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم اور ان کی اندرونی اور چہرے کی جو کیفیت اخبار میں تھی اور ان شخصیتوں کی ظاہری اور باطنی کیفیات کی ایک تصویر ذہن میں بنائی اور انھیں الفاظ کی سانچے میں ڈھال دیا۔ میں کسی سیاسی شخصیت سے کبھی متاثر نہ رہا۔ اس کی وجہ اکثر ظاہر کر چکا ہوں اس لیے سچائی سے میں اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اور سچائی نے نظم میں جو بات پیدا کی ہے مولانا کے متعلق شاید کسی اور دوسری نظم میں پیدا نہیں ہوئی ہوگی، میرا اپنا مطالعہ یہی ہے۔

چند روز بعد سائنس کالج میں تعزیتی جلسہ ہوا، مولانا ریاست علی ندوؔی مرحوم پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے، وہ مولانا ابوالکلام آزادؔ کے عقیدت مند بھی تھے اور دوست بھی۔ انھوں نے ایک نظم کی مجھ سے فرمائش کی۔ میں نے وہی نظم جلسہ میں پڑھ دی۔ جب تک میں پڑھتا رہا۔ مولانا ریاست علی ندوؔی صاحب ہال میں کرسی سے اُٹھ کر بیتابی سے ٹہلتے رہے۔ میں باہر جانے لگا تو روکا بھی نہیں مگر میری پشت پر آہستہ آہستہ دو تین تھپکیاں دیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال شب کے تین بجے ہوا تھا اسی وقت کی ترجمانی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد

رات کے پچھلے پہر کا وقت ہے درد دِل سوزِ جگر کا وقت ہے
امتحانِ چشمِ تر کا وقت ہے کس کے سامانِ سفر کا وقت ہے؟
ایک عالم جب کہ محوِ خواب ہے
کون جانے کے لیے بیتاب ہے؟
لٹ رہا ہے ساز و سامانِ وفا چاک ہوتا ہے گریبانِ وفا
ایک جانِ آرزو جانِ وفا توڑتا ہے عہد و پیمانِ وفا
آرزوؤں کا جو اس پر دین ہے
پھیر دینے کے لیے بے چین ہے
رو رہے ہیں یار بھی غمخوار بھی ہم نشین بھی محرمِ اسرار بھی
ملنے والے بھی شریکِ کار بھی برہمن بھی شیخ کج دستار بھی
وہ اُدھر تنہا اِدھر سب ساتھ میں
ایک دامن ہے ہزاروں ہاتھ میں
التجا کرتا ہے منّت سے کوئی رو رہا ہے رنجِ فرقت سے کوئی
چپ ہے اندوہِ طبیعت سے کوئی دیکھتا ہے چشمِ حسرت سے کوئی
روکنے والوں کی ہمّت پست ہے
جانے والا اپنی دھن میں مست ہے
سرنگوں بیٹھے ہیں احبابِ چمن تابِ خاموشی نہ یارائے سخن
روشنی جس کی ہوئی ظلمت شکن بجھتی جاتی ہے وہ شمعِ انجمن
اب جدا یہ ہم سفر ہونے کو ہے
قافلہ بے راہبر ہونے کو ہے
سب تمنائیں ہوئیں ناکامیاب دوست اُٹھے پہلو سے با چشمِ پُر آب
کون دے اب التجاؤں کا جواب خامشی نے ڈال دی منہ پر نقاب
چاندنی ڈوبی اندھیرا ہوگیا
صبح کے پہلے سویرا ہوگیا

شبِ معراج

شبِ معراج اسی طبیعی کائنات اور مابعد الطبیعی کائنات کا ایک نہایت ہی عظیم اور مقدس واقعہ ہے جس نے روح اور جسم دونوں کو متاثر کیا ہے اور قیامت تک یہ چھاپ روحانی اور جسمانی کائنات پر بہت گہری رہے گی۔ وہ کائنات جو نگاہ کے سامنے ہے اور بتدریج نگاہوں کے سامنے آتی رہے گی اور منکشف ہوتی رہے گی۔ اس کائنات کے پسِ پردہ ایک اور کائنات ہے جس کی آغوش کے ایک گوشے میں یہ پوری مادّی کائنات ہے۔ اس مادّی کائنات میں یہ صلاحیت اور استعداد نہیں ہے کہ نظروں سے پوشیدہ اس روحانی کائنات کے کسی بھی ادنیٰ سے ادنیٰ راز کی راز دار ہونے کی متحمل ہو سکے۔ اس حقیقت کا یہ پہلو واقعہ معراج ہے۔ ایک مادّی جسم کو اللہ تعالیٰ نے یہ شرف بخشا اور اس کی آنکھوں کو یہ وسعت اور گہرائی و پہنائی بخشی کہ اس مابعد الطبیعی کائنات کی جھلک دیکھ لے اور ان جلوؤں کا کچھ حصہ بقدرِ توفیق انسانوں کے خزانۂ علم کو بخش دے۔

ہر تخلیق خالق کی ذات کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ اس کائنات کی مخلوق بھی اسی خالق کی ذات کا پرتو ہے۔ اسی مرکز سے جدا ہوا ہے اور اسی مرکز کی طرف واپس پرواز کر رہا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ واقعہ معراج اسی حقیقت کی ایک دلیل ہے کہ اپنے خالق کے وجود سے اپنے مادّی جسم مبارک کے ساتھ ایک بار وابستہ ہو آئے۔ ایسے وصال کے وقت، اس معراج کے وقت یعنی ایک مخلوق کا خالق سے وصل، ایک بندے کا بندہ نواز سے ہم آغوش ہونے کے وقت، یہ کائناتِ طبیعاتی کس عالم میں ہو سکتی ہے اسی کا ایک ہلکا عکس، ایک ہلکا سا پرتو یہ نظم ہے۔ یہ کائنات اس معراجِ جسمانی اور روحانی کے وقت کس عالمِ تحیر، کس عالمِ خود فراموشی میں ہوگی۔ اتنا عظیم واقعہ اس کائنات کا ہو رہا ہے جو پہلے کبھی نہیں ہوا اور آئندہ کبھی نہ ہوگا۔ یہ کائنات، یہ عالم کتنا دم بخود ہوگا، اس کی ایک نہایت ہی حقیر سی تصویر اس نظم میں ہے۔ آسمان سے زمیں تک ہر

حصہ اس کائنات کا متحیر، دم بخود، ساکت وخود فراموش تھا۔ سب کی آنکھیں اس ایک واقعہ کے مشاہدہ میں مستغرق تھیں، زمین سے ایک چاند اُٹھ رہا ہے اور ہفت آسمان عرش وکرسی کو چھلانگتا ہوا اس سورج سے جس سے ٹوٹ کر الگ ہوا تھا ہم آغوش ہوجاتا ہے، چاند سورج کی آغوش میں سماجاتا ہے۔ شاعر کا یہ تخیل ہے کہ جس وقت اس کائنات میں یہ عظیم واقعہ رونما ہو رہا ہوگا اس وقت یہ دنیا کس عالم میں ہوگی۔ ایک پُراسرار سناٹگی اور خاموشی:

یہی وہ وقت تھا جب مدّتوں کا عشق خموش
لپٹ کے حسنِ حقیقت سے ہوگیا مدہوش

اس عظیم واقعہ کی راز دار اور امین ہے اور قیامت تک امین و رازدار رہے گی۔ جب اس واقعہ کی تفسیر اور تفصیل ہر نگاہ کے سامنے آجائے گی، وہ روزِ محشر ہی ہوگا اس سے قبل نہیں۔

شبِ معراج

زمیں پہ لالہ و نسریں ونسترن خاموش — فلک پہ چاند ستاروں کی انجمن خاموش
بکھیرے دوش پہ گیسوئے پُرشکن خاموش — کسی خیال میں تھی رات کی دلہن خاموش

گھروں میں کوئی صدا تھی نہ کوہساروں میں
سکوت تھا عربستاں کے ریگ زاروں میں

یہی تھا وقت دِلوں کے گداز ہونے کا — کشادہ خلوتِ راز و نیاز ہونے کا
نظر نظر میں بہم سازباز ہونے کا — زبانِ حرف و حکایت دراز ہونے کا

یہی وہ وقت تھا جب دل کو دل کی راہ ملی
بڑے زمانے کی بچھڑی ہوئی نگاہ ملی

یہی تھا وقت ملا پردہ در سے پردہ پوش — جب آئینہ ہو آئینہ گر سے ہم آغوش
یہی وہ وقت تھا جب مدّتوں کا عشق خموش — لپٹ کے حسن حقیقت سے ہوگیا مدہوش

بلند و پست نہ فرقِ نیاز و ناز رہا
بس ایک نغمہ رہا اور ایک ساز رہا

امین احمد مرحوم کی موت پر

مسٹر امین احمد (آئی سی ایس لندن) کرائے پر سرائے پٹنہ کے رہنے والے پٹنہ شہر میں مقیم رہے۔ کلکٹر کمشنر کے عہدوں پر بہار اُڑیسہ کے کئی مقامات پر رہ کر ہر مقام پر اصلاحی، اخلاقی، تعلیمی تحریکیں چلائیں۔ کہیں اسکول کھلوا دیا، کہیں مدرسے قائم کر دیئے، مسجدیں بندا دیں۔ مختلف قسم کے فلاحی کاموں کا آغاز کر کے خود اتنی محنت اور کوشش و کاوش سے بہترین انجام تک پہنچا دیا۔ ریٹائر ہوئے تو دینی محنت نے شدّت سے ان کو استعمال کیا۔ انسانیت کے علمبردار، ایمان کے سپہ سالار، اخلاق کی نشأۃ کا مجسمۂ عجز و انکسار، ایسا جھک کے ملتے کہ دوسروں کو شرم آنے لگتی۔ مومن کا چہرہ، مومن کا لباس، مومن کی زبان، شیریں گفتار، شیریں بیان۔ جس مجلس میں جاتے ایمان، اخلاق، اعمال کی باتیں کرتے۔ قربانی وایثار کی روایتیں ارشاد کرتے، عمل کی ترغیب دیتے، حسنِ اخلاق کی طرف متوجہ کرتے۔ جو بھی اپنے یہاں بلاتا خوش مزاجی سے تشریف لے جاتے۔ نرم و شیریں انداز میں دین کی باتیں کرتے۔ گفتگو میں تاثیر، خوش سلیقگی سے اپنی بات دل میں اُتار دیتے۔ ان کی آنکھوں سے ان کے دل کا درد نمایاں رہتا۔ دیدے عموماً نمناک رہتے، مومن کا کردار جس طرح شکل وصورت، لباس و پوشاک، حرکت و اعمال سے نمایاں رہتا، ان کی باتوں کی چلمن سے بھی ان کے دل کی گرمی اور اخلاق کی حرارت جھانکتی۔

ریٹائرمنٹ کے بہت دن بعد ان کے دوستوں کی برابر خواہش ہوتی رہی کہ وہ اسمبلی کی نشست کے لیے الیکشن میں حصہ لیں۔ وہ ہمیشہ انکار کرتے رہے۔ خدمت کا جو اسمبلی کے باہر میدان ہے اسمبلی کے اندر نہیں ہے، مگر لوگوں کی خواہش کم نہیں ہوتی زیادہ ہوتی، اصرار کم نہیں ہوتا بڑھتا۔ یہ تو مجھے یاد ہے بہت اصرار ہوئے اور خواہش مندوں کا ہجوم بڑھتا رہا اور دل شکنی کے آثار ظاہر ہونے لگے تو فرمایا آپ لوگ اس قدر مصر ہیں تو اس شرط پر آمادگی ظاہر کرتا ہوں کہ میں ووٹ مانگنے نہیں جاؤں گا۔ کسی جلسے میں اس نوعیت کی تقریر نہیں کروں گا۔ کوئی بیان نہیں نکالوں گا۔ پوسٹر اور پمفلٹ نہیں چھپواؤں گا۔ ان کے احباب نے یہ تمام شرطیں منظور کر لیں۔

اُن کی محنت دوسروں نے اپنے سر لے لی۔ شائستگی سے اعلان بھی ہوا، سنجیدگی سے محنت بھی ہوئی۔ تھوڑی سی محنت ان کی پُرزور اور توانا شخصیت کو مقبولیت کی بلندی پر لے گئی۔ اور وہ اسمبلی

کے لیے منتخب کر لیے گئے۔ یہ شمع ایوانِ سیاست کے اندر جلی تھی کہ بجھ گئی اور مسٹر امین احمد صاحب کا کچھ ہی دن بعد انتقال ہو گیا۔ تاریخ زمانہ مجھے یاد نہیں ہے۔ میں ان سے چند بار ہی مل سکا۔ وہ میرے یہاں بھی دو ایک بار تشریف لائے۔ ویسی ہی مجلس میں یا بزم میلادِ نبویؐ میں موٴثر باتیں بھی ارشاد فرمائیں، ان کے وصال کا مجھے دن تاریخ یاد ہے نہ زمانہ یاد ہے۔ شاید یونیورسٹی میں میری تعلیمی مشغولیت کا دور تھا۔ یہ یاد ہے کہ میں یونیورسٹی ہی میں تھا کہ مجھے اطلاع ملی۔ میں ان سے بے حد متاثر تھا، یہ تاثر یونیورسٹی کے کلاس میں ہی میرے قلم سے بے ساختہ ٹپک پڑا۔ میں نے یہ تین بند لکھ کر استاذی اختر اورینوی صاحب کو دیئے تو وہ بہت متاثر ہوئے اور بے حد خوش ہوئے اور اسی وقت شاید 'صدائے عام' روزنامہ میں اشاعت کے لیے بھیج دیئے۔

امین احمد مرحوم کی موت پر

گھٹا تو آج نہ اُٹھی مگر غبار اُٹھا
سرور ختم ہوا پردۂ خمار اٹھا
ہر ایک رند جگر خستہ دل فگار اُٹھا
صراحی روتی اُٹھی جام اشکبار اٹھا
پھر آج میکدے سے ایک بادہ خوار اٹھا

یہ انجمن تھی اگرچہ کہیں کہیں خالی
مگر ہے آج بہت دُور تک زمیں خالی
خرد کو غم کہ ہوئی میری آستیں خالی
جنوں کو رنج کہ میرا شریکِ کار اُٹھا
پھر آج میکدے سے ایک بادہ خوار اُٹھا

کہو کسی سے بلند اپنا پھر پیالہ کرے
دوا بھی بخش دے اور درد بھی حوالہ کرے
سرور وکیف کے فقدان کا ازالہ کرے
کسی کو لاؤ کہ تفسیرِ آہ و نالہ کرے
کتابِ عشق کا اِک تبصرہ نگار اٹھا
پھر آج میکدے سے ایک بادہ خوار اٹھا

پٹنہ سے منیر شریف تک

یاد آیا مے کہ پٹنہ یونیورسٹی کا بدن بیماروں جیسا تھا مگر چہرے پر بڑی تابانی تھی۔ پروفیسر عبدالمنان بیدلؔ نہیں تھے، حافظ شمس الدین صاحب شمسؔ منیری نہیں تھے، پروفیسر سیّد حسن عسکری نہیں تھے، ڈاکٹر عظیم الدین عظیمؔ نہیں تھے، پروفیسر نجم الحسن نجمؔ نہیں تھے، پروفیسر فضل الرحمٰن نہیں تھے، لیکن ڈاکٹر زین العابدین کا چراغ بھڑکیاں لے رہا تھا۔ کلیم الدین احمد بھی تھکے ہارے چل رہے تھے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی کا شباب باقی تھا۔ صدرالدین فضاؔ بھی بیماری سے سن سفید ہو رہے تھے مگر جوشِ جوانی باقی تھا، تن کر چلتے تھے۔ پروفیسر مطیع الرحمٰن صاحب کا تو آغازِ شباب ہی تھا۔ پٹنہ یونیورسٹی میں بزمِ ادب کی رونق تھی۔ پروفیسر وسیم بزمِ ادب کے سکریٹری تھے، ان کا عہد ختم ہونے کو تھا اور یہ ناچیز مشیت ایزدی میں سکریٹری بننے کے لیے کروٹیں لے رہا تھا۔ یعنی میں بے خبر تھا، مگر قدرت کی مشین نقوش بنا رہی تھی۔ کلاس میں سیمینار ہوتے تھے، بیت بازی ہوتی تھی۔ مباحثے ہوتے تھے، کلاس میں مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے۔ دو شعر اس نے پڑھ دیئے، چار اس نے پڑھ دیئے، ایک غزل اس نے سنا دی چلئے۔ چراغاں ہو جاتا تھا۔ ایم۔اے کے سال اوّل میں جو طالب علم آتے تھے ان کے لیے الوداعی تقریبات ہوتی تھی، تقریریں ہوتی تھیں، یونیورسٹی کے سائبان کو سجایا جاتا تھا، جھنڈے پھڑ پھڑاتے اور جھنڈوں پر مناسبت سے اشعار چمکتے تھے۔ کلاس میں ٹیوٹوریل ہوتا تھا، لڑکوں کا امتحان لیا جاتا تھا۔ اشعار اور ادبی پیراگراف تشریح کے لیے دیئے جاتے تھے۔ لڑکوں کو تیاریاں کرنے کی تیاریوں میں مشغول رکھا جاتا تھا۔ پروفیسر جمیلؔ مظہری صاحب مرحوم میرے اور میرے چند ساتھیوں کا ٹیوٹوریل لیتے تھے۔ دس نمبر میں مجھے ساڑھے پانچ نمبر دیتے تھے اور کہتے تھے کلیم عاجزؔ میاں اگر تُو فرسٹ کلاس نہیں آیا تو ہمیں بیحد افسوس ہوگا اور جب نتیجہ نکلا اور میں فرسٹ کلاس فرسٹ آیا تو رکشہ پر مجھے مبارک بادی دینے

اور گلے لگانے آئے۔ میں نے رکشہ کا کرایہ رکشہ والے کو دینے کو ہاتھ بڑھایا تو خفا ہو کر سختی سے بولے کہ تم نے مجھے مرغا سمجھ رکھا ہے! کچھ اسی قسم کا جملہ تھا۔ میں نے معذرت کی اور ندامت کا اظہار کیا اور بہترین شاہی ٹکڑا گھر کا بنا کر کھلایا تو ہنسنے لگے اور بولے شاہی ٹکڑا کھا کر غصّہ ٹھنڈا ہو گیا۔ تو یونیورسٹی میں اس پائے کی نہیں مگر کسی نہ کسی سطح پر ہما ہمی باقی تھی، جی لگتا تھا اور پڑھنے میں کلاس جانے میں مزا بھی آتا تھا، اب تو یہ حال ہے کہ:

شہر یہ شہرِ خموشاں ہوگیا
آؤ آکر فاتحہ پڑھ جاؤ شادؔ

تو موقع موقع سے پکنک بھی ہوا کرتی تھی، ٹُور بھی ہوتے تھے۔ ایک بار پروفیسر مطیع الرحمٰن صاحب نے منیر شریف کا ٹور بنایا، ہم لوگ دس پندرہ طلبہ اور طالبات منتخب ہوئے۔ آٹھ نو طالب علم، تین چار طالبات! ہمارے کلاس میں تو صرف ایک طالبہ تھی جس کو ہمارے ساتھی مرتاض الدین مرحوم نے تعزیہ کا لقب دے رکھا تھا۔ اس قدر سنجیدہ اور برقعہ میں اس طرح سر سے پاؤں تک ملبوس کہ جہاں وہ کلاس میں آتیں اور مرتاض بول اُٹھتے لو بھائی تعزیہ آگیا اب مرثیہ شروع کردو۔ مگر ہم سے اوپر فائنل میں چار پانچ تراق پڑاق طالبہ تھیں، ان میں دو تین اس وفد میں شامل ہوئیں، اور ہمارے ساتھیوں میں حسن آرزو سب سے اسمارٹ تھے، کچھ بنتے بھی تھے سنورتے بھی تھے۔ ہلکی سردی میں بھی، گلابی بش شرٹ اور سفید زین کا پینٹ۔ یہ 'زین' Geen مت سمجھ لیجیے۔ Geen تو وحشیوں کا لباس ہے۔ سفید زین کا پینٹ اور سفید ٹوئیڈ کا شرٹ یا ہاف بش شرٹ بہت پروقار، مہذب اور حسین مغربی لباس تھا۔ تو حسن آرزو اسی لباس میں اور ہمارے دوست ساتھی شاہ عظیم الرحمٰن دو اسمارٹ طالب علم ہمارے ساتھ تھے جن کی ترجمانی کسی شاعر نے سو سال پہلے کی تھی کہ:

لکھی تھی حسن پرستی ازل سے قسمت میں
مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا

یہ مجسم شعر حسن آرزو اور شاہ عظیم الرحمٰن تھے، اور طالب علم ذرا نیچے درجہ کے اسمارٹ تھے اور سب سے زیادہ نان اسمارٹ یہ خاکسار تھا۔ جو کارواں کے ساتھ گردِ کارواں بنا ہوا چل رہا تھا۔ ہمارے کلاس کی تنہا طالبہ زاہدہ جسے مرتاض مرحوم نے تعزیہ کا لقب دیا تھا، تو اس تعزیہ کی رعایت سے اس خاکسار کو امام باڑہ کہہ لیجیے۔ گرچہ زاہدہ کی شادی ایم اے کرنے کے دو چار سال بعد ہوئی

اور یہ کمترین میٹرک کرنے کے بعد ہی ایک گھنٹے کے لیے سہرا باندھ چکا تھا۔ پھر سہرا پھینک کر پلّے کی ٹوپی پہن لی تھی۔

تو ہم لوگوں کا گروہ گاندھی میدان سے بس پر منیر شریف روانہ ہوا۔ راہ میں حسن آرزو اور عظیم الرحمٰن مرحوم کی طالبات کے ساتھ دو چار طالب علموں کی بناوٹی اور معصومانہ چھیڑ راستہ بھر رہی جو پروفیسر مطیع الرحمٰن صاحب کی پروفیسرانہ سے زیادہ حاکمانہ رویہ کی وجہ سے بہت نمایاں نہیں ہو سکی مگر ہم لوگ سے چھپ بھی نہ سکی۔

منیر شریف پہنچنے کے بعد وہاں کی آٹھ سو سالہ تاریخ کی جو یادگاریں خانقاہ کے بوسیدہ در و دیوار کے اندر رکھی ہوئی ہیں وہ زیارت کے لیے سامنے لائی گئیں۔ حضرت تاج فقیہ رحمۃ اللہ جو حضرت مخدوم بہاری کے مورث اعلیٰ ہیں ان کی فلسطین سے منیر شریف آمد، ان کے ہمراہ صوفی و مجاہد شہسوار کی فلسطین سے منیر شریف تک ان شہسواروں کے گزرنے اور منیر شریف تک پہنچنے کی دستاویزی یادگاریں۔ ان کے جامے اور عمامے، ان کی تسبیحیں، سجادے، کلاہیں اور دستار۔ دن کو ان کی شہسواریاں اور پیکار اور راتوں کو ان کی نمازیں، دُعائیں، آہ وزاریاں اور استغفار۔ یہ سب آنکھوں کی راہ سے تصور میں زندہ ہوگئیں۔ اور میں نے اس کو دن بھر کے سفر میں صبح سے چل کر رات تک کی واپسی کے دوران قلمبند کر لیے۔ شاعرانہ علامات میں جس قدر مقدور ہو سکا انھیں پیش کیا۔ چنانچہ ایک سال بعد ۱۹۵۸ء میں کلکتہ کے ایک مشاعرہ سے واپسی کے دوران ٹرین پر اصرار سے استاذی علامہ جمیل مظہری نے اور پروفیسر پرویز شاہدی نے مجھ سے وہ نظم سُنی اور فرمایا کہ بہترین سمبولک نظم ہے۔ یہ چند سطریں اُن اشارات، تشبیہات اور استعارات کے لیے جو نظم میں استعمال ہوئی ہیں شاید مختصر وضاحت کے لیے کافی ہوں گی۔

پٹنہ سے منیر شریف تک

وہ سحر وہ اوّلیں ماہِ دسمبر کی سحر　　وہ دِلوں کی آرزو آنکھوں کی منظورِ نظر
کروٹیں لیتے ہیں جس کے لیے ہم رات بھر　　آ گئی اُڑتی ہوئی ٹھنڈی ہوا کے دوش پر
سادگی تھی رنگ ابھی نکھرا نہیں تھا روپ کا
صرف ہلکا ہلکا غازہ تھا سنہری دھوپ کا

دوست بستر سے اٹھے آراستہ ہو کر چلے　　سرخ پوش و عنبریں زلف و سبک پیکر چلے
کچھ برہنہ آستیں تھے، کچھ برہنہ سر چلے　　اور ہم آہستہ آہستہ پسِ منظر چلے
ہم رکابی میں یہ جان ناتواں بھی ہوگئی
کارواں کے ساتھ گردِ کارواں بھی ہوگئی

محفلِ یاراں میں دو شمعیں تھیں پروانے تھے سب　　دو ہی تھے عنوانِ رنگیں جن کے افسانے تھے سب
آستیں سے بے خبر دامن سے بیگانے تھے سب　　میں اکیلا ہوش میں تھا ورنہ دیوانے تھے سب
عشق یوں پیچھے پڑا تھا ان کے پنجے جھاڑ کے
ڈر تھا جنگل کو نکل جائیں نہ دامن پھاڑ کے

کامرانی کے تصور میں اُچھلتا تھا کوئی　　شوق کی ناکامیوں پر ہاتھ ملتا تھا کوئی
بیخودی میں لڑکھڑاتا تھا سنبھلتا تھا کوئی　　نو جوانی کی اکڑتی چال چلتا تھا کوئی
دل میں گستاخی کی نیت کس نے فرمائی نہ تھی
سب سے بڑھ کر یہ مصیبت تھی کہ تنہائی نہ تھی

راہ میں کتنے گلستاں کتنے ویرانے ملے　　کتنی روشن محفلیں کتنے سیہ خانے ملے
کچھ حقیقت سامنے آئی کچھ افسانے ملے　　کچھ بھرے ساغر ملے کچھ خالی پیمانے ملے
شام کی محفل، سحر کی خلوت آرائی ملی
دن کی ہنگامے ملے راتوں کی تنہائی ملی

دُھندلے دُھندلے سے نقوش بزم جانانہ ملے　　شمع کے آنسو غبارِ خاکِ پروانہ ملے
شعر کے مضموں ملے عنوانِ افسانہ ملے　　چشمِ بے سرمہ ملی گیسوئے بے شانہ ملے
ہر طرف بکھرے ہوئے محفل کے شیرازے ملے
خستہ دیواریں ملیں بوسیدہ دروازے ملے

ہفت صد سالہ دلوں کی گمشدہ دھڑکن ملی　　نکہتِ دستار آئی بوئے پیراہن ملی
شہسواروں کی ہوائے جنبشِ دامن ملی　　دُور تک اڑتی ہوئی گردِ رمِ توسن ملی
خرقہ و چادر ملی تسبیح و سجادہ ملے
ایک جا کتنے نقوشِ دُور افتادہ ملے

جشن عید

شاید ۱۹۵۷ء میں میرا داخلہ ایم. اے میں ہو چکا تھا اور ڈاکٹر ذاکر حسینؔ صاحب کچھ ہی دنوں قبل گورنر بہار کے منصب پر تشریف لائے تھے۔ میرے ہم زلف سیّد جمیل احمد مرحوم ایم ایل اے پٹنہ سیٹی میں اپنے مکان کے قریب منگل تلاب کے میدان میں جشنِ عید کا اہتمام کر رہے تھے اور مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر ذاکر صاحب مرحوم کو شرکت کی دعوت دے چکے تھے۔ مجھ سے فرمائش کی کہ گونر صاحب کے اعزاز میں ایک استقبالیہ نظم لکھ دو۔ میں نے کبھی کسی کے اعزاز میں یا استقبال میں نظم نہیں لکھی تھی۔ گرچہ ذاکر حسین صاحب مرحوم سے میری ملاقات راج بھون میں ہو چکی تھی۔ اس نوعیت کی نظم میرے افتادِ مزاج سے ہم آہنگ نہ تھی اور جمیلؔ صاحب مرحوم کا رشتہ اور بزرگی کی بنیاد پر اصرار شدید تھا۔ میں نے کہا استقبالیہ نظم نہیں لکھوں گا عید کے موضوع پر اشعار لکھ دوں گا اور اسی میں ڈاکٹر صاحب کی تعریف میں کچھ اشعار شامل کر دوں گا۔ وہ گرانی کے ساتھ راضی ہوئے، میں نے نظم لکھ دی۔ اس نظم میں چار پہلو ہیں۔ صبحِ عید کی منظر کشی، منگل تالاب جہاں جشن عید تھا، اس جشن کا منظر تیسرا حصہ ذاکر صاحب کی تعریف میں دو بند اور آخر کے تین بند ہیں اسی جلسے سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اپنا درد اور سخن گسترانہ بات۔

میں نے نظم جمیلؔ صاحب کے حوالے کی تو انھوں نے پڑھا نہیں بلکہ مجھ سے کہا کہ میں اس وقت کیا پڑھوں تمھاری ہی زبان سے سنوں گا۔ وہ جشن ہوا اور منگل تالاب پر وہی منظر تھا جو میں نے اپنے تخیل سے قبل از وقت کھینچا تھا۔ آخر میں ڈاکٹر ذاکر صاحب مرحوم کی مختصر گفتگو ہوئی اور میں نے نظم پڑھی۔ اب جو میں نظم پڑھ رہا ہوں تو بند پر بند گذر رہے ہیں، منظر سامنے آتا جا رہا ہے، لوگ تعریف کر رہے ہیں اور بھائی جمیل احمد صاحب میرا منہ دیکھ رہے ہیں کہ ڈاکٹر ذاکر صاحب کا نہ قصیدہ آ رہا ہے، نہ ان کا نام آ رہا ہے۔ آخر ڈاکٹر صاحب کے متعلق بھی دونوں بند

پڑھ دئے گئے اور وہ مجھے اسٹیج پر ہی سرخ ہو کر گھورر ہے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اپنا ذکر خوب سمجھ گئے، محظوظ بھی ہوئے، مسکرائے بھی۔ آخر کے تین بند پڑھ کر میں بیٹھ گیا اور جمیل بھائی اسی طرح مجھے گھورتے رہے اور جلسہ کے بعد شکوہ کرنے لگے۔ میں نے خصوصیت کے ساتھ صرف وہ دونوں بند پھر پڑھ کر انھیں سنائے مگر وہ مطمئن نہ ہوئے۔ پھر یہ نظم کئی رسالوں میں شائع ہوئی۔ ایک رسالہ نے ڈاکٹر صاحب کا نمبر نکال کر انھیں دو بندوں کو ان کی تصویر کے ساتھ شائع کیا۔

جشنِ عید

کیا شام ہے عید کی سہانی　　پھولوں پہ برس پڑی جوانی
سبزے کا بچھا ہے فرش دھانی　　ہے رنگ زمیں کا آسمانی
غنچہ جو چمن میں کھل رہا ہے
فطرت کا سراغ مل رہا ہے

چہرے پہ گلوں کے ہے بحالی　　رگ رگ سے ٹپک رہی ہے لالی
ڈالی سے لپٹ گئی جو ڈالی　　پتّوں نے بجائی مل کے تالی
پھولوں کا نکھارا اگر عجب ہے
کانٹوں کا بھی بانکپن عجب ہے

سورج جو چلا برائے آرام　　دیتا گیا آسماں کو پیغام
ہوتی ہے زمیں پہ آج کی شام　　آراستہ بزم شیشہ و جام
سن کر یہ سدا خوشی کے مارے
خلوت سے نکل پڑے ستارے

کھولے ہیں بہار نے جھروکے　　دوشیزۂ گل اٹھی ہے ہے سو کے
زلفوں کو گلاب میں بھگو کے　　بیٹھی ہے نہا کے بال دھو کے
تقسیم متاعِ دید ہے آج
یارانِ چمن کی عید ہے آج

عید آئی پیام شوق آئے　　سو جلوے نگاہ نے دکھائے
ہاتھ آرزوؤں نے پھر بڑھائے　　ارمانوں کے پاؤں لڑکھڑائے
جذبات نے لے کے دل میں کروٹ
ہونٹوں کو سکھا دی مسکراہٹ

تازہ ہوئے شوق کے فسانے　　یاد آئے نئے نئے بہانے
آباد ہوئے نگارخانے　　ہونے لگے گیسوؤں میں شانے
چھوٹے ہیں گھروں میں یا بڑے ہیں
آئینے کے سامنے کھڑے ہیں

لینے لگے جائزہ بدن کا　　رخسار کا، چشم کا، دہن کا
ہر نقش و نگار بانکپن کا　　بننے لگا جزو پیرہن کا
جتنی شکنیں تھیں کُل جبیں میں
سب چُن دی گئی ہیں آستیں میں

پیری ہے کہیں نہ ناتوانی　　لوٹ آئی ہے گمشدہ جوانی
وہ خواہ نئی ہو یا پرانی　　خوشبو میں بسی ہے شیروانی
نکلے ہیں گھروں سے بن سنور کے
بچھڑے ہوئے دوست سال بھر کے

تالاب پہ جل رہی ہے مشعل　　احباب بچھائے فرشِ مخمل
کھولے ہوئے شربتوں کی بوتل　　جنگل میں منا رہے ہیں منگل
کچھ لوگ غزل سنا رہے ہیں
کچھ بیٹھ کے گنگنا رہے ہیں

سالک بھی ہیں ان میں گریاں بھی　　افرادِ گروہِ مئے کشاں بھی
محرابِ حرم کے پاسباں بھی　　آوارۂ کوچۂ بتاں بھی
زاہد بھی ہیں بادہ خوار بھی ہیں
دیوانے بھی ہوشیار بھی ہیں

خوش وضع بھی آئے خوب رو بھی　　رنگین مزاج و سادہ خو بھی
برباد جہانِ رنگ و بو بھی　　ہم جیسے خراب رو بھی
مطلوب نگاہِ یار بھی ہیں
مجروح غمِ بہار بھی ہیں

اِک پیرِ مغاں ہے میرِ محفل　　بالیدہ نگاہ و صاحبِ دل
تعلیم کی برکتوں کا حامل　　تہذیب کی کوششوں کا حاصل
حالیؔ کے ادب کا آئینہ دار
سیّد کی مصوّری کا شہکار

احساس بھی، فکر بھی، نظر بھی　　جذبات بھی، سوز بھی، اثر بھی
دامانِ خرد کا بخیہ گر بھی　　اربابِ جنوں کا ہم سفر بھی
ذاکر بھی ہے اور کم سخن بھی
خلوت بھی ہے اور انجمن بھی

اس عید ملاپ کی خوشی میں　　آنسو بھی بدل گئے ہنسی میں
میں سوچ رہا ہوں اپنے جی میں　　شمعوں کی حسیں روشنی میں
ظاہر کردوں بھید یا چھپاؤں
خموش رہوں کہ مسکراؤں

یاد آتے ہیں مجھ کو کچھ فسانے　　وہ انجمنیں وہ آستانے
وہ صحنِ چمن وہ آشیانے　　وہ باغ و بہار کے زمانے
یاد آتی ہیں بھولی بسری باتیں
وہ شام و سحر وہ دن وہ راتیں

جب حسن پہ بے کسی نہیں تھی　　جب عشق نے جان دی نہیں تھی
سازوں میں شکستگی نہیں تھی　　نغموں میں فسردگی نہیں تھی
ساقی کی نظر میں سم نہیں تھا
اندیشۂ بیش و کم نہیں تھا

مبارک باد

شاید ۱۹۵۸ء میں جبل پور فساد ہو،عید ہونے والی تھی ،رمضان المبارک کا آخری عشرہ تھا۔ دل ٹوٹنے کا سلسلہ تو دن رات ہی تھا۔ٹوٹتا تھا لیکن پھر جڑتا نہیں تھا،اب تک خدا جانے دل کے کتنے ٹکڑے ہو چکے ہیں اور ابھی کتنا ٹوٹنا باقی ہے ۔بغیر دل ٹوٹے بات تو بن نہیں سکتی ۔شاعری ہو نہیں سکتی:

غزلوں کے پردے میں بیٹھے میؔر تقی فرماتے ہیں
دل ٹوٹے ہے تب ہونٹوں پر گیت سہانا آئے ہے

تو اس وقت بھی دل ٹوٹا۔اور مصیبت زدوں، مظلوموں ،خون آلودوں کی کراہ عید کے دن مبارک باد بن کر کانوں میں آئی اور میں نے یہ نظم لکھ دی۔شاید کسی پرچے میں بھیج دی۔ وہاں چھپی اور اشاعت کے بعد کتنے میگزینوں اور رسالوں میں چھپی۔ اس وقت سیکریٹری جمعیۃ علماء ہند حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ممبر پارلیمنٹ تھے۔ میں ایک موقع پر ان سے پارلیمنٹ ہاؤس میں ملا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب دو سال بعد میں مرکزی وزارتِ تعلیم میں پی ایچ ڈی کے اسکالرشپ کے لیے آل انڈیا مقابلہ میں بیٹھا تھا۔اردو میں پورے ہندوستان سے سترہ طالب علم و طالبات مقابلے میں تھے۔ اس کے بعد ایک ذریعہ سے میں اجازت نامہ حاصل کر کے پارلیمنٹ میں گیا۔ بہت سے ممبروں کو ایک دوسرے سائبان میں اور صحن میں محو گفتگو پایا۔ایک صاحب بلند و بالا کشمیری پھولدار شیروانی ،سفید ٹوپی اور کام دار ناگرہ جوتے میں ایک صاحب سے محو گفتگو تھے ۔ان کی نمایاں وضع داری دیکھ کر میں نے اپنے رہبر سے پوچھا یہ کون صاحب ہیں؟ میرے رہنما بولے یہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ایم پی ہیں اور مجھے یاد آ گیا کہ میں نے جبل پور فساد کے دلدوز حادثے کے وقت یہ نظم لکھی۔اس زمانے میں کسی اخبار میں حضرت مولانا کی معرکۃ الآرا تقریر پڑھی۔ مولانا نے پورے پارلیمنٹ کے پانچ سو سے زیادہ ممبران کے

سامنے کھڑے ہوکر کیا شیرانہ تقریر فرمائی۔ مولانا نے فرمایا جبل پور فساد کی روشنی میں آپ تمام حضرات سے یہ سوال کرتا ہوں کہ یہ ملک میرا بھی ہے یا صرف آپ کا ہے؟ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ ملک صرف آپ کا ہے تو اس کی زمین سے آپ کہیں کہ وہ خون واپس کردے جو ہم نے اس کے لیے بہایا ہے۔ اور آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آئندہ یہ ملک صرف آپ کا رہے گا؟ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو فوج کو آپ کہیے کہ وہ اپنے بارکوں میں واپس جائے۔ پولیس کو کہیے کہ وہ اپنی رائفلوں کے ساتھ تھانے میں رہے اور تین روز چھوڑ دیجیے۔ جو رہے گا اسی کا یہ ملک ہوگا۔ اخبار میں تھا کہ مولانا جس وقت پارلیمنٹ میں ایمان کی پوری قوت کے ساتھ تقریر فرما رہے تھے تو پانچ سو ممبران ساکت وسامت مولانا کا پُرجلال چہرہ دیکھ رہے تھے اور کسی کی زبان نہ کھلی۔ کہاں ہیں وہ لوگ؟ کہاں گئے وہ لوگ؟ یہ ملک ایسی آواز سننے کا محتاج ہے۔ کس وادی میں، کس کوہسار میں ایسے لوگ چھپ گئے؟ کس سمندر میں ڈوب گئے؟ آج گجرات کے دوزخ میں جنت کی کوئی ایسی چھینٹ ڈالنے والا ہے؟

یہ آدمیوں کی بھیڑ اور ایسا سناٹا
کہ دور دور کوئی آدمی نہیں پیارے

"مبارک باد"

جبل پور سے ایک عید کارڈ آنے پر

(۲۰ ر رمضان المبارک ۱۳۸۰ھ)

یہ عید تم کو اے اہلِ وطن مبارک باد
جمالِ گل رخ و غنچہ دہن مبارک
بہارِ لالہ و سرو و سمن مبارک
یہاں ہے آگ چمن در چمن مبارک باد
تمھارے گیسو ہیں گیسو کے واسطے شانے
تمہارے واسطے آئینے، آئینہ خانے

وہ جگمگاتی ہوئی محفلیں وہ کاشانے
چراغ ہے یہ یہاں انجمن مبارک باد
وہ مسکراتے ہوئے لب وہ چہرۂ شاداب
وہ شیر وشکر وخرمہ، وہ جام و ساغرناب
وہ مشک وعنبر و صدل وعودوعطر وگلاب
لہو سے تر ہے یہاں پیرہن مبارک باد
نصیب ہیں تمھیں آرام وراحتِ بستر
تمھاری آنکھوں پہ رکھی ہے نیند کی چادر
بڑے سکون سے سوئے ہو پاؤں پھیلا کر
یہاں ہے زخم سے چھلنی بدن مبارک باد
جلوس وجشن ، براتیں، تمھیں مبارک ہوں
ہمیشہ چاندنی راتیں تمھیں مبارک ہوں
خرد کی عقل کی باتیں تمہیں مبارک ہوہ
ہمیں جنوں ہمیں دیوانہ پن مبارک باد
وہ طرہ ہائے جواہر، وہ ریشمی دستار
قبائے اطلس و دیبا، کلاہ حاشیہ دار
تمھارے واسطے سامانِ خلعتِ زرکار
یہاں نصیب نہیں ہے کفن مبارک باد

مسافر

شاید ۱۹۵۷ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم بہار کے گورنر بن کر راج بھون آئے۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت ہندستان کی تحریکِ آزادی، ملتِ اسلامیہ کی بہی خواہی، علمی جدوجہد اور اس کے لیے قربانی، دُوراندیشی اور دُور بینی، سچائی اور بے باکی، خطابت اور زورِ بیانی، ادبی اور شعری ذوق اور قدردانی، سخن سنجی اور سخن فہمی اور حصولِ آزادی کے بعد اردو دوستی اور اردو کے لیے معرکہ آرائی کا ایک نادر علمی نمونہ تھی۔ وہ بہار کے گورنر بن کر آئے تو بہار میں تحریک اردو کے علمبرداروں میں کچھ نئی اُمنگیں اور آرزوئیں انگڑائیاں لینے لگیں۔ بزم سخن سائنس کالج پٹنہ کا سالانہ اجلاس ہونے لگا۔ پروفیسر ڈاکٹر احسانؔ جلیل صاحب بزمِ سخن سائنس کالج کے صدر تھے اور مجھ سے بے حد مانوس تھے اور ہیں۔ وہ اپنے موضوع کے ایک متبحر معلم اور میں اردو کا ایک معمولی طالب علم، درد کا ستایا، غموں کا کھویا کھپایا۔ اس لیے اس دور کے دردمند اور شعروادب کے اہلِ ذوق بزرگی اور خوردی کے فرق کو الگ کر کے مجھ سے اپنے دوستوں جیسی محبت کرتے تھے۔ ڈاکٹر احسان جلیل صاحب بے حد بضد کہ تمھیں بزم سخن کے سالانہ جلسہ کے لیے نظم لکھنی ہے جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا جو اس دن صدر ہوں گے منظوم استقبال کرنا ہے۔ اس دور میں مشاعرے کے جلسوں میں خوب جایا کرتا تھا، غزلیں پڑھتا تھا۔ پٹنہ کالج بزمِ ادب، سائنس کالج بزم سخن، اور بی این کالج بزم اردو۔ ان تین انجمنوں کا گویا محبوب ترین اور دل پسند ترین شاعر تھا اور یہ تین ادارے گویا اس دور کے عظیم آباد کی ادبی اور شعری شناخت کی کسوٹیاں تھے۔ جو ان تینوں جلسوں میں کسی ایک میں بھی آیا اس نے گئی گذری عظیم آبادی شعری وادبی ساکھ اور معیار کا لوہا مان لیا، اور کھلے عام یہ اعتراف کرتا ہوا گیا کہ جو نگاہ پٹنہ والوں کی ہے وہ اس وقت ہندستان میں کہیں نہیں۔ ان تینوں اردو انجمن کے سامعین تو مشترک تھے۔ طلبا بھی اساتذہ کی نگاہ

شناسی میں مشہور تھے۔ پروفیسر حافظ شمس الدین صاحب، پروفسر المنان صاحب بیدلؔ کے تربیت یافتہ صاحبانِ ذوق اساتذہ موجود تھے۔ شادؔ، آزادؔ، باقرؔ، اثرؔ کے پسماندہ تلامذہ عظیم آباد کی گلیوں سے جھانک کر اشارے کردیا کرتے تھے اور عظیم آباد کے جوان ان اشاروں سے مسلح ہوکر مشاعروں میں آتے تھے، شاہ جھبو بسملؔ، زارؔ عظیم آبادی، ثاقبؔ عظیم آبادی، غضنفرؔ نواب دانشؔ، ہوشؔ عظیم آبادی کے سینوں میں چھپی ہوئی چنگاریاں محفلوں کو جگمگا دیتی تھیں۔ ولیؔ الرحمٰن ولی عظیم آبادی، عطاء الرحمٰن عطاؔ کاکوی، ڈاکٹر اخترؔ اورینوی، پروفیسر سیّدؔ حسن، پروفیسر سیّد حسن عسکری، خود اور ان کے صحبت یافتہ اور تربیت یافتہ طلبا اور ان کے قریب کے ادب شناس اور سخن فہم اہلِ علم سے اس وقت بھی عظیم آباد نگار خانۂ چین بنا ہوا تھا۔ پروفیسر نواب کریم، پروفیسر ذکی الحق، پروفیسر صدرالدین فضاؔ شمسی، پرفیسر جمیل مظہری ادب و شعر کے کھونٹے موجود تھے اور سب ان کھونٹوں سے بستہ اور وابستہ تھے۔ مختصر یہ کہ ان تینوں اداروں نے گئے گذرے عظیم آباد کا وقار کچھ نہ کچھ سنبھال رکھا تھا۔

تو خیر پروفیسر احسانؔ جلیل صاحب نے مجھے نظم لکھنے پر آمادہ کیا۔ میں نے وعدہ تو کرلیا مگر طبیعت کا جائزہ لیا تو سوچنے لگا کہ اس نظم نگاری کی مہم سے کیسے گذروں گا؟ ذاکر صاحب کی ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کا تأثر تو بھرپور تھا لیکن مدح جس نوع کی مطلوب تھی اور جو مدح اس دور کا رواج تھا، یا مدح سے جو تصوّر مداحی کا ابھرتا تھا وہ میرے مزاج اور طبیعت کے موافق نہیں۔ میں نے نظم کہنے کی کوشش کی اور اس کوشش کا جو ثمر برآمد ہوا وہ یہ نظم ہے۔

'مسافر' سے مراد اہلِ اردو ہیں، اہلِ اردو سے میری مراد وہ اہلِ عشق، اہلِ جنوں، اہلِ محبت، اہلِ درد، اہلِ نگاہ، صاحبانِ فکر و نظر، بردبار، مستغنی اور بے نیاز شعراء اور ادیب ہیں جنھوں نے اردو زبان، ادب اور شاعری سے ایسی محبت کی کہ اس محبت میں اپنی زندگی کی روح کی تمام توانائیاں اور ظاہر و باطن کا تمام جوہر سمو دیا۔ اب نہ ایسے اہلِ درد ہیں، نہ ایسے اہلِ ادب، نہ ایسے اہلِ شعر و سخن، تو گویا ماحول تو وہ ہے جس میں آزادی کے بعد اردو بیوہ اور بے کس بنادی گئی ہے۔ اس کا کوئی پرستار نہیں کوئی جان نثار نہیں اور اردو کا مزاج وہی شاہانہ، صوفیانہ، عارفانہ اور قلندرانہ، یہ مزاج بھیک کیسے مانگ سکتے ہے؟ اپنی پرورش کی درخواست کیسے کرسکتا ہے؟ اور جس سے مانگنے کو کہا جاتا وہ بھی تو کوئی ایسا صاحبِ اختیار غزنوی نہیں جو ہر شعر پر ایک اشرفی دے ہی

دے۔اُردو کو اس کا جائز مقام مفت عطا کر ہی دے۔اِدھر اُردو کا مزاج شاہانہ، بے نیازانہ اور قلندرانہ، درویشانہ اور خسروانہ، اُدھر تختِ غزنوی پر بیٹھے ہوئے مانگے کی حکمرانی کرنے والے کی غرض مندانہ زندگی جس کے سامنے تقاضائے موسم بھی اور لحاظِ جیب و دامن بھی۔موسم کچھ اور اشارہ کرتا ہے اور حفاظتِ جیب و دامن کچھ اور سرگوشیاں کرتی ہے۔رند کچھ اور کہہ رہے ہیں اور نگاہِ پیرمغاں کچھ اور کہتی ہے۔اِن دونوں پاٹوں کے بیچ میں 'ساقی' یعنی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نظر آرہے تھے اور میں اس کشمکش میں کہ اپنا مزاج مدح وقصیدہ کا نہیں اور مزاج بنایا بھی جائے تو اس کا حاصل کیا ہے؟ ڈاکٹر ذاکر صاحب کیا کرسکیں گے،اس کشمکش نے 'مسافر' نظم لکھوائی کہ یہ 'مسافرِ اردو' اپنی مستی بھری چال سے ٹھوکریں کھاتا ہوا لیکن شاہانہ تیور سے اور مدبرانہ رفتار سے، عارفانہ نگاہ سے، قلندرانہ شان سے گذر رہا ہے دیکھتا ہوا، پرکھتا ہوا، جانچتا ہوا، فیصلہ کرتا ہوا، قدرو قیمت بتاتا ہوا۔وزن اور مقدار کی نشان دہی کرتا ہوا، آواز لگاتا ہو، پکارتا ہوا۔آواز گدایانہ ہے مگر بات شاہانہ ہے، لباس فقیرانہ ہے مگر مزاج شاہانہ ہے۔ پتے کی بات کہتا ہوا، دعوت دیتا ہوا۔ارادے، نیت اور عمل کا اظہار کرتا ہوا۔اپنا منصب ومقام بناتا ہوا، اپنا منصوبہ، اپنا مقصد، اپنا پیغام واضح کرتا ہوا، آزماتا ہوا، امتحان لیتا ہوا، نتیجہ پیش کرتا ہوا۔

ہر شعر میں ایک پوری دُنیا ہے، ہر منزل کی تصویر ہے، ہر منزل کا جائزہ ہے اور فیصلہ ہے، لیکن مسافر کی منزل نہیں آتی،اس کی تلاش پوری نہیں ہوتی اور شاید پوری نہیں ہوسکے گی، مسافر کا سفر ختم نہ ہوگا، تلاش نہ رُکے گی، آواز بند نہیں ہوگی، پکار نہ چھوٹے گی۔اہلِ عشق نہ کبھی مرتے ہیں نہ تھکتے ہیں۔یہ تو ایک دوامی سفر ہے،ایک کبھی نہ ختم ہونے والی تلاش ہے، ایک کبھی نہ آسودہ ہونے والی جستجو۔یہ سفرِ ارتقا ہے،اس کی آخری منزل کوئی نہیں۔راستہ بنانا اس کا کام، منزل تخلیق کرنا اس کا مقصد اور تاریکیاں روشن کرتے جانا اس کا منصب ہے۔

درمیان میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کی سچی شخصیت ہے اور یہ شخصیت کہاں کہاں بنی اور کیسے کیسے اونچی اٹھی چند زینوں کی طرف اشارہ ہے، اور آخر میں یہ مقطع ہے کہ آپ گورنر ہیں صوبے کے،سب سے بااختیار شخصیت ہیں ہیں، آپ اس محفل کے ساقی ہیں۔دیکھیں ساقی گری کا صحت مند اور پروقار منصب آپ کیسے ادا کرتے ہیں،اس منصب کا پاس لحاظ کیا ہے۔ہم ذرا سا تماشہ دیکھیں گے۔ہم تو مسافر ہیں۔ہم تو اپنا چراغ جلاتے رہیں گے،آپ چراغ کی

حفاظت کرسکیں تو کریں۔ ہم تو آگے بڑھ جائیں گے، بڑھتے جائیں گے، گیت گاتے ہوئے، اپنی کنڈی کھٹکھٹاتے ہوئے، اپنا جام اُچھالتے ہوئے، صندان بجاتے ہوئے۔

تھکتے نہیں ہیں ہم کہ مسافر ہیں عشق کے
چاہے طویل راہ ملے مختصر ملے

مسافر

یوں تو قدم قدم پہ شریکِ سفر ملے
رہرو ملے، رفیق ملے، راہبر ملے

گو شیخ زادے اور برہمن پسر ملے
سب آستیں دراز ملے، کم نظر ملے

جتنے بلند، جتنے تناور شجر ملے
بے شاخ، سایہ دار ملے، بے ثمر ملے

جتنے رفاہِ عام کے پیغامبر ملے
خود بیں وخود نواز ملے خود نگر ملے

اہلِ خبر تو اور بھی کچھ بے خبر ملے
نزدیک تر جو سمجھے گئے دُور تر ملے

اربابِ ذی وقار کا تو پوچھنا ہی کیا
جتنے بلند بام ملے تنگ در ملے

ملنے کو اِک نظر بھی نہ درد آشنا ملی
کہنے کو کیسے کیسے وسیع النظر ملے

....

ہم تو نہ شیخ ڈھونڈ رہے ہیں نہ برہمن
ہم تو بشر کو ڈھونڈ رہے ہیں بشر ملے

جو ہم تلاش کرتے ہیں جو چاہتے ہیں ہم
جانِ عزیز بیچ کے لے لیں اگر ملے

ہم چاہتے ہیں مست جو ہیں ہوشیار ہوں
ہم چاہتے ہیں بے خبروں کو خبر ملے

ہم چاہتے ہیں پیاس کا احساس ہی نہ ہو
دو گھونٹ ہی بلا سے ملے عمر بھر ملے

ہم چاہتے یہ ہیں کہ چلے پھر ہوائے درد
منہ میں مٹھاس آئے، زباں میں اثر ملے

ہم چاہتے ہیں کام محبت کا عام ہو
ہاتھوں میں ہاتھ آئے نظر سے نظر ملے

پتھر دلوں کو بھی تو لگے چوٹ عشق کی
کچھ تو انھیں بھی لذّتِ دردِ جگر ملے

....

مدت سے کاروانِ خرد کو تلاش تھی — اک رہبرِ جنوں ملے اور معتبر ملے
مدت پہ جستجوئے نظر کا مراں ہوئی — مدت پہ ایک قدر شناسِ گہر ملے
اب ایک دھوم قافلہ والوں میں ہے کہ ہاں — ایسا ملے رفیق کسی کو اگر ملے
اس کی نگاہ دوربیں کیوں کر نہ ہو جسے — سیّدؔ کی بارگاہ سے فکر و نظر ملے
جس کو رہا ہے خاکِ علی گڑھ سے واسطہ — اس شعلۂ عظیم سے جس کو شرر ملے
جس کو وہاں کی دھوپ حرارت دے شوق کی — جس کو وہاں کی چھاؤں سے ذوقِ نظر ملے
جس کو وہاں کی خلوت وجلوت نصیب ہو — جس کو وہاں کی شام وہاں کی سحر ملے
رہبر ہو جس کا اکبرؔ و اقبالؔ کا شعور — حالیؔ سے جس کو تحفۂ سوزِ جگر ملے

جس میں مسیحِ ملک نے پھونکی ہو روحِ فن
جس کو ابوالکلامؔ سے درسِ ہنر ملے

....

ہم تو کشادہ قلب، کشادہ مزاج ہیں — ہم کو تو راہ میں جو ملا دوڑ کر ملے
ہم چاندنی کے شوق میں پھرتے ہیں بیقرار — شاید کہیں سے کوئی شعاعِ قمر ملے
اس ظلمتِ جمود میں تکتے ہیں ہر طرف — دیکھیں کہاں چراغ سرِ رہ گزر ملے
ہم تو فقیرِ عشق گدائے خلوص ہیں — اس کی ہوس نہیں زر ولعل و گہر ملے
ہم کو تو اتنا اپنی حمیت پہ ہے غرور — ٹھوکر لگا دیں دولتِ قاروں اگر ملے
مرتے ہیں اس لیے کہ رہے زندہ نامِ عشق — اس واسطے نہیں کہ کوئی نوحہ گر ملے
دشوارئ حیات کا شکوہ ہو کیوں ہمیں — ہم کو ملا ہے سر تو کسے دردِ سر ملے
غم تو غذائے روح ہے اس سے گریز کیا — جس سے ملے جہاں سے ملے جس قدر ملے
تھکتے نہیں ہیں ہم کہ مسافر ہیں عشق کے — چاہے طویل راہ ملے مختصر ملے
دیتے پھریں گے ہم تو صدائے وفا ضرور — جس کا بھی آستانہ ملے جس کا گھر ملے

اپنا یہ کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ
رستے میں خواہ دوست کہ دشمن کا گھر ملے

فضلِ حق آزادؔ

شمس العلما حافظ فضلِ حق آزادؔ ضلع کے مشہور گاؤں شاہو بگہہ میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں جہاں آباد سے تقریباً دس بارہ میل ایسے راستے پر ہے جہاں چالیس برس پہلے کوئی سڑک بھی نہ تھی، سواری گھوڑے کی ہوتی تھی۔ زیادہ لوگ پا پیادہ آتے جاتے تھے۔ تقریباً اڑتیس سال قبل میں اس گاؤں میں گیا، اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لئے، آزادؔ پر مواد حاصل کرنے کے لیے تو جہان آباد سے امتھوا شریف تک کچی سڑک پر اس طرح چھوٹی سی لاری پر سفر ہوا کہ امتھوا پہنچتے پہنچتے شکل پہچانی نہیں جاتی تھی۔ پورا جسم شیروانی، پاجامہ، ٹوپی، چہرہ گرد سے لپا ہوا تھا۔ امتھوا پہنچ کر شاہ طٰہٰ صاحب مرحوم کے یہاں غسل کیا، کپڑے بدل کر پھر ایک رہبر کے ساتھ غالباً کسی دیہاتی سواری پر شاہو بگہہ پہنچے۔

ایسے دیہات ایسے گاؤں جہاں خبریں بھی نہیں پہنچتی تھیں، راستے ہی میں تھک کر رہ جاتی تھیں کہ خبریں پہنچانے والے ہی مسافت برداشت کرنے سے رہ جاتے تھے۔ ایسے گاؤں میں رہ کر سیّد فضلِ حق نے تعلیم حاصل کی۔ حافظ بنے، قاری بنے، ادیب بنے، مقرر بنے۔ ایسے ادیب ایسے شاعر بنے کہ نواب سائلؔ دہلوی جانشینِ داغؔ دہلوی جب پٹنہ تشریف لائے تو مشاعرے میں پہلے شعر ارشاد فرمایا:

حاجب باب اثرؔ بندۂ آزادؔ آیا
سائلؔ آیا نہ کہو معتقدِ شادؔ آیا

مجھے نواب سائلؔ جانشینِ داغؔ دہلوی نہ کہو، یہ کہو کہ امداد امام اثرؔ عظیم آبادی کے در کا دربان آیا۔ فضلِ حق آزادؔ کا غلام آیا۔ شادؔ کا عقیدت مند آیا۔

دورِ متوسطہ عظیم آباد کے تین صاحبِ کمال شادؔ، آزادؔ اور اثرؔ دورِ جدید کے آغاز کرنے

والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ شادؔ نے لکھنؤ کے زوال کے بعد غزل کو نئے آہنگ سے آراستہ کر کے بھٹکے ہوئے قافلے کے لیے کشش پیدا کی اور قافلہ اس ارتقا کی راہ پر چل پڑا جس میں حسرتؔ موہانی لکھنوی، صفیؔ لکھنوی، ثاقبؔ لکھنوی قافلہ سالاروں میں ہیں۔ نظم میں آزادؔ نے یعنی حافظ فضلِ حق آزادؔ نے نظیرؔ اکبرآبادی، غالبؔ اور اقبالؔ کو سمولیا۔ شاید تمام اصنافِ شاعری ملحوظ، نظم میں آزاد جیسا پُرگو، زودگو، صاف گو پورے ہندستان نے اقبالؔ کے بعد اب تک پیدا نہ کیا۔ آزادؔ نے تقریباً ۷۰ برس شاعری کی۔ قدیم و جدید رنگ و آہنگ کو مذہبی، اخلاقی، سماجی، سیاسی، شاعری میں کمال اور ہنرمندی، تاثیر سے سمولیا۔ آزادؔ پر پی ایچ ڈی ہو چکی ہے، تفصیل میرے لئے ضروری نہیں۔ یہ نظم میرے کسی دوست نے میرے یہاں آ کر بیٹھ کر فرمائش کی کہ ابھی پڑھنا ہے اور پھر گلدستۂ آزاد نمبر میں شائع کرنا ہے۔ میں بیٹھا ہوں تم لکھ دو۔ چنانچہ ڈھائی تین گھنٹے کا وقفہ ملا۔ بات شاعری میں سچی کہنی چاہئے۔ ایک بات یہ پیش نظر اس نظم کے لکھتے وقت تھی کہ تعریف یا تنقید میں اعتدال بنیادی اور مرکزی شرط ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ آزاد کے متعلق مستند اور جچی تلی حقیقت پیش کر دینا چاہئے جس سے کسی کو گنجائشِ انکار نہ ہو۔ انھیں دو باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر چھ بند، اٹھارہ شعر کی یہ نظم فی البدیہہ کہہ دی گئی تھی۔

فضلِ حق آزاد

(ایک ناتمام نظم جو صرف تین گھنٹے میں لکھی گئی)

زبان چلا نہ زیادہ بہت نہ بول کے چل — مزہ ہی تلخ ہو اتنی شکر نہ گھول کے چل
تو راہِ حق کا مسافر ہے آنکھ کھول کے چل — قدم سنبھل کے بڑھا پاؤں تول تول کے چل

زباں اگرچہ کلیدِ درِ بہشت بھی ہے
دراز ہو تو یہی سنگ بھی ہے خشت بھی ہے

سخن وہ چھیڑ کوئی بانکپن رہے جس میں — اٹھا وہ پردہ اچھوتی دلہن رہے جس میں
وہ پھول گوندھ بہارِ چمن رہے جس میں — وہ شمع لا تپشِ انجمن رہے جس میں

اگر نہ فرقِ مراتب کا تجھ کو ہوش رہے
تو بولنے سے ہے بہتر کہ تو خموش رہے

یہ شہر اہلِ کمالات، یہ عظیم آباد　　یہ سجدہ گاہِ تمنا یہ قبلہ گاہِ مراد
یہ حادثات کا محور یہ مرکزِ بیداد　　زمین جس کی ستمگر ہے آسماں جلاّد
جہاں کتاب تو سڑ جاتی ہے ڈھول بکتا ہے
گہر بھی لاؤ تو کوڑی کے مول بکتا ہے

یہیں کا ایک ہنر مند فضلِ حق آزاد　　قلم کو جس کے ملا زورِ بازوئے فرہاد
کیا وہ چشمۂ تجدید فکر و فن ایجاد　　ہے جس سے شہرِ سخن کی گلی گلی آباد
ہر ایک رخ میں طبیعت کی وہ روانی ہے
کہ جس کے آگے سمندر بھی پانی پانی ہے

نظر حسین، تخیل وسیع، فکر بلند　　مشاہدات کی دنیا نظیرؔ سے دو چند
زبان عروض و قواعد کی ہر طرح پابند　　بیاں کچھ ایسا سبک جیسے خوش خرام سمند
ہر اِک قدم پہ صفائی کا، سادگی کا لحاظ
جچے تلے ہوئے جملے جچے تلے الفاظ

حیات خدمتِ فن میں گزار دی اس نے　　تخیلات کی دُنیا سنوار دی اس نے
کلاہِ کہنۂ تقلید اتار دی اس نے　　قدیم فکر کو تازہ بہار دی اس نے
نئے خیال سے روشن کیے دماغ اس نے
قدم قدم پہ جلائے نئے چرغ اس نے

پنڈت جواہر لعل نہرو

اس نظم کے محرکِ خارجی بھی مسٹر پرملاّ چندر سابق پروگرام انچارج آل انڈیا ریڈیو شعبۂ ہندی اُردو ہیں، وہ پنڈت جواہر لال کی زندگی میں بھی ایک نظم نما غزل مجھ سے لکھوا کر لے گئے۔ وطن ہندوستان پر نظم لکھوا کے لے گئے اور اُن کے انتقال کے دن ہی شام کو میرے گھر میں آ کر بیٹھ گئے اور پوری قوت سے مجھے یہ نظم لکھنے پر مجبور کر ہی دیا اور میں نے بھی پوری قوتِ شعری اس وقت بے ساختہ استعمال کر کے اسی دن نظم لکھ دی۔

میں پنڈت جواہر لال نہرو کو صرف دو بار دیکھا۔ ۱۹۴۵ء میں جب وہ قلعہ احمد نگر سے رہا ہوئے۔ پٹنہ بھی آئے اور لان کے میدان میں مجمع ہوا۔ اور مسٹر نہرو نے اونچے مقام پر کھڑے ہو کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں سنجیدہ تقریر کی۔ میں نے کسی کتاب میں اس تقریر کا ماحول شاید لکھا ہے۔ مجھے پنڈت نہرو ایک بڑے سیاسی لیڈر کی بجائے ایک بہت شائستہ، خوش سلیقہ، خوش رو اور خوش لباس رئیس لگے۔ وہ دورانِ تقریر اکثر خوبصورت ترشی اور سلی ہوئی خوش رنگ شیروانی کی جیب سے سفید رومال نکالتے، ناک ہونٹ صاف کرتے اور ایسی اُردو جس اُردو کا میں شائق تھا اور رہا اور ہوں ایسی ہی خوبصورت اُردو میں وہ بے تکلف گفتگو یا تقریر کر رہے تھے۔ اور دوسری بار وہ اپنے عہدۂ وزارتِ عظمیٰ کے دوران پٹنہ آئے تھے اور اشوک راج پتھ سے ان کا جلوس بالکل میرے مکان اور دُکان کے سامنے سے گزرا۔ وہ ویسی ہی خوبصورت شیروانی اور اسی رنگ کی گاندھی کٹ نہیں نہرو کٹ ٹوپی اور چست پاجامہ میں ایک کھلی ہوئی موٹر میں شیشہ پکڑے ہوئے کھڑے سلام لیتے اور سلام کرتے ہوئے گزر رہے تھے اور ٹھیک میری دُکان کے چبوترے کے سامنے ایک واقعہ ہوا۔ مسٹر نہرو سیاست میں جو ہوں میں اس سلسلے کی رائے دینے سے بالکل قاصر ہوں۔ سیاست کی سمجھ بوجھ مجھے اس وقت بھی نہیں ہے پینتالیس سال پہلے کیا ہوگی۔ مگر سر تیج بہادر سپرو، اور موتی لعل نہرو وغیرہ کے دور میں الٰہ آباد، لکھنؤ، دہلی یا عظیم آباد میں جو خالص منفرد تہذیبی روایت تھی، خواہ معاشرت کے اعتبار سے خواہ زبان و ادب کے لحاظ سے، اس

ماحول کا شاید آخری نمونہ پنڈت نہرو تھے۔ وہ نمونہ دلکش تھا، دلنشیں تھا، بہت خوب اور بہت پیارا تھا۔ اور اب تو اس پر اور زیادہ پیار آتا ہے۔ وہ گزر چکا، معدوم ہو چکا بلکہ مرحوم ہو چکا کہیے۔ تو اس لحاظ اس وقت میں نہرو جی کو اس تہذیبی روایت کے آئینے میں دیکھ رہا تھا اور جو پیار میرے ذہن میں اس تہذیب کے لیے اس وقت تھا وہ نگاہوں کے آگے آ گیا، مجمع بہت زیادہ نہ تھا۔ گاڑی بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور پولیس آفیسرس گاڑی کے اِردگرد پاپیادہ مجمع کو ہٹاتے ڈانٹتے اور ایک طرف کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ ایک پولیس آفیسر نے شاید ایس پی ہوگا ایک ہاتھ میں چھوٹا ڈنڈا لیے ہوئے قریب آتے ہوئے مجمع کے کسی فرد کی پشت پر زور سے ڈنڈا لگا کر اسے دھکیل دیا۔ مجھے یاد نہیں پنڈت نہرو کی عمر اس وقت کیا ہوگی، مجھے وہ سال بھی یاد نہیں جب وہ پٹنہ آئے تھے، ممکن ہے ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء ہو۔ وہ دیکھنے میں تو ویسے ہی لگ رہے تھے جیسے دس پندرہ سال پہلے سے تصویروں میں لگ رہے تھے۔ قد متوسط، بدن گول، یقیناً پچپن سال کے تو ہوں گے۔ مسٹر نہرو نوجوانوں کی سی پھرتی سے موٹر کا شیشہ چھوڑ کر سڑک پر کودے اور اس پولیس کا ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھین کر اس کی کمر پر دو ہاتھ کس کر لگایا۔ وہ لڑکھڑایا، گرا تو نہیں، پنڈت جی نے ڈنڈا ہاتھ میں لیے زور سے ڈانٹا پھر ڈنڈا اس پر پھینک کر موٹر پر سوار ہو کے شیشہ پکڑ لیا۔ ان کا چہرہ طیش یا قہر میں تو نہ تھا مگر بے حد سنجیدہ اور متحمل نظر آیا۔ مجمع نے ''پنڈت نہرو زندہ باد'' کا نعرہ زور سے لگایا اور موٹر آگے چلی۔ وہ پولیس کچھ کھسیانا، کچھ شرمندہ، کچھ خوف زدہ ہو کر پھر گاڑی کے ساتھ ساتھ چلا۔

پنڈت نہرو سے مجھے اُنس تھا، وہ اُنس جو ایک اچھے نمونے کے شائستہ، صاف، پڑھے لکھے، باقاعدہ مہذب، باادب، باضابطہ، بااصول، مخلص اور بے تکلف انسان سے ہونا چاہیے۔ میرا بچپن اور میری نوجوانی ایسے ہی انسانوں کی صحبت اور چاہت میں گزری تھی۔ ایسے انسان کے دُنیا سے یک بیک اُٹھ جانے کا غم مجھے بھی تھا اور اس کا غم بھی تھا کہ ملکی سطح پر کوئی دوسرا انسان ان کی جگہ لینے کو باقی نہ تھا۔ تو دل کو ایک بہت حسّاس دھکا لگا تھا اور پھر اس خبر کے ساتھ دہلی میں مختلف سطحوں پر غم کی جو کیفیت ریڈیو سے نشر ہو رہی تھی وہ میرے ذہن میں خوب گونج رہی تھی، اور پٹنہ پر بھی یک بیک سنّاٹگی کا جو عالم طاری ہوا، بازار بند ہو گئے، لوگوں پر افسردگی کا عالم تھا، وہ پوری پوری خارجی اور داخلی کیفیت جو میں نے خود محسوس کی، دیکھی اور سُنی وہ میرے قلم سے تقریباً قلم برداشتہ کاغذ پر ڈھل گئی۔ جذبات اس نظم میں صرف ایک بند میں ہیں:

منزل تک پہنچا کے سب کو کس کا قدم منزل سے اٹھا

اس بند کے چھ مصرعے اس پوری نظم کی تصویریت کے نتیجے میں تخلیق ہوئے ہیں۔ یہ میری اپنی شاعرانہ ترجمانی ہے اس پوری فضا اور ماحول کی جن کی محاکاتی ترجمانی دوسرے تین بندوں میں ہے۔ ان تین بندوں میں وہی مناظر آئے ہیں جو پنڈت نہرو کے مرنے کی خبر سن کر پورے شہر میں رونما ہوئے، جن کی تصویر ریڈیو یا صبح ہی کے اخبار میں آئی۔

مرثیہ جواہر لال نہرو

(جواہرلال نہرو کی موت پر)

وقت کی زُلفیں اُلجھی اُلجھی چشمِ زمانہ پرنم ہے   دُنیا دُنیا چوٹ گئی ہے صدمہ عالم عالم ہے
خلوت اُجڑی اُجڑی سے ہے محفل درہم برہم ہے   آنگن آنگن سوگ مچا ہے دیوڑھی دیوڑھی ماتم ہے
سونی سونی شہر کی گلیاں سناٹا گلزاروں میں
لٹی لٹی سی ہیں دوکانیں کوئی نہیں بازاروں میں
منزل تک پہنچا کر سب کو کس کا قدم منزل سے اٹھا   موجیں چھاتی پیٹ کے روئیں شور لبِ ساحل سے اٹھا
آنسو ہر ایک آنکھ سے ٹپکا اور دُھواں ہر دل سے اٹھا   پیار کا بندھن کس نے توڑا کون بھری محفل سے اٹھا
آہوں کی آندھی چلتی ہے شنکھ پُھنکا ہے نالوں کا
بازو تھر تھر کانپ رہا ہے دامن تھامنے والوں کا
چپ چپ سے احباب کھڑے ہیں اپنی اپنی بات لیے   سینوں میں طوفان چھپائے آنکھوں میں برسات لیے
جاتا ہے اک دُکھیارا ہی سب سکھ کے دن رات لیے   دہنے بائیں اس دھرتی کے پھولوں کی سوغات لیے
آن وہی ہے مرنے پر بھی شان جو تھی کل جینے میں
ہلکی ہلکی مسکاہٹ ہے ہونٹوں کے آئینے میں
بھیڑ کھڑی ہے دروازوں میں سڑکوں پر گلیاروں میں   'نہرو امر ہو' گونج ہے ہر سو دہلی کے بازاروں میں
ارتھی ہولے ہولے نکلی آشیرواد کے دھاروں میں   کونے کونے ذکر یہی ہے نئے پرانے یاروں میں
دیش کی دنیا کا رکھوالا دل کی دنیا لوٹ گیا
ایسا ساتھی پھر نہ ملے گا جیسا ساتھی چھوٹ گیا

حسن عسکری صاحب کی موت پر

سیّد حسن عسکری صاحب ملک کے مانے ہوئے تاریخ داں، اُردو، فارسی، عربی قدیم مخطوطات کے بلاشرکتِ غیرے عالم اور ماہر۔ ان کے معرکۃ الآرا تحقیقی مضامین خدا جانے ملک اور بیرونِ ملک کہاں کہاں پڑھے گئے، کہاں کہاں چھاپے گئے۔ شاید لوگ عسکری صاحب پر تحقیق کریں۔ میں نے اتنا سادہ انسان، اتنا بے تکلف انسان، اتنا منکسر المزاج اور مخلص انسان اور تاریخ کا عظیم ترین عالم ہونے کے ساتھ اُردو فارسی شاعری کا ایسا صاحبِ ذوق نہیں دیکھا۔

ان کا انتقال ہوا تو ان کے صاجزادے چند بار میرے پاس تشریف لائے کہ تین چار اشعار کا ایک قطعہ لکھ دو۔ معلوم نہیں ان کے ذہن میں تین چار اشعار کا کیا مصرف تھا۔ میں نے لکھ کر پیش کر دیا۔ اس وقت سے آج تک نہیں معلوم اس کا استعمال کیا ہوا۔ تین اشعار کے چھ مصرعوں میں ان کی صفات کا خلاصہ شعریت اور بلاغت کے اہتمام کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے:

۱۸۵

ذوقِ افسانۂ ماضی نہ رہا میرے بعد
کوئی تاریخ کا ماہر نہ ہوا میرے بعد

عسکری ! میں تو چلا جاتا ہوں اب لوگ کہاں
پوچھنے جائیں گے منزل کا پتہ میرے بعد

آئینے راہ میں یوں ہی پڑے رہ جائیں گے
کون پہچانے گا نقشِ کفِ پا میرے بعد

حضرت رضا علی وحشتؔ

استاذی جمیل مظہریؔ کی مجھ پر بزرگانہ شفقت بھی تھی۔ میرے مہربان بھی تھے میرے قدرداں بھی۔ انھیں میرے خلوص کا اعتماد بھی تھا، میرے فن کا اعتراف بھی اور میرے اعتقاد پر بھروسہ بھی تھا. وہ سمجھتے تھے کہ یونیورسٹی کے تمام شاگردوں میں کلیم سب سے زیادہ سعادت مند ا باادب اور باتمیز ہے۔ اسی لیے وہ مجھ سے وہ بات بھی کہہ دیتے جو کسی اور سے نہیں کرتے۔ چنانچہ علامہ رضا علی وحشتؔ کلکتوی جو اسلامیہ کالج کلکتہ کے معزز مدرس اور جمیل صاحب کے استادِ علم اور استادِ فن رہے ہیں، کا انتقال ہوا تو پٹنہ یونیورسٹی میں یومِ وحشتؔ منایا گیا اور جلسہ سے ایک دن پہلے انھوں نے مجھ سے بے تکلف کہہ دیا کہ تم کوئی مختصر نظم لکھ ڈالو۔ انھوں نے کسی سے نہیں کہا نہ اور کوئی دوسری نظم پڑھی گئی، نہ خود انھوں نے کوئی نظم لکھی۔ میں جانتا تھا کہ علاّمہ وحشتؔ مرحوم سے انھیں کس قدر عقیدت ہے، اور ان کی عقیدت نے مجھے بھی عقیدت مند بنادیا۔ گرچہ میں نے علامہ وحشتؔ مرحوم کو صرف ایک ہی بار دیکھا وہ بھی دس گیارہ سال کی عمر میں، مگر جمیل صاحب کی شخصیت ادب و شعر کی دنیا میں ویسے بھی باعظمت اور معزز تھی۔ میں نے خود کو جمیل صاحب کی شخصیت میں ڈھال دیا ان کا تعلق خاطر میرا قلبی لگاؤ بن گیا اور میں نے اسی سبب بے اختیار اور بے ساختہ تین بند کی یہ مختصر نظم کہہ ڈالی اور جمیل صاحب نے جلسۂ یومِ وحشتؔ میں مجھے گلے سے لگالیا۔ تین بند کے نو اشعار میں علامہ مرحوم کی شخصیت، ان کی حیثیت، ان کے ماحول اور ان کے رخصت کے اثرات کی تصویر کھینچ دی۔ علامہ وحشتؔ کا صاحب طرز استادفن کی حیثیت سے بنگال میں وہی مقام تھا جو شادؔ عظیم آبادی کا عظیم آباد میں، اس لحاظ سے کہ شادؔ صاحب کا بھی بہت مؤثر اور وسیع حلقہ تھا عظیم آباد میں اور وحشتؔ صاحب کا بھی حلقۂ سخن کلکتہ سے ڈھاکہ تک پھیلا ہوا تھا۔ جس طرح شادؔ نے منفرد شاگردوں کا ایک کارواں اپنے پیچھے چھوڑا۔ علامہ وحشتؔ نے بھی بنگال میں صاحبِ طرز تلامذہ کا ایک حلقہ چھوڑا۔ فرق یہ ہے کہ شادؔ کا رنگ عالم گیر ہوگیا۔ علامہ وحشتؔ کی

میراث ان کے شاگردان سنبھال نہ سکے۔اسی لیے کہا گیا ہے کہ:

خشک نخلِ فکر کی ایک ایک ڈالی ہوگئی
گلستانِ شاعری کی جیب خالی ہوگئی

علّامہ وحشت کلکتوی کی وفات پر

(جمیل صاحب کی فرمائش پر)

چند دن سے کس قدر مدھم ہے آوازِ جنوں
چوٹ وہ پہنچی کہ تھرّانے لگا سازِ جنوں
کون دے اب شاعروں کو درسِ پروازِ جنوں
اُٹھ گیا بزمِ جنوں سے واقفِ رازِ جنوں

جب سے تو اے بلبلِ شیریں نوا خاموش ہے
گلشنِ بنگال کی ساری فضا خاموش ہے

موسمِ گل سے ادائے گلشن آرائی گئی
سبزہ پوشانِ چمن کی جامہ زیبائی گئی
پھول سے خوشبو گئی شاخوں سے انگڑائی گئی
تیرے جاتے ہی چمن کی ساری رعنائی گئی

خشک نخلِ فکر کی ایک ایک ڈالی ہوگئی
گلستانِ شاعری کی جیب خالی ہوگئی

گردنِ مینا خمیدہ دیدۂ ساغر پُرآب
پابہ گل جام و صراحی دم بخود موجِ شراب
کون لے گا بیش وکم کا بادہ خواروں سے حساب
اُٹھ گیا مسند نشینِ بزمِ رندانِ خراب

شاعروں سے وحشتؔ جادو بیاں رخصت ہوا
کارواں باقی ہے میرِ کارواں رخصت ہوا

سہیلؔ عظیم آبادی

پٹنہ میں شعر و ادب کی نسبت سے میرے بزرگ بہت لوگ تھے۔ وہ مجھ سے ملتے تو دُعا دیتے، میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے اور کہتے رہتے میاں جیتے رہو۔ جی خوش کر دیتے ہو۔ محبت ان کی آنکھوں میں ہوتی جن کی چمک دیکھ کر میں اس محبت کا رازداں بن جاتا، محبت آمیز ادب سے جھک جاتا۔ ان تمام بزرگوں میں سہیلؔ صاحب کا اندازِ محبت اور ہم دونوں کے درمیان طرزِ تعلق کا رنگ بالکل دوسرا تھا۔ یوں کہیے کہ ہم دونوں میں ایک ایسا پیار تھا جو بزرگی خوردی کے باوجود بے تکلفی کی سرحدوں کو چھو لیتا۔ وہ اکثر اپنی پیشانی پر ڈھلکتے ہوئے بالوں کو انگشتِ شہادت سے کبھی بل دیتے کبھی اوپر اٹھاتے۔ پان بھرے ہونٹوں کو دانتوں سے دَباتے اور مجھے دیکھتے ہی مسکرادیتے اور اور فوراً بول پڑتے۔ ''ارے میاں کلیم'' کہہ کر کہتے سلام علیکم اور پھر کہتے ''ارے میاں! تم نہایت نالائق ہو۔'' میں وعلیکم السلام کہتا اور کہتا، سہیل صاحب آپ اس نالائق کو پٹنہ سے نکال کیوں نہیں دیتے؟ جواب دیتے تم نالائق اس لیے بھی ہو کہ پہلے سلام نہیں کرتے میں کہتا، ماموں جان آپ کی بزرگی کے آگے میری کیا چلے گی۔ آپ نے بزرگوں سے مشق سیکھ لی ہے جب تک میں آپ کو دیکھوں آپ کھٹ سے سلام داغ دیتے ہیں۔ آپ میں پُھرتی ہے، مجھ میں سستی ہے۔ پھر کہتے، ہاں جی اس شہر سے ہم بھی نکل جانا چاہتے ہیں اور تم کو بھی نکال دینا چاہتے ہیں۔ ہم بھی سہیلؔ ہو کر کولہو کے بیل ہو گئے تم بھی کلیم ہو کر عاجزؔ ہو گئے۔ نہ تم نکل سکتے ہو نہ ہم نکل سکتے ہیں۔ سہیلؔ صاحب جب دہلی میں تھے تو بہت باغ و بہار تھے۔ یہ بات یہاں ظاہر کر دوں مجھے لال قلعہ کے جشنِ آزادی کے مشاعرے میں سب سے پہلے متعارف کرنے والے یہی تھے۔ سہیلؔ صاحب نے ہی ساغرؔ نظامی سے کہا کلیم عاجزؔ کو بلاؤ اور شاعر کیسا ہوتا ہے سنو اور مجھے لکھا کہ اس سال لال قلعہ کے مشاعرۂ جشنِ آزادی میں تم آ رہے ہو۔ تم میرے ہی یہاں پنڈارا روڈ پر ٹھہرو گے، میرے ساتھ رہو گے۔ ہرے چنے کی جھنگڑی لیتے آ ؤ گے۔ اور میں دہلی گیا، جھنگڑی کا ایک بوجھا لے گیا۔ مجھے اسٹیشن سے لے گئے۔ دوسری شام کو مجھے لال قلعہ

مشاعرہ میں کندھے پر ہاتھ رکھے اسٹیج پر جا کر اپنے ساتھ بغل میں بٹھایا۔ پھر جو مشاعرہ کا حال ہوا وہ شاید کہیں دوسری کتابوں میں لکھا ہوا ملے گا:

زہرِ غم سے نہیں انکار کہ پینا ہے یہی
ہم غریبوں کا تو مرنا یہی، جینا ہے یہی

سات آٹھ شعر کی غزل نئے پرانے شعرا کی زبان زد ہوگئی۔ دوسرے یا تیسرے سال مجھے عرشؔ ملسیانی صاحب نے بلایا اور:

آنسوؤں کی مئے بنی زخموں کا پیمانہ بنا
سینکڑوں میخانے اُجڑے ایک میخانہ بنا

آٹھ شعر کی غزل برسوں تک 'لال قلعہ' کا نام پا گئی اور مشاعروں میں فرمائش کر کے سُنی گئی۔ تو سہیلؔ صاحب دہلی میں باغ و بہار تھے۔ ساغرؔ نظامی ملنے کو آ رہے ہیں، جگن ناتھ آزادؔ آ رہے ہیں، عرشؔ ملسیانی آ رہے ہیں، بسملؔ سعیدی آ رہے ہیں، گلزارؔ دہلوی آ رہے ہیں۔ بس شعرا و ادبا کا تانتا ہے۔ پٹنہ میں سہیلؔ شیروانی اور ناگرہ جوتا پہنے آوارہ گردی کر رہے ہیں۔ یہاں تھا کون جو پوچھتا۔ میرؔ خوار پھرا کرتے تھے۔ دہلی آل انڈیا ریڈیو سے پٹنہ ریڈیو میں آئے تو شان وہی رکھی، معیار وہی رکھا۔ اپنے اعلیٰ مذاق کے اعتبار سے پروگرام رکھتے تھے۔ لوگ پروگرام کے شائق تھے۔ سہیلؔ صاحب کے شائق چند لوگ تھے۔ یہاں کی مٹّی تو بڑوں بڑوں کو بغیر ڈکار لیے ہضم کر چکی تھی۔ جمیلؔ کو، پرویزؔ کو، اجتبیٰؔ کو نگل رہی تھی۔ اس سرزمین کو تو کھانا ہی آتا ہے، کھلانا کہاں آتا ہے۔ سہیلؔ صاحب ان فنکاروں میں تھے جو وضع داری پر سب کچھ قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں اور تیار رہے اور وضع داری پر سب کچھ قربان ہی کر دیا۔ اور خواجہ حیدر علی آتشؔ کی طرح لکھنؤ والوں سے ایسے ناراض رہے:

مرنے کا وقت جب آ جائے تو مرجاؤں مگر
تم سے مٹّی بھی نہ اے گردِ مسلماں مانگوں

آتشؔ نے مٹّی مانگی نہیں مگر بغیر مانگے مٹّی لکھنؤ کی ہی ملی۔ سہیلؔ صاحب نے ایسا کہا نہیں لیکن ان کی غیرت داری نے اس سرزمین پر جس پر پیدا ہوئے، بڑھے، جوان ہوئے، یہاں مرنا پسند نہیں کیا۔ دُور جا کر گنگا جمنا کے سنگم پر۔ مجھے واقعی اسی در پردہ غیرت داری کی موت کا زبردست تاثر ہوا:

دیوانے نے کہا نہیں مگر کر کے دکھا دیا

مرثیہ سہیل عظیم آبادی

(سہیلؔ عظیم آبادی کی موت پر)

غم نے یوں گدگدی لگائی ہے　　آنکھ ہر شخص کی بھر آئی ہے
آنسوؤں کے ہیں قمقمے روشن　　درد نے انجمن سجائی ہے
آبِ گنگ و جمن کے سنگم پر　　آج ہنگامۂ جُدائی ہے
شمع روشن زمیں نے کی تھی کہاں　　آسماں نے کہاں بجُھائی ہے
دن دھاڑے لٹیری جمنا نے　　آبرو گنگا کی چُرائی ہے
آخری سانس لی یہاں نہ سہیلؔ　　ان ہواؤں میں کیا بُرائی ہے
کہاں پٹنہ کہاں الہ آباد　　اتنی تکلیف کیوں اُٹھائی ہے
پاس جیتے ہو دُور مرتے ہو　　کیا یہی رسمِ آشنائی ہے
تم کبھی ایسے بے وفا تو نہ تھے　　آج یہ کیسی بے وفائی ہے
سرزمینِ بہار ہے یہ سہیلؔ　　سچ ہے کس کی یہاں بن آئی ہے
آبروئے عروس فنِ کے لیے　　جان کتنوں نے یاں گنوائی ہے
جتنے فنکار اس انجمن میں ہیں　　سب کو احساسِ بے نوائی ہے
راسخؔ و شادؔ ومظہریؔ پرویزؔ　　سب کے لب پر یہی دُہائی ہے
تم نے مرکر پرائی بستی میں　　چوٹ اپنوں کو جو لگائی ہے
طنزیہ بھولیں گے نہ اہلِ بہار　　اس زمیں کی یہی کمائی ہے
تم نے غربت میں جان دے کے سہیلؔ　　ایسی بانکی ادا دِکھائی ہے
زندگی میں بھی خوش ادائی تھی　　مرتے مرتے بھی خوش ادائی ہے
برسوں پہلے کہی گئی تھی جو بات　　لب پہ بے ساختہ پھر آئی ہے

مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ
کیا دِوا نے نے موت پائی ہے

جمیؔل مظہری

جمیؔل مظہری بہار میں پیدا ہوئے۔ بنگال میں تعلیم حاصل کی، وہیں غیر اُردو سرزمین پر بنگالی شاعر کے شاگرد ہوئے۔ بنگال جہاں وحشتؔ کے سوا کوئی صاحبِ طرز شاعر پیدا نہیں ہوا، اُس بنگال میں جمیؔل مظہری کی شاعری آفتاب بن کر چمکی اور بچہ بچہ اس آفتاب کی پرستش میں لگ گیا۔ جوانی ہی میں بنگال نے انھیں علامہ بنا دیا۔ اپنی خمیر کی زمین پر پھر واپس آئے تو اس مردم خیز اور مردم خور سرزمین نے جس کی زمین بھی اُردو اور آسمان بھی اُردو، جس کی ہوائیں اُردو، جہاں کا پانی اُردو، جس کے ہوا پانی سے ایسے ایسے نایاب اور شاداب اُردو کے گل بوٹے کھلے جن کی خوشبو مشرق و مغرب کو معطر کر گئی۔ اس مردم خیز سرزمین پر آ کر پھر جمیؔل یہاں کے حسبِ دستور مردم خوروں کے ہاتھ لگ گئے جس نے جمیؔل مظہری کو محفل کا بھانڈ بنا دیا۔ جو شخص چاہے جمیؔل سے سہرہ لکھوالے، قطعہ لکھوالے، تہنیت نامہ لکھوالے، ہجو لکھوالے، پڑھوالے اور جمیؔل مظہری کی پیٹھ ٹھونک دے۔ بس جمیؔل مظہری کا وقار و جمال اور جلال و کمال بہار کے مردم خوروں کی مجلس آرائی اور چند واہ واہ کے سوا اور کچھ حاصل نہیں کر سکا۔ اگر جمیؔل بہار کی مغربی سرحد عبور کر کے دہلی نہیں، لکھنؤ نہیں، الہ آباد نہیں بنارس ہی میں پیدا ہوئے ہوتے پھر دیکھتے جمیؔل مظہری کی گل افشانیِ گفتار۔ جگرؔ کا، جوشؔ کا، فراقؔ کا، ساغرؔ کا چراغ اتنا بلند بام نہیں رہتا۔ جمیؔل کا فن ناقدر شناسی کا سینہ چیر کر نکلتا۔ جمیؔل کی توانائی فن اور فکر کتنے جھاڑ جنگلوں کو صاف کر دیتی، بے جان درختوں کو اُکھاڑ پھینکتی، لیکن بہار میں جمیؔل کی تخلیقی توانائی مفلوج ہو کر رہ گئی۔ فکرِ جمیؔل کو نکھرنے کا ماحول ہی نہیں ملا۔ جمیؔل ہر موڑ پر ہمّت شکنی کا شکار ہوئے۔ جمیؔل میں یہ توانائی، یہ قوتِ نمو د نہیں تھی کہ ماحول کے ناموافق خول کو ٹھوکر مار کر توڑ پھوڑ کر رکھ دیں۔ اپنے شجرِ فکر و فن کی عجیب و غریب شاخوں کو پوری خوشنمائی، خوش نظری، خوش روئی اور خوش ادائی کے ساتھ اُبھرنے کے لیے اور

پھیلنے کے لیے چھوڑ دیں۔ وہ ایسا نہ کر سکے، مرجھا کر رہ گئے، افسردہ ہو کر رہ گئے۔ اس کے خلاف ان میں الگ ردِّعمل پیدا ہوا۔ شاعری ردِّعمل ہی کا نام ہے۔ مگر چونکہ جمیلؔ مظہری کی شخصیت غیر مانوس ماحول میں وہ نہیں بن پائی جو سازگار ماحول میں بنتی یا یہ کہ انھوں نے اپنی شخصیت کو کوئی نظریہ، کوئی آدرش، کوئی مقصد نہیں بخشا اس لیے ان کا ردِّعمل غیر صحت مند ہوا، فکر میں تلخی اور فن میں اُلجھاؤ پیدا ہوا، جس کی وجہ سے ان کا فن دلنواز، دلفریب، دل فروز نہیں بن سکا۔ اس میں قصور جمیلؔ صاحب کا بہت کم جمیلؔ کے ماحول اور ان کے اہلِ صحبت کا بہت زیادہ ہے۔ ان کے ہم صحبت بالغ نظر فنکار نہ تھے۔ بس خوش گپّی کرنے والے تھے اور اسی خوش گپّی میں جمیلؔ صاحب گھل مل گئے مگر ان کی فطرت پر ایک مستقل افسردگی چھائی رہی۔ وہ شکار ہو گئے، شکار کر نہ سکے۔ مجھے جمیلؔ صاحب سے پندرہ بیس سال تک قریب رہنے کا موقع ملا اور مجھے افسوس رہا کہ یہ ہیرا ناتراشیدہ رہا۔ ایسے جوہری کے ہاتھ نہ آیا جو اس کے پہلوؤں کو باریک بینی اور خوش اُسلوبی سے تراشتا۔ مجھے جمیلؔ صاحب پر افسوس رہا اور اسی افسوس کا اظہار ان کے انتقال پر اس نظم کے باطن میں چھپا دیا ہے۔ فنکار کو اس کا ماحول تراشتا ہے، سان پر چڑھاتا ہے اور جلا بخشتا ہے۔ اوّل تو بہار کا ماحول انحطاط پذیر تھا۔ یہ انحطاط ان کی کمزور شخصیت نے قبول کر لیا۔ ان کی شخصیت نے اپنا اعتماد کھو دیا۔ اپنا اعتماد گیا تو انسانی عظمت پر بھی اعتماد گیا، فطرت کی سچائی پر بھی اعتماد گیا اور خدا پر بھی اعتماد گیا۔ وہ اطاعت کی حدود سے باہر آ گئے۔ لیکن ہمّت بغاوت کی بھی نہیں تھی اس لیے باہر آنے کے بعد وہ زندگی بھر تشکیک کا شکار ہوئے۔ جو شخص اطاعت کر سکتا ہے وہی بغاوت بھی کر سکتا۔ بہر حال کسی حال سے جمیلؔ صاحب کو چین اور اطمینان نہ بخشا وہ افسردہ ہی رہے۔ نیاز مندی اور بے نیازی کے بین بین ان کی زندگی گزری۔ وہ ماحول سے بہت کچھ چاہتے تھے۔ وہ نہ ملا تو وہ ماحول کو ٹھکرا بھی نہ سکے۔ عجیب بے بسی کا عالم ان کی شخصیت پر تھا۔ اس بے بسی کو وہ خوب سمجھتے رہے اور اسی تضاد میں رخصت ہو گئے:

گریزاں احسانِ دوستاں سے خموش رخصت ہوا جہاں سے
جو طرز آج اس کی موت کا ہے وہی تھا انداز زندگی کا

جمیلؔ صاحب کے انتقال پر تعزیتی جلسہ پٹنہ کالج بی۔ اے لکچر تھیٹر میں منعقد ہوا۔ پرنسپل پٹنہ کالج ڈاکٹر چٹیکو جھا جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔ صدر شعبۂ اُردو ڈاکٹر مطیع الرحمٰن بغل

میں تھے۔ سفید دھوتی کُرتہ اور ماتھے پر صندل اور چندن کے ٹیکے اور قشقہ کے ساتھ ڈاکٹر چٹیکر جھا اور بالشت بھر لمبی ریش، سفید ٹوپی شیروانی اور پاجامہ کے ساتھ ڈاکٹر مطیع الرحمٰن صاحب:

اُداس سب اہلِ وفکروفن ہیں شریکِ غم شیخ و برہمن ہیں
کہیں صدا ہے خدا خدا کی کہیں بھجن ہے ہری ہری کا

میں نظم پڑھ رہا تھا۔ جذبات کی سچائی، مضمون کی واقعیت، محاکات کے اہتمام اور اُسلوب کی سادگی اور روانی سے مجمع متاثر تھا اور اس بات کا منتظر تھا کہ جمیلؔ صاحب کا نام اب آئے گا۔ لیکن کسی شعر میں جمیل صاحب کا نام آیا نہ اشارہ ان کی شخصیت کی طرف آیا۔ لوگوں کو یہ بھی خیال نہ تھا کہ یہ نظم جمیلؔ صاحب ہی کی ایک غزل کی زمین میں ہے۔ نظم ختم ہو رہی ہے اور یہ آخری شعر:

جو نام پوچھا اِک اجنبی نے، کہا یہ بے ساختہ کسی نے
جنازہ یہ جا رہا ہے جس کا، یہ شعر مشہور ہے اُسی کا

پڑھا گیا۔ اُس وقت تک کسی کا ذہن جمیل صاحب کے کسی شعر کی طرف نہیں جا رہا تھا۔ نظم نے ایسا سماں باندھا کہ سب خالی الذہن ہو کر مراہی منہ دیکھ رہے تھے۔ کسی کو جمیلؔ صاحب کا شعر نظم کے اس ماحول میں یاد نہ رہا حالانکہ یہ شعر بچّے بچّے کی زبان پر رہا ہے۔ جب میں نے یہ شعر پڑھا:

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

تو آدھا مجمع سمجھ داروں کا کھڑا ہو گیا۔ اور نظم کی سحر آفرینی سے نکل کر بے ساختہ تحسین سے ہال گونج اُٹھا۔

جمیل مظہری کے انتقال پر

(شب دہم رمضان مطابق شب ۲۴؍ جولائی)

یہ کون مہمان جا رہا ہے یہ وقت ہے کس کی واپسی کا
اُداس اُداس آج شہرِ دل ہے، بجھا ہے چہرہ گلی گلی کا

یہ اُٹھ گیا کون انجمن سے کہ سب کو احساس ہے کمی کا
دیے کی لَو تھرتھرا رہی ہے قدم لرزتا ہے روشنی کا

چلا یہ محفل سے کون اُٹھ کر کہ محفل اس طرح چونک اُٹھی ہے
کہ جیسے بزم مشاعرہ میں چراغ بجھ جائے شاعری کا

فضائیں کروٹ بدل رہی ہیں ہوائیں تھم تھم کے چل رہی ہیں
لہو لہو پھول، پھول کا دل، جگر ہے پانی کلی کلی کا

خیال و فکر آہ بھر رہے ہیں غزل کے گیسو بکھر رہے ہیں
قلم پہ حالِ شکستگی ہے زباں پہ عالم ہے خامشی کا

اُداس سب اہلِ فکر و فن ہیں شریکِ غم شیخ و برہمن ہیں
کہیں صدا ہے خدا خدا کی، کہیں بھجن ہے ہری ہری کا

گریزاں احسانِ دوستاں سے خموش رخصت ہوا جہاں سے
جو رنگ آج اس کی موت کا ہے وہی تھا انداز زندگی کا

جو نام پوچھا اِک اجنبی نے، کہا یہ بے ساختہ کسی نے
جنازہ یہ جا رہا ہے جس کا، یہ شعر مشہور ہے اُسی کا

”بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا“

یومِ شادؔ

۱۹۵۷ء میں بزمِ ادب پٹنہ یونیورسٹی کا میں سیکریٹری تھا۔شاید دو سال بعد ۱۹۵۹ء میں پروفیسر عبدالمغنی صاحب بزمِ ادب کے سیکریٹری ہوئے۔ اس کا سالانہ جلسہ جمنا زیم ہال پٹنہ یونیورسٹی میں ہو رہا تھا۔اس جلسے کا ایک حصہ یومِ شادؔ کے لیے نکالا گیا۔گرچہ کم از کم یہ تقاضا تھا کہ ایک پوری تقریب شادؔ پر ہوتی۔اس میں مقالے اور مضامین پڑھے جاتے۔کچھ دیر شاید شادؔ پر کچھ باتیں کی گئیں اور پھر مشاعرہ شروع ہو گیا۔ مجھے یہ بات شادؔ کی شان سے بہت گری ہوئی معلوم ہوئی۔ مجھ سے کسی نے فرمائش نہیں کی،مگر بزمِ ادب پٹنہ یونیورسٹی کے جلسہ کا کچھ وقت شادؔ کے لیے مختص کرنا شادؔ کی توہین نظر آئی۔بہار اور عظیم آباد کے اربابِ کمال مظلوم ہیں۔ان کے ساتھ اب تک انصاف بھی نہیں ہوا،اب کیا ہوگا، میں نے شادؔ کی مظلومیت پیشِ نظر رکھی اور یہ نظم لکھ دی اور جلسہ میں جا کر بجائے غزل یہ نظم پڑھ دی۔عظیم آباد کے پس منظر میں شادؔ کی شخصیت اور فن کی یہ منظوم پیشکش اختصار کے باوجود ایک ہمہ جہت پیشکش ہوگئی۔اس میں اختصار سے تقریباً سب کچھ آ گیا۔عظیم آباد قدرداں اور مہمان نواز رہا ہے،اُردو شعر و ادب کی ابتدا سے قدردانی اور میزبانی کی کشش دوسری جگہوں سے لوگوں کو یہاں لاتی رہی۔عظیم آباد کے ماحول اور یہاں کے اہلِ نگاہ کی قدردانی اور سب سے زیادہ یہاں کے بزرگوں کی تواضع اور انکساری جس کا تفصیلی خاکہ میری کتاب 'دفترِ گم گشتہ' میں ہے،آنے والوں کے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔ وہ مسحور ہو کر رہے لیکن بعد میں یہ انکساری کمزوری اور احساسِ کمتری بن گئی اور وہ اعلیٰ حالہ باقی ہے:

یہ شہر جس میں ہر اِک طفلِ مبتدی آ کر
بجا کے جاتا ہے نقارۂ کمال اپنا

یہ سب کچھ اشاروں میں اس نظم میں داخل ہو گیا۔اس پس منظر میں شادؔ کی شخصیت اور شادؔ کے فن کی چنگاریاں چمکتی ہیں اور ساتھ ساتھ شادؔ کی مظلومیت کا دردانگیز پہلو بھی ذرا اُبھر آتا ہے۔شادؔ کی شخصیت اور فن کے بعض اجزا بھی ہلکے ہلکے نمایاں ہو جاتے ہیں۔نظم پڑھی گئی تو گویا جمنا زیم

ہال میں دھوم مچ گئی۔ استادی پروفیسر جمیلؔ مظہری نے کھڑے ہوکر صرف اتنا کہا کہ اہلِ عظیم آباد پر جو شادؔ کا حق تھا، وہ آج کلیم عاجزؔ نے ادا کردیا۔

اس میں دو نظمیں ہیں۔ ایک تو ۱۹۵۹ء میں جمنازیم ہال میں پڑھی گئی جس کا تعارف اس تحریر میں ہوا۔ اور دوسری نظم پٹنہ سٹی کے کسی غیر مسلم معتقدِ شادؔ کے گھر میں آج سے شاید دس بارہ سال پہلے پڑھی گئی۔ نظم پڑھنے کے بعد بہت سے پرانے غیر مسلم شناسانِ شادؔ میرے چاروں طرف اکٹھا ہوگئے۔ میرے دل کی بات نے ان کے دِلوں میں چھپی ہوئی باتوں کو ظاہر کردیا۔ وہ مجھ سے محبت آمیز لہجے میں شادؔ کی خیر خواہی کے لیے شکر ادا کرنے لگے اور کچھ پرانی یادیں شاد کی دَور کی اپنے حافظے سے سنانے لگے اور گلی میں دُور تک میرے ساتھ ساتھ آئے۔ سڑک پر جب میں سواری پر ان سے رخصت ہونے لگا تو وہ سب کسی قدر نم دیدہ ہوگئے۔

محبت اور سچائی کی ہر دَور میں قیمت ہے اور یہ قیمت ادا کرنے والوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے، یہ عالم گیر ہے۔

یومِ شادؔ

(۱۱؍نومبر ۱۹۵۹ء)

دکھایا شادؔ کو اِک دن مجھے تصور نے — وہ مردِ قال کہ روشن تھا جس پہ حال اپنا
یہ شہر جس کو ہنر دوستی نہیں آتا — جو فن کشی کو سمجھتا رہا کمال اپنا
یہ شہر جس کو ملی دولتیں بہت لیکن — کبھی سنبھال کے رکھا نہ جس نے مال اپنا
یہ شہر جس میں ہر اِک طفل مبتدی آکر — بجا کے جاتا ہے نقارۂ کمال اپنا
یہ شہر جس نے بہت کھوئے جاوداں لمحے — نہ احتساب کیا جس نے کوئی سال اپنا
یہ شہر جس کے لیے آئینہ بھی پتھر ہے — جو عیب کو بھی سمجھتا رہا کمال اپنا
یہ شہر ان سے گزرتا ہے منہ پھرائے ہوئے — جنھوں نے ڈال دیا دل جگر نکال اپنا
یہ شہر محو رہا حسن کے تماشے میں — شناخت کر نہ سکا حسن بے مثال اپنا
یہ شہر جس کو خدا نے غنی بنایا تھا — پھرا کرے ہے اُٹھائے کفِ سوال اپنا

....

اسی دیار کا وہ شاعرِ فقیر مزاج — بنایا جس نے امیروں کو ہم خیال اپنا

بس ایک درِ محبت ہی اس کی پونجی تھا　　غریب جس کو سمجھتا تھا ملک و مال اپنا
وہ حسن کا متلاشی وہ عشق کا بیمار　　جو دل میں لے کے گیا دردِ لازوال اپنا
جو منزلوں رہِ شعر وادب سے گزرا ہے　　بکھیرتا ہوا گنجینۂ کمال اپنا
اُسی کو دیکھا کہ جاتا تھا یوں جھکائے سر　　فقیر جیسے سنا کر پھرے سوال اپنا
لیے شکایتِ اربابِ فن نگاہوں میں　　اٹھائے دوش پہ خمیازۂ کمال اپنا
قدم قدم پہ ضعیفی سے لڑکھڑاتا ہوا　　سنبھالتا ہوا قلب شکستہ حال اپنا
جبیں پہ بہ ایں ہمہ ایک شانِ استغنا　　خودی کی تہہ میں چھپائے ہوئے ملال اپنا

………………

سلام کرکے ادب سے یہ عرض میں نے کیا　　کہ گرچہ منہ تو نہیں قابلِ سوال اپنا
کہ میں بھی فرد ہوں آخر اسی جماعت کا　　جو خود سے کرتی ہے سرمایہ پائمال اپنا
مگر سنا ہے کہ بہرِ تلافیِ مافات　　زمانے والوں نے بدلا ہے کچھ خیال اپنا
سنا ہے شعر وادب کے اجارہ داروں نے　　بہت دِنوں پہ نکالا خراجِ مال اپنا
منا رہی ہے یونیورسٹی کی بزمِ ادب　　بڑے تپاک سے اِکیسواں یہ سال اپنا
اسی کے ضمن میں تقریب یومِ شادؔ بھی ہے　　یہ حوصلہ نہیں کیا قابلِ خیال اپنا
اُس انجمن میں ذرا دیر کے لیے چل کر　　قبول کیجیے شکرانۂ کمال اپنا

………………

یہ سن کے مجھ سے نگاہیں اُٹھا کے سوئے فلک　　بلند کرتے ہوئے دستِ بے سوال اپنا
کچھ ایسے درد سے جس میں بڑی متانت تھی　　سنا دیا مجھے مقطع یہ حسبِ حال اپنا

ہماری موت امیروں کی موت کب ہے شادؔ
ہمیں تو روئے گا اِک عمر تک کمال اپنا

یومِ شادؔ

آج برسی ہے تمھاری آؤ شادؔ　　ہم ریا کاروں سے بھی مل جاؤ شادؔ
رسمی اور بے جان تعریفوں کے لفظ　　سن لو آکر اور خوش ہوجاؤ شادؔ
تم بجھے اور ساری محفل بجھ گئی　　بزم ٹھنڈی ہے ذرا گرماؤ شادؔ

فلسفوں اور حکمتوں کی آنچ سے — درد کی بھٹّی ذرا سلگاؤ شادؔ
کون سمجھے گا تمھیں اس دَور میں — بن گئے ہیں ہم تو پچھمن ساؤ شادؔ
حکمتوں کے تم خزانے دے گئے — ہم نے تم سے کیا کیا برتاؤ شادؔ
تم دِلوں کو کر گئے درد آشنا — اور ہمارا فن ہے 'دل بہلاؤ' شادؔ
سستا فن، سستی زباں، سستا خیال — اور اس میں بھی بڑا اُلجھاؤ شادؔ
ہم تمھاری ناخلف اولاد ہیں — بد دُعا مت دو، دُعا فرماؤ شادؔ
تم رہو گمنام ہم تو بن گئے — اپنے اپنے گھر میں کنپت راؤ شادؔ
ہم خود اپنے وقت کے استاد ہیں — اب تمھارا رہ گیا کیا بھاؤ شادؔ
سستی تعریفوں میں ہم تو مست ہیں — کون دیکھے گا تمھارے گھاؤ شادؔ
یہ عظیم آباد، یہ شہرِ قدیم — فکر و فن کا تھا جہاں اُپجاؤ شادؔ
جس سے نکلا چشمۂ علم و ہنر — اور پہنچا دُور تک پھیلاؤ شادؔ
قدر دانوں کی یہ بستی تھی جہاں — باکمالوں کا رہا ٹھہراؤ شادؔ
خوش بیانی کا سخن آرائی کا — ہر گلی کوچے میں تھا چھڑکاؤ شادؔ
زارؔ و بسملؔ تھے کنورؔ سکھراجؔ تھے — پھر پکارو ان کو پھر بلواؤ شادؔ
اور جمیلؔ و اجتبیٰؔ کے بعد تو — شاعری کا ہوگیا ستھراؤ شادؔ
آکے اب ہر مبتدی اس شہر میں — کہتا ہے خلعت مجھے پہناؤ شادؔ
باندھو دستارِ فضیلت میرے سَر — میرے آگے اپنا سر نہوڑاؤ شادؔ
ٹھیکرے لاتا ہے اپنی جیب میں — بیچتا ہے اشرفی کے بھاؤ شادؔ
کیا ہوا اہلِ عظیم آباد کو — آکے دیکھو اور مر جاؤ شادؔ
جس جگہ تشنہ لبوں کے واسطے — ہر قدم تھا علم کا دریاؤ شادؔ
آج اس محفل سرائے علم میں — زُلف بے علمی کا ہے بکھراؤ شادؔ
بے کمالوں پر ہے بارش پھولوں کی — اہلِ فن پر ہے یہاں پتھراؤ شادؔ

شہر یہ شہرِ خموشاں ہوگیا
آؤ آکر فاتحہ پڑھ جاؤ شادؔ

مولودِ اقبال

پٹنہ یونیورسٹی میں اقبالؔ صدی کے دوران یومِ اقبال منعقد ہوا۔ مجھ سے کہا گیا تم ایک شایانِ شان نظم لکھ دو، مقالے اور حضرات پڑھیں گے۔ میں نے یہ نظم لکھی، پڑھی اور چھپی۔

جب سے شاعری شروع کی، جو بھی کہا، جس پیرایہ میں کہا، جس اُسلوبِ انداز میں کہا، حقیقت کہی، صداقت کہی، سچائی کہی۔ نہ کبھی بات بنائی نہ بتنگڑ بنایا۔ نہ کہیں سے اُدھار لایا نہ مستعار لیا۔ نہ کسی کی کہی ہوئی کہی نہ انداز سے کہی۔ جو گزری وہ کہی، جو سمجھی وہ کہی، جو سوچی وہ کہی۔ تجربہ اپنا، مشاہدہ اپنا، فکر اپنی، حوالہ اپنا، فیصلہ اپنا۔ نہ کہیں سے حوالہ لانا سیکھا، نہ کسی کے فیصلے کی نقل کرنی سیکھی، چھوٹی سہی، اپنے تجربہ نے جو کہا، اپنی فکر نے جو کہا وہی کہا۔ جو محسوس کیا وہی کہا۔ کل بھی یہی انداز رہا، آج بھی یہی انداز ہے۔ یہی شرط، یہی اصول، یہی ضابطہ ہے۔ اللہ نے دل اپنے قابو میں رکھا ہے۔ ماحول سے، مشاہدہ سے، فکر و تخیل سے جو بات دل پر ٹپکتی ہے وہی زبان سے، وہی قلم سے ٹپک جاتی ہے۔ بیشک حقیقت سے کم نہیں کہتا لیکن حقیقت سے زیادہ بھی نہیں کہتا۔ مبالغہ مزاج کو چھو بھی نہیں گیا۔ میں نہیں جانتا مبالغہ کیا ہے اور مبالغہ کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ جو بات ذہن میں آتی ہے خود اتنی سجی سجائی، بنی بنائی رہتی ہے اور تقریباً مکمل رہتی ہے کہ اس اضافہ اور توسیع کی کبھی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی۔ اسی لیے پچاس برس میں جو کچھ کہا کسی نے انگلی رکھ کر یہ بات کہنے کی ہمّت نہیں کی کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ خدا جانے اقبالؔ پر کتنے لوگوں نے نظمیں لکھی ہوں گی۔ شاید دو ایک میں نے دیکھی ہوں گی۔ میں نے جو باتیں اس نظم میں کہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ بات سچ نہیں ہے اسی لیے کوئی میرے کسی شعر، کسی غزل، کسی نظم یا کسی عبارت میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں انتشار ہے یا تضاد ہے یا تکرار ہے۔

اس نظم میں ذرا ڈرامائیت پیدا ہوگئی ہے۔ میں نے ڈرامے بہت دیکھے اور پڑھے ہیں۔ مجھے یہ سلیقہ ہے کہ کس بات کو صاف اور دوٹوک کہا جائے۔ اور کون سی بات کہانی بنا کر ڈرامائیت

اور رمزیت کے پیرائے میں کہی جائے۔ اور یہ سلیقہ اتنا رچ بس گیا ہے کہ اس کے لیے کوشش اور سعی اور اہتمام کی ضرورت نہیں پڑتی، بس ذہن میں ہلکا سا خاکہ آتا ہے اور کبھی بلکہ بیشتر خاکہ بھی پہلے سے نہیں آتا۔ بس فکر چلتی رہتی ہے اور فکر کے ماتحت قلم چلتا رہتا ہے۔ کہاں محاکات کی ضرورت ہے، کہاں موقع آرائی کی حاجت ہے، کہاں ماحول سازی کی ضرورت ہے، کہاں اسٹیج لانے کی ضرورت ہے، کہاں کردار پیش کرنی ہے اور کہاں کردار نگاری کرنی ہے، سب اپنے اپنے مقام پر خود بخود قلم سے ٹپکتے جاتے ہیں۔ اس نظم کے کئی حصے ہیں۔

زوال یافتہ یا زوال آمادہ قوموں کی تاریخ یہی کہتی ہے کہ باہر کا زوال پہلے اندر سے شروع ہوتا ہے۔ دل حوصلوں سے خالی ہوجاتے ہیں۔ اُداسی مایوسی کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں، بے ہمّتی، بے سمتی، بے مقصدی نمایاں ہونے لگتی ہے، فکر فرسودہ ہوجاتی ہے، خیالات پسماندہ ہوجاتے ہیں، غور فکر سوچ کی صلاحیت ماند ہوجاتی ہے، قوتِ فیصلہ جواب دینے لگتی ہے، دُوراندیشی کوتاہ اندیشی میں بدل جاتی ہے، عزم ارادے کا فقدان ہوجاتا ہے۔ پہلے حصّے میں یہی ماحول دکھایا گیا ہے، پہلے یہی منظر ہے۔ انسانیت ایسی ہی تاریکی، مایوسی، بے ہمتی، پسپائی، بے نوائی کے عالم میں تھی کہ ڈرامائی طور پر ایک جانب سے حوصلہ مندی کی آواز آتی ہے اور وہ آواز کہتی ہے ہمیں تمھارے حالات کا علم ہے، اندازہ ہے اور اس علم اور اندازہ نے مجھے بے قرار، بے چین، مضطرب کر رکھا ہے۔ درپردہ یہ تخلیقی اضطراب ہے۔ اقبالؔ کی ذات تخلیق کا ایک آتش فشاں پہاڑ ہے جو پھوٹ پڑ آمادہ ہے، خصوصیت کے ساتھ آواز دینے والی ذات کی زبان پر عالمِ اسلام کے مرکز سرزمین حجاز کی مایوس کن شکست حالی کا بیان ہے کہ وہ مرکز جہاں سے چہار دانگ عالم میں روشنی پہنچی، نور پہنچا، سرفرازی اور سربلندی پہنچی، زندگی، تازگی، حرارت اور گرمی پہنچی، قوتِ فکر، قوتِ عمل پہنچی، رنگ اور خوشبو پہنچی، نغمہ اور جوش پہنچا، انسانیت اور ملکوتیت کا پیغام پہنچا، وہ سرزمین خود ان نعمتوں سے اور صفات سے خالی ہوتی جارہی ہے بلکہ خالی ہوگئی۔ یہ آواز دینے والی ذات اقبالؔ کی روح جو عالمِ بالا سے زمین کی طرف مخاطب ہے اور یہ خوش خبری دیتی ہے کہ خدا کو بھی یہ صورتِ حال پسند نہیں۔ اور انقلابِ حالات کے لیے مجھے حکم تولد ہے:

اسی آواز کے ساتھ ایک ستارہ چمکا
جیسے قطرہ کسی فنکار کے چشمِ نم کا

یہی مولودِ اقبالؔ ہے۔ اقبالؔ کے آتے ہی اُس کی قوتِ تخلیق، فکری توانائی، جوش اور حکمت و دانائی، تخیل اور دردمندی نے جو انقلاب پیدا کیا، اس کا اشارہ بعد کے چند اشعار میں مختصراً پیش کیا گیا ہے۔ اختصار ملحوظ رہا کہ یہ نظم اقبالؔ کی خصوصیاتِ فن کی وضاحت کے لیے نہیں صرف اقبال پیدا ہو جاتے ہیں اور پیدا ہوتے ہی جن جن عناصرِ فنِ اقبال کو جو جو کام کرنا ہے اُن کا آغاز ہو جاتا ہے۔

مولودِ 'اقبال'

رات اماوس کی گھٹا ٹوپ ، فضا اَبر آلود
سات پردوں میں مقید مہہ و انجم کی نمود

راہیں ظلمات کی آغوش میں سوئی سوئی
منزلیں خواب کے صحراؤں میں کھوئی کھوئی

فکر حیراں ، کسی گم کردۂ منزل کی طرح
فن پریشاں غمِ فرقت میں کسی دل کی طرح

جس کا اپنا ہو کوئی اور نہ بیگانہ ہو
عقل اس طرح تھی جیسے کوئی دیوانہ ہو

فلسفہ یوں کوئی اُلجھی ہوئی کاکل جیسے
خارزاروں میں گھرا ہو شجرِ گل جیسے

عشق بیتاب تڑپتا ہوا آہو جیسے
بسترِ ہجر پہ بدلے کوئی پہلو جیسے

اور بے چارہ جنوں جیسے کہیں کا نہ رہے
جیسے عنوان سے خالی کوئی افسانہ رہے

جیسے دیوان کے اوراق ہوں پارہ پارہ
زندگی کے یہ مسافر تھے یوں ہی آوارہ

ایک سے ایک الگ ایک سے اِک بیگانہ
جیسے تسبیح کا بکھرا ہوا دانہ دانہ

ٹھوکریں کھاتے تھے گرتے تھے بکھر جاتے تھے
بے کسی میں اِدھر آتے تھے اُدھر جاتے تھے

اس اندھیرے میں کہیں تھا نہ سہارا کوئی
کہ اچانک کسی جانب سے پکارا کوئی

....

ہم بھی آوارہ پھرا کرتے تھے کہساروں میں
لہلہاتے ہوئے فردوس کے گلزاروں میں

گرچہ جنت کی فضاؤں میں بہت دیر رہے
اور ایک طرح سے آسودہ رہے سیر رہے

پھر بھی اِک دل میں کھٹک سی ہے جو تڑپاتی ہے
کم تو کیا ہوگی کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے

یہ خلش وہ ہے کہ جس پر نہیں قابو ہم کو
چین لینے نہیں دیتی کسی پہلو ہم کو

آہ وہ جنتِ ارضی و گلستانِ حجاز
خلوتِ سوز و گداز، انجمنِ ناز و نیاز

کبھی اشکوں کا رگِ گل سے نہ رشتہ ٹوٹا
آہ وہ خون سے سینچا ہوا بوٹا بوٹا

جن کی خوشبو لیے دُنیا میں صبا پھیل گئی　　دیکھتے دیکھتے ہر سمت ہوا پھیل گئی
نغمۂ گل کا کچھ ایسا تھا نرالا انداز　　"لے اُڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز"

……………….

آہ وہ مدرسۂ حکمت و افکار و خیال　　نہ کہیں جس کی نظیر اور نہ کہیں جس کی مثال
اِک سے اِک اہلِ نظر صاحبِ دل صاحبِ حال　　جن کی خاکِ کفِ پا رونقِ اورنگِ کمال
اَن پڑھ اُٹھے سندِ فکر و معانی لے کر　　پیر آئے تو گئے جوشِ جوانی لے کر
وہ قلندر وہ کلہ دار وہ غازی نہ رہے　　آہ وہ صاحبِ اوصاف حجازی نہ رہے
ہر طرف ہیں گل افسردہ و حیراں خالی　　ہوگیا بلبل و قمری سے گلستاں خالی
کوئی سینہ بھی جنوں سے شرر آباد نہیں　　اب کسی دل کو محبت کا سبق یاد نہیں
عشق بے سوزش و بے سوز دلِ رومی ہے　　دوسرا نام ، اُس عشق کا محرومی ہے
فن کی آگ ایک زمانے سے ہے کجلائی ہوئی　　اُفقِ فکر پہ صدیوں کی گھٹا چھائی ہوئی
نہ کوئی فن ہے نہ فنکار نہ دانا نہ حکیم　　بند اِک عمر سے ہے سلسلۂ طور و کلیم
دیکھتے دیکھتے چھلنی ہے کلیجہ غم سے　　اب تو دیکھا نہیں جاتا ہے یہ عالم ہم سے
حکم ہے بادشۂ محفلِ یکتائی کا　　نئے انداز سے پھر انجمن آرائی کا

……………….

ہوسکی جب متحمل نہ کوئی طبع بلند　　قرعۂ فال بنام منِ دیوانہ زدند
لے کے حکمِ سفر از باغِ ارم آتے ہیں　　خانہ بردوشو نہ گھبرائیو ہم آتے ہیں
اسی آواز کے ساتھ ایک ستارہ چمکا　　جیسے قطرہ کسی فنکار کی چشمِ نم کا
ہوگیا بزمِ تخیل میں اُجالا ہر سُو　　فکر وفن آکے کھڑے ہوگئے پہلو پہلو
بندوبستِ روش و رسمِ سخن ہونے لگا　　پھر سے آباد خزاں دیدہ چمن ہونے لگا
فکر نے خم لیا، شیشہ لیا، پیمانہ لیا　　ہاتھ میں اپنے نظامِ مئے و میخانہ لیا
عشق نے مملکتِ مستی و سرشاری لی　　عقل نے حکمت و اندیشہ وہشیاری لی

فن کی سرکار میں آئینہ گیا شانہ گیا
اور آغوشِ جنوں میں دلِ دیوانہ گیا

میراوطن

۱۹۶۰ء کے پہلے سے کچھ بعد تک آل انڈیا ریڈیو پٹنہ میں ہندی شعبہ کے انچارج شری پروفلاّ چندر جی تھے، خالص ہندو، ٹھیٹ ہندو، دھوتی کُرتہ پہنتے تھے۔ چندن لگاتے تھے، پوجا کرتے تھے، گنگا اشنان کے پابند تھے، لمبی ٹیک رکھتے تھے، بال منڈاتے نہ تھے مگر زُلف بھی نہیں رکھتے تھے، وہی ریڈیو کے اُردو وِبھاگ کے بھی انچارج تھے۔ اُردو ہندی دونوں شعبے ان کے ماتحت تھے۔ مزے اور پُرتکلف بات تو یہ ہے کہ ایک خالص ہندو ایک خالص مسلمان کا پرستار تھا۔ وہ مجھے چاہتے ہی نہیں تھے میرے فدائی تھے، میں کٹرّ مسلمان اور وہ کٹرّ ہندو اور دونوں مل کر کٹرّ دوست۔ اُردو کے پروگرام کے لیے سب سے پہلے مجھ پر نظر، پھر اس کے بعد حالات کے اعتبار سے دوسروں پر نظر، عام غزل خوانی کے سلسلے میں تو وہ خاص کر کے مجھے پکڑ کر لے ہی جاتے۔ ہاں یہی سمجھئے کہ وہ مجھے پکڑ کر لے ہی جاتے۔ بس اپنی دھوتی کُرتہ اور لمبی ٹیک کے ساتھ وہ میری دُکان پر پہنچ جاتے اور اگریمنٹ پر دستخط کرا کے ہی لے جاتے۔ وقت پر، حالات پر، ماحول پر، حکومت پر میں جیسا تیز طنز نگار، پروفلاّ اتنا ہی تیز سمجھ دار۔ وہ خوب سمجھتے اور خوب داد دیتے، لیکن غزل کے علاوہ دو نہیں تین مرتبہ وہ مجھ سے خاص اپنے موضوع پر مجھ سے غزل یا نظم لکھوا کر لے گئے اور پڑھوا کر چھوڑا۔ ایک مرتبہ آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کے یومِ پیدائش پر کسی پروگرام میں مجھ سے نظم لکھوانے کو آئے اور کہا تعریف بھی کرو اور جو طنز کرنا ہے وہ بھی شاعرانہ طور پر ضرور کرو مگر ضرور لکھو، میں انکار کرتا رہا مگر وہ نہیں مانے اور ایک غزل نما نظم مجھ سے لکھوا کر اور پڑھوا کر ہی چھوڑا۔ وہ خالص غزل تھی۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ وہ غزل اب نہیں مل رہی ہے۔ دوسری مرتبہ وہ مجھ سے اپنے وطن ہندوستان کے متعلق نظم لکھوانے آئے۔ میں نے اس سے پہلے کبھی کوئی نظم ہندوستان پر نہیں لکھی تھی۔ انھوں نے بے جھینپ کہا کہ وطن سے چوٹ اور زخم کے باوجود تمھیں جو محبت ہے وہ میں جانتا ہوں، تم ضرور لکھو۔ (وہ مجھ سے عمر میں پندرہ بیس سال

بڑے تھے) تم جو لکھو گے وہ دوسرا اِس وقت نہیں لکھ سکتا۔ میں نے ان کی فرمائش بہ آسانی پوری کردی۔ وہ بہت خوش ہوئے اور ریڈیو پر پڑھوا کر اور زیادہ خوش ہوئے۔ وہ یہی نظم ہے۔

وطن پرستی کوئی نئی چیز نہیں یہ ایک فطری میلان ہے، انسان کو اپنی زمین سے اور زمین سے اُگنے والی ہر چیز سے، زمین سے مس کرنے والی اور زمین سے نظر آنے والی ہر چیز سے محبت ہو جاتی ہے۔ ہندوستان، ایران، توران، عربی، سمرقند تمام عالم کی زمین ایک ہی ہے۔ اس کی شکل میں فرق نہیں لیکن اس کی پیداوار میں فرق ہے، اس کی ہواؤں میں، اس کے موسموں میں فرق ہے۔ یہی موجوں کی وطن پرستی میں انفرادیت پیدا کرتی ہے۔ اس نظم میں جو تلمیحات اور تشبیہات استعمال ہوئی ہیں وہ کسی دوسرے خطۂ زمین کی نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف جذباتی نہیں محاکاتی نظم ہے۔ جذبات تخیل سے نہیں پیدا ہوئے ہیں مشاہدات سے پیدا ہوئے ہیں، مشاہدات اور جذبات ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو فن کا حسن اور اس کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ میں خالص ہندوستانی آدمی ہوں، خالص ہندوستانی ہونا اس دَور میں بہت مشکل بہت دشوار ہے۔ ہندوستان والوں سے سخت تکلیف پہنچانے کی شکایت کے باوجود وہ تعلق ذرا بھی کمزور نہیں جو ایک فنکار کو اپنی جائے پیدائش اور اس کے ماحول سے ہوتی ہے۔ نظم کی زبان سے وہ تعلق بول رہا ہے، وہ محبت بول رہی ہے۔ پہلے دو بندوں میں میرے جذبات ہیں اور سچے جذبات ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس وطن میں میرا سب کچھ چھن گیا پھر بھی اس سرزمین کی محبت نے مجھے بڑے لالچ، بڑے بڑے وعدوں، بڑے بڑے استقبالی منظر کو بالکل ٹھکرا دینے پر مجبور کیا۔ پہلے پاکستان اب امریکہ، کناڈا، اور سعودی عرب نے حسین حسین نقشے مجھے پیش کیے مگر کوئی وعدۂ حسین میرے قدموں کو لغزش نہ دے سکا۔

تیسرا بند ایک حقیقت ہے جس کے سب معترف ہیں (تیسرا مصرع) شعر و ادب کا بھی چالیس پچاس پہلے یہی حال تھا۔ گرچہ اب یہ بات نہ رہی۔

چوتھے اور پانچویں بند میں سرزمینِ ہند کے مختلف حصوں اور منظروں کی شاعرانہ تشبیہیں ہیں جو منفرد ہیں اور میری ایجاد ہیں۔ انوکھی ہیں اور نرالی ہیں۔

آخر کے تین بندوں میں وہ سب کچھ ہے جو اس ملک کی تاریخ کہتی ہے۔ گواہ ہے شاہد اور دلیل ہے۔ اُس ہندوستان کا نقشہ ہے جو ہم نے بنایا ہے اور جو ہم بنانا چاہتے ہیں۔ پہلے ہم بااختیار تھے، ہم نے جیسا چاہا ہندوستان کو بنایا، اب جو کچھ اس سرزمین پر ہے وہ ہمارا بنایا ہوا ہے۔

دہلی ہمارا بنایا ہوا ہے، لکھنؤ ہمارا بنایا ہوا ہے، الہ آباد ہمارا بنایا ہوا ہے، عظیم آباد ہمارا بنایا ہوا ہے، لال قلعہ، لاہور کا قلعہ، فتح پور سکری، جامع مسجد، تاج محل، شالیمار باغ، گرینڈ ٹرنک روڈ ہمارا بنایا ہوا ہے۔ زبانِ شیریں ہماری بنائی ہوئی ہے۔ غزل ہماری بنائی ہوئی ہے، عمدہ کھانے ہمارے بنائے ہوئے ہیں، عمدہ لباس ہمارے بنائے ہوئے ہیں یہ وہ چیزیں ہیں جو صرف ہندوستان کی تعریف نہیں حاصل کر رہی ہیں، ملکوں ملکوں سے تعریف کے ڈونگرے برستے ہیں۔ کتنے انگریز مسلمانوں کا کھانا کھا کر اس کی لذّت سے مست ہو کر مسلمان ہو گئے۔ سینکڑوں انگریز اُردو کے شاعر بن گئے انگرکھا، کنٹھے دار کُرتے، چست پاجامے، کامدار سفید ٹوپی اور ناگرہ پہننے لگے۔ شاعری کرنے لگے، غزل پڑھنے لگے اور محفلوں میں آداب عرض کرنے لگے۔ اب بھی ایسا ہی ہوسکتا ہے، لیکن اب ہم بااختیار نہیں ہیں، تو آخر کے تین بندوں میں وہی تصویر ہے جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں، جو ہم بنانا چاہتے ہیں۔ اگر ہم نہیں دیکھ سکے، ہم نہیں بنا سکے۔ تو ہمارا نقصان بہت کم ہے۔ اس ملک کا بہت نقصان ہے، ہمارا ایمان انشاءاللہ کوئی نہیں لے سکتا، ہماری جان جا سکتی ہے لیکن اس ملک کی آن بان شان سب چلی جائے گی۔ خوش قسمت ہوگا ہندوستان اگر ایسا ہونے سے پہلے اس کی سمجھ میں آ جائے:

خرد کی عقل میں اے کاش آ جائے
جنوں سے بڑھ کے ہشیاری نہیں ہے

مرا وطن

سنو سنو کہ مرا حاصلِ سخن ہے یہی — مرا خیال، مری فکر، مرا فن ہے یہی
جلا رہی ہے جو سینے کو وہ جلن ہے یہی — مرا پیار یہی تو یہی لگن ہے یہی
میں ایک شمع ہوں اور میری انجمن ہے یہی
مرا وطن ہے یہی

پھوار بن کے برستے ہیں رنگ و نور یہاں — ہے پارساؤں کو بھی بے پئے سرور یہاں
یہ وہ جگہ ہے کہ مٹّی کو ہے غرور یہاں — ہوا بھی رہتی ہے مستی سے چور چور یہاں
زمین لالہ و نسرین و نسترن ہے یہی
مرا وطن ہے یہی

نہ چشم مست نہ رخسارِ لالہ فام کہیں — نہ ایسے ماہ و شانِ سبک خرام کہیں
نہ ایسے شاعرِ خوش فکر و خوش کلام کہیں — نہ ایسی صبح کہیں ہے نہ ایسی شام کہیں
دیارِ حسنِ رُخ و زُلفِ پُرشکن ہے یہی
مرا وطن ہے یہی

ہر ایک رنگ میں پیدا ہے حسن کا پہلو — ہمالہ اس کی بھویں اور ندّیاں گیسو
بہار میں شبِ وعدہ کی جاگتی خوشبو — خزاں میں صبحِ عروسی کا بولتا جادو
سدا بہار سہاگن ہو وہ دُلہن ہے یہی
مرا وطن ہے یہی

یہی ہے ہاتھوں میں جس کے ہے پریم کی مشعل — چھلکتا جاتا ہے کندھوں پہ جس کے گنگا جل
اسی کے پاؤں میں ہے بحرِ ہند کی چھاگل — یہی ہے ماتھے پر رکھا ہے جس کے تاج محل
گلے میں جس کے چمکتا ہے نورتن ہے یہی
مرا وطن ہے یہی

وہ حسن جن کے مدھر گیت ہیں میرے اشعار — اسی چمن کی خزاں ہے اسی چمن کی بہار
ہیں زینتِ رُخ و گیسو یہیں کے گردو غبار — وہ گل یہی ہے جو ہے اپنا طرۂ دستار
وہ کانٹا جس میں اُلجھتا ہے پیرہن ہے یہی
مرا وطن ہے یہی

میں ایک خواب ہوں تعبیرِ خواب ہے اس میں — اِک اِک سوال کا میرے جواب ہے اس میں
وفا کے پھولوں کا پنہاں شباب ہے اس میں — بسا ہوا دلِ خانہ خراب ہے اس میں
لہو سے جس کو نکھارا ہے وہ چمن ہے یہی
مرا وطن ہے یہی

خزاں کی دُھوپ میں یا اَبرِ نوبہاری میں — حیات گزری ہے پھولوں کی پردہ داری میں
کمی نہ آئے گی گلشن کی آبیاری میں — یہی رہے گی جولالی ہے کیاری کیاری میں
صدائے خونِ رگِ شیخ و برہمن ہے یہی
مرا وطن ہے یہی

زندگی

'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' میں صفحات چار سو پہنچ گئے تو قلم رکھ دینا پڑا۔ ٹھیک اسی طرح کہ شدید بھوک میں دو چار نوالے حلق سے پار گئے تو سامنے سے دستر خوان اُٹھ گیا۔ ہاتھ چاٹتے رہ گئے، بھوک جاتی کیا اور بڑھ گئی۔ 'ابھی سن لو مجھ سے' شروع کی تو اُمید تھی بات کچھ پوری ہو جائے گی، پوری کیا ادھوری بھی نہیں ہو سکی۔ 'دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی'۔ کیا زمانہ تھا جب سامان تھا۔ تحریر کے اتنے وسائل نہ تھے۔ قلم تراشو، کاغذ مہیّا کرو، پھر روشنائی بناؤ، سرکنڈی لاؤ، نرکٹ لاؤ، لکھو اس کے باوجود دس دس بیس جلدیں ایک ایک موضوع پر لوگ لکھ ڈالتے تھے۔ اور وہ ہاتھوں ہاتھ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے تھے۔ اب لکھنے پڑھنے کی آسانیاں ہیں، جتنے قلم چاہو گھر بیٹھے منگوالو۔ کاغذ کی فراوانی ہے۔ فرصت بھی کچھ نہ کچھ نصیب ہوگئی، لکھو تو کیوں؟ لکھو کسی لیے لکھو؟ ہاتھوں ہاتھوں کون لے اور پاؤں پاؤں کب تک چلے:

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ

خود مٹّی بنو، خود چاک بنو اور خود ہی گڑھو، اور ڈھیر لگا دو۔ کبھی کبھی کوئی ٹھوکر مارنے آ جائے گا۔ اب تو یہ شیطانی آرٹ چل پڑا ہے کہ Satanic verse لکھو اور بھاگ جاؤ۔ موت کا فتویٰ لگے گا اور اتنا پروپیگنڈا ہوگا، اتنے لوگ اس کے متعلق ہو لیں گے، اتنی اشتہار بازی ہو جائے گی کہ لاکھوں لاکھ جلدیں گھروں کی طرف اُڑنے لگیں گی۔ 'لچّا' کہیے اور دُنیا آشنا ہو جائے بلکہ ملک آشنا ہو جائے۔ فرشتے سیخ لیے استقبال کو منتظر رہیں گے۔ یہاں بھی استقبال وہاں بھی استقبال۔ میں نے دو چار ورق 'رشدی' کے Satanic virse کے پڑھے اور لاحول بھیجا، شیطان پر نہیں بلکہ اس جاہل پر جو اپنی جہالت سے بھی دنیا کو اس قدر بے وقوف بنا سکتا ہے۔ دنیا میں جتنے خرافات ہو رہے ہیں ان پر لکھئے اور پیشگی نذرانہ کڑوروں کا حاصل کر لیجیے، بل کلنٹن کی داستانِ معاشقہ کی کہانی لکھئے اور لاکھوں پونڈ پبلشر صاحب سے پیشگی نذرانہ وصول کیجیے اور لوگ بھی اس قسم کی تیسری سطح نہیں، چوتھی سطح کی کتاب ایسی رغبت سے پڑھیں گے جیسے انجیل اور

تو رات بھی نہیں پڑھتے ہیں۔ لہنگے کی داستان اور پینٹ کی کہانی، ہوٹل کے کمرے کی کہانی، کینڈی کی فحاشی کی داستان، کڑوروں ڈالر چھپّر پھاڑ کر گھر میں ڈال گئی یا پھر اخبار نکالیے رسالے شائع کیجیے۔ آپ اُن پر، وہ آپ پر تبصرہ کریں۔ آپ اُنھیں حاجی کہیے وہ آپ کو حاجی کہیں، بس چلایئے کاروبار اور گھر بیٹھے کمایئے۔ ایک چراغ اس گھر سے اُٹھا لیجیے، اِک دِیا وہاں سے لے آیئے اور اپنے گھر میں چراغاں کر لیجیے۔ کچھ اقتباسات یہاں سے نکالیے، کچھ وہاں سے لیجیے، ہر اقتباسات پر دو چار سطریں ایسی زبان میں جو وہ سمجھیں یا ان کا خدا سمجھے، ہر اقتباسات پر چپکا دیجیے اور مصنف، مولف، نقاد اور محقق بن جایئے۔ خیر یہ مرض عام ہو گیا بلکہ مرض مرض نہ رہا بلکہ صحتِ عامہ بن گئی، خیر چھوڑیئے۔

تو 'ابھی سن لو مجھ سے میں' نے علی عباس صاحب پر کچھ صفحے لکھے اور قلم روک لینا پڑا کہ کہاں تک کہانی لے جاؤ گے؟ پیسے ہیں؟ کیسے چھپواؤ گے؟:

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

سیّد علی عباس صاحب ڈی آئی جی پٹنہ پولیس مے اسکاٹ لینڈ میں ٹریننگ حاصل کی، پٹنہ میں شہر کوتوال یعنی پٹنہ ضلع پولیس کے انچارج سینئر ایس پی تھے، جب ان سے ملاقات ہوئی، شاید گذشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں اُن سے ملاقات ہوئی اور تقریباً چالیس سال تک یہ دورِ ملاقات رہا۔ اس میں محبت، جان نثاری، سخن فہمی، شاعر پرستی، مردم شناسی اور اعلیٰ درجہ کا ذوقِ شاعری جس میں جدید و قدیم کا بہترین امتزاج تھا، یہ چند صفات جو بالکل سامنے کی صفات ہیں، یہ صفات منفرد نہیں مرکب ہیں۔ ان میں کتنے خانے ہیں اور کتنے خانوں کا میں مشاہدہ کر سکا اور کتنے ایسے ہیں جہاں تک اس طویل شناسائی کے دَور میں بھی میری رسائی نہ ہو سکی، ان کے رٹائرمنٹ کے دن پٹنہ یونیورسٹی میں جلسہ ہوا جہاں کے یہ قدیم اسٹوڈنٹ تھے اور میرے استاد اخترؔ اور رینوی صاحب کے ہم سبق نہیں ہم عصر تھے۔ ہم سب بھی کہ کالج کے دورِ اوّل میں دونوں سائنس کے طالب علم تھے پھر اخترؔ صاحب اُردو کی طرف چلے آئے۔ عباس صاحب سائنس ہی میں رہے۔ تعلیم اور ماحول کے اختلاف کے باوجود جو ذوقِ شعری عبّاس صاحب میں تھا اور جو گداز قلب پولیس ہونے کی باوجود اللہ نے انھیں عطا کیا تھا وہاں تک میرے استاد اخترؔ اور رینوی صاحب کی رسائی بھی نہیں تھی، یہ نظم جو عباس صاحب پر اس جلسے میں اخترؔ صاحب کے ایما سے

پڑھی گئی میں نے عباس صاحب کی زندگی اور شخصیت کا غائبانہ تعارف تمہیدی بندوں میں کیا ہے۔عباس صاحب کی زندگی کے گونا گوں پہلو تھے،جن کا احاطہ میں کر بھی نہیں سکا۔کیا نہیں تو لکھوں کیا؟ نگاہ پسِ پردہ نہ جاسکی۔بہت سے جلوے جو عباس صاحب کی شخصیت کے میرے سامنے آئے ان جلوؤں کے پسِ پردہ کتنے جلوؤں کی قطار میں محسوس کر رہا تھا مگر ان کو نام دینے سے قاصر تھا۔ان جلوؤں کی مہک ان کے جملوں میں مل جاتی جو وہ شعر وسخن کے موضوع پر اشعار سن کر بول جاتے ان کی تشریح میں نہیں کرسکتا۔انھوں نے زندگی کے طویل تجربات حاصل کیے۔ انسان دوستی، دوست پرستی، محبت، وفاداری، جاں سپاری، خطر پسندی یہ عنوانات ہیں جن کے تحت ان کی شخصیت بہت سے تجربات سے گزری جو عام زندگیوں میں کیا خاص زندگیوں میں نہیں پائے جاتے۔ ان جلوؤں کی طرف میں نے تمہیدی بند کے اشعار میں اشارے کیے ہیں۔ وہ دوستی کرتے تھے مگر دوستی کرتے نظر نہیں آتے تھے۔محبت کرتے تھے مگر محبت کرتے نظر نہیں آتے تھے، خدمت کرتے تھے مگر خدمت کرتے نظر نہیں آتے تھے۔قربانی کرتے تھے مگر پسِ پردہ رہتے تھے، کام کرگزرتے تھے مگر سامنے نہیں آتے تھے۔جب وہ میرے شعر سنتے تو ان کا وجود ساکت ہوجاتا۔وہ داد نہیں دیتے اس لیے کہ وہ شاعری کے ساتھ اور شاعر کے تجربات کے ہمراہ سفر کر جاتے،جب واپس آتے تو صرف 'ہوں' کرتے اور گولڈ فلیک کا ڈبّہ اور ماچس ہاتھ میں لیے اُٹھ جاتے۔کس وقت میرے یہاں ٹپک پڑتے اس کی کوئی نشان دِہی پہلے سے نہیں ہوتی۔اگر میں مل جاتا تو کہاں لے کے وہ مجھے نکل جاتے اس کی نشان دِہی بھی نہیں ہوتی، جہاں آتے، جہاں مجھ سے ملتے یا جہاں مجھے لے جاتے تو وہ ہوتے اور ان کے سگریٹ کا ڈبّہ۔مہین اور دھیمی گفتگو،ایسی جو کسی بھی پڑھے لکھے انسان یا ادیب وشاعر کا موضوعِ گفتگو نہیں ہوتا۔وہ سب سے الگ نظر آتے اور سب کے درمیان نظر آتے۔ میں اُن کی خاموش اور دھیمی گفتگو میں محو ہوجاتا۔میرا دل کھل جاتا،میری شاعری کا ہم نوا مل جاتا۔وہ مجھے پہچان جاتے مگر انھیں میں نہیں پہچان پاتا، ایک سحر ہوتا، ایک فسوں ہوتا، جو اُن کی خاموش شخصیت مجھ پر طاری کردیتی۔پھر وہ ترغیب دیتے اور میں اسی عالمِ فسوں کاری میں دو چار پانچ اشعار پڑھ جاتا، پھر وہ فسوں زدہ ہوجاتے۔میرے پڑھنے کے بعد بھی دیر تک فسوں زدہ رہتے۔نہایت شدید سنجیدگی میں ہونٹ بھینچے،خلا میں دیکھتے رہتے، پھر مسکرا دیتے اور بول اُٹھتے کلیم صاحب آپ زندہ رہیے، آپ کی محبوبہ زندہ رہے۔ (اِندرا گاندھی) پھر اور کسی چیز کی دنیا کو فی الحال ضرورت نہیں، پھر

کھانے کا دَور چلتا، کبھی اکبر ہوٹل میں جو فریزر روڈ پر تھا، کبھی ان کے گھر میں جو اسی روڈ پر تھا۔
وہ چند روز اسپتال میں رہے اور میں ان کے بستر کی بغل میں کرسی پر۔ بسترِ مرگ پر بھی ان کی شخصیت کا حسن اور ان کے گداز قلب کی آنچ اور ان کی نہایت لطیف ذوقِ شعری کی کرنیں ویسی ہی زندہ اور تندرست رہیں وہ کبھی کبھی کہتے آپ کے محبوب کا کیا حال ہے، کوئی پیغام آیا ہے؟ اور میں اس قسم کے اشعار انھیں سنا دیتا:

اس نے یادیں اپنی بھیجی ہیں کہ جا کر پوچھیو
مری یاد آتی تو ہے عاجؔز غزل کہتے تو ہیں

وہ مسکرا دیتے اور پھر جلد ہی انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور مجھے ایسا لگا کہ میرے تمام کلؔیم شناسوں کی آنکھیں بند ہو گئیں، میری پہچان وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ عباس صاحب کی میراثِ سخن شناسی کسی کو نہیں ملی۔

زندگی

(عباس صاحب کی سبکدوشی کے موقع پر)

زندگی کیا ہے یہ پہچان بہت عام نہیں
زندگی لیل و نہار و سحر و شام نہیں
زندگی سلسلۂ گردشِ ایام نہیں
یہ فقط درد نہیں یہ فقط آرام نہیں
تشنگی صرف نہیں، صرف مئے و جام نہیں
زندگی اور بھی ہے جس کا کوئی نام نہیں

زندگی کیا ہے یہ کم کوئی سمجھ پاتا ہے
زندگی حسن کی سرکار کا ہے حسنِ عمل
جیسے برسات میں اُمڈا ہوا تہہ تہہ بادل
رمز وا ایما سے ہو جیسے کوئی بھرپور غزل
دن کو کچھ اور نظر آتا ہے یہ تاج محل
چاندنی رات میں کچھ اور نظر آتا ہے

کیا دِکھائیں اُسے جو دیکھنے والا نہ بنے

ہوں تماشائی تو ہو جائے تماشا بھی یہاں
اہلِ بازار بھی، بازار بھی، سودا بھی یہاں
پردہ دَر بھی یہاں صاحبِ پردا بھی یہاں
وادیِ نجد بھی، محمل بھی ہے، لیلیٰ بھی یہاں

شرط ہاں یہ ہے کہ پہلے کوئی دیوانہ بنے

لیجیے ہم کہتے ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

بزم اِک جسم ہے عباس نہیں دل ہیں یہی
محفل آراستہ ہے رونقِ محفل ہیں یہی
نظم میری ہے مگر نظم کا حاصل ہیں یہی
مرے افکار و خیالات کی منزل ہیں یہی

قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ان کے قیدی جو ہیں وہ قیدیِ زنجیر نہیں

کوئی قابو میں نہیں پھر بھی ہے سب پر قابو
ان کے تیور ہیں فسوں، ان کا تبسّم جادو
ایک اِک بات میں پوشیدہ ہیں سوسو پہلو
مئے پلاتے ہیں مگر جام نہ شیشہ نہ سبو

قتل کرتے ہیں مگر ہاتھ میں شمشیر نہیں

تو تو اے دوست بڑا ظالمِ دوراں نکلا

گفتگو ہے تری جلاّد خموشی قاتل
جینا دُشوار ترے ہجر میں مرنا مشکل
کچھ ہمیں پر نہیں موقوف یہ کیفیتِ دل
بوئے گُل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

کہانی

یہ کہانی ہے میری اور اُس کی جسے میں نے اپنی غزل کا محبوب بنایا ہے، جس کی باتیں غزل میں کہتا ہوں۔ اُس کے جلووں کی باتیں، اس کے ناز کی باتیں، انداز کی باتیں، چال ڈھال کی باتیں، رفتار گفتار کی باتیں، اس کے لب و رخسار کی باتیں، جس کی بے رُخی خزاں ہے، جس کی توجہ بہار ہے:

خزاں کا دور تیری بے رُخی کو کہتے ہیں
بہار تیری توجہ کا نام ہے پیارے

یا

تیرے ہی تبسّم کا سحر نام ہے پیارے
تو کھول دے گیسو تو بھری شام ہے پیارے

میرے دوست نے جدّہ کے چند جلسوں میں کئی مقالے پڑھے۔ ایک مقالہ کا موضوع یہ تھا کہ جس نے کلیم عاجؔز کی غزلوں میں ضمائرِ مخاطب کو سمجھ لیا۔ تُو، وہ، آپ، میری، تمھاری، آپ کی۔ یہ تُو، یہ وہ، یہ آپ کون ہے؟ جس نے یہ سمجھ لیا اس نے کلیم عاجؔز کو، ان کے فن کو، ان کی شاعری کے تمام پہلوؤں کو سمجھ لیا۔ تو وہی جسے تقریباً چالیس سال سے مخاطب کر رہا ہوں۔ چار سو سے زیادہ غزلیں لکھ لیں۔ ہر شعر ایک جلوہ ہے، ایک رنگ ہے، ایک پہلو ہے۔ کتنے شعر کہہ دیئے، کتنی غزلیں کہہ دیں لیکن بات ابھی پوری نہیں ہوسکی ہے اور شاید پوری نہیں ہوسکے گی، تصویر ادھوری رہے گی:

کب دیکھئے تیار ہو ہم خونِ جگر سے
اِک شوخ کی تصویر بنانے میں لگے ہیں

....

پیارے تیری صورت سے بھی اچھی ہے جو تصویر
رکھی ہے تجھے میں نے دکھانے کے لیے آ

....

میں نے لیکن جو غزلیں کہی ہیں   رکھ دیا جن میں دل چیر صاحب

ایک تصویر ان سے بنی ہے دیکھئے تو یہ تصویر صاحب!

……..…………

میں نے تیار کی ہے جو اشعار سے کس قیامت کی تصویر ہے آپ کی
میں دِکھاؤں وہ تصویر اگر آپ کو آپ حیرت سے تصویر بن جایئے

……..…………

تو یہ نظم ہم ہی دونوں کی کہانی ہے۔ یہ کہانی بھی گویا ایک غزل ہی ہے، جو دو جلدوں کے مجموعۂ کلام میں مکمل نہیں ہوسکی ہے وہ چند اشعار کی ایک نظم میں کیا کہی جاسکے گی لیکن بایں ہمہ یہ کہانی اسی کی اور ہماری ہے۔ یہ ہماری تاریخ بھی ہے اور اس کی تاریخ بھی ہے یعنی تاریخ کا ایک مختصر پہلو ہے، مختصر حصہ ہے۔ جس طرح میری کوئی غزل سن کر ہم دونوں کا ایک جلوہ لوگوں کی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے اسی طرح اس نظم میں بھی بہت سی کہانیوں میں ایک کہانی سامنے آجاتی ہے۔ اس سلسلے میں مزید وضاحت کرنا نظم یا شعر کی خوبصورتی کو زائل کردے گا۔

اس نظم کے چار حصے ہیں۔ شروع کے پانچ اشعار کے بند میں تمہید ہے۔ اس کے بعد چار بند کے آٹھ اشعار میں میرا کردار ہے یا میرے کردار کا ایک پہلو ہے، جس کی سچائی پوری تاریخ ہے، یہ میرا تعارف ہے۔ اس کے بعد کے چار بند کے نو اشعار میں اس کا تعارف اور تصویر ہے۔ دسویں بند کے تین اشعار میں میر مکالمہ اور آخر کے تین اشعار میں اُس کا ناز، آواز، تیورا اور چوتھے شعر میں اس کا فیصلہ ہے۔ اس کا فیصلہ تاحال قائم ہے۔ اس کے دونوں حکم جاری اور ساری ہیں اور اب تک اسی پر عمل ہے۔ مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔ میرا کردار اور اس کی تصویر اتنا واضح ہے کہ پڑھتے ہی میرے محبوب کا نقشہ اور اُس کے اعمال و کردار آئینہ کی طرح صاف نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کا فیصلہ بھی بالکل جنچا تلا، نپا ہوا ہے، جیسی شبیہ پیش ہوئی ہے، اس شبیہ کا فیصلہ بالکل ہم آہنگ ہے۔

کہانی

آیئے ہم سے آپ اِک آج کہانی سنیئے
آج تک ہم سے بہت شعر و غزل سنتے رہیے
اور ہر شعر کی تاثیر پہ سر دُھنتے رہے
آج اس شعر و غزل کا پس منظر سنیئے
ہم تو شاعر نہ تھے شاعر ہوئے کیونکر سنیئے

ہر چمن میں رہے ہم فصلِ بہاراں کی طرح
سوکھے کھیتوں پر برستے رہے باراں کی طرح
ہر گلی ہم سے رہی کوچۂ جاناں کی مثال
ہم سے ہر شہر رہا شہرِ نگاراں کی طرح

کسی دامن کے لیے ہم نہ کبھی خار بنے
پھولوں کا ہار بنے طرۂ دستار بنے
چاہنے والے بنے دوست بنے یار بنے
ہم تو نغمہ بنے سنگیت بنے پیار بنے

پیار جس کو کیا حسن اس کا دو بالا ہی کیا
اِس طرح اس کو سنوارا کہ نرالا ہی کیا
جس طرف نکلے ادھر شمع جلائے نکلے
جس کے گھر میں گئے اس گھر میں اُجالا ہی کیا

عمر بھر خاک اُڑائی ہے محبت کے لیے
قیس و فرہاد کے ہم بھی رہے شامل شامل
ہم نے تو چاہا اُسے بھی کہ جسے دیکھتے ہی
لوگ بے ساختہ بول اُٹھتے ہیں قاتل قاتل!

جس کی صورت ہے زمانے کے لیے وجہِ سرور
جس کی سیرت ہے ہزاروں کے لیے تیرِ قضا
جس کا دل سنگ دَہن پھول زباں موجِ نسیم
جس کی ہر سانس میں پوشیدہ ہے سو موجِ بلا

انگلیاں جس کی لچک جاتی ہیں نشتر کی طرح
جس کے بازو خم شمشیر کو شرماتے ہیں
جس کی زُلفوں کی طرف دیکھتے ہی یادوں میں
رسن و دار کے افسانے اُبھر آتے ہیں

آنکھیں کہتی ہیں کہ میخانہ سلامت ہے ابھی
اب بھی شیشوں میں مئے ہوش رُبا باقی ہے
اب بھی اَبرو یہی کہتے ہیں کہ ہشیار رہو
خنجروں میں ابھی تیزیِ ادا باقی ہے
اب بھی سیندور میں اربابِ وفا کا ہے لہو
ہونٹوں پہ سُرخیِ خونِ شہدا باقی ہے

حسن میں فرد وہی ظالم و بے درد وہی
ہائے کمبخت دل آیا بھی تو آیا کس پر
وہی قاتل وہی مخبر بھی ہے منصف بھی وہی
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

میں نے اندازِ غزل میں کہا اے جانِ جہاں
کچھ تجھے جان نثاروں کی خبر ہے کہ نہیں
تیری آنکھیں مئے و مینا سہی میخانہ سہی
وقت کے تشنہ لبوں پر بھی نظر ہے کہ نہیں
میں جو اِک عمر سے دل تھامے غزل کہتا ہوں
تجھ پہ بھی کچھ اثر دردِ جگر ہے کہ نہیں

جس طرح کوئی قفس اپنے سرہانے رکھ کر
نالۂ بے بسیِ مرغِ گرفتار سنے
اس نے سو ناز، سو انداز سے نظروں کو اُٹھا
آنسوؤں کو میرے دیکھا میرے اشعار سنے
اور پھر اس طرح جسے ناز بھی نخوت بھی کہیں
ایسے لہجے میں جسے زہر بھی اَمرت بھی کہیں

آنسوؤں سے یہ کہا 'بہتے رہو بہتے رہو'
اور مجھ سے کہا 'تم شعر و غزل کہتے رہو'

یہ زخم سینہ نہیں تمغۂ ہنر ہے سراجؔ

پٹنہ وقف بورڈ کے سیکریٹری سیّد محمد سراج معزز خاندان کے چشم و چراغ۔ بھرپور جوانی، شادی شدہ، شاید دو کمسن بچیاں، بورڈ میں جو بدعنوانیاں ہوتی ہیں ان بدعنوانیوں کے شباب میں سیکریٹری کا منصب سنبھالا اور خود کو بڑے جوکھم میں ڈال کر اس منصب کی بدعنوانیوں پر قابو پانے کی کوشش کی۔ دیانت داری میں مشہور ہو گئے، شکرگزاروں کی تعداد بڑھی لیکن ان سے زیادہ ناراضمندوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ آخر دیانت داری کا انعام حاصل کرنے کا وقت آ گیا۔ اور بورڈ کے دفتر ہی میں کسی ناراضمند نے انھیں ریوالور کی گولی کا نشانہ بنایا۔ دفتر سے انھیں اسپتال میں منتقل کیا جا رہا تھا کہ کسی ذریعے سے مجھے اطلاع ملی۔ میں ان سے واقف تھا، ان کے دوسرے بڑے بھائیوں سے گہری ملاقاتیں تھیں مگر ان سے نہیں ملا تھا۔ شاید صورت آشنا بھی نہیں تھا۔ میں بھی اسپتال دوڑا تو فوراً ہی انھیں اسپتال کے بیڈ پر پشت کے ساتھ تکیہ لگا کر نیم دراز کیا گیا تھا۔ خون کے نشانات اِدھر اُدھر تھے۔ اور سینے پر پٹّی بندھی ہوئی تھی اور پٹّی کے اندر سے خون رِس کر سفید پٹّی پر ایک بڑا سُرخ گول نشان بنا چکا تھا۔ میں پہنچا تو وہ گویا بیہوش تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور سانس زور زور سے چل رہی تھی۔ میں نے سینے پر ہاتھ رکھا تو انھوں نے بہت ذرا سی آنکھ کھول کر مجھے دیکھا۔ ایک نہایت غیرمحسوس سی مسکراہٹ ہونٹوں پر نمودار ہوئی، پھر مسکراہٹ بھی گئی اور آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔ شاید اسی وقت انتقال ہوا یا کچھ دیر بعد۔ میں سمجھ گیا کہ انتقال ہو گیا یا ہو رہا ہے۔ میں سیدھا یونیورسٹی چلا آیا۔ لڑکے آئے، میں نے حاضری لے کر کلاس ختم کر دی اور وہیں کلاس میں ٹیبل پر بیٹھ کر نظم لکھی۔ صدر شعبہ ڈاکٹر ممتاز احمد آ گئے۔ وہ بغل میں بیٹھے رہے۔ میں نظم لکھتا رہا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں نظم تیار ہو گئی۔ ممتاز صاحب بیٹھے رہے، جب میں نے آخر شعر لکھا، انھوں نے چند لڑکوں کو بلایا۔ سب کے ہاتھ میں کاغذ دیا اور خود نظم پڑھتے رہے اور لڑکوں سے نقل کرواتے

رہے۔ دو تین نقلیں اس وقت پٹنہ کے مقتدر اُردو اخباروں کو بھجوائیں۔ سراؔج کا انتقال ہو چکا تھا۔ دوسرے دن تین چار اخباروں میں اسی سُرخی کے ساتھ شائع ہوئی، اور گھر میں دوسرے دن بھی نظم پڑھتے ہوئے کہرام پڑا۔ بورڈ کا دفتر چل رہا ہے۔ دفتر والے چل رہے ہیں۔ پیون، دربان، کلرک، منشی، ڈائریکٹر، سکریٹری، چیئرمین سب چل رہے ہیں، لیکن کس زمین پر چل رہے ہیں۔ خوردبین سے بھی دیکھوگے تو کوئی نقش اُبھرا ہوا نظر نہ آئے گا۔ جیسے کسی میں وزن ہی نہیں، کسی کے پاؤں میں، ہاتھ میں کوئی لکیر ہی نہیں، سب سپاٹ ہیں۔ دیکھنے میں بھاری بھرکم لیکن ترازو پر دیکھو تو ماشہ دو ماشہ بھی تول نہیں، نقش بنے تو کیسے؟ باپ دادا سے ترکے میں جو وزن، جو ریکھائیں لاتے ہیں وہ بھی گھنٹہ دو گھنٹہ نہیں چلتا۔ غیرت داروں کا ترکہ بے غیرتوں کے یہاں نہیں رہ سکتا۔

یہ زخم سینہ نہیں تمغۂ ہنر ہے سراؔج

یہ تُو جو شوق سے باندھے ہوئے کمر ہے سراؔج
ٹھہر بتا کہ ارادہ ترا کدھر ہے سراؔج
لگی ہوئی تری کس سمت کو نظر ہے سراؔج
کس آستانے کی جانب ترا سفر ہے سراؔج
یہ کس طرح کی تجھے مستیِ سفر ہے سراؔج
کہ اپنوں کی نہ پرایوں کی کچھ خبر ہے سراؔج
بلاوا کس کا ہے اور کون لینے آیا ہے
ہے انتظار کہاں کون منتظر ہے سراؔج
کہاں سے آیا ہے یہ سُرخ پیرہن تیرا
یہ کیسا پھول ہے جو تیرے سینے پر ہے سراؔج
تمام فرش ہے قدموں میں سُرخ پھولوں کا
بڑی سجائی ہوئی تیری رہ گزر ہے سراؔج
تو اتنے نشے میں ہے کون دے جواب اس کا
کہ یہ سوال ہر اِک کی زبان پر ہے سراؔج

بھلا یہ جانے کا بھی کوئی وقت ہے پیارے
یہ کوئی موقعِ موسمِ سفر ہے سراؔج
ابھی تو دن بھی نہیں ڈھل سکا ہے پوری طرح
ابھی تو تیری جوانی کی دوپہر ہے سراؔج
ابھی تو شام ہی ہونے میں دیر کافی ہے
پھر اس کے بعد ہے شب تب کہیں سحر ہے سراؔج
ابھی تو لوگ بہت آس پاس بیٹھے ہیں
ابھی تو کام بہت تیرا منتظر ہے سراؔج
ابھی تو ایک جہاں ہے امیدوار ترا
ابھی تو وقت کی تیری طرف نظر ہے سراؔج
اُمیدواروں کو تو کس پہ چھوڑے جاتا ہے
یہ بوجھ کون اُٹھائے گا کس کا سر ہے سراؔج
بہت مکانوں میں تونے جلا دیئے ہیں چراغ
مگر اندھیرا اندھیرا ترا ہی گھر ہے سراؔج
دِکھایا تونے کہ جیتے ہیں اہلِ دل کیسے
اگرچہ جینا بڑا سخت دردِ سر ہے سراؔج
چراغ تھام کے ہاتھوں میں لوگ چلتے ہیں
ترا چراغ مگر تیرے سینے پر ہے سراؔج
پتہ چلا تجھے مرنے کا فن بھی آتا تھا
یہ زخمِ سینہ نہیں تمغۂ ہنر ہے سراؔج

ڈوب مرنے کا مقام آیا

ایک شام غلام سرور صاحب سے ملاقات ہوئی جب وہ جنتا پارٹی کی بہار صوبائی حکومت کے وزیر تعلیم تھے، حکومت ختم ہوجانے کے بعد کچھ مایوس اور کم آمیز ہوگئے تھے۔ انھیں ہمیشہ چاق و چوبند پُر اُمید اور باعزم رہنے کی تلقین کرنے کے لیے کبھی کبھی مل لیتا تھا۔ انھوں نے 'سنگم' اخبار کی ایک سُرخی اور اخبار کا اداریہ مجھے دِکھایا۔ اس ملک میں ہی نہیں دنیا کے تمام حصّے میں حسّاس مسلمانوں کو اپنوں ہی کے کسی عمل سے سخت چوٹ لگا کرتی ہے اور شاید یہی مسلمانوں کی تاریخ کی اہم خصوصیت بھی ہے کہ اس ملّت میں ایسے ایسے واقعات چھوٹے یا بڑے اور ایسے ایسے افراد چھوٹے یا بڑے پیدا ہوتے رہیں گے جو اس ملت کے دل پر اس ملت کے وجود پر چھوٹی یا بڑی ضرب لگاتے رہیں گے اور اُمتِ مسلمہ کے غیور، دردمند اور باحمیت لوگ تڑپ جایا کریں گے اور تڑپ کر کچھ نہ کچھ کر گزریں گے۔

وہ خبر یہ تھی اور اخبار کا اداریہ اُسی خبر پر حرارت زدہ دل کے تڑپ کی دھیمی اور مختصر آواز تھی کہ دہلی کے ائمہ مساجد کی تنظیم نے موجودہ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کو اپنے محافظ، مددگار اور سرپرست کی حیثیت سے تلوار پیش کی اور طالب وخواستگار ہوئے کہ مسلمانوں کے امام اور حکومت وملک کے وفادار ہونے کی حیثیت سے وہ اس بات کے حقدار ہیں کہ ان کی تنخواہیں بھی حکومت کے ملازمین اور نمک خواروں کی سطح پر لائی جائیں، ان کی ملازمت کی ضمانت دی جائے۔ ان کے لیے بھی وہی مراعات منظور کی جائیں جو حکومت کے دوسرے ملازمین کے لیے قانون میں منظور کی گئی ہیں۔ اُنھیں سرکاری رہائشی مکانات دیئے جائیں وغیرہ وغیرہ۔

خبر دیکھ کر اس شب مجھے نیند نہیں آئی اور جی چاہا کہ غیرت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ چہرہ نہ کسی کو دِکھایا جائے نہ کسی کا چہرہ دیکھا جائے مگر یہ دونوں باتیں اُس سپاہی کے مترادف ہوئیں جو سینے پر زخم کھا کر گھٹنے ٹیک دیتا ہے اور اپنی شکست تسلیم کرلیتا ہے۔ زخم تو ہمارا مقدر رہے کہ ہم چوٹ کھا کر ہی اپنا جوہر دِکھاتے ہیں۔ ہم کسی پر حملہ نہیں کرتے مگر جب حملہ ہوجاتا ہے تو ہم نئی طاقت حاصل کرتے ہیں۔ ہر چوٹ پر نیا حوصلہ، ہر ضرب پر نئی توانائی سے آگے بڑھتے ہیں یہاں تک کہ ہم

سُرخ رواور کامیاب ہوجاتے ہیں—— تو اسی شب میں نے یہ نظم تخلیق کی اور صبح کو 'سنگم' کو بھیج دی۔ دوسرے دن وہ شائع ہوئی اور تیسرے دن میں نمازِ صبح مسجد میں ادا کرکے مراد پور سے گزر رہا تھا کہ مراد پور مسجد سے ڈاکٹر عثمانی صاحب نماز پڑھ کر نمودار ہوئے۔ مجھے گزرتے دیکھ کر بے اختیار زور سے میرا نام لے کر پکارا۔ میں سڑک پر رُک گیا تو وہ سڑک عبور کرکے میرے پاس آئے اور لپٹ کر دو آنسو گرائے اور کہا کلیم تم ایسے خیالات کس دل سے برآمد کرتے ہو اور ایسے الفاظ کس لغت سے نکالتے ہو جو حرارتِ جوش، سچائی اور تاثیر سے لہکتے رہتے ہیں:

تم ہوگئے ہو میر تقی میرؔ کی طرح
آگ اپنے دل کی سب کے دِلوں میں لگاؤ ہو

ڈوب مرنے کا مقام آیا

یہ کیسی شب ہے آنے کو یہ کیسا وقتِ شام آیا
زمانہ لوٹنے کو عصمتِ بیت الحرام آیا
حمیت پر بڑا الزام آیا اِتّہام آیا
چمن میں روتی ہے بلبل کہ شاہیں زیرِ دام آیا
تڑپ جی کھول کر اے دل تڑپنے کا مقام آیا

وہ فتنہ جو اُٹھاتا ہے جنازہ پارسائی کا
جو فتنہ دوست ہے شیطاں کا دُشمن ہے خدائی کا
گلا ہی گھونٹ دیتا ہے جو ہمّت آزمائی کا
سبق جو مقتدی کو گھر میں دیتا ہے گدائی کا
وہ فتنہ داخلِ مسجد ہوا اور تا اِمام آیا

جسے سونپی گئی ہے دین و ملت کی نگہبانی
قیامت ہے کہ وہ بھی ہوگئے صیدِ تن آسانی
زبانِ خوگرِ قرآں پہ جاری مدح سلطانی
کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی
برہمن کیوں نہ خوش ہو شیخ کرنے کو سلام آیا

جو بے پروا رہا ناآشناؤں آشناؤں سے
خودی جس کی نہ تھی مرعوب انسانی خداؤں سے
زمیں والوں میں جو محبوب تھا اپنی اداؤں سے
بدل دیتا تھا گردش آسمانوں کی دُعاؤں سے
ہوس کی آج شمشیر برہنہ سے وہ کام آیا

عطا جس کو ہوئی تھی مسندِ عظمت غزالی کی
جبیں جھکتی تھی جس کے در پہ سرکارانِ عالی کی
جگہ جس کے لیے اسکندر و دارا نے خالی کی
بنالی ہائے اس نے حیثیت اپنی سوالی کی
سرِفہرست شاہاں سے گدا میں اس کا نام آیا

صبا طیبہ کو جا فریاد کر سالارِ مسجد سے
شکایت کا کہاں موقع رہا اغیارِ مسجد سے
کہ توہینِ قبائے دیں ہوئی دیندارِ مسجد سے
صدائے درد آتی ہے در و دیوارِ مسجد سے
کلیؔم اب کیا جیوگے ڈوب مرنے کا مقام آیا

سبب کیا دوستو تم سے بتائیں شدّتِ غم کا
گلہ نامحرمِ دیں سے ہے بڑھ کر دیں کے محرم کا
ستارہ اوج پر جب حکمرانِ وقت کا چمکا
تو آیا مدح کو یوں نائب آقائے دوعالم کا
کہ جیسے سر جھکائے ہاتھ پھیلائے غلام آیا

ہمیں تاریخ پھر افسانۂ عبرت سناتی ہے
یہ اُمت اکثر اپنوں ہی کے ہاتھوں چوٹ کھاتی ہے
وہی دیتے ہیں دھوکا رہنما جن کو بناتی ہے
مزارِ حضرتِ اقبالؔ سے آواز آتی ہے
یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

ریحان پسر ڈاکٹر طیب

طیب صاحب سے میرا مکمل تعارف ہے۔ ان کے لڑکے ریحان ایک صالح نوجوان تھے۔ بہت دردمند، خدمت گزار، منکسر المزاج، مستعد، بے تکلف، شگفتہ مزاج۔ ان کی اپنی ذاتی صفتیں ہی ان کے امتیاز کی ضمانت تھیں۔ ساتھ ساتھ وہ انسانی ہمدردی کے ایک نمایاں نمونے تھے۔ خدمت میں نقصان برداشت کرنے میں بہادر اور کسی خدمت سے کوئی نفع حاصل کرنے کے جذبے سے سخت متنفر، مجھے ان کا بہت قریبی تعارف نہیں تھا، مگر ان کی تعریف اور مدح کرنے والے بہت تھے، ان سے میرا تعارف تھا۔ پٹنہ میں ہی خدمت کے مہم پر نکلے ہوئے تھے، ایسے حادثے کا شکار ہوئے کہ سن کر کلیجہ منہ کو آ گیا۔

انھوں نے ایک عینک کی دُکان کھولی تھی، تنہا اس کے مالک، کارندے اور محنت کش تھے۔ ان کا معاون کوئی نہ تھا، نہ ملازم نہ کوئی شریک دار۔ سننے کے بعد ہمیں ان سے ہمدردی تو پہلے ہی سے تھی۔ ان کے ذریعۂ معاش جن پر ان کے بچوں کی پرورش و پرداخت کا انحصار تھا اس دُکان سے بھی مجھے گہری ہمدردی ہوگئی، وہ چلتی رہے، کوئی نہ ہو تو خریدنے والے جائیں خود پتہ لگائیں کہ اس عینک یا اس شیشہ کی یا اس فریم کی کیا قیمت ہے، اس سے کچھ زیادہ عطا کر کے دُکان میں کہیں رکھ دیں، اور اپنی ضرورت کی چیز لے جائیں۔

بہر حال اللہ نے معاون و مددگار کھڑے کر دیئے۔ مجھے بھی بہت خوشی ہوئی، اور جس جذبے کے اُبھار کے نتیجہ میں یہ نظم فی البدیہہ لکھی گئی۔ اس جذبے کی قدر دانی بھی ہوئی، یہ پندرہ بیس سال پہلے کی بات ہے۔

ڈاکٹر طیب صاحب سلطان گنج کے فرزند
ریحان کے حادثے کا شکار ہونے کے بعد

موریا کمپلیکس کے اندر ایک چشمے کی ہے دُکان میاں
نام ہے اس کا 'پریزما آپٹکس' نام میں گو نہیں ہے شان میاں
کام ہے اس کا آنکھوں پر رکھنا روشنیوں کا سائبان میاں
یہ دُکان اِک جواں نے کھولی تھی کیا کہوں کیا تھا وہ جوان میاں
نیک دل کم سخن سعادت مند نرم گفتار خوش زبان میاں
ہر بڑے اور بزرگ کا خادم اور چھوٹوں پہ مہربان میاں
صحبتِ بد سے دُور کوسوں دُور نیک بختوں کا قدردان میاں
ہائے وہ نیک دل، سعادت مند وہ جواں مالکِ دُکان میاں
حادثے کا شکار ہو بیٹھا دی سرِ راہ اس نے جان میاں
راہِ خدمت میں جان دی اس نے ہے شہیدوں میں وہ جوان میاں
اس کے بچوں کی پرورش کے لیے رہ گئی ہے یہی دُکان میاں
اب ہمیں سب ہیں اس کے کارندے ہیں ہمیں اس کے پاسبان میاں
اب توجہ ہمیں کو کرنی ہے چل پڑے خوب یہ دُکان میاں

کتنے ہمدرد اس جواں کے ہیں
اب ہمارا ہے امتحان میاں

وہ جو شاعری کا سبب ہوا

'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کی رسمِ اِجرا وگیان بھون نئی دہلی میں مسٹر فخر الدین علی احمد مرحوم صدر جمہوریہ ہند نے ادا کی۔ فخر الدین علی احمد مرحوم مجھ سے قبل واقف نہ تھے۔ مجموعہ کی فوٹو کاپی جب ان کو دی گئی اور اِجرا کی رسم ادا کرنے کی درخواست مسٹر عزیز نقی امام ایم پی جو میری عزیز ہیں، نے پیش کی تو فخر الدین صاحب نے کتاب پڑھنے کے بعد اپنی رضا مندی یا نا رضا مندی کا اظہار کرنے کا وعدہ کیا اور ایک ماہ کا وقت مانگا۔ ایک ماہ بعد جب ان سے مل کر ان کا منشا پوچھا تو وہ مسکرائے اور فرمایا ضرور اِجرا کروں گا اور وگیان بھون اس تقریب کے لیے منتخب کیا۔ اس سے پہلے میں نے دہلی کلاتھ مل کے ایک مشاعرے، اور اشوکا ہوٹل میں 'شامِ اقبالؔ' کا افتتاح کرتے انھیں دیکھا تھا۔ چونکہ میں بھی ان دونوں تقریبات میں شریک تھا، میں نے دیکھا کہ وہ پورے جاہ و حشم کے ساتھ پیادوں، علمبرداروں، وزرا اور حکام کے ہجوم میں ٹیلی ویژن کی تیز روشنی میں اسٹیج پر آئے اور کھڑے کھڑے لکھی ہوئی اختتامی تقریر پڑھی اور تشریف لے گئے۔ میں نے سمجھا اُسی انداز کی تحریری تقریر پڑھیں گے اور تشریف لے جائیں گے۔ مگر مجھے حیرت ہوئی جب وہ ہال کے صدر دروازے سے نہیں چھوٹے دروازے سے اپنی بیگم اور چند مرکزی وزرا کے ساتھ بالکل بے تکلّفانہ انداز میں آئے۔ اور کرسی پر بیٹھ کر سامنے ٹیبل پر اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ملا کر ہال کے تمام سامعین کو اور مجھے اور میرے رفیقوں کی طرف دیکھتے ہوئے جم کر دس منٹ کی دل افروز اور دل گداز دل سے نکلی ہوئی تقریر کی۔ شاعری کا عمومی منصب، میری شاعری کا پس منظر اور میری شاعری کی خصوصیات پر واقف کار کی حیثیت سے ضروری اشارے کیے۔ کتاب کا بہت اہتمام سے اجرا کیا اور آخر تک تقریب میں بیٹھے۔ میرا اور دوسرے شعرا کا کلام سنا، مجھ سے فرمائشیں کیں۔

تو جب وہ تقریر فرما رہے تھے اور کتاب کا اجرا فرما رہے تھے، دوسری مدعوئین وزرا اور

مخصوصین کی تقریریں سماعت فرمارہے تھے۔فخرالدین علی احمد صاحب مرحوم کواپنے پچھلے رسمی انداز سے بالکل برعکس ایک جانے پہچانے اور واقف کار انسان کی حیثیت سے بے ساختہ زبانی تقریر کرتے دیکھ کر میرا دل اُمڈا اور میں نے یہ چند اشعار کہے اور جب میرا نام پکارا گیا تو میں نے یہ مختصر سا قطعہ پڑھا، اس کے بعد دوسری غزلیں پڑھیں ۔میری سمجھ میں آیا کہ وہ صدرِ مملکت کی گدی پر بیٹھ کر محض رسمی گفتگو ہی نہیں ۔اپنے رسمی راستے سے بالکل الگ ہوکر ادب وشعر،اس کے منظر و پس منظر،فن وفنکار پر شناخت اور پہچان،فہم وادراک کے ساتھ بے ٹوک غیر رسمی گفتگو بھی پوری بصیرت کے ساتھ کرسکتے ہیں۔اس تجربے نے مجھے متحرک کیا اور یہ اشعار نکل پڑے۔

بموقع رسم اجرا ’وہ جو شاعری کا سبب ہوا‘

بدست صدرِ جمہوریہ فخرالدین علی احمد

آرزو ہم کو قصّہ خوانی کی — اور نہ عادت ہے لن ترانی کی
ہم سنا کر کبھی سبک نہ ہوئے — داستاں اپنی سرگرانی کی
دل جلایا زباں نہیں کھولی — شمع کی طرح زندگانی کی
وہ بھی دامن ہی تک رہی محدود — آنسوؤں نے جو ترجمانی کی
چوٹ کھائی نئی نئی لیکن — بات ہم نے وہی پرانی کی
یعنی شکرِ کرم کیا ان کا — نہ شکایت نہ نوحہ خوانی کی
فن کے سانچے میں سب کو ڈھال دیا — جتنی آنکھوں نے خوں فشانی کی
شور ہے ان کی دُوربینی کا — دھوم ہے ان کی نکتہ دانی کی
بات سب ان کی جانی بوجھی ہے — کیا ضرورت ہے خوش بیانی کی
اور ضرورت بھی ہو تو تاب کہاں — ہم کو اُس دُکھ بھری کہانی کی
وہ جو آئے تو ہم نے اے عاجزؔ — عرض یہ میرؔ کی زبانی کی

حال بدگفتنی نہ تھا اپنا
تم نے پوچھا تو مہربانی کی

مسدّس

اچھے اور پائیدار فن کی چاہے ہم جتنی خصوصیتیں بیان کردیں اور وہ خصوصیتیں صحیح بھی ہوں لیکن ایک خصوصیت جو میرے خیال میں سب سے اہم اور بنیادی نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ فنکار کا تعارف ہوتا ہے۔ اوّل تو یہ تعارف بیشتر غیر شعوری ہوتا ہے۔فنکار کی جو حیات ہوتی ہے اس حیات کے جتنے اجزا ہوتے ہیں ،اس کا عقیدہ،اس کا نظریہ،اس کا اعتماد،اس کا شوق،اس کی نیتیں ، اس کے ارادے،اس کی پسند،اس کی ناپسند، اس کے ارمان ،اس کی خواہشیں جو اس کے وجود کا مجموعی خاکہ ہوتے ہیں اور جس کا اظہار اس کی زندگی میں،اس کے عمل ،اس کی رفتار،اس کی گفتگو، اس کی نشست وبرخواست، اس کے معاملات، معمولات اور تعلقات سے ہوتا رہتا ہے۔ یہ سب اس کے فن میں کچھ تو غیر شعوری طور پر منتقل ہوتے رہتے ہیں اور کچھ اس کے ارادے اور شعوری کوششوں سے بھی اس کے فن میں ڈھلتے رہتے ہیں ۔ فنکار خود بھی چاہتا ہے کہ اس کی تخلیق کے ذریعے اسے پہچانا جائے، اس کی شناخت کی جائے۔ ہر فنکار اپنی شناخت چاہتا ہے یہ فطرت ہے بلکہ اسے جبلت کہیے۔ یہ جبلت ہر وجود میں ہے چاہے وہ انسان ہو یا حیوان ہو۔ یہ جبلت نباتات میں بھی پوشیدہ ہے، فرق یہ ہے کہ انسان اس کا شعور رکھتا ہے اور غالب شعور رکھتا ہے، حیوانات میں بھی کسی حد تک یہ شعور پایا جاتا ہے۔ نباتات میں یہ غیر شعوری جبلت میں داخل ہے۔ انسان میں یہ شعور غالب اس لیے ہے کہ انسان کے خالق کی بھی یہ خواہش ہے کہ اُسے شناخت کیا جائے۔ اسی کو معرفتِ الٰہی کہتے ہیں، اور اسی کو یوں ارشاد فرمایا گیا ہے ’’جس انسان نے خود کو پہچانا اس نے اپنے خالق کو پہچانا‘‘ تو خالق کی شناخت خالق کا منشا ہے کیونکہ بغیر اس شناخت اور اس معرفت کے مخلوق کو خالق سے محبت نہیں ہوسکتی اور محبت اطاعت کی شرط ہے جس کی مثالیں اور دلیلیں مختلف زبانوں میں انسانوں کی زندگیوں میں نمایاں ہوتی رہی ہیں ۔ انہی قسم کے انسانوں کو اہلِ دل، اہلِ درد، اہلِ محبت، درویش، سادھو، سنت ، پیر، قطب ابدال، ولی اور پیغمبر کہا گیا ہے۔ ان کے درجات میں فرق ہے، وزن اور قد میں فرق ہے مگر حقیقت سب میں ایک ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو تخلیق کائنات ہوتی ہی نہیں۔ تخلیقِ کائنات کا منشا اور مقصد یہی ہے کہ خالق کی شناخت ہو۔

خالق خود بھی اس کا خواہش مند ہے:

دہر جز جلوۂ یکتائی محبوب نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

تخلیق وہی مکمل ہے جو اس دور کے عقل و دانش، بصیرت و بصارت، فہم و ادراک، ذوق و وجدان کے ذریعے فنکار کا مکمل تعارف ہو۔ خدا چونکہ بہترین اور عظیم ترین فنکار ہے اس لیے اس کائنات کی ایک ایک شئے میں اس کی شناخت موجود ہے۔ ذرّہ سے آفتاب تک اس کی معرفت اور شناخت کی گواہی دے رہے ہیں۔ خاک کا ایک ایک ذرّہ، ہواؤں کا ایک ایک جھونکا، آفتاب کی ایک ایک کرن، چاند کی ایک ایک شعاع، آگ کی ایک ایک چنگاری، پانی کا ایک ایک قطرہ، گھاس کی ایک ایک پتّی، درخت کا ایک ایک پتہ خالق کی موجودگی اور اس کے جلوۂ بیکراں کی گواہی دے رہا ہے:

برگ درختاں سبز درنگہ ہوشیار   ہر ورقِ دفتریست معرفتِ کردگار

خالق چونکہ بہترین فنکار ہے اس لیے اس کی معرفت بھی بہترین انسانوں کو نصیب ہوتی ہے اس لیے ’ہوشیار‘ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ انسان کے فن کا جو معیار ہوگا اسی اعتبار سے معیار کی آنکھیں اسے شناخت کرسکیں گی۔ داغؔ نہ فنکار بڑے، نہ ان کا فن بڑا اس لیے داغؔ کی شناخت ان کے فن میں اوسط ذہن اور معمولی ذہن بھی جان لے سکتا ہے کہ داغؔ کی شخصیت کیا ہے۔ میرؔ بڑے فنکار ہیں اس لیے ان کی شخصیت کی معرفت سب کو نہیں ہوسکتی گرچہ ان کا کلام سہل اور آسان ہے اسی لیے میرؔ فرماتے ہیں:

سہل ہے میرؔ کا سمجھنا کیا؟   ہر سخن اس کا اِک مقام سے ہے
میرے سب شعر ہیں خواص پسند   پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

کلام سہل ممتنع ہونے کی وجہ سے پسندیدگی عام ہے اور تاثر عام ہے مگر شعر کی گہری کیفیت تک پہنچنا کہ فنکار کی شخصیت سے آشنائی اور تعارف ہوجائے اس کے لیے بلند سطح کا ذوق درکار ہے اس لیے میرؔ کہتے ہیں کہ سمجھ کر بھی سمجھنا آسان نہیں ہے۔ اسی لیے اکثر مشتاقین اور عاشقینِ کلام کو میرؔ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ آپ میرا کلام نہیں سمجھ سکتے۔

تو میں بھی اب یہی کہنے لگا ہوں کہ آپ مجھے نہیں سمجھ سکتے اسی لیے عام مشاعروں میں شرکت سے مجھے سخت پرہیز ہے۔ یہ نظم میرے پہلے سفرِ امریکہ اور کناڈا کے دور میں لکھی گئی۔

افضل امام جو میرے بہت گہرے دوست اور بڑے مخلص عاشق ہیں۔ مجھے سنتے تھے، پسند کرتے تھے، ملتے تھے اور شوق، اشتیاق اور محبت سے ملتے تھے۔ دیندار بھی تھے۔ تبلیغ کی دینی اصلاحی تحریک میں بھی میرے ہمنوا ہوئے۔ ان کی محبت، تعلقِ خاطر اور ذوق کی شعر پسندی کا کھل کر اظہار اس وقت ہوا جب یہ بیرونِ ہند کے مسافر بنے۔ یورپ انگلینڈ کی ٹھوکریں کھا کر کناڈا پہنچے اور برسرروزگار ہو کر کسی حد تک مطمئن اور یکسو ہوئے تو میری یاد ٹوٹ کر آئی۔ اس یاد میں انھوں نے ایک ایسے شخص کو بھی شریک کیا جو مجھے ناآشنا رکھ کر مجھ سے بہت آشنا تھا۔ ہم آواز تماشائی تھا مگر دُور دُور تھا۔ میرا تماشائی تھا مگر تماشا گر سے قریب ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔ مجھے دیکھتا تھا مگر میں بھی اسے دیکھوں یہ گوارا نہ تھا۔ شاید اسے احتیاط تھی۔ شاید اسے علم تھا کہ یہ دُھوپ دُھوپ جانے والا شخص ہے، اس کے جلتے بدن سے الگ ہی رہنا مناسب ہے:

اہلِ جنوں کے جلتے بدن سے رہو الگ
ہم دُھوپ دھوپ جاتے ہیں تم سائے سائے جاؤ

۱۹۷۷ء کے آخر میں ایک مشاعرہ کے دوران ایک مقبول صورت اور وجیہ شخص سے ملاقات ہوئی، وہ شخص بڑھا اور مصافحہ کیا۔ بولا میرا نام خورشید ملک ہے۔ میں شکاگو میں ہوں۔ آپ اپنا تفصیلی تعارف لکھ دیجیے۔ ہم لوگ آپ کو امریکہ آنے کی دعوت دے رہے ہیں، تو یہ شخص وہی تھا جس کے ساتھ افضل امام نے سازش کی اور میں کشاں کشاں دہلی سے اُڑ کر سرزمینِ امریکہ کے شہر شکاگو پہنچا۔ وہاں ڈاکٹر خورشید ملک کے کشادہ مکان میں پچاس ساٹھ وضع دار لوگوں سے ملاقات ہوئی جو امریکن لباس میں ہندوستانی، پاکستانی تھے اور ان دونوں کا پہلا آبائی وطن بہار تھا۔ بہار میں پیدا ہونے والے بھی اور تقسیم کے بعد پیدا ہونے والی نسل بھی۔ مشاعرہ ہوا ردِّعمل واجبی واجبی تھا۔ سنا کہ پاکستان سے دو کھیپ شاعروں کی امریکہ آچکی ہے۔ میں نے سوچا انھیں کیا خبر کہ دریائے آتش سے گزرنا کسے کہتے ہیں اور دریائے غم میں ڈوب کر اُبھرنے والے کی زبان کیا ہو جاتی ہے، لہجہ کیا ہو جاتا ہے، وہ تہہ سے کیا لے کر آتے ہیں اور کیا کیا کھو کر آتے ہیں۔ کیا ساحل پر رہنے والوں کے سرمائے سے ان کا مالی سرمایہ ملتا جلتا رہتا ہے کہ دیسی بدیسی کا فرق ہو جاتا ہے۔ تو وہاں رہ کر میں نے یہ نظم لکھی کہ مغالطہ دُور ہو جائے وہ سمجھ سکیں کہ ساحل پر رہنے والوں کی نظر کچھ اور ہے، باہر سے آنے والا کچھ اور خبر لے کر آیا ہے۔ اور خبر لانے والا کہہ رہا ہے کہ نظر کو بھول جاؤ، خبر پر یقین کر لو۔ نظر محدود ہے، خبر لامحدود ہے۔ نظر رنگ دیکھ رہی ہے، رُوپ

دیکھ رہی ہے، رقص دیکھ رہی ہے، روپیہ دیکھ رہی ہے، روٹی دیکھ رہی ہے، رہائش دیکھ رہی ہے، روڈ دیکھ رہی ہے، روشنی دیکھ رہی ہے۔ خبر تاریکی سے، طوفان سے، سیلاب سے، خون سے، آگ کے شعلوں سے، زخموں سے، آہوں سے، کراہوں سے، بھوک سے، فاقہ سے، پیاس سے، رسن سے، زنجیر سے ہوکر آرہی ہے۔ خبر کی صورت دیکھو، خبر کا چہرہ دیکھو، بدن دیکھو:

نکل کر کوچۂ محبوب سے ہم آئے ہیں لیکن
یہ حالت ہے کہ جیسے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

نظر جو کہہ رہی ہے وہ رومان ہے۔ خبر کہہ رہی ہے حقیقت ہے۔ وہ جھوٹی ہے یہ سچی ہے۔ جھوٹا بھیس بدل کر آتی ہے، آج نہیں کل ننگی ہو جائے گی۔ حقیقت سورج ہے چاند ہے۔ دُھوپ کو، چاندنی کو لباس کی ضرورت نہیں ہے۔ نقال بھیس بدلتا ہے اور ہمیشہ نیا نیا رُوپ اوڑھتا ہے۔ سچائی کو لباس کی حاجت نہیں۔ یہی اس نظم کا مرکزی خیال ہے۔ جہاں پڑھی گئی یہ باتیں وہاں پسِ پردہ تھیں۔ نظم پڑھنے کے بعد پردہ اُٹھ گیا۔

مسدّس

لکھ اے کلیم حالِ دل اپنا اُٹھا قلم — اشکوں کی روشنائی بنا آہ کا قلم
یہ بوجھ کیا اُٹھائے کوئی دوسرا قلم — تیری زباں، تیری کہانی، تیرا قلم
دو چار آبلے ہی سہی آج پھوڑ دے
تھوڑا سا دل کا خون قلم سے نچوڑ دے

اربابِ ذوق بھی ہیں، سخنور بھی ہیں یہاں — خود گیر و خودنگر بھی ہیں، خودگر بھی ہیں یہاں
رہرو بھی، رہ شناس بھی، رہبر بھی ہیں یہاں — دریائے آگہی کے شناور بھی ہیں یہاں
ہیں اُن میں اہلِ ناز بھی، اہلِ نیاز بھی
پہلو میں اِن کے ہوگا دلِ پُرگداز بھی

اِن دوستوں کے دل میں اُترتے چلو کلیؔم — یادوں کے زخم بن کے اُبھرتے چلو کلیؔم
خوشبو بنو فضا میں بکھرتے چلو کلیؔم — اور چپکے سے یہ عرض بھی کرتے چلو کلیؔم
کیا کیا حسین صبح، حسین شام آئے گی
لیکن ہماری یاد بھلائی نہ جائے گی

کیونکہ ہم ایک ایسے گلستاں سے آئے ہیں　　جس گلستاں کے پھولوں پہ کانٹوں کے سائے میں
شبنم کی طرح پتّوں نے آنسو بہائے ہیں　　اِک اِک کلی نے دل پہ بہت زخم کھائے ہیں

بکھرا کیے ہیں شاخوں سے گل ٹوٹ ٹوٹ کے
روئی ہے عندلیب چمن پھوٹ پھوٹ کے

کچھ دُور ہی بہارِ چمن آ کے رہ گئی　　اُبھری نہ تھی کہ آرزو مرجھا کے رہ گئی
پھیلائے ہاتھ شاخ نے پھیلا کے رہ گئی　　خوشبوئے گل نہ جانے کہاں جا کے رہ گئی

اِک عمر گزری حسرتِ فصلِ بہار میں
اب تک تڑپ رہے ہیں اُسی انتظار میں

ہیں اُس چمن کے درد کو پھیلانے والے ہم　　سینے میں ہیں غموں کی امانت سنبھالے ہم
اشعار کے چراغ میں اشکوں کو ڈالے ہم　　پھرتے ہیں گنگناتے اندھیرے اُجالے ہم

جو اُن کی چشمِ ناز میں زُلفوں کے بل میں ہے
وہ ساری داستان ہماری غزل میں ہے

دل سے لگائے دردِ چمن عمر بھر پھرے　　پھولوں کو بانٹتے ہوئے خونِ جگر پھرے
اے عشق مل سکیں گے نہ ہم جیسے سر پھرے　　برسوں چراغ لے کے زمانہ اگر پھرے

کرتے ہیں ہم غزل میں جگر کے لہو کی بات
اس سرخرو سے بڑھ کے ہے کس سرخرو کی بات

آپ آشنائے درد ہیں آپ آشنائے دل　　اور آپ سب کے بیچ میں یہ خوش نوائے دل
بیٹھا ہے اس لیے کہ سنائے صدائے دل　　"اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل"

زنہار اگر تمھیں ہوسِ ناؤ و نوش ہے
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

اہلِ زبان اہلِ سخن آئیں گے بہت　　اصحابِ فکر صاحبِ فن آئیں گے بہت
ساغر بکف سبو بہ دہن آئیں گے بہت　　لے کر کلامِ توبہ شکن آئیں گے بہت

ایسا شکستہ حال غزل خواں نہ آئے گا
پھر ہم سا کوئی چاک گریباں نہ آئے گا

دِل

جنوری ۱۹۸۵ء کی ابتدائی تاریخوں کی کوئی تاریخ تھی۔ میں غسل ناشتہ سے فارغ ہوکر گرم موزہ، گرم شیروانی پہن کر حسبِ معمول پٹنہ یونیورسٹی کلاس لینے کے لیے پیادہ پا روانہ ہوا۔ یہ سردیوں میں معمول رہا کہ بغیر سواری ایک کیلومیٹر سے کچھ زیادہ کی یہ مسافت طے کرتا تھا۔ تقریباً تین سو قدم جانے کے بعد سینے کے اندر کچھ تشنج کی کیفیت کا آغاز ہوا جیسے سینے اندر جکڑ رہا ہے۔ میں پیچش کا مریض قدیم ہوں۔ یہ تکلیف پیٹ کی اسی بیماری کا کوئی حصہ سمجھ کر میں نے اپنی روانگی جاری رکھی۔ تکلیف میں اضافہ ہوتا رہا اور ہلکے پسینے کے قطرے پیشانی پر نمودار ہونے لگیں۔ اُسی تکلیف کا شاخسانہ اِسے بھی سمجھتے ہوئے اپنی رفتار میں نے جاری رکھی۔ جکڑن تیز ہوتی گئی۔ میں نے دوچار بار تیز سانس لی اور تکلیف برداشت کرتا ہوا مطمئن چلتا رہا۔ یونیورسٹی کے قریب پہنچتے ہی آہستہ آہستہ تمام تکلیفیں ختم ہوگئیں۔ میں نے دو تین گھنٹہ کلاس لیا اور ظہر کے بعد اسی اطمینان سے واپس ہوا۔ دوسرے دن ساڑھے نو بجے صبح پھر اسی معمول پر روانہ ہوا۔ اور ٹھیک اسی مقام پر تین سو قدموں کے بعد پھر تشنج شروع ہوا جو بڑھتا رہا، پیشانی پر قطرے اُبھرتے رہے۔ میں اسی چال سے چلتا رہا۔ تکلیف ترقی کرتی رہی۔ جوانی کا جوش تو نہیں تھا لیکن زندگی کا جوش تھا جو ہر وقت رہتا ہے۔ اِس وقت بھی ہے اور اُس وقت بھی اسی کے سہارے تکلیف کا مقابلہ کرتا ہوا سفر جاری رکھا۔ گذشتہ دن کی طرح پھر یونیورسٹی پہنچتے پہنچتے تکلیف بالکل ختم ہوگئی کلاس لیا اور اسی رفتار سے واپس ہوا، ذہن پر کوئی بوجھ نہیں، کچھ خوف نہیں، کسی خطرے کا احساس نہیں۔ گھر میں بیٹا تجربہ کار ڈاکٹر۔ پٹنہ میڈیکل کالج کا ذمّہ دار۔ اس سے تذکرہ تک نہیں کیا۔ اسی دن مجھے کسی ضرورت سے شاید کسی ادبی تقریب میں شرکت کے لیے روانہ ہونا تھا۔ دوسرے روز دہلی میں کانفرنس تھی، میرا برتھ مگدھ ایکسپریس سے ریزرو تھا۔ شام ہوئی، سامان لیا۔ میاں ڈاکٹر وسیم سلّمہٗ اسٹیشن پہنچانے کو آئے۔ ٹھیک وقت پر آٹھ بجے شب میں گاڑی دہلی کی طرف

روانہ ہوئی۔ داناپور پہنچ کر میں نے عشا کی نماز سے فراغت کرلی۔ برتھ پر لیٹ گیا۔ گاڑی رُکی رہی۔ میں نے سمجھا گاڑیاں کیا ٹھکانے رہیں گی جب گاڑیوں پر چلنے والے ٹھکانے پر نہیں ہیں۔ تھوڑی دیر غنودگی میں رہا پھر نیند آ گئی۔ گاڑی داناپور اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ میں سو گیا۔ تین گھنٹہ سو کر بارہ بجے نیند ٹوٹی تو مسافروں میں انتشار تھا۔ آوازیں تیز ہو رہی تھیں، دیکھا تو گاڑی داناپور ہی میں کھڑی ہے۔ معلوم ہوا بکسر کے قریب مال گاڑی اُلٹ گئی ہے لائن بند ہے۔ گاڑی شاید آگے نہ جاسکے گی۔ ایک بجے شب میں گاڑی پٹنہ جنکشن واپس ہوئی۔ کچھ لوگوں نے دوسرے دن کا ریزرویشن کرایا۔ میں نے ٹکٹ کے دام واپس لیے، دو بجے شب میں گھر واپس ہوا۔ گھر والے حیران مشاعرہ چھوڑ کر چلے آئے؟ نہیں بھائی مشاعرہ میں نے نہیں چھوڑا مشاعرہ نے مجھے چھوڑ دیا۔ گاڑی نے جانے سے انکار کردیا۔ ہم سب لوگ سو رہے۔ تقریباً پانچ بجے اخیر شب میں بیدار ہوا۔ اللہ نے جتنی توفیق عطا فرمائی نوافل سے فارغ ہو کر آوازِ اذان سن کر تقریباً تین سو گز دُور مسجد روانہ ہو گیا۔ سنت سے فارغ ہوا تو وہی تکلیف جو گذشتہ صبح یونیورسٹی جاتے ہوئے شروع ہوئی تھی نمودار ہوئی۔ یہ گویا تیسری صبح مسلسل اس تکلیف کی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں بات آئی کہ اگر ٹرین روانہ ہو چکی ہوتی تو اس وقت میں ٹونڈلہ جنکشن میں ہوتا۔ خیر تکلیف نظر انداز کر کے جماعت کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ اقامت ہوئی کھڑا ہوا تو تکلیف بڑھنی شروع ہوئی۔ پہلی رکعت درد اور تشنج کی ترقی میں گزرا۔ دوسری رکعت شروع ہوتے ہوتے برداشت جواب دینے لگی، تحمل ساتھ چھوڑنے لگا۔ کراہتے کراہتے رکعت ختم کرنے لگا اور ایسا معلوم ہوا کہ تکلیف کی شدّت سے اب گروں گا۔ ڈگمگانے لگا اور سلام پھیرتے ہی میں لغزشیں سنبھالتا ہوا مسجد سے باہر نکلا۔ تین سو گز کا فاصلہ دوڑ کر طے کیا کہ راستے ہی میں نہ گر جاؤں اور گھر میں نیچے ہی منزل پر چوکی پر گر کر تڑپنے لگا۔ سانس پوری نہیں، دم پھولنے لگا، گھر میں شور ہوا۔ ڈاکٹر وسیم آ گئے، انھوں نے فوری کچھ دوا دی۔ ٹیلی فون کیا، ایمبولینس آئی اور میں پٹنہ جنرل اسپتال کے انٹینسیو کیئر رُوم میں پہنچا دیا گیا۔ ہاتھ پاؤں اور سینے میں مشین کے سیاہ تار لگا دیئے گئے اور میں گویا بیہوش ہو گیا۔ پتہ نہیں کتنی دیر بیہوش رہا۔ ہوش آیا تو دائیں بائیں ڈاکٹر اور نرسیں ایک طرف ڈاکٹر وسیم سلّمہٗ، سامنے امراضِ قلب کے ماہر ڈاکٹر ٹھاکر، ان کے برابر ڈاکٹر محبّ احمد پرنسپل میڈیکل کالج اور دو تین ڈاکٹر۔ مشین چل رہی ہے، دوائیں بھی دی جارہی ہیں، انجکشن بھی لگ رہے ہیں، دو تین

دن گزر گئے۔ لوگ خاموش خاموش تھے۔ اشارے چل رہے تھے۔ میری بیوی ایک کنارے خاموش، میرے بھائی نسیم سلّمہٗ بھی ایک کنارے کچھ لرزاں اور جنباں ہونٹوں کے ساتھ۔ شاید وہ دُعا میں مشغول رہتے تھے۔ وسیم سلّمہٗ ڈاکٹروں کے جھرمٹ میں محوِ مشورہ۔ اوروں کو کمرے میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں اور بھی کسی وقت غافل رہا سوائے ان چند گھنٹوں کے جو سخت نگرانی والے کمرے میں ابتداً دو تین گھنٹے بیہوشی میں رہا۔ میں سمجھ گیا تھا عارضۂ قلب کا سخت حملہ ہوا ہے۔ اس عالم میں جو مریضوں کو ہدایات ہوتی ہیں وہ خوب ذہن میں تھیں اور میں ان پر عمل پیرا تھا لیکن مجھے یاد نہیں ہے کس وقت ہلکی سی گھبراہٹ بھی میرے ذہن کی فضا سے تھوڑی دیر کے لیے بھی گزری ہو۔ نہ مجھے کسی قسم کی تکلیف کا کوئی احساس تھا۔ ہوش و ہواس بجا ہی نہیں بالکل چست اور صحت مند تھے۔ میں دوسروں کی رعایت اور طبّی اصول کی پابندی میں خاموش تھا اور بے حس و حرکت تھا۔ پوری تصویر میرے ذہن پر ایک مریض کی نہیں بلکہ معالج کی طرح مجھ پر روشن اور نمایاں تھی کہ میں اس وقت سخت خطرے میں ہوں اور گذشتہ تین دِنوں سے جو تکلیف میرے سینے کے اندر وقت کی پابندی سے گزر رہی تھی وہ تکلیف ہارٹ اٹیک کی تھی اور میں کرشمۂ قدرت کے زیر ان تکالیف سے صحت مندی اور بے پروائی سے گزر رہا تھا۔ اور یہ کہ عارضۂ قلب کا حملہ قدرت کی طرف سے رازِ قدرت کا مجھ پر انکشاف تھا کہ جس طرح مولوی صاحب یا ماسٹر ترپاٹھی جی مجھے غلطیوں پر اصلاح کے لیے پیار سے تھپڑ لگاتے تھے مجھے تکلیف ہوتی تھی مگر رنج کبھی نہیں ہوتا تھا بلکہ اُنس بڑھ جاتا تھا۔ اللہ میاں بھی پیار سے مجھے تھپڑ لگا رہے تھے مگر رنج محسوس کرنے کے برعکس مجھے اطمینان محسوس ہو رہا تھا، دلجمعی سی لگ رہی تھی اور مجھ پر اسی وقت بات پوری فرحت اور بشاشت سے کھلی کہ میں دہلی روانہ ہو چکا تھا مگر اللہ کو اپنے تعلق اور کرم کا مشاہدہ مجھے کرانا تھا کہ آگے مال ٹرین کا حادثہ کر کے گاڑی پٹنہ واپس لا کر شب کو سلا کر صبح ہی صبح بھرپور طمانچہ لگا کر اپنی قدرت کا راز کھول دیں اور اپنی قدرت کے سب سے اعلیٰ مظہر یعنی 'دل' کی حیرت انگیز طاقت، قدرت، وسعت، بلندی اور گہرائی کا بھی مشاہدہ کرا دیں۔ دل بنانے میں خدائی کا کس قدر لہو خرچ ہوتا ہے دل کو توڑ کر اس کا تماشہ دکھا دیں:

لفظ دل لکھ کر یہ لکھا کاتبِ تقدیر نے
ہر جگہ اس لفظ کے معنی بدلتے جائیں گے

یہ کائنات جس طرح قدم قدم، لمحہ بہ لمحہ نئے رنگ نئے آہنگ سے اپنے جلوؤں کی رنگینیاں دکھاتی جائیں گی، اس کائنات کے نچوڑ جسے 'دل' کہتے ہیں اس کی جلوہ فرمائیاں بھی اہلِ دل پر منکشف ہوتی جائیں گی۔ اس طرح خدا نے جو عقل و عشق، مادیت اور روحانیت کی دو متوازی لہریں چلائی ہیں یہ دونوں لہریں چلتی رہیں گی۔

کبھی اِس کی بات اُونچی کبھی اُس کا بول بالا

کبھی عقل چکا چوند کردے گی کبھی عشق سکتہ میں ڈال دے گا۔ کوئی بڑے پیمانے پر کوئی چھوٹے پیمانے پر۔ دونوں طاقتیں بہرحال کائنات میں کارفرما رہیں گی۔ کچھ اس کائنات میں عقل کی کارفرمائی پر حیران اور مبہوت رہیں گے تو کچھ ایسے بھی ہوں گے کہ عشق کے کرشمۂ قدرت پر رقصِ مستی کریں گے۔ ابھی میں یہ سطریں امریکہ کے ایک شہر میں بیٹھا لکھ رہا ہوں، دو چار دن ہی پہلے عقل کی رہنمائی میں ترقی کی معراج پر پہنچے ہوئے ملک میں ایک مشاہدہ کرامتِ عشق کا بھی ہوا۔ امریکہ کے سب سے بڑے شہر کی سب سے اونچی معجزہ نما ایک سو دس منزل کی دو عمارتیں جو پورے نیویارک شہر کی عکسی تصویریں تھیں، یعنی جو شہر میں تھا وہ تمام چیزیں چھوٹے پیمانے پر ان دونوں عمارتوں کے اندر تھیں۔ شہر میں گلیاں ہیں، سڑکیں ہیں، دُکانیں ہیں، ہوٹل ہیں، چائے خانے ہیں، پارک ہیں، نشست گاہیں ہیں، سینما ہیں، بینک ہیں، لائبریریاں ہیں۔ یہ سب اور اِن کے علاوہ بھی کیا کیا ان دونوں عمارتوں کے اندر چھوٹے پیمانے میں تھی۔ کوئی سیر کو جاتا تو ایک عمارت کے اندر کئی دن میں مکمل مشاہدہ کرسکتا۔ ایک شہر میں کہیں کہیں دس پانچ ہزار لوگ بستے ہیں، اس ایک عمارت میں پچاس ہزار لوگ مختلف مشغلوں میں تھے۔ جو نہ جانے کتنی پلاننگ، کتنی منصوبہ بندیوں کے بعد کتنی مدت میں کتنے ناقابلِ شمار مال دولت اور ناقابلِ احساس محنت اور کاوش سے بنی ہوں گی۔ عقل نے اپنا کتنا خزانہ بتدریج اس میں صرف کیا ہوگا۔ اور اس کی حفاظت کے کیا کیا سامان ہوں گے۔ اس شہر میں جس میں کا تنکا تنکا کمپیوٹر میں ہے، جس شہر کی ایک ایک چیز کی حرکت سائنسی آلات کے آنکھوں کے سامنے ہیں، اس شہر میں ایک صبح صرف بیس منٹ کے اندر ہوا میں کہاں سے اُڑتے ہوئے کہاں جاتے ہوئے سوسو مسافروں کو کہاں لے جاتے ہوئے، پانچ میل زمین سے آسمان میں اُڑتے ہوئے دو مسافر جہازوں نے یک بیک رُخ موڑ کر رفتار کی راہ بدل کر، ارادہ بدل کر جسے کہیں بھی اُترنے کے لیے آغاز سے ہی تمام

مشینیں ایک پروگرام کے مطابق فٹ کرنی پڑتی ہیں اور بتدریج ان پر عمل کرنے کا موقع حاصل کرتی ہیں بوسٹن سے پانچ چھ میل اونچی فضا میں پرواز کرتے ہوئے دو ہزار میل لاس اینجلس میں اُترنا تھا، وہ یک بیک چند منٹ میں ایسا نشانہ لگاتے ہیں دونوں ہوائی جہاز بالکل پہلو بہ پہلو ایک سودس منزلہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے درمیان میں دونوں جہاز مع مسافروں کے گھس جاتے ہیں اور دونوں ایک سودس منزلہ عمارتیں چند منٹ میں ریت کا تودہ بن کر زمین دوز ہو جاتی ہیں:

عشق کی ایک جست ہی نے کردیا قصّہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

عقل کی برسہابرس کی محنت دل کے ایک ادنیٰ سے اشارے پر چند منٹ میں ملیامیٹ ہوگئی۔ ساری مشاہداتی مشین، سارے راڈار، ساری نگرانیاں، ساری انٹیلیجنس ناکامیاب ہوگئی۔ سائنس کے سارے انتظامات، حفاظت کے سارے اہتمامات، مدافعت کے ہزاروں انسانوں کی عقلی کوششوں کے باوجود بیکار اور مفلوج ہوکر رہ گئے۔

تو میں ہارٹ اٹیک کے سخت نگرانی کے کمرے میں مشینوں اور مشین والوں کی نگرانی میں، ڈاکٹروں، نرسوں اور تیمارداروں کے ہجوم میں بے حس وحرکت پڑا ہوا اُسی مریض دل جو ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تھا، ان ٹکڑوں کے کرشموں سے گویا لطف اندوز ہورہا تھا۔ بدن بے حرکت لیکن بیمار دل پورے حرکت وعمل میں تیزی سے مشغول تھا۔ لوگ متحرک اور پریشان تھے اور میں دلجمعی سے اپنے بیمار دل کی گوناگوں کرشمہ سازیوں کے مشاہدے میں شعوری اور غیر شعوری دونوں اعتبار سے مشغول تھا۔ اور آخر میں یہ بات کہہ دوں کہ اس وقت جب میڈیکل سائنس کے قوانین کے مطابق دل عظیم قسم کے خطرات میں مبتلا تھا، مجھے انگلی ہلانے کی بھی اجازت نہ تھی، میں نے دو چار دِنوں میں شاید دو یا تین غزلیں کہیں:

(۱) مری ہر غزل کے رُباب سے یہ نکل رہی ہے صدائے دل
(۲) مت بُرا اس کو کہو گرچہ وہ اچھا بھی نہیں

اور یہ نظم 'دل' کہہ ڈالی۔ دونوں غزلیں دماغ میں محفوظ رہیں اور نظم 'دل' کے تین چوتھائی اشعار میں نے اسی عالم میں کہہ لیے اور تینوں ہی حافظے میں محفوظ رہے۔ دو ہفتہ بعد جب نقل وحرکت کی اجازت ہوئی تو دونوں غزلیں کاغذ پر منتقل کیں اور نظم کے کچھ اشعار حسبِ ضرورت اِدھر اُدھر

جوڑ کر مکمل کیں:

دل بڑی چیز ہے ہم دل کو کریں جھک کے سلام
یہ خدا کے سوا ہے ساری خدائی کا امام

ان تین دن کے داخلی کیفیات کی ایسی شاعرانہ ترجمانی ہے جو میں بیمار دل کو لیے اسپتال کے بستر پر بے حرکت رہ کر کرسکا ہوں، اس کے بعد میں نے پھر اس کے لیے قلم نہ لیا، نہ اس میں کچھ وضاحتی پہلو کا اضافہ کرنا چاہا، نہ اسے منطقیانہ انداز بخش سکا۔ یہ میرے دماغ کی نہیں میرے دل کی کیفیات ہی خود اپنا لفظی جامہ لے کر آئے ہیں۔ آخر کے چار اشعار:

دل کی جانب نگہِ غور سے جھانکا میں نے — کھولنا چاہا ذرا سا یہ لفافہ میں نے
کان میں دل نے کہا شوخی زیادہ نہ کرو — پاؤں چادر سے بڑھانے کا ارادہ نہ کرو
دردِ دل، دردِ جگر مالِ غنیمت سمجھو — کچھ جو تکلیف ہے پیمائشِ ہمّت سمجھو
ہر مرض کے لیے اللہ ہے شافی سمجھو — آگے پھر اور کبھی فی الحال یہ کافی سمجھو

یہ میرے کہے ہوئے شعر ہیں لیکن ایسے ہی ہیں جیسے کان میں کوئی کہہ رہا ہو اور میں مصرعوں میں ڈھال رہا ہوں۔ تین دن تک ایسا ہوتا رہا اور میں بے خبر رہا۔ تیسرے دن صبح کو دل توڑ کر اس میں کچھ بھر دیا گیا اور پھر اس کے شکستہ حصوں کو جوڑ دیا گیا۔ یہ جڑا ہوا رہے اس کے لیے دوائیں بتادی گئیں۔ کھاتے رہو اور اس کا جوڑ باقی رکھو۔ دوسرے ہی سال ۱۹۸۶ء کے رمضان المبارک میں میرا سفر مدینہ منورہ کا ہوا۔ رمضان المبارک کے بعد شاہ فہد اسپتال کے سب سے بڑے ماہر قلب ڈاکٹر شاکر نے مجھے اسپتال میں اپنی ذہانت کے تمام پرزے لگا کر مشین کی تمام آنکھیں جما کر میرا معائنہ دو روز تک کیا اور مجھ سے مسجد نبوی میں نماز کے دوران سرگوشی میں کہا کہ ہر طرح آزما چکا، دِل میں تمام اسکیئرس ہیں سخت حملہ ہوا مگر حملہ کیوں ہوا اس کا سبب کسی ٹیسٹ سے ظاہر نہ ہوا خون، ایکسرے، پیشاب، ای سی جی میں کوئی علامت نہیں ہے۔ تم سگریٹ نہیں پیتے، کوئی نشہ نہیں پیتے، شراب استعمال نہیں کرتے، بلڈ پریشر کا کہیں نام ونشان نہیں ہے جو ہے الحمدللہ وہ نارمل ہے پھر کیا سبب ہے میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے اس نظم کا آخری شعر پڑھ دیا:

ہر مرض کے لیے اللہ ہے شافی سمجھو
آگے پھر اور کبھی فی الحال یہ کافی سمجھو

ہم نے کہا ڈاکٹر صاحب آپ سبب کے پیچھے نہ جایئے پھر کیا سبب ہے اس کی کرید نہ کیجیے۔ اس سے مجھے بھی منع کر دیا گیا ہے۔ اسپتال ہی میں ایک ماہ کے بعد جب میں گھر واپس آنے والا تھا تو سات شعر کا چھوٹا سا قطعہ کہا تھا۔ جو اس ڈاکٹر کی طرف سے تھا جو پٹنہ اسپتال میں میرا معالج تھا، مگر یہ سات شعر کا قطعہ جو بالکل اچھے ہونے کے بعد کہا تھا، ذہن سے بالکل غائب ہو گیا۔ نہ اسے کاغذ پر منتقل کیا نہ حافظہ میں رہا۔ مگر تقریباً بیس شعر کی یہ نظم اور آٹھ آٹھ نو نو اشعار کی دو غزلیں جو دل پر مشین لگے ہوئے حال میں کہی تھیں حافظے پر نقش ہو کر رہ گئیں:

اس سات شعر کے قطعہ کا آخری شعر یہ تھا۔ ڈاکٹر کہتا ہے:

تیرے ذوقِ شعر گوئی کا سبب ظاہر ہوا
چوٹ کب دل کو لگی تھی درد اب ظاہر ہوا

یہ شعر میرا ہے دل نے میرے کان میں نہیں کہا اور 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کی رعایت سے، لیکن ممکن ہے یہ شعر صحیح ہو کہ چوٹ چالیس سال پہلے لگی۔

دل

دل بڑی چیز ہے ہم دل کو کریں جھک کے سلام
یہ خدا کے سوا ہے ساری خدائی کا امام

دل کی تخلیق ہے اللہ کی نظروں میں بلند
اس کی عظمت پہ فرشتوں کی بھی پہنچی نہ کمند

اس کی تخلیق پہ خالق کو بھی وہ ناز ہوا
کہ یہی کون و مکاں کا سرِ آغاز ہوا

زہرہ و مشتری اس میں، مہ و انجم اس میں
وسعتِ کہکشاں در کہکشاں سب گم اس میں

عرش و کرسی بھی یہی، لوح و قلم بھی اس میں
خالقِ کون و مکاں سرتا بہ قدم بھی اس میں

گر خدا کا کوئی گھر ہے تو یہ دل اس کا چراغ
ہے وہ ساقی تو یہ دل اس کا سبو اس کا ایاغ

آسماں کہیے خدا کو تو یہ دل ہے خورشید
جیسے جمشید کے ہاتھوں میں ہو جامِ جمشید

ہے وہ جس بام پہ اس بام کا یہ زینہ ہے
حسن ہے وہ تو یہ دل حسن کا آئینہ ہے

جتنا اس عالمِ تخلیق کے امکان میں ہے
سب کا کھینچا ہوا جوہر دلِ نادان میں ہے

بوند بوند ہر دو جہاں خوشبوئے نافہ کی طرح
ایک جا کر دیا اس دل میں لفافہ کی طرح

ایک ذرّہ بھی یہیں، وسعتِ افلاک یہیں
گل یہیں، خار یہیں، سونا یہیں، خاک یہیں

نہ کوئی آدمی زنداں میں نہ زنجیر میں ہے
وہی جیتا ہے یہاں جس کی جو تقدیر میں ہے

ای سی جی سے نہ کوئی جان سکے گا اس کو
ایکسرے کر کے نہ پہچان سکے گا اس کو

آج کل جس کو یہ انسان سمجھتا ہے کمال
اس کا احوال تو بس یہ ہے بقولِ اقبالؔ

نئی دُنیا، نئی منزل کا، نئی راہوں کا
''ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا''

اپنے افکار کی دُنیا میں سفر کر نہ سکا
یعنی اپنی شبِ زنداں کی سحر کر نہ سکا

پہلے تو اس شبِ زنداں کی سحر کی میں نے
سب سے منہ پھیر لیا دل پہ نظر کی میں نے

یعنی افکار کی دنیا میں گزر میں نے کیا
تب ستاروں کے بھی ہمراہ سفر میں نے کیا

ہاں مگر چاند ستاروں کو نہ چاہا میں نے
آسمانوں کی بہاروں کو نہ چاہا میں نے

نہ خلاؤں سے کوئی خوش نظری مجھ کو رہی
زہرہ و مشتری سے بے خبری مجھ کو رہی

نہ مجھے شوق رہا اُن کا نہ ارمان رہا
اور یہ بھی نہیں ان سب سے میں انجان رہا

تھے میری منزلِ مقصود کے یہ نخل و شجر
میری رفتارِ سفر کے تھے یہ سب گردِ سفر

میں نے دیکھا انھیں، سمجھا بھی انھیں جانا بھی
ان سے کی میں نے ملاقات بھی پہچانا بھی

نہ یہ مطلوب رہے مجھ کو، نہ مرغوب رہے
ہاں میرے راہنما جانبِ محبوب رہے

درد جب دل میں ہوا کھل گئیں آنکھیں دل کی
جیسے مل جائے مسافر کو جھلک منزل کی

سامنے آنکھوں کے تاریکی ہی تاریکی تھی
اس تاریکی میں پنہاں بڑی باریکی تھی

دل کی جانب نگہِ غور سے جھانکا میں نے
کھولنا چاہا ذرا سا یہ لفافہ میں نے

کان میں دل نے کہا شوخی زیادہ نہ کرو
پاؤں چادر سے بڑھانے کا ارادہ نہ کرو

دردِ دل، دردِ جگر، مالِ غنیمت ہے یہاں
کچھ جو تکلیف ہے پیمائشِ ہمّت ہے یہاں

ہر مرض کے لیے اللہ ہے شافی سمجھو
آگے پھر اور کبھی فی الحال یہ کافی سمجھو

مزدلفہ کی شب

بعض ایسی نظمیں بے ساختہ صادر ہوگئی ہیں جو رمزیت و ایمائیت، علامات اور استعارات کا ایک مکمل پیکر بن گئی ہیں۔ ایسی نظمیں ارادے کی اور نیت کی تخلیق ضرور ہیں مگر ان کا کوئی منصوبہ یا ڈھانچہ پہلے سے بالکل تیار نہیں ہوا۔ منظر میں کچھ کھوسا گیا۔ وضاحت کرنا بھی چاہی تو جیسے دل رُک گیا اور دل نے قلم کو بھی روک لیا اور آگے راستہ نظر آیا۔ ایک چہار دیواری بنا کر میں خود اس کے اندر محوِ نظارہ ہو گیا۔ کچھ ایسی بات جو بظاہر نہ سمجھنے کی ہو نہ سمجھانے کی ہو، موضوع اور منظر نے خود ہی اپنا ڈھانچہ بھی تیار کر لیا۔ جیسے میں نے کچھ نگینے چن لیے اور انھیں ہاتھ میں لیے ان کی آب و تاب میں کھو گیا۔ اتنے میں وہ نگینے خود متحرک ہو گئے اور اپنے اپنے مقام پر جڑنے لگے اور یک بیک ایک مکمل نقش بن گئے۔ یہ عموماً اس وقت ہوتا ہے جب کسی واقعہ، کسی خاص منظر، کسی خاص حالت میں پگھلے ہوئے جذبات میں ڈوب جاتا ہوں۔ ایسی چند نظمیں میں نے لکھیں۔ ایک تو 'شبِ معراج' وہ کئی جگہ چھپی اور کہیں نصابِ تعلیم میں بھی شامل ہوئی مگر میرے پاس اس کی نقل نہیں۔ ایک اور نظم 'منیر شریف کی سیر' جو کالج کی ایک ٹیم کے ساتھ گزرتے ہوئے اور منیر شریف پہنچتے پہنچتے ہوئے مکمل ہوگئی، چھپی اور ضائع ہوگئی۔ (یہ دونوں نظمیں بعد میں مل گئیں اور شاملِ مجموعہ ہیں)

میرا تیسرا سفر حج ۱۹۸۷ء میں ہوا۔ پہلا سفر ۱۹۶۶ء میں ہوا، جب نواحِ بیت اللہ کا منظر وہی تھا جو پچاس سال پہلے رہا ہوگا۔ پہاڑیاں اور ٹیلے۔ اور ان کے درمیان حجاج کرام کے خیمے۔ ۱۹۷۸ء میں ٹیلوں اور پہاڑیوں کو کاٹ کاٹ کر راستے بنائے جا رہے تھے لیکن راستوں کے اِرد گرد ان کا وجود کافی تعداد میں موجود تھا۔ منیٰ کے میدان میں دُور تک منظر آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ چونکہ وہاں قیام بھی پانچ چھ دن رہتا ہے اس لیے آبادی کے اعتبار سے اُن علاقوں میں

دور دور تک پہاڑیوں کو صاف کر کے میدانی شکل دے دی گئی تھی، مگر عرفات اور مزدلفہ میں چونکہ قیام بہت مختصر رہتا ہے، چند گھڑیاں اس لیے ان پر تعمیری محنت کم ہوئی تھی ۔ جب ۱۹۸۷ء میں گیا تو نواحِ بیت اللہ کا منظر بالکل بدلا ہوا تھا۔ وادیِ مزدلفہ میں میلوں دُور تک پہاڑیوں کا پتہ نہ تھا اور میلوں دُور تک منظر صاف نمایاں اور میدانی تھا۔ بڑی چوڑی چوڑی، ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی صاف چکنی سڑکیں ۔جگہ جگہ آب رسانی کا نظم ۔میلوں دُور تک منظر یہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے گروہ، قافلے، مجمعے ۔ شام سے صبح تک کا وقت گزارنے کے لیے مختلف مشاغل و اعمال میں مصروف تھے۔ جتنی دُور تک دیکھ سکتے جیسے میدانِ قیامت برپا ہے۔ مگر یہ میدانِ قیامت پرسشِ اعمال کا نہ تھا، پیشکشِ اعمال کا تھا۔ نہ کہیں خیمہ، نہ کہیں شامیانہ، نہ کوئی راوٹی، نہ کوئی مسند، نہ کرسی، نہ پلنگ، کہیں چادر بچھی ہے اور کہیں صاف سڑک پر ہی قافلے ٹھہرے ہیں جیسے لاکھوں لشکریوں کا پڑاؤ اور جنگ کی تیاری ہو رہی ہو یا لاکھوں بندگانِ خدا اپنے اپنے اعمال کے جو پیش ہونے والا ہے اور فیصلہ ہونے والا ہے اور وہ فیصلہ سزا کا نہیں، قید کا نہیں، گرفتاری کا نہیں ۔نوازش کا، عنایت کا، خوشی کا، بشارت کا، خوشخبری کا، عطیات کا، بخششوں کا۔ ان عطیات کو، بخششوں کو، نوازشوں کو، بشارتوں کو لینے کا ظرف سنبھال کر رکھنے کی استعداد، دامان وگریبان، جیب وآستیں کا جائزہ اس کے رختوں اور چاک کو سینے اور رفو میں مشغول رکھیں گے کہاں، جو بخشش ملنے والی ہے اسے سمیٹا کہاں جائے ۔سب کو اپنے اپنے چاکِ پیراہن کی فکر، تنگ دامانی کی فکر۔ کوئی قیام میں ہے، کوئی سجدے میں ہے، کوئی رکوع میں ہے، کوئی دعا میں ہے، کوئی آہِ جگرسوز میں، کوئی نالۂ دل دوز میں، کوئی اشک گہر ریز میں، کوئی مناجات میں۔ اس نظم میں 'چمن' کا لفظ، اسلام کا استعارہ ہے۔ یہ اسلام ایک شب کے لیے شام سے رنگِ سحر تک مزدلفہ میں آتا ہے۔ اپنے پورے وجود کے ساتھ، اپنی پوری صفات کے ساتھ، اپنے پورے پیغام کے ساتھ، اپنے پورے اعمال کے ساتھ۔ پوری انفرادی اور اجتماعی خصوصیتوں کے ساتھ، اپنی پوری رنگارنگی اور بوقلمونی کے ساتھ، اپنی وجاہت اور اپنی توانائی کے ساتھ، اپنی تجلیات اور اثرات کے ساتھ، اپنے تمام نرم لمحات اور گرم اوقات کے ساتھ مزدلفہ میں اکٹھا ہوتا ہے اور اپنے خالق کے سامنے رقصِ اطاعت میں مشغول ہوتا ہے۔ عرش سے فرش تک اسلام کے جمال اور جلال کا کہکشاں اپنا نور، اپنی رنگینی بکھیر دیتا ہے، سب کچھ کہہ لیتا ہے اور آئندہ کا سب کچھ سمیٹ کر نئے ارادے، نئی نیت، نئے

عزم کے ساتھ عالم عالم اپنے وجود کے تمام محاسن، تمام تجلیات، تمام انوارات بکھیرنے کے لیے سارے عالم میں منتشر ہوجاتا ہے۔ جیسے یہ شب مزدلفہ میں سال بھر کی رپورٹ لے کر اسلام آتا ہے اور آئندہ سال کے لیے تمام بشارتیں، تمام وعیدیں، تمام ذمہ داریاں، تمام پیغامات اور ان کے لیے تمام طاقتیں، تمام توانائیاں، تمام جوش، تمام جذبے نئے آہنگ سے الاپتا ہوا منتشر ہوجاتا ہے۔ ایک شب کی چند گھڑیوں میں وہ سب کچھ ہوجاتا ہے جو پچھلے ایک سال میں ہوا۔ اور وہ سب جو آئندہ سال ہونے والا ہے اسلام اپنی پرانی کینچلی اُتارتا ہے اور نیا جامہ پہن کر یہ تازہ دم ہوکر پورا مشن لے کر رخصت ہوتا ہے۔ رات گزرتے گزرتے پوری وادیِ مزدلہ جوش سے گرم ہونے لگتی ہے۔ اسلام اپنے پورے وجود کو کھول کر رکھ دیتا ہے اور پورے وجود میں نیا خون، نئی روانی لے کر واپس آتا ہے جس طرح طیورِ صبح کو نئے چہچہوں، نئے نغموں، نئے سوز، نئے ساز کے ساتھ وسعت عالم میں پھیل جاتے ہیں۔ چھ شعروں میں اس پورے ظاہری منظر اور اس منظر کی تمام باطنی کیفیات کو مختصر علامتوں میں سموکر ایک نہایت خوش رنگ، خوش آہنگ، خوشبودار گلدستہ ترتیب دے کر پیش کردیا گیا ہے لیکن پیشکش بے ساختہ، بے کوشش اور بے نیاز صناعی ہے۔

دوسرے مصرع میں 'خوش آوازِ چمن' سے مراد شاعر یعنی کلیم عاجزؔ:

مزدلفہ کی شب

اللہ اللہ کششِ جلوہ گہہ نازِ چمن
دیر تک روتا رہا ایک خوش آوازِ چمن

وادیِ مزدلفہ سوزِ چمن سازِ چمن
شام تک جانے لگی عرش تک آوازِ چمن

رات بھر کیا کہیں اندازِ چمن نازِ چمن
ذرّہ ذرّہ رہا اس وادی کا غمّازِ چمن

ایک اِک پھول تھا مصروفِ تگ و تازِ چمن
کون جانے کہ کہاں تک رہی پروازِ چمن

ایک ہی شب میں چمن کہہ گیا سب رازِ چمن
سارے عالم میں سنانے کو یہ اعجازِ چمن

اپنے ہونٹوں پہ لیے وقتِ سحر سازِ چمن
اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پروازِ چمن

دُعا

تمنّائیں، آرزوئیں، حسرتیں، اُمیدیں وغیرہ وغیرہ ستون ہیں جن پر زندگی کی عمارت کھڑی ہے۔ یہ ستون جب کمزور ہوتے ہیں یعنی آرزوئیں، تمنّائیں جب کم ہوتی ہیں یا ان کی طاقت کم ہوتی ہیں تو زندگی بیمار ہونے لگتی ہے، اس کی توانائی جاتی رہتی ہے اور توانائی کے ساتھ اس کا وقار، اس کی قدر و قیمت، اس کا وزن بھی کم ہو جاتا ہے۔ انسان وہی زندہ ہے جس کی تمنّائیں زندہ ہیں۔ تمنّاؤں میں جتنی شدّت ہوتی ہے زندگی کا جوش بڑھتا ہے۔ زندگی میں ارتقا کے دروازے کھلتے ہیں اور ان دروازوں سے قدم باہر نکلتا ہے۔ زندگی کی ہر صبح پچھلی شام سے زیادہ پرنور اور ہر شام پچھلی صبح سے زیادہ پُرسرور ہوتا ہے:

ہر صبح نیا طور، نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

آرزوؤں کی صحت مندی یہ ہے کہ وہ کبھی آسودہ نہیں ہوتیں اور کبھی محدود نہیں ہوتیں۔ لامحدود تمنائیں ہر شخص کی نہیں ہوتیں۔ لامحدود تمنائیں رکھنے والے اصطلاحاً اہلِ عشق کہے جاتے ہیں۔ اس زُمرے میں وہ ہیں جنھیں ہم پیغمبر کہتے ہیں کہ یہ اپنی تمناؤں کی آغوش میں ساری کائنات کو سمیٹے رہتے ہیں۔ یہ کوئی خیر بھی مانگ سکتے ہیں۔ مخلوق کی تمنائیں کرتے کرتے یہ خالق کی تمنا میں لگ جاتے ہیں۔ محمود غزنوی کو ایاز بے حد عزیز تھے۔ ان کی طرف بادشاہ کا میلان اور بادشاہ کی نگاہوں میں ایاز کی قدر و منزلت دیکھ کر حکومت کے امرا اور منصب دار بھی رشک کرتے تھے حالانکہ ایاز کا منصب غلامی ہی کا تھا۔ ایاز کوئی عہدہ دار نہ تھے، منصب دار نہ تھے، ان کا منصب خدمت ہی تھا مگر کوئی بات تھی کہ غزنوی ان سے مشورہ بھی لیتے اور ان کے مشوروں کو اکثر مانتے۔ امرا، رؤسا اور منصب داروں نے غزنوی سے دبے لفظوں میں شکایت بھی کی کہ آپ نے ایک غلام کو اتنا سر چڑھا رکھا ہے۔ باشادہ نے جواب دیا میں اس کا جواب آپ لوگوں کو دوں گا۔ کچھ دنوں بعد جب اس اظہارِ رشک کی شکایت کرنے والے خود بھی بھول گئے، بادشاہ نے

اعلان کیا کہ میں اپنے تمام جاں نثار اہلِ سلطنت سے بہت خوش ہوں اور انھیں انعام واکرام دینا چاہتا ہوں۔ ایک بڑے وسیع ہال میں بادشاہ نے قیمتی اشیا، جواہرات، زرنگار کپڑے، سونے، چاندی اور اشرفیوں کے بہت بڑی تعداد میں اِدھر اُدھر ڈھیر لگا دیئے۔ ان کے درمیان بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوئے اور ایاز بادشاہ کے سر پر چنور کرنے لگے۔ بادشاہ نے تمام عہدیداروں، اعنانِ سلطنت، اُمرا اور منصب داروں کو اس ہال میں بلایا اور کہا میں آپ لوگوں سے بہت خوش ہوں۔ آپ کی خدمات، جاں نثاری اور وفاداری کے صلے میں انعام دینا چاہتا ہوں۔ یہ مختلف قیمتی اشیا کے بہت سے ڈھیر ہیں، ان میں جس کو جو پسند آجائے وہ اس ڈھیر پر ہاتھ رکھ دے۔ میں غلاموں کو اشارہ کردوں گا کہ اسے الگ کرکے ان کا نام لکھ کر رکھ دے۔ چنانچہ بادشاہ نے اشارہ کیا اور تمام اعیانِ سلطنت اپنی پسند، رغبت اور ذوق کے لحاظ سے ڈھیر کو دیکھتے ہوئے کسی پر ہاتھ رکھتے رہے اور اس پر ان کا نام لکھ کر رکھ دیا گیا۔ سب اپنا اپنا ڈھیر اپنی پسند کے اعتبار سے منتخب کرچکے اور اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہوگئے تو بادشاہ نے ایاز سے کہا کہ تم نے بہت دِنوں میری خدمت کی ہے۔ تمھارا ابھی مجھ پر حق ہے کہ آج اس انعام میں تمھیں بھی شریک کرنا چاہتا ہوں، جو ڈھیر تمھیں پسند آجائے تم بھی ہاتھ رکھ دو وہ تمھارا ہے۔ ایاز بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں چنور رکھ کر ڈھیروں کے درمیان پھرنے لگے۔ ہر ایک ڈھیر کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ اور پورے دائرے سے گزرتے ہوئے بادشاہ کے قریب آئے اور بادشاہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ بادشاہ نے پوچھا یہ کیا؟ ایاز نے عرض کیا مجھے آپ چاہئیں۔ آپ میرے ہیں تو یہ سب ڈھیر میرے ہیں کہ یہ سب آپ ہی کے ہیں۔ خالق کی تمنّا تمام تمنّاؤں کی معراج ہے۔ تو یہ اہلِ عشق ہیں جو کائنات کی ہر چیز سے پیار کرتے ہیں، ہر چیز انھیں عزیز ہے چونکہ وہ ان کے محبوب کی محبوب ہیں تو اہلِ عشق کی تمنائیں لامحدود ہیں۔ کوئی مال مانگتا ہے، کوئی متاع، کوئی عہدہ، درجہ، منصب، شہرت، عزّت، مقام، مرتبہ، سلطنت، حکومت، جنت، گلزار، خوشبوئیں، رنگ سرور، نور ونغمہ، منظر، صحت، اچھی زندگی، صحت مند زندگی تاکہ ان نعمتوں سے لذّت اندوز ہوسکے۔

اس نظم 'دعا' میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں چار چیزیں ہیں جو اس کائنات میں انسان کی محبوب ترین چیزیں ہیں۔ مال، ماحول، مزاج اور محبوب اس دُعا میں مال کی نفی ہے، درجہ، منصب، مقام، عزّت، شہرت، عہدہ اور اقتدار ان کی جتنی نوعیت ہوسکتی ہے سب کی نفی ہے کہ میں نے اس لائن کی دُعا نہیں کی:

رات جی کھول کے پھر میں نے دُعا مانگی ہے

مصرع کہتا ہے کہ رات ہی یہ دعا نہیں مانگی ہے بلکہ 'پھر' مانگی ہے، خدا جانے کب سے مانگی جارہی ہے، نہیں مل رہی ہے لیکن تمنّا مردہ نہیں ہوتی، ناکامی کے بعد ہمّت اور بڑھتی ہے 'پھر' مانگی ہے اس لفظ 'پھر' نے لامحدود مدّت کا زمانہ سامنے کردیا ہے:

اور ایک چیز بڑی بیش بہا مانگی ہے

جو چیز مانگی ہے یا مانگی جارہی ہے، عمر گزرتی جارہی ہے لیکن دُعا جاندار سے جاندار ہوتی جارہی ہے۔ وہ ایسی چیز ہے جس کی قدر و قیمت کی کوئی انتہا نہیں ہے اور اس کے بعد سلسلہ ہے اس کائنات میں پھیلی ہوئی تمام تمنّاؤں کا جو انسان کی طلب اور تمنّا کا مرکز ہوتی ہیں اور پوری قوت سے ایک ایک کرکے سب کی نفی کی ہے۔ مال کے اعتبار سے تمام چیزوں کی نفی ہے، منصف، درجہ، عہدہ، کرسی، اقتدار، حکومت، سلطنت، عزّت کی، وقار کی، بلندی کی، عروج کی جتنی قسمیں انسان کے ذہن میں ہوسکتی ہیں سب کی نفی، سب کا انکار ہے پھر ماحول کا انکار ہے۔ خوش منظر ماحول، جنت، گلزار، جام وساغر، شراب، مطربِ خوش نوا، ساز ونغمہ جنت میں جو کچھ ہوسکتا ہے ان سب کی تمنّاؤں سے مانگنے والے کی تمنّا اور طلب بے نیاز ہے۔ پھر 'مزاج' ہے اچھی صحت، اچھا مزاج، زخم سے نجات، دُکھ سے، درد سے، مرض سے، بیماری سے، آزاد صحت مند زندگی جس کی تمنّا ہر شخص کو ہے۔ اس نعمت سے بھی انکار ہے کہ میری دعاؤں کا یہ مرکز اور محور بھی نہیں:

سن کے حیران رہے جاتے ہیں احبابِ چمن
آخرش کون سی پاگل نے دُعا مانگی ہے؟

سننے والے کا ذہن کُرید اور جستجو کی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے۔ آخرش کون سی پاگل نے دُعا مانگی ہے۔ لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ پاگل ہی ہوگا۔ کائنات میں جتنی چیزیں تمنّاؤں کی سزاوار ہیں سب سے تو یہ انکار ہی کرتا چلا آرہا ہے، سب کی نفی ہی کررہا ہے آخر وہ کون سی چیز ہوسکتی ہے جو ان سب سے بڑھی ہوئی ہے۔ اکثر مقامات پر، واشنگٹن میں اور ہندستان میں بھی۔ یہ نہیں مانگی ہے وہ نہیں مانگی ہے کے کلائمکس سے متاثر ہوکر لوگ اکثر کھڑے ہوگئے کہ بھائی کیا مانگی ہے؟ کیا مانگی ہے؟ اور مجھے کہنا پڑا کہ جی ہاں بتاؤں گا ضرور بتاؤں گا۔ اس کے بعد شاعر کہتا ہے:

آ تیرے کان میں کہہ دوں اے نسیم سحری

سننے والا بیتاب ہوجاتا ہے کان میں کہہ دوں؟ تو پھر ہم لوگ کیسے سنیں گے؟ نسیم سحری سن لے گی

اور چلی جائے گی۔ ''کان میں کہہ دوں'' نے سننے والوں کی ذہن کو ایک ایسے مرکز پر کھینچ لیا جہاں ہر چیز غائب ہو جاتی ہے۔ پوری کائنات اوجھل ہو جاتی ہے اور تفتیش اور جستجو اور خواہش ایک مرکز پر یکسو ہو جاتی ہے اس کو سننے کے لیے جو بات نسیم سحری کے کان میں کہی جانے والی ہے۔ نسیم سحری کو درمیان میں اس لیے لایا گیا ہے کہ جو بات کہی جا رہی ہے اس کا تعلق نسیم سحری سے اٹوٹ اور بہت گہرا ہے اس کے بغیر دعا کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے اور مدعا بھی اپنی رنگت، اہمیت، قیمت حسن اور خوشبو کھو بیٹھتا ہے:

وہ سراپائے ستم جس کا میں دیوانہ ہوں

یہ مصرع کہہ کر نسیم سحری کے کان میں کہتے ہوئے مائکروفون سے منہ قریب کر کے آہستہ سے یہ مصرع پڑھا جاتا ہے:

اس کی زُلفوں کے لیے بوئے وفا مانگی ہے

اور سارا مجمع یک بیک اُچھل جاتا ہے دو باتوں کی وجہ سے۔ اوّل تو یہ کہ سولہ سترہ شعر کے دوران کبھی ذہن کا شائبہ بھی اس کی طرف نہیں جاتا اور دوسری بات یہ کہ محبوب کی زلفوں میں خوشبوئے وفا واقعی ایسی قیمتی چیز ہے جو ساری کائنات کو واقعی ہیچ کر دیتی ہے اور آخر میں یہ بات کہہ دوں کہ یہ نظم محض خیال نہیں، فنکاری نہیں، صناعی نہیں اور صرف شاعری نہیں۔ اس نظم کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس موضوع کا تعلق شاعری، خیال آرائی، فنکاری اور صناعی کے ساتھ ساتھ گہری اور میری زندگی کی ایک بنیادی حقیقت سے ہے کہ تیس سال تک جو میری غزلوں کا محبوب رہا ہے وہ ظالم سہی بے درد سہی، اس کا ظلم اور اس کا ستم، اس کی سنگ دِلی واقعی اُسے اور زیادہ محبوب بنا دیتی ہے:

ہے تو قاتل کی ہر ادا مشہور
سب سے مشہور دل رُبائی ہے

....

اُسے کیوں نہ جانِ غزل کہوں اُسے کیسے بھولوں دعاؤں میں
مجھے شاعری جو سکھا گئی اِک ادا ہے اس کی داؤں میں

....

جس نے یہ شاعری سکھائی ہے
ایک خوش رو کی خوش ادائی ہے

اور تیس سال کی تمنّاؤں، آرزوؤں، غزل خوانیوں اور نغمہ سرائیوں کے باوجود اُس کی زُلفوں سے

بوئے وفا کبھی نہیں آئی۔لیکن دُعا بھی کبھی ختم نہیں ہوئی۔

یہ نظم موجودہ دور میں ہندوستان کی مشہور اور بے مثال فرماں رو امسز اِندرا گاندھی پر ہے:

دُعا

رات جی کھول کے پھر میں نے دُعا مانگی ہے
اور اِک چیز بڑی بیش بہا مانگی ہے

اور وہ چیز نہ دولت نہ مکاں ہے نہ محل
تاج مانگا ہے نہ دستار و قبا مانگی ہے

نہ شریکِ سفر و زادِ سفر مانگا ہے
نہ صدائے جرس و بانگِ درا مانگی ہے

نہ تو قدموں کے تلے فرشِ گہر مانگا ہے
اور نہ سرپہ کلہِ بالِ ہما مانگی ہے

نہ سکندر کی طرح فتح کا پرچم مانگا
اور نہ مانندِ خضر عمرِ بقا مانگی ہے

نہ کوئی عہدہ، نہ کرسی، نہ لقب مانگا ہے
نہ کسی خدمتِ قومی کی جزا مانگی ہے

نہ تو مہمانِ خصوصی کا شرف مانگا ہے
اور نہ محفل میں کہیں صدر کی جا مانگی ہے

....

میکدہ مانگا، نہ ساقی، نہ گلستاں، نہ بہار
جام و ساغر، نہ مئے ہوش رُبا مانگی ہے

نہ تو منظر کوئی شاداب و حسین مانگا ہے
نہ صحت بخش کوئی آب و ہوا مانگی ہے

محفلِ عیش نہ سامانِ طرب مانگا ہے
چاندنی رات نہ گھنگھور گھٹا مانگی ہے

بانسری مانگی، نہ طاؤس، نہ بربط، نہ رُباب
نہ کوئی مطربۂ شیریں نوا مانگی ہے

....

چین کی نیند، نہ آرام کا پہلو مانگا
بخت بیدار، نہ تقدیر رسا مانگی ہے

نہ تو اشکوں کی فراوانی سے مانگی ہے نجات
اور نہ اپنے مرضِ دل کی شفا مانگی ہے

نہ غزل کے لیے آہنگ نیا مانگا ہے
نہ ترنم کی نئی طرزِ ادا مانگی ہے

سن کے حیراں ہوئے جاتے ہیں احباب
آخرش کون سی پاگل نے دُعا مانگی ہے

آ ترے کان میں کہہ دوں اے نسیمِ سحری
سب سے پیاری مجھے کیا چیز ہے کیا مانگی ہے

وہ سراپائے ستم جس کا میں دیوانہ ہوں
اس کی زُلفوں کے لیے بوئے وفا مانگی ہے

بلاعنوان

پٹنہ کے دو بہت مشہور رسالے کے دو ایڈیٹر مجھ سے اُس وقت ملے جب میری شاعری کی عمر دس بارہ سال کی تھی یعنی آج سے تقریباً چالیس سال پہلے وہ میرے یہاں یوں تشریف لائے جیسے بہت دنوں ہمت اور حوصلہ حاصل کرنے کے بعد آئے ہیں۔ بولے جس کا مفہوم کچھ اس قسم کا تھا:

''حاضر ہونے کی ہمّت نہیں ہورہی تھی اور مخاطب ہونے کی جرأت نہیں ہورہی تھی۔ جی بہت چاہتا تھا آپ سے مل کر کچھ باتیں کروں۔''

یہ اس وقت کی بات ہے جب میں صرف مشاعروں میں پڑھتا تھا۔ بہار کے تمام شہروں میں اس سلسلہ میں جانا آنا ہورہا تھا، پٹنہ کے سائنس کالج کی 'بزمِ سخن' میں، بی این کالج کی بزم اُردو میں، پٹنہ کالج کی بزمِ ادب میں جب شریک ہوتا تو سائنس کالج کا ہال، بی۔ این. کالج کا ہال اور پٹنہ کے جمنا زیم ہال میں میرے داخل ہوتے ہی طلبہ سارے کے سارے تالیاں بجاتے ہوئے کھڑے ہوجاتے۔ کوئی کوئی استاد بھی مثلاً پروفیسر سیّد حسن صاحب، پروفیسر فیاض الدین حیدر صاحب بھی کھڑے ہوجاتے اور میں نہایت نروس اور شرمایا شرمایا جب تک اسٹیج پر آنہ جاتا تالیاں بند نہیں ہوتیں۔ بی این کالج ہال میں ایک بار مشاعرہ تھا، مسٹر محمد حسین آزاد مرحوم وزیر مملکت بہار صدارت کررہے تھے۔ میں کچھ دیر سے آیا۔ ہال میں داخل ہوتے ہوئے سارے لڑکے کھڑے ہوکر تالیاں بجانے لگے۔ تو محمد حسین آزاد صاحب بھی کھڑے ہوکر حسرت سے مجھے دیکھنے لگے کہ یہ کون آرہا ہے۔ وہ مجھے جانتے تھے لیکن پہچانتے نہ تھے۔ جب مجھے اسٹیج پر ان کی بغل میں بٹھا دیا گیا تو محبت سے لپٹ گئے۔ ایک مسجد میں ایک امام صاحب مجھے صف میں کھڑا دیکھ کر امامت کرنے میں ہچکچانے لگے اور نماز کے بعد میرے پاس آکر معذرت کرنے لگے کہ میری ہمت امامت کرنے کی نہیں ہورہی تھی حالانکہ وہ عالم تھے حافظ تھے قاری تھے۔ اور میں کچھ بھی نہیں تھا بالکل کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر میری شاعری، میری آواز کے ساتھ دل میں ایسی جم کر بیٹھ گئی تھی کہ لوگ بے انتہا مجھ سے محبت کرنے لگے تھے۔ عوام، خواص اور دونوں طبق کو ٹنے والا بھی۔ اور ایک معمولی چائے خانہ کا مالک بھی مجھے مشاعرے میں دیکھ کر کھل اٹھتا اور اساتذہ بھی۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے ٹیچر بھی۔ مسلمان اور ہندو، اُردو داں آفیسر بھی، کلکٹر بھی، ہائی کورٹ جج بھی، وکیل

اور بیرسٹر بھی، داروغہ رائے وزیراعلیٰ بھی، بیر چند پٹیل فائنانس منسٹر بھی، کامتاپرشاد کام ایم ایل اے بھی۔عبدالقیوم انصاری صاحب بھی،جعفرامام صاحب بھی،عبدالغفور بھی اور ایسے ایسے تمام وہ حضرات جو صرف مجھے سن رہے تھے۔مشاعروں میں میری آواز اور میرے الفاظ ان کے کانوں میں پڑ رہے تھے وہ میرے والہ وشیدا تھے، میں اور کہیں لکھ چکا ہوں کہ ہال کے مشاعرہ میں پٹنہ کے طلبہ جنھیں بیٹھنے کی جگہ ہال میں نہیں مل سکی تھی وہ کھڑے تھے اور میں غزل سنارہا تھا تو بعضوں کو میں نے دیکھا ان کی آنکھیں نم تھیں۔وہ سر کو اِدھراُدھر ہلا کر جھوم رہے تھے اور بعضوں کی آنکھوں کے کونے سے کچھ قطراتِ اشک ڈھلک بھی رہے تھے۔ یہ منظر اس وقت کا ہے جب چالیس سال پہلے میں جمنازیم ہال میں غزل سنارہا تھا:

بہار آ بھی جا لَولگائے ہوئے ہیں — بہت دن ہمیں مسکرائے ہوئے ہیں
غزل کا وہی ساز اٹھائے ہوئے ہیں — کلیجے پہ جو چوٹ کھائے ہوئے ہیں
خدا درد والوں کو آباد رکھے — کہ جاگے ہوئے ہیں جگائے ہوئے ہیں
بہت خوش نصیب آپ ہیں کہ ابھی تک — محبت سے پہلو بچائے ہوئے ہیں
کسی دن تو ہاتھ آئے گا اُن کا دامن — جو دیوانہ ہم کو بنائے ہوئے ہیں
جلائے ہیں اتنے چراغ آنسوؤں کے — تیرے بام و دَر جگمگائے ہوئے ہیں
ہمیں چین سے بیٹھنے کیا کہو ہو — بڑا بوجھ دل پر اُٹھائے ہوئے ہیں
ذرا کوئی سمجھا کے عاجزؔ سے کہتا — یہ کیا حال اپنا بنائے ہوئے ہیں

اس طرح کی غزلیں میں مشاعروں میں سناتا تھا،تو مرثیہ کی مجلسوں کی طرح ٹیس مچ جاتی تھی۔ ایک بار کلاس میں بہت اصرار ہوا، میں آمادہ نہیں تھا مگر اساتذہ طلبا سب کا بہت اِصرار ہوا تو مجھے چند اشعار پڑھنے پڑے:

میرا حال پوچھ کہ ہم نشیں مرے سوزِ دل کو ہوا نہ دے
یہی بس دُعا میں کروں ہوں اب کہ یہ غم کسی کو خدا نہ دے
یہ زخمِ دل کو پکائے ہم، لیے پھر رہے ہیں چھپائے ہم
کوئی ناشناسِ مزاجِ غم کہیں ہاتھ اس کو لگا نہ دے

تو لڑکے بیتاب ہوگئے اور ایک اسٹوڈنٹ شمیم صادقہ، جواب بھی شاید کسی کالج میں پروفیسر ہے، سسکیاں لے کر رونے لگی۔تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دل کیا تھا،اس زمانے میں،اور دل کتنا گداز

تھا اس دَور میں اور فہم و فراست کتنی لطیف تھی اُن دِنوں میں، جب میں صرف شاعری کر رہا تھا، پڑھ رہا تھا، چھپا نہیں تھا۔ مجموعوں میں سامنے نہیں آیا تھا، شاعری شروع کرنے کے پچیس سال بعد جب چند نہایت ہی دردمند سخن شناس بزرگ 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' شائع کرنے کا اہتمام کرنے لگے تو، دِلوں کا درد کھسکنے لگا اور گداز کم ہونے لگا، رشک و رقابت کی چنگاری سلگنے لگی اور کتاب چھپ گئی تو کہیں تو یہ حال ہوا کہ رات بھر کتاب پڑھی جانے لگی اور بار بار راتوں کو کتاب چھوڑ کر پانی کے چھینٹے آنسوؤں کو دھونے کے لیے منہ پر مارنے پڑے۔ اور بعض بڑے لوگوں نے یہ کہا کہ میاں جب سونے جاتا ہوں تو آخری کام یہ کرتا ہوں کہ تمھاری کتاب تھوڑی دیر پڑھتا ہوں اور جب سویرے اُٹھتا ہوں تو پہلا کام یہ کرتا ہوں کہ تمھاری کتاب پڑھتا ہوں۔ یہ کہنے والے شاید شیام نندن شرما یا کوئی شرما صاحب تھے جو وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی تھے اور پہلے پٹنہ یونیورسٹی صدر شعبۂ ہندی تھے۔

تو یہ حال کتاب چھپنے سے پہلے مجھے سن کر صوبے اور ملک میں عام طور پر تھا۔ فراقؔ کا تو حال انھوں نے خود ہی پیش لفظ لکھ کر کھول دیا۔ یہی حال جسٹس آنند نرائن ملا، سلام مچھلی شہری وغیرہ کا تھا، جنھوں نے مجلس میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ سرورؔ مرحوم اور خواجہ احمد فاروقی مرحوم کا یہی حال تھا، بلکہ فاروقی مرحوم نے تو ایک بار (ابھی شاید دس بارہ سال پہلے) ہال سے نکل کر مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے ایسی بات ایسے ٹھیٹھ انداز میں کہہ دی کہ سب محوِ حیرت ہوگئے۔ اِن میں دو گواہ تو اب بھی میرے جانے ہوئے موجود ہیں۔ فاروقی صاحب نے ہال سے نکل کر بہت زور سے کہا "عاجزؔ صاحب خوب کہا، اب کوئی نہیں کہہ سکتا سب سالے مر گئے۔" تو یہ حال تو بیس پچیس سال پہلے تک تھا۔ اب تو یہ حال ہے۔ کتاب لوگ پڑھیں گے (اگر کہیں مل جائے گی تب خریدیں گے نہیں) سر دُھنیں گے، چومیں گے، لیکن مجھ سے اتنے کترائیں گے، اتنی دُور رہیں گے جیسے میں کوئی اچھوت ہوں اور مجھ سے اتنے خفا اور اتنے گراں خاطر رہیں گے جیسے میں نے ان کا سب کچھ چھین لیا ہو۔ ان کی جیب خالی ہوگئی ہو۔ کبھی اتفاق سے سامنا ہوگا تو ایسے محجوب ہوں گے جیسے انھوں نے کوئی جرم کیا ہو اور اس حجاب کو یوں مٹانے کی کوشش کریں گے کہ آپ تو پٹنہ میں رہتے ہی نہیں ہیں۔ جب سنیے تو امریکہ میں، کناڈا میں، سعودی عرب میں، پاکستان میں حالانکہ وہ جان رہے ہیں کہ دو چار ماہ کا سفر کرتا ہوں آٹھ نو مہینے تو پٹنہ ہی میں موجود رہتا ہوں۔

تو کچھ اسی قسم کے خیالات اور افکار تھے، جو اس نظم 'بلاعنوان' کی تخلیق کا باعث ہوئے۔ یعنی دِلوں سے دردمندی، محبت، خوش خیالی، حسنِ ظن اجتماعیت غائب ہوگئی ہے۔ ان کی جگہ خود

پسندی، ہوس، خودغرضی، جاہ پسندی، شہرت خواہی وغیرہ قسم کے عیوب پیدا ہوگئے ہیں۔ اچھی چیزوں سے بے رغبتی، بُری چیزوں سے رغبت، حسن سے قطع نظر، عیب پیشِ نظر، اگر ایسے دِلوں میں یک بیک درد پیدا ہوجائے یعنی سودوسو سال پہلے والی انسانیت جاگ اُٹھے تو اس کا دل اس زمانے میں نہیں لگے۔ وہ بے چین رہے، بیتاب رہے، محبت اور آسودگی ڈھونڈھنے کو بے قرار ہے، جیسے شدّتِ پیاس میں ٹھنڈے پانی حاصل کرنے کی بے تابی ہو، ایسے لوگوں کے سامنے 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' یا 'جب فصل بہاراں آئی تھی' کتابیں رکھ دو، وہ اِن کو مطالعہ کرے اور ان کتابوں میں اُسے وہ آسودگی، وہ سیرابی، وہ شگفتگی، وہ چین، وہ سرور وہ کیف ملے کہ بیتاب ہوکر کلیم عاجزؔ کو ڈھونڈنے نکلے پھر یہ حال ہو:

پھر تم بھی مسکراتے ہوئے مجھ سے یوں ملو سورج سے جیسے چاند بوقتِ سحر ملے
جیسے اِک اجنبی کو کسی شہرِ غیر میں اِک ہم خیال ہم سخن وہم نظر ملے

دراصل یہ تلاش اور کسی کو ہو نہ ہو خود کلیم عاجزؔ کو تو ہے۔ وہ خود بھی بیتاب ہے کہ مجھ سے کٹ کر جو الگ ہوا، وہ چاند پھر اس سرزمین سے ملے کلیم عاجزؔ کو جو ہر جگہ اجنبی اجنبی سا رہتا ہے۔ کوئی محفل کوئی انجمن اسے شناسا نظر نہیں آتی۔ سب ناآشنا نظر آتے ہیں۔ بھیڑ میں وہ تنہا نظر آتا ہے، کوئی ہم سخن، کوئی ہم خیال، کوئی ہم مزاج، کوئی ہم مشرب، کوئی ہم آہنگ نظر نہیں آتا۔ وہ کلیم عاجزؔ خود کسی دردآشنا، دردمند، درد شناس کی تلاش میں ہے:

جو ہم تلاش کرتے ہیں جو ڈھونڈتے ہیں ہم
جانِ عزیز بیچ کے لے لیں اگر ملے

کسی شخص کے دل میں درد پیدا ہوجائے اور وہ اس کا مداوا، اس کا علاج، اس کا مرہم ڈھونڈنے کے لیے مارا پھرے۔ جو کیفیت کسی ایسے شخص کی اس نظم میں ہے وہ اور کسی کی ہو یا نہ ہو خود کلیم عاجزؔ کی تو ہے۔ پہلے وہ اسی قسم کے مجمع میں تھا، ایسے ہی ماحول میں تھا، اس کے قریب ایسے ہی گداز دل احباب اور بزرگ اور عزیز تھے جس میں اس کی زندگی سوارت تھی، لذّت تھی، اشکوں کو دامن میسر تھا، دھڑکتے دل پر تسکین کا ہاتھ موجود تھا۔ اب آنکھوں سے دامن چھن گیا۔ دھڑکتے دل سے ہاتھ جدا ہوگیا۔ اب:

غزل ہی کو گلے لپٹا کے رولیتے ہیں ہم عاجزؔ
کہاں غم لے کے جائیں؟ غمگساری کون جانے ہے

بلا عنوان

میں یہ دعا کروں جو زباں میں اثر ملے
میری ہی طرح تجھ کو بھی دردِ جگر ملے

جو درد میرے دل نے سمیٹا ہے کل کا کل
اس کا حقیر جزو بھی تجھ کو اگر ملے

پھر کیسا بننا کیسا سنورنا کہاں کی سیر
میری ہی شام میری ہی جیسی سحر ملے

پھر ناز کیا، غرور کیا، پندارِ حسن کیا
جو سر ہے آسماں پہ وہی خاک پر ملے

اِک ایسا کرب ہو کبھی اِک ایسا اضطراب
باہر ملے سکون نہ آرام گھر ملے

اور ایسی بے خودی ہو کبھی ایسی محویت
اپنی خبر رہے نہ کسی کی خبر ملے

مارے پھرو تمام تقاضوں کو بھول کر
اس فکر میں کہ مرہمِ زخمِ جگر ملے

جی چاہتا ہو پھاڑ کے دامن نکل چلیں
اس شہر خود پرست سے رستہ اگر ملے

تنہا مگر نکلنے کی ہمّت بھی تو نہ ہو
جب تک نہ غمگسار کوئی معتبر ملے

اِک ایسے دردمند کی ہونے لگے تلاش
پہلو میں جس کے راحتِ قلب و جگر ملے

یاد آئے تب کلیمؔ کا مجموعۂ کلام
اور حکم ہو کہ لاؤ گراں جس قدر ملے

اور جب پڑھو تو دل کی ہو کچھ ایسی کیفیت
صحرا میں جیسے روح کو خوشبوئے تر ملے

جس طرح رند تشنہ دہن کو ملے شراب
جیسے کسی فقیر کو لعل و گہر ملے

بے تاب ہو کے نکلو حریمِ غرور سے
اور پوچھو اُس سے جو بھی سرِ رہ گزر ملے

للہ تم کلیمؔ کا مجھ کو پتہ بتاؤ
میں بھی چلوں جہاں بھی وہ آشفتہ سر ملے

تب آکے اس غریب سے اس خاکسار سے
اِک خود نواز، خود نظر و خود نگر ملے

تب پوچھوں میں حضور یہ کیا انقلاب ہے!
کس بدگہر سے حضرتِ والا گہر ملے

پڑھنے سے احتراز بہت تھا مگر پڑھا!
ملنے سے احتیاط بہت تھی مگر ملے

میں ہی کلیمؔ ہوں مجھے پہچانتے ہیں آپ
سرمت جھکایئے ذرا مجھ سے نظر ملے

پھر تم بھی مسکراتے ہوئے مجھ سے یوں ملو
سورج سے جیسے چاند بہ وقتِ سحر ملے

جیسے اِک اجنبی کو کسی شہرِ غیر میں
اِک ہم خیال، ہم سخن و ہم نظر ملے

اور اس کے بعد پیار سے پوچھو کہ اے کلیمؔ
تجھ کو تو لاکھوں قدر شناسِ ہنر ملے

پھر تو نے میرے واسطے کیوں دردِ سر لیا؟
کیوں یہ دُعا کی مجھ کو بھی دردِ جگر ملے

تب میں کہوں یہی تو ہمارا وقار ہے
ہم کو ملا ہے سر تو کسے دردِ سر ملے

وہ فقیرِ راہِ سلطانِ عرب

حضرت محبوبِ الٰہی نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ اور خانقاہ سے متصل بنگلے والی مسجد کہی جانے والی ایک چھوٹی سی مسجد سے ایک اصلاحی اور تبلیغی تحریک گذشتہ بیسویں صدی کی شاید تیسری دہائی سے شروع ہوئی، جس کے متعلق چند الفاظ میں پٹنہ کے مشہور سوشلسٹ لیڈر اور جے پرکاش نرائن کے ایک دست راست احد فاطمی صاحب نے مجھے دس منٹ میں ایک خاکہ سنا دیا۔ ایک روز جب میں جماعت لے کر گشت کرتے ہوئے ان کے مکان میں گیا تو وہ مجھے پہچانتے تھے، مجھے بٹھایا اور کہا کہ میں نے حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کی وفات کے فوراً بعد یعنی گذشتہ صدی کی پانچویں دہائی میں اپنے سوشلسٹ میگزین 'بھودان' میں ایک مضمون لکھا تھا۔ تقریباً اسی طرح کے الفاظ ہیں، احد فاطمی صاحب نے مجھے کہا میں نے لکھا۔ (یہ مضمون شاید انھوں نے ۱۹۴۵ء میں لکھا تھا۔ اور مجھ سے ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ بیان کیا):

> ''نظام الدین درگاہ کے قریب کھپر پوش بنگلہ نما مسجد سے ایک کمزور، ناتواں بیمار شخص نے بے مال کے، بے سامان کے، بغیر کسی پارٹی کے، بغیر کسی منشور کے، بغیر اخیار کے، بغیر فنڈ کے صرف اُردو فارسی عربی جانتے ہوئے ایک تحریک چلائی۔ چند کمزوروں کو ساتھ ملایا دیہاتوں کا سفر کیا۔ پہاڑیوں میں، گاؤں گاؤں پھرا اور چند برسوں میں شاید بیس پچیس سال کے اندر بغیر کسی اخبار، ریڈیو، اعلان اور جلسہ کے اس تحریک کو کھپر پوش چھوٹی سی مسجد سے چلا کر عرب، یورپ، امریکہ اور کناڈا پہنچا دیا۔''

تقریباً یہی الفاظ تھے۔ صرف ایک دن سہ پہر کو اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے چند منٹ میں انھوں نے تبلیغی تحریک کا پچیس سالہ خلاصہ مجھے سنا دیا۔ میں نے سن لیا اور تقریباً اُن کے الفاظ یاد کر لیے۔ تقریباً چالیس بیالیس سال پہلے میں نے اس تحریک کو دیکھا۔ ۱۹۷۸ء کے سفرِ یوروپ و امریکہ اور کناڈا میں میں نے دیکھا کہ پورے انگلینڈ میں جہاں ۱۹۶۰ء سے قبل صرف ایک مسجد Working کی تھی جہاں صرف نمازِ جمعہ ادا ہوا کرتی تھی، اگر سنیچر کے دن کوئی میّت ہوگئی تو اس کی جنازہ کی نماز پھر جمعہ کو ہی ہوگی اور ایک ہفتہ مسجد میں میّت پڑی رہے گی۔ اب صرف

لندن میں ہی سو سے زیادہ مسجدیں ہیں۔ واشنگٹن میں عرب سینٹر جو عرب حکمرانوں کی بنائی ہوئی مسجد ہے وہی پورے امریکہ میں ۱۹۶۰ء میں ایک ہی مسجد تھی۔ اب امریکہ اور کناڈا کے تمام شہروں میں ہزاروں مسجدیں ہیں، مدرسے ہیں، اسلامی اسکول ہیں، شہروں کو تو چھوڑیئے وہاں کے گاؤں اور قصبوں میں مدارس اور مسجدیں قائم ہوگئیں۔ کناڈا کے ایک گاؤں 'کورنوال' میں گیا وہاں دیکھا ایک مدرسہ ہے اور مدرسہ سے متصل ایک مسجد ہے۔ اور وہاں کے بازاروں میں دیکھا کہ دُکان میں وضو کا لوٹا اور مسواک بک رہا ہے۔ امریکہ کے جنوب میں ایک بہت بڑا شہر اٹلانٹا ہے، وہاں شہر کے ایک علاقے میں گیا جہاں بلیک امریکن کی اکثریت ہے، وہاں دیکھ کر جی چاہا میں سجدے میں گر پڑوں۔ بازار میں بُرقعہ پوش امریکن نومسلم عورتیں سبزیاں پھل بیچ رہی ہیں، سڑک پر بیٹھی ہیں، چھوٹا سا اسٹال ہے یا ٹھیلہ ہے، جسم سراپا سیاہ برقعہ میں ہے، خریدنے والیاں بھی کچھ برقعہ پوش ہیں، صرف عام طور سے عیسائی مرد اور عورت سودا لے رہے ہیں، جا رہے ہیں۔ اکثر دُکانوں پر دیکھا عربی میں سائن بورڈ ہیں، عربی کے ساتھ انگریزی بھی ہے اور دُکان میں لمبے کرتے پر جیکٹ پہنے، عمامہ باندھے، سیاہ ریش سیاہ امریکن نومسلم کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہیں۔ میں داخل ہوا، سلام کیا، مصافحہ کیا۔ دونوں نے بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا۔ کسی نے کیلنڈر پیش کیا، کسی نے ڈائری قلم پیش کیا، کسی نے عربی اور اُردو میں پیمائش کا فیتہ دیا۔ مسجدوں میں ان کے ساتھ گیا تو دیکھا تعلیم ہو رہی ہے، گشت ہو رہی ہے اور خوشی کے ساتھ دین اور ایمان کی باتیں کی جا رہی ہیں۔

۱۹۸۰ء میں ایک چھوٹے سے شہر، واشنگٹن سے تقریباً سوا سو میل ہریسن برگ گیا تھا جہاں میرے بھانجی داماد گورنمنٹ اسپتال میں Vetenary ڈاکٹر تھے۔ اس شہر میں اس وقت صرف تین مسلمان خاندان آباد تھے۔ ایک میرے بھانجی داماد قاضی مظہر الحق، دوسرے پروفیسر اشرف قادری حیدر آبادی سائنس کے پروفیسر اور تیسرے ایک فلسطینی مسلمان انجینئر۔ کوئی مسجد وہاں نہ تھی۔ عیدین کی نماز کے لیے سوا سو میل واشنگٹن جاتے تھے۔ میں نے اس وقت کا مختصر حال اس شہر کا اپنے سفر نامۂ امریکہ میں لکھا ہے۔

گذشتہ سال ۲۰۰۱ء میں اپنی بھانجی کے ساتھ جو واشنگٹن میں رہتی ہے، مسلمان انجینئر سے ملنے ہریسن برگ گیا تو دیکھا کہ وہاں تین کشادہ مسجدیں بنی ہوئی ہیں اور سینکڑوں خاندان پاکستانی، ہندوستانی، بنگلہ دیشی ملازموں اور تاجروں کے آباد ہیں۔ تعلیم ہو رہی ہے، گشت ہو رہی

ہے ۔لوگوں کومسجدوں میں لایا جارہاہے۔ایمان افروزتقریریں ہورہی ہیں۔شاید وہاں بہار کے بھی ایک صاحب سے ملاقات ہوئی ۔نام ٹھکانہ یادنہیں رہا۔

حضرت مولانا شاہ الیاسؒ کے انتقال کے بعد حضرت مولانا یوسف صاحب ان کے صاحبزادے اس تحریک کے ذمہ دار بنے ،حضرت مولانایوسف صاحبؒ خلف حضرت مولانا الیاسؒ کی ایمان افروزتقریروں اور گفتگوؤں کا ذکر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی کتاب 'حضرت مولانا یوسف کاندھلوی' میں فرمایا ہے۔مولانا کی گفتگواورتقریروں کا وہی انداز تھا جو حضرت پیرانِ پیرغوث الاعظم عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔میں نے بہت تقریریں حضرت مولانا یوسف کی سنیں لیکن حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ کی رائے کے بعد میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔

حضرت مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ کی وفات کے بعد اس تحریک کی ذمہ داری مولانا یوسف صاحبؒ کے ہم زلف مولانا شاہ انعام الحسن صاحبؒ کے سپرد ہوئی۔تقریباً تیس سال حضرت مولانا انعام الحسن صاحب رحمۃ اللہ سے قربت رہی ۔انھیں خود دیکھا خوب سنا اور سمجھا۔ حضرت مولانا بہت خوبصورت ، بہت وجیہہ اور مؤثر شخصیت کے مالک تھے۔کم سخن لیکن صاحبِ بصیرت ۔حضرت مولاناؒ کا موضوع کام کی خصوصیات کونمایاں کرنا، کام کرنے والوں میں صفاتِ روحانی پیدا کرنا اور ایسا ماحول قائم کرنا کہ فتنہ اور شر اور نفسانیت کے داخلہ کی گنجائش نہیں رہے۔ مولانا کی دردمندی اوران کی روح کا سوز حضرت مولانا کی بے انتہا گہری اور وسیع آنکھوں سے نمایاں تھا۔ان کی کم گوئی لیکن فکر اور دعا نے سادگی اور خاکساری نے ان کے قریب رہنے والوں کووارفتہ وشیدا بنادیا تھا۔ یہ نظم ان کے وصال کے وقت لکھی گئی۔کیسے لکھی گئی مختصراً عرض کرتا ہوں۔

وفات کی اطلاع ہم لوگوں کو پٹنہ میں ٹیلی فون سے ملی۔ہم دو تین ساتھی حسن اتفاق سے اسی وقت جانے والے ہوائی جہاز میں خداداد طور پر سیٹیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے ۔ پلین کے روانہ ہونے کے دس منٹ پہلے ہم لوگوں کا نام پکارا گیا کہ پلین پر آجائیں۔تین بجے سہ پہر کے وقت کے قریب ایئرپورٹ پر پہنچے۔شہر کی طرف تھوڑی دُور جانے کے بعد زیارتِ رُخ اور نمازِ جنازہ میں شریک ہونے والوں کی بھیڑ نظر آئی۔نظام الدین سے دور ہی ٹیکسی سے اُتر جانا پڑا کہ سڑک پر گنجائش نہیں تھی ۔نظام الدین بستی میں تمام راہیں بھیڑ سے کھچا کھچ۔وہیں راستوں میں سبیل جاری ہے۔کھانا سڑکوں پرمل رہاہے،لوگ آرہے ہیں کھارہے ہیں۔ ہوٹل میں جگہ نہیں، مکانوں میں گنجائش نہیں ، ہر جگہ زائرین کی بھیڑ ہے۔معلوم ہوا عصر کے بعد پانچ

بجے نماز ہوگی۔ ہم لوگ یونہی کھڑے یا مسجدوں میں بیٹھے رہے۔ زیارت کے لیے ایسا سیلاب تھا کہ قابو میں آنا محال تھا۔ پولیس مجمع کو قابو میں رکھنے کے لیے بڑی تعداد میں مجمع کے اندر مختلف گروہ کی شکل میں مصروف تھی، پٹنہ کے سابق آئی جی مسٹر متھلیش کمار کے لڑکے اس وقت دہلی پولیس کمشنر تھے، وہ اپنی گاڑی میں اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ زائرین کا کیو بنا رہے تھے۔ لاکھوں تھے۔ کون زیارت کرے کون نہ کرے۔ عصر گزر گیا، مغرب آنے لگی لیکن جنازہ مسجد سے نکلنا دشوار۔ راستہ ہی نہیں۔ مغرب بھی گزر گیا، زیارت کا وہی ہجوم رہا۔ عشا کے قریب پولیس کمشنر صاحب نے اہلِ مسجد کے مشورہ سے بہت بڑی وین مسجد کے عقبی دروازے سے لگائی۔ خاموشی سے جنازہ اسی پر رکھا گیا اور ہمایوں کے مقبرے میں جہاں جنازے کی نماز کے لیے لاکھوں کی بھیڑ عصر سے کھڑی تھی، وین زیارت کرنے والوں کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے ہمایوں کے مقبرے میں سامنے کھڑی کی گئی اور فوراً اعلان ہوا کہ نماز ہورہی ہے۔

جنازہ ٹرک سے اُتارا نہیں گیا۔ (جہاں تک مجھے علم ہے) بڑا ٹرک تھا، اسی پر امام تشریف لائے۔ عشا کے بعد فوراً نمازِ جنازہ ہوگئی۔ ہزار ہا زیارت سے محروم رہے۔ اسی ٹرک پر جنازہ بنگلے والی مسجد میں لایا گیا۔ قبر تو عصر سے تیار تھی فوراً لاش قبر میں اُتاری گئی۔ مٹّی دینے والوں کی بھیڑ، کچھ مٹّی دینے میں شریک ہوئی۔ شب کے گیارہ بجے کے بعد مجبور ہو کر مسجد کا دروازہ بند کر لینا پڑا۔ مجمع مایوس واپس ہوا۔ یہ مختصر منظر سہ پہر کے تین بجے سے شب کے گیارہ بجے تک کا تھا۔ رات کو ہمیں ایک سرائے میں جگہ مل گئی۔ وہیں ہم لوگ نے رات گزاری۔ صبح نمازِ فجر سے گھنٹہ بھر پہلے ہم لوگ مسجد کے دروازے کی طرف جا رہے تھے، کچھ جانے والوں، کچھ اُدھر سے آنے والوں کی بھیڑ ویسی ہی تھی جیسی بھیڑ گذشتہ شام کو تھی۔ مسجد سے تقریباً پچیس تیس قدم پہلے مسجد کی طرف سے آتے ہوئے ایک خوبصورت جوان آدمی سفید گول ٹوپی پہنے، خوبصورت داڑھی، سفید کُرتہ اور لنگی، مجھ سے گزرتے ہوئے یک بیک میری کلائی پکڑ لی اور ایک جملہ کہا۔ کلیمؔ کچھ لکھو گے نہیں؟ اور وہ بھیڑ میں آگے بڑھ گئے، میں بھی کچھ حیران ہو کر آگے بڑھا۔ کیا لکھنے کو یہ کہہ رہے تھے؟ سوچتا رہا۔ دس قدم یا پندرہ قدم اور آگے مسجد کی طرف بڑھوں ہوں گا کہ مسجد کی طرف سے آتی ہوئی بھیڑ میں سے کچھ اسی قسم کے دوسرے خوبصورت شخص نے تقریباً اسی طرح سفید گول ٹوپی لمبے کرتے لنگی میں میری کلائی پکڑ لی اور وہی جملہ دہرایا۔ ''کلیم عاجزؔ کچھ لکھو گے نہیں؟'' میں حیران یہ کون شخص ہیں اور مجھ سے کیا لکھوانا چاہتے ہیں۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ صبح

کی نماز ہوئی، پھر ظہر میں شرکت ہوئی، رات گزر گئی۔ دوسرے روز ہم لوگ مگدھا ایکسپریس میں پٹنہ کے لیے سوار ہوئے۔ رات گزر گئی۔ صبح گاڑی مغل سرائے پہنچی۔ ہم لوگوں نے ناشتہ کیا اور پھر سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ایک اُردو اخبار کسی کے پاس تھا۔ میں ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا کہ ایک مصرع میری زبان پر آیا: (مولانا انعام الحسن کا وصال شبِ عاشورہ کی صبح کو ہوا)

وہ شبِ عاشورہ کی پچھلی گھڑی

اور پھر مصرعوں کی آمد شروع ہوئی۔ مغل سرائے سے گاڑی روانہ ہوئی اور میں نے اخبار کے حاشیہ پر مصرعہ اور اشعار لکھنے شروع کیے اور دلدارنگر آتے آتے اسی اخبار کے حاشیے میں یہ نظم اپنی موجودہ صورت میں مکمل ہوگئی۔ اس میں کوئی تخیل نہیں ہے۔ کوئی ڈرامائیت نہیں ہے، کوئی خیال آرائی نہیں۔ بس جو منظر سہ پہر سے شب کے گیارہ بجے تک نظروں کے سامنے آیا وہ حقیقت آرائی کے ساتھ اشعار میں منتقل ہوگیا۔ ان کی جو شخصیت میرے دل کی آنکھوں میں تھی اس کے اظہار میں نہ تو کوئی کوشش، نہ کسی تکلف کو دخل تھا۔ ہاں اب تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ دو شخص جو تقریباً ہم شکل ہم لباس مسجد جاتے ہوئے دس پندرہ قدم کے وقفے پر ملے اور چند سکنڈ میری کلائی پکڑ کر یہ جملہ بول گئے ”کلیم عاجزؔ کچھ لکھوگے نہیں؟“ وہ کون تھے۔ مجھے اس سے پہلے بھی ملے یہ مجھے بالکل یاد نہیں۔ اور اس کے بعد تو آج تک نہیں ملے۔ پھر نظم لکھی گئی۔ پٹنہ آنے کے بعد لوگوں کو دِکھائی تو حاجی بدرالدین صاحب نے اُسے ایک طویل صفحے پر چھاپ دیا۔ وہ نظم خدا جانے کہاں کہاں گئی۔ ہندوستان، پاکستان، یورپ، امریکہ، انگلینڈ۔ کہیں فریم میں لگائی گئیں۔ کتنی فرمائشیں اور آئیں۔ جتنی دستیاب ہوسکیں بھیج دی گئیں۔

وہ فقیرِ راہِ سلطانِ عرب

وہ شبِ عاشورہ کی پچھلی گھڑی چاند پژمردہ افسردہ چاندنی
جو امانت تھی زمیں کے دوش پر وہ امانت عالمِ بالا گئی

....

حضرت مولانا انعام الحسن وارثِ کیفیتِ پیغمبری
وہ فقیرِ راہِ سلطانِ عرب وہ امیرِ باطنی و ظاہری
وہ ہزاروں دل کے تنہا بادشاہ وہ کروڑوں دل کی تنہا روشنی
ایک حضرت جی سبھوں کے مدعا ایک حضرت جی کے سارے مدعی

ایک حضرت جی تمنّائے جہاں ایک حضرت جی اُمیدِ عالمی
ایک حضرت جی ہی وجہِ دردِ عشق اور وہی درمانِ دردِ عاشقی
وہ چراغِ عشق گو خاموش ہے باقی ہے سینوں میں اس کی شعلگی
اس کو یہ پونجی بہت کام آئے گی جس کو حضرت جی سے تھی وابستگی

……………

کیا قبولِ عام تھی وہ شخصیت جب کہیں ہوتی تھی تشریف آوری
بیچ میں وہ صاحبِ روشن ضمیر دائیں بائیں صاحبانِ آگہی
سر سے پا تک فقر کا عالم مگر فقر کے عالم میں بھی شاہنشہی
فقر میں شامل وجاہت کی نمود نام جس مجموعے کا ہے سادگی
لوگ کھنچ آتے تھے پروانے کی طرح دوست ہوں یا آشنا یا اجنبی
اضطرات و دعوت و فکر و دعا بس ان ہی چاروں میں گزری زندگی
آخر آخر تک رہا فیضانِ نور بجھتے بجھتے شمع یہ جلتی رہی

……………

آہ وہ بستی نظام الدین میں عاشقوں کا عالمِ دیوانگی
آہ وہ لاکھوں دِلوں میں موجزن آخری دیدار کی وارفتگی
آخرش باہر جنازہ کیسے آئے فوج دیوانوں کی ہے آگے کھڑی
بھوک ہے ان کو نہ ان کو پیاس ہے عشق کی ہے بندگی بیچارگی
سارے دیوانے یہ کہتے ہیں کہ آج اور نہیں ہے کچھ تمنّائے دِلی
ہم کو اس خاموش شمعِ عشق پر ڈالنے دو اِک نگاہ آخری
ہم اُسی سرمائے کو دل سے لگائے کاٹ دیں گے اپنی باقی زندگی

……………

سائبانِ مسجدِ بنگلہ میں جب لاشِ حضرت قبر میں رکھی گئی
درد سے دل کروٹیں لینے لگا بندھ گئی آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی
انتہائے درد میں بے ساختہ آیا لب پر شعرِ خسروؔ دہلوی

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہرِ تماشا می روی

سائیاں

مسجد قرطبہ کا ایک شعر ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

اللہ سے بھرپور تعلق اور خلقِ خدا کی بھرپور معرفت یہ شانِ مومن ہے۔ وہ غالب بھی ہے یعنی وہ شکست نا آشنا ہے، کار آفریں بھی ہے یعنی بہترین اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیت کا مالک۔ کارکشا بھی ہے یعنی رازہائے دروں کا جاننے والا اور کارساز بھی ہے۔ اس کے سامنے مسائل پانی کی طرح بہہ کر نکل جاتے ہیں۔

'سائیاں' لفظ ہندی ہے۔ میرے لڑکپن کے زمانے میں میری بستی کے کنارے جامع مسجد سے متصل تین چار گھر مسلمان سائیوں کے آباد تھے۔ وہ گیروا لباس پہنتے تھے، مسجد میں نماز پڑھتے تھے اور جمعرات کے دن مسلمان گھروں میں صرف پھر جاتے تھے۔ سائیں بابا آئے ہیں یا نام لے کر فلاں سائیں بابا۔ وہ کوئی سوال نہیں کرتے تھے لیکن گھر والے عزت اور احترام سے جو کچھ مقدور ہوتا تھا مٹھی میں لے کر آتے تھے اور سائیں جی کی مٹھی میں ڈال دیتے تھے۔ سائیں جی اسی طرح مٹھی بند ہاتھ اپنے جھولے میں ڈال دیتے تھے۔ کیا ملا نہیں دیکھتے تھے۔ وہ صرف جمعرات کو نکلتے تھے۔ بقیہ چھ دن اپنے جھونپڑوں میں رہتے تھے، صرف مسجد جاتے تھے اور کہیں نہیں نکلتے تھے۔ یہ میری یادداشت تقریباً ستر سال پہلے کی ہے۔ پھر میں کمسنی ہی میں کلکتہ چلا گیا۔ وہیں تعلیم کا آغاز ہوا۔ سال میں ایک بار آتا تھا۔ ۱۹۴۶ء کے فسادات میں پتہ نہیں ان کا حشر کیا ہوا۔ ان کے جھونپڑے ختم ہو گئے اور کہیں نظر نہیں آئے۔

میں نے سائیں کی تحقیق لغت میں نہیں کی ہے۔ خدا جانے تحقیق سے مجھے کیوں عداوت ہے۔ میں بلا تحقیق بھی بہت کچھ بول جاتا ہوں اور مجھے یاد نہیں کہ کبھی کسی نے جھٹلایا ہو۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میں جو لکھ جاتا ہوں مجھے اس پر کیوں اس قدر اعتماد ہوتا ہے۔ بہرحال تو سائیں کے لفظ سے مجھے عقیدت ہے۔ میں اس لفظ میں ایک شخصیت مراد لیتا ہوں جو دانشور بھی ہے، صوفی بھی

ہے، خدا دوست اور انسان دوست، ماہر اور تجربہ کار بھی ہے اور زیادہ وضاحت نہیں کروں گا۔

میں نے یہ نظم بالا رادہ نہیں لکھی۔ بس ایک دن چلتے پھرتے جب مجھ پر کچھ دُھن سوار تھی یہ شعر بے ساختہ زبان پر آ گیا:

کلیم آ کہ چلتی ہیں پُروائیاں سنا کوئی تازہ غزل سائیاں

سائیاں سے مراد سائیں کی جمع نہیں ہے بلکہ 'اے سائیں جی' ہے۔ پروائیاں ایک اصطلاح ہے یعنی ایسا رُخ ہوا کا جس سے زخم تازہ ہو جاتے ہیں۔ درد اُبھر آتا ہے۔ یادیں تیز ہو جاتی ہیں۔ سوز بڑھ جاتا ہے اور ساز کی طرف ہاتھ لپکنے لگتے ہیں۔ ایسی ہی کچھ کیفیت مجھ پر تازہ تھی۔ اس نظم میں شاید دو ایک شعر مجھے تسلسل میں پوری قوت لانے کے لیے لانے پڑے۔ ورنہ تمام اشعار بے ساختہ ہیں (اور ایسا معلوم ہوتا ہے اور ایسا ہر نظم اور ہر غزل میں ہے) کہ سامنے نقشہ بنا ہوا ہے۔ خانے تیار ہیں، ڈھانچے مکمل ہیں۔ اب ہر خانے میں گوٹی بٹھاتے جایئے، نقشے میں رنگ بھر جاتے ہیں۔ آتشؔ کا قطعہ مشہور ہے:

کھینچ دیتا ہے شبیہِ یار کا خاکہ خیال
فکر اس پر کام کرتی ہے پرِ پرواز کا
بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں سے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتشؔ مرصع ساز کا

میں کہہ نہیں سکتا۔ آتشؔ کا یہ قطعہ میری شاعری کی دنیا میں کس قدر محکم، ٹھوس اور ناقابلِ شکست و ریخت بنیاد رکھتا ہے۔ میں جب کوئی غزل یا نظم مکمل کر لیتا ہوں تو یہ قطعہ مجھے یاد آ جاتا ہے اور آتشؔ پر اعتماد بڑھ جاتا ہے۔ خدا جانے غالبؔ پر میرا اتنا اعتماد کیوں نہیں جمتا۔ ابھی کل ہی لکھتے لکھتے میں نے اپنی تحریر میں غالبؔ کا ایک شعر استعمال کر لیا اور وہ میرے مفہوم کے اعتبار سے بہت چست بھی ثابت ہوا:

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

میں اپنے مجموعہ غزل میں ایک دو صفحہ لکھ آیا ہوں اور اکثر غالبؔ پرست نے اعتراف کیا ہے کہ ٹھیک لکھتے ہو لیکن وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ پھر بھی غالبؔ ہی ہمارے ذہن پر سوار رہتا ہے۔ جو یہ لکھتے ہیں صحیح لکھتے ہیں کیونکہ واقعی غالبؔ ایسا فسوں کار اور جادوگر ہے کہ ذہن اس کی گرفت سے

باہرنہیں آتا۔میرے بہنوئی ڈاکٹر اکرام الحق مرحوم ایسے مجلس آرا، ایسے ماہرِ گفتگو، ایسے شوخ گفتار ایسے بذلہ سنج، ایسے لطیفہ گو کہ بڑی سے بڑی مجلس میں جہاں وہ بیٹھ جاتے اہلِ مجلس کو یوں مسحور کر لیتے کہ ذہن ان کی گرفت سے نکلتا ہی نہیں، وہ شاعر نہیں تھے مگر برجستہ کام چلاؤ شعر موزوں کر لیتے۔اب دیکھئے ایک نمونہ ان کا برجستہ شوخ گفتاری اور نطقِ مہارت کا پیش کرتا ہوں۔میں اسکول میں تھا۔کلکتہ سے آیا تھا۔طبیعت میں شعری حس تو بالکل بچپن سے تھی، شعر کہہ لیتا تھا مگر بیکار مشغلہ سمجھتا تھا۔میں گھر سے اپنے دلی دوست شاہ بدرالدین صاحب عرف دموماموں کے ہمراہ نکلا۔اکرام بھائی باہر برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔میں نے مذاقاً کہا دُلہا بھائی میں شعر کہنا چاہتا ہوں اور 'صحرائی' تخلص رکھنا چاہتا ہوں۔ایک سکنڈ کی تاخیر کے بغیر انھوں نے فوراً کہا، ہاں اور یہ جو تمھارے ساتھ ہیں ان کا تخلص 'چغد' رکھ دو اور تم دونوں مل کر چغد صحرائی بنو اور شعر کہو۔

اِس سوجھ بوجھ کا انسان کیوں جادوگر اور فسوس کار نہ کہلائے گا۔مگر کیا کروں کہ اسی بستی میں ایک صاحب تھے سہیل صاحب۔سمستی پور میں سیپ کا بٹن بنواتے تھے اور اِدھر اُدھر سپلائی کر دیتے تھے۔عسرت سے بسر کرتے تھے۔مگر بزرگوں کی صحبت میں بیٹھتے تھے۔خاموش رہتے تھے۔ایک بار ان کی مجلس میں کسی نے مومنؔ کا شعر پڑھ دیا۔شاید مومنؔ ہی کا ہے۔اور شاید ایسے ہی ہے:

صبحِ عشرت ہے وہ نہ شام وصال
ہائے کیا ہوگیا زمانے کو؟

سہیل صاحب نے سر دیوار پر دے مارا اور دیر تک مٹھی دبائے سر دیوار سے لگائے رہے۔ ایسی ہی بہت سی باتیں سہیل صاحب کی یاد ہیں۔اکرام بھائی کم یاد آتے ہیں۔سہیل صاحب بہت یاد آتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ جتنا کچھ بھی دنیا کو صحت مند اور بھلا چنگا بنائے رکھنے میں سہیل صاحب، سہیل صاحب کے سے انسانوں کو دخل ہوگا، اکرام بھائی جیسے انسانوں کا نہیں ہوگا۔آپ تردید کریں گے، اعتراض کریں گے، میں چپ رہ جاؤں گا، بحث نہیں کروں گا۔

تو یہ نظم ہوگئی۔سائیاں کے سامنے دورِ جدید کے شعرا و اُدبا کا ذکر بھی آ گیا، جو زندگی سے دور چلے جا رہے ہیں اور منزل کا پتہ بھی نہیں بتاتے۔خود پتہ نہیں تو دوسروں کو کیا بتائیں۔'سائیں' کو ٹھوکر دی جا رہی ہے ذرا منہ کھولو۔دل سامنے کرو۔دماغ پر سب ضرب لگا رہے ہیں۔سائیں جی ذرا دل کا دروازہ کھولو، درد کو انگڑائیاں لے کر اُٹھنے کہو، آرکسٹرا بہت بج رہا ہے۔ذرا شہنائی کی میٹھی مدھر آواز سناؤ، یہ میٹھی مدھر آواز کہاں سے آئے گی؟ کہاں سے آ سکتی ہے؟ سائیں جی! یہ

آواز ٹوٹے ہوئے دل سے آئے گی، بچھڑی ہوئی یادوں کو سامنے لانے سے پیدا ہوگی۔ بس سائیں جی دل کا دروازہ کھول دیتے ہیں:

میرے گاؤں کے وہ بغیچے وہ پل
وہ تالاب و ندیاں کھائیاں

بس چلا۔ شہنائیاں بجنے لگیں، حسین دل کو چھو لینے والی زندگیوں کے مرقعے سامنے آنے لگے:

وہ انگنائیوں میں چنبیلی کے پھول
بہاریں جنھیں دیکھ شرمائیاں

چنبیلی کے پھول جیسے بہن بھائی امرود کی شاخ میں لگے ہوئے جھولے پر جھول رہے ہیں۔ جھولا Aristocrate لفظ ہے۔ گھر گھر بولا جاتا ہے۔ انسانیت جوان ہوگئی ہے۔ اب یہی لفظ مہذب اور شریف ہے:

بوبو جی، بوبو جی امرود میں ہنڈولہ لگا ہے

اب کون بولے۔ بس پھر:

چھری کی ہوائیں چلیں، لہو کی گھنی بدلیاں چھائیاں

جو سب بہا کر لے گئیں، نہ انگنائی رہی نہ چنبیلی کے پھول، نہ جھولا، نہ ہنڈولہ، نہ بوبو، نہ بھیّا:

جہاں اب خارزاریں ہوگئی ہیں　　وہیں اکثر بہاریں ہوگئی ہیں
سنا جاتا ہے شہرِ عشق کے گرد　　مزاریں ہی مزاریں ہوگئی ہیں

اب مزاریں بھی نہیں، نہ مکاں رہے نہ مکیں۔ نہ ہمسائے نہ ہم سائیاں:

وہ کمرے اُسارے وہ شامیں وہ گیت
وہ کھٹیے وہ مچیے وہ چرپائیاں

لہو کی گھٹا سب بہا کر لے گئی۔ انسانیت کا گہوارہ گاؤں، انسانیت کی چھاتی کا دودھ گاؤں، انسانیت کی ماں گاؤں ختم ہوگیا۔ اس گاؤں کا معصوم لڑکپن۔ 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' میں اور اس گاؤں کی جوانی 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' میں دیکھو اور پھر پڑھو:

ہوئے تھے چاک کیا کیا جیب و داماں یاد آتے ہیں
ہمیں پھر آج ایامِ بہاراں یاد آتے ہیں

جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی جہاں نغمے ہی نغمے تھے
وہ گلشن اور وہ یارانِ غزل خواں یاد آتے ہیں
بہاریں، سیر گاہیں، چاندنی راتیں، ملاقاتیں
ہمیں اب تک یہی خوابِ پریشاں یاد آتے ہیں

میں خود کو سائیں جی نہیں سمجھتا، محبت کی دُنیا کا جوگی سمجھتا ہوں۔ اب سائیں جی سات آسمان وزمین میں کہیں نہ ملیں گے۔ ہاں سائیں جی کی پرچھائیاں دیکھنی ہوتو کلیم عاجزؔ کو دیکھو پھر یہ پرچھائیاں بھی نہ رہے گی۔ کھیل ختم پیسہ ہضم۔ کھیل تو ختم ہو جائے گا لیکن پیسہ آپ کی جیب میں ہی رہ جائے گا۔ پھر نہ ہم رہیں گے نہ آپ۔ نہ آپ کی جیب نہ آپ کا پیسہ:

سائیاں

کلیمؔ آ ، کہ چلتی ہیں پروائیاں
سنا کوئی تازہ غزل سائیاں
تو سائیں ہے اور سائیں کی جھولی میں
چھپی ہیں بہت بزم آرائیاں
میں کیا حال ان کا بتاؤں تجھے
دِکھاتے پھرے ہیں جو مرزائیاں
حقیقت میں ہے مال سستا مگر
بڑھاتے ہیں پیکنگ سے مہنگائیاں
لفافے ہیں لمبے مضامیں سبک
غزل ہوں کہ نظمیں کہ چوپائیاں
کرائے کے اجرا کرائے کے جشن
کرائے کی مضمون آرائیاں
مٹی جائے ہے آبروئے سخن
بڑھی جائے ہیں فن کی رُسوائیاں
اب ایسے میں کاہے تو خاموش ہے
سنا سائیاں کچھ سنا سائیاں
محقق نہ ہم کوئی نقّاد ہیں
مبارک انھیں کو ہوں چتورائیاں
میاں بس ہمیں تو پسند آ گئیں
تری سادگی تری سچائیاں
ترے طرز و اسلوب و انداز کو
دعا دیتی ہیں دل کی گہرائیاں

……..…………

محبت کی دُنیا کا جوگی ہے تو
تو جوگی بنا کیوں بتا سائیاں
بتا او محبت کے مارے بتا
محبت کی کیا کیا سزا پائیاں
بتا دل ترا کاہے چھلنی ہوا
کلیجے پہ کیوں برچھیاں کھائیاں

ہلا پھر درِ دل کی زنجیر کو　　اُٹھے درد پھر لے کے انگڑائیاں
ذرا چھیڑ جذبات کی بانسری　　بجا دل کے کانوں میں شہنائیاں
خیالات کی سیڑھیاں پھر لگا　　اتر آئیں یادوں کی پرچھائیاں

....

وہ یادیں مری ہاں وہ یادیں مری　　وہ پرچھائیاں ہاں وہ پرچھائیاں
وہ پرچھائیاں جن سے بھرپور ہیں　　مری شاعری کی توانائیاں
ہے رنگین جن سے مری انجمن　　حسیں جن سے ہیں میری تنہائیاں
صدف بن گئیں جن سے آنکھیں مری　　بہت موتیاں جن نے برسائیاں
مرے گاؤں کے وہ بغیچے وہ پھول　　وہ تالاب وہ ندّیاں کھائیاں
وہ منڈوے وہ بارات وہ رتجگے　　وہ ڈیوڑھی اُسارے وہ انگنائیاں
وہ شامیں وہ کمرے وہ باتیں وہ گیت　　وہ مچئے کھٹولے وہ چرپائیاں
وہ گھر وہ نمونے مساوات کے　　برابر جہاں بیبیاں دائیاں
وہ انگنائیوں میں چنبیلی کے پھول　　بہاریں جنھیں دیکھ شرمائیاں
وہ جھولا اِک امرود کی شاخ پر　　وہ جھولے پر بیٹھی بہن بھائیاں
وہ جھولا ہنڈولا جسے کہتی تھیں　　ہمارے دیہاتوں کی ماجائیاں
وہ گاؤں کی بولی کہ جس پر فدا　　ترنّم تغزل کی رعنائیاں

....

یکا یک چھری کی ہوائیں چلیں　　لہو کی گھنی بدلیاں چھائیاں
وہ بولی کہاں جاکے گم ہوگئی　　کہاں جاچھُپیں وہ بہن بھائیاں
وہ جھولا نہ شاخیں وہ امرود کی　　نہ اب وہ چنبیلی نہ انگنائیاں
اب آگے نہ مجھ سے کہا جائے ہے　　مری دونوں آنکھیں ہیں بھرائیاں
نہ اب وہ مکاں ہیں نہ اب وہ مکیں　　نہ ہمسائے اب ہیں نہ ہمسائیاں

انھیں دیکھنے کو ترستا ہوں میں
بتا مجھ کو اُن کا پتہ سائیاں

تیلہاڑہ کے گنج شہیداں کا تازہ سفر

اس نظم یا اس غزل کا شانِ نزول لکھنے کو سوچتا ہوں، کیا کروں 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' پوری کتاب نقل کردوں۔ 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' پورا دیباچہ دُہرا دوں؟ کیا کروں؟ میری شاعری کی عمر تقریباً پچاس باون سال ہوگئی۔ چار پانچ سو غزلیں لکھ دیں، کتنی نظمیں لکھ دیں، کتابیں لکھ دیں۔ باتیں انھیں کی اشاروں کنایوں میں کرتا رہا، لیکن سامنے بٹھا کر مخاطب کر کے نہیں لکھا۔ ۱۹۴۶ء کے بعد گیارہ سال تک اس بستی کی طرف دیکھنے کی ہمّت نہیں ہوئی تھی۔ گیارہ سال بعد گیا اور پھر یہ حال ہوا کہ ۱۹۵۷ء سے اس وقت تک پینتالیس سال ہوگئے کسی سال یہ سفر ناغہ نہیں ہوا۔ جاتا رہا جاتا رہا، روتا رہا رولاتا رہا، یاروں کو ہم سفر لے گیا۔ کبھی کبھی 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' کا کوئی ایک آدھ صفحہ راستے میں سنایا اور پھر کوئی قابو میں نہیں رہا اور ایسا لگا کہ:

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

بستی میں پہنچنے سے پہلے سنگی مسجد میں داخل ہوتا، جھاڑ جھنکاڑ صاف کرتا، گھاس چھیلتا اور مٹّی پر چادر بچھا کر نماز ادا کرتا۔ دعاؤں میں رونے کے علاوہ کیا کہنا تھا۔ کیا کہہ سکتا تھا، کچھ یاد ہی نہیں آتا تھا۔ سنگی مسجد کا حصہ گرتا رہا، ٹوٹتا رہا۔ اس اُمید میں کہ شاید مسجد کی زبانی جو کہانی دیباچہ میں کہی ہے اور مسجد کی روح کہانی کہتے کہتے بول اُٹھی کہ میں بس یوں ہی رہوں گی تا آنکہ میرے سینے سے وہی آوازِ اذان گونجے جو ایک دن یکایک کہیں دُور سما گئی، شاید مسجد کی دیواروں میں سمائی ہوئی روح پھر باہر آجائے۔

میں ہر سال جاتا رہا۔ یہ عمل ہوتا رہا مگر اپنے سفر کا تاثر کبھی نظم کی صورت میں بیان کرنے کی ضرورت یا ہمّت محسوس نہیں ہوئی لیکن پنج شنبہ ۵/ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ مطابق ۲۷/جون ۱۹۹۳ء میں وہ سالانہ سفر ہوا تو میرے ساتھ حسبِ معمول جماعت تھی۔ کچھ طلبا، کچھ دوست، کچھ واقفِ حال، کچھ غمگسارِ حال۔ مسجد پہنچا، سامنے کنویں پر ہم لوگ وضو سے فارغ ہوئے، مسجد میں داخل ہوئے۔ گرد بہت گہری تھی، کچھ صاف کی کچھ صاف نہیں ہوسکی۔ اسی پر مہین چادر بچھائی، اذان

دی، ظہر کی نماز ادا کی، گرد کچھ چادر پر کچھ پیشانی پر بیتابی میں چادر سے باہر زمین پر پہنچ گئی، پیشانی پر گرد جم گئی۔ نماز ختم کی، دعا کے لیے ہاتھ اٹھا۔ کچھ منہ سے نہ نکلا۔ بس آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے اور لگا تار نکلنے لگے اور سب کی آنکھوں کا یہی حال تھا:

اشکوں کے مسافر صف باندھے خاموش گزرنے لگتے ہیں
پھر خواب کہاں اِن آنکھوں میں جب ان کا خیال آ جاتا ہے

سسکیاں ختم ہوئیں۔ چادر اٹھانے لگے تو میرے ہم سفر پروفیسر محمد عباس جو ایران میں فارسی کے استاد تھے، جہان آباد کے رہنے والے ہیں، اب ایران سے واپس آ کر تجارت میں مشغول ہیں، انھوں نے چادر والا ہاتھ میرا پکڑ کر صرف یہ کہا۔ عاجؔز صاحب کیا کچھ لکھئے گا نہیں؟

میں نے کہا کیا؟ بولے کچھ بھی نہیں لکھو گے؟ کچھ تو لکھ ڈالو۔ یہ سوال یا مطالبہ مجھ سے ۳۶ سال تک کسی نے نہیں کیا۔ عباس صاحب کے دل میں کیا آیا۔ وہ بول اُٹھے، شاید میرے آنسوؤں کے ساتھ وہ میرے دل میں داخل ہو گئے اور وہ دیکھ لیا جو باہر آنے کے لیے بیتاب تھے، وہ شہدائے تیاہاڑہ کی زبان بن گئے۔ میں خاموش رہا۔ میرے دل کا دروازہ کھل گیا۔ آنکھوں سے پردہ اُٹھ گیا۔ بہت دن پہلے غزل کہی تھی:

ہم جس میں ہمیشہ رہتے ہیں دہکی ہوئی غزلیں کہتے ہیں
اس درد کی بھٹّی سے ہو کر اوروں کا گزرنا مشکل ہے

تو کلیؔم بن کر آنے والا اپنی ماں کا بیٹا، اپنی بہن کا بھائی۔ اپنی چچیوں کا بھتیجا، اپنی خالاؤں کا بھانجہ بن کر پہنچتا تھا۔ اس دن کلیم عاجؔز شاعر بن کر اور سفینۂ غزل بغل میں دَبا کر اس مجمع میں پہنچ گیا۔ جو ۵؍نومبر ۱۹۴۶ء کو عید کی تیاری کرتے کرتے، قربانی کا منصوبہ بناتے بناتے ٹھیک ۹؍ذی الحجہ کو بستی کی بستی خلوت نشیں خواتین، کنواری دوشیزائیں، بیاہتا بیبیاں، کمسن بچے، معصوم بچیاں، سن رسیدہ بزرگ، پسِ دیوار اور سرِ راہ قربان ہو گئے تو اس درد کی بھٹّی میں جو میرے تخیل میں سینتالیس سال سے دہک رہی تھی، میں کاغذ قلم لیے اپنے سفینۂ غزل کے ساتھ کود گیا:

پھر آج درد کی بھٹّی میں جل کے آئے ہیں
پگھل کے آئے ہیں سانچے میں ڈھل کے آئے ہیں

میرا کودنا تھا کہ چاروں طرف سے چھنا چھن، جھنا جھن، کھنا کھن بہنوں کا، بھوجائیوں کا، خالاؤں کا اور چچیوں کا مجمع جنت سے کود پڑا۔ ارے یہ تو ایک جشن ہو گیا درمیان میں میری

مسکراتی ہوئی ماں اور کھلکھلاتی ہوئی بہن:

منانے ہم بھی شہیدوں کا جشن سالگرہ
بغل میں لے کے سفینے غزل کے آئے ہیں
ہمارے سامنے مجمع ہے سُرخ پوشوں کا
شہانہ عید کا جوڑا بدل کے آئے ہیں

اور پھر:

کسے مجال ہو انکار کی وہ جب یہ کہیں
میاں ترے لیے جنت سے چل کے آئے ہیں

اُف اتنی دُور جنت سے یک بیک سب کود گئیں؟ کلیؔم سے غزل سننے کے لیے؟

اب کے پھر برسات میں گنجِ شہیداں پر چلیں
آسماں روئے گا اور اپنی غزل گائیں گے ہم

تو پھر کلیؔم کو اور کیا چاہیے:

جن کے لیے کراہتے رہتے تھے روز و شب
دیکھا تو سامنے تھے وہ سب مرکزِ نظر

پھر کلیؔم نے جو کیا، جو کہا، وہ پڑھ لیجیے:

اب آگے نہ مجھ سے کہا جائے ہے
مری دونوں آنکھیں ہی بھر آئیاں

میں غزل کہتا رہا اور تیلہاڑہ کے شہید اِن سُرخ پوش کا مجمع سامنے جھوم رہا تھا۔ غزل کہتے کہتے ماں کے پیار کی انگلیاں خوش ہو کر بلائیں لینے کو اُٹھیں، میں نے انگلیاں پکڑ کر آنکھوں سے لگا لیں۔ خون کے ٹہٹہاتے رنگ سے بھیگے ہوئے دوپٹے کا آنچل ہاتھوں پر لے کر جب میری بہن سلام کو جھکی تو میں نے آنسوؤں کے سارے موتی اُس آنچل میں اونڈیل دیئے۔ میں نے غزل ختم کی اور سُرخ پوشوں کا قافلہ جنت کی طرف پرواز کر گیا۔ شہیدوں کا جشنِ سال گرہ ختم ہوا اور میرے سفینۂ غزل میں ان سُرخ پوشوں کی بخشی ہوئی غزل کا اضافہ ہوا۔ وہیں میں نے اسی مطلع سے آغاز کر کے:

پھر آج درد کی بھٹّی میں جل کر آئے ہیں
پگھل کے آئے ہیں سانچے میں ڈھل کے آئے ہیں
بہا کے آئے ہیں ویران راہوں میں آنسو
چراغ کی طرح صحرا میں جل کے آئے ہیں

اسی مٹی کو جوان کی اجتماعی قبروں کی چادر ہے اپنی پیشانی پہ مل کے آئے اور کانٹوں پر جس کی چادر اِرد گرد بچھی ہے چل کے آئے، خدا سے دعا کر کے آئے، رو کے اور مچل کے آئے کہ اے اللہ کیا یہ مسجد پھر آباد نہ ہوگی۔ اس مسجد کی روتی ہوئی روح جو مجھے ساری کہانی سنا کر گئی، کیا مسجد کی دیواروں سے پھر برآمد نہ ہوگی؟ کیا آوازِ اذاں پھر نہ گونجے گی:

سنو، تیلہاڑہ کے جانِ جہاں شہید وسنو! تمھاری آتشِ فرقت میں جل کے آئے ہیں
تمھارے واسطے سجدے کیے ہیں مٹّی پر دعائیں کر کے جبینوں پہ مل کے آئے ہیں
لہو تمھارا نئے رنگ و بو میں اُبھرے گا اشارے ہم کو نئے پھول پھل کے آئے ہیں
یقین ہے کہ نئی صبح رونما ہوگی
یقیں ہے کہ مقدر بدل کے آئے ہیں

کیا یہ پیشین گوئی صحیح ہوجائے گی؟ یہ نظم اور غزل میں نے ۵؍ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ مطابق ۷؍جون ۱۹۹۳ء میں تیلہاڑہ سے واپس آتے ہوئے لکھی۔ دو سال بعد سنا کہ دو چار مسلمان بستی میں سڑک کے کنارے چھوٹی چھوٹی دُکان بنا کر رہ رہے ہیں، جا کے دیکھا تو صحیح ہے، پھر تعداد بڑھنے لگی اور پچھلے سال دو سال کے وقفے کے بعد گیا۔ تو مسجد میں چٹائی کا فرش بچھا ہوا ہے۔ ممبر پر رنگین چادر پھیلی ہوئی ہے۔ خطبہ کی کتاب اور عصا رکھا ہوا ہے، گھڑے میں پانی بھرے ہوئے ہیں اور وضو کے کتنے چھوٹے چھوٹے لوٹے رکھے ہوئے ہیں اور تیلہاڑہ بستی میں بکھرے ہوئے اِدھر اُدھر کے مسلمان مسجد میں جمع ہو گئے۔ کچھ لنگر سرائے سے آ گئے، اذان ہوئی، خطبہ ہوا۔ اور تقریباً دو صف نمازی اللہ کے آگے سجدہ ریز ہو گئے۔ کسی منزل کی کسی وادی میں چھپا ہوا عشق کا قافلۂ سخت جان لوٹ آیا۔ میں اِسے معجزہ کہوں گا۔ تقریباً پچاس سال بعد جس بستی میں ایک گز زمین مسلمان کی باقی نہیں تھی، ایک دیوار بھی کہیں سلامت نہ تھی۔ ۹؍ذی الحجہ مطابق ۵؍نومبر ۱۹۴۶ء کو ۹۰۰ مسلمانوں کے شہید ہو جانے کے بعد کچھ سخت جان جو بچے وہ بستی چھوڑ کر اِدھر اُدھر ہوتے ہوئے پڑوسی ممالک میں چلے گئے۔ وہ ختم ہو گئے، ان کی نسل پاکستان، بنگلہ دیش بھی

گئی ۔میرے گھر کا کچھ حصہ جلنے اور اُجڑنے سے جو بچا جسے ایک نیک دل ہندو نے خرید لیا اس شرط پر کہ یہ بچی ہوئی دیواریں اور کمرے اسی طرح رہیں گے۔ وہ بولا اسی طرح رہے گا۔آپ ہی کا گھر رہے گا۔ آپ آیئے ، بیٹھئے ، رہیے۔ اس کی شکل نہیں بدلی جائے گی ۔ آپ جب تک زندہ رہیں گے اسی طرح اس کو دیکھیں گے اور اسی طرح وہ ہے۔تو وہ بستی جہاں ایک فرد مسلمان ۵/نومبر ۱۹۴۶ء کو نہ بچا، پچاس باون سال بعد پھر وہاں آوازِ آذان گونج رہی ہے ۔شہدائے تیلہاڑہ کی روح آگے صف میں، ان کے پیچھے مسجد کے آباد کرنے والے چند مہمان مسلمان سجدہ ریز ہورہے ہیں ۔وضو کے لوٹے مسجد میں قطار سے رکھے ہوئے ہیں ۔سجادے بچھے ہوئے ہیں، سامنے عصائے خطیب کھڑا ہے محراب و منبر پر سُرخ چادر بچھی ہے۔

اللہ کرے یہ سپیدۂ سحر صبح درخشاں بن جائے

تیلہاڑہ کے گنج شہیداں کا تازہ سفر

(پنج شنبہ ۴/ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ مطابق ۲۷/جون ۱۹۹۳ء)

پھر آج درد کی بھٹّی میں جل کے آئے ہیں — پگھل کے آئے ہیں سانچے میں ڈھل کے آئے ہیں
بہا کے آئے ہیں ویران راہوں میں آنسو — چراغ کی طرح صحرا میں جل کے آئے ہیں
ستم رسیدوں کی یادوں کے پاک چشموں میں — نہا کے آئے ہیں رنگت بدل کے آئے ہیں
وہ خوشبوئیں جو شہیدوں کی خاکِ پاک میں ہیں — تمام چہرے پہ گردن پہ مل کے آئے ہیں
انھیں شہیدوں نے پھر پیار سے بلایا تھا — انھیں کے پیار کے سائے میں پل کے آئے ہیں
جو اُن کے پھول سے جسموں کا آج پردہ ہیں — برہنہ پا انھیں کانٹوں میں چل کے آئے ہیں
بہت فسردہ ہم اُترے تھے ان فضاؤں میں — مگر بہت تر و تازہ نکل کے آئے ہیں
رگوں میں دوڑ رہی ہیں نئی تمنّائیں — اُداس اُداس گئے تھے بہل کے آئے ہیں
گئے تھے یوں کہ گریں گے تو اُٹھ نہ پائیں گے — مگر گرے ہیں اُٹھے ہیں سنبھل کے آئے ہیں
نئی اُمنگیں، نئے ولولے، نئے ارماں — نئی اُمیدوں کے چشمے اُبل کے آئے ہیں
زمانے کے لیے ہیں درد کے نئے پیغام — میرے لیے نئے تحفے غزل کے آئے ہیں

…….…………

سنو تیلہاڑہ کے جانِ جہاں شہیدو سنو! تمھاری آتشِ فرقت میں جل کے آئے ہیں
تمھارے واسطے سجدے کیے ہیں مٹّی پر دُعائیں کرکے جبیں اپنی مل کے آئے ہیں
لہو تمھارا نئے رنگ و بو میں اُبھرے گا اشارے ہم کو نئے پھول پھل کے آئے ہیں
پکار آئے ہیں لوح و قلم کے مالک کو تڑپ کے آئے ہیں رو کے مچل کے آئے ہیں
یقین ہے کہ نئی صبح رونما ہوگی
یقین ہے کہ مقدر بدل کے آئے ہیں

غزل

پھر آج درد کی بھٹّی میں جل کے آئے ہیں پگھل کے آئے ہیں سانچے میں ڈھل کے آئے ہیں
یہ ہم جو شہر سے آئے ہیں گاؤں عید کے دن پرانے گھر نئے گھر سے نکل کے آئے ہیں
منانے ہم بھی شہیدوں کا جشنِ سالگرہ بغل میں لے کے سفینے غزل کے آئے ہیں
ہمارے گاؤں میں مجمع ہے سُرخ پوشوں کا شہانہ عید کا جوڑا بدل کے آئے ہیں
ہماری ماں کو ہماری بہن کو ساتھ لیے شہیدِ ناز اغل کے بغل کے آئے ہیں
ہر ایک کی ہے زباں پر کہ ہاں سناؤ کلیمؔ ہم اشتیاق میں تازہ غزل کے آئے ہیں
کسے مجال ہو انکار کی وہ جب یہ کہیں میاں، تیرے لیے جنت سے چل کے آئے ہیں
سنا دی میں نے غزل اور سنا دی یوں کہ سب کے چہرہ کی رنگت بدل کے آئے ہیں
کوئی تڑپ گیا دل تھامے کوئی لوٹ گیا کسی کی آنکھوں میں آنسو مچل کے آئے ہیں
بلائیں لینے کو جب ماں کی انگلیاں اُٹھیں ان انگلیوں کو ہم آنکھوں سے مل کے آئے ہیں
بہن کے پھیلے ہوئے لال لال آنچل میں ہم اپنے اشکوں کے سب پھول اُچھل کے آئے ہیں
گو اِن شہیدوں کی تربت پہ جھونپڑا بھی نہیں ہمیں تو لطف بہشتی محل کے آئے ہیں
ہماری شاعری کے اصل قدرداں ہیں یہی یہیں مزے ہمیں شعر و غزل کے آئے ہیں
ہمارے شعروں کو گھر دوسرا نہیں معلوم
یہ دل میں جائیں گے دل سے نکل کے آئے ہیں

بوسنیا

جس زمانے میں 'بوسنیا' کا خونی انقلابی پھریرا لہرا رہا تھا، خون کی بارش اور زخموں کی پھوار پڑ رہی تھی۔ امریکہ میں 'بوسنیا' کے نام پر چندہ کا بازار گرم تھا۔ 'بوسنیا' کے احوال کو اندوہناک، خوفناک اور سب سے زیادہ شرمناک بنا کر پیش کر کے چندہ کی اپیل کرنے والے ایک دوسرے سے بازی جیتنے کی کوشش میں سب کچھ فراموش کر چکے تھے۔ حیا، شرم، غیرت، سب کچھ پس جیتنے کی کوشش میں سب کچھ فراموش کر چکے تھے۔ حیا، شرم، غیرت، سب کچھ پسِ پشت تھا۔ جو باتیں وہ پمفلٹ اور کتابچے میں لکھ لکھ کر بانٹ رہے تھے اور بیچ رہے تھے اور چندے کے حقدار میں سب سے آگے رہتے تھے۔ ان باتوں کو مجھے ان سطور میں لکھتے ہوئے کیا سوچتے ہوئے اور یاد کرتے ہوئے بھی غیرت سے ڈوب مرنے کو کہتی ہے۔ عصمت دریوں کی ایسی کریہہ داستانیں اور اس کے نتائج کی ایسی شرمناک تصویریں پیش کر رہے تھے کہ مجھے خوف آتا تھا کہ اسلام کے نام پر ایسے بے غیرت بننے والوں پر اللہ کا عذاب نازل ہو، اور شاید مختلف شکلوں میں آتا بھی۔

'بوسنیا' یوروپ کے اسلامی علاقوں میں تھا۔ یوروپ کا بیشتر حصہ مشرف بہ اسلام تھا لیکن عیسائی اور روسی سازشوں نے ان کی وجود کی انفرادیت اور اسلامی خصوصیت گویا ختم ہی کر ڈالی تھی اور رفتہ رفتہ ان کا معاشرہ اسلام سے کتنی دور جا پڑا اس کا بیان بغیر تفصیل مشکل ہے۔ مصر و شام تو خیر عربی اثرات کے کسی حد تک ماتحت تھے اس لیے ان کی تہذیب اور معاشرت پر اسلامی حاشیے کسی حد تک باقی تھے اور باقی ہیں، مگر یوروپ کے اسلامی ممالک تو سب کچھ فراموش ہی کر چکے تھے۔ روسی اقتدار کے ختم ہونے کے بعد کچھ قدریں جاگیں، کچھ حمیت کچھ لوگوں میں زندہ ہوئی اور اس چنگاری کو ہوا دے کر شعلہ بنانے کی کوشش کرنے لگے تو استبداد کا دیو انگڑائیاں لے کر بیدار ہوا اور اس ذہنی اور دینی انقلاب کو اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے آثار کو فنا کر دینے کے لیے پھر

تیار ہوا۔ یہ گویا عذاب کی شکل اختیار کرگئی، اور برائے نام مسلم بھی بڑی بے دردی سے کچلے جانے لگے۔ اور پھر وہ سب ہوا جو پچھلے آٹھ دس برسوں میں ہماری نگاہوں کے سامنے لٹیروں کی شکل میں پہنچا۔ اللہ نے اس چنگاری کی حفاظت فرمائی، شعلہ تو نہیں بن سکا مگر جگنو کی کہکشاں بن سکا۔ اسلامی ملک تقسیم ہوا اور نصف سے زیادہ علاقہ سے مسلمانوں کا انخلا ہو گیا جس پر عیسائی قابض رہے۔ جو حصہ اسلامی اقتدار کے نام آیا وہ تھوڑا رہا۔ سبکی ہوئی، پامالی ہوئی مگر فنا ہونے سے بچ گیا۔ اسی دوران شکاگو کے علی گڑھ ایسوسی ایشن نے مشاعرہ کیا جس میں ایک خاص فرمائش 'بوسنیا' پر نظم کی تھی، میں نے وہیں نظم کہی اور مشاعرے میں شامل ہوا۔ ہند و پاک کے بیشتر صفِ اوّل کے شعرا تھے مگر میرے سوا کسی نے بوسنیا پر نظم نہیں لکھی۔

اہلِ اسلام کے عروج و زوال کا قانون ایک ہی ہے، وہ کبھی نہیں بدلتا اور کبھی نہیں بدلا۔ حضرت نوح علیہ السلام اور قومِ حضرت نوحؑ، حضرت صالح علیہ السلام اور قومِ حضرت صالح، حضرت شعیب علیہ السلام اور قومِ حضرت شعیبؑ، حضرت براہیم خلیل اللہ علیہ السلام اور نمرود، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور قوم بنی اسرائیل، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قوم ابوجہل، یہ تمام تاریخیں ایک قانون کے ماتحت وجود میں آئیں اور قیامت تک ایک ہی قانون کا کرشمہ نظر آتا رہے گا۔ یزداں اور اہرمن، انسان اور شیطان، ایمان اور کفر، روشنی اور تاریکی۔ یہ تصادم ازل سے ابد تک چلتا رہے گا:

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

اس کشمکش اور کھینچا تانی میں اگر ایمان کفر کی طرف کھینچتا رہا تو زوال شروع ہو جائے گا۔ حجاز سے بغداد، بغداد سے اسپین، اسپین سے ترکی، گرنے اُٹھنے کے تماشے ہوتے رہے اور ہوتے رہیں گے۔ بغداد سے ترکی عنانِ خلافت پہنچی تو چند برسوں میں یوروپ ہل کے رہ گیا۔ قلعے گرنے شروع ہوئے۔ کنگورے مسمار ہونے لگے اور اہلِ اسلام کا پھریرا یوروپ کے سینے پر لہرانے لگا۔ مال آیا، سلطنت آئی، حکومت آئی۔ آرام طلبی آئی تو بندے کا خالق سے تعلق کمزور ہونے لگا۔ ترکی سے کلاہِ لالہ رنگ یوروپ پہنچ گئی۔ قبا و دستار، شمشیر و کمر بند سے رشتہ ٹوٹنے لگا۔

پھر معاشرہ بدلا۔عقائد بدلے کچھ دنوں تک:

صرف نام کا تھا اور کوئی فرق نہ تھا

کچھ دنوں بعد نام کا فرق بھی نکل گیا۔کفر و اسلام، روشنی اور تاریکی سب گھل مل گئے۔پھر روس سے لے کر یوروپ تک بیاباں کی شبِ تاریک میں کہیں قندیلِ رہبانی نہیں رہی۔گماں آباد ہستی سے یقین مردِ مسلماں کا رخصت ہوگیا۔روس کے زوال کے بعد کسی کسی گھر میں کچھ روشنی ٹمٹمانے لگتی۔احساس ہوا کہ ہم کون تھے اور اب کون ہیں۔یہ احساس گھر سے نکل کر جب بازار میں اور میدان میں آیا،تو کفر بھی انگڑائیاں لے کر چاق و چوبند ہوکر سامنے آ گیا۔پھر معرکہ شروع ہوگیا۔اور مسلمانانِ بوسنیا خاک وخون میں نہانے لگے۔کشمکش جاری رہی۔پھر چپکے سے بندر داخل ہوگئے۔صلح کی بات چلنے لگی تو بندر بانٹ شروع ہوگئی، اسلامی حصہ تقسیم ہوگیا جو حصہ دشمنوں کو ملا وہاں سے مسلمانوں کو نکالا جانے لگا۔اس دوران میں جو کچھ ہوا اس کی گھناؤنی کہانیاں چندے کے لیے امریکہ انگلینڈ کے مسلمانوں نے خوب خوب دِکھائیں۔میں جب امریکہ جاتا تو یہ اشتہار بازی اور پروپیگنڈا کی مشین کھل کر چلتی۔آبرو ریزیاں، عصمت دریاں اور ناجائز اولادوں کی داستانیں خوب خوب اُچھالی گئیں (جیسے آج گجرات میں اچھالی جارہی ہیں)

کسی سفر میں اُسی دوران شکاگو سے علی گڑھ ایسوسی ایشن نے مشاعرہ کیا۔مجھے بھی بلایا گیا،اس مشاعرے میں ایک فرمائش 'بوسنیا' پرنظم کی بھی تھی،تو میں نے یہ نظم وہیں لکھی اور مشاعرہ میں پڑھی،کوئی دوسری نظم نہیں پڑھی گئی۔لوگوں نے سمجھا کہ جو کچھ اشتہاروں میں، کتابچوں میں، پمفلٹس میں پڑھتے آئے،وہ شعر وادب میں ڈھل کر آئے گا،مگر اس نظم میں جب بات آگے بڑھی تو لوگوں کے کان کھڑے ہوئے۔پھر سب متوجہ ہوئے اور پھر جھکے۔سچی بات سامنے آ گئی۔جس کی سند پڑھے لکھے لوگوں کے چہروں پر اُبھر آئی، تاریخ یاد آ گئی۔

مختصر یہ کہ نظم بہت کامیاب رہی۔میگزین میں چھپی وہ میگزین امریکہ سے مجھ تک ہندوستان بھی پہنچی۔اور اب آپ کے سامنے ہے۔سچائی کو ٹھوس بنانے کے لیے روایتی اصطلاحات کا استعمال بھی کیا گیا ہے تاکہ شکوک وشبہات جو نئی تعلیمات سے ذہنوں میں پیدا ہوگئے ہیں وہ بھی دُور ہوجائیں۔

بوسنیا

’بوسنیا‘ سے شکاگو جو ہوا آتی ہے دلِ مجنوں کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
وہ صدا کہتی ہے ’’اس دورِ کے مجنوں ہم تھے‘‘ وقت کے سینے کے اندر دلِ پُرخوں ہم تھے

دل میں آوازِ بلالِ حبشی رکھتے تھے
آگ تکبیر کی سینوں میں دَبی رکھتے تھے

عشق کی چوٹ بہت دن سے مگر کھائی نہ تھی یعنی اُس آگ میں پہلی سی توانائی نہ تھی
ہم قریب ایک صدی زیرِ زبردست رہے وہ پلاتے رہے ہم پیتے رہے مست رہے
ہم کو سمجھا دیا جاتا تھا، خدا کچھ بھی نہیں بس یہی زندگی ہے اِس کے سوا کچھ بھی نہیں

اپنی ہی مرضی سے آزاد بھی پابند بھی ہیں
ہمیں بندے بھی ہیں اور ہم ہی خداوند بھی ہیں

جھونکے آتے رہے سیلابِ بلا آتے رہے ٹوٹتے ہی رہے ہم اور بکھر جاتے رہے
اپنا جام و مئے و مینا نہ رہا یاد ہمیں بھول بیٹھے جو سلیقہ تھا خداداد ہمیں
آخرش جام گیا، شیشہ گیا، مینا گیا مستیِ کہنہ گئی، نشۂ دیرینہ گیا
لذّتِ بے خودی، گرمیِ خودی چھینی گئی جوش چھینا گیا، آشفتہ سری چھینی گئی
چودہ سو سال کی تعلیمِ فنا چھینی گئی جینے کا ضابطہ، مرنے کی ادا چھینی گئی

ہم سے دستار و کمر بند قبا چھینی گئی
اور ناموس کے ماتھے سے ردا چھینی گئی

لیلئ نجد بھی رخصت ہوئی مجنوں بھی گیا اور سینے سے ہمارا دلِ پرخوں بھی گیا
اپنی لَے، اپنی فغاں، اپنی نوا بھول گئے ہاتھ اُٹھانا نہ رہا یاد، دُعا بھول گئے
مدرسے لوٹے گئے، مسجدیں مسمار ہوئیں گردنیں اپنی سپردِ رسن و دار ہوئیں

گو حریفوں میں بظاہر فلکِ پیر بھی تھا
اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

خیر وہ رات کٹی دور اندھیرا تو ہوا جس سویرے کی طلب تھی وہ سویرا تو ہوا
اب سحر آئی تو کیا کہیے کہ نقشہ کیا ہے کیا بتائیں کہ یہ صبح ستم آرا کیا ہے
گئے دُشمن تو بنے دوست بھی اب دُشمنِ جاں
آستینوں سے برآمد ہوئی شمشیر و سناں
وہ گلا کاٹتے ہیں جن سے گلے ملتے رہے اب وہ تلوار ہے جس شاخ پہ گل کھلتے رہے
جن کی رفتار پہ گفتار پہ ہم مرتے رہے ہاتھ میں ہاتھ لیے جن کا پھرا کرتے رہے
جن کی صورت لی، عقائد لیے، اعمال لیے جن کے روز و شب و تاریخ و مہ سال لیے
جن کی تہذیب و تمدن لیے، پوشاک لیے پھینک کر لال و جواہر خس و خاشاک لیے
جن کے افکار لیے، جن کے خیالات لیے فلسفہ جن کا لیا جن کے مقالات لیے
علم سے دُور ہوئے جہل کی سوغاتیں لیں خوبیاں چھوڑ دیں سب اور خرافاتیں لیں
کون تھا ہم میں اُسی رنگ میں جو غرق نہ تھا
بس ذرا نام کا تھا اور کوئی فرق نہ تھا
اب وہی کہتے ہیں بدحال ہو بدطَور ہو تم تم نہیں ہو میرے ہم سائے کوئی اور ہو تم
ملکیت چھوڑ دو، گھر چھوڑ دو، دلاّلی کرو جاؤ آوارہ پھرو، نکلو، جگہ خالی کرو
آئے شمشیر لیے دادِ وفا دینے لگے زندگی بھر کی رفاقت کا صلہ دینے لگے
سچ تو یہ ہے کہ گلہ کا نہیں یارا ہم کو
اپنے ہی شامتِ اعمال نے مارا ہم کو
آنکھ سے پردا اُٹھا، سینے سے اِک آگ اُٹھی غیرتِ عشق جو سوئی ہوئی تھی جاگ اُٹھی
اُٹھ پڑے ہم عَلمِ وعدۂ فردا لے کر اپنی آنکھوں میں نبیؐ کا رُخِ زیبا لے کر
حوصلہ لے کے یقیں لے کے بھروسہ لے کر سر پہ دستِ شہِ کونین کا سایہ لے کر
موجِ خوں گردنوں سے اپنی گزر جائے تو جائے پاؤں اب پیچھے نہیں جائے گا سر جائے تو جائے
مردِ میدانِ محبت کا طریقہ ہے یہی
ہم تو قربان ہی ہو جائیں گے سوچا ہے یہی

ہم نشیں

نیویارک سے دہلی اور پھر پٹنہ پہنچنے تک کا تھوڑا وقفہ ۱۹۸۹ء میں بھاگلپور کے فساد کے بعد مجھ پر ایک جنونی کیفیت طاری کر گیا۔ یہ موقع یک بیک امریکہ کے قیام کا ارادہ ترک کر کے فسادات کے شباب میں سفر کا نہیں تھا حالات کا جائزہ لینے کا اور سمجھ بوجھ کر قدم اٹھانے کا تھا، مگر یہ عملِ جنوں انھیں دو نظموں (جاناں اور ہم نشیں) کے جوش تخلیق کا تھا، جس میں میرا وجود متحرک ہوا، دل بھی، دماغ بھی اور جسم بھی۔ میں سیدھا نیویارک سے دہلی پہنچا، دہلی میں احباب نے ٹرین سے سفر کی مخالفت کی، احباب میں ایسے بزرگ بھی تھے جن کے مشورے کے خلاف میں قدم نہیں اٹھاتا تھا، چنانچہ دہلی سے بھی پلین سے پٹنہ پہنچا، دونوں نظمیں کچھ کاغذ پر کچھ ذہن میں مکمل ہو رہی تھیں۔ پٹنہ پہنچ کر سارا ڈھانچہ، اور اس میں رنگ آمیزی، مصوری اور مرصع سازی تکمیل کو پہنچ گئی۔ بھاگل پور روانگی سے پہلے میں نے یہ نظم 'قومی آواز' کو بھیج دی۔ ایک ہفتہ میں واپس آیا تو سڑکوں پر روک روک کر کچھ احباب اس کے اشعار سناتے رہے، بعض گھروں میں محفلِ میلاد کی طرح بجلی کی روشنی اور لالٹین کے دھیمے اُجالے میں سر جوڑ کر یہ نظم پڑھی گئی۔ ایک گھر میں ایک ہندو آئی سی ایس ریٹائرڈ آفیسر میرے ایک دوست سعید اختر مقیم جدّہ کے دوست تھے۔ وہ گہری سنجیدگی سے زور دار آواز کے ساتھ نظم پڑھ رہے تھے کہ میں پہنچ گیا۔ پھر وہ چپ ہو گئے اور میگزین میری طرف بڑھا دی۔ اب اسے تم ہی سنا دو۔ میں نے سنا دی اور وہ آبدیدہ ہو گئے۔ یہ نظم کی کاریگری اور شاعری نہ تھی جو متاثر کر رہی تھی۔ یہ وہ حقیقت تھی جو صدیوں سے انسانوں کے ذہن اور دل میں اپنے نقوش چھوڑ گئی تھی وہ اُبھر آئی:

میاں بس ہمیں تو پسند آ گئیں تیری سادگی تری سچائیاں
تیرے طرز و اُسلوب و انداز کو دُعا دیتی ہیں دل کی گہرائیاں

سچائی کا بیان سچائی سے، پھر اور چاہیے سامان کیا غزل کے لیے؟ یہ ہیں تو سارا سامان ہے۔ میں تاریخ کا طالب علم نہیں، گرچہ اسکول میں تاریخ بھی میرا اسجیکٹ تھا، مگر میرا ایک دوست اور ہم عصر طالب علم مہندر ایک شام آتا، وہ تاریخ کا ریکارڈ تھا، چائے کا سامان لے کر بیٹھتا، چائے بناتا پیتا اور ساری رات تاریخ بولتا اور صبح کو میں تاریخ کا پرچہ امتحان میں لکھ آتا اور ستّر پچھتّر فیصد نمبر آجاتا، لیکن اس نظم میں تاریخ کا حسین مفید اور مستحکم پہلو بہاؤ کی طرح آگیا اور جب نظم مکمل ہوئی میں بھی حیران ہوگیا کہ سفر میں ایک ہزار کیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتے ہوئے ہوائی جہاز پر میں اسی رفتار سے تاریخ کی سرزمین پر چلتا رہا۔ اس نظم میں نہ کوئی فضا بندی ہے، نہ ماحول آرائی ہے، نہ تمہید ہے، نہ تشبیب۔ بس:

ہم نشیں آ ذرا دِل کھول کر کچھ بات کریں

اور دل کھول کر بات ہوگئی، میں نے 'جب فصلِ بہاراں آئی تھی' کے دیباچہ میں ایک جگہ اپنا اور اقبالؔ کا موازنہ کیا ہے۔

> ''میں اپنی غزلوں میں وہیں پہنچا ہوں جہاں اقبالؔ اپنے مجموعے 'بالِ جبرئیل' کی غزلوں میں پہنچے ہیں۔ اقبالؔ خدا سے مخاطب ہیں، میں خدا کے بندے سے مخاطب ہوں۔ اقبالؔ خدا سے خدا کے بندوں کی وکالت کررہے ہیں۔ میں خدا کے بندوں سے اپنی وکالت کررہا ہوں۔ اقبالؔ ساری خدائی کے مال کو اپنا سمجھ رہے ہیں، میں اپنے مال کو ساری خدائی کا مال سمجھ رہا ہوں۔ اقبالؔ کے کارواں کو لوٹنے والے اقبالؔ کے اہلِ کارواں ہیں، مجھے اور میرے قافلے کو لوٹنے والا رہزن ہے۔ اقبالؔ رہزن کی مدافعت کررہے ہیں، میں نے اپنے رہزن کا دامن پکڑ لیا ہے۔ اقبالؔ فریادی ہیں، میں فریادی نہیں مدعی ہوں۔ اقبالؔ چور کی طرف اشارہ کررہے ہیں، میں نے چور کی کلائی پکڑ کی ہے۔''

ہم نشیں آ ذرا دل کھول کے کچھ بات کریں۔ اس کی کلائی میرے ہاتھوں میں ہے۔ اور چور ہکّا بکّا ہورہا ہے، بولے تو کیا بولے۔ یہ تو سارا کا سارا کچّا چٹھا ہے۔ شاعری کو چور کی گفتگو نہیں بنایا ہے، میں نے چور سے گفتگو کو شاعری بنادیا ہے۔ میرے ہاتھ میں فلم کا کیمرہ ہے اور پورا عکس چور کے چہرے پر پڑتا ہے۔ اس کا چہرہ تاریخ کے اوارق بن گیا۔ ورق الٹتا جارہا ہے، سین منظر

بدلتا جارہا ہے، محشر میں سب کے سامنے اس کے اعمال نامہ کا دفتر حدِ نگاہ تک کھول دیا جائے گا۔ میں نے مدعا علیہ کے سامنے ۲۷ دفتر کھول کر رکھ دیئے۔ مسلمانوں کے آنے سے پہلے ہندوستان کا کیا منظر تھا؟ وہی منظر تھا جو اسلام آنے سے پہلے مشرکینِ عرب کا تھا:

کہیں گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا
کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا

اس وقت مسدس حالیؔ کے اشعار یاد نہیں آرہے ہیں۔ آپ نکال لیجیے اور پڑھ لیجیے، پڑھا دیجیے۔ ہندوستان میں بڑے دھماکے سے آرین آئے۔ کیا آرین نے ہندوستان کو کچھ دیا؟ یا جو ہندوستان کا تھا وہ بھی نہ رکھا۔ مار دھاڑ کر سب کے چیتھڑے اُڑا دیئے:

اِک گھر بھی سلامت نہ رہا شہرِ وفا میں

سب چھین چھان کر بکھیر دیا اور سو فیصد اپنی بات چلا دی۔ وہ خانہ بدوش تھے، انھیں گھر چاہیے تھا۔ مسلمان خانہ بدوش نہ تھے، آلِ تیمور خانہ بدوش نہ تھے۔ بڑی بڑی سلطنتیں انھوں نے قائم کیں۔ اُجاڑ علاقوں کو سبزہ زار بنا دیا۔ فتنہ پردازیاں ختم کر دیں، انتشار کو اجتماعیت میں بدل دیا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو جوڑ کر اہم سلطنتیں بنا دیں، اور ان سلطنتوں میں دودھ کی نہریں جاری کر دیں۔ کوہسار کو بہشت زار بنا دیا۔ وہی آلِ تیمور ہندوستان آئے، سلطنت کرنے کو نہیں، سلطنت تو وہ چھوڑ کر آئے تھے۔ وہ ایسا ہنر، ایسا سلیقہ لے کر آئے جس سے دُنیا محروم ہو گئی تھی:

کوئی بزم ہو کوئی انجمن، یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اِک چراغ جلا دیا

روشنی کا چراغ چھیننے کو وہ نہیں آئے تھے، چراغ سے محروم یا ٹمٹماتے چراغوں کو تیز کرنے، چراغ سے چراغ جلانے اور چراغاں کرنے کو آئے، جے چند اور پرتھوی راج اور ایسے ایسے کتنے غیر سلیقہ مند لوگ اس ملک کو انتشار کا نمونہ بنائے ہوئے تھے۔ آلِ تیمور آئے۔ مغل آئے اور وہ ہنر لائے، وہ سلیقہ لائے، وہ قوتِ تخلیق لائے، وہ نورانی دل لائے، روشن دماغ لائے جس نے برکتوں کے دروازے کھول دیئے، تخلیق کی مشین جاری کر دی، سیاست، معاشرت، ہنر، آرٹ، فن، تہذیب اور شاعری، وہ تمام چیزیں جو ایک ترقی یافتہ ملک کی برکتیں ہوتی ہیں مسلمانوں نے عام کر دیں، عدل وانصاف کا وہ جھنڈا لہرایا کہ دنیا حیران رہ گئی۔ محل کے باہر زنجیر لٹکا دی گئی، دن

یا رات کے جس وقت بھی چاہے بادشاہ کے عدل کی زنجیر ہلا کر بادشاہ سے عدل کا طالب ہوسکتا ہے اور طلب پوری کی جائے گی بلکہ نور جہاں کے تیر سے ایک دھوبی کپڑا دھوتے ہوئے ہلاک ہو گیا۔ دھوبن کو بلا کر تیر کمان جہاں گیر نے سامنے رکھ دیا، کسی کو حکم دو، ملکہ نے تمھارے شوہر کو تیر سے ہلاک کیا ہے۔ تم ملکہ کے شوہر کو تیر سے ہلاک کر وا دو۔ سنسکرت اور بھاشا کے ایسے صوفی بنائے کہ ہندوستان اپنی روایت بھول گیا۔ ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خان خاناں، رحیمن، امیر خسرو اور کتنے مسلمان صوفی اور شاعر نے ہندوستان کے برباد ہوتے ہوئے تہذیبی خزانے کو نئے انداز اور زندگی کی نئی طاقت اور توانائی بخش دی، ڈاک کا ایسا نظام بنایا کہ کسی کے خواب و خیال میں نہ تھا۔ آسام سے پشاور تک ایسی سڑک بنا دی کہ یہ کام صدیوں سے کسی کے تخیل میں بھی نہیں تھا۔ کشمیر سے راس کماری تک یکجہتی، ہم آہنگی، مروّت اور رواداری کا ایسا دریا بہا دیا کہ سمجھ دار لوگ انگشت بدنداں ہیں:

حسن تھا حسن پرستی کا یہ ماحول نہ تھا ایسا ماحول تجھے پہلے پہل ہم نے دیا
ایک سے ایک چمن تھا چمن آرائی نہ تھی تھا عمل پاس تیرے حسنِ عمل ہم نے دیا
تجھ میں پیدا کیا ہم نے نیا احساسِ جمال تیری زُلفوں میں نئے طرز سے بل ہم نے دیا
ہم نے تعمیر کیا تیرے لیے لال قلعہ تیرے ماتھے کے لیے تاج محل ہم نے دیا
بات کرنے کو دی اُردوئے معلّٰی ہم نے
گنگنانے کے لیے سازِ غزل ہم نے دیا

ہم نے شالیمار دیا، ہم نے فتح پور سیکری دیا، ہم نے جامع مسجد دیا، ہم نے تہذیب میں، تمدن میں ایسے نقوش بنائے، اتنے نقوش بنائے کہ اب تک نہیں مٹ سکے ہیں، کھانے میں، لباس میں، طرزِ معاشرت میں، زبان میں، تعمیر میں، موسیقی میں، مصوری میں ایسے ایسے نقوش بنائے کہ انگریز بھی ان سے متاثر ہوئے، بریانی اور تنجن کھا کر لوگ ہوش کھو بیٹھے۔ انگر کھا چست، پاجامہ، کامدار ٹوپی اور ناگرہ جوتا پہن کر انگریز افسران مجلسوں میں تشریف لاتے تھے۔ اُردو زبان میں شعر کہتے تھے۔ مساوات کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ ہندوستان کی کسی زمانے کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ چٹنی اچار کھانے والوں کو اسّی اسّی قسم کی ترکاریاں دیں۔ گڑ چاٹنے والوں کو ایسی ایسی شاہانہ اور رنگین نام کی مٹھائیاں دیں۔ کیلے کے پتوں پر کھانے والوں کو ایسے برتن، ایسے ایسے

ظروف دیئے، مستورات کو پردے کے نام پر گھونگھٹ دیا، رتھ، بیل گاڑی پر چلنے والوں کو ڈولہ، محافہ، بارہ دری، پالکی دی۔ ایسے ایسے زیورات دیئے کہ کہیں، کسی قوم کسی ملک کی تاریخ میں ان کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ مجھے اِس وقت وہ پُر بہار اور رنگین نام یاد نہیں آ رہے ہیں۔ کمر بند، بازو بند، خوش نونگا، جگنو، چمپا کلی، پازیب، گلو بند۔ دھوتی مرد بھی پہنتے تھے اور عورتیں بھی جو بعد میں عورتوں کی ساڑی کہلائی اور مردوں کی دھوتی جس کا کھونٹ پیچھے کمر میں کھونٹ لیا جاتا تھا۔ دھوتی اور مرزئی پہننے والوں کو انگرکھا، چپکن، اچکن، شیروانی، چست پاجامہ اور غرارہ دیا۔ مغلوں کے دسترخوان پر اسّی اسّی قسم کی سبزیاں چنی جاتی تھیں۔ کھانے اور مٹھائیوں کی کتنی قسمیں گنواؤں، مجھے نوجوانی تک یاد تھیں۔ اب بھول رہا ہوں، شاہی ٹکڑا، بالوشاہی، شکر پالے، جہانگیری برفی، گلاب جامن، تاریخ کی کتاب دیکھئے۔ تعداد سو تک پہنچے گی، یہی نظم کا تعارف ہے تحقیقی مقالہ نہیں ہے۔ اہلِ اسلام کو خالق نے بہترین اور اعلیٰ ترین تخلیقی قوت عطا فرمائی تھی:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم　　سفال آفریدی ایاغ افریدم
بیاباں وکہسار و راغ آفریدم　　خیاباں وگلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم　　من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

تیس چالیس سال پہلے پٹنہ میں ایک جرمن ڈیلی گیشن آیا تھا۔ اس میں ایک جرمن کچھ اُردو شاعری کی باتیں جانتا تھا۔ گیسٹ ہاؤس کے کسی ذمہ دار نے ایک رہبر کے ساتھ میرے پاس بھیج دیا، وہ انگریزی جانتا تھا۔ اس سے انگریزی میں باتیں ہوئیں۔ میں نے اُردو شاعری کے متعلق چند باتیں اسے بتائیں، وہ بہت خوش ہوا۔ پھر میں نے اُسے کھانے پر بلایا۔ میری بیوی بیچاری جتنا تکلف کرسکتی تھی کھانا پکایا۔ بریانی، قورمہ، شامی کباب، مرغ مسلم، فیرنی، ماقوتی، میٹھا ٹکڑہ دو ایک قسم کا حلوہ۔ وہ بیچارہ دسترخوان پر بیٹھا تو کھائے جا رہا ہے اور حیران ہو رہا ہے: Oh marvelous, Oh Wonderful۔ جتنی تعریف اس کی زبان سے ادا ہوسکتی تھی اس نے بخالت نہیں کی۔ اتنی چیزیں لذت اور ذائقہ کی اس کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھیں۔ وہ حیرت سے اور تعریفی کلمات کہتے کہتے تھک رہا۔

Oh Mr. Kalim, you serprised me. (کلیم صاحب آپ نے تو مجھے حیران کر کے رکھ دیا)۔ وہ زمانہ محرم کا تھا، اتفاق سے اسی رات کو اکھاڑے نکلے ہوئے تھے، میں نے

اُسے گیسٹ ہاؤس میں فون کیا کہ ہندوستان کے ایک تہذیبی تہوار کی شب ہے اور محرم کے اکھاڑے نکل رہے ہیں۔ The Procession is on way بس جلوس نکلا ہوا ہے۔ وہ بستر سے چادر پھینک کر کھڑا ہو گیا۔ اور گاڑی پر میرے یہاں پہنچ گیا۔ میں اُسے لیے لیے پتھر کی مسجد کے کسی گوشے میں آ گیا۔ اب جو نئی نئی آرائش کی سپر، تعزیے اور ڈنکے کی عجیب و غریب پُر اسرار آواز اور ان کی تال پھر سپر پھرنے والوں کی چال، گدکے اور بنکیٹھی اور نیزہ بازی کے پینترے دیکھ رہا ہے تو بے حال ہو رہا ہے۔ اُوہ کلیم صاحب کیا منظر ہے؟ ارے کلیم صاحب یہ کیا ہے، یہ آواز کیسی ہے؟ ڈنکے کی آواز، جس کو ہم لوگ اپنی بستی میں ترجمہ کرتے تھے۔ ''بجے ڈنکا اماموں کا'' میں نے محرم کے اکھاڑوں کا ایک مختصر مرقعہ اپنی کتاب 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' میں پیش کیا ہے۔ واقعی ہوش اڑ جاتے تھے۔ تو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ برکتیں، نعمتیں، مرقعے اور نقشے اور معجزے جو مسلمانوں نے ہندوستان آ کر پیش کیے، کیا ہندوستان اپنی چار ہزار سالہ تاریخ میں پیش کر سکتا ہے۔ یہ سب برکتیں لانے والے مسلمان، ہندوستان کو سب کچھ اپنے اندرون اور بیرون کا خزانہ دے گئے۔ ایک پتّی، ایک گھانس، ایک شاخ، ایک تنکا بھی اپنے ملک میں نہیں لے گئے، سب یہیں پیدا کیا، سب یہیں تخلیق کیا، سب کچھ یہیں سجا گئے، یہیں بنا گئے پھر یہیں مر گئے، یہیں گڑ گئے۔ ان میں ٹوپی خود اپنے ہاتھ سے سی کر اپنا روزانہ کا خرچ نکالنے والے اور قرآن شریف کی کتابت کر کے اپنی روزی چلانے والے بادشاہ بھی تھے۔ (سلطان ناصر الدین محمود، سلطان عالم گیر اورنگ زیب):

تو اگر شمع تھا ہم تیرے لیے تھے فانوس
تو مکیں تھا تو مکاں کے در و دیوار تھے ہم

آلِ تیمور اور مغل کو ہندوستان آنے سے روکنے والے لودھی ہی تھے، یہ اور بات ہے لودھی اس سلیقے کے نہ تھے، ان کی رگوں میں وہ خون نہ تھا جو آلِ تیمور اور مغلوں میں تھا۔ بنانے سجانے، ملانے جوڑنے، دل لگانے، پیار کرنے اور پیار کے لیے جان دینے کا جو سلیقہ ان میں تھا وہ صرف انھیں میں تھا۔ 'تزکِ بابری' اور 'تزکِ جہانگیری' پڑھو اس سلیقے کا پتہ چل جائے گا:

دل کبھی دے کے لیا جان کبھی دے کے لیا
یعنی ہر حال میں تیرے ہی خریدار تھے ہم

اکبر سجانے، بنانے، ملانے، جوڑنے، دل لگانے میں اتنا آگے بڑھ گیا کہ اپنا دین ایمان سب کچھ دے دیا:

مجرمِ جرم وفا تم بھی تھے ہم بھی تھے مگر وقت آیا تو سپردِ رسن و دار تھے ہم
معرکہ جب بھی پڑا بڑھ کے علم ہم نے لیا تم رہے قافلے میں قافلہ سالار تھے ہم

کیا تاریخ کے نثری صفحات دہراؤں؟ حضرت اسمٰعیل شہید، حضرت سیّد احمد سعید، میر ولایت حسین اور ان کا پورا خاندان انگریزوں سے اور انگریزوں کے پٹھوؤں سے معرکہ کرتے ہوئے شہید ہوئے، کالا پانی کے سپرد کر دیئے گئے، پورے قبیلہ کے قلعہ اور گھر دوار پر صادق پور میں ہل چلوا دیا، دہلی میں توپ کے دہانے پر بندھ کر خود کو گولے سے پرخچہ پرخچہ کر کے اُڑوا دیا، لاؤ مثال اپنے ملک سے، لو کوئی نام۔ بھگت سنگھ کو لیے پھرتے ہو۔ نام سنا ہے مولوی پیر علی کا اور ان کے غریب ساتھیوں کا۔ ڈنکا اور ڈھول کے ساتھ بغاوت کا نعرہ بلند کرتے ہوئے صدر گلی، گورہٹہ، اور مچھرہٹہ سے نکلے اور لان کے میدان تک آتے آتے اِسی میدان میں پھانسی پر چڑھ گئے۔

دہلی میں بغاوت کے جرم میں اپنے علاقوں کو کھنڈر کروا دینے والے توپ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے والے کیا چاندنی چوک کے، ساہوکار اور صدر بازار کے بزاز تھے یا پھاٹک حبش خاں، ترکمان گیٹ اور جامع مسجد کے شاعر ادیب اور چھوٹے چھوٹے زمیندار؟ جواب دیجیے۔

طشت میں شہزادگانِ بہادر شاہ کے سر تھے یا راجہ کنور سنگھ کے بیٹوں کے؟ ''دو گز زمین بھی مل نہ سکی کوئے یار میں'' کہہ کر وطن سے دور زندگی ہی میں زندہ درگور ہونے والا کون تھا۔ گھر سے جھانسی کی رانی نکالی گئیں یا بیگم حضرت محل:

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

کس نے حسرت سے نظر کرتے ہوئے لکھنؤ وطن سے مٹیا برج کے دیہات کے امام باڑے تک سفر کیا، کھٹواسی بٹواسی لے کے کون پڑا:

اندوہ الم کا دل پہ گھیرا ہوگا اے بزم عجیب حال تیرا ہوگا
شمع کیا، بجھ جائیں گے گھر گھر کے چراغ چھپ جائے گا اختر تو اندھیرا ہوگا

یہ اندھیرا کر کے جانے والا اختر کون تھا۔ واجد علی شاہ اخترؔ یا کوئی دوسرا:

مجرمِ جرمِ وفا تم بھی تھے ہم بھی تھے مگر
وقت آیا تو سپردِ رسن و دار تھے ہم

ایک بھگت سنگھ کیا تاریخ کے ورق الٹو تو درجنوں خدا پرست ملیں گے۔

کارگل کے نوجوان کرائے کے سپاہی بہت یاد ہیں؟ اور بہت بڑی یادگار بنادی گئی۔ کشمیر کے بریگیڈیر عثمان اور بریگیڈیر عبدالحمید بھی یاد ہیں جو نہ ہوتے تو وہ آدھا کشمیر بھی ہاتھ سے نکل گیا ہوتا جو آج ہندوستان میں ہے۔ مولانا ابوالکلام معاف کیجیے وہ گفتار کا غازی بہت یاد رہا اور لال قلعہ کے سامنے قبر پر یادگار بنادی گئی۔ وہ عمل اور کردار کا آغاز محمد علیؒ بھی یاد ہے جو ہندوستان سے یہ کہتا ہوا لندن گول میز کانفرنس میں گیا کہ آزادی لے کر آؤں گا ورنہ وہیں اپنی قبر بنالوں گا۔ قسم پوری ہوئی آزادی نہیں ملی لیکن اللہ کی غیرت نے اس سچے مردِ مجاہد کا اعزاز دونوں جہاں میں بڑھا دیا، لندن میں گڑنے نہیں دیا، خاکِ فلسطین مجاہدوں کی سرزمین میں ملا دیا:

عمر گزری ہے تجھے خونِ جگر دیتے ہوئے
اور تیری زُلفوں کو اشکوں کے گہر دیتے ہوئے
تیری محفل میں صراحی کے لیے خم کے لیے
گردنیں دیتے ہوئے کاسۂ سر دیتے ہوئے

کہاں سے تشریح شروع کی جائے۔ وہاں سے ہی سہی جب جمنا ندی میں مرہٹوں کے ہاتھوں ترش ترش کر شہزادیاں شہزادے پھینکے گئے، ۱۹۱۷ء کا آرہ رائٹ۔ ۱۹۴۲ء کا بہار شریف رائٹ اور پھر تو شہیدوں کا دبستان کھلا ہوا ہے اور کھلتا چلا جا رہا ہے، پورے بہار میں ”رقصِ شمشیر بہ ہنگامِ بہاراں“ اور پھر جبل پور، جمشید پور، راوڑکیلا، پھر جمشید پور، مرادآباد، میرٹھ، بھیونڈی، بمبئی، گجرات احمدآباد، سورت، بڑودہ، بھاگل پور، کتنے نام لیے جائیں۔ گردنوں کی صراحیاں، زخموں کے جام اور سروں کے خم، کارخانے سپلائی کے کھل گئے اور کھلتے جارہے ہیں:

ہم دیں خوابوں کو تعبیر صاحب
اور ہمیں پر چلے تیر صاحب

یہ بال گنگا دھر تلک، گوکھلے، لاجپت رائے، سپرو، نہرو اور پنڈت مدن موہن مالویہ، پنڈت گوبند ولبھ پنتھ وغیرہ کہاں سے آئے؟ یہ سب تو اسی سلسلے کے ہیں۔ پنڈت دَیا شنکر نسیم، پنڈت رتن ناتھ

سرشارؔ، پنڈت دیانرائن نگم یہ سب اسی سلسلۂ حریت کی پیداوار تو ہیں جو مسلمان لے کر آئے تھے۔ وہ غلام نہ تھے، نہ کسی کو غلام بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔ یہ حضرت معین الدین چشتیؒ، حضرت محبوب الٰہیؒ، حضرت امیر خسروؒ، حضرت بابا گیسو درازؒ کی روحانی اور تہذیبی تخلیق کا کرشمہ ہے۔ یہ وہی شانِ مومنانہ ہے:

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
ان کی نظر دلفریب ان کی ادا دلنواز

یہ سرچشمہ وہیں سے نکلا ہے، یہ سرچشمہ تعمیری ہے، تخریبی سرچشمہ تو شنکر اچاریہ جی کا تھا کہ چند روز میں بودھوں کو جلا کر کاٹ کر نکال دیا۔ یہ کاٹتے نہیں ہیں کٹ جاتے ہیں اور کٹتے کٹتے جوڑ جاتے ہیں۔ انھیں کے باطنی سلسلے کی پیداوار ہندوستان کے مخلص رہنما تھے اور ان کے ظاہری سلسلہ کی تخلیق سراج الدولہ، میر قاسم اور ٹیپو سلطان تھے۔ نکالیے، ہے تو نکالیے، تھیلی کا منہ کھولیے:

بازارِ مصر میں چل یوسف کا سامنا کر
کھوٹے کھرے کا پردہ کھل جائے گا چلمن میں

زباں تو وہ بھی بولتی ہے جو دل میں نہیں، اور اب تو زبان بالکل وہی بولتی جو دل میں نہیں لیکن:

زباں کو ہم نہیں دیکھیں گے ہم تو دل ٹٹولیں گے
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

یہ شعر لکھتے لکھتے مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ ۳۰ رمئی ۲۰۰۲ء کے ہندوستان ٹائمز میں ایک خط چھپا ہے، کچھ تو رومن میں ہے کچھ انگریزی زبان میں۔ ایک صاحب منی نی کمار (Manini Kumar) دہلی سے لکھتے ہیں، میں اُردو میں ترجمہ کر رہا ہوں:

”اٹل بہاری باجپئی! اگر وہ ہندوستانی شاعری کا دل میں کچھ احترام رکھتے ہیں تو ان کو اپنی شاعری چھوڑ دینا چاہیے، اگر وہ ایسا نہیں کرتے ہیں تو یہ قومی بے عزتی ہوگی۔ اس فاش غلطی کے پیشِ نظر جو انھوں نے ایک عوامی جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے منالی میں کی ہے۔“

یہاں سے کمار صاحب نے باجپئی جی کے جملوں کو رومن رسم الخط میں دیا ہے۔

Woh Kisi Shayar Ne Kaha Hai (وہ کسی شاعر نے کہا ہے)

Ragon Me Daurne Ke Ham Nahin Kayal (رگوں میں دوڑنے کے ہم نہیں قائل)

Jo Ankhon Se Na Tapka To Khoon kia hai (جو آنکھوں سے نہ ٹپکا تو خون کیا ہے)

یہ جو باجپئی جی کہہ رہے ہیں یہ شعر ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر مرزا غالبؔ کا ہے۔اور انھوں نے رومن میں بالکل صحیح شعر دیا ہے۔یعنی:

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

ہم تو بالکل صاف دلی سے باجپئی جی کو منی نی کمار صاحب کا مشورہ دُہراتے ہیں کہ واقعی انھیں شاعری اور شاعر ہونے کا دعویٰ چھوڑ دینا چاہیے۔ مجھے سخت حیرت ہوئی، میں اپنے پچاس ساٹھ سالہ شاعری کے دَور میں کسی ایک غیر مسلم کو اپنے ذہن میں نہیں لاسکتا۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات ذہن میں آ گئی۔ ہندوستان کی آزادی کی رہنمائی کرنے والے مخلص رہنما جن میں چند کے نام ہم نے اُوپر لیے یہ مسلمانوں کی دینی، رُوحانی، تعلیمی، تہذیبی تربیت کی پیداوار ہیں۔ڈاکٹر راجندر پرشاد کچھ ہوں یا کچھ کہیں، ہندوستانی آزادی کی تحریک کے علمبردار اب کچھ کہیں مگر ان کا دل انکار نہیں کرسکتا۔ یہ آزادی کی سچی اسپرٹ پیدا کرنے والے، سچے پکے مسلمان ہی مخلص و گمنام رہنما تھے۔ آزادی کی تحریک کے رہنما اور ڈاکٹر راجندر پرشاد جیسے لیڈر کی نشو ونما کرنے والے مسٹر مظہر الحق جیسے دریا دل، بے ریا اور باصفا لوگ تھے جو اعلیٰ خاندان میں اعلیٰ زندگی اختیار کرکے انگلینڈ سے اعلیٰ ڈگری حاصل کرکے انگلینڈ سے فیشن ایبل معاشرت ساتھ لاکر پھر یہاں کی تحریکِ آزادی سے متاثر ہوکر اعلیٰ طرح دار پوشاکوں کے بکس کے بکس، شاندار جوتوں، ہیٹ اور ٹائی کے ٹرنک پھنکوا کر کھدر کا کرتہ، پاجامہ، کھدر کی ٹوپی اور دیسی چپل پہن کر مسٹر مظہر الحق سے مولوی مظہر الحق بن گیا اور اپنی پٹنہ کی زمین کا نام صداقت آشرم رکھ کر تحریک کو سپرد کرکے خود پسِ پردہ قربانیوں کا سلسلہ قائم کر دیا۔ آزادی ان کے سبب سے ملی ہے، اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ بہار شریف کا بوڑھا مزاجیہ گو شاعر گرو بہاری مر گیا، مگر ایسے ایسے بہت اشعار کہہ گیا:

زندگی کرلی بسر کانگریس کے جھنڈے تلے
ہم تڑپتے رہ گئے پولیس کے ڈنڈے تلے
اور جب آزادی ملی انگریز رخصت ہوگئے
کھائیں سب انڈے تلے اور ہم ہیں تلھنڈے تلے

ہمارے وزیراعظم اٹل بہاری باجپئی کی تقریریں گوا کی اور کہاں کہاں کی سنیے اور کچھ نہ بولیے، صرف یہ نظم رکھ دیجیے۔ وہ اپنی تمام 'سوکالڈ' حسنِ خطابت، شاعری اور زبان دانی کی پوری فوج لے کر آئیں، ان چند اشعار کا جواب دے سکیں تو دیں۔ یہ شاعری نہیں ہے، یہ دعویٰ بادلیل ہے، اس کی دلیلیں ہندوستان کی سینکڑوں تاریخی کتابوں میں، ادب کی کہانیوں میں، مقرروں اور خطیبوں کی تقریروں میں محفوظ ہیں:

کس کس جگہ بیاضِ وطن سے مٹاؤ گے
ہر ہر ورق پہ مہرِ وفا کر چکے ہیں ہم

انسان پر کبھی کبھی ایسا وقت آجاتا ہے جب اس کی تمام توانائیاں صرف زبان کے دو تولہ گوشت میں سما جاتی ہیں۔ اس کی زندگی حقیقت سے خالی ہوجاتی ہے۔ وہ ڈھول بن جاتا ہے جس پر ہر تھاپ اس کے پول ہونے کی دلیل بن جاتا ہے۔ اس کی زندگی سے تمام اعتماد نکل کر اس کے اِردگرد جمع کی ہوئی طاقت، اس کے وسائل، اس کے سامان، اس کا دھن، اس کی دولت، اس کی پارٹی، اس کی پولیس، اس کی فوج میں، تعداد میں، اکثریت میں سما جاتی ہے۔ وہ خود کچھ نہیں ہوتا، وہ مردہ ہوجاتا ہے جو ڈھونے والوں کے کندھے پر سوار ہوکر چلتا ہے۔ وہ اپاہج اور فالج زدہ ہوتا ہے، ایسے انسان ہوتے ہیں لیکن ایک عظیم ملک کا ایک عظیم نمائندہ بھی ایسا ہوسکتا ہے، اس کی دلیل تاریخ میں نہیں ملتی۔

میں نے آج سے ۲۳-۲۴ سال پہلے کی تصنیف 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' میں ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ اس وقت باجپئی موجود تھے، مگر ان کو پالنا نہیں ملا تھا۔ وہ کھسک رہے تھے۔ میں ۱۹۴۲ء کے ایک سفر کا ذکر کیا ہے جو پٹنہ سے دہلی اپنے ایک تقریباً ہم عمر ماموں سلام اللہ مرحوم کے ساتھ کیا تھا، بنارس کے بعد مسافر کچھ زیادہ آگئے۔ ان نئے آنے والوں میں ایک پنڈت جی تھے۔ دھوتی اور مرزئی اور ٹوپی، ماتھے پر چندن، ریل کے ڈبے میں آئے تو آہستہ آہستہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کا ذکر آ گیا۔ پھر مسلم لیگ کی بات آ گئی۔ پنڈت جی بہت شائستگی، بہت اچھی

اُردو میں بڑے مہذب انداز میں مسلم لیگ تحریک کو ہندوستان کے لیے مسلمانوں کے لیے نقصاندہ ثابت کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ میرے ماموں سلام اللہ لیڈر نہیں تھے اور سیاست ان کی فطرت میں بھی نہیں تھی، مگر بڑے تیز بولنے والے اور بہت مستند بولنے والے اور بہت معقول کردینے والے انداز میں وہ پنڈت جی کے ساتھ بحث میں شامل ہوگئے۔ مسلم لیگ کی حمایت میں گزشتہ پندرہ بیس سال کے تاریخی حوالے دینے لگے۔ پنڈت جی اتنی معقول دلائل نہیں دے سکتے تھے مگر ان کا انداز اتنا سنجیدہ، شگفتہ اور نرم تھا کہ وہ سلام اللہ کی دلیلوں کو ردّ تو نہیں کررہے تھے مگر ماننے پر بھی تیار نہ تھے۔ پھر پنڈت جی نے میرے ماموں سلام اللہ کو مخاطب کر کے کہا کہ ہاں بیٹا تم سچ کہتے ہو۔ ہماری بھول ہی نے مسلم لیگ کو ہمارے سر پر تھوپا ہے اور ہم کو اس کے نتائج بھگتنے ہیں، تم مسلم لیگی رہو اور ضرور رہو، میں بھی مہاسبھائی ہوں اور مہاسبھائی رہوں گا۔ پھر انھوں نے بہت خوشبودار اگر بتیاں جلا کر ہم دونوں کو دیں اور دعائیں بھی دیں۔ مجھے نہیں معلوم باجپئی کی تعلیمی ڈگری کیا ہے۔ ۱۹۴۲ء والے پنڈت جی بھی ڈگری والے نظر نہیں آتے تھے (میرے ماموں سلام اللہ اس وقت سائنس کالج میں بی ایس سی کے اسٹوڈنٹ تھے) مگر ہزار ڈگریاں ان پر قربان تھیں، وہ سلام اللہ کی دلیلوں کو ردّ نہیں کررہے تھے مگر ان دلیلوں پر کوئی مضبوط عمارت کھڑی ہونے کے قائل نظر نہیں آرہے تھے۔ میں تو باجپئی کے سامنے یہ نظم پیش کرتا ہوں، جو صرف کاغذی دلیل نہیں ہے، اس پر صدیوں کی عمارت بنی ہوئی ابھی تک ہندوستان میں کھڑی ہے۔ کیا باجپئی جی، تقریباً پینتالیس شعر کی اس نظم میں کسی ایک شعر کو بھی دلیل سے ردّ کرسکتے ہیں؟ کیا گوا میں تقریر کرنے والا، عالمی تاریخ سے نہیں کسی غیر ملکی تاریخ سے بھی نہیں، اپنے ہی ملک کی ہزار سالہ تاریخ سے اتنا بے خبر، اتنا بے پرواہ، اتنا بے نیاز ہے اور کیا وہ تاریخ کی ہزاروں سالہ حقیقت سے بے پرواہ ہوکر ایک نئی انوکھی اور غیر فطری تاریخ بنانے کا دعویٰ کرتا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ تاریخ کسی کی من مانی تصنیف نہیں ہے۔ یہ نظامِ کائنات کے فطری ماحول میں پیدا ہوئے انسانوں کے اعمال کی تصویریں ہیں۔ کیا وہ اس نظامِ کائنات کو اپنے ہاتھوں لے کر ایسے انسانوں کو وجود میں لانے کے دعویدار ہیں، جو ان کی من مانی توقعات اور خواہشات پر ان کی من مانی تاریخ تصنیف کردے۔ ایک ایسا عالم وجود میں لے آئے جس میں مسلمان دہشت گرد، منافق، وحشی اور حیوان کی صورت میں نمایاں ہوں اور ان کے اندھے دعوؤں کی تصدیق ہوجائے:

چند دن سے تھے نہایت ہی پس و پیش میں ہم چپ ہی رہ جائیں کہ اظہارِ خیالات کریں
پھر یہ سوچا کہ پس و پیش کا اب وقت نہیں ہم نشیں آ، ذرا دل کھول کے کچھ بات کریں

....

ہم نشیں یاد ہے تجھ کو کہ تیرے یار تھے ہم
تیری زلفوں میں صدیوں سے گرفتار تھے ہم

کیا جائسیؔ، رحیمنؔ، کبیرؔ (اور بہت نام ہیں جو اس وقت یاد نہیں ہیں اور میں کتابیں ڈھونڈ کر سامنے رک کر بولنے یا لکھنے کا عادی نہیں) ان کی زندگی محمود سالار غازی کی زندگی، خسروؔ، بابا گیسودرازؒ، اور ہزاروں صوفیوں اور بزرگوں کی زندگی ہندوستان میں پھیلی ہوئی اس شعر کی تقریر ہیں۔ کیا اس تفسیر سے انکار کا وہ کوئی جواز پیش کر سکتے ہیں، اور جو اشعار اس بند میں آئے ہیں وہ پانچ چھ سو سال کی تاریخ کے روشن صفحات نہیں ہیں؟

کس کس جگہ بیاض وطن سے مٹاؤ گے ہر ہر ورق پہ مہرِ وفا کر چکے ہیں ہم

....

حسن تھا حسن پرستی کا یہ ماحول نہ تھا ایسا ماحول تجھے پہلے پہل ہم نے دیا

....

بیرون سے آنے والے دوسروں کے قافلے نے یہ ماحول نہیں دیا۔ انھوں نے ماحول کو مٹادیا۔ مسلمانوں نے کسی ماحول کو نہیں مٹایا، اسے برقرار رکھا بلکہ اس میں اضافہ کیا، چار چاند لگائے، مکانوں کے نقشے، کھانے کے نقشے، پہننے کے نقشے، آدابِ نشست و برخاست کے نقشے، عدل و انصاف کے نقشے، مروّت اور وفات کے نقشے، مساوات کے نقشے، حکمرانی کے نقشے، زبان و بیان، ادب و شاعری کے نقشے، ان مسلمان آنے والوں کی ہنرمندی، سلیقے، تخیل اور تخلیقی صلاحیت کے نتیجے میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے، شہاب الدین غوری یا محمود غزنوی بادشاہت کے بھوکے نہیں تھے، ان کی سلطنت وافر تھی، انھیں سلطنت کا سلیقہ تھا اور اس سلیقے کے نمونے ان کے ممالک تھے۔ جب یہ سلیقہ کہیں نہیں تھا، نہ یوروپ میں تھا، امریکہ میں تھا نہ دُنیا کے کسی گوشے میں تھا۔ زندگی تاریک تھی اور تاریکی میں ہاتھ پاؤں، مارنے والے کیڑوں، مکوڑوں کی مشابہت انسانوں جیسی تھی۔ اس وقت انھوں نے وہ تخلیقی صلاحیت جو خدادا دتھی اس کا نمونہ دِکھایا اور اس کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہندوستان بھی تھا، اب نہیں ہے:

دوست بن دوست، نہ بننے میں بہت گھاٹا ہے　　　آ، کہ پھر دوستی کی آب و ہوا تازہ کریں
آ، کہ پھر پھیل چلے رنگِ چمن، بوئے چمن　　　آ، کہ پھر رسم گل و بادِ صبا تازہ کریں
آ، کہ پھر پیار کا رشتہ جوڑیں　　　آ، کہ پھر وعدہ و پیمانِ وفا تازہ کریں

گرچہ ہم گزشتہ صدی میں بہت کوٹ دیئے گئے، بہت پیس دیئے گئے۔ مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سعید احمد، مفتی کفایت اللہ، مولانا حفظ الرحمٰن، پروفیسر عبدالباری، ڈاکٹر محمود دشمنوں سے لڑتے ہوئے بدنام ہوئے، رسوا ہوئے، خاک ہوئے، راکھ ہو گئے، لیکن:

چمن کے ساتھ احسانِ رفاقت کچھ نہ کام آیا

ان سب جالاؤں پر خاک ڈال دی گئی، اب بھی ہم میں وہ جوہر ہے اور وہ جوہر صرف ہم میں ہے اور کسی میں نہیں ہے، پہلے بھی بہت کچھ سنوار دیا ہے، بہت کچھ بنا دیا ہے، مسلمانوں کے لہو میں ہے سلیقہ کارسازی کا۔

ابھی اس چنگاری میں بڑے بڑے آتش کدے پوشیدہ ہیں۔ اب بھی ہم زہر سے نوشتہ نکال سکتے ہیں، سنگ سے آئینہ نکال سکتے ہیں، لیکن ہمیں زور زور سے محروم کر دینے کی سازش جو چلی ہے تو چلتی جا رہی ہے۔ آخر ہم کس برتے پر اپنی آشنائی کا جوہر دکھائیں؟ لیکن ہمارا جوہر استعمال نہ کیا گیا تو ہم تو ڈوبیں گے مگر پھر نکلیں گے، آپ ڈوبیں گے تو پھر نہیں نکلیں گے، اس لیے اب بھی:

دوستی کا بڑھائے ہوئے پھر ہاتھ ہیں ہم
تو بھی گر ہاتھ بڑھا دے تو ترے ساتھ ہی ہم

ہم نشیں

۱۹۸۹ء میں ہوئے بھاگلپور کے فسادات سے متاثر ہو کر امریکہ میں لکھے گئے

چند دن سے تھے نہایت ہی پس و پیش میں ہم
چپ ہی رہ جائیں کہ اظہارِ خیالات کریں
پھر یہ سوچا کہ پس و پیش کا اب وقت نہیں
ہم نشیں آ، ذرا دل کھول کے کچھ بات کریں

ہم نشیں! یاد ہے تجھ کو کہ ترے یار تھے ہم؟
تیری ہی زلفوں میں صدیوں سے گرفتار تھے ہم
سایۂ گل تھے ترے چاہنے والوں کے لیے
تیرے دشمن کے لیے برہنہ تلوار تھے ہم
تو اگر شمع تھا ہم تیرے لیے تھے فانوس
تو مکیں تھا تو مکان کے در و دیوار تھے ہم
وید و قرآن کا ایک ساتھ نکالا تھا جلوس
قشقہ ماتھے پہ لگانے کو بھی تیار تھے ہم
جب نہ تھا کوئی ترے گھر کو بسانے والا
تیرے غم خوار، تیرے دوست ترے یار تھے ہم
تجھ کو سج دھج کے بڑھا دیتے تھے قیمت تیری
تیری دستار تھے ہم طرۂ دستار تھے ہم
مجرمِ جرم وفا تم بھی تھے ہم بھی تھے مگر
وقت آیا تو سپردِ رسن و دار تھے ہم
معرکہ جب بھی پڑا بڑھ کے علم ہم نے لیا
تم رہے قافلے میں قافلہ سالار تھے ہم

حسن تھا حسن پرستی کا یہ ماحول نہ تھا
ایسا ماحول تجھے پہلے پہل ہم نے دیا
ایک سے ایک چمن تھا چمن آرائی نہ تھی
تھا عمل پاس ترے حسنِ عمل ہم نے دیا
تجھ میں پیدا کیا ہم نے نیا احساسِ جمال
تیری زلفوں میں نئے طرز سے بل ہم نے دیا
ہم نے تعمیر کیا تیرے لیے لال قلعہ
تیرے ماتھے کے لیے تاج محل ہم نے دیا
بات کرنے کو دی اُردوئے معلیٰ ہم نے
گنگنانے کے لیے سازِ غزل ہم نے دیا

زندگی گزری تجھے خونِ جگر دیتے ہوئے
اور تری زلفوں کو اشکوں کے گہر دیتے ہوئے
تیری محفل میں صراحی کے لیے خم کے لیے
گردنیں دیتے ہوئے کاسۂ سر دیتے ہوئے

آج جب صاحبِ جام و مئے سر جوش ہے تو
اتنا بدمست ہے؟ سرشار ہے؟ مدہوش ہے تو؟
اپنے محسن کا لہو کرلیا شامل اس میں؟
سچ تو یہ ہے بڑا احسان فراموش ہے تو

خوں سے جب تک نہ لبالب ترا جلوہ ہوگا
کیا تجھے لطف مئے و جام نہیں آئے گا؟
کیا ہمیں رہ گئے ہیں پیاس بجھانے کے لیے؟
کیا کوئی اور ترے کام نہیں آئے گا؟
پہلوئے دوست میں جب تک نہ چبھوئے خنجر
ہم نشیں! کیا تجھے آرام نہیں آئے گا؟

ہم بغل گیر تمھارے ہیں غنیمت سمجھو — ہم گر اُٹھ جائیں گے پہلو سے تو پچھتاؤ گے
مل کے رہنے کا سبق ہم نے دیا ہے تم کو — تم تو بکھرے ہوئے تھے اور بکھر جاؤ گے

یہ نہیں ہے کہ بغاوت مجھے اُکساتی نہیں — یا حمیت رگِ غیرت مری بھڑکاتی نہیں
یا مجھے چھیننی شمشیر جفا آتی نہیں — بات یہ ہے کہ مری خوئے وفا جاتی نہیں
کب سے آئینہ دِکھاتی ہے تجھے میری غزل — دیکھنا یہ ہے کہ کب تک تجھے شرم آتی نہیں

تم عمل پر نظرِ ثانی اگر کرلوگے — ہم بھی کوتاہیوں سے صرفِ نظر کرلیں گے
پیارے ہم دوست تمہارے ہیں نمک خوار نہیں — تم جومنہ پھیروگے رُخ ہم بھی ادھر کرلیں گے

دردمندانِ محبت کا یہی گہنا ہے — ہم نے زخموں کو بھی زیور کی طرح پہنا ہے
رنج وغم تھوڑا بہت سب کو یہاں سہنا ہے — عمر بھر پھولوں کے بستر پہ کسے رہنا ہے؟
اپنے کرتوت کی گٹھری لیے اُٹھ جائیں گے — نہ ہمیں رہنا ہے پیارے نہ تمھیں رہنا ہے
نہ ہماری نہ تمھاری، ہے خدا کی یہ زمیں — آج ہم تم ہیں کل اوروں کو یہاں رہنا ہے
نقش ہے ہر درودیوار پہ انجامِ غرور — تم بھی مغرور نہ ہو، ہم کو یہی کہنا ہے

ہم نے اِک عمر گزاری کہ بقولِ غالبؔ — آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک
اور جیتے ہیں تری زلف کے سر ہونے تک — اور سر تک ہی نہیں تا بہ کمر ہونے تک
اور اس قطرۂ ناچیز پہ سب کچھ گزرا — جوبھی کچھ گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
ہم بھی اب جبر پہ آمادہ نہ ہوجائیں کہیں — صبر ہوتا ہے تو ہے اے دوست مگر ہونے تک

دوست بن دوست نہ بننے میں بہت گھاٹا ہے — آ، کہ پھر دوستی کی آب و ہوا تازہ کریں
آ، کہ پھر پھیل چلے رنگ چمن بوئے چمن — آ، کہ پھر رسمِ گل و بادِ صبا تازہ کریں
آ، کہ پھر درد کا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑیں — آ، کہ پھر وعدہ و پیمانِ وفا تازہ کریں

دردمندی سے بڑھائے ہوئے پھر ہاتھ ہیں ہم
تو بھی گر ہاتھ بڑھادے تو ترے ساتھ ہیں ہم

جاناں

تو ہی سرپھروں کا امام ہے یہ کلیم تیرا ہی کام ہے
کسی اور کا یہ جگر نہیں کہ وہ دشمنوں سے لگائے دل

....

دشمنی ایسی نہ کرتا دشمن وہ مرا دوست تھا اب یاد آیا

....

جانتا تھا کہ ستمگر ہے مگر کیا کیجے دل لگانے کے لیےاورکوئی تھا بھی نہیں

....

جو دشمن ہے ہمارے جان جی کا وہی جی جان سے پیارا لگے ہے

....

میری غزلوں کے مجموعوں میں ڈھونڈیئے سینکڑوں کے قریب اس قسم کے اشعار ملیں گے، معشوق کی ستمگری یعنی بے نیازی اُردو شاعری بالخصوص اُردو غزل کا مرکزی اور بنیادی موضوع ہے جس کے چاروں طرف بلکہ شش جہت تغزل کا جال پھیلا ہوا ہے، اس جال میں خدا جانے کتنے عالم آباد ہیں جن میں جھانکئے تو ایک طلسم ملے گا۔حقیقت کا طلسم بھی اور خلاّقی کا طلسم بھی۔ میں اس طلسم کی پردہ کشائی نہیں کروں گا، کچھ جو سب جانتے ہیں، بہت ایسے ہیں جو کچھ نہیں جانتے۔سب جاننے والے کم سے کم ہوتے جائیں گے۔نہیں جاننے والے بہت بڑھتے جائیں گے بہ ایں ہمہ جان کر اور نہ جان کر بھی اس طلسم سے متاثر ہوتے رہیں گے۔یہ اس طلسم کی خصوصیت ہے۔جو علم اب دسترس میں ہے یا جس علم کی طرف دسترس بڑھتا جارہا ہے اس علم کی وسعتوں سے یہ باہر کی چیز ہے۔عجب بات یہ ہے کہ شاعری اور تغزل اور محبت کے اشاروں کی کنہیات تک پہنچنے والے تو کم ہوتے جائیں گے کہ ان کا علم انھیں دوسری طرف لے جارہا ہے، وہ اس سمت اور جہت سے دُور ہوتے جائیں گے مگر سچے جذبات اور سادہ اسلوب کی تاثیر بڑھتی جائے گی۔ یہ اور بات ہے کہ اس تاثر کے فوری اور بے ساختہ اظہار میں تکلف ہوگا۔وہ سمجھیں گے کہ اظہار میں ان کی بے علمی کا پردہ چاک نہ ہو جائے۔قدیم مقولہ ہے کہ ایک من علم کے لیے دس من عقل چاہیے۔ایک من عقل نہیں ہے اور دس من علم حاصل کیا جارہا ہے، تو یہ جہالت کی فراوانی کا سبب ہوگا۔کھیت

میں ضرورت سے زیادہ پانی آ جانے سے فصل سڑ جاتی ہے۔ سیلاب آ جائے تو فصل بہہ جاتی ہے، زیادہ روشنی آ جائے تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور اندھے پن کے مترادف ہو جاتا ہے۔ آج سے تقریباً بیس سال پہلے کا واقعہ ہے، ایسا واقعہ اور بھی بہت درپیش آیا مگر بیس سال پہلے میں جدہ میں ایک دوست کے گھر مہمان تھا۔ وہاں کچھ شعر خوانی بھی ہوئی، کچھ جوان اور بوڑھوں کے درمیان صاحبِ خانہ کے بچے بھی تھے۔ بڑا بچہ چھ یا سات سال کا تھا، میں نے ایک غزل پڑھی:

یہ طرزِ خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا　　　جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا

عام طور سے پسند ہوا، اور خوب پسند ہوا۔ میں نے دوسرا مطلع پڑھا:

غزل میں کون نئی چاشنی چکھائے گا　　　اگر کلیؔم نہ ہوگا مزا نہ آئے گا

قبل اس کے کہ اور لوگ داد دیں میرے میزبان کا چھ سالہ لڑکا واہ کہتے ہوئے اپنے زانو پر کھڑا ہو گیا اور تالیاں بجانے لگا۔ میں اس بچے کے اس بیساختہ اظہارِ تأثر پر صحیح معنوں میں حیراں ہو کر اس کا منہ تکنے لگا اور وہ دیر تک تالیاں بجاتا رہا۔ یہ سچائی اور بے ساختہ اسلوب کی خصوصیت ہے جو زبان کے ساتھ ہمیشہ باقی رہے گی۔

تو دشمن کو محبوبِ غزل بنانے کا ہنر جو میں نے اپنی غزل میں پیش کیا ہے، یہ حقیقت اُردو غزل کی تارخ میں ایک نمایاں اور بھرپور خصوصیت کے ساتھ میری غزلوں میں اُبھری ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ میں شاید واضح نہ کر سکوں مگر ایک بات ضرور عرض کروں گا کہ میری شاعری کو میری زندگی سے جتنی گہری وابستگی، ربط، تعلق اور ہم آہنگی ہے شاید اُردو فارسی شاعری میں نظر نہ آئے۔ شاید یہ میری تحقیق کا قصور ہے مگر بہر حال یہ میرا فیصلہ نا قابلِ شکست بنیادوں پر کھڑا ہے۔

۱۹۸۹ء میں بھاگلپور میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ میں اُن دِنوں امریکہ میں تھا اور میرا ارادہ عموماً امریکہ میں چار ماہ کے قیام کا ہوتا ہے اور ہوتا رہا ہے۔ میں اُس وقت نیویارک میں تھا۔ میری بہن اور بھانجیاں واشنگٹن میں تھیں مگر اتنا گہرا زخم، اتنی گہری چوٹ اس فساد نے مجھ پر لگائی کہ میرا قیام امریکہ میں محال ہو گیا۔ میں نے وہیں سے واپسی کا ریزرویشن کیا اور چند ہی روز میں دہلی ہوتا ہوا پٹنہ پہنچ گیا اور پھر پٹنہ سے کچھ ساتھیوں کو لے کر بھاگلپور پہنچا۔ اس سفر میں یہ غزل نما نظم ہوئی، اس کا عنوان 'جاناں' ہے، دوسری نظم 'ہم نشیں' ہے جو تاریخ کی بہترین شاعرانہ ترجمانی ہے۔

میں نے مولانا حسرتؔ موہانی کی ایک بات ان کے ایک شاگرد کی زبان سے سنی تھی جو

انھوں نے اپنے اسی شاگرد سے ارشاد فرمائی تھی۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ میاں غزل یوں تھوڑی ہی کہی جاتی ہے، جیسے تم کہتے ہو میاں معشوق کو بلاؤ، اُسے سنوارو، بناؤ، پھر اسے آگے بٹھاؤ، پھر غزل کہو۔ مولانا کے ارشاد کا یہی مفہوم تھا جو مجھے یاد ہے۔ پھر میں نے اپنی غزل پر نگاہ ڈالی اور ایسا لگا کہ مولانا نے وہ بات ارشاد فرمائی جو غیر ارادی طور پر بیسیوں برسوں سے کر رہا ہوں، مگر اس عمل کو زبان اور نام مولانا نے دیا۔ اس وقت سے یہ شناخت بھرپور اور مکمل ہوگئی۔

زندہ انسان جو کرتا ہے، جیسا بنتا ہے، جو کہتا ہے، جو لکھتا ہے وہ تاریخ کا ہی کرشمہ ہوتا ہے، اسی کا ردّعمل اور اسی کی ترجمانی ہوتی ہے لیکن یہ ردّعمل واضح اور کھلا ہوا ہوتا ہے۔ کہیں مبہم، یہ ابہام صحیح معنوں میں ابہام نہیں ہوتا، ایک ایسا چلمن ہوتا ہے جس کے پیچھے حقیقت اور سچائی جھانکتی ہے اور مسکراتی ہے۔ غزلوں پر یہ چلمن بہت دبیز ہوتا ہے اور اصناف میں نازک اور لطیف۔ میری غزلوں میں یہ پردہ دبیز ہے اور اس کے پیچھے حقیقت کا بنا سنورا، مسکراتا ہوا حسین چہرہ ہے، اس غزل نما نظم میں پردہ لطیف اور نازک ہے، چلمن اور صاحبِ چلمن دونوں واضح ہیں جو الگ الگ بھی کیے جاسکتے ہیں۔ اس غزل نما نظم میں جدید تاریخ ہے جو پچھلے پچاس سال میں لکھی جارہی ہے لیکن نظم ہم نشیں میں تقریباً آٹھ سو سالہ تاریخ ہے۔ اس کا کینوس بہت پھیلا ہوا ہے۔ ’جاناں‘ میں گزشتہ پچاس برسوں کی تصویر ہے، جو کوئی ایک شخص بھی دیکھ رہا ہے۔ یہ تصویر ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا پردہ، اس پر چلمن دبیز نہیں، لطیف اور نازک ہے۔ ذرا سے ہوا کے جھونکے سے پردے کا کونا اُٹھ جاتا ہے اور اندر کی واقعیت سامنے آجاتی ہے۔ یہ پردہ ایسا نہیں ہے کہ لوگ کہیں:

عاجؔز یہ کس سے بات کرو ہو غزل میں تم
پردہ اُٹھاؤ ہم تو دیکھیں چھپا ہے کون

ہلکے سے اشارے سے پردہ کا کچھ حصہ اُٹھ سکتا ہے اور ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ پردے کے پیچھے کون ہے؟ گزشتہ پچاس برسوں میں جتنا میں نے دیکھا اور جیسا جیسا میں نے دیکھا، جتنا قریب سے دیکھا اور ہر تماشے کو اپنی زندگی کا جزو بنایا اور یہ صفت و ہنر کسی دوسرے میں نظر نہیں آتا۔ لوگ دیکھتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں:

ہر شام ہوئی صبح کو اِک خوابِ فراموش　　　دُنیا یہی دُنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

میری شاعری میں کوئی صبح، کوئی شام نہیں ہوتی۔ ایک سیریل کی طرح ہر منظر اپنے سیاق وسباق

کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے۔فلم چل رہی ہے، اس کے مختلف مناظر تسلسل کے ساتھ میری شاعری میں دیکھے جاسکتے ہیں۔کوچۂ جاناں اب کوچۂ جاناں نہیں ہے۔عاشق مر کے زندہ ہوجاتا ہے مگر اب روز مرنا پڑتا ہے اور روز زندہ ہونا پڑتا ہے:

عمر اس قتل گہِ زیست میں گزری ہے یوں ہی
روز اُتارا ہے کفن، روز کفن پہنا ہے

کوچۂ جاناں کی موت حیاتِ ابدی ہے، ہم بھی چاہتے ہیں کہ تیری آرزو پوری ہو۔آہم بھی اس کے خواہشمند ہیں، لیکن یہ نہیں ہوسکتا۔اس میں قاتل کو بھی مرنا پڑے گا مگر قاتل اس ہمت سے محروم ہے۔ہم یہ ہمت اسے عطا کر سکتے ہیں، مگر وہ یہ ہمت طلب نہیں کرسکتا، پھر داستان شروع ہوتی ہے۔غزلوں میں مختلف انداز سے کہی گئی ہے۔اس محبوب کو ہم نے کتنا سنوارا، اس کی محفل کیسے کیسے سجائی:

کیا کہیں درد محبت نہیں اُٹھنے دیتا
یہ نہ سمجھو کہ بھکاری ہیں تمھارے در کے

تعلق اور محبت، رواداری اور مروّت، وفاداری اور جاں سپاری کی چند ہی تصویریں ہیں جو تاریخ کے پس منظر میں آفتاب کی طرح روشن ہیں اور ساتھ ساتھ یہ تنبیہ اور پیشین گوئی ہے کہ:

ڈر یہ ہے ہم نہ رہے منتظم کار اگر
بزم ہوجائے گی اوراقِ پریشاں جاناں

یہ ملک تو اوراقِ پریشاں تھا، ہم نے بیاضِ گلشن بنا دیا۔تیرا گریباں پھر چاک ہوگا اور ہمیں اپنا ہنر لے کر رفو کے لیے آگے بڑھیں گے:

سو بار لے چکا ہے تو امتحاں ہمارا

ایسی بات وہی کرسکتا ہے جو اس اعتبار سے آزمائشوں میں رسن و دار سے بارہا گزر چکا ہو اور آتشِ نمرود کو گلزارِ ابراہیم بناتا رہا ہو:

اے کاش مری بات سمجھ میں تری آجائے
جو میری غزل ہے مرا پیغام ہے پیارے

یہ پیغام سمجھ میں نہیں آتا، شاید تاریخ سمجھا دے، ہم تو بار بار سمجھ چکے ہیں، بار بار سمجھا چکے ہیں، دلیل اور ثبوت دے چکے ہیں:

ہم سلامت ہیں تو دُنیا ہے سلامت ہم سے
اس لیے نام ہی اپنا ہے مسلماں جاناں

آخر میں یہ بات صاف کردی گئی ہے۔

جاناں

خیریت سے ہے یہاں سر نہ دل و جاں جاناں
کوچۂ جاناں نہیں کوچۂ جاناں جاناں

قتل کرنے کا بہت ہے تجھے ارماں جاناں
اب تو ہم بھی ہیں اسی بات کے خواہاں جاناں

دردِ بے داد سے تو بھی ہے پریشاں جاناں
ہم بھی اب دردِ وفا سے ہوئے نالاں جاناں

کیا دِکھاتا پھرے ہے خنجرِ عریاں جاناں
یہی درماں ہے تو ہو جائے یہ درماں جاناں

تجھ سے یہ کام نہ ہوگا مگر آساں جاناں
ہم سے آ مانگ لے کچھ ہمتِ مرداں جاناں

سارا سرمایۂ فن کردیا قرباں جاناں
پھر بھی سلجھی نہ تری زلفِ پریشاں جاناں

اس قدر اپنے قبا پر نہ ہو نازاں جاناں
ہم نے دیکھا ہے تجھے چاکِ گریباں جاناں

ہم جو شیدا ہوئے تجھ پر بہ دل و جاں جاناں
آ گئی تجھ میں وہی عادتِ خوباں جاناں

جتنا ہم مہر و محبت میں ہوئے تجھ سے قریب
تو ہوا مہر و محبت سے گریزاں جاناں

آشنائی نہ تعلق نہ مروّت تھی نہ لحاظ
تو نے سب توڑ دیئے وعدہ و پیماں جاناں

چاہنے والوں پہ چلتی رہی شمشیر تری
چاہنے والے پکارا کیے جاناں جاناں

ہم تو ہیں حسن کے ہر رمز و ادا سے آزاد
تو نہیں باخبرِ عشق مزاجاں جاناں

ہم نے شرمندۂ احسان و کرم سب کو کیا
نہ ہوئے ہم کبھی شرمندۂ احساں جاناں

درد نے ہم کو کبھی چین سے رہنے نہ دیا
ہم لٹایا ہی کیے سب پہ دل و جاں جاناں

آج یہ زخم سیا، کل وہاں پھاہا رکھا
بس گزرتی ہے یوں ہی عمر گریزاں جاناں

ڈر یہ ہے ہم نہ رہے منتظم کار اگر
بزم ہوجائے گی اوراقِ پریشاں جاناں

کون ہے اور جو آئے گا رفو کرنے کو
پھر اگر چاک ہوا تیرا گریباں جاناں

ٹوٹے پھوٹے ہوئے ہی سہی خانماں برباد سہی
ہم ہی ہوں گے ترے احوال کے پرساں جاناں

جو بھی گرتا نظر آتا ہے اُٹھا لیتے ہیں
دوست اپنا رہے یا دشمنِ ایماں جاناں

ہم سلامت ہیں تو دُنیا ہے سلامت ہم سے
اس لیے نام ہی اپنا ہے مسلماں جاناں

انجم

نظم کہہ رہی ہے کہ یہ شاعری نہیں ہے۔ یہ ایک چلتا پھرتا ڈرامہ ہے جو پوری وضاحت، نزاکت اور لطافت کے ساتھ آنکھوں کے سامنے گزر رہا ہے۔ ایک شاعر دوست نے نظم پڑھ کر کہا Very Tonety یعنی ایک دم دل کو لگنے والی بات ہے، یہ لکھوں کہ یہ لڑکی امریکہ میں رہتی ہے، پٹنہ ہی کی ہے، اس کے والدین میرے دوست اور قرابت مند تھے، اس کی شادی ہوئی، لندن چلی گئی، پھر وہاں سے امریکہ آ گئی۔ جب پٹنہ میں تھی تو میرے بزرگ دوست ڈاکٹر عبدالمجید شمس عظیم آبادی صدر شعبۂ جغرافیہ پٹنہ یونیورسٹی اپنے یہاں نشستیں کرتے تھے، مجھے بھی بلواتے تھے۔ میری غزلیں دل کو چھو لیتی تھیں اور اس لڑکی کے دل کو بھی چھو لیتی تھیں۔ میں نے اسے پٹنہ میں کبھی نہیں دیکھا۔ امریکہ گیا تو ملاقات ہوئی اور میرے اشعار کی تاثیر وہاں بھی باقی تھی۔ میں تو اپنے گاؤں، اپنی بستی کے ماحول کو پھونک کر آیا۔ کچھ باقی نہ رہا۔ اس لڑکی کا گھر نہیں جلا، کوئی مرا نہیں، کوئی لٹا نہیں، مگر یہ خود سب کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئی۔ وطن سے پیار، گھر سے پیار، شجر حجر، گھاس، بیل بوٹے، پھل پھول، ڈالیاں۔ ان کے درمیان رہنے والے زندہ لوگوں سے ہی چھوٹ گئی تو میرے دل میں دردسوز تڑپ، زخم اور چبھن، ان سب کے جل کر خاک ہونے سے پیدا ہوئی۔ اس لڑکی کے دل میں بھی اس کی خلش پہنچی اور ان کی جدائی کا غم اسے بھی ستانے لگا۔ اس رشتے سے وہ میرے جذبات اور احساسات سے ہم آہنگ ہو گئی اور میرے اشعار اور غزلوں میں اسے اپنے دل کی آواز سنائی دینے لگی تو اس کی دلچسپی میری شاعری سے بڑھتی رہی۔

چند سال پہلے میں جب امریکہ گیا، اور اپنی بہن کے یہاں سے اسے فون کیا تو اس نے وارفتگی اور اشتیاق سے کہا جلدی آ جائیے۔ میں آ گیا۔ جب گھر میں داخل ہوا تو یہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی اور پاؤں میں بنڈیج تھا اور بغل میں بیساکھی رکھی ہوئی تھی۔ میں چند لمحوں تک سکتے میں کھڑا رہا۔ یہ کیا دیکھ رہا ہوں، وہ مسکرائی اور بولی، اگر میں ٹیلی فون پر اپنا حال کہہ دیتی تو شاید تم نہیں آتے۔ میں نے چھپایا، میں ایک ماہ پہلے گر گئی اور میرا پاؤں فریکچر ہو گیا۔ ایک ماہ سے پڑی

رہی۔اب ذرا ذرا بیساکھی کے ذریعہ گھر سے باہر بھی نکلنے لگی۔اس درمیان بین الاقوامی مشاعرہ ہوا، ہند، پاکستان اور امریکہ کے شعرا اکٹھے ہوئے، یہ مشاعرے میں جانے کے قابل نہ تھی۔مگر اس تمنا میں کہ بہت سے اصحابِ ذوق بیک وقت جمع ہوں گے، میری کتابوں کے فروخت ہونے کا امکان ہے۔سردی کی کپکپائی ہوئی رات کو تیز ہواؤں کا جھونکا، ہال سے بہت دور کار پارکرنا ہوتا ہے۔ وہاں سے تقریباً ایک فرلانگ کی مسافت پا پیادہ ہال تک طے کرنا ہوتا ہے، سردی اور سردی کی تیز ہواؤں کے جھونکوں میں انجم بیساکھی کے ذریعے یہ تکلیف دہ مسافت طے کرنے کی کوشش کررہی تھی اور میرا سینہ افسوس اور دردمندی سے بیٹھا جارہا تھا۔ یہ پرتکلف تکلیف صرف اس واسطے تھی کہ لوگ مشاعرہ میں میری کتابیں خریدیں گے۔اور وہ اسٹال میں کرسی پر اپنے پاؤں کی تکلیف برداشت کرتے ہوئے بیٹھی رہے گی۔ بار بار اس کو بیساکھی تھام کر سہارا دینا چاہتا تھا اور وہ مجھے جھٹک دیتی کہ تم کمزور ہو، سردی لگ جائے گی۔جلدی سے بڑھ جاؤ، ہال میں چلے جاؤ۔ میں آہستہ آہستہ دیر میں پہنچوں گی۔وہ بھی دیر سے پہنچی اور میں بھی جلدی نہیں پہنچ سکا۔میرا سینہ درد سے بھر گیا اور مشاعرے سے واپس آتے ہی آخر شب صبح تک یہ چند رواں دواں اشعار کہہ لیے۔

انجم

(ڈٹورائٹ، امریکہ کے ایک مشاعرہ کی بات)

رات ہم اِک مشاعرے میں گئے

ساتھ تھے چند درد والے بھی | اور اُن میں خصوصیت کے ساتھ
ایک ہم راز، ہم سخن بھی تھی | واقفِ رمزِ فکر و فن بھی تھی
قدرداں تھی ہماری غزلوں کی | اور حافظ بھی ساری غزلوں کی
چاہتی تھی کہ ڈٹورائٹ میں | جتنے دوست اور ملنے والے ہیں
سب ہی غزلوں کے قدرداں بن جائیں | ہم سخن اور ہم زباں بن جائیں
لطفِ سوزِ سخن سے واقف ہوں | دل کے دردِ نہاں سے واقف ہوں

چاشنیِ زباں سے واقف ہوں

ہے جو اِن غزلوں میں نیا انداز
اس نئی داستاں سے واقف ہوں
آج اس دور، اس زمانے میں
عشق کو لوگ بھول بیٹھے ہیں
درد کو لوگ بھول بیٹھے ہیں
بات سو طرح کی بناتے ہیں
سچی باتوں سے جی چراتے ہیں
منہ حقیقت سے موڑ بیٹھے ہیں
غم کسے کہتے ہیں تڑپ کیا ہے
شاعری کیا ہے اور گپ کیا ہے
زندہ رہنے کا کیا سلیقہ ہے
اور مرجانے کی ادا کیا ہے
دل پہ لگتے ہیں کس طرح سے تیر
غم میں کس طرح آتی ہے تاثیر
ایسے ماحول میں جو رہتے ہیں
بس وہی ایسی غزلیں کہتے ہیں
خود کو غم میں لپیٹنا کیا ہے
اوروں کا غم سمیٹنا کیا ہے
ساری دُنیا کے واسطے رونا
شاعری کی جو یہ حقیقت ہے
یہ جو عزت ہے اور شرافت ہے
یہ جو درجہ ہے یہ جو منصب ہے
اب کسی کو یہ یاد ہی کب ہے
کاش یہ سب کو یاد آجائے
زندگی میں سواد آجائے
اس پہ گر اعتبار آجائے
ایسے ہی پھول پھر سے کھلنے لگیں
گل و بلبل گلے سے ملنے لگیں
اس تمنا میں تھی وہ بے چاری
درد کی پھر سے نہر ہو جاری
درد کا پھر وہ ذائقہ آجائے
اُس مزے کو ہیں لوگ بھولے ہوئے
یاد بھولا ہوا مزہ آجائے
اِسی اُمید اسی تمنا میں
لے کے مجموعے مرے غزلوں کے
مرے افسانے اور سفر نامے
درد مندی سے فکر مندی سے
اپنی تکلیف کو چھپاتی ہوئی
سرد آنکھوں کے سرد جھونکوں میں
کس مصیبت سے کتنی دقت سے
رُکتی، تھمتی ہوئی، سنبھلتی ہوئی
ہال کی سمت وہ روانہ ہوئی
تیز جھونکے سنبھلنے دیتے نہ تھے
چلنا چاہے تھی چلنے دیتے نہ تھے
میں جو رُکتا سنبھالنے کو اُسے
اس کا کہنا کہ چھوڑیئے مجھ کو
آپ کو ٹھنڈ لگ نہ جائے کہیں
آپ جلدی سے آگے بڑھ جائیں

میں بھلا کیسے چھوڑتا اُس کو　　وہ اسی طرح تھرتھراتی ہوئی
دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی ہوئی
آخرش ہال میں ہوئی داخل　　اور کتابیں سجا کے ٹیبل پر
اس بشاشت سے اس مسرت سے　　بن کے دوکاندار بیٹھ گئی
جیسے میری کتابیں اس کی ہیں　　ان کتابوں سے اس کو الفت ہے
مال اس کا منافع اس کا ہے　　ان کی بِکری سے فائدہ ہے اُسے
اُس کی عزت سے اس کی شہرت سے　　اُس کا سرمایہ اس کی دولت ہے

ہال میں ہے مشاعرہ جاری　　فکر اس کو مگر کتابوں کی ہے
چھوڑ کے جاتی ہے پھر آتی ہے　　کہیں ایسا نہ ہو کوئی گاہک
بے خریدے چلا گیا واپس
آہ وہ ناسمجھ وہ بے چاری　　وہ محبت کی درد کی ماری
سب کو اپنی طرح سمجھتی ہے　　درد کا آج کون گاہک ہے
آنسوؤں کا ہے قدرداں اب کون　　کس کی نظروں میں غم کی قیمت ہے

....

وہ کتابیں پڑی رہیں یوں ہی　　سطحی سستی کتابیں بکتی رہیں
وہ بے چاری شکستہ دل و جاں　　آنسوؤں سے بھری بھری آنکھیں
ڈالتی رہ گئی کتابوں پر　　لوگ آتے رہے گزرتے رہے
شاعروں پر کمنٹ کرتے رہے
آپ بھرتی ہوئی کتابوں کو　　جھولیوں میں سمیٹ کر رکھا
اور یوں ہی ٹکتی ڈگمگاتی ہوئی　　سرد جھونکوں سے تھرتھراتی ہوئی
دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی ہوئی
واپس آخر مشاعرے سے ہوئی

شکوہ سنجی اپنی عادت میں نہیں داخل مگر

(۱۹۵۹ء)

کب ہماری پرسشِ احوال فرماتے ہیں آپ
لیجیے ہم اپنا قصہ آج دُہراتے ہیں آپ

اِک زمانہ تھا کہ پیمانِ وفا ہم سے بھی تھا
رفتہ رفتہ وہ زمانہ بھولتے جاتے ہیں آپ

غیر سے کیا کیا نہ گفتارِ شکرآمیز ہے
میرے آگے برہنہ شمشیر بن جاتے ہیں آپ

کچھ خبر ہے حسن کو کس نے لگائے چار چاند
وہ ادا کس کی ہے جس پر ناز فرماتے ہیں آپ

کس کے زخموں سے ہیں در پردہ چمن آرائیاں
کس کے سوزِ غم سے محفل اپنی گرماتے ہیں آپ

وہ میرے ہی ساز کا چھیڑا ہوا نغمہ تو ہے
جس کی دُھن پر گنگناتے رقص فرماتے ہیں آپ

وہ مری بخشی ہوئی مئے ہے کہ جس کے کیف میں
جھومتے ہیں بزم میں اور جام چھلکاتے ہیں آپ

ہیں مرے ہی شانہ کش ہاتھوں کے سلجھائے ہوئے
جن خمیدہ کاکلوں پر آج اتراتے ہیں آپ

میرے ہی خونِ بہار آور کا صدقہ ہے کہ آج
چین سے بیٹھے گلستاں کی ہوا کھاتے ہیں آپ

مہرباں! میرے ہی دامانِ وفا کی چھاؤں میں
جس قدر جی چاہتا ہے پاؤں پھیلاتے ہیں آپ

کل وہ عالم تھا کہ راحت ہی نہ تھی میرے بغیر
آج منہ پھیرے ہوئے مجھ سے گزر جاتے ہیں آپ

کل اسے سمجھے ہوئے تھے رونقِ بزمِ جنوں
آج دیوانے کو خود زنجیر پہناتے ہیں آپ

مجھ کو مفہومِ وفا اچھی طرح معلوم ہے
میری ہی سمجھائی باتیں مجھ کو سمجھاتے ہیں آپ

نانک

یہ دن جشن نانک منانے کا ہے   پیامِ محبت سنانے کا ہے
یہ دن پیار کے گیت گانے کا ہے   دلوں کو دلوں سے ملانے کا ہے
نئی روشنی دل میں بھر لیجیے
کدورت جو ہو دُور کر لیجیے
وہ درویش نانک وہ شاہی فقیر   وہ پنجاب کا مردِ روشن ضمیر
نظر جس کی شیریں زباں دل پذیر   ہر اِک دل میں اس کی محبت کا تیر
محبت کے جو گل کھلا کر گیا
جو دُکھ جھیل کر مسکرا کر گیا
اِدھر آؤ نانک کی سمرن اُٹھاؤ   ہر اِک دانہ اس کا دیا ہے جلاؤ
مسافر کو منزل کے نزدیک لاؤ   ہر اِک بھولے بھٹکے کو راستہ دِکھاؤ
گرو کا سبق عام کرنے کا ہے
یہی وقت تو کام کرنے کا ہے
زمانے کو نانک کا پیغام دو   جو تکلیف دے اس کو آرام دو
نیا خمُ، نئی مئے، نیا جام دو   نئی صبح بخشو، نئی شام دو
ہوس اور مایا کے گھیرے میں ہے
یہ دُنیا ابھی تک اندھیرے میں ہے
اندھیرے سے اس کو نکالو اُٹھو   اُٹھو ناز و نعمت کے پالو اُٹھو
گرو کی کمائی سنبھالو اُٹھو   اُٹھو ہاں اُٹھو سونے والو اُٹھو
اُٹھو اور زمانے کو آواز دو
نیا نغمہ چھیڑو نیا ساز دو

قاسم صہبا جمیلی

یہ جلسہ غم کا ہے سب مائلِ فریاد آتے ہیں
سنانے اپنے اپنے قلب کی روداد آتے ہیں
بہت افسردہ دل اہلِ عظیم آباد آتے ہیں
کہ سب کو قاسم صبا جمیلی یاد آتے ہیں

انھیں کے دوست کی احباب کی یاروں کی محفل ہے
یہ غم گینوں کی محفل، درد کے ماروں کی محفل ہے

ابھی ہر سمت رونق تھی ابھی ہر سمت تھی لالی
ابھی ہر روز روزِ عید تھا ہر شام دیوالی
یکا یک دن رہے جاتی رہی گلشن کی ہریالی
اُٹھے کچھ اس طرح قاسم کہ محفل ہوگئی خالی

ہزاروں لوگوں میں شاید ہی کوئی دل سے ملتا ہے
ایک اچھا آدمی اس دَور میں مشکل سے ملتا ہے

ہر اِک انسان کی ہمدردی میں اب دل ہل نہیں سکتے
جو سب کوفٹ ہو ایسے پیرہن اب سِل نہیں سکتے
وہ ایسا پھول تھا کہ پھول ایسے کھل نہیں سکتے
بہت ڈھونڈ وگے اب صہبا جمیلی مل نہیں سکتے

کوئی حاصل نہیں الزام مت دو چرخِ نیلی کو
بس اب تو یاد ہی کرتے رہو صہبا جمیلی کو

حُسن

حسن کاکل میں نہ گیسوئے شکن دار میں ہے | نہ یہ ابرو کی لچکتی ہوئی تلوار میں ہے
نہ یہ موجود ہے خم ڈالی ہوئی زلفوں میں | مانگ میں ہے نہ یہ پیشانیِ گلنار میں ہے
نہ یہ کاجل میں نہ یہ سرمے کی ہے تحریروں میں | نہ یہ مژگاں میں نہ یہ چشمِ فسوں کار میں ہے
تابشِ غازہ نہ یہ سرخیِ گلگونہ میں | لبِ شیریں میں نہ یہ آئینۂ رخسار میں ہے
نہ گہر جیسے چمکتے ہوئے یہ دانتوں میں | نہ یہ غنچہ سے مشابہ دہنِ یار میں ہے
نہ یہ پوشیدہ ہے لہراتے ہوئے آنچل میں | نہ قبا میں نہ یہ پیراہنِ زرکار میں ہے
چوڑیوں کی نہ کھنکتی ہوئی آوازوں میں | نہ مچلتی ہوئی پازیب کی جھنکار میں ہے
یہ تو وہ حسن ہے جس کا ہے زمانہ محدود | یہ جوانی کی مقید درودیوار میں ہے
ایسا یوسف کہ طلب جس کی تمنا جس کی | ہر زمانے میں ہر اِک دور کے بازار میں ہے

جس کی قیمت کبھی اُترے نہ لطافت جائے
حسن وہ دل میں ہے سیرتؔ میں ہے کردار میں ہے

نونہالو میاں!

(زبان وادب، نومبر-دسمبر ۱۹۷۹ء، اطفال نمبر)

سنو میرے دل کی اُجالو میاں | پریشاں و آشفتہ حالو میاں
اے رنگین پوشاک والو میاں | پری چہرہ و خوش جمالو میاں
اے آلو میاں میرے کالو میاں | اے بے ننگ و بے نام والو میاں
کہاں کے ہو اور کس خاندان کے ہو تم | پتہ تو کسی سے چلا لو میاں

زمانہ ہوا تم کو کھوئے ہوئے ذرا آپ اپنے کو پالو میاں
بہت گمرہی میں بھٹکتے رہے کوئی راستہ اب نکالو میاں
سوا نیزے پر آفتاب آگیا اُٹھو بے خبر سونے والو میاں
لڑکپن زیادہ مناسب نہیں اب اس کو جوانی بنا لو میاں
زمانے کو تم پر نہ رحم آئے گا تمھیں رحم اپنے پہ کھا لو میاں
وہی ساری دُنیا کا موسم بنے جو موسم تم اپنا بنا لو میاں
زمیں پر بہت دانے چگتے رہے اب اُڑنے کو بھی پر نکالو میاں
بہت گھر میں غیروں کے مہماں رہے اب اپنا بھی گھر دیکھو بھالو میاں
تمھیں سے ہے دُنیا تمھیں سے ہے دیں یہ دو گٹھریاں ہیں سنبھالو میاں
جو کرنا ہے بس آج ہی کر چلو کوئی کام کل پر نہ ٹالو میاں
تم اپنے ہر اِک کام کے واسطے طریقہ بھی اپنا نکالو میاں
چلو راہ اپنی اور اپنا قدم کسی نقشِ پا پہ نہ ڈالو میاں
بچاؤ طبیعت کو تقلید سے یہ مہلک مرض ہے نہ پالو میاں
یہ چہرہ ، یہ انداز یہ پیرہن زیادہ نہ اِن کو اُچھالو میاں
غلامی کی آلودگی ان میں ہے بدن پاک کرلو نہالو میاں
جسے دین کہتے ہیں اِک پھول ہے اگر عطر اس کا نکالو میاں
اسی عطر کا نام ایمان ہے اِسے پیرہن میں بسالو میاں
کہاں تک صراحی کہاں تک سبو یہ رکھی ہے شمشیر اُٹھا لو میاں
سمندر ہے علم اور کوزہ ہے دل سمندر کو کوزے میں ڈھالو میاں
کبھی وقت کے تم ہی استاد تھے اسی وقت کو پھر بلالو میاں
دِکھاؤں گا کیا کیا تماشہ تمھیں مری آنکھوں میں آنکھ ڈالو میاں

اگر شاعری کا تمھیں شوق ہے
مجھ ہی سے غزل کہلوا لو میاں

کلیم الدین احمد

جب فکر کلیمی نے نئی شمع جلائی
تنقید کی محفل تہہ و بالا نظر آئی
یاروں نے کہیں راہ نکلنے کی نہ پائی
سب دینے لگے ضربِ کلیمی کی دُہائی

آئینہ یہ کہنے لگا صورت ہے تو یہ ہے
افسانے پکار اُٹھے حقیقت ہے تو یہ ہے

تنقید میں تھوڑی سی جو آشفتہ سری ہے
یہ عین علاجِ مرضِ شیشہ گری ہے
کو تہ نگہی ہے نہ پریشاں نظری ہے
جو بات ہے وہ صاف ہے سیدھی ہے کھری ہے

کانٹوں کو اگر کیجیے جدا گل نظر آئے
صحرا میں چہکتی ہوئی بلبل نظر آئے

گل پیرہنی میں ہے نہ غنچہ دہنی میں
گفتارِ شمالی نہ زبانِ دکنی میں
تلوار میں خنجر میں نہ برچھی کی انی میں
جو بات ہے پوشیدہ تیری کم سخنی میں

جس طرح حسینوں کی نظر جاتی ہے دل میں
یونہی تری ہر بات اُتر جاتی ہے دل میں

اُمّ کلثوم اہلیہ خورشید حسن کے انتقال پر

اُمّ کلثوم تو اب ہم سے بہت دُور ہوئیں　　باغِ جنت میں گئیں ہم نفسِ حور ہوئیں
روشنی پہلے فقط خانۂ خورشید کی تھیں　　آئینہ خانۂ فردوس کی اب نور ہوئیں
کون اس عالمِ ناشاد میں مسرور ہوا　　قیدِ عالم سے رہا ہو کے وہ مسرور ہوئیں
ان کی تقدیس نے گمنام انھیں رکھا تھا　　اپنے شوہر کے لیے خلد میں مشہور ہوئیں
آئی فردوس سے لینے کے لیے موجِ بہار　　رنگ و نکہت میں بسیں سرتا بہ پا نور ہوئیں

وقت نے جب انھیں ڈھونڈا تو یہ ہاتف نے کہا
اُمّ کلثوم تو رخصت ہوئیں مغفور ہوئیں
۱۳۹۷ھ

خورشید حسن صاحب کے انتقال پر

وہ جو تھے شیریں زباں شیریں سخن خلد میں ہیں　　چھوڑ کے حلقۂ اربابِ چمن خلد میں ہیں
جامۂ خلد کیے زیبِ بدن خلد میں ہیں　　دھوم ہے سیّدِ خورشید حسن خلد میں ہیں

چاک دامن ہیں نہ اب چاک گریباں ہیں وہ
ان کا کیا کہنا ہے فردوس کے مہماں ہیں وہ

جب وہ دُنیا میں تھے دُنیا بھی تھی جنّت ان کی　　ہر قدم پھول کھلاتی تھی محبت ان کی
درد سرمایہ تھا اخلاق تھا دولت ان کی　　مسکراہٹ سے نہ خالی رہی صورت ان کی

پیار کرتا تھا ہر ایک اپنا پرایا اُن کو
ہائے کیا خوب تھا جینے کا سلیقہ ان کو

دوست دشمن کے تھے وہ غیر کے بھی یار تھے وہ　　تھکے ہاروں کے لیے سایۂ دیوار تھے وہ
دل کے گاہک تھے محبت کے خریدار تھے وہ　　کم سخن تھے وہ مگر صاحبِ کردار تھے وہ

قید و بندِ سحر و شام سے آزاد ہوئے
جا کے اب گلشنِ فردوس میں آباد ہوئے

ٹیگور

آبرو ہند کی ہے نازِ وطن ہے ٹیگور
دیش ٹیگور کا دھن، دیش کا دھن ہے ٹیگور

اس کے گیتوں میں اُجالا بھی ہے آندھی بھی ہے
رنگ اور نور کا مجموعۂ فن ہے ٹیگور

کون سے دیش میں خوشبو نہیں پھیلی اس کی
لہلہاتے ہوئے پھولوں کا چمن ہے ٹیگور

ایک چلّو بھی جو پیتا ہے نکھر جاتا ہے
ندیاں دودھ کی بہتی ہیں وہ تھن ہے ٹیگور

جو چمک اس میں ہے وہ جوت کہیں اور نہیں
مادرِ ہند کے ماتھے کا رتن ہے ٹیگور

دل کی گرمی کو سمویا ہے مدھر گیتوں نے
چاند کی چاندنی سورج کی کرن ہے ٹیگور

دل کے پیالے میں لبالب ہے محبت کی شراب
مست و مخمور ہے ٹیگور مگن ہے ٹیگور

اعجازی صاحب کے وصال پر

(مولانا منظور احسن اعجازی صاحب)

یہ لوگ کتنے عجیب و غریب ہوتے ہیں
جو دور ہو کے بھی سب سے قریب ہوتے ہیں

سبھوں کا ہوتا ہے جوان کے پاس ہوتا ہے
امیر ہوتے ہوئے بھی غریب ہوتے ہیں

سمیٹ لیتے ہیں دُکھ درد ملک و ملت کا
یہ لوگ ہم صفتِ عندلیب ہوتے ہیں

کسی کا زخمِ جگر ہو بہ صورتِ مرہم
ہمیشہ زخمِ جگر کے قریب ہوتے ہیں

گھر ان کے ہوتے ہیں زندانِ وقت کے نزدیک
سر ان کے دار و رسن کے قریب ہوتے ہیں

بتوں کے ظلم سے پتھر پگھل گئے کیا کیا
مگر خدا کے یہ بندے عجیب ہوتے ہیں

بہارِ شعر و ادب بھی انھیں سے ہے ہر چند
نہ شاعر اور نہ بظاہر ادیب ہوتے ہیں

شمار جن میں تمھارے پدر کا ہوتا ہے
زماں[1] یہ لوگ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں

---

[1] منظور احسن اعجازی کے بڑے صاحبزادے

علی عباس صاحب مرحوم کی اہلیہ کے انتقال پر

دل کے اندر کروٹیں لیتا ہے غم کا جوش کیوں
بار بار اُڑ جانے کو پر تولتا ہے ہوش کیوں
دھوپ ابھی تھی یک بیک سورج ہوا روپوش کیوں
جھومتی گاتی ہوائیں ہوگئیں خاموش کیوں

تیرا منہ بے نور ایسا اے سویرا کیوں ہوا
یک بیک یہ گھر میں دن رہتے اندھیرا کیوں ہوا

کھڑکیاں ایسی ہیں جیسے دیدۂ بے نور ہوں
بام و در یوں مضمحل جیسے غموں سے چور ہوں
جیسے دیواریں بھی گرنے کے لیے مجبور ہوں
گھر کے لوگ اِک دوسرے سے بے خبر ہوں دُور ہوں

مسکراتا جاگتا عالم یکایک سوگیا
تھا ابھی موتی انگوٹھی میں ابھی تو کھو گیا

سیّدہ بیگم ہیں اِک عنوان فسانے کے لیے
ایک تصویرِ محبت ہیں زمانے کے لیے
جب علی عباس اُٹھے امریکہ جانے کے لیے
وہ بھی اُٹھیں دھڑکنیں دل کی دبانے کے لیے

ساتھ دروازے تک آئیں اور کرامت ہوگئی
خود خدا حافظ کہا اور خود ہی رخصت ہوگئیں

یوں اچانک چل پڑیں وہ جانبِ عمرِ دوام
نامہ بر کے ہونٹ پر جیسے ادھورا ہو کلام
جیسے رہ جائے غزل کا کوئی مصرع ناتمام
چھوٹ کر گر جائے جیسے ہاتھ سے ساقی کا جام

ہوسکی پیدا نہ ہلکی سی کوئی جھنکار تک
اس نزاکت سے ہے شرمندہ خرامِ یار تک

ان کی شخصیت محبت کی تھی شہنائی کلیمؔ
درد جس میں ہر گھڑی لیتا تھا انگڑائی کلیمؔ
اب کہاں ہوگی نصیب ایسی پذیرائی کلیمؔ
چائے منگواتی ہوں بیٹھو پی تو لو بھائی کلیم

سننے والا سنتے سنتے سوگیا پہلو بدل
اب کسے جاکر سناؤگے کلیم اپنی غزل

گرچہ زیباؤں میں وہ تھیں اور نہ حسن آراؤں میں
پیار کا مرکز تھیں اپنے شہر اپنے گاؤں میں
واقعی اولاد کی جنت تھی جن کے پاؤں میں
سو رہی ہیں اب گھنیرے برگدوں کی چھاؤں میں

خاک نورانی کو ان کی اور نورانی کرے
آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

ذاکر صاحب کی برسی کے موقع پر

(راج بھون پٹنہ میں پڑھی گئی)

اے راج بھون ہے یاد تجھ کو؟ وہ روز و شبِ مراد تجھ کو
وہ صاحبِ خوش نہاد تجھ کو؟ جو کہہ گیا خیر باد تجھ کو؟
بھولی نہیں ہوگی تو نے آہٹ
شیروانی کی خاموش سرسراہٹ
اس راج بھون کو یاد ہوگا پردوں کی شکن کو یاد ہوگا
شمعوں کو، لگن کو یاد ہوگا دھرتی کو گگن کو یاد ہوگا
صورت تو چھپی ہے آب و گل میں
تصویر ہے اس کی سب کے دل میں
بے مثل تھی آن بان اُس کی شائستہ روی تھی جان اُس کی
کیا وضع تھی کیسی شان اُس کی کیا بات تھی کیا زبان اُس کی
رنگینی میں عکسِ سادگی تھا
واللہ وہ ایک آدمی تھا
وہ شخص یہ دے گیا گواہی ہے فقر کی زندگی بھی شاہی
صوفی تھا کبھی کبھی سپاہی جس راہ سے بھی چلا وہ راہی
آواز اُٹھی یہ بام و در سے
یہ کون گزر گیا اِدھر سے

پجاری تیرے مؤذن امام بھی تیرے

پجاری تیرے مؤذن امام بھی تیرے
صنم کدے تیرے، بیت الحرام بھی تیرے
گناہگار بھی خیرالام بھی تیرے
سیاہ بخت بھی فیض المرام بھی تیرے
کرشن بھی تیرے، لکشمن و رام بھی تیرے
مسیح و خضر علیہ السلام بھی تیرے
رئیس و شاہ بھی تیرے ، غلام بھی تیرے
فقیر و خواجۂ مستِ خرام بھی تیرے
جنابِ بادہ کشانِ کرام بھی تیرے
سمندروں میں گھرے تشنہ کام بھی تیرے
پیام بھی ترا، اہلِ پیام بھی تیرے
ادیب و شاعرِ شیریں کلام بھی تیرے
گلی بھی ، کوچہ و بازار و بام بھی تیرے
اوران میں سارے خواص وعوام بھی تیرے

یہ سب ہیں تیرے تو پھران میں انتشار ہے کیوں
ترا ہی گھر تیرے بیرونِ اختیار ہے کیوں

پتہ چلا جو یہاں کے نظام کو دیکھا
حساب سلسلۂ صبح و شام کو دیکھا
برہمنوں کو بتِ مشک فام کو دیکھا
یہاں کے مقتدیوں کو امام کو دیکھا
رئیس و شام کو دیکھا، غلام کو دیکھا
فقیر و خواجۂ مستِ خرام کو دیکھا
حضور و حضرتِ عالی مقام کو دیکھا
ہر اِک شریف ہر اِک نیک نام کو دیکھا
یہاں مشاعروں کے اہتمام کو دیکھا
ادیب و شاعرِ شیریں کلام کو دیکھا
فقیر و شیخ مدارالمہام کو دیکھا
رشی مہاتما سادھو تمام کو دیکھا
طوافِ صبح کو تسبیحِ شام کو دیکھا
ہری ہری کو سنا رام رام کو دیکھا
گلی کو ، کوچہ و بازار و بام کو دیکھا
اِک اِک خواص کو اِک اِک عوام کو دیکھا
حرم کو ، دیر کو ، ساقی کو، جام کو دیکھا
غریب مشہدی نے ہر مقام کو دیکھا

یہ دھندا سب کا ہے اور کچھ کسی کا دھندا نہیں
ہیں سب خدا یہاں کوئی خدا کا بندہ نہیں

ندوۃ العلما میں مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کی کتاب

'المرتضیٰ' کے اجراء کے موقع پر

میں عاجزؔ گدائے سرِ خاکِ رہ گزر
ناقابلِ توجہ و ناقابلِ نظر
میں اِک شکستہ حال شکستہ دل و جگر
خانہ خراب ہی نہیں خانہ خراب تر

میں گوشہ گیر کہاں یہ انجمن کہاں
اس انجمن میں مجھ کو مجالِ سخن کہاں

یہ رہنمائے اہلِ متاعِ وفا کی بزم
یہ پیشوائے مسلکِ صبر و رضا کی بزم
سرخیلِ عاشقان و گروہِ صفا کی بزم
یعنی جناب سیّدِ شیرِ خدا کی بزم

بادِ صبا پیام شرف لے کے آئی ہے
خوشبوئے گلستانِ نجف لے کے آئی ہے

ان خوشبوؤں کے ہم تو پرانے فقیر ہیں
قیدی ہیں ہم انھیں کے انھیں کے اسیر ہیں
ہم ہی نہیں ہمارے یہ سب ہم صفیر ہیں
سب ان میں بے نظیر ہیں روشن ضمیر ہیں

سب بن سنور کے آئینہ خانے میں رہ گئے
اِک ہم ہی خاک ہو کے زمانے میں رہ گئے

مولانا سعید احمد خاں صاحب کی فرمائش پر

یہ کیسی دُنیا بدل رہی ہے یہ کیا زمانہ اب آ رہا ہے
دماغ ماؤف ہو رہا ہے خیال پر ابر چھا رہا ہے
نگاہ کے سامنے دھندلکا سیاہ چادر سا بن گیا ہے
اندھیرا باہر سے اب زیادہ دلوں کے اندر سما رہا ہے
نہ دوستی کا کہیں نشاں ہے نہ ذکر ہوتا ہے دوستی کا
ہوس نے مشعل اُٹھا لیا ہے تمام جادو جگا رہا ہے
غرض کے بندوں کا جمگھٹا ہے فساد کی بات چل رہی ہے
جہاں کوئی فتنہ گر ہے بیٹھا وہیں سے فتنہ اُٹھا رہا ہے
وفا کا ہے کاروبار مندہ جفاؤں کی ہیں کھلی دُکانیں
شرارتوں کی تجارتیں ہیں ہر اِک طرف مال آ رہا ہے
کلیم ایسے میں کیا کروگے خموش بیٹھوگے یا اُٹھوگے
فضائیں آواز دے رہی ہیں زمانہ تم کو بلا رہا ہے
حیات سہمی ہوئی کھڑی ہے گھڑی قیامت کی آ پڑی ہے
کلیم جاگو قدم بڑھاؤ کہ وقت ہاتھوں سے جا رہا ہے
ہر اِک طرف زور سے صدا دو جو سو رہے ہیں انھیں جگادو
کہ دشمنِ جاں و دین ایماں کفن تمھارا سلا رہا ہے
بڑی ہلاکت کا سامنا ہے خدا کی رسّی کو تھامنا ہے
وگرنہ یہ بھی نہیں رہے گا جو تھوڑا سا حوصلہ رہا ہے
کلیم یہ موقعِ سفر ہے، سعید احمد سا راہبر ہے
مدینہ والے کے آستانے کا در ہمیشہ کھلا ہوا ہے

حیدرآباد

دل نے جب کھینچا ہم کو آ گئے ہم　　نظم یا کچھ غزل سنا گئے ہم
یادِ ماضی تمھیں دلا گئے ہم　　آئینہ لائے اور دِکھا گئے ہم

آگے تم جانو آئینہ جانے
کیا خدا چاہے ہے خدا جانے

آج بکھرا ہے غم کا شیرازہ　　ہے مرادوں کی یہ شبِ تازہ
آج کیا ناپ تول اندازہ　　کھول دو بخششوں کا دروازہ

لٹ رہا ہے خزانہ لے جائے
جس کا جی چاہے جتنا لے جائے

آج الطاف کی جو شادی ہے　　شہر میں ہر طرف منادی ہے
جس نے سن لی خبر دُعا دی ہے　　بڑھ کے پھر یہ صدا لگا دی ہے

آج ہنس بول لو غنیمت ہے
روز ہنسنے کی کس کو فرصت ہے

آج پھر شہر ناز کرتا ہے　　اس کی گلیوں سے رنگ اُبھرتا ہے
قافلہ پھولوں کا اُترتا ہے　　حیدرآباد پھر سنورتا ہے

شہر یوں روشنی میں ڈھل آیا
چاند بھی دیکھنے نکل آیا

حیدرآباد از عظیم آباد　　آیا دینے یہ خانماں برباد
مرتضٰی بھائی کو مبارک باد　　چشمِ تُو روشن و دلِ ما شاد

حیدرآباد ناز کرتا رہے
یوں ہی ہر سال یہ سنورتا رہے

حیدرآباد کل جو بستی تھی ذرّے ذرّے میں ایسی مستی تھی
ایسی خوشبو یہاں برستی تھی دُنیا جس کے لیے ترستی تھی
سب کی قسمت کا پھول کھلتا تھا
حسب مقدار سب کو ملتا تھا
یہ محبت کا آستانہ تھا علم و فن کا یہاں خزانہ تھا
اس کے ہاتھ آئینہ تھا شانہ تھا جس کا محتاج اِک زمانہ تھا
لوگ اِدھر کے اُدھر کے آتے تھے
اس کے ہاتھوں سنور کے جاتے تھے
پودے سائے میں اس کے پلتے تھے پھلتے پھولتے تھے پھلتے تھے
چڑھ کے پروان جب نکلتے تھے شہروں شہروں چراغ جلتے تھے
کون تردید کرنے والا ہے؟
آج بھی دُور دُور اُجالا ہے
جب بھی اس شہر میں ہم آتے ہیں کچھ نہ کچھ کہہ کے لکھ کے جاتے ہیں
جشن اس شہر کا مناتے ہیں عہد ماضی کے گیت گاتے ہیں
ٹوٹا پھوٹا کلام آتا ہے
اور ہمیں کون کام آتا ہے
کسی لائق نہ کوئی قابل ہم ہنرمندوں میں ہیں نہ شامل ہم
ہاں بس اِک بات میں ہیں کامل ہم ہیں بغل میں لیے دُکھا دل ہم
یہ دُکھا دل بڑا نرالا ہے
گرچہ ٹوٹا ہوا پیالہ ہے
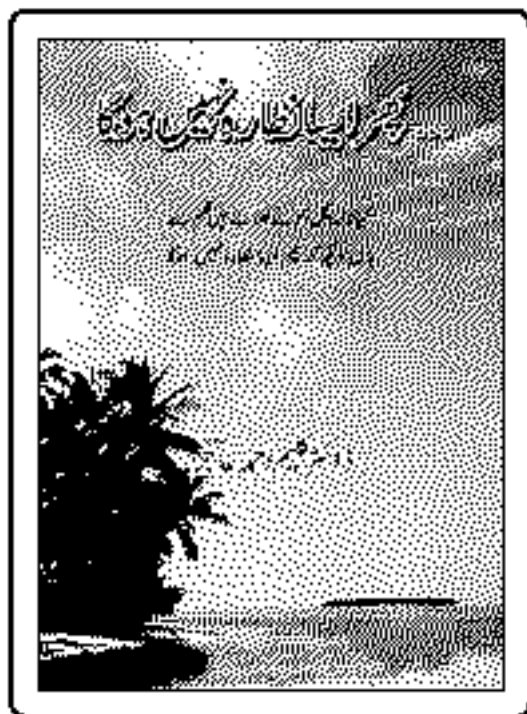
چوتھا مجموعہ
پھر ایسا نظارہ نہیں ہوگا
کیا لالہ و گل ہم نے کھلائے ہیں قلم سے
ہاں دیکھ کر پھر ایسا نظارہ نہیں ہوگا

زمانہ قدر کر ہاں قدر کر ہم کج کلاہوں کی
کہ پیدا اس نمونے کے جواں ہر دم نہیں ہوں گے

مقدمہ

ابھی صبح کے ناشتے میں تلے ہوئے چنے چھلے ہوئے سیب کی چند قاشیں میرے سامنے آئیں تو مجھے یاد آیا کہ کبھی یہ عالم تھا کہ مسلّم سیب مع چھلکے اور سخت امرود دانت سے کام کر کھایا کرتا تھا۔ اب دانت کمزور ہوئے تو سیب چھیل کر اور قاشیں بنا کر سامنے لائی جاتی ہیں۔ یہاں تک خیال آیا تو کلکتہ کے ظفر تبریزی صاحب یاد آ گئے۔ ۱۹۴۰ء کے پہلے کمسنی میں میرے جوان مداحوں میں تھے۔ ایک پاؤ کا بڑا سیب ہاتھوں میں لیے دانت سے کاٹ کر کھاتے ہوئے میرے ہاں آ کر کرسی پر بیٹھ جاتے تھے۔ بھاری بھرکم آدمی تھری پیس سوٹ میں ملبوس ٹائی لگائے ہوئے اور ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کرنے لگتے۔ میں پندرہ سولہ سال کا تھا۔ کبھی کبھی مضمون لکھ لیتا تھا اور شعر کہہ لیتا تھا۔ کبھی کبھی دو ایک شعر کسی مجلس میں شرما شرما کر پڑھ دیتا، تو ایسے لوگ میرے مداحوں میں تھے۔ ظفرؔ تبریزی صاحب کلکتہ کے بڑے اُردو جرنلسٹوں میں تھے۔ اسٹیج اور فلمی ڈراموں پر ریویو لکھتے تھے۔ ظفرؔ تبریزی صاحب یاد آئے تو ان کے سینئر دوست مسعود صابری یاد آ گئے۔ دونوں اکثر ساتھ ساتھ رہتے اور نکلتے تھے۔ دونوں بہترین اسٹائل کے سوٹ میں مگر ہیٹ نہیں۔ مسعود صابری کلکتہ کے مشہور ہفتہ وار رسالہ 'فلم اسٹیج' کے ایڈیٹر تھے۔ مسعود صابری صاحب یاد آئے تو عنایت دہلوی مشہور اخبار 'چونچ' کے مشہور ایڈیٹر یاد آ گئے۔ گھونگھریالے سیاہ بال پر سیاہ رامپوری ٹوپی اور گلے تک بٹن بند شیروانی اور خالتہ پاجامہ میں ملبوس ہاتھ میں بریف کیس لیے کبھی چاندنی چوک میں مل جاتے۔ مسکرا کر سلام کا جواب دیتے اور میری پیٹھ ٹھونک دیتے۔ پھر ظفرؔ تبریزی، مسعود صابری، عنایت دہلوی اور کسی حد تک پرویز شاہدی عظیم آبادی۔ ان سب کے پیرِ مغاں علامہ محمود طرزی یاد آ گئے۔ محمود طرزی صاحب علامہ رضا علی وحشت صاحب اور علامہ آغا حشر کاشمیری کے جوان دوستوں میں اور ہم صحبتوں میں تھے۔ بہت وجیہ بارُعب بلند و بالا

شخصیت، داڑھی منڈی ہوئی، سر پر بال اور اس پر تر کی ٹوپی، لمبی سیاہ شیروانی اور علی گڑھ پاجامہ اور سیاہ بوٹ۔ کلکتہ کے مشہور حشرؔ ڈرامیٹک کلب کے ڈائریکٹر، کلکتہ کے ادیبوں جرنلسٹوں کے سردار بہت پُر وقار باعلم تجربہ کار مسلم شہری۔ کلکتہ میں ادب وشاعری، تہذیب اور معاشرت کے دلدادہ شہریوں کے پیرِ مغاں ہر طرح کے جلسوں میں، سیمینار مشاعروں میں عزت واحترام سے بلائے جاتے۔ گفتگو کرتے تو ایسی حسین کہ منہ سے پھول جھڑتے اور اس اعتماد اور وقار سے گفتگو کرتے کہ پورے جلسے پر چھا جاتے۔ ایک بار شاید میں نے اپنا پہلا مضمون لکھا تو میرے ماموں محمد ظفیر احمد جو کلکتہ میں ایک تاجر تھے اور محمودؔ طرزی کے دوست تھے۔ مجھے لیے ہوئے محمودؔ طرزی کے دفتر میں پہنچ گئے کہ میرے بھانجے نے مضمون لکھا ہے اس پر اصلاح کر لیجیے۔ ان کا دفتر بند ہو گیا تھا اور وہ آفس سے باہر نکل چکے تھے۔ میرا مضمون ہاتھ میں لے کر انھوں نے ایک اسٹول پر اپنا دایاں پاؤں رکھا اور زانو پر میرا مضمون رکھ کر کھڑے کھڑے پڑھنے لگے اور جیب سے قلم نکال کر کچھ بڑھایا گھٹایا اور حاشیے پر چند سطریں لکھ کر دیا کہ اسے 'خادم' پرچے کے ایڈیٹر صاحب (نام بھول گیا) کے پاس لے جاؤ وہ شائع کر دیں گے۔ محمودؔ طرزی یاد آئے تو ایک واقعہ یاد آ گیا۔ یہ سب ابھی ناشتے کے وقت سیب کی چھیلی ہوئی قاشیں دیکھ کر ہوا۔ وہ واقعہ یاد آیا تو یہ ارادہ ہوا کہ کچھ لکھ ڈالو۔ کیا لکھ ڈالو، یہ آگے بتاؤں گا۔ پہلے واقعہ سن لیجیے۔

غالباً ۱۹۶۱ء کی بات ہے اور میری نئی شاعری کا گیارہواں سال تھا۔ یعنی شاعری نے مجھے اپنے اظہار کے لیے پکڑا تو اس گرفت کا گیارہواں سال تھا۔

کلکتہ میں اُردو کی مشہور لائبریری علامہ محمد علی لائبریری کا سالانہ جلسہ اور اس سالانہ جلسے میں طرحی مشاعرہ کی دعوت پر میں کلکتہ گیا۔ اس سے قبل ۱۹۵۸ء میں انجمن ترقی اُردو کے سالانہ ہندو پاک جلسے میں شریک ہو چکا تھا۔ اس کی روداد مختصر بھی آگے عرض کر دوں گا پہلے محمد علی لائبریری کے مشاعرہ جس میں محمودؔ طرزی صاحب کے واقعہ کا تعلق ہے سن لیجیے۔ تو میں اس مشاعرے میں شریک ہوا۔ جس کی طرح غالباً میرؔ تقی میرؔ کی غزل کے ایک شعر کا مصرع تھا:

دامن کے تار اور گریباں کے تار میں

غالباً میرؔ صاحب کا شعر یہ ہے۔ واضح رہے کہ یہ سطریں میں لکھ رہا ہوں اپنے مستقل جائے قیام سے دور اپنے فرزند ڈاکٹر وسیم احمد سلّمہٗ کے فلیٹ میں جہاں میں ایک دو روز کے لیے ان کی

بچی یعنی اپنی چھوٹی پوتی کی شادی کے سلسلہ میں کچھ ضروری مشورے کے لیے آیا ہوا ہوں۔ یہاں نہ کتابیں ہیں نہ کاغذ ہے۔ایک ڈائری کے اوراق پھاڑ کر اسی چوکی پر بے ساختہ لکھ رہا ہوں تو غالباً میرؔ صاحب کا شعر یہ ہے:

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے تار اور گریباں کے تار میں

تو جناب شہر کے ایک بہت بڑے کمرشیل ہال میں مشاعرہ ہے۔اس زمانے یعنی آج سے پینتالیس پچاس سال والا پہلا کلکتہ علامہ وحشتؔ کلکتوی، آرزو لکھنوی، حکیم ناطق لکھنوی شاگرد امیرؔ مینائی کے شاگردوں، جانشینوں اور علم برداروں کا حلقہ، کلکتہ جہاں وحشتؔ کی آرزو کی غزلیں پیارقوال اور کالوقوال اور نابینا قوال محفلوں میں گایا کرتے تھے۔ پارک سرکس، انٹالی اور کولوٹولہ کے میدانوں میں جلسے ہوا کرتے تھے اور وضع دار اُردوداں عوام وخواص اہلِ ذوق سخن آشنا شریک ہوا کرتے تھے۔تو اسی کلکتہ کے ایک بڑے ہال میں مشاعرہ ہے اور اس مشاعرے میں مدعوئین کے جو چند نام مجھے یاد ہیں وہ یہ ہیں شکیلؔ بدایونی، خمارؔ بارہ بنکوی، نشورؔ واحدی، یہ تینوں نام اس لیے یاد ہیں کہ ہم چاروں ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے۔ان کے علاوہ دہلی لکھنؤ کے اور نامور شعرا بھی تھے جن کے نام مجھے اس وقت یاد نہیں۔تین سال پہلے پارک سرکس میدان میں انجمن ترقی اُردو کے سالانہ ہندو پاک جلسہ میں میری شرکت ہو چکی تھی۔اس لیے کلکتہ کا پورا ادبی حلقہ مجھ سے واقف تھا۔ مجھ سے آشنا اور کسی حد تک میرا مداح تھا۔تو مشاعرہ شروع ہوا۔نو بجے سے تقریباً بارہ بج گئے۔شاید ایک بج رہا تھا کہ میرا نام ناظم مشاعرہ نے پکارا۔ میں ڈرتے ڈرتے مائک پر آیا۔ میں نے اکثر لکھا ہے کہ مشاعرہ میں پڑھنے کو جاتے ہوئے میں بہت نروس ہو جاتا ہوں یعنی بہت احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہوں کہ میں پڑھ بھی سکوں گا، لوگ بہت ہوٹ کریں گے یا مذاق اُڑائیں گے۔ مائک تھام کر جب میں شروع کرتا ہوں یعنی مطلع کا پہلا مصرع پڑھتا ہوں تو میرا اعتماد پوری قوت سے بحال ہو جاتا ہے۔تو ایسے ہی ڈرتے ڈرتے میں سامنے آیا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مائک تھام کر دس پندرہ سیکنڈ تک میں نے سر جھکا دیا اور پھر آنکھ بند کر کے سر اٹھایا اور پہلا مصرع پڑھا:

ایسی بہار آئی کہ اب کے بہار میں

یہ واضح رہے کہ یہ طرحی مشاعرہ تھا۔ اور ایک مصرع پر پندرہ بیس مشاق اور مشہور شعرا کی غزلیں پڑھی جا چکی تھیں۔ مصرع سنتے ہی تمام گوشوں اور حلقوں کی آپس میں بولنے کی آوازیں یک بیک بند ہو گئیں۔ ایسا مصرع کسی نے نہیں پڑھا تھا:

ایسی بہار آئی کہ اب کے بہار میں

پہلا مصرع تین بار لحن سے پڑھ کر میں نے دوسرا مصرع پڑھا:

سایہ نہیں کسی شجرِ سایہ دار میں

معلوم ہوا ہال کی چھت گر پڑی۔ یک بیک پانچ ہزار کا مجمع گویا چیخ پڑا۔ مجمع کیا بول رہا ہے میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ دو منٹ تک میں خاموش کھڑا ہوں۔ دو منٹ کے بعد میں نے دوسرے مصرع کی تکرار کی اور پورے مجمع کی آواز بلند ہوئی۔ پھر پڑھئے، پھر پڑھئے، اور میں نے پھر پڑھا اور پھر پڑھا اور پھر پڑھا۔ مجمع شانت ہوا تو میں نے دوسرا شعر شروع کیا:

ہیں ایک ہی چمن میں مگر فرق ہے بہت

مجمع ایک دم ساکت ہو گیا۔ "ہیں ایک ہی چمن میں مگر فرق ہے بہت" عجیب مصرع تھا۔ لفظ فرق نے امید وانتظار کا ایک سمندر بیچ میں حائل کر دیا:

ہیں ایک ہی چمن میں مگر فرق ہے بہت

پہلا مصرع حسبِ دستور تین بار پڑھ کر میں نے دوسرا مصرع بلند آواز سے لہرا کر سنایا:

اُن کی بہار اور ہماری بہار میں

ہال کا آدھا مجمع کھڑا ہو گیا۔ میری طرف لوگ کم دیکھ رہے ہیں۔ کچھ دیکھ رہے ہیں اور زیادہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو چیخ چیخ کر سنا رہے ہیں، ان کی بہار اور ہماری بہار میں۔ معلوم ہوتا تھا سب دیوانے ہو رہے ہیں اور شاید آپس میں دست وگریباں ہو جائیں گے۔

ڈیڑھ دو منٹ کے بعد کھڑا ہوا مجمع پھر بیٹھا اور تقریباً تین چار منٹ مجھے تیسرے شعر پڑھنے میں لگے، اور ہر شعر پر تقریباً یہی صورت حال ہوتی۔ مقطع سے اس واقعہ کا تعلق ہے جو میں نے آغاز میں عرض کیا ہے تو پوری غزل سنانے میں مجھے تقریباً دس پندرہ منٹ لگے اور پھر میں نے مقطع پڑھا۔ غزل پڑھنے کے دوران صدر مشاعرہ جو میرے بغل میں مائک کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ بار بار بیقراری سے ہاتھ پھیلا کر میری تعریف کر رہے تھے۔ بہت پُر وقار شخصیت

سفید نہایت خوبصورت گول ترشی ہوئی داڑھی ایرانی ٹوپی ۔ سیاہ شیروانی ایرانی ٹوپی سر سے اُتر کر سامنے رکھی ہوئی تھی۔ چندیا پر بال نہیں تھے۔ تو میں نے غزل کا مقطع پیش کیا پہلا مصرع:

عاجزؔ یہ تم نے کیا غزلِ بے مزہ پڑھی!

پوری غزل لوگ سن چکے تھے اور سننے والوں کا کیا حال ہوا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے صدر سے لے کر تمام سامعین تک روشن تھا۔ اب یہ مقطع کا مصرع کہہ رہا ہے:

عاجزؔ یہ تم نے کیا غزلِ بے مزہ پڑھی!

یہ غزل بے مزہ تھی؟ سب یہی سوچ رہے ہیں ۔ اور مجمع گویا ساکت ہے۔ میں نے تین چار بار پہلے مصرع کی تکرار کے بعد دوسرا مصرع عرض کیا:

اِک شعر بھی نہیں صفتِ زُلفِ یار میں؟

جیسے بجلی کوند گئی ۔ صاحب صدر بے چندیا کے بال والے بزرگ کھڑے ہو گئے ۔ ہاتھ پکڑ کر میرا کھینچا اور گلے لپٹا لیا اور مجمع ہے کہ دیوانہ ہو رہا ہے۔ کسی کو ہوش نہیں ۔ ایں؟ ایک شعر بھی نہیں صفتِ زُلف یار میں ۔ اور پوری غزل سن لی۔ جس کا تعلق ہی زلف وچشم یار سے ہے ۔ زلف یار کے بغیر پوری غزل ہو گئی ۔ یعنی غزل جس کا تعلق صرف زلف یار سے ہی ہے۔ بغیر زلف یار کے غزل کیا؟ مگر بھرپور غزل ہو گئی مگر زلف یار کا کہیں نام ونشان نہیں ۔

یہ غزل پہلے مجموعہ ’وہ جو شاعری کا سبب ہوا‘ میں ہے۔ اس وقت میرے سامنے نہیں ہے۔ جو دو تین اشعار یاد تھے۔ لیجیے یہ شعر بھی یاد آ یا:

کیا ہو گی اے جنوں تری خاطر بہار میں
اِک پیرہن ہے وہ بھی نہیں اختیار میں

لیجیے ایک اور شعر یاد آ یا:

تو اے کرن اُمید کی ہے کس دیار میں؟
اب تو سحر سے شام ہوئی انتظار میں

تو جناب عالی کہنا یہ کہ صاحب صدر نے ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ کر مجھے گلے لگا لیا اور پھر اپنی بغل میں بٹھا کر دیر تک میری تعریف کرتے رہے۔ میرا کندھا تھپتھپاتے رہے۔ اور فرمایا ’’مجھے بہت خوشی ہوئی تمھاری غزل سن کر۔ میرا نام محمود طرزی ہے۔‘‘

میں جیسے چونک گیا، بالکل گویا مجھ میں بجلی کوندگئی۔ میں نے تڑپ کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔محمودؔ طرزی؟ حشر ڈرامٹک کلب کے ڈائریکٹر؟ کلکتہ کے ادبی، شعری، تہذیبی دنیا کے سربراہ ادب اور جرنلسٹ بڑی مونچھیں کلین شیو بلند و بالا اور یہ داڑھی اور سفید چندیا؟ غور سے دیکھا تو بدن اس طرح چست چالاک وجیہ اور وسیع، رنگ ویسا ہی سُرخ سفید، داڑھی اور صاف چندیا نے کچھ پردہ ڈال دیا ہے۔ پردے کے پیچھے وہی بارعب اور باوضع شخصیت ہے۔ پھر انھوں نے اپنی بغل میں بیٹھی ہوئی ایک جوان مگر پتلی دُبلی حسین خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔''یہ میری بیوی فریدہ کاشانی ہیں'' میں پھر ایک دفعہ چکرا گیا۔ دونوں کو دیکھا اور پھر اپنے اوپر قابو پالیا کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ یہ بہت تعجب خیز اَمر نہیں ہے:

بڑھاپے میں جوانی سے زیادہ جوش ہوتا ہے
بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے

پھر میں نے محمودؔ طرزی کو چونکایا۔

میں آپ کا پرانا شاگرد ہوں؟ وہ ایک دم حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ ایں تم میرے شاگرد۔ یہ کیا بول رہے ہو؟ میں نے کہا جی ہاں میں آپ کا شاگرد ہوں۔ اور پھر میں انھیں بائیس سال پہلے لے گیا کہ ان کے آفس میں میرے ماموں مجھے لے کر گئے تھے۔ کہ میں نے ایک مضمون لکھا ہے۔ اصلاح کر دیجیے اور آپ نے کھڑے کھڑے چند الفاظ اِدھر اُدھر کیے اور ایک میگزین والے کو لکھا کہ اسے شائع کر دو۔ انھیں یاد آ گیا اور پھر مجھے دوبارہ گلے لگا لیا۔

تو یہ اوپر کی سطریں ایک واقعہ کی یاد آتے ہی لکھیں کہ اب مجھے چند باتیں اور عرض کرنی ہیں۔ تو اب ناشتے کا وقت ختم ہو گیا۔ جمعہ کا دن ہے، غسل کرنا ہے اور نماز کے لیے جامع مسجد جانا ہے۔ پھر دیکھئے وہ چند باتیں کس وقت اور کب عرض کرتا ہوں۔ امید ہے آج ہی انشاء اللہ مکمل کرلوں گا۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنی کتاب 'آزاد کی کہانی کچھ ان کی کچھ اپنی زبانی' میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کے متعلق لکھا ہے کہ وہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں اپنی تقریر لکھ لیتے تھے۔ پھر اپنی تقریر پر اپنی اصلاح کا دور چلتا تو گھنٹوں گزر جاتے اور اتنا کاٹ کُٹ کرتے کہ تقریر کے پرخچے اُڑ جاتے۔ تو میں تو قلم برداشتہ لکھتا ہوں اور اکثر نظر ثانی کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ یوں ہی طالب کے حوالہ کر دیتا ہوں کہ بھائی ایک ذرا دیکھ لیجیے گا۔ غلطی سلطی ہو تو

درست کر دیجیے گا۔

صبح دس بجے تحریر ختم کی تھی، ابھی آٹھ بجے شب میں کچھ فرصت ملی تو قلم اور ڈائری کے اوراق لے کر بیٹھا ہوں یہ لکھنے کہ یہ واقعہ جو پچھلے سطور میں لکھ آیا ہوں، کیوں لکھا؟ اور ہاں وہ دو سال پہلے والے مشاعرہ کا حال بھی سن لیجیے جو انجمن ترقی اُردو کلکتہ نے پارک سرکس گراؤنڈ پر بڑے پنڈال میں منعقد کیا تھا۔ پانچ چھ ہزار کے پڑھے لکھے سخن فہموں کا مجمع تھا۔ اُردو صرف مشاعروں میں نہیں گھروں میں بازاروں میں دُکانوں میں کارخانوں میں دفتروں میں سڑکوں پر بالاخانوں میں مسجدوں میں میخانوں میں تمام تھی۔ محلے محلے مشاعرے ہوتے تھے۔ تو اسی مشاعرے میں مشرقی پاکستان سے پروفیسر عندلیب شادانی اور سرور بارہ بنکوی تشریف لائے تھے۔ پٹنہ سے استادی پروفیسر جمیل مظہری اور میں بمبئی سے علی سردارؔ جعفری، ترقی پسندوں کے پیرِ مغاں سجاد ظہیر، بیگم رضیہ ظہیر سجاد، دہلی سے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی بسملؔ سعیدی، کلکتہ سے پروفیسر پرویزؔ شاہدی، پروفیسر بیخودؔ اور خدا جانے کون کون تھے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ صدارت فرما رہے تھے۔ یاد نہیں مجھ سے پہلے کس کس نے غزل یا نظم پڑھی۔ مجھے بلایا گیا تو صدر مشاعرہ کے بغل میں مائک پر میں کھڑا ہوا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مائک پکڑ کر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کو قابو میں لائے۔ میں نے مطلع کا پہلا مصرع پڑھا:

ہم ہیں بکھرے ہوئے جلوؤں کو سجانے والے

مولانا سعید احمد صاحب صدر مشاعرہ نے مجھے سر اٹھا کر دیکھا اور دیکھتے رہے۔ دوبارہ پہلے مصرع کی تکرار کرنے کے بعد دوسرا مصرع پیش کیا۔ میں ایک ایک مصرع تکلیف اور اسٹریس کے ساتھ لکھ رہا ہوں اور اَغل بغل کے ماحول اور پس منظر کو واضح کرتے ہوئے لکھ رہا ہوں کہ ان سطور کے پڑھنے والوں کی پوری توجہ میرے ہر مصرع پر ہو وہ سمجھیں گے تو لطف لیں گے۔ تو میں نے پہلا مصرع:

ہم ہیں بکھرے ہوئے جلوؤں کو سجانے والے

دو بار پڑھ کر تیسری بار اعتماد اور قوت سے مطلع کا دوسرا مصرع:

گیسوؤں والوں سے کچھ کم نہیں شانے والے

پڑھا اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی صدر مشاعرہ کا دونوں ہاتھ اوپر اُٹھ گیا اور پورے مجمع کا ہاتھ

اوپر اُٹھ گیا۔ ایک نوجوان کی اور غیر معروف نوجوان کی زبان سے یہ شعر سن کر سامنے بیٹھے ہوئے سجاد ظہیر، سردآر جعفری اور زیادہ کھلتے ہوئے انداز میں ڈاکٹر خواجہ فاروقی کی والہانہ داد۔ سب محو حیرت تھے کہ یہ کالج کا لونڈا اپنی اساتذہ کے سامنے کیسی بات کہہ رہا ہے کہ ایک دور ایک پورا زمانہ جو اس وقت موجود ہے اس کا ذہن بھی ان خیالات، جذبات اور احساسات سے خالی ہے۔ اور بات ذہن پر یوں پڑ رہی ہے جیسے زمین سے نہیں آسمان سے براہِ راست اُتر رہی ہے۔ میں نے دوسرا شعر شروع کیا:

رسن و دار نہیں اہلِ جنوں کی منزل

یہ بھی سمجھ رہے ہیں کہ رَسن و دار ہی تو اہلِ جنوں کی آخری منزل ہے۔ اور ہم کہہ رہے ہیں کہ:

رسن و دار نہیں اہلِ جنوں کی منزل

اب تو مسلسل پورا مجمع مع صدر مشاعرہ سر اٹھائے مجھے دیکھ رہا ہے۔ کچھ حیرت، کچھ امید، کچھ استعجاب۔ مگر سب محو اور محسور:

رسن و دار نہیں اہلِ جنوں کی منزل

پھر میں نے دوسرا مصرع پڑھا:

ہم مسافر ہیں بہت دور کے جانے والے

اور مجمع اُٹھ گیا۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی سامنے سے اُٹھ کر میرے قریب آ گئے، کھڑے ہی کھڑے گلے لگا لیا۔ یہ غزل بھی پہلے مجموعے میں موجود ہے۔ شاید پانچ شعر ہیں۔ اب مجھے سب شعر یاد نہیں۔

غزل ختم کر کے میں تھک کر صدر مشاعرہ سے دُور ہٹ کر بیٹھ گیا اور مجمع کا تقاضہ کہ ایک غزل اور ایک غزل اور۔ اور میں اٹھنے سے معذور۔ میں عموماً ایک غزل سے زیادہ کسی مشاعرے میں نہیں پڑھتا۔ بہت اصرار ہوتا ہے اور مسلسل اصرار ہوتا ہے تو دوسری غزل پڑھنے کو اٹھتا ہوں میں نے ایک جدید غزل میں شعر لکھا تھا:

ہمارا دل تو یہ سنتے رہیں اور اس کی یہ عادت
غزل جب پڑھ کے جاتا ہے تو دہرانے نہیں آتا

تو دوسری غزل کی فرمائش بڑھتی رہی اور میں اُٹھنے کو تیار نہیں۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اُٹھے اور میرے دونوں بغل میں اپنے ہاتھ ڈال کر مجھے اُٹھایا اور

مائک کے سامنے کھڑا کر دیا اور میں نے دوسری غزل شروع کی۔اس کے تقریباً سب شعر یاد ہیں۔اس غزل نے تو مشاعرہ کی رہی سہی کسر نکال دی۔میں نے مطلع شروع کیا:

ہنسیں گے مجھ پر وہی کہ جن کو شعور حالِ چمن نہیں ہے

یہ غزل استعاروں اور اشاروں کی بجائے سچی اور سیدھی بات کا مجموعہ جس نے سامعین کو اور تڑپایا:

ہنسیں گے مجھ پر وہی کہ جن کو شعور حالِ چمن نہیں ہے

تین بار پہلا مصرع پڑھ کر میں نے دوسرا مصرع شروع کیا:

میں چاک دامن جو پھر رہا ہوں یہ میرا دیوانہ پن نہیں ہے

مجمع بے قابو ہے اور جھوم رہا ہے۔دوسرا شعر:

خموش میں اس لیے نہیں ہوں کہ دولتِ فکر وفن نہیں ہے
بہت سخن ہائے گفتنی ہیں مگر مجالِ سخن نہیں ہے

مجمع اور اساتذہ اور شعرا کا وہی حال ہے۔بار بار کیا دہراؤں۔بس پوری غزل عرض کر دوں۔سخن شناس جوان سطور کر پڑھیں،توجہ دیں۔تیسرا شعر:

زمانہ آنے تو دو جنوں کا ضرور کچھ دھجیاں اُڑیں گی
قبائے رنگیں تو ہے کسی کی اگر مرا پیرہن نہیں ہے
ہے مشورہ دوستوں کو میرا کہ کم نہ ہو گرمیِ تمنّا
چراغ خلوت ہی میں جلاؤ اگر کوئی انجمن نہیں ہے

پانچواں شعر:

ستم ہے،اہل حرم ابھی تک مغالطے میں پڑے ہوئے ہیں
وہ شیخ اس دور میں کہاں ہے جو بندۂ برہمن نہیں ہے

اور مقطع سنیے:

غزل جو سنتا ہے میری عاجزؔ وہ مجھ کو حیرت سے دیکھتا ہے
کہ دل پہ گزری ہے کیا قیامت مگر جبیں پر شکن نہیں ہے

گرمی کا زمانہ تھا۔میں ململ کا کُرتہ پاجامہ پہنے ہوا تھا۔کچھ موسم کا اثر تھا،کچھ اپنا جوش،کچھ گرمیٔ سخن۔میں پسینے پسینے ہو رہا تھا۔اور جگہ جگہ ململ کا کُرتہ پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ترقی پسندوں

کے سالارِ اعظم سیّد سجاد ظہیر اور ان کی بیگم رضیہ سجاد ظہیر نے چند جوانوں کو اشارہ کیا۔ ان میں ایک شہزاد منظر، ترقی پسندوں کا لیڈر، پنکھا لے کر اسٹیج پر آ گیا اور میرے سامنے دوزانوں بیٹھ کر زور زور سے پنکھا ہلانے لگا۔ سجاد ظہیر بھی آ گئے، رضیہ بھی آ گئیں۔ ان دونوں سے میری پہلی شناسائی ہوئی۔ سجاد ظہیر پھر مجھے لے کر اسٹیج سے نیچے اُتر آئے اور صوفے پر لے کر بیٹھ گئے۔ میرا پورا تعارف چاہا۔ میں نے مختصر بتا دیا۔ شہزادہ منظر تو میرا عاشق اور دست گرفتہ بن گیا۔ دو روز میں کلکتہ میں رہا۔ سائے کی طرح میرے ساتھ رہا۔ پھر اس سے بیس سال بعد کراچی میں ملاقات ہوئی۔ 'ڈان' اخبار میں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا۔ کئی انٹرویو ڈان کے لیے اس نے لیے:

تو اب سنیے وہ بات۔ میرے حافظہ میں شاؔد کا ایک شعر آ رہا ہے:

بعد مرنے کے کسے ہوگا بھلا غم اپنا
ہاتھ قابو میں ہے کر لے ابھی ماتم اپنا

غالبؔ اپنے دور سے پہلے پیدا ہو گئے۔ انشاء اللہ خاں انشاؔء کا مصرع ہے:

تصوّر عرش پر ہے گو نظر ہے پائے ساقی پر

وہ تھے بہادر شاہ ظفرؔ کے زمانے میں۔ جب دہلی لٹ رہی تھی، مگر دلی کے لٹنے برباد ہونے کا تعلق ان کی شاعری سے نہ رہا۔ یہ تعلّق ان کے خطوط میں ہے۔ ان کی شاعری کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں اس دور کو جب جاگیرداری نظام ختم ہوگا بادشاہت ختم ہو جائے گی، انگریز آ جائیں گے۔ ان کی لائی ہوئی تہذیب ان کی لائی ہوئی تعلیم پھیل جائے گی، علی گڑھ قائم ہو جائے گا۔ اور لڑکے پڑھ پڑھ کر اپنے باپ کو خبطی سمجھنے لگیں گے، مدارس مٹ جائیں گی دین مذہب، دل کے خوش رکھنے کا ایک خیال ہو جائے گا۔ جام جم کی قدر نہ ہوگی۔ جام سفال ٹوٹا کرے گا اور بازار سے لے آیا کریں گے۔ پرستش کی جگہ خواہش لے لے گی۔ پیشہ کی قدر مزدور سرمائے دار کی چقلش ہوگی:

عشق و مزدورِ عشرت گہ خسرؔو؟ کیا خوب
ہم طرف دارِ نکونامیِ فرہاد نہیں

یہ بات قصّۂ پارینہ بن جائے گی اور:

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میرؔ بھی تھا

خدا کے حضور میں بحث کا دروازہ کھل جائے گا۔ ایسا کیوں ہے؟ ایسا کیوں نہیں ہے؟:

کیا فرض ہے کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

ہم اپنے اعمال کے جواب وہ کیوں ہیں ۔فرشتوں نے جو چاہا لکھ لیا۔ ہمارا کوئی گواہ کہاں موجود تھا؟:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

مختصر یہ ہے کہ چناں چنیں کا زمانہ آنے والا ہے۔ غالبؔ کا تخیل اور غالبؔ کا بے پناہ ذہن پردوں کو چاک کر کے پس پردہ کیا ہے سب دیکھ رہا تھا۔ اس لیے وہ عندلیب گلشن ناآفریدہ بنے اور ان کے فکر وفن کی قدر شناسی بیسویں صدی میں شروع ہوئی۔

بہرحال تو یہ الگ موضوع ہے۔ تو غالبؔ اپنے عہد سے پہلے پیدا ہو گئے اور میں پیدا ہوا جب میرا عہد ختم ہو رہا تھا۔ تاریخ کا طمانچہ لگا تو سب خواب فراموش ہو گئے۔ میں نے وہ طمانچہ کھایا تو سب خواب یاد آ گئے۔ میں نے خواب کی وہ باتیں شروع کیں تو جن کے خواب فراموش ہو گئے تھے انھیں یاد آ گئے۔ وہ بھی میری لَے سے لَے ملانے لگے۔ ان خواب فراموشوں کو میری شاعری جنت گم شدہ لگی اور سب اس میں داخل ہونے لگے اور بے تحاشہ کود کود کر آنے لگے۔ ان کود کر آنے والوں کو کچھ تو نام سے جانتا ہوں۔ ان کے علاوہ ایک مخلوق ہے۔ اس مخلوق میں سب ہیں، پڑھے لکھے بھی، اَن پڑھ بھی، نوکر بھی، اور آقا بھی، حاکم بھی، محکوم بھی، کلرک بھی، آفیسر بھی، مزدور بھی، سرمایہ دار بھی، چور بھی، کوتوال بھی، تاجر بھی اور کاشتکار بھی۔ سب نے طمانچہ کھایا تھا۔ پھر سب گال سہلا کر اپنے اپنے دُھندے میں لگنے لگے تھے، کہ میں نے دل پکڑ کر زور سے کراہ کی۔ یہ کراہ جس سے سنی سب کو اپنا اپنا زخم دیا آ گیا اور سب آہ کر کے اور اپنے اپنے زخم کو سہلانے لگے۔ اور حال یہ ہوا کہ:

کون یہاں ہے زخم سے خالی
بسمل کو کیا بسمل دیکھے؟

میرے ساتھ سب بسمل تڑپنے لگے۔ نواب اسمٰعیل خاں بھی نواب اسمٰعیل خاں کے بیٹے بھی، پوتا بھی اِدھر اُدھر کروٹ لینے لگا۔ پھر سب کے بیٹے پوتے جاگیرداری کو خطرہ میں دیکھ کر

دُکانداری کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ یہ تو قافلہ کا رُخ مڑ گیا۔ کوئی دُکانداری میں لگ گیا۔ کوئی سیاسی بازیگری میں لگ گیا۔ اب گھر گھر سیاست کا اکھاڑا بن گیا۔ سب کیک کھانے لگے، سویوں کا مزا بھول گئے۔ شیروانی اُتر گئی، بش شرٹ چڑھ گیا، پاجامہ اُتر گیا پینٹ چڑھ گیا۔ گٹ پٹ ہونے لگی آوا کا آوا بدل گیا۔ جاگیرداری میں قناعت تھی، کشادہ دِلی تھی، فراخ حوصلگی تھی، دکانداری میں جمع کرنے کی دُھن بڑھ گئی۔ خرچ سے کترانے لگے۔ ذخیرہ اندوزی بڑھ گئی تو بھلا شاعری اور ذخیرہ اندوزی، مشرق و مغرب کا فرق۔ اب شاعری کون دیکھے۔ سب سوٹ دیکھ رہے ہیں۔ کار دیکھ رہے ہیں، بنگلہ دیکھ رہے ہیں۔ شاعری کی طرف کون دیکھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سب سہل علاج میں لگ گئے۔ کوٹھی کا مرہم، بنگلہ کا مرہم، عہدہ کا مرہم، اقتدار کا مرہم۔ سب نے مرہم لگا لگا کر اپنا اپنا زخم اچھا کر لیا اور میاں کلیم ایک ایک زخم کھرچ کھرچ کر اور تازہ کر رہے ہیں:

ہوئے جو اُن کے بسمل مر گئے سب
کلیمؔ آخر تو کیوں کر جی رہا ہے؟

اس لیے جی رہے ہیں:

ہم زخمِ جگر ان کو دکھانے میں لگے ہیں
وہ زُلف میں آئینے میں شانے میں لگے ہیں
دیوانۂ گل کون بنے موسم گل میں
سب لوگ تو زنجیر بنانے میں لگے ہیں

چنانچہ زنجیر بنانے کا دھندہ بڑھ گیا اور کلیم اپنے دُھندے میں لگے ہیں:

جگر کے چاک دل کے خاک ہو جانے کی باتیں ہیں
یہ دیوانہ ہے جیسا ویسی دیوانے کی باتیں ہیں

تو لوگ دیوانے کی باتیں سمجھ نہیں رہے ہیں اور زنجیر پر زنجیر پہنا رہے ہیں۔ چنانچہ میاں کلیمؔ پڑھ رہے ہیں:

جب تک تو کلیمؔ اپنی غزل گائے نہیں ہے
ہم کیا کریں ہم کو تو مزا آئے نہیں ہے

تو کہنے والے بدل گئے، اب کہنے والے زنجیر بنانے والے بن گئے اور کلیمؔ گانا شروع کرتا ہے تو لوگ منہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ کون زبان ہے اور کون زمانہ ہے؟ اور کوئی صاحب پڑھ رہے ہیں:

فقیہِ شہر کے سائے تلاش کرتے ہیں

تو لوگ اُچھل رہے ہیں کہ مولوی صاحب کو سب پہچانتے ہیں اور سائے کو شہر کا شہر پہچانتا ہے۔ اور میاں کلیمؔ پڑھ رہے ہیں:

میں یہ دعا کروں جو زباں میں اثر ملے
میری ہی طرح تجھ کو بھی دردِ جگر ملے

یہ دردِ جگر کیا بلا ہے بھائی۔ لیور کے خراب ہونے کی دُعا کر رہا ہے؟ اور ایک شاعر نے پڑھا:

میری دُعا ہے تجھ کو لچکتی کمر ملے

تو لوگ چھ چھ فٹ اُچھل رہے ہیں۔ واہ پتلی کمر ہوگی تو خوب لچکا لچکا کر چلیں گے۔ کتنا اچھا شعر ہے اور کتنا اچھا شاعر ہے۔ اسے انعام دو اور نکالو اس کو جو ہمارے لیور کے خراب ہونے کی دُعا کرنا چاہتا ہے:

برہم ہیں میرے طرزِ سخن سے کچھ اہلِ بزم
اور کہہ رہے ہیں اس کو نکلوانا چاہیے

تو غالبؔ اپنے عہد سے پہلے پیدا ہوئے اور کلیم اپنے عہد کے بعد تو:

بعد مرنے کے بھلا ہوگا کسے غم اپنا
ہاتھ قابو میں ہیں کر لے ابھی ماتم اپنا (شادؔ)

مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی مر گئے۔ محمودؔ طرزی مر گئے۔ خواجہ احمد فاروقی بھی مر گئے۔ چھ سات سال پہلے لکھنؤ کے ہال میں حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب 'المرتضیٰ' کی رسمِ اِجرا تھی۔ مسٹر ضیاء الرحمٰن انصاری مرکزی وزیر صدارت کر رہے تھے۔ اور ڈاکٹر پروفیسر خواجہ احمد فاروقی مہمان خصوصی تھے۔ مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کا مجھے ارشاد ہوا کہ آؤ۔ میں آیا تو میں نے چند اشعار اجرا کے متعلق لکھے اور پڑھے۔ یہ تین بند یعنی نو اشعار کی ایک چھوٹی سی نظم تھی۔ دو بند حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی مدح میں اور تین شعر کے تیسرے بند میں دو شعرا کابرین ندوی کی مدح میں اور آخری شعر اپنی مذمت میں:

میں عاجزؔ گدائے سرِ خاکِ رہ گزر ناقابلِ توجہ و ناقابلِ نظر
میں اِک شکستہ حال شکستہ دل و جگر خانہ خراب ہی نہیں خانہ خراب تر

میں گوشہ گیرِ غم کہاں ، یہ انجمن کہاں
اس انجمن میں مجھ کو مجالِ سخن کہاں

یہ رہنمائے اہلِ متاعِ ہنر کی بزم یہ پیشوائے مسلکِ صبر و رضا کی بزم
سرخیلِ عاشقان و گروہِ صفا کی بزم یعنی جنابِ سیّدِ شیرِ خدا کی بزم

بادِ صبا پیام شرف لے کے آئی ہے
خوشبوئے گلستانِ نجف لے کے آئی ہے

ان خوشبوؤں کے ہم تو پرانے فقیر ہیں دیوانے ہیں انھیں کے انھیں کے اسیر ہیں
ہم ہی نہیں ہمارے یہ سب ہم صفیر ہیں سب ان میں بے نظیر ہیں روشن ضمیر ہیں

سب بن سنور کے آئینہ خانے میں رہ گئے
اِک ہم ہی خاک ہو کے زمانے میں رہ گئے

لکھنؤ، الٰہ آباد کے اساتذہ شعرا نے اس تقریب میں اپنی اپنی معرکۃ الآرا تہنیتیں ارشاد فرمائیں۔ انھیں حضرات کے درمیان میں نے یہ چند شعر کی مختصر ترین نظم پیش کر دی تو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے گونجتی ہوئی اس بھری بزم میں اُٹھ کر زور سے پکار کر یہ کہہ دیا۔

’’ارے میاں کلیم عاجزؔ! خوب کہا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا سب سالے مر گئے۔‘‘ یہ ٹکڑا ’’سب سالے مر گئے‘‘ دورِ حال کی شاعری سے کبیدگی اور ناپسندیدگی کا ایسا اظہار تھا کہ مجمع کچھ دیر سکتہ میں رہا۔ پھر زور سے ہنس دیا کہ خواجہ صاحب کا مخصوص طرزِ کلام جو یاروں کی بزمِ خاص میں رونما ہوا کرتا تھا اس عام مجمع میں بے ساختہ اُبھر آیا۔ خواجہ صاحب کا ریمارک کبھی کبھی بہت سخت ہوا کرتا تھا جسے کچھ لوگ ناپسند کرتے مگر جو خواجہ صاحب کے مزاج اور صورتِ حال سے باخبر ہوتے کافی پسند کرتے۔

(کلیم احمد عاجزؔ)

نعت

کہو صبا سے کہ میرا سلام لے جائے
سلام ہی میں چھپا ہے پیام لے جائے

لہو سے دل کے ہے لبریز جام لے جائے
حضوؐر تک کوئی میرا کلام لے جائے

نقوش خونِ جگر نے جو کچھ بنائے ہیں
سب انتساب انھیں کے ہے نام لے جائے

دکھا تو دے کہ گزرتی ہے زندگی کیسی
یہ روز و شب یہ مری صبح و شام لے جائے

غریب دل سے نچوڑے ہوئے ہیں پانچ اشعار
یہ میرا حوصلۂ ناتمام لے جائے

نعت

درد اتنا ہے کہ کروٹ نہیں بدلا جاتا
غم نے کیا حال بنایا ہے ہمارا کہیو

گھر سے خود شوق شہادت میں نہا دھو کے چلے
عید میں بھی کفن اپنا نہ اُتارا کہیو

عید جب آئی تھی اور غنچہ و گل ہنستے تھے
ہم نے وہ وقت بھی کس طرح گزارا کہیو

آپؐ کے نام پہ مٹنے کی وہ بیتابی تھی
مڑ کے دیکھا بھی نہیں گھر کو دوبارا کہیو

عید کا دن ہی سوئمبر تھا جوانوں کے لیے
جھوم کر دوڑے جو حوروں نے پکارا کہیو

نوٹ: حادثۂ مراد آباد جو عید کی صبح عیدگاہ میں پیش آیا۔

پیش لفظ

اب تو دانا پور سے مال سلامی تک رہنے والے لوگ شعر و ادب کی دنیا میں عظیم آبادی ہی کہے جاتے ہیں یا کہتے ہیں اصل عظیم آباد تو پچھّم دروازے سے پورب دروازے تک تھا، جس میں مغل پورہ، کیواں شکوہ، لودی کٹرہ وغیرہ محلے ہیں۔ یہیں راسخؔ تھے یہیں شادؔ تھے اور اس سے پہلے عظیم آبادی خصوصیات کی آبرو راجہ شتاب رائے، راجہ رام نرائن موزوںؔ اور راجہ کلیان سنگھ وغیرہ تھے اور یہیں ہیں اس سلسلہ کے آخری تاجدار۔ تاجدار نہ کہیے کلہ دار کہہ لیجیے۔ راجہ جیلان رائے سے ملا۔ جب میں کسی عظیم آبادی بزرگ کے ساتھ ان سے ملنے گیا۔ اپنے محل نما مکان میں سلک کی دھوتی، سلک کا کُرتہ اور ریشمی بیل دار ٹوپی پہنے وقار اور ادب سے ملے اپنے مخصوص کمرے میں لے گئے اور خاندانی نوادرات دکھاتے رہے، تعارف کراتے رہے ایسی شستہ اُردو میں جو اَب لکھنؤ اور رامپور کے کسی قدیم خاندان کے ورثہ سے بھی نہ سُنی جا سکے گی۔ گفتگو کرتے رہے اور کبھی روتے رہے:

ایک دن لے جا کے قبرستان میں وہ — تربتیں لوگوں کی دِکھلاتے رہے
یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ قیس — عاشقانِ ناز تھے، جاتے رہے

لیکن ایک تربت پہ جب پہنچے تو وہ دیر تک افسوس فرماتے رہے:

میں نے پوچھا یہ کس کا ہے مزار — آپ جو رہ رہ کے پچھتاتے رہے
ہنس کے بولے یہ سخیؔ کا ہے مزار — جان دے دی لاکھ سمجھاتے رہے

(سخیؔ عظیم آبادی)

رائے جیلان کا بیٹا ہیرا رائے اپنی خاندانی روایت سے ہٹ گیا۔ پرنس کوٹ اور پینٹ پہن کر پرانے موڈل کی اپنی رائل رائس موٹر پر ایک دوبار میری چھوٹی سی دُکان میں آیا تھا۔ یہ ۱۹۴۸ء کی بات ہے جب میں نے ایک چھوٹی سی دُکان کر لی تھی۔ پٹنہ سٹی کی محفلوں میں غزل پڑھ کر لوگوں کو چونکتا اور حیران کرتا تھا۔ تو اصل عظیم آباد میں گھر گھر دبستانِ عظیم آباد قائم تھا۔ چھوٹی بڑی نشستیں ہوتی تھیں کبھی دس بیس افراد کی اور کبھی تیس چالیس افراد کی۔ مصرع طرح پر غزلیں پڑھی جاتیں۔

طبیعتوں کے جوہر دکھائے جاتے زبان کی نکھار بندشوں کی بہار دکھائی جاتی۔ اور میں روایتی انداز میں بھی اپنے مخصوص غم دل کی جھنکار سنایا کرتا۔ لوگ حیرت بھی کرتے، متعجب بھی ہوتے، تعریف بھی بے ساختہ کرتے اور پیٹھ بھی ٹھونک دیتے۔ دعائیں بھی دیتے۔ یہی عظیم آباد تھا اور یہی دبستانِ عظیم آبادی کی خاکستر میں پوشیدہ چنگاریوں کا مرکز تھا۔ بزم رفیق الشعرا انجمن نوبہار ادب، میخانۂ ادب، یارانِ میکدہ، رفیق الشعر، میر باقر عظیم آبادی کے شاگردوں کی مجلس تھی۔ انجمن نوبہار ادب جانشین شادؔ، حمید عظیم آبادی کے نئے ہونہار نوجوان شاگردوں کی محفل، میخانۂ ادب، محمد اکرام پرویز شاہدی کے چھوٹے بھائی محمود حسن صہبا عظیم آبادی کی محفل اور یارانِ میکدہ ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کے قدر دان معتقدین دوستوں کی مجلس جسے پلاؤ کی پارٹی بھی کہا جاتا۔ یہاں مشاعرہ کے بعد پُرتکلف دعوتِ طعام بھی ہوتی تھی تو ان سب محفلوں میں پٹنہ کے ایک دُور دراز بستی کی خاکستر سے اٹھا ہوا خستہ، زخم خوردہ، برباد شدہ نوجوان کلیم عاجزؔ کی آواز بھی ترنّم کے ساتھ گونجتی اور لوگ:

سن کے غزل سب چونک کے بولے ایں کس کی آواز ہے یہ؟
کس کو ایسی چوٹ لگی ہے؟ یہ کس کا دل ٹوٹا ہے؟

شعر و ادب کی شمعیں تو اسی قدیم عظیم آبادی جگہوں میں چمکتی اور بانکی پور کی مجلس بزم سخن سائنس کالج، بزم ادب پٹنہ یونیورسٹی، بزمِ اُردو بی.این.کالج کے شاندار مشاعرے انھیں پٹنہ سٹی کی محفلوں کے وضع دار، طرحدار شعرا سے آباد ہوئی۔ شاہ چھبّو بسملؔ عظیم آبادی، محمود علی خاں صباؔ عظیم آبادی، نواب غضنفر علی خاں غضنفر عظیم آبادی، سیّد کاظم حسین زارؔ عظیم آبادی، ارتضٰی حسین ہوش عظیم آبادی، حمید عظیم آبادی اور ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کی غزلوں پر اہلِ محفل جھوما کرتے۔ ان کے صحبت یافتہ کالجوں کے استاد بھی ان کے ہم بغل ہوئے۔ پروفیسر عطاء الرحمٰن عطاؔ کاکوی عظیم آبادی، پروفیسر سیّد حسن سرمدؔ عظیم آبادی اور ان کے پس قدم کلیم عاجزؔ عظیم آبادی۔ اب تو عظیم آبادی کہلانے والا کوئی رہا بھی نہیں۔ اس لیے دبستان عظیم آباد بھی جدیدیت کی نذر ہو گیا:

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن — کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہے غمازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن — اُڑ گئے ڈالوں سے زمزمہ پردازِ چمن

ایک بلبل ہے جو ہے محوِ ترنّم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

اس کتاب میں جو غزلیں ہیں وہ تقریباً تمام کی تمام ابتدائی دَور کے طرحی مشاعروں کی پیداوار

ہیں۔ پٹنہ سٹی کی مجلسوں میں عام طور سے طرحی مشاعروں کا رواج تھا۔ایک مشاعرہ ختم ہوا اور اسی محفل میں آئندہ مشاعرہ کی تاریخ اور مصرعۂ طرح منتخب کر کے اعلان کر دیا گیا۔شاعری تو ودیعت خداوندی ہے۔ اس ودیعت کا اظہار مختلف انداز میں مختلف حالات میں مختلف ہوتا ہے۔میرؔ میں بھی اس عطیۂ خداوندی کا اظہار ان کے ماحول کے مطابق ہوا۔ان کا ماحول فقیر منش دردمند صوفیوں کا تھا۔طبیعت میں بے نیازی بلکہ دنیا بیزاری۔اس خمیر میں ابتدا ہی سے ارزوؤں کی شکست و ریخت نے درد و سوز کا بے پناہ لاوا زندگی میں بھر دیا، دل پگھل کے رہ گیا تو پھر:

دل پُرخوں کی اِک گلابی سے　　　　عمر بھر ہم رہے شرابی سے

باپ کا مر جانا، مشفق اور دردمند چچا کا گزر جانا، بھائیوں کی سرد مہری۔ پھر آخری ولی اور سرپرست ماموں کی بے رُخی، محبت میں ناکامی، غریب الوطنی، اکبر آباد چھوڑ کر دہلی میں آوارہ گردی مرزا جعفر علی حسرتؔ عظیم آبادی سے ملاقات ان کی شفقت اس غمِ ذاتی میں غم کائناتی داخل ہونے لگا۔ دہلی کی لوٹ کھسوٹ قدروں کی پامالی، شرفا کی بے پناہی، عوام کا قتلِ عام:

جگر دورِ گردوں سے خوں ہوگیا　　　　مجھے رُکتے رُکتے جنوں ہوگیا

یہ مزاج میرؔ کا بن گیا۔ غالبؔ استثنا ہے کہ ان کا مزاج فلسفیانہ تھا اور ان کی تعلیم بھی اسی انداز کی ہوئی۔ وہ ایک غیر معمولی ذہانت کی آئینہ دار ہے تھوڑا بہت گداختگی جو دل میں ہے وہ دہلی کی اس دَور کی تاریخ کی پیداوار رہے۔اقبال بھی ایسی وراثت لے کر پیدا ہوئے۔صوفی باپ کی تربیت اور اپنے استاد مولوی محمد حسن کی صحبت نے مزاج کا خمیر تیار کیا۔ پہلے صوفی منشی مزاج میں رہی۔ پھر یورپ کے سفر اور قیام نے قدرت کا منشا پورا کر دیا۔مسلمانوں کی تاریخ مسلمانوں کا ماضی پیشِ نظر تھا۔مسلمانوں کا حال دیکھا اور شیشہ چوکھٹے میں فٹ ہوگیا۔ایک پیام تھا جو اقبالؔ کے ذریعہ قلب کو مل گیا۔اس کا اثر ہوا مگر وہ انقلاب برپا نہ ہو سکا، جو رومیؔ نے تاریخ اسلام پر کر دیا۔ وجہ یہ کہ تمام عالم پہ مغربی سامراجیت نے تہذیبی اور معاشرتی جال جو بچھایا تھا، اسے توڑنے کے لیے جس کردار کی تعمیر کی ضرورت تھی، اقبالؔ کی شاعری وہ تعمیر نہ کر سکی۔ ذہن ضرور بڑی حد تک بدلا مگر صرف ذہن سے انقلاب نہیں آتا۔انقلاب عملی زندگی کی قوت اور حرارت سے آتا ہے۔ اقبالؔ کا کلام مشاعروں اور محفلوں کی زینت بن گیا بس اور کچھ نہیں۔

خیر یہ بات قلم سے بے ساختہ نکل پڑی۔ بات یہ تھی کہ طرحی مشاعروں سے چھپی ہوئی شعریت کی دَبی ہوئی چنگاری اُبھرتی ہے۔ اگر وہ چنگاری نہ بھی ہو تو مشق و ریاض سے شعری استعداد

ضرور رونما ہو جاتی ہے۔ میں طرحی مشاعروں میں شریک ہوا کیا، چونکہ طبیعت میں شعریت تھی۔ مجھے اپنا راستہ ملنے لگا اور پھر میں راہ پر لگ گیا۔ مجھے راہ ڈھونڈنے میں جو تھوڑا وقت لگا اس وقت میں مجھ سے سرزد ہونے والی شاعری اس مجموعے میں ہے۔ کہیں کہیں وہ چنگاری بھی نمایاں ہے، جو آہستہ آہستہ بنی اور اب آتش کدہ ہے:

ہم جس میں ہمیشہ رہتے ہیں دہکی ہوئی غزلیں کہتے ہیں
اس درد کی بھٹّی سے ہوکر اوروں کا گزرنا مشکل ہے

……..…………

دلِ درد کی بھٹّی میں کئی بار جلے ہے
تب ایک غزل حسن کے سانچے میں ڈھلے ہے

سانچے بہت ہیں، زبان کا سانچہ، ذہن کا سانچہ، درد کا سانچہ۔ زبان کا سانچہ امام بخش ناسخؔ اور ان کے حلقے نے اور شاگردوں نے بنایا، ذہن کا سانچہ غالبؔ کے یہاں معراج کمال کو پہنچا۔ درد کا سانچہ میرؔ کی زندگی نے ڈھالا اور پھر وہ مجھ کو ملا، میرا حادثۂ زندگی اس کا سبب بنا:

سنتے ہیں کہ ہم بھی تھے قسمت کے دھنی پہلے	کیا دَور رہا ہوگا اللہ غنی پہلے
مشہور تھی اپنی بھی گل پیرہنی پہلے	گلزار میں ڈیرا تھا، پھولوں میں بسیرا تھا
کھائی ہے کلیجے پر برچھی کی اَنی پہلے	یوں ہی نہیں پھوٹا ہے سرچشمۂ فن عاجزؔ

یہ میری ابتدائی غزلوں میں سے ایک ہے۔ میرے دونوں تینوں مجموعوں میں جو چیزیں بھی شامل ہیں وہ مجلس آرائی کی شاعری سے الگ ہیں۔ مجلس آرائی والی جو شاعری ہے، وہ کہیں پڑی ہوئی تھی وہ میاں وسیم سلّمہٗ کو ہاتھ لگ گئی۔ زیرنظر مجموعے میں جو غزلیں ہیں گرچہ میں انھیں مجلس آرائی والی شاعری کہتا ہوں لیکن اس میں ایسے بہت اشعار مل جائیں گے جو پتہ دیں گے کہ شاعر جس راستے سے گزرتا ہے وہ اس راہ یا اس راہ کے آگے اس کی منزل نہیں ہے۔ ان موجوں کی تہوں میں کچھ اور طوفان کی نشاندہی ہے۔ جیسے اقبالؔ کی غزل:

مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی	نہ آتے بھلا اس کی تکرار کیا تھی
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی	تمھاری ہی پیالی نے سب راز کھولا

کے اس شعر نے داغؔ کو چونکا دیا کہ یہ شکار میرا نہیں ہے۔ یہ کسی اور ہی فتراک کے لیے ہے۔ اور کہہ دیا کہ تمھیں مزید اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ غزلیں صرف وہی ہیں جو وسیم سلّمہٗ کی دسترس میں آ سکیں۔ بہت ہوں گی، جو میری بے نیازی اور بے پروائی کی نذر ہو گئیں۔ اس کا غم مجھے نہیں ہے۔ کیونکہ غم اس کو ہو جو کمائی چھوڑ بیٹھا ہو کمایا ہوا کھا رہا ہو۔ الحمدللہ کمائی جاری ہے اور جس وقت مشاعروں میں چھوٹی موٹی نشستوں میں طرحی غزلیں پڑھتا رہتا تھا اُس وقت بھی مجھے قطعی یہ احساس نہیں تھا کہ میں کوئی بڑا کام کر رہا ہوں اس کام کو محفوظ رکھنا ہے، یہ میرے کام آئے گا۔ اس سے یہ حاصل ہوگا، یہ فائدہ ہوگا، یہ ملے گا، وہ ملے گا۔ بہت چیزیں اور غزلیں ہوں گی جو پٹنہ میں مسلم اسکول میں پڑھنے کے دوران میرے شناسا دوست، قرابت مند، رشتہ دار، اسکول کالج میں پڑھنے والے اداروں کی تقریبات میں پڑھنے کے لیے فرمائشیں کر کے لے گئے (کسی نہ کسی مقدار میں یہ اب بھی جاری ہے) مگر ان کا کوئی ریکارڈ میرے پاس نہیں ہے۔ اور ہو تو کیوں کر ہو:

جب مال بہت تھا تو سخاوت بھی بہت تھی ہر شام سناتے تھے حسینوں کو غزل ہم

جب اوپر سے آ رہا ہے تو جانے میں بخالت کیوں کی جائے۔ بہرحال تو جو بھی بچی کھچی غزلیں اُس دور کی اِس مجموعہ میں ہیں آپ انھیں غور سے مطالعہ کریں گے تو اکثر پوری غزلوں میں اور بعض غزلوں کے اشعار میں یہ نشاندہی آپ کو ملے گی کہ:

یہ مسافر ہے کہیں دُور کا جانے والا

آپ کو چالیس پچاس ساٹھ سال پہلے کی انجمنوں ادبی شعری اداروں کی روداد اور گلدستہ مل جائے تو دیکھئے گا، موازنہ کیجیے گا تو اندازہ ہوگا کہ اس ابتدائی دَور کی غزلوں کا بھی چوکھٹا ہی کچھ اور ہے، نہج ہی کچھ اور ہے تیور اور خال وخد ہی کچھ اور ہیں، جس طرح آج ہند و پاک کے شعرا میں آپ میری غزل پہچان لیں گے، عظیم آباد کی پچھلی صدی کی پانچویں دہائی کے نئے شعرا میں بھی آپ بہ آسانی مجھے شناحت کر لیں گے۔ اور یہ شناخت آپ کو مایوس نہیں کرے گی۔ آپ کو حوصلہ مند بنا دے گی، تازگی سوا کر دے گی، شگفتہ کر دے گی اور آپ بھی زمانے سے ہاتھ دو ہاتھ لڑنے کا ارادہ کریں گے۔ ان غزلوں میں بھی پٹی پٹائی لدی لدائی باتیں آپ کو بہت کم ملیں گی جو ملیں گی وہ بھی نئے رنگ و آہنگ میں ملیں گی۔ کیونکہ ان میں وقت کی آواز ہے۔ ان میں عہد کے دِلوں کی دھڑکن ہے۔ میں اسی لیے کہتا رہا ہوں، لکھتا رہا ہوں کہ مجھے ٹھٹک کر سرسری دیکھ کر گزر نہ جائیے، تامل کیجیے، میری آواز پہچانئے۔ کچھ دیر بعد آپ کو احساس ہو جائے گا کہ ارے یہ تو میری ہی بات کر رہا ہے۔

۞۞

غزلیں

۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۲ء

قدم قدم پہ فریبِ وفا دیا تم نے		نیاز مند کو اچھا صلا دیا تم نے
جوابِ شوق دیا بھی تو کیا دیا تم نے		بہت ہوا تو ذرا مسکرا دیا تم نے
تم ہی بتاؤ میں الزام اور دوں کس کو		مجھے بگاڑ دیا یا بنا دیا تم نے
تمھارے سامنے دوچار ہوں تو دُہراؤں		توقعات کا ایک سلسلہ دیا تم نے
پہنا کے طوق وسلاسل وفا گزاروں کو		بڑا عروج بڑا مرتبہ دیا تم نے
سنبھل سکیں گی نہ جور وستم کی بنیادیں		اگر وفا کا قدم ڈگمگا دیا تم نے

کچھ اور چاہیے تھی قدرِ شمع وپروانہ
یہ کیا کیا کہ تماشا بنا دیا تم نے

وہ محوِ ناز ہے قدرِ نیاز کون کرے		ادھر یہ شرم کہ دامن دراز کون کرے
ہمیں بھی راز بہارِ چمن کا ہے معلوم		سوال یہ ہے کہ افشائے راز کون کرے
اسی لیے خلشِ زخمِ دل گوارہ ہے		کہ منّتِ کرمِ چارہ ساز کون کرے
رہے نہ جب ہوس وعشق کا کوئی معیار		تو جرأتِ گنہِ امتیاز کون کرے

ہر اِک طرف ہے اِک ہنگامۂ جنوں برپا
خرد سے بیٹھ کے راز و نیاز کون کرے

لٹی آبروئے محبت جہاں — یہی سرزمیں تھی یہی آسماں
کوئی بے وطن کوئی بے خانماں — یوں ہی منتشر ہوگیا کارواں
ملے ہم کو دو رنج ہائے گراں — ملالِ اسیری غمِ آشیاں
رہی رات بھر رونقِ انجمن — سحر ہوتے ہی ختم تھی داستاں
مرا حال معلوم ہے شمع کو
دلِ دوستاں محرمِ دوستاں

ہم اگرچہ اپنے منہ سے نہ کسی کا نام لیں گے — جو سمجھنے والے ہوں گے ترا ہاتھ تھام لیں گے
کبھی تجھ سے ہم چمن کا اگر انتظام لیں گے — نہ یہ طرزِ صبح لیں گے نہ یہ رنگ شام لیں گے
غم دو جہاں پہ گرچہ ابھی دسترس نہیں ہے — ہم یہیں سے بیٹھے بیٹھے غمِ دل سے کام لیں گے
ابھی غمزدوں پہ ہنس لے وہ دن آ رہا ہے ساقی — ترے ہاتھ ہی سے اِک دن مئے لالہ فام لیں گے
میری شاعری سلامت یہی نشہ کم نہیں ہے
جو شراب ختم ہوگی تو غزل سے کام لیں گے

شعور آتے ہی تم یہ کمال کر بیٹھے — جو دوست تھے انھیں دُشمن خیال کر بیٹھے
یہی خطا ہے کہ ہم عرض حال کر بیٹھے — ذرا سی بات کا اتنا ملال کر بیٹھے
اس انجمن میں اب وہ بے تکلفی نہ رہی — یہاں جو بیٹھے وہ دامن سنبھال کر بیٹھے
بس ایک مرحلۂ دار و رسن کا باقی تھا — یہ کام بھی ترے آشفتہ حال کر بیٹھے
بنے ہوئے تھے لڑکپن میں کس قدر معصوم
شباب آتے ہی کیا کیا کمال کر بیٹھے

قدم بڑھاؤ کہ راہِ نجات باقی ہے سحر بھی دور نہیں گرچہ رات باقی ہے
ثباتِ عزم سے ثابت کرو زمانے پر کہ اس چراغ میں سوزِ حیات باقی ہے
نظر اٹھاؤ حقیقت کا جائزہ بھی تو لو جو بات پہلے تھی اب بھی وہ بات باقی ہے
تمھیں کو ہاتھ بڑھانے سے عار ہے ورنہ ابھی تو ساغرِ آبِ حیات باقی ہے
یہ بے خودی ہے کہ یہ بھی خبر نہیں تم کو تمھاری جیب میں کیا کائنات باقی ہے
عمل کا وقت ہے مایوسیوں کا وقت نہیں چراغِ رہ گزرِ ممکنات باقی ہے

ہمارا سلسلۂ مدعا تو ختم ہوا
اب آپ کی نگہِ التفات باقی ہے

مجھی سے آج بل کھائے ہوئے ہیں جو گیسو میرے سلجھائے ہوئے ہیں
جنابِ شیخ ہوں یا برہمن ہوں اسی بت کا نمک کھائے ہوئے ہیں
انھیں ناحق ہے ہم سے بدگمانی نہ ہم بہکے نہ بہکائے ہوئے ہیں

نگاہیں آپ کی کب بدلیں اور ہم
ابھی تک ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں

مجھے اور کیا دے گئے دینے والے یہی چند آنسو یہی چند نالے
بھلا ہو تری رونقِ انجمن کا غریبوں کو بے خانماں کرنے والے
تو سُلجھی ہے جس دن سے اے زُلفِ جاناں پریشان ہیں تیرے سلجھانے والے

محبت عجب کشمکش میں پڑی ہے
گریباں بچائے کہ دامن سنبھالے

ہم نے بھی بہت کی تھی مگر کچھ لطف محبت پا نہ سکے
جو زخم کہ دل پر کھائے تھے وہ زخم کبھی مرجھا نہ سکے

مجبوریِ اُلفت میں اکثر انساں کا یہ عالم ہوتا ہے
رونے کو کہو تو رو نہ سکے گانے کو کہو تو گا نہ سکے

اُس شوخ کی محفل میں ہم سا محرومِ تمنّا کوئی نہیں
سب اپنی کہانی کہہ کے اُٹھے ہم اپنی غزل دُہرا نہ سکے

اِس عشق وجنوں کی دُنیا میں کچھ عقل وخرد کا کام نہیں
جو ہوش کی دولت کھو نہ سکے انعامِ محبت پا نہ سکے

اِک درد کی دُنیا سینے سے ہر وقت لگائے بیٹھے ہیں
ہم ایسے تن آسانوں میں نہیں جو تابِ محبت لا نہ سکے

عشق اِک راز ہے افشا کہیں یہ راز نہ ہو
اس طرح دل کو مرے توڑ کہ آواز نہ ہو

نالہ کرتے ہوئے رہ رہ کے یہ آتا ہے خیال
اہلِ گلشن کی طبیعت کہیں ناساز نہ ہو

ہم تو جب قائلِ فیضان بہاراں ہوں گے
ایک کانٹا بھی چمن کا نظر انداز نہ ہو

کیا کروں شکوۂ ناکامیِ اربابِ جنوں
ڈر رہا ہوں کہ خرد گوش بر آوازنہ ہو

خانماں برباد و ننگ زندگی بن کر رہے
جو لکھا تھا اپنی قسمت میں وہی بن کر رہے ہے

اپنے ہاتھوں پھونک کر اپنے سیہ خانے کو ہم
دوسروں کی انجمن میں روشنی بن کر رہے

خوش نصیبی اور کیا ہوگی غریبوں کے لیے
ہم اُجڑ جائیں مگر تیری گلی بن کر رہے

ساری محفل جرأت اظہار سے محروم تھی
بس ہمیں تنہا وفا کے مدعی بن کر رہے

بغیر عشق دل پر اعتبارِ دل نہیں ہوتا　　جو اس قابل نہیں ہوتا کسی قابل نہیں ہوتا
تری تصویر میں اے دوست رعنائی نہیں آتی　　مرے افکار کا جب تک لہو شامل نہیں ہوتا
میرے آنسو مرے آنسو نہیں ہیں سب کے آنسو ہیں　　میں وہ قطرہ نہیں رکھتا جو دریا دل نہیں ہوتا

ہوس والو تم اہلِ عشق کی دنیا میں آ جاؤ
یہاں جینا تو کیا مرنا بھی لاحاصل نہیں ہوتا

میخانے میں چھوڑ آئے کہ گھر بھول گئے ہم　　اے زندہ دِلی تجھ کو کدھر بھول گئے ہم
مدّت ہوئی پردہ شبِ غم کا نہیں اُٹھتا　　کس چیز کا ہے نام سحر بھول گئے ہم
دیوانے ہیں کیا خاک زمانے سے لڑیں گے　　شمشیر اُٹھائی تو سپر بھول گئے ہم
ہر سمت ہے اِک بھیڑ کرشموں کی تمھارے　　دل کس نے لیا کس نے جگر بھول گئے ہم
غربت ہی کی اب خاک مقدر میں لکھی ہے　　وہ راہ جو پہنچاتی ہے گھر بھول گئے ہم
رستہ ہی دِکھانا تو نہیں کام نظر کا　　ٹھوکر بھی کھلاتی ہے نظر بھول گئے ہم
اوروں کو بھی اس زخم سے دیکھا جو پریشاں　　اپنی خلِشِ زخمِ جگر بھول گئے ہم
مرنے کا تو فن کب کا فراموش ہوا تھا　　جینے کا بھی دُنیا میں ہنر بھول گئے ہم
دھجی کوئی دامن کی ترے واسطے رکھنا　　اس سال بھی اے دیدۂ تر بھول گئے ہم
سودا ہی لیا عشق میں سر بھول گئے ہم　　کچھ لے چلے کچھ زادِ سفر بھول گئے ہم
کیا کیا نہ ترا ظلم ہوا جانِ حزیں پر　　بھولا نہیں جاتا تھا مگر بھول گئے ہم
دنیا کی خبر سے کیا دُنیا کو خبردار　　وقت آیا تو اپنی ہی خبر بھول گئے ہم
اتنا تو رہا یاد نظر ان کی اُٹھی تھی　　کیا کہہ گئی تھی اُن کی نظر بھول گئے ہم
مقصودِ حیاتِ بشری تو ہی بتادے　　افسوس کہ اے شمعِ سحر بھول گئے ہم

اس در پہ جھکائی تو جھکی رہ گئی گردن
ہے بھی کہ نہیں دوش پہ سر بھول گئے ہم

الگ مقام ہیں دونوں کے امتحاں کے لیے — خرد کہاں کے لیے ہے جنوں کہاں کے لیے
جنابِ عشق ہی کرتے ہیں جو بھی کرتے ہیں — ہمارا نام تو ہے زیبِ داستاں کے لیے
غزل میں آئے گی کیا دلکشی کہ میرے پاس — سوائے غم کوئی پہلو نہیں بیاں کے لیے
چمن کو دیکھ کے اکثر یہ سوچتا ہوں میں — دُعا بہار کی مانگی تھی یا خزاں کے لیے
میں جل رہا ہوں یوں ہی جلتے رہنے دو مجھ کو — چراغ راہ بتاتا ہے کارواں کے لیے

ہمارے دل کی کہانی طویل ہے عاجزؔ
اِک عمر چاہیے تکمیلِ داستاں کے لیے

کعبہ کے روبرو حرمِ دل بنا دیا — اِک جھونپڑا محل کے مقابل بنا دیا
کس طور کس غضب کا مرا دل بنا دیا — برقِ نگاہ کا متحمل بنا دیا
دل کیا تھا جھلملاتا ہوا سا چراغ تھا — اِک داغ عشق نے مہِ کامل بنا دیا
وہ دن کی زیست کو کسی وعدہ فریب نے — آساں بنا دیا کبھی مشکل بنا دیا
مٹّی خراب ہونے نہ دی کوہِ طور کی — اِک مشت خاک لے کے مرا دل بنا دیا
سر دے کے دردِ عشق کا سودا لیا ہے مول — خود کو بگاڑ کر تجھے اے دل بنا دیا
غم دیکھنے کے واسطے آنکھیں ہی کم نہ تھیں — اس پر ستم یہ درد بھرا دل بنا دیا
آنا نہ چاہیے تھا تمھیں جاں کنی کے وقت — مشکل کو تم نے اور بھی مشکل بنا دیا
بنیادِ غم بھی رکھی بِنائے خوشی کے ساتھ — جب دل بنا تو درد بھی شامل بنا دیا
انجامِ سوزِ عشق کا قائل نہ تھا کوئی — دُنیا میں اِک مثال مرا دل بنا دیا
میری نگاہ سے وہ نکل کر نہ جاسکے — ہر حلقۂ نظر کو سلاسل بنا دیا

عاجزؔ کی زندگی تو کسی کام کی نہ تھی
تیری نگاہ نے کسی قابل بنا دیا

غم سے بلبل تو جلے سینۂ گلشن نہ جلے — یہ بھی ممکن ہے کہ ساکن جلے مسکن نہ جلے
ہم جلیں دل جو ہے ارمانوں کا مخزن نہ جلے — سانپ جل جائے مگر سانپ کا یہ من نہ جلے
گرمیِ شوقِ شہادت سے ہے گردن پرسوز — دیکھ جلاّد ترا خنجرِ آہن نہ جلے
آتشِ حسن نے پتھر کو تو پھونکا صد حیف — ہم جو پھیلائے ہوئے بیٹھے تھے دامن نہ جلے
آنے والا ہے کوئی پردہ نشیں تربت پر — آج کی شام چراغِ سرِ مدفن نہ جلے
جامۂ زندگی پھر رہ نہ سکے گا قائم — دیکھ اے سوزشِ غم صبر کا دامن نہ جلے
سوزِ پنہاں سے جلا دوں گا میں خرمن اس کا — برق بیتاب سے کہہ دو کہ نشیمن نہ جلے

گرم اشعار نکالے تو ہیں عاجزؔ تم نے
آتشِ بغض وحسد سے کہیں دُشمن نہ جلے

کام کے قابل ہیں یا بے کام کے — لینے والے ہیں تمھارے نام کے
درد جب اُٹھتا ہے تیری یاد میں — بیٹھ جاتا ہوں کلیجہ تھام کے
فرق اُن میں رات دن کا آ گیا — ملنے والے تھے جو صبح وشام کے
ہم کہاں جاتے ہیں اس کی بزم میں — دل لیے جاتا ہے دامن تھام کے
وصل اب ہوگا وصالِ دل کے بعد — صبح ہوجائے گی پہلے شام کے
دل ہوا خود سے اسیرِ زُلفِ یار — دام کو بندے ملے بے دام کے

دل کہاں اب دل کا مدفن بھی نہیں
کچھ نشان باقی ہیں وہ بھی نام کے

برباد تجھ سے شام گلستاں نہ ہوسکا — اتنا بھی تجھ سے صبح بہاراں نہ ہوسکا
پوشیدہ رنگ خونِ شہیداں نہ ہوسکا — یہ وہ چراغ تھا تہہ داماں نہ ہوسکا
سب ہم صفیر خوش ہوئے فصل بہار میں — لیکن یہ تیرا سوختہ ساماں نہ ہوسکا
جھنکار بیڑیوں کی چمن تک پہنچ گئی
جوشِ جنوں مقیدِ زنداں نہ ہوسکا

کوتاہ اپنا دیدۂ حسرت نگر نہ ہو — اونچا ہو بامِ حسن تو نیچی نظر نہ ہو
صیدِ اجل نہ ہو کہ شکارِ نظر نہ ہو — اِک جان زار میری کدھر ہو کدھر نہ ہو
پھر پنجۂ جنون شبِ غم ہے جوش پر — پھر چاک چاک دامن و جیب سحر نہ ہو
اپنا شریک رنج بھی ہم چاہتے نہیں — ہم جس مقام پر ہیں کوئی بھی ادھر نہ ہو
آنکھیں بھی ساتھ ساتھ بنی تھیں گناہگار — یہ کیا کہ دل اسیرِ بلا ہو نظر نہ ہو
محوِ خیال یار رہوں بے خودی میں بھی — ان کی خبر ضرور ہو اپنی خبر نہ ہو
اس کی بقا ہی پرتو بقائے حیات ہے — ہم بھی نہ ہوں یہ سوزِ محبت اگر نہ ہو
وحشت میں قید جیب و گریباں ہے ناگوار — دشتِ جنوں میں کوئی مرا ہم سفر نہ ہو
کہہ دے کوئی پکار کے ہم بھی چمن میں ہیں — مغرور اتنی بلبلِ شوریدہ سر نہ ہو
کیا بات ہے کہ آنکھوں میں جچتا نہیں کوئی — میری نگاہ میں کہیں ان کی نظر نہ ہو
ناکام اپنا شوقِ محبت رہے، رہے — بدنام ان کی حسن کی دُنیا مگر نہ ہو
دیدار یار میں نہ تکلف کوئی رہے — پردہ نظر کا بیچ میں حائل اگر نہ ہو
کھینچا ہے ہم کو خواب تصور نے اس جگہ — پیکِ خیال کا بھی جہاں پر گزر نہ ہو
ہم کو تو اپنی خانہ بدوشی پہ ناز ہے
دشتِ بلا کی خیر ہے عاجزؔ تو گھر نہ ہو

محبت میں کہیں آسودگی دیکھی نہیں جاتی
دلِ برباد کی دُنیا بسی دیکھی نہیں جاتی

مصیبت کی گھٹا برقِ بلا بن بن کے آتی ہے
فلک سے چار دن کی زندگی دیکھی نہیں جاتی

ٹپک جاتا ہے خونِ دل جب آنسو خشک ہوتے ہیں
غریبوں سے کسی کی مفلسی دیکھی نہیں جاتی

گلا ہم کاٹ کر اپنا جو مرتے ہیں تو مرنے دو
اب ہم سے زندگی دُکھ میں گھری دیکھی نہیں جاتی

ادھر فریاد کرنے میں کلیجہ منہ کو آتا ہے
ادھر ظالم سے خاموشی مری دیکھی نہیں جاتی

یہاں ہر ہر قدم پر غور کرنے کی ضرورت ہے
یہ دُنیا بندہ پرور سرسری دیکھی نہیں جاتی

اب ہم سے ہو نہیں سکتی ہے ضبطِ غم کی پابندی
طبیعت کے گلے پر یہ چھری دیکھی نہیں جاتی

جگر کا خشک ہونا دل کا جلنا دیکھ سکتا ہوں
مگر سوزِ محبت میں کمی دیکھی نہیں جاتی

اِدھر سے آج وہ گزرے تو منہ پھیرے ہوئے گزرے
اب ان سے بھی ہماری بے کسی دیکھی نہیں جاتی

فراغِ غم بھی ہو جس میں فراغِ عیش بھی عاجزؔ
سنی جاتی ہے ایسی زندگی دیکھی نہیں جاتی

ہزاروں یوں تو تصویریں نظر آتی ہیں اے عاجزؔ
جو صورت دیکھنے کی ہے وہی دیکھی نہیں جاتی

ہجر کے خوف کبھی وصل کے ارماں میں رہے
عمر بھر ایک نہ اِک خواب پریشاں میں رہے

باغباں پھولوں سے کہہ دے کہ ہنسی بند کریں
چار دن ماتمِ بلبل تو گلستاں میں رہے

چھیڑ آغازِ محبت کا فسانہ اے دل
مشغلہ کوئی نہ کوئی شبِ ہجراں میں رہے

نااُمیدی مجھے للہ جہنم سے نکال
کون اس کشمکشِ حسرت و ارماں میں رہے

باغباں کیا یہی دستورِ چمن ہے تیرا
ہم قفس میں رہیں صیّاد گلستاں میں رہے

رحم آئے اگر اس کو مری تنہائی پر
بے کسی آ کے مرے خانۂ ویراں میں رہے

دیر تو دیر ہے کعبہ بھی چھڑایا تو نے
اب تو کافر میں رہے ہم نہ مسلماں میں رہے

عشق اور حسن کی قسمت میں نہیں یکجائی
داغ سینے میں رہا پھول گلستاں میں رہے

دیدۂ تر سے لہو بن کے ٹپکنا کیسا
میرا دل ہے تو مرے سینۂ سوزاں میں رہے

طبیعت قیامت کی خوددار نکلی — مگر عشق کی ناز بردار نکلی
عجب چیز تُو اُلفتِ یار نکلی — نہ آسان نکلی نہ دُشوار نکلی
شبِ ہجر یوں جانِ بیمار نکلی — پلٹ آئی سو بار سو بار نکلی
بلا ہے طبیعت کا سودائے گیسو — ہوئی شام اور سوئے بازار نکلی
مصیبت کے دن شکر ہے اب کٹیں گے — اجل ہاتھ میں لے کے تلوار نکلی
فراغت کو ہم خلد میں ڈھونڈتے تھے — مگر آپ کے زیرِ دیوار نکلی
ہمیں جان و دل سے اُمیدیں تھیں کیا کیا — یہ بے لطف نکلا وہ بے کار نکلی

شبِ غم میں آنے سے کترا رہی ہے
قضا بھی اُنھیں کی طرفدار نکلی

ساقی کہیں ہے آج نہ پیمانہ آج ہے — بس ایک ہم ہیں یا دلِ دیوانہ آج ہے
کچھ اضطرابِ برق جداگانہ آج ہے — کیا پھر نگاہ میں مرا ویرانہ آج ہے
زیبِ چمن نہ زینت ویرانہ آج ہے — کس بیکسی میں آپ کا دیوانہ آج ہے
بلبل سے کہہ دو اپنے کلیجے کو تھام لے — میری زبان پر مرا افسانہ آج ہے
کیا ہنس رہے ہیں اہلِ چمن میرے حال پر — ہشیار کل یہی تھا جو دیوانہ آج ہے
ہم کیا مٹے کہ رونقِ محفل چلی گئی — وہ شمع ہے نہ گرمیِ پروانہ آج ہے

شبنم کی آنکھ تر ہے گلوں کی قبا ہے چاک
گلشن میں ماتمِ دل دیوانہ آج ہے

ساقی تھا اَبر باد تھا شیشہ تھا مئے تھی جام تھا
خدمتِ ہوش میں مرا دُور ہی سے سلام تھا

دشتِ بلا میں یوں رواں یہ آپ کا غلام تھا
پیچھے تو خیر موت تھی آگے خدا کا نام تھا

بدنام میری لاش پر کتنا اجل کا نام تھا
حالانکہ وہ بھی سامنے بیٹھا تھا جس کا کام تھا

دیکھا جو اس مقام کو دل کا جہاں مقام تھا
خون کا اِک نشان تھا وہ بھی برائے نام تھا

محفل میں شمع کا ادھر خاتمۂ کلام تھا
بیمارِ سوزِ عشق کا قصّہ اِدھر تمام تھا

ایمان روزِ حشر میں گرچہ ہمیں کلام تھا
لیکن کسی کے وعدۂ فردا کا احترام تھا

مایوسیِ دوام کی تاریکیاں نہ پوچھئے
خورشید صبح بھی مجھے اکثر چراغِ شام تھا

رنجِ شبِ فراق جھوٹ ، شکوۂ آسماں غلط
مرنے میں کیا برائی تھی جینا اگر حرام تھا

چھری چلے گی تو نکلے گی آرزو تیری
سمٹ کے حسرتیں آئی ہیں تا گلو تیری

کہانی جائے گی اے شمع چارسو تیری
کھلی نہ گرچہ زباں بہرِ گفتگو تیری

مزاج تیرا سا، انداز تیرے، خو تیری
بغل میں دل ہے کہ تصویر ہو بہو تیری

ہوس تری دلِ اغیار کو مبارک ہو
خدا نے ہم کو عطا کی ہے آرزو تیری

اگرچہ تو مرے آغوشِ شوق سے نکلا
نکل کے جا نہ سکی پیرہن سے بو تیری

مقابلہ ہے دلِ سخت جاں سے اے قاتل
خدا کرے کہ ہو تلوار سرخرو تیری

جلا کے شمع اُمیدِ وفا شبِ وعدہ
تمام رات رہی دل سے گفتگو تیری

پھر حسرتوں کے سوا کیا رہے گا اس دل میں
خدا نخواستہ نکلی جو آرزو تیری

تو اپنے دیدۂ گریاں کی قدر کر عاجزؔ
اُن آنسوؤں نے بڑھائی ہے آبرو تیری

ستم کی انتہا بھی او بتِ بے دین ہوتی ہے
غضب ہے پھر ہمیں کو صبر کی تلقین ہوتی ہے

الٰہی پھر زباں پر شکوۂ بیداد آتا ہے
خطا ہوتی ہے ہم سے اور بہت سنگین ہوتی ہے

خدا رکھے طبیعت کس قدر بیدرد پائی ہے
جو ہم بیتاب ہوتے ہیں انھیں تسکین ہوتی ہے

اِدھر فریاد کرنے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے
اُدھر نالوں سے جذبِ عشق کی توہین ہوتی ہے

نہ پوچھو غمگسارو اشک ہائے خون آلودہ
انھیں سے میرے غم کی داستاں رنگین ہوتی ہے

اُکتا کے اب بہت ستم باغباں سے ہم
بجلی کی کر رہے ہیں دُعا آسماں سے ہم

گھبرائیں کیوں نہ مشقِ جفائے بتاں سے ہم
لائیں گے روز ایک کلیجہ کہاں سے ہم

تعظیم میہماں کا رہا کس قدر خیال
بجلی چلی فلک سے اُٹھے آشیاں سے ہم

بدنام ہوکے دَہر میں جینا نہیں قبول
باز آئے چارہ سازیِ دردِ نہاں سے ہم

رویا کریں نہ کیوں دل مرحوم کے لیے
ایسا رفیق ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ہم

اے بیکسی کہاں ہے خدا کے لیے سنبھال
سَر اب اُٹھا رہے ہیں کسی آستاں سے ہم

دونوں ہی ساتھ ساتھ غریب الوطن ہوئے
بجلی فلک سے چھوٹ گئی آشیاں سے ہم

عاجزؔ عدو نے خوب ہمیں آزما لیا
نکلے ہر ایک معرکۂ امتحاں سے ہم

غنیمت ہے گنہ گاروں کو اتنا بھی صلہ دینا
مرا رودادِ غم کہنا، کسی کا مسکرا دینا

ارے صیّادِ قربِ گل سے کچھ تسکین ہوتی ہے
قفس بلبل کا دیوارِ گلستاں سے لگا دینا

کسی کعبہ نشیں کو دیر سے آواز دیتا ہوں
ذرا اے برہمن زنجیرِ بت خانہ ہلا دینا

نزولِ برق ٹھہرا اصطلاحِ اہلِ گلشن میں
مری محرومیوں پر آسماں کا مسکرا دینا

یہی تو اس بھری محفل میں پردہ آبرو کا ہے
کہیں دامن نہ میرے دیدۂ تر سے ہٹا دینا

اِدھر کچھ ماسوائے گیسو و شانہ نہیں آتا
اُدھر زنجیر سے قابو میں دیوانہ نہیں آتا

جو غم اس جاں پہ گزرا ہے دُہرانا نہیں آتا
تماشہ ہے مجھ ہی کو میرا افسانہ نہیں آتا

ابھی جوشِ جنوں ناآشنائے موجِ طوفاں ہے
ابھی تک آپ کی زُلفوں کو بل کھانا نہیں آتا

گلوں سے جب ملے ہیں خارزاروں سے بھی لپٹے ہیں
خوشی کا لطف لے کر غم سے گھبرانا نہیں آتا

سمیٹیں گود میں گلہائے باغِ مدعا کیوں کر
ہمیں تو باغباں دامن بھی پھیلانا نہیں آتا

وہی رودادِ بربادی وہی ذکرِ چمن سوزی
تجھے اے برق کوئی اور افسانہ نہیں آتا

وفا اپنی مسلّم، جاں نثاری مستند، لیکن
اسے شرمائیں کیوں کر جس کو شرمانا نہیں آتا

نظر جب آپ کی کچھ مہرباں معلوم ہوتی ہے
مری قسمت نصیبِ دُشمناں معلوم ہوتی ہے

ہر اِک اُمید بے نام ونشاں معلوم ہوتی ہے
یہ دُنیا داستاں ہی داستاں معلوم ہوتی ہے

اگر اُٹھتا بھی ہوں دوگام چل کر بیٹھ جاتا ہوں
میری ہستی غبارِ کارواں معلوم ہوتی ہے

ستارے بن کے میری خاک کے ذرّے چمکتے ہیں
زمیں ان کی گلی کی آسماں معلوم ہوتی ہے

ذرا اے برق مجھ کو اپنی آنکھوں سے لگانے دے
ترے دامن پہ خاکِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

لہو سے آستیں جب تر ہوئی دامن بھگوئے ہیں
ہنسے اتنا نہ تھے اے ہمدمو جتنا کہ روئے ہیں

جفائے برق و جور باغباں تو خیر کیا کہیے
ستم تو یہ ہے پھولوں نے ہمیں کانٹے چبھوئے ہیں

سلامت چشمِ پُرنم داغِ رُسوائی کا رونا کیا
عزیزو ہم نے اپنی آبرو سے ہاتھ دھوئے ہیں

بہار آتے ہی دیکھے دو تماشے اہلِ گلشن نے
ہنسے دل کھول کر وہ اور ہم جی بھر کے روئے ہیں

بت بھی دعویٰ کریں خدائی کا
صدقہ ہے میری جبّہ سائی کا

آہ میں دم کہاں رسائی کا
رنج اُن کو ہے بے نوائی کا

دل کو سوزِ جگر نے پھونکا ہے
بھائی دُشمن ہوا ہے بھائی کا

دیکھ دل داغِ آرزو نہ مٹے
ہے یہ سکّہ بڑی کمائی کا

پی کے مئے سُرخ کیوں نہ ہو زاہد
رنگ اُترا ہے پارسائی کا

شمع روشن نہیں سرِ تربت
داغ ہے آپ کی جدائی کا

رہ رہ کے یہ کھٹک سی جو خارِ وطن کی ہے
اِک یادگار دل میں بہارِ وطن کی ہے

روؤں گا عمر بھر بھی تو ٹھنڈا نہ ہو گا دل
پھونکی ہوئی یہ آگ شرارِ وطن کی ہے

میرا فسانہ میرا فسانہ نہیں رہا
اِک داستاں خزاں و بہارِ وطن کی ہے

اُٹھ اُٹھ کے راہ بادِ صبا دیکھتا ہوں میں
آمد اسی کے ساتھ غبارِ وطن کی ہے

رکھوں نہ کیوں عزیز دلِ داغدار کو
تصویر عہدِ فصل بہارِ وطن کی ہے

مرہم بھی رکھئے تربتِ عاجزؔ پہ پھول بھی
یہ قبر ایک سینہ فگارِ وطن کی ہے

طبع ستم رسیدہ آمادۂ فغاں ہے
جذبات کے لہو میں ڈوبی ہوئی زباں ہے

جو شعر ہے غزل کا شرحِ غمِ نہاں ہے
نالوں کی ہے کہانی آہوں کی داستاں ہے

دل عشق کی بدولت رتبہ میں آسماں ہے
ہر داغ ماہِ کامل ہر زخم کہکشاں ہے

ایک ایک بوند آنسو ایک ایک داستاں ہے
اس کا روانِ غم کا ہر فردِ کارواں ہے

اُمید اور تبسّم مایوسیاں اور آنسو
وہ آپ کا فسانہ یہ میری داستاں ہے

دامن تک آتے آتے اشکوں نے رنگ لایا
آنسو جہاں جہاں ہے سُرخی وہاں وہاں ہے

خود ہو کے چاک چاک گریباں ترے لیے
سلجھا دی تیری زُلفِ پریشاں ترے لیے

اُٹھ اُٹھ کے نیم شب سے دُعائیں وہ صبح تک
تیرے لیے او دُشمنِ ایماں ترے لیے

اے دولتِ چمن تو مرا حوصلہ نہ پوچھ
کافی ہے ایک گوشۂ داماں ترے لیے

بربادیِ اُمید خرابیِ آرزو
سب ہے قبول اے غمِ جاناں ترے لیے

عاجزؔ تجھی سے سوز وگداز انجمن میں ہے
روئے گی شمعِ محفلِ یاراں ترے لیے

غلط الزام ہے آلودۂ جرم فغاں ہم ہیں
ستم پر بھی زباں کھلتی نہیں وہ بے زباں ہم ہیں

نگاہِ برق کی تکلیف فرمائی یہاں بھی ہے
قفس میں رہ کے بھی کتنا قریبِ آشیاں ہم ہیں

فریبِ دُشمناں اہلِ محبت پر نہیں چلتا
جو سچ پوچھو شہیدِ اعتبارِ دوستاں ہم ہیں

یہاں تو سایۂ دار ورسن میں عمر ہی گزری
ستم گر خوب لذّت آشنائے امتحاں ہم ہیں

ابھی تک ربط باہم کا کوئی پہلو نہیں نکلا
اُدھر کچھ مشتبہ وہ ہیں اِدھر کچھ بدگماں ہم ہیں

اِک رسم نغمہ و لحنِ ساز رہ گئی ‌ ‌ ‌ ‌ تاثیر ختم ہوچکی آواز رہ گئی
کچھ ہوتے ہوتے گفتگوئے راز رہ گئی ‌ ‌ ‌ ‌ اُٹھ کر مری طرف نگہِ ناز رہ گئی
کیا کیا نہ ہم کو بے پروبالی کا تھا گلہ ‌ ‌ ‌ ‌ پر ہوگئے تو ہمتِ پرواز رہ گئی
شکوہ ہوا نہ شکر ستم ہوسکا ادا ‌ ‌ ‌ ‌ گھٹ کر وفورِشوق میں آواز رہ گئی
سنتا ہے کون سن کے سمجھتا ہے کون اُسے ‌ ‌ ‌ ‌ سو بار اُٹھ کے درد کی آواز رہ گئی
ناوک کچھ یوں لگا ہے دل کی زبان پر ‌ ‌ ‌ ‌ تعریف بازوئے قدر انداز رہ گئی

گرچہ تھی ناتواں کسی مسکن کی آہ سرد
تھرا کے شمعِ انجمنِ ناز رہ گئی

نہ مئے کم ہے نہ اپنے ظرف سے کچھ بیش ہے ساقی
عنایت تیری کتنی مصلحت اندیش ہے ساقی

ہماری چاک دامانی پہ جو ہنستے ہیں ہنسنے دے
بہت ہشیار دیوانہ بکارِ خویش ہے ساقی

کہیں مستی میں حدِّشوق سے باہر نہ ہوجاؤں
خودی کو بے خودی کا مرحلہ درپیش ہے ساقی

بہت بدنام رندِ میکدہ ہم ہیں تو کیا غم ہے
ہمارا پیرِ میخانہ بڑا درویش ہے ساقی

میں تجھ کو کیا کہوں کیا عاجزِ دیوانہ بکتا ہے
ان اُلجھی اُلجھی باتوں میں غضب کا نیش ہے ساقی

کب خانہ خرابی میں اپنی تاخیر گوارا کرتے ہیں
تعمیر نشیمن ہوتے ہی بجلی کو اشارا کرتے ہیں

پھر عہدِ وفا فرماتے ہیں پھر مجھ کو تسلّی دیتے ہیں
وہ میری پریشاں محفل کی تنظیم دوبارا کرتے ہیں

تحریکِ فغاں کوشی بھی ہے تاکیدِ زباں بندی بھی ہے
دل اور تقاضہ کرتا ہے وہ اور اشارا کرتے ہیں

بیمار محبت کی حالت رہ رہ کے بگڑتی جاتی ہے
وہ آئینہ خانہ میں بیٹھے زُلفوں کو سنوارا کرتے ہیں

اس گلشنِ عالم میں ہم کو ایذا طلبی مرغوب رہی
کانٹوں کو گلے لپٹاتے ہیں پھولوں سے کنارا کرتے ہیں

سو بار گھر اپنا پھونکا ہے سو بار تماشا دیکھا ہے
اندازۂ ہمّتِ اہلِ ستم کیا آج ہمارا کرتے ہیں

کیا موسمِ گل کیا فصلِ خزاں دیوانوں کی دُنیا تنگ نہیں
گلشن سے جو دن بچ جاتے ہیں صحرا میں گزارا کرتے ہیں

ہم بیٹھے ہیں اب درد کی روداد سنانے
محفل سے ہٹاؤ گل و بلبل کے فسانے

سمٹی ہوئی رگ رگ سے چلی دھار لہو کی
جب اشک سے خالی ہوئے آنکھوں کے خزانے

کیا جانے دعاؤں میں اثر ہے کہ نہیں ہے
کچھ ہم نے بھی تیروں کے لگائے ہیں نشانے

اظہارِ تمنّا پہ وہ کچھ بولے تھے لیکن
سننے نہ دیا دل کے دھڑکنے کی صدا نے

افسردہ نگاہوں میں چمکتے ہوئے آنسو
خاموش محبت کے ہیں خاموش فسانے

نہیں نہیں کہ مجھے جرأت کلام نہیں مگر ابھی میری شمشیر بے نیام نہیں
فغاں کے واسطے کچھ قیدِ صبح و شام نہیں نظامِ دل کبھی پابندِ انتظام نہیں
خزاں بہار سے کچھ کم سبک خرام نہیں گلوں سے کہہ دو کہ ہنسنے کا یہ مقام نہیں
یہ صبح صبح نہیں ہے یہ شام شام نہیں میں کیا کروں مرا ذوقِ نگاہ عام نہیں
کمی یہی ہے کہ ساقی خوش انتظام نہیں وگرنہ مئے نہیں ساقی نہیں کہ جام نہیں
لبوں پہ مہر لگاکر نہ مطمئن رہنا دُعا غریب کی شرمندۂ کلام نہیں

حرام موت بہرحال ہے حرام مگر
وہ کون ہے کہ جسے زندگی حرام نہیں

فغانِ بے اثر تک یا اِک آہِ آتشیں تک ہے
الٰہی کیا ہماری کائناتِ غم یہیں تک ہے

تمھیں بس دیکھ لوں گا اور آنکھیں بند کرلوں گا
کہ اب جینے کی حسرت اِک نگاہِ واپسیں تک ہے

نہ ان کو رحم آتا ہے نہ میری آگ بجھتی ہے
مرے اشکوں کا سارا زور میری آستیں تک ہے

وہ کل بھی مسکرا دیتے تھے اب بھی مسکراتے ہیں
مرے نالوں کی شنوائی جہاں تک تھی وہیں تک ہے

لہو کا ایک نامحسوس تھرّاتا ہوا رشتہ
مری گردن سے لےکر ان کے دستِ نازنیں تک ہے

دل سے لگائے بیٹھا ہوں زخمِ جگر کو میں　　تم کو بھلا سکا نہ تمھاری نظر کو میں
جلووں کی تاب حسبِ تمنّا نہ ہوسکی　　آیا ہوں اعترافِ شکستِ نظر کو میں
مدّت سے ہے ورودِ قیامت کا انتظار　　اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہوں تری رہ گزر کو میں
کیوں زندگی نہ خندۂ مینا میں ڈھال دوں　　اب رکھ کے کیا کروں گا غمِ بے اثر کو میں
وہ بزمِ حسن ہے نہ وہ ہنگامہ ہائے عشق　　ان کی خبر کو جاؤں کہ اپنی خبر کو میں
اے ہم نفس نہ دے مجھے پیغامِ شامِ عشق　　بھولا نہیں ہوں عالمِ شمعِ سحر کو میں
اب کیا رُکے گی کاکل و رُخسار پر نگاہ
طے کر چکا ہوں منزلِ شام و سحر کو میں

کوششِ اظہارِ غم ہائے نہاں جاری رہے　　یعنی جس عنوان سے ہو داستاں جاری رہے
اور ہے کنجِ قفس میں کون اپنا ہم نفس　　آمد و رفتِ نسیمِ گلستاں جاری رہے
زنگ آلودہ نہ ہونے پائے شمشیرِ ستم　　سرفروشانِ وفا کا امتحاں جاری رہے
اُس طرف جاری ہے تدبیرِ ختمِ آشیاں
اور اِدھر فکرِ قیامِ آشیاں جاری رہے

اب کسے حوصلۂ عرضِ وفا ہوتا ہے　　اس خموشی پہ سو طرح گلا ہوتا ہے
باغباں کون چمن میں نہیں شاکی تیرا　　تُو تو بیکار اسیروں پہ خفا ہوتا ہے
پاک دامن ہی رہے آپ مرے قتل کے بعد　　خون کے چند نشانات سے کیا ہوتا ہے
اپنے مٹنے کا نہیں غم مجھے غم ہے تو یہ ہے　　ختم اب سلسلۂ رسمِ وفا ہوتا ہے
عقل والے تو پسِ پردہ چلے جاتے ہیں
تیرا دیوانہ ہی انگشت نما ہوتا ہے

آہ اب منزلِ تاثیر تک آ پہنچی ہے
زندگی خواب سے تعبیر تک آ پہنچی ہے

بڑھتے بڑھتے سرِ قاتل سے گزر جائے گی
موجِ خوں دامنِ شمشیر تک آ پہنچی ہے

گلستاں تک نہیں محدود عنایاتِ بہار
بوئے گل خانۂ زنجیر تک آ پہنچی ہے

مہرباں اب تو نہیں پاسِ ادب کا موقع
گفتگو جرأتِ تقصیر تک آ پہنچی ہے

دیکھیں اے جوشِ جنوں کب تجھے غیرت آئے
بات دیوانوں کی زنجیر تک آ پہنچی ہے

رسن و دار سے ہوتی ہوئی مری روداد
آپ کی زُلفِ گرہ گیر تک آ پہنچی ہے

زباں پر جب کسی کی ذکرِ عقل و ہوش آتا ہے
مری دیوانگی کو اور زیادہ جوش آتا ہے

گیا جب موسمِ گل مئے کشی کا جوش آتا ہے
کہاں پر ہوش آنا تھا کہاں پر جوش آتا ہے

سوئے ویرانہ جب دیوانہ سیرِ جوش آتا ہے
غبارِ دست پھیلائے ہوئے آغوش آتا ہے

کوئی آتا ہے اور زُلف سیہ بردوش آتا ہے
خرد کو نیند آتی ہے جنوں کو ہوش آتا ہے

اُدھر بیٹھے ہیں وہ آنسو اِدھر آنکھوں سے جاری ہے
دلِ بیتاب کا پیغام کیا خاموش آتا ہے

تہہِ خنجر گلا کیوں کر نہ رکھ دیں کیا کریں عاجزؔ
وفا کا نام آتے ہی لہو کو جوش آتا ہے

ٹھرّا دیا پھولوں کی غم انگیز ہنسی نے
اب اپنا قدم سوئے گلستاں نہ اُٹھے گا

شوریدہ بیانی مری موقوف نہ ہوگی
جب تک کوئی محفل سے پریشاں نہ اُٹھے گا

مٹّی دلِ برباد کی برباد نہ سمجھو
اس خاک سے کیا پھر کوئی طوفاں نہ اٹھے گا

ستم بقدر ستم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے
یہ اُن کا حسن کرم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

ہماری پرسشِ غم سے جناب کا مقصد
ہماری پرسشِ غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

نہ پوچھ بات کہاں سے کہاں پہنچتی ہے
صنم کدے میں صنم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

تمھیں بتاؤ کہ وہ چیز کون سی ہوگی
تمھاری زُلف میں خم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

میں کیا بتاؤں کہ قصۂ حرم سے میری مراد
فقط طوافِ حرم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

وفورِ آرزو شرمندہ کررہا ہے مجھے
زباں پہ شکرِ ستم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

تمھارے ترکِ محبت کی یادگاروں میں
ہمارا دیدۂ نم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

مرے بیان میں سرمایۂ بیان مرا
فسانۂ شبِ غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

تمھیں خبر بھی ہے اس کی کہ آستاں کے قریب
تمھارا نقشِ قدم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

مری غزل پہ ہے عاجزؔ یہ فیصلہ اُن کا
کہ اس میں زورِ قلم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

بچشم تر سہی لیکن فغاں بلب تو نہیں
میں بے ادب ہوں پہ اتنا بھی بے ادب تو نہیں

بہت ملیں گے مقاماتِ غم زمانے میں
ہر اِک مقام تری محفلِ طرب تو نہیں

کچھ اس میں دخل تمھاری نگاہ کا ہے ضرور
یہ اِک خلش سی مرے دل میں بے سبب تو نہیں

ادب سے جرأت اظہارِ غم تو کرتا ہوں
یہ فکر ہے یہی ترکِ رہِ ادب تو نہیں

پہلے تجربات کو داستاں بنانا ہے
مہرباں پھر آپ کو مہرباں بنانا ہے

اس جہاں سے الگ اِک جہاں بنانا ہے
منزلیں بنانی ہیں کارواں بنانا ہے

شاخ ہائے گل پہ تو آشیاں نہ بن سکا
بجلیوں کے دامن میں آشیاں بنانا ہے

کانٹے صحنِ باغ کے جمع کررہا ہوں میں
ایک طرزِ خاص کا گلستاں بنانا ہے

میری آرزوؤں پر اِک نگاہ ڈال دو
چند روزہ عمر کو جاوداں بنانا ہے

درد کے سوانہیں زندگی میں کوئی بات
اِک لفظ ہے جسے داستاں بنانا ہے

اے ہوائے گلستاں رائیگاں نہ کرسکے
خاکِ آشیاں سے پھر آشیاں بنانا ہے

تم اس دلِ غم نادیدہ کو ساماں یہ کیا کیا بخش گئیں
انعامِ محبت بخش گئیں پیغامِ تمنّا بخش گئیں

جاتے ہوئے وہ کیا جانئے کیا در پردہ اشارا بخش گئیں
اِک صبر کا عالم بخش گئیں اِک درد کی دُنیا بخش گئیں

مٹنے کو تمنّائیں تو مٹیں لیکن یہ نتیجہ بخش گئیں
ان سوختہ ساماں آنکھوں کو اِک خون کا دریا بخش گئیں

تم اپنی اُچٹتی نظروں کا انداز مرے دل سے پوچھو
اس غم کی اندھیری دُنیا میں جینے کا سہارا بخش گئیں

اب نیند بھلا کیا آئے گی نظروں سے سماں جاتا ہی نہیں
اِک جلوہ انھیں کیا بخش گئیں آنکھوں کو تماشہ بخش گئیں

جہاں ہم ہیں فغاں ہے اور کیا ہے
غمِ نا مہرباں ہے اور کیا ہے

نشانی کاروانِ رفتگاں کی
غبارِ کارواں ہے اور کیا ہے

قفس میں سرنگوں بیٹھی ہے بلبل
ملالِ آشیاں ہے اور کیا

خفا ہوتے ہو کیوں ان آنسوؤں سے
ذرا حسنِ بیاں ہے اور کیا ہے

یہ اپنے دوستوں سے کج ادائی
نصیبِ دُشمناں ہے اور کیا ہے

کتابِ دل کے اوراق نہاں میں
حسابِ دوستاں ہے اور کیا ہے

وہ اِک پیکاں جو پیوستہ ہے دل میں
تمنّاؤں کی جاں ہے اور کیا ہے

چھری پھر تیز ہوتی ہے ستم کی
وفا کا امتحاں ہے اور کیا ہے

محبت کا یقیں اور وہ بھی تم سے
مرا وہم و گماں ہے اور کیا ہے

جنابِ خضر کو ہے ناز جس پر
حیاتِ جاوداں ہے اور کیا ہے

ان کی تعریف کرم کے ماسوا اور کیا رہا
ہم تو جس محفل میں بھی پہنچے یہی چرچا رہا

یوں تو ساری داستانِ فصل گل رنگین ہے
لیکن اس ٹکڑے کا کیا کہنا جو در پردہ رہا

آشیانوں کا بھڑک اُٹھنا اِک ادنیٰ کھیل ہے
اس چمن میں یہ تماشہ بھی بہت اچھا رہا

مجھ سے آغازِ شبابِ گل نہ دیکھا جاسکا
لوگ جب محوِ تماشہ تھے میں دیوانہ رہا

کون تھا میرے سوا اس بزم میں نقّادِ حسن
اب حسینوں کو ہمیشہ کے لیے دھوکا رہا

ہم جو اپنی داستانِ غم سنا کر چپ ہوئے
دیر تک احباب کی محفل میں سنّاٹا رہا

دُشمنی آہ میں اور آہ کی تاثیر میں ہے
مستقل عہد خرابی مری تقدیر میں ہے

دل شوریدہ کسی زُلفِ گرہ گیر میں ہے
میری دنیائے جنوں حلقۂ زنجیر میں ہے

تم خمِ گیسوئے پُر پیچ سنوارو اپنا
اس کو زنجیر میں رہنے دو جو زنجیر میں ہے

دل تو پہلے ہی تھا مٹھی میں عدو کی لیکن
ہاتھ بھی آپ کا اب قبضۂ شمشیر میں ہے

صحبتِ گل میں بھی جاتا نہیں وحشت کا خیال
ہم گلستاں میں ہیں دل خانۂ زنجیر میں ہے

حلقۂ غم سے کہاں جانِ حزیں نکلے گی
اُسی زنجیر کی دُنیا اسی زنجیر میں ہے

یہ جب اُٹھتی ہے تڑپ کر میں تڑپ اٹھتا ہوں
جان مجھ میں نہیں قاتل تری شمشیر میں ہے

خوفِ رُسوائی انھیں ہے تو مجھے پاسِ وفا
حسن بھی قید میں ہے عشق بھی زنجیر میں ہے

دم ہی ٹوٹے گا تو ٹوٹے گا جنوں سے رشتہ
سلسلہ تارِ نفس کا مری زنجیر میں ہے

وہ سیاہی جو شبِ غم کو بھی حاصل نہ ہوئی
کچھ تری زُلف میں ہے کچھ مری تقدیر میں ہے

دلِ بیتاب تک ہے یا جہاں تم ہوں وہاں تک ہے
نہیں معلوم میرے درد کی دُنیا کہاں تک ہے

کبھی وابستہ کردے گی حدودِ قید و آزادی
یہ زنجیرِ تصور جو قفس سے آشیاں تک ہے

ہوئی جب نا اُمیدی پھر کہاں یہ لطف جینے کا
فریبِ زندگانی اعتبارِ دوستاں تک ہے

کبھی اس مرحلے سے بھی گزر جانا ہی اچھا ہے
ہراسِ امتحاں اے دوست وقتِ امتحاں تک ہے

حشر دنیا میں یونہی مل کے بہم آپ کریں
چرخ تائید کرے اور ستم آپ کریں
آخری وقت نہ بدنامِ کرم آپ کریں
میں جو مرتا ہوں تو للہ نہ غم آپ کریں
دور سے آہ کی آواز پہ ہنسنا کیا خوب
کاش بیمار کا اندازۂ غم آپ کریں
تیغ کے سائے میں آرام کی نیند آ ہی گئی
اب نہ میرے لیے تکلیفِ ستم آپ کریں
ہم ادھر دل کو بناتے ہیں مجسم شانہ
اس طرف زُلف کو سرتا بہ قدم آپ کریں
بخدا جانتا ہوں آپ کی مجبوری کو
ظلم کس پر کریں مجھ پر جو کرم آپ کریں
شوق کو تیز کریں ضبط کو کم آپ کریں
اور رنگین بہارِ شب غم آپ کریں
میرے انجامِ وفا پر بھی رہے ایک نگاہ
جب مری خاک کو پامال قدم آپ کریں
میں تو چلتا ہوں اشاروں پہ دلِ وحشی کے
مہرباں پیروِ نقشِ قدم آپ کریں

عشق کی مستی ہو تو ہر غم خوشی بن کر رہے
درد بھی سینے کے اندر راگنی بن کر رہے
سوز والوں کو ضرورت ساز کی ہوتی نہیں
دل سے جو آواز نکلے بانسری بن کر رہے
حسن ہوتا ہی نہیں خوئے وفا سے آشنا
دوستی بھی کیجیے تو دُشمنی بن کر رہے
اللہ اللہ مصلحت کی یہ کرشمہ سازیاں
ماجرائے گفتنی نا گفتنی بن کر رہے
ضبط ہی عاجؔز مناسب ہے کہیں ایسا نہ ہو
تیرا رونا ساری محفل میں ہنسی بن کر رہے

مرنے کا ہے امکان نہ جینے کا یقیں ہے
اللہ کس آفت میں مری جانِ حزیں ہے

تم جب سے نہیں ہو مجھے کچھ ہوش نہیں ہے
دل ہے کہیں آنکھیں ہیں کہیں دھیان کہیں ہے

کس نور کے سانچے میں ڈھلی ہے تری صورت
جو بات ہے شیریں جو ادا ہے نمکیں ہے

ہم جانتے ہیں عشق کا انجام بُرا ہے
کچھ زور مگر اپنی طبیعت پہ نہیں ہے

غم عیاں اے دلِ ناشاد نہ ہونے پائے
آبروِ عشق کی برباد نہ ہونے پائے

خاک اُڑانا نہ کہیں بادِ صبا میرے بعد
دیکھ مٹّی مری برباد نہ ہونے پائے

راہ مل جائے نکلنے کی نہ ارمانوں کو
غم سے چھلنی دلِ ناشاد نہ ہونے پائے

دل کو لینی ہے ابھی دادِ وفا کی ہم سے
کشتۂ خنجرِ فولاد نہ ہونے پائے

یاس نے دل میں امیدوں کو بھی رہنے نہ دیا
ہم کسی شکل میں آباد نہ ہونے پائے

جہاں درد سے باخبر نہ ہو جائے
جدھر میں ہوں دُنیا اُدھر ہو نہ ہو جائے

جنوں عشق کا پردہ دَر ہو نہ ہو جائے
محبت مری مشتہر ہو نہ ہو جائے

سہارے پہ غم کے ابھی زندگی ہے
غم ہی پر کہیں منحصر ہو نہ ہو جائے

بنائی ہے دل نے نئی ایک دنیا
کہیں آسماں کو خبر ہو نہ ہو جائے

قیامت اُٹھائے نہ فریاد میری
یہ فتنہ کہیں فتنہ گر ہو نہ ہو جائے

وصال دلِ ناتواں ہو رہا ہے
محبت کا برباد گھر ہو نہ ہو جائے

بلائیں تری زُلف کی لے رہا ہوں
کہیں یہ بلا میرے سر ہو نہ جائے

مان لیتے ہیں ستم کی تمھیں عادت ہوگی
ہم جو مر جائیں گے پھر کس پہ عنایت ہوگی

نہ جہاں درد نہ ارمان نہ حسرت ہوگی
اے خدا وہ مرے کس کام کی جنت ہوگی

میرے نالوں سے نہ ہو آپ کی ٹھوکر سے سہی
اِک نہ اِک روز تو ہونی ہے قیامت ہوگی

سنتا ہوں خانۂ دُشمن پہ گری ہے بجلی
ہو نہ ہو یہ مرے آہوں کی شرارت ہوگی

عشق میں بات بنانی ہمیں آتی ہی نہیں
ہم تو جو عرض کریں گے وہ حقیقت ہوگی

حشر میں پردا اُٹھائے گا جو وہ فتنہ طراز
منہ چھپائے ہوئے دامن سے قیامت ہوگی

لاش کیوں اس کی گلی سے نہیں بڑھتی آگے
چارہ گر دیکھنا دل میں کوئی حسرت ہوگی

دل بے جانی کو نہ ٹھکراؤ کہے دیتے ہیں
پھر یہ فتنہ کہیں اُٹھا تو قیامت ہوگی

جان جاتی ہے حسینوں پہ تو پروا کیا ہے
جی بھی لیں گے کبھی مرنے سے جو فرصت ہوگی

قتل بھی آپ کریں گے تو نہ شکوہ ہوگا
ہم اگر اُف بھی کریں گے تو شکایت ہوگی

کوئی تو ہوگا غمِ ہجر میں ہمدم اپنا
تم نہ ہوگے تو تمھاری شبِ فرقت ہوگی

میں نے تو کرہی دیا نام وفا کا روشن
کچھ نہ ہوگی تو چراغِ شبِ فرقت ہوگی

صبحِ وصل آ نہ سکے گی میرے غم خانے تک
راہ روکے ہوئے ظالم شبِ فرق ہوگی

خاکِ پروانہ بچھائے گی وفا کی چادر
دامنِ شمع سے لپٹی ہوئی حسرت ہوگی

نام رہ جائے گا گو ہم نہ رہیں گے عاجؔز
وجہ شہرت یہی بدنام محبت ہوگی

دل عشق میں آزادِ غمِ دنیا و دیں ہے
رُتبے میں جہاں ہم نہ فلک ہے نہ زمیں ہے

یہ ہوش بھی اب جوشِ عقیدت میں نہیں ہے
چوکھٹ ہے کہاں تیری کہاں میری جبیں ہے

دل محرمِ اسرارِ محبت ہی نہیں ہے
ورنہ کوئی پردہ نہ کوئی پردہ نشیں ہے

دل جا ہی چکا حسرت وارماں بھی سدھارے
اب کون مریضِ شبِ ہجراں کے قریں ہے

جب سے مرے نالوں نے اٹھا رکھا ہے سر پر
ہمدوشِ فلک آپ کے کوچہ کی زمیں ہے

نہ آئیں جو وہ آنے والے نہیں ہیں　　یہاں ہم بھی مر جانے والے نہیں ہیں
نصیحت ہے بے کار قلب وجگر کو　　یہ وحشی اب ہاتھ آنے والے نہیں ہیں
چمن میں صبا دشت میں بادِ صرصر　　یہاں میرے بہکانے والے نہیں ہیں
جئیں گے تو دل میں مریں گے تو دل میں　　یہ ارماں نکل جانے والے نہیں ہیں
فسردہ نہ ہوں گے کبھی داغِ دل کے　　مرے پھول مرجھانے والے نہیں ہیں
اجل خود غرض چارہ گر بے مروّت　　یہ غم خوار غم کھانے والے نہیں ہیں
جہاں سے نہ جب تک گزر جائیں عاجزؔ
ستم سے وہ باز آنے والے نہیں ہیں

پیتا ہوں دل کے جام میں بھر کر شرابِ عشق　　دیتا ہے بے خودی میں مزا اضطرابِ عشق
وعدہ تو کرلو وصل کا پورا نہ ہو نہ ہو　　اتنا تو کامیاب ہو ناکامیابِ عشق
داغوں کی اِک بہار تھی دل میں وہ مٹ گئی　　افسوس ہے کہ تم نے نہ دیکھا شبابِ عشق
یکتا ادا میں تم ہو تو کامل وفا میں ہم　　تم لاجوابِ حسن ہو ہم لاجوابِ عشق
لو میرے نامہ بر نے نئی ان سے چال کی　　وہ خط کو پڑھ رہے ہیں سمجھ کر کتابِ عشق
مشتاقِ دید یوں تو ہزاروں ہیں آپ کے　　قسمت میں لکھ دیا ہے ہمارے عذابِ عشق
میں تیری بزمِ ناز میں آیا نہیں ہوں خود　　لے آئے ہیں لگا کے یہاں تک جنابِ عشق
دُنیا نے ہم کو آپ کا عاشق سمجھ لیا　　آخر کو ہم سے چُھپ نہ سکا اضطرابِ عشق
میں تم سے دل لگا کے مصیبت میں پھنس گیا
مجھ کو نہ ترکِ عشق گوارا نہ تابِ عشق

تم تو کرتے ہو دل لگی دل کی   کیا مٹاؤ گے بے کلی دل کی
آتشِ غم کی چل رہی ہے لُو   دیکھو مرجھائے نہ کلی دل کی
ایک بدمست کی نگاہوں نے   آبرو آج لُوٹ لی دل کی
پوچھی اِک بات بھی نہ ظالم نے   ہائے دل ہی میں رہ گئی دل کی
خوش رہیں آپ ہم تو جاتے ہیں   معاف کرنا کہی سنی دل کی

اب تو رونا ہے عمر بھر عاجزؔ
چار دن کی تھی زندگی دل کی

مجھ کو یہ خوف ہے کہیں ایسا نہ کیجیے
دل لے کے اس غریب سے دھوکا نہ کیجیے

محشر خرام ناز سے برپا نہ کیجیے
سب کھیل کیجیے یہ تماشہ نہ کیجیے

کون و مکان میں انھیں ڈھونڈھا نہ کیجیے
محدود اپنے عشق کی دُنیا نہ کیجیے

بکھرایئے نہ دوش پہ یوں گیسوئے دراز
کوتاہ مری عمر کا قصّہ نہ کیجیے

ایمان ہے اگر کششِ جذبِ عشق پر
ان کے غرورِ حسن کی پروا نہ کیجیے

شعلہ رُخوں سے بچیئے جو رونا نہیں قبول
پانی نہ ہو تو آگ سے کھیلا نہ کیجیے

اشکوں کا رنگ دیکھیے آخر بدل گیا
کہتے نہ تھے کہ خونِ تمنّا نہ کیجیے

پھرتی تھی آسماں پہ جو کل چیختی ہوئی　　ہے خاک آشیاں پہ وہ بجلی گری ہوئی
دیکھو نہ چھیڑو میرے جلے دل کی خاک کو　　کیا کر رہے ہو آگ ہے اس میں دَبی ہوئی
لو ہم بتائیں گل وغنچہ میں ہے فرق کیا　　اِک بات ہے کہی ہوئی اِک بے کہی ہوئی
اس بے کسی میں ہم کو گلے سے لگائے کون
تلوار بھی تو ان کی ہے ہم سے کھنچی ہوئی

رموزِ عشق جہاں کو سکھائے جاتے ہیں　　جو راہ پر نہیں آتے وہ لائے جاتے ہیں
ہوا ہے بعد فنا اس طرح عروجِ وفا　　ہماری خاک کے ذرّے اُڑائے جاتے ہیں
عجیب دُنیا ہے اپنی اُمید کی دُنیا　　بسائے جاتے ہیں ہم وہ مٹائے جاتے ہیں
انھیں کے واسطے مٹّی مری ہوئی برباد　　جو میری خاک سے دامن بچائے جاتے ہیں
بقدرِ ہمّتِ دل غم سے منہ نہ موڑیں گے　　ستم اُٹھائیں گے جب تک اُٹھائے جاتے ہیں
نگاہِ شوق رہِ شوق میں کہاں ٹھہرے　　یہاں تو دل کے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
وہ اپنے حسن کو الزام کچھ نہیں دیتے　　مری نگاہ پہ تہمت لگائے جاتے ہیں
تری جفاؤں کے پابند ہیں مرے نالے　　یہ فتنے خود نہیں اُٹھتے اُٹھائے جاتے ہیں
کبھی ہے دید کا وعدہ کبھی امیدِ وصال　　ہمارے حوصلے کیا کیا بڑھائے جاتے ہیں
عدو سے ناز محبت نہ اُٹھ سکا عاجزؔ
نیاز منداب اُن کے بلائے جاتے ہیں

کہاں چھوڑ آیا ہم کو دل بے قرار اپنا　　ہے بہت دنوں سے اب تک ہمیں انتظار اپنا
میں خود ایسا حال کرتا اوستم شعار اپنا　　اگر اپنے بس میں ہوتا دل بے قرار اپنا
نہ تمھیں پسند آیا نہ ہمارے پاس ٹھہرا　　کسی کام کا نہ نکلا دلِ داغدار اپنا
کبھی فاتحہ تو مجھ پر وہ پڑھیں گے آتے جاتے
اسی بے وفا کے دَر پر جو بنے مزار اپنا

عروس مرگ پہ یوں دل نثار میں نے کیا
لپٹ کے خنجرِ قاتل کو پیار میں نے کیا

کسی کے عہدِ وفا پر مدار میں نے کیا
بڑا قصور یہ پروردگار میں نے کیا

جو روبرو یہ دلِ داغدار میں نے کیا
چمن گلوں کی نگاہوں میں خار میں نے کیا

جو کام بھی کیا دیوانہ وار میں نے کیا
اَجل کو آپ کے دھوکے میں پیار میں نے کیا

میں داد ضبط کی لینے خدا سے، کیوں آیا
یہ کیا کیا کہ تجھے شرمسار میں نے کیا

ہوا صبا کو نہ احساسِ کمتری کیا کیا
بلند اپنا جو مشتِ غبار میں نے کیا

یہ رنگ گیسو و رُخسار بھی نہ تھا پہلے
انھیں تو غیرتِ لیل و نہار میں نے کیا

ہوئی جو دھوم چمن کی تو میرے نالوں سے
بہار وباغ کو باغ و بہار میں نے کیا

عدو کو وصل مبارک ہو مجھ کو سوزِ فراق
جو سب پہ جبر تھا وہ اختیار میں نے کیا

جفا کو مہرِ ستم کو ترے کرم سمجھا
کہا جو تو نے وہی اعتبار میں نے کیا

دعائے موت شبِ غم میں کر کے اے عاجزؔ
غرورِ ضبط کو بے اعتبار میں نے کیا

اس نے مٹایا یوں مجھے خونِ جگر کے بعد
جیسے کوئی چراغ بجھا دے سحر کے بعد

برق ستم کو ہوگئی آسودگی نصیب
یہ آگ پھر کہیں نہ لگی میرے گھر کے بعد

آنکھوں کو مل رہا ہوں کہ یہ ماجرا ہے کیا
کچھ اور بڑھ گیا ہے اندھیرا سحر کے بعد

دیکھی گئی کرامتِ صبحِ بہار بھی
جو شب کو کیفیت تھی وہی ہے سحر کے بعد

ناکامیِ وفا کوئی کم مرتبہ نہیں
یہ درد بھی ملا ہے بڑے دردِ سر کے بعد

آشفتگی مزاج میں پہلے ہی کم نہ تھی
کچھ اور بڑھ گئی ہے تمھاری نظر کے بعد

نظمیں

دیباچہ

آج سے چالیس پینتالیس سال قبل پٹنہ سٹی میں رمز عظیم آبادی مرحوم اور ان کے تلامذہ نے تحریک چلائی۔ رمضان المبارک آتے ہی سحری میں روزہ داروں کے بیدار کرنے کو نغموں کی بارات نکلتی تھی۔ یہ بارات دُور دُور تک جاتی، سڑکوں پر بھی نکلتی، گلیوں میں بھی داخل ہوجاتی۔ سال دو سال جب یہ چہل پہل بہت بڑھی تو بانکی پور کے نوجوان طالب علم شعرا کو بھی شوق ہوا۔ انھوں نے مجھے پکڑا۔ میں نے اپنے کان پکڑے کہ بھائی یہ میرے بس کی چیز نہیں، مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں۔ مجھے کسی چیز کا تجربہ نہیں۔ میں جو شاعری کرتا ہوں یہ مجھے تجربہ سے نہیں آئی ہے۔ مہینوں میں اُسے ٹالتا رہا مگر وہ مجھے چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ مستقل نوجوانوں کا قافلہ اصرار کے لیے آنے لگا۔ میں تو بے بسی کا اظہار کر دیتا مگر دل توڑنا میرے مشرب میں کفر ہے وہ مجھے کسی طرح چھوڑنے پر تیار نہیں تو مجھ سے بھی بہت زیادہ منہ موڑا نہ گیا میں نے کوئی چیز لکھ کر انھیں دے دی۔ اس زمانے میں باقر گنج کی گلی میں میرا کرایہ کا مکان تھا۔ ایک منزلہ عمارت۔ اب یہ قافلہ نکلنے لگا تو میرے مکان کے پاس دیر تک شب کے دو بجے سے نکل کر دھرنا دینے لگا۔ اَڑوس پڑوس کے غیر مسلم لوگ بھی اپنے دروازوں اور چھجوں پر کھڑے سن سن کر مزا لینے لگے، اور پھر یہ سلسلہ ہوگیا تو اور چیزیں بھی مجھے لکھ کر دینی پڑیں۔ پھر اس کی نقل اور محلوں میں بھی ہونے لگی۔ پیر بہوڑ اور شریف کالونی کے نوجوان کمر کس کر میرے یہاں پہنچ گئے۔ یہ کیسے ہوگیا۔ ہم بھی سحری میں قافلہ نکالیں گے۔ ارے بھائی نکالو مجھے کیوں پریشان کرتے ہو؟

نہیں لکھیں گے تو ہم گھیراؤ کریں گے۔ مختصر یہ کہ پیر بہوڑ کے قافلے بھی نکالنے لگے۔ اور سب میرے گھر کے پاس بھی آجاتے اور اگر میں سنیچر کو نوری مسجد میں شب گزاری میں رہتا تو قافلہ وہاں بھی پہنچ جاتا اور زور زور سے نغموں کی جھنکار نکلنے لگتی۔ یہ مطالبہ کہ میں بھی آؤں اور ان کے سامنے کھڑا رہوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میاں عاجزؔ نوشہ بنے ہوئے ان کے درمیان یا سامنے کھڑے ہیں اور لوگ جھوم جھوم کر نغمۂ سحری یا نغمۂ عید سنا رہے ہیں۔ یہ دور بھی گزر گیا اور اس دَور کی کچھ چیزیں جو میری ڈائری میں ہوں گی وہ شامل کر دی گئی ہیں۔ ان موضوعات پر بہت چھوٹی بڑی نظمیں یاروں نے مجھ سے لکھوائیں:

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں

الوداع-۱

چلا ہے اے مہِ رمضاں تو مسکراتا جا
ہمیں اِک آخری پیغام تو سناتا جا
وہ ہم سفر تھے تو ہر پیچ وخم میں ساتھ رہا
جہاں رہا مرے ہاتھوں میں تیرا ہاتھ رہا
کٹے گا راستہ اب کس طرح بتاتا جا
چلا ہے اے مہِ رمضاں تو مسکراتا جا
یہ زندگی کا سفر اور یہ اپنی تنہائی
قدم قدم پہ ہیں کانٹے یہ آبلہ پائی
ہماری راہ میں کچھ پھول تو بچھاتا جا
یہ زندگی کبھی تنہا گزر نہیں سکتی
ترے بغیر یہ دُنیا سنور نہیں سکتی
ہمارے ہاتھ سے دامن نہ یوں چھڑاتا جا
چلا ہے اے مہِ رمضاں تو مسکراتا جا
ہجوم یاس ہے ناکامیوں نے گھیرا ہے
بہک نہ جائیں کہ چاروں طرف اندھیرا ہے
مسافروں کو ذرا روشنی دِکھاتا جا
چلا ہے اے مہِ رمضاں تو مسکراتا جا
یہ سال بھر کی جدائی کا غم ستم ہے ستم
یہ خوف ہے کہ کہیں ڈگمگا نہ جائے قدم
میں ناتواں ہوں مرا حوصلہ بڑھاتا جا
چلا ہے اے مہِ رمضاں تو مسکراتا جا

الوداع-۲

رُوٹھ کر برکتوں کا مہینہ چلا
باغِ جنت کے محلوں کا زینہ چلا
درد سے نیم جاں ہورہا ہے کوئی
دل کو تھامے ہوئے رو رہا ہے کوئی
چھید کرغم سے ایک ایک سینہ چلا
روٹھ کر برکتوں کا مہینہ چلا
اِک مہینہ رہا خوب سیر و سفر
پھر سمندر کنارے ہمیں چھوڑ کر
لے کے ملاّح اپنا سفینہ چلا
روٹھ کر برکتوں کا مہینہ چلا
وہ چہل ہے پہل ہے نہ سامان ہے
میکدہ پھر اسی طرح سنسان ہے
لے کے سب شیشہ و جام و مینا چلا
روٹھ کر برکتوں کا مہینہ چلا
سب مہینوں سے افضل مہینہ تھا یہ
زندگی تھی انگوٹھی نگینہ تھا یہ
کرکے خالی انگوٹھی نگینہ چلا
روٹھ کر برکتوں کا مہینہ چلا
تھا یہ بخشش مدینے کے سرکار کی
ہم سے کچھ قدر اس کی نہیں ہوسکی
شکوہ کرنے کو سوئے مدینہ چلا
روٹھ کر برکتوں کا مہینہ چلا

اُٹھو رمضان والو!

اُٹھو رمضان والو رمضاں سے گلے مل لو
تیار ہے جانے کو مہماں سے گلے مل لو

اب رات کہاں باقی پچھلا ہے پہر دیکھو
اس ماہِ مبارک کو ترسے گی نظر دیکھو
بہنے کو ہے آنکھوں سے پھر خونِ جگر دیکھو
اُٹھنے کو ہے دلبر کا سامانِ سفر دیکھو
دلبر سے گلے مل لو جاناں سے گلے مل لو
تیار ہے جانے کو مہماں سے گلے مل لو

اس ماہ مبارک کی کیا کہیے اداکاری
دن بھی تھے بہت پیارے راتیں بھی بہت پیاری
وہ ذائقۂ سحری وہ لذّت افطاری
اب سوچ کے آنکھوں سے ہوتا ہے لہو جاری
افطار کے سحری کے ساماں سے گلے مل لو
تیار ہے جانے کو مہماں سے گلے مل لو

اِک سال میں آیا تھا اِک ماہ میں جاتا ہے
اب دیکھیں جب آتا ہے تب کون اسے پاتا ہے
فی الحال تو ہم کو بھی رونا بہت آتا ہے
رمضان بڑی حسرت سے آواز لگاتا ہے
حسرت سے گلے مل لو ارماں سے گلے مل لو
تیار ہے جانے کو مہماں سے گلے مل لو

چاندرات

عید آئے گی آج عید کی رات ہے
دن بھی اس رات کے سامنے مات ہے

شام ہی سے ہے منظر عجب دید کا
آگے آگے نیا چاند ہے عید کا
پیچھے پیچھے ستاروں کی بارات ہے
عید آئے گی آج عید کی رات ہے

اب تمنّاؤں کی خشک سالی کہاں
کھلنے والا ہے دروازۂ آسماں
اور برسنے کو رحمت کی برسات ہے
عید آئے گی آج عید کی رات ہے

آج کا دن تھا اقرار و پیمان کا
آج کا دن تھا اُمید و ارمان کا
آج کی شام شامِ ملاقات ہے
عید آئے گی آج عید کی رات ہے

بھر مہینہ تو ہم روتے گاتے رہے
گڑگڑا گڑگڑا کر مناتے رہے
آج وہ مسکرا دیں تو کیا بات ہے
عید آئے گی آج عید کی رات ہے

فکر یہ ہے کہ وعدے کی رات آ گئی
صبح ہے ان کے دربار میں حاضری
اور نہ تحفہ ہے کوئی نہ سوغات ہے
عید آئے گی آج عید کی رات ہے

یہ مرا دفترِ جرم بے انتہا
ہے تو بے شک بہت ہی بڑا مسئلہ
لیکن ان کے لیے کیا بڑی بات ہے
عید آئے گی آج عید کی رات ہے

عید-۱

اب تو پوری سمجھ آجائے گی دیوانے کو
عید آئی ہے بڑے پیار سے سمجھانے کو

وہ محبت جسے مدّت سے بھلا رکھا ہے
یاد کر پھر اسی بھولے ہوئے افسانے کو

پیار اِک شمع ہے اور زندگی پروانہ ہے
شمع سے دُور نہ رکھیو کبھی پروانے کو

آج وہ دن ہے کہ پھر دل کو ملالے دل سے
جس طرح رند ملا لیتے ہیں پیمانے کو

آج وہ دن ہے کہ دُشمن بھی اگر ہو کوئی
لے چلو پیار کی زنجیر اُسے پہنانے کو

آج کعبہ سے اُٹھے ایسی محبت کی پکار
برہمن چھوڑ کے آجائے صنم خانے کو

عید-۲

پھر کسے وقت ہے پیارے کسے فرصت پیارے
عید کا دن ہے بہرحال غنیمت پیارے

عید ملنا تو ہے دونوں کی ضرورت پیارے
دل ہی سے دل کو ملا کرتی ہے راحت پیارے

پھونک دے خانۂ دل آتشِ نفرت پیارے
گر نہ ہو عید تو ہوجائے قیامت پیارے

خود کو کہتے ہو مسلماں تو مسلماں ہوکر
کیسے رکھو ہو مسلماں سے کدورت پیارے

دوستوں پر بھی تمھیں پیار نہیں آتا ہے
ہم تو دُشمن سے بھی کرتے ہیں محبت پیارے

آج بھی گر یوں ہی منہ پھیرے گزر جاؤ گے
سال بھر پھر نہیں دیکھو گے یہ صورت پیارے

آہِ صبح گاہی

سحر اب آرہی ہے رات جاتی ہے اُٹھو پیارے
خدائے پاک کی رحمت اٹھاتی ہے اُٹھو پیارے

تم استقبال کو اُٹھتے نہیں یہ نامناسب ہے
ہَوا فردوس کی آتی ہے جاتی ہے اُٹھو پیارے

سرور و نور کی آغوش میں جس نے سُلایا تھا
وہی چشمِ کرم تم کو جگاتی ہے اُٹھو پیارے

بشارت دی گئی ہے تم کو جس رحمت کے آنے کی
کھڑی زنجیر دروازہ ہلاتی ہے اُٹھو پیارے

نیاز و ناز کی لذّت اسی پچھلے پہر میں ہے
سرہانے حور بیٹھی گنگناتی ہے اُٹھو پیارے

شب آخر کے سنّاٹے کا پردہ چاک کر ڈالو
اسی پردے میں قدرت مسکراتی ہے اُٹھو پیارے

جو اہلِ عشق ہیں اس وقت کب آرام کرتے ہیں
کسی کی یاد دل کو گدگداتی ہے اُٹھو پیارے

یہی تو وقت ہے جب کملی والا اُٹھ کے روتا تھا
تمھیں اس وقت کیسے نیند آتی ہے اُٹھو پیارے

فضا میں اب بھی ربِّ اُمتی کی گونج ہے اور تم
پڑے سوتے ہو کیا پتھر کی چھاتی ہے اُٹھو پیارے

بڑے میٹھے نہایت پیار کے انداز میں عاجؔز
صدا یہ کوچۂ طیبہ سے آتی ہے اُٹھو پیارے

حمیؔد عظیم آبادی کے پاکستان ہجرت کے وقت

اے کہ ترکِ ہند ارمان تو است
شکوہ احباب بر جان تو است

چوں بہ سامان سفر آمادہ ای
تحفۂ دادم کہ شایان تو است

تو نہ خالی می روی از بزم دوست
اشک مادرِ جیب و دامن تو است

سوئے گل رفتی نشیمن ساختی
دوستاں را در قفس بگذاشتی

(۲۶ رفروری ۱۹۵۶ء)

اِک گل کھلا باغِ جہاں میں

خلیل اِک گل کھلا باغِ جہاں میں
خبر پھیلی گلستاں بوستاں میں

چمک یوں آئی اس سے چشم وجاں میں
کہ جیسے شمع روشن ہو مکاں میں

یقیں بن کر وہ گل اُبھرا جہاں میں
جو تھا جعفر رشیدی کے گماں میں

مبارک باد ان کو کامیابی
کہ اوّل آئے اوّل امتحاں میں

جو دیکھے ہے وہ فوراً بول اُٹھے ہے
ہے بچہ خوب آغوشِ جواں میں

یہ غنچہ اِک نرالا اِک انوکھا
اضافہ ہے چمن کے خانداں میں

کہو بلبل کو اپنا ساز چھیڑے
نہ اب خاموش بیٹھے آشیاں میں

کہو شاخوں سے اپنا ہاتھ اُٹھائیں
دُعائیں گونج اُٹّھیں آسماں میں

چمن والوں کو اس پر پیار آئے
بڑھے توقیر چشمِ باغباں میں

پھرے دوشِ صبا پر اس کی خوشبو
کہے بلبل غزل اپنی زباں میں

تمنّائیں اُمیدیں ہاجرہ کی
سمٹ پائیں نہ آغوشِ جہاں میں

محبت ہو بلا تخصیص اس کی
ہر اِک نامہرباں میں مہرباں میں

کہو راضح سے یہ اِک اورطُرّہ
ہے دستارِ امیرِ کارواں میں

جنابِ رابع حسنی کہہ رہے ہیں
اِک اپنے خاص اندازِ بیاں میں

نیا نورِ بصارت دے دیا ہے
نوا سے نے نگاہِ نانا جاں میں

بزرگ اعلیٰ جو مولانا علی ہیں
لہوجن کا ہے سب رگ ہائے جاں میں

دعا کے ساتھ یہ فرما رہے ہیں
مسرت کی بہارِ جاوداں میں

تعجب کیا اگر اللہ چاہے
یہ بچہ مجھ سے بڑھ جائے جہاں میں

تجھے مرحبا ہے تجھے آفریں ہے

صبا تیرا انداز کتنا حسیں ہے
تو ہی رنگ و آہنگِ روئے زمیں ہے
تو ہی قوتِ جسم و جانِ حزیں ہے
تجھی سے انگوٹھی تجھی سے نگیں ہے
دل مضمحل تیرا ہی خوشہ چیں ہے
تجھی سے یہ ماحول خندہ جبیں ہے
تُو آئی تو ہر برگِ گل نازنیں ہے
نہ آتی تو ہر پھول اندوہگیں ہے
ترے لب پہ جو مژدۂ دل نشیں ہے
تجھے مرحبا ہے تجھے آفریں ہے
ادھر آ ترا منہ مٹھائی سے بھردوں
کہ تیری جزا شیری وشکریں ہے
کھلا ہے چمن میں گلاب ایک تازہ
ہر اِک گل جسے دیکھ کر شرمگیں ہے
عجب اس کی خوشبو عجب رنگ اس کا
عجب گلبدن ہے عجب نازنیں ہے
خبر ہی میں وہ مطلعِ جانفزا ہے
معطر مکاں ہے معطر مکیں ہے
خدا کی امانت ہے جعفر کے گھر میں
امین احمد اب سارے گھر کا امیں ہے
رشید اور رابع کی روشن ہیں آنکھیں
کہ قبلہ کا یہ دوسرا جانشیں ہے
بفضل خدا پہلوئے ہاجرہ میں
خلیل ایک طرف ایک جانب امیں ہے

یہ نظم حسیں لکھ کے لایا ہوں طارقؔ
ملے گا کچھ انعام مجھ کو یقیں ہے

قطعہ برائے علی حیدر نیّؔر مرحوم

سخت ہے تعمیلِ حکمِ دوستاں میرے لیے
تم نے کیوں تکلیف کی اے مہرباں میرے لیے

یہ نویدِ ہمّت افزائی بنام شاعراں
بن گیا پیغام مرگِ ناگہاں میرے لیے

میں کہاں ہوں درخورِ لطف و سزاوار کرم
کررہے ہو اپنے موتی رائیگاں میرے لیے

اب نہیں وہ دن کہ ہوں گے باعثِ تحریک شوق
نکہتِ باغ و ہوائے گلستاں میرے لیے

سبزۂ کہسار کی لرزش ہے تصویرِ سکوت
ساز بے آواز جوئے نغمہ خواں میرے لیے

آبشاروں کے ترنّم پر یہ ہوتا ہے گماں
کوئی دوشیزہ ہے سرگرمِ فغاں میرے لیے

وقت نے کچھ ایسا بدلا ہے مرا اندازِ فکر
دیدۂ نرگس ہے چشمِ خوں فشاں میرے لیے

مختصر یہ عرض کرنا ہے کہ اب دُشوار ہے
شرکت بزمِ ادب اے مہرباں میرے لیے

یہ مشاغل اور یہ تعلیم کی مصروفیت
کھولتے جاتے ہیں راہِ امتحاں میرے لیے

کیا ضرورت ہے کہ باتوں کو زیادہ طول دوں
اتنی ہی کافی ہے شرحِ داستاں میرے لیے

دل میں جو آیا وہ لکھ بیٹھا قلم برداشتہ
گرچہ یہ قدرت بظاہر تھی گراں میرے لیے

صابر آروی

کیا تھے ہم اور ہوگئے کیا ہم
دیکھے ساری محفل دیکھے

ہم بھی پھرتے تھے زُلفوں میں شکن ڈالے، ہم بھی البیلے، ہم بھی رہے ہریالے، ہمارا بھی کبھی پھولوں میں بسیرا تھا، گلزار میں ڈیرا تھا، ریشمی شیروانی اور لیس کی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ جوان ہوئے تو اَدّھی ململ کا کُرتہ، پانچ پی کا پاجامہ، ترکی ٹوپی، کلائی پر گھڑی باندھے، شیروانی اوپر سے پہنی تو سنہری زنجیر کے ساتھ گھڑی شیروانی کی جیب میں ڈالے۔ عید آتی، بقرعید آتی، شبِ برات آتی، رمضان آتا، محرم آتا، یہی سب موسم تھے۔ زندگی میں رنگ آنے کے یا رنگ بدلنے کے۔ سوئیاں اور مٹھائیاں عید میں، گریل اور کباب عید میں، شربتوں کے گلاس اور پھلکیوں کی تشتریاں رمضان میں، حلوہ اور کچوریاں شبِ برات میں، بن دھنیا اور توشے کی روٹیاں محرم میں۔ لیکن نیا سال کی آمد کدھر ہوتی، کدھر روانگی ہوتی۔ کوئی جان نہ پہچان، خط لکھا گیا تو جو تاریخ ہوئی ہجری یا عیسوی لکھ دی گئی۔ نئے سال کی تہنیت اور خوش خبریوں سے کبھی کان آشنا ہی نہیں۔ پھر دن بدل گئے۔ شیروانی ترکی ٹوپی جیب گھڑی بھی گئی، اَدّھی ململ کا کُرتہ، پانچ پی کا پاجامہ، گلاسکٹ اور وارنش کا پمپ بھی گیا۔ سویّوں میں وہ مزا نہ رہا، کباب و گریل کا ذائقہ بھول گئے۔ شبِ برات کے حلوے اور کچوریوں کا دَور چلا گیا۔ بہار کدھر آتی ہے، غنچے کس وقت کھلتے ہیں، نہ باغ رہا نہ بہار رہی۔ نیا سال پرانے سال سے جان پہچان نہ پہلے نہ اب رہی۔

ایسے میں بھائی صابر آروی صاحب کی نئے سال کی مبارک بادی، پھولوں کی شگفتگی، بلبل کی دل بستگی کی خبر لے کر آئی تو کانوں سنی اور آنکھوں دیکھی بات نہ لگی۔ نئی بات لگی اور ہم نئی باتوں کے عادی نہیں کہ نئی باتیں کھاد والے گیہوں کے آٹے سے بنی اور ڈالڈا میں چھنی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہم لوگ دیسی انڈے کھانے والے اور خالص گھی میں نوش کرنے والے ادھر کیا

دیکھیں۔سب کے چھوٹ جانے کے غم سے دل ٹوٹ چکا۔سب پہلی کرامات بھول گئے تو نئے سال کی مبارک بادی سمجھنے اور محسوس کرنے سے بھی محروم رہ گئے۔تو صابر بھائی کو اپنے بدقسمتی کا حال لکھ کر بھیج دیا کہ کسی قدردان کے پاس بھیجتے تو آنکھوں سے لگاتا، کلیجے سےساٹتا۔ہم تو کچھ نہ کر سکے، کام نہ کاج کے دُشمن اناج کے رہ گئے۔

صابر آروی

بھائی صابر کو ملے بندۂ عاجزؔ کا سلام

میں تو دس روز پہ دہلی سے ابھی آیا ہوں
تھک گیا ہوں ابھی آرام نہ لے پایا ہوں
شکریہ پہلے ادا کرلوں تو پھرلوں آرام
شکریہ آپ کا اور آپ کی فنکاری کا

سال نو کی ملی منظور مبارک بادی
جس نے اس دور میں یہ بات مجھے سمجھا دی
دُور اب بھی ہے خیالوں کی چمن کاری کا
ہم تو سب حسن چمن رنگِ چمن بھول گئے

لالہ ونسترن وطوطی وبلبل کا بیاں یاد نہیں
قمری و طوطی و بلبل کی زباں یاد نہیں
درد کے ماسوا سب طرزِ سخن بھول گئے
غمِ دوراں غمِ دل سے مرا اب حال ہے یہ

آپ کی نظم اگر یاد دلاتی نہ مجھے
گوشۂ غم سے اگر کھینچ کے لاتی نہ مجھے

مجھ کو معلوم نہ ہوتا کہ نیا سال ہے یہ

ہری مہتاب

میں ٹرین کے سفر میں کہیں جاتے ہوئے یا کہیں سفر سے واپس ہوتے ہوئے پٹنہ جنکشن کے پل کی سیڑھیاں اُتر رہا تھا کہ سامنے ایک شخص نے مسکراتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مصافحہ کرتے ہوئے کہا:

راہ میں اُن سے ملاقات ہوئی   جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی

بلند و بالا سُرخ وسفید، سیاہ سجے ہوئے بال کلین شیو۔ بہت موزوں خط وخال سنہرے سوٹ پر سُرخ ٹائی لگائے ہوئے، چست بدن، سیاہ چشمہ زبان بے ساختہ اور بے تکلف لہجہ گرم جوشی سے مصافحہ کا ہاتھ ہلاتے ہوئے اس نے جو شعر پڑھا تو میری آنکھ پھٹ گئی۔ ایسا با محل شعر پڑھنے والا مجھے کم یاد تھا۔ کم از کم اس وقت تو یاد نہ آیا۔ مولانا میرا نام ہری مہتا ہے۔ میں ڈائریکٹر ڈیفنس اِکاؤنٹ ہوں۔ آپ کا عاشق ہوں۔ چند ماہ سے میری پوسٹنگ پٹنہ میں ہے۔ ملنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ آج اس وقت بے بہانہ آپ مجھے مل گئے اور واقعی میں اس سے مل گیا اور وہ مجھے مل گیا۔ ہری مہتا سے ربط وتعارف بہت مختصر رہا۔ شاید برس ڈیڑھ برس یا دو برس مجھے بخوبی یاد نہیں کہ وہ شخص کتنے دن اس کے بعد زندہ رہا۔ مختصر یہ ہے کہ مجھے یاد ہے وہ اس ملاقات کے بعد بہت مختصر زندہ رہا۔ بس اتنا یاد ہے کہ شاید دو یا تین بار وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ اور شاید دو ایک بار کہیں اور محفلوں میں ملاقات ہوئی ہو۔ جب وہ مجھے اپنے گھر لے گئے تو ایسے لے گئے جیسے میں ان کا پیر ہوں، ان کا گرو ہوں، ان کا آئیڈیل ہوں، ان کا مرشد ہوں۔ میں جب ان کی بھیجی ہوئی کار سے ان کے بنگلے پر پہنچا تو وہ دوڑ کر کار کا گیٹ کھولتے۔ مصافحہ سے پہلے وہ جھک کر میرا پاؤں چھونا چاہتے، میں ان کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ پھر وہ دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ پکڑ لیتے اور کیا بولتے ہیں دُہرا نہیں سکتا، یاد بھی نہیں اور جو یاد ہے وہ دہرانے کے قابل نہیں۔ ان کے گھر میں جیوند سنگھ ہوتے جو پولیس کمشنر تھے جن سے میری پرانی ملاقات تھی وہ سبھی میرے معتقدوں میں تھے۔ پریتم سنگھ کوہلی، کمشنر آب پاشی اور ایک شخص وہ بھی پنجابی اور کچھ دنوں تک پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر

رہے تھے، پھر گورنمنٹ کے کسی محکمے کے سکریٹری تھے اور چوتھے جو مجھے یاد ہیں وہ شاہ مشتاق احمد صاحب سکریٹری، اُردو اِکادمی اور مسٹر محمد یونس صاحب جو کمشنر کمرشیل ٹیکس تھے بعد میں وہ بھی اُردو اکیڈمی کے سکریٹری ہوئے بس آٹھ دس بارہ احباب کی مجلس ہوتی کھانا ہوتا۔ کھانا بہت سادہ۔ وہ بہت سادہ کھانا کھاتے اور سادہ ہی کھانا کھلاتے اور پھر جم کر محفل میں بیٹھتے۔ مجھ سے دو یا تین غزلیں سنتے اور پھر مجھے روک دیتے کہ بس کلیم صاحب بس اس سے زیادہ کا مجھے تحمل ہے نہ آپ کو اس سے زیادہ پڑھنے کا متحمل سمجھتا ہوں اور پھر ان کی باتیں ہوتیں اور ان باتوں کا زیادہ حصّہ میں ہوتا یا میری شاعری ہوتی۔ وہ بات تول کر نہیں بولتے بے ساختہ بولتے بے تکلف بولتے ایسا لگتا جیسے دیوانگی کی حد کو پہنچ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا اس شخص کے دل میں کچھ دنیا ہے ہی نہیں۔ وہ دنیا سے بے نیاز ہے۔ یہ شخص صرف محبت کرنا چاہتا ہے اور کچھ نہیں چاہتا۔ اس کی گفتگو میں گرم جوشی اُبھر اُبھر کر آتی۔ دردمندی محبت بےغرضی اور اخلاق کا سیلاب اس کی گفتگو میں کروٹیں لیتا۔ وہ شخص ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شاید بیرونی ڈگری بھی تھی۔ ایک نہایت اہم اور نازک سرکاری محکمے کا ڈائریکٹر اعلیٰ افسر۔ گفتگو میں معلوم ہوتا جیسے ابھی بولنا سیکھ رہا ہے جس سے سیکھ رہا ہے اس سے بہت پیار ہے۔ اس مجلس میں سب سے اعلیٰ انداز میں گفتگو کرنے والے جیونند سنگھ ہوتے۔ وہ پہلے کلکٹر پٹنہ تھے جن سے میری ملاقات شروع ہوئی، پھر وہ شاید کمشنر ہوئے۔ پھر وہ گورنر بہار کے ... سکریٹری ہوئے پھر پبلک سروس کمیشن کے باوقار ممبر۔ اُردو اور فارسی کا اتنا ذوق تھا۔ فارسی اشعار بھی ویسے ہی بے ساختہ پڑھتے جیسے اُردو کے۔ گفتگو میں بہت ٹھہراؤ، ٹھہراؤ کے ساتھ چاشنی جو کسی پنجابی میں میں نے نہیں دیکھی تو ہری مہتا گفتگو میں بھی دیوانگی کی کیفیت رکھتے تھے۔ اور شعر بھی بے ساختہ دیوانگی کے انداز میں پڑھتے۔ وہ خود شاعر تھے اور بہت اچھا کہتے تھے مگر کم کہتے تھے۔ میں ان کی شاعری سے متاثر مگر بہت زیادہ ان کی زندگی اور ان کے کردار سے متاثر ہوا۔ وہ شخص جلد ہی مر گیا۔ شاید دنیا کا ظرف اس کے لیے بہت تنگ تھا۔ وہ جوانی میں مرا اور اپنی جوان یاد میرے دل میں چھوڑ گیا۔ ایسے لوگ بجلی کی کوند کی طرح سامنے آتے ہیں، نہ کچھ سمجھاتے ہیں نہ سمجھنے کا موقع دیتے ہیں۔ حیرت زدہ رکھتے ہیں اور حیراں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ کہاں مرے مجھے یاد نہیں۔ اور پٹنہ والے ایسے بھولے کہ ان کا نام میں نے پھر کسی زبان سے نہیں سنا:

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار　　　اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ھری مھتا

چاندنی رات ہے مئے جام ہری مہتا ہیں
عاشقِ بادۂ گلفام ہری مہتا ہیں

پھولوں کے حسن کی مستی ہے غزل میں ان کی
رنگ اور خوشبو کا پیغام ہری مہتا ہیں

اُن کے ہر شعر میں ہے دل کے دھڑکنے کی صدا
دردمندوں کے دلآرام ہری مہتا ہیں

ان کا دل جلتا ہے ہر گھر میں چراغوں کی طرح
روشنیِ صحن و درو بام ہری مہتا ہیں

آنکھ والا ہے وہ جس نے انھیں پہچان لیا
یوں تو ہر وقت سرِ عام ہری مہتا ہیں

کیوں ہیں انسانوں کے دل آج خوشی سے محروم
اسی غم میں سحر و شام ہری مہتا ہیں

بے غرض ہو کے یہ کرتے ہیں محبت سب سے
یعنی اِک عاشق ناکام ہری مہتا ہیں

جو بھی ہو پیاسا لگا سکتا ہے ہونٹوں سے انھیں
پیار کا ایک بھرا جام ہری مہتا ہیں

ان کو سن کر کوئی بے درد نہیں رہ سکتا
درد اور سوز کا پیغام ہری مہتا ہیں

آنکھ والے تو بٹھاتے ہیں سر آنکھوں پہ انھیں
اندھے لوگوں ہی میں بدنام ہری مہتا ہیں

وقت کا ہاتھ انھیں انعام بھلا کیا دے گا
وقت کو خود ہی اِک انعام ہری مہتا ہیں

گو بہار اُردو اکیڈمی نے نوازا ہے انھیں
پہلے ہی سے بلند انجام ہری مہتا ہیں

زاہدہ

۱۹۳۸ء میں نئے قائم شدہ مسلم اسکول میں آٹھویں کلاس میں میرا داخلہ ہوا۔ پانچ ماہ بعد سالانہ امتحان ہوا۔ تو میرے پرچے اتنے اچھے تھے کہ میرا آگے داخلہ نویں کلاس کی بجائے دسویں کلاس میں ہوا اور ایک سال بعد ۱۹۴۰ء میں میٹرک کا امتحان ہوا تو پورے صوبے میں میری پانچویں پوزیشن آئی۔ پچیس روپے کی اسکالرشپ ملی اور میں پٹنہ کالج میں آئی اے پہلے سال کا طالب علم بن گیا۔ چند دن بعد بیمار ہو گیا۔ صحت مند نہیں ہوا تھا کہ باپ بیمار ہوا۔ اور بارہ ماہ کی علالت کے بعد باپ نے اللہ میاں کے یہاں سدھارا۔ ایک سال کے اندر ماں نے رودھوکر مجھے راضی کیا اور شادی کر دی۔ پٹنہ کالج چھوٹا۔ ایک بھائی دق میں مبتلا ہوا۔ تین سال مختلف مقامات پر علاج کے لیے پھرا۔ ۱۹۴۶ء کے اگست میں وہ بھی سدھار گیا۔ اور ۵؍نومبر ۱۹۴۶ء کو زمین پھٹ گئی، آسمان ریزہ ریزہ ہو گیا۔ پاؤں کے نیچے سے زمین بھی نکل گئی۔ خدا جانے میں زمین میں دھنسایا باد تند و تیز کے حوالے ہوا۔ مشرق مغرب، شمال وجنوب ہر طرف اندھیرا۔ چھوٹے بھائی اور بیوی کا ہاتھ پکڑے پکڑے ڈوبنے سے بہنے سے بچا تو ایک چھوٹی سی دُکان کر لی۔ ایک بچے اور ایک بچی کا باپ بن گیا۔ ۲۸؍سال کی عمر ہو گئی۔ ایک بزرگ نے طعن کی۔ بارہ سال میٹرک کیے ہو گئے تھے۔ اسی وقت اٹھا بی ان کالج گیا۔ آئی. اے کا پرائیویٹ امتحان دینے کا ارادہ کر لیا۔ ایک کالج سے پرائیویٹ امتحان آئی اے کا دیا۔ فرسٹ کلاس نمبر آ گیا۔ بی. اے آنرس اُردو میں داخلہ ہو گیا۔ بی. اے آنرس کیا تو کنووکیشن میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گورنر بہار یکے بعد دیگرے تین گولڈ میڈل دینے کو کھڑے رہے۔ بی. اے آنرس فرسٹ کلاس فرسٹ گولڈ۔ ذاکر صاحب نے میڈل دے کر ہاتھ ملایا اور پیٹھ ٹھونکی۔ آواز آئی اُردو کمپوزیشن میں فرسٹ ہونے گولڈ میڈل، ذاکر صاحب نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے مبارک باد دی۔ پھر اعلان ہوا۔ بی. ان. کالج کی تاریخ میں پہلے ٹاپر کو پرنسپل کالج کی طرف سے عوامی گولڈ میڈل۔ ذاکر صاحب نے مصافحہ سے پہلے گلے لپٹا لیا۔ میڈل دے کر کئی بار پیٹھ ٹھونکی۔ یونیورسٹی

نے ساٹھ روپے اسکالرشپ دی۔ پٹنہ یونیوسٹی کے ایم۔اے سال اوّل میں داخلہ لیا۔ اور دس طالب علم اور ایک طالبہ زاہدہ۔ ہمارے کلاس کی ساتھی۔ سبھی برگزیدہ لوگ تھے۔ خانقاہی تھے۔ مرتاض الدین، مظفر اقبالؔ، سعید رضا گوہر، خالد رشید صبا وغیرہ وغیرہ میں ایک حسین طالبہ مجلس کا چراغ ثابت ہوئی۔ ہمارے سب ساتھی بزرگی خانقاہیت اور تقدس کے باوجود کبھی کبھی رگ مذاق پھڑک جاتی۔ جس کا اظہار نہ ہونے پاتا کہ طالبہ زاہدہ اس قدر سنجیدہ، اتنی خاموش، اتنی کم آمیز کہ سر جھکائے آتی سرتا پا سیاہ برقعہ میں ملبوس گونقاب اُٹھی ہوئی، مگر پیشانی سے ڈوپٹّہ کا آنچل ایک کان کو چھپاتا ہوا ٹھوڑی کو پوشیدہ کرتا ہوا دوسرے کان کو غرق حجاب کرتا ہوا پیشانی پر بندھ جاتا۔ آنکھوں پر سنہری کمانی میں دبیز شیشے کی عینک۔ نہ کسی سے سلام نہ کلام، نہ مخاطبت۔ بس آنکھوں جھکائے آئی آنکھیں جھکائے بیٹھی اور آنکھیں جھکائے کلاس سے رخصت ہوجاتی۔ ساتھیوں نے زاہدہ کا نام تعزیہ رکھ دیا اور مرتاض الدین کبھی کبھی تنگ آکر بول پڑتے کلیم بھائی آپ محرم کے سپر ہیں اور بی زاہدہ موم کا تعزیہ۔ بس آپ ہی دونوں کلاس میں رہیے تو اچھا ہے۔ ہم لوگ کا تو دم گھٹتا ہے۔ ہم لوگ سے اوپر سال ششم میں پانچ چھ لڑکیاں تھیں۔ شاید انیس فاطمہ صاحبہ ساری اور چادر میں رہتیں مگر تمام لڑکیاں برقعہ میں رہنے کے باوجود تڑاق پڑاق۔ لکچر کے شروع سے پہلے کلاس میں کہرام ہوتا۔ ہنگامہ ہوتا لیکن ہمارے کلاس میں قرآن خوانی کا عالم رہتا۔ سب خاموش زاہدہ سے سب ناراض رہتے لیکن سب مرعوب رہتے۔

ایک دن ساتھیوں نے مجھے نرغے میں لے لیا۔ کلیمؔ بھائی آپ کو ایک نظم لکھنی ہے۔ ہمارے جذبات کی ترجمانی کرنی ہے۔ کم از کم وہ نظم کے اشعار ہم زاہدہ کو مخالب کر کے پڑھیں گے تو ہمارے دل کا غبار نکلے گا ورنہ ہم لوگ تو دامن پھاڑ کر کلاس سے نکل بھاگنا چاہتے ہیں۔ میں انکار کرتا رہا مگر اِصرار اس قدر رہا کہ مجھے چند اشعار فی البدیہہ کہنے پڑے۔ اچھے کاغذ پر کتابت ہوئی اور مرتاض الدین کے حوالے ہوئی کہ یہ کلاس میں سب کے سامنے زاہدہ کو مخاطب کر کے پڑھے جائیں گے، مگر جناب نظم مدتوں مرتاض الدین کی جیب میں پڑی رہی۔ زاہدہ آتی رہی جاتی رہی۔ یہ چھوٹی سی نظم۔ یہ چند اشعار نہ پڑھے جاسکے نہ زاہدہ کو سنائے جاسکے۔ سب کی رگ مذاق مردہ ہوتی گئی۔ زاہدہ کا رُعب چھایا رہا اور سب کے دست و پا ٹھنڈے رہے:

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا

غالبؔ کے ساتھ بھی نہ ہوا اور زاہدہ کے ساتھ بھی نہیں ہوا۔ ہم لوگ سال پنجم سے سال ششم میں آئے وہ بھی ختم ہوا۔ ساتھی اپنا بوریہ بستر لے لے کر رخصت ہوئے۔ اشعار کہاں جیب میں پڑے رہے۔ زاہدہ پٹنہ گورنمنٹ گرلس اسکول میں ٹیچر تھی۔ زاہدہ میری طرف سے گزرتی۔ کبھی کبھی میری بیوی سے ملنے چلی آتی۔ باتیں کرتی رہتی۔ کبھی کبھی کوئی سوال مجھ سے کردیتی۔ کبھی کوئی کتاب مانگ لیتی۔ واپس کرنے آجاتی۔ امتحان کے بعد وہ آئی تو میں نے یہ اشعار اس کے حوالے کیے کہ دیکھو ہمارے ساتھیوں نے تمھارے متعلّق ہم سے کیا لکھوایا ہے۔ اور کس کسمپری میں ان کے دو سال گزرے ہیں۔ زاہدہ مسکرائی اور پُرزہ لے کر چلی گئی۔
زاہدہ کی آگے کی مختصر داستان میں نے اپنی کتاب 'ابھی سن لو مجھ سے' میں لکھی ہے۔

زاہدہ

زُلفیں سنوارے مانگ پر افشاں کیے ہوئے
ہر گوشۂ جبیں کو درخشاں کیے ہوئے

اَبرو میں ہلکے ہلکے خم و پیچ ڈال کے
اِک انتشارِ ذہن نمایاں کیے ہوئے

سرمے کی ہلکی ہلکی لکیروں کے درمیاں
آنکھوں کو رشکِ چشمِ غزالاں کیے ہوئے

عینک کی دونوں سمت سنہری کمانیاں
قوس و قزح کا رنگ نمایاں کیے ہوئے

سنجیدہ ہونٹوں پر ہے تبسّم خفیف سا
پھولوں کی پنکھڑی کو پشیماں کیے ہوئے

اپنے گلے میں اپنا دوپٹّہ لپیٹ کر
پھانسی کا سب کے واسطے ساماں کیے ہوئے

آرائشِ لباس و تجلّیِ جسم کو
اِک برقعۂ سیاہ میں پنہاں کیے ہوئے

یوں پھر رہے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہیں

کیا دوں تم کو

پھلواری شریف ضلع پٹنہ اور یمن ڈیہہ ضلع اورنگ آباد کی مشترک شہریت رکھنے والے سیّد حسن عسکری طارقؔ جو میری جوانی کے دوست ہیں۔ میرے تبلیغی نقل وحرکت کے معاون اور شغل شعروادب سے متاثر ہیں۔ کچھ دنوں مرکزی حکومت میں ٹیلی فون انجینئر رہ کر اب مستقل طور پر حجازِ مقدس میں اسی عہدہ پر معمور ہو کر سبکدوش ہوئے ہیں اور وہیں بود و باش کے خواہش مند ہیں اور مقیم ہیں۔ ان کی شریکِ حیات خالدہ میری منہ بولی بہن، میری میز بان، میری محافظ، میری دنیا اور عاقبت کی خیر خواہ، میری صحت کے لیے دُعا گو اور نجات کے لیے خدا سے عرض گزار، میرے شعروغزل کی پرستار ہے۔ بیسویں صدی کی ساتویں دہائی سے الحمدللہ مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پڑوسن ہیں۔ دونوں میاں بیوی الحمدللہ پانچوں نمازوں میں حاضر دربار اور عبادت گزار ہیں۔ میرا قیام شہر نبویؐ میں انھیں کے یہاں رہتا ہے۔ انھیں کی معیت میں میری حاضری بھی ہو جاتی ہے۔ جاتا ہوں تو ہنستا ہوا جاتا ہوں۔ آنے کا وقت ہوتا ہے تو روتا ہوا آتا ہوں۔ کچھ دے تو نہیں سکتا جتنا مقدور ہوتا ہے یا جتنا ظرف ہوتا ہے، دامن بھر کر ہی لاتا ہوں۔ گزشتہ کسی سال آتے ہوئے یہ چھوٹی سی نظم میں ہدیہ کر کے آیا۔

کیا دوں تم کو

خالدہ ، میں نے بہت سوچا کہ کیا دوں تم کو
باغ دوں تم کو بہاروں کی فضا دوں تم کو

بوئے گل، شاخِ سمن ، برگِ حنا دوں تم کو
عطر میں ڈوبی ہوئی بادِ صبا دوں تم کو

چاند دوں چودھویں کا، رات اندھیری ہوا اگر
دُھوپ ہو تیز تو ساون کی گھٹا تم کو

ہاتھ افسوس سے ملتے ہوئے پھر سوچتا ہوں
یہ تو مجھ کو بھی میسر نہیں کیا دوں تم کو

کچھ وفا کا بھی سبق سیکھا ہے میں نے لیکن
خود وفادار ہو ، کیا درسِ وفا دوں تم کو

سب دعا والوں کے آقا کی پڑوسن ہو تم
خود دُعا خواہ ہوں تم سے، کہ دعا دوں تم کو

کچھ بڑائی نہیں مجھ میں میں بڑا بھائی سہی
ڈھول کا پول ہوں چاہو تو دِکھا دوں تم کو

نہ بزرگی نہ تقدس نہ عقیدہ نہ عمل
لوگ دھوکے میں پڑے ہیں یہ بتا دوں تم کو

ہاں غم و درد جواب تک کی کمائی ہے مری
اس کو رہنے دوں میں اپنے لیے یا دوں تم کو؟

پھر تو دو کوڑی میں بھی کوئی نہ پوچھے گا مجھے
خالدہ اس لیے کہتا ہوں کہ کیا دوں تم کو

اور ناخوش تمھیں کر دوں یہ نہیں تاب مجھے
آؤ ،اِک تازہ غزل اپنی سنا دوں تم کو

پلا ساقی کہ موسم ولولہ انگیز ہے ساقی

ڈی سی ایم دہلی کلاتھ ملس کے مالک لالہ سری رام کے دو صاحبزادے لالہ مرلی دھر شادؔ (دوسرے کا نام بھول رہا ہوں) علامہ بیخود دہلوی جانشین داغؔ کے شاگرد تھے۔ ان دونوں صاحبزادوں کے مرجانے کے بعد دہلی کلاتھ ملس نے ان کے نام پر ایک ٹرسٹ قائم کیا۔ وہ ٹرسٹ علاوہ اور دوسرے کاموں کے ہر سال ایک شاندار مشاعرہ کرتی تھی۔ جس میں ہندوستان اور بعد میں پاکستان کے بھی نامور شاعروں کو مدعو کرتی تھی۔ دہلی کلاتھ ملس کا مشاعرہ ہندوستان کی ادبی تاریخ کا ایک نہایت شاندار باب تھا۔ اس کے اہتمام کے متعلق تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ ہر سال مشاعرہ کے ختم ہونے کے بعد ہی دوسرے سال کے مشاعرہ کی تیاری شروع ہوجاتی تھی۔ اندازہ ہوسکتا ہے کہ جس کی تیاری پورے سال کی جاتی ہو وہ کس نوعیت کا، کس معیار کا مشاعرہ ہوگا۔ ایک معمولی سی بات یہ کہہ دوں کہ دوران مشاعرہ اگر کسی فرد نے کوئی تہذیب سے گری ہوئی کوئی بات کوئی جملہ ہوٹنگ کی زبان سے نکالا تو اسے مشاعرے کے منتظمین فوراً لکھ لیتے تھے۔ اور بعد مشاعرہ اس بات کی تحقیق کرتے تھے کہ جس مقام سے یہ ہوٹنگ ہوئی تھی اس مقام پر کہاں کے لوگ مدعو تھے۔ اس کی تحقیق کی جاتی پھر ان مدعوئین سے مل کر اس کی تحقیق ہوتی کہ یہ حرکت کس نے کی تھی۔ اس کے بعد اس کا نام مدعوئین کی فہرست سے خارج کردیا جاتا تھا۔ میں ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۵ء تک ہر سال اس میں شریک ہوا۔

۱۹۶۹ء کا مشاعرہ تھا۔ شاید یہ یومِ غالبؔ یا یومِ اقبالؔ کا مشاعرہ تھا۔ پانچ سات ہزار دہلی کے پڑھے لکھے عوام کی کرسیوں کے بعد پانچ چھ سو صوفوں پر مرکزی اور صوبائی حکومت کے وزرا اور حکام اس کے بعد تقریباً ۳۰×۲۰ فٹ کے فوم کے گدوں کا فرش اس پر مراد آباد، میرٹھ، سہارنپور، مظفر نگر، علی گڑھ کے منتخب سخن فہم، سخن شناس اور سخن آشنا مدعو رہتے تھے۔ اس کے بعد تقریباً ۲۰×۲۰ فٹ کے اسٹیج پر دہلی، بمبئی، یوپی، حیدرآباد کے تقریباً ۲۰ شعرا۔ تو یومِ اقبالؔ یا یومِ غالبؔ کے اس مشاعرہ میں ہم شعرا کے درمیان کوئی تیس چالیس سال کا ایک شخص پینٹ اور بش

شرٹ میں ملبوس آ کر بیٹھ گیا اور منتظمین مشاعرہ کی اجازت کے بعد گفتگو شروع کر دی۔ وہ تقریر تھی مگر مجھے ایسا لگا کہ تقریر خطابت اور شاعری کو بالکل بے تکلّف انداز میں شہد میں گھول کر صرف دو گھونٹ پلا دیا۔ دس منٹ میں گفتگو ختم ہو گئی اور ہم لوگوں کی زبان پر شہد کا ذائقہ رہ گیا۔ یہ شخص مسٹر اِندر کمار گجرال تھے جو اس وقت کسی سرکاری محکمے میں بڑے آفیسر تھے۔ پھر سب نے غزلیں نظمیں سنائیں۔ میں نے بھی غزل پڑھی۔ جس طرح مجھے اس شخص کی تقریر شہد آمیز گھونٹ لگی اس شخص کو میری غزل میں شیر و شکر آمیز ایک بہت درد انگیز کہانی لگی۔ اور پھر ہم دونوں دوست بن گئے۔ روٹری کلب جیمس فورڈ کلب وغیرہ میں وہ میری غزل سنتا رہا اور میں اس کی تقریر سنتا رہا۔ ۱۹۷۱ء میں اِندرا گاندھی کی ترتیب داداہ اُردو کمیشن کا سربراہ بن کر وہ پٹنہ آیا تو بی. اِن کالج کے سالانہ مشاعرہ کی صدارت کی اور میں نے مشرقی پاکستان کی طرف سے آنجہانی میڈم کو مخاطب کر کے غزل پڑھ دی:

واللہ کس غضب کے ہو ہنس مکھ دکھائے جاؤ ۔۔۔ ہم آہ آہ کرتے ہیں تم مسکراتے جاؤ
ہم تو غزل کے پھول کھلاتے ہی جائیں گے ۔۔۔ تم جانتے ہو زخم لگانا لگائے جاؤ
فنکار تم ستم کے ہو ہم شاعرِ وفا ۔۔۔ ہم اپنی گائے جائیں تم اپنی سنائے جاؤ
میرے فسانے پر ہے تمھارا ہی اختیار ۔۔۔ جو بات چاہو اپنی طرف سے ملائے جاؤ
اہلِ وفا کے جلتے بدن سے رہو الگ ۔۔۔ ہم دُھوپ دُھوپ جاتے ہیں تم سائے سائے جاؤ
اپنوں کو ہم تو غیر تمھارے لیے بنائیں ۔۔۔ اور تم ہمارے غیر کو اپنا بنائے جاؤ
ہم ہیں اگر تو خونِ جگر کی کمی نہیں ۔۔۔ جتنے چراغ بزم میں چاہو جلائے جاؤ
آتی نہیں ہے آج تو کل آئے گی بہار ۔۔۔ غنچو خزاں کا غم نہ کرو مسکرائے جاؤ

وہ سن کے اَن سُنی جو کرے ہے کیا کرے
تم اے کلیم اپنی غزل گنگنائے جاؤ

اِندر کمار گجرال مبہوت ہو گئے۔ کچھ بولے نہیں مگر وہ میرے معتقد ہو گئے۔ پھر میرے پہلے مجموعہ غزل 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کا اجرا مرحوم صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد صاحب نے وگیان بھون نئی دہلی میں کیا تو وہ روس میں سفیر ہند کی حیثیت سے رسم اجرا کی اس مجلس میں شریک ہوئے۔ پھر ان سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ روس سے کئی خطوط آئے مگر کبھی ہم دونوں ایک جگہ نہیں ہوئے۔ وہ ہندوستان میں پاکستانی مہاجر تھے۔ جھیلم ندی کے اُس پار رہنے والے

گنگنا جمنا کی سرزمین پر آ گئے۔ پھر وہ ہندوستان کے وزیر اعظم ہوئے تو میں نے یہ نظم لکھی۔ اس نظم میں کچھ پرچھائیاں ان باتوں کی ملیں گی۔ یہ نظم میں نے انھیں ڈاک سے بھیج دی مگر اس کی کوئی رسید نہیں آئی۔ میں نے بھی پھر کچھ نہیں لکھا شاید وہ میری اس نظم سے محجوب ہوئے۔ وہ اس نظم کے شایانِ شان بننا چاہتے تھے۔ وہ بن نہ سکے تو خاموشی اختیار کر لی۔

پلا ساقی کہ موسم ولولہ انگیز ہے ساقی

بتا پھر آج کیوں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
ہوا کیوں اس قدر شیر و شکر آمیز ہے ساقی

یہ کس جانِ جہانِ آرزو کی آمد آمد ہے
یہ کس کی آرزو میں نبضِ محفل تیز ہے ساقی

مزاجِ وقت کی چلمن سے باہر کس نے جھانکا ہے
نقاب آزاد کس کا حسن آفت خیز ہے ساقی

یہ کس کے پیار کی مستی نے سب کو مست کر ڈالا
یہ کس کے پیرہن کی خوشبو اتنی تیز ہے ساقی

جسے گجرال کہتے ہیں وہ خود شاعر نہیں لیکن
مجسم شعر ہے اور شعر معنی خیز ہے ساقی

وہی اس شعرِ معنی خیز کو پہچان پائے گا
نظر باریک جس کی ذہن جس کا تیز ہے ساقی

کنارِ آب رودِ گنگا ہے گرچہ قیام اس کا
لہو میں اس کے جھیلم کا بھی آبِ تیز ہے ساقی

وہی جو آج ہے پیرِ مغاں ایوانِ دہلی کا
وہی لاہور کا اِک شہریِ نوخیز ہے ساقی

سنی ہے گفتگو اس کی اگرچہ گفتگو اس کی
نہ جوش آمیز ہے ساقی نہ شور انگیز ہے ساقی

دِلوں کو گرم دیتا ہے مستیِ محبت سے
زباں میں اس کی وہ آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

دِلوں کو جوڑ دینے کا ہنر معلوم ہے اس کو
ہر اِک سوکھی زمیں اس کے لیے زرخیز ہے ساقی

کمی آتی نہیں گرچہ بہت تقسیم کرتا ہے
ہمیشہ پیار سے اس کا سبو لبریز ہے ساقی

مرے دل کی تمنّا بار بار اٹھ اُٹھ کے کہتی ہے
بدل جائے یہ دُنیا کیا تعجب خیز ہے ساقی

اسی کے واسطے اقبالؔ نے شاید یہ فرمایا
”ذرا نم ہو تو یہ مٹّی بہت زرخیز ہے ساقی“

یہ اس کی ہمتِ مردانہ سے اُمید ہے مجھ کو
جلائے گا دِیا ہر چند طوفاں تیز ہے ساقی

خدا توفیق دے چاروں طرف وہ پھول برسا دے
زمانے کی ہوا گرچہ شرر انگیز ہے ساقی

دُعا کر دامن گجرال کے محفوظ رہنے کی
چمن میں ہر طرف کانٹوں کا ناخن تیز ہے ساقی

بھروسہ کر خدا پر چھیڑ سازِ آرزو اپنا
ترے ہی ہم بغل عاجزؔ بھی نغمہ ریز ہے ساقی

فضل احمد

(سینئر ایس پی فضل احمد صاحب کے تبادلہ کے موقع پر فخر الہدیٰ صاحب کی فرمائش پر لکھی گئی)

یوں تو بہت ہیں اپنی خاطر مسکرانے کے لیے
کچھ ہیں ایسے بھی جو ہنستے ہیں ہنسانے کے لیے

دوسروں کا درد دُکھ ہر ہر قدم رکھتے ہیں یاد
اپنا سب کچھ بھول جاتے ہیں زمانے کے لیے

اپنے بیگانے سے ہے یکساں تواضع کا سلوک
بڑھ کے جھک جاتے ہیں گرتوں کو اٹھانے کے لیے

بانٹتے رہتے ہیں اپنا خونِ دل خونِ جگر
سُرخ روئی ناتوانوں کی بڑھانے کے لیے

بے تامل کود پڑتے ہیں ہر اِک میدان میں
دوسروں کا بوجھ اپنے سر اُٹھانے کے لیے

جب مصیب کی کوئی تلوار اُٹھتی ہے کہیں
خود بڑھاتے ہیں وہ سینہ زخم کھانے کے لیے

بے تکلف بخش دیتے ہیں خود اپنا پیرہن
دُھوپ میں غیروں کے سر پر شامیانے کے لیے

ایک ایسا ہی نمونہ ایک ایسی ہی مثال
شخصیت ہے فضل احمد کی زمانے کے لیے

گفتگو جس کی ہے جادو خامشی جس کی سحر
دوست اور دُشمن کو دیوانہ بنانے کے لیے

واقعی تو فضل احمد فضل احمدؐ سے ہوا
اِک اضافہ آدمیت کے خزانے کے لیے

رنج بے شک ہے کہ تو شہر عظیم آباد سے
چھوڑ کر جاتا ہے ہم کو خاک اُڑانے کے لیے

ہم مگر خوش ہیں کہ لگ جائیں گے اس کو چار چاند
شمع یہ جاتی ہے جس آئینہ خانے کے لیے

سھرا

دیباچہ

شادیات میں سہرا لکھنے کا آغاز کب ہوا، یہ تحقیق تو میری نہیں ہے۔ میں تو بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ بہادرشاہ ظفرؔ نے اپنے بیٹے جواں بخت کی شادی میں غالبؔ سے فرمائش کردی کہ اس یومِ مسرت کے لیے کوئی چیز کہیے۔ غالبؔ نے سہرا لکھ دیا اور مقطع میں قلم فرسائی کردی کہ:

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بہتر سہرا

یقیناً غالبؔ سے چوک ہوئی۔ ان کی اَنا اُن کی زبان سے پھوٹ پڑی۔ ایک تو ایجاد کا فخر دوسرے اندازِ بیان کا غرور بہادرشاہ ظفر کو بھی یہ بات تیکھی لگی کہ یہ استاد ذوقؔ پر طنز ہے۔ بات ذوقؔ تک پہنچ گئی اور استاد نے قلم توڑ دیا۔ سہرا جم کر لکھا اور اس میں شک نہیں کہ خوب لکھا اور مقطع میں منہ توڑ بات کردی کہ:

جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

غالبؔ گھبرا گئے کہ ذوقؔ یعنی اپنے ہم صفیر سے بھی بگڑی اور بادشاہ سلامت بھی خفا ہوئے۔ جھٹ سے معذرت نامہ لکھ دیا:

مقصود ہے گزارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو سال سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
استادِ شہ سے ہو مجھے پُرخاش کا خیال — سرتاب ہے محال یہ ہمّت نہیں مجھے

مقطع میں آ گئی تھی سخن گسترانہ بات
منظور اس سے قطع محبت نہیں مجھے

بات کہنے کی نہیں مگر کہنی پڑتی ہے کہ غالبؔ کوتقلید سے بغض ہے۔ اُن کی اَنا کسی کی پیروی کرنے نہیں دیتی:

کیا فرض ہے کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

وہ کہتے ہیں کہ دہلی میں جسے دیکھو سر پر بابڑی رکھے اور داڑھی منڈوائے پھرتا ہے۔ ہم نے سر منڈا دیا اور داڑھی رکھ لی لیکن اپنے مفاد کے لیے وہ سب کچھ کر دیتے تھے۔ خیر یہ باتیں کہی ہوئی اور جانی ہوئی ہیں ان کا اعادہ غیر مناسب ہے تو سہرا غالبؔ وذوقؔ کے بعد بھی اپنا سفر کرتا رہا۔ مجھے اس سے بالکل دلچسپی نہیں رہی۔ میری بہنوں اور بھائی کی شادی جو مجھ سے پہلے ہوئی، کسی سے سہرا نہ لکھوایا گیا۔ گر چہ اس کا رواج دیہاتوں میں بھی تھا۔ خود میری شادی جو تیلہاڑہ میں ہوئی۔ میرے جوار کے ایک بزرگ اور رئیس امیر الدین صاحب امیرؔ شاگرد بدرؔ آروی نے سہرا لکھا۔ مجھے درمیان محفل بلوایا کہ مجھے سامنے بٹھا کر میرا سہرا پڑھیں، مگر میں محفل سے نکل گیا۔ انھوں نے سہرا پڑھا مگر میں نے نہیں سنا۔ پھر تو آسمان زمین سب ہی بدلے۔ پھولوں کا پیرہن تارتار ہو گیا۔ کانٹوں کا بستر لگا دیا گیا۔ جب میں نے یونیورسٹی میں تعلیم کا آغاز کیا تو میرے ہم درجہ ساتھیوں میں خالد رشید صبا بھی تھے۔ مولوی احمد نور صاحب ڈپٹی منسٹر کے صاحبزادے۔ خالد رشید اکثر اپنے ابّا کی ڈانٹ سے خفا ہو کر میرے یہاں آ جاتے۔ احمد محمد نور صاحب میرے یہاں آ جاتے۔ احمد محمد نور صاحب پھر ان کی تلاش میں نکلتے اور میری دُکان کی طرف بھی آتے اور دیکھتے کہ خالد رشید میرے بغل میں بیٹھے ہوئے ہیں تو سلام کر کے موٹر گھما کر چلے جاتے۔ پھر خالد کو ہم سمجھا بجھا کر انھیں گھر واپس کرتے۔ ان کی شادی ہونے لگی تو خالد رشید کا بھی اصرار رہا کہ میرے لیے سہرا لکھو اور نور صاحب نے بھی فرمائش کی۔ چنانچہ شاید زندگی کا پہلا سہرا میں نے خالد رشید کا سہرا لکھا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے کہیں سہرا پڑھا۔ دُھندلی سی یاد ہے کہ میں نے شاید خالد رشید کا سہرا پڑھا لیکن سہرے کی دُھوم ہو گئی اور پھر میرے اکثر ساتھیوں خلیل، ضیا وغیرہ نے فرمائش کر کے سہرا لکھوایا مگر پڑھوایا نہیں۔ مگر میرے سہرے کی دھوم ہو گئی۔ نغموں کی دھوم تو تھی ہی۔ میں جب غزل پڑھتا تھا تو یہی حال ہوتا تھا:

محفل میں اگر پڑھنے کو غزل عاجزؔ کسی سال آ جاتا ہے
کچھ تھام کے دل رہ جاتے ہیں کچھ لوگوں کو حال آ جاتا ہے

تو بات یوں ہوئی کہ میرے ایک بزرگ میری بستی تیلہاڑہ کے جوار اسلام پور کے رئیس شاہ کلو صاحب کے صاحبزادے شاید شہاب الدین نام ہے، بعد میں وہ سینئر افسر بھی ہوئے، کی شادی انور اسحاق صاحب فائنانس آفیسر پٹنہ یونیورسٹی کی صاحبزادی سے قرار پائی۔کلو صاحب بھی میری شاعری کے شیدا اور انور اصحاق صاحب بھی دلدادہ۔مگر میں سہرا لکھنے پر آمادہ نہ ہوا۔تو ان حضرات نے استادی جمیل مظہری کو پکڑا اور سہرے کی پُرزور فرمائش کی۔جمیل صاحب نے فرمایا۔اگر آپ لوگ کلیم عاجزؔ کو میرا سہرا پڑھنے پر آمادہ کریں تو میں سہرا لکھوں گا۔اب وہ قافلہ میرے پاس آیا۔اوّل تو جمیل صاحب میرے یونیورسٹی کے استاد پھر مجھ پر بہت مہربان بلکہ معتقد، ان کا لکھا ہوا سہرا، پڑھنے سے انکار کیسے کرسکتا تھا۔میں نے رضامندی دے دی۔بڑے پنڈال میں برأت کا قیام ہوا۔ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گورنر بہار اور شہر کے رؤسا اور اربابِ اقتدار کا مجمع تھا۔میں نے جمیل صاحب کا سہرا پڑھا۔استاد کا سہرا اور شاگرد کا نغمہ۔پورا پنڈال گونج اُٹھا۔احمد حسین رعنا رئیس و شاعر عظیم آباد، علی عباس ڈی آئی .جی .اور بہت سے بزرگ جھومتے جھامتے مسکراتے میرے پاس آئے اور کہا کلیم صاحب آپ نے یہ قدیم کلیہ آج غلط ثابت کردیا:

تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں

یعنی مصنف ہی اپنی تصنیف کو زیادہ بہتر بیان کرسکتا ہے۔تو سہرے کے سلسلے میں ایک چھوٹا سا واقعہ نوک قلم پر آ گیا۔مگر اس کے نتیجہ میں یہ مصیبت آئی کہ پٹنہ کے کسی پڑھے لکھے سربرآوردہ خاندان میں تقریب شادی قرار پائی اور میرے پاس قافلہ پہنچ گیا۔آپ سہرا لکھ دیجیے۔میں نے یہ چھوٹا سا جملہ 'سہرا لکھ دیجیے' کہا مگر یہ فرمائش کس کس عنوان سے اور کس کس انداز سے آتی تھی۔وہ ادب و شاعری الگ الگ انداز تھا اُسے بیان کرنا مشکل ہے اور وہ سب میرے بزرگ یا میرے بہترین دوست۔حاصل گفتگو یہ ہے کہ مجھے سہرا لکھنا ہی پڑا۔مگر پہلے یہ شرط میں منوالیتا کہ میں پڑھوں گا نہیں۔اور یہ بات مان لی جاتی۔سہرا لکھا جاتا اور وہ کس دھوم دھام سے کس اہتمام سے رنگین اور مرصع انداز میں لکھا جاتا اور پڑھوایا جاتا کہیں بلکہ اکثر پڑھنے

والا بہک جاتا مگر سہرا چمک جاتا۔ ہاں معاف کیجیے ایک بات غلط ہوگئی۔ میں نے ایک جگہ سہرا اور بھی پڑھا۔ میرے دوست اور میری کتاب 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کے پبلشر کہو، مؤلف کہو، مرتب کہو، مربی کہو، چھ ماہ اپنا کارخانہ چھوڑ کر جان ومال، دل، دماغ، جسم و روح سے اس کی طباعت میں لگ جانے والے شبیر بھائی اور فخر الدین بھائی۔ کمپنی کے مالک کی لڑکی کی شادی ہوئی اور مجھے سہرا لکھنے اور پڑھنے دونوں کی فرمائش ہوئی اور میں نے ردّوقدح کے بعد منظور بھی کرلیا۔ سہرا لکھا اور پڑھا۔ اس مجلس میں بہت سے اہل علم کے علاوہ پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد ڈاکٹر رنجن نرائن اوران کی پروفیسر بیوی بھی تھیں، میں ان کی بیوی کا نام بھول گیا۔ میں نے سہرا پڑھ کر ختم کیا تو رنجن کی بیوی کھڑی ہوگئی اور زور سے بولی کہ کلیم بھائی اگر آپ میرا سہرا لکھنے اور پڑھنے پر تیار ہوجائیں تو میں پھر شادی کرنے کو تیار ہوں۔ سہروں کا بھی وہی حال ہے۔ میرے پاس سب کی نقلیں نہیں رہیں۔ کاغذ پر لکھ کر دے دی گئیں۔ کچھ ڈائریوں میں نقل کی گئیں۔ زیادہ تر نقل ہونے سے رہ گئیں۔ جن کا پتہ ٹھکانہ کچھ یاد تھا۔ ان سے تقاضہ ہوا۔ کہیں سے ملیں۔ کہیں سے زیادہ اصرار ہونے کی وجہ سے دستیاب نہیں ہوسکیں۔ جو ملیں وہ بھی اتنی سی کہ شاید کسی شاعر نے آج تک نہ لکھی ہوں گی۔ مگر انھیں آپ غور سے پڑھیں تو اندازہ ہوگا کہ شعریت اور اندازِ بیان کی انفرادیت اس صنف میں بہت نمایاں ہے جو شاید کہیں نہ ملے گی۔ اچھا تو جتنا لکھ دیا اس سے بہت زیادہ سمجھئے گا۔ والسلام۔

سہرا

(ماسٹر ادریس صاحب مرحوم، مسلم ہائی اسکول، پٹنہ نے کسی کے لیے لکھوایا تھا)

تاروں سے کرن لے کے بنا لائے ہیں سہرا
فردوس کے پھولوں میں بسا لائے ہیں سہرا

سہرا تو زمانے میں سبھی باندھتے آئے
ہم سارے زمانے سے جدا لائے ہیں سہرا

مہکی ہوئی خوشبوئے وفا سے ہیں فضائیں
کس شان سے اربابِ وفا لائے ہیں سہرا

پھولوں کی جبینوں پہ لہو دل کا چھڑک کر
کچھ اور بھی رنگین بنا لائے ہیں سہرا

محفل میں ہر اِک آنکھ تھی بیتاب تمنّا
ہر ایک کی آنکھوں سے لگا لائے ہیں سہرا

قیمت میں جو ہیں گوہرِ نایاب سے افضل
جذبات کے ان موتیوں کا لائے ہیں سہرا

عظمت سے محبت سے عقیدت سے ادب سے
دم کر کے بزرگوں کی دعا لائے ہیں سہرا

ٹھگنے کے لیے لوگوں کو یہ حضرت ادریس
کس جاہل مطلق سے لکھا لائے ہیں سہرا

مسٹر شبیّر ونک مالک وانکوس کمپنی کی دختر کی شادی

فروری کی شبِ آخر ہے ہوا چلتی ہے
جھومتی جھامتی بہ ناز و ادا چلتی ہے
دوش پر کھولے ہوئے زُلف دو تا چلتی ہے
اس طرح جیسے کوئی جانِ وفا چلتی ہے
کبھی سمٹی کبھی پھیلی کبھی شرماتی ہے
کبھی بڑھتی ہے کبھی بڑھ کے ٹھہر جاتی ہے

جیسے آتی ہو انوکھا کوئی پیغام لیے
کوئی تحفہ کوئی بخشش کوئی انعام لیے
آرزوؤں کا مرادوں کا کوئی جام لیے
سب کے دل کے لیے خوشبوئے دلآرام لیے
کوئی چمکیلا سا ہاتھوں میں طبق ہو جیسے
حرف سونے کا ہو چاندی کا ورق ہو جیسے

آ ہوا آ تیرے ہاتھوں میں ہے کیا دیکھیں تو
سبب شوخی و انداز و ادا دیکھیں تو
کھول تو اپنی ہتھیلی کو ذرا دیکھیں تو
کیا دکھانے کو تولائی ہے دکھا دیکھیں تو
ہم یہاں آئے ہیں کیوں تو یہاں آئی کیوں ہے
پاٹلی پتر نے یہ بزم سجائی کیوں ہے

اس نے کھولی جو ہتھیلی تو کہوں کیا نکلا
روشنی پھیل گئی نور کا جھونکا نکلا
چاند کے ماتھے سے ترشا ہوا پرچا نکلا
اور اس پرچے پہ لکھا ہوا سہرا نکلا
بنتِ شبّیر کی شادی میں سنانے کے لیے
جس کا ہر شعر انوکھا ہو زمانے کے لیے

نوشہ جاوید ہے تسنیم دُلہن آج کی شام
رقص کرنے میں ستارے ہیں مگن آج کی شام
چاند برساتا ہے ہر سمت کرن آج کی شام
پھول لایا ہے نچھاور کو چمن آج کی شام
آج کی شام کیے سولہ سنگار آئی ہے
شہر پٹنہ میں ہر اِک سمت بہار آئی ہے

نیک سیرت ہے دُلہن نیک طبیعت نوشاہ
قدرتِ حق سے ہے کلثوم و خریمہ کا نباہ
چاند ہے قاضیِ تقریب ستارے ہیں گواہ
پیار سے پڑتی ہے حورانِ بہشتی کی نگاہ
تہنیت گانے کو آتی ہے صبا آج کی رات
پاٹلی پتر میں ہے جشن نیا آج کی رات

میزباں خانۂ تقریب ہیں شبّیر ونک
خوش زباں خوش نگہ و خوش سخن و خوش مسلک
درد کی دل میں کسک روح میں خدمت کی لہک
آنکھوں کے پردے میں پوشیدہ محبت کی چمک
نہ تکبّر کوئی دل میں نہ انا رکھتے ہیں
پرتوِ زندگیِ سیّدنا رکھتے ہیں

ڈاکٹر اسرار عالم ملک کے لڑکے کی شادی

خوشی سے دوست اور احباب کے چہرے نکھر آئے
غیاث الدین جب محفل میں سہرا باندھ کر آئے

چمن ایسا سجایا ڈاکٹر اِسرار عالم نے
مبارک مباد دینے پھول والے ان کے گھر آئے

بہاروں کا خزانہ ہے انھیں سہرے کے پھولوں میں
جسے بوئے محبت کی تمنّا ہو ادھر آئے

صبا نے اس قدر تعریف کی سہرے کے پھولوں کی
تماشہ دیکھنے کو شہر کے اہلِ نظر آئے

نگاہیں آنکھوں سے بے ساختہ باہر چلی آئیں
دِلوں میں دوستوں کے جتنے ارماں تھے اُبھر آئے

سجایا شوق نے اس طرح اِک اِک پھول سہرے کا
حسیں جیسے کوئی آئینہ خانے میں سنور آئے

بلائیں بیٹے کی لینے کی سب آنکھوں سے پوشیدہ
زمیں پر خلد سے مرحوم سیف الدین اُتر آئے

دُعاؤں کا نئے دولہا دُلہن کو شامیانہ دو
سفر میں زندگانی کے لیے دو ہم سفر آئے

رہے دونوں کے سر پر عمر بھر سایہ بہاروں کا
ہمیشہ رنگ و بو کا قافلہ دونوں کے گھر آئے

ڈاکٹر ظفیر احمد (جدّہ سعودی عرب) کے بھتیجے کی شادی

ہر پھول کا ہے دل یہ تمنّا لیے ہوئے
جاؤں گا احتشام کا سہرا لیے ہوئے

وہ جو بہار میں ہے محلّہ سلیمؔ پور
امن اور سلامتی کا پھریرا لیے ہوئے

گھر اس محلے میں ہے جنابِ صغیرؔ کا
سرچشمۂ حیاتِ مسیحا لیے ہوئے

نکلا ہے جن کے گھر سے عموماً ہر ایک فرد
آغوش میں طہارت و تقویٰ لیے ہوئے

اِک فرد نوجواں ہے اسی گھر کا احتشام
دُنیا کا ڈھنگ دیں کا سلیقہ لیے ہوئے

آئی جو اس کے گلشنِ شادی میں ہے بہار
مستی بھری ہواؤں کا جھونکا لیے ہوئے

ہے پیچ و خم لیے ہوئے سہرے کی ہر لڑی
ہر گل ہے رنگ و بو کا پیالہ لیے ہوئے

ہر تار میں تڑپ ہے مسرّت کے نور کی
ہے ہر کرن خوشی کا ستارا لیے ہوئے

اس طرح شاخِ گل پہ کلی اور پھول ہے
ساقی ہو جیسے ساغر و مینا لیے ہوئے

بیٹھے ہوئے ہیں اہلِ چمن انتظار میں
پیالے میں گھی کے ساتھ بتاشہ لیے ہوئے

اِک سمت جھومتے ہیں کھڑے ڈاکٹر ظفیر
سرمہ برائے دیدۂ بینا لیے ہوئے

اِک سمت ابومحمد شمس الضحیٰ بھی ہیں
اِک دوست جس کا نام ہے شیدا لیے ہوئے

پھرتے ہیں آج جھونکے ہواؤں کے ہر طرف
عطرِ گلاب و مشک کا پھاہا لیے ہوئے

مدّت کے بعد آئی ہے یہ شامِ آرزو
منظر بڑا سنہرا سنہرا لیے ہوئے

منہ دھولیا گلاب سے جب احتشامؔ نے
آئی بہار پھولوں کا سہرا لیے ہوئے

مختار احمد آئے ہیں سب سے اخیر میں
کشتیٔ گل میں عطرِ شمامہ لیے ہوئے

اب احترامؔ تم بھی دُعا کو اُٹھاؤ ہاتھ
لاکھوں اُمید لاکھوں تمنّا لیے ہوئے

کس چمن سے آئے ہے کس گلستاں سے آئے ہے؟
شہر میں یہ پھول کی خوشبو کہاں سے آئے ہے

اس طرح آئے ہے خوش خبری غموں کی بھیڑ میں
چاند جیسے بادلوں کے درمیاں سے آئے ہے

چاندنی میں یوں لپٹ کر آ رہی ہے بوئے گل
جیسے رحمت کا فرشتہ آسماں سے آئے ہے

کس کا سہرا ہے کہ جس کو دیکھنے کے واسطے
روشنی بے تاب ہو کر کہکشاں سے آئے ہے

آج جو گاہک بھی جائے ہے سوئے بازارِ گل
ہاتھ خالی گل فروشوں کی دُکاں سے آئے ہے

گل کسی قیمت پہ اوروں کو نہ بیچے جائیں گے
آج یہی آواز ہر اِک گلستاں سے آئے ہے

سب خریدا جائے ہے رفعت کے سہرے کے لیے
آج جتنا پھول آئے ہے جہاں سے آئے ہے

جنت الفردوس میں مسرور ہے روحِ سعید
رقعۂ شادی انھیں کے خانداں سے آئے ہے

نام سے منظور کے تحفہ مبارک باد کا
شہر کی ہر اِک گلی سے ہر مکاں سے آئے ہے

شاہ میناؒ اِک طرف ہیں شاہ وارثؒ اِک طرف
کاروانِ خیر و برکت درمیاں سے آئے ہے

جیوند سنگھ سیکریٹری گورنر بہار کی بیٹی نیلما کی شادی

نیلما اور اشوک چشم و چراغ
ایک اہلِ وفا کے گھر کے ہیں

دونوں مل کر وفا کے اس گھر کو
چاندنی دیں گے روشنی دیں گے

چاندنی دے گی چشم و دل کو سرور
روشنی راستہ دکھائے گی

اس طرح کارواں محبت کا
مثل فصل بہار گزرے گا

اور سالارِ کارواں بن کر
نیلما اور اشوک گزریں گے

ڈاکٹر مسعودالرحمٰن میڈیکل کالج پٹنہ کی لڑکی کی شادی

دور سے آیا ہے پیغام بہار اب کے برس
قابلِ دید ہے پھولوں کا سنگار اب کے برس
جوش میں بلبل وقمری کا ہے پیار اب کے برس
ہاتھ میں پھولوں کے ہے پھولوں کا ہار ب کے برس

ہار اتنے ہیں کہ پہنائے کہاں جائیں گے؟
پھولوں سے پوچھو یہ برسائے کہاں جائیں گے؟

بول اُٹھے پھول کہ اے سجدہ گزارانِ صنم
ہم نے اِک نیک ارادے سے اُٹھایا ہے قدم
ارضِ ہند آئے ہیں گلشن کدۂ پاک سے ہم
دور کرنے کے لیے تفرقۂ دیر و حرم

کل تھے دو ٹکڑے الگ آج ہیں چولی دامن
دولہا ہے شہر کراچی کا تو پٹنہ کی دُلہن

یوں تو گلشن میں بہت پھول کھلا کرتے ہیں
کچھ فقط طرۂ دستار بنا کرتے ہیں
خوش نصیب ایسے بھی کچھ پھول ہوا کرتے ہیں
بن کے ارمان جو سینوں میں رہا کرتے ہیں

آج دو پھولوں کا ہر اِک طرف افسانہ ہے
ایک کا نام کمالؔ ایک کا ربّانہؔ ہے

ہند اور پاک سے آئے ہیں پیام ان کے لیے
دو گھروں میں ہے مسرت کا نظام ان کے لیے
صبح نے بھیجا ہے کلیوں کا سلام ان کے لیے
پھول برساتی ہوئی آئی ہے شام ان کے لیے

اتنا وارفتہ و شیدا ہے زمانہ ان پر
کردیا ختم دعاؤں کا خزانہ ان پر

لبِ بلبل پہ نیا گیت نیا گانا ہے
نیا نغمہ نئی دُھن ہے نیا افسانہ ہے
نیا آئینہ نئی زُلف نیا شانہ ہے
اِک نئی شمع جلی ہے نیا پروانہ ہے

سارباں بھی ہے نیا لیلیٰ محمل بھی نئی
میرِ محفل بھی نیا رونقِ محفل بھی نئی

تذکرے رنج و عداوت کے تو دن رات چلے
آؤ اب مہر و محبت کی بھی کچھ بات چلے
دل سے دل ہاتھ سے ملنے کے لیے ہات چلے
بس یونہی سلسلۂ ربط و ملاقات چلے

آج کے دن سے محبت کا گھر آباد رہے
جتنے دن آتے رہیں آج کا دن یاد رہے

کیفِ دل آج کا دن نورِ نظر آج کی رات
رحمتِ حق کی کھلی راہ گزر آج کی رات
میہماں موسمِ گل ہے ترے گھر آج کی رات
اے مرادوں کے چمن خوب سنور آج کی رات

آج ربّانہ رحمٰن کی برات آتی ہے
کتنی راتوں پہ خدا جانے یہ رات آتی ہے

آج کی رات صبا سے کہو اِتراتی چلے
گنگناتی چلے گاتی چلے اَٹھلاتی چلے
فخر سے ناز سے انداز سے بل کھاتی چلے
اپنا آنچل سرِ نوشاہ پہ لہراتی چلے

اور پھر میرؔ کے انداز میں تیور کو بدل
جھوم کر چھیڑ دے عاجزؔ کی کوئی تازہ غزل

مسٹر علی عباس ڈی آئی جی پولیس کی دختر

کہو فلک سے ستاروں کا شامیانہ بنائے
اوراس کے سائے میں ایسا نگارخانہ بنائے

کہ پھر نہ بن سکے گو عمر بھر زمانہ بنائے
پھر ایسا آئینہ ڈھالے اِک ایسا شانہ بنائے

سنور کے جن سے شمیمؔ آئے جب دُلہن بن کر
تمام گھر میں رہے نور کی کرن بن کر

کہو زمیں سے کرے کاروبار پھولوں کا
تمام ڈھیر لگے بے شمار پھولوں کا

سنائے بلبل و قمری کو پیار پھولوں کا
ہر ایک پھول کو پہنائے ہار پھولوں کا

دُلہن شمیمؔ ہے رکھے دلہن کو پھولوں میں
سمیٹ لے مہِ نو کی کرن کو پھولوں میں

کہو بہار سے رنگینیاں دو بالا کرے
گلاب سُرخ سے لبریز اپنا پیالہ کرے

طوافِ نو کرے اور رنگ اُچھالا کرے
کرنؔ کے چاروں طرف سرخیوں کا ہالہ کرے

برات چاند کی تاروں کو لے کے آئے گی
کرنؔ کی شادی قمرؔ سے رَچائی جائے گی

اگرچہ شادی فضائے وطن سے دور ہے یہ
الم ضرور ہے یہ رنج وغم ضرور ہے یہ

رواج ورسم کی نظروں میں گو قصور ہے یہ
مگر خوشی ہے یہ مستی ہے یہ سرور ہے یہ

کہ دو بٹے ہوئے ٹکڑوں کو اس نے جوڑا ہے
دولہا دُلہن نے زمانے کا رُخ تو موڑا ہے

اٹھاؤ ساز کہ تقریب پر تپاک ہے آج
رفوئے جیب وگریبان چاک چاک ہے آج

سماں یہ دیکھ کے دُشمن کے منہ میں خاک ہے آج
کہ دستِ ہند میں دامانِ ارضِ پاک ہے آج

زمین شبنمِ مہر و وفا سے دُھلتی ہے
بڑھو کہ آج محبت کی راہ کھلتی ہے

کراچی جاتی ہے پٹنہ سے رہ گزارِ چمن
لیے ہے دونوں کو آغوش میں بہارِ چمن

قمر سے اور کرن سے ہے کاروبارِ چمن
وہ عندلیبِ گلستاں ہے یہ نگارِ چمن

ہر ایک اپنی جگہ لاجواب ہے پیارے
اِک آفتاب ہے اِک ماہتاب ہے پیارے

صبا چمن میں یہ میرا کلام لیتی جا
وہاں کے بلبل وقمری کے نام لیتی جا

یہ شاعری یہ مئے لالہ فام لیتی جا
مرے لہو سے یہ لبریز جام لیتی جا

جو لفظ شعر میں آئے وہ پھول ہوجائے
خدا کرے کہ یہ سہرا قبول ہوجائے

بہ تقریب شادی منظور الحق ولد محمد ولی الحق (اے ڈی ایم)

یہ کس ملک سے شام آئی ہے آج　　کہاں زُلف اس نے بنائی ہے آج
کچھ ایسی سجی اور سجائی ہے آج　　کہ حیرت میں ساری خدائی ہے آج
فضائے دَر و بام ایسی نہ تھی　　سنہری کوئی شام ایسی نہ تھی
جبیں پر ہیں افشاں دُلہن کی طرح　　بھرے اپنی گودی چمن کی طرح
چھپائے ہوئے کوئی سوغات ہے
بہت مسکراتی ہے کچھ بات ہے

نہ کر اے حسیں شام اتنا ٹھٹھول　　دبایا ہے کیا اپنی مٹھی تو کھول
جو قیمت تجھے چاہیے منہ سے بول　　کہ ہم لوگ کرتے نہیں مول تول
سخاوت میں حاتم سے کم ہم نہیں　　اگر جان مانگے تو کچھ غم نہیں
وفا کی نزاکت پہ مرتے ہیں ہم
جو کہتے ہیں ہم کر گزرتے ہیں ہم
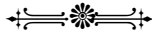
یہ سن کر حسیں شام گانے لگی　　چہکنے لگی چہچہانے لگی
مہکتی ہوئی مسکراتی ہوئی　　اُٹھی رنگ و نکہت لٹاتی ہوئی
نگاہیں جھکا کر اِک انداز سے　　بڑی دل رُبائی بڑے ناز سے
کہا میں جو لائی ہوں کیجیے قبول
ہیں منظور بابو کے سہرے کے پھول
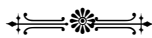
مبارک ہو منظورؔ سہرا تمھیں   پہناتی ہے زنجیر دنیا تمھیں
یہ سہرا نہیں اے اسیرِ جمال   محبت نے پھینکا ہے پھولوں کا جال
سنہری ہے بندھن رو پہلی گرہ
مبارک اسیری کی پہلی گرہ
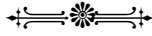
نہ کیوں کر ہوں شاداں جناب ولیؔ   پلٹتا ہے دیکھو شبابِ ولیؔ
دل اُن کا ہے اِک میکدہ ساقیا   پلا ساقیا ہاں پلا ساقیا
پلا ساقیا تیری محفل کی خیر   شبستاں کے اس ماہِ کامل کی خیر
گل و لالہ و سرو ریحاں کی خیر
ولیؔ کے مہکتے گلستاں کی خیر

مبارک تمھیں یہ نظارے ولیؔ
دُعا ہے مری میرے پیارے ولیؔ
خمِ شادمانی لنڈھاتے رہو
دِلوں کو پیالہ بناتے رہو

نغمۂ لالہ وگل

پروفیسر اعجاز علی ارشد ہمراہ شمشاد جہاں
(اکتوبر ۱۹۷۶ء)

زندگی صبح کا منظر ہے کبھی شام ہے یہ　　کبھی شمشیر کبھی بادۂ گلفام ہے یہ
کبھی تکلیف سراسر کبھی آرام ہے یہ　　کبھی دھوکا ہے حقیقت کا کبھی نام ہے یہ

جادۂ ہجر بھی ہے راہِ ملاقات بھی ہے
دُکھ بھرا دن بھی ہے یہ تاروں بھری رات بھی ہے

چاندنی بھی ہے گھٹا ٹوپ اندھیرا بھی ہے یہ　　یاس کی شام اُمیدوں کا سویرا بھی ہے یہ
چین کا گھر بھی ہے یہ درد کا ڈیرا بھی ہے یہ　　پھولوں کا کنج بھی زخموں کا بسیرا بھی ہے یہ

دل کو دہلاتی ہوئی غم کی سواری ہے کبھی
ناز سے چلتی ہوئی بادِ بہاری ہے کبھی

زندگی عشق کی اُلجھن میں سنور جاتی ہے　　درد کی اوس میں کچھ اور نکھر جاتی ہے
کتنی ہی تیز رہے دُھوپ گزر جاتی ہے　　چھاؤں آتی ہے تو کچھ دیر ٹھہر جاتی ہے

آج کی شام بھی اِک چھاؤں ہے پیارے آؤ
کچھ دکھانا ہے تمھیں ساتھ ہمارے آؤ

یہ محلّہ یہ وہی لالہ و گل کی وادی　　جس محلّے میں تھے سلطانؔ عظیم آبادی
جو محلّہ کبھی جھولوں کا رہا تھا عادی　　جھولنے کی تھی حسینوں کو جہاں آزادی

جھولے جب پڑتے تھے تب اودی گھٹا اُٹھتی تھی
جھولوں کی پینگ بڑھانے کو ہوا اُٹھتی تھی

’حیدری جان‘ کے گونجا کیے نغمے جس میں — اور سلطانؔ کی غزلوں کے تھے چرچے جس میں
کتنی ہی ’چست قباؤں‘ کے تھے چرچے جس میں — شاد و سلطاں نے کیے سجدے پہ سجدے جس میں
وقت تو بات مری ہنس کے اڑا ہی دے گا
اس کی ’میخانۂ الہام‘ گواہی دے گا

ہر محلے میں صبا جا کے پکار آئی ہے — اس محلے میں بہت دُور بہار آئی ہے
درد کا بوجھ بہت دن پہ اُتار آئی ہے — اپنے ہونٹوں پہ لیے مژدۂ یار آئی ہے
اس محلے کی ہے کچھ اور فضا آج کی شام
گنگناتی ہوئی پھرتی ہے صبا آج کی شام

گو زمانہ ہے شرابور پسینے میں بہت — تپشِ غم سے گھٹن آ گئی جینے میں بہت
بادۂ آرزو گو تلخ ہے پینے میں بہت — آبلے پڑتے ہیں ہر گھونٹ پہ سینے میں بہت
زندگی ناز سے کروٹ کبھی یوں لیتی ہے
زخم کو ہنستا ہوا پھول بنا دیتی ہے

آؤ کچھ ہم بھی ہنسی کھیل کا ساماں کرلیں — بزمِ شادی میں چلیں درد کا درماں کرلیں
زندگی بارِ گراں ہے اُسے آساں کرلیں — اس اندھیرے میں ذرا دیر چراغاں کرلیں
مسکرا لو ہے یہی وقت کی قیمت پیارے
چند لمحے یہ خوشی کے ہیں غنیمت پیارے

باغ پاتو سے نکلتی ہے برات آج کی شام — کیسی اٹھلاتی ہے مستی میں حیات آج کی شام
اپنی جھولی میں چھپائے تھی جو بات آج کی شام — وہ محمد علی خاں ہے ترے ہات آج کی شام
بلبلیں گوندھ کے کچنار کلی کا سہرا
آئیں گاتی ہوئی اعجاز علی کا سہرا

سہرا باندھے ہے جو سودا زدہ سر رکھے ہے — درد دل رکھے ہے بیتابِ جگر رکھے ہے
لالہ و گل کی حقیقت پہ نظر رکھے ہے — جو یہ رکھے ہے وہ سب لعل و گہر رکھے ہے
میں دعا گو ہوں کہ سہرا بھی رہے سر بھی رہے
یعنی شمشیر بھی شمشیر کا جوہر بھی ہے

ڈاکٹر خالد حسین ہمراہ ناہید بنت جسٹس سیّد علی احمد

(۲۵؍دسمبر ۱۹۸۲ء)

ڈاکٹر خالدؔ جو سر سے باندھ کر سہرا چلے
انورؔ و اقبالؔ دامن کا کیے سایہ چلے
اس طرح باراتیوں کے درمیاں دولہا چلے
شاہوں کے حلقے میں جیسے کوئی شہزادہ چلے
ساز اٹھائے گل لبِ بلبل سے یہ نغمہ چلے
آرزوؤں کے سبو میں عشق کی صہبا چلے

نور برساتی ہوئی تاروں بھری رات ہے آج
کس اُمنگوں بھرے نوشاہ کی بارات ہے آج
تحفہ ہی تحفہ ہے سوغات ہی سوغات ہے آج
سب مسرت سے گلے ملتے ہیں کیا بات ہے آج
کس جواں بخت کے سہرے کی کرامات ہے آج
پھولوں کی خوشبوؤں سے مہکی ہوئی رات ہے آج
ہو نہ ہو کوئی تو ہونے کو نئی بات ہے آج
آج کی شام ہے ایسی کہ سحر مات ہے آج
کون مہمان چمن آج ہے بننے والا
کس کی خاطر سے یہ سامان مدارات ہے آج
جو بھی ڈالی ہے مسرت سے جھکی پڑتی ہے
جو بھی پتّا ہے وہ پھیلائے ہوئے ہات ہے آج
بات یہ ہے کہ ہیں باندھے ہوئے خالد سہرا
یہ اسی سہرے کے پھولوں کی کرامات ہے آج
دو دِلوں کے لیے سامان ہے یکجائی کا
پھول سے پھول کی تقریب ملاقات ہے آج
عطر ملنے کی ضرورت ہی کہاں باقی ہے
جس طرف جایئے خوشبوؤں کی برسات ہے آج
دونوں گھر والوں کے جس فرد کے ہونٹوں سے سنو
یہ دعا ہے یہ گزارش یہ مناجات ہے آج
اے خدا انورؔ و اقبالؔ و علیؔ احمد پر
یہ ترا فضل ہے یہ تیری کرامات ہے آج

تیرے ہی لطف و کرم سے یہ خوشی حاصل ہوئی
یہ مسرّت تری بھیجی ہوئی سوغات ہے آج

بہ تقریب شادی عشرت بانو اور عصمت جہاں

دختران پروفیسر ممتاز احمد (۲۴؍نومبر ۱۹۸۶ء)

یہ دوستوں کی رات ہے یاروں کی رات ہے
پھولوں کی رات ہے یہ بہاروں کی رات ہے

جلوؤں کی رات ہے یہ نظاروں کی رات ہے
یہ چاند کی ہے رات ستاروں کی رات ہے

اس رات سے تو بوئے جگر دوز آتی ہے
یہ رات وہ نہیں ہے جو ہر روز آتی ہے

اس رات کی فضا میں دِلوں کی کہانی ہے
خوشبو سہاگ کی ہے تو رنگت شہانی ہے

آنچل ہے زعفرانی قبا ارغوانی ہے
اس رات کی جوانی عجب جاودانی ہے

یہ جب بھی آئے گی تو فضا جھوم جائے گی
بادِ نسیم اس کے قدم چوم جائے گی

یہ رات فصلِ گل کی منادی کی رات ہے
چشموں کی آبشار کی وادی کی رات ہے

ارمانوں کی بلند مرادی کی رات ہے
عشرتؔ کی یہ نکاح کی شادی کی رات ہے

یہ رات اس کے چاند سے چہرے کی رات ہے
چہرے پہ جھولتے ہوئے سہرے کی رات ہے

عصمتؔ جہاں بھی آج بنی شمع انجمن
جس طرح صحن باغ میں نسرین و نسترن

بیٹھی ہیں باپ ماں کی بغل میں یہ دو بہن
اس جانب اِک دُلہن ہے اُدھر دوسری دُلہن

ممتازؔ کے لیے یہ کرامات آ گئی
اِک رات ہی میں دونوں کی بارات آ گئی

مستی میں گنگناتی ہوئی آئی ہے یہ رات
لہراتی مسکراتی ہوئی آئی ہے یہ رات

گاتی ہوئی بجاتی ہوئی آئی ہے یہ رات
سنسان گھر بساتی ہوئی آئی ہے یہ رات

آئی ہے کتنی منتوں سے لیکن آئی ہے
اور اپنے ساتھ جشنِ چراغاں بھی لائی ہے

پھولوں سے کہہ دو اپنے کہانی سنائیں پھول
سہروں میں ہے مزا کہ چمن میں، بتائیں پھول

ان پھول جیسے چہروں پہ قربان جائیں پھول
سہروں سے اب نکل کے چمن میں نہ آئیں پھول

پھولوں کا رشتہ پھول سے چہروں کے ساتھ ہے
تقدیر ان کی اب انہی سہروں کے ساتھ ہے

ممتازؔ کی یہ دونوں جو پیاری ہیں بیٹیاں
خونِ دل و جگر کی سنواری ہیں بیٹیاں

فیضِ پدر کی چشمۂ جاری ہیں بیٹیاں
گھر ہے چمن تو بادِ بہاری ہیں بیٹیاں

یارب یہ گلستاں یوں ہی پھولا پھلا کرے
خوشبوئیں لے کے بادِ بہاری چلا کرے

پیغامِ محبت بہ تقریب عزیزی ریحان سلّمہٗ

(میری لینڈ، امریکہ)

یہ میری لینڈ نہیں شالامار کہیے اُسے　　حسین کہیے اُسے طرحدار کہیے اُسے
اگرچہ دورِ خزاں ہے بہار کہیے اسے　　اور ایک بار نہیں بار بار کہیے اسے

بدل کے کانٹوں کو پھولوں کا ہار کرنا ہے
ہمارا کام خزاں کو بہار کرنا ہے

سنوار دیں تو گلوں پر نکھار آجائے　　چھڑک دیں رنگ تو فصلِ بہار آجائے
دُعا کریں تو دِلوں کو قرار آجائے　　غزل سنائیں تو دشمن کو پیار آجائے

جہانِ زیست کا یہ کارخانہ ہم سے ہے
زمانے سے نہیں ہیں ہم ،زمانہ ہم سے

مگر ہم اب تو زمانے کے ہیں غلاموں میں　　کہ مقتدیٰ ہوئے ہم اور سب اماموں میں
بنیں بلا سے خدا کے نمک حراموں میں　　مگر کسی طرح پہنچیں بلند ناموں میں

یہاں تو سوٹ بدن میں گلے میں ٹائی ہو
بلا سے روزِ قیامت میں جگ ہنسائی ہو

زمانہ کاش عمل سے جی آشنا ہوجائے　　ارادہ ہی نہیں ہے ورنہ کیا سے کیا ہوجائے
خودی کا ہم سے اگر کچھ حق ادا ہوجائے　　جو فیصلہ ہوا تھا پھر وہ فیصلہ ہوجائے

جدا نہیں ہے مشیت کے ساتھ ساتھ ہے یہ
ہمارا ہاتھ نہیں ہے خدا کا ہاتھ سے یہ

ارادہ یہ ہے کہ آراستہ چمن ہو آج　　نمائش گل و نسرین و نسترن ہو آج
کہو پکار کے بلبل سے نغمہ زن ہو آج　　ہر اِک زبان پہ شیرینیِ سخن ہو آج
ہمارے ظاہر و باطن کی سب فضا بدلے
زبان ہی کا نہیں دل کا بھی ذائقہ بدلے

یہ بزم اس کی نہیں صرف پئیں کھائیں ہم　　خوشی کا جشن گھڑی دو گھڑی منائیں ہم
ملائیں دل سے بھی دل ہاتھ جب ملائیں ہم　　ہر ایک دل پہ کوئی نقشہ چھوڑ جائیں ہم
دِلوں سے زہرِ کدورت نکالتے جائیں
ہٹائیں کانٹوں کو اور پھول اُچھالتے جائیں

یہ شادیاں تو بہانہ ہیں بے بہانہ ملیں　　جو سامنے نہ ہو اس سے بھی غائبانہ ملیں
نہ آئے ملنے تو ہم جاکے والہانہ ملیں　　تکلّفوں سے نہیں بے تکلّفانہ ملیں
ملے بغیر کسی سے نہ چین آئے ہمیں
یہ دل خدا کرے لے جائے بے بلائے ہمیں

چلو ہواؤ چلو میرے ساتھ آؤ چلو　　میں آگ دوں گا محبت کی تم لگاؤ چلو
کوئی جگہ کوئی موسم ہو رُک نہ جاؤ چلو　　چلو چلو چلو اوروں کو بھی چلاؤ چلو
چلو کچھ اتنا کہ ہر سمت نقشِ پا بن جائے
ہر ایک دل میں محبت کا راستہ بن جائے

سمیٹے پھرتی ہے بس ننگ و نام کو دُنیا　　بھلائے بیٹھی ہے اپنے مقام کو دُنیا
نہ دل کو سمجھی نہ دل کے پیام کو دُنیا　　ترس رہی ہے محبت کے جام کو دنیا
پھر آج بھر کے محبت کا جام دے دو اُسے
نکمّی بیٹھی ہوئی ہے یہ کام دے دو اُسے

یہ بزمِ شادی جو آراستہ ہوئی ہے آج　　بنا ریحانؔ ہے اور فوزیہؔ بنی ہے آج
بنا بنی میں یہی شرط طے ہوئی ہے آج　　کہ خوشبوؤں سے جو یہ زندگی بسی ہے آج
اب ان سے خوشبو ہر اِک در ہر ایک بام کرو
چھپاؤ مت انھیں ان خوشبوؤں کا عام کرو

یہ خوشبو کیا ہے ؟ گلِ اعتبار کی خوشبو　　وفا کی وعدہ و پیمان یار کی خوشبو
شعور حسن کی حسنِ شعار کی خوشبو　　یہ خوشبو کیا ہے ؟ محبت کی پیار کی خوشبو

یہ خوشبو اب کہیں ملتی نہیں زمانے میں
اب اُن کو بھر دو ہر اِک آئینے میں شانے میں

سعیدؔہ اور ریحانہ جس انجمنؔ کی ہیں　　ضیا کریم کہ فرزانؔہ جس چمن کی ہیں
علاوہ ان کے بھی جس ملک جس وطن کی ہیں　　وہ سارے مرد وزن محتاج اس سخن کی ہیں

کہ درد اگر نہ ہو دل میں تو زندگی ہی نہیں
چراغ طاق پہ رکھا ہے روشنی ہی نہیں

خدا کرے کہ یہ تقریب کامیاب رہے　　اور ایسی شان ہو اس کی کہ لاجواب رہے
حیات دولہا دُلہن کی یہ آب و تاب رہے　　ہمیشہ دل پہ جوانی رہے شباب رہے

نمونہ بن کے رہیں باکمال بن کے رہیں
یہ دونوں اپنی جگہ پر مثال بن کے رہیں

اُمید یہ ہے کہ جتنے شریکِ محفل ہیں　　تمام اہلِ محبت میں صاحبِ دل ہیں
میں جتنا جانتا ہوں اس سے بڑھ کے قابل ہیں　　بڑی صفات بڑی خوبیوں کے حامل ہیں

خدا کرے کہ مراغم نباہنے لگ جائیں
نہ چاہے جو انھیں اس کو یہ چاہنے لگ جائیں

کیا باغ میں کھلی ہوئی اِک اِک کلی ہے آج   شمعوں سے جگمگائی ہوئی ہر گلی ہے آج
لکھا ہوا یہ شعر بخطِ جلی ہے آج   پھولوں کی مانگ پر کہ نہایت بھلی ہے آج
جب تک جہاں میں شمع رہے انجمن رہے
دوشالۂ سہاگ میں لپٹی دُلہن رہے

کیا جھومتی ہے فرطِ مسرت سے کائنات   آئی ہے آج رابعہ خاتون کی برات
بجلی بھی مارے شرم کے کرتی نہیں ہے بات   ہے شب کے وقت روشنی ایسی کہ دن ہے مات
یہ ڈالی ڈالی پھول عجب پیارے پیارے ہیں
پتّے تو یوں چمکتے ہیں گویا ستارے ہیں

جس کے لیے دِلوں میں جگہ بالعموم ہو   ایسی دُلہن کہ جس کی زمانے میں دھوم ہو
ہر سمت خیر خواہوں کا جس کے ہجوم ہو   جس کی جبیں پہ تاجِ فنون و علوم ہو
رانی دِلوں کی بن کے ہر اِک حال میں رہے
میکے میں ہو مقیم کہ سسرال میں رہے

خاتونِ دوجہان کا سایہ نصیب ہو   تجھ کو ہوائے چادرِ زہراؓ نصیب ہو
صدقے میں دین کے تجھے دُنیا نصیب ہو   شادابیِ نہال تمنّا نصیب ہو
آنکھوں میں عکس برقِ تجلائے فاطمہؓ
سر پر ہو تیرے خاکِ کفِ پائے فاطمہؓ

جس گھر میں جائے رشکِ گلستاں وہ گھر بنے   تسکین جان و راحت قلب و نظر بنے
جس راہ جائے پھول ہر اِک گام پر بنے   دُکھے ہوئے دِلوں کے لیے چارہ گر بنے
یوں ہر قدم عزیز کا سایہ قریب ہو
جو دیکھے وہ کہے کہ بڑی خوش نصیب ہو

ڈاکٹر خورشید عالم ملک شکاگو کی دختر کی شادی

پیش کرکے مؤدبانہ سلام
عرض کرتا ہوں دست بستہ کلام

لی ہے میرے نصیب نے کروٹ
آرہی ہے بہار کی آہٹ

آپ حضرات کی دُعا جو ہوئی
نگہِ رحمتِ خدا جو ہوئی

دلِ افسردہ مسکرانے کو ہے
مرے گھر بھی بہار آنے کو ہے

چل پڑی ٹھنڈی ٹھنڈی پروائی
لے رہی ہے مسرّت انگڑائی

خوش زباں خوش مزاج خوش مقدور
موضع ڈھونڑا کے حضرتِ منظورؔ

اُن کے فرزند قوتِ بازو
یعنی خورشید عالم آئینہ رو

خوش جبیں خوش جمال خوش گفتار
خوش نظر خوش خیال خوش کردار

نیلوفر ناز روشنیِ نظر
میری شب ہائے آرزو کی سحر

میری آنکھوں میں ہے اُسی سے نور
روح میں تازگی ہے دل میں سرور

دونوں ہیں آفتاب اور مہتاب
دونوں ہیں ایک دوسرے کا جواب

آپ سے میری التجا یہ ہے
آرزو یہ ہے مُدعا یہ ہے

آیئے مہرباں کرم کیجے
دولہا دُلہن کو یوں دُعا دیجے

خوش رہو دونوں بے شمار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

حکیم احمد مرحوم کے بیٹے کی شادی میں

عدم شرکت کی معذرت

(۱۹۶۰ء)

یہ خوشی سب کو مبارک ہو کہ دُنیا ہے یہی
ہم تماشائی ہیں جس کے وہ تماشا ہے یہی

رنگ بھرتی ہے یہی شوق کی تصویروں میں
دل کے آئینے میں نقاشِ تمنّا ہے یہی

آرزوؤں کے لیے ہے یہی افسون حیات
حسرتوں کے لیے پیغام مسیحا ہے یہی

ڈھونڈتی اس کو نسیم سحری پھرتی ہے
غنچۂ خوبی یہی ہے گلِ رعنا ہے یہی

یہ جو آتی ہے تو دُنیا میں بہار آتی ہے
زندگی ایک چمن ہے چمن آرا ہے یہی

اِک زمانہ ہے تمنّائے خریداری میں
دھوم بازار میں جس کی ہے وہ سودا ہے یہی

گاہے گاہے چمنِ خلد کے دروازے سے
جس کو تقدیر اُٹھاتی ہے وہ پردا ہے یہی

یہ وہ لمحہ ہے کہ سب اپنے پرائے خوش ہیں
ہم بھی اظہارِ خوشی کردیں کہ موقع ہے یہی

دو گھرانوں میں تعلق ہے اُسی کے دم سے
دو دِلوں کو جو ملاتا ہے وہ رشتہ ہے یہی

آپ کے گھر جو یہ تقریبِ خوشی آتی ہے
ہم بھی خوش ہیں کہ طبیعت کا تقاضہ ہے یہی

گرچہ میں عقد کی تقریب میں شامل نہ ہوا
اتفاقاتِ جہاں سے مجھے شکوہ ہے یہی

عذر کچھ اور بھی لاحق تھے مگر باایں ہمہ
عذر صحت ہی کروں آپ سے اچھا ہے یہی

میں نہیں پہنچا تو کیا سیکڑوں پہنچے ہوں گے
اِک نہیں آتا ہے دس آتے ہیں ہوتا ہے یہی

شراب آج تو ساقی نہ رکھ چھپائے ہوئے   کہ دُور دُور سے ہیں بادہ خوار آئے ہوئے
اُمید باندھے ہوئے آسرا لگائے ہوئے   کھڑے ہیں پیاس کے مارے پرا جمائے ہوئے
مطالبہ یہ نہیں ہے کہ جامِ جم مل جائے
سکون دل کو ہو اتنی تو کم سے کم مل جائے
دِلوں میں حوصلے بیٹھے ہیں سر اُٹھائے ہوئے   چراغِ انجمن آرزو جلائے ہوئے
اُمنڈ اُمنڈ کے نغمے ہیں لب تک آئے ہوئے   زمانہ ہوگیا اے دوست گنگنائے ہوئے
رہے خموش وہ کیوں کر جو دل گداز رہے
یہی تو وقت ہے کچھ لطفِ سوز و ساز رہے
یہی تو وقت ہے جذبات کی گھٹا برسے   ہو جتنا دل میں برسنے کا حوصلہ برسے
چنبیلی برسے گلاب اور موتیا برسے   جو کچھ بھی ہو تری جھولی میں اے صبا برسے
یہ وقت وہ ہے کہ اِک بوند بھی غنیمت ہے
برس برس کے برسنے کی آج قیمت ہے
فسردہ دل غمِ دوراں سے آدمی ہے بہت   اگر ملے تو مسرت کی اِک گھڑی ہے بہت
کبھی کبھی کوئی ہنس بول لے یہی ہے بہت   اندھیری رات میں تھوڑی سی روشنی ہے بہت
سنا ہے آج اسی روشنی کا ساماں ہے
پتنگے ٹوٹ پڑے ہیں کہ پھر چراغاں ہے
گلی میں راہ میں خلوت میں انجمن میں چراغ   مکانِ شیخ میں ایوانِ برہمن میں چراغ
قبائے لالہ و نسرین و نسترن میں چراغ   یہ گل کھلے ہیں کہ ہیں خانۂ چمن میں چراغ
جدھر نگاہ اُٹھاؤ عجیب دُھوم ہے آج
زمیں پہ چاند ستاروں کا اِک ہجوم ہے آج

یہ بزم وہ ہے جسے شوق نے سنوارا ہے   لہو جگر کا چھڑک کر اُسے نکھارا ہے
عجیب نقش تمنّاؤں نے اُبھارا ہے   جو دیکھتا ہے وہ کہتا ہے کیا نظارا ہے
حسیں تھیں پہلے بھی دُنیا مگر یہ بات نہ تھی
جو رات آج ہے ایسی تو کوئی رات نہ تھی

وہ رات جس میں بڑے حوصلوں سے رات سجی   بہت دِنوں سے جو سنسان تھی حیات سجی
زمیں سے تا بہ فلک ساری کائنات سجی   وہ رات جس میں جہانگیر کی برات سجی
وہ رات جس کی تمنّا میں دن گزرتے تھے
وہ رات جس کی دعا صبح و شام کرتے تھے

وہ رات جس میں جہانگیر کے ہے سرسہرا   کسی سے اور ملاتا نہیں نظر سہرا
وہ سامنے ہے محبت کی رہ گزر سہرا   خدا کرے کہ ہو پورا ترا سفر سہرا
ہمیشہ ہاتھ میں نوشہ کے تیرا ہاتھ رہے
دُعائے خضر علیہ السلام ساتھ رہے

جلوس میں جو نکل کر یہ شہسوار چلے   ستارے ساتھ چلے گرچہ شرمسار چلے
بکھیرتے ہوئے یوں پیرہن کا تار چلے   کہ جیسے پھول لٹاتی ہوئی بہار چلے
خدا کے فضل کے سائے میں تجھ کو لیتے ہیں
فرشتے ہاتھ اُٹھا کر دُعائیں دیتے ہیں

.......جہاں شہ نشیں ہے پھولوں کی   اب آسماں سے بھی اونچی زمیں ہے پھولوں کی
یہ حیثیت بڑی رشک آفریں ہے پھولوں کی   مگر کچھ اس میں کرامت نہیں ہے پھولوں کی
چڑھے جو سر پہ تو سہرے کا نام اُن کو ملا
اسی طفیل میں ایسا مقام ان کو ملا

ہنسی خوشی کی یہ حسین رات دیکھتے چلو
بہار پر ہے ساری کائنات دیکھتے چلو
کہاں تک آتی ہے کہاں سے بات دیکھتے چلو
نکاح دیکھ ہی چکے برات دیکھتے چلو
نظر جھکائے جو چلا وہ بدنصیب رہ گیا
اُٹھاؤ سر تبسمِ حیات دیکھتے چلو
یہ جگمگاتی روشنی پہ مسکراتی چاندنی
بہت دِنوں پہ یہ آئی ہے رات دیکھتے چلو
وہ دُھوم ہے کہ حسرتوں کی نیند ٹوٹنے کو ہے
بدل رہی ہے کروٹیں حیات دیکھتے چلو
یہاں خزاں کا ذکر کیا یہ موسمِ محفل بہار ہے
وہ رات بھولتے چلو یہ رات دیکھتے چلو

اپنے کلاس فیلو خلیل احمد کی شادی میں

نہ کوئی بھید ہے سہرا نہ راز ہے سہرا
نقابِ جلوۂ حسنِ مجاز ہے سہرا
قدم قدم پہ تخیل نے ٹھوکریں کھائیں
عجب مقامِ نشیب و فراز ہے سہرا
حریمِ حسن کے رنگین آستانے پر
جبینِ عشق کی پہلی نماز ہے سہرا
اسی کی چھاؤں میں ملتا ہے دو دِلوں کو سکوں
بڑا کریم بڑا چارہ ساز ہے سہرا
نہ ہوگا شوق کو کوتاہ دستیوں کا گلہ
خدا کے فضل سے دامن دراز ہے سہرا
ہر ایک پھول پہ احباب کی دُعائیں ہیں
جگر کا سوزِ دِلوں کا گداز ہے سہرا
اب اس کے آگے خموشی بہت مناسب ہے
کہ اِک حکایتِ راز و نیاز ہے سہرا
اُلجھ کے اس میں تمنّائیں مسکراتی ہیں
کسی حسین کی زُلفِ دراز ہے سہرا
اسی کے دم سے محبت کا گرم ہے بازار
چراغِ انجمنِ سوز و ساز ہے سہرا
سمجھنے والے سمجھتے ہیں گفتگو اس کی
صدا ہے جس کی خموشی وہ ساز ہے سہرا
خدا ہے راہنمائے نسیم و اسمٰعیل
کہ ایک منزل دُور دراز ہے سہرا

اُٹھا بادِ صبا گھونگھٹ اُٹھا روئے گلستاں سے　　　کہ اہلِ ذوق مشتاقِ زیارت ہیں دل وجاں سے
ہوا ٹکرا کے آئی کس عروسِ گل کے داماں سے　　　چمن مہکا ہوا ہے نکہتِ زُلف پریشاں سے
خیالِ مصلحت وحشت میں کوئی خاک کرتا ہے
جو آتا ہے وہ اپنا ہی گریباں چاک کرتا ہے
یہ وہ محفل ہے جس میں خیر ہی ہے شر نہیں کوئی　　　یہاں جو قید ہے اس قید سے باہر نہیں کوئی
کلی افسردہ سارے باغ کے اندر نہیں کوئی　　　چراغاں ہو نہ جس میں آج ایسا گھر نہیں کوئی
یہاں جو آئے ہیں نعمت بڑی ہم لے کے آئے ہیں
براتِ نوشۂ مقصود عالم لے کے آئے ہیں
نہ پوچھو انتہا محبوب عالم کی مسرت کی　　　بنی ہے ایک گل دستہ کلی کِھل کر طبیعت کی
کوئی دُشمن بھی ہو تو بات کرتے ہیں محبت کی　　　کسی سے ایک چنگاری نہیں دل میں عداوت کی
کلی دل کی شگفتہ کس طرح ہوتی ہے شبنم سے
فروز عالم سے پوچھو یا سنو منظور عالم سے
شکور احمد کا ہے محفل میں عالم ہی جداگانہ　　　خوشی سے ایسے بے قابو ہیں جیسے کوئی دیوانہ
یہی اِک شور پھیلا ہے حرم سے تا بہ بت خانہ　　　کہ بیٹا آج شمع انجمن ہے باپ پروانہ
بہت کم اس طرح کے صاحبِ ارمان ہوتے ہیں
بچھے جاتے ہیں صدقے ہوتے ہیں قربان ہوتے ہیں
یہی احوال ہے نور الہدیٰ بدر الہدیٰ کا بھی　　　نبی احمد کا بھی خورشید عالم باصفا کا بھی
عجب انداز ہے منظور عالم کی دُعا کا بھی　　　کبھی سجدے میں جا کر شکر کرتے ہیں خدا کا بھی
کہ اے اللہ تیری کس قدر رحمت نمائی ہے
چچا کو آخرش شادی بھتیجے کی دکھائی ہے
مبارک مژدۂ شادی تمام اُمیدواروں کو　　　مبارک دوستوں کو چاہنے والوں کو یاروں کو
مبارک ہم جلیسوں کو مبارک ہم شعاروں کو　　　مبارک لالہ وگل کو مبارک چاند تاروں کو
دُعائیں دے رہے سب بلائیں لے کے چہرے کی
کہ عمر خضر سے بھی ہو زیادہ عمر سہرے کی

جس طرف جایئے بات پھولوں کی ہے
گفتگو اب تو دن رات پھولوں کی ہے

آج شہزآد ہے تیری شادی کا دن
اس لیے آج کی رات پھولوں کی ہے

بے تکلف بہت آ رہی ہیں نظر
تجھ سے کب کی ملاقات پھولوں کی ہے

کل چمن میں کوئی پوچھتا ہی نہ تھا
آج کتنی مدارات پھولوں کی ہے

فصل آئی خوشی کی گیا دورِ غم
دن تو کانٹوں کا تھا رات پھولوں کی ہے

کس کے سہرے کی ہے فکر میں باغباں
کس لیے آج برسات پھولوں کی ہے

تیرا سہرا ہمیشہ سلامت رہے
یہ خدا سے مناجات پھولوں کی ہے

مست و سرشار سہرے کی لڑیاں بھی ہیں
آج پہلی ملاقات پھولوں کی ہے

بے سبب ناز کرتی نہیں ہے صبا
اس کی جھولی میں خیرات پھولوں کی ہے

زُلف ہر رنگ کے تاروں سے بنی سہرے کی
آج پیشانی ہے گنگا جمنی سہرے کی

نو عروسانِ گلستاں کو بھی شرماتی ہے
مہکی مہکی یہ قبائے چمنی سہرے کی

چوم لیتی ہے ہوا بھی تو لچک جاتا ہے
اللہ اللہ یہ نازک بدنی سہرے کی

رشک سے دامن گل چاک ہوا جاتا ہے
دیکھ کر شوخیٔ گل پیرہنی سہرے کی

کل چمن میں کوئی پھولوں کا خریدار نہ تھا
آج کیا دھوم ہے اللہ غنی سہرے کی

خنکیاں لائی ہے گرمیِ تمنّا کے لیے
حسن کی دُھوپ پہ یہ چھاؤں گھنی سہرے کی

شوق کی بات سمجھتے ہیں سمجھنے والے
لاکھ گفتار ہے اِک کم سخنی سہرے کی

نام سہرے کا ہوا نام سے تیرے حیدؔر
تیری تقدیر سے تقدیر بنی سہرے کی

چند اشعار بھی کہنے ہی پڑیں گے عاجزؔ
کس کو منظور ہے خاطر شکنی سہرے کی

سہرا

(برائے اکبر پسر مسٹر علی عباس مرحوم، ڈی.آئی.جی)

چلو وطن کی ہواؤ ہنر دکھاتی چلو　　خوشی میں جھومتی لہراتی گنگناتی چلو
جو ساتھ ہیں انھیں بانگِ درا سناتی چلو　　سفر ہے دُور قدم تیز تیز اُٹھاتی چلو
اگرچہ دہلی و کابل کی دُھوپ راہ میں ہے
ہمارا قافلہ اللہ کی پناہ میں ہے

نہ جانے پٹنہ میں گزرے ہیں کتنے لیل و نہار　　کہ جن میں آنکھوں کو ٹھنڈک ملی نہ دل کو قرار
چھپا ہے سادگی میں حسن کا رُخِ گلنار　　تکلّفات میں ہم ڈھونڈھتے رہے بیکار
ہواؤ آؤ چلو سادگی سے پیار کریں
خزاں کی گود سے پیدا نئی بہار کریں

چلیں گے اکبر عباس یوں برات لیے　　کہ جیسے چاند چلے حسن کائنات لیے
اِک اپنے دل میں ہزاروں دِلوں کی بات لیے　　خموشیوں میں بھی ہنگامۂ حیات لیے
زمیں پہ فرش رہے بادلوں کی چھاؤں کا
ستارے چھتر سنبھالے رہیں دُعاؤں کا

گواہ ہوں قلعۂ سُرخ کے دَر و دیوار　　وکیل مسجدِ جامع کے گنبد و مینار
براتیوں میں ہو دلّی کی گرمیِ بازار　　بجائے پھول کے سہرے میں گوندھئے اشعار
نہ رنگ اُڑے گا نہ کم ہوسکے گی بو ان کی
ہمیشہ بڑھتی ہی جائے گی آبرو اُن کی

روانہ دلّی سے ہو قافلہ سوئے مشہد　　ملی ہے جنتِ فردوس کی جہاں سرحد
خدا کے فضل کا ہے جس جگہ حساب نہ حد　　جہاں کی خاک فرشتوں کے واسطے مسند
وہیں گناہ محبت کی ابتدا ہوگی
یہ رسم عقد اسی خاک پر ادا ہوگی

اگرچہ ساز نہ شہنائیاں وہاں ہوں گی نہ قمقموں کی طرحدار جالیاں ہوں گی
نہ دورِ بادہ و ساغر کی مستیاں ہوں گی نہ جام ہوں گے نہ مئے کی گلابیاں ہوں گی
مگر نہ ہونے کا اُن کے گلہ نہیں ہوگا
ملے گا وہ بھی جو اَب تک ملا نہیں ہوگا
رہیں گے دولہا دُلہن شاد مثل لالہ و گل سبق انھیں سے محبت کا سیکھے گی بلبل
چکور چاند سے رہتا ہے جس طرح مل جل قریب رہتے ہیں جس طرح شانہ و کاکل
یونہی قریب یہ محبوب اور حبیب رہیں
جس انجمن میں رہیں بن کے خوش نصیب رہیں

اُدھر ہے باغباں کو فکر دامن گیر پھولوں کی اِدھر ہے کھینچنی الفاظ میں تصویر پھولوں کی
انوکھے رنگ بھی ہوں اور خوشبو بھی نرالی ہو بہاروں سے کہو ایسی کریں تدبیر پھولوں کی
کہاں گلشن کہاں یہ جگمگاتی محفلِ شادی کہاں سے کھینچ کر لائی کہاں تقدیر پھولوں کی
یہ محفل ہی نہیں کوچے بھی گلیاں بھی معطر ہیں ہواؤں میں بھی پیدا ہوگئی تاثیر پھولوں کی
گلستاں خواب میں حاجی ظہیر احسن نے دیکھا تھا صغیر احمد کے سہرے سے ملی تعبیر پھولوں کی
زمانہ آ گیا قیدِ محبت کا مبارک ہو صغیر احمد کو پہنائی گئی زنجیر پھولوں کی
حفیظِ محترم بھی جھومتے ہیں مسکراتے ہیں شرابِ معرفت سے کم نہیں تاثیر پھولوں کی
کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہے حسد سے جلنے والوں کا گلے پر دُشمنوں کے چل گئی شمشیر پھولوں کی
کچھ اس انداز سے نوشاہ سہرا باندھ کر آیا دِلوں پر دوستوں کے کھنچ گئی تصویر پھولوں کی
یہاں جو آیا پھولوں کی ہوس لیتا ہوا آیا یہاں سے جو گیا پہنے گیا زنجیر پھولوں کی

کچھ ایسے حسن سے عاجؔز لکھا ہے تم نے یہ سہرا
ہر اِک مصرع ہے گویا خوشنما تحریر پھولوں کی

بزم میں صدر نشیں ہے کوئی نوشہ دیکھو
دیکھنے کا یہی موقع ہے سہرا دیکھو

آج چوکوگے تو کل ہاتھ نہ مَلنا دیکھو
پھر نہ دیکھو گے کہیں ایسا تماشا دیکھو

رنگ و خوشبو کی سمٹ آئی ہے دُنیا دیکھو
کھل گیا گلشنِ جنت کا جھروکا دیکھو

ایک سے ایک کی رونق ہے دوبالا دیکھو
پھول سے منہ پہ ہے کیا پھول کا سہرا دیکھو

ہے ہر اِک پھول چمکتا ہوا تارا دیکھو
تاروں کے بیچ میں ہے چاند سا مکھڑا دیکھو

سہرے والا بھی حسیں پھول کا سہرا بھی حسیں
کون ان دونوں حسینوں میں ہے اچھا دیکھو

پھول ہی پھول ہر اِک سمت نظر آتے ہیں
پھولوں کا اَبر اُٹھا اُٹھ کے وہ برسا دیکھو

جس کا جی چاہے سبو بھولے صراحی بھر لے
جوش میں عیش و مسرت کا ہے دریا دیکھو

آج کی رات ہوا میں بھی ہے تاثیر شراب
جھوم کر رہ گیا محفل میں جو آیا دیکھو

آج وہ دن ہے کہ قابو سے ہوئے ہیں باہر
حسرت و آرزوئے شوق و تمنّا دیکھو

جتنے احباب ہیں نوشاہ پر پروانہ ہیں
ہر طرف چاہنے والوں کا ہے ریلا دیکھو

شاعری ہم تو سمجھتے تھے بہت مشکل ہے
لو مظفر بھی سنانے لگے سہرا دیکھو

تو نے نوشاہ جو باندھا ہے جبیں پر سہرا
ہورہا ہے تری صورت پہ نچھاور سہرا

مستِ ہے پی کے مئے حسن کا ساغر سہرا
اپنے جامے سے ہوا جائے ہے باہر سہرا

دستِ گل چیں نے جو باندھا ہے ترے سر سہرا
سو بہاروں کا نچوڑا ہوا جوہر سہرا

تیرے چہرے کی جو معراج ملی ہے اس کو
پاؤں کب ناز سے رکھتا ہے زمیں پر سہرا

اہلِ محفل کی نگاہیں ذرا ہشیار رہیں
اُڑنے والا ہے پَرِ شوق لگا کر سہرا

باغ سے دامنِ گل چیں میں پھر اس محفل میں
آرہا ہے کئی منزل سے گزر کر سہرا

ہاتھ میں مطربِ فطرت کے کوئی ساز ہے یہ
یا کسی حور کی ہے زلفِ معنبر سہرا

دیکھ اے چشمِ زمانہ کہ کسی چہرے کو
نہ ہوا ہوگا کبھی ایسا میسر سہرا

چشمِ احباب کا ہے نور تو دل کی ٹھنڈک
جلنے والوں کے کلیجہ پہ ہے نشتر سہرا

بہ تقریب شادی نواسی منظور عالم صاحب (پاٹلی پترہ)

شادی امریکہ میں ہوئی

معجزہ اے خدا یہ تیری خدائی کا ہے — تیری قدرت میں کسی اور کا کیا ٹھیکا ہے
یہ کرشمہ بھی تری قدرتِ عالی کا ہے — پاٹلی پترہ کہاں اور کہاں امریکا ہے
کھینچ لایا ہمیں کچھ دیر کے اندر تونے
کردیا ایک قدم سات سمندر تو نے

اس لیے ہم نہیں آئے کہ تماشہ دیکھیں — ہیوسٹن دیکھیں ڈلس دیکھیں اُوٹاوا دیکھیں
آرزو یہ نہیں کہ امریکہ کناڈا دیکھیں — ہم تو آئے ہیں کہ نازش ترا سہرا دیکھیں
تیرا قد تیری جبیں تیرا سراپا دیکھیں
سہرا باندھے ہوئے لگتا ہے تو کیسا دیکھیں

ملک جیسا بھی ہواس ملک میں وہ بات کہاں — وہ ہماری روش و رسم و روایات کہاں
وہ بری اور وہ خلعت کہاں بارات کہاں — سمدھی سمدھن کے لیے تھالی کی سوغات کہاں
تھوڑی ہی دیر سہی رسم کہن تازہ کریں
ہم تو آئے ہیں کہ خوشبوئے وطن تازہ کریں

ہاں چل اے بادِ صبا پھول کا سہرا لیے چل — مژدۂ آرزو پیغامِ تمنّا لیے چل
ہار نوشے کا دُلہن کے لیے گہنا لیے چل — لب کی سُرخی لیے چل آنکھوں کا سرمہ لیے چل
دولہا دُلہن کو سلیقے سے سنوارا جائے
دونوں کو حسن کے سانچے میں اُتارا جائے

گلِ شاداب کی بلبل کی نوا کی خوشبو　　کیوڑے کی بیلے کی جوہی کی حنا کی خوشبو
دل کے ارمانوں کی ہونٹوں کی دُعا کی خوشبو　　پیار کی خوشبو محبت کی وفا کی خوشبو
ہم انھیں خوشبوؤں سے لائے بنا کر سہرا
تجھ کو امریکہ کہاں ایسا میسر سہرا

اسی سہرے میں کناڈا کو گرفتار کریں　　شہر صہبؔا کا ہے اس شہر سے ہم پیار کریں
خوشبوؤں سے یوں معطر در و دیوار کریں　　لوگ اس شہر کے، بے ساختہ اقرار کریں
یہ وہ نعمت ہے کہ قدرت نے ہمیں دی ہی نہیں
ایسی خوشبو کبھی اس شہر میں برسی ہی نہیں

نہیں یہ سہرا کسی ملک کی ملکہ کے لیے　　یہ تو ہے ہند کے اِک حسن دلآرا کے لیے
پاٹلی پترہ کی اِک دخترِ رعنا کے لیے　　سہرا یہ خاص ہے پیشانیِ صہبؔا کے لیے
جس کے دیدار کو سب بیٹھے ہیں حلقہ باندھے
اُسی محبوب کو حق ہے کہ یہ سہرا باندھے

زندگی دولہا دُلہن کی ہو بسر پھولوں میں　　شام پھولوں میں گزر جائے سحر پھولوں میں
ان کا مسکن رہے پھولوں میں سفر پھولوں میں　　شہر پھولوں میں مکاں پھولوں میں گھر پھولوں میں
دن بھی پھولوں کا رہے رات رہے پھولوں کی
عمر بھر اُن سے ملاقات رہے پھولوں کی

یہ محفل محفلِ شادی ہے آئے جس کا جی چاہے
علی عبّاس کے جی میں سمائے جس کا جی چاہے
انھوں نے سیکڑوں احسان مند اپنے بنائے ہیں
انھیں احسان مند اپنا بنائے جس کا جی چاہے
یہاں سوزِ طبیعت بھی ہے اور سازِ تبسم بھی
جو چاہے سوز لے لے ساز اٹھائے جس کا جی چاہے
کسے کیا چیز مل جائے گی ہم کچھ کہہ نہیں سکتے
مقدر اپنا اپنا آزمائے جس کا جی چاہے
فضا گوکل کی ہے موسم ہے بندرابن کا اس گھر میں
اَلاپے گنگنائے گیت گائے جس کا جی چاہے
غم و رنج والم کے دفتروں میں آج چھٹی ہے
ہنسے جی چاہے جس کا مسکرائے جس کا جی چاہے
یہ محفل کیا ہے اِک میخانہ ہے دورِ محبت کا
پیئے اس میکدے میں اور پلائے جس کا جی چاہے
خدا کے فضل سے سلمہ ستارے کی طرح چمکے
دُعا کا وقت ہے یہ ہاتھ اٹھائے جس کا جی چاہے
محبت کی نظر سے چل رہی ہیں ہر طرف چوٹیں
مزے کی چوٹ ہے یہ چوٹ کھائے جس کا جی چاہے
عظیم آباد کی مسند پہ ہے مسند نشیں اعظم
مبارک باد کی بنسی بجائے جس کا جی چاہے

ریحانؔ سر سے باندھ کے سہرا جو آئے ہے
تقدیر چاند تاروں کی شرمائی جائے ہے

یوں بے تکلفی سے صبا گدگدائے ہے
بے ساختہ گلوں کو ہنسی آئی جائے ہے

سہرے پہ رشک اس لیے دُنیا کو آئے ہے
دو اجنبی گھروں کو یہ پھولوں سے چھائے ہے

ہر ہر قدم پہ مچلے ہے یوں سہرے کی لڑی
جیسے شراب پی کے کوئی لڑکھڑائے ہے

ایسا لگے ہے شاخ پہ پتّوں کو دیکھ کر
جیسے کوئی دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہے

محفل تمام سہرے کی خوشبو سے مست ہے
اللہ جس کو دے ہے وہ یوں ہی لٹائے ہے

ہلکے قدم سے ناچ رہے ہیں تمام دل
دھیمے سروں میں ساری فضا گنگنائے ہے

ایسی بہار بن کے رہیں دولہا اور دُلہن
جس سے یہ سارا باغ جہاں مسکرائے ہے

روز اِک نئی بہار ہو دونوں کے واسطے
ہر صبح جیسے تازہ کلی مسکرائے ہے

ہر روز روزِ عید ہو ہر شب شبِ برات
موجِ صبا یہ مصرعِ آتش سنائے ہے

بہ تقریب شادی خالد رشید صبا

یہ کس کی آرزو کرتے ہیں پھول سہرے کے
کہ شام ہی سے سنورتے ہیں پھول سہرے کے

کچھ اس ادا سے عروسِ بہار آئی ہے
قدم قدم سے اُبھرتے ہیں پھول سہرے کے

ٹپک رہی ہے جبینِ بہار سے شبنم
نہا نہا کے نکھرتے ہیں پھول سہرے کے

چمن کے دوسرے پھولوں میں یہ جمال نہیں
کس آئینے میں سنورتے ہیں پھول سہرے کے

بکھیرتے ہوئے جاتے ہیں نکہتِ شادی
جہاں جہاں سے گزرتے ہیں پھول سہرے کے

نیاز و ناز کا پردہ نہ رہ سکا باقی
بڑا کمال یہ کرتے ہیں پھول سہرے کے

سرورِ کیف سے محروم شیشۂ دل میں
شراب بن کے اُترتے ہیں پھول سہرے کے

یہ دور وہ ہے کہ حسن و شباب کا دامن
گلِ مراد سے بھرتے ہیں پھول سہرے کے

دعائے نور سے خالد رشید کے سر پر
ستارے بن کے بکھرتے ہیں پھول سہرے کے

یہی نہیں کہ یہ بے حد حسین ہیں عاجزؔ
حسین کام بھی کرتے ہیں پھول سہرے کے

(۱۲را کتوبر ۱۹۵۷ء)

بتقریب شادی فوزیہ بنت ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

(مکہ مکرمہ)

تمنّائیں سراپا بن کے رحمت خواہ جاتی ہیں دعائیں چشم و کف برداشتہ ہمراہ جاتی ہیں
صدا آئی کہاں جاتی ہیں؟ کس درگاہ جاتی ہے جواب آیا کہاں جائیں گی؟ بیت اللہ جاتی ہیں

زمیں سے آسماں تک اور دروازہ نہیں کوئی
وہاں جا کر کہاں جائیں گی اندازہ نہیں کوئی

جہاں لے جائے بیت اللہ سے غیبی سڑک جائیں جہاں جاتی نہیں ہے ماہ و انجم کی چمک جائیں
زمیں بعد از زمیں جائیں فلک بعد از فلک جائیں اور آخر منصبِ معراج پائیں عرش تک جائیں

پھر اس کے بعد وہ سب کچھ وہاں کہہ دیں جو کہنا ہے
وہاں تو گفتگو جاری ہی رکھنا، چپ نہ رہنا ہے

وہاں کہنا ہے رحمت بھیج عبداللہ ندوی پر جو برسوں سے پڑا ہے شہر میں تیرے گدا بن کر
وہ کب سے شارعِ منصور پر پھیلائے ہے چادر طلبگارِ کرم باچشم نمناک و دلِ مضطر

بہارِ خیر و برکت گھر میں آئے اور بس جائے
اُٹھے اَبرِ کرم اور چپے چپے پر برس جائے

دُلہن بن جائے ان کی فوزیہ تاروں کی چھاؤں میں ہمیشہ زندگی گزرے مسرّت کی فضاؤں میں
تقدس زندگی کا گھر میں ہو خوشبو ہواؤں میں کلی کھلتی رہے دل کی بزرگوں کی دعاؤں میں

خوشی سے باپ ماں سرشار ہوں مسرور ہو جائیں
بہن بھائی محبت کے نشے میں چور ہو جائیں

ڈاکٹر مظہر الحق

ریحانہ سلمہا کے شوہر (میری لینڈ، امریکہ)

مظہر الحق! تم عزیزوں میں تھے پر بات ہے یہ
اور قریب آ گئے تم حسنِ کرامات ہے یہ

یوں تو ہر بات ہے اللہ کا احسان و کرم
دل سے مل جائے اگر دل تو بڑی بات ہے یہ

رشتۂ دل میں ہے پوشیدہ دو عالم کا کمال
دولت و سلطنتِ ارض و سماوات ہے یہ

رشتۂ دل پہ برستی ہے خدا کی رحمت
سببِ خیر ہے یہ موجبِ برکات ہے یہ

رشتۂ دل سے ہیں رنگین شب و روز حیات
سب سے خوشرو ہے یہ دن سب سے حسیں رات ہے یہ

رشتۂ دل ہی وہ رشتہ ہے جو سب کو ہے عزیز
سب سے جو بات پسندیدہ ہے وہ بات ہے یہ

رشتۂ دل نے فرشتوں سے کیا اس کو بلند
دَہر میں حضرتِ انساں کی کرامات ہے یہ

رشتۂ دل تمھیں حاصل ہے تو سب حاصل ہے
آدمی کے لیے سب سے بڑی اوقات ہے یہ

تم کو ریحانؔہ کو خوشیوں کا سمندر ہو نصیب
صبح آج اُٹھ کے مری پہلی مناجات ہے یہ

اگر الفاظ میں جذبات کے موتی ڈھل جائیں
ایک شاعر کے لیے سب سے بڑی بات ہے یہ

اور کیا دوں میں مسافر ہوں یہی دیتا ہوں
رونمائی بھی ہے سوغات کی سوغات ہے یہ

بتقریب شادی شعیب احمد

(اسلام پور)

سہرا شعیب کا ہے کھلائے گئے ہیں پھول
چن چن کے دُور دُور سے لائے گئے ہیں پھول

شبنم سے دھوکے چاند کی کرنیں لپیٹ کے
خوشبوئے عطرِ گل میں بسائے گئے ہیں پھول

گوندھا نہیں گیا ہے کہ نازک بہت ہیں یہ
لڑیوں پہ کہکشاں کی جمائے گئے ہیں پھول

پھول اس قدر کھلے کہ خزاں بھی بنی ہے چور
آج اس کی آستیں میں بھی پائے گئے ہیں پھول

گزرے جہاں بھی آج گئے جس طرف بھی آج
دیکھے گئے ہیں پھول دکھائے گئے ہیں پھول

اس طرح لڑکھڑائیو اس طرح جھومیو
کیا کیا ادا و ناز سکھائے گئے ہیں پھول

محفل بھی یہ حسیں ہے حسیں شامیانہ بھی
تارے ہیں آسماں پہ کہ چھائے گئے ہیں پھول

کچھ اس میں احترام ہے کچھ اس میں پیار ہے
آنکھوں سے دوستوں کی لگائے گئے ہیں پھول

باراتیوں کا نقشِ قدم ہے زمین پر
یا راہ میں دُلہن کی بچھائے گئے ہیں پھول

سہرا نہیں لکھا ہے جنابِ کلیمؔ نے
الفاظ کی مدد سے بنائے گئے ہیں پھول

بتقریب شادی افضل امام

(ٹورنٹو)

یہ کس کے نکلنے کا ساماں ہے آج — کہ چھڑکاؤ میں اَبر باراں ہے آج
یہ کس چاند کے رَشک میں اپنا منہ — چھپائے ہوئے ماہِ تاباں ہے آج
مسرّت کی ہر سمت برسات ہے — غمِ دل نہ آلامِ دوراں ہے آج
ہر اِک نخل ہے سروقد کی طرح — ہر اِک شاخ زُلفِ پریشاں ہے آج
زمانہ بھی ہے مطمئن مطمئن — ہوا بھی خراماں خراماں ہے آج
ہر اِک آدمی آج ہے باغ باغ — ہر اِک دل گلستاں گلستاں ہے آج
مسلماں تو ہے سُرخ رو سُرخ رو — منافق پشیماں پشیماں ہے آج
بنا آج نوشاہ افضل امام — ہر اِک آرزو گل بداماں ہے آج
یہی آج ہے رونقِ انجمن — یہی بزم میں جانِ جاناں ہے آج
یہی ہے سرورِ دلِ دوستاں — یہی راحتِ قلبِ یاراں ہے آج
جو آوارہ صحرا بہ صحرا رہا — وہ دیوانہ قیدئ زنداں ہے آج

مبارک یہ سہرے کی زنجیر ہو
جو دُشوار تھا کل وہ آساں ہے آج

بتقریب شادی نسیم احمد ڈی آئی جی کی بیٹی

اے نسیم آؤ دُعاؤں کا یہ سہرا باندھو ہار اُمیدوں کا ارمانوں کا گجرا باندھو
کلۂ شوق پہ دستارِ تمنّا باندھو اونچی نیّت کرو اونچا ارادہ باندھو
انشاء اللہ مقدر نہ ادھورا ہوگا
جو ارادہ کرو گے آج وہ پورا ہوگا

یہ ارادہ کرو ہر بات رہے پھولوں کی دن بھی پھولوں کا رہے رات رہے پھولوں کی
دامن وجیب میں سوغات رہے پھولوں کی عمر بھر تم سے ملاقات رہے پھولوں
زندگی دونوں کی ہو پھولوں کی خوشبو کی طرح
ہو اندھیرا تو چمکتے رہو جگنو کی طرح

پھول انجام ہو تم دونوں کا آغاز ہو پھول ہر اِک اُسلوب ہر اِک طرز ہر انداز ہو پھول
دونوں کے منہ سے جو باہر ہو وہ آواز ہو پھول یعنی ہر گیت ہر اِک نغمہ ہر اِک ساز ہو پھول
کوئی گل رو ہو کوئی غنچہ دہن ہوجائے
زندگی دونوں کی پھولوں کا چمن ہوجائے

میں کوئی سنت نہیں شیخ نہیں پیر نہیں خالقِ شعر ہوں میں کاتبِ تقدیر نہیں
گرچہ میری زباں خنجر نہیں شمشیر نہیں یہ نہیں ہے کہ مری بات میں تاثیر نہیں
جوش جذبات میں جب آدمی کھو جاتا ہے
پھر جو کہہ دیتا ہے اکثر وہی ہوجاتا ہے

بتقریب شادی احتشام الحق
ولد محمد ولی الحق، اے ڈی ایم

سہرے میں کس چمن کی بہاروں کے پھول ہیں
شرمندہ جن سے چاند ستاروں کے پھول ہیں

کشمیر کے حسین نگاروں کے پھول ہیں
یا شالا مار تیرے چناروں کے پھول ہیں

برسے ہیں پھول یہ سفر ماہتاب سے
یا کہکشاں کی راہ گزاروں کے پھول ہیں

ترکانِ شہر حافظِ شیراز کے ہیں پھول
یا اصفہاں کے لالہ عذاروں کے پھول ہیں

آئے ہیں گلستانِ سمرقند سے یہ پھول
یا گلشنِ ختن کے بہاروں کے پھول ہیں

کیا کامروپ والوں کے گجرے کے ہیں یہ پھول
یا کوہ قاف والوں کے ہاروں کے پھول ہیں

گنگا تری حسین ترائی سے آئے ہیں
یا وادیٔ جمن کے کناروں کے پھول ہیں

بیدرد حسن والوں کی ہیں یہ ہنسی کے پھول
یا عاشقوں کے دل کے شراروں کے پھول ہیں

یہ سب مبالغہ ہوا ، سچ بات تو یہ ہے
یہ دوستوں کے پھول ہیں یاروں کے پھول ہیں

آئے ہیں چُن کے گلشنِ اُمید سے یہ پھول
گلزارِ آرزو کی بہاروں کے پھول ہیں

سہرا جو سر سے باندھ کے بیٹھے ہیں احتشام
اس کی ہر اِک لڑی میں ہزاروں کے پھول ہیں

برسوں جو ٹمٹماتے رہے دل میں اے ولیؔ
یہ پھول انھیں چمکتے ستاروں کے پھول ہیں

کسی کے واسطے رحمت کا جب فیضان ہوتا ہے　　کوئی ساماں نہ ہو لیکن ہر اِک سامان ہوتا ہے
خدا پر صابر و شاکر اگر انسان ہوتا ہے　　وہ پورا ہو کے ہی رہتا ہے جو ارمان ہوتا ہے

مصیبت جو بھی سر پر آتی ہے وہ زیر ہوتی ہے
کبھی اندھیر ہوتا ہی نہیں ہاں دیر ہوتی ہے

ہوا گلشن سے جب آتی ہے کچھ آواز آتی ہے　　کہ جیسے باغ میں پھولوں کی رانی گنگناتی ہے
فضا اِک وجد میں انگڑائی لے کر مسکراتی ہے　　طبیعت مست ہو کر ناچتی ہے جھوم جاتی ہے

چمن کے واسطے یہ سال سالِ کامیابی ہے
کھلے ہیں پھول اتنے ہر طرف منظر گلابی ہے

سمیع اختر کے گھر بھیجو مبارک باد سہرے کی　　ہزاروں سال تک لڑیاں رہیں آباد سہرے کی
دِلوں میں دُور تک گہری رہے بنیاد سہرے کی　　کہیں ہو ذکر سہرے کا کہیں ہو یاد سہرے کی

یہ شادی اِک نئی فصل بہاراں کی علامت ہو
چمن کے گوشے گوشے میں نئی بارانِ رحمت ہو

دِلوں میں جذبۂ اُلفت اُٹھے انگڑائیاں لے کر　　بہار آئے نئی پچھوائیاں پُروائیاں لے کر
فرشتے آئیں تازہ انجمن آرائیاں لے کر　　نئے نغمے نئی غزلیں نئی شہنائیاں لے کر

ہر انساں گیت بن جائے ہر اِک دل ساز بن جائے
یہ شادی اِک حسیں انجام کا آغاز بن جائے

یہ بستی سنتے آئے نام ہے رمضان پور اس کا　　رہا ہوگا کبھی ہر ایک باشندہ غیور اس کا
یہ شادی برکتوں کی ہے اثر ہوگا ضرور اس کا　　خدا پیدا کرے کھویا ہوا پھر اس میں نور اس کا

سمیع اختر اُمیدوں کا علم بردار بن جائیں
یہ بستی کارواں وہ کارواں سالار بن جائیں

بتقریب شادی دختر جناب شبیر ونک مالک وانکوس، پاٹلی پترا

اے قلم اِک نیا عالم تاثیر بنا اِک نئی انجمنِ میر تقی میرؔ بنا
لفظ سے پھول کبھی اور کبھی شمشیر بنا کبھی دل شاد بنا اور کبھی دل گیر بنا
اپنے اشعار سے یہ کام بھی وہ کام بھی لے
مسکرائے کبھی وہ اور کبھی دل تھام بھی لے

عقدِ کلثومؔ و خزیمہؔ کی یوں تصویر بنے اِک بنے نور جہاں ایک جہانگیر بنے
وہ جو اِک خواب تھا اس خواب کی تعبیر بنے یعنی دونوں کے لیے پھولوں کی زنجیر بنے
ہتھکڑی پھولوں کی پاؤں میں رسن پھولوں کی
عمر بھر قید میں ہوں دولہا دُلہن پھولوں کی

دن بھی پھولوں کا رہے رات رہے پھولوں کی ذکر پھولوں کا رہے بات رہے پھولوں کی
سر پہ چھائی ہوئی برسات رہے پھولوں کی عمر بھر اُن سے ملاقات رہے پھولوں کی
نہ کبھی ختم ہو پھولوں کی کہانی اُن کی
پھولوں میں کھیلا کرے ساری جوانی اُن کی

ان کا ہر طرز ہو پھول ان کا ہر انداز ہو پھول ان کے ہر کام کا انجام اور آغاز ہو پھول
ان کا ہر گیت ہر اِک نغمہ ہر اِک ساز ہو پھول ان کے ہونٹوں سے جو باہر ہو وہ آواز ہو پھول
کوئی گلفام کوئی غنچہ دہن ہو جائے
زندگی دونوں کی پھولوں کا چمن ہو جائے

زندگانی مہ و انجم کی پناہوں میں رہے چاند سورج کی کرن دونوں کی بانہوں میں رہے
چاندنی ان کے خیالوں میں نگاہوں میں رہے روشنی گھر میں رہے روشنی راہوں میں رہے
کوئی مشکل نہ ہو ایسی جو نہ آساں ہو جائے
پاؤں ویرانے میں رکھیں تو گلستاں ہو جائے

میں کوئی سنت نہیں شیخ نہیں پیر نہیں خالق شعر ہوں میں کاتبِ تقدیر نہیں
میں گو غالبؔ نہیں اقبالؔ نہیں میرؔ نہیں یہ نہ سمجھو کہ میری بات میں تاثیر نہیں
اہلِ دل جب کبھی جذبات میں کھو جاتا ہے
جو وہ کہہ دیتا ہے اکثر وہی ہو جاتا ہے

بتقریب شادی نسیم احمد (ڈی آئی جی) کی بیٹی

کہاں چھپے ہوئے ہو سامنے تو آؤ نسیم
مصافحہ کے لیے ہاتھ تو بڑھاؤ نسیم
ہمیں بھی اپنا شریکِ خوشی بناؤ نسیم
ہم اپنے سازِ غزل چھیڑیں تم بھی گاؤ نسیم
بہت بہانہ کیے ہو بہت پھرائے ہو
نسیم آج بہت دن پہ ہاتھ آئے ہو

بہت دِنوں پہ چمن کی ہوا پھری ہے آج
چمن سے جھومتی بادِ صبا پھری ہے آج
گئی تھی سرنگوں با حوصلہ پھری ہے آج
قبولیت کے نشہ میں دُعا پھری ہے آج
خبر یہ لائی ہے محفل سجاؤ پھولوں کی
تمام شہر میں چادر بچھاؤ پھولوں کی

کہو کہ قمریاں لب پہ لیے ترانے آئیں
مغنیوں سے کہو لیکے شایانے آئیں
امیر خسرو کے شاگرد گیت گانے آئیں
جو بھگت کرشن کے ہیں بانسری بجانے آئیں
کہو ہر ایک سے قصہ سنائے پھولوں کا
بہار آئی ہے سہرا اُٹھائے پھولوں کا

عجب کرم ہے عجب شانِ کبریائی ہے
عجب بلندی ہے اس کی عجب بڑائی ہے
قسم خدا کی عجب قدرتِ خدائی ہے
ایک عید گزری ابھی دوسری پھر آئی ہے
خدا جو چاہے تو بیمار پر شفا برسے
خزاں کے دور میں پھولوں کا ڈونگرا برسے

سروں سے زیبؔا و شاہدؔ کے جب بندھا سہرا
کچھ ایسا مست ہوا جھومنے لگا سہرا
جو غیر تھے انھیں اپنا بنا گیا سہرا
دِلوں میں ڈال گیا رشتۂ وفا سہرا
دو اجنبی دِلوں میں پیار کا بہانہ ہے
ہے نام سہرا تو کام اس کا عاشقانہ ہے

بہت دِلوں نے اُمیدوں کے رُخ سنوارے ہیں
بہت دِلوں نے دعاؤں میں دن گزارے ہیں
خدا نے تب رُخِ زیبا کے پھول اُتارے ہیں
جو پھول سب کے ہیں محبوب سب کو پیارے ہیں
تمام عمر یہ خوشبو رہے نکھار رہے
خدا کرے کہ یہ سہرا سدا بہار رہے

ہر دُکھ کی ہر مرض کی دوا لے کے آئی ہے
فصلِ بہار فضلِ خدا لے کے آئی ہے

افسردہ روح کے لیے پیغام تازگی
غم کے لیے پیامِ قضا لے کے آئی ہے

یوں تو حسین ہوتی تھی ہر سال کی بہار
اس سال ایک خاص ادا لے کے آئی ہے

ہر پھول کی زبان پہ ہیں نیک خواہشات
ہر غنچے کے لبوں پہ دُعا لے کے آئی ہے

کیا کیا کوئی بتائے کہ اس سال کی بہار
کیا کیا نویدِ بیش بہا لے کے آئی ہے

جھولی میں دیکھئے تو ہے سوغات بھی نئی
تحفہ بھی دیکھئے تو نیا لے کے آئی ہے

سچ بات تو یہ ہے کہ شبانہؔ کے واسطے
سہرے کے پھول بادِ صبا لے کے آئی ہے

آرائشِ عروس کا سامان ہے یہی
بوئے سہاگ و رنگ حِنا لے کے آئی ہے

بزمِ چمن کے واسطے پرویزؔ نام کا
اِک عندلیب شیریں نوا لے کے آئی ہے

دولہا کے واسطے کلۂ کار چوب ہے
دُلہن کا مدانی قبا لے کے آئی ہے

پوچھو اگر نسیمؔ سے تو بول اُٹھیں گے وہ
گرمی کی لوُ میں ٹھنڈی ہوا لے کے آئی ہے

نورِ نظر تبسّمِ لب چستئ بدن
رگ رگ میں کیفِ روح فزا لے کے آئی ہے

اور ساتھ ساتھ بزم کے ہر دوست کے لیے
موسم ہرا گلاس بھرا لے کے آئی ہے

آخر میں نظم پھر اسی مصرعے پہ ختم ہو
فصل بہار فضلِ خدا لے کے آئی ہے

یہ فروری کی رات یہ موسم یہ ہوائیں　　احباب کو پہنچاؤ سلام اور دُعائیں
کچھ گرمیِ محفل کا بھی ساماں کریں آئیں　　دیپک کا کوئی راگ کوئی راگنی گائیں
جل اُٹھیں جسے سن کے چراغوں کی طرح دل
کھلنے لگیں کشمیر کے باغوں کی طرح دل

اس موسمِ سرما میں دِلوں کو ہے ضرورت　　چھیڑے کوئی افسانۂ گرمیِ محبت
جکڑے ہوئے سینوں میں پھر آ جائے حرارت　　پھر رقص کریں جھوم کے یارانِ طریقت
خوشبوئے محبت درودیوار میں بس جائے
پھر اَبرِ بہاراں اُٹھے اور پھول برس جائے

کیا لطف ہے گر صحنِ گلستاں میں رہیں پھول　　ہم چاہتے ہیں ہر کفِ انساں میں رہیں پھول
دامن میں رہیں پھول گریباں میں رہیں پھول　　آنکھوں میں رہیں دل رہیں جاں میں رہیں پھول
پھولوں سے زمانے میں سروکار بڑھاؤ
بازار کو پھیلاؤ خریدار بڑھاؤ

ہاں چل اے قلم محفلِ شادی میں کھلا پھول　　پرویز علی پھول ہے پھولوں سے ملا پھول
اے بادِ صبا گلشنِ فردوس سے لا پھول　　یہ پھول سامنہ آج نہ رہ جائے بلا پھول
ہم پھول کو پھولوں سے جدا رکھ نہیں سکتے
یہ جرم ہے اور جرم روا رکھ نہیں سکتے

پھولوں میں سجی آتی ہے پرویزؔ کی بارات　　گلشن کو مبارک گل و بلبل کی ملاقات
یہ جوڑا یہ رشتہ یہ کرشمہ یہ کرامات　　کیا بات ہے کیا بات ہے کیا بات ہے کیا بات
آباد یہ دولہا یہ دُلہن شاد رہے گی
شاعر کی دُعا ہے یہ دُعا یاد رہے گی

بتقریب شادی اپنی بہن سعیدہ کے نواسے ریحان احمد

شادی، ورجینیا امریکہ (۲۰۰۰ء)

بہار کے موسم آرہے ہیں خزاں کے اب دَور جارہے ہیں
کہ شاخ شاخ آج جھومتی ہے شجر شجر گنگنارہے ہیں

چمن کے دیوار و دَر کو مالی سجا رہے ہیں بنا رہے ہیں
گلوں نے چھیڑا ہے گیت شادی کا، پتّے تالی بجارہے ہیں

پہن کے پوشاک شادیانہ ادھر جو ریحانؔ آرہے ہیں
سبھی کی آنکھوں میں کھب رہے ہیں سبھوں کے دل میں سمارہے ہیں

گلوں کے پیغام ہرطرف سے ریحان کے نام آرہے ہیں
اسی طرف پھول گر رہے ہیں جدھر نگاہیں اُٹھارہے ہیں

حسین اور دل نشیں ترنّم میں سہرا طارقؔ جو گارہے ہیں
وہ خود بھی دیوانے بن رہے ہیں ہمیں بھی پاگل بنارہے ہیں

چمن کے احباب پھول لے کر سب اُن کا سہرا بنارہے ہیں
مگر ابھی سر سے باندھنے کا وہ کوئی موقع نہ پارہے ہیں

یہ رسم تو ہندو پاک کی ہے مگر یہ ملک امریکہ ہے
یہاں کے رسم و رواج سے وہ ٹھٹک رہے ہیں لجارہے ہیں

اگرچہ ریحانؔ کی جبیں پر گلوں کا سہرا نہیں تو کیا ہے
نظر میں کلیاں چٹک رہی ہیں لبوں پہ گل کھلکھلارہے ہیں

پہن کے شیروانی اور عمامہ کہیں کا شہزادہ لگ رہا ہے
جبیں پہ ایسی چمک دَمک ہے ستارے بھی مسکرا رہے ہیں

اگرچہ اس بزم امریکہ میں پرندوں کو پرمیشن نہیں ہے
کہیں وہ دُور اپنے گھونسلوں میں ترانہ شادی کا گا رہے ہیں

بلانے والے کہ آنے والے ہیں دونوں آپس میں پیار والے
بلانے والے بلا رہے ہیں تو آنے والے بھی آ رہے ہیں

گلوں کی خوشبو تو دو گھڑی کی دِلوں کی خوشبو تو مستقل ہے
یہاں جو احباب آ رہے ہیں وہ خوشبوؤں میں نہا رہے ہیں

خوشی کی شب میں خوشی کے مہماں خوشی کا اظہار کر رہے ہیں
سب اپنے اپنے لباس میں ہیں سب اپنی سج دھج دکھا رہے ہیں

خدا تمھیں اور تمھارے گھر بھر کو یاد و آباد و شاد رکھے
جو لوگ ملنے کو آ رہے ہیں دُعائیں دے دے کے جا رہے ہیں

کلیم عاجؔز کو دیکھئے مت بس ان کے اشعار سنتے رہیے
یہ ہم جو تعریف کر رہے ہیں وہ شرم سے سر جھکا رہے ہیں

افضال کی ہے شادی میرے گھر میں عید ہے
تاریخ بھی سعید ہے دن بھی سعید ہے
بیشک مرے لیے یہ خوشی کی نوید ہے
خوش ہوں گے آپ بھی مجھے پوری اُمید ہے
اللہ کے کرم سے ہو تقریب کامیاب
تشریف آپ لائیں تو برکت مزید ہے

بتقریب شادی ڈاکٹر شبیر اشرف ولد ڈاکٹر کمال اشرف

پیار کا رستہ ہے یہ، جو پیار کا رستہ چلے
چلنے والے پر خدا کے فضل کا سایہ چلے

دیر سے آراستہ ہے لاڈو کا بنگلہ چلے
یہ بجریا یہ مرا نوشاہِ نولکھیا چلے

چلنے دو تھوڑی دُور اگر رسم و رہِ دنیا چلے
گوری کا ڈولہ اٹھائے گوری کا بندرا چلے

شیروانی پہنے باندھے سبز عمامہ چلے
یہ مرا ہریالا بندرا بن کے ہریالا چلے

دھوم ہے آؤ بنے آؤ بنے آؤ بنے
ہاں چلے نوشہ چلے نوشہ چلے نوشہ چلے

فصلِ گل آتی ہے کاروبارِ میخانہ چلے
خمُ کھلے شیشہ بڑھے ساغر اُٹھے مینا چلے

ساز والے کو بلاؤ گیت شادی کا چلے
ہاں کہو شہنائی چھیڑے ہاں کہو ٹونا چلے

سر سے جب شبیر اشرف باندھ کر سہرا چلے
یوں لگا جیسے زمیں پر چاند کا ٹکڑا چلے

یوں چلے بارات یوں بارات میں نوشہ چلے
جیسے پھولوں میں کوئی پھولوں کا شہزادہ چلے

رنگ اور خوشبوؤں کا چاروں طرف جھونکا چلے
ہر براتی ہاتھ میں باندھے ہوئے گجرا چلے

اس طرح روشن ہو تہذیبی روایت کا چراغ
ہر طرف شہرِ عظیم آباد میں چرچا چلے

یاد آجائے زمانے کو عزیز اشرف کا نام
ایس پی ورما روڈ سے بارات چٹ کہرہ چلے

یوں کمال اشرف چلے ہیں بیٹے کی بارات میں
قافلے کے ساتھ جیسے قافلہ والا چلے

کیا ضروری ہے کہ صرف انساں چلے بارات میں
سب ہی مخلوقِ خدا ہیں چاہے جی جس کا، چلے

ڈونگرا پھولوں کا برسانے چلے بادِ صبا
چونچ میں بلبل اُٹھائے پھولوں کی مالا چلے

شمع اپنا نور پھیلانے چلے بارات میں
رقص کرنے کے لیے ہمراہ پروانہ چلے

غیر شاعر دوست آئے داد دینے کے لیے
اور جو شاعر ہے وہ پڑھنے کے لیے سہرا چلے

نوجواں تو لوٹنے آئے چھوہارا اور نُقل
اور بزرگ اپنی دُعاؤں کا لیے تحفہ چلے

سب کے ہونٹوں سے یہی نکلا کلامِ آخری
عمر بھر جوشِ مسرّت کا یہی نقشہ چلے

ہر طرف ہو دولتِ اقبال مندی کا نزول
جس طرف جائیں ادھر خوشیوں کا سرمایہ چلے

اے صبا چل ، ذرا انداز دِکھاتی ہوئی چل　　پھول کی بستیاں ہر سمت بساتی ہوئی چل
رنگ کی خوشبوؤں کی چھاؤنی چھاتی ہوئی چل　　مست کرتی ہوئی سرشار بناتی ہوئی چل
رقص کرتی ہوئی ہنستی ہوئی گاتی ہوئی چل

اس طرح گا کہ ہر اِک لب پہ ترا گیت رہے　　ہار ہو دُشمنی کی دوستی کی جیت رہے
کوئی موسم کوئی ماحول کوئی ریت رہے　　نغمہ ہی نغمہ ہو سنگیت ہی سنگیت رہے
ایسا جادو کوئی لا اور جگاتی ہوئی چل

ایسا جادو کوئی ، ہاں ایسا ہی جادو کوئی لا　　نیم مردوں کو صحت بخش دے مردوں کو جِلا
دل خزاں دیدہ ہے اور مجھ سے یہ کرتا ہے گلہ　　کہ بہت دن سے کوئی قافلۂ گل نہ ملا
اے صبا پھول کھلا اور کھلاتی ہوئی چل

آج اسؔعد کی ہے شادی تجھے معلوم ہے یہ　　میں کہوں اور سے؟ میرے لیے مذموم ہے یہ
سہرا لانا ہے تجھی کو ، مرا مفہوم ہے یہ　　تو بڑی دھوم سے لائے گی بڑی دھوم ہے یہ
ہاں بڑی دھوم سے لا دھوم مچاتی ہوئی چل

اسؔعد و عارؔفہ کی ذات رہے پھولوں کی　　اُن کی ہر شام ہر اِک رات رہے پھولوں کی
سر پہ چھائی ہوئی برسات رہے پھولوں کی　　عمر بھر اِن سے ملاقات رہے پھولوں کی
یہ دُعا میری ذرا لحن سے گاتی ہوئی چل

یوں تو کیسے کہوں ہر شخص کو مرغوب ہوں میں　　میؔر سے غالبؔ و اقبالؔ سے منسوب ہوں میں
لیکن اس بات سے ثابت ہے کہ محبوب ہوں میں　　سہرا عاجؔز سے لکھالا یا ہوں کیا خوب ہوں میں
اے صبا مجھ سے ذرا ہاتھ ملاتی ہوئی چل

یہ دُلہن!

یہ تہنیتی نظم اُردو کونسل کے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر اسلم جاوداں کی ہمشیرہ تارا رفعت کی شادی
(بتاریخ ۲۳ر اپریل ۱۹۹۳ء ہمراہ ولی اللہ اشرف بن جناب بشیر اللہ، الہ آباد)

ایک دُلہن جس کو تاریخ و روایت یاد ہے
پھول سی فطرت ہے لیکن عزم کی فولاد ہے

دل میں درد آنکھوں میں غیرت خوش زباں شیریں سخن
قدسیوں کی خوبیاں ہیں ، گرچہ آدم زاد ہے

یہ دُلہن ان خوبیوں کے ساتھ ہے گرمِ سفر
گھر عظیم آباد ہے ، منزل الہ آباد ہے

یہ دُلہن خوشبوؤں کی برسات لے کر جائے گی
گیتوں کی نغموں کی اِک بارات لے کر جائے گی

عمر یوں گزرے گی جیسے خوش خرامیِ بہار
کیف کے دن چاندنی کی رات لے کر جائے گی

تحفۂ حسنِ نظر ، حسنِ عمل کے ساتھ ساتھ
نعمتِ ایمان کی سوغات لے کر جائے گی

ایک خاموشی میں پنہاں ہوگی سَو سَو گفتگو
جس جگہ جائے گی اپنی بات لے کر جائے گی

تارا رفعت کو مبارک ہو نیا عزمِ سفر
جگمگاتے جگنوؤں کے درمیاں یہ رہ گزر

دائیں بائیں رَنگ و نکہت روشنی پیشِ نظر
باخبر سارے مسائل سے بظاہر بے خبر

یہ سفر آسان ہو تجھ کو ولی اشرف کے ساتھ
دونوں شانوں پر فرشتے ہاتھ میں شوہر کا ہاتھ

شامِ غم ختم ہوئی ساز اُٹھا آج کی رات
چھیڑ نغمہ کوئی اے بادِ صبا آج کی رات
چاند نیچے اُتر آئینہ دکھا آج کی رات
سہرا باندھے ہوئے بیٹھے ہیں ضیاؔ آج کی رات

سر جھکائے ہوئے سمٹے ہوئے شرمائے ہوئے
جیسے مجرم کوئی بیٹھا ہو سزا پائے ہوئے

چھاؤنی چاروں طرف چھائی گئی پھولوں کی
چھوٹی سی کوٹھری بنوائی گئی پھولوں کی
یہ سزا پھر اُسے سنوائی گئی پھولوں کی
ہتھکڑی ہاتھوں میں پہنائی گئی پھولوں کی

یہ گنہگار محبت ہے نہ چھوڑا جائے
عمر بھر قیدِ وفا میں اُسے رکھا جائے

شام مغرب کے اندھیروں پہ تھکن آئی ہے
روشنی کرنے کو مشرق سے کرن آئی ہے
خوش شکاگو ہے کہ قسمت مری بن آئی ہے
میرے گھر آج کراچی سے دُلہن آئی ہے

بدھیاں موجِ مشی گن اُٹھی پہنانے کو
سی ایس ٹاور جھکا آداب بجالانے کو

اے ضیا آج یہ رتبہ کیا حاصل تونے
کتنے احباب کو بلوا لیا شامل تونے
اِک اشارے میں ہزاروں کے لیے دل تونے
پھونک دی گرمیِ رخسار سے محفل تونے

سب یہاں جمع ہیں جن سے بھی شناسائی ہے
کس کو کہنے کا ہے موقع کہ تو ہرجائی ہے

آج کی انجمن آرائی میں عدنان بھی ہیں
میہمانوں کی مدارات میں سلطان بھی ہیں
اہلِ اسباب بھی ہیں صاحبِ سامان بھی ہیں
اور اِک کونے میں ہم چاک گریبان بھی ہیں

ہم ہی کیا اور یہاں مل جائیں گے دیوانے چند
ایں خطائیست کہ در شہر شما نیز کنند

باغباں سے کہو تقسیم گل و لالہ کرے
عنبر و مشک سے لبریز ہر اِک پیالہ کرے
مست ہر ایک کو ہر ایک کو متوالا کرے
بے چمن والا ہو اس کو بھی چمن والا کرے

پیار کے سب ہیں خریدار لٹا دے پیارے
آج بازار کا بازار لٹا دے پیارے

تنگ لوگ آج کے انداز و ادا سے ہیں بہت
غازہ اُڑ جائے تو چہرے پہ مہاسے ہیں بہت
جھوٹے وعدے ہیں بہت جھوٹے دلاسے ہیں بہت
اے محبت تو کہاں ہے ترے پیاسے ہیں بہت

عشق کی بزم ہے یہ عشق میں کھودے ہم کو
آج تو پیار کے دریا میں ڈبودے ہم کو

ہاں بٹے بزم محبت میں محبت کی شراب
گرچہ یہ آج زمانے میں بہت ہے کمیاب
اور لوگوں کو اگر اس میں کچھ آتا ہو حجاب
میں تو تیار ہوں ہونے کے لیے خانہ خراب

ساقیا دُور چلے دُور چلے دُور چلے
چل چکا بھی ہے تو کچھ فکر نہ کر اور چلے

سلیم معینی

خواجۂ خواجگانِ اجمیر شریف کی خاک کا ایک پتلا انجینئرنگ کر کے جدّہ ایئرپورٹ پر ملازم ہوگیا۔ ایک عمر وہاں گزری۔ جوانی سے جب نیچے بڑھاپے کی طرف اس کا قدم بڑھنے لگا تو میں نے حجاز مقدس کا سفر شروع کیا۔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۶ء تک پھیرے کے بعد برادرم سعید اختر کمپیوٹر انجینئر بھی جدّہ ایئرپورٹ پر ملازم ہوئے تو میرے قیام کا رُخ ایئرپورٹ کی طرف پھر گیا۔ سعید اختر کے ماچس کی ڈبیہ نما وسیع کوارٹر میں میرا قیام ہونے لگا تو ایئرپورٹ کا پبلک ہال میری شاعری سے گرمانے اور آواز سے گونجنے لگا۔ پھر تو ایسا ہوا کہ جدّہ کے علاوہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے سامعین قافلے بنابنا کر ایئرپورٹ کے مشاعرے میں آنے لگے اور کلیم کی آواز کانوں کان بیابان ہوگئی۔

اجمیر شریف کا وہ انجینئر سلیم معینی بھی میرے معتقدوں میں شامل ہوگیا اور مرید بن کر ہاتھ چومنے لگا۔ شاعری سے بھی شوق، تقریر کا بھی ذوق، دینی مباحث کا بھی میلان، سیاست اور سماجی مسائل سے بھی بھرپور تعلق۔ ادب مجلس ہو یا شعری، عام مسلمانوں کے ہر مسئلے پر بے دھڑک گفتگو اور تقریر بیان۔ اس ضمن میں حکومت سعودیہ بھی کبھی کبھی تنقید کا شکار ہوجاتی۔ سلیم معینی صاحب کی دوسری قومیت پاکستانی تھی۔ وہ کراچی ہجرت کر گئے تھے۔ وہ بھی ان کا وطن تھا۔ پاکستانی حال احوال پر بھی کھلے عام دوٹوک گفتگو کر بیٹھتے۔ آخر حکومت کے کان کھڑے ہوگئے۔ ایک دن پاکستانی حکومت کے ایما پر سعودی گورنمنٹ نے انھیں گرفتار کر کے پاکستان واپس کر دیا۔ مقدمہ لگا۔ تا مقدمہ شاید جیل میں بھی رہے پھر رِہائی ہوگئی۔ مگر دل بھی ٹوٹ گیا اور بدن بھی چور ہوگیا۔ امریکہ چلے گئے۔ مگر وہاں بھی نہ تھم سکے۔ کراچی آ کر ذی فراش ہوگئے۔ اور ذی فراشی میں یہ حسرت ناک بات ہوئی۔ عوامی زندگی کے ہر شعبے سے وہ خود کو وابستہ رکھتے تھے۔ اور اپنی استعداد بھر اعتماد سے حصّہ لیتے۔ مشاعرے بھی کراتے۔ جدّہ ایئرپورٹ سے ان کا انخلا ایئرپورٹ کے

لیے بھی المیہ ہوگیا اور خود وہ تو سراپا الم بن گئے۔ بالکل مرجھا کے رہ گئے۔ وہ مرجھائی شمع دھیمے دھیمے اپنا کنج عزلت میں جل رہی ہے۔ مجھ سے بہت اخلاص رکھتے رہے، مجھے پہچانتے بھی رہے اور مانتے بھی رہے۔ ان کی صاحبزادی کی شادی ہونے لگی تو مجھ سے چند اشعار کی فرمائش کی۔ میں نے یہ نظم امریکہ سے لکھ کر انھیں بھیج دی۔ مگر میرے واپس آنے تک جدّہ سے وہ چھین لیے گئے:
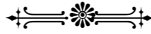
تاریخ مقدّس ہے یہ چھبیس رجب کی
یہ دن بڑی تعظیم کا ہے رات ادب کی
تقدیر بنی اس سے عجم اور عرب کی
دولت اُسے حاصل ہوئی معراج کی شب کی

یہ دن عمل حسن و محبت کے لیے ہے
اور رات بھی مخصوص عبادت کے لیے ہے

یہ ترکِ غم و صدمہ و آلام کا دن ہے
آرائشِ دیوار و دَر و بام کا دن ہے
یہ برکتوں کے نامہ و پیغام کا دن ہے
یہ اِک عملِ خیر کے انجام کا دن ہے

اخلاق و مروّت کے بڑھانے کا یہ دن ہے
روٹھے ہوئے لوگوں کو منانے کا یہ دن ہے

شاہنشہِ کونین کا یہ بیتِ مکرم
یہ سرزمیں یہ بارگہِ سرورِ عالم
جس طرح کہ پھولوں پہ گرا کرتی ہے شبنم
بادل یہاں رحمت کے برستے ہیں جھما جھم

اس سرزمیں پہ اپنا یہ چھوٹا سا جو گھر ہے
اس شکر میں ہر وقت خمیدہ مرا سر ہے

اس گھر میں ہے اللہ کی بھیجی ہوئی رحمت
بخشا مجھے آج اس نے یہ سامانِ مسرّت
اس گھر میں میری بیٹی کا ہے عقدِ سعادت
سب فضل خدا کا ہے خدا کی ہے عنایت
احسان کا کچھ شکر ادا ہو نہیں سکتا
ہاں ہو نہیں سکتا بخدا ہو نہیں سکتا

یہ باپ ترا اے میری بیٹی تجھے کیا دے؟
اچھا ہے کہ بس ہاتھ اُٹھا کر یہ دُعا دے
ہر چیز تجھے اپنے خزانے سے خدا دے
اور جتنی ضرورت رہے اس سے بھی سوا دے
گل کی طرح ہر وقت بہاروں میں رہے تو
مہتاب کی مانند ستاروں میں رہے تو

حاصل ہے مجھے فخر مکانی نہ مکینی
اور مرتبۂ خاص نہ دُنیاوی نہ دینی
نااہل ہوں منصب ہے مرا خاک نشینی
ہے نام سلیم اور مری نسبت ہے معینی
ہاں خاک سے گر پاک خدا چاہے تو کر دے
ممکن ہے کہ وہ دامنِ خالی مرا بھر دے

بتقریب شادی نبیل احمد پسر افتخار حسین صاحب، حیدر آباد

حیدر آباد ہم آئے تو کدھر آئے ہیں
کس کے پاس آئے ہیں کس شخص کے گھر آئے ہیں

ہم جو اڑتے ہوئے پٹنہ سے اِدھر آئے ہیں
ڈھونڈنے کے لیے تسکینِ جگر آئے ہیں

ہم ہیں اور ساتھ ہمارے شبِ تنہائی ہے
شبِ تنہائی کی کرنے کو سحر آئے ہیں

نہ ہمیں چین ہے محفل میں نہ خلوت میں قرار
جب نظر آئے ہیں بے تاب نظر آئے ہیں

کہیں ہوکر ہمیں مجبور گر آنا ہی پڑا
دل دبائے ہوئے اور تھامے جگر آئے ہیں

آج اس شہر میں آئے تو ہم آئینہ کو
خوش نظر آئے ہیں بشاش نظر آئے ہیں

اور سبب یہ ہے کہ دیکھا کہ چمن ہے شاداب
برگ آئے ہیں گل آئے ہیں ثمر آئے ہیں

بزم میں رونقِ محفل نظر آتے ہیں نبیلؔ
ہم انھیں کے لیے عثمان نگر آئے ہیں

گرچہ دُشوار تھا اس بزم میں آنا لیکن
ہم لگائے ہوئے سرخاب کا پر آئے ہیں

طائرانِ چمنِ خلد بریں ان کے لیے
لے کے سہرے کے حسیں پھول اُتر ائے ہیں

جتنے احباب بزرگ ان کے ہیں سب دوست بزرگ
لے کے دامن میں دُعاؤں کے گہر آئے ہیں

اور تصور میں لگا ایسا کہ کچھ قدر شناس
خوانِ سیمیں میں لیے خلعتِ زر آئے ہیں

جذب ہو جائیں گے گھل جائیں گے مل جائیں گے
شیر کے پیالے میں ہم بن کے شکر آئے ہیں

حیدر آباد کے دلداروں کا یہ مجمع ہے
جو بھی آئے ہیں سلیقے سے سنور آئے ہیں

شیروانی کی بہاریں ہیں چمک سوٹ کی ہے
سب کے سب حسن کے سانچے میں اُتر آئے ہیں

شاؔہ عالم بھی ہیں یوسفؔ بھی ہیں منانؔ بھی ہیں
اہلِ علم آئے ہیں اربابِ ہنر آئے ہیں

باغزالانِ حضرموت بھی ہیں بیگ بھی ہیں
نقش تہذیب و تمدن کے اُبھر آئے ہیں

حیدر آباد کی مٹّی سے یہ نکلے ہوئے لوگ
اب بھی اس گزرے زمانے میں جدھر آئے ہیں

حیدر آباد کے اس چھوٹے سے گلدستے میں
منتخب پھول جو یہ آج نظر آئے ہیں

اِک زمانہ تھا کہ سارا ہی چمن ایسا تھا
ہم بھی اس دَور سے خوابوں میں گزر آئے ہیں

اجنبی ہم نہیں گو دُور کے باشندے ہیں
بارہا اپنے خیالوں میں ادھر آئے ہیں

درد اپنا لے جس شہر میں پہنچے ہیں کلیمؔ
درد سے لوگوں کو بھی آشنا کر آئے ہیں

دیباچہ

میری شاعری کو ۵۶ سال تو ہو گئے یعنی وہ شاعری جو دنیا کے سامنے ہے۔ کہہ رہا ہوں کب سے یہ مجھے بھی یاد نہیں ۔ یہ ایسی چیز میری نگاہ میں نہیں تھی جسے یاد رکھا جاتا۔ جن کے درمیان تھا وہ یاد رکھنے کی چیز تھی ۔ سو وہ یاد ہے۔ تو ۵۶؍سال پہلے جب شاعری نے مجھے اختیار کیا تو میں اس کے اختیار میں چلا گیا۔ شاعری نے مجھے استعمال کیا کہ بے آنسوؤں کے روؤں ۔ الفاظ نے ان کی جگہ لے لی:

جو قطرے لہو کے نہ آنکھوں سے ڈھلکے
بنے ہیں وہ اشعار میری غزل کے

بس اتنا ہی اس زمانے کی یاد ہے کہ رونا چاہتا تھا اور رُلانا چاہتا تھا۔ سو خوب ہوا۔ بوڑھے بھی روئے اور جوان بھی، مرد بھی، عورت بھی۔ پڑھے لکھے بھی، اَن پڑھ بھی، اپنے بھی، پرائے بھی، مسلم بھی اور کافر بھی۔ کسی کے آنسو آہ آہ تھے کسی کے آنسو واہ واہ۔ مگر آنسو دونوں کے تھے۔ زیادہ لوگ ایسے تھے جنھیں میری گزری اپنی لگتی تھی۔ ایسے لوگ بھی تھے کہ اُن پر گزری تو نہ تھی، مگر جس پر گزری تھی، ان سے ان کو پیار ہو گیا۔ ان میں بھی بہت لوگ ہیں، داروغہ رائے وزیراعلیٰ بہار بھی، بیر چند پٹیل بھی، کامت پرشاد کام بھی، شنکر دَیال سنگھ بھی، جسٹس برج کشور بھی اور ڈاکٹر نول کشور بھی۔ تو میں ان سب سے مل جل کر خوب روتا رہا۔ آہ آہ اور واہ واہ سن کر مزا بھی خوب آتا تھا اور رونا بھی تیز ہو جاتا تھا۔

یہ سطریں میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اس کتاب میں میری رُباعیاں بھی ہیں اور میں ان رُباعیوں کو تقریباً بھول گیا تھا۔ خدا جانے کہاں سے میاں وسیم سلّمہٗ کو دستیاب ہو گئیں۔ اللہ ہنسی کو ہوا میں اُڑا دیتے ہیں مگر آنسوؤں کو سمیٹ لیتے ہیں۔ کچھ زیادہ سمیٹ لیتے ہیں تو خوش اعمالیوں

میں شامل کر لیتے ہیں:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے (اقبالؔ)

میرے آنسو عرق انفعال کے قطرے تو نہ تھے۔ یہ تو بہت اونچے مقام کی بات ہے، لیکن اللہ ٹوٹے ہوئے دِلوں میں رہتا ہے تو ٹوٹے ہوئے دِلوں کے بول آنسو ہی سمجھ کر اسے محفوظ رکھنے کا حکم دیتا ہے:

شاعری بھی اچھی باتوں میں اِک اچھی بات ہے
اس کو بھی من جملۂ حسنِ عمل کہتے تو ہیں

میں فن تو کسی چیز کا نہیں جانتا نہ غزل کا، نہ قصیدے کا، نہ مرثیے کا، نہ رباعی کا۔ گرچہ اس کے حاصل ہونے میں ساری چیز میری گئیں:

کیا بتائیں چھین کر کیا کیا ہنر
وقت نے مجھ کو غزل کا فن دیا

……………

ہمیں تو دل لہو کرنا پڑا وہ اور ہی ہوں گے
جنھیں اہلِ غزل بننے میں آسانی ہوئی ہو گی

تو میں رُباعی کا فن بھی بالکل نہیں جانتا اور اتفاق ہے کہ غزل تو آٹھ دس سال کی عمر سے مطالعہ میں رہی۔ میں کسی رباعی گو شاعر کا مجموعۂ رُباعیات بھی شاید نہیں دیکھ سکا ہوں۔ اسی کمسنی کے زمانے میں شاید 'عالمگیر' لاہور یا 'نیرنگ خیال' لاہور کے کسی سال نامے میں چار رُباعیاں امجدؔ حیدرآبادی کی پہلے پہلے نظر سے گزریں اور اس کی ساخت مجھے عجب لگی لیکن اچھی لگی۔ ان چار رُباعیوں کا مطالعہ رُباعی کے ڈھانچے کو میرے ذہن میں اُتار گیا۔ ان رُباعیوں کا موضوع پیری تھا۔ رباعی سنیے:

کیا بات دم اشک فشانی کہیے کیا عہدِ گزشتہ کی کہانی کہیے
سر پر دمِ پیری نہیں یہ موئے سفید کفنائی ہوئی نعشِ جوانی کہیے

……………

دنیا کی طرف اب جو نہیں دیکھتے ہیں
ہم زیست کا انجام قریں دیکھتے ہیں
پیری میں نقاہت سے جھکی ہے جو کمر
مرقد کے لیے اپنی زمیں دیکھتے ہیں

کہتے ہیں کہ رباعی کا فن بہت پیچیدہ ہے اور اس کی تکنیک بہت نازک ہے۔ ذرا سے فرق سے وزن بدل جاتا ہے اور موسیقیت متاثر ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔ میں تو فرق نہیں جانتا، ہاں موسیقیت ہی میرا معیارِ علم ہے۔ امجدؔ حیدرآبادی کی مطبوعہ رُباعیاں پڑھنے کے بعد اسی کمسنی کے دور میں اپنی نانیہال ہلسہ میں ایک مشاعرے میں شریک ہوا جس کا تفصیلی مرقع ہم نے اپنی سوانح 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' میں پیش کیا ہے۔ نورؔ نوحی صاحب ہلسہ رجسٹری آفس میں ہیڈ کلرک تھے۔ بزم ادب پٹنہ کالج میں نوحؔ ناروی تشریف لائے تو انھیں ان کے شاگرد نورؔ نوحی صاحب ہلسہ سے لے آئے اور ایک شب کے قیام میں مشاعرہ منعقد کر دیا اور میں نے نوحؔ صاحب کو دیکھا۔ اور ان کی زبانی مخصوص موضوع پر ان کی رُباعی سُنی:

اے نوحؔ کمال اپنا دِکھاتے جاؤ
ہر شخص کو حیران بناتے جاؤ
پٹنہ میں تو اِک حشر اُٹھایا تم نے
ہلسہ میں بھی طوفان اُٹھاتے جاؤ

اور طوفان اُٹھ گیا۔ پتلے دُبلے منحنی آدمی جالہ دار کی شیروانی چست پاجامہ اور چوگوشیہ ٹوپی پہن کر جب شعر پڑھنے لگے تو بوڑھے سے جوان بن گئے۔ ہاتھ پھیلا کر سینہ نکال کر گردن اونچی کر کے بدن کو جوان کی طرح حرکت دیتے ہوئے شعر یوں پڑھتے تھے کہ پورے مجمع پر چھا جاتے۔ رُباعی پڑھنے کے بعد غزل شروع کی:

آتی ہے آئے فصلِ گُل جاتی ہے جائے ہر برس
ہم غمزدوں کے واسطے جیسا چمن ویسا قفس
رخصت ہوا بیمارِ غم بالیں سے اُٹھے ہم نفس
تدبیر تو کرتے ہیں سب تقدیر پر کس کا ہے بس

جو شعر پڑھتے اشاروں سے پورے شعر کی تصویر بنا دیتے۔ دوسری غزل کا مطلع پڑھنے لگے:

یہ کیا پیش بندی یہ کیا رخنہ سازی، یہ کیسا کنایہ یہ کیسا اشارہ
ابھی تیر آیا نہ میرے جگر تک کہ وہ تیر انداز بولا کہ مارا

وہ مارا کہتے ہیں کہ ہاتھ لمبا کر کے اُفق کی طرف یوں اشارہ کیا کہ پورا مجمع اس طرح دیکھنے لگا کہ واقعی کوئی شکار ہو گیا۔

تو مطلب کہنے کا یہ ہے کہ رباعی جیسی نازک اور پیچیدہ تکنیک والی صنف دو چار رباعیاں سننے کے بعد اپنا نقش ذہن پر بٹھا گئی۔

اپنی شاعری کے ابتدائی دَور میں جب مشاعروں میں غزل پڑھنے لگا۔ غزل سے پہلے دو رُباعیاں پڑھ دیتا اور مجمع پر میرے رنگ سخن کا غزل پڑھنے سے پہلے ہی نقش ثبت ہو جاتا:

اشعار میں غم سنا رہا ہے کوئی
فریاد کی لے میں گا رہا ہے کوئی
ہیں ساز پر انگلیاں بظاہر لیکن
دُکھتی ہوئی رَگ دَبا رہا ہے کوئی

چند رُباعیاں رسمی اور چالو موضوع پر ہیں ورنہ تمام رُباعیاں میں نے اپنی افتادِ طبع، اپنی شاعری کے مخصوص مزاج اور آہنگ کی ترجمانی میں ہی کہی ہیں۔ یہ تمام رُباعیاں میری شاعری کی ابتدائی دَور کی ہیں۔ یعنی ۱۹۵۰ء ۱۹۵۵ء تک کی۔ پھر رُباعیوں سے دلچسپی ختم ہو گئی اور میرا وجود سرتاپا غزل ہی کے سانچے میں ڈھل گیا اور میری غزل کے تعارف کی کوئی حاجت باقی نہ رہی۔ دہلی کلاتھ مل کے بڑے آفیسر مسٹر ساہنی صاحب جو پنجاب کے ایک نہایت ہی ستھرے ذوق کے سخن فہم تھے وہی مشاعرے کے مہتمم اعلیٰ تھے۔ مشاعرے میں شرکت کے کسی عذر کو وہ تسلیم نہیں کرتے۔ تمھیں آنا ہی ہے ان کا فیصلہ ہوتا اور جب میں مشاعرہ میں غزل پڑھنے کو اُٹھتا تو مائک تک پہنچنے کے دوران وہ یہ جملہ کبھی ایک کبھی دو بار زور سے کہتے۔ ''میاں کلیم عاجزؔ مشاعرہ لوٹ لو'' وہ ہم سے سن میں بہت بڑے اور بہت ہی خوش وضع انسان تھے۔ وہ مر گئے تو دہلی کلاتھ ملس کے مشاعرہ کا مخصوص وقار ختم ہو گیا اور میں نے وہ مشاعرہ ترک کر دیا۔

❁❁

رُباعیاں

۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۵ء

عاجؔز یہ طبیعت عالی تیری   یہ فکر یہ شوریدہ خیالی تیری
ہر شعر میں اِک سخن انوکھا تیرا   ہر بات میں اِک بات نرالی تیری

جو دل پہ گزرتی ہے سنا دیتا ہوں   جو بات بھی کہتا ہوں لٹا دیتا ہوں
اشکوں میں لہو جب سے لگا ہے آنے   ہر شعر کا میں رنگ جما دیتا ہوں

میخوار ہوں میخوار بنا دیتا ہوں   پیتا ہوں جو بچتا ہے پلا دیتا ہوں
کھلوانا اگر ہوتا ہے بابِ توبہ   میخانہ کی زنجیر ہلا دیتا ہوں

مئے پینے سے دل قوی ہو جاتا ہے   دُھل دُھل کے یہ آئینہ جلی ہو جاتا ہے
آجاتی ہے کچھ ایسی زباں میں طاقت   جو منہ سے نکلتا ہے وہی ہو جاتا ہے

اب دیر نہ کر ڈھال پلا دے ساقی   شیشہ میں جو ہے مال پلا دے ساقی
(مجموعے میں یہ مصرع نہیں ہے)   وہ آتشِ سیال پلا دے ساقی

ہاں ابروئے خمدار دکھا دے ساقی　　چلتی ہوئی تلوار دِکھا دے ساقی
یوسف کی طرح بکنے لگیں ہوش وخرد　　وہ گرمیِ بازار دکھا دے ساقی

آنکھوں میں ہے کیوں خوار جوانی میری　　بدخو ہے نہ بدکار جوانی میری
اِک جرمِ محبت جو کیا ہے اس نے　　کیا کیا ہے گنہگار جوانی میری

جینا ہے جو رندوں میں تو مرنا ہوگا　　دم ساقیِ میخانہ کا بھرنا ہوگا
جس وقت چڑھے گا مئے گلگوں کا نشہ　　زاہد کو بھی شیشہ میں اُترنا ہوگا

غم ہے تو ہے بیکار جوانی دل کی　　ٹھہرے گی نہ زنہار جوانی دل کی
اُٹھتا ہوا طوفان بڑھاپا غم کا　　گرتی ہوئی دیوار جوانی دل کی

اب دل ہے نہ پہلو میں نشانی دل کی　　کر آئے تہہ خاک جوانی دل کی
دل سے کبھی سنتے تھے فسانہ غم کا　　غم آج سناتا ہے کہانی دل کی

وہ جوش نہ وہ گرم زبانی دل کی　　بلبل میں کہاں شعلہ بیانی دل کی
چھپتا ہی نہیں آنکھوں میں پھولوں کا شباب　　پھرتی ہے نگاہوں میں جوانی دل کی

عاجزؔ ہر اِک افتاد سناتے جاؤ　　حالِ دلِ ناشاد سناتے جاؤ
پرواہ نہیں داد ملے یا نہ ملے　　تم شکوۂ بیداد سناتے جاؤ

دن رات ہے توبہ پہ تباہی توبہ　　شب بادہ کشی و صبح گاہی توبہ
گھبرا کے میری جرأتِ رندانہ سے　　توبہ بھی پکار اُٹھی الٰہی توبہ
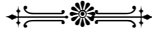
عاجزؔ نہیں اچھا یہ قرینہ دل کا　　غرقاب نہ ہوجائے سفینہ دل کا
ٹھنڈا کہیں کردے نہ تپِ غم دیکھو　　آنسو ہیں کہ آتا ہے پسینہ دل کا

قصّہ نہ کہانی ہے جوانی میری　　اِک یاد دہانی ہے جوانی میری
تحفہ یہ وہی دے کے گیا ہے مجھ کو　　بچپن کی نشانی ہے جوانی میری

دُنیا ابھی آسودۂ کاشانہ ہے　　ناواقفِ سوزِ غم جانانہ ہے
چھیڑا جو تری زُلف کا قصّہ ہم نے　　سب بول اُٹھے دیوانہ ہے دیوانہ ہے

ساقی ہے نہ شغلِ مئے و پیمانہ ہے　　اب عشق کا انداز جداگانہ ہے
ہر وقت تصور ہے خمِ گیسو کا　　زنجیر ہے اور آپ کا دیوانہ ہے

یوں زُلف بہ تدبیر بناتے جاؤ　　ہر حلقہ گرہ گیر بناتے جاؤ
جاتے ہو جو دیوانہ بنا کر ہم کو　　پہنانے کو زنجیر بناتے جاؤ

عاجزؔ ہے اب انجمن میں آنے والا　　طوفان الم کو جھیل جانے والا
بادل کی طرح آنسوؤں سے لبریز　　بجلی کی طرح مسکرانے والا

کس پر کرم عام نہیں ہے ساقی　　اِک میرے لیے جام نہیں ہے ساقی
واللہ گلہ ہے مجھے محرومی سے　　تجھ پر کوئی الزام نہیں ہے ساقی
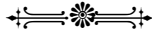
ناپاک ہیں ناقص ہیں نہ گندے ساقی　　پیتے ہیں تو پی لینے دے چندے ساقی
مانا کہ تو ہی ساقیٔ میخانہ ہے　　ہم بھی تو ہیں اللہ کے بندے ساقی

پھر اشکِ خوں بہا رہا ہے کوئی　　دامن پہ چمن بنا رہاہے کوئی
گلشن کو دکھاکے زخم نو شگفتۂ دل　　پھولوں کی ہنسی اُڑا رہا ہے کوئی

ساقی یہ ترا ظلم ہے کہہ جاتے ہیں　　مجبور ہیں ناچار ہیں سہ جاتے ہیں
غیروں کو جو ملتی ہے شرابِ گلگوں　　ہم اپنا لہو گھونٹ کے رہ جاتے ہیں
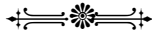
جب ہم نہیں آواز اُٹھائے گا کون　　مطرب جو گیا ساز اُٹھائے گا کون
ساقی ترا ہر ناز ہر انداز ہے خوب　　لیکن یہ بتا ناز اُٹھائے گا کون

اشعار میں غم سنا رہا ہے کوئی　　فریاد کی لَے میں گارہا ہے کوئی
ہیں ساز پر انگلیاں بظاہر لیکن　　دُکھتی ہوئی رگ دَبا رہا ہے کوئی

مایوسیِ دل عام ہوئی جاتی ہے　　اب صبح کہاں شام ہوئی جاتی ہے
وہ محفلِ احباب جو تھی ماہِ کمال　　خورشیدِ لبِ بام ہوئی جاتی ہے

گلشن کی ہوا زار ہوئی جاتی ہے　　پھولوں کی نظر خار ہوئی جاتی ہے
جو شاخ کبھی جھک کے گلے ملتی تھی　　کھنچ کر وہی تلوار ہوئی جاتی ہے

مئے آج وہ بے مثال دینا ساقی　　رندوں کی ہوس نکال دینا ساقی
سب پوچھتے ہیں عروجِ ہستی کیا ہے　　ساغر تو ذرا اُچھال دینا ساقی
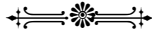
یہ دُور فراموش نہ ہوگا ساقی　　آئینہ سیہ پوش نہ ہوگا ساقی
ہشیار ہیں چپ مصلحت اندیشی سے　　دیوانہ تو خاموش نہ ہوگا ساقی

زنداں سے فضا غم کی چھنٹی جاتی ہے　　دیوار بتدریج ہٹی جاتی ہے
دیوانۂ غیور کھڑا ہنستا ہے　　اور شرم سے زنجیر کٹی جاتی ہے
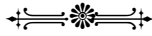
تقریب تگ و تاز چلی آتی ہے　　پھر فصل جنوں ساز چلی آتی ہے
دیوانوں کی زنجیر کی جھنکار نہ ہو　　کچھ دُور سے آواز چلی آتی ہے

پہلو ہے وہی راز بدل دیتا ہوں　　تیور کا کچھ انداز بدل دیتا ہوں
نغمات و شکایات میں ہے فرق یہی　　یعنی ذرا آواز بدل دیتا ہوں

تخریب سرنیاز ہوتی ہی گئی　　تعمیر حریم ناز ہوتی ہی گئی
زندانِ حیات تنگ ہوتا ہی گیا　　وہ زُلفِ سیہ دراز ہوتی ہی گئی

گلشن میں کہیں پھول مہکتے ہی رہے کانٹے کہیں سینے میں کھٹکتے ہی رہے
آنکھیں یہاں آنسو کو ترستی ہی رہیں محفل میں وہاں جام چھلکتے ہی رہے

اربابِ ستم کا زور ٹلتا ہی رہا آغوشِ وفا میں عشق پلتا ہی رہا
چلتی تھی ہوائے تیز چلتی ہی رہی جلتا تھا جہاں چراغ جلتا ہی رہا
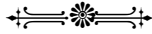
کیا بندگی کیا بندہ نوازی اے دوست محمودی ہے باقی نہ ایازی اے دوست
رخصت ہوئی دنیائے حقیقت کی بہار اب رہ گئی افسانہ طرازی اے دوست

دل سوزی ہے نہ سینہ گدازی اے دوست
اب عشق ہے اِک شعبدہ بازی اے دوست
کچھ بھی نہیں آرائش و زینت کے سوا
دیکھی تری زُلفوں کی درازی اے دوست

اسیرانِ قفس کی کیا طبیعت میں اُبھار آئے
اگر آتی ہے صحنِ باغ میں فصلِ بہار آئے
نہ دل پر زور تھا اپنا نہ قابو اپنی قسمت پر
گئے بے اختیار اس بزم میں بے اختیار آئے

متفرق اشعار

غزل بن گئی تو نرالی رہی ‏ وہ اِک بات جو درد والی رہی

ہم نشیں دیکھنا بڑھ کر یہی عاجؔز تو نہیں ‏ یہ جواں کیوں جھکائے ہوئے سر جاتا ہے

وہ دن اگر گزر گئے یہ بھی گزر ہی جائیں گے ‏ عیش بھی جاوداں نہ تھا رنج بھی جاوداں نہیں

غموں کے پھول ہمیشہ کھلے ہی رہتے ہیں ‏ نہ کوئی وقت ہے اُن کے لیے نہ موسم ہے

اسیرانِ قفس کی کیا طبیعت میں اُبھار آئے ‏ اگر آتی ہے صحن باغ میں فصلِ بہار آئے

نہ دل پر زور تھا اپنا نہ قابو اپنی قسمت پر ‏ گئے بے اختیار اس بزم میں بے اختیار آئے

یہ مئے تُند غمِ دَہر جسے کہتے ہیں ‏ شہد ہے شیر ہے شربت ہے کہ سم ہے کیا ہے
ہم دبائے ہوئے پھرتے ہیں بغل میں جس کو ‏ کوزۂ خاک ہے یا ساغرِ جم ہے کیا ہے

کھڑے ہیں ناخنوں کو تیز کر کے ہر طرف کانٹے
گلستاں میں ہمارے پیرہن کی آزمائش ہے
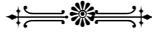
سروں پر قمقمے ہوں گے دِلوں میں غم تو کیا ہوگا   اندھیرا اور بڑھتا ہی رہے گا کم تو کیا ہوگا
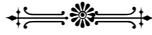
ہو کے بے آبرو جس بزم سے نکلے عاجزؔ   پھر اسی بزم میں لے کر دل دیوانہ چلا

گلشن گلشن محفل محفل آگ لگا کر بیٹھے ہو
تم نہ اگر شرماؤ پیارے پھر بولو شرمائے کون
دردِ وفا کس کو کہتے ہیں دل کی لگی کیا ہوتی ہے
ہم تو دیوانے ہو بیٹھے دُنیا کو سمجھائے کون

اپنا دل بھی رہِ دل سوختگاں جائے ہے   کوئی دیوانے کو سمجھائے کہاں جائے ہے
دے ہے کیا مشورۂ ترکِ محبت ناصح   اب کہاں سینے سے یہ سنگِ گراں جائے ہے

ہو تم کو ناپسند یہ قسمت کی بات ہے   میری ہر ایک بات محبت کی بات ہے

اَبر جس دن زیادہ ہوتا ہے   اور ہی کچھ ارادہ ہوتا ہے
میکدے کا ہر ایک رند جواں   وقت کا شاہزادہ ہوتا ہے
آ نہ اس کے فریب رنگیں میں   شیخ کہنے کو سادہ ہوتا ہے

مری کہانی فصل بہاراں تجھ سے بہت وابستہ ہے
زخم نہیں ہیں لالہ وگل ہیں دل نہیں ہے گلدستہ ہے
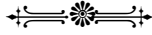
دوستوں کی بے وفائی دیکھ کر دُشمنوں کی آنکھ شرماتی رہی
پھول مرجھاتے رہے اور عندلیب درد سے روتی رہی گاتی رہی

جو زُلفِ پُرشکن والے ہوئے ہیں وہی دار و رسن والے ہوئے ہیں
لہو بھی مانگتے ہیں وہ دِلوں کا جو شمع و انجمن والے ہوئے ہیں

نہ رنگِ گل نہ خوشبو چاہتے ہیں لہو دیتے ہیں آنسو چاہتے ہیں
تری صورت کے عاشق چاندتارے تری آنکھوں کو آہو چاہتے ہیں

کہاں تک کوئی سر پر دُھوپ کی چادرتنی دیکھے
زمانہ ہوگیا آنکھوں کو ٹھنڈی چاندنی دیکھے

ذرا ہماری طرف چشم سرمگیں کرتے تو ہم تمھارے لیے یار کیا نہیں کرتے
شہیدِ ناز کا منصب تمھیں کہاں ملتا ہمارے خوں سے جو وہ تر نہ آستیں کرتے

کیا بات ہے کیا اس نے مجھے یاد کیا ہے کل شام سے پھر دل میں بہت درداُٹھا ہے
اے اہلِ زمانہ جسے تم ڈھونڈھ رہے ہو وہ فتنۂ عالم مری غزلوں میں چھپا ہے

اُنھیں کچھ نہ آنکھیں بدلتے لگی
یہاں عمر اپنی سنبھلتے لگی

محبت تو پیچھا مرا چھوڑ دے
ہر اِک چوٹ تیرے ہی چلتے لگی

بہت دیر مئے کو تری بزم میں
صراحی سے ساغر میں ڈھلتے لگی
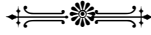
موسموں نے کرلیا ہے اتحاد ان کے لیے
دُھوپ مرے واسطے ہے اَبرو وباد ان کے لیے

مری ہر فریاد ہے مری ملامت کا سبب
ان کی ہر بیداد ہے سامانِ داد ان کے لیے

پھونک کر مرا نشیمن بھون کر میرا جگر
فصلِ گل لائی پیامِ دل کشا ان کے لیے

اگر یہ میٹھا میٹھا درد کم ہوجائے گا پیارے
ہمارے دل کی دُنیا میں ستم ہوجائے گا پیارے
ذرا ہم کو غزل اپنی مکمل کر تو لینے دو
تیری زلفوں میں دونا پیچ وخم ہوجائے گا پیارے

شور ہے قافلہٗ اہلِ جنوں آتا ہے
ساتھ دینا ہے تو دو ورنہ کنارے جاؤ

شہر میں غم رہے ماتم رہے فریاد رہے
تم تو آئینے میں زُلفوں کو سنوارے جاؤ

سب لگے جھومنے جب کوئی خوش آواز آیا
گر یہی فن کا ہے معیار تو میں باز آیا

ہر ادا جانِ من آئی تجھے ہر ناز آیا
پر تجھے دل کے لبھانے کا نہ انداز آیا

اُمید کے ماتھے سے چمک چھوٹ چکی
غفلت کے ستاروں کی لڑی ٹوٹ چکی

انگڑائیاں لے کر اُٹھو سونے والو
اب رات کہاں رہی کرن پھوٹ چکی

اعزاز افضل کی غزل کا مطلع

گداگرانہ روش پر اٹل رہے ہیں ہم
پرانی فکر کے ٹکڑوں پہ پل رہے ہیں ہم

مزاجِ کج کلہی کو بدل رہے ہیں ہم
دوپٹّہ اوڑھ کے سڑکوں پہ چل رہے ہیں ہم
وہ لوگ چین سے سوتے تھے زہرِ غم پی کر
شراب پی کے بھی کروٹ بدل رہے ہیں ہم
وہاں تو دُھوپ تھی چلتے تھے لوگ جل جل کر
یہاں تو سائے ہیں بیٹھے پگھل رہے ہیں ہم

یہ مانا وہ ظالم ہے بے درد ہے
فقیروں کا دل بھی جواں مرد ہے

خاک پروانہ بچھائے گی وفا کی چادر
دامن شمع سے لپٹی ہوئی حسرت ہوگی

دم بخود حسرت مرحوم اِدھر اور اُدھر
شمع کی گود میں انجام تھا پروانے کا

پانچواں مجموعہ
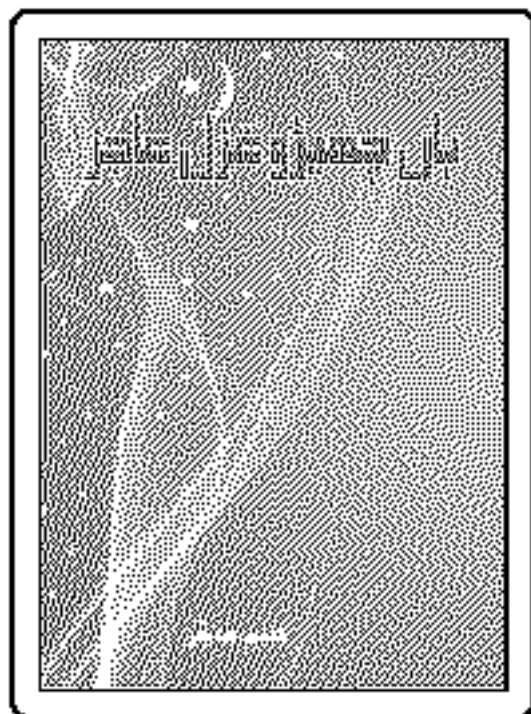
ہاں چھیڑو غزل عاجز

اشاعت: ۲۰۱۳ء

ہاں چھیڑو غزل عاجز چپ رہنے سے کیا ہوگا
کچھ لوگ تو خوش ہوں گے وہ ہوگا خفا ہوگا

انتساب

ان کے نام
جو کہتے ہیں

کلیمؔ آ، کہ چلتی ہیں پُروائیاں
سنا کوئی تازہ غزل سائیاں

کلیم عاجز

۱۵/۹/۲۰۱۴

ہاں چھیڑو غزل عاجزؔ

میں اپنے تیسرے مجموعۂ غزل 'ہاں چھیڑو غزل عاجزؔ' کا دیباچہ لکھنے بیٹھا ہوں:

بدلی سی اپنی آنکھوں میں چھائی ہوئی سی ہے
بھولی ہوئی سی یاد پھر آئی ہوئی سی ہے
لیتا ہوں سانس بھی تو بھٹکتا ہے تن بدن
رگ رگ میں ایک نوک سمائی ہوئی سی ہے
مت ہاتھ رکھ سلگتے کلیجے پر ہم نشیں
یہ آگ دیکھنے میں بجھائی ہوئی سی ہے

ان تینوں شعروں کے ساتھ پوری غزل شاید پچاس سال پہلے کہی تھی اور اب تک شاید کہیں نہیں پڑھی۔ یاد تو یہی ہے کہ کہیں نہیں پڑھی۔ اس طرح کی درجنوں غزلیں ہوں گی جو فکر سے لکھی، درد سے لکھی، کلیجہ تھام کر لکھی، پڑھنا بھی چاہا، اچھا آج نہیں کہیں اور پڑھوں گا۔ ہر مشاعرے میں یہی سوچا اور:

ہر شام ہوئی صبح کو ایک خوابِ فراموش

یوں ہی ہر شام صبح کو ایک یادِ فراموش ہوتی رہی اور غزل میرے خیال سے ماحول سے دُور ہوتی رہی اور بے پڑھے رہ گئی اور اب تو پڑھتے ہوئے جی ڈرتا ہے اور شرماتا ہوں کہ سن کر لوگ کیا کہیں گے، کیا یہ شخص پاگل ہو رہا ہے؟:

زمانہ سرحد دیر و حرم سے بڑھ گیا آگے
مگر ہم ہیں کہ شیخ و برہمن کی بات کرتے ہیں

وہی پرانا گیت، وہی پرانی الاپ:

کلیؔم کیسے کوئی تجھ کو خوش کلام کہے
جو دن کو رات بتائے سحر کو شام کہے

کتنے باغیچے کھلتے جاتے ہیں، شاداب چمن اُبھر رہے ہیں، ہر جگہ سیر گاہیں بنائی جا رہی ہیں، پھولوں کی قطاریں سج رہی ہیں۔ گلاب، موتیا اور بیلے چنبیلی کی کیاریاں بن رہی ہیں۔ جھرنے اور آبشار وجود میں آ رہے ہیں۔ اس کے باوجود ہمیں شکایت ہے کہ:

موسم سب آتے ہیں لیکن موسم میں وہ بات نہیں
نکھری نکھری شام نہیں، اب مہکی مہکی رات نہیں

ہاں بھائی ہم خوش کلام کہلانا نہیں چاہتے، لیکن دعا یہی کہ خوش کلام کہنے والے رہتے:

بدلی سی اپنی آنکھوں میں چھائی ہوئی سی ہے

سن کر واقعی سننے والوں کی آنکھوں میں بدلی چھانے لگتی ہے اور انھیں بھی:

بھولی ہوئی سی یاد پھر آنے لگتی ہے

جب جام تھا جم نہیں تھا۔ ساقی کی نظر میں سم نہیں تھا۔ اندیشہ بیش وکم نہیں تھا۔ لیکن بھائی اب جام کہاں ہے۔ اگر رہتا تو لکھنے والا کہتا:

یہ عمارت تو عبادت گاہ ہے اس جگہ ایک میکدہ تھا کیا ہوا

پہلے تو سب کے ہاتھوں میں جام تھا، جم نہیں تھا، چُلّو تھا:

ساقیا جام خدا داد ہے چُلّو تیرا (شادؔ)

اور جام، چُلّو کی ضرورت بھی نہیں، بے شراب کے سرشار تھے:

عجب نگاہ نے ساقی کی بندوبست کیا
شراب بعد میں دی پہلے سب کو مست کیا (شادؔ)

لوگ بے پئے مست رہتے تھے:

شیشہ تھا، جام تھا، نہ بادہ تھی بے پئے کیفیت زیادہ تھی

آہ! یہ کیسی کیفیت تھی، یہ کیسا نشہ تھا، یہ کیفیت یہ نشہ محبت کا تھا۔ محبت کا نام زبان پر اتنا نہ تھا، اتحاد، اجتماعیت، محبت، تعلق فریفتگی کا نام نہ تھا۔ مگر یہ کام تمام ہو رہا تھا یہی پیاس زیادہ تھی جس نے تمام پیاس سے انسانوں کو بے نیاز اور مستغنی کر دیا تھا۔ جب بے پئے لوگ مست تھے۔ بے ڈنکا

پیٹے محبت کرتے تھے، اتنا ہاتھ ملانے کا رواج نہیں تھا لیکن بے ہاتھ ملائے دل ملا رہتا تھا۔ جب دُور سے لوگ پکارتے تھے، محبت سے آواز دے کر بلاتے تھے۔ بہت دن نہیں ہوئے شاید بیس سال ہوئے ہوں گے۔ بات ہے میرے بیٹے ڈاکٹر وسیم کی بیٹی ڈاکٹر صنوبر عرف گڑیا چھ سات سال کی تھی۔ ولی منزل چوہٹہ، رضا اسکول کے ابتدائی درجوں میں تھی۔ روزانہ اسکول رکشہ پر کلاس کرنے جاتی تھی۔ اغل بغل کے فٹ پاتھ پر دُکان لگانے والے اس کو آتے جاتے دیکھتے تھے۔ ایک دن اُسے متلی ہونے لگی اور منہ سے کچھ کف جاری ہو گیا۔ ہم پٹنہ یونیورسٹی میں کلاس لے رہے تھے۔ میری اہلیہ اسے گود میں لے کر رکشہ پر ڈاکٹر محمود شاہ کے یہاں چلی گئیں اور دیکھتے دیکھتے فٹ پاتھ کے کئی دُکانداریوں ہی فٹ پاتھ کی دُکانیں پسری چھوڑ کر ڈاکٹر محمود شاہ کے یہاں پہنچ گئے۔ میں ڈاکٹر محمود شاہ کے یہاں پہنچا تو ایک بھیڑ تھی۔ گڑیا کیسی ہے؟ گڑیا اچھی ہے۔ سب کی زبان پر تھا۔ ہندو زیادہ تھے، مسلمان کم، مگر بھیڑ تھی۔ اب وہ فٹ پاتھ پر دُکان والے چلے گئے:

آشنائے وفا ہیں نہ یارِ وفا، بند ہے شہر میں کاروبارِ وفا
اس قدر بھاؤ بازار کا گر گیا، لوگ اپنی دُکانیں اُٹھا لے گئے

اصل بات یہی ہے۔ جب یہ بات ہے تو کسی اور کی آنکھوں میں بدلی سی کیوں چھانے لگی اور بھولی ہوئی سی یاد کیوں آنے لگی۔ اور جس کی آنکھوں میں بدلی سی چھا رہی ہے، بھولی ہوئی یاد آ رہی ہے اگر وہ سامنے کھڑا ہو کر پڑھے کہ:

بدلی سی اپنی آنکھوں میں چھائی ہوئی سی ہے
بھولی ہوئی سی یاد پھر آئی ہوئی سی ہے

اور لوگ اونگھنے لگیں یا اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ جیسے اُٹھ کر بھاگنا چاہتے ہوں تو پڑھنے والا اندھوں کے سامنے روئے یا دیدہ کھوئے۔ تو کلیم ایسا بے شرم، بے حیا، بے غیرت بن کر کون جئے۔ تو کلیم خاموش اپنا کلام پڑھتا ہے اور پرنم آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے، اے بھولی ہوئی سی یاد و! آیا کرو، میرے دل کو پہلے گدگدایا کرو، پھر رُلایا کرو، دل کی کثافت دُور کیا کرو اور پھر غزل کہلوایا کرو:

رونا جب آتا ہے تو غزل گانے لگتے ہیں
شاعر نہیں لگتے ہیں ہم دیوانے لگتے ہیں

تو آج میں اپنی غزلوں کے تیسرے مجموعے کے لیے کچھ لکھنے بیٹھا ہوں۔تو آنکھوں میں بدلی سی چھا رہی ہے۔بھولی ہوئی سی یادیں یاد آ رہی ہیں۔اور میرے دل کو باغ و بہار بنا رہی ہیں۔آنکھوں کو پگھلا رہی ہیں اور دل میں پھول کھلا رہی ہیں۔لوگ آ رہے ہیں، دخل درمعقولات دے رہے ہیں، کسی کو کیا معلوم کلیم اس وقت کس کیفیت میں ہے۔اس کی روح کس لذّت میں ہے۔اس کا وجود کس جنت میں ہے۔لوگ آ کے سلام کریں، پکاریں باتیں کرنا چاہیں:

میں یوں بھی کم سخن، کم آمیز، کم اختلاط ہوں۔تنہائی میں خیالوں اور یادوں کے ہجوم میں رہنا میری بہترین انجمن ہے۔غموں میں انھیں سے بہلتا ہوں اسی سے رشتہ ہے، اسی سے تعلق ہے، ربط ہے، محبت ہے، دس سال کی عمر تھی جب خیالوں میں ڈوبنا، اپنے گھر کے لوگ، محلے کے لوگ چھوٹے بڑے، ذات والے، کم ذات والے، کنجڑے، قصائی کی باتیں بھی دل کو موہ لیا کرتی تھیں۔تنہائیوں میں ان ہی باتوں کو یاد کر کے مزے لینا یہ میرا بہترین مشغلہ ہے۔ان یادوں میں ہنسی کھیل کی باتیں کم ہوتی ہیں۔محبت، تعلق کی مٹھاس زیادہ ہوتی ہے۔یہ عجب بات ہے کہ زور سے ہنسنا مجھے آتا نہیں تھا ہنستا ضرور تھا۔ہلکی آواز کے ساتھ دانت کھل جاتے تھے۔

معزّز لوگوں کے سامنے کیا اپنے ہم عمر یا اپنے سے کچھ بڑے دوستوں اور ہم نشینوں کے سامنے بھی بے تکلّفانہ زور کی ہنسی شاید مجھے کبھی نہیں آتی ہے۔اور گھر میں ماں کو، والد کو، بہن کو، بھائی کو بھی قہقہہ لگاتے دیکھنا میری یادوں کے کسی گوشے میں نہیں۔لوگ ہنستے ضرور تھے لیکن بے تحاشہ قہقہہ لگانا یہ شاید ادب اور تہذیب کے دائرے سے باہر تصور کیا جاتا تھا۔ہماری بستی کے جتنے اہلِ علم شرفا تھے۔بہترین مزاح سے آشنا تھے، خوبصورت جملوں کی پھلجھڑیاں خوب چھوڑنا جانتے تھے۔لیکن مجھے یاد ہے کہ خوش مزاج لوگ ہنسی سے جھوم جاتے۔اِدھر اُدھر سر گھمانے لگتے۔کبھی ہاتھ اِدھر کبھی اُدھر پھیلاتے۔باچھیں کھلی رہتیں مگر آواز بتیس دانتوں کے اندر مقید ہوتی۔بہت سے بے قابو ہوئے تو عجب طرح کی آواز نکال کر منہ پر ہاتھ رکھ لیتے۔

یہ نقشہ ہم نشینوں میں ہم نشستوں میں ہوتا۔گھر کے بزرگ مرد اور عورتیں بھی عزیزوں کے سامنے کبھی بے تکلف نہیں ہوتیں۔زور سے ہنسنے کا کیا سوال۔

یہ اس لیے لکھ رہا ہوں کہ میری شاعری کا جو رنگ، جو آہنگ ہے، اس میں صبر و ضبط کی جو کیفیت ہے، اس میں جو باتوں کو ایک خاص اہتمام سے کہنے کا سلیقہ ہے، سادگی میں جو پرکاری

ہے، بے تکلفی میں جو تکلف ہے وہ اسی فضا اور ماحول کے اثرات سے ہے۔ میں خود بھی اپنی باتوں کے طرز و انداز سے کبھی کبھی حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہوں کہ یہ بات میں نے کیسے کہہ دی۔ اس انداز سے کیسے کہہ دی۔ یہ انداز میں نے کبھی سیکھا نہیں، غالبؔ سے نہیں، میرؔ سے بھی نہیں سیکھا۔ میرؔ کی گرمیِ مزاج، میرؔ کا حزم و احتیاط ان کا اپنا ہے۔ اس کی نہ کوئی نقل کر سکتا ہے نہ اسے سیکھا جا سکتا ہے۔ وہ جو قطرہ کو دریا میں سمو دینے کا انداز اور زمین و آسمان کو اپنی مٹھی میں بند کر لینے کا انداز میرؔ میں ہے وہ اوروں میں کسی کی قسمت نہیں۔ مگر یہ میں ضرور سمجھتا ہوں کہ میرؔ مجھے سنتے تو بہت خوش ہوتے۔ مصحفیؔ نے ایک غزل مشاعرے میں پڑھی تو اس کے ایک شعر کو میرؔ نے مکرر پڑھوایا تو مصحفیؔ نے کہا میں اس شعر کے سامنے اپنے دیوان میں لکھ دوں گا کہ اس شعر کو حضرت میرؔ نے مکرر سنا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ میرؔ صاحب میرے ایک شعر پر نہیں کئی غزلوں پر جھوم جاتے۔ ایک غزل میں نے لکھی، بڑی لمبی ہے۔ غزل میں دو قطعات بھی ہیں:

درد کی ہے یہ تاثیر صاحب ۔۔۔ میرؔ صاحب بنے میرؔ صاحب
عشق کے پا بہ زنجیر صاحب ۔۔۔ آج ہم کل رہے میرؔ صاحب

آخر شعر ہے:

زندگی درد سے جھوم اُٹھی ہے ۔۔۔ ہائے مارا ہے کیا تیر صاحب

اس میں مقطع ہے:

بول اُٹھّے کہ شاباش عاجزؔ ۔۔۔ سن کے میری غزل میرؔ صاحب

اور مجھے یقین ہے کہ ضرور بول اُٹھتے۔

جب فراقؔ جیسا بددماغ بہت کچھ کہتے کہتے آخری سطر میں لکھ جاتا ہے کہ ’’یہ سطریں سخت بیماری میں بول کر لکھا رہا ہوں۔ میں کلیم عاجزؔ کی شاعری پر کچھ بھی کہتے ہوئے اپنے آنسو مشکل سے روک پاتا ہوں اس سے زیادہ میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔‘‘

ارے فراقؔ اور آنسو؟ یہ مار کلیمؔ نے ماردی کہ فراقؔ کو رُلا دیا، تو یہ سو فیصد آنسوؤں سے جنم لینے والی شاعری ہے جسے سن کر بے آنسو والا شاعر بھی آنسو کو نہیں روک پاتا ہے۔

میرے متعلق بلا استثنیٰ یہ بات سب کہتے ہیں کہ بہار کے حادثے نے کلیم کو شاعر بنا دیا۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ یہ بات الٹی بات ہے۔ بہار کے حادثے نے کلیمؔ کو

شاعر نہیں بنایا۔کلیمؔ نے بہار کے حادثے کو شاعری بنا دیا۔ اس لیے کہ یہ حادثہ بہار ہی میں نہیں سارے ہندوستان پر گزرا۔ گلیوں گلیوں، راستے راستے گزرا۔ پورب پچھّم گزرا۔ لیکن آسام سے پشاور تک کوئی اس حادثہ کو شاعری نہ بنا سکا۔ کسی کا منہ نہیں کھلا۔ کسی کا قلم نہیں چلا۔ اس ہندوستان کی سرزمین کے کسی کونے سے کوئی شخص نہیں اٹھا۔ کسی میں یہ سلیقہ نہ تھا۔ کسی کو یہ سلیقہ نہیں سکھایا گیا۔ لکھنے والے لکھ گئے ہیں کہ حشر کے میدان میں شاید اس کی پرسش ہوگی کہ سرزمینِ ہند پر خون کی بارش ہوئی، زخموں کی پھوہاریں پڑیں، شمشیروں کی گھٹائیں چھائیں۔ بڑے بڑے گلزار اس میں بہہ گئے، بڑے بڑے سروگل کے سائے گم ہو گئے۔ کتنے شہر ویران ہو گئے۔ کتنی بستیاں شام ہوتے ہوتے بے چراغ ہو گئیں۔ کہیں بھی ایک ٹمٹماتا دِیا نہ تھا۔ لیکن ایک آہ بھی کہیں نہیں اُٹھی۔ ایک کراہ بھی کہیں نہیں گونجی، کوئی ایک شاعر بھی ہندوستان کے کسی کونے سے اس کا ماتم گزار ہو کر نہیں اٹھا۔ اللہ پوچھے گا کہ پورے ملک میں سینکڑوں کربلا کھل گئے۔ شہر کے شہر دفن کر دیئے گئے لیکن غم کی عزت محفوظ کرتے ہوئے اور اُسے مرثیے نہ بننے دینے کے لیے کوئی غزل خواں آب و گل ہندوستان سے نہ اُٹھا؟

غم کی عزّت غزل نے رکھ لی کلیمؔ
ورنہ ہونٹوں پہ مرثیے ہوتے

پورے ہندوستان کی اس قیامتِ صغریٰ کو غزل کا شبنمی پیرہن دینے والا ایک چھوٹے سے گاؤں کا صرف ایک کلوا کھڑا ہوا اور سارا ہندوستان سویا رہا۔ حشر میں شاید یہ سوال ہو تو سامنے صرف تیلہاڑہ گاؤں کا کلو کھڑا ہوگا اور مشرق و مغرب، شمال و جنوب کی گماں آباد بستی میں ایک ہی مردِ مسلماں کا یقین قندیل ربانی بن کر ٹمٹماتا نظر آئے گا۔ کلیم عاجزؔ کے اس غم کو قندیل ربانی بننا تھا تو پھر زندگی بھر اس شراف کو قائم رکھنے کے لیے اس کی آنکھوں میں زندگی بھر بدلی سی چھائی رہے گی، بھولی سی یاد آتی رہے گی، سانس لینے میں تن بدن دُکھتا رہے گا۔ رگ رگ میں ایک تیز نوک سمائی رہے گی۔

مجھے دس سال کی عمر سے ہ تربیت دی گئی، یہ فن سکھایا گیا، یہ توانائی ڈالی جاتی رہے کہ آگ کو پھول بنا دو، خون کو زمزم بنا دو، آنسوؤں کو شراب بنا دو، آہ کو قمقمہ بنا دو۔ میری رودادِ زندگی پڑھی جائے ’وہ جو شاعری کا سبب ہوا‘ پڑھی جائے ’جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی‘ پڑھی جائے، یہ واضح ہوگا کہ حادثے نے مجھے شاعر بنایا یا حادثے کو میں نے شاعری بنا دیا۔ میرؔ کی شاعری آنسو ہے،

میرے آنسو شاعری ہیں۔ یہ بات ہمارے نقّادوں کو کیوں سمجھ میں نہیں آتی۔ کلیم کو دس سال کی عمر سے اسی منصب کے لیے منتخب کیا گیا۔ اِسے ایک گاؤں کے در و بام سے، مٹّی کی، اینٹ کی، چونے کی دیوار سے ایسی محبت دی گئی کہ ان دیواروں سے وہ یوں چمٹتا تھا جیسے وہ انھیں کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ ماں سے، بہن سے، بھائی، چچی، ممانی، پھوپھی سے، کسے محبت نہیں ہوتی۔ لیکن اس نوعیت کی محبت کیا کسی نے کسی کو کبھی بھی کرتے دیکھا؟ کہیں کتابوں میں پڑھا؟ کوئی کہانی کسی کی نظر سے ایسی گزری تو بتائے، کوئی نہیں بتا سکتا۔ گاؤں سے، گھر گھر سے، لوگوں سے، محلے سے، پڑوس سے، گاؤں کے حلوائی سے، سنار سے، بنیوں سے، چماروں سے، پاسیوں سے، جھونپڑے والوں سے، گاؤں والوں سے، گرو جی کے سمدھیانے سے، گاؤں کی گلیوں سے کیچڑ والے راستوں سے، آلو پیاز اور ساگ کے کھیتوں سے، کنویں پر کھیت بٹاتے ہوئے کسانوں سے، آلو کی کیاریوں سے، ٹوٹے ہوئے پل سے، امرود کے باغوں سے، باغوں کے مالیوں سے، حجاموں سے، ایسی بے ساختہ محبت کا نمونہ کوئی پیش کر سکتا ہے۔ یہ کہانیاں اور بھی باریک و نازک ہوتیں، اگر اس کی کوشش ہوتی۔ مگر مقصد تو صرف شاعری کا سبب بیان کرنا تھا اور غزلیں کہلوانی تھیں:

جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی جہاں نغمے ہی نغمے تھے
وہ گلشن اور وہ یارانِ غزل خواں یاد آتے ہیں

اور کلیم پینسٹھ سال سے اس خاک خون کو، در و دیوار کو، گلی اور راستوں کو، مٹّی کی دیواروں کو، گھر کے چھپّروں کو، اور ان کے نیچے رہنے والی رفّو نانی کو، رقیہ خالہ کو، حسنیٰ خالہ کو، درگاہن خالہ کو، ماں کو، بہن کو، پھوپھی کو، ممانی کو، چچی کو، نانی کو، حوریں بنا کر کیچڑ بھرے گاؤں کو، امرود کے درختوں کو، سنگر ہار کی جھاڑیوں کو، غزل بنا کر گا رہا ہے۔ ان کی رعنائیاں، رنگینیاں، خوشبوئیں بڑھتی جا رہی ہیں اگر حادثہ ہی شاعر بناتا ہے تو انھیں جگہوں میں شاہ عبدالحمید صاحب تھے۔ اچھے شاعر تھے۔ خود اپنے بڑے بھائی کو، بھاوج کو، بھتیجوں کو، چھوٹے بھائی کو، چھوٹے بھائی کی بیوی کو، گھر بھر کو شہید ہوتے دیکھ کر چالیس سال زندہ رہے۔ ایک شعر بھی ایسا کہہ کے نہ گئے جو اس ماتم کدہ سے ٹپکا ہوا ایک ہی آنسو قطرہ ہوتا، بہاء الدین کلیم بھی حادثے کے بعد چالیس پینتالیس سال زندہ رہے۔ ان کا چھوٹا بھائی صلاح الدین سب انسپکٹر ان کے گاؤں کے سو مردوں، عورتوں کو بچا کر لے جاتے ہوئے کھیتوں میں شہید کر دیا گیا۔ بستی کی بستی کھیتوں میں دفن ہو گئی۔ پٹنہ شہر

میں چالیس سال گزار کر مشاعروں میں صدارت کرتے شعر پر داد دیتے اور حافظے سے بے تحاشہ شعروں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے ہوئے مر گئے۔ایک شعر بھی نہ کہہ سکے۔

اور ہزاروں ہندوستانی شاعر جو پاکستان چلے گئے، کچی پکّی دیواروں کے گھروں میں رہتے تھے محلوں میں رہنے لگے، کاروں میں پھرنے لگے، غزلوں کے مجموعے چھپوا کر اجرا کرتے رہے۔ کہاں ہے حادثہ؟ دہلی کی جامع مسجد کے پھاٹک حبش خاں کے، ہمایوں کے مقبرے کے، سینکڑوں مہاجر کراچی پہنچ گئے، چھوٹے مکانوں میں تھے، مکان چھوٹا، مکان کے مکیں چھوٹے، جائیداد مال، پیاری جانیں تڑپتی چھوٹیں، کراچی آ کر بڑے مکانوں میں رہنے لگے۔ امریکی انگلش کاروں پر پھرنے لگے۔ شاعری کرنے لگے، استاد بن گئے۔ آداب عرض کرنے لگے، جی محبت ہے، کرم ہے، شکریہ ادا کرنے لگے۔ جھک کر سلام کرتے۔ گاؤں، نہ وطن، نہ مکاں، نہ مکیں، نہ زخمی جسم، نہ بے جان لاشے، نہ خون میں نہائی ماں بہنیں، کبھی آ کر کہتی ہیں کہ ہم کو بھی تو شاعری میں جگہ دو، ہمارا بھی تو ذکر و، تمھارا ذکر کروں گا تو داد کیسے حاصل کروں گا۔

۱۹۴۷ء کے تیس سال بعد میں جب کراچی پہنچا، کچھ بہاریوں کو خبر ہوگئی، بیدل لائبریری کے سکریٹری ظفر صاحب کو خبر ہوگئی۔ میرے متعلق سن رکھا تھا۔ میرے بھانجے کے مکان پر آئے، تعارف ہوا اور بات ہوئی، چھوٹے ہوئے وطن سے ایک شاعر آیا ہے۔ کانوں کان خبر ہوگئی تو بھولے بھٹکے کلیم عاجزؔ کو دیکھنے کے لیے لوگ آنے لگے۔ شاعری کی باتیں آئیں۔ چلو ایک مشاعرہ کرایا جائے۔ بیدل لائبریری کے ہال میں مشاعرہ ہوا۔ بہار کے تو دو چار ہی شاعر آئے لیکن رازؔ مراد آبادی، اسماعیل مینائی، ظفرؔ امروہی، تابشؔ دہلوی۔ ۱۹۴۷ء کے مارے کھدیڑے کراچی میں رئیس بن کر گھومنے لگے اور فرشی شاعری کرنے لگے۔ بیدل لائبریری کے مشاعرے میں پہنچ گئے۔ ایک دُبلے پتلے آدمی کو بہار کی شیروانی اور خالتہ پاجامہ اور سیاہ رامپوری ٹوپی میں ڈائس پر آ کر جب پڑھتے ہوئے دیکھا:

تجھے کیا اگر ترے واسطے کوئی زندگی سے گزر گیا
تری زُلف اور سنور گئی، تیرا حسن اور نکھر گیا تیری
قدر و قیمتِ حسن کی تجھے کون دے کے خبر گیا
نہ نگاہ تیری اوپر اُٹھی نہ خیال تیرا ادھر گیا

مجھے دل کے حال کا غم نہیں مگر اس کا غم تو ضرور ہے
کہ اسی نے توڑا یہ آئینہ جو اس آئینے میں سنور گیا

تو دل سینے سے تڑپ کر حلق میں آ گیا۔ اب نہ بولا جائے ہے، نہ چپ رہا جائے ہے۔ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے؟ یہ کراچی کی بات ہے نہ لاہور کی نہ راولپنڈی کی نہ اسلام آباد کی۔ تب یاد آ گیا یہ تو ہندوستان کی بات ہے۔ یہ تو دہلی کی بات ہے، جالندھر کی بات ہے۔ یہ تو پٹنہ کی بات ہے، جس بات کے ہونے پر پورے ہندوستان سے محبت کے قافلے پٹنہ پہنچ گئے۔ سر فیروز خان نون، نواب ممدوٹ، میاں ممتاز دولتانہ، میاں داؤد غزنوی، نواب زادہ لیاقت علی خاں، سردار عبدالرب نشترؔ صافہ لہراتے ہوئے، شلوار اور کوٹ چمکاتے ہوئے۔ یہاں آ کر دیکھا کہ کہیں ہچکیاں چل رہی ہیں، کہیں سسکیاں نکل رہی ہیں، کہیں زخمی پڑے ہیں، آئے اور چند دن رہ کر بہار کے پناہ گزینوں کا ایک قافلہ اپنے ساتھ لے کر پاکستان چلے گئے۔ وہاں آپ کو بسا گئے۔ تیس سال کے بعد وہ پٹنہ میں گزارے ہوئے چند دن یاد آ گئے۔ ارے یہ بھی شاعری بن سکتی؟ یہ بھی شاعری ہو سکتی ہے؟ جان سے گزر کر کسی کی زُلف سنوار دینا، خاک وخون میں مبتلا ہو کر کسی کے حسن کو نکھار دینا، یہ بھی کام ہوتا ہے۔ یہ باتیں تو پہلے نہیں سُنی تھیں۔ ایں! زخم بھی پھول بن سکتے ہیں۔ آنسو بھی شراب بن سکتے ہیں۔ درد بھی خوشگوار بن سکتا ہے۔ تلخی بھی شیرینی بن سکتی ہے:

آنسوؤں کی مئے بنی زخموں کا پیمانہ بنا
سینکڑوں مئے خانے اُجڑے، ایک مئے خانہ بنا
بے تحاشہ کود پڑتے ہیں وفا کی آگ میں
ہم ہیں اس مٹّی سے جس مٹّی سے، پروانہ بنا

واقعی سچ مچ کچھ لوگ پروانہ بن جاتے ہیں؟ بے تحاشہ وفا کی آگ میں کود بے جا سکتے ہیں اور پھر یہ انوکھا اور نرالا کام کرنے والے حسین وجمیل شاعری بن سکتے ہیں کہ ان پھلواریوں کو دیکھ کر اس کے حسن پر لوگ مست ہو جا سکتے ہیں، فریفتہ ہو جا سکتے ہیں، لوٹ پوٹ ہو جا سکتے ہیں۔ بیدل لائبریری کی فضا بدل گئی۔ کراچی کو لوگ بھول گئے، پاکستان کو لوگ بھول گئے۔ محلوں کو لوگ بھول گئے۔ صوفے اور مسہریوں کو لوگ بھول گئے۔ گھر سے نکال نکال کر، محلوں سے نکال نکال کر، صوفوں اور مسہریوں سے نکال نکال کر، کاروں سے اُٹھا اٹھا کر حسین پلیٹ اور پیالوں

میں رکھے ذائقہ دار کھانوں سے اُٹھا اُٹھا کر، دہلی جامع مسجد کے پھاٹک سے اُٹھا اُٹھا کر زخموں کی مجلسوں میں، آنسوؤں کی انجمنوں میں، درد کی گلیوں میں لا کر چھوڑ دیا۔ پورے کراچی میں درد کی آگ پھیل گئی۔ آنسوؤں کا سیلاب آ گیا۔ جتنے ادبی ادارے تھے اب نام بھی یاد نہیں۔ جتنے لٹریری کلب تھے، ادبی گہوارے تھے۔ ایک ایک دن میں دو دو نشستیں مغرب سے عشا ایک کلب میں، عشائیے کھانے کے بعد دوسرے ادارے میں کامران کلب اور عرفان کلب، آرٹس کونسل، پریس کلب، امروہہ کلب، حیدرآباد کلب، کراچی میں چاروں طرف درد کی شمعیں جلنے لگیں۔ مولانا صلاح الدین جن سے ذوالفقار بھٹو کی حکومت کانپتی تھی۔ 'جسارت اخبار' کے ایڈیٹر جن کی تحریریں آگ لگا دیتی تھیں۔ آخر کار بے نظیر بھٹو کے گذشتہ عہد میں کراچی کے ڈیفنس کالونی کے شاہراہ پر گاڑی پر سفر کرتے ہوئے صلاح الدین صاحب کو رائفل کی گولی نے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔ آرٹس کونسل کی نشست میں ایک شخص صف سے آگے بڑھا۔ ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا اور ایک جملہ کہا ''آپ کا صلاح الدین'' میانہ قد، چہرہ داڑھی کے بالوں سے چھپا ہوا۔ پاجامہ شیروانی میں ملبوس، میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ معمولی حلیہ کا اور سادہ لباس کا شخص پاکستان کے عوام کو اس قدر گرم کرسکتا ہے؟ پھر یہ حال ہوا۔ میں اپنے بھانجے کے چھوٹے سے کوارٹر میں ظہر کی نماز کے لیے باہر کے صحن میں بیٹھا ہوں کہ سامنے صلاح الدین صاحب۔ شام ہوئی اور صلاح الدین موجود۔ بس چلو مرے گھر چلو۔ گھر لے کر آ گئے اور حبیب جالب آ گئے۔ ادھر سے مشفق خواجہ آ گئے اور محفل گرم ہوگئی۔ کبھی جینس ہوٹل کا ہال کراچی کے خوش پوشوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور میاں کلیم عاجزؔ غزل خواں ہیں۔ تقسیم سے پہلے مسٹر جناح کے نیشنل گارڈ کے کمانڈر ظفر احمد انصاری اور جنرل ضیاء الحق کے دور میں جنرل صاحب کے دست راست اور صلاح کار اور نظریاتی کونسل آف پاکستان کے چیئرمین مولانا ظفر احمد انصاری اپنی چھڑی ٹیکتے ہوئے میرے بھانجے کے گھر پہنچ گئے۔ ان کو دیکھ کر محلے کا محلّہ جمع ہوگیا۔ مولانا اسی معمولی سی چوکی پر پاؤں پھیلا کر اور دیوار کی ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور مزاج پرسی کے ساتھ بہار کے حادثے پر گفتگو ہونے لگی۔ اور پھر مجھے ساتھ لے کر بندر روڈ کے دو منزلہ مکان میں آ گئے اور کراچی کے منتخب اہل علم و ادب اور شعرا جمع ہو گئے اور میاں کلیم عاجزؔ کو چھیڑ چھیڑ کر درد کے فسانے اور زخموں کی داستانیں سننے لگے۔ ممبئی میں مسلم لیگ کے صدر مسٹر عبدالکریم سومار کراچی کے فاروق ٹیکسٹائل

کے مالک گاڑی لے کر آ گئے اور اپنے گھر ایک قوالی کی مجلس میں صدر بنا کر بیٹھا دیا۔ اب لوگ قوال کو نذر پیش کر رہے ہیں تو پہلے میرے ہاتھ میں رکھ دیتے ہیں، پھر قوال میرے ہاتھ سے رقم لے کر سلامی مارتا ہے۔

حکیم سعید صاحب ہمدرد دواخانہ دلّی کے مالک حکیم عبدالحمید صاحب کے چھوٹے بھائی اور ہمدرد پاکستان کے مالک، بہترین شیروانی، دستار اور انگریزی جوتے۔ اپنے گھر لے جا رہے ہیں۔

مجنوں گورکھپوری جنھیں میں نے ۱۹۳۶ء میں کلکتہ کے محمد علی پارک میں مضمون پڑھتے دیکھا تھا، بوڑھے معذور اپنے عزیز کو بھیجتے ہیں کہ کلیم عاجؔز کو لیتے آؤ۔ میں بھی دیکھ لوں اور سن لوں۔ میں پہنچا تو دُبلے پتلے دیوار سے سٹے بیٹھے تھے۔ بینائی کمزور تھی۔ میری مزاج پُرسی کی، کچھ حال پوچھا پھر بولے میاں سناؤ تم نے تو کراچی کو گردش میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں نے دو غزلیں سنائیں۔ دعا دیتے رہے۔ وہ اس وقت ۷۶ سال کے تھے اور میں ۵۵ سال کا تھا۔ وہ اندر اور باہر سے ٹوٹ چکے تھے۔ میں اندر، باہر دونوں مستحکم تھا۔ بدن کشتی کی مشق سے ٹھوس اور میری روح شعر و ادب کے زمزم سے سیراب تھی۔

پٹنہ اور گاؤں گاؤں کی قیامتوں میں، آفتوں میں، مصیبتوں میں لوگ گرنے لگے۔ بیدل لائبریری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ تیس برس کا آگ اور خون میں جلتا ہوا، بہتا ہوا بہار سامنے آ گیا۔ حسین خوبصورت، لفظوں کے پردے، طرحدار تشبیہوں اور استعاروں کے چلمن سے، تصور سے حقیقت تک لوگ پہنچ گئے۔ اور سب بھول گئے۔ اپنی فرشی یا مجلسی شاعری بھول گئے۔ داد و تحسین و تعریف بھول گئے۔ بہار کے شہیدوں کے ساتھ لوگ دوڑ دوڑ کر لپٹنے لگے۔ یہ کام شاعری کر گئی۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ نہ صبح چین نہ شام آرام۔ روز کہیں نہ کہیں مجلسیں ہونے لگے۔ زخموں کے گلاب کھلنے لگا۔ شرابِ اشک کے دورِ جام چلنے لگے۔ لوگ کھانا بھولنے لگے۔ سونا بھولنے لگے۔ آپس میں ملنا جلنا بھولنے لگے۔ لوگ کہنے لگے کہ کیا کہیں عاجؔز صاحب گھر میں جی نہیں لگتا ہے۔ آفس میں بیٹھنا گوارہ نہیں ہوتا ہے۔ کھانے میں مزہ نہیں آتا۔ بھاگم بھاگ مشاعرے میں، مجلسوں میں پہنچتے ہیں اور کلیم کو سنتے ہیں:

مجھے اس کا کوئی گلہ نہیں کہ بہار نے مجھے کیا دیا
تری آرزو تو نکال دی تیرا حوصلہ تو بڑھا دیا

میری حسرتوں کا چمن جو تھا اُسے خاک وخوں میں ملا دیا
ترے گھر میں پھول کھلا دیئے، تجھے خوشبوؤں میں بسا دیا
تجھے اب بھی میرے خلوص کا نہ یقین آئے تو کیا کروں
ترے گیسوؤں کو سنوار کر تجھے آئینہ بھی دکھا دیا

میرؔ تک کون پہنچا؟ کوئی پہنچ سکتا ہے؟ سارا ہندوستان چلنے کی کوشش کرتے کرتے، گرتا پڑتا بڑھا لیکن سانس پھولنے لگی۔ تھک ہار کر سر ٹیکنے لگے نا بھائی یہ تو آتش کدۂ نمرود ہے:

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں کل یہاں سرو گل کے سائے تھے
فرصتِ زندگی سے مت پوچھو سانس بھی ہم نہ لینے پائے تھے
پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ کتنے آنسو پلک تک آئے تھے
میرؔ صاحب رُلا گئے سب کو کل وہ تشریف یاں بھی لائے تھے

اس آتش فشاں کے دہانے کے قریب کون آ سکتا ہے؟

یہ سمندر ہے کنارے ہی کنارے جاؤ

کوئی کنارے بھی نہیں پہنچ سکا۔ ہم کنارے تو ضرور پہنچ گئے، جس بھاری پتھر کو چوم کر رکھ دیا گیا، ہم اسے لے کر دو چار قدم ضرور چلے۔ دو قدم سے زیادہ چلنے کا دم خم نہ تھا:

کچھ سجے ہیں زلف میں کچھ گلوئے یار میں پھول جس قدر کھلے موسمِ بہار میں
جی میں ہے کہ رویئے شاخِ سایہ دار میں دونوں ہاتھ ڈال کے گردنِ بہار میں
ہم رہے تو کیا رہے، ہم ہیں کس شمار میں قافلے کا قافلہ لٹ گیا بہار میں

یہ کیا ہے؟

کیا حال بیاں کیجیے سب حال ہے آئینہ اشکوں سے بھرا دامن زخموں سے بھرا سینہ
یہ فصلِ گل و لالہ گزری چلی جاتی ہے بے شیشہ و بے ساغر بے بادہ و بے مینا
وہ انجمن آرائی یہ غربت و تنہائی بخشا تو بہت بخشا، چھینا تو بہت چھینا
دُنیا میں غریبوں کو دو کام ہی آتے ہیں جینے کے لیے مرنا، مرنے کے لیے جینا

یہ کیا ہے؟

اسیروں سے ذرا ہٹ کر بہارِ گلستاں گزرے
کہیں ایسا نہ ہو دل پر ملالِ آشیاں گزرے

مبارک برق تجھ کو لالہ و گل کی نگہبانی
کہ اب تو گلستاں سے در دِمندِ گلستاں گزرے

یہ کیا ہے؟

جب فصل بہاراں آئی تھی گلشن میں انھیں ایام سے ہم
یاروں میں لٹاتے پھرتے ہیں کچھ پھول غزل کے نام سے ہم
کھولے ہوئے ہیں غزلوں کی دُکاں ٹوٹے ہوئے دل کے نام سے ہم
چھلکائیں گے کتنے جام ابھی اس ایک شکستہ جام سے ہم
بجھنے کا خیال آتا ہی نہیں روشن جو ہوئے اِک شام سے ہم
تکلیف سلگنے ہی تک تھی ، جلتے ہیں بڑے آرام سے ہم

یہ کیا ہے؟

جو میرے حافظے میں ابتدائی دَور کے اشعار آئے ان میں یہ ہیں، بہت ہیں جن پر کلیمؔ خود طنز کرتا ہے:

کب تک سنیں عاجزؔ سے غمِ دل کی حکایت
کمبخت ہمیشہ یہی افسانہ کہے ہے

....

ع کہو کلیمؔ سے محفل کو بے مزہ نہ کرے

کسی نے فکر سے توجہ ہی نہیں کی جو نگاہ اور قلم والے تھے وہ چونک کے میرا منہ دیکھتے تھے۔عرش ملسیانی کے والد لبھو رام جوش ملسیانی شاگر دِداغ۔دہلی میں مجھ سے سن کر حیرت سے دیکھنے لگے۔ غالبؔ کے پوتے شاگرد حکیم الیاس بہاری زور سے بول اُٹھے۔''بہت اونچے جارہے ہو کلیمؔ۔''

اب صاحبِ نگاہ گزر گئے۔اہلِ قلم رہ گئے۔تو قلم اس منزل تک نہیں پہنچا۔غالبؔ و اقبالؔ کو چھوڑیئے۔یہ دونوں انقلابی شاعر تھے۔غالبؔ ظاہر میں انقلاب لانا چاہتے تھے،لے آئے۔ اقبالؔ باطنی انقلاب لانا چاہتے تھے۔اِس کا دَور گزر چکا تھا۔غالبؔ کا دور آ گیا تھا۔دل غالبؔ کی طرف رجوع ہو چکا تھا۔اقبالؔ کی شاعری مجلس آرائی بن کر رہی۔تقریروں میں،تحریروں میں اقبالؔ کے کلام سے زینت بڑھائی جانے لگی۔شیخ صاحب جھوم جھوم کر محفلوں میں اقبالؔ کا شکوہ

پڑھنے لگے، یہ دل قبول نہ کررہا تھا۔صرف زبان کہا کرتی، میؔر کے بعد اقبالؔ پیدا ہوتے۔انگریز آ چکے ہوتے تو ۱۸۵۷ء کا انقلاب کچھ اور رنگ لایا ہوتا۔لیکن اقبالؔ اس کے بعد آئے، رومی یہ کر چکے تھے۔ ان کا مشن کامیاب ہو چکا تھا۔لیکن رومی کے جانشیں میؔر کے بعد پیدا ہوئے۔ اقبالؔ کو خود شکایت ہے:

نہ اُٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گِل ایراں وہی تبریز ہے ساقی

میرے ساتھ بھی یہی ٹریجڈی ہوئی۔غالبؔ اپنے عہد سے پہلے پیدا ہوئے:

ہوں گرمیِ نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

اس لیے وہ بات کہہ گئے جب تعلیمی ذہن ہوا، انگریز آئے۔ تجسّس اور تشکیک کا دَور شروع ہوا۔ غالبؔ کام آ گئے اور کسی حد تک اب تک کام آ رہے ہیں۔ اقبالؔ کے گانے والے اور اقبالؔ کا کلام الاپنے والے کا دل کچھ اور ہے اور زباں کچھ اور ہے۔ زبان کا کیا وزن۔ ادھر بات منہ سے نکلی اور ہوا میں اُڑ گئی:

جی چاہتا نہ ہوتو زباں میں اثر کہاں

....

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

....

وفا کیسی، کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

....

ہم بھی تمھیں دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غم دوراں سے گر ملے

....

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ ایک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

جب آزادیِ خیال اور آزادیِ عمل کی ہوا شروع ہوئی تو لوگ غالبؔ کو سمجھنے لگے اور سر دُھننے لگے۔ بولے یہ تو ہمارے دل کی بات کہتا ہے۔ بس کیا تھا سرسیّد کو بھی سہارا مل گیا اور غالبؔ کی بات سرسیّد کے کندھے پر سوار ہوگئی اور آخر قید و بند والی قبا اُترنے لگی۔ لوگ عید کی سوئیوں کا مزہ بھولنے لگے، کیک چلنے لگا۔ ہوٹل میں عید کی دعوت ہونے لگی:

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

……..…………

دشت تو دشت ہے صحرا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

ارے باپ رے باپ۔ یہاں تو:

فرشِ مخمل پہ مرے پاؤں چھلے جاتے ہیں

نواب واجد علی شاہ، شاہی چھوڑ کر صحرا نشینی کریں۔ آپ بھی کیا بات کرتے ہیں؟ ایک صاحب نے سیرت پر تقریر کرتے ہوئے جَو کی روٹی اور دال کی اتنی فضیلت پورے جوش کے ساتھ اتنی دیر تک بیان کی کہ صاحب خانہ بھی متاثر ہوئے اور جلسے کے بعد دسترخوان بچھا تو مولانا کے سامنے اہتمام سے جو کی روٹی اور دال رکھی گئی۔ مولانا رونے لگے۔ روٹی اور دال کے پیالے کو سر پر رکھا، احترام سے چوما اور فرمانے لگے۔ بھائی ہم جیسے گنہگار اتنی مقدس غذا کیسے کھا سکتے ہیں؟ ہمارے لیے تو وہی معمولی چالو کھانا، بریانی، قورمہ وغیرہ لاؤ۔ تو میری شاعری میں قدامت پرستی، جدت پرستی، میرؔ پرستی، غالبؔ پرستی، اقبالؔ پرستی یکجا ہوگئی۔ اور سچ یہ ہے کہ بیسویں صدی کے وسط میں جو بھی شاعری کی جاتی تھی چاہے اس میں لکھنؤ اسکول ہو یا دلّی اسکول ہو۔ علی گڑھ اسکول ہو، یا عظیم آباد اسکول ہو، میں جب ۱۹۵۰ء اسے مشاعرہ میں پڑھنے لگا تو پورے ہندوستان کے پہاڑ کی چوٹی ہل گئی۔ یہ دعویٰ نہیں، تعلّی نہیں، اس کی شہادت دینے والے اب بھی یہاں وہاں مل جاویں گے:

میں نے تاریخ کا اِک ایک ورق دیکھ لیا
کوئی بھی میری طرح درد کا مارا نہ ہوا

دردوالوں میں تیری بات کا چرچا ہے کلیمؔ
لوگ کہتے ہیں کہ ایسا سخن آرا نہ ہوا

سجاد ظہیر، رضیہ سجاد ظہیر سے لے کر ظ انصاری، آل احمد سرور، کیفی اعظمی، سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی سب اپنا کلام بھول گئے۔ جیسے فراقؔ بھول گئے۔ اس بات سے میرے کچھ احباب اور تمام نئے احباب دل برداشتہ نہ ہوں۔ میں نے ہمیشہ کہا ہے اور لکھا ہے۔ میری شاعری میں، میری نثر نگاری میں، میرے کلام نثر و نظم میں، ریاض کا کوئی دخل نہیں ہے۔ میں اس پر ایمان رکھتا ہوں کہ شہیدانِ وقت نے میری جھولی بھر دی:

اس دَور کے جتنے بھی شہیدانِ ستم ہیں
وہ سب میری غزلوں کے نقابوں میں ملیں گے

میں اسی جھولی سے دانہ دانہ دے رہا ہوں۔ میری کمائی ہوئی کوئی چیز نہیں ہے۔ کسی نے کہا:

جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

میری شاعری میں بے چھینٹ کا دامن اور بے داغ کا خنجر پکار کر کہہ رہا ہے اور مشرق سے مغرب، شمال سے جنوب، پیشاور سے راس کماری تک اس کی شہادت دینے والے لوگ کھڑے ہیں۔

اسلام پسند ہوں، چاہے کفر پسند ہوں۔ حضرت مولانا ظفر احمد انصاری کی حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں مرحوم سے جدہ میں جب ملاقات ہوئی، مولانا ظفر احمد انصاری نے بے ساختہ پوچھا۔ علی میاں صاحب آپ کے ہندوستان میں ایک بڑا شاعر پیدا ہو گیا ہے۔ حضرت علی میاں مرحوم نے بھی بے ساختہ کہا، شاید آپ کلیم عاجزؔ کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ اور کفر پسندوں میں فراقؔ گورکھپوری، کنہیا لال کپور دلیل ہیں اور ہندوستان کے تمام ہندو شاعر جو اب گزر گئے پڑھتے پھرتے تھے:

مجھے پہلے ہی کچھ ایسا لگا تھا — کہ وہ ایسا نہیں جیسا لگے ہے
اُٹھا آگے سے ساقی جام و مینا — دل اچھا ہو تو سب اچھا لگے ہے
ذرا دیکھ آئینہ میری وفا کا — تو کیسا تھا اب کیسا لگے ہے

....

اس ناز اس انداز سے تم ہائے چلو ہو
روز ایک غزل ہم سے کہلوائے چلو ہو

رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں
چلنا ذرا آیا ہے تو اترائے چلو ہو

تو میرا کہنا یہی ہے کہ شہیدوں نے بلا فرق ملت سب کا دل پکڑ لیا۔ یہ اس دور میں ہوا جب اُردو شاعری کا دَور ختم ہو رہا تھا اور میں اس خاتمہ کے وقت پیدا ہوا۔ جب میں نے شاعری شروع کی تو جوان ہوں یا بوڑھے، پڑھے لکھے ہوں یا بے پڑھے لکھے۔ افسران کرسی نشیں ہوں یا مزدوران بوریہ نشیں، ہوٹل کے ملازمین ہوں، دفتروں کے کلرک، تاجر ہوں یا ملازمین، طالب علم ہوں یا پروفیسر، مدرسہ ہو یا کالج۔ سب زور زور سے سر دھننے لگے۔ گھر میں بھی اور بازاروں میں بھی۔ دُکانوں میں بھی اور دفتروں میں بھی۔ انجمن اسلامیہ، پٹنہ میں شاید ۱۹۵۰ء میں ایک مشاعرہ ہوا عرش ملسیانی کی صدارت میں۔ میں نے ایک غزل پڑھی، اس زمین پر جو میں نے حضرت جگرؔ مرادآبادی کو انجمن اسلامیہ ہال (پٹنہ) میں پڑھتے سنا تھا:

جہل خرد نے دن یہ دِکھائے
گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

اس زمین پر میں نے اسی دن غزل کہی۔ دو سال بعد انجمن میں پڑھی اور دوسرے دن میں اتفاق سے انجمن اسلامیہ (پٹنہ) کے سامنے شاد ہوٹل والی گلی میں جا رہا تھا۔ اس میں ایک بہت مشہور ہوٹل 'حبیبہ ہوٹل' تھا۔ اس کے دُکاندار مجھ پر فریفتہ تھے۔ بڑی قدر کرتے تھے مگر نہاری پائے سے مجھے نقصان ہوتا تھا۔ اس لیے میں ان کے ہوٹل میں کبھی نہ گیا۔ بس صاحب سلامت بہت گرم جوشی سے ہو جایا کرتی تھی۔

مشاعرے کی صبح جب میں اُن کے ہوٹل کے سامنے سے گزرا تو کُرسی پر کھڑے ہو گئے۔ آیئے آیئے عاجزؔ صاحب! ایک لقمہ تو لے لیجیے۔ میں نے کہا نہیں حبیب اللہ صاحب مجھے پرہیز ہے۔ نہیں عاجزؔ صاحب دو لقمے میں کچھ ہونے جانے والا نہیں ہے۔ بس ذرا آ جایئے، یوں ہی رسم ادا کر دیجیے۔ میں ان کی دُکان میں داخل ہو گیا۔ ان کے ٹیبل کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ انھوں نے زور سے ہوٹل کے دو ایک لڑکے سے کہا۔ عاجزؔ صاحب کے لیے ایک پلیٹ نہاری لاؤ۔ اس لڑکے نے گھوم کر مجھے دیکھا۔ پھر ایک ہلکے سے رقص کی طرح پاؤں کو اچھالتا ہوا اور سر کو ہلاتا ہوا اِ کاؤنٹر کی طرف جاتا ہوا زور سے گنگنانے لگا۔ یہ وہی غزل تھی جو میں نے گذشتہ رات

جگرؔ کی غزل پر کہی تھی:

کالے بادل جب لہرائے　　آنکھوں میں آنسو بھر آئے
پھول کھلے، کھل کر مرجھائے　　رہ گئے ہم دامن پھیلائے
کون تیری زُلفیں سلجھائے　　ہم تو دیوانے کہلائے
مرا لہو ان کے کام آئے　　کس کی دولت کون لٹائے

جب تک وہ کاؤنٹر پر نہاری کے پلیٹ کے انتظار میں کھڑا رہا، سر ہلاتے ہوئے اور بدن کو جنبش دیتا ہوا اشعار پڑھتا رہا اور حبیب اللہ صاحب میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹیبل پر اپنی انگلیوں سے تال دیتے رہے اور مسکراتے رہے۔ یہ انقلاب ۲۰-۲۵ سال تک ہر گوشے میں، ہر میدان میں، ہر چمن میں، ہر ویرانے میں، ہر شہر میں، ہر ملک میں رہا۔

پھر وہ نسل مرتی رہی اور اب ان کی موجودہ نسل اُردو شاعری سے ایسی بیزار ہوئی کہ مشاعروں میں آنے والے سامعین بھی، میں غزل پڑھتا ہوں تو گویا تعجب سے میرے منہ کی طرف دیکھتے ہیں کہ یہ شخص کیا پڑھ رہا ہے۔ اب جب پڑھتا ہوں:

سب کا دُکھڑا سب کے دل کا درد بن جائیں گے ہم
لوگ سر دھننے لگیں گے جب غزل گائیں گے ہم
اپنی تاثیرِ سخن ہر دل میں رکھ جائیں گے ہم
شکل آنکھوں میں پھرے گی جن کو یاد آئیں گے ہم

تو کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کی آنکھیں بھی کھلی رہتی ہیں اور زبان بھی کھلی رہتی ہے، اور زیادہ ایسے ہوتے ہیں جن کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں لیکن زبان بند رہتی ہے۔ اِدھر اُدھر کچھ ایسے بھی مل جاتے ہیں جن کی زبان بھی بند ہوتی ہے اور آنکھیں بھی اور ان کا سر جھکا رہتا ہے، یعنی وہ تقریباً غنودگی میں رہتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ:

(۱) ان کی خاندانی روایت ادب وشعر کی کمزور ہوتی ہے۔
(۲) شعروادب کا مطالعہ سطحی اور محدود ہوتا ہے۔
(۳) ادب وشعر سے ان کا تعلق کمزور ہوتا ہے یا بالکل نہیں ہوتا ہے۔

اب ایسے سامعین کی اکثریت ہوتی ہے۔ فیصد شرح بہت مشکل ہے۔ کہیں تو ایسا امکان

نظر آتا ہے کہ اہلِ مطالعہ صفر فیصد ہوتے ہیں۔اس موضوع کو پھر انشاءاللہ اختیار کروں گا۔اب پھر میں اپنے ماضی کی طرف لوٹتا ہوں جو میری شاعری میں دل کی حیثیت رکھتا ہے۔ میری نظم ونثر میں خون کی روانی، میرے ماضی سے ہی آتی ہے وہ کتنی بھی بعید ہو۔ میرا ماضی کچھ دیدہ، کچھ شنیدہ،تقریباً سوسال پر پھیلا ہوا ہے۔ کچھ میں نے دیکھا ہے اور بہت مختصر میرا ماضی ایسا ہے جو میں نے اپنے بزرگوں سے سنا۔ میرا سرمایہ یہی ہے۔ مثلاً میں نے سنا کہ ہمارے علاقے میں بڑی بڑی بستیاں خالص ہندوؤں کی تھیں۔ وہاں وبائی امراض کا اکثر حملہ ہوتا تو وہاں کے باشندے بستی چھوڑ کر دوسری بستیوں کے غیر مسلم علاقوں میں جاتے تو بستی کے غیر مسلم پوچھتے کہ تمھاری بستی میں کچھ مسلمان میاں جی رہتے ہیں؟ وہ کہتے کہ نہیں تو وہ ہدایت دیتے کہ جاؤ اپنی بستی میں مسلمانوں کو بساؤ اور ان کی مدد کرو۔ میں نے قدر کرتے بہت دیکھا مگر یہ نہیں سمجھا کہ اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ مسلمان اللہ کے پیارے بندے ہیں۔اللہ ان کی سنتا ہے اور جو یہ کہتے ہیں ان کا اللہ اس کو پورا کرتا ہے۔میں نے بے ساختہ بعض موقعوں پر یہ سنا۔ مثلاً ۱۹۶۳ء کے سخت سرد موسم میں ایک بس کے ذریعے ہم دس آدمی دہلی سے سہارن پور سفر کر رہے تھے۔ ہم سب داڑھی والے تھے اور شریفوں کے لباس میں تھے۔بس پر تقریباً ساٹھ مسافر تھے جن میں پچاس غیر مسلم تھے۔ان میں کچھ تعلیم یافتہ اور کچھ دیہاتی اَن پڑھ۔

چبھنے والی سردی تھی اور تیز ہوا چل رہی تھی،بس کی تمام شیشہ دار کھڑکیاں بند تھیں۔بس تیز رفتار سے جا رہی تھی۔سڑک کی دونوں جانب گڈھے تھے۔ کہیں پانی،کہیں خشک۔ یک بیک بس داہنی طرف کروٹ کے بل گری اور کئی کروٹ لیتی ہوئی پانی کے گڈھے میں یوں گری کہ اس کی چھت پانی میں تھی اور چکے والا حصّہ اوپر تھا۔ میں تو کچھ پڑھ رہا تھا اور لوگ بھی کچھ دعائیں کر رہے ہوں گے۔کئی بار پلٹا کھانے کے دوران کسی کھڑکی کا شیشہ نہیں ٹوٹا۔ڈرائیور کے قریب بڑی کھڑکی کا شیشہ یوں ٹوٹا ہوا تھا جیسے کسی نے کسی اوزار سے تراش دیا ہو کہ کہیں پر شیشہ کا کوئی حصّہ باقی نہ تھا صرف اس کا فریم تھا۔ ہم سب لوگ اسی کھڑکی سے نکل کر اوپر سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ساٹھ آدمیوں میں کسی ایک کو کوئی خراش بھی نہیں آئی۔ چند منٹ کے بعد جب سب کے ہوش وحواس درست ہوئے تو تمام غیر مسلم مسافر گویا ایک زبان ہو کر کہہ رہے تھے:

’’اللہ والے ہمارے ساتھ تھے کہ ہم لوگ بچ گئے۔‘‘

یہ باتیں کسی اور دنیا کی ہیں جواب اس دنیا میں نہیں سنی جاتی ہیں ماں کے پیٹ سے سب اچھے ہی پیدا ہوتے ہیں نشوونما میں جیسا ماحول ہوتا ہے اس سانچے میں ڈھلتے ہیں۔ میرے گاؤں کے سبزی فروش نپٹ جاہل تھے، لیکن انسان اچھے۔ صاف ستھرے رہتے تھے۔ دھودھو کر مارکین یا مٹیا کے کپڑے پہنتے تھے۔ ننگے سر نہیں رہتے تھے۔ میرے یہاں گاؤں کے صحن میں جلسہ اسلام پور پٹنہ کے شاعر آئے تو مشاعرے میں دو ایک سبزی فروش کنارے فرش پر بیٹھ گئے تو ایک جوان طبیعت والے شاعر نے غزل میں ان کی زلفوں کی خوشبو کی بات چھیڑ دی تو ایک بوڑھے سبزی فروش نے مُچھے سے اپنا منہ چھپالیا۔ پڑھنے والے کو نہیں ایک دیہاتی اَن پڑھ سبزی فروش کو حجاب آ گیا۔ یہ روایات اور ماحول سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ انسانوں کو بھی اور خدا کو بھی پیارے لگتے تھے۔

لکھنؤ میں ایک مشاعرے کے لیے آتشؔ کے شاگردوں نے غزلیں لکھیں۔ آتشؔ خوددار صوفی منش آدمی تھے۔ مشاعرے کے دن ان کے شاگرد آنے شروع ہوئے، غزلیں سنا کر اصلاح لینے لگے۔ نواب محمد خان اُٹھ کر اپنی غزل سنا گئے، اصلاح کرا گئے۔ 'یاد آیا، فرہاد آیا' قافیے ردیف کی غزل تھی۔ محمد خاں رِندؔ بیٹھے تھے کہ وزیر علی وزیرؔ آئے، اپنی غزل سنانے لگے۔ لکھنؤ کا چالو رنگ تھا۔ وزیر علی وزیرؔ، نواب محمد خاں رِندؔ آتشؔ کے مشہور شاگردوں میں تھے۔ زبان پر وہ قدرت تھی کہ مشاعرہ کا مشاعرہ مرعوب ہوجاتا تھا۔ دونوں جانے لگے تو آتشؔ نے کہا ٹھہرو، میرؔ آتا ہوگا۔ ان کی غزل بھی سن لو۔ اتنے میں میر وزیر علی صباؔ آ گئے۔ شرماتے شرماتے استاد کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ آتشؔ نے پوچھا غزل مکمل کرلی؟ بولے جی ہاں۔ کہنا سناؤ۔ صباؔ مؤدب بیٹھ گئے اور غزل نکال کر پڑھنے لگے:

اے صباؔ جذب پہ جس دم دلِ ناشاد آیا
اپنی آغوش میں اُڑکر وہ پری زاد آیا
دل میں اِک درد اُٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

آتشؔ نے پہلے سے بیٹھے ہوئے دونوں شاگردوں کی طرف دیکھا پھر صباؔ کی پیٹھ پر دو تھپکیاں دیں اور بولے جاؤ مشاعرے میں آئیو۔

صؔبا اپنی غزل بے اصلاح لے گئے۔ شاعری مشق وریاض کی بھی ہوتی ہے۔ طبع زاد بھی ہوتی ہے، خداداد بھی ہوتی ہے، رونے والی بھی ہوتی ہے، ہنسنے والی بھی ہوتی ہے اور بے ساختہ دل سے اُچھلنے والی بھی ہوتی ہے۔ میں نے کہیں لکھا ہے کہ خدا بخش لائبریری میں ایک طرحی مشاعرہ میری ایک نظم کے ایک مصرع پر ہورہا تھا:

ہم کو ملا ہے سرتو کسے دردِ سر ملے

ہم سے پہلے کسی بزرگ شاعر نے پڑھا، اس کا ایک ہی مصرع مجھے یاد ہے:

میری دُعا یہ ہے تجھے پتلی کمر ملے

یہ تقریباً تیس پینتیس سال پہلے کی بات ہے۔ مجھے یاد ہے کہ لائبریری کے مشاعرے میں زیادہ تعداد کالج کے طلبا کی تھی تو ان کا مصرع سن کر نوجوان لونڈے بلا مبالغہ تین تین فٹ اُچھل رہے تھے۔ یعنی مجمع کے درمیان کہیں کھڑے ہوکر پنجے پر اُچھل اُچھل کر داد دے رہے تھے۔

میں نے جب غزل شروع کی:

میں یہ دعا کروں جو زباں میں اثر ملے
مری ہی طرح تجھ کو بھی دردِ جگر ملے

تو مطلع سن کر اِدھر اُدھر سے کچھ پرانے وضع دار لوگوں نے تعریف وتحسین کی۔ پرانی آوازیں آئیں، سامنے کے جوانوں کا مجمع جسے مشاعرے کے عام شعرا اہتمام سے بلواتے ہیں۔ اپنے دوستوں کو، عزیزوں کو شاگردوں کو کہ میں پڑھوں تو اُٹھ اُٹھ کر اور کود کود کر اور اچھل کر تالیاں بجا بجا کر داد دیجیو۔ یہ مرض چالیس سے پچاس برس سے عام ہوگیا ہے۔ ایسے گروہ کے گروہ کو شعرا اہتمام سے بلواتے ہیں۔ انھیں یہ بھی سکھاتے ہیں کہ میں جب پڑھنے کو آؤں تو اُٹھا اُٹھ کر فرمائش کیجیو۔ مصرع پڑھیو کہ یہ غزل سنایئے۔ ان شعراء کے پاس دس پانچ غزلیں رہتی ہیں جنھیں تمام مشاعروں میں فرمائش کرا کر پڑھتے ہیں۔ ان کا سرمایہ اتنا ہی ہے۔ ان کی پونجی اتنی ہی ہے۔ ان کے تخلیقی کارنامے کا دیوالیہ ہوچکا ہوتا ہے۔ اپنی چند غزلوں یا نظموں پر انھیں زندگی گزارنی ہے تو وہ سامعین میں لوگوں کو اِدھر اُدھر بیٹھا دیتے ہیں کہ میں آؤں تو یہ فرمائش کیجیو۔ جب پڑھ لوں تو کسی دوسرے سے کہا کہ تم اس نظم کی فرمائش کیجیو۔ یہ دُھندا پہلے شہر شہر تھا، اب ملکوں ملکوں ہے۔ تو سامنے کا مجمع بیشتر بے ذوق کا اور عموماً نافہم نوجوانوں کا ہوتا ہے۔ ایسے مجمع

کے سامنے جب میں نے غزل کا یہ مطلع پڑھا:

میں یہ دُعا کروں جو زباں میں اثر ملے
میری ہی طرح تم کو بھی دردِ جگر ملے

تو سامنے کا مجمع یوں خاموش رہا جیسے میں کسی دوسری زبان کا شعر پڑھ رہا ہوں یا یہ کہہ رہے ہوں کہ یہ شاعر تو بڑا بدمعاش ہے۔ یہ ہمارے جگر کے خراب ہونے کی دُعا کر رہا ہے۔ ہمارے جگر کے بیمار ہونے کی دعا کر رہا ہے۔ اسے مشاعرے سے نکالو:

برہم ہیں میرے طرزِ سخن سے کچھ اہلِ بزم
اور کہہ رہے ہیں اس کو نکلوانا چاہیے

پہلے شاعر نے کتنی اچھی دُعا کی ہے کہ میری دعا یہ ہے تجھے پتلی کمر ملے۔ پتلی کمر ملے گی تو خوب لچکا لچکا کر چلیں گے، لڑکیاں ہم پر عاشق ہوں گی۔

ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہر طرف ہندوستان میں چیخ ہے، پکار ہے۔ اُردو زبان ختم ہو رہی ہے۔ یہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ اسے دیش سے نکالنے کا منصوبہ بن رہا ہے۔ اس کی پڑھائی ختم کی جا رہی ہے۔ اسکولوں میں اُردو اساتذہ بحال نہیں ہو رہے ہیں۔ اُردو کا رشتہ روزی روٹی سے توڑا جا رہا ہے۔ یہ ملک بی جے پی کا ملک بننے والا ہے۔ یہ ملک اُردو دشمنوں کا ہے۔ یہ ملک ہندو راشٹر کی اسکیم چلانے والوں کا ملک ہے۔ یہ نعرہ، یہ تقریر، یہ تحریر عام ہے۔ کتابوں میں یہی لکھا جا رہا ہے۔ اخباروں میں نکل آیا ہے۔ یہی رونا گھروں میں ہے، بازاروں میں ہے، اسکولوں میں ہے، کالجوں میں ہے، یونیورسٹیوں میں ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اب اُردو نہ پڑھائی جاتی ہے نہ پڑھی جاتی ہے جو پڑھائی جاتی ہے وہ اُردو وہ نہیں ہے جو اُردوئے معلیٰ ہے۔

اس موضوع پر تفصیل سے لکھنا موجودہ سیاست کا موضوع ہو جائے گا۔ یہ تحریر ایک شاعری کی کتاب کا دیباچہ ہے۔ مختصر کہہ دوں کہ پاکستان بنے ہوئے بھی پینسٹھ سڑسٹھ سال ہو گئے۔ پینسٹھ سڑسٹھ سال پہلے بھی دیہاتوں میں، گاؤں میں، مکتب قائم تھے۔ راجپوت، برہمن، گوالے، کائستھ کے لڑکے مکتبوں میں اُردو پڑھتے تھے۔ ہم نے پاکستان بننے کے آٹھ سال بعد کالج میں پڑھنا شروع کیا۔ ہمارے وقت کے پڑھے ہوئے ہندو پروفیسر کا اب انتقال ہو چکا ہے۔ تیج بہادر سنگھ، رام بجھاون سنگھ، سورج نارائن سنگھ ہندی کے پروفیسر تھے مگر اُردو پڑھتے تھے۔ اُردو لکھتے تھے

اُردو بولتے تھے اور آج کل کے اُردو پروفیسر سے زیادہ اچھی بولتے تھے۔ آج کے استادوں سے بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ آج کے استادوں سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ اُردو کے لیے لڑتے تھے۔ اُردو کے لیے انگریزوں کے زمانے میں اتنے کالج نہیں تھے۔ اتنے اسکول نہیں تھے لیکن صحیح اور پُرلف اور مزیدار اُردو جاننے والے زیادہ تھے۔ میرے کالج کے ہندو ساتھیوں میں کئی وکیل ہوئے، کئی گورنمنٹ ملازمین ہوئے۔ وہ شستہ اور شائستہ اُردو بولنے اور لکھنے والے تھے۔ اُردو شاعری اور ادب کی آج کے استادوں سے زیادہ محبت رکھنے والے اور قدر کرنے والے تھے۔

یہ سب اس لیے نہیں تھا کہ انگریز اُردو فارسی عربی کے دوست تھے، وہ اُردو فارسی کے دشمن تھے۔ وہ مسلمانوں کی تمام خوبیوں کے دشمن تھے۔ ہندوستان میں آ کر فورٹ ولیم کالج اس لیے قائم ہوا کہ اُردو اور ہندی دو زبان قرار دی جائے۔ دونوں قوموں کی یکجہتی، اتحاد و اتفاق کو توڑا جائے۔ یہ داغ بیل انھیں کی ڈالی ہوئی تھی۔ وہ کبھی نہیں چاہتے تھے۔ علی گڑھ میں اُردو کالج قائم ہوا۔ وہ کالج سے اس تفریق کو بادِ نسیم سے ہَوا، اور ہوا سے طوفان پیدا کرنا چاہتے تھے اور اسی طوفان میں سب کو اُڑا دینا چاہتے تھے۔ اُردو سے یکساں پیار کرنے والے ہندو مسلمان دونوں ہی تھے۔ ہمارے زمانے تک یعنی ہمارے بچپن میں جتنے راجے مہاراجے رئیس زمیندار تھے، ٹکاری مہاراجہ، ہتھوا مہاراجہ اور دربھنگہ راجہ صاحب، سورج پورہ راجہ صاحب اور خدا جانے کتنے اہلِ دولت تھے۔ پٹنہ کا ایک ایک ہندو رئیس فارسی کا اسکالر تھا۔ پٹنہ کی گلیوں میں نکل جائیے۔ تقریباً ایک ایک گھر میں اُردو کا رواج تھا۔ جتنے وکیل، جتنے ڈاکٹر، جتنے بیرسٹر، جتنے جج کلکٹر تھے سب اُردو کے رسیا، میں نے جج کورٹ میں مسٹر نول کشور پرسا دایڈوکیٹ کو ایسی شستہ اور شائستہ اُردو میں بحث کرتے دیکھا کہ ہندو جج بھی بے حال ہو گیا۔ اس کا چہرہ مسرت سے تمتما گیا۔ تقریباً ہر خوش حال اور زمیندار گھروں میں چاہے ہندو ہوں، مسلمان ہوں کوئی نہ کوئی مولوی صاحب تھے۔ محلوں میں مکتب قائم تھے۔ یہ سب گھر، یہ سب مکاتب اپنی جیب سے پڑھنے والے لڑکوں کی خدمت کرتے تھے۔ عموماً مولوی صاحبان بھی بے اُجرت لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔

ہوا یہ کہ تقسیم ہند کے بعد دردمندوں، فکرمندوں، انسان دوستوں، خدا پرستوں، خدمت گزاروں، خیر خواہوں کا قافلہ کا قافلہ لٹ گیا۔ طوفان میں اُڑ گیا۔ سیلاب میں بہہ گیا اور ایسا لٹا، ایسا اُڑا کہ نام ونشان تک نہ رہا۔ معمولی کھاتے پیتے گھروں سے، زمیندار رئیسوں کے گھروں

تک وابستگان کا ایک جمگھٹا تھا۔ یہ پٹواری ہیں، یہ گماشتہ، یہ سرشتہ دار ہیں، یہ براہل ہیں، خدمتگار ہیں، دُکاندار ہیں، یہ ٹہلوا ہے، اب تو وہ درجات یاد بھی نہ رہے۔ ایک بھیڑ کی بھیڑ وابستگان کی تھی۔ یہ دائی ہے، یہ کھلائی ہے، یہ باورچن ہے، یہ دھوبن ہے، یہ جھاڑو بردارن ہے۔ گھر والے کو اپنی دولت کی خبر بھی نہیں۔ سب پٹواری جی، گماشتہ جی، براہل جی جانتے ہیں۔ جتنی ضرورت ہے گماشتہ جی نے پیش کر دیا اور کس کی کس کی خدمت ہو رہی ہے وابستگان کا گھر بھرا ہوا ہے۔ نوکر، مالک، غلام، آقا، دائی مائی سب ایک خاندان معلوم ہوتے ہیں۔ سب ایک سے ایک باذوق، آداب واصول سے واقف، بات چیت کے اصول کے ماہر، نشست و برخاست کے ہنر سے آگاہ، گھروں میں مولوی صاحب ہی نہیں ماں باپ بھی بچوں کی ایک ایک ادا پر نگاہ رکھنے والے۔ ذرا سی غلطی ہوئی فوراً گرفت ہوئی۔ آپ پر سن کر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا کہ گھر کی مالکن یعنی بیوی سے بھی کوئی تہذیبی غلطی ہوئی تو جرمانہ ہو گیا۔ یہ زیور ضبط کر لیا گیا۔ پھر وہ کسی بہانے سے دوسری شکل میں دے دیا جاتا۔ یہ اور بات ہے کہ آپ یہ سن کر بھی تعجب کے سمندروں میں ڈوب جائیں گے کہ اس زمانے کی طوائفیں بھی اس ضابطۂ حیات کی ماہر تھی۔ تہذیب اور اخلاق کی وہ استاد تھیں۔ شریفوں کے کمسن ہوشیار بچّے طوائفوں کے یہاں روزانہ اتنے اوقات کے لیے بھیج دیئے جاتے تھے۔ وہ بچّے طوائفوں کے یہاں آداب وتہذیب، نشست وبرخاست، اور آداب وگفتار کے ایسے نمونے بن کر آتے تھے کہ اب ان کے کوائف بیان کیے جائیں تو کوہِ قاف کی حکایتیں اور الف لیلیٰ کی داستانیں معلوم ہوں۔ یہ سب یک بیک چند برسوں میں لپیٹ کر، سپیٹ کر، گھسیٹ کر، سمیٹ کر سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ بگولوں میں اُڑا دیا گیا۔ اب جو نسل ہوگی اس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے کچھ نہیں، وہ خلا میں معلق نظر آئے گی۔ جو اخبار کہہ رہا ہے، جو ریڈیو بول رہا ہے، جو سینما دِکھا رہا ہے، پوسٹروں پر جو نظر آ رہا ہے، جو ہوٹلوں میں، بازاروں میں سامنے ہے وہی زندگی ہے۔ کیا شعر، کیا ادب، کیا زبان، کیا لہجہ، کیا اشارہ، کیا کنایہ، کیا رمز، کیا استعارہ۔ اب اسے کیا خبر عظیم آباد، دہلی، بلگرام، لکھنؤ اور دکن کی تہذیب۔ وہ کیا جانے کیا پہچانے الف لیلیٰ، داستانِ امیر حمزہ، طلسم ہوشربا، قصہ حاتم طائی، وہ کیا جانیں ملا رموزی، خواجہ حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، مولوی نظیر احمد، خواجہ شفیع، منشی ذکاءاللہ، میر امن، مرزا رجب علی بیگ، مرزا رسوا کو۔ نہ جانے، نہ پہچانے تو کیا گائے، کیا بجائے۔ یہی گائے کہ

اُردو کی پڑھائی نہیں ہوتی ہے۔نصاب کی کتابیں نہیں ملتی ہیں۔ تاریخ غلط پڑھائی جاتی ہے۔ پہلے جب پڑھائی نہیں جاتی تھی، دیہاتوں میں اسکول کی تعلیم نہیں تھی، کالج نہیں تھا تو اُردو گھر گھر مہکتی پھرتی تھی۔ چراغ لیے کونے کونے ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ جو ملتا تھا وہ اندھیرے سے اُجالے میں آجاتا تھا۔گوالے اور بنیا بھی شعر سن کر جھوم جاتے تھے۔اب وکیل صاحب، مسٹر صاحب بھی منہ پھاڑ دیتے ہیں کہ یہ کیا کہا جا رہا ہے۔پتے کی بات سن لیجیے۔اب گھر گھر ماما عظمت کا جھگڑا ہے کہ گھر سے بھی دلالی وصولی کرتی ہے اور بنیا سے بھی کمیشن لیتی ہے۔میاں جی اور دُلہن جی سب کا دل پیسے میں لگا ہے۔کوڑی کوڑی جمع کیا جا رہا ہے اور کوٹھا،صوفہ، گاڑی، ساڑی، شلوکہ، شلوار جمپر، سندور، ٹیکہ، پینٹ، ہیٹ، ٹائی اور سوٹ میں لگا جا رہا ہے۔اُردو میں کا ہے کو لگائے۔ اُردو کوٹھا صوفہ دے گی۔ ہیٹ پینٹ دے گی، مکھن ملائی دے گی۔ گاڑی موٹر دے گی،سوچ تو یہ رہے ہیں اور نعرہ یہ لگا رہے ہیں کہ اُردو پڑھائی نہیں جاتی ہے۔ پڑھائے کون؟ پڑھنے پڑھانے والے دونوں کا دل تو موٹر صوفہ میں لگا ہوا ہے۔ ملا واحدی صاحب سری کے قلم سے اپنے دل کا سارا خزانہ کاغذ پر بکھیرتے تھے اور اسی کمرے میں سوتے تھے جس میں جلاون رہتا تھا۔صبح اٹھ کر مسجد کی طرف جاتے تھے تو جلاون کے ریزے بدن پر بکھرے رہتے تھے۔ مولوی فضل الحسن حسرت موہانی دونوں ہاتھوں میں بالٹی لے کر تڑکے نل کے قریب کھڑے رہتے تھے۔ دونوں بالٹیوں میں پانی لے کر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر گھر لاتے تھے اور شعر کہتے تھے:

اسیرِ زُلف کرے یا شہیدِ ناز کرے	کرم ہے اس کا جسے چاہے سرفراز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد	جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
دِلوں کو فکرِ دوعالم سے کر دیا آزاد	خدا جنوں کا ترے سلسلہ دراز کرے

جیتے رہیے مولانا، اپنے کفن میں جیتے رہیے۔اپنی قبر میں جیتے رہیے۔ہمیں اپنے کوٹھے صوفے میں مرنے دیجیے۔فکر نہ کیجیے،سب کا اپنا اپنا الگ الگ مقام ہے۔آپ قبر میں بھی زندہ ہیں،ہم اپنے کوٹھے صوفے میں بھی مردہ ہیں۔آپ گھر سے ٹفن کے ڈبےّ میں روٹی، آلو کی بھُجیا لاتے تھے۔ پارلیمنٹ میں تقریر کیجیے اور لنچ کے وقت پارلیمنٹ کے میدان میں زمین پر بیٹھ کر روٹی بھُجیا کھائیے،بوتل سے پانی پیجیے۔ ہم موٹر سے پھر سے اُڑ کر گھر جائیں ٹیبل پر بیٹھیں، مرغ بریانی اُڑائیں، پارلیمنٹ میں تقریر کریں، مسلمان بہت غریب ہے، کھانے کو پیسہ نہیں

ہے، پڑھنے کو کتاب نہیں ہے، مسلمان پسماندہ ہے، اچھوت ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ مسلمانوں کا کوٹا مقرر کرے، اسے تعلیم دے، اسے روزگار دے:

سب کا جو دامن سیتے تھے اپنا ہی گریباں بھول گئے

ہمیں پیچھے کر کے آگے بڑھنے والے، ہمیں گونگا کر کے ہماری ترجمانی کرنے والے، ہمیں خاک نشیں کر کے شہسوار بننے والے، ہمیں بے دست و پا کر کے طاقتور بننے والے:

یہ دُشمنِ جنوں یہ پرستارِ عقل و ہوش پیرانِ میکدہ یہ امامانِ بادہ نوش

باطن سیاہ کار بظاہر سفید پوش گندم نما یہ دوست یہ احباب جَو فروش

یہ تاجرانِ لالہ و گل یہ تیغ در بغل

دیتے ہیں زخم کرتے ہیں فرمائشِ غزل

بات ذرا قطار سے ہٹ گئی۔ ذرا سا لائن سے الگ ہو گئے:

جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات گفتار کے اُسلوب پر قابو نہیں رہتا

....

تمھیں نے تو چھیڑا شرارت سے پہلے ہمیں شکوہ سنجی کی عادت نہیں تھی

....

ہم لوگ تو رونے رُلانے والے آدمی، کوئی چپ رہے تب بھی رو دیں، کوئی بولنے کو کہے تب بھی رو دیں۔ اپنے حال پر رو دیں، دوسرے کے حال پر رو دیں۔ یہ اوپر سے ہی آ رہا ہے۔ کوئی ہماری پیداوار نہیں ہے۔ میرے نانا مولوی ضمیر الدین کی صرف دو بیٹیاں اُمت الفاطمہ میری ماں اور دوسری ان سے چھوٹی قمر النسا میری تنہا خالہ۔ اسلام پور اسٹیٹ کے نظم کار، خدا جانے کیا نام تھا یا میں نام بھول رہا ہوں۔ ان سے تعلق کم رہا۔ وہ زیادہ تر اسٹیٹ کے انتظام میں گھر سے باہر رہتے تھے۔ میں بچپن میں گیا تو وہ کم ملے یا کبھی کبھی ملے۔ بہت مصروف رہتے، لوگ ان کا نام لیتے، مولوی محمد گھیسو۔ اسی زمانے میں تیلہاڑہ میں ہم لوگوں کو بنوٹ سکھانے کے لیے ایک بزرگ آئے تھے۔ وہ بزرگ آدمی ثابت ہوئے۔ ان کا حال تفصیل سے میری کتاب 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' میں تحریر ہے۔ تیلہاڑہ سے اسلام پور سات آٹھ میل پر تھا۔ ہم لوگ تیلہاڑہ سے تین میل یکہ پر اکنگر سرائے سے آتے۔ پھر وہاں سے مارٹن کمپنی کی ریل پر آدھے گھنٹے میں اسلام پور اسٹیشن آتے۔ پیدل راستہ تیلہاڑہ سے دوسرا تھا۔ لوگ دو تین یا ڈھائی گھنٹہ میں پہنچ

جاتے تھے۔ ہم لوگوں کا راستہ اکنگر سرائے ہوکر تھا۔لیکن دیہات کے لیے یہ مسافت تھی۔ سال میں دوبار میری خالہ اپنی بڑی بہن سے ملنے آتیں۔ یہ سفر ڈولی پر ہوتا جسے چار کہار کندھے پر اٹھا کر لاتے۔ دو یا ایک کہار فاضل ہوتا جو پیچھے پیچھے چلتا۔ کسی کو کندھا بدلنا ہوتا تو وہ یہ کام کرتا۔ میری خالہ جب آتیں تو ایک اہتمام ہوتا۔ آہ کیا منظر ہوتا۔ ہمارے بچپن میں گھروں میں عموماً تین کام ہوتے۔ رونا ہوتا، کوئی گیا تو رونا، کوئی آیا تو گانا۔ گھر میں کوئی کہانی چھڑ گئی تو پہلا کام رونا، دوسرا کام کہانیاں۔ یہ بچوں کو بھی سنائی جاتیں اور سیانوں کو بھی۔ تقریباً ہر رات کہانیوں کا کوئی نہ کوئی دَور چل جاتا۔ شام ہوتی تو مغرب کی نماز پڑھ کر کمرے کے اندر کوئی کہانی شروع ہوجاتی۔ کہانیاں کچھ گزری ہوئی شخصیتوں کی، کچھ پیغمبروں کی اور بچوں کی طوطا مینا قسم کی کہانیاں۔ دوسری قسم کہانیوں کی کتابیں ہوتیں۔ الف لیلیٰ کی کہانیاں، ان میں کچھ نہ کچھ رُلانے کی باتیں نکل جاتیں۔ ہنسی کی بھی کہانیاں ہوتیں۔ مگر بہت معتدل قسم کی ہنسی کی کہانیاں۔ لطیفے ہرگز نہیں ہوتے۔ وہ ہنسی بس بشاشت قسم کی، مسکراہٹ یا کم سنوں کی دَبی دَبی ہنسی۔ تیسرا کام گھروں میں گیتوں کا ہوتا۔ وہ گیت شادیوں میں ہوتے اور بچوں کے ختنوں میں بھی۔ عموماً بچوں کو دولہا بنایا جاتا، ریشمی یا رنگین پاجامے، شیروانی اور عمامے باندھے جاتے، اس میں اکثر گیت ہوتے۔ کبھی کبھی محرم کے عشرے میں بچوں کے ختنے بغیر گیت رنگ کے کردیئے جاتے۔ شادیوں میں گیت اہتمام سے ہوتے۔ کبھی کبھی میں نے دیکھا کہ مستورات گھر کے کپڑے سینے میں گیت گاتیں۔ یہ گویا کام کی مشقت کو بشاشت میں تبدیل کرنے اور کام کو سہل بنانے کو ہوتے یا دل بہلانے کو۔ گھر کا ماحول بہت سنجیدہ، سیدھا اور سادا ہوتا۔

ہاں تو رونے کی بات نکلی تو میری خالہ ڈولی یا میانہ سے اُتر کر گھر میں داخل ہوتیں تو ان کی لڑکیاں یا میری بہنیں گلے مل کر روتیں۔ اور اماں خالہ سے گلے مل کر دیر تک بیٹھی بیٹھی روتیں اور جانے کے وقت تک تو بالکل کہرام مچ جاتا۔ اس میں گھر بھر شامل ہوتا۔ بہن بھائی بھی اور بچے بچیاں بھی۔ ہاں جب بھائی جان مرحوم یا ان کے بعد میں کلکتہ سے گھر آتا تو گھر میں ہنسی کا ایک جھماکا آجاتا۔ آنگن سائبان میں دوڑ ہوجاتی۔ بہنوں کی کھی کھی کھی کھی خوب چلتی اور دھماکے بھی ہوتے۔ ہم بہنوں کی پیٹھ پر مکے لگاتے اور بہنیں بھی لپٹ لپٹ کر جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر مکے لگاتی۔ کبھی کبھی سعیدہ اور بنّی چیخ کر ہنستی ہوئی اماں سے مخاطب ہوتیں۔ دیکھئے اماں جان، بھیّا کو منع کیجیے

ورنہ ہم بھیّا کا شوربہ بنا کر پی جائیں گے۔ میں کہتا میں تم لوگوں کی چٹنی بنا کر چاٹ جاؤں گا۔ بس یہ منظر دس بیس منٹ کا ہوتا۔ پھر سب تھک تھکا کر بیٹھ جاتیں۔ لیکن رونے کا معاملہ تو زمین و آسمان کو نیچے اوپر کر دیتا ہے۔ میں نے محمودہ باجی کو شادی میں جو دیکھا وہ بالکل ایسی کہ بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

مہینوں دھوم دھام رہتی۔ آج وہ آ رہی ہیں تو کل وہ آ رہی ہیں۔ آج یہ ہو رہا ہے، تو کل یہ ہو رہا ہے۔ سردیوں کے زمانے میں مہینوں بھر کا ناشتہ بن رہا ہے، کلچے بن رہے ہیں، شکر پارے بن رہے ہیں۔ کھجوریں بن رہی ہیں، نمک پارے بن رہے ہیں، بن بنا کر بڑے بڑے گھڑوں میں رکھے جا رہے ہیں، پھر سلائیاں ہو رہی ہیں، پھر مانجھا ہے، رتجگا ہے، منڈوہ ہے، کندوری ہے۔

یہ مختلف رسمیں سال بھر کی خاموشیوں کو توڑنے کے لیے اور گھر کی سنجیدگیوں کا منظر بدلنے کے لیے غالباً ہوتے تھے۔ بس دھوم دھام، چلت پھرت، چہل پہل، یہ سلسلہ مہینوں چلتا۔ دیہا توں کی شادی دُور کے رشتے داروں، قرابت داروں کے اکٹھے ہونے کا بہانہ ہوتا۔ گھروں میں ہجوم ہوتا۔ کمروں میں بستر لگ جاتے، چوکیوں پر بھی مسہریوں پر بھی، چارپائیوں پر بھی، بڑی بوڑھیاں کھٹولے پر براجمان ہو جاتیں۔ اس پر دری، اس پر چادر، اس پر توشک، اور سوزنیوں کی بہار آ جاتیں۔ چار پانچ کمروں میں تیس چالیس عورتیں، بچے بچیاں۔ معلوم ہوتا ابھی دنیا بنی ہے، اور دنیا والے ابھی دنیا سے آشنا ہوئے ہیں۔ گیتوں کی ٹولیاں بن جاتیں۔ گھر کی بزرگ عورتوں میں جوان شامل ہو جاتیں۔ پھر جوان عورتوں کی ٹولیاں پھر کمسن لڑکوں کی ٹولیاں۔ کمسن بچیوں میں میں نے ڈھولک بھی دیکھا۔ کوئی تال سر میں نہیں بلکہ آہستہ آہستہ دونوں طرف تھاپ پڑ رہی ہے اور گیت چل رہا ہے۔ بارات آئی، نوشہ گھر میں بلایا گیا، آرسی مصحف کی رسم ہوئی، بری کا آنا، بری میں سہاگ پوڑا ایک زرّیں مینار کی شکل کا ہوتا ہے۔ اس میں دُلہن کے سنوارنے کی اشیا ہوتیں جو مجھے اب یاد نہیں ہیں۔ اور بوڑھی جوان ماماؤں کے سر پر سات یا نو یا گیارہ بڑے طشت ہوتے، جس میں دُلہن کے کپڑے، زرّیں غلاف سے ڈھکے ہوئے ہوتے۔ بری آ جاتی تو نوشہ کا خلعت جاتا۔ یہ بھی پانچ چھ طشت پر زرّیں غلاف سے ڈھکے ہوتے۔ نوشاہ کے کپڑے اور جوتے ہوتے۔ ان سب رسموں کے الگ الگ گیت ہوتے جو تخلیق کار کی مہارتِ فن کا نمونہ ہوتے۔ یہ ہو جاتا تو صبح بارات کا ناشتہ آ جاتا۔ اسی وقت سے گھر کا ماحول بدل جاتا۔ شادی کی

تمام چہل پہل پر اوس پڑ جاتی۔ جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر لوگ اُٹھے ہوں۔ گیت بند ہوجاتے، مراثنیں بھی ڈھولک چھوڑ کر الگ بیٹھ جاتیں۔ وہ مزدورنیاں تھیں، انھیں گانے بجانے کی معقول رقم ملتی۔ اس کے علاوہ کپڑے اور تحفے اور انعام واکرام بھی دیئے جاتے۔ لیکن وہ مزدوری کرنے والی میراثنیں بھی اس وقت شادی کے گھر کا رکن بن جاتیں۔ گویا ۷۵-۸۰ پہلے سال والے سب لوگ مزدور سے لے کر ساہوکار، مساکین سے لے کر شاہجہاں تک کے سینوں میں ایک ہی دل دھڑکتا تھا۔ خوشی ہوتی تو سب کو ہوتی، غم ہوتا تو سب کو ہوتا۔ شادی ہے تو پورے محلے ٹولے کی شادی ہے اور غم ہے تو پورے ہمسایوں کو بھی غم ہے۔ اب تو جنازے میں بھی لوگ جاتے ہیں تو ڈبےّ سے نکال کر پان کھاتے ہیں۔ دوڑ دوڑ کر جانے پہچانے لوگوں سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ ہنس ہنس کر مزاج پُرسی کرتے ہیں۔

رُخصتی کی صبح کو گھر کی ماما بجنیوں اور مراثنوں تک دُلہن کی رُخصتی کے اندوہ میں مبتلا ہوجاتیں۔ نہ کوئی ناشتہ کرتا نہ سر جھاڑتا، نہ بالوں کو درست کرتا۔ دس بجتے بجتے دروازے پر دُلہن کی رُخصتی کا ڈولا لگ جاتا۔ تمام عورتیں، بچے، دُلہن کے کمرے میں جمع ہوجاتیں۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں، ناک سے پانی جاری ہے، کوئی آنچل سے ناک صاف کرتا، کوئی رومال منہ سے لگاتا ہے۔ لیجیے دُلہن کو سواری میں پہنچانے کے لیے اُٹھایا گیا اور ایک کہرام گھر میں مچ گیا۔ سولہ سترہ سال کی پالی پوسی ہوئی بیٹی اب دوسرے گھر میں جارہی ہے۔ بیٹی اِدھر ڈولے پر بیٹھی، ڈولا اُٹھا، اور گھر والوں کے دل سے صبر کا پتھر اُٹھا۔ ماں، بہن، چچی، پھوپھی، خالہ پلنگ پر پڑ کر سسکنے لگیں اور کروٹیں لینے لگیں۔ میں یہ باتیں وہ کر رہا ہوں جو آنکھوں سے دیکھی ہوئی ہیں۔ ایک خاندان، ایک محلّہ، کبھی کبھی ایک ایک بستی ایک دھاگے میں گتھی ہوئی مالا ہوتی تھی۔ اب تو ایک گھر میں بھی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ میری چھوٹی بہن سعیدہ اس وقت ۸۴ سال کی ہے۔ میں ۹۰ سال کا ہوگیا ہوں۔ سعیدہ کی شادی ہوگئی تو بیاہ کر آسنسول چلی گئی جہاں اس کے میاں ریلوے آفیسر تھے تو میں ہر ماہ وہاں جایا کرتا۔ پھر وہ مشرقی پاکستان چلی گئی تو ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۰ء تک ہر سال کبھی کلکتہ کی راہ سے، کبھی کٹیہار کی راہ سے مشرقی پاکستان جاتا رہا۔ ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش بن گیا۔ آٹھ سال بعد ۱۹۷۸ء میں کراچی گیا تو ہم دونوں گلے لپٹ کر یوں روئے جیسے میری ماں اپنی بہن سے لپٹ کر ہر سال یا ہر چھ ماہ پر رویا کرتی تھی۔ آج ہم دونوں بوڑھے ہوگئے ہیں۔ میں

جھک کر زمین کو دیکھنے لگا ہوں، وہ آسمان پر نگاہ رکھنے لگی ہے۔ تو یہ رسم گلے لپٹ کر رونے کی آج بھی جاری ہے۔ دو سال پہلے تک ویسے روتے ہوئے لوگ جدا ہوئے۔ اب جاؤں گا تو وہی ہوگا جو دس سال سے ہو رہا ہے۔ میری بھانجیاں، بیٹی داماد والی بن گئی ہیں۔ ایک تو پوتے پوتی والی بن گئی ہیں۔ دو سو میل آسنسول ہر ماہ جاتا رہا۔ پھر پانچ سو میل پاروتی پور اور آٹھ سو میل ڈھاکہ جاتا رہا۔ پھر پندرہ سو میل کراچی اور راولپنڈی جاتا رہا۔ اب دس ہزار میل دُور واشنگٹن اور میری لینڈ ہر سال جاتا ہوں۔ سال ختم ہونے پر آتا ہے تو ٹیلی فون جو ہفتہ دس روز پر آتا تھا دو دو روز پر آتا ہے کہ دو ماہ نہیں چار ماہ کا ٹکٹ لے کر آیئے گا۔ اور اب بہن، بھانجی گلے مل کر ہنستی ہے اور رخصت ہونے پر گلے مل کر روتی ہے:

ہر کسے را بہر کار ساختند

یہ بات ایک ہزار سال پہلے سعدیؔ نے کہی تھی۔ لوگ پہلے ایسا نہیں کر رہے تھے اور اب بھی ایسا نہیں کرتے ہیں۔ لوگوں کو مختلف قسم کے کام اور کیفیات کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ہمیں ایک ہی کام اور ایک ہی کیفیت کے لیے پیدا کیا گیا ہے:

جس جگہ بیٹھنا، دُکھ درد ہی گانا ہم کو
اور آتا ہی نہیں کوئی فسانہ ہم کو

کیا یہ سلسلہ غلط ہے؟ آج سے زیادہ سے زیادہ سو سال پہلے تک تمام دنیا کے ادب وشاعری کا سرمایہ اُٹھا کر دیکھئے، آپ غالبؔ کی شاعری، اقبالؔ کی شاعری، ناسخؔ، آتشؔ، حسرتؔ، فانیؔ، جگرؔ، اصغرؔ، سیمابؔ، فراقؔ، ساغرؔ، سلامؔ، وحشتؔ، جمیلؔ مجھے نام کی مکمل فہرست پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہندی شاعری کی تاریخیں معلوم نہیں۔ مگر تلسی، رحیم، کبیر اور نئے دَور میں چکبستؔ، میلا رام وفاؔ، آنندؔ نارائن ملا، یا سردار جعفریؔ، کیفیؔ، مجروحؔ، مخدومؔ محی الدین، یا انگریزی شاعری کی تاریخ دیکھ لیجیے، فارسی شاعری کی صدیاں دیکھ لیجیے، کیا یہ سب کس حد تک اس چھاؤں تلے نہیں بستے، پلتے، پنپتے ہیں؟ مہاراجہ دربھنگہ، مہاراجہ ٹکاری، ہتھوا یا کنور سنگھ، اَمر سنگھ، ۱۸۵۷ء کے باغی زمیندار، فارسی، ہندی، انگریزی، اُردو شعر وادب کے پروردہ، شیر خوردہ، آراستہ، پیراستہ نہیں معلوم ہوتے؟ کیا نذیر احمد، ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد، شبلی، حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ سب کے سب اسی آغوش کے پرورش یافتہ نہیں معلوم ہوتے؟ جوناتھن سویفٹ کتنے ہوئے،

اکبؔرالٰہ آبادی کتنے ہوئے، ظریفؔ لکھنوی کتنے ہوئے اور جب ظریفؔ تھے، اکبرالٰہ آبادی تھے، واقفؔ مرادآبادی تھے تو کیا ان کی ظرافت ادب پر چھائی ہوئی تھی۔ کن کی بات زیادہ چلتی تھی یا خواص وعوام کی زندگی میں کن کی پرچھائیاں زیادہ تھیں؟ زمانہ میں اکبؔر پرست کتنے تھے۔ ظریفؔ پرست کتنے تھے، میؔر پرست، اقبالؔ پرست، غالبؔ پرست، جگرؔ پرست، مجروحؔ پرست ان میں کم تھے یا زیادہ تھے؟ مثال میؔر کی، غالبؔ کی، اقبالؔ کی، آتشؔ کی، جگرؔ کی، اکبؔر کی، فانیؔ کی، سیمابؔ کی، حسرتؔ کی، اب بھی کس کی دی جاتی ہے۔ اب بھی زندگی ان سے وابستہ ہے یا نہیں؟

ہم کو تو اس پوری زندگی میں پٹنہ ہی میں سہی محمود علی خان صباؔ، زارؔ عظیم آبادی، جمیلؔ مظہری وغیرہ جیسا پاگل اور کوئی نہ ملا۔ یہ جو اندر تھے وہی باہر تھے۔ جو کہتے تھے وہ کرتے تھے، وہی لکھتے تھے۔ ان کا چہرہ پڑھ لو تو دل کا حال بھی کچھ نہ کچھ پتہ چل جاتا ہے۔ رمزؔ کو دیکھا ہوگا۔ اس کلیم عاجزؔ کو دیکھا ہوگا، بولو اور کسی کو دیکھا جو باہر سے جیسا ہے اندر سے بھی ویسا ہی ہو۔ دلی کلاتھ مل کے ایک مشاعرے میں ایک ہندو نوجوان غیر معروف شاعر نے یہ شعر پڑھ دیا:

کہنے کو یوں تو ترکِ محبت کی بات ہے
ناصح مرے لیے تو قیامت کی بات ہے

ایک بڑا مجمع واہ واہ! سبحان اللہ! کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ ایں! ترکِ محبت ایسی بات ہے؟ کسی سے رشتہ توڑنا ایسا ہے جیسے قیامت آجائے، اب یہ شعر کسی مشاعرے میں پڑھو تو؟

تقسیم ہند کے پچیس سال ہو گئے تھے۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر غزل پڑھ دی:

منہ شرم سے غربت میں دِکھائے نہ بنے ہے
پوچھے ہے کوئی گھر تو بتائے نہ بنے ہے
تم دوست ہو کیسے کہ دِکھاؤ ہو دلِ دوست
دُشمن کا بھی دل ہم سے دِکھائے نہ بنے ہے
ایک تم ہو کہ جو چاہو ہو وہ کر کے رہو ہو
ایک ہم ہیں کہ کچھ ہم سے بنائے نہ بنے ہے

تو غزل پڑھنے والا پڑھتا چلا گیا لیکن لوگ دیر تک سر دھنتے رہے۔

کراچی کے ایک میدان میں جس میں دس ہزار شیروانی پوش، دستار بند اور کلاہ دار سامعین

بیٹھے ہوئے تھے، کسی نے یہ غزل پڑھ دی:

کیا غم ہے اگر شکوۂ غم عامِ ہے پیارے
تو دل کو دِکھا تیرا یہی کام ہے پیارے

جب پیار کیا، چین سے، کیا کام ہے پیارے
اس میں تو تڑپنے میں ہی آرام ہے پیارے

تیرے ہی تبسم کا سحر نام ہے پیارے
تو کھول دے گیسو تو بھری شام ہے پیارے

ہر شعر پر کچھ مجمع واہ واہ کہتا ہوا کھڑا ہو جاتا اور جب اس نے یہ شعر پڑھا:

ہم ہیں جہاں سو درد ہیں، سو رنج ہیں، سو فکر
تو ہے جہاں آرام ہی آرام ہے پیارے

تو پورا مجمع کھڑا ہو گیا۔

اس کے گئے پہ ایسی گئی دِل سے ہم نشیں
معلوم بھی نہیں ہوا طاقت کو کیا ہوا

یہ ایک شعر ہے، لیکن اس میں ایک بات ہے۔ شعر تو دو سو سال پہلے کہا گیا تھا مگر جو بات اس میں کہی گئی ہے ایسا لگتا ہے وہ روز ہی ہو رہی ہے۔ ہر صبح وشام ہو رہی ہے:

ہر شام ہوئی صبح کو اِک خوابِ فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

یہ بھی ایک شعر ہے۔ اس میں صبح یا شام متعین نہیں ہے۔ یہ صبح سال دو سال چار سال دس سال بعد یا پچاس سال بعد بھی ہو سکتی ہے۔ میں تو ایسا سمجھتا ہوں کہ واقعی ہر شام صبح کو خواب فراموش ہو جاتی ہے۔ ابھی آپ ایک دوست سے ملے، کل ملاقات ہوئی تو وہ دوست کچھ اور لگا:

آنکھیں کدھر دل اور طرف ہے لگا ہوا

ایک دو جملے کے بعد چہک کر سلام کر کے یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گا کہ اچھا انشاء اللہ پھر ملاقات ہو گی۔ سرِ راہ ملاقات ہو گئی تھی اس لیے ٹھہر گیا۔ ورنہ آنکھیں بچا کر نکل جاتا۔ ”پھر انشاء اللہ

ملاقات ہوگی'' کا مطلب یہ ہے کہ اچھا ہے ملاقات نہیں ہو ورنہ ملنے والے یوں تھے کہ راستے میں مڈبھیڑ ہوگئی۔ میں بھی کسی خیال میں گردن جھکائے جارہا تھا۔ وہ بھی بینائی کمزور ہونے کی وجہ سے اِدھر اُدھر دیکھتے جارہے تھے۔راستے میں ٹکر ہوگئی۔ ارے کلیم صاحب؟ آہ کلیم صاحب، ہاتھ پکڑلیا اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔روز چاہتا ہوں آپ سے مل لوں۔ کچھ پوچھ لوں، کچھ کہہ لوں، اللہ آپ کو خوش رکھے۔آپ کی چاہت میں برکت دے۔ لیجیے کلیم صاحب یہ عطر کی شیشی تحفہ قبول فرمایئے۔آپ وہاں کے ہیں ''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی'' اس خوشبو کو کسی خوشبو سے کیا تعلق؟ جب سوچو تب خوشبو موجود۔ یہ خوشبو، تو جیب سے شیشی نکالو، انگلیوں میں لو، ہاتھ میں ملو تو کچھ مہک لگے۔ آپ کلیمؔ صاحب تو اسی خوشبو کے ہیں کہ ذرا خیال آیا، بس خوشبو میں نہا گئے، مست ہو گئے۔کلیمؔ صاحب ہم بھی اس خوشبو کی چاہت میں صبح و شام دیوانے پھرتے ہیں لیکن اب وہ کہاں ملے:

تھی کسی شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

آپ کو کلیم صاحب وہ شخص بھی میسر تھا اور اس کا تصور بھی آپ کے ساتھ تھا۔میرے پاس کلیم صاحب، نہ وہ شخص، نہ اس شخص کا تصور ہے۔آپ کو دیکھ کے وہ شخص بھی مل جاتا ہے اور اس کا تصوّر بھی آجاتا ہے۔

وہ شخص بولے جارہا ہے، آنکھیں ڈبڈبائی ڈبڈبائی جیسے اب رو پڑے، مگر دل اتنا مصروف ہے کہ آنکھوں کو رونے کا موقع ہی نہیں مل رہا ہے۔ میں چاہ رہا ہوں کہ یہ شخص مجھے بھی یہ باتیں یاد نہ دلائے۔اپنی راہ لگے مگر وہ اپنی راہ کہاں سے لائے۔اسی راہ کی تلاش میں تو وہ آدھی اندھی آنکھیں لیے اِدھر اُدھر کچھ تلاش میں مارامارا پھرتا ہے۔ہم سے عمر میں کچھ چھوٹا، مگر دل ہم سے بھی بڑا۔ میں شاید کسی ایسے شخص سے ملتا جیسا وہ مجھے سمجھ رہا تھا تو میں بھی اتنا صاف دل تھا۔اس کے آگے دل کھول کر رکھ دیتا۔ میں اس شخص کو جان رہا تھا۔زمانے سے جانتا تھا۔ ہزاروں، لاکھوں میں وہ رہ گیا تھا جو پرانی صدیوں کو چند لمحوں میں سمیٹ لیتا تھا اور چند جملوں میں پھر ان کو بکھرا دیتا تھا۔ پہلے قدم قدم پر ایسے لوگ مل جاتے تھے جو خود بھی خوشبو والے تھے، اپنے ہم جنسوں میں مل جاتے تھے تو پرواز کرنے لگتے تھے۔ وہ شخص بھی ایسا ہی اکیلا تھا جیسا میں تھا۔فرق یہ تھا کہ میں لبالب تھا اور اس کا پیالہ خالی تھا۔اس کا پیالہ خالی ہی رہنے والا تھا۔اس پر گزری نہیں تھی۔

میری جوانی میں تیاہاڑہ میں ایسے لوگ تھے جن پر گزری نہیں تھی اور گزرنے سے پہلے وہ رخصت ہو چکے تھے لیکن ایسے تھے جیسے صدیاں گزار کر آ چکے تھے۔ اور سب مدوجزر، اُتار چڑھاؤ سے گزر کر آئے تھے۔ عشق نہیں کیا تھا لیکن عشق کی چاشنی اور درد کا ذائقہ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ کوئی ذراسی درد والی بات کسی کی زبانی سنتے تو ان کا دَم گھٹنے لگتا تھا۔ ایسے ایک آدمی میری بستی میں تھے اور فساد کے پانچ چھ سال پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے۔ صدیوں میں بھی اب جیسے لوگ پیدا نہیں ہوں گے۔ یہ میاں صاحب جہاں مجھے دیکھتے مجھ سے لپٹ جاتے اور ایسا لگتا کہ وہ مجھے اپنے دل میں بیٹھا لینا چاہتے ہیں۔ آنکھوں میں سمو لینا چاہتے ہیں۔ ہر جگہ لیے لیے پھرنا چاہتے ہیں۔ جب کوئی نہ ہو تو دل سے نکال کر اپنے سامنے بیٹھا کر پیار کی بات کر کے اپنا دل ٹھنڈا کرنا چاہتے ہوں۔ میں گھبرا جاتا، کچھ اس وجہ سے کہ میرے سامنے بھی دفتر کے دفتر کھل جاتے اور میں ان کے مطالعہ میں محو ہو جاتا۔ پھر میں دیوانگی کی سرحدوں پر پہنچ جاتا اور کسی وجہ سے میں اس دردمند فرشتے کو کچھ نہیں کہہ پاتا۔ اس کی بے قرار آنکھیں مجھے دیکھتی رہتیں، اس کے ہونٹ سُرخ ہو جاتے۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا اور ایسی طاقت سے لے لیتا جیسے میں ہاتھ چھڑا کر بھاگ نہ جاؤں اور میں واقعی ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہتا تھا مگر اس کی آنکھوں کا جادو مجھے ایسا کرنے نہیں دیتا تھا۔ گذشتہ صدی کی آخر کا یہ آدمی خدا جانے کب پیدا ہوا تھا، کہاں کہاں سے اس نے اپنے دل کا یہ افسوں جمع کیا تھا اور یہ تمام خزانہ پٹنہ کے کنگال شہر میں لیے پھرتا تھا اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔ پٹنہ میں اشوک راج پتھ پر ایک نوشیرواں سونے اور جواہرات کی تھیلیاں اپنے ہونٹوں پر سجائے ہوئے گزر رہا ہے کہ دائیں گندگیاں، بائیں گندگیاں۔ یہ خزانہ ان گندگیوں میں نہ گر جائے، میں سامنے آجاتا تو جیسے وہ حفاظت میں آجاتا اور اپنے تھیلیوں کا منہ کھول دیتا اور بکھیرتا رہتا، جیسے سوچ رہا ہو کہ بچا کر کہاں لے جائے۔ پھر وہ شخص غائب ہو گیا۔ میری نظروں سے نہیں دنیا ہی کی نظروں سے اور ستاروں سے آنکھ مچولیاں کرتا رہا ہے۔ اب میرا دل بھی سنّاٹا سنّاٹا بغل میں 'بابا گلاس کمپنی' کا بڑا سا شوروم ہے۔ اس شوروم سے نکل کر ایک شخص سانولا رنگ، قمیص اور پینٹ پہنے ہوئے سامنے پان والے کے ٹھیلے پر پان کھانے آتا ہے ماتھے پر ٹیکہ لگائے اور جنیو کان سے لپیٹے۔ میں اگر اپنے کھلے کمرے میں بیٹھا نظر آتا تو دُور ہی سے جھک کر سلام کرتا اور پان کی گلوری منہ میں ڈال کر مسکراتا۔ مجھے دیکھتا، چلا جاتا۔

کبھی کبھی میں نظر آجاتا تو وہ مجھے دیکھتا اور سلام کر کے چلا جاتا۔ کئی سال گزر گئے۔ ابھی تین چار سال ہوئے۔ اس نے پان کھاتے کھاتے میرے کمرے میں قدم رکھ دیا۔ بغل میں بنچ پر بیٹھ گیا، مسکراتے ہوئے بولا۔ کلیم صاحب آپ اشوک راج پتھ کی آبرو ہیں۔ اَبے یہ کیا بول گیا؟ نہ جان پہچان، دُور کا صورت آشنا۔ پان کھاتے کھاتے دیکھا، مسکرایا اور کیا کیا سمجھ لیا۔ میں نے کہا، بھائی! آپ کو بابا گلاس کمپنی کے شوروم سے نکلتا دیکھتا ہوں، اور تو میں کچھ نہیں جانتا آپ کے متعلق اور آپ میرے متعلق یہی جانتے ہیں کہ آپ کی بغل میں ایک دُکان نما کمرے میں سڑک کے کنارے رہتا ہوں۔ میں آپ کا نام بھی نہیں جانتا۔ بولا کلیم صاحب میں اسی بابا گلاس کمپنی کے مالک کا پوتا ہوں۔ میرے باپ آپ کو جانتے تھے۔ میرے دادا آپ کو جانتے تھے، لیکن میرے باپ دادا آپ سے ملے نہیں مگر آپ کی بات ہمارے گھر میں ہمیشہ چلتی تھی۔ آپ جب کرائے کے مکان میں بغل والی گلی میں رہتے تھے تو میرے مکان کی کھڑکیاں آپ کے مکان کی کھڑکی کے بالکل سامنے تھیں۔ میری دادی اور میری ماں اس کھڑکی سے آپ کی بیگم سے بات کیا کرتی تھیں۔ آپ پر جو گزری وہ میری دادی اور میری ماں جانتی تھیں۔ میری دادی بھی مر گئیں اور ماں بھی مر گئی۔ دادا، باوا دونوں مر گئے۔ آپ کی بات بچپن سے میری کان میں پڑتی رہی۔ آپ کی محبت میرے دل میں ہے۔ کلیم صاحب! آپ نے ایک عمر اس اشوک راج پتھ پر گزاری ہے۔ آپ اپنے دُکھ کے ساتھ ساٹھ برس سے اس راج پتھ پر گزر کر رہے ہیں۔ کلیم صاحب! آپ اشوک راج پتھ کی آبرو ہیں۔ آپ کو یہ سڑک یاد کرے گی۔ اس کی ہوائیں اس کی روشنیاں یاد کریں گی۔ آپ جس آن بان سے اس مکان میں خاموشی کے ساتھ گزار رہے ہیں، وہ میرے دل میں زندہ ہے۔ میں اپنے باپ دادا کا جلوہ آپ میں دیکھتا ہوں۔ آپ کو دیکھ کر میں بلوان (طاقتور) ہو جاتا ہوں۔ میں حیران ہو گیا کہ یہ شخص کیا بول رہا ہے۔ یہ تیس پینتیس سال کا جوان پینسٹھ سال پہلے کی بات بول رہا ہے۔ جو بات اب بوڑھے بھی نہیں بولتے۔ یہ جوانی میں بول رہا ہے۔ اس نے ۱۹۴۶ء کا خون نہیں دیکھا۔ اس کے بدن میں وہی خون ہے جو اس کے باپ دادا اپنی رگوں میں لے گئے۔ جیسے میں نے اپنی شاعری کی حفاظت کی، یہ اپنے باپ دادا کی باتوں کو اپنے حافظے میں پالتا پوستا رہا۔ میں اٹھاسی سال کا ہوں۔ تیس سال کا ساٹھ سال پرانی بات اپنے باپ دادا سے سن کر اپنے سینے میں پالتا رہا، پوستا رہا اور پال پوس کر آج اسے

میرے سامنے رکھ دیا ہے۔ یہ تو دیوتا معلوم ہوتا ہے۔

میں جو بات لکھ گیا، کیا کسی کے خواب وخیال میں بھی یہ بات ہوگی کہ ایک نوجوان اپنے دادا باپ کی یاد کرائی ہوئی بات اس اکیسویں صدی میں فخر سے، محبت سے، عقیدت سے، احترام سے ایک بوڑھے مسلماں سے کہے گا؟ یہ باتیں اسے کیسے یاد رہ گئیں؟ میں اسی لیے کہتا ہوں کہ دنیا کا سلسلہ کہیں نہ کہیں کئی یا ایک دھاگے سے بندھا ہوا کسی کونے میں پڑا رہتا ہے جس پر نظر پڑتے ہی تاریخ کے گمشدہ اوراق اپنی اپنی کہانیاں لیے سامنے آجاتے ہیں۔ جو کتابوں میں بھی نہیں ملتیں وہ زندہ ہوکر سامنے آجاتی ہیں:

پہنچا دیا ساقی نے پایانِ حقیقت تک

پیمانہ بہ پیمانہ، میخانہ بہ میخانہ

اب اکثر پان کھانے کو آتے اس شخص سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ اگر میں نے اُسے دیکھ لیا تو فوراً بول اُٹھتا ہوں:

دیکھو وہ آگئے، منہ میں پان، اشوک راج پتھ کی شان

وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوجاتا ہے۔ نہیں حضور اب تو یہ پدوی کسی کو نہ ملے گی۔ آپ کی ہے، آپ کے ساتھ جائے گی۔ چار پانچ سال پہلے جب میں واشنگٹن میں تھا تو اپنی بھانجی ریحانہ کے ساتھ نیوجرسی جارہا تھا۔ میری لینڈ کے اسٹیشن پر پہنچا تو لمبے چوڑے پلیٹ فارم پر چند ہی مسافر ٹکٹ لینے والے تھے۔ میری بھانجی نے مجھے ایک بنچ پر بیٹھا دیا کہ میں ٹکٹ لینے جاتی ہوں۔ پانچ ہی منٹ کے بعد وہ واپس آئی اور بولی، ٹکٹ کاؤنٹر پر ایک امریکن لیڈی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس نے آپ کو دور بنچ پر بیٹھا دیکھ کر مجھ سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ میں نے کہا یہ میرے ماموں ہیں۔ ہندوستان سے آئے ہیں۔

وہ لیڈی بولی۔ ان سے ملنا چاہتی ہوں، کیا وہ مجھے اجازت دیں گے؟ میں اپنی روایتی زرد شیروانی، زرد ٹوپی، سفید پاجامے اور سیاہ جوتے میں تھا۔ میں نے کہا، بھئی میری طرف سے اجارت ہی اجازت ہے۔ ریحانہ گئی اور اس کے ساتھ ایک چالیس سالہ امریکن لیڈی میرے سامنے آکر کھڑی ہوگی۔ اس نے سلام کیا اور بولی آپ ہندوستان سے آئے ہیں؟ میں صوفی ازم پر کتابیں پڑھ رہی ہوں۔ یہ میرا بہت محبوب مطالعہ ہے اور مجھے اس میں بڑی شگفتگی ملتی ہے۔ میں

کتابیں انگریزی میں پڑھ رہی ہوں۔آپ سے انگریزی میں باتیں کررہی ہوں۔ میں تصوف کے تعلق سے آپ سے اطمینان کے ساتھ کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ میرا دل چاہ رہاہے کہ آپ سے باتیں کروں۔ مگر میں اس وقت سرکاری ڈیوٹی پر ہوں، میں آپ کو اپنا نمبر اور پتہ دیتی ہوں آپ سفر سے واپس آئیں تو مجھے فون کریں۔ میں آجاؤں گی اور دیر تک باتیں کروں گی۔ مجھے یہ لباس دیکھ کر احساس ہوا کہ مشرقی صوفی ازم کا اس لباس سے تعلق ہے جو مجھے بہت دلکش معلوم ہوتا ہے۔ میں دورانِ گفتگو آپ سے آپ کی اپنی زبان میں سننا چاہوں گی کہ صوفی ازم آپ کو کیسا لگتا ہے؟

وہ تقریباً تین چار منٹ تک کھڑے کھڑے بہت احترام سے باتیں کرتی رہی، اپنی ڈائری نکال کر اپنا نام، نمبر اور پتہ لکھا اور ورق پھاڑ کر مجھے دیا کہ آپ واپس آکر مجھے ملنے کا ضرور موقع دیجیے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مجھے اس سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور مزید خوشی اس وقت ہوگی جب اس سے بہ اطمینان ملاقات ہوگی۔ میں واپس آتے ہی آپ کو فون کروں گا۔ میں نے وہ پرزہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ وہ سلام کر کے رخصت ہوئی۔ میں دو روز نیوجرسی میں رہا، تیسرے روز واشنگٹن واپس آیا۔ آنے کے دوسرے دن میں نے شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پرزہ نکالنا چاہا۔ کئی بار تشویش سے ڈھونڈنے پر بھی وہ پرزہ نہیں ملا۔ بے احتیاطی میں رومال وغیرہ نکالنے کے دوران شاید ڈائری کا وہ چھوٹا ورق کہیں گر گیا۔ مجھے اپنی بدقسمتی پر افسوس کرنے کو چھوڑ گیا۔ خدا جانے کیا بات ہوتی، اس کا ذوق، اس کی طلب کس منزل پر اُسے پہنچاتا۔

میں جو اس قسم کی باتیں لکھ رہا ہوں، آپ کہہ رہے ہوں گے کہ ان باتوں کا اس شعری مجموعے کے دیباچہ سے کیا تعلق ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے میرا مجموعہ ہاتھ میں لیا ہے اور کچھ سمجھ کر ہی لیا ہے۔ تو آپ ایسا نہیں سوچ رہے ہوں گے۔ آپ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہیں۔ میں بیسویں صدی کے تیسری دہائی کا ہوں۔ آپ نے یہ سمجھ کر کتاب لی ہے کہ تقریباً ایک صدی پہلے کے ایک انسان سے اس کتاب کے ذریعہ مخاطب ہوں۔ میوزیم میں آپ جاتے ہیں تو اپنے عہد کی چیزوں سے دلچسپی بہت کم لیتے ہیں کہ یہ تو میوزیم کے باہر ہر طرف پڑی ہوتی ہے۔ میں اپنی نوجوانی میں ایک بزرگ کے ساتھ راجا رام نارائن موزوںؔ کے پوتے رائے جیلان سے ملنے گیا۔ میری شاعری پٹنہ سٹی کے حلقے میں گونج رہی تھی۔ میں نے ان کا نام سنا تو بہت اشتیاق سے ایک صاحب مجھے ان کے محل نما مکان میں لے گئے۔ اب یہ مجھے یاد نہیں ہے

کہ ان کا مکان کہاں تھا۔ یہ ساٹھ سال پہلے کی بات ہے۔ مکان کے دروازے میں ایک خوبصورت سن رسیدہ آدمی ملے۔ بادامی سلک کی دھوتی، بادامی سلک کا کرتا اور اسی کپڑے کی ٹوپی۔ مجھے اس شخص کو دیکھ کر یہ لگا کہ یہ اس صدی کا آدمی نہیں ہے۔ پھر اس سے باتیں ہوئیں جس میں حوصلہ، محبت، ہمّت افزائی، قدردانی اور بے لوث تعلق کی خوشبو سی ملی۔ یہ چیزیں اب بھی زبان پر، تحریر میں، گفتگو میں، بیان میں ملتی ہیں مگر اس کی خوشبو جسموں سے، باتوں سے، خیالوں سے، آوازوں سے دُور چلی گئی ہے۔ خیر تو وہ ملے، پھر پان لایا۔ عطر لایا، اِلائچیاں لائیں پھر باتیں ہوئیں۔ جیسے دُور بادلوں سے کوئی بول رہا ہے۔ اس کے بعد وہ شخص اُٹھا اور ہمیں لیے ہوئے ایک کمرے میں جس میں پرانی یادگاریں حسین الماریوں میں میں سجی رکھی تھیں۔ میں نے کیا دیکھا، کیا کیا دیکھا یہ تو یاد نہیں ہے مگر وہ شخص ہمیں لے کر ایک الماری کے پاس آیا جس میں کوئی چیز چمک رہی تھی۔ نزدیک آئے تو زرّیں نیام میں ایک تلوار رکھی تھی۔ اس شخص نے الماری کھولی۔ نیام کو ہاتھ لگایا، پھر ہاتھ کھینچ لیا۔ ہم لوگوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ یہ نواب سراج الدولہ لی تلوار ہے اور کہتے ہوئے اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ لگا جیسے آنکھیں بھی ڈبڈبا گئی ہیں۔ بس مجھے اتنا ہی کہنا ہے۔ رائے جیلان کے دادا پر دادا، راجہ رام نارائن موزوںؔ نواب سراج الدولہ کے دیوان تھے:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پر کیا گزری

یہ شعر کیا تھا راجہ رام نارائن موزوںؔ بھی روئے تھے اور ان کا پوتا یا پڑپوتا رائے جیلان بھی نواب سراج الدولہ کا نام لیتے ہی رو دیا یا روتے روتے رہ گیا۔ جیلان بھی سدھار گئے لیکن نواب سراج الدولہ کے ماتم گزار ہم بھی ہیں۔ کیون کہ سراج الدولہ کے پہلے سے ایک تاریخ بنی، وہ تاریخ ہم تک آئی تو آپ بھی تاریخ کے ایک ورق کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں۔ ہم بھی الماری میں رکھی ہوئی کوئی یادگار ہیں۔ سراج الدولہ نے تلوار کمرے سے باندھی تھی کہ کلکتہ سے سودخوروں اور بنیوں کو نکال کر ہی یہ تلوار نیام میں جائے گی لیکن تلوار باہر نکل نہ سکی اور غداروں نے تلوار والوں کا ہی خاتمہ کردیا۔ تو آپ نے یہ سمجھ کر میری کتاب ہاتھ میں لی ہے کہ یہ وہ جوہردار تلوار ہے جو اب میوزیم میں پڑی ہے۔ لوگ اس کی کاٹ جانتے ہیں، اس کا جوہر جانتے ہیں، اس کی سبک روی جانتے ہیں۔ نزاکت جانتے ہیں، اس کی چمک جانتے ہیں۔ آب وتاب

جانتے ہیں، اس کی تراش خراش جانتے ہیں۔ رائے جیلان تلوار کو ہاتھ لگاتے ہی رو پڑے۔ گرچہ تلوار کا جوہر نیام میں تھا۔ بے نیام نہیں تھا۔ میرا کلام بھی وہ تراش خراش رکھتا ہے، وہ آب و تاب رکھتا ہے، وہ نزاکت اور سبک روی جانتا ہے اور اس کی دھار اور کاٹ جانتا ہے جو نیام کھولتے ہی بے نقاب ہو جائے گی۔ یہ دو دھاری تلوار ریشمی کاٹ رکھتی ہے مگر آزماؤ گے کس پر؟

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

میں نے جو لکھا وہ دیباچہ سے تعلق نہ رکھتا ہو لیکن مجھ سے تو بہت گہرا اور بہت مضبوط استوار تعلق رکھتا ہے۔ کلام میری ہی ذات، حیات اور شخصیت کا پرتو ہے۔ جو مجھے سمجھیں گے وہی میرا کلام سمجھیں گے۔ اب تو کاغذ کے سکّے چلتے ہیں۔ اس سے پہلے رانگے کے سکّے چلتے تھے۔ اس سے پہلے سلوری سکّے چلتے تھے۔ میں نے بچپنے میں وِکٹوریہ کے خالص چاندی کے سکّے دیکھے جس پر ملکۂ وِکوریہ کی تصویر کھدی ہوئی تھی۔ پچاس سال پہلے میری ایک رشتہ کی نانی نے کہا، بیٹا میرے پاس تین چار سو وِکٹوریہ کے سکّے ہیں۔ ہم نے کہا، نانی، یہ تو سکّہ رائج الوقت نہیں ہے۔ اس کا رکھنا جائز نہیں ہے۔ بیٹا اس کو کہیں بکوا دو۔ میں نے کہا یہ بھی بہت خطرناک ہے۔ میرا ایک دوست کشن پرساد ہے، اس کی زیورات کی دُکان تھی، میں نے راز دارانہ اس سے کہا کہ میری نانی کے پاس کچھ روپئے وِکٹوریہ کے عہد کے ہیں۔ یہ سنتے ہی وہ بڑے بے ساختہ پن سے کان میں بول اُٹھا۔ کتنے سکّے ہیں؟ مجھے ایسا لگا کہ یہ بڑا خواہش مند معلوم ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا تم خریدو گے۔ جتنے سکّے ہیں سب خرید لوں گا۔ اس کے آگے یاد نہیں ہے کہ اس نے کس دام کو خریدے مگر بیسیوں گنا قیمت ایک سکّے کی ادا کی۔ لہٰذا اگر یہ کتاب بھی کلام خالص ہے تو ہر عہد میں اس کی طلب ہوگی۔ لوگ منہ مانگی قیمت میں خریدیں گے۔ 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کی اشاعت کے وقت اس کی قیمت ۱۰۰ روپے سن کر سب کے کان کھڑے ہو گئے کہ دس بیس روپے میں تو لوگ اچھی سے اچھی کتابیں خریدنے سے بھاگتے ہیں، ایک سو دس روپے میں کون لے گا؟ لیکن وقت آیا کہ عرب میں اس کے دو دو سو ریال ادا کر کے تحفہ لیا گیا۔ امریکہ میں عام طور سے پچاس ڈالر میں لائن لگا کر لوگ خریدنے لگے۔ ہاں یہ اس وقت تھا جب جب عالم عالم بجھے بجھے چراغ روشن تھے۔ ان چراغوں کی ہچکیوں نے جو قیمت ادا کی اب نئے چراغوں میں وہ ہمتِ ادا ئیگی

نہیں ہے۔ وہ اس روش سے واقف ہی نہیں ہے۔ اب لوگ سڑکوں پر مرکری لگاتے ہیں جس میں اندھیروں کا نام ہی نہیں رہتا۔ ہم اس وقت کی بات کرتے ہیں جب چھوٹے چھوٹے بانس میں کپڑا لپیٹ کر کیروسین تیل سے بھگو دیئے جاتے تھے اور ایک ایک جگہ دس دس بیس ایسی مشعلیں روشن ہو جاتی تھیں، لیکن وہ ان اُجالوں اور اندھیروں کا ملاپ تھا اور دونوں کے اشتراک سے طلسمات وجود میں آتا تھا اور دُور سے دیکھنے والے کو ایسا لگتا تھا کہ دور دیس میں کوہِ قاف میں ستاروں کی جھرمٹ میں پریاں رقص کر رہی ہیں۔ تیز روشنی میں آنکھیں اپنی چمک کھو دیتی ہیں:

مغرب میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

یہ روشنی نہیں ہے۔ اس روشنی میں انسان اپنی بصیرت اور بصارت دونوں کھو چکا ہے۔ آنکھوں سے بھی اندھا اور دل سے بھی اندھا۔ یہ شیشہ اور ہیرے میں فرق نہیں کر سکتا۔ حضرت سعید احمد اکبر آبادی سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ اور صدر شعبہ دینیات علی گڑھ یونیورسٹی، خدا جانے کتنی ہزار کتابیں اُردو، فارسی کی مطالعہ سے گزار چکے ہوں گے۔ وِگیان بھون دہلی میں 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کی رسمِ اِجرا میں موجود تھے، کتاب لی، علی گڑھ لے گئے۔ ایک ہفتہ کے بعد مجھے خط لکھا کہ زندگی میں یہ پہلی کتاب ہے جو میں نے الف سے ے تک پڑھی ہے۔ اور مولانا عبدالماجد ندوی ہمعصر مولانا ابوالحسن ندوی عشا کی نماز کے بعد کتاب لے کر بیٹھے تو رات بھر روتے رہے، منہ دھوتے رہے اور پڑھتے رہے اور صبح کو مجھ سے کہا اور بہت بے ساختہ اور بے ٹوک کہا کہ میاں کلیم اگر تلہاڑا میں تم بھی شہید ہو جاتے تو یہ کتاب کون لکھتا۔ اب جاؤ شہید ہو جاؤ، کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ کتاب میری شاعری کے آغاز کے ۲۷ سال بعد چھپی۔ اُردو شعر و ادب کے کیسے کیسے لعل و گہر بازار میں آئے۔ جگمگاہٹ دِکھا گئے۔ لیکن کتاب کے چھپنے سے ایک سال پہلے فراقؔ بخار اور نقاہت میں چادر اوڑھ کر لیٹے ہوئے تھے کہ علی عباس (آئی جی) نے آہستہ سے کہا۔ کلیم عاجزؔ کا مجموعہ چھپ رہا ہے۔ آپ کچھ کہیں گے؟ یہ سنتے ہی فراق نے چادر پھینک دی۔ اُٹھ کر بیٹھ گئے، ٹیبل سے اپنا لیٹر پیڈ دیتے ہوئے کہا، ہاں۔ لکھاؤں گا اور ابھی لکھاؤں گا۔ اور پھر ایسا لکھایا کہ لوگ سن سن کر حیرت سے دانتوں میں انگلیاں کاٹنے لگے۔ ایں ایسا فراق نے لکھ دیا؟ اور لکھتے لکھتے لکھوایا'' (ایسا کلام) اس سے پہلے مجھے کبھی اس موجودہ صدی میں دیکھنے یا سننے کو نہیں

ملا۔ میں کلیم عاجؔز صاحب کی شاعری پر کچھ بھی کہتے ہوئے اپنے آنسو مشکل سے روک پاتا ہوں۔‘‘
پھر ایں.... فراقؔ اور کلیمؔ اور آنسو؟ کہاں تھے یہ آنسو، فانیؔ، اصغر، جگر، فیضؔ اور فرازؔ کے سامنے؟

بلایا کوہ پر شیریں کو اے فرہاد کیا کہنا　　بڑے پتھر کو پانی کردیا اُستاد کیا کہنا

....

میرے سنگِ مزار پر فرہاد　　رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد

....

کلیمؔ نے دس سال کی عمر سے آنسو بہائے، کھیت کی مٹّی کے سامنے آنسو بہائے، گلیوں کی کیچڑ کے سامنے آنسو بہائے، دروازے کے پٹ سے لگ کر آنسو بہائے، ایک قدم آگے رکھ کر پھر گھوم کر لوگوں کو دیکھتے ہوئے آنسو بہائے، کچےّ راستوں پر، پگڈنڈیوں پر آنسو بہائے، چھوٹی چھوٹی ندیوں اور پل پر کھڑے ہو کر آنسو بہائے، لوگ دیکھتے تھے اور کہتے تھے کہ بیچارے کا دل نرم ہے۔ گھر کو چھوڑتے ہوئے، بستی کو چھوڑتے ہوئے، کلیمؔ کو آنسو آتے ہیں۔ بے چارہ بہت نرم دل ہے۔ بے چارہ بہت محبت کرتا ہے۔ میرے آنسو دیکھ کر ان کے دِلوں میں بے پناہ پیار کا جذبہ اُبھر آتا تھا۔ اتنا آنسو بہہ گیا تو جو سوچتا تھا کلیم ’وہ‘ ہو گیا اور دل اس کا بھٹی بن گیا، جس میں سب کچھ جل گیا۔ سب کچھ جلا کر اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی پیاری پوری کائنات کو اس کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا اور ساری کائنات آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے ڈھلنے لگی۔ تب پتھر سے پتھر دل بھی اس کے آنسوؤں سے پگھل گئے۔ جنھوں نے مجھے روتے ہوئے دیکھا وہ سب گزر گئے تو یہ معجزہ ہوا کہ کلیمؔ شعر کہنے لگا تو لوگ حیرت میں پڑ گئے کہ ایسی شاعری تو سُنی ہی نہیں تھی۔ تو کلیمؔ کی شاعری نے ان کے دِلوں کو اُکسایا یا ان کے دل میں بھی کچھ رکھا ہوا تھا۔ شعر نے اس کو کریدا:

بھولے بسرے ارمانوں کو چھیڑو ہو، اُکساؤ ہو
تم تو اورا ے ٹھنڈی آہو، دل میں آگ لگاؤ ہو

رکھی رکھائی بھولی بسری پونجی جو آنسوؤں کی میرے سننے والوں کے دِل میں تھی وہ بلبلا کر نکل آئی۔ وہ پونجی والے ختم ہو گئے۔ اب کسی کے پاس پونجی ہی نہیں، نکلے تو کیا نکلے۔ درد کی پونجی بازاروں سے نکل گئی، شاہراہوں سے نکل گئی، محلوں سے نکل گئی، کوٹھوں سے نکل گئی، کوٹ پتلون سے نکل گئی لیکن نکل کے کہاں جاتی۔ ہواؤں میں سو گئی، فضاؤں میں کھو گئی، ان فضاؤں کو ہواؤں کو، چھیڑے دے کر شاعری بیدار کرتی ہے تو کہیں کہیں دِلوں میں گھس جاتی ہے۔ آنکھیں کھل

جاتی ہیں تو بے ساختہ دل پر لوگ ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ ایسے لوگ دَبے چھپے کہیں کہیں ہیں۔ کہیں وہ انگڑائی نہیں لیتے ہیں کہ لوگ اُنھیں حقیر سمجھ لیں گے۔ بے وقوف سمجھ لیں گے۔ لیکن لوگ ہیں، میں نے کسی محفل میں یہ شعر پڑھا تھا:

غمِ محمل نشیں میں ڈوب کر محمل سے آئے ہیں
یہ آنسو آنکھ سے آئے نہیں ہیں دل سے آئے ہیں

تو بے ساختہ چند اہلِ محفل کی آنکھوں پر رومال آ گیا، کچھ کھنکھارتے ہوئے محفل سے اُٹھ گئے۔ کچھ باہر نکل کر ٹہلنے لگے۔ سونا رائیگاں نہیں جائے گا، وکٹوریہ کا روپیہ ٹھکرایا نہیں جائے گا۔ ایک کے بدلے دس پچاس دے کر لوگ لے ہی لیں گے۔ سب نہیں لیں گے:

یہ منصبِ بلند ملا جس کو مل گیا　　ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اور پھر:

اِک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق　　رکھی ہے آج لذتِ درد جگر کہاں

تلاش کرنے والوں کو ملے گی۔ یہ وہ جنس نہیں جو پیش پا افتادہ کسی کو مل جائے، بے ستوں توڑو تو شیریں نہر جاری ہوگی۔ خس و خاشاک پر ہتھوڑا اچلا دو گے تو خس و خاشاک ہی اُڑے گی، دودھ کی نہر کیسے جاری ہوگی:

طبیعت کو قابو میں لانا پڑے ہے　　اُٹھے ہے کہاں غم اُٹھانا پڑے ہے
کچھ آساں نہیں منصبِ سرخروئی　　کئی بار مقتل میں جانا پڑے ہے

مقام شہادت کا ہے۔ خون لگا کے شہیدوں میں نام کرنے کا نہیں ہے۔ سوٹ، ٹائی، کوٹ پینٹ پھینک کر لوگوں نے انگرکھا پہنا، شیروانی پہنی تو اُردو کا مزہ لوٹا بھی اور لٹایا بھی۔ اب شیروانی، ٹوپی، پاجامہ پھینک کر سوٹ بوٹ، ٹائی لگا کر اُردو کا دعویٰ کرو گے تو اُردو کہہ دے گی:

ایں ناز بہ خانۂ پدر باید کرد

پٹنہ کے گاندھی میدان کے قریب کچھ لڑکے کھیل رہے تھے۔ لکھنؤ کے ایک وضع دار بادامی جوتا اور بادامی ٹوپی پہن کر گزرے۔ لڑکوں میں سے ایک لڑکے نے زور سے پکار کر کہا۔ سنو یار! آج کل ایک نئے قسم کی دِیا سلائی نکلی ہے جس کے دونوں طرف مسالہ ہے۔ لکھنؤ والے سمجھ گئے۔ جلد جلد ادھر سے گزر گئے اور ایک سیاہ مخمل کی ٹوپی پہن کر پھر ادھر سے گزرے۔ اسی لڑکے

نے پھر زور سے پکار کر کہا۔ ارے بھائی ایک طرف کا مسالہ جل گیا ہے۔ وہی صاحب ایک صرّاف کے یہاں بالکل چمکدار تانبے کے نئے پیسے کمر سے باندھ کر نکلے۔ دو ایک بار گاندھی میدان کی طرف سے گزرے۔ کوئی کچھ نہیں بولا تو خود ہی بولنے لگے، یہ کیسا عظیم آباد، پٹنہ ہے۔ کتنی دیر سے اشرفیاں باندھے پھر رہا ہوں۔ کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ فوراً ایک لڑکا بول اٹھا۔ ''اَبے جا دیکھ کر چھوڑ دیا۔ تانبے کے پیسے لیے پھرتا ہے اور کہتا ہے اشرفیاں لیے پھرتا ہوں۔'' تانبے کے پیسے اشرفیاں نہ بن سکیں گی۔ تانبہ، تانبہ ہی رہے گا اور گنی، گنی۔ گنی لوگ لوٹ لیں گے۔ تانبہ کو کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا:

ادب شناس نہ ای تو ، زحلقہ بیروں شو
نصیب بے ادباں آتش است صہبا نیست

کھیل کود کی طرف کبھی رغبت نہیں رہی۔ وہ کھیل جو سنجیدہ لوگ کھیلا کرتے تھے، اسی میں کبڈّی اکثر میرے گھر کے بیرون صحن میں ہوتی۔ اطہر نانا، اعظم نانا، واعظ نانا تینوں بھائی۔ دمو ماموں اور نظام الدین ماموں دونوں بھائی۔ قاضی سراج الحق، قاضی ریاض الحق، قاضی عین الحق تینوں بھائی۔ بشیر حیدر اور ظہیر الدین۔ ان کے بدن کرتے اُترنے کے بعد تانبے کی طرح چمکتے اور کبڈّی میں جب ایک دوسرے کو پکڑتے تو بجلی کے کڑکنے کی آواز ہوتی۔ یہ کھیل میں اسی طرح سنجیدہ ہوتے جیسے عام زندگی میں ہوتے۔ تین تین بھائی ایک دوسرے کے فریق ہوتے۔ دو اِدھر، ایک اُدھر۔ مگر کھیل میں فریق ہی رہے، بھائی کبھی نہیں ہوئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے شامل ہوتا۔ میں اپنے ہم سنوں کے ساتھ بہت کم ہی کھیل میں شریک ہوتا۔ سیّد ہوں یا شیخ، سبزی فروش ہوں یا نعل بند طور اطوار سے یہ ایک معیار کے ہوتے۔ تعلیم ان میں امتیاز پیدا نہیں کرتی۔ خاندانی تربیت، چھوٹے بڑے تدریسی علم کا بدل بن جاتی۔ سبزی فروش یا نعل بند جو ہمارے گاؤں میں تھے اَن پڑھ تھے مگر تربیت گھروں میں ایسی تھی کہ بول چال، نشست و برخاست میں دوسروں کو تمیز نہیں ہوتی کہ ان میں شیخ زادے کون ہیں، کون سیّد زادے ہیں، کون سبزی فروش اور کون آتش باز اور کون خیاط اور کون نعل بند ہے۔

عبدالسبحان پارچہ دوز (درزی) عنایت حسین دیوار ساز اور میرے نانا مولوی ضمیر الدین ایک ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے اور حقہ پیتے تو تینوں بھائی معلوم ہوتے اور کبھی کبھی تہدو میاں مہتر

ٹوپی اور لمبے کرتے میں آ جاتے تو میرے نانا مرحوم فرماتے تہدو میاں تم حلال خور ہو۔ہم گندگیاں لگاتے ہیں تم گندگیاں صاف کرتے ہو۔تہدو میاں تم افضل ہو۔

میں گاؤں میں رہا، کلکتہ میں رہا اور کلکتہ میں جن جن سے قربت رہی وہ تھیٹر کے ایکٹر، شہر کے مشہور بدمعاش کہے جانے والے فرقے کے افراد اور کوٹھے پر بیٹھنے والیاں۔ یہ میری پڑوسن تھیں۔مچھوا بازار کے آگے کالج اسٹریٹ میں الفریڈ تھیٹر کے نقال یعنی بہروپئے۔اور مچھوا بازار میں رہائشی ولایتو بدمعاش، کالو بدمعاش، فجّے بدمعاش۔ میں اس کی تحقیق نہیں کرسکا کہ یہ بدمعاش کیوں کہے جاتے تھے۔صورت شکل کے بہت اچھے، لباس پوشاک میں بہت وضع دار، بات چیت میں خوش گفتار، رحم دل، انصاف پسند، غریبوں کے خدمت گار، منکسر المزاج اور سخی تھے۔ غالباً بدمعاش کی اصطلاح انگریزی حکومت نے وضع کی تھی۔ یہ انگریزوں کے دشمن اور ان کے اہل کاروں سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔ جرم اور ظلم کی قربان گاہ پر بہادرانہ خود کو نثار کردیتے تھے۔ کلکتے جیسی رنگا رنگ معصیت کی فضا میں میرا ان سے قریب ہوجانا میری زندگی کے محفوظ حصار میں قلعہ بند ہوجانے کا ذریعہ ہوتا۔گاؤں اور مضافات کی عام بلند کرداری نے مجھے ٹھونک بجا کر کلکتہ میں ڈالا اور کلکتہ کے ان بدنام حلقوں نے مجھے خوش نام، خوش خرام اور خوش انجام بنا دیا۔ ورنہ دو دن میں میرے کردار کے پرخچے اُڑ جاتے۔۷۵ سال کی تجربہ کار زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جو میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ بزرگوں کے جو واقعات میرے علم میں اس وقت آئے اور بعد میں آئے ان میں نے یہی اندازہ کیا کہ اللہ کچھ لوگوں سے کام لینا چاہتا ہے تو اس کی نشو ونما کے ایسے نظام سے ان کو گذار دیتا ہے کہ پوری زندگی پر کوئی انگلی نہیں رکھ سکتا۔کلکتہ میں بڑے بڑے بزرگی کے مراکز تھے۔خانقاہیں بھی تھیں۔قطب ابدال قسم کے لوگ تھے۔بڑے بڑے بزرگوں کے مزارات اور ان کے متوسلین کی پوری پوری آبادیاں کلکتہ میں تھیں اور ٹھگوں اور بدکرداروں کے بھی بڑے بڑے حلقے تھے۔ بزرگوں اور بڑے اللہ والوں سے میرا سابقہ نہ کرایا۔ مجھے اسی قسم کے بدنام روزگار انسانوں میں رکھا جو اوپر سے بدنام تھے۔انھیں اولیائے کرام کے اوصاف دے کر مجھے ان کے سپرد کردیا۔ مجھے ان کے درمیان یوں رکھا کہ جیسے کانٹوں میں گلاب رہتا ہے۔ وہ کانٹے گلاب کی خوشبو اور نور کی پوری حفاظت کرنے والے مل گئے۔ میں کلکتہ جیسے بدبودار شہر میں بدبو سے دور کا آشنا بھی نہ رہا۔ مجھے سمندر کی سطح پر رکھا کہ آسمان کی

صاف بارشیں مجھے غسل دیتی تھیں اور سطح سمندر تمام آلائشوں سے مجھے دھودھا کر اپنی موجوں کی آغوش میں لوریاں دے کر پال رہا تھا۔ میں وضع میں یکتا، صورت شکل میں یگانہ اور کردار میں مقبول۔ کردارسازی میں یہی میرے معاونین اور مشفقین تھے اور ذہن سازی میں کلکتہ کے ادب حلقوں کی پاک صاف اور صحت مند فضا تھی۔ علامہ وحشتؔ کلکتوی کا حلقہ۔ عباسؔ صاحب، آصفؔ بنارسی، واقفؔ بنارسی، پرویزؔ شاہدی کا نہایت مصفّٰی صحافتی حلقہ۔ محمودؔ طرزی، پروفیسر مسعودؔ صابری، ظفرؔ تبریزی، عنایتؔ دہلوی کا بنایا ہوا ماحول۔ آرزؔو لکھنوی کے شاگردوں کا حلقہ جرمؔ محمد آبادی، نوابؔ دہلوی، جوانؔ سندیلوی اور پیارو قوال۔ کالو قوال، نابینہ قوال کی صاف ستھری محفلیں اور میرے بہت سینئر دوست شاہجہاں بیگ، بی اے علیگ، سہسرام کے رئیس زادے، فن موسیقی کے ماہر اور بہت اچھے گلوکار، گیا کے نواب دولھا کے صاحبزادے جمن میاں اور گیا کے واحد ڈرامہ نویس اور واحد اداکار علامہ ظفیر الدین شمس گیاوی۔ کن کن کا نام لوں۔ مجھے تحقیقی مقالہ پیش نہیں کرنا ہے۔ اشفاق صاحب، کتب فروش اور غفار بھائی اخبار فروش۔ ان میں سے کسی کسی کا ذکر اپنی کتاب 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' میں کیا ہے۔ یہ سب فرشتے یا اللہ کے سپاہی، کلکتہ میں میری تربیت پر مامور کیے گئے تھے۔ یہ خدائی نظام تھا جنھیں میں نے بعد میں سمجھا۔ جن کی پرچھائیاں جاوداں بن کر میرے کلام نظم ونثر پر سایہ فگن ہیں۔ میں جہاں بھی رہا کچھ ایسا ہی نظام خاموشی سے میرے ساتھ رہا۔ میں نے اس کی چاپ نہیں سنی لیکن ہم صحبتی کے اثرات مجھ میں جذب ہوتے رہے۔ میرے دل کی کلی اندر اندر کھلتی رہی، شگفتہ ہوتی رہی، اس کی خوشبو رگوں میں گھومتی رہی، پھرتی رہی۔ مگر زبان سے ٹپکنے کا وقت نہیں آیا تھا اس لیے زبان بند تھی۔ مگر آنکھیں ہر طرف نگراں رہتی تھیں۔ کچھ دیکھتی رہتی تھیں۔ کچھ سیکھتی رہتی تھیں۔ ہمیں کچھ سکھایا پڑھایا جارہا تھا۔ بتایا جارہا تھا۔ سمجھایا جارہا تھا۔ میں نے 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' میں لکھا ہے کہ کبھی کبھی نیم بیداری کے عالم ایسا لگتا کہ میں کہیں چل رہا ہوں۔ میری بغل میں ایک عورت مجھ سے دس بیس اِنچ پیچھے یوں چلتی ہے کہ مجھے اس کی ساری کے رنگ کا احساس ہوتا ہے مگر اس کی شکل نظر نہیں آتی ہے۔ وہ عورت کچھ بولتی رہتی ہے، جیسے کوئی کسی کو ڈھارس دلا رہا ہو۔ بڑی نرمی اور شیرینی سے وہ مستقل کچھ بولتی رہتی مگر میں سن نہیں پاتا۔ میں نے ایک آدھ بار اپنے ساتھیوں سے اس کا تذکرہ کیا تو وہ کہنے لگے۔ تم پر کوئی عاشق ہوگی۔ خواب اور نیم بیداری میں

تمھارے پاس آجاتی ہے مگر مجھے ان کی یہ بات پسند نہیں آئی۔ مگر وہ عورت اکثر نیم بیداری میں ہم سفر رہتی، یوں ہی سمجھاتی، انگلیوں سے کچھ اشارہ کرتی رہتی۔ میں نے 'جہاں خوشبو ہی خوشبو' میں لکھا ہے کہ کیسے اچانک مجھ پر واضح ہو کہ وہ تو میری پیاری ماں تھیں۔ زرّیں بیل والی سفید ساڑی پہنے ہوئے جو والد کے انتقال کے بعد وہ اکثر پہنا کرتی تھیں۔ یہ حقیقت کیسے واضح ہوئی میں نے اس کتاب میں لکھا ہے۔ یہاں اسے دہرانا طوالت ہے۔ گویا دائیں بائیں، آگے پیچھے مجھے تیار کرنے کا ایسا اہتمام تھا:

عجب طرح کا ساقی نے بندوبست کیا
شراب بعد میں دی، پہلے سب کو مست کیا

اور پھر چند برسوں کے بعد امتحان کا پرچہ دے دیا کہ اب لکھو۔ اب تک کیا پڑھا لکھا ہے بتاؤ۔ نمبر لو۔ پاس کرو۔ اور کلیم عاجزؔ بن جاؤ۔

میری جتنی بھی کتابیں شائع ہوئی ہیں اس کا پیش لفظ میں نے خود لکھا۔ میں جانتا تھا کہ دوسرے لوگ جتنا واضح طریقہ سے مجھے دیکھ سکتے ہیں، میں خود اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے باوجود جب وقت آیا تو میں نے قلم اُٹھایا اور بے اختیاری میں لکھنا شروع کر دیا۔ مجھے اس وقت خیال ہی نہیں تھا کہ بڑے اچھے اچھے صاحبانِ نظر مجھے جانتے ہیں، پہچانتے ہیں، مانتے ہیں ان کا قلم بہت حال آشنا ہے، وقت آشنا ہے، راز آشنا ہے۔ وہ جو لکھ دیں گے وہ سند ہو جائے گی۔ یہ باتیں اس وقت میرے دماغ سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ جیسے شعر لکھتا ہوں تو چلتے پھرتے لکھ دیتا ہوں یا بیٹھے بیٹھے لکھ دیتا ہوں۔ نہ میرا کوئی ارادہ ہوتا ہے، نہ نیت ہوتی ہے، نہ باہر سے کوئی تحریک ہوتی ہے۔ تحریک تو ہوتی ہے لیکن لکھنے کے وقت نہیں ہوتی ہے۔ تحریک سو جاتی ہے اور وہ تحریک میں محسوس کرتا ہوں۔ میرا دل دُکھ جاتا ہے۔ دل چلتے چلتے ایک لمحہ کو ٹھہر جاتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اس وقت کر کچھ کر جاؤں، حالات سے لپٹ جاؤں، اسے زیر کر لوں، اسے کچھ کرنے سے روک دوں، لیکن یہ باتیں میرے اختیار سے باہر ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ تحریک کچھ دیر بعد یا کچھ دنوں بعد میرے دل کی بھٹّی میں داخل ہو جاتی ہے اور پھر کسی ارادے یا مقصد کے بغیر اس بھٹّی سے اُبل جاتی ہے اور میرے قلم سے شعر بن کر نکل جاتی ہے۔ لیکن نثر لکھنے کے وقت

میرے دل میں کچھ ایسی بات آتی ہے کہ شاید دوسرے یہ بات نہیں لکھ سکتے۔ اس لیے فوراً قلم میرے ہاتھ میں آ جاتا ہے اور میں لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ یہ صحیح ہے میں نے جب بھی اپنی کسی تخلیق کا تعارف یا مقدمہ لکھا وہ زمانے کے ہاتھوں جا پہنچا۔ زمانے نے اسے پڑھا۔ بڑے اہلِ قلم، اہلِ نظر، اہلِ فن تاثر و جذبات سے بے قابو ہو گئے۔ بعض نے اس کا اظہار کر دیا۔ اور اظہار کرتے کرتے یہ بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر لکھ دیا کہ میں اپنی تفصیلی رائے آئندہ رقم کر کے بھیجوں گا حالانکہ میرا مطالبہ نہیں تھا مگر اس کے باوجود ان کا دل انھیں بے قابو کر دیتا ہے اور وہ اظہار کر دیتے ہیں کہ میں اپنے تاثرات ابھی نہیں، عنقریب لکھ کر بھیجوں گا۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ اس ارادہ کو پورا کرنے کے لیے کبھی بیٹھتے ہوں گے لیکن جب لکھنا چاہتے ہوں گے تو گم صم ہو کر بیٹھ جاتے ہوں گے۔ جیسے ان کا دل رُکنے لگا، ان کا دماغ ماؤف ہو گیا، ان کا قلم مفلوج ہو گیا۔ ان سے کچھ لکھا نہ گیا۔ آج عالم عالم کے تبصروں کی بھیڑ بھاڑ رسالوں میں دیکھ لو، بڑے بڑے مقام اور مرتبے والے کو دیکھ لو، لکھنے والوں کے بھاری بھرکم ناموں کو اور مقاموں کو دیکھ لو اور پھر ان کی تحریر پڑھ لو شاید وہ ارادہ کرتے ہوں گے کہ لکھوں مگر پھر دیکھتے ہوں گے، بھئی یہ تو آتش کدۂ نمرود ہے۔ اس کی آنچ دو دو کوس دُور بھی ٹھہرنے نہیں دیتی اور وہ دامن بچا کر نکل جاتے ہیں۔ آج بھی میرے ساتھ پڑھے ہوئے یا میرے پڑھائے ہوئے عالم عالم، مستند نقّاد اور ادیب بنے ہوئے ہیں۔ کیا کیا نہیں لکھتے ہیں وہ اپنی تحریروں میں، اپنے مضامین میں، اپنی تنقیدوں میں۔ ایک ایک جگہ دس دس پندرہ پندرہ نام لکھ جائیں گے۔ ایسے ایسے نام بھی ہوں گے جنھوں نے ابھی قلم پکڑا ہے۔ کچھ الف ب ت ث لکھا ہے مگر افسانہ نگار، ادیب اور نقّاد کی کرسیوں پر بیٹھ گئے ہیں۔ ان ناموں کی بھیڑ میں کہیں کلیم عاجزؔ کا نشان بھی نہیں ملے گا کہ کلیم عاجزؔ کوئی شاعر تھا یا ہے۔ کچھ لکھتا تھا، کچھ لکھ گیا ہے، جسے عالم عالم پڑھ رہا ہے اور عالم عالم کی زبانوں پر اس کا نام ہے۔ اس کے اشعار ہیں، اس کی تحریریں ہیں، اس کا کلام ہے۔ ملکوں ملکوں لوگ کلیمؔ کو جانتے ہیں۔ اس سے ملنے کے خواہش مند ہیں، آرزومند ہیں مگر اتنے دُور دراز آنے کی مشقتوں اور مشکلات پر قابو نہیں پا سکتے ہیں۔

ابھی میں مدینہ منورہ میں حاضر ہوں۔ عمرہ کے لیے آیا ہوا ہوں۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم پاک کے نیچے خاک پر سجدہ ریز ہوں۔ مسجدِ نبوی میں کل میرے ایک دوست

مجھ سے ملے جو یہاں جامعہ میں استاد ہیں۔وہ کہنے لگے کہ طارق جمیل صاحب عمرہ کے لیے آئے ہوئے ہیں۔کل اُن سے مکہ مکرمہ میں ملاقات ہوئی۔ برسبیلِ تذکرہ انھوں نے میرا نام بھی لے لیا کہ کلیم عاجزؔ بھی آئے ہوئے ہیں۔بس وہ چونکہ پڑے اوران سے لپٹ گئے۔بھئی مجھے ان سے ملاؤتو، وہ کہاں ملیں گے؟ میں ہوائی جہاز سے بھی ان سے ملنے کو جاسکتا ہوں۔آج بھر میرا قیام ہے۔کل میری فلائٹ وطن کے لیے ہے۔لیکن میرے وہ دوست واقف نہ تھے کہ میں کہاں ہوں۔جدہ میں ہوں کہ مکہ میں ہوں، یامدینہ ہوں اس لیے وہ بتانہیں سکے۔وہ صاحب افسوس کرکے رہ گئے۔میں انھیں جانتا ہوں۔اور دین اسلام سے تعلق رکھنے والے ان کے نام سے واقف ہیں۔عالم عالم ان کی تقریریں آڈیو، ویڈیو پر، انٹرنیٹ پر سنی جارہی ہیں۔میں انھیں جانتا ہوں۔دیکھانہیں ہے۔ان کی تقریریں بہت سنی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وہ میری کتابیں پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کلیم عاجزؔ میرا محبوب شاعر ہے مگر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔اس کلیم عاجزؔ کو آج کسی میگزین میں، کتاب میں، رسالوں میں ڈھونڈوگے تو اس کا نام کہیں نہیں ملے گا۔بس لوگ سمجھتے ہیں کہ نام لکھوں گا تو جل جاؤں گا یا بےعزّت ہوجاؤں گا۔میرامقام خاک ہوجائے گا۔میرا میک اپ اُتر جائے گا۔وہ میک اپ پر جان دیتے ہیں۔بغیر میک اپ کے ان کی پہچان غائب ہوجائے گی۔وہ پہچان میں رہنا چاہتے ہیں،اس لیے کلیم عاجزؔ کی بھری برسات یا تیز لُو میں وہ داخل نہیں ہونا چاہتے کہ میک اپ ڈُھل جائے گا یا پسینہ بن کر نکل جائے گا۔

آخر میں میں نے اپنے دونوں مجموعۂ غزل 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' اور 'جب فصل بہار آئی' کا سوسو صفحات کا دیباچہ خود لکھا ہے اور عالم عالم کو معلوم ہے کہ ان دیباچوں نے عالم کو کیا دیا ہے۔اپنے تیسرے مجموعہ غزل 'ہاں چھیڑ و غزل عاجزؔ' جو اس وقت زیر اشاعت ہے اس کا دیباچہ لکھ رہا ہوں۔تقریباً پچاس صفحات ہوچکے ہیں اور ابھی بہت کچھ لکھنا ہے۔ جتنا لکھنا ہے وہ تو پورا نہیں ہوسکے گا۔

عجب منشا قدرت ہے کہ جب میں قلم اٹھاتا ہوں تو مجھے مبہم سا کچھ خیال رہتا ہے کہ مجھے دیباچے میں کیا لکھنا ہے مگر جب لکھ چکتا ہوں تو دل معترف ہوتا ہے، یہی مجھے لکھنا چاہیے تھا جو کسی نے قلم پکڑ کر لکھوادیا۔

میں نے اپنے پہلے مجموعہ 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کے دیباچے میں شاعری کا سبب سمجھایا

ہے۔دوسرے دیباچے 'جب فصل بہاراں آئی تھی' میں:

کرتے رہو کلیمؔ اشاروں میں گفتگو

میں اپنی شاعری کو سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اپنے تیسرے مجموعے کے دیباچے میں میں نے شاعر کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ پہلے دیباچے میں آنسوؤں کی زبان استعمال کی ہے:

ادا کیوں کر کریں گے چند آنسو دل کا افسانہ

دوسرے میں اشاروں کی زبان استعمال کی ہے:

کرتے رہو کلیمؔ اشاروں میں گفتگو

دونوں مجموعوں میں آنسو اور اشارے ہیں۔ دونوں ضروری تھے۔ اس ضرورت کا مجھے احساس نہیں تھا مگر جس نے لکھوایا اسے سب معلوم ہے۔ وہ جو چاہتا تھا وہی ہوا۔

اب اس مجموعے میں نہ آنسو کی زبان ہے، نہ اشاروں کی زبان ہے۔ اس میں میرے لکھانے والے نے کہا۔ ہاں دوٹوک لکھو۔ دوبار شرعی طور پر اجازت ہے کہ ترغیب دو اور شاعری کو سمجھانے کے لیے وہی مبہم طرزِ بیان کی ضرورت ہے۔

مگر شاعر کو سمجھانے کے لیے زبانِ حال کا استعمال ضروری ہے۔ اس میں تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی لکھنا چاہیے۔ مگر مجھ سے یہ نہیں ہوسکا۔ زبان پر چلمن ہمیشہ ڈالی، کبھی کھل کر گفتگو نہیں کی۔ اس لیے اب تک جو لکھا وہ بس نظر میں کسی تک ہے۔ ہم کیسے بنے، کیوں بنے یہ نہیں لکھا ہے اور شاید یہی لکھ کر ختم کردوں گا۔ کیسے بنے یہ ہوچکا۔ کیا بنے ہو اب چل رہا ہے۔ کیوں بنے یہ ایک الگ موضوع ہے۔ یہ بھی سیر حاصل ہے مگر اسے چھیڑنا اور اختتام تک پہنچانا ایک بڑا کام ہے۔ کیا بنے یہ کوشش جاری ہے۔ اس میں کچھ نہیں کہوں گا۔ کچھ لوگ جو کہہ گئے ہیں ان کی وضاحت ہوگی اور کچھ تاریخ کے حوالے بتائیں گے۔

میرے متعلق جو دو ایک بزرگوں نے کہا ہے ان اشاروں کی تھوڑی وضاحت کی ضرورت ہے۔ کہنے والوں میں استاذی جمیل مظہری اور سیّد علی عباس کے تحریری تاثرات ہیں اور پاک و بے عیب اور مخلصانہ تاثرات ہیں۔ دونوں میرے بزرگ، میرے چاہنے والے مخلص ہیں۔ جو کچھ الفاظ میں انھوں نے ادا کیا ہے اس سے بہت زیادہ وہ اپنے عمل سے ظاہر کرچکے ہیں۔ اللہ ان کو کروٹ داخلِ جنت کرائے۔ ان سے نہایت کرم، نہایت بخشش اور نہایت فضل و احسان کا

معاملہ فرمائے۔آمین! کلیم الدین احمد صاحب نے جو کہا وہ ایک اٹل آدمی ہیں۔عملی آدمی ہیں، وہ بات بنانے کے عادی نہیں اور چبا کر بھی بات نہیں کہتے۔ وہ دوٹوک کہتے ہیں۔کبھی کبھی ٹھوکریں بھی لگتی ہے۔وہ عین تقاضائے انسانیت ہے اور انسان کے فرشتہ ہونے کی نفی ہے۔میں نے بعض ٹھوکروں کو بہت مہین اور نازک پیرائے میں نمایاں کر دیا ہے جو بعض مضامین میں ہیں۔ ورنہ وہ پہاڑ کی طرح اٹل ہیں۔ان کا جائزہ صحیح ہے اور محاکمہ صحیح ہے۔ یہ وقت نے تسلیم کرلیا ہے۔اب اس سے انکار ممکن نہیں ہے۔ نہ گنجائش ہے۔ بہار میں دو دیو قامت انسان گزرے ہیں۔قاضی عبدالودود اور کلیم الدین احمد۔ان کو تراش کر کے کوتاہ کرنے کی کوشش کرنے والے کی کمزوری اور ان کی منافقت کی پردہ پوشی ہوگی۔

کلیم صاحب نے جو کچھ میرے متعلق کہا ہے وہ صحیح ہے۔ جتنا انھیں تسلیم کرنا تھا وہ تسلیم کرلیا ہے اور بشاشت اور صاف دِلی سے کیا ہے۔کسی کے متعلق انھوں نے اپنی زندگی میں بشاشت سے اعتراف نہیں کیا ہے جو انھوں نے میرے متعلق کیا ہے۔میں ان کا شاگرد نہیں ان سے قربت بھی نہیں رہی۔ دُور دُور رہا مگر دُوری ان سے میری قربت کو دُور نہ کرسکی۔ وہ میری غزل بہت توجہ سے سنتے تھے۔تعریف نہیں کرتے تھے وہ کسی کے لیے انھوں نے زبان سے تعریف نہیں کی۔لیکن ان کی پسندیدگی نمایاں رہتی تھی۔وہ مجھے پسند کرتے تھے اس سلسلے میں جو تعریف کرنی تھی وہ بہت موزوں الفاظ میں انھوں نے تحریر کردیا ہے۔اس سے اچھی تعریف مختصر لفظوں میں کوئی نہیں کرسکتا۔جس حد تک کمی کی انھوں نے نشاندہی کی ہے وہ اگر زندہ رہتے تو وہ واپس لیتے۔اور بہت دل کھول کر وہ ایک چھوٹے ہم وطن شاعر کلیم عاجزؔ کی شاعری کی تعریف کرتے۔میری غزلوں میں وہ بات انھیں نظر آجاتی جو اس سے پہلے کسی میں نظر نہیں آئی۔انھوں نے میری غزلوں کی تاثیر کی اور حقیقت نگاری کا اعتراف کیا۔اس کے بعد وہ اگر زندہ رہتے تو غزلوں کے انتشارِ خیال اور بیان اور بے ترتیبی کا اعتراض وہ بشاست سے واپس لے لیتے اور میری پیٹھ ٹھونک دیتے۔انھوں نے میری پیٹھ نہیں ٹھونکی ،مگر چلنے کا اشارہ کر کے خاموش ہوگئے۔ اب وہ خاموش نہیں رہتے۔جس طرح دوٹوک میری غزلوں کے محاسن کا اعتراف کیا ہے، جو اُردو شاعری میں کسی کے لیے نہیں کیا۔میرے لیے دَبی زبان سے نہیں کھلے زبان سے بہت خوش الفاظی سے اعتراف کرلیتے۔اللہ انھیں جزائے خیر عطا کرے۔وہ اس جزائے خیر کے مستحق ہیں۔

میرے دوسرے اجنبی ناآشنا دور کے باسی کنہیالال کپور مجھے نہیں جانتے تھے۔ کہیں بھی کسی بھی محفل، مجلس میں وہ نظر نہیں آتے۔ ان کی تحریریں میں نے پڑھی تھیں۔ میں بھی اس کے باوجود ان سے بہت زیادہ آشنا نہیں تھا۔ ان کا نام مجھے یاد تھا مگر ان کے کام سے، ان کے مقام سے، ان کے طرزِ کلام سے میں واقف نہیں تھا۔ ایک غیر معروف اجنبی شاعر کا مجموعہ ان کو کسی سے مل جاتا ہے اور اپنے تمام کام اور مقام سے باہر آکر ایک اجنبی شاعر کے تعلق سے جس فراخ دِلی اور سچائی سے انھوں نے اظہارِ خیال کیا ہے وہ ان کے اہلِ علم اور اہلِ دل ہونے کی کھلی شہادت ہے۔ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا جو کچھ ان کے حالات ہیں، تاثرات ہیں، جذبات ہیں وہ سچے ہیں، تعصّبات سے پاک ہیں۔ میں ان کی تحریر کے بالکل آخری حصے جس پر انھوں نے اپنے مضمون کا خاتمہ کیا ہے اس کے ایک جملے کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ وہ ایسے ہیں کہ اس طرف کسی کی نگاہ نہیں گئی۔ میرے جاننے والوں، میرے چاہنے والوں میں کسی نے بھی نہ اس وقت، نہ اس کے بعد آج تک وہ بات اشارتاً بھی کبھی کسی نے نہیں کہی۔ وہ ایسی بات کیسے بول گئے جو پیشین گوئی تھی۔ ایسی آنکھ جو مستقبل کی طرف اتنا کھل کر دیکھ رہی ہو کسی کی نہیں تھی۔ اس کے قریب بھی نہیں پہنچ سکی اور اس نے آج سے چالیس سال پہلے کہہ دیئے جو آج کے لوگ نہیں کہہ رہے ہیں، نہ دیکھ رہے ہیں، نہ سمجھ رہے ہیں۔

میں ان کے متعلق وہ بات کہہ دوں جو ان کے خط میں تھی، جو انھوں نے اپنے مضمون کے ساتھ بھیجا تھا۔ وہ میری کتاب 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کے ناشر مسٹر فخر الدین ونک کے پاس محفوظ تھا۔ اب وہ بہت دُور دیس جا کر بس گئے۔ مجھ سے کم رابطہ ہے۔ خدا جانے اس خط کا کیا حشر ہوا۔ ان کے بہت بڑے کارخانے کے دھوؤں میں اُڑ گیا یا کیا ہوا؟ بہر حال اس کا خلاصہ میری زبان سے سنیے۔ انھوں نے اپنے خط میں جو کچھ لکھا اس کا خلاصہ ہے۔

مجھے کلیم عاجزؔ کا مجموعۂ کلام ہاتھ لگا۔ میں اپنا قلم روک نہیں سکا، میں نے یہ مضمون لکھا اور مضمون مجھے انھوں نے واپس بھیج دیا یہ لکھ کر کہ 'آج کل' میں کسی زندہ شاعر یا فنکار پر کوئی مضمون شائع نہیں ہوسکتا۔ میں جواب پڑھ کر حیرت زدہ ہوگیا۔ پھر میں نے وہ مضمون اپنے صوبے یوپی کے سرکاری میگزین 'نیا دور' کے ایڈیٹر صاحب کو اشاعت کی درخواست کے ساتھ بھیجا۔ چند روز بعد وہ مضمون اس جواب کے ساتھ واپس ملا کہ فی الحال اس میگزین میں بہار کے کسی شاعر کے

متعلق کوئی مضمون شائع نہیں ہو سکے گا۔ کنہیا لال کپور لکھتے ہیں کہ میں اس جواب سے اتنا رنجیدہ ہوا کہ میں نے اور کسی کو مخاطب نہیں کیا۔ وہ مضمون میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ وہی مضمون ہے جو پہلے پاکستان میں چھپنے والے 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کے دوسرے ایڈیشن میں شامل ہے:

کون یہ نغمہ سرا میؔر کے انداز میں ہے

اور میری غزلوں کے دوسرے مجموعے 'جب فصل بہاراں آئی تھی' کی پہلی اشاعت میں اور دوسری اشاعت میں شامل ہے۔ کنہیا لال کپور کے مضمون کا آخری پیراگراف یہ ہے۔

"کلیم عاجؔز نے غزل کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ بلاشبہ ان کا شمار ان شعرا میں کیا جا سکتا ہے جو وقتاً فوقتاً عروس غزل کو سنوارنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور جنھیں زمانۂ حال سے کہیں زیادہ زمانۂ مستقبل کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ کلیم عاجؔز نے ایک نئے دبستان کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اس نے نہ صرف اپنے ہم عصروں کے لیے نئی راہیں کھولی ہیں بلکہ یہ بشارت بھی دی ہے:

نہ ساتھ دیں گی یہ دم توڑتی ہوئی شمعیں
نئے چراغ جلاؤ کہ روشنی کم ہے"

کنہیا لال کپور نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ میرے ذہن میں نہیں آئے لیکن ان الفاظ کے پیچھے جو حقیقت ہے وہ ادھر بیس سال سے میرے ذہن کے دریا میں موج در موج بن کر اُٹھ رہے ہیں اور مجھے کچھ کہنے پر اُکسا رہے ہیں، چھیڑ رہے ہیں۔ شاید کہیں بہت مبہم اشاروں میں کچھ کہلوا بھی دیا ہے، مگر یہ بات صاف صاف کہنے کا شدید تقاضہ کر رہی تھی اور میں اس تقاضے کو دبا رہا تھا اور اب بھی کہنے میں مجھے پس و پیش ہو رہا ہے۔ پس و پیش اس کی سچائی اور حقیقت پر نہیں ہے پس و پیش اس لیے کہ:

عاجؔز کا دل بہت بڑا ہے ظرفِ زمانہ چھوٹا ہے
ڈھیروں ڈھیروں بات ہے لیکن تھوڑا تھوڑا بولے ہے

شاعر اپنے محدود وجود میں اپنے محدود مقام میں وہی حیثیت رکھتا ہے، جو ایک نبی اپنی لامحدود حیثیت میں رکھتا ہے۔ شاعری جزویست از پیغمبری، شاعر کی بھی ذمہ داری ہے۔ شاعر ذمہ دار ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو چھپا کر نہیں رکھتے۔ یہ خیانت ہو گی۔ صحیح آواز کو چھپانا، خوشبو کو

چھپانا، پانی کے بہاؤ کو روکنا نقصان دہ ہے۔ شاعر ادیب دنیا کا نقصان کرنے والا نہیں۔ دنیا والوں کو نقصان پہنچانے والا نہیں۔ حالؔی نے کہہ دیا:

یہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر

حالؔی نے عمومی طور سے یہ محاکمہ کرکے بہ بانگِ دہل اعلان کردیا اور قافلہ جو سرپٹ جا رہا تھا وہ پہلے ٹھٹکا، پھر ٹھہرا۔ بات سچ تھی اس لیے قافلہ کو سوچنا پڑا۔ جب انسان سوچتا ہے تو سوچ اور غور وفکر میں یہ صفت ہے کہ اسے کچھ روشنی نظر آجاتی ہے۔ اللہ نے بار بار انسانوں کو غور وفکر کی دعوت دی ہے۔ تم سوچتے نہیں؟ غور وفکر نہیں کرتے؟ اگر سوچو گے اور غور وفکر کرو گے تو ہدایت کے دروازے کھلیں گے۔ اس وقت دنیا جس رفتار سے چل رہی ہے، اسے غور وفکر کرنے کی فرصت نہیں اس لیے دنیا کی رفتار صحیح نہیں ہے۔ ایجادات سے دنیا کو جس قدر فائدہ پہنچ رہا ہے، انسان کی فطرت اسے اس کے منفی پہلو پر سوچنے کی فرصت نہیں دیتی۔ جوشؔ ملیح آبادی نے ۱۹۴۸ء میں انجمن اسلامیہ ہال میں ایک نظم پڑھی تھی، اس کا ایک بند مجھے یاد ہے:

کوئی کچھ کہتا نہیں بنیادِ ناہموار کو
گالیاں دیتے نہیں سب گرتی ہوئی دیوار کو
سچ تو یہ ہے زیب یہ دیتا نہیں سرکار کو
پالیے بیماریوں کو ، ماریئے بیمار کو

اس وقت عالم عالم میں ہو رہا ہے۔ اخبار کو، ٹیلی ویژن کو، موبائل کو، کمپیوٹر کو، انٹرنیٹ کو سنبھل کر استعمال کرنے کی اور کثرتِ استعمال کو روکنے کی بات ہر وقت ہو رہی ہے، بچوں پر نگاہ رکھنے کی، ان کی صلاحیتوں کی حفاظت کرنے کی، ان کے طور اطوار پر روک لگانے کی بات ہر جگہ ہو رہی ہے، اور کیا کیا عرض کروں۔ سینماؤں کی، فلموں کی کارستانیوں پر ہر جگہ بات ہو رہی ہے۔ شراب اور زنا کی بربادکاری پر آواز اُٹھ رہی ہے۔ لیکن اس پر روک لگائے تو کون لگائے۔ جو روک لگانے والے ہیں، جنھیں مخاطب کیا جا رہا ہے وہ خود ہی اس میں مبتلا ہیں۔ حالؔی کے زمانے میں سمجھنے کی ضرورت کا احساس تھا۔ حالؔی نے للکارا تو لوگ ٹھہرے، شادؔ کھڑے ہوگئے، عزیزؔ لکھنوی کھڑے ہوگئے۔ صفؔی، ثاقبؔ، محویؔ لکھنوی، فانیؔ، اصغرؔ کھڑے ہوگئے۔ سنبھلنے لگے تو

سنبھال اور ٹھہراؤ آ گیا۔ ترقی پسندی بھی سنبھل کر کھڑی ہوئی۔ پریم چند نے، اقبالؔ نے، آزادؔ سبحانی نے اعتدال کا مشورہ دیا تو فیضؔ، سردارؔ، کیفیؔ کچھ سنبھلے۔ پھر گراوٹ شروع ہوئی۔ پھر اسی صلب سے، اسی بطن سے جدیدیت نے وجود حاصل کیا۔ اب پھر اندھا دُھند لوگ دوڑ رہے ہیں۔ پتہ نہیں چلتا کہ کدھر جا رہے ہیں، منزل کیا ہے، راستہ کس نے بتایا ہے، راستہ کہاں جا رہا ہے۔ کیا دے رہے ہو، کیا لے رہے ہو۔ سودا کیا ہے۔ کچھ چھان پھٹک نہیں، کوئی کسوٹی نہیں، کوئی میزان نہیں، کوئی تول نہیں۔ کوئی بٹکھرا نہیں۔ ایسے میں شاعری ''جزو یست از پیغمبری'' کا، کچھ کچھ منصب کا احساس رکھنے والوں کی ذمہ داری دامن پکڑ کر کھینچ رہی ہے۔ چلو آگے بڑھو، زبان کھولو، نقار خانہ میں طوطی سہی۔ طوطی کو اپنے آواز نکالنی چاہیے۔ پکار اُٹھنی چاہیے۔ شکست و فتح کے شش و پنج کی گرد دامن سے جھاڑو۔ مقابلے پر آجاؤ۔ اصل کام مقابلہ ہے۔ معاملہ مقابلہ پر ہوگا۔ شکست و فتح پر نہیں۔ چھٹکارا مقابلہ پر ہوگا۔ مقابلہ ہمّت سے ہوگا اور سب کچھ جھونک دینے کے جذبے سے ہوگا تو فتح کی شفق پھوٹے گی۔ گمان آبادستی میں چراغِ رہبانی کام کرسکتی ہے۔ بغیر چراغ جلائے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے رہنے سے خود بھی ڈوبیں گے، دنیا تو ڈوب ہی جائے گی۔

میں نے شاعری نہ بزم آرائی کے لیے اختیار کی نہ مضمون آفرینی کے لیے۔ میری شاعری کی جھولی ان دونوں سے خالی ہے۔ نہ مجلس واہ واہ کے لیے۔ میں نے چھہتّر برس کی زندگی شاعری میں گذاری کہ شاعری آ کر دامن سے لپٹتی رہی اور میں دامن جھاڑتا رہا۔ گرچہ مجھے آٹھ سال کی عمر سے شاعری نے اختیار کیا۔ میرے دامن سے لپٹی رہی۔ مجھے اس شاعری سے کوئی شغف نہ رہا نہ سروکار۔ لیکن شاعری میرے اندر بیج بوتی رہی اور قدرت اس کی نشو و نما کرتی رہی۔ شاعری جس گہوارے پر پلتی ہے وہ گہوارا مجھے ہلا ڈُلا کر کرتا رہا۔ پینگ دیتا رہا۔ جھولا جھلاتا رہا، کبھی دل مایوسی کے قریب آیا، کبھی دُور ہو گیا۔ بڑے بڑے طمانچے مجھے لگتے۔ محبت نے مجھے کوٹا، پیسا، چھانا پھٹکا۔ فیضان سماوی نے مجھے چھوڑا نہیں۔ محبت کا ایسا بیج میرے دل میں بویا کے پتّہ پتّہ، ڈالی ڈالی، بوٹا بوٹا، گھانس گھانس، گلی گلی، کھیت کھیت مجھے رُلانے لگی، مجھے تڑپانے لگی۔ میرے رونے کے دن نہیں تھے۔ تڑپنے کے دن نہیں تھے۔ بہترین قسم کا کرتا، بہترین سلک اور بہترین سرج کی شیروانی، بہترین لٹھے PPPPP (پانچ پی) کا پاجامہ اور بنگالی ٹینری کے گلاسکٹ کا شو، جاپانی گنجی اور رام پوری مخمل کی ٹوپی۔ جیب میں Omega اور ایسٹرن کی

گھڑی مع چین لگا، بازار اور سڑکوں پر مجھے فیشن میں دیکھا اور کلکتہ میں راستوں پر چلنے والے مجھے مڑ کر دیکھا کرتے تھے۔مگر یہ فیشن رونے اور تڑپنے سے مجھے نہ روک سکا۔

ارے بھائی کیوں رو رہے ہو۔گھر بہت یاد آیا رہا،بستی بہت یاد آرہی ہے، اماں بہت یاد آرہی ہیں،محمودہ باجی یاد آرہی ہیں۔بھیّا یاد آرہے ہیں، دمّو ماموں، اعظم نانا یاد آرہے ہیں۔ پانکڑ تلے کا کھیل یاد آرہا ہے۔ان کے لیے مجھے بارہ سال رُلایا، کلکتہ کے تھیٹر، سینما،چمکتی دمکتی دُکانیں،فیشن کے سامان، پُررونق بازار مجھے تیلہاڑہ کی گلیوں کے سامنے مردہ نظر آتے تھے اور میں مُردوں کی جمگھٹ سے بھاگ کر کیچڑ اور دھول والے گاؤں کی زندہ فضاؤں میں ناچنا،کودنا، اُچھلنا چاہتا تھا۔جس طرح انبیا کو ایک مدّت تک داخلی اضطراب میں رکھا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس سال غارِ حرا میں رُلایا، تڑپایا پھر تمغۂ نبوت دے کر کوہِ فاراں پر اعلان کروا دیا۔ مجھے بارہ برس تک تیلہاڑہ بستی اور گھر اور گھر والوں کی محبت میں رُلا کر، تڑپا کر اس مرکزِ محبت کو جلا کر، اس کے باسیوں کو خاک میں ملا کر میرے رونے کو، آنسوؤں کو بند کر کے مجھے شاعری دے دی اور ایسی شاعری دے دی کہ اس دور کے بڑے بڑے استاد، جوشؔ ملسیانی، ساغرؔ نظامی، سلامؔ مچھلی شہری، سکندر علی وجدؔ، شاذؔ تمکنت، سردارؔ جعفری، کیفیؔ اعظمی، مجروحؔ سلطان پوری، شکیلؔ بدایونی، جگن ناتھ آزادؔ، ظ۔انصاری، اور آخر میں جسٹس آنند نرائن ملا اور فراقؔ گورکھپوری کے نام لیتا ہوں کہ یہ دیوانے ہو گئے۔ یہ کیسی آواز ہے، یہ کیسی پکار ہے؟ یہ کیسا لہجہ ہے؟ یہ کیسا اُسلوب ہے؟ یہ کیسی بات ہے، یہ کیسی شاعری ہے؟ مجھے کچھ اچنبھا نہیں ہوا۔اس لیے کہ میں شعر کہہ رہا تھا اور کہنے کے بعد میں اکثر خود حیرت میں رہ جاتا تھا کہ یہ میں نے کیسے کہہ دیا۔ایسی تو میری سوچ میں بات نہیں تھی؟ لیکن کہلوانے والے نے دل ہاتھ میں ڈال کر بات نکال لی اور میری زبان پر رکھ دی:

تجھے کیا اگر ترے واسطے کوئی زندگی سے گزر گیا
تری زُلف اور سنور گئی ، ترا حسن اور نکھر گیا
کوئی طنز میرے خیال پر کوئی میرے حال پر کر گیا
میں نگاہ نیچی کیے ہوئے تیری انجمن سے گزر گیا
مجھے دل کے حال کا غم نہیں مگر اس کا غم تو ضرور ہے
کہ اسی نے توڑا یہ آئینہ جو اس آئینے میں سنور گیا

یہ آواز کہاں تھی۔ یہ آواز فراؔق میں کہاں تھی، یہ آواز جگؔر میں کہاں تھی یہ آواز ساغؔر میں کہاں تھی، جو میں اپنی ابتدائے شاعری کے دور میں آج سے ساٹھ سال پہلے کر رہا تھا؟

ابھی میں عرب میں آیا ہوا ہوں۔ عمرہ کے لیے حاضری ہوئی۔ دو روز پہلے میں اپنے ایک دوست کے گھر میں تھا۔ مجھے ایک کتاب ان کے یہاں ملی 'دہلی کے مشاعرے' بہت مہین، باریک حروف میں تقریباً چار سو صفحات کی ہے۔ ۱۹۵۰ء سے غالباً ۱۹۶۰ء تک کے تمام شہرۂ آفاق مشاعرے، لال قلعہ کے، دہلی کلاتھ ملس کے، چیمسفورڈ کلب کے، روٹری کلب کے پچاسوں مشاعروں کی تفصیلی روداد ہے۔ جوؔش و جگؔر سے لے کر فنؔا نظامی کے ہند و پاک مشاعروں کی روداد ہے۔ میں نے انھیں سنا تو بہت، ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک۔ ان تمام مشاعروں میں شرکت کی، دیکھا یہی کہ فراؔق کچھ بول گئے۔ بھائی منظوؔر (ملک زادہ منظؔور احمد) کلیم عاجؔز کو پڑھوا دو۔ میں اب جانا چاہتا ہوں۔ آنند نرائم ملاّ بول رہے ہیں کہ بھئی آج کا مشاعرہ تو پٹنہ کا وہ لونڈا لوٹ کر لے گیا۔ سلاؔم مچھلی شہری نے کہا۔ ملاّ صاحب کلیم عاجؔز یہیں پر موجود ہیں۔ ملاّ صاحب کھڑے ہو گئے۔ بھائی عاجؔز معاف کر دو میں نے تمھیں پیار سے لونڈا کہہ دیا لیکن فرمائش کر رہے ہیں۔ بھئی کلیم وہ غزل سنا دو:

یہ شب انھیں زُلفوں کی کرامات لگے ہے
سنتے تھے غزل میں یہ وہی رات لگے ہے

علی سردؔار جعفری کہہ رہے ہیں عاجؔز صاحب وہ غزل سنا دو:

یہ سمندر ہے کنارے ہی کنارے جاؤ
عشق ہر شخص کے بس کا نہیں پیارے جاؤ

یہ سب مشاعروں میں ہوتا رہا۔ کل میں نے وہ کتاب پڑھی 'دہلی کے مشاعرے' اور دیر تک پڑھتا رہا اور سوچتا رہا یا اللہ کسی کا کلام زندگی سے، حقیقت سے اتنا دور بھی ہوسکتا ہے؟ جس میں روحِ عصر کی موجودگی کا دُور دُور تک احساس نہیں ہوتا۔ وہی زبان دانی، وہی بیان کی باریکی، لیکن کلیجے کی کسک، دل کی دھڑکن دھیمی آواز میں سرگوشی کے طور پر بھی کہاں محسوس ہوتی؟ اور اب تو شاعری بہت دُور جا چکی ہے۔ شاعری میں زمین کی بات نظر ہی نہیں آتی۔ اب تو شاعری میں سب کچھ نظر آتا ہے، ہوا، پانی، پہاڑ درخت، جھرنا، آبشار، چڑیے، طوطے، مینا، سایہ، گرمی

لیکن انسان تو بہت کم نظر آتا ہے۔ زبان کی گرمی کی جھونک چل رہی ہے۔لیکن دل کس برف خانے میں ہے خبر نہیں ملتی ۔اور ہم کہہ رہے ہیں:

ہے عجب دوست کہ جب یاد آیا　　جتنا غم بھولے تھے سب یاد آیا
دل بھی ہوتا ہے لہو یاد نہ تھا　　جب لہو ہوگیا تب یاد آیا
دُشمنی ایسی نہ کرتا دُشمن　　وہ میرا دوست تھا اب یاد آیا
دیکھیں یاد آئے سحر تک کیا کیا　　آج وہ اوّلِ شب یاد آیا
جس کا یاد آنا غضب ہے عاجؔز　　پھر وہی ہائے غضب یاد آیا

ہوا، پانی، آگ، مٹّی کچھ نہیں۔مٹّی سے اُگتی ہوئی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔لیکن آگ، مٹّی، ہوا، پانی چار عناصر سے بنی ہوئی سب سے بڑی چیز اپنے پورے ماحول، پوری فضا، اپنے عصر ماضی مستقبل اور حال سے آراستہ وپیراستہ پوری قوت، رنگ وآہنگ، ذائقہ، چٹخارے، لذّت، چاشنی، تلخی اور ترشی کے ساتھ موجود ہے۔ ہر پڑھنے والے کو لگے گا یا لگنا چاہیے کہ یہ تو ہمیں ہیں اور صرف ہمیں ہیں۔اس میں کھو جانے کو جی چاہے گا:

نہ پوچھو کیوں میرے لب پر ہنسی نہیں پیارے
یہ زندگی ہے کوئی دلگی نہیں پیارے

حضرت خواجہ میر دؔرد کہتے ہیں:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

یہی زندگی شاعری میں منتقل ہوتی ہے۔زندگی کبھی بادِنسیم کا پیرہن پہن لیتی ہے کبھی طوفان بن جاتی ہے۔شاعری بادِنسیم ہے۔کبھی اپنے اندر زندگی کو ڈھال لیتی ہے۔کبھی طوفان کے حوالے کر دیتی ہے۔شاعر بہترین نقاد ہے۔زیورساز ہزار پہلو سے زیور کو جانچتا ہے تب تکمیل کو پہنچاتا ہے۔ یہ کاتا اور لے دوڑے نہیں ہے۔مشاعروں نے تمام بندشیں توڑ دیں۔ شاعر غلط بندشوں کو توڑتا ہے۔صحیح بندشوں کو قائم رکھتا ہے۔شاعری توازن کا نام ہے۔ یہ توازن جذبات میں بھی، خیال میں بھی، اندازِ بیان میں بھی، طرزِ اسلوب میں بھی۔ایک شاعر کا شعر ہے:

میں کہاں دفن ہوں کچھ پتہ تو چلے　　پھاوڑا لاؤ اور کھودو زمین

میں کہاں دفن ہوں یہ پتہ چلانے کی ضرورت، پھاوڑے کے علاوہ اور ذرائع سے بھی پوری ہوسکتی ہے:

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلام نرم و نارک بے اثر

میں جب شعر کہتا ہوں تو قافیہ ہاتھ باندھے حاضر ہونے لگتے ہیں۔ میں ردّ کرتا جاتا ہوں۔ خیالات مختلف بھیس میں آنے لگتے ہیں۔ میں درگزر کرتا جاتا ہوں۔ اسی دوران ایک ہیجان ہوتا ہے، ایک جنگ ہوتی ہے۔ فتح یاب خیال موزوں پیرائے میں، دلکش اسلوب میں آجاتے ہیں۔ پھر میں شعر اپنا لیتا ہوں۔ میں دعویٰ نہیں کرتا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ مرا تجزیہ کرنے والوں کو بڑی مشکل ہوگی کہیں انگلی رکھنے میں۔ یہ اس لیے کہ میرا ایک مشن ہے۔ میرا ایک موضوع ہے، میری ایک پلاننگ ہے۔ صرف شعر ہونا میرے لیے کافی نہیں، اس مشن، اس موضوع، اس پلاننگ کا حصہ ہونا شرط ہے۔ یہ پلاننگ اور مشن موضوع کی مشین میرے دل کے اندر رہے، میرے قلم یا زبان پر نہیں ہے۔ مجھے کیا اچھا لگتا ہے یہ بھی میری ایک پسند ہے لیکن میں اسے قربان کردیتا ہوں اپنے مشن اور موضوع پر:

مقصود ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا ہے

کیونکہ میں خود اس سوزِ حیاتِ ابدی کا قائل ہوں۔ وہیں میرے سرور اور سوز کا سبب بھی ہے۔ میں نے شاعری کو کسی نوع کے انعام کا محتاج نہیں بنایا۔ فن کو سر پر رکھا۔ احتیاج کو ٹھوکر میں رکھا۔ یہ آج کا نہیں ساٹھ سال کا مرض ہے۔ اب یہ لاعلاج ہے۔ ۱۹۴۹ء میں کشمیر ریڈیو سے دعوت آئی۔ نس بندی پر مشاعرہ ہے۔ کرایہ ہوائی جہاز کا، پانچ سو روز قیام کے اور پانچ سو روپے مشاعرے کے۔ میں نے صاف لکھ دیا۔ میں یہ موضوع ناجائز سمجھتا ہوں۔ پھر خط آیا۔ دو شعر کا کوئی قطعہ ہی سہی۔ اشاروں، کنایوں، استعاروں میں سہی پڑھ دیجیے۔ میں نے لکھا ایک لفظ بھی اس موضوع پر میری زبان سے نہیں نکلے گا۔ ایک بہت بڑے شاعر پٹنہ کے مشاعرے میں شرکت کی دعوت پر آئے۔ مشاعرہ پڑھا۔ معاوضہ انھیں مشاعرے میں نہیں ملا۔ دو دن تک وہ مختلف ذمہ داروں کے یہاں دوڑتے رہے۔ ملا یا نہیں ملا یہ مجھے یاد نہیں۔

پٹنہ کے گاندھی میدان میں یومِ آزادی کا مشاعرہ ہوا۔ پروفیسر عبدالمنان صاحب صدارت فرمارہے تھے۔ میں نے دیکھا لوگ غزل پڑھتے ہیں اور چند منٹ ٹھہر کر ایک طرف تیزی سے جارہے ہیں۔ کچھ دیر بعد میں نے ایک صاحب سے پوچھا یہ حضرات کہاں جاتے ہیں۔ وہ بولے وہاں آفس ہے۔ لوگ جاتے ہیں، فارم پر ٹکٹ لگا کے دستخط کرتے ہیں اور معاوضہ کی رقم حاصل کرتے ہیں۔ مجھے سخت شرمندگی ہوئی۔ میں غزل پڑھ چکا تھا، مشاعرے سے اُٹھ کر اپنے گھر چلا آیا۔ دوسرے تیسرے روز سکریٹریٹ سے آدمی آیا کہ آپ معاوضہ کی رقم سکریٹریٹ میں جاکر حاصل کرلیجیے۔ میں نے لاحول پڑھا۔ ایسے واقعات ہندوستان میں، امریکہ میں کئی بار ہوئے۔ بعض کا ذکر میری کتابوں میں ہے۔

میں نے اپنی کتابوں میں کئی جگہ لکھا ہے کہ مجھے دین اور مذہب کے بعد سب سے زیادہ احترام اپنی شاعری کا ہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے شری کرشن میموریل ہال میں عوامی کوآپریٹو بینک، پٹنہ کی جانب سے مشاعرہ ہوا۔ انور احمد سابق ایم ایل اے میرے دوست ڈاکٹر وصی احمد مرحوم کے لڑکے ہیں۔ وہ بہت اصرار کرکے مشاعرے میں لے گئے۔ اس مشاعرے میں پڑھنے والے اور پڑھنے والیاں شاعر نہیں لگے۔ کیا لگے یہ نہیں بتاؤں گا۔ غزل تو میں نے پڑھ دی مگر دوسرے روز انور صاحب بارہ ہزار کی رقم لے کر میرے پاس آئے۔ میں نے معذرت کی۔ انھوں نے معذرت قبول کرلی اور رقم واپس لے گئے۔

میری شاعری محبت کی، درد کی، انسان سوزی اور قدر کی بےعزتی کی کہانی ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی حفاظت کے لیے جانیں گئی ہیں۔ گھر بار لٹے ہیں۔ ان کے غم میں زندگیاں روتے کٹی ہیں، آزمائشوں میں پڑی ہیں۔ میرؔ صاحب بادشاہ آصف الدولہ کے بہت اصرار اور منّت سماجت پر لکھنؤ گئے۔ نواب صاحب نے مصاحب بنایا اور اصلاحِ سخن کی درخواست کی۔

ایک روز نواب صاحب حوض میں مچھلیوں سے کھیل رہے تھے۔ میرؔ صاحب سامنے بیٹھے تھے۔ آصف الدولہ نے اپنے شعر سنانے شروع کیے۔ دو تین شعر کے بعد دیکھا کہ میرؔ صاحب خاموش بیٹھے ہیں، کچھ بول نہیں رہے ہیں تو نواب صاحب نے کہا۔ میرؔ صاحب میں شعر عرض کررہا ہوں۔ میرؔ صاحب نے کہا پڑھے جایئے۔ جو شعر ہوگا وہ مجھے خود مخاطب کرے گا۔ نواب صاحب محجوب ہوکر خاموش ہوگئے۔

ایک روز نواب صاحب کی مجلس میں ایک نوجوان لڑکے کو کسی مصاحب نے پیش کیا۔ بہت

اچھا گویّا ہے اور اس کا ترنّم بہت دلسوز ہے۔ اس نے کچھ گایا اور نواب صاحب بہت مسرور اور محظوظ ہوئے۔ اتنے میں میرؔ صاحب تشریف لائے۔ نواب صاحب نے بے ساختہ کہا۔ میرؔ صاحب یہ لڑکا بہت اچھا گاتا ہے۔ اگر آپ اس کو ایک غزل دے دیجیے پھر تو سماں بندھ جائے گا۔

میرؔ صاحب بیٹھے بھی نہیں۔ اُلٹے پاؤں یہ کہتے ہوئے واپس ہوئے کہ میرا کلام اور گویّا پڑھے؟ اتنا رنج میرؔ صاحب کو ہوا۔ نواب صاحب کی مصاحبت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور پھر کبھی نواب صاحب کے دربار میں نہ گئے۔ ایک روز نواب صاحب ہاتھی پر سوار لکھنؤ کے بازار سے گزر رہے تھے۔ بازار کا بازار نواب صاحب کے احترام میں کھڑا ہو رہا تھا۔ آگے ایک حوض کے منڈیر پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ نواب صاحب جب ادھر سے گزرنے لگے تو وہ شخص راستے کی طرف سے منہ پھیر کر اسی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ نواب صاحب کے ساتھ انشاء اللہ خاں انشاؔ تھے۔ نواب صاحب نے کہا یہ کون بدتمیز ہے؟ انشاء اللہ خاں نے کہا۔ یہ میرؔ صاحب ہیں، یہ شان دیکھئے، میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی فاقے سے ہی ہوں گے۔ نواب صاحب نے اشرفیوں کی ایک تھیلی انشاؔ کو دی۔ جاؤ منا کر لے آؤ۔ انشاؔ نے میرؔ صاحب کی خدمت میں ادب سے وہ تھیلی پیش کی کہ بادشاہ صاحب آپ کے منتظر ہیں۔ میرؔ صاحب بولے۔ تیرا بادشاہ مجھے فقیر سمجھتا ہے کہ سرِ راہ اشرفیاں بانٹتا ہے۔ یہ کہہ کر اُٹھ گئے اور کہیں چلے گئے۔

دوسری طرف یہ حال ہے کہ دہلی جب لٹی تو میرؔ صاحب کے قدر داں احباب بھی لٹ گئے۔ ایک رئیس صاحب تھے وہ بھی اُجڑ گئے اور دہلی سے دُور کہیں ایک چھوٹا سا مکان لے کر رہنے لگے۔ میرؔ صاحب جب دہلی میں ان کے یہاں جاتے تھے وہ بہت پیار اور احترام سے ایک طشت میں مٹھائیاں لے کر آتے تھے۔ اور میرؔ صاحب کی تواضع کرتے تھے۔

میرؔ صاحب ایک دن ان کو ڈھونڈتے ہوئے پہنچے تو وہ صاحب اندر گئے اور ایک مٹّی کے ڈھکّن میں کچھ گڑ کے ٹکڑے لے کر میرؔ صاحب کے سامنے لا کر بیٹھ گئے۔ میرؔ صاحب بھی کھانے لگے اور میزبان بھی۔ میرؔ صاحب بھی روتے رہے اور ان کے میزبان بھی:

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں ۔۔۔ کل یہاں سرو و گل کے سائے تھے
پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ ۔۔۔ کتنے آنسو پلک تک آئے تھے
میرؔ صاحب رُلا گئے سب کو ۔۔۔ کل وہ تشریف یاں بھی لائے تھے

میرؔ صاحب نے شاعر اور شاعری کو جو آبرو بخشی ہے، جو احترام اور وقار اس کو بخشا ہے وہ اُردو شاعری میں کوئی نہ کرسکا۔ نہ غالبؔ، نہ اقبالؔ نے یا کسی اور نے۔ میرؔ صاحب نے اپنے بیٹے میر کلو عرشؔ کو وصیّت کی، زبان اور کردار میں اپنے سینے سے لگائے مر رہا ہوں۔ تو بھی اسے سینے سے لگائے مر جائیو۔ باپ نے کہا اور بیٹے نے سنا اور وہ بھی دونوں کو سینے سے لگائے مر گیا:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

میں نے ۱۹۶۵ء میں ایک غزل کہی تھی۔ بس کہہ دی۔ کیسے کہہ دی مجھے کوئی خبر نہیں اور پوری غزل کہہ دی اور ۱۹۶۶ء میں سیّد حامد صاحب جو دہلی کلاتھ ملس کے مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے، دوسرے دن مجھے اپنے گھر لے گئے۔ دستر خوان بچھایا، کھانا کھلایا اور فرمائش کی۔ میں نے وہی غزل پڑھ دی:

یہ طرزِ خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا — جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا
غزل میں کون نئی چاشنی چکھائے گا — اگر کلیم نہ ہوگا ، مزا نہ آئے گا
غموں کے بوجھ سے کانپے گا تھرتھرائے گا — مگر مزاج جو پوچھو گے مسکرائے گا
زمانہ لاکھ اسے تڑپائے گا، رُلائے گا — وہ مرثیہ نہ کہے گا، غزل ہی گائے گا
کوئی نہ دردِ جہاں کو غزل بنائے گا — یہ بوجھ اسی پر پڑا ہے وہی اٹھائے گا
اسی نے دل کو جلایا ہے روشنی کے لیے — جو دل جلا نہ سکا شمع کیا جلائے گا

وہ دُور دُور سے لگتا ہے اجنبی جیسا
قریب جا کے ملو گے تو پیار آئے گا

سیّد حامد صاحب چپ چاپ مجھے گھورتے ہوئے پوری غزل سنتے رہے اور اسی روز سے واقعی ان کو ایسا پیار مجھ سے ہو گیا کہ آج تک نہ چھوٹا۔ جہاں وہ گئے، سعودی عرب گئے، امریکہ گئے، اور میرے وہاں رہنے کی خبر ملی تو اہتمام سے آئے اور ملے یا بلایا اور ملے۔ ایک بار وہ پٹنہ خدابخش لائبریری میں ایک خطبہ دینے کو آئے۔ مجھے خبر نہ تھی۔ وہ لائبریری سے فارغ ہو کر گیارہ بجے شب میں میرے گھر آئے۔ اتفاق سے میں اس روز سو گیا تھا۔ وہ میرے ملازم کو ایک پُرزہ دے کر چلے گئے جس پر ان کا نام اور فارسی کا ایک شعر لکھا ہوا تھا۔ وہ شعر مجھے اس وقت یاد نہیں

آرہا ہے۔میں دوایک بار دہلی گیا اوران سے ملنے گیا۔خبرسن کرگھر سے باہرنکل آئے۔میں نے اپنے تمام مجموعوں اور کتابوں پرخود پیش لفظ لکھا ہے۔کبھی میں نے کسی سے درخواست نہ کی۔اس مجموعہ کی ترتیب کے دوران مجھے بڑی خواہش پیدا ہوئی کہ سیّد حامد صاحب سے کہوں کہ پچاس سال کی ملاقات کا تاثر لکھ دیجیے۔میں اپنی کتاب میں شامل کروں گا۔قاصد خبر لے کر آئے کہ وہ بالکل معذور ہوکر پلنگ تھام چکے ہیں۔نہ صاف بول سکتے ہیں نہ کچھ لکھ سکتے ہیں۔مجھے افسوس ہوااور میں نے ان کی صحت کی دعا کی۔تو یہ غزل جو میں نے ہر طرح کے ارادے اور نیت سے خالی الذہن ہوکر پچاس سال پہلے لکھی تھی اسے میں نے اپنے دوسرے مجموعہ غزل 'جب فصل بہاراں آئی تھی' کا پیش لفظ ختم کرکے اوّل صفحے پر ایک چوکھٹے میں 'دیباچہ' کی سُرخی کے ساتھ چھاپ دیا۔

میرے خیال میں کنہیالال کپور کے مضمون کی جو آخری سطریں ہیں، کنہیالال کپور نے تو یہ غزل نہیں دیکھی اس لیے کہ پہلا مجموعہ ۱۹۷۵ء میں چھپا اور یہ غزل ۱۹۹۰ء کی شائع شدہ مجموعۂ غزل میں ہے۔کنہیالال کپور کا محاکمہ سوچا سمجھا ہوا ایک تجربہ کار دُور اندیش اور فن آشنا نقّاد کا محاکمہ ہے۔یہ غزل فیضانِ سماوی ہے یا القا کیا ہوا ہے۔اس دور میں جو حضرات شعروادب اور نقد ونظر والے ہیں وہ اس غزل کو اور کنہیالال کپور صاحب کی پیشین گوئی کو کم ہی سمجھ پائیں گے اس پر لکھنا تو درکنار۔میں بھی اپنی غزل کی وضاحت کی کوشش نہ کروں گا۔کچھ اشارے کردوں گا جو آئندہ پیدا ہونے والی نسل کے کسی اہلِ نگاہ کو دعوتِ اظہار دے گی تو شاید وہ میری شاعری کا تجزیہ کرسکے۔اس دور کے ایک بہت بڑے نقّاد ڈاکٹر عبدالحق نے ایک مضمون شاید دس سال پہلے لکھا تھا جو کسی پرچے میں شائع ہوا تھا۔یہی وہ نوجوان ہیں جنھوں نے دہلی کلاتھ ملس کے ایک مشاعرے میں میری ایک غزل کے اس شعر پر:

وہی تو عمر میرے دردِ دل کی بھی ہوگی
تیرے شباب کا یہ کون سال ہے پیارے

مجمع میں کھڑے ہوکر کہا تھا۔''ستائیسواں سال ہے۔کلیم عاجزؔ صاحب۔''

وہی عبدالحق جب تیس سال بعد ایک مضمون مجھ پر لکھتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ''میں کراچی ایک مشن کی دعوت پر گیا تو معلوم ہوا کہ پاکستان میں تقریباً آٹھ ہزار مہاجر شعرا ہیں خدا جانے ہندوستان میں کتنے ہوں گے۔ان سب میں کوئی ایک شاعر بھی ایسا نہیں جس کے یہاں اتنے

بڑے عظیم حادثے جو تقسیم سے پہلے ہندوستان میں ہوئے، ہوں گے، جس نے کروڑوں انسانوں کو ایک ایسا زلزلے کی گرفت میں ڈال دیا، جس کے اثرات سے سڑسٹھ برس کے بعد بھی انسانیت چھٹکارہ حاصل نہیں کرسکی ہے، جس کے فن میں، شاعری میں، اتنے بڑے حادثہ کا کوئی حوالہ ہو۔'' انھوں نے مزید لکھا کہ ''قیامت میں ہندوستان کے شاعروں کی خدا اس سلسلے کی پرشش کرے گا، تو پورے میدان میں ایک شخص کھڑا ہوگا اور وہ ایک شخص پٹنہ کا کلیم عاجؔز ہے۔''

لیکن ڈاکٹر پروفیسر عبدالحق صدر شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی کو بھی مجھ پر لکھتے ہوئے صرف ایک ہی بات ملی جس کا ڈھنڈورا پوری نقد و نظر کی آبادی پیٹ رہی ہے کہ تقسیم کے حادثے نے کلیم عاجؔز کو شاعر بنادیا۔ میں نے جو غزل کا حوالہ دیا ہے اس میں بھی دوسرا شعر ہے:

غزل میں کون نئی چاشنی چکھائے گا
اگر کلیم نہ ہوگا ، مزا نہ آئے گا

وہ نئی چاشنی کیا ہے؟ غزل سینکڑوں شاعروں اور اہلِ فن وفکر نے پڑھی ہوگی، کسی کی رگِ تنقید نہ پھڑکی اور آج تک کسی کے مضمون کی ایک سطر میں بھی اس کی طرف کوئی حوالہ نظر نہ آیا۔ مگر ایک بار ایک معجزہ ہوا۔ ۱۹۸۶ء میں جدّہ میں اپنے ایک دوست کے یہاں مقیم تھا اور وہ بہار کے موضع دیسنہ کے میرے ایک نہایت مخلص قدر داں ڈاکٹر صلاح الدین کے بیٹے انجینئر احتشام الدین تھے جو مدینہ منورہ میں انجینئر تھے۔ میں ان کا مہمان تھا۔ ایک شب کو کھانے کے بعد ہم لوگ چند احباب تھے۔ احتشام صاحب نے ایک غزل کی فرمائش کی۔ اس مختصر سے حلقہ میں احتشام صاحب کا ایک چھ سات سالہ لڑکا بھی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے مطلع پڑھا:

یہ طرز خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا
جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا

پڑھ کر جب دوسرا مطلع میں نے پڑھا:

غزل میں کون نئی چاشنی چکھائے گا
اگر کلیم نہ ہوگا مزا نہ آئے گا

تو احتشام صاحب کا چھ سات سالہ لڑکا بے ساختہ کھڑا ہوکر تالیاں بجانے لگا۔
مضمون کھینچتا چلا جارہا ہے اور سامنے ایک وسیع لمبا چوڑا میدان ہے جسے مجھے طے کرنا

چاہیے تاکہ کنہیا لال کپور کی آخری سطروں میں ان کی چھپی ہوئی دل کی سچی آواز کو سطروں سے نکال کر آپ کے کان میں داخل کیا جائے۔ لیکن یہ بہت بڑا کام ہے۔ دوسروں کے لیے نہ ہو میرے لیے ہے، کیونکہ یہ مختصر پیراگراف میرے دل میں پوشیدہ خزانے کے قفل کی کنجی ہے۔

آج میں نے بیس صفحات لکھ دیئے ہیں، تھک گیا ہوں۔ آج مدینہ منورہ سے شام کو واپسی ہے۔ دن کے گیارہ بج گئے ہیں۔ آپ ایک نوّے سالہ مریض انسان کے قوائے جسمانی و ذہنی سے کتنا کام لینا چاہتے ہیں؟ آپ خود کیوں نہیں اُٹھتے۔ آپ کی علمی فنّی حرارت کیوں بیدار نہیں ہوتی۔ آپ کے پاس قوت ہے، صحت ہے، جوانی ہے۔ آپ کے پاس کتابیں ہیں، آپ کے گھروں میں کتابوں کی لائبریریاں ہیں جو آپ کی کمی، کوتاہی کی تلافی کر دیں گی۔ آپ کا حلقہ ہے، آپ کا گروہ ہے۔ آپ کی مجلس ہے، آپ کی انجمن ہے۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میری غذائیت کم ہے۔ میں بہت کم سوتا ہوں، میں مریض ہوں۔ روزانہ تین چار بار اپنے مرض کو قابو میں رکھنے کے لیے دوائیں کھاتا ہوں۔ فطری طور پر میری بصارت آپ جیسی نہیں ہے۔ اکثر یہ ہوجاتا ہے کہ میں کیا لکھ رہا ہوں، یہ میں دیکھتا نہیں۔ میری فکر، میرا عزم مجھے دھکیلتا ہے۔ میں بڑھنے لگتا ہوں۔ لیجیے میں قفل میں کنجی ڈالتا ہوں اور دروازہ کھولتا ہوں۔ میرے ساتھ آپ بھی آجایئے۔ آپ کو اندر داخل ہوتے ہی بہت کچھ نظر آنے لگے گا۔ آپ مجھ سے آگے بڑھ کر جاسکتے ہیں۔ بڑھ کر دروازوں پر دروازے کھولتے جایئے۔ یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ میں نے اپنی ذمہ داری بہت زیادہ ادا کر دی۔ میں نے اوپری عمارت کھڑی کر دی ہے۔ ایک ڈھے ہوئے مکان کے نقشے پر ایک پورا محل تیار کر دیا ہے۔ آپ اس محل میں گھومئے۔ اس کی مضبوطی، اس کا استحکام، اس کا ٹھوس پن، اس میں استعمال کیے ہوئے ایک ایک پتھر اور اس کی ایک ایک اینٹ آپ کے سامنے اپنے رازہائے دروں کے ساتھ سامنے کھڑی ہوجائے گی۔ آپ اسے ٹٹولیے، اس سے پوچھئے، اس سے ہم کلام ہوجایئے۔ یہ جان رکھتے ہیں، زندگی رکھتے ہیں، توانائی رکھتے ہیں۔ یہ اپنے متعلق بھی بتائیں گے اور آگے کے لیے نشاندہی بھی کریں گے۔ آپ اس کے دروازوں کو، اس کی کھڑکیوں کو، اس کے رنگ کو، اس کے روغن کو، اس کی چمک کو، آب و تاب کو کھلی آنکھوں سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ بقدر ضرورت خوردبین کی طرح استعمال بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے نقش و نگار کو دیکھئے جسے لیونارڈ داونسی (Leonardo da vinci) کی معرکۃ الآرا تخلیق

مونالیسا کو آج تک دیکھ رہے ہیں، بول رہے ہیں، لکھ رہے ہیں۔ اتنا نہیں تو تھوڑا ہی سہی۔ آپ بھی اس کی فنکاری پر دل اور نگاہیں جمائیے۔ دیکھئے میں پہلا دروازہ کھولتا ہوں۔

میں نے کئی جگہ لکھا ہے کہ میرا ایک موضوع ہے۔ ایک مقصد ہے۔ ایک پلاننگ ہے۔ یہ میرا بنایا ہوا موضوع، مقصد پلاننگ نہیں ہے، یہ میں نے بنایا نہیں ہے یہ بنا بنایا، طے شدہ اور منظور شدہ ہے۔ یہ مستقل طور پر میرے دل میں فٹ ہے۔ گڑھا ہوا ہے، کندہ ہے، اس موضوع، اس مقصد، اس پلاننگ کو اس شعر میں ڈھونڈو:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

یہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہزار ہا، لاکھ ہا برسوں سے جنگ ہو رہی ہے۔ کیا آپ یہ جنگ لڑ رہے ہیں؟ میں لڑ رہا ہوں، میں زندگی کی تمام صلاحیتوں، تمام قوتوں، تمام دَبی ہوئی مشق و ریاض سے پیدا کی ہوئی توانائیوں کو اس میں جھونک رہا ہے۔ میرا فن اس کسوٹی پر کسا جاتا ہے۔ اسی پر وزن ہوتا ہے۔ جو وزن پر نہیں آتا اُسے پھینک دیا جاتا ہے۔ فن میں تمام چیزیں ہیں، شاعری میں بہت لوازمات ہیں جن کے مجموعے کا نام فن ہے، شاعری ہے۔ آپ کی نگاہوں میں اس کے جتنے لوازمات ہیں۔ اسے پیش نظر رکھ کر اس کا مطالعہ کیجیے۔ خیالات، مشاہدات، تجربات، تخیلات، موسیقیت، اشاریت، اندازِ بیان، اسلوب، طرزِ اظہار، سادگی پرکاری، حقیقت نگاری، حسن بیان۔ آپ شاعری کی لغت لائیے، ان سب لوازمات کو اکٹھا کیجیے اور پھر میرا کوئی شعر لیجیے۔ آپ کو قسم ہے آپ کی دیانت داری کی، آپ کی انسانیت، آپ کی سچائی کی۔ آپ کو قسم ہے اپنے خالق کی، آپ کو قسم ہے اپنی تمام صلاحیتوں کی، آپ کو قسم ہے اپنے عقیدے کی، اپنے نظریات کی، اپنے ایمان کی، اپنے یقین کی، اپنے اعتماد کی، آپ ان سب کو اپنے ساتھ لے کر کسی شعر کو منتخب کیجیے اور پھر جانچئے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

اپنے تمام نمونوں سے اس شعر کی کسوٹی پر میرے کمزور، حقیر شعر کا جائزہ لیجیے کیا کمزور ہی سہی، نحیف ہی سہی، کیا یہ مقابلہ میرے شعر میں نہیں ہو رہا ہے؟

ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی لَو کی طرح سہی اور کمزور جنگ ہی سہی۔ اس جنگ سے بہت حقیر فتح یابی ہی سہی، کیا اس فتح یابی کا اظہار یا کم از کم جنگ جاری رکھنے کا عزم، ارادہ، ہمّت اور حوصلہ ظاہر نہیں ہو رہا ہے اور یہ فتح یابی کو پیغام کی طرح دعوت کی طرح، پوری انسانیت کو بھیجا نہیں جا رہا ہے؟ ابھی چلتے پھرتے ایک غزل ہوگئی ہے۔ اس کا مطلع سنیے اور اشعار بھی سن لیجیے:

تعلق اس سے ہے یاری نہیں ہے
کہ اس میں اب وفاداری نہیں ہے

ارے یہ شعر ہے یہ تو بات ہے۔ یہ تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں۔ تو شعر تو بات ہی ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے آپ ذرا کہہ کے تو دیکھئے۔ اگر آپ کے دل میں یہ موضوع، مقصد، پلاننگ اور مشین فٹ نہیں ہے تو آپ بھی ایسا سادہ صاف آسان شعر کہہ سکتے ہیں؟ کہہ کے ذرا دیکھئے۔

کم از کم ۱۹۴۹ء سے اس وقت ۲۰۱۴ء تک یہ بات سچ نہیں ہے؟ کیا یہ سچ ہندوستان میں نہیں؟ اُردو دنیا کے اکثر مقامات پر نہیں ہے؟ کیا سچائی کم ہوتی نہیں جا رہی ہے۔ محبت کم ہوتی نہیں جا رہی ہے۔ منافقت بڑھتی نہیں جا رہی ہے۔ قول و فعل میں تضاد بڑھتا نہیں جا رہا ہے۔ کیا انسانیت کو نقصان پہنچانے کی کوشش بڑھتی نہیں جا رہی ہے۔ دھوکا بڑھتا نہیں جا رہا ہے اور کتنے زاویے سے انسان بدل نہیں رہا ہے۔ وضع داری ختم ہوتی نہیں جا رہی ہے۔ یہ سب اور اس طرح کے بہت سے عیوب پیدا نہیں ہو رہے ہیں؟ کیا ان کی طرح شعریت، موسیقیت، اشاریت، حسنِ بیان اور سادگی کے ساتھ اشارہ کر کے برائی کو یا برائیوں کو شاعرانہ حسنِ بیان سے اس میں واضح نہیں کیا جا رہا ہے۔ کیا یہ کوشش اس میں پنہاں نہیں ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

یہ دُنیا انسان کی صفات کی جولان گاہ ہے، اس پوری کائنات کا جوہر چراغِ مصطفویؐ ہے۔ جو شرارِ بولہبی سے ستیزہ کار ہے۔ مجھے خدا نے بارہ سال تک چراغِ مصطفویؐ کے سامنے رکھا، اس کی محبت کی پوری جلن میرے سینے میں بھر دی اور پھر اس روشنی کو مجھ سے دُور کر دیا۔ اب میں ساٹھ سال سے اس روشنی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ اس کے چھیننے والی پہلے ایک شخصیت تھی۔ پھر وہ شخصیت ایک سماج میں منتقل ہوئی جو میرے ملک میں تھی۔ پھر اس سوسائٹی نے سارے عالم کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ پٹنہ کو بھی، بہار کو، پھر سارے ہندوستان کو، پھر سارے عالم کو۔ یہ ستیزہ کاری اپنے ملک میں بھی ہے، ایشیا میں بھی، یورپ میں بھی ہے، امریکہ میں بھی ہے۔ سارے عالم میں یہی ہو رہا ہے۔ میں نے اپنے پہلے مجموعے میں اس کی چنگاریاں بکھیر دی ہیں، ایمرجنسی جس دن

لگائی گئی ہے فوراً لکھا اور اسی دن اتفاق سے ریڈیو پر پڑھ دیا۔ رضا نقوی واہیؔ مرحوم کہتے رہے۔ نہیں عاجزؔ صاحب یہ غزل مت پڑھیے۔ مگر میں نے پوری قوت سے ریڈیو پر پڑھ دی:

غزل کہو کہ یہ موسم غزل کے قابل ہے
پکا پکا ہے کلیجہ ، دُکھا دُکھا دل ہے
کسی کے منہ میں زباں ہے نہ سینے میں دل ہے
یہ کس حسینۂ کافر ادا کی محفل ہے

بس یہ غزل ہے، یہ تغزّل سے بھرپور غزل ہے۔ غزل کی تمام تعریفیں اس میں الگ الگ بن کر گھلی ملی ہوئی ہیں۔ حقیقت، افسانہ، زندگی کی تنقید، موسیقیت، اشاریت، رمزیت غزل کے تمام لطیف اجزا کو لاؤ اور اس میں ان کو تلاش کرو، ایک ایک کر کے سب مل جائیں گے۔ یہ آواز اُردو شاعری کی ابتدا میں بھی تھی، درمیان بھی رہی، اب کھو گئی ہے۔ اب ڈھونڈنے سے کہیں نہ ملے گی۔ میرے یہاں آج بھی مل جائے گی۔ بقول کنہیا لال کپور: غزل کی وہ نئی جہت ہے جس نے کلیم کے ہم عصروں کو آواز دی ہے اور آنے والی نسلوں کو بھی۔

کلیم عاجزؔ کے ہم عصروں نے کان کھڑے کر دیئے مگر ان کو اس کا اتنا وقت نہیں ملا کہ وہ کھڑے ہوں۔ سوچیں اور پھر رُخ تبدیل کریں ارادہ کرتے ہی کرتے وہ میدان چھوڑ گئے۔ بعد کی آنے والی نسل کو اس صلاحیت سے آراستہ نہ کیا گیا۔ وہ پکار بھی نہ سمجھ سکی۔ کچھ سن گن لگی تو رفتار تھم نہ سکی، دوڑ بھاگ میں لگ گئی۔

آپ میرے اس مجموعے اور اس سے پہلے کے دو مجموعوں 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' اور 'جب فصلِ بہاراں آئی تھی' کی ایک ایک غزل لیں اور دُوربین لے کر دیکھیں کہ ایک آواز ایسی ملے گی جو کبھی میرؔ کے انداز میں، کبھی آتشؔ کے انداز میں، کبھی اقبالؔ کے رنگ میں اور اس کے علاوہ ہزاروں رنگ میں بڑے آب وتاب سے نمایاں ملے گی۔ ہر آواز کی سچائی اور تاثیر کا شبنمی پیراہن ایسے رنگ کا ہوگا، جو ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ لیکن روح ایک ہی ہوگی۔ یہ آپ کو اُردو کے کسی شاعر میں نہ ملے گا۔ کبھی اس کا رنگ یہ ہوگا:

جنھیں اہلِ شہرِ ستمگراں نہیں یاد کرتے دُعاؤں میں
مرا گھر بھی تھا کبھی دوستو! انھیں مرنے والوں کے گاؤں میں

یہ غبار کیسا بدن پہ ہے، یہ کیسے پھپھولے ہیں پاؤں میں
مرے حال کی انھیں کیا خبر جو کھڑے ہیں پھولوں کی چھاؤں میں
انھیں کیوں نہ جانِ غزل کہوں انھیں کیسے بھولوں دُعاؤں میں
مجھے شاعری جو سکھا گئی، اِک ادا تھی اُن کی اداؤں میں
غزل ان کے سامنے چھیڑیئے کبھی داد ان سے بھی لیجیے
یہ خطا اگر ہے تو کیجیے کہ مزا ہے ایسی خطاؤں میں

کبھی یہ رنگ بھی ہوگا:

کبھی ان کی بزم میں آگئے تو غزل انھیں کو سنا گئے
ہمیں اب بھی پیار انھیں سے ہے جو ہمارے دل کو دُکھا گئے
بس انھیں کے گیسوئے مشک بوکی، روِش روِش پر ہے گفتگو
یہ بہار آئی ہے باغ میں کہ بہار بن کے وہ آگئے
اُنھیں چشم لب کا فسوں رہا نہ خرد رہی نہ جنوں رہا
ابھی آئے تھے ہی وہ بزم میں کہ تمام بزم پہ چھا گئے

یہ اور ایسی سینکڑوں غزلیں جو ہندوستان کی اب تک کی واحد خاتون وزیرِاعظم پر بھی ہیں، ہندوستان کے مختلف دَورِاقتدار پر بھی، انگلینڈ کے ٹونی بلیئر اور امریکہ کے سینئر اور جونیئر مسٹر بش کے قامت پر بالکل فٹ نہیں ہو جاتیں؟

آپ تینوں کتابوں کے ایک ایک شعر پر انگلی رکھتے جایئے، غور کرتے جایئے، آپ کو راستہ ملے گا کہ ایک ایک شعر اپنے رنگارنگ پیراہن میں اپنی گوناگوں آواز میں اسی حسینۂ کافرادا کا جلوہ ہے جس کی ہم زبانی سب کررہے ہیں، جس کا جلوہ عالمگیر ہے کبھی وہ چمک کر ہندوستان میں کبھی چمک پر انگلستان میں ہے۔ کبھی امریکہ میں ہے، یہی افغانستان میں، عراق میں ہے، الیکشنوں میں مختلف پارٹیوں کی مختلف شخصیتیں بن کر جلوہ فرما ہوتی رہی ہے۔ ایسی شاعری کا مقابلہ کس کا دل گروہ ہے کہ کرے؟:

ہم جس میں ہمیشہ رہتے ہیں دہکی ہوئی غزلیں کہتے ہیں
اس درد کی بھٹّی سے ہوکر اوروں کا گزرنا مشکل ہے

اب پیار سے ہم کو مت روکو یہ پیار وہ دریا ہے پیارے
اِک بار جو اس میں ڈوب گیا پھر اس کا اُبھرنا مشکل ہے

اس تبصرے سے مہینہ دو مہینہ، چھ مہینہ نہیں، سال دو سال نہیں، صرف گرمی میں نہیں، سردی میں نہیں، خشکی میں نہیں، دریا میں نہیں، جنگل میں نہیں، صحرا میں نہیں ہر چپّہ زمیں پر، ساٹھ سال گزر سکتا ہے اور کس شور سے گزر سکتا ہے؟:

نام آتا ہے جب میرا ہوتا ہے خفا کوئی — کیا میں نے بگاڑا ہے پوچھے تو ذرا کوئی
اس شوخ کی ہے یہ بھی شوخیِ ادا کوئی — کرتا ہے بُرا کوئی بنتا ہے بُرا کوئی
بے درد حسیں تجھ سا ہم کو نہ ملا کوئی — اب بھی نہیں کوئی پہلے بھی نہ تھا کوئی

اور پھر یہ بھی کہے:

آیا ہے نہ آئے گا پھر ایسا مزا کیا — میں چھیڑوں غزل کوئی، تو ساز اُٹھا کوئی
محفل میں نہیں مجھ سا اب شیریں نوا کوئی — شک تجھ کو ہے گر کوئی جا ڈھونڈ کے لا کوئی

کیا آپ کو کسی دبستان میں ایسا چھوٹا یا بڑا شاعر ملا ہے۔ کوئی ایسا غزل گو نظر سے گزرا ہے یا اب اِس وقت ڈھونڈھ کے نکال سکتے ہیں، جس نے اپنی پوری شاعری کو ایک محاذ بنایا ہو، پیار کی جنگ کا ایک ایسا نقشہ بنایا ہو جہاں مستقل پیکار ہو رہی ہو۔ پیار کے ایسے ایسے ہتھیار استعمال ہو رہے ہیں، ایسے ایسے داؤں چل رہے ہوں، ساٹھ برس گزر جائے۔ کہیں تکان کا نام ونشان نہ ہو، نہ کوئی ہانپتا ہے، نہ تھکتا ہے، نہ لڑکھڑاتا ہے، نہ ڈگمگاتا ہے۔ تیور وہی ہے، پینترا وہی ہے، ایسی جنگ میرے علم میں نہیں ہے۔ دو ماہر جنگ آزما ہیں جو سامنے آ کے ڈٹے ہوئے ہیں۔ کیا کیا پردے اُٹھ رہے ہیں، کیا کیا نظر آ رہے ہیں، جتنی غزلیں اتنے مناظر، جتنے اشعار اتنے ہتھیار، جس کا کبھی تیور یہ ہو:

دل جگر ہوں گے لہو، جان کے لالے ہوں گے
کیا نہیں ہوگا، جہاں گیسوؤں والے ہوں گے
کیف و مستی میں وہی، سب سے نرالے ہوں گے
جن کی تقدیر میں ٹوٹے ہوئے پیالے ہوں گے
بچ بھی جائیں گے اگر آج ہم اِک قاتل سے
کل کسی دوسرے قاتل کے حوالے ہوں گے

کیا مرے دل کی طرح بھی کوئی ٹوٹا ہوگا؟
ساقی تو نے تو بہت جام اُچھالے ہوں گے

اور کبھی یہ للکار بھی آتشؔ کے لہجے میں:

کہہ دو کلیمؔ سے کہ اُسے آنا چاہیے — محفل اُداس ہے، کوئی دیوانہ چاہیے
چھیڑا ہے پھر ستم کا نیا ساز وقت نے — تازہ غزل پھر اس سے کہلوانا چاہیے
سامانِ زندگی جو فقیرانہ ہے تو ہو — تیور ہر ایک حال میں شاہانہ چاہیے
ساقی سے بھیک مانگتے ہو کیا شراب کی — اے دوست کچھ تو جرأتِ رندانہ چاہیے
بیباک تو ہے جس طرح پٹنہ میں اے کلیمؔ — ایسا ہر ایک شہر میں دیوانہ چاہیے

اور کبھی اس انداز میں شاعر کا تپاک اور تپشِ دل میرؔ کے رنگ میں یوں نمایاں ہوتی ہے:

کھیل ہی میں درد سے یاری لگی — ہم کو بچپن سے یہ بیماری لگی
چوٹ چاہے ہلکی یا بھاری لگی — ہر ادا ان کی ہمیں پیاری لگی
کچھ تو خود پیاری تھی اُن کی شخصیت — کچھ ہماری اس میں فنکاری لگی

بارہ اشعار کی غزل میں ہر شعر پڑھتے جائیے۔ صبر وضبط، طاقت وتوانائی، خاک ہو کر پاک ہونے اور پاک کرنے کا عزم ایسا ملے گا کہ آپ ڈھونڈتے رہیے، دُور دُور سفر کرتے رہیے، ایسا منظر کہیں نہیں ملے گا۔ کبھی خودی اور خود آگہی کا ایسا رنگ ہوگا:

ستم کشوں میں وفا کا شعار باقی ہے — دُکاں تو لُٹ چکی ہے کاروبار باقی ہے
ہزار شکر کہ اس دَورِ بے لباسی میں — ہمارا پیرہنِ تار تار باقی ہے
مجاہدانِ محبت نے کیوں کمر کھولی؟ — ابھی تو معرکۂ کار زار باقی ہے
دل اپنا کوئی دے اس کو تو کس بھروسے پر؟ — اب اس حسین کا کیا اعتبار باقی ہے؟

کلیمؔ پر یہ بھروسہ ہے، اور کبھی یہ آن بان دیکھئے:

کل کہتے رہے ہیں وہی کل کہتے رہیں گے
ہر دَور میں ہم ان پہ غزل کہتے رہیں گے
ہر صبح کو آتی رہے گی تازہ قیامت
ہر شام کو ہم تازہ غزل کہتے رہیں گے

وہ ہم کو بدلنے کو کہے جائے گا اور ہم
یہ شیوۂ گفتار بدل، کہتے رہیں گے
چھپ چھپ کے جو کرتے رہیں گے اہلِ سیاست
کھل کر سرِ بزم اہلِ غزل کہتے رہیں گے
ہر ایک قدم پر ہم اس آوارہ قدم کو
ہاں دیکھ کے چل دیکھ کے چل، کہتے رہیں گے

سینکڑوں غزلوں میں بات سچ کہنے کا سلیقہ اور اس سلیقہ کی سادگی اور پرکاری پر آپ کو حیرانی ہوگی کہ یہ ہم کہاں آ گئے ہیں:

گلوں میں رنگ بھرے، بادِ نو بہار چلے

اس کی فرصت اب کہاں؟

کہاں فرصت خوابِ راحت ہمیں اُٹھا فصلِ گل اپنا بستر اُٹھا
ہے چپ بیٹھنا شرطِ محفل اگر یہ بندہ تو اے بندہ پرور اُٹھا
اب اِک جوئے خوں جن سے اُٹھتی نہیں ان آنکھوں سے پہلے سمندر اُٹھا

ہزار آئینے، ہزار آئینہ خانے کا مشاہدہ آپ کو اس نگارخانے میں ہوگا۔ ایسا نگارخانہ جس میں شفق کی سُرخیاں خونِ جگر سے مات کھا رہی ہوں گی:

کیا کیا نہیں رکھا ہے غزلوں میں نہاں کر کے
جب چاہا چلے آئے سیرِ دو جہاں کر کے
چھیڑی ہے غزل میں نے خونِ دل و جاں کر کے
جاؤ کوئی لے آؤ آتشؔ کو جواں کر کے
تھی صنف غزل عاجزؔ بیمار و کہن سالہ
ہم از سرِ نو اس کو لے آئے جواں کر کے

یہ ہے کنہیا لال کپور کی دور بینی کہ کلیمؔ نے غزل کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ اِک نئے دبستان کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اس نے اپنے ہم عصروں کے لیے نئی راہیں کھولی ہیں اور بشارت دی ہے:

نہ ساتھ دیں گی یہ دم توڑتی ہوئی شمعیں
نئے چراغ جلاؤ کہ روشنی کم ہے

غور سے دیکھو کو تو آنکھ چندھیا جائے۔ کہیں اس جنگ میں، اس مقابلے میں آپ کو کوئی خطرہ محسوس نہ ہو۔ جی چاہتا ہوں کہ ہم بھی شامل ہو جائیں، ہم بھی دو دو ہاتھ کر لیں۔ درمیان میں جائیں تو ایسا لگے کہ ہمیں بھی چوٹ آ گئی ہے۔اس چوٹ میں درد بھی ہے اور مزا بھی۔

میں نے شاعری نہیں سیکھی۔ مجھے شاعری کسی نے نہ سکھائی، میرا کوئی استاد نہیں۔لیکن میں نے سب سے سیکھا، میرؔ سے، غالبؔ سے بھی، داغؔ سے بھی، آتشؔ اور ناسخؔ سے بھی۔ کسی کا رنگ مجھ پر نہیں چڑھا یا سب کا رنگ چڑھ گیا۔ میں کوئی قرآن لے کر نہیں آیا۔ مجھے رنگ و آہنگ سب سے ملا مگر ان کا امتزاج قدرتی ہے۔ یہ امتزاج فیضانِ سماوی نے دیا ہے۔ یہ ہنر انسان کے بس کا نہیں ہے۔ آگ، مٹّی، ہوا، پانی، اس کا امتزاج قدرتی ہے۔اس امتزاج سے کیا کیا بنا ہے، کیا کیا بن رہا ہے، کیا کیا بنے گا یہ نظر آیا ہے، نظر آ رہا ہے، نظر آئے گا:

دلِ پر خوں کی اِک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

یہ میرؔ نے نہیں بنایا ہے:

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ میں چلا

یہ سوداؔ نے نہیں بنایا ہے:

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

یہ غالبؔ نے نہیں بنایا ہے:

ملے مجھ سے تو فرمایا تمھیں کو داغؔ کہتے ہیں
تمھیں ہو ماہ کامل میں، تمھیں رہتے ہو لالے میں

یہ داغؔ نے نہیں بنایا ہے۔

ان سب کے بننے میں کیا کیا کارفرما ہے، یہ تجزیہ قلم نہیں کر سکتا۔تنقید یا تحقیق، حقیقت نہیں ہے، عکس ہے۔ میری بات یہ ہے کہ میں نے کہہ دیا کہ میں نے سب سے سیکھا ہے۔لیکن جو کہا ہے یا لکھا ہے وہ ان کا نہیں وہ میرا ہے۔ یہ کسی کی نقل نہیں ہے۔ کسی کا بہروپ نہیں ہے۔ کسی کی

تقلید نہیں ہے۔ تقلید جو ہوتی ہے وہ چھپتی نہیں ہے، ظاہر ہوجاتی ہے کہ یہ نقل ہے، یہ تقلید ہے۔ آپ میری شاعری کو تقلید نہیں کہہ سکتے۔

میں نے زبان ضرور سیکھی۔ میں نے میرؔ سے بھی سیکھی، غالبؔ سے بھی اور سب سے سیکھی اور اصل زبان میں نے اپنی خالاؤں سے، اپنی چچیوں سے، اپنی ممانیوں سے، اپنی چچیری، پھوپھیری، خلیری بہنوں سے سیکھی۔ بیج انھوں نے ہی بویا، پودے میں انھیں کا لہو ہے۔ رفو نانی، رفیعہ خالہ، خدیجہ خالہ، حسنیٰ خالہ، درگاہن خالہ یہ سب میری زبان کا خمیر بنانے والی ہیں۔ ڈھانچہ مجھے میر قمرالدین قمرؔ، میر محمد حسین جاہ، (مصنّفین طلسم ہوش رُبا) خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی، ملا رموزی، فرحت اللہ بیگ، مرزا شفیع سے ملا۔ اس میں روح میری نانی، میری ماں، میری خالہ، میری چچیوں اور بہنوں نے ڈالی ہے۔ ڈھانچہ زندہ ہے، تو اس میں روح پورے آب و تاب سے جاری وساری ہے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں میرؔ کو پڑھ کر بھی بےخود ہوتا ہوں، غالبؔ کو پڑھ کر بھی جھومتا ہوں، اقبالؔ کو پڑھ کر بھی مست ہوتا ہوں۔ مومنؔ، شادؔ، عزیزؔ، فانیؔ سب مجھے کیفیت عطا کرتے ہیں۔ لیکن میں جب گنگناتا ہوں:

آج سُہانی رات ہے چنداتم اُگیو

تو میں کانپ جاتا ہوں اور کبھی رونے لگتا ہوں۔ میری خالہ، میری ممانی، چچی جھما کے ساتھ سامنے کود پڑتی ہیں اور میں اُن کی گود میں چلا جاتا ہوں۔ جیسے میں چشمۂ حیواں میں داخل ہوگیا۔ ان حالات میں نئی جوانی، نئی توانائی حاصل کر رہا ہوں۔ مجھے ان کی زبانی سنے ہوئے گیت بہت یاد تھے۔ میں گنگناتا تھا اور مچلتا تھا۔ یہ اب بھی کبھی کبھار ہوتا ہے۔ اب دنیا نے میری چاروں طرف بہت گھیرا کرلیا ہے۔ اس گھیرے سے نکلنے میں مجھے دیر لگتی ہے۔ میں نکل آتا ہوں۔ اب بھی مجھے گیت یاد ہیں۔ میں گنگناتا ہوں اور اپنے محلے میں پہنچ جاتا ہوں۔ رفو نانی، رفیعہ خالہ، خدیجہ خالہ اور بہت سی خالاؤں اور ممانیوں کے جمگھٹ میں پہنچ جاتا ہوں:

میں وہی گاؤں کا کلوا ہوں، نہ عاجزؔ، نہ کلیمؔ
میری بیداد گری نے میری شہرت کردی

مجھے اب بھی کلیمؔ یا عاجزؔ سے زیادہ کلوا پسند ہے۔ میرا سن میرے پیچھے چلا جاتا ہے اور میں جوان ہوجاتا ہوں۔ میں نے کشتی سیکھی، سپہ گری سیکھی، موسیقی سیکھی، سازندگی سیکھی، شاعری نہیں

سیکھی۔ کشتی، سپہ گری، سازندگی، موسیقی سب چھوڑ کر چلی گئی جو سیکھا وہ سب چلی گئی جو نہیں سیکھا وہ رہ گئی جانے والیاں سب کچھ اسی کو دے گئیں:

یہ ستم کی محفلِ ناز ہے کلیم اس کو اور سجائے جا
وہ دِکھائیں رقصِ ستمگری تو غزل کا ساز بجائے جا
جو اکڑ کے ناز سے جائے ہے اسے پیار سے یہ بتائے جا
کہ بلندیوں کی ہے آرزو تو دِلوں میں پہلے سمائے جا
ترا سیدھا سادہ بیان ہے، تیری ٹوٹی پھوٹی زبان ہے
ترے پاس ہیں یہی ٹھیکرے تو محل انھیں سے بنائے جائے
جو وہ زخم دیں سو قبول ہے تیرے واسطے یہی پھول ہے
یہی اہل دل کا اصول ہے وہ رُلائے جائیں تو گائے جا

یہ سب کبھی ایک جگہ ملیں گے۔ کبھی نمایاں یا پنہاں جلوے، ہر جگہ ملیں گے، ہر غزل میں ملیں گے۔ میں یہی کہتا ہوں، کیا آپ ایسے نمونے پیش کر سکتے ہیں؟

میں نے تاریخ کا اِک ایک ورق دیکھ لیا — مجھ سا دُنیا میں کوئی درد کا مارا نہ ہوا
درد والوں میں تری بات کا چرچا ہے کلیم — لوگ کہتے ہیں کہ ایسا سخن آرا نہ ہوا

جب کبھی ایسے اشعار یا اس قسم کا مقطع میں نے کہا تو میرے ذہن یا شعور کے کسی گوشے میں بھی کسی نوعیت کا فخر کا وجود محسوس نہیں ہوا بلکہ رونا آیا کہ ہم ہی ایسے بدقسمت ہیں جن کے زندگی میں تمام عمر کا رونا ہی لکھا ہے:

عمر بھر پیار کیا جس کو وہ پیارا نہ ہوا — ہم تو اس کے ہوئے لیکن وہ ہمارا نہ ہوا
کتنا زخموں کے چراغوں سے سجایا دل کو — پھر بھی کمبخت کسی آنکھ کا تارا نہ ہوا
کاروبارِ دل و جاں راس نہ آیا ہم کو — کوئی سودا نہ ہوا جس میں خسارا نہ ہوا

تو اکثر یہی خیال ستاتا رہا کہ دردمندی، دل فروزی، دل سوزی، دل خراشی مظلوموں ہی کی قسمت میں کیوں ہے؟ یہ فقیری کی زینت کیوں ہے، یہ مسند شاہی پر کیوں نہیں بیٹھتی۔ چھپر کھٹ پر کیوں نہیں سوتی، قبائے زرتار، اطلسی دستار میں یہ کیوں نہیں جھومتی۔ یہ بھی نہیں ہے۔ میں پھٹے پرانے میں رہتا ہوں، میلا کچیلا رہتا ہوں، وضع داری میری وراثت ہے۔ دس بارہ سال کی عمر سے

شیروانی، جوتا، مخملی ٹوپی چلتی رہی۔ وضع داری تھی، صاف ستھرا لباس، صاف ستھری زندگی، صاف ستھرا حال، صاف ستھرا عمل، گھر میں کھرہری پلنگ پر ہاتھ سرہانے دھر کے سو رہا۔ آج میں جبکہ میرے بچے کوئی اعلیٰ ڈاکٹر، کوئی اعلیٰ پروفیسر، کوئی اعلیٰ انجینئر ہے، میرے دل میں کسی نوعیت کی کوئی چاہت نہیں۔ چالیس برس سے ایک چوکی میری بساط ہے۔ اس پر سوتا ہوں، اسی پر کھانا تناول کرتا ہوں، اسی پر نماز پڑھتا ہوں، اس پر بیٹھے بیٹھے ادب شاعری کے دھویں اُڑاتا رہتا ہوں۔ کلکتہ میں رہا، کسی شان کے شہر میں رہا۔ اب بھی سال کے چار پانچ مہینے بیرون میں گزارتا ہوں۔ اپنی بہن بھانجیوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ ہوائی جہاز میں اُڑتا ہوں، اعلیٰ کار پر پھرتا ہوں، مگر وہی لٹھے کا پاجامہ، ململ کا کرتا، مخملی ٹوپی، چپل یا کوئی معمولی جوتا مگر سب ہیں ایک خاص وضع کے۔ یونیورسٹی میں پڑھا، یونیورسٹی میں پڑھایا۔ کبھی پینٹ نہیں پہنا، کبھی شرٹ کوٹ سوٹ بوٹ نہیں پہنا۔ گورنمنٹ نے گاڑی بھی دے رکھی ہے۔ اس پر بہار سرکار لکھا ہوا ہے۔ سُرخ بتّی چکر کاٹتی رہتی ہے مگر دل میں کوئی شائبہ تمکنت کا نہیں۔ چونکہ گاڑی مجبوری ہے، کمزور ہو گیا ہوں، رِکشے پر نہیں چڑھ سکتا، نہیں اُتر سکتا۔ گاڑی کی سہولت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ مگر سرکاری گاڑی پر آتے جاتے، کبھی سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے کی نہ ہوس، نہ خواہش، نہ جرأت، بلکہ گاڑی پر چلتے ہوئے اپنے کو جھکا لیتا ہوں، سیٹ پر لیٹ جاتا ہوں۔ کوئی مجھے دیکھے نہیں۔ یہ نہ سمجھے کہ:

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

نہ کسی وقت اپنے شاعر یا ادیب ہونے پر سر اونچا کر کے چلنا مطوعِ خاطر ہوا۔ تو ہر حال میں بظاہر و باطن فقیر ہوں، خود کو گناہ گار اور مظلوم سمجھتا ہوں۔ پدم شری ملنے پر صدرِ ملک کے سکریٹری کا خط آیا۔ راشٹر پتی کے آپ مہمان ہوں گے۔ ایک روز قیام رہے گا۔ دوسرے دن راشٹر پتی آپ کو مڈل پیش کریں گے۔ میں نے لکھ دیا میں دوسرے راشٹر پتی کے دربار میں جا رہا ہوں میں نہیں آ سکوں گا۔ یہ مسکینیت، یہ فقر، یہ بے نیازی، یہ استغنا اُردو کا فیض ہے۔ محبت اور اُردو دونوں سگی بہنیں ہیں۔ یہ فقیروں کی کٹیا میں رہتی ہیں۔ تکیۂ فقیری ہی اس کی راجدھانی ہے۔ اس کا لباس ہے۔ اس کی خاص وضع ہے۔ یہ پنڈتوں کو بھی، اچھوتوں کو بھی چاہتی ہیں۔ اس نے ایک وضع اپنوں کو دی۔ اسے شیروانی چاہیے، پاجامہ چاہیے، ٹوپی چاہیے۔ یہی اس کی ریاست ہے۔

جسے دیکھو سوٹ بوٹ، جیب میں کاغذ کی گھڑی اڑاتے پھرتا ہے۔ یہ رتن ناتھ سرشارؔ کون ہیں، یہ آنند نرائن ملاؔ، یہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفیؔ ہیں، یہ گوپی ناتھ امنؔ ہیں، یہ دیانارائن نگم ہیں، یہ پنڈت سندر لعل ہیں، یہ چکبستؔ ہیں، یہ میلا رام وفاؔ ہیں۔ یہ پنڈت لبھو رام جوشؔ ہیں، یہ بال مکند عرشؔ ملسیانی ہیں، یہ مالک رام ہیں، یہ جوشؔ ہیں، یہ جگرؔ ہیں، یہ فانیؔ ہیں، یہ خواجہ حسن نظامی ہیں، یہ ملا رموزی ہیں، یہ ملاّ واحدی ہیں، یہ فرحت اللہ بیگ ہیں، یہ خواجہ محمد شفیع ہیں۔ یہ نذیر احمد ہیں۔ اُردو ان کے بغل میں رہی، ان کے بازو میں رہی۔ جب سکریٹری صاحب نے، صدر صاحب نے، شاعر صاحب نے، ادیب صاحب نے، پروفیسر صاحب نے سوٹ بوٹ اختیار کیا۔ یہ پہلو سے اُٹھ کر نکل گئی:

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

یہ اُردو کے اپنے کہاں رہے، یہ تو اُردو کے پرائے ہیں:

جب سے دلِ زندہ تو نے چھوڑا ہم کو
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

پروفیسر رالف رسل لندن یونیورسٹی کے صدرِ شعبہ پٹنہ آئے۔ شاید خدا بخش لائبریری میں ان کی تقریر ہوئی۔ میر ضاحکؔ پر لکچر دینے کو آئے تو ہم سب مبہوت ہو کر رہ گئے۔ حسین نوجوان سُرخ سپید چہرہ، سیاہ شیروانی، سیاہ ٹوپی، سفید پاجامہ، سلیم شاہی جوتا، لکچر دینے لگا تو معلوم ہوا کہ واجد علی شاہ کا پوتا واجد علی شاہ کی غزل پڑھ رہا ہے۔ لندن یونیورسٹی کے دوسرے استاد پروفیسر ڈیوڈ میتھیو سے ڈھاکہ میں ملاقات ہوئی۔ شیروانی، پاجامہ، ٹوپی میں آ کر بغل میں بیٹھ گئے۔ پان کا سلوری ڈبّہ کھول کر مجھے پان بڑھایا۔ تھوڑی دیر کے بعد پیچوان آیا اور حقہ لینے لگے۔ اُردو وہاں سے یہاں آ کر ان کی کروٹ میں بیٹھ گئی۔ اُردو عزّت چاہتی ہے، محبت چاہتی ہے، پیار چاہتی ہے۔ اُردو کے دشمنوں کا چہرہ اختیار کرو گے تو اُردو تمھارے پاس کیسے رہے گی۔ ہر چیز اپنے مخصوص ماحول میں نشو ونما پاتی ہے۔ مخالف ماحول میں زندہ نہیں رہے گی، اس کی خوشبو اُڑ جائے گی، اس کا رنگ ہوا ہو جائے گا۔ اُردو کا ڈھول پیٹا کرو، اور ڈھول نہیں۔ یہ بارات نہیں ہے، یہ دُلہن ہے، یہ بہن ہے، یہ ماں ہے، ماں بہن بیوی کی عزّت اِسے دو گے تو اس سے جہانگیر بنو گے اور نور جہاں کا ہاتھ تمھارے کندھے پر رہے گا۔ تم باہر رہو گے تو اندر سے اُردو تمھاری آنکھوں میں رہے گی۔

تمھارے دل میں رہے گی، تمھاری سانسوں میں رہے گی۔ ہر طرف اُردو تمھیں گھیر لے گی۔ تم نوشاہ رہو گے ورنہ اُردو تم کو نکال پھینکے گی۔ رانڈ بھڑوئے بن کر اُردو کی ڈفلی بجایا کرو گے۔ مانگ چانگ کر کھاؤ گے۔ اُردو سر کا تاج ہے جو سر پر رہے گی تو یہ اپنی چمک دمک سے دُشمنوں کو بھی اپنے آگے جھکائے گی۔ لوگ عزّت اور خوشنمائی کی تم سے بھیک مانگیں گے۔ ورنہ تم بھیک مانگو گے۔ ہم کو اُردو پڑھاؤ، ہم کو ٹیچر دو، ہم کو گریس مارک دو، ہم کو روزی روٹی دو، ہم کو ریزرویشن دو۔ اُردو کے بادشاہ ٹھوکروں میں رہیں گے، بھیک مانگیں گے اور کھائیں گے۔ غیروں کے لباس میں، غیروں کے خیال میں، غیروں کی زبان میں بات کریں گے۔ بات بات پر انگریزی کوٹیشن دیں گے۔ ان کا خیال، ان کا عقیدہ، ان کا نظریہ اُردو بنا کر پیش کریں گے تو جن سے عقیدہ ہوگا، جن سے تعلق ہوگا، جن کے گیت گاؤ گے انھیں کے کہلاؤ گے۔ اُردو کا نام رہے گا تو نام سے کہاں کام چلتا ہے:

بازارِ مصر میں آ یوسف کا سامنا کر
کھوٹے کھرے کا پردہ اُٹھ جائے گا چلن سے

سو اُٹھ رہا ہے، تم جو چاہے کہلاؤ، اُردو والے نہ بنو گے۔ اُردو اس دھوکے کی ٹٹّی میں کیسے بند رہے گی۔ تمام جدید اُردو کے نام لینے والوں سے، شاعروں سے، ادیبوں سے، محققین سے، ناقدین سے عرض کر دوں گا۔ اُردو کو اس دھوکے کی ٹٹّی سے نکالو، اسے آنکھوں سے لگاؤ۔ سر پر بیٹھاؤ تو یہ دوسروں کو تمھارے قدموں میں جھکا دے گی۔ ورنہ سب نقلی رہے گا۔ کتابیں لکھو گے، گورنمنٹ کے تعاون سے چھپواؤ گے، خود ہی پڑھو گے یا ایک دوسرے کی نذر کر دو گے۔ آپس میں ایک دوسرے کو حاجی کہو گے۔ ”من ترا حاجی بگویم تو میرا حاجی بگو“ ذرائع استعمال کر کے گورنمنٹ سے رائلٹی لو گے۔ اپنی معاش چلاؤ گے۔ اپنا نام کماؤ گے۔ یہ بھی از قسم معاش ساتھ دے گی۔ مختلف لوگ مختلف قسم سے کمائی حاصل کر رہے ہیں۔ یہ بھی چند لوگوں کے لیے کمائی کا ذریعہ تھوڑے دن تک رہے گا۔ آخر ڈھول کا پول کھل جائے گا۔ بہت کچھ کھل چکا ہے۔ جو ہے وہ بھی کھل جائے گا۔

جدید اُردو، جدید اُردو ادب، جدید اُردو شاعری یہ سب اصطلاح غیروں کی دی ہوئی ہیں۔ ہمارے دُشمنوں کے ایجنٹوں کے عطا کردہ ہیں۔ قطب شاہ ملا وجہی سے لے کر قدیم جدید کی کوئی

تقسیم نہیں تھی۔ بیج سے پودا، پودے سے درخت یہ فطری نشو ونما ہے۔ ہر آج کل سے جدا ہوگا یہ تو فطرت کا خاصہ ہے۔ قدیم وجدید کی اصطلاح ہماری داخل کی ہوئی ہے۔ موسم میں گھٹاؤ بڑھاؤ ہوتا رہے گا۔ بعض اجزا کم وبیش ہوں گے تو فرق ہوگا۔ یہ فرق آتا رہے گا، جاتا رہے گا۔ کھانا غلط ہوگا تو صحت میں فرق آئے گا۔ پھر اعتدال پر آیا تو صحت ٹھیک ہوجائے گی۔

محبت اخوت، روشنی اندھیرا، سردی گرمی، یہ ساری چیزیں ہیں، اس میں فرق ہمارے اعمال اور ہمارے غلط یا صحیح استعمال سے ہوگا۔ اعمال پھر معتدل ہوجائیں گے تو پھر فرق مٹ جائے گا۔ فرق کا نظریہ اور ہے۔ انسانوں کے کمال سے سب نے فائدہ اٹھایا اور اٹھاتے رہیں گے۔ اب کہیں خدا کا غلبہ ہے، کہیں شیطان کا غلبہ، تو فرق آ گیا۔ مشرق نے پوری سرزمین کی تقدیر بدل دی۔ شیطان سوار ہوا۔ مغرب نے ان کی الگ راہ نکالی۔ یہ بغاوت کی راہ ہے۔ مغرب کے پاس بے پناہ طاقت ہے۔ وہ سچ کو جھوٹ، جھوٹ کو سچ ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس کے پاس غلط چمک دمک ہے۔ ہم اس چمک دمک پر نہیں جاتے۔ ہم اگر اس کے پیرو رہیں گے تو ہمارے صراطِ مستقیم میں فرق آئے گا۔ میں کوئی فلسفی نہیں، کوئی تاریخ داں نہیں، سمجھانے کو نہیں بیٹھا ہوں۔ لیکن بات ٹھیک کررہا ہوں اور اکثر یہ سمجھتے ہیں کہ بات ہی ٹھیک ہے۔ مگر:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ابوجہل سچ جھوٹ خوب جانتا تھا مگر بات کی پکڑ نے اسے جھکنے نہیں دیا۔ یہ معاملہ قیامت تک چلتا رہے گا۔ میں بس اتنا ہی کہوں گا۔ بحث کا دروازہ نہیں کھولوں گا۔

آج سے پچپن سال پہلے بی این کالج کے سالانہ مشاعرے میں میں نے غزل پڑھی:

فصلِ گل آتی رہی جاتی رہی — آرزو دامن ہی پھیلاتی رہی
ہوشیاری کا تقاضہ تھا کچھ اور — بے خودی کچھ اور سمجھاتی رہی
دوست مرے حال پر روتے رہے — اور مجھے ان پر ہنسی آتی رہی

پوری غزل اسی نوعیت کی ہے۔ تو بی این کالج کے شعبۂ نفسیات کے بنگالی صدرِ شعبہ ڈاکٹر ہالدار کھڑے ہو کر بولے:

"I never heard such a poetry and scuch a music"

ان کی بنگالی بیوی بھی شاعرہ تھیں۔ دونوں بے حد مدح خواں بن گئے۔ ایک سال پہلے میں نے غزل کہی۔ ایک سال میں پچاسوں بار اس کو گنگنا تا رہا ہوں اور کبھی رونے لگا ہوں:

کھیل ہی میں درد سے یاری لگی ہم کو بچپن سے یہ بیماری لگی
چوٹ چاہے ہلکی یا بھاری لگی ہر ادا اُن کی ہمیں پیاری لگی
کچھ تو خود پیاری تھی اُن کی شخصیت کچھ ہماری اس میں فنکاری لگی
ہائے وہ مستی شروعِ درد کی کام کی ہر بات ناکاری لگی
ہم نہ سمجھے، سب نے سمجھایا بہت ہم کو ناسمجھی سمجھ داری لگی
اب تسلّی کا تحمل بھی نہیں دل دِہی ہم کو دلآزاری لگی
مجھ اکیلے پر ہی گزرا وہ ستم جس میں دُنیا بھر کی تیاری لگی
کہنے بیٹھے شاعری کا ہم سبب اور اِسی میں زندگی ساری لگی
ہوگئی بلبل غزل خواں میرے ساتھ اس بے چاری کو بھی چنگاری لگی
ہائے بچپن سے بڑھاپا آ گیا وہ نہیں چھوٹی جو بیماری لگی

اب بھی ہر شعر پڑھتے پڑھتے رو دیتا ہوں۔ مسٹر شمس الرحمٰن فاروقی یہ غزل سنیں گے تو بول اُٹھیں گے: ''اب تک اُردو شاعری میرؔ و سوداؔ کے حلقے سے باہر نہیں آئی ہے۔'' اس لیے بول اُٹھیں گے کہ انھیں میرؔ و سوداؔ کے حلقے سے باہر کا منافع مل رہا ہے اور وہ اس حلقے میں داخل ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ سوال ان کے مرنے جینے کا ہے اور ہر شخص ہر حال میں جینے کا خواہش مند ہے، مرنے سے ڈرتا ہے۔ جس کے لیے میرؔ نے کہا (مرزا علی بیگ عشرتی):

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے ایک ہاتھ پر چاند رکھ دو اور دوسرے ہاتھ پر سورج، مگر اس عشق سے میں باز نہ آؤں گا۔ یہ بیماری بچپن سے لگتی ہے تو موت کے بعد ہی ختم ہوتی ہے۔ جس میں:

خرد کا نام جنوں پڑ گیا ، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اور ایسے تمام صحت مند نظریے اس غزل میں چھپے ہوئے ہیں جس کے استقبال کو خالقِ کائنات کی آغوش ہمیشہ کشادہ رہتی ہے۔لیکن اس دَور میں:

چلے ہے کون اب اتنا سنبھل کے
کہ ٹھوکر کھائے اور ساغر نہ چھلکے

جس کے لیے کسریٰ کے تاج کو ایک سپاہی ٹھوکر مار دیتا ہے کہ جس تاج نے کسریٰ کے سر کو فائدہ نہیں پہنچایا وہ مجھے کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ جس کے لیے طارق بن زیاد نے سمندر کے کنارے کھڑے ہوکر یہ کہا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس سمندر کے بعد بھی انسانوں کی بستی ہے تو سمندر میں گھوڑا ڈال دیتا۔ یہ مرض بچپن سے لگتا ہے اور موت آنے تک نہیں چھوٹتا:

ہائے بچپن سے بڑھاپا آ گیا
وہ نہیں چھوٹی جو بیماری لگی

یہ ہائے وہ تان ہے جس کے لیے فرشتے گوش برآواز رہتے ہیں۔ یہ وہ نگاہِ مومن ہے جس سے تقدیر بدل جاتی ہے۔ یہ تمام باتیں آج انسانوں سے اوجھل ہیں۔ یہ تصویریں کئی بار بدل چکیں۔

یہ غزل جو میں نے لکھی، شاید میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ اب یہ فلسفۂ زندگی اور اُسلوبِ زندگی عام طور سے انسان بھول چکا ہے۔ اس لیے یہ انجان اور کسی حد تک ناپسندیدہ نظر آئے گا:

عشق میں موت کا نام ہے زندگی　　　جس کو جینا ہو مرنا گوارہ کرے

یا بقول اقبالؔ:

نشانِ مرد مومن با تو گویم　　　چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

یہ وہ زندگی ہے جو اس پوری کائنات کو بہترین تخلیق مانتی ہے۔ یہ وہی عشق ہے جس کی ایک جست زمین و آسمان کو طے کر لیتی ہے۔ یہ وہ مرض عشق ہے جس پر زندگیاں قربان ہوتی ہیں۔ یہ وہ جنون ہے جو آتش کدۂ نمرود میں بے تحاشا کود پڑتا ہے۔ خدا کے باغیوں نے اُسے پاگل پن کہا ہے۔ یہ وہی مرض ہے جس کی طرف میرؔ نے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

اور یہ کہا ہے:

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں　　　تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

اور یہ کہا ہے:

تمنّائے دل کے لیے جان دی　　　سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے

جس کے لیے میرؔ نے آصف الدولہ کی سیم وزر والی ہم نشینی کو لات مار دی۔ جسے وہ کہتے ہیں:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

جس کے متعلق اقبالؔ نے کہا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جس کے متعلق کہا گیا ہے:

دریں دریائے بے پایاں، دریں طوفانِ موج افزا
دل افگندیم ، بسم اللہ مجریہا و مرساہا

جسے حسرتؔ موہانی یوں کہتے ہیں:

دِلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد　　　خدا جنوں کا ترے سلسلہ دراز کرے

....

درد والوں میں تیری بات کا چرچا ہے کلیمؔ
لوگ کہتے ہیں کہ ایسا سخن آرا نہ ہوا

کیوں نہیں ہوا؟ بھائی میں کیا جانوں کیوں نہیں ہوا؟ انھیں کہنے والوں سے پوچھو، مجھ سے پوچھو گے تو میں اتنا ہی کہوں گا کہ یہ معاہدہ مجھ سے ہوا تھا اوروں سے نہیں ہوا تھا۔ مجھ سے معاہدہ میرے خالق نے میری روح سے کیا تھا۔ جیسے خالق نے عالم ارواح میں تمام پیدا ہونے والی روحوں سے کیا تھا۔ ''کیا میں تمھارا ربّ اعلیٰ نہیں ہوں؟'' تمام روحوں نے کہا بیشک آپ میرے رب اعلیٰ ہیں۔ اللہ نے یہ معاہدہ کر کے چھوڑ دیا۔ مجھے نہیں چھوڑا۔ چونکہ اللہ نے اپنی منشا کے مطابق اس معاہدہ کو پورا کرانے کے لیے مجھے اپنی منشا کے مطابق چلایا، پھرایا، رُلایا، جلایا، کھپایا، گرایا، اٹھایا۔ ایک جنت بنائی، مجھے دِکھائی اور پھر ایک دن اس جنت کو لپیٹ سپیٹ کر خاک و

خون میں ملایا۔ جلایا، ہوا میں اُڑا دیا اور مجھے کھڑا کر دیا کہ اب تو پھر اُسے تعمیر کر۔

جس دن وہ جنت مٹائی گئی اس کے دوسرے ہی دن مجھے اس خاکستر کی سیر کرائی کہ اب تو اس خاکستر میں وہ گمشدہ جنت ڈھونڈ کر نکال اور سارے عالم کو اس کی سیر کرا۔

اب میں اسی خاکستر کی طرف جا رہا ہوں۔ ۵ر نومبر ۱۹۴۶ء کو وہ جنت مٹائی گئی اور ۶ر نومبر ۱۹۴۶ء کو اُسے ڈھونڈ کر نکالنے کے لیے مجھے تلہاڑہ کی طرف روانہ کیا۔ چند روز میں پٹنہ میں رہا۔ اس دوران قیامت ہوئی۔

راستے میں چمر بیگہ ملا، محی الدین پور ملا، کرڑ واندی کے بعد ہم لوگ کٹھارندی کے قریب آئے تو آگے پگڈنڈی آنے والی تھی۔ اس لیے ٹرک، اس کے ڈرائیور اور رجمنٹ کے ایک جوان کو وہیں چھوڑ کر ہم آگے بڑھے اور پل پر سے گزرتے ہوئے کٹھارندی کو دیکھا۔ یہ کیا ہوا؟ کٹھارندی! میں جب تجھ سے گزرتا تھا تو تیری موجیں زور زور سے اُٹھنے لگتی تھیں، جیسے تو مجھ سے ملنے کے لیے بے قرار ہے۔ تیرے بلبلے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھتے تھے۔ جلدی جلدی پلک جھپکاتے تھے کہ کوئی جلوہ رائیگاں نہ ہو جائے۔ جوش سے تیرا سینہ اُبھرنے لگا تھا۔ اے کٹھارندی! آج تجھے کیا ہوا۔ تیری سطح بے نور کیوں ہے۔ تیری آنکھوں کی چمک کو کیا ہو گیا۔ تیری سطح کا اُتار چڑھاؤ بند کیوں ہو گیا؟ اُٹھ اے ندی اُٹھ، اُٹھ مجھ سے مل۔ ندی آنکھ بند کیے سوئے رہی۔ اے کٹھارندی کیا تو زندہ نہیں ہے؟ کیا تیری روح پرواز کر گئی۔ میں دل تھامے بڑھا کہ بستی کی طرف سے تیز ہوا شپاشپ آنے لگی۔ میرے دامن سے لپٹنے لگی میرے بدن میں گھسنے لگی، میرے کانوں میں سنسانے لگی۔ کچھ سرگوشیاں کرنے لگی۔ جیسے بے تحاشہ کچھ بولنا چاہ رہی ہو۔ میرے کانوں میں داخل ہونے لگی۔ بے تحاشہ سسکیوں کے لہجہ میں ہوا بولنے لگی۔

آ، اے میرے بدیسی ساتھی آ۔ تو ایک مہینے پر آ رہا ہے مگر ایک قیامت گزرنے پر آ رہا ہے۔ آ مجھ سے مل۔ اے میرے رات دن کے ساتھی۔ میرے ساتھ کھیلے ہوئے ساتھی۔ میرے ساتھ جھولا جھولنے والے ساتھی۔ میں پانکڑ کی شاخوں سے آ رہی ہوں، اَمرود کی ڈالیوں سے آ رہی ہوں۔ سنگر ہار کے پھولوں سے آ رہی ہوں۔ مہندی کے پتوں سے آ رہی ہوں۔ اے میرے ساتھی مجھے پانکڑ کی شاخوں سے دُور کر دیا گیا۔ مجھے امرود کی ڈالیوں سے ہٹا دیا گیا۔ مجھے سنگر ہار کے پھولوں سے نکال دیا گیا۔ مجھے مہندی کے پتوں سے سسور دیا گیا۔ میرے ساتھی

اب میں تجھ سے وہاں نہیں ملوں گی۔ میرے مانگ اُجاڑ دی گئی۔اس کی افشاں چھڑا دی گئی۔اس کے گیسونوچ دیئے گئے۔اس کی مہندی دھو دی گئی۔اے مجھے سہاگن دیکھ کر جانے والے! آج آ مجھ بیوہ سے مل۔مجھ رانڈ سے ملاقات کر۔میری بے کاجل آنکھوں سے آنکھیں ملا۔میرے آنسو بھرے چہرے کی طرف دیکھ۔آ میں تجھ کو سلام کرتی ہوں۔اپنی بے مہندی کی ہتھیلیوں سے، بے چوڑیوں کے ہاتھوں سے، بے آنچل کے دوپٹّے سے،اُلجھی ہوئی زلفوں سے، میرے ساتھی! میرا سہاگ لوٹ لیا گیا۔میری مانگ اجاڑ دی گئی۔میری چوڑیاں توڑ دی گئیں۔آ میرے ساتھی! میرا آخری سلام لے۔اب میرا وہاں کوئی نہیں۔میں تیرے خیالوں میں اور ننگا ہوں میں رہوں گی۔اب میرا آخری ٹھکانہ یہی کٹھا رندی ہے،جس میں میرا سہاگ دفن ہے۔میں اس کی سطح پر لوٹوں گی، کراہوں گی، روؤں گی۔مرجاؤں گی اور اس ندی کی مٹّی ،اس میں میرا سہاگ دفن ہے، دم توڑ دوں گی اور اسی مٹّی میں مل جاؤں گی۔‘‘

ایسا لگا جیسے میرا کلیجہ بیٹھ گیا۔میں کلیجہ تھام کر چیخا اور بے تحاشہ بستی کی طرف دوڑا۔ پگڈنڈی سے ہوتا ہوا حضرت پیر یوسف ابدال کے مزار کے چبوترے سے گزرا۔دیکھا، حضرت پیر یوسف ابدال اپنے مزار سے نکل کر چبوترے پر دونوں ہاتھ آگے ٹیکے ہوئے ہیں۔دستار کھل گئی ہے،کلاہ ڈھل گئی ہے، سر جھک گیا ہے۔ایسا لگا جیسے پیر یوسف ابدال کہہ رہے ہیں۔یوسف ابدال! تین چار روز سے پھول لے کر آنے والے لاپتہ ہیں۔ہونٹوں پر درود والے بے نشان ہیں۔ پھول مرجھا گئے ہیں۔ پھول لانے والے چلے گئے۔یوسف ابدال اب وہ تمھارے پھولوں کے محتاج ہیں۔چلو یوسف ابدال ان کے بکھرے ہوئے پھول اٹھاؤ۔تم قرضدار رہو۔یوسف ابدال۔اٹھو، برسوں کا قرض ادا کردو۔ان بکھرے ہوئے پھولوں کو ہوا میں اُڑا دو۔مسجد کے دروازے سے سراپا پھولوں میں لدی چھپی حرم مسجد نکلی۔

آؤ کلیم! تم آ گئے تو میری بے قراری کو قرار آ گیا۔تین روز سے میری دیوار لہک رہی ہے۔میرا فرش تپ رہا ہے۔کوئی پیشانی اسے ٹھنڈی کرنے کے لیے نہیں جھکی۔انھوں نے وہ سجدہ کردیا جس کے بعد اب انھیں کسی اور سجدے کی محتاجی نہیں رہی۔وہ سب اب اپنے سجدے والے کے پاس پہنچ گئے مگر میں تنہا اپنی دیواروں میں جیتی رہوں گی۔اپنے فرش پر تڑپتی رہوں گی تا آنکہ قیامت آجائے۔پھر میں داورِ محشر کے سامنے پہنچ جاؤں گی اور کہوں گی انھیں جنت میں بھیجنے سے

پہلے میری دیواروں سے لپٹنے کے لیے اور میرے فرش پر صرف ایک سجدہ کرنے کے لیے بھیج دو۔ پھر میں بھی ان کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤں گی، میرا دل ٹھنڈا ہو جائے گا۔ میرے در و دیوار کو سکون آ جائے گا۔ اے اللہ! یہ پہلے میرے قرضدار ہیں۔ میں اپنا قرضہ وصول کر کے پھر انھیں پر نچھاور کر دوں گی۔

آؤ کلیم! آؤ کلیم! میں اب تمھیں کہیں نہیں لے جاؤں گی۔ صرف اس ایک کنویں کے قریب لے جاؤں گی جہاں تمھاری ماں اور تمھاری بہن زخم کھا کر گری ہیں اور ساتھ تمھاری سب خالائیں، ممانیاں، پھوپھیاں، خالہ زاد اور پھوپھی زاد بہنیں، بیاہتائیں اور کنواریاں اور پرانی اور نئی اشرفیاں چھنا چھن کنویں میں گریں۔ آؤ زیارت کرو۔

کون؟ کلیم؟ آ گئے بیٹا۔ آؤ، دُور ہی رہو۔ میں تمھیں کلیجے سے نہیں لگاؤں گی۔ میں ڈر رہی تھی۔ تم اگر کل آ جاتے تو شاید تم کو بھی میرے ساتھ ہی رہنا پڑتا۔ تم نہ آئے۔ اب میرے تمام ارمان، میری تمام تمنّائیں، تمھاری پیاری بہن بنّی کی آرزوئیں اور تمھاری چچیوں، ممانیوں، پھوپھیوں اور بہنوں کی آرزوئیں تمھارے سینے میں سما گئیں۔ تم کو ان کی خوشیاں، ان کی حرارت، ان کی چاہت، ان کی محبت، زندگی بھر گرم رکھیں گی۔ تم ان سے ایسے ایسے نغمے، ایسی ایسی آوازیں، ایسی ایسی حسین تصویریں، ایسے ایسے نازک لطیف نقوش بناؤ گے، ایسے ایسے آہنگ سے پیش کرو گے کہ تمھارے دوست بھی رشک کریں گے اور تمھارے دشمن بھی جھومیں گے۔ یہ جو پھولوں والی تمھاری بغل میں کھڑی ہیں ان کے رب نے تم کو زندگی دینے کے وقت ہی منتخب کر لیا تھا۔ یہ پھولوں والی اس کی گواہ ہیں اور ہم سب تمھاری گواہ ہیں۔ تمھارے نغمے، دوست دُشمن سنیں گے۔ ہم اور ہمارے ساتھ تم سے تمام جدا ہونے والے اور ہونے والیاں قیامت تک انجمن میں محوِ سماعت رہیں گی۔ اصل سامعین تمھارے ہم ہیں۔ ہم جنت کی غذاؤں کے بعد اس غذا کے لیے اکٹھے ہوا کریں گے۔ ہمارے سینے کے زخم، ہماری چھاتیوں کے گھاؤ، ہمارے آنسو، نقش و نگار بن کر تمھاری شاعری میں جگمگائیں گے۔ ایسا حسن، ایسے شگفتہ پھول، ایسے نغمے دنیا نے پہلے نہ سنے ہوں گے۔ بیٹا۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ ایسے منصب کے لیے اللہ نے تم کو منتخب کیا۔ جو اس سرزمین کو اس صدی میں کسی کو نہ ملا۔ اس منصب کے حصول میں جو بھی استعمال ہوا وہ تمھارا پیارا ہے۔ ہم بھی تمھارے پیارے ہیں یعنی تمھارا تمام خاندان ہمارا تمام

قبیلہ جو اس وقت میرے ساتھ ہیں سب تمھارے پیارے پیاریاں ہیں اور بیٹا وہ تمھارے پیارے ہیں جو اس منصب کے متعین ہونے کا ذریعہ بنے۔ یہ زخم بھی ہمارا پیارا ہے جو ہمارے سینوں اور گردنوں پر ہے اور وہ تلوار بھی، وہ برچھا وہ چھری بھی تمھاری پیاری ہیں جن سے یہ زخم لگا اور وہ ہاتھ بھی تمھارے پیارے ہیں جنھوں نے زخم دیئے۔ بیٹا ان سے بھی پیار کیجیو۔ بیٹا ان کا احسان ہے، ہم احسان فراموش نہیں۔ بیٹا تم بھی ان کے احسان مند ہو۔ ہم اس مٹّی میں موجود ہیں۔ اس مٹّی سے زیادہ پیاری تمھیں کون مٹّی ہوسکتی ہے؟ نہیں میرے بیٹے اس مٹّی سے بھی پیار کیجیو۔ یہی مٹّی تمھیں اعزاز، وقار، عظمت، عزت، رحمت، محبت حاصل ہونے کا ذریعہ بنی ہے۔ یہ تمھارے وطن کی مٹّی ہے، جس میں ہم خاک وخوں ہوکر ملے ہیں۔ یہ ہمیں بھی پیاری ہے اور تمھارے پیار و درد کا مرکز بھی یہی مٹّی ہے۔ جاؤ بیٹا روؤ۔ تمھاری آواز بہترین نغمہ ہے۔ بیٹا ہماری تکلیف کی چند گھڑیاں گزر گئیں، اب تو آرام ہی آرام ہے۔ یہ آرام کتنا پیارا ہے۔ ہم جب اِس دُنیا سے زخم کھا کر اُس دُنیا میں پہنچے تو چاروں طرف فرشتوں کا ہجوم ہوگیا۔ وہ ٹوٹے پڑ رہے تھے ہم سے ملنے کو۔ ہماری زیارت کرنے کو، ہمیں چھونے کو لیکن وہ ہمیں چھو نہ سکے۔ ان کو احساس ہوا کہ وہ فرشتے ہیں اور ہم انسان۔ پھر ان کو اس احساس سے تکلیف ہوئی۔ وہ تمنّا کرنے لگے کہ کاش وہ بھی انسان ہوتے تو ہمیں چھو کر، ہم سے مل کر ان کو کتنی خوشی ہوتی۔ لیکن فرشتے ہو کر بھی وہ اس خوشی سے محروم ہوگئے۔ بیٹا ہم تم اس خوشی کے وارث ہیں۔ اس غم سے پیار کیجیو جو اس خوشی کے حاصل ہونے کا سبب ہے۔ جاؤ بیٹا نغمہ چھیڑو، لوگوں کو رُلاؤ اور ہمیں مسکراہٹ کی سوغات پہنچاؤ۔ بائیس برس اس حیثیت میں رہے پھر وہ جنت والے اور والیاں آسمان پر اٹھائی گئیں اور دو تین دن بعد ہی اس برباد شدہ جنت کی تعمیر کا منصب مجھے ملا۔

میں چار سال تک اس جنت کا نقشہ بنانے میں رہا اور چار سال کے بعد میں نے اس کی تعمیر شروع کردی اور پینسٹھ سال سے یہ تعمیر چل رہی ہے۔ کیسے کیسے نقشے ہیں، کیسی کیسی عمارتیں ہیں، کیسے کیسے دروازے، صحن و بام ہیں، کیسی کیسی آرائشیں ہیں، کیسے کیسے لوازمات ہے۔ کہاں سے اتنا سامان آرہا ہے، کیسے کیسے استعمال ہو رہا ہے اور لوگ دیکھ دیکھ کر رشک کررہے ہیں۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ ہم بھی بنائیں لیکن کیسے بناتے؟ یہ ہنر تو اور کسی کو ملا ہی نہیں۔ اس ہنر کے لیے اور کسی کو تیار ہی نہیں کیا گیا۔ لوگ دیکھتے رہے اور حسرت کرتے رہے:

جب تک تو کلیمؔ اپنی غزل گائے نہیں ہے — ہم کیا کریں ہم کو تو مزہ آئے نہیں ہے
ہر چند تیرا درد سنا جائے نہیں ہے — لیکن بے سنے بھی تو رہا جائے نہیں ہے
وہ گل ہے غزل تیرا جو مرجھائے نہیں ہے — سب لوگوں کا یہ فیصلہ ہے، رائے نہیں ہے
تم آؤ تو رنگ آئے، بہار آئے نہیں ہے — تم آؤ نہیں ہو تو کوئی آئے نہیں ہے

اور کبھی یوں کہتے ہیں:

کہہ دو کلیمؔ سے کہ اُسے آنا چاہیے — محفل اُداس ہے کوئی دیوانہ چاہیے
چھیڑا ہے پھر ستم کا نیا ساز وقت نے — تازہ غزل پھر اس سے کہلوانا چاہیے
اب ایسے بادہ نوش کی ہے وقت کی تلاش — جو چڑھ کے دار پر کہے پیمانہ چاہیے

ہم دورِ جام میں مشغول رہ کر یا پیچوان کی نَے تھام کر مجموعوں اور دیوان کے اوراق سامنے رکھ کر شاعری نہیں کرتے:

ہم کو درد جب اُٹھتا ہے، غزل کہتے ہیں

اور درد کب اُٹھتا ہے آؤ، دیکھو، سنو اور دل تھام لو۔

آؤ تمھیں ایسے کنویں دکھاتا ہوں جن میں بے شمار اشرفیوں نے خود کو دفن کر دیا۔ وہ اشرفیاں جنت میں لٹائی جائیں گی۔ فرشتے اور حوریں ان کے لیے دامن یوں پساریں گے جیسے فقیر لال و گہر کے دامن پھیلائے رہتے ہیں۔ ہر اشرفی خود اُچھلتی تھی اور کنویں میں چھلانگ لگاتی تھی:

جب اس نے بلایا ہے پھر کیسی فراموشی

چھنا چھن، چھنا چھن، چھنا چھن، چمکتی ہوئی اشرفیاں، سُرخ سنہری اشرفیاں، جگمگاتی ہوئی اشرفیاں، اشرفیوں پر نقلی صورتیں کندہ ہوتی ہیں۔ یہ مجسم حسین اشرفیاں تھیں جنھیں چاندنی شرما شرما کر دیکھتی تھی۔ ہوائیں آنکھیں بند کر لیتی تھیں۔ انھیں دن کی دُھوپ نے نہیں دیکھا۔ راتیں ان جگنوؤں سے سج جاتی تھیں۔ جب یہ چلتی تھیں تو ہوا ساکت ہو جاتی تھی۔ ان کے آنچل ان کے چہرے سے کبھی جدا نہیں ہوئے۔ ان کی اوڑھنیاں ان کے سروں سے کبھی نہیں ڈھلکیں۔ حوریں ان سے جھینپ جاتی تھیں۔ یہ بیاہتا اور کنواریاں، چاند ستاروں کی آبروئیں تھیں۔ باپوں کی چہیتیاں، ماؤں کی لاڈلیاں، شوہروں کی پیاریاں۔ جب یہ اشرفیاں چھنا چھن کے نغموں کے ساتھ کنویں میں کودنے لگیں تو حوروں نے کنوؤں کو ہر طرح سے گھیر لیا تھا۔ وہ باغِ ارم سے ٹیپ

ریکارڈ رلائی تھیں۔ خدا نے فرمایا جاکر ان چھنا چھن گیتوں کو ٹیپ کرلو۔ یہ نغمے میرے لیے ہیں۔ میں یہاں سے بھی سن رہا ہوں۔ لیکن یہ غیر فانی نغمے ایک بار سننے کے نہیں ہیں۔ میں انھیں بار بار سنوں گا اور جب ابدی کی دنیا آباد ہوگی تو جنت میں اپنے مخصوص ترین پیارے بندوں کو سناؤں گا۔ جس دن جنت میں یہ نغمے بلند ہوں گے اس دن جنت کی ساری ہوائیں بند رہیں گی۔ سارے نغمے فراموش رہیں گے۔ مسکراہٹیں مہر بہ لب رہیں گی۔ جنت والوں کے دل پہلی بار غم سے دھڑکیں گے اور جنت میں پہلی بار آنکھوں سے آنسو ٹپکیں گے۔ غموں اور آنسوؤں کا داخلہ جنت میں حرام ہے۔ لیکن ان معصوموں کے ادب و احترام میں جنت سے یہ حرمت اُٹھالی جائے گی۔

''بھائی جان کچھ لڑکیاں آئیں، بڑی حسین پیاری لڑکیاں ہیں۔ وہ میرے سر سے غبار جھاڑنے لگیں، میرے چہرے کے خون پونچھنے لگیں، لیکن ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، وہ روئے جارہی تھیں اور مجھے سنوارے جارہی تھیں۔ آپ کیوں رو رہے ہیں بھائی جان، مت روئیے بھائی جان، مجھے یہ کپڑے اچھے نہیں لگ رہے ہیں۔ آپ روئیں گے تو میں انھیں تار تار کرکے پھینک دوں گی۔ مت روئیے بھائی جان۔ نہیں بیٹی! تمھارے بھائی جان رو نہیں ہنس رہے ہیں۔ تمھارے بھائی جان شاعر ہیں۔ بیٹی وہ شاعری کررہے ہیں۔ اس کا نام شاعری ہے۔ بیٹی زور سے کہو شاعری کیا ہے؟ بھائی جان ہم کو بھی سنایئے بھائی جان! دیکھو بیٹی تمھارے بھائی جان شاعری گنگنا رہے ہیں۔''

ہوئے تھے چاک کیا کیا جیب و داماں یاد آتے ہیں
ہمیں پھر آج ایامِ بہاراں یاد آتے ہیں
دل اپنا اُلجھا اُلجھا ہے، طبیعت بکھری بکھری ہے
نہ جانے کس کے گیسوئے پریشاں یاد آتے ہیں

(جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی)

''واہ واہ بھائی جان۔ بہت اچھا بھائی جان، لیکن سمجھ میں نہیں آیا بھائی جان۔ یہ بہاراں کیا ہے بھائی جان؟ امّی آپ بتایئے نا۔ بیٹی میں بھی پہلے کہاں سمجھتی۔ اب سمجھ رہی ہوں۔ بیٹی ایام بہاراں وہ ہے جہاں سے پھٹا دوپٹہ، دُھول گرد میں اَٹے بال، آنسوؤں میں، لہو میں لت پت چہرہ، سوکھے ہوئے حلق، کانٹے پڑی زبان، اُکھڑی سانسیں، زخمیوں کی کراہیں، مظلوموں

کی چیخیں چھوڑ کر آئیں۔ جہاں جلتے ہوئے چھپّر، جھلسی ہوئی دیواریں چھوڑ آئیں۔ام...ماں... ام... ماں مت بولیے۔مت بولیےام... ماں۔ بھائی جان کیا وہاں سے بول رہے ہیں؟ بھائی جان کیا وہاں سے جھانک رہے ہیں؟ دوڑیئے بھائی جان! بھاگیے بھائی جان!وہاں مت رہیے بھائی جان! یہاں آجایئے بھائی جان! آپ وہاں کیوں ہیں بھائی جان! نہ نہ نہ بھائی جان !وہاں مت رہیے بھائی جان! بھابھی جان کہاں ہیں؟ انھیں بھی لیتے آیئے۔ یہاں آجایئے بھائی جان!''

''چپ رہو بٹی... بھائی جان کو وہیں رہنا ہے۔ بیٹا نہیں بیٹا۔تمھارے رہنے کی جگہ ابھی تو وہی ہے۔ابھی تو تمھارے کام کرنے کے دن ہیں۔ یہاں تو آرام کے دن ہیں۔ بیٹا میں تمھیں اس کام کرنے کی جگہ چھوڑ آئی ہوں۔ میں تڑپوں گی، چھٹپٹاؤں گی۔تمھاری یاد میں آنسو بہاؤں گی کہ تم ہمارے اور سب کے مالک کی طرف سے ایک منصب پورا کرنے کو رُکے ہو۔تم جہاں ہو بیٹا،تمھارے نانا بھی وہیں ہیں۔تمھاری نامی بھی وہیں ہیں۔تمھارے سلیم بھیّا بھی وہیں ہیں۔محمودہ باجی بھی وہیں ہیں، ہم بھی یہیں آ گئے۔تمھاری بنّی بھی یہیں آ گئی۔ بیٹا اب تو یہ زمین تمھاری جنت ہے۔اس کا ایک ایک حصہ تمھاری روح کا ٹکڑا ہے۔اس جنت سے محبت کرو۔وہاں بقیہ دن گزارنے کی تمنا کرو۔انھیں دُعائیں دو جنھوں نے اس جنت کو تعمیر کرنے کا تمھیں بہانہ دیا۔ بیٹا ہم بوڑھی ہو گئے تھے۔ پھر جھرّیاں پڑ جاتیں، پھر ہاتھ پاؤں کمزور ہو جاتے۔ پھر پٹّی سے لگ جاتے، پھر مر جاتے۔تم دفن کر کے چلے آتے۔مہینہ دو مہینہ، میرے غم میں روتے کراہتے۔پھر تم بھی اسی قافلے میں شامل ہو جاتے جن کی گرد بھی اب نظر نہیں آتی۔تمھاری بنّی جوان ہوتی، شادی بیاہ ہوتا، بال بچّے ہوتے۔پھر یہ بھی بوڑھی ہو جاتی، مر جاتی۔پتہ نہیں کون جینے میں ساتھ رہتا۔کون مرنے میں رہتا۔زندگی قربت کا نام ہے۔لیکن زندگی ہی سب سے بڑی دوری کا نام ہے۔نگاہوں کے سامنے رہنے والے دِلوں سے دُور رہتے ہیں۔آج ہم بھی ویسے ہی ہیں جیسے پٹنہ سے آئے تھے اور ہمیشہ ویسے ہی زری کی سفید ساڑی میں تمھارے سامنے رہیں گے اور بنّی کو دیکھو کیسی چہک رہی ہے،کیسی لہک رہی ہے۔ایسی ہی چمکتی رہے گی بُنّی۔ بھائی جان کو سلام کرو۔ میں تو سلام کر چکی ہوں۔آپ بھائی جان کو اپنی باتوں میں لگائے ہوئی ہیں۔نہ جانے کیا کیا بول رہی ہیں۔ بھائی جان تو میری طرف دیکھتے ہی نہیں۔دیکھیے بھائی جان! میں کیسی اچھی لگ رہی ہوں۔سُرخ جوڑا بھائی جان! پتہ نہیں کون کپڑا ہے۔میری سمجھ میں نہیں آتا۔آپ بتایئے نہ

بھائی جان! آپ تو رو رہے ہیں بھائی جان! شاعری بہت اچھی ہے بھائی جان۔لیکن آپ روتے کیوں ہیں بھائی جان!''

''بیٹی! بھائی جان کو رونے دو۔اب یہی کام اُن کا ہے۔جاؤ بیٹا میری دعاؤں کے سائے میں واپس جاؤ۔ بھائی جان جارہے ہیں بھائی جان۔ گلے نہیں ملئے گا بھائی جان۔ابھی نہیں! ابھی نہیں!! تو کب؟ کب؟؟ کب؟؟؟....''

ہوئے تھے چاک کیا کیا جیب وداماں یاد آتے ہیں
ہمیں پھر آج ایامِ بہاراں یاد آتے ہیں
جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی ، جہاں نغمے ہی نغمے تھے
وہ گلشن اور وہ یارانِ گلستاں یاد آتے ہیں
دل اپنا اُلجھا اُلجھا ہے طبیعت بکھری بکھری ہے
نہ جانے کن کے گیسوئے پریشاں یاد آتے ہیں
کبھی دن کو لہو کی نقش کاری یاد آتی ہے
کبھی راتوں کو زخموں کے چراغاں یاد آتے ہیں
میرے سینے میں دل کا کوئی حصہ ٹوٹ جاتا ہے
جب آغازِ وفا کے عہد وپیماں یاد آتے ہیں
بہاریں ، سیرگاہیں ، چاندنی راتیں ، ملاقاتیں
ہمیں اب تک یہی خوابِ پریشاں یاد آتے ہیں
کہاں ہم اور کہاں یہ طرز و اندازِ سخن عاجزؔ
غزل کہتے ہیں جب ہم ان کے احساں یاد آتے ہیں

کہیے کیسا لگا؟ یہ کیسا لگا کہ کچھ بولیے؟ کچھ یاد آیا؟ بھولے تو کیا؟ یاد آیا تو کیا؟ کچھ عبا قبا اُتری؟ کچھ پیشانیوں کی شکنیں ہٹیں۔اللہ جانے یا آپ جانیں؟اور کچھ سن لیجیے:

بھری بزم میں گیت گانا بھی ہے — اکیلے میں آنسو بہانا بھی ہے
غزل ہے میرے درد کا مرثیہ — یہی زندگی کا ترانہ بھی ہے
محبت ہے دل خون کرنے کا نام — یہی دل لگی کا بہانہ بھی ہے

عجب کشمکش میں ہے یہ زندگی
تڑپنا بھی ہے، مسکرانا بھی ہے
وہ ہیں دُشمنِ جان وایمان و دل
مگر دل انھیں سے لگانا بھی ہے
بڑا تیز ہے اُن کا تیرِ نظر
بہت بے تکلف نشانہ بھی ہے
نہ پوچھ اس کا طرزِ تعلق نہ پوچھ
عداوت بھی ہے، دوستانہ بھی ہے
شکایت کریں اس کی جا کر کہاں
جدھر وہ اُدھر ہی زمانہ بھی ہے
مرا دل ہے ہر دَور کا آئینہ
نیا زخم بھی ہے پرانا بھی ہے
اسی سے نکلتی ہے میری غزل
یہ دل درد کا کارخانہ بھی ہے

ایک اور سن لیجیے:

مری ہر غزل کے رُباب سے یہ نکل رہی ہے صدائے دل
مجھے درد سب سے عزیز ہے چاہے دل رہے چاہے جائے دل
اُسے کیا سلیقۂ شاعری جو پھرے ہے اپنا بچائے دل
وہ کلیمؔ جیسی غزل کہے ، جو کلیمؔ جیسا بنائے دل
مرے دل کے محرمِ راز کا، یہی حکم اب ہے برائے دل
کہ اگر چراغ نہیں رہے تو کلیمؔ اب ہے برائے دل
بڑی ٹوٹیں دل پہ مصیبتیں بہت آئی دل پہ بلائے دل
مگر اب تک زباں پر کبھی یہ نہ آیا کہ ہائے دل
وہی میرا دشمنِ جان و دل جو گیا ہلاکے بِنائے دل
اسی دشمنِ دل و جان کو مری ہر غزل ہے دعائے دل
مجھے جس حسین سے پیار ہے میرا پہلا پہلا جو یار ہے
اسے سب ملا ہے بجائے دل، یہاں کچھ نہیں ہے سوائے دل
تمام اہلِ درد سے جا کہو کہ سنو ہماری غزل سنو
ہمیں دردِ دل کے مریض ہیں ہمیں بانٹتے ہیں دوائے دل
تو ہی سرپھروں کا امام ہے ، یہ کلیم تیرا یہ کام ہے
کسی اور کا یہ جگر نہیں کہ وہ دُشمنوں سے لگائے دل

میں نے یہ بات مختلف مقامات پر لکھی ہے کہ شاعری الگ چیز ہے اور شاعری میں منصوبہ بندی الگ چیز ہے۔ میں شعر کہنا شروع کرتا ہوں اور آہستہ آہستہ اس منصوبے کی طرف چلنے لگتا ہوں۔ یہ چلنا شعوری سے زیادہ فیضانِ سماوی ہے۔ جیسے ایک مشین ہو جو چلنا شروع کر کے ایک معین تکمیل تک پہنچتی ہے۔ میں کسی واقعہ سے متاثر ہوتا ہوں۔ وہ واقعہ میرے دل کی بھٹّی میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ ایک شکل اختیار کرتا ہے۔ جیسے نطفہ اپنی شکل تبدیل کرتے کرتے ایک مکمل شکل اختیار کر لیتا ہے۔ وہ واقعہ بھی اپنے اندر واقعات کی تشکیل کرتا ہے اور پھر اسے ایک مکمل تصویر یا کہانی کی شکل دے دیتا ہے۔

اب نئے پرانے مجموعوں کی بیشتر غزلوں میں سماوی ترتیب نظر آئے گی۔ میری ہر غزل میں ایک کردار ہے جو خود میں ہوں اور میرے مقابل کوئی کردار ہے۔ ان دو مختلف کرداروں میں کشمکش میری شاعری کا موضوع ہے۔ آپ کسی غزل کو لے لیجیے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ اس سے زیادہ آپ کی بصیرت کا راستہ بند کرنا نہیں چاہتا۔ بغیر کسی کشمکش کے زندگی صحت مند نہیں ہے، تو شاعری بھی کسی کشمکش کے بغیر تندرست اور حسین نہیں ہو سکتی، میری شاعری اس کا واضح ثبوت ہے۔ یہ میں اکثر کہتا گیا ہوں، مگر اس طرف توجہ دینے کی ہمّت نہیں، بصیرت نہیں یا فرصت نہیں یا ضرورت نہیں۔ ایک ایک غزل ہندوستان اور اس کے پردے میں بین الاقوامی تاریخ کا پس منظر ہے اور کسی کی پوری تصویر ہے۔ یہ بات آپ کو اُردو کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملے گی۔ اسی لیے کنہیا لال کپور نے کہا ہے کہ کلیمؔ عاجز نے شاعری میں ایک نئی جہت کی بنیاد ڈالی ہے اور اپنے ہم عصروں کو للکارا ہے۔ فراقؔ نے میری شاعری کی کیفیت وکمیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کنہیا لال کپور نے دعوت اور پیغام کی طرف توجہ دلائی ہے۔ دونوں پہلو اہم ہیں۔ مگر یہ کام فراقؔ اور کپور ہی کر سکتے تھے۔ انھوں نے کیا نہیں تو اور کسی کے بس کا نہیں ہے۔ اس لیے کہ غور وفکر کرنے کے لیے جو تخلیہ چاہیے اس تخلیہ سے ہم نکل آئے ہیں۔ باہر کے ہجوم کا حصہ بن گئے ہیں۔ اب تخلیہ کی طرف پھر واپس ہونا بہت محال ہے۔ اس لیے یہ کام بھی فی الحال محال ہی نظر آتا ہے۔

مثلاً ۱۹۷۰ء کے قریب کی ایک غزل ہے۔ اس کے علاوہ اور غزلیں بھی اس سلسلے کی جن میں نبض پر اور دل کے تار پر انگلی بہت مضبوطی سے رکھی گئی ہے، مگر یہ غزل اس دور کی عمومی فضا سے

بہت ہم آہنگ ہے:

واللہ! کس غضب کے ہو ہنس مکھ دکھائے جاؤ — ہم آہ آہ! کرتے ہیں تم مسکرائے جاؤ
ہم تو غزل کے پھول کھلاتے ہی جائیں گے — تم جانتے ہو زخم لگانا لگائے جاؤ
اہلِ وفا کے جلتے بدن سے رہو الگ — ہم دُھوپ دُھوپ جاتے ہیں، تم سائے سائے جاؤ
میرے فسانے پر ہے تمھارا ہی اختیار — جو بات چاہو اپنی طرف سے ملائے جاؤ
اپنوں کو ہم تو غیر تمھارے لیے بنائیں — اور تم ہمارے غیر کو اپنا بنائے جاؤ
فنکار تم ستم کے ہو ہم شاعرِ وفا — ہم اپنی گائے جائیں تم اپنی سنائے جاؤ
آئی نہیں جو آج تو کل آئے گی بہار — غنچو! خزاں کا غم نہ کرو مسکرائے جاؤ

وہ سن کے اَن سُنی جو کرے ہے، کیا کرے
تم اے کلیمؔ اپنی غزل گنگنائے جاؤ

پس منظر مشرقی پاکستان کا انتشار رہے اور دو ہمسائے کے درمیان سازش اور تیسرے پر تیر کا نشانہ ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں پر الزامات، مشرقی پاکستان میں ہمارے بہاری مہاجر ہمارے غیر بن گئے۔ ہمارے غیر ہندوستان کے اپنے بن گئے اور دونوں چکیوں کے بیچ ہم پسنے لگے۔ پھر صورتِ حال انشا اللہ بدلے گی۔

غنچو غمگین نہ ہو مسکرائے جاؤ۔ آج ہم جو کہہ رہے ہیں وہ سن کر اَن سنی کی جا رہی ہے، لیکن کبھی سنی جائے گی۔ ہم ۱۹۷۰ء میں گویا جوان تھے اس کو پینتالیس سال گزر گئے۔ ان اشاروں کو سمجھنے والے اس وقت بھی کم تھے۔ اب کون ہے؟ جس زمانے میں یہ غزل بی این کالج میں پڑھی گئی۔ اِندر کمار گجرال اُردو مشن لے کر بہار آئے تھے، وہ شریکِ مشاعرہ ہوئے۔ سر جھکائے سنتے رہے۔ غزل ختم کی تو گلے سے لگا لیا اور لوگ مشاعرہ کے بعد بھی ٹیپ ریکارڈ لے کر میرے پاس آتے رہے۔ ریکارڈ کراتے رہے اور گھروں میں بجاتے رہے، جھومتے رہے:

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

چند باتیں فن کے سلسلے میں عرض کر دوں۔ غزل اشارہ بھی نہیں ہے بلکہ اشاروں کی روح ہے۔ اس روح تک رسائی پہلے بھی بڑے غور و فکر کے بعد ہوتی تھی۔ میرؔ صاحب اور میں اشاروں کی روح کے بانی ہیں۔ انھوں نے غزل کو اتنا پھٹکا، اتنا نچوڑا، اتنا چھانا کہ وہ لطیف سے لطیف

ترین بن گئی۔اس لطافت پر بڑے اہلِ نگاہ بھی مشکل سے پہنچے اور میرؔ صاحب بڑے بڑے سخن فہموں اور اہلِ ذوق کو بھی جھٹکتے رہے کہ تم میری شاعری نہیں سمجھ سکتے، یہ صحیح ہے جس معراج پر میرؔ نے اُردو شاعری کی لطافت کو پہنچایا کوئی نہ پہنچا سکا:

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں　　کل وہاں سرو گل کے سائے تھے

کہتے کہتے یہ کہہ جاتے ہیں:

پاس ناموسِ عشق تھا ورنہ　　کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

اس لطافت کی یہ معراج میرؔ ہی حاصل کر سکتے تھے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرزند حضرت ابراہیم کی میّت گود میں اُٹھائی اور کہا ابراہیم ہم تمہارے غم میں بلک رہے ہیں اور ہمارے آنسو چھلک رہے ہیں مگر خدا کا حکم صبر کا ہے۔ہم خدا کے حکم ماننے والے ہیں۔میرؔ نے اسے 'پاس ناموسِ عشق' کا نام دیا۔فراقؔ نے بھی لطافت کا ایک مقام حاصل کیا۔گرچہ وہ مقام میرؔ سے بہت نیچے ہے:

تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو　　وہ درد اُٹھا فراقؔ کہ میں مسکرا دیا

ہم بھی اس لطافت کا حصول کرتے رہے ہیں تو یہاں تک پہنچے ہیں:

وہ کہتے ہیں جب خیریت سے ہو عاجزؔ　　جگر تھام کر مسکرانا پڑے ہے

....

جو قطرے لہو کے نہ آنکھوں سے ڈھلکے　　بنے ہیں وہ اشعار میری غزل کے

....

وہ پرسشِ مزاج جو فرمانے لگتے ہیں　　چوٹ ایسی لگتی ہے کہ دل سہلانے لگتے ہیں

....

بھری بزم میں گیت گانا بھی ہے　　اکیلے میں آنسو بہانا بھی ہے
بڑی کشمکش میں ہے یہ زندگی　　تڑپنا بھی ہے، مسکرانا بھی ہے

....

میرے متعلق فراقؔ نے ایسی بات کہہ دی جس کی طرف میری نگاہ بھی نہیں گئی تھی۔وہ کہتے ہیں: ''ٹھیٹھ آدمیت یا آدمیت کا ٹھیٹھ پن کلیم عاجزؔ کی غزلوں میں نغمہ بن کر جھلک جاتا ہے۔''

میں نے پھر سمجھ لیا کہ یہ ٹھیٹھ آدمیت یا آدمیت کا ٹھیٹھ پن میری شاعری میں میرے گاؤں سے آیا ہے۔ماں بہنوں، خالہ، ممانی اور خالہ و ماموں زاد بھائی بہنوں سے آئی ہے:

مرے گاؤں کے وہ بغیچے وہ پل　　وہ تالاب ، وہ ندّیاں ، کھائیاں
وہ کھٹئے وہ مچئے وہ چرپائیاں　　وہ کمرے اوسارے وہ انگنائیاں
وہ انگنائیوں میں چمیلی کے پھول　　بہاریں جنھیں دیکھ شرمائیاں
وہ جھولا اِک امرود کی شاخ میں　　وہ جھولے پہ بیٹھی بہن بھائیاں
وہ جھولا ہنڈولہ جسے کہتی تھیں　　ہمارے دیہاتوں کی ماں جائیاں
وہ گاؤں کی بولی کہ جس پر فدا　　تغزل ، ترنّم کی رعنائیاں

میرے اس اسلوب کو فراقؔ نے ٹھیٹھ آدمیت کہا ہے اور صحیح کہا ہے۔ اور میرے دل کی بات کہی ہے، جو میرے ذہن میں بھی نہیں تھی۔ اور یہ ٹھیٹ پن بھی میری غزلوں میں اُبھرتا ہے:

یہی دُعا کرے بس اور کوئی دعا نہ کرے　　الٰہی حسن نہ دے اس کو جو وفا نہ کرے
نصیب ہو کسی کم بخت کا خدا نہ کرے　　وہ دل جو سینے میں ٹھنڈا رہے، جلا نہ کرے
یہ صرف رسم نہیں، صرف رسم ادا نہ کرے　　نہ دل میں درد ہو جس کے، غزل کہا نہ کرے
زمانہ اب نہ رہا درد آشنائی کا　　کیا جو ہم نے کوئی درد آشنا نہ کرے
چنا اسی کو محبت کے واسطے میں نے　　جو حق طلب کرے اور میرا حق ادا نہ کرے
نہ آیا کچھ ہمیں نقصان جان و دل کے سوا　　جو نفع چاہے وہ ہم سے معاملہ نہ کرے
میں تجھ کو بھولا نہیں ہوں مری غزل ہے گواہ　　میں تجھ کو بھول کے زندہ رہوں خدا نہ کرے

وہی شکایتِ غم بس وہی شکایتِ غم
کہو کلیمؔ سے محفل کو بے مزہ نہ کرے

مجھے اس لہجے پر فخر ہے:

یہ بیانِ حال، یہ گفتگو ، ہے میرا نچوڑا ہوا لہو
ابھی سن لو مجھ سے کہ پھر کبھو، نہ سنو گے ایسی کہانیاں

اور واقعی ایسی کہانیاں، ایسے لہجے میں سو سال کی مدّت میں کسی نے نہیں کہیں۔ میرے اس لہجے کی نقل لوگوں نے بہت کی۔ پروفیسر اقبال عظیم نے کی، جاں نثار اختر نے کی اور لوگوں نے بھی کی اور بھی کرتے رہتے ہیں، مگر یہ نقل کی چیز نہیں ہے۔ یہ تو نچھوڑا ہوا لہو ہے۔ کوئی اپنے رگ رگ سے لہو نچوڑنے کو بھی تیار ہو جائے تو بہہ کے نکل جائے گا۔ فن میں کیسے سمائے گا۔ یہ تو پہلے سے

طے ہوا ہے۔ مشین فٹ ہے، بات دل میں آئی اور مشین چالو ہو گئی۔ خونِ دل منتقل ہو رہا ہے اور فن کا پیکر تیار ہو رہا ہے:

اب اہلِ عقل کو ہے شوقِ چاک دامانی
یہ کاروبارِ جنوں بھی ہو کوئی فن جیسے

یہ فن نہیں جسے کوئی سیکھے، یہ تو فیضانِ سماوی ہے جسے مل جائے، مل جائے۔ اس میں کسی کوشش اور ریاض کو دخل نہیں ہے:

ہم زخمِ جگر ان کو دِکھانے میں لگے ہیں — وہ زلف میں آئینے میں شانے میں لگے ہیں
گنتی تو نہیں یاد مگر یاد ہے اتنا — سب زخم بہاروں کے زمانے میں لگے ہیں
جس روز سے تو آئی ہے اے فصلِ بہاراں — ہم تیری کہانی ہی سنانے میں لگے ہیں
ہم خانماں برباد چمن چھوڑ کے سب کام — کانٹوں سے رگِ گل کو بچانے میں لگے ہیں
دیوانۂ گل کون بنے موسمِ گل میں — سب لوگ تو زنجیر بنانے میں لگے ہیں
پیارے وہی ٹکڑے ہیں مرے شیشۂ دل کے — جو آج ترے آئینہ خانے میں لگے ہیں

یہ سجی سجائی، بنی بنائی، سنوری سنواری، بیسویں صدی کی تاریخ کی کہانیاں کیا ان آشفتہ مزاج شاعروں کے بس کی ہیں؟ جو زُلفیں جھٹکائے، سرمہ لگائے آنکھیں چمکائے پھرتے ہیں:

تنقید ہم آشفتہ مزاجوں پر نہ کر دوست — جا بیٹھ کے آراستہ زلفوں کی شکن کر
تیرے لیے ہے آئینہ خانہ ہی مناسب — تزئینِ رُخ و گیسو و رخسار و دہن کر
میدانِ شہادت میں نہ آ یاروں کے گھر بیٹھ — وہ ناز وہ انداز جو کرتی ہے دُلہن، کر
پھر شوق سے رکھ لینا کلیمؔ اپنا تخلص — ایجاد مری طرح کوئی طرزِ سخن کر

……..…………

دل پرخوں کے اِک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

یہ میرؔ صاحب کر گئے، اب ہم کر رہے ہیں اور دو چار دس دن، دس بیس سال نہیں بلکہ اب تو پینسٹھ سال ہو گئے۔ اتنے دِنوں میں تو دجلہ بھی خالی ہو جاتا مگر یہاں تو ایک طرف سے آ رہا ہے اور دوسری طرف جا رہا ہے:

کھولے ہوئے ہیں غزلوں کی دُکاں ٹوٹے ہوئے دل کے نام سے ہم
چھلکائیں گے کتنے جام ابھی اس ایک شکستہ جام سے ہم

اب میں کچھ اور عرض کردینا چاہوں گا اس لیے کہ نہ کہنے میں خطرہ زیادہ ہے اور کہہ دینے میں اُمید یہ ہوتی ہے کہ شاید لوگ کچھ سوچیں گے اور جب سوچ درمیان میں آتی ہے تو کہیں نہ کہیں سے کچھ کرن پھوٹنے کا امکان پیدا ہوجاتا ہے۔ ایسا کیوں لکھا اس شخص نے؟ اس پر غور کرنا چاہیےاور جب غور وفکر کا آغاز ہوجاتا ہے تو حقیقت کی طرف قدم بڑھنے لگتا ہے۔

بغداد میں جب چنگیزیوں کا حملہ ہوا تو خلافت کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ علوم وفنون کا جو مرکز تھا اسے خاک میں ملا دیا گیا۔ تمام تعلیمی حلقے تباہ کردیئے گئے۔ لاکھوں لاکھ علمی تصانیف دریابرد کردی گئیں۔ دریائے دجلہ کا پانی کتابوں کی روشنائی سے سیاہ ہوگیا۔ مسلمان ہونا بہت بڑا جرم قرار دے دیا گیا۔ بادشاہ نے اعلان کردیا کہ حکومت کے سربراہ جب بغداد کی شاہراہ پر کبھی نکلیں، تو کوئی مسلمان، کوئی عرب اور کوئی فقیر راستے میں نہیں نکلے، ورنہ اس کا سر قلم کردیا جائے گا۔

ایک روز ولی عہد سلطنت شکار کے لیے نکل پڑا۔ شہر ہی کے اندر ایک مقام پر درمیان راہ میں ایک شخص بیٹھا ہوا ملا۔ شہزادہ بہت غصہ ہوا۔ اس نے نفرت سے پوچھا تو کون ہے؟ درمیان شاہراہ بیٹھے ہوئے شخص نے جواب دیا۔ میں ایک عرب مسلمان فقیر ہوں۔ قوم کے اعتبار سے عرب ہوں، مذہب کے اعتبار سے مسلمان ہوں اور حال کے اعتبار سے فقیر۔

غصہ سے، نفرت سے، شہزادے کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ اس نے کہا تو جانتا ہے میں تجھے کیا سمجھتا ہوں؟ میں تجھے کتّے سے زیادہ حقیر اور ذلیل سمجھتا ہوں۔ اس شخص نے فوراً جواب دیا۔ بیشک شہزادے میں کتّے سے بھی زیادہ کمینہ اور ذلیل ہوں۔ اگر میرا خاتمہ ایمان پر نہیں ہوا۔ اس جواب نے منگول شہزادے کی چول ڈھیلی کردی۔ وہ ششدر کھڑا رہ گیا۔ ایں یہ شخص کیا بول گیا؟ ایمان یہ ایمان کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایسی چیز ہے جس کے نہ ہونے سے انسان کتّے سے بھی زیادہ ذلیل اور کمینہ ہوجاتا ہے؟

بس سوچ کا دروازہ کھل گیا اور اقبالؔ نے جو بہت بعد میں کہا وہ رونما ہوگیا:

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

مختصر یہ کہ سوچ کا دروازہ کھل گیا اور چند ماہ کے بعد ہی وہ شہزادہ جب بادشاہ بنا تو اس نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا:

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

یہ عرب مسلمان فقیر خواجہ کمال الدین تھے۔ میرا مطلب یہی ہے۔ میں ایک حقیقت پر ایمان رکھتا ہوں اور وہ بات ظاہر کر دینا چاہتا ہوں۔

۱۹۴۸ء کے بعد مشاعروں میں کچھ ایسی فضا مجھے نظر آنے لگی کہ میں نے پٹنہ سے باہر کسی بھی مشاعرے میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لال قلعہ، دہلی کلاتھ ملس، روٹری کلب، چیمس فورڈ کلب، ہر دعوت نامے کو میں نے ٹھکرا دیا۔ اس فیصلے کی بنیاد اس وقت پڑی جب میں نے دلّی ریڈیو کے ایک مشاعرے میں پڑھا:

شاعری کام ہے پیارے بڑی مشکل والا — درد والا وہی بنتا ہے جو ہے دل والا
شمع کو دیکھ کے پروانہ سا ہو جاتا ہوں — میں ہوں شاید کسی اُجڑی ہوئی محفل والا
لوگ آمین کہیں، میں یہ دعا کرتا ہوں — کسی دل کو نہ لگے گھاؤ مرے دل والا
کیا مزا ہے غمِ دل میں کہ جہاں جاتا ہوں — لوگ کہتے ہیں پڑھو شعر غمِ دل والا
یہ تو سنتا ہوں کہ آئے ہو مسیحا بن کر — مگر انداز ہے پیارے وہی قاتل والا

شمع سر دھننے لگی میں جو غزل پڑھنے لگا
دُکھے دل والوں کو سمجھے ہے دُکھے دل والا

آنکھیں بند کر کے میں غزل پڑھتا رہا۔ کچھ تالیوں کی اور کچھ منہ کی نکلی ہوئی آواز سنتا رہا۔ آنکھ کھولی تو دیکھا کہ تقریباً پورا ہال ہنس رہا ہے اور تالیاں بجا رہا ہے اور ہندی میں یہ کہتے سنا کہ ''ہاسیہ رس کی بہت اچھی غزل ہے'' یعنی بہت اچھی مزاحیہ غزل ہے۔ میرا بدن بالکل ٹھنڈا ہو گیا ہے اور میں فرش پر بیٹھ گیا۔ لوگ آتے رہے اور کہتے رہے۔ کل ایک مزاحیہ مشاعرہ ہم لوگ کرتے ہیں اور آپ کو خصوصیت سے مدعو کرتے ہیں۔ میرا تو یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ میں کسی طرح ہوٹل پہنچا اور صبح پٹنہ واپس ہو گیا۔

پھر اس درمیان اور مقامات پر ایسے تجربے ہوئے کہ اپنے فیصلے کی قدر و قیمت بڑھنے لگی۔ جدہ ریڈیو پر میری صدارت میں مشاعرہ ہو رہا تھا اور نواز دیوبندی صاحب یہ غزل پڑھ رہے تھے:

پانی میں تم نکلے کیوں
نکلے تو پھر بھیگے کیوں

اس طرح ڈوبے کیوں؟ وغیرہ وغیرہ، اور مجمع خوشی سے بے تاب ہو رہا تھا۔ اُچھل اُچھل کر داد دے رہا تھا۔ میں نے جب غزل شروع کی:

غزل سے چاک دل کی بخیہ کاری کون جانے ہے
جو ہم جانے ہیں ایسی وضع داری کون جانے ہے
رگِ گل کس طرح دیتی ہے پھانسی کون سمجھے ہے
بنے ہے شاخِ گل کیسے کٹاری کون جانے ہے

تو ایسا لگا کہ میں اُردو کے بجائے کسی اور زبان میں شعر پڑھ رہا ہوں۔ جو یہ سامعین نہیں سمجھتے ہیں۔ اس طرف چند برسوں میں ایسے کئی تجربے ہوئے تو میں نے سوچا کہ کچھ کہا جائے۔ اس میں مجھے خطرہ مول لینا پڑے گا۔

ایک فوج میرے پیچھے پڑ جائے گی۔ مرا سانس لینا محال کر دے گی۔ میرا چودہ طبق الٹ دے گی۔ میرا ناطقہ بند کر دے گی اور جو کچھ اب تک کر چکی ہے اس کا سوگنا کر کے دکھا دے گی۔ لیکن مجھے یہ اطمینان ہے کہ فوج میرے پیچھے پڑ کر میرا چودہ طبق الٹ کر، میرا ناطقہ بند کر کے وہ نہیں کر سکے گی۔ جو کرنا چاہتی ہے۔ یعنی میری بات کا جواب نہیں دے سکے گی۔ یہ تاریخ کے رو کے نہیں روک سکے گی اور آنے والی سچائی کا راستہ نہیں بند کر سکے گی۔

میں نے شاعری میں اور ادب میں یعنی نظم میں اور نثر میں بہت کچھ کہا ہے۔ وہ اس وقت بھی سچا تھا، آج بھی سچ ہے اور آئندہ بھی سچ رہے گا۔ اس لیے کہ وہ میری بات نہیں ہے، وہ تاریخ کی بات ہے اور تاریخ کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ میری کوئی پُرکھارت نہیں ہے۔ میں نے کوئی بات اپنی نہیں کہی ہے۔ میں نے پڑھا ہے، سنا ہے، دیکھا ہے اور پڑھنے، سننے، دیکھنے کے بعد کچھ سمجھا ہے۔ پھر لکھا ہے اور لکھنے کے وقت یہ بات میرے سامنے تھی کہ یہ میں نہیں کر رہا ہوں۔ زمانہ جو کچھ کہہ گیا ہے وہ میں دہرا رہا ہوں۔ چیخ و پکار سے، مار پیٹ سے، گالی گفتہ سے کوئی زمانے کی زبان بند نہیں کر سکتا ہے۔ زمانے کی یہ صفت ہے کہ وہ بدل سکتا ہے بدل یوں سکتا ہے کہ زمانہ کوئی فطرت کے خلاف قدم اُٹھائے۔ جب احساس ہوگا تو وہ اپنا قدم واپس لے لے گا،

زمانہ بدل جائے گا۔ دبستانِ لکھنؤ نے حالات کا ساتھ دے کر ایک قدم بڑھا دیا۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ قدم غلط تھا۔ تو زمانے نے اپنا قدم پیچھے کرلیا اور واپس آ کر صحیح رُخ پر اپنا قدم ڈال دیا تو زمانہ بدل گیا۔ لکھنؤ کے سماج کو انگریزوں نے دلّی کے سماج کے مقابل کھڑا کیا تھا۔ دلّی کو نوچ کھسوٹ کر سارا سرمایہ لکھنؤ کو دے دیا اور اسے آزاد چھوڑ دیا تاکہ دہلی کو شکست ہو گی مگر دہلی میری نہیں۔ ادھر لکھنؤ کو سب مل گیا تو اس کے دماغی توازن پر زلزلہ آ گیا:

تری نازک کمر بل کھا نہ جائے ۔۔۔۔ یہ چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے

……………….

میں کیا بتاؤں کہ سینے پر کیوں اُبھار آیا
جوانی آپ کی تعظیم کو اُٹھی ہوگی

بس گُھار ہو گیا:

انتہائے لاغری سے جب نظر آیا نہیں
ہنس کے فرمانے لگے بستر کو جھاڑا چاہیے

……………….

ٹٹولے قضا لاکھ بستر ہمارا ۔۔۔۔ نہ ہاتھ آئے گا جسم لاغر ہمارا

دماغی توازن بگڑ گیا۔ حالؔی نے کہہ دیا:

یہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بدتر

ارے سنڈاس سے بدتر ہے؟ یہ کیا کہا؟ جیسے منگولین شہزادے کو چونک جانا پڑا کہ ایمان؟ ایمان بھی ایسی چیز ہے؟ سوچ آ گئی تو بدل گیا اور تقدیر پھر گئی۔ تو جدید شاعری کا بھی دماغی توازن کچھ الگ ہے۔ اکبؔر نے کہا:

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

باپ کو خبطی کہنے والی بات زیادہ دیر تک کیسے چل سکتی ہے۔ کچھ لوگ ٹھٹکے، سوچنے لگے، توازن ٹھیک ہونے لگا۔ علی سردارؔ جعفری، سبطِ حسنؔ وغیرہ بیخودؔ لکھنوی سے ملنے گئے۔ شعر سنانے لگے تو بیخودؔ نے کہا کہ بھائی میری سمجھ میں آپ کی بات نہیں آئی تو پھر کچھ دنوں کے بعد بات

بدلنی پڑی۔اب پھرتوازن کچھ بگڑنے لگا۔جدید شاعری بہت کچھ کہنے لگی ہے۔جدید شاعر بہت ذہین ہیں۔جیسے غالبؔ ذہین تھے۔غالبؔ پرذہانت کا قبضہ ہوگیا تو وہ بہت دُور تک نہیں چل سکے۔مولانافضل حق خیرآبادی نے سمجھایا۔بھائی اتنی ذہانت سے کام مت لو۔بات بدلو۔غالبؔ نے بات بدل دی۔بہت زیادہ ذہانت والی بات سے کچھ پرہیز کرنے لگے توان کی شاعری وید اور گیتا سے بات کرنے لگی۔

ابھی ایک میگزین پرنظر پڑی ہے۔غالبًا دہلی کا ہے۔ایک بہت اچھے شاعر، واقعی انھیں اچھا شاعر کہا جائے، ان کا نام شکیبؔ جلالی ہے، جوان آدمی ہیں، خوبصورت آدمی ہیں۔اپنی خوبصورتی کے متوازی شاعری کرنا چاہتے ہیں اور کررہے ہیں:

جو دل کا زہر تھا کاغذ پہ سب بکھیر دیا
پھر اپنے آپ طبیعت مری سنبھلنے لگی

دل زہر سے خالی ہوگیا تو طبیعت کا سنبھلنا بالکل فطری بات ہے۔مجمع کا مجمع سند دینے لگا۔ ہاں جی بات بہت سچی ہے۔ یہ بات شکیبؔ جلالی سے بھی ہم کہیں گے اور سب سے کہیں گے کہ ٹھیک ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔لیکن ہم تو اس کے قائل ہیں کہ بات زبان سے نکلے اور دل میں اُتر جائے۔ڈاکیہ بھیج کر یا موبائل سے ذہانت کو بلائیں اور اس سے تشفی حاصل کریں۔تو بھائی اس دور میں یہ بہت مشکل کام ہے۔ہم جدید شعرا سے ضرور عرض کریں گے۔وہ ہم سے اتنی محنت نہ لیں۔آنکھ جھپکی، پگڑی غائب۔ پاؤں کا کانٹا نکالنے لگے، اتنے وقفے میں راستہ ہی فراموش ہوگیا۔اب جائیں تو کدھر جائیں۔ دل کا زہر کیا تھا جو کاغذ پر سب بکھیر دیا، یہ بتانا پڑے گا۔یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ سب کہیں گے۔سب پوچھیں گے۔آپ سمجھا کر چلے جایئے اور ہم مان لیں ایسا نہیں ہوگا اور آپ کے شاعروں کو قاسمی صاحب زمین وآسمان کا پیراہن پہنانے لگیں تو کام نہیں چلے گا۔آپ سمجھ رہے ہیں کہ ہم جو کہہ دیں گے وہ سب مان لیں گے۔ایسا نہیں ہے۔ آپ یہ سمجھتے رہیں گے اور پانی سر سے گزر جائے گا۔شعر آپ ہی کے گھر میں رہے گا۔گھر کے باہر نہیں نکلے گا۔آپ شعر کو چاہیے گا،شعر آپ کو چاہے گا۔اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔من ترا حاجی بگویم ،تو مرا حاجی بگو۔یہ کب تک چلے گا؟ سب لوگ حج کیسے کرسکیں گے۔جو حاجی نہ ہوں، اسے حاجی کہیں تو وہ کہہ دے گا کہ نہیں میں حاجی نہیں ہوں اور آپ حاجی نہ ہوں اور دوسرے سے

کہیں کہ مجھے حاجی کہو تو جھگڑے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہے۔ شعر وادب جھگڑا نہیں ہے۔ یہ تو صلح وصفائی ہے۔ اس کا کام جھگڑا دُور کرنا ہے۔ دو جھگڑنے والوں کے سامنے یہ دو شعر پڑھ دو:

مئے پلاتے ہو مگر جام، نہ شیشہ، نہ سبو
قتل کرتے ہو مگر ہاتھ میں شمشیر نہیں

……..………

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دونوں مسکرا کر گلے مل جائیں گے۔ نادرشاہ غصّے میں بپھرا ہوا شمشیر بکف جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑا ہے اور دلّی میں قتل عام کررہا ہے۔ جو نادرشاہ کو سمجھانے جاتا ہے، شمشیر سے اس کے دو ٹکڑے ہوجاتے ہیں۔ نظام الملک گلے میں شمشیر لٹکائے زور سے یہ شعر پڑھتے ہوئے نادرشاہ کی طرف آ رہے ہیں:

کسے نہ ماند کہ اورا بہ تیغِ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی شہر را و باز کشی

بس نادرشاہ کو جھرجھری آ گئی۔ شمشیر نیام میں کر کے فوج کو شہر خالی کرنے کا حکم دیا اور دلّی سے واپس چلا گیا۔ شکیبؔ جلالی جو شعر کہہ رہے ہیں اور قاسمی صاحب جو نکات اور تشریح فرما رہے ہیں وہ اُردو زبان وادب کو لے مرے گی اور کوئی اُردو نہیں پڑھے گا۔ کہے گا نکالو اس گھاس پھوس کو، خالی کرو ہندستان۔ شکیبؔ صاحب ایسے شاعر اور ابوالکلام قاسمی جیسے نقّاد کھلے عام اُردو زبان وادب پر چھری چلا رہے ہیں:

نہ ہوں گے بادہ کش تو بادۂ گلفام کیا ہوگا
یہ شیشہ ، یہ سبو ، یہ جام کیا ہوگا

……..………

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب اُنھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

نئی شاعری اور نئی تنقید یہی کررہی ہے۔ رضا علی عابدی (بی بی سی لندن والے) اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں کہ شعرا وادبا کی ایک مجلس میں کسی نے کہا آج کے نقّاد ادیبوں کو گمراہ کررہے

ہیں تو ایک بڑے ادیب انتظار حسین نے کہا۔ کوئی پرواہ نہیں میں نقّادوں کو گمراہ کرر ہا ہوں:

اب تو ہی بتا، تیرا گنہگار کہاں جائے؟

کبیرؔ کا یہ دوہا یاد آتا ہے:

چلتی چاکی دیکھ کر دیا کبیرا روئے
دو پاٹن کے بیچ میں ثابت رہا نہ کوئے

اُردو شعر و ادب کے بازار میں بڑے بڑے دھندے ہو رہے ہیں۔ اُردو بیچی جا رہی ہے اور پیسہ ادیب و شاعر و نقّاد کی جیب میں جا رہا ہے۔ میں جو سنتا ہوں اور جو خبریں آتی ہیں تو رونا آتا ہے کہ یا اللہ ہمارے اسلاف نے جس اُردو کو بھونا، پھٹا کھا کر، پھٹا پرانا پہن کر اُردو کے حلق میں قطرہ قطرہ لہو ٹپکا کر، اسے سجا بنا کر، اُسے سنگھاسن پر چڑھا کر خود مٹّی میں مل گئے، کیا یہ وہی اُردو ہے جو شکیبؔ جلالی صاحب اور قاسمی صاحب لکھ رہے ہیں؟ میں نے ایک غزل کہی ہے جس کا ایک شعر ہے:

نئی شاعری، شاعری ہی نہیں ہے
نئی شاعری کو پھر آغاز دینا

انگریزوں نے ہی دلّی کو نوچا کھسوٹا، بے آبرو کیا۔ پھر انگریز ہی مشرق کو نوچ رہے ہیں، ننگا کر رہے ہیں، پاگل کر رہے ہیں، دیوانہ کر رہے ہیں۔ ناسخؔ لکھنوی نے کہا:

میرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا
یہ کس خورشید رُو کو آج جذبِ دل نے کھینچا ہے
کہ نورِ صبحِ صادق ہے، غبار اپنے بیاباں کا
صریرِ کلک کو اب شہر کا نعرہ سمجھتے ہیں
گماں اعدا کو ہے میرے قلمداں پر نیستاں کا

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ بے معنی اشعار ہیں۔ بہترین معنی نکل آئیں گے لیکن اس کے لیے اوزار لانا پڑے گا۔ آپریشن کرنا پڑے گا تو بھائی ایسے معشوق ہم کیوں لائیں جس کا بوسہ لینے کے لیے ہمیں سیڑھی لانا پڑے۔

لکھنو کی مثالیں میں نے دی۔ ناسخؔ کی مثال دی۔ خواجہ وزیرؔ کے شعر کہے:

ٹٹولے قضا لاکھ بستر ہمارا
نہ ہاتھ آئے گا جسم لاغر ہمارا

شکیبؔ جلالی کی شاعری کے سلسلے میں مضمون پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب کا ہے۔ پورا مضمون ان کی اعلیٰ تنقیدی بصیرت کا نمونہ ہے۔ یہ نمونے بہت عام ہیں۔ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ یہ ہر شاعر پر چسپاں ہوتے ہیں اور شاعر کے ساتھ تنقید نگار کا بھی ڈنکا بج جاتا ہے۔ ہمیں زیادہ کہنے کا دم نہیں ہے۔ دو ایک اقتباس سن لیجیے۔ شکیبؔ جلالی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

”جہاں تک غزل گوئی کا سوال ہے تو شکیبؔ کے مزاج کی مخصوص ساخت اور تصورات کے جوہر کو کشید کر کے کسی ایک نکتے پر مرکوز کر لینے کی کیفیت کو ان کی غزلوں میں نت نئے لہجے اور رنگارنگ زاویہ نظر کے ساتھ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔“

انھوں نے اپنی ایک غزل میں کہا تھا:

جو دل کا زہر تھا کاغذ پہ سب بکھیر دیا
پھر اپنے آپ طبیعت مری سنبھلنے لگی

اس شعر میں تخلیقی عمل کے ایک مرحلے کو شاید غیر شعوری طور پر اس خوبصورتی کے ساتھ کہا گیا ہے کہ شعر گوئی کے مدعا کے ساتھ محرک کا بھی سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تخلیق کا یہ عمل اسی شعر میں بیان ہونے والے مرحلے میں اپنی شخصیت کو توازن، تناسب اور اعتدال سے دوچار کرنے کا مترادف بن جاتا ہے۔“

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اُسے کیا کہیے

یہ نئے نقّاد ہمیں سمجھا رہے ہیں یا ہمیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ عبارت آرائی کا یہ ہنر کس نے سکھلایا۔ رشید احمد صدیقی صاحب نے؟ احتشام حسین صاحب نے؟ آل احمد سرور صاحب نے؟ خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب نے؟ بس اتنا ہی مجھے کہنا ہے۔ جہاں تک شعر کا سوال ہے تو بے چارے کو سمجھاؤ کہ دل کا زہر کاغذ پر نہیں بکھیرا جاتا ہے، وہ تو اَمرت ہوتا ہے۔ اگر زہر کو اَمرت نہ بنا سکے تو شاعری کیوں کرتے ہو؟ زہر بکھیرنے کے بعد اپنے آپ طبیعت سنبھلنے کا کیا سول ہے۔ یوں کہہ سکتے ہو کہ:

پھر اس کے بعد طبیعت مری سنبھلنے لگی

نالائق کا شعر بھی سن لو:

شکایت اس کی عاجؔز کیا کرے ہے
غزل کہہ لے ہے بس اتنا کرے ہے
غزل کہنے دو عاجؔز کو نہ روکو
یونہی رو دھو کے جی ہلکا کرے ہے

میں نئی شاعری پر کیوں لکھوں۔ یہ لکھنے کی چیز نہیں ہے۔ اُسے یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو اپنی موت آپ مرجائے گی۔ اس میں زندہ رہنے والی روح نہیں ہے۔ یہ الفاظ کا گورکھ دھندہ ہے۔ لکھنؤ میں اُسے رعایتِ لفظی کہتے تھے۔ اسی کی یہ بگڑی ہوئی شبیہ ہے۔ شاہ قائؔم صاحب نے پڑھا:

ہے آئینے کے سامنے رُخ گلعذار کا
جلوہ بہار دیکھ رہی ہے بہار کا

بس گہُا رہو گیا۔ جلوہ بہار دیکھ رہی ہے بہار کا۔ کیا کہنا ہے۔ پچاس ساٹھ برس پہلے تک اِکّا دُکّا یہ آواز سننے میں آتی تھی۔ اب دُور فضاؤں میں کھوگئی۔ اب نئی شکل بنا کر آئی ہے:

خموشی بول اُٹھے ہر نظر پیغام ہوجائے
یہ سنّاٹا اگر حد سے بڑھے، کہرام ہوجائے

پہلے ناسؔخ سے، وزیر علی وزیؔر سے، نواب علی خاں رندؔ وغیرہ سے سنتے تھے۔ اب شکیبؔ جلالی وغیرہ سے سنتے ہیں۔ پھر یہ آواز بھی دُور دیس چلی جائے گی، کیونکہ اس میں زندگی کی کوئی علامت نہیں ہے۔

(کلیم عاجؔز)

دیباچہ

(تیلہاڑہ میں گنجِ شہیداں کے قریب بیٹھ کر لکھی گئی غزل)

پھر آج درد کی بھٹّی میں جل کے آئے ہیں
پگھل کے آئے ہیں، سانچے میں ڈھل کے آئے ہیں

یہ ہم جو شہر سے آئے ہیں گاؤں عید کے دن
پرانے گھر نئے گھر سے نکل کے آئے ہیں

منانے ہم بھی شہیدوں کا جشنِ سالگرہ
بغل میں لے کے سفینے غزل کے آئے ہیں

ہمارے گاؤں میں مجمع ہے سُرخ پوشوں کا
شَہانا عید کا جوڑا بدل کے آئے ہیں

ہماری ماں کو ہماری بہن کو ساتھ لیے
شہیدِ ناز اَغل کے بغل کے آئے ہیں

ہر ایک کی ہے زباں پر کہ ہاں سناؤ کلیمؔ
ہم اشتیاق میں تازہ غزل کے آئے ہیں

کسے مجال ہو انکار کی وہ جب یہ کہیں
میاں ترے لیے جنت سے چل کے آئے ہیں

سنادی میں نے غزل اور سنادی یوں
کہ سب کے چہرے کی رنگت بدل کے آئے ہیں

کوئی تڑپ گیا، دل تھامے کوئی لوٹ گیا
کسی کی آنکھوں میں آنسو مچل کے آئے ہیں

بلائیں لینے کو جب ماں کی انگلیاں اُٹھیں
ان انگلیوں کو ہم آنکھوں سے مل کے آئے ہیں

بہن کے پھیلے ہوئے لال لال آنچل میں
ہم اپنے اشکوں کے سب پھول اُجھل کے آئے ہیں

ان آنے والوں نے سب درد وغم نچوڑ لیا
گراں گراں گئے تھے ہلکے ہلکے آئے ہیں

گو ان شہیدوں کی تربت پہ جھونپڑا بھی نہیں
ہمیں تو لطف بہشتی محل کے آئے ہیں

ہماری شاعری کے اصل قدرداں ہیں وہی
وہیں مزے ہمیں شعر وغزل کے آئے ہیں

ہمارے شعروں کو گھر دوسرا نہیں معلوم
یہ دل میں جائیں گے دل سے نکل کے آئے ہیں

دیباچہ

(حصّہ دوم)

سنو ! تیلہاڑہ کے جانِ جہاں شہیدو سنو
تمھاری آتشِ فرقت میں جل کے آئے ہیں

تمھارے واسطے سجدے کیے ہیں مٹّی پر
دُعائیں کر کے جبیں اپنی مَل کے آئے ہیں

لہو تمھارا نئے رنگ و بُو میں اُبھرے گا
اشارے ہم کو نئے پھول پھل کے آئے ہیں

بہاکے آئے ہیں ویران راہوں میں آنسو
چراغ کی طرح صحرا میں جل کے آئے ہیں

وہ خوشبوئیں جو شہیدوں کی خاکِ پا میں ہیں
ہم اپنے عارض و ابرو پہ مل کے آئے ہیں

جو اُن کے پھول سے جسموں کا آج پردہ ہیں
برہنہ پا انھیں کانٹوں پہ چل کے آئے ہیں

انھیں شہیدوں کی یادوں کے پاک چشموں میں
نہاکے آئے ہیں، رنگت بدل کے آئے ہیں

بہت فسردہ ہم اُترے تھے ان فضاؤں میں
مگر بہت تروتازہ نکل کے آئے ہیں

رگوں میں دوڑ رہی ہیں نئی تمنّائیں
اُداس اُداس گئے تھے بہل کے آئے ہیں

نئی اُمنگیں ، نئے ولولے ، نئے ارمان
نئی اُمیدوں کے چشمے اُبل کے آئے ہیں

زمانے کے لیے ہیں درد کے نئے پیغام
میرے لیے نئے تحفے غزل کے آئے ہیں

پکار آئے ہیں لوح و قلم کے مالک کو
تڑپ کے آئے ہیں رو کر، مچل کے آئے ہیں

یقین ہے کہ نئی صبح رونما ہوگی
یقین ہے کہ مقدر بدل کے آئے ہیں

غزلیات

ترا اے جانِ جاں دارم سبو دارم چہ غم دارم
مئے و معشوق ہر دو روبرو دارم چہ غم دارم

اگر ناآشنایاں چار سو دارم چہ غم دارم
کریمِ مہربانِ ہم چو تو دارم چہ غم دارم

سبوئے ما شکستی محتسب کارِ عبث کردی
کفِ دستم بہ اندازِ سبو دارم چہ غم دارم

محبت پیش گانِ راستم گاراں چہ پروائے
تو شمشیر داری ، من گلو دارم چہ غم دارم

بہ زلفش آشنا غم بے نیازم از جہاں عاجزؔ
کہ من دیگر جہانِ رنگ و بو دارم چہ غم دارم

وہ جو اِک شام میرے بوریہ خانے سے اٹھا
رفتہ رفتہ وہ دُھواں سارے زمانے سے اُٹھا

چوٹ جب دل کو لگی ، میں نے غزل کہہ ڈالی
آئینہ ٹوٹا تو شور آئینہ خانے سے اُٹھا

گرچہ مجرم نہیں ہم پھر بھی ہیں گردن ڈالے
ہاں تو شمشیر اُٹھا ، کوئی بہانے سے اُٹھا

اہلِ دل اُٹھ گئے اور ایسی خموشی سے اُٹھے
کچھ پتہ بھی نہ چلا کون زمانے سے اُٹھا

ایسے بکھری ہے کہ بکھری ہی چلی جاتی ہے
بوجھ زُلفوں کا نہ اب تک ترے شانے سے اُٹھا

اس ستمگر کے ہمیں مدِّ مقابل ٹھہرے
وہ ستم ہم سے اُٹھا جو نہ زمانے سے اُٹھا

چارہ فرمانے دوا دی تھی سکوں کی کل شام
رات تو دردِ جگر اور ٹھکانے سے اُٹھا

ساتھ عاجزؔ کے گیا سوزِ سخن ، سازِ سخن
پھر کوئی ایسا غزل خواں نہ زمانے سے اُٹھا

نگرم نظر نمی آئی چہ می کنم　　من می روم کجا تو کجائی چہ می کنم
نے تاب وصل وتاب جدائی چہ می کنم　　آئی چہ می کنم نہ می آئی چہ می کنم
تو بادشاہ حسن تو فرماں روائے حسن　　در کوچۂ تو جزبہ گدائی چہ می کنم
من ضبط گریہ می کنم بیرونِ انجمن
درانجمن تو نغمہ سرائی چہ می کنم

آدابِ رسم و راہِ وفا ہم سے پوچھئے　　ہم نے یہ حق کیا ہے ادا ہم سے پوچھئے
ہر صبح اوڑھنا کفن ہر شام اُتارنا　　مرمر کے زندگی کا مزہ ہم سے پوچھئے
رہتے ہیں شمع کی طرح اس انجمن میں ہم　　اس انجمن میں کون ہے کیا، ہم سے پوچھئے
ہم کو بتوں کا ڈر نہ برہمن کا خوف ہے　　سچ سچ کہیں گے ہم ، بخدا ہم سے پوچھئے
چلنا نہ آیا ہم کو زمانے کے ساتھ ساتھ　　کیوں ہے زمانہ ہم سے خفا، ہم سے پوچھئے
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ فقیروں کے بھیس میں　　کون آیا اور کون گیا ،ہم سے پوچھئے
دو دوستوں میں زخم کا اِک حادثہ ہوا　　کس نے لگایا کس کو لگا ، ہم سے پوچھئے
اہلِ غرض سے پوچھئے انعام و احترام　　اور دل سے چاہنے کی سزا ہم سے پوچھئے
قاتل ہے کون شہر میں اوروں کو کیا خبر　　نام اس کا ہم سے سنیے ، پتہ ہم سے پوچھئے
شیرینیِ بہار کی لذّت بتائیں آپ　　تلخیِ فصلِ گل کا مزا ہم سے پوچھئے
یہ کیسی دل لگی ہے یہ کیسا مذاق ہے　　درد آپ دیجے اور دوا ہم سے پوچھئے
گرچہ کلیمؔ کی بہت اچھی ہے شاعری
وہ آدمی ہے کتنا بُرا ، ہم سے پوچھئے

لوگ آج اُنھیں پہنے ہوئے پھرتے ہیں تن کر
کل ہم نے قبائیں جو اُتاری تھیں پہن کر

ویراں ہوں پڑا شاخِ گلِ سوختہ بن کر
اے جانِ بہار آ ، مجھے بھی رشکِ چمن کر

احساس کچھ اس کا بھی تو اے وعدہ شکن کر
میں کیا تھا تیرے درد میں ، کیا رہ گیا بن کر

شاید تیرے ہی گیسوؤں سے آئی ہے بن کر
دیوانہ بہت مست ہے زنجیر پہن کر

بلبل تو جدا پھولوں سے ہو ترکِ چمن کر
تب آ کے مرے سامنے دعوئے سخن کر

انگاروں پہ مت درد کے ماروں کے قریب آ
تو باغ میں رہ سیر گل و سروسمن کر

تنقید ہم آشفتہ مزاجوں پہ نہ کر دوست
جا بیٹھ کے آراستہ زُلفوں کی شکن کر

تیرے لیے ہے آئینہ خانہ ہی مناسب
تزئینِ رُخ و گیسو و رُخسار و دَہن کر

میدانِ شہادت میں نہ آ ، یاروں کے گھر بیٹھ
وہ ناز وہ انداز جو کرتی ہے دُلہن کر

پھر شوق سے رکھ لینا کلیم اپنا تخلص
ایجاد میری طرح کوئی طرزِ سخن کر

فصلِ گل آئی دو کام والے بنے اور دونوں کے ارماں نکالے گئے
اِک طرف آستینیں بھگوئی گئیں ، اِک طرف جام و ساغر اُچھالے گئے

باغباں سچ بتا جب بہار آئی تھی ، رہنے والے رہے ، جانے والے گئے
جو رہے اُن کے دامن میں کیا رہ گیا ، جو گئے اپنے دامن میں کیا لے گئے

پھول سی گردنیں بھی تراشی گئیں ، پھول سے ہاتھ بھی کاٹ ڈالے گئے
پھول کے ہار گجروں کی بِکری گئی ، پھول بازار سے پھول والے گئے

بستیاں درد والوں کی ویران ہیں ، اب وہاں میزباں ہیں نہ مہمان ہیں
راستے اِک مدّت سے سنسان ہیں ، آنے والے گئے ، جانے والے گئے

عشق آساں بھی تھا اور مشکل بھی تھا ، پھول بھی تھے گلستاں میں کانٹے بھی تھے
چاک دیوانوں کا پیرہن ہو گیا ، ہوشیار اپنا دامن بچا لے گئے

آشنائے وفا ہیں نہ یارِ وفا ، شہر میں بند ہے کاروبارِ وفا
اس قدر بھاؤ بازار کا گر گیا ، لوگ اپنی دُکانیں اُٹھا لے گئے

آنکھیں سلگ رہی ہیں، سینہ لہک رہا ہے
لیکن نشاطِ غم سے عاجزؔ چہک رہا ہے

وہ درد ہے مجسم کیا اس میں شک رہا ہے
کمبخت کا کلیجہ زخموں سے پک رہا ہے

دیوانگی کی باتیں دیوانہ بک رہا ہے
جو شخص سن رہا ہے وہ بھی سنک رہا ہے

شمشیر کھینچ کے اکثر آتی رہی ہے سر تک
سر کا سفر بھی اکثر شمشیر تک رہا ہے

دیوانہ پھر رہا ہے کھولے ہوئے گریباں
زخموں کی خوشبوؤں سے صحرا مہک رہا ہے

کیا غم بیاں کریں گے دو چار بوند آنسو
دریا اُمنڈ رہا ہے قطرہ ٹپک رہا ہے

باتیں بھی اجنبی ہیں صورت بھی اجنبی ہے
ہر ایک سننے والا منہ میرا تک رہا ہے

کل ہم بھی پی رہے تھے اور کتنے باخبر تھے
اب جو بھی پی رہا ہے، کتنا بہک رہا ہے

زخم اپنا ہے سلامت تو ہم بھی دیکھ لیں گے
دُنیا کی چٹکیوں میں کتنا نمک رہا ہے

ہم بھی اگر بارگہِ یار میں شامل ہوتے
کسی قابل بھی نہ ہوکر بڑے قابل ہوتے

وقت کی بات بنانے میں جو کامل ہوتے
اہلِ محفل ہی نہیں صاحبِ محفل ہوتے

وقت کے اہلِ بصیرت میں جو شامل ہوتے
لبِ گرداب نہ ہوتے، لبِ ساحل ہوتے

یہی دو کام تو اس دَور کی تقدیر میں ہے
ہم اگر قتل نہیں ہوتے تو قاتل ہوتے

ہوتے ہم خاصۂ خاصانِ زمانہ میں شمار
روشِ عام کے گر کچھ متحمل ہوتے

بس ذرا چشم شناسِ بہاراں ہوتی
پھول ہی پھول چمن میں ہمیں حاصل ہوتے

شمع سے پوچھو کہ کیا حالتِ محفل ہوتی
گر نہ ہم سوختۂ جان و جگر و دل ہوتے

اتنے زخموں کے جھروکے تو کسی گھر میں نہیں
درد کس گھر کی طرف جاتا، مرا دل ہوتے

اس قدر عام ہے یہ پیشہ کہ اب ممکن ہے
شرم قاتل کو بھی آنے لگے قاتل ہوتے

اب تو فرصت ہی نہیں ملتی تڑپنے سے کلیمؔ
قتل ہوجاتے یہ اچھا تھا کہ بسمل ہوتے

(۷ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو لاس اینجلس، امریکہ میں نمازِ مغرب کے وقت بابری مسجد کی شہادت کی خبر سن کر)

دردانگڑائیاں پھر لے کے اُٹھا آج کی شام
دل کا پھر ایک ستوں ٹوٹ گیا آج کی شام

آج لوٹی گئی ناموسِ محبت سرِ بزم
عشق رُسوا سرِ بازار ہوا آج کی شام

جسے طوفانوں میں جلتے ہوئے صدیاں گزریں
وہ چراغ اپنی ہی پھونکوں سے بجھا آج کی شام

گھر اجودھیا میں خدا کا نہیں برباد ہوا
رام کا سر ہوا گردن سے جدا، آج کی شام

ہے ہوس صاحبِ دستار و قبا و پاپوش
عشق ہے برہنہ سر، برہنہ پا، آج کی شام

کوئی خوشبو کا خریدار نہیں آج کلیمؔ
نکہتِ گل لیے پھرتی ہے صبا، آج کی شام

جب شکوہ گزاروں کی فہرست بنی پہلے
ٹھہرائے گئے ہم ہی، گردن زدنی پہلے

کیا دَور رہا ہوگا اللہ غنی پہلے
سنتے ہیں کہ ہم بھی تھے قسمت کے دَھنی پہلے

گلزار میں ڈیرا تھا پھولوں میں بسیرا تھا
مشہور تھی اپنی بھی گل پیراہنی پہلے

ساقی کے تواضع کا ساماں تو ہوا لیکن
کتنوں کی ہوئی ہوگی، خاطر شکنی پہلے

کیا جانئے زخموں نے کیا حال کیا دل کا
آنسو تو نہ آتے تھے، گنگا جمنی پہلے

دل ٹوٹنے کا شاید پہلا وہی دن ہوگا
جس روز ہوئی ہوگی، وعدہ شکنی پہلے

تب پھوٹ کے نکلا ہے سرچشمۂ فن عاجزؔ
کھائی ہے کلیجے پر برچھی کی اَنی پہلے

دل کشا چاہے دلگیر بن جایئے ، شاخِ گل چاہے شمشیر بن جایئے
پہلے آ جایئے تو مرے مہرباں ، پھر جو ہو میری تقدیر بن جایئے

میرے خوابوں کا بے سمت ہے قافلہ، آپ اس کے عناں گیر بن جایئے
کرنے دیجے نہ ترکِ تعلق مجھے، میرے پاؤں کی زنجیر بن جایئے

اب مرا دُور رہنا بہت دُور ہے ، میرا جو حشر ہو مجھ کو منظور ہے
مجھ کو مت چھوڑیئے میری تقدیر پر، آپ ہی میری تقدیر بن جایئے

میں تو دیوانہ ہوں اور ہر حال میں ، میری دیوانگی کا علاج آپ ہیں
مسکرائیں تو بن جایئے گلستاں ، زُلف کھولیں تو زنجیر بن جایئے

میرے اشعار کے چشم ولب آپ ہیں، ہاں مری شاعری کا سبب آپ ہیں
میں بنا دوں گا اپنی غزل آپ کو ،آپ غزلوں میں تاثیر بن جایئے

میں نے تیار کی ہے جو اشعار سے، کس قیامت کی تصویر ہے آپ کی
میں دِکھاؤں وہ تصویر اگر آپ کو، آپ حیرت سے تصویر بن جایئے

چشم و اَبرو کو مجھ سے اگر بیر ہے، پھر یہ کیسا تکلف ہے کیا دیر ہے
آپ کا ہے شکار آپ کے سامنے ،ہاں کماں کھینچئے تیر بن جایئے

آپ ہی پھول لیں آپ ہی رنگ و بو، رہنے مت دیجیے مجھ میں میرا لہو
مجھ کو صحرائے ویراں بنا دیجیے۔ آپ وادیِ کشمیر بن جایئے

حسن والوں کا حسنِ ادا ہے یہی ، ہو چکا ہے یہی ہو رہا ہے یہی
زخم دیجے مہا پُرش بن جایئے ، قتل کیجیے مہابیر بن جایئے

ایک بے درد نے دل مرا توڑ کر، طنز سے اِک تبسم کیا اور کہا
جایئے درد انگیز کہیے غزل اور اس دَور کے میرؔ بن جایئے

آپ کے غم کی عاجزؔ بڑی شان ہے، آپ پرتو زمانے کا احسان ہے
زخم کھا کھا کے بن جایئے سرخرو ، زہر کھا کھا کے اکسیر بن جایئے

اب کوئی رُکاوٹ نہیں آنے کے لیے آ
دل خود تجھے ڈھونڈھے ہے ستانے کے لیے آ

ابروؤں پہ بل ڈالے بکھیرے ہوئے گیسو
آ پھر مجھے دیوانہ بنانے کے لیے آ

آ سینہ و دل تیرے لیے کھول دیا ہے
زخموں کے نئے پھول کھلانے کے لیے آ

وہ زخم دیا تونے کہ دل جھوم اُٹھا ہے
کیا کہنا ہے آ ، ہاتھ ملانے کے لیے آ

آ کچھ بھی تو دیرینہ محبت کا بھرم رکھ
دل سے نہ آ ، دنیا کو دِکھانے کے لیے آ

آ رکھ دَہن زخم پر پھر اُنگلیاں اپنی
دل بانسری تیری ہے ، بجانے کے لیے آ

میں تیرے نہ آنے کا سبب بھول گیا ہوں
تو رنج ہے ، یہ یاد دلانے کے لیے آ

اِک بار تو پھر موقع منانے کا مجھے دے
روٹھا ہے تو پھر روٹھ کے جانے کے لیے آ

مانا کہ مرے گھر سے عداوت ہی تجھے ہے
رہنے کو نہ آ ، آگ لگانے کے لیے آ

پیارے تری صورت سے بھی اچھی ہے ، وہ تصویر
میں نے تجھے رکھی ہے دِکھانے کے لیے آ

آ دیکھ لے کیا حال کیا آتشِ غم نے
میں یہ نہیں کہتا کہ بجھانے کے لیے آ

کوئی مجھے شاعر کوئی دیوانہ کہے ہے
میں کون ہوں دنیا کو بتانے کے لیے آ

کچھ روز سے ہم شہر میں رُسوا نہ ہوئے ہیں
آ پھر کوئی الزام لگانے کے لیے آ

مجھ سے تو غزل سن لی بہت تو نے مگر اب
میں ساز اٹھاتا ہوں تو گانے کے لیے آ

اب کے جو وہ آ جائے تو عاجزؔ اُسے لے کر
محفل میں غزل اپنی سنانے کے لیے آ

صاحبِ بزم ہے تو بزم سے باہر ہم ہیں
تو ہی کہہ ، تو ہے ستمگر کہ ستمگر ہم ہیں

سخت جاں ایسے ہیں جیسے کوئی پتھر ہم ہیں
کب سے رکھے ہوئے گردن تہہِ خنجر ہم ہیں

آگے آئینے کے آ ، فیصلہ ہوجائے گا
تجھ سے اونچے ہیں کہ نیچے کہ برابر ہم ہیں

اگر اہلِ جنوں چاہیں گے خود آزاد ہو لیں گے
یہ اہلِ ہوش کیا دیوانوں کی زنجیر کھولیں گے

زمانہ جانتا ہے کس کا دامن چاک کتنا ہے
زمانہ خود ہی پردہ کھول دے گا ہم نہ کھولیں گے

محبت کا ، وفا کا عہد و پیماں عمر بھر کا ہے
زمانہ ڈول جائے ڈول جائے ہم نہ ڈولیں گے

ہمیں کو فن یہ آتا ہے اور اُن کا آزمودہ ہے
گرہ جو پڑ گئی ہے گیسوؤں میں ہم ہی کھولیں گے

زباں تو بولتی ہے وہ بھی جو دل میں نہیں ہوتا
زباں اُن کی نہیں دیکھیں گے ہم تو دل ٹٹولیں گے

یہاں اے عشق سب نکلے ہوس کے پاسداروں میں
نہ بولے گا کوئی تیری طرف سے ہم ہی بولیں گے

جہاں میں سارے بیدردوں نے آخر مات کھائی ہے
وہی جیتیں گے بازی دردِ دل سے کام جو لیں گے

صفت دونوں طرح کی ہے ہمارے دونوں ہونٹوں میں
اگر وہ زہر گھولیں گے تو ہم بھی رَس نہ گھولیں گے

چل اے عاجزؔ ذرا سازِ طرب کی چھیڑ بھی سن لیں
اگر اُمڈے گا دل، جا کر کسی کونے میں رو لیں گے

ہم ہی تو ہیں عاجؔز دل و جاں سے، ہم نہ کہیں تو کون کہے
دردِ جہاں بے درد جہاں سے، ہم نہ کہیں تو کون کہے
آنکھوں سے آنسو بن کے ڈھلے بزم میں بن کر شمع جلے ہیں
ہم ہیں واقف رازِ نہاں سے، ہم نہ کہیں تو کون کہے
زخم کے دن اور درد کی راتیں نالۂ شام اور آہِ سحر
کیا کیا ملا ہے شہرِ بتُاں سے، ہم نہ کہیں تو کون کہے
فصلِ گل آئی شاخیں جھومیں، کلیاں چٹکیں، پھول کھلے
کتنا لہو نکلا دل و جاں سے، ہم نہ کہیں تو کون کہے
اِک ہی زباں اور اِک ہی کہانی سیکھتے گزری ساری جوانی
دل کی کہانی دل کی زباں سے ہم نہ کہیں تو کون کہے گا
کیا تھے ہم اور ہو گئے کیا ہم، کیا تھے تم اور ہو گئے کیا
بات کہاں پہنچی ہے کہاں سے، ہم نہ کہیں تو کون کہے
میؔر میاں کی جیسی باتیں میؔر میاں کے لہجے میں
جا کے پوچھو میؔر میاں سے، ہم نہ کہیں تو کون کہے

جس چمن جا کر غزل ہم گائیں گے　　پھول مرجھائے ہوئے کھل جائیں گے
پیار کی کچھ ایسی خوشبو پائیں گے　　زندگی کے حوصلے بڑھ جائیں گے
رازِ دشمن راز داں بن جائیں گے　　منہ جو پھیرے ہیں گلے مل جائیں گے
جتنا چاہو گے نہ آئے گی ہنسی
اور آنسو بے بلائے آئیں گے

جب بھی تیری نظروں نے شہہ دل کو ذرا دی ہے
کہہ دی ہے غزل ہم نے اور تجھ کو سنا دی ہے

رنگوں کی ہنرمندی لفظوں میں چھپا دی ہے
جو بات بھی کہہ دی ہے، تصویر بنا دی ہے

اے صنفِ غزل تیری توقیر بڑھا دی ہے
تو اور جواں ہوگی، جا میں نے دُعا دی ہے

ہر سمت ڈھونڈھورا ہے، ہر سو یہ منادی ہے
عاجؔز کو خوشی مت دو، وہ درد کا عادی ہے

تا عمر جگر تھامے رونے کی سزا دی ہے
واللہ ستمگر نے کیا دادِ وفا دی ہے

زخموں کو کسی نے بھی مرہم نہ دوا دی ہے
ہر کنڈی ہلائی ہے، ہر دَر پہ صدا دی ہے

ہشیاروں کے جھرمٹ میں بارات چلی زنداں
زنجیریں غزل خواں ہیں دیوانے کی شادی ہے

دل جلنے کا افسانہ پوچھو گے تو کہہ دوں گا
انگارہ رکھا کس نے، اور کس نے ہوا دی ہے

دیوانِ غزل عاجؔز ایوانِ چراغاں ہے
اِک شعر نہیں لکھا، اِک شمع جلا دی ہے

پھر ہے مشتاق ترا سوختہ ساماں جاناں
آ مرے دل کے عدو، جان کے خواہاں جاناں

ہر قدم پر کھلیں زخموں کے گلستاں جاناں
ہاں خراماں ہو پھر، ہاں پھر ہو خراماں جاناں

اس قدر اپنی قبا پر نہ ہو نازاں جاناں
ہم نے دیکھا ہے تجھے چاک گریباں جاناں

تو نے مدّت ہوئی اِک درد کا بخشا تھا چراغ
وہ چراغ اب بھی لیے ہوں تہہِ داماں جاناں

کس بشاشت سے ستم جھیل رہا ہوں تیرے
ساری دُنیا ہے مجھے دیکھ کے حیراں جاناں

چاہنے والوں پہ چلتی رہی شمشیر تری
چاہنے والے پکارا کیے، جاناں جاناں

آج بھی جھوٹی تسلّی سے بہل جاتا ہے
دلِ ناداں ہے ابھی تک دلِ ناداں جاناں

درد کی ڈالیاں، اشکوں کی کلی، زخم کے پھول
ہم تو جانے ہیں یہی فصلِ بہاراں جاناں

رازِ گل تو کہاں جانے ہے جو ہم جانے ہیں
آ کبھی مل کے کریں سیرِ گلستاں جاناں

درد تھمتا ہے تو کرتا ہوں شکایت تیری
درد بڑھتا ہے تو ہوتا ہوں غزل خواں جاناں

بہار آتی ہے اور لوگ جام لیتے ہیں
تو ہم بھی اپنے کلیجے کو تھام لیتے ہیں

زمانہ گزرا مگر آج تک ترے بسمل
تڑپتے رہتے ہیں اور تیرا نام لیتے ہیں

کوئی چراغ بھی ساتھ اُن کا دے نہیں سکتا
یہ صبح لیتے ہیں چین اور نہ شام لیتے ہیں

یہ زخم خوردہ ترے پھر بھی ہیں عجیب وغریب
یہ اپنے درد سے کیا کیا نہ کام لیتے ہیں

یہ روز اپنا جگر کرتے ہیں لہو اور روز
کلام پڑھتے ہیں، دادِ کلام لیتے ہیں

یہ ایک ہاتھ سے قاتل کا روکتے ہیں وار
اور ایک ہاتھ میں ساقی سے جام لیتے ہیں

اگر چمن سے گزرتے ہیں یہ خرابِ بہار
گلوں کا دونوں طرف سے سلام لیتے ہیں

نکل تو جائیں یہ صحرا کو پھاڑ کر دامن
تقاضے شہر کے دامن کو تھام لیتے ہیں

جنابِ میرؔ تو سرخیلِ عاشقاں ہیں کلیمؔ
سنا ہے لوگ تمھارا بھی نام لیتے ہیں

ہر شخص کے ہاتھوں میں آئینے ہیں شانے ہیں
ہم جیسے دِوانے تھے، ویسے ہی دِوانے ہیں

سینے میں جدھر دیکھو زخموں کے خزانے ہیں
اور ہونٹوں پہ جب دیکھو نغمے ہیں ترانے ہیں

ہر روز یہ قصّے ہیں، ہر شب یہ فسانے ہیں
کچھ تیر چلاتے ہیں، کچھ لوگ نشانے ہیں

خنجر جو اُٹھائے ہیں شمشیر جو تانے ہیں
سب ساتھ کے کھیلے ہیں، سب دوست پرانے ہیں

اس دَور میں جینے کے اسباب نہیں ملتے
مرنے کے لیے کیا کیا حیلے ہیں بہانے ہیں

اہلِ جنوں کیا جانیں ہیں کون سے زنداں میں
جس شہر میں بھی دیکھا، سب لوگ سیانے ہیں

یاری و وفا داری، بے مہری و عیّاری
وہ تم نہیں جانو ہو، یہ ہم نہیں جانے ہیں

بے دردوں کی بستی میں ہیں سوچ کے یہ عاجزؔ
آنسو یہاں بونے ہیں اور پھول کھلانے ہیں

گلوں کے سر تو ہمارے ہی فکر وفن سے اُٹھے
بہار ساتھ اُٹھے گی ، جو ہم چمن سے اُٹھے

جو کم نگاہ ، تہی ذوق ، تنگ داماں تھے
سنا ہے بھر کے وہی جھولیاں چمن سے اُٹھے

رہے تو شمع کی مانند انجمن میں رہے
اُٹھے تو نکہتِ گل کی طرح چمن سے اُٹھے

نہ جانے خونِ وفا کب سے جذب ہوتا ہے
کبھی تو بوئے وفا تیرے پیرہن سے اُٹھے

اس انتظار میں بیٹھی ہے وقت کی شیریں
کہ کوہکن کوئی پھر خاکِ کوہکن سے اُٹھے

کلاہ کج کیے بیٹھا ہوا ہوں مقتل میں
چُھری اُٹھے مری جانب تو بانکپن سے اُٹھے

چمن چمن میں غزل خواں رہا عجب کیا ہے
مرے کلام کی خوشبو چمن چمن سے اُٹھے

خوانخواستہ میں شاعری اگر نہ کروں
تو میرے غم کا دُھواں میرے تن بدن سے اُٹھے

حدودِ دَیر و حرم سے نکال دو اُن کو
اُٹھے جو فتنے انھیں شیخ و برہمن سے اُٹھے

کلیجہ خوں کیا عاجزؔ جس انجمن کے لیے
کلیجہ تھامے ہوئے ہم اس انجمن سے اُٹھے

عاجزؔ یہ دردِ جاں ،کوئی دیکھے تو کیا کہے
تم ایسے ناتواں، کوئی دیکھے تو کیا کہے؟

غم کے مقابلے میں صف آرا تمام دن
راتوں کو سسکیاں کوئی دیکھے تو کیا کہے؟

خلوت میں دل کو تھامے ہوئے سرنگوں خموش
محفل میں نغمہ خواں ،کوئی دیکھے تو کیا کہے؟

باتیں تو کررہے ہو بڑے اعتماد سے
منہ پر ہوائیاں کوئی دیکھے تو کیا کہے؟

ہونٹوں پر مسکراہٹیں ،آنکھیں بھری بھری
تم ہی کہو میاں ، کوئی دیکھے تو کیا کہے؟

چھوٹا سا ایک پھوڑا سا ،اِک آبلہ سا دل
اس میں غمِ جہاں ، کوئی دیکھے تو کیا کہے؟

بُت خانے میں قیام بتوں کا زباں پہ نام
ماتھے پہ یہ نشاں ، کوئی دیکھے تو کیا کہے؟

چہرہ اُداس اُداس و دل و جان تتر بتر
نظریں جہاں تہاں ،کوئی دیکھے تو کیا کہے؟

شاعر نہ تھا کلیم تو کیا یہ جواں تھا ہائے
اب کیا ہے یہ جواں ،کوئی دیکھے تو کیا کہے؟

درد کی ہے یہ تاثیر صاحب — میرؔ صاحب بنے میرؔ صاحب
عشق کے پا بہ زنجیر صاحب — آج ہم کل رہے میرؔ صاحب
خود تو رخصت ہوئے میرؔ صاحب — دے گئے ہم کو جاگیر صاحب
اُف وہ زلفِ گرہ گیر صاحب — کس بلا کی ہے زنجیر صاحب
سب اسی کے ہیں نخچیر صاحب — شیخ صاحب ہوں یا پیر صاحب
روز ملتی ہے تعزیر صاحب — آج یہ کل وہ زنجیر صاحب
گھر میں وہ، ہم ہیں رہ گیر صاحب — اپنی اپنی ہے تقدیر صاحب
آج شاہجہاں بن گئے وہ — کل ہمیں تھے جہانگیر صاحب
کل جو آنکھیں چراتے تھے ہم سے — اب بنے ہیں مہابیر صاحب

زندگی درد سے جھوم اُٹھی ہے
ہائے مارا ہے کیا تیر صاحب

قطعہ

کیا کہیں کیا ستم کر گیا ہے — وہ بتِ ہند بے پیر صاحب
اب تک اُسی زُلف کی وادیوں میں — پھرتے ہیں پا بہ زنجیر صاحب
ایسے جاں سوختہ جاں شکستہ — ایسے دل خستہ دلگیر صاحب
دیکھ کر لوگ کہنے لگے ہیں — تم ہو مجنوں کی تصویر صاحب

قطعہ

کیا کہیں کچھ نہ کہتے بنے ہے — سر پہ لٹکی ہے شمشیر صاحب
جتنے ہوتے ہیں گھربار ویراں — جتنی چلتی ہے شمشیر صاحب
آپ پر جرم ثابت نہیں ہے — سب ہماری ہے تقصیر صاحب
میں نے لیکن جو غزلیں کہی ہیں — رکھ دیا جن میں دل چیر صاحب
ایک تصویر اُن سے بنی ہے — دیکھئے تو یہ تصویر صاحب

بول اُٹھےؔ کہ شاباش عاجزؔ
سن کے میری غزل میرؔ صاحب

اُن کی محفل میں ہمیں رونا پڑا گانا پڑا
ہم تو دیوانے نہ تھے ، دیوانہ بن جانا پڑا

درد کے اظہار میں برسوں غزل گانا پڑا
اتنی آساں بات کو بھی کتنا سمجھانا پڑا

ہم نے تو بے ٹوک کہہ دی بات جو کہنے کی تھی
حیرت اُن پر ہے جنھیں خاموش رہ جانا پڑا

تم ہمہ دانی میں مست وہ چاک دامانی میں مست
شہر میں تم ہو پڑے صحرا میں دیوانہ پڑا

پھول جو درکار ہوتے ہیں صبا دے جاتی ہے
شکر ہے ہم کو کبھی دامن نہ پھیلانا پڑا

آئینہ دکھلا کے اِک دُنیا کو شرماتے تھے ہم
آئینہ دیکھا تو خود ہم کو بھی شرمانا پڑا

کلیمؔ شاعرِ خوش فکر و خوش گلو جو ہوئے
یہ فیض ہے اُنھیں ارمانوں کا لہو جو ہوئے

پرانی دوستی جن سے تھی، وہ عدو جو ہوئے
ہمیں کو شرم بہت آئی، رُوبرو جو ہوئے

ہمارے سامنے گرچہ ہمارا ذکر نہ تھا
ہمیں ہیں بعد میں موضوعِ گفتگو جو ہوئے

گلوں میں خوب اڑائی گئی ہنسی ان کی
وہ سادہ لوح، طلبگارِ رنگ و بُو جو ہوئے

وفا کا نام ہوا جن سے، ہو گئے بدنام
بے آبرو وہ ہوئے، وجہِ آبرو جو ہوئے

تمھارے دَور میں یہ بات ہوگئی ثابت
بڑے غضب ہوئے معشوقِ خوبرو جو ہوئے

اُنھیں سے ہوگا کبھی شہرِ آرزو آباد
تمھارے شہر میں بربادِ آرزو جو ہوئے

یہ کس کی بزم ہے جس میں خموش بیٹھے ہیں
وہ لوگ ماہرِ آدابِ گفتگو جو ہوئے

ادب کے ساتھ ہماری غزل سن اے قاتل
یہ اُن کی بات ہے مقتل میں سرخرو جو ہوئے

فسردہ رُو تھے عبادت گہہِ غزل میں کلیمؔ
شگفتہ ہو گئے اشکوں سے باوضو جو ہوئے

بات کم کہتے ہیں لیکن بامحل کہتے تو ہیں
اور کچھ کہتے نہ ہوں، لیکن غزل کہتے تو ہیں

تم ہی سننے کا سلیقہ بھول بیٹھے ورنہ ہم
بات جس انداز سے کہتے تھے کل، کہتے تو ہیں

شاعری بھی اچھی باتوں میں اِک اچھی بات ہے
اس کو بھی منجملہ حسنِ عمل کہتے تو ہیں

کاروبارِ فصلِ گل جاری تو ہے بے فصلِ گل
تم غزل سنتے ہو اور ہم غزل کہتے تو ہیں

وہ ہمیں اپنا گنہگارِ وفا ، یارِ وفا
پہلے تو کہتے نہیں تھے، آج کل کہتے تو ہیں

ہم نے اب تک دردمندی کا بھرم رکھا تو ہے
روتے جاتے ہیں لہو، لیکن غزل کہتے تو ہیں

ہم تو باتوں میں کبھی ردِّ و بدل کرتے نہیں
لوگ کرنے کے لیے ردّوبدل کہتے تو ہیں

فقرو فاقہ ہی سہی ، شاہانہ خودداری تو ہے
جھونپڑے کو اپنے ہم ، اپنا محل کہتے تو ہیں

جھوٹ کہتے ہیں، غلط ہی کہتے ہیں باایں ہمہ
لوگ ہم کو میرؔ صاحب کا بدل کہتے تو ہیں

اس نے یادیں اپنی بھیجی ہیں کہ جاکر پوچھیو
میری یاد آتی تو ہے، عاجزؔ غزل کہتے تو ہیں؟

اب محفلِ غزل میں غزل آشنا ہے کون؟
مانا کہ ایک ہم ہیں مگر دوسرا ہے کون؟

قاتل نے جب پکارا کہ اہلِ وفا ہیں کون ؟
سب لوگ جب خموش رہے، بول اُٹھا ہے کون؟

تم اپنی انجمن کا ذرا جائزہ تو لو
کہنے کو تو چراغ بہت تھے ، جلا ہے کون؟

دعویٰ سخن کا سب کو ہے لیکن تمام عمر
اِک دشمنِ سخن سے مخاطب رہا ہے کون؟

سب دیکھتے جدھر ہیں، اُدھر کیا ہے کچھ نہیں
ہم دیکھتے جدھر ہیں ، اُدھر دیکھتا ہے کون ؟

میں نے جو چھیڑی اپنی نئے طرز کی غزل
سب پوچھنے لگے کہ یہ نغمہ سرا ہے کون؟

تصویرِ میکدہ مری غزلوں میں دیکھئے
سنبھلا رہا ہے کون ، نشے میں گرا ہے کون؟

سب دوست اِک ایک کر کے مجھے چھوڑتے گئے
دُشمن بھی دنگ ہے کہ یہ تنہا کھڑا ہے کون؟

آئینہ تجھ سے پوچھ رہا ہے ، جواب دے
جس نے سنوار دی تری زلفِ رسا ہے کون؟

گھر بھی ترا ، گلی بھی تری شہر بھی تیرا
جو چاہے جس کو کہہ دے تجھے روکتا ہے کون؟

خود اپنی آستیں سے، خود اپنی چھری سے پوچھ
اہلِ وفا ہے کون ، یہاں بے وفا ہے کون؟

عاجزؔ یہ کس سے بات کرو ہو غزل ہو تم
پردہ ہٹاؤ ہم بھی تو دیکھیں چھپا ہے کون؟

ستم کشوں میں وفا کا شعار باقی ہے
دُکاں تو لُٹ چکی ہے، کاروبار باقی ہے

ہزار شکر کہ اس دورِ بے لباسی میں
ہمارا پیرہنِ تارتار باقی ہے

میں ریزہ ریزہ ہوا خانماں خراب ہوا
تو خوش تو ہے ترا سولہ سنگار باقی ہے

دل اس کو اپنا کوئی دے تو کس بھروسے پر
اب اس حسین کا کیا اعتبار باقی ہے

اگر کسی میں طلب ہے تو آئے سیر کرے
مری غزل کے چمن میں بہار باقی ہے

ابھی نہیں تو کبھی میں بلایا جاؤں گا
کہ پیچ و خم تری زُلفوں میں یار باقی ہے

غزل کا ساز بغل میں دبائے پھرتا ہوں
یہی نشانیِ فصلِ بہار باقی ہے

مجاہدانِ محبت نے کیوں کمر کھولی
ابھی تو معرکۂ کار زار باقی ہے

میں جانتا ہوں ترا حال پیرِ میخانہ
نشہ تو ٹوٹ چکا ہے خمار باقی ہے

لہو لہو ہے کلیجہ شکن جبیں پہ نہیں
ہمیں سے اہلِ وفا کا وقار باقی ہے

سب ان کے حلقۂ احساں میں ہوگئے داخل
بس ایک عاجزِؔ شکوہ گزار باقی ہے

کلیمؔ پر ہے بھروسہ غزل کے یاروں کو
کہ اُن کے پاس ابھی اِک شہسوار باقی ہے

دوغزلہ

جسے دیکھوں، جدھر دیکھوں، حیرانی نہیں جاتی
یہ دنیا ایسے بدلی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی

پڑے ہیں شہر میں آ کر، تن آسانی نہیں جاتی
جنوں والوں سے بھی خاکِ جنوں چھانی نہیں جاتی

سروساماں میں بھی بے ساز وسامانی نہیں جاتی
قبا پہنے چلے جاتے ہیں، عریانی نہیں جاتی

شکایت غیر کی، اپنی ثنا خوانی نہیں جاتی
سبق پڑھتے چلے جاتے ہیں، نادانی نہیں جاتی

اب آئینوں کی، شانوں کی فراوانی نہیں جاتی
اسی باعث تو زُلفوں کی پریشانی نہیں جاتی

خدا کی مانتے ہیں اوروں کی مانی نہیں جاتی
فقیری میں بھی ہم سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

اگر آباد رہنا ہے محبت کو نہ آنے دو
یہ آئی جس کے گھر اس کے گھر سے ویرانی نہیں جاتی

شروعِ عمر میں کی ہوگی نادانی محبت کی
اور اس کے بعد سے اب تک یہ نادانی نہیں جاتی

ستم کرتے ہیں وہ اور ہم دُعائے خیر کرتے ہیں
بتوں کے ساتھ بھی خوئے مسلمانی نہیں جاتی

ہماری بات بالکل صاف اور شفّاف ہے عاجؔز
کہیں پھٹکی نہیں جاتی، کہیں چھانی نہیں جاتی

یہ سب شاعر ہیں پہچانے مگر یہ کون صاحب ہیں
کہیں دیکھا ہے لیکن شکل پہچانی نہیں جاتی

کلاہِ کج جبیں پر شیروانی کے بٹن کھولے
خرد کے دَور میں بھی چاک دامانی نہیں جاتی

شمار ان کا بھی ہوتا ہے لکیروں کے فقیروں میں
یہ ایسی بات کہتے ہیں جواب مانی نہیں جاتی

امارت، بادشاہت لٹ چکی اب تو فقیری ہے
فقیری میں بھی لیکن بوئے سلطانی نہیں جاتی

ہمیشہ ٹھوکریں کھاتے ہیں لیکن مسکراتے ہیں
سبق پڑھتے چلے جاتے ہیں نادانی نہیں جاتی

میاں کو شاید عادت ہوگئی ہے وضع داری کی
یہ مشکل ہے کہ یہ عادت بہ آسانی نہیں جاتی

محبت کی، وفا کی، درد کی، باتیں سناتے ہیں
کوئی سنتا نہیں پر اُن کی من مانی نہیں جاتی

بدن بیماروں کی مانند، صورت عاشقوں جیسی
لہو کم ہے مگر چہرے کی تابانی نہیں جاتی

بڑھالی ریش بھی اور ناک پر عینک بھی رکھ لی ہے
میں جتنا دیکھتا ہوں، میری حیرانی نہیں جاتی

اگر عاجؔز یہی ہیں تو بڑا افسوس ہے ان پر
یہ حالت آ گئی لیکن غزل خوانی نہیں جاتی

یہی دُعا کرے بس، اور کوئی دُعا نہ کرے — الٰہی حسن نہ دے اُس کو جو وفا نہ کرے

نصیب ہو کسی بدبخت کو خدا نہ کرے — وہ دل جو سینے میں ٹھنڈا رہے، جلا نہ کرے

یہ صرف رسم نہیں، صرف رسم ادا نہ کرے — نہ دل میں درد ہو جس کے، غزل کہا نہ کرے

بس ایک شرط ہے ان کی گلی میں رہنے کی — گلا بھی کاٹ لیا جائے تو گِلہ نہ کرے

زمانہ اب نہ رہا درد آشنائی کا — کیا جو ہم نے کوئی درد آشنا نہ کرے

یہ فیصلہ اُسی ظالم کے اختیار میں ہے — کہ فیصلہ کرے یا کوئی فیصلہ نہ کرے

یہ آیا کچھ مجھے نقصانِ جان ودل کے سوا — جو نفع چاہے وہ ہم سے معاملہ نہ کرے

چنا اسی کو محبت کے واسطے میں نے — جو حق طلب کرے اور میرا حق ادا نہ کرے

شراب چھوڑ دے غیرت کا یہ تقاضا ہے — شراب کے لیے ساقی سے التجا نہ کرے

جنابِ شیخ کو فرمانِ برہمن ہے یہی — کہ بت کدے میں رہے تو خدا خدا نہ کرے

میں تجھ کو بھولا نہیں ہوں مری غزل ہے گواہ — میں تجھ کو بھول کے زندہ رہوں، خدا نہ کرے

وہی شکایتِ غم ، بس وہی شکایتِ غم
کہو کلیمؔ سے ، محفل کو بدمزہ نہ کرے

پوشیدہ تھا جو رازِ نمو بولنے لگا — ہر برگِ گل سے میرا لہو بولنے لگا

میں نے غزل جو چھیڑ دی آ کر کنارِ جو — خوش ہو کے سبزۂ لبِ جو بولنے لگا

قاتل نے میرا منہ تو دبا رکھا تھا مگر — ایسی چھری چلی کہ گلو بولنے لگا

اب شہر میں تمیزِ سخن ہی نہیں رہی — جو 'آپ' بولتا تھا، وہ 'تو' بولنے لگا

لبریز ماجرا سے تھا لیکن خموش تھا
ہونٹوں سے مل گیا تو سبو بولنے لگا

کاہے کلیمؔ اتنے بُرے ہوتے جاؤ ہو
دِل چھید ڈالے ہے جو غزل تم سناؤ ہو

اُٹھ اُٹھ کے کاہے راتوں کو روؤ ہو گاؤ ہو
تم جاگتے ہو جاگو، ہمیں کیوں جگاؤ ہو

بات ایسی سادہ جیسے ندی کا بہاؤ ہو
اور درد ایسا جیسے کلیجے میں گھاؤ ہو

یوں تو مشاعروں میں بہت کم ہی آؤ ہو
لیکن جب آؤ ہو تو قیامت اُٹھاؤ ہو

اُنگلی ذرا دُکھے ہے تو ہم تلملائے ہیں
تم چوٹ دل پہ کھاؤ ہو اور مسکراؤ ہو

ہر چند شاعری کا مذاق اب بدل گیا
اب بھی مشاعروں میں تمہی یاد آؤ ہو

ہو شہر میں پہ ربط نہیں شہر والوں سے
دیوانے کی طرح یوں ہی آؤ ہو جاؤ ہو

سنتا ہے جو تمھیں، نہ سنے ہے کسی کو وہ
کیا جانے کیا سکھاؤ ہو تم کیا پڑھاؤ ہو

دل میں اُٹھے ہے ٹیس، تو کرتے ہو شاعری
رونا اُمنڈ کے آنے لگے ہے تو گاؤ ہو

تم ہوگئے ہو میر تقی میرؔ کی طرح
آگ اپنے دل کی سب کے دِلوں میں لگاؤ ہو

المختصر تم اچھے نہیں ہو پہ کیا کریں
یہ ممبری نہیں ہے کہ پھر سے چناؤ ہو

تاریخ کہہ رہی ہے چمن میں پکار کے
ایسے نہ آئے تھے کبھی موسم بہار کے

کیا ایسے خوش نصیب بھی ہوں گے جہان میں
جو زندہ رہ گئے ہیں شبِ غم گزار کے

دونوں کے ساتھ وضعِ محبت نباہ دی
غم یار ہی کا چھوڑے نہ غم روزگار کے

کیا دیکھیں ہم کہ ہو رہا ہے کیا زمانے میں
ہم تو کرشمے دیکھتے ہیں چشمِ یار کے

ہم یارِ باوفا نہ سہی، بے وفا سہی
لیکن پڑے ہوئے تو ہیں کوچے میں یار کے

کر لیتے ہم بھی ترکِ وفا، ترکِ آرزو
لیکن یہ کام اب نہ رہے، اختیار کے

پروردگار حشر میں پوچھے مزاجِ دل
اور ہم کہیں کہ شکر ہیں پروردگار کے

کیا کیا نہیں رکھّا ہے غزلوں میں نہاں کرکے
جب چاہا چلے آئے سیرِ دوجہاں کرکے

کہتے تو بہت کچھ ہو، تقریر و بیاں کرکے
کہہ دینے سے کیا ہوگا، دکھلاؤ میاں کرکے

چھیڑی ہے غزل ہم نے خونِ دل وجاں کرکے
جاؤ کوئی لے آؤ آتشؔ کو جواں کرکے

تہذیبِ سخن کرکے تزئینِ بیاں کرکے
دِکھلا دیا قطرے میں دریا کو رواں کرکے

شمع و گل و پروانہ کرنے کو جو کہتے ہیں
بیٹھے ہوئے ہیں سب کچھ ہم سوختۂ جاں کرکے

دل کے لیے جاں کو بھی ڈھوئے لیے پھرتے ہیں
جب دل نہیں کیا ہوگا، اندیشۂ جاں کرکے

ہم ہوگئے مستغنی، جاں سے بھی جہاں سے بھی
پیمانِ وفا تم سے، اے جانِ جہاں کرکے

پھر بھی نہیں خوش کوئی، گو ہم نے بہت رکھا
اپنے کو سُبک کرکے اوروں کو گراں کرکے

سوداگری کانٹوں کی بازار میں جاری ہے
اور ہم ہیں کہ بیٹھے ہیں پھولوں کی دُکاں کرکے

دیکھا نہ کسی نے بھی پوچھا نہ کسی نے بھی
ہم مل گئے مٹّی میں فکرِ دِگراں کرکے

بے نام ونشاں والے، نام ونشاں والے ہیں
نام و نشاں والوں کو بے نام و نشاں کرکے

تھی صنفِ غزل عاجزؔ بیمار و کہن سالہ
ہم ازسرِ نو اس کو، آئے جواں کرکے

لہو جگر ہوا دل خوں ہوں ہوا سو ہوا
میاں غزل کہو روتے ہو کیا، ہوا سو ہوا

روا ہوا سو ہوا ناروا ہوا سو ہوا
ستم جو ہم پہ ہوا، مرحبا! ہوا سو ہوا

وہ جبر کرتا رہا تم بھی صبر کرتے رہے
چلو اُسی کا کرو شکر ادا ہوا سو ہوا

زمانہ گرچہ تماشہ بہت دِکھاتا رہا
دل ابتدا ہی سے دردآشنا ہوا سو ہوا

جو کوئی کر نہ سکا وہ مرے لہو نے کیا
تو سُرخ رُو کبھی اتنا نہیں ہوا سو ہوا

تقاضا زیست کا پورا تو کر نہیں سکتا
جو نہیں ہوا کیا کیجیے، جو ہوا سو ہوا

اے خوشبوئے بہار ، گل و نسترن میں آ
تو آ کے بھی چمن میں نہیں ہے، چمن میں آ
اے خوشبوئے بہار ہر اِک تن بدن میں آ
ہر پیر ہر جواں میں ، ہر اِک مرد وزن میں آ
تو اس لیے نہیں کہ چھپی رہ کسی کے گھر
خلوت کو چھوڑ بزم میں آ ، انجمن میں آ
اب اس کی خوشبوؤں سے مہکتی نہیں فضا
لالہ و رُخوں کی زُلفِ شکن درشکن میں آ
تیرے بغیر ہیچ ہیں سب وضع داریاں
چادر میں آ ، کلاہ میں آ ، پیرہن میں آ
دیوی میں دیوتا میں فرشتوں میں ہے تو کیا؟
انسانوں میں آ ، شیخ میں آ ، برہمن میں آ
تو زندگی کو چھوڑ کر کس کہکشاں میں ہے
گفتار میں، زباں میں ،لبوں میں، دہن میں آ
باتیں بہت ہیں دل میں اُترتی ہی کچھ نہیں
جذبات میں خیال میں آ ،فکر وفن میں آ
جلسے ہیں بے سواد نشستیں ہیں بے مزہ
آداب میں ادب میں آ ،شعر وسخن میں آ
پہلے زمیں ہی گھر تھی ترا آسماں نہ تھا
آ اے وطن کو چھوڑنے والی ، وطن میں آ
تیار دفن ہونے کو ہے میّتِ بہار
پوشاک میں اگر نہیں آئی ، کفن میں آ
تو ہو تو دُشمنی میں بھی ہے لطفِ دوستی
بت گر میں بت پرست میں، آ بت شکن میں آ

خوشبوؤں کو پکار رہا ہے کہاں سے تو
کس گوشے میں چھپا ہے کلیمؔ ، انجمن میں آ

سب اپنا گھر بنا کے گلستاں میں رہ گئے
ہم خاک ہو کے کوچۂ جاناں میں رہ گئے
ہر اِک طرف سے آنے لگی درد کی پکار
گر تھوڑی دیر حلقۂ یاراں میں رہ گئے
ہم نے اُٹھا کے دردِ جہاں دل میں رکھ لیا
سب اپنے اپنے درد کے درماں میں رہ گئے
فصلِ بہار لوٹ کے سب لے گئی بہار
ہم اہتمامِ جشنِ چراغاں میں رہ گئے

عاجزؔ کا بھی شمار سنا ہے انھیں میں ہے
روشن دُو اِک چراغ جو طوفاں میں رہ گئے

درد کی شب ہے کلیمؔ آؤ کہ کچھ رات کٹے
ہاں ذرا روؤ ذرا گاؤ کہ کچھ رات کٹے

دن کسی طرح کسی حال سے کٹ جاتا ہے
رات کٹتی نہیں آ جاؤ کہ کچھ رات کٹے

غم کے مارے ہوئے ہم، درد کے مارے تم
دونوں دیوانے ہیں مل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

ہم تو اب تک نہیں سمجھے یہ غمِ دل کیا ہے
تم سمجھتے ہوتو سمجھاؤ کہ کچھ رات کٹے

غم کی گرد اُڑ رہی ہے، ظلم کو لُو چلتی ہے
آنسوؤں کا کرو چھڑکاؤ کہ کچھ رات کٹے

خود ہو محروم تسلّی سے، ہمیں کیا دوگے
خیر جھوٹی سہی، دے جاؤ کہ کچھ رات کٹے

دُور ہی دُور گزرتی چلی جاتی ہے بہار
خوشبوؤں کو ذرا ٹھہراؤ کہ کچھ رات کٹے

پیاس نے اور بھی یہ رات کٹھن کردی ہے
خالی پیمانے ہی ٹکراؤ کہ کچھ رات کٹے

پہلے بھی جاگے ہیں ہم حال تمھارا سن کر
پھر کہانی وہی دُہراؤ کہ کچھ رات کٹے

درد ہی درد کا درماں کبھی ہوجاتا ہے
اِک غزل درد بھری گاؤ کہ کچھ رات کٹے

اُنگلیاں ٹوٹے ہوئے سازِ جگر پر رکھو
پرچم آواز کا لہراؤ کہ کچھ رات کٹے

کیا حسیں لفظ تراشی کا ہنر ہے تم میں
غم کو جوڑا نیا پہناؤ کہ کچھ رات کٹے

صبح کہتے ہیں غزل ، شام غزل کہتے ہیں
اور ہم کچھ نہیں کہتے ہیں غزل کہتے ہیں
دُھوم ہے شہر کے یارانِ غزل میں کہ کلیمؔ
کیا غزل کہتے ہیں، کیا خوب غزل کہتے ہیں
لوگ کہتے ہیں غزل جب انھیں ملتی ہے شراب
اور ہمیں درد جب اُٹھتا ہے، غزل کہتے ہیں
وہ بہاتا ہے لہو اور غزل سنتا ہے
ہم لہو گھونٹتے ہیں اور غزل کہتے ہیں
چاہتا ہے وہ سزا دینا مگر دیتا نہیں
جرم کرتے ہیں حسین ہم کہ غزل کہتے ہیں
اس کو رنجش نہیں ہوتی ہے مزا آتا ہے
ہم شکایت نہیں کرتے ہیں غزل کہتے ہیں
ان کا عالم عجب ہوتا ہے جو سنتے ہیں غزل
جانے ہم کون سے عالم میں غزل کہتے ہیں
درد کی چوٹ نہیں کھائے تو ممکن ہی نہیں
غزل ایسی کہے ، ہم جیسی غزل کہتے ہیں
کیا غضب ہے یہ زمانہ کہ غزل دُشمن ہے
کیا غضب لوگ ہیں ، جواب بھی غزل کہتے ہیں
درد و غم جمع کیا میرؔ نے ہم نے بھی کیا
وہ بھی کہتے تھے غزل ، ہم بھی غزل کہتے ہیں
اس سے بہتر تو کوئی طرز تخاطب ہی نہیں
ان سے باتیں نہیں کرتے ہیں، غزل کہتے ہیں
ذکر پر میرے وہ منہ پھیر کے بولے عاجزؔ
صورت اچھی نہیں، ہاں اچھی غزل کہتے ہیں

کیا کہیں حال کسی سے ہم، کیا پوچھیں حال کسی سے
شہر میں تو رہتے ہیں لیکن بول نہ چال کسی سے

چارۂ حال کسی کے پاس اور عرض، حال کسی سے
ہم بھی کیا ہیں، مال کہیں ہے، اور سوال کسی سے

کتنی جانیں دے کے لیا ہے غم کا مال کسی سے
بدلے بھی تو ہم نہیں بدلیں اپنا حال کسی سے

بات الگ رہتی ہے اپنی، سب لوگوں کی باتوں سے
ملتا جلتا ہم نہیں رکھتے ، کوئی خیال کسی سے

جیب میں ہے تو چنگاری ہے ، باہر تو انگارہ ہے
اپنا مال بھی دے دیجیے، مت لیجیے مال کسی سے

پھول تو کیا کانٹا بھی لے کر، دے دیتے ہیں خونِ جگر
ہم نے تو اب تک نہ خریدا ، سستا مال کسی سے

چوٹ نہیں لگتی گر دل پر ، شاعر کیسے ہوتے
پہلے ہوگا اب تو نہیں ہے ، ہم کو ملال کسی سے

حال فقیرانہ ہے لیکن تیور تو شاہانہ ہے
کیا جانیں کیسے کرتے ہیں لوگ سوال کسی سے

سالوں سال اسی سے ہم نے درد کی آس لگائی
یہ نہیں کہ اِک سال کسی سے، دوسرے سال کسی سے

اس دُنیا میں کیسے کیسے درد کے مارے گزرے ہیں
میرے دوست مگر نہیں دیتے، میری مثال کسی سے

دبکے دبکے جاتے ہیں عاجزؔ چپکے چپکے آتے ہیں
ہم تو نہیں کرواتے اپنا استقبال کسی سے

کھولی کسی نے زُلف سیہ فام ہی تو ہے
کافی ہے اِک چراغِ غزل، شام ہی تو ہے

اب مجھ سے بے رُخی بے دِلی عام ہی تو ہے
یہ اہلِ درد ہونے کا انعام ہی تو ہے

دل خون خون ہو کہ جگر چاک چاک ہو
اے درد اُٹھ کہ اُٹھنا ترا کام ہی تو ہے

خوش ہیں کہ ایسے دَور میں بھی جی رہے ہیں ہم
ہم جیسوں کے لیے یہ بڑا کام ہی تو ہے

کیوں مجھ پہ ہیں زمانے کی نظریں لگی ہوئی
اب مرے پاس اِک دلِ ناکام ہی تو ہے

دل تھامے کیسی کیسی غزل کہہ رہا ہوں میں
تکلیف میرے واسطے آرام ہی تو ہے

ہم تجھ سے پیار کر کے بھی بدنام ہی تو ہیں
تو سب کا دل دُکھا، کہ دل آرام ہی تو ہے

کل بھی ہم اہلِ ظرف تھے، اب بھی ہیں اہلِ ظرف
مٹی کا اپنا جام سہی ، جام ہی تو ہے

کل تک یہ فرق بھی نہ رہے کیا بعید ہے
میں زیرِ بام تو بھی لبِ بام ہی تو ہے

ہے جس قدر کلیؔم سے ملنے میں احتیاط
اتنا بُرا تو وہ نہیں ، بدنام ہی تو ہے

ہاں چھیڑو غزل عاجؔز چپ رہنے سے کیا ہوگا
کچھ لوگ تو خوش ہوں گے، وہ ہوگا خفا ہوگا

حشر اہلِ محبت کا جو ہوتا رہا ہوگا
دل جوڑو گے گر دل سے، سرتن سے جدا ہوگا

جو زخم بھی وہ دیں گے ، ہر زخم نیا ہوگا
آج اور مزا آیا ، کل اور مزا ہوگا

ہونے کو ستم یوں تو کیا کیا نہ ہوا ہوگا
جیسا کہ ہوا ہم پر ، ایسا نہ ہوا ہوگا

افسانۂ دل ہم سا کب کس نے کہا ہوگا
دل تھام لیا ہوگا ، جس نے بھی سنا ہوگا

یہ معجزہ شاعر سے اے بادِ صبا ہوگا
ہر پھول تر و تازہ ہر بوٹا ہرا ہوگا

ہم اہلِ محبت ہیں ، تاثیر بدل دیں گے
وہ زہر بھی گر دیں گے، اس میں بھی مزا ہوگا

ہر دَور میں دُشمن کو ہم نے یہ دُعا دی ہے
تو نے تو بُرائی کی ، جا تیرا بھلا ہوگا

شمشیر بکف قاتل اشعار بلب شاعر
تلواروں کا جرمانہ غزلوں سے ادا ہوگا

ایک مدّت دل سے صبر و شکر کی باتوں کے بعد
ایک جا ہم تم ہوئے کتنی مناجاتوں کے بعد

چاند نکلا تھا بہت لمبی سیہ راتوں کے بعد
اِک غزل اُبھری تھی کتنی درد کی باتوں کے بعد

زخموں کی چھائی گھٹا، پھولوں کی برساتوں کے بعد
گھپ اندھیرا ہوگیا پھر چاندنی راتوں کے بعد

دل پسیجا وقت کا، کتنی مداراتوں کے بعد
درد کے تحفوں کے بعد اشکوں کی سوغاتوں کے بعد

دوست بن جاتے ہیں دُشمن بھی مداراتوں کے بعد
ہم نہ اپنے ہوسکے اتنی ملاقاتوں کے بعد

خون کے شعلوں سے عاجزؔ کھیت سارے جل گئے
پھر یہ فصل آئے، نہ جانے کتنی برساتوں کے بعد

جس نے اِک بار پیا درد کا نسخہ تیرا
پھر وہ بیمار نہ ہوگا کبھی اچھا تیرا

گھر میں رہنے نہیں دیتا جنھیں سودا تیرا
اب اُنھیں خانہ خرابوں سے ہے رشتہ تیرا

سحر ہے جادو ہے افسوں ہے کرشمہ تیرا
جس نے پکڑا کبھی دامن نہیں چھوڑا تیرا

تیرا ہی چہرہ ان آنکھوں میں نظر آتا ہے
گرچہ اِسن آنکھوں نے دیکھا نہیں چہرا تیرا

وقت نے کیا غضب کیا فرقِ مقام رکھ دیا
مجھ کو تو زیرِ بامِ ، انھیں بالائے بام رکھ دیا

بزمِ غزل میں اِک نیا کیفِ کلام رکھ دیا
میں نے بدل کے بادہ و مینا و جام رکھ دیا

لذّتِ عشق کے سوا ، دولتِ غم کے ماسوا
وقت نے ہم کو جو دِیا ، کر کے سلام رکھ دیا

غم سے جو روشنی ملی ، رکھتے گئے غزل غزل
تا حدِّ شب قدم قدم ، ماہِ تمام رکھ دیا

بلبل کو بھی غزل مری اتنی پسند آ گئی
میرا کلام لے لیا ، اپنا کلام رکھ دیا

میرؔ کے بعد میکدہ خالی پڑا تھا ، میں نے پھر
بھر کے شراب درد سے ، مینا و جام رکھ دیا

قتلِ جہاں کا مسئلہ بس میں نہ تھا جہان کے
تیری بس اِک نگاہ نے کر کے یہ کام رکھ دیا

ساقی ترے ہی ربط سے مینا و مئے عزیز تھی
تو نے نگاہ پھیر لی ، میں نے بھی جام رکھ دیا

میری طرح اب اِک جہاں رکھے پھرے ہے دل پہ ہاتھ
درد جو میرے دل میں تھا ، میں نے تمام رکھ دیا

تھوڑا سا خوں جگر میں تھا وہ بھی غزل میں ڈھال کے
پیشِ جنابِ حضرتِ والا مقام رکھ دیا

اچھا سہی ، بُرا سہی ، میں نے زبانِ سادہ میں
اِک سنگدل کے سامنے دل کا پیام رکھ دیا

ہر غزل ہے نشترِ غم ، کیا کریں
اس میں دل کو دخل ہے ہم کیا کریں

غم زیادہ زندگی کم ، کیا کریں
حق ادا کیوں کر کریں ہم ، کیا کریں

اب پریشاں ہو گئے ہم ، کیا کریں
کیا کریں اے زُلف برہم ، کیا کریں

آنسوؤں کو روک کر ہم ، کیا کریں
ایسے نامحرم کو محرم ، کیا کریں

بن چکے ناسور جتنے زخم تھے
چارہ گر سے لے کے مرہم ، کیا کریں

جب ہنسی کی بات ہوتی ہے کہیں
آنکھ ہو جاتی ہے پُرنم ، کیا کریں

شاعری سے گرچہ دل بیزار ہے
ہو ہی جاتی ہے غزل ، ہم کیا کریں

خرد کی جو فراوانی ہوئی ہے — ہمیں سے کوئی نادانی ہوئی ہے
بڑی ہوشیار بنتی پھر رہی ہے — یہ دُنیا کیسی دیوانی ہوئی ہے
تحمل غم کا جب مشکل ہوا ہے — غزل کہنے میں آسانی ہوئی ہے
سببِ رنجش کا اُن سے پوچھ لیں گے — اگرچہ بات تو جانی ہوئی ہے
کسی محفل میں چھپ سکتے نہیں ہم — کہ یہ آواز پہچانی ہوئی ہے
ذرا دیکھو تو رنگِ لالہ و گل — لہو کی کتنی ارزانی ہوئی ہے
ہزاروں سال بھی گر ہم جئیں گے — وہی ہوگی جو نادانی ہوئی ہے
ہے میری سیدھی سادی بات لیکن — زمانے بھر کو حیرانی ہوئی ہے

غزل پڑھنے کو ہے عاجزؔ یہ سن کر
اُنھیں کیا کیا پریشانی ہوئی ہے

رونا جب آتا ہے تو غزل گانے لگتے ہیں — شاعر نہیں لگتے ہیں ہم دیوانے لگتے ہیں
وہ پرسشِ مزاج جو فرمانے لگتے ہیں — چوٹ ایسی لگتی ہے کہ دل سہلانے لگتے ہیں
بے ساختہ غزل پہ غزل ہونے لگتی ہے — یاد آنے لگتے ہیں تو بس یاد آنے لگتے ہیں
اُٹھتا نہیں ہے درد تو درد اُٹھنے لگتا ہے — چین آنے لگتا ہے تو ہم گھبرانے لگتے ہیں
کرتے ہیں جرم شہر میں جب بھی امیر لوگ — زنجیر ہم غریبوں کو پہنانے لگتے ہیں
میں کس طرح کہوں کہ یہ میرے قاتلوں میں ہیں — سب میرے جانے لگتے ہیں پہچانے لگتے ہیں
آخر تو اپنا یار ہی ہے بے وفا سہی — رُسوا وہ ہوتا ہے تو ہم شرمانے لگتے ہیں
ہے سلسلہ بندھا ہوا شمشیر والوں کا — کچھ جانے لگتے ہیں تو پھر کچھ آنے لگتے ہیں
میری غزل تو خیر مرا آئینہ ہی ہے — اس آئینے میں وہ بھی نظر آنے لگتے ہیں
کیا پوچھتے ہو درد کے ماروں کی زندگی — جینے کو سوچتے ہیں تو مرجانے لگتے ہیں

عاجزؔ یہ کیسا درد تمھاری غزل میں ہے
تم گاتے ہو تو لوگوں کو حال آنے لگتے ہیں

آنکھیں بھی ٹھنڈی کرے گا، دل بھی گرمائے گا کون
ایسا شاعر کون ہے ، ایسی غزل گائے گا کون
درد کا قصہ سنانے والا اب کوئی نہیں
ایک ہم ہیں ہم نہیں آئیں گے تو آئے گا کون
سب نظر آئیں گے جس کو ہم نظر آئے نہیں
ہم جسے آئے نظر اس کو نظر آئے گا کون
اس لیے ہم نے غزل کا فن ابھی چھوڑا نہیں
تم ستم سے تھک کے بیٹھو گے تو بہلائے گا کون
اب کوئی میرے سوا ان کے قبیلے سے نہیں
میرؔ کا جب شعر پڑھیے گا تو یاد آئے گا کون
ہم نے شاہی چھوڑ کر کی ہے فقیری اختیار
ہاتھ ہم پھیلائیں گے تو پاؤں پھیلائے گا کون
ہم نہیں ہوں گے تو لطفِ رقصِ مستانہ کہاں
پینے والے ہیں یہاں پی لیں گے، چھلکائے گا کون
قتل گہ میں جب کبھی گونجے گی قاتل کی پکار
مسکراتا ، رقص کرتا ، جھومتا ، جائے گا کون
بت سے کی ہو یا خدا سے بے وفائی سب نے کی
سب ہی مجرم ہیں کسے زنجیر پہنائے گا کون
ہم ابھی ہیں ہم سے کچھ پوچھو میاں سن لو میاں
کل کہے گا کون ، یہ باتیں کہلوائے گا کون
سامنے کی بات سیدھی بات سادہ بات میں
کام کی بات اور پتے کی بات کہہ جائے گا کون
سن کے وہ میری غزل منہ پھیر کر کہنے لگے
یہ تو دیوانہ ہے کمبخت اس کو سمجھائے گا کون

یہ شکر ہے کہ شکر فراموش ہم نہیں — جو کچھ ملا طلب سے زیادہ ہے کم نہیں
کیا کیا ستم نہیں ہے پہ رنجِ ستم نہیں — اکثر خیال آتا ہے، ہم ہیں کہ ہم نہیں
یہ کیا کہا کہ اور حسینوں میں ہم نہیں — وہ سب تو سنگِ دل ہیں مگر تم بھی کم نہیں
بولے نہیں نہیں، تیرے سر کی قسم نہیں — جیسا کہ تو سمجھ رہا ہے ایسے ہم نہیں
سازش تمھیں نے وقت سے کی ہے کہ بزم میں — ہم ہیں اگر تو تم نہیں، تم ہو تو ہم نہیں

آئینہ ہم تو دیکھ کے حیران رہ گئے
چہرہ لہو لہو ہے مگر آنکھ نم نہیں

چھیڑیئے کیا غزل کوئی، درد آشنا ہو یا نہ ہو — پہلو میں دل ہو یا نہ ہو، ہو تو دُکھا ہو یا نہ ہو
حشر بپا تو ہو گیا، شور اُٹھا ہو یا نہ ہو — شہر پہ جو گزر گئی تم نے سنا ہو یا نہ ہو
سیر چمن کو کیا چلیں اب وہ ہوا ہو یا نہ ہو — موجِ نسیم ہو نہ ہو، بادِ صبا ہو یا نہ ہو
باغ میں میرا گھر بھی تھا، آؤ اُدھر چلیں ذرا — چل کے ذرا صدا تو دیں کوئی رہا ہو یا نہ ہو
میری غزل کے واسطے شرط غزل سرا نہیں — کوئی بھی چھیڑ دے اُسے شیریں نوا ہو یا نہ ہو
میری یہ سرگذشتِ غم جس کو سناؤ گے اُسے — چوٹ لگی ہو یا نہ ہو درد اُٹھا ہو یا نہ ہو
اُن سے تعلقات ہی قائم رہیں تو کم نہیں — وعدے سے ہے غرض ہمیں وعدۂ وفا ہو یا نہ ہو
کہنا جو کچھ تھا کہہ گئے لوگ بھی سب سمجھ گئے — بات ادا تو ہو گئی طرزِ ادا ہو یا نہ ہو
جھانکو تو میرے سینے میں دیکھو تو میرا زخمِ دل — ایسا کسی کے باغ میں پھول کھلا ہو یا نہ ہو
ہم سے ملا کرو میاں ہم سا پھر اس زمانے میں — کوئی ملے نہیں ملے، کوئی ملا ہو یا نہ ہو
دامن دکھا رہے ہو کیا، دامن کوئی سند نہیں — حلق پر چل چکی چھری، خون بہا ہو یا نہ ہو

عاجزؔ کی بات جس سے کی، ہر اِک نے بس یہی کہا
مجھ سے بُرا ضرور ہے سب سے بُرا ہو یا نہ ہو

یہ سرزمین جو وطن ہے شکستہ حالوں کا
یہاں کبھی بڑا مجمع تھا خوش جمالوں کا

ختن کو رشک تھا جن پر یہی وہ بستی ہے
یہاں بھی جھُنڈ نکلتا رہا غزالوں کا

زمین کھا گئی یا آسمان چوس گیا
نشاں کہیں نہیں ملتا ہے درد والوں کا

لگے ہے درد کی صدیاں گزر گئیں دل پر
اگرچہ واقعہ ہے صرف چند سالوں کا

نگاہِ کم سے نہ دیکھو ستم رسیدوں کو
خدا کے ہاتھ میں ہے، ہاتھ پائمالوں کا

ہم اب تو چل نہیں سکتے ہیں بے ٹٹولے ہوئے
یہاں پڑاؤ رہا ہے کبھی اُجالوں کا

یہاں تو لوگ تری بات ہی سمجھتے نہیں
جواب کون دے عاجؔز ترے سوالوں کا

عشق کے غمزدوں سے ہم سفری میری ہے
یہ سبب ہے، غزل درد بھری میری ہے

آنسوؤں سے اُنھیں سیراب کیا کرتا ہوں
شجرِ درد کی ہر شاخ ہری میری ہے

کیا تعجب ہے کہ آباد کبھی ہو جائے
یہ جو ارمانوں کی اُجڑی نگری میری ہے

ندّیاں سوکھ گئیں، ہوگئے دریا پایاب
آج تک آنسوؤں سے آنکھ بھری میری ہے

اس لیے سب کے دِلوں میں یہ اُتر جاتی ہے
شاعری رسمِ تکلف سے بَری میری ہے

نہ ملاوٹ نہ لگاوٹ نہ سجاوٹ نہ بناؤ
چاہے جو بات ہو ہر بات کھری میری ہے

اور کوئی میرا سرمایہ نہیں فن کے سوا
ساری اوقات ترے آگے دھری میری ہے

چُھپ کے الزام نہ دے سامنے آ آنکھ ملا
بول تیری ہے کہ بیداد گری میری ہے

پیار کے لیے میں نے جو چُنا ہے تجھ کو
شہر میں دھوم ہے کیا خوش نظری میری ہے

تیری زُلفوں کو پریشاں نہیں ہونے دے گی
یہ جو غزل میں کچھ آشفتہ سری ہے میری

ہند میں، میں ہوں کلیمؔ اُردو زباں کا گلفام
راجہ اِندر کے اکھاڑے کی پَری میری ہے

درد کے کھیل میں ہستی میری غارت کردی
دلِ کمبخت یہ کیا تو نے قیامت کردی

مجھ کو ضائع نہ کرے گا یہ بھروسہ تھا مجھے
تو نے تو میری امانت میں خیانت کردی

چھین کر مجھ سے میری زندگی کا سارا ہنر
شاعری دے دی بڑی تو نے عنایت کردی

زخموں کو بھرنے کا موقع ہی نہیں ملتا ہے
تُو نے تو سینہ خراشی کی میری عادت کردی

شاعری کی تھی کہ پردہ مری حالت پہ رہے
دیکھئے شاعری نے کیا مری حالت کردی

درد نے کھول دیا آنسوؤں کا دروازہ
آ گیا مال تو میں نے بھی سخاوت کردی

فرصتِ غم نہ تھی مجھ کو ترے غم سے پہلے
تو نے وہ شغل دیا فرصت ہی فرصت کردی

میں ترا تھا ترا ہوں تیرا رہوں گا لیکن
تو بھی تو حوصلہ کر میں نے تو ہمّت کردی

روز سوچا کہ غزل گوئی سے توبہ کرلوں
روز کوئی نہ کوئی اس نے شرارت کردی

ہوبہو تُو میری تصویر نظر آتی ہے
شاعری جا بڑی اُونچی تیری قسمت کردی

اکثر آتا تو رہا ترکِ تعلق کا خیال
میں نے جب قصد کیا دل نے بغاوت کردی

تیرا احسان ہے اے دل کہ ہجومِ غم سے
میں تو گھبرا گیا تھا تو نے حفاظت کردی

میں وہی گاؤں کا کلوا ہوں نہ عاجؔز، نہ کلیؔم
تیری بیداد گری نے مری شہرت کردی

ہر اِک ہاتھ پر ہاتھ مارے چلو ہو
ہمیں سے کنارے کنارے چلو ہو

جو بازی بھی کھیلو ہو ہارے چلو ہو
یہ کیا بے تکی چال پیارے چلو ہو

طبیعت میں پیچیدگی ہے کجی ہے
مگر گیسوؤں کو سنوارے چلے ہو

ہمیں روشنیوں سے محروم کرکے
سجے ماتھے پر چاند تارے چلو ہو

کسی کے بنو یا بنالو کسی کو
یہ کیا شہر میں مارے مارے چلو ہو

میں نہیں کہتا بُرا تھا میں کہ اچھا میں تھا
لوگ ایسے نہیں تھے شہر میں جیسا میں تھا

سونپ دی جس نے ترے ہاتھ میں اپنی تقدیر
وہ سیہ بخت کوئی اور نہیں تھا میں تھا

میری تصویر ترے پاس ہے دیکھ اور بتا
جب تجھے مجھ سے محبت تھی تو کیسا میں تھا

آ گئے اب تو بہت چاند ستارے بن کر
پہلے محفل میں تری آنکھ کا تارا میں تھا

لوگ مجھ سے ہنرِ کج کلہی سیکھتے تھے
اِک زمانہ تھا کہ اس شہر کا بانکا میں تھا

قرۃ العین نے گھر بیٹھے کہانی لکھ دی
حالانکہ آگ کے دریا سے جو گزرا، میں تھا

پیار کے جرم میں لوٹا جو گیا، کون تھا وہ
ہائے وہ شامتِ اعمال کا مارا میں تھا

میرے احباب کو سب سے بڑا غصہ ہے یہی
آج بھی میں وہی چہرہ ہوں جو چہرہ میں تھا

پھولوں میں گوندھ کے زنجیر مجھے پہنا دی
اور میں پھول گیا کیسا دیوانہ میں تھا

سب یہ کہتے تھے کہ اب شاعری کا دَور گیا
ایسے میں سازِ غزل لے کے جو اُٹھا میں تھا

صحن کے بیچ میں جو کھینچ کر دیوار گیا
وہ کوئی اور تھا اور تو نے یہ سمجھا میں تھا

گائے جاتے تھے مرے گیت گلی کوچوں میں
سانوری میری یہ دُنیا تھی سنوریا میں تھا

شبِ غم کیا یونہی کروٹ بدلتے ہی بسر ہوگی
ستارو! رات کتنی رہ گئی ہے کب سحر ہوگی

ہمیں پہلے کہاں معلوم تھا طول اس قدر ہوگی
یہ شب جو آپ کی زُلفوں کے سائے میں بسر ہوگی

نویدِ فصلِ گل سے واسطہ کیا ہم غریبوں کو
یہ عید آئی ہے کن کے گھر، انھیں لوگوں کے گھر ہوگی

بہت ہے شرحِ غم کے واسطے اِک قطرہ آنسو کا
کہانی اتنی دلکش ہوگی جتنی مختصر ہوگی

وفا سے منہ نہ موڑا ہے نہ موڑیں گے کبھی عاجزؔ
خطا یہ ہم سے ہوتی آئی ہے اور عمر بھر ہوگی

غربت میں وطن کا جو کبھی نام لیا ہے
وہ چوٹ لگی ہے کہ جگر تھام لیا ہے
زنجیر ہمیں کیا یونہی پہنائی گئی ہے
دل جان دیا ہے تو یہ انعام لیا ہے
غزلوں کا نیا تاج محل کردیا تعمیر
ہم نے ان اشکوں سے بڑا کام لیا ہے
یہ عمر طویل اس کی محبت میں جو گزری
اس عمر میں کیا کیا نہیں الزام لیا ہے
رشک آنے لگا ہے ہمّتِ مردانہ پہ اپنی
جب جائزۂ گردشِ ایّام لیا ہے
اِک زخم لگایا ہے مرے دل پر ہر اِک صبح
اور اِک چراغ اس نے ہر اِک شام لیا ہے
اس شوخ نے فرمائی ہے جب پرسشِ احوال
وہ چوٹ لگی ہے کہ جگر تھام لیا ہے
آئینہ کوئی خانۂ دل کا دیا اس کو
اور ٹوٹا سا پھوٹا سا کوئی جام لیا ہے
احسان و کرم ہم نے ہمیشہ کیا اس پر
اس کا کوئی احسان نہ اکرام لیا ہے
چونسٹھ برس تو ہو گئے چھوڑے ہوئے سب کام
بس ان پہ غزل کہیے یہی کام لیا ہے
پتھر ہمیں کچھ ایسے بتا توڑ لگے ہیں
دل تھام لیا ہے کبھی سر تھام لیا ہے
جس شوخ نے اس حال میں پہنچایا ہے ہم کو
اس شوخ کا ہم نے نہ کبھی نام لیا ہے

ہم نے کس کا کیا بول بالا نہیں
ہم گرے تو کسی نے سنبھالا نہیں
پھر نہ ایسی کہانی سُنی جائے گی
جو ہوا ہم پہ اب ہونے والا نہیں
موسمِ گل بھی خوشبو نہ پھیلا سکا
چاند نکلا ہے لیکن اُجالا نہیں
ہر غزل کیوں ہماری انوکھی نہ ہو
کون انداز اس کا نرالا نہیں
کون چھینے اُسے کون توڑے اُسے
یہ خدا ساز چلّو ہے پیالا نہیں
کب تری مہربانی سے اے باغباں
میری گردن میں اشکوں کی مالا نہیں
کون اہلِ وفا پر کہے گا غزل
کوئی میرے سوا رونے والا نہیں

اشکوں سے لبالب ہو کے مری آنکھوں کا سفینہ آیا ہے
پھر دھوم مچی ہے یاروں میں ساون کا مہینہ آیا ہے
دل خون کیا تب ہم کو غزل کہنے کا قرینہ آیا ہے
ہر شعر انگوٹھی ہے جس میں ہر لفظ نگینہ آیا ہے
زخموں سے دل چھلنی ہوا تب تان کے سینہ آیا ہے
اِک عمر مرے بے موت میاں تب ہم کو جینا آیا ہے
ہاتھوں میں تنگ ظرفوں کے خم و جام مئے و مینا آیا ہے
محروم ہے ان سے مئے خانہ جن لوگوں کو پینا آیا ہے
کیا سال مہینے دن وہ تھے، جب ہم بھی تھے تم بھی خوش تھے
وہ سال کبھی پھر آیا ہے وہ دن نہ مہینہ آیا ہے
شاگرد نہیں ہم مکتبِ غم کے اہلِ غم کے وارث ہیں
غم درس بہ درس نہیں آیا، سینہ بہ سینہ آیا ہے
اس شخص نے اتنی عمر میں بھی کیا تازہ طبیعت پائی ہے
اکثر میری غزلوں کو سن کر یاروں کو پسینہ آیا ہے

وہ لمحہ کاش ترے دل پہ بھی گزر جائے
جو عمر بھر کے لیے بے قرار کر جائے
کمال اس میں نہیں ہے کہ عرش پر جائے
کلیمؔ بات وہ کہہ دل میں جو اُتر جائے
میری حیات بکھر جائے تو بکھر جائے
دعا ہے زُلفِ پریشاں تری سنور جائے
اس انہماک سے میری غزل نہ سن پیارے
مری طرح تیرے دل میں نہ درد بھر جائے
اب ایسی آنکھ کسی کو نہ دیجیو یارب
کہ درد ہی نظر آئے جدھر نظر جائے

زخم کھایا مگر دل لگا تو چلے ہم ہیں کس کام کے یہ بتا تو چلے
تجھ پہ اے ہند کے سرزمینِ وطن درد کی سوکھی گنگا بہا تو چلے
اور کچھ شاعری کا نہ حاصل سہی تھوڑا رو تو چلے تھوڑا گا تو چلے
دور کا ڈھول ہی ہو سہاون تو ہے ہم محبت کا ڈنکا بجا تو چلے
ہر غزل جشن ہے مرگِ انبوہ کا اس مقولے کو سچ ہم بنا تو چلے
نوحۂ غم سہی کچھ تو ہنگامہ ہے کچھ نہ کچھ گھر کی رونق بڑھا تو چلے
تم نے کتنا ہلایا ڈُلایا ہمیں ہم ہلیں گے نہیں یہ دِکھا تو چلے
یہ بڑا کام تھا خیر ہو تو گیا تم ہمیں ہم تمھیں آزما تو چلے
ترک مت کیجیے مشقِ دارورسن فائدہ ہو نہیں ہو، دوا تو چلے
مستقل بند دروازہ کچھ تو کھلا تم میرے حال پر مسکرا تو چلے
نکہتِ گل تو چلنے کو تیار ہے پہلے گلشن میں بادِ صبا تو چلے
میرؔ پہنچے جہاں کون پہنچا وہاں ہم مگر میرؔ کا راستہ تو چلے
جس کو سب لوگوں نے چوم کر رکھ دیا دُور تک ہم وہ پتھر اٹھا تو چلے
غم ہے لٹنے کا لیکن خوشی بھی تو ہے لٹ کے جو کچھ بچا وہ لٹا تو چلے
غم کی گرمی میں غزلوں کی شبنم لیے بن کے ہم ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا تو چلے
بن کے نقّار خانے میں طوطی سہی ہم بھی اپنی غزل گنگنا تو چلے

اپنے فن کو ترازو بناؤ کلیمؔ
کس کا کیا وزن ہے کچھ پتہ تو چلے

شکوہ بہت ہے اس سے مگر پیار بھی تو ہے
وہ گرچہ بے وفا ہے مگر یار بھی تو ہے

ہم دوستی کا ہاتھ بڑھائے ہوئے تو ہیں
مانا کہ اس کے ہاتھ میں تلوار بھی تو ہے

یہ شاعری ہماری فقط شاعری نہیں
اس شاعری میں در کا بیوپار بھی تو ہے

اس شہر میں کوئی تو خریدے گا دردِ دل
اِک تیری ہی گلی نہیں بازار بھی تو ہے

گرمی بہت ہے، دھوپ بہت ہے، تپش بہت
لیکن کسی کا سایۂ دیوار بھی تو ہے

ہم میں زیادہ عقل کی باتیں نہ ڈھونڈیئے
ہم شاعروں کو عشق کا آزار بھی تو ہے

آخر ہم اور کس سے کریں کاروبارِ عشق
تم سامنے ہو تم سے سروکار بھی تو ہے

اس کے خلاف میری زباں بولتی تو ہے
کم بخت دل اسی کا طرفدار بھی تو ہے

مانا نتیجہ پیار کا اچھا ضرور ہے
بعد از مگر خرابیِ بسیار بھی تو ہے

داڑھی کلیم نے جو بڑھالی تو کیا ہوا
مانا بزرگ ہے پہ گنہگار بھی تو ہے

یہ جو ہم اپنا دلِ زار سنبھالے ہوئے ہیں
حضرتِ عشق کا گھر بار سنبھالے ہوئے ہیں

وہ ہیں کشتی پر یہ پتوار سنبھالے ہوئے ہیں
دینداروں کو گنہگار سنبھالے ہوئے ہیں

ہر قدم زیست کا معیار سنبھالے ہوئے ہیں
وضع کو ہم ہی وضع دار سنبھالے ہوئے ہیں

ایک دُکانِ وفا بھی نہیں سنبھلی تم سے
ہم تو بازار کا بازار سنبھالے ہوئے ہیں

ہم ہی دیوانے ہیں جو آج بھی گردن دے کر
کاروبارِ رسن و دار سنبھالے ہوئے ہیں

معجزہ یہ ہے کہ اس دورِ صحت مندی میں
عشق کو عشق کے بیمار سنبھالے ہوئے ہیں

ہم فقیروں ہی سے شاہی بھی سنبھل جائے گی
اس سے پہلے بھی کئی بار سنبھالے ہوئے ہیں

آپ کے عہد میں گو ہم بہ سرِ کار نہیں
ہم ہی تو آپ کو سرکار سنبھالے ہوئے ہیں

یہ خبر سن کے، کہ نکلے ہیں قلم لے کے کلیم
جتنے جلاّد ہیں تلوار سنبھالے ہوئے ہیں

خدایا غزل کا اگر ساز دینا　　مجھے میؔر صاحب کا انداز دینا
وہ لہجہ جو ہے قابلِ ناز دینا　　وہی سوز دینا ، وہی ساز دینا
وہ آہنگ دینا اُتر جائے دل میں　　کلیجے کو چھولے وہ آواز دینا
مرے پاس کہنے کی باتیں بہت ہیں　　مجھے بات کہنے کا انداز دینا
مجھے آسمانوں میں اُڑنا نہیں ہے　　دِلوں کی فضاؤں میں پرواز دینا
غزل درد انگیز چھیڑی ہے ہم نے　　ذرا درد والوں کو آواز دینا
بدل جائیں گی دوریاں قربتوں میں　　میں آواز دوں گا تم آواز دینا
میں تنہا کلامی سے گھبرا گیا ہوں　　مجھے کوئی یارب ہم آواز دینا
تمھیں جب ضرورت ہو خونِ جگر کی　　میں آجاؤں گا مجھ کو آواز دینا
نئی شاعری شاعری ہی نہیں ہے　　نئے شاعروں کو پھر آغاز دینا
میں پھر اپنے اشعار میں جی اُٹھا ہوں　　مرے قاتلوں کو پھر آواز دینا

بہت خوش ہے عاجؔز فقیری میں اپنی
اُسے کوئی عہدہ نہ اعزاز دینا

(دورۂ قلب کی علالت کے دوران آئی سی یو میں لکھی گئی غزل)

آج عاجؔز تیرا پوشیدہ تعب ظاہر ہوا　　تیرا رازِ گفتگوئے زیرِ لب ظاہر ہوا
جس سے دن بے چین تھا راتوں کو بے آرام تھا　　وہ ترا سوز و گدازِ روز و شب ظاہر ہوا
جس سے نکلی پھوٹ کر شیرینیِ حسنِ کلام　　وہ نہاں سرچشمۂ شعر و ادب ظاہر ہوا
سن رہے تھے شعر تو بیسوں برس سے لیکن آج　　وہ جو تیری شاعری کا تھا سبب ظاہر ہوا

مختصر لفظوں میں بس میری یہی تشخیص ہے
چوٹ کب دل پر لگی تھی درد اب ظاہر ہوا

نام آتا ہے جب میرا ہوتا ہے خفا کوئی
کیا میں نے بگاڑا ہے پوچھے تو ذرا کوئی

اس شوخ کی ہے یہ بھی شوخیِ ادا کوئی
کرتا ہے بُرا کوئی ، بنتا ہے بُرا کوئی

ہم اہلِ محبت ہیں ہو اہلِ جفا کوئی
کر بھی سکا کیا کوئی ، کرلے گا بھی کیا کوئی

بے درد و حسیں تم سا ہم کو نہ ملا کوئی
اب بھی نہیں ہے کوئی پہلے بھی نہ تھا کوئی

وعدے تو ہوئے کتنے ، پورا نہ ہوا کوئی
اُمڈے تو بہت بادل برسی نہ گھٹا کوئی

سولی دو اگر توڑے پیمانِ وفا کوئی
چاہے بے وفا ہم ہوں یا آپ ہوں یا کوئی

اس شہر میں سنتے ہیں منصف نہ رہا کوئی
اب دے بھی تو کس کو دے مجرم کا پتہ کوئی

آیا ہے نہ آئے گا پھر ایسا مزا کوئی
میں چھیڑوں غزل کوئی ، تو ساز اُٹھا کوئی

ہم سا نہیں محفل میں اب شیریں نوا کوئی
شک تجھ کو ہو گر کوئی جا ڈھونڈ کے لا کوئی

یوں سامنے کی باتیں آتی ہیں غزل بن کر
جیسے میرے کانوں میں دیتا ہے صدا کوئی

جو دیکھے ہے کہہ دے ہے دیکھو یہی عاجؔز ہیں
ہم سا بھی نہیں ہوگا انگشت نما کوئی

سر سے تلوار کہ سینے سے کٹاری گزرے
کم ہے جو کچھ بھی رفاقت میں تمھاری گزرے

عمر گزری کہ سرِ راہ وفا بیٹھے ہیں
بھولے بھٹکے تو کبھی تیری سواری گزرے

ہم اسے جان چکے خوب اُسے پہچان چکے
دُور ہی دُور ذرا بادِ بہاری گزرے

دلِ برباد سے منزل گہہِ دامن کی طرف
کتنے ہی قافلے آنکھوں سے ہماری گزرے

ان کی راتوں کی بہت دھوم سنا کرتے ہیں
کاش ایسی کوئی اِک رات ہماری گزرے

دردِ دل میں وہ حلاوت ہے کہ جی چاہے ہے
زندگی یوں ہی تڑپتے ہوئے ساری گزرے

کھیل ہی میں درد سے یاری لگی
ہم کو بچپن سے یہ بیماری لگی
چوٹ چاہے ہلکی یا بھاری لگی
ہر ادا اس کی ہمیں پیاری لگی
کچھ تو خود پیاری تھی اس کی شخصیت
کچھ ہماری اس میں فنکاری لگی
ہائے وہ مستی شروعِ درد کی
کام کی ہر بات ناکاری لگی
ہم نہ سمجھے، سب نے سمجھایا بہت
ہم کو ناسمجھی سمجھ داری لگی
اب تسلّی کا تحمل بھی نہیں
دلدہی ہم کو دل آزاری لگی
ہوگئی بلبل غزل خواں میرے ساتھ
اس بے چاری کو بھی چنگاری لگی
کہنے بیٹھے شاعری کا ہم سبب
اور اسی میں زندگی ساری لگی
رفتہ رفتہ ہر ستم آساں لگا
پہلے پہلے تھوڑی دُشواری لگی
مجھ اکیلے ہی پہ گزرا وہ ستم
جس میں دُنیا بھر کی تیاری لگی
ہائے بچپن سے بڑھاپا آ گیا
وہ نہیں چھوٹی جو بیماری لگی
دیکھا عاجزؔ کو تو ویرانہ لگا
شاعری دیکھی تو پھلواری لگی
ہم تو عاجزؔ دنگ ہوکر رہ گئے
سادگی میں بھی وہ پُرکاری لگی

آنسو نہیں ہیں خونِ جگر کی ہیں کیاریاں
یہ سُرخ سُرخ جیب وگریباں کی دھاریاں

شمشیر والوں کو بھی ہوئیں شرمساریاں
اللہ رے ان کے ابروؤں کی زخم کاریاں

اب تو بھی آزمالے مقدر اے ہم نشیں
ہم کو تو راس آ نہ سکیں اُن کی یاریاں

سب کا دُکھڑا، سب کے دل کا درد بن جائیں گے ہم
لوگ سر دھننے لگیں گے، جب غزل گائیں گے ہم

اپنی تاثیرِ سخن ہر دل میں رکھ جائیں گے ہم
شکل آنکھوں میں پھرے گی جن کو یاد آئیں گے ہم

یاد آ جائیں گی کچھ باتیں تڑپ جاؤ گے تم
باتوں باتوں میں کچھ ایسی بات کہہ جائیں گے ہم

وہ کسی میں بھی نہیں ہے جو سلیقہ ہم میں ہے
جب نہ کوئی کام آئے تو کام آئیں گے ہم

ہم تو اہلِ شوق ہیں اور شوق کی کچھ حد نہیں
حد اگر آ جائے گی حد سے گزر جائیں گے ہم

ہم کو کچھ رنجش نہیں ہے تم کو رنجش ہو تو ہو
تم خفا جب ہو کے بیٹھو گے تو بہلائیں گے ہم

جس کے ہم آئینہ و شانہ ہیں وہ گیسو ہو تم
تم بکھر جاؤ گے گر، تم سے بچھڑ جائیں گے ہم

اتنا سرمایہ عنایت کر گئی فصلِ بہار
زندگی بھر آنسوؤں کے پھول برسائیں گے ہم

اُن کے کوچے میں پھرا کرتے تھے دل کھولے ہوئے
کیا خبر تھی چوٹ اتنی سخت کھا جائیں گے ہم

ہم تو اس کوشش میں ہیں اندھیرا محفل میں نہ ہو
ان کو یہ ضد ہے کہ زُلفیں اور بکھرائیں گے ہم

بے وفا تم ہی سہی لیکن یہ رُسوائی تو ہے
سب تمھیں الزام دیں گے اور شرمائیں گے ہم

دیکھئے حضرتِ کلیم احمد عاجزؔ ہیں یہی
سب ہمیں مڑ مڑ کے دیکھیں گے جدھر جائیں گے ہم

وہ یاد آتے ہیں یاد آنے کے دن ہیں غزل گاؤ غزل گانے کے دن ہیں
جفاؤں کی گھٹا چھانے کے دن ہیں یہ اُن کے زُلف لہرانے کے دن ہیں
کہاں وہ دن اب ان کی سادگی کے شباب آیا ہے اترانے کے دن ہیں
شکایت کرکے بھی ہم کیا کریں گے ستم ڈھائیں ستم ڈھانے کےدن ہیں
غضب ہوتی ہے دیوانی جوانی سمجھنے کے نہ سمجھانے کے دن ہیں
یہ جشنِ یومِ آزادی نہیں ہے ہمیں زنجیر پہنانے کے دن ہیں
دلِ پُرخوں کا ہے فیضان جاری یہی تو جام چھلکانے کے دن ہیں
وہ دن آئے کہیں دل ان کا آئے ابھی تو ان پر دل آنے کے دل ہیں
غزل عاجزؔ نے پھر چھیڑی ہے تم پر
چلے آؤ ، چلے آنے کے دن ہیں

چلے جارہے ہوتو رخصت سے پہلے ذرا مل تو لو پھر محبت سے پہلے
خفا ہوتو کیوں ہو خطا ہے تو کیا ہے؟ سزا دے رہے ہووضاحت سے پہلے
غزل ہے مری اس لیے خوبصورت تعلق تھا اِک خوبصورت سے پہلے
وہ نام آشنا میرا ہو یا نہیں ہو کلام آشنا تھا وہ مدّت سے پہلے
شکایت پہ اب اس کی مجبور ہوں میں محبت تھی جس بے مروّت سے پہلے
مزا آ گیا وہ دِیا درد تم نے نہ تھے آشنا ایسی لذّت سے پہلے
زمانہ اِدھر سے اُدھر ہورہا ہے نہ چلتے تھے تم اس نزاکت سے پہلے
مجھے شاعری کا سلیقہ نہیں تھا کسی کی نگاہِ عنایت سے پہلے
یہ تیور ، یہ لہجہ غزل میں کہاں تھا
کلیم عاجزِ خوش طبیعت سے پہلے

مرے بعد آنکھ ان کی ڈبڈبائے گی، مری جب یاد آئے گی
گھٹا اُمڈی تو بے برسے نہ جائے گی، مری جب یاد آئے گی

بہت بنتے ہیں کچھ بھی بن نہ آئے گی، مری جب یاد آئے گی
یہ زنجیرِ تکلف ٹوٹ جائے گی، مری جب یاد آئے گی

کلیجہ دھک سے ہو جائے گا سینے میں، بدن ہوگا پسینے میں
جگر میں ایک بجلی کوند جائے گی، مری جب یاد آئے گی

بہت سنسان ہوں گے آئینہ خانے، دھرے رہ جائیں گے شانے
وہ زلفِ خم بہ خم پھر بل نہ کھائے گی، مری جب یاد آئے گی

صبا کو درد سوز و ساز بخشتا ہے خرامِ ناز بخشتا ہے
صبا بھی چلتے چلتے لڑکھڑائے گی، مری جب یاد آئے گی

نہ بلبل کو ترانے یاد آئیں گے، نہ سبزے لہلہائیں گے
کلی بھی مسکرانا بھول جائے گی، مری جب یاد آئے گی

یہ دُنیا جو بہت اِترائے چلتی ہے، مجھے ٹھکرائے چلتی ہے
مری غزلوں کو سینے سے لگائے گی، مری جب یاد آئے گی

آنکھ سے آنسو نہیں آتے ہیں، آتے ہیں چراغ
لوگ لاتے ہیں اندھیرے، ہم جلاتے ہیں چراغ

جستجو میں کس رُخِ روشن کے سرگرداں ہیں ہم
پاؤں رکھتے جا رہے ہیں، جلتے جاتے ہیں چراغ

درد میرا ایک سامانِ بصیرت بن گیا
مجھ سے جو آتے ہیں ملنے، لے کے جاتے ہیں چراغ

دونوں اپنے کام میں سرشار ہیں سرمست ہیں
وہ بُجھاتے ہیں چراغ اور ہم جلاتے ہیں چراغ

جسے درد سے آشنائی نہ دے الٰہی اُسے دل رُبائی نہ دے
تمنّا بہت دے رسائی نہ دے مجھے بندگی دے خدائی نہ دے
جسے دیکھ لے وہ نگاہیں اُٹھا اُسے پھر کہیں کچھ دِکھائی نہ دے
دعا مرتے مرتے میں کر جاؤں گا کسی کو بھی دردِ جدائی نہ دے
بھلا کیا دے یا حسن کے پاس ہے اگر تحفۂ بے وفائی نہ دے
غزل میں دُکھوں کو سنگارا کروں مجھے اور کوئی کمائی نہ دے
نہ گھر ہے نہ بستی کدھر جاؤں گا مجھے قید ہی رکھ رہائی نہ دے
غضب ہے غزل سننے والوں کو بھی میرے دل کی دھڑکن سنائی نہ دے
یہ وہ دور ہے جس میں ہو قتل عام مگر کوئی قاتل دِکھائی نہ دے
پہنچ میری غزلوں کے مفہوم تک مجھے دادِ نغمہ سرائی نہ دے
وہاں چل جہاں دردِ دل کے سوا
صدا اور کوئی سنائی نہ دے

آئینے ہم سے ہیں شانے ہم سے زندہ ہیں سارے فسانے ہم سے
چھین کر سارے خزانے ہم سے سننا چاہے ہیں ترانے ہم سے
منتشر کر کے وہ شیرازۂ دل آئے ہیں ہاتھ ملانے ہم سے
لوگ ہر شام سنا کرتے ہیں اُن کی زُلفوں کے فسانے ہم سے
دوستی سے بھی وہ ہوتے ہیں خفا دُشمنی کیا ہے نہ جانے ہم سے
خوب ہے اوروں سے وعدوں کا لحاظ کیا کیا ہوتے ہیں بہانے ہم سے
کر دیا ڈھیٹ جفا میں اُن کو بے وفائی کی وفا نے ہم سے
چھیڑ کر ہم کو نئے دوست کلیمؔ
قصّے سنتے ہیں پرانے ہم سے

نکھرتی صبح جانے ہے، سنورتی شام جانے ہے
مجھے اچھی طرح سے گردشِ ایام جانے ہے
جو میری طرح زخمِ دل کو بھی انعام جانے ہے
وہی ناکامیوں میں ڈھونڈ ھ لینا کام جانے ہے
محبت جو سبھی کاموں سے بڑھ کر کام جانے ہے
نہ وہ تکلیف جانے ہے نہ وہ آرام جانے ہے
چمن کا ہر شگوفہ ، ہر کلی ، ہر پھول ، ہر پتّا
مری گفتار سمجھے ہے مرا پیغام جانے ہے
گریباں پھاڑ لوں ہوں، سی بھی لوں ہوں جوڑ بھی لوں ہوں
وہ دیوانہ ہوں میں جو عقل کا سب کام جانے ہے
اِک ایسی نسل میخانہ کا میرِ کارواں میں ہوں
جو خوں نابِ جگر کو بادۂ گلفام جانے ہے

جب سے چوٹ لگی ہے دل پر جان کو ہارے پھرتے ہیں
شہروں شہروں ،گلیوں گلیوں مارے مارے پھرتے ہیں
گرچہ اپنی اپنی دُھن میں چاند ستارے پھرتے ہیں
ہم کو تو ایسا لگتا ہے یہ ساتھ ہمارے پھرتے ہیں
دِل ٹوٹے دِل والے اُجڑیں ، بجلی گرے یا آگ لگے
اُن کو کیا ہے وہ تو اپنی زُلف سنوارے پھرتے ہیں
دید کی خوشیاں ملن کی گھڑیاں ، پیار کے میٹھے میٹھے بول
جاگتے سوتے آنکھوں میں، اب تک وہ نظارے پھرتے ہیں
پیار کی بھیک کہاں مل جائے ، دل کی پیاس کہاں بجھ جائے
چوکھٹ چوکھٹ ، ڈیوڑھی ڈیوڑھی ، دوارے دوارے پھرتے ہیں
یہ تو بتاؤ آنکھیں ملا کر جیسے تم آنکھیں پھیر گئے
یوں ہی کیا سب دُنیا والے پیار سے پیارے پھرتے ہیں؟
عاجزؔ صاحب دیوانے ہیں شعر و سخن وہ کیا جانیں
دُکھڑا گاتے ، گیت سناتے ، رات گزارے پھرتے ہیں

کہلواتا ہے جو دورِ جہاں کہنا ہی پڑتا ہے
کبھی نامہرباں کو مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

لیے پھرتے رہے اب تک حسابِ دوستاں دردِل
مگر اب تو حسابِ دوستاں کہنا ہی پڑتا ہے

زباں سے تم تو کہتے ہو کہ تم پہ مہرباں ہیں ہم
نظر کہتی ہے کیا اے مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

بتوں سے اتنا دیرینہ تعلق باوجود اس کے
ہوا جو کچھ سرِ کوئے بتاں کہنا ہی پڑتا ہے

غزل ہرگز نہیں کہتے مگر دل کی یہ حالت ہے
کہ مشکل ہے نہیں کہنا میاں کہنا ہی پڑتا ہے

ہر اِک محفل میں جا کر ہم غزل کہتے نہیں لیکن
جہاں وہ شوخ ہوتا ہے وہاں کہنا ہی پڑتا ہے

مروّت بھی اور اس پر مصلحت بھی اُف قیامت ہے
عدوئے جاں کو بھی جانِ جہاں کہنا ہی پڑتا ہے

وہ ہنس کر جب یہ کہتے ہیں، کہو اچھے تو ہو عاجزؔ
نہیں دل میں ہے لیکن منہ سے ہاں کہنا ہی پڑتا ہے

❁

مہہ و انجم کسی قابل نہ ہوں گے
اگر دُنیا میں اہلِ دل نہ ہوں گے

غموں سے چور جب تک دل نہ ہوں گے
محبت کے مزے حاصل نہ ہوں گے

ملیں گے کیسے کیسے چارہ فرما
مگر آگاہِ دردِ دل نہ ہوں گے

گریباں چاک ہوں اور دل نہ ہوں چاک
ہم اُن دیوانوں میں شامل نہ ہوں گے

نظر آئیں گے کیا کیا حسن والے
مگر وہ پیار کے قابل نہ ہوں گے

جب انساں کا کوئی دُشمن نہ ہوگا
بغل میں کیا جنابِ دل نہ ہوں گے؟

محبت میں بچے گی جان کیوں کر
حسیں جو ہوں گے یا قاتل نہ ہوں گے؟

بہت ہوں گے جہاں میں زخم خوردہ
مگر میری طرح بسمل نہ ہوں گے

وہ محفل کیسی محفل ہوگی عاجزؔ؟
جہاں ہم رونقِ محفل نہ ہوں گے

غزل کو دیتے ہیں خوں، دل میں جس قدر بھی ہے　　یہی ہے عیب ہمارا ، یہی ہنر بھی ہے
وہ بدگماں ہیں وفا سے کرم سے ہم مشکوک　　جو حال ادھر ہے وہی ماجرا ادھر بھی ہے
اسی پہ مست نہ ہو آئینہ جو کہتا ہے　　زمانہ کیا تجھے کہتا ہے کچھ خبر بھی ہے
جو کہہ رہا ہوں غزل میں وہ دیکھتا بھی ہوں　　جہاں خیال گیا ہے وہیں نظر بھی ہے
جہاں خزاں نے اُتارا ہے قافلہ اپنا　　وہی تو بادِ بہاری کی رہ گزر بھی ہے
یہ دَور دورِ خزاں ہے کب اس سے ہے انکار　　مگر بہار ہے نزدیک یہ خبر بھی ہے

اگرچہ شام کا منظر ہے ہر طرف عاجؔز
میری نگاہ میں اس شام کی سحر بھی ہے

مرنا جو مقدر ہے پھر کاہے کو رونا ہے　　بن جائے جو بننی ہے، ہو جائے جو ہونا ہے
ہے عشق تو دُنیا کے ہنسنے پہ نہ رونا ہے　　دُشنام تو کھانی ہے ، بدنام تو ہونا ہے
جھولی کی بھی کیا حاجت ہم جیسے فقیروں کو　　اک ہاتھ سے پانا ہے اک ہاتھ سے کھونا ہے

بھٹّی میں محبت کی دل جھونک کے بیٹھا ہوں
جل جائے تو مٹّی ہے، گل جائے تو سونا ہے

یہ سماں اُسے دکھا دوں ، صبا جا اُسے بلالا　　نہ بہار ہے نہ ساقی ، نہ شراب ہے نہ پیالا
ہمیں اہلِ غم نے اُٹھ کر علمِ جنوں سنبھالا　　جہاں راستہ نہیں تھا وہاں راستہ نکالا
نئے پیار کی زباں میں، میں غزل جو لکھ رہا ہوں　　ہے دیارِ برہمن میں یہی اِک نیا شوالا

اسی شہر میں سنا ہے، رہے ہے کلیم عاجؔز
مرا بھی سلام کہیو جو ملے وہ درد والا

یہ کس حسین کے گیسو سنوارے جاتے ہیں
کہ ہم پھر آئینہ لے کر پکارے جاتے ہیں

سمندروں میں ہمیں لوگ اُتارے جاتے ہیں
وہ اور ہیں جو کنارے کنارے جاتے ہیں

پکارے جاتے ہیں یا بے پکارے جاتے ہیں
جو اس گلی میں پہنچتے ہیں، مارے جاتے ہیں

وہ راہ جو رَسن و دار پر گزرتی ہے
اسی سے اہلِ محبت گزارے جاتے ہیں

لہو کے پھولوں کی ہے مانگ ہر زمانے میں
ہر ایک دَور میں قاتل سنوارے جاتے ہیں

یہی تو دیکھ رہے ہیں ،یہی تو دیکھا ہے
جو پیار کے لیے جیتے ہیں، مارے جاتے ہیں

ہمیشہ خاک نشینوں نے یہ دکھایا ہے
سوار کیسے زمیں پر اُتارے جاتے ہیں

سنبھال اُنھیں جنھیں اب پیار کو بلایا ہے
ہماری فکر نہ کر، ہم تو پیارے جاتے ہیں

سمجھ میں دیکھئے آتا ہے یا نہیں آتا
کلیمؔ کرتے ہوئے کچھ اشارے جاتے ہیں

دل درد کی بھٹّی میں کئی بار جلے ہے
تب کوئی غزل حسن کے سانچے میں ڈھلے ہے

برباد مجھے کرکے بہت لوگ ہیں آباد
اِک میرا لہو کتنے چراغوں میں جلے ہے

رشتہ رَسن و دار سے ہے اہلِ جنوں کا
پروانہ بھی آئے ہے جہاں شمع جلے ہے

بے چین ہمیں کرکے یہ بے درد زمانہ
یوں چین سے سوئے ہے کہ کروٹ بھی نہ لے ہے

صحرا کا ہے کیا ذکر کہ بادِ سحری کا
گلشن میں بھی چلتے ہوئے اب پاؤں جلے ہے

تری تلوار سے مرعوب اب تک ہم نہیں پیارے
نظر نیچی نہیں ہے پیارے گردن خم نہیں پیارے

جو عالم تیرا کل تھا آج وہ عالم نہیں پیارے
تغیّر کا سبب تُو خود ہے پیارے ہم نہیں پیارے

میرے پیارے یہ آنسو ہیں مرے، شبنم نہیں پیارے
الگ رہیو کہ یہ چنگاریوں سے کم نہیں پیارے

یہی چلّو بہت کچھ ہے ، یہ چلّو کم نہیں پیارے
گدائے عشق کو پروائے جامِ جم نہیں پیارے

دِلوں کو جیتتے ہیں ، ملک پر قبضہ نہیں کرتے
قلم رکھتے ہیں اپنے ہاتھ میں پرچم نہیں پیارے

نہ آئی بے وفائی ہم کو اب تک غم اسی کا ہے
وفاداری نہ آئی تم کو ، اس کا غم نہیں پیارے

بہت دیکھو گے عاجؔز سے تماشا رقصِ بسمل کا
غلط سمجھے ہوئے ہو تم کہ اس میں دَم نہیں پیارے

خوب تڑپوں گا میں اور خوب تماشا ہوگا
درد اگر اچھا نہیں ہوگا تو اچھا ہوگا

یوں تو اس شوخ کے عالم پہ تھی عالم کی نظر
ہم نے جو دیکھا وہ کسی نے نہیں دیکھا ہوگا

لوگ سنتے ہیں غزل میری تو بول اُٹھتے ہیں
اس کی تصویر ہے ایسی تو وہ کیسا ہوگا

مری حسرتوں کا چمن جو تھا، اُسے خاک وخوں میں ملا دیا
ترے گھر میں پھول کھلا دیئے، تجھے خوشبوؤں میں بسا دیا

یہ تیرے ستم کی بڑائی ہے ، مجھے روز غم نیا دیا
یہ میری وفا کا کمال ہے کہ نباہ کرکے دکھا دیا

مرے دل کو دولتِ غم ملی، ، تیری آرزو کی کلی کھلی
مرے آنسوؤں کو دُعائیں دے، تجھے مسکرانا سکھا دیا

کبھی جن سے رسم نہ راہ تھی ، جسے ذوق تھا نہ نگاہ تھی
اسے انجمن میں بلالیا ، مجھے انجمن سے اٹھا دیا

مری کچھ خطا نہ قصور ہے مگر اتنا جرم ضرور ہے
جو بھی ترا طرزِ عمل ہوا وہ غزل میں کہہ کے سنا دیا

مری شاعری میں ترے سوا ، کوئی ماجرا ہے نہ مدعا
جو فسانہ تیری نظر کا تھا ، وہ مری غزل نے سنا دیا

اندھیرے جائیں گے، روشن دن آنے والے ہیں
خبر ملی ہے کہ وہ مسکرانے والے ہیں

ابھی سے جامہ سے باہر زمانے والے ہیں
ابھی کہ آئے نہیں ہیں وہ آنے والے ہیں

بہت دِکھایا ، بہت کچھ دِکھانے والے ہیں
ہم آئینے نہیں آئینہ خانے والے ہیں

ہمارا نام بھی آتا ہے اُن کے نام کے ساتھ
وہ ناز والے ہیں ہم ناز اُٹھانے والے ہیں

بچی ہوئی ہے محبت کی آبرو ہم سے
ہم اس زمانے میں اگلے زمانے والے ہیں

جسے وہ چاہیں بگاڑیں جسے وہ چاہیں بنائیں
وہی بگاڑنے والے بنانے والے ہیں

بہار کانٹوں سے گلشن کو بھر رہی ہے بھرے
نہیں ہم ان میں جو دامن بچانے والے ہیں

(فساد کے پس منظر میں بھاگلپور سے ایک بچے کی غزل، بزبانِ کلیم عاجزؔ، ۱۸ر دسمبر ۱۹۸۹ء)

ہمارے دوست عجب دوستی نبھا کے چلے
جو گھر سنوارنے آتے تھے گھر جلا کے چلے

گلے لگاتے تھے ہنس ہنس کے صبح و شام جنھیں
وہ آئے اور گلے پر چھری چلا کے چلے

بڑے جلال میں شمشیر تولتے آئے
تڑپتے دیکھ لیا جب تو مسکرا کے چلے

کمالِ قوتِ بازو کا ان کی کیا کہنا
گلوں کی شاخ پر شمشیر آزما کے چلے

درخت مہندی کا شاید نہ تھا علاقے میں
لہو ہمارا بڑے شوق سے لگا کے چلے

ہماری عمر تھی کم اور اُچٹ گئی تھی نیند
تھپک تھپک کے چھری سے ہمیں سلا کے چلے

کہا جو ہم نے کہ ہم آپ کے پڑوسی ہیں
تو سر اُتار کے اور ٹھوکریں لگا کے چلے

اگرچہ رات تھی سردی کی اور غریب تھے ہم
لہو کی گرم سی چادر ہمیں اوڑھا کے چلے

اُمید تھی ذرا پُر لطف وقت گزرے گا
کلیم کیسی غزل تم ہمیں سنا کے چلے

مجھ کو اس نے پہچانا ہے جس نے مرا پہچانا درد
جیسا میں ہوں ویسا دل ہے جیسا دل ہے ویسا درد

رشتے بہت دنیا میں ہیں لیکن سب میں ہے گہرا رشتہ درد
اب بھی درد وہی دیتا ہے جس نے دیا تھا پہلا درد

میری غزل اتنی ہی سنوری جتنا مجھ کو پہنچا درد
شعر و ادب کا گہنا غزل ہے اور غزل کا گہنا درد

دولتِ دل، سرمایۂ دُنیا سب کچھ کھوکر پایا درد
مجھ سے سنو کس کو کہتے ہیں سستا درد اور مہنگا درد

اس میں مرجانا پڑتا ہے، اس میں جینا پڑتا ہے
دشمن کا ہے کڑوا کڑوا، دوست کا میٹھا میٹھا درد

ہیں جمع سخن والے ،فن والے ، ہنر والے
چھیڑ ایسی غزل عاجؔز جو دل کو ہلا ڈالے

اے عشق کے دیوانے ،اے درد کے متوالے
رونا ہوتو کچھ رولے ، گانا ہوتو کچھ گالے

پہلے نہ تھے یہ آنسو ، یہ آبلے ، یہ چھالے
ہم بھی رہے پھولوں میں،ہم بھی تھے چمن والے

ہم بھی پھرا کرتے تھے زُلفوں میں شکن ڈالے
ہم بھی رہے البیلے ، ہم بھی رہے ہریالے

اور اب تو یہ حالت ہے ،غم ٹلتا نہیں ٹالے
نالوں سے بھرے نغمے،نغموں سے بھرے نالے

زخموں کو رہیں پالے مرہم کو رہیں ٹالے
پیدا کہاں ہوتے ہیں اب ایسے غزل والے

اے غم یہاں اب کیا ہے، جا اور کوئی رستہ لے
سب مل گئے مٹّی میں ، دل والے ،جگر والے

اب رہ گئے ہیں ہم ہی ناکردہ خطا والے
ہاں خوب جفا کرلے ہاں خوب ستم ڈھالے

ہر قاتلِ شہر آئے ، کرسیِ مسیحا لے
ہر زخم پہ تمغہ لے ، ہر قتل پر درجہ لے

ہم غم کے ہیں بیوپاری، جو چاہے یہ سودا لے
دونوں کو موافق ہے ،مجنوں لے کہ لیلیٰ لے

ہر درد کے مارے کو یہ کہہ کے پکڑ والے
آ میری غزل سن لے، آ دل ذرا بہلا لے

پھر کاش بہار آئے صحرا میں کھلیں لالے
پھر نکہتِ گل لے کر آ جائیں غزل والے

دل کے لیے غزلوں میں ہے برف بھی بجلی بھی
جلتا ہوتو ٹھنڈا کر ٹھنڈا ہوتو گرما لے

عاجؔز نے کہی جیسی اور جیسی وہ کہتا ہے
تب جانوں ،غزل ایسی اوروں سے کہلوا لے

سب ہمیں اُن کا نوا سنجِ جفا کہتے ہیں
دیکھنا یہ ہے وہ سنتے ہیں تو کیا کہتے ہیں

بس یہی تجھ سے ہم اے بادِ صبا کہتے ہیں
ملیو پھولوں سے تو کہیو کہ دُعا کہتے ہیں

آپ کس کس کی زباں بند کریں گے صاحب
ہم جو کہتے ہیں لوگ اس سے سوا کہتے ہیں

قتل ہونا ہی پڑے گا کہ کیا ہے ہم نے
وہ بڑا جرم جسے جرمِ وفا کہتے ہیں

وہ جس پہ سارے جہاں کا عتاب ہے پیارے
یہی وہ عاجزِؔ خانہ خراب ہے پیارے

غموں نے بیچا غموں نے مجھے خرید لیا
یہ میری زیست کا لبِّ لباب ہے پیارے

اسی لیے تو بہرحال چاہتا ہوں تجھے
سنا ہے عشق بھی کارِ ثواب ہے پیارے

میں دل لگا کے بھی ناکام ہوں زمانے میں
تو دل کو توڑ کے بھی کامیاب ہے پیارے

مری غزل میں جو ہے داستانِ فصلِ بہار
وہ تیرا قصۂ عہدِ شباب ہے پیارے

نہ اہلِ غم کوئی مجھ سا ، نہ تجھ سا اہلِ ستم
میں بے مثال ہوں تو لاجواب ہے پیارے

ذرا بتا کہ یہ میرا لہو بھرا دل ہے
کہ تیرے ہاتھ میں جامِ شراب ہے پیارے

تو گل بدست تھا خنجر بہ کف تو کیسا ہوا
یہ میرا خواب کہ تعبیرِ خواب ہے پیارے

کسی کو عہدِ وفا کیا ، وفا بھی یاد نہیں
اس عہد کا یہ بڑا انقلاب ہے پیارے

سنبھال کے میرا مجموعۂ غزل رکھیو
اسی میں تیرا حساب و کتاب ہے پیارے

کلیمؔ کو ترے غم نے بنا دیا عاجزؔ
یہ میرا نام نہیں ہے خطاب ہے پیارے

اب آئے ہو بہلانے اب آئے ہو سمجھانے
جب پھاڑ چکے دامن ، جب ہو چکے دیوانے

تم عمر کے ساتھی تھے جب تم نہیں پہچانے
دُنیا کی شکایت کیا ؟ دُنیا ہمیں کیا جانے؟

اب ہم کو بھی کہتے ہو گلشن سے نکل جانے
دو پھول جو ہاتھ آئے تم بھی لگے اِترانے

کیا ہوگا محبت کا انجام خدا جانے
تم عشق کے دُشمن ہو ہم حسن کے دیوانے

اب ہم ہی سنائیں گے دُکھ درد کے افسانے
دم توڑ چکی بلبل ، جل بجھ چکے پروانے

سب ہم سے ہیں برگشتہ سب ہم سے ہیں بیگانے
خم ہوں کہ مئے و مینا شیشے ہوں کہ پیمانے

جب درد کی مستی میں ہم بیٹھے غزل گانے
کچھ لوگ تڑپ اُٹھے ، کچھ ہوگئے دیوانے

اس فصلِ بہاراں میں دل ٹوٹ گئے جتنے
اتنے کسی موسم میں ٹوٹے نہیں پیمانے

چھیڑی جو غزل ہم نے موسم ہی نکھر آیا
رُخ سے ملے آئینے زُلفوں سے ملے شانے

اب دیکھئے عاجزؔ بھی دھوکہ ہمیں دیتے ہیں
آئے تھے غزل پڑھنے ، کہنے لگے افسانے

جو مری غزلوں کو عاجؔز ہوش مندانہ سنے
ایسے افسانے سنے کہ پھر نہ افسانہ سنے

جیسا سننے کا تقاضا ہے اگر ایسا سنے
ہوش آ جائے مری باتیں جو دیوانہ سنے

ہم نہیں کہتے کہ اوروں کا نہ فرمانا سنے
ہم نے چھیڑی ہے غزل سب سے جداگانہ سنے

درد کیسا گیت ہے بلبل سے پروانہ سنے
ایک دیوانہ سنائے ،ایک دیوانہ سنے

خم سنے ،شیشہ صراحی ، جام و پیمانہ سنے
ہم جو کہنے جا رہے ہیں سارا میخانہ سنے

دردِ دل کی بات سب کے فائدے کی بات ہے
دوست یا دشمن سنے اپنا کہ بیگانہ سنے

سلسلہ دوش و کمر تک ہی نہیں ، ہم سے کوئی
قصّۂ کارِ درازِ زلفِ جانانہ سنے

شمع پر جلنے میں اس کو اور مزہ آ جائے گا
ہم جلے ہیں کس طرح گر ہم سے پروانہ سنے

ہم شکستہ دل نہ تھے ، کیسے شکستہ دل ہوئے
اس کا بھی دل ٹوٹ جائے جو یہ افسانہ سنے

اُن کا دامن بچ گیا تو چپ رہیں ایسا نہ ہو
بات نکلے شہر سے اور کوئی دیوانہ سنے

ہم نے شاہی چھوڑ کے کی ہے فقیری اختیار
ہم فقیروں سے کوئی گفتارِ شاہانہ سنے

مجھ سے جو ملتا ہے وہ حیرت میں رہتا ہے کلیؔم
میرا رونا دیکھے یا میرا غزل گانا سنے

ہر جگہ پینا مزہ دے یہ خیالِ خام ہے
میکدہ پھر میکدہ ہے ، جام پھر بھی جام ہے

کل بہت پیارا تھا عاجؔز اب بہت بدنام ہے
ہائے کیا آغازِ افسانہ تھا ، کیا انجام ہے

میری غزلوں میں جو میرا غم ہے وہ غم عام ہے
لوگ کہتے ہیں کہ ایسی شاعری الہام ہے

میری بربادی کا اُس کے سر الزام ہے
وہ ہنسی روکے ہوئے بیٹھا ہے جس کا کام ہے

وہ محبت کی ملاقاتیں کہاں ، باتیں کہاں
اب تو کوئی بام پر ہے اور نہ زیرِ بام ہے

سب کو شاید اپنا اپنا واقعہ یاد آ گیا
میں نے چھیڑی ہے غزل تو ہر طرف کہرام ہے

دردِ دل پھر شاعری دے کر کہا یہ وقت نے
یہ تو مزدوری ہے تیری اور یہ انعام ہے

جو کہے ہم سے محبت کے لیے تیار ہیں
ہم دیوانوں کو محبت کے سوا کیا کام ہے

کل تو اس کمبخت نے پڑھ کر غزل تڑپا دیا
وہ جو ہے پٹنہ کا اِک شاعر بھلا سا نام ہے

لہو کی اشرفیاں آنسوؤں کے لال و گہر | منگائے جاتے ہیں اوران پہ وارے جاتے ہیں
اُنھیں کی مانگ سجائی ، بنائی جاتی ہے | اُنھیں کے واسطے سب چاندتارے جاتے ہیں
ہم ایسے لوگ کہاں اُن کے پیار کے قابل | ہم ایسے لوگ تو صدقے اُتارے جاتے ہیں
وہی تو دولتِ غم بانٹتے ہیں کیا کیجے | وہ جب بلاتے ہیں دامن پسارے جاتے ہیں
شہیدِ ناز کا خوں رائیگاں نہیں جاتا | اسی لہو سے تو قاتل سنوارے جاتے ہیں

ہمارے درمیاں باتیں غزل میں ہوتی ہیں
اشارے آتے ہیں اُن کے اشارے جاتے ہیں

میرا درد و سوزِ جانی اور ہے | اور لوگوں کی کہانی اور ہے
میں مریضِ غم نہیں اس دور کا | مجھ کو بیماری پرانی اور ہے
حضرتِ عاجزؔ نے چھیڑی ہے غزل | آج تو محفل سہانی اور ہے
مجھ سے سنیے اس حسیں کا تذکرہ | لطف کچھ میری زبانی اور ہے
میں غزل کہتا ہوں جس محبوب پر | کیا جہاں میں اس کا ثانی اور ہے؟
اس کو دیکھو اور کہو ایمان سے | کیا کہیں ایسی جوانی اور ہے؟
میں اسی کا تھا اسی کا اب بھی ہوں | لیکن اس کو بدگمانی اور ہے
میں تڑپنے کا ہوں ماہر اس لیے | مجھ پر اس کی مہربانی اور ہے
رنگ لایا ہے شہیدوں کا لہو | اب تو قاتل کی جوانی اور ہے
ہوگی دَورِ میرؔ میں اُجڑی ہوئی | اب تو دلّی راجدھانی اور ہے

ہر غزل سے ہے الگ میری غزل
خونِ دل ہے اور ، پانی اور ہے

تعلق اُن سے ہے یاری نہیں ہے
محبت کوئی فنکاری نہیں ہے

مرا تو امتحاں ہو ہی چکا ہے
اب ان کی ہے مری باری نہیں ہے

وفا والے دُکانیں بند رکھیں
ابھی اس کی خریداری نہیں ہے

بہت کھیلے وفا کے کھیل ہم نے
کوئی بازی مگر ہاری نہیں ہے

غزل میں سوز و ساز آئے تو کیسے
دِلوں میں کوئی چنگاری نہیں ہے

مجھے سب کچھ محبت نے دیا ہے
کوئی شئے غیر سرکاری نہیں ہے

میں اُن سے پیار کرنا کیسے چھوڑوں
مجھے کیا زندگی پیاری نہیں ہے

سمجھ کر پاؤں رکھ کوئے وفا میں
کہ یہ مقتل ہے، پھلواری نہیں ہے

یہ مانا ہم نے بے چارہ ہے عاجزؔ
غزل عاجزؔ کی بے چاری نہیں ہے

میں اس کا غزل خواں ہوں اور وہ میری دشمن ہے
میں ابنِ مسلماں ہوں وہ بنتِ برہمن ہے

اس دَور میں پھر زندہ دو مکتبِ فن ہے
پٹنہ کا میں جوگی ہوں، دلی کی وہ جوگن ہے

سیندور ہے نہ چندن ہے، ٹیکہ ہے نہ کنگن ہے
سچ ہے کہ پیا جس کو چاہے وہ سہاگن ہے

اس کو تو نہیں مجھ کو اس کے لیے تڑپن ہے
یہ درد کا رشتہ ہے یہ پیار کا بندھن ہے

ہر سمت یہ منظر ہے، ہر سو یہی درشن ہے
گردن پسِ خنجر ہے، خنجر پسِ گردن ہے

دونوں ہی سیانے ہیں، دونوں ہی کھلاڑی ہیں
میں اس کا سپیرا ہوں اور وہ میری ناگن ہے

جھٹکے تو بہت پہنچے، جھونکے تو بہت آئے
اب تک اسی چولی سے اٹکا ہوا دامن ہے

سب اہلِ نظر عاجزؔ رکھتے ہیں نظر اس پر
یہ میری غزل ہے یا سنوری ہوئی دُلہن ہے

گراہی چاہے تو گر لیکن ایسا مت گر تُو
کہ یار اُٹھنے کے قابل نہیں رہے پھر تُو

لڑے ہے کیوں تو، سمجھتا نہیں ہے کیوں آخر تُو
کہ اس جہاں میں مسافر ہوں میں مسافر تُو

وفا کی اپنی میں لاؤں سند، میں لاؤں سند
یہ پھر تو کہہ گیا کیا ، کیا یہ کہہ گیا پھر تُو

پکار جب بھی ہوئی بہرِ امتحانِ وفا
ہر ایک بار میں حاضر تھا ، غیر حاضر تُو

وفا کے عہد سے انکار مجھے ہے کہ تجھے
تو خود ہی بول کہ کافر ہوں میں کہ کافر تُو

کرے گا قتل بھی ، دامن بچا بھی جائے گا
میں جانتا ہوں کہ ہے اس ہنر میں ماہر تُو

تو جھوٹ بولے گا، ثابت بھی اس کو کردے گا
میں جانتا ہوں کہ اس بات پہ ہے قادر تُو

میں جانتا ہوں کہ سارا قصور تیرا ہے
میں مانتا ہوں کہ مجرم نہیں بظاہر تُو

میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں تھا تُو پہلے
میں پوچھتا ہوں کہ ایسا ہوا کیوں آخر تُو

ہم اجنبی ہیں کہ دُشمن ہیں کہ دوست ہیں کیا ہیں؟
ہمارے بارے میں کیا سوچتا ہے آخر تُو

زمانہ تجھ کو بہت ناپسند کرتا ہے
مگر ابھی بھی ہے میرا پسند خاطر تُو

یہ ملنا رُوٹھنا ہوتا ہی ہے محبت میں
چلا گیا ہے بلا سے ، چلا تو آ پھر تُو

ترے لیے تو کوئی مستقل تڑپتا ہے
کبھی کبھی تو تڑپ جا کسی کی خاطر تُو

میں اس اُمید میں غزلیں کہے ہی جاتا ہوں
کسی دن آئے گا بے چین ہو کے آخر تُو

خدا کرے میری غزلیں قبول ہوجائیں
زمانہ دیکھے وہی میں ہوں پھر ، وہی پھر تُو

کم اختلاط ،کم آمیز ، کم سخن عاجزؔ
کسی بھی حال سے لگتا نہیں ہے شاعر تُو

یاد اِک گزرا ہوا دورِ بہار آ ہی گیا
رونا تو آنا ہی تھا بے اختیار آ ہی گیا

دل کی زینت کے لیے زخموں کا ہار آ ہی گیا
لو ہمیں بھی تحفۂ فصلِ بہار آ ہی گیا

مشغلے کچھ اور بھی رکھتے ہیں لیکن اے جنوں
تو نے جب آواز دی ، بے اختیار آ ہی گیا

اپنے ہی ڈالے ہوئے پھندے میں دُنیا آ گئی
آخرش جس وقت کا تھا انتظار ، آ ہی گیا

سب کے دل سرد ہیں گرمانے کو جی چاہے ہے
پوچھو عاجزؔ سے غزل گانے کو جی چاہے ہے؟

لُٹ کے ہم آئے ہیں جس راہ گزر سے اِک دن
پھر وہی راہ گزر جانے کو جی چاہے ہے

آپ کہتے ہیں غزل گاؤ اور اپنا تو جناب
شاعری ترک ہی کر جانے کو جی چاہے ہے

درد کی چوٹ کسی شعر سے لگتی ہی نہیں
بس چھری بھونک کے مر جانے کو جی چاہے ہے

اب کسی بزم میں کم اپنا گزر ہوتا ہے
اور گزر ہو تو گزر جانے کو جی چاہے ہے

شہر میں درد کے ماروں کی نہیں گنجائش
چلیئے صحرا کو اگر جانے کو جی چاہے ہے

ہائے صحرا میں بھی کوئی نہ رہا چاک قبا
اب تو مجنوں کا بھی گھر جانے کو جی چاہے ہے

بہت اونچی کیے پھرتے رہے اب تو گردن
دمِ شمشیر پر دھر جانے کو جی چاہے ہے

کوئے جاناں سے نکل کر کوچۂ قاتل کی طرف
رکھ کے ہاتھ پر سر جانے کو جی چاہے ہے

جس طرف دیکھئے سوداگری ہے اب تو کلیمؔ
شعر کہتے ہوئے مر جانے کو جی چاہے ہے

محبت کا دُشمن زمانہ بھی ہے
طبیعت مری عاشقانہ بھی ہے

وہ ہے دُشمنِ جان و ایمان و دل
مگر دل اسی سے لگانا بھی ہے

وہ بکھری ہوئی زُلف مت پوچھیئے
رگِ گل بھی ہے تازیانہ بھی ہے

شکایت کریں اس کی جا کر کہاں
جدھر وہ، اُدھر ہی زمانہ بھی ہے

اِسی سے نکلتی ہے میری غزل
یہ دل درد کا کارخانہ بھی ہے

بھروسہ بھی اس پر ہوتا نہیں
یہ ہشیار بھی ہے، دیوانہ بھی ہے

اسی بے بھروسے کے سر پر مگر
محبت کا تاجِ شہانہ بھی ہے

یہی غم کی گرمی میں ہے آفتاب
یہی دُھوپ میں شامیانہ بھی ہے

تڑپتے ہو عاجزؔ تڑپتے رہو
تمھیں جاگنا بھی جگانا بھی ہے

۞

ترس رہا ہوں محبت کی اِک نظر کے لیے
کہ یہ ملے تو فراغت ہے عمر بھر کے لیے

نہ چاہیے مجھے کچھ اور زخم دل کے سوا
یہی چراغ اُجالا ہے سارے گھر کے لیے

حیاتِ عشق کا ہوتا ہے موت سے آغاز
اگر چہ موت ہے انجام ہر بشر کے لیے

صراطِ عشق پر چلئے تو اس طرح چلئے
نہ زادِراہ نہ توشہ رہے سفر کے لیے

کلاہ کیسی قبا کیسی پیرہن کیسا
اِک آستیں بھی نہیں اپنی چشم تر کے لیے

اسیر تھے تو ہنسی بال و پر پہ آتی تھی
رہا ہوئے ہیں تو روتے ہیں بال و پَر کے لیے

ہمیں خراب کیا شاعری نے اے عاجؔز
ہزار عیب لیے ہم نے اِک ہنر کے لیے

۞

کوئی تو پوچھتا کیوں بے قرار گزرے ہے
تری گلی سے کوئی بار بار گزرے ہے

جدھر سے خوشبوئے گیسوئے یار گزرے ہے
اسی طرف سے تو فصلِ بہار گزرے ہے

وہی غزل میں مری بار بار گزرے ہے
جو بات ان کو بہت ناگوار گزرے ہے

نہ گزری ہوگی کسی پر وہ شہرِ دُشمن میں
ستم جو ہم پہ سرِ کوئے یار گزرے ہے

وہ اِک حادثہ منصور پر جو گزرا تھا
وہ حادثہ تو یہاں بار بار گزرے ہے

جو معرکہ بھی ہوا شرمسار ہم نہ رہے
کسی سے دَب کے نہ نکلے کسی سے کم نہ رہے

اب اپنے حال پہ اشکوں کو ہم نے چھوڑ دیا
بہت دِنوں رہی کوشش کہ آنکھ نم نہ رہے

اگرچہ ہم سرِبازار ہوگئے رُسوا
جناب بھی تو زمانے میں محترم نہ رہے

اب اُس کے پیار کو ترسو گے عمر بھر پیارے
جو تم رہے بھی تو کیا تم رہے کہ ہم نہ رہے

نتیجہ جو بھی ہوا ایسا مگر کبھی نہ ہوا
صدا لگائی ہو قاتل نے اور ہم نہ رہے

تمام عمر برہمن سے کاروبار رہا
وہاں کبھی نہ رہے ہم جہاں صنم نہ رہے

سوال یہ ہے کہ ایسی غزل کہے گا کون
سوال یہ نہیں ہے ہم رہے کہ ہم نہ رہے

رہے ضرور رہے لیکن اعتدال کے ساتھ
یہ کون چاہے گا زُلفوں میں پیچ وخم نہ رہے

غزل جو سنتے ہیں دیتے ہیں یہ دُعا عاجزؔ
خدا کرے کہ ترے دل میں درد کم نہ رہے

کیوں نہ ہوتا سرِ منزل گزرِ پروانہ
تپشِ شوق رہی ہم سفرِ پروانہ

جاوداں بن گیا سوزِ جگرِ پروانہ
مرحبا زندگیِ مختصرِ پروانہ

شمع ہر حال میں معصوم صفت ٹھہرے گی
خونِ پروانہ رہے گا بہ سرِ پروانہ

منزلِ عشق بظاہر تھی بہت دُور دراز
ایک گردش میں ہوا طے سفرِ پروانہ

شمع پروانے کی دُشمن سہی، قاتل ہی سہی
کون ہے اس کے سوا نوحہ گرِ پروانہ

ہمّتِ شوق نے دونوں سے سبکدوش کیا
سر کے ہمراہ گیا دردِ سرِ پروانہ

سوز وساز اپنی غزل میں نہیں عاجزؔ بے وجہ
اثرِ شمع ہے کچھ اور کچھ اثرِ پروانہ

کہیں لوگ جو کچھ کہا چاہتے ہیں
میاں ہم تو سب کا بھلا چاہتے ہیں

اب اس میں مزا ہم کو آنے لگا ہے
وہ الزام دیں جو دِیا چاہتے ہیں

جہاں لوگ خنجر بہ کف ہوں وہاں ہم
ربابِ غزل چھیڑنا چاہتے ہیں

چراغاں ہی کرنا ہے بس کام اپنا
اندھیرے گھروں کا پتہ چاہتے ہیں

اگر چہ کبھی تو نے ہم کو نہ چاہا
تجھی کو ہم اے بے وفا چاہتے ہیں

غزل میں جو عاجزؔ کا پیغام سمجھیں
ہم ایسے سخن آشنا چاہتے ہیں

تری محفل سے دل تھامے ہوئے تنہا نہ ہم نکلے
ہمارے جیسے کتنے لے کے اپنا اپنا غم نکلے

ہماری فکر کی آنکھوں سے گر میخانے کو دیکھو
تو ہر ساغر کے پردے میں کسی کی چشم نم نکلے

لیے ہی پھر رہے ہیں ہم تو مٹّی کا سبو اپنا
کسی کے پاس ہے تو لے کے اپنا جام جم نکلے

وہیں سے پوچھتے ہو، شور کیسا ہے زمانے میں
ذرا اے مہرباں محفل سے تو باہر قدم نکلے

جبیں پر تمکنت، اَبرو پر بل، زنجیر ہاتھوں میں
نکلتا کون اس انداز سے، نکلے تو ہم نکلے

لب پر کوئی فغاں ہے، نہ ماتم نہ ہائے ہے
لیکن بدن کو دیکھو تو پگھلا ہی جائے ہے

پھولا نہ اپنے جور و جفا پر سمائے ہے
وہ میرا حال دیکھے ہے اور مسکرائے ہے

ہم نے اُسے بنایا، یہ ہم کو مٹائے ہے
کمبخت شرم بھی نہ زمانے کو آئے ہے

وہ دور آ گیا ہے کہ کچھ نہ سُہائے ہے
غم کھائے جاؤں ہوں، مجھے غم کھائے جائے ہے

کیا جانے کیا ہے شہرِ محبت کا حال چال
مدّت ہوئی کہ آئے ہے کوئی نہ جائے ہے

اب تیری بزم میں کچھ رہا ہی نہیں
جو چلا مڑ کے پھر دیکھتا ہی نہیں
کیا کریں سیر جی چاہتا ہی نہیں
اب چمن کی وہ آب و ہوا ہی نہیں
کیا مرا ماجرا ماجرا ہی نہیں
یوں سنا تم نے جیسے سنا ہی نہیں
شرم بھی دوستی کی نباہی نہیں
بے مروّت بھی ہو بے وفا ہی نہیں
کیسی معصوم باتیں بناتے ہیں وہ
جیسے کوئی اُنھیں جانتا ہی نہیں

لہو چراغوں میں ڈھلتے ہیں جام چلتے ہیں
یہ وہ اصول ہیں جو اب تمام چلتے ہیں
دِلوں کا حال ہے کیا، کوئی پوچھتا ہی نہیں
یہ کام بند ہے اور سارے کام چلتے ہیں
ستم ہی منزلِ مقصود ہے حسینوں کی
اگرچہ لے کے وفا ہی کا نام چلتے ہیں
زباں بہت ہیں مگر بات اُنھیں کی چلتی ہے
جدھر وہ چلتے ہیں بن کر امام چلتے ہیں
جگر کا خوں کریں ہم، آپ واہ واہ کریں
ہمارا لیجیے صاحب سلام، چلتے ہیں

بہت دلچسپ افسانے رہیں گے
جہاں ہم جیسے دیوانے رہیں گے
وہی اکثر چھری تانے رہیں گے
جو اپنے جانے پہچانے رہیں گے
رہے گا اُن کو دیوانوں پر غصّہ
ہم اس غصّے پر دیوانے رہیں گے
جو رنگیں ہوں گے رندوں کے لہو سے
اُنھیں ہاتھوں میں پیمانے رہیں گے
بدل سکتا نہیں ہم کو زمانہ
جو ٹھانا ہے وہی ٹھانے رہیں گے
چمن میں ہم نہ ہوں گے تب بھی عاجزؔ
چمن والوں سے یارانے رہیں گے

کسے مجال ہے مسند کہ بوریا چاہے
وہ دینے والا ہے دے جس کو دِیا چاہے

بغیر اجازتِ پیرِ مغاں ہے وہ بھی حرام
شراب کیا کہ اگر زہر بھی پیا چاہے

سخن میں عکسِ رُخِ انقلاب رکھتا ہوں
نگاہ لائے جو یہ آئینہ لیا چاہے

وہ ننگ و نام کے اونچے محل کرے گا کیا
جو اے جنوں ترے کوچے میں گھر لیا چاہے

گزر کے منزلِ دار و رَسن سے دیکھ لیا
یہ کام سہل ہے ہمّت اگر کیا چاہے

طبیب عشق کا یہ نسخۂ مجرب ہے
مرے کسی کی محبت میں گر جیا چاہے

دلِ پُرغم نہ ہوں گے دیدۂ پُرنم نہیں ہوں گے
اندھیرا ہوگا اس محفل میں جس میں ہم نہیں ہوں

چراغِ دل بجھے ہیں روشنی دنیا میں کیا ہوگی
دیے جتنے جلا ڈالو اندھیرے کم نہیں ہوگے

خردمندوں کی زنجیریں جسے بے دست پا کردیں
وہ کوئی اور ہی دیوانہ ہوگا ، ہم نہیں ہوں گے

یہاں تو عمر ہی شمشیر کے سائے میں گزری ہے
جو بھاگیں گے وہ کوئی اور ہوں گے ہم نہیں ہوں گے

زمانہ قدر کر، ہاں قدر کر ہم کج کلاہوں کی
کہ پیدا اس نمونے کے جواں ہر دم نہیں ہوں گے

محبت چاہنے والوں کے دل میں بڑھتی جائے گی
اگرچہ چاہنے والوں میں جھگڑے کم نہیں ہوں گے

ابھی وہ کچھ مہرباں ہیں، غم سے نجات مانگو، نجات ہوگی
نگاہ اُن کی بدل گئی تو بڑے قیامت کی بات ہوگی

چلا تو جاتا ہے مجھ کو لے کر اُس آفتِ جاں کی انجمن میں
کہاں پکاروں گا تجھ کو اے دل، اگر کوئی واردات ہوگی

سیاہیٔ شام بڑھ رہی ہے، کھلی ہوئی ہے وہ زُلفِ برہم
پڑے گا جس رات پر یہ سایہ، وہ کس قیامت کی رات ہوگی

جو ہوتے دو چار زخم دل میں، تو رکھتے مرہم کی آرزو ہم
فگار ہے دل کا گوشہ گوشہ، کہاں کہاں التفات ہوگی

یارانِ گذشتہ کا اب نام نہ لے ساقی
چھا جاتا ہے اندھیرا آنکھوں کے تلے ساقی

کٹوانے لگے اُٹھ کر کیوں اپنے گلے ساقی
احباب ابھی بیٹھے تھے سب اچھے بھلے ساقی

وہ جام و خم و مینا سانچے میں ڈھلے ساقی
کچھ ٹوٹ چکے ساقی کچھ ٹوٹ چلے ساقی

خاکِ دَرِ میخانہ چہرے پہ ملے ساقی
فریاد بلب ہم بھی آئے ہیں چلے ساقی

ایسا بھی ہو گر کوئی لپٹا دے گلے ساقی
جو دِل کے شراروں پر پنکھا نہ جھلے ساقی

جب بھی میں غزل کہنے لگتا ہوں تو لگتا ہے
اِک آگ لہکتی ہے سینے کے تلے ساقی

سن سکو تو غم کا عاجزؔ ایسا افسانہ کہے
شمع محفل کہہ سکے جس کو نہ پروانہ کہے

کون ہے اس دَور میں جو دل کا افسانہ کہے
تیرے دیوانے پہ گزری ، تیرا دیوانہ کہے

میرے جیسا تشنہ لب کیا حالِ میخانہ کہے
جو لیے بیٹھا ہوا ہے جام و پیمانہ کہے

کس نے میری طرح جھیلا دردِ جانانہ کہے
شمع کیا کھولے زباں کس سے یہ پروانہ کہے

تیری غزلوں کی طرح غزلیں وہ دیوانہ کہے
کوئی قاتل کو جو عاجزؔ ، کوئے جانانہ کہے

تجھ سے گر اِک روز عاجزؔ اپنا افسانہ کہے
وہ مزا آئے کہ دل سننے کو روزانہ کہے

یہ سلیقہ شخصیت میں ہے بہت مشکل کلیم
دل فقیرانہ رہے اور بات شاہانہ کہے

وہ زُلفیں جو فتنے جگاتی پھرے ہیں، بڑے پیار سے اُن میں شانہ پڑے ہے
ہمیں پتھروں کے نشانہ بنے ہیں ، ہمارے ہی پیچھے زمانہ پڑے ہے

یہاں شکر ہے نام مجبوریوں کا ، اُٹھے ہے کہاں غم ، اُٹھانا پڑے ہے
کبھی ایسا بھی ہووے ہے روتے روتے ، جگر تھام کر مسکرانا پڑے ہے

جو سرو سمن کے نکھرنے کے دن ہیں، وہی زخم دل کے اُبھرنے کے دن ہیں
ہمیں جب لگے ہے جھڑی آنسوؤں کی، وہی مئے کشی کا زمانہ پڑے ہے

چمن میں اگر جائیو اے صبا تُو ، کرم اتنا فرمائیو اے صبا تُو
ادھر سے بھی ہو آئیو اے صبا تُو ، مرا جس طرف آشیانہ پڑے ہے

بہت حادثے روز آتے رہے ہیں، بہت حادثے روز آئیں گے لیکن
ترا درد اتنا بڑا حادثہ ہے کہ ہر حادثہ بھول جانا پڑے ہے

ترے حسن کی راجدھانی سلامت ، ترے راج میں ہم بھکاری بنے تھے
بھکاری سے شاعر بنے ، دیکھنا ہے ہمیں بھیس اب کیا بنانا پڑے ہے

مرنا تو بہت سہل سی ایک بات لگے ہے
جینا ہی محبت میں کرامات لگے ہے

ہم دونوں میں ہے بس اسی اِک بات پہ تکرار
وہ دن کہے ہے اور ہمیں رات لگے ہے

ہاں رہیو الگ صحبتِ اربابِ خرد سے
وہ بزم ہے یہ، دن بھی جہاں رات لگے ہے

کیا پیار ہے تم سے اجی کیا پیار ہے تم سے
جو زخم بھی تم دو ہو وہ سوغات لگے ہے

سب دیتے ہیں تقدیر کو یا وقت کو الزام
ہم کو تو تمھاری ہی کرامات لگے ہے

بے بات کی تم بات بناتے نہیں عاجزؔ
ہر بات میں کوئی نہ کوئی بات لگے ہے

وہ جانیں جو تعریف کیا کرتے ہیں عاجزؔ
ہم کو تو غزل تیری خرافات لگے ہے

جو حال ہے اس بزم کا ایسا نہ کہیں ہے
آئینہ کہیں ، زُلف کہیں ، شانہ کہیں ہے

اب رقصِ محبت کا تماشا نہ کہیں ہے
پروانہ کہیں ہے پَرِ پروانہ کہیں ہے

پھیلا چلا جائے ہے بہت عقل کا دامن
پوچھو تو جنوں سے کوئی دیوانہ کہیں ہے

دل کا کچھ الگ رنگ ہے، چہرے کا الگ رنگ
افسانہ کہیں ، سُرخیِ افسانہ کہیں ہے

صحرا ہی پہ سب بوجھ ہے اب شہر کے غم کا
دیوانہ کہیں ہے ، دلِ دیوانہ کہیں ہے

بھرتے ہیں کلیمؔ اپنا لہو اپنی غزل میں
مئے ایسی کہیں ہے نہ یا پیمانہ کہیں ہے

ہمارا کام ہی میخانہ سازی ہے زمانے میں
جہاں اپنا لہو دے دیں گے میخانہ بنا دیں گے

ہمارا ظرف محتاجِ سروسامان نہیں ساقی
یہ چلّو ہے اسی چلّو کو پیمانہ بنا دیں گے

بہت ہوشیار ہیں اس مطلبی دُنیا کے لوگ اے دل
نہ سن لوگوں کی باتیں، لوگ دیوانہ بنا دیں گے

بہت معصوم صورت بن کے عاجزؔ آئیں گے لیکن
غزل جیسی سنائیں گے کہ دیوانہ بنا دیں گے

یہ کوئی درد سراپا ہے کہ تم ہو
تم ہو بھی تو ایسا نہیں لگتا ہے کہ تم ہو

پہلے تو نظر آئی ہمیں میرؔ کی پرچھائیں
جب غور کیا تب نظر آیا ہے کہ تم ہو

سب چاہتے ہیں تم نہ رہو بزمِ غزل میں
لیکن یہ غزل ہی کا کرشمہ ہے کہ تم ہو

ہم خودکشی کر لیتے اگر تم نہیں ہوتے
ہم کو بھی غم وقت گوارا ہے کہ تم ہو

تم کہتے ہو میں جانشینِ میرؔ نہیں ہوں
اور سارا زمانہ یہی کہتا ہے کہ تم ہو

ہم سن کے تڑپتے بھی ہیں آتا ہے مزہ بھی
تم اچھے نہیں ہو مگر اچھا ہے کہ تم ہو

جب بھی کہیں سے درد بھری آتی ہے آواز
ہم نے تو ہمیشہ یہی سمجھا ہے کہ تم ہو

تم کو تو تڑپنے کا مرض ہی ملا عاجزؔ
ہم کو بھی تڑپ لینے کا موقع ہے کہ تم ہو

اُنھیں زُلفوں کا افسانہ کہیں گے بلا سے لوگ دیوانہ کہیں گے
کہیں گے آئینہ ہر شعر کو ہم غزل کو آئینہ خانہ کہیں گے
فقیرانہ صدا ہوگی ہماری مگر ہم بات شاہانہ کہیں گے
کہیں گے لوگ اس کو دُشمنِ جاں مگر ہم جانِ جانانہ کہیں گے
بھرم کھل جائے گا پیرِ مغاں کا اگر ہم رازِ میخانہ کہیں گے

جو ہم کہتے ہیں ساقی کل وہ سنیو
سبو و جام و پیمانہ کہیں گے

آپ کیا دیکھ سکے آپ نے کیا دیکھ لیا ہم نے جو دیکھ لیا دیکھ لیادیکھ لیا
تجھ کو او دُشمنِ اربابِ وفا دیکھ لیا جیسا تھا ویسا سنا جیسا سنا دیکھ لیا
آپ سنتے ہی رہے ہوں گے مگر ہم نے میاں زہرِ غم کھاکے کئی بار مزا دیکھ لیا
نئے وعدوں کے چراغ اب نہ دکھاؤ ہم کو خوب کرکے سفرِ راہِ وفا دیکھ لیا

اس کا آنا جو قیامت تھا وہ دیکھی ہی تھی
اس کے جانے کا بھی انداز و ادا دیکھ لیا

سائے جوان کی زُلف کے رستے میں آگئے ٹھکراکے روشنی کو اندھیرے میں آگئے
ان گیسوؤں کے جھونکے جو رستے میں آگئے ایسا لگا کہ دُھوپ سے سائے میں آگئے
آیا ہی تھا کسی کے بدن کا مجھے خیال خوشبو کے قافلے مرے کمرے میں آگئے
محفوظ رہ گئے لبِ ساحل جو لوگ تھے طوفاں سمٹ کے میرے سفینے میں آگئے

چھلکے جو دستِ ساقی سے قطرے شراب کے
گرنے سے پہلے میرے پیالے میں آگئے

ہر ایک دل یہ شدّتِ غم سہہ نہیں سکتا
ہم جو کہا کرتے ہیں کوئی کہہ نہیں سکتا

سب غم تو سہے ضبط کا غم سہہ نہیں سکتا
وہ خوش ہو کہ ناخوش ہو میں چپ رہ نہیں سکتا

جب بھی کہیں سے درد کے رشتے نے پکارا
میں پیچھے رہا ہوں یہ کوئی کہہ نہیں سکتا

یہ سوچ کے میں دورِ ستم جھیل رہا ہوں
جو دورِ ستم آج ہے کل رہ نہیں سکتا

تیار رہے قافلۂ اہلِ محبت
کس سمت نکلنا ہے ابھی کہہ نہیں سکتا

کیا آتے ہوئے وقت کے پردے میں چھپا ہے
تم سن نہیں سکتے میں ابھی کہہ نہیں سکتا

احسان ہے اس کا جو دُکھاتا ہے مرا دل
جب تک نہ دُکھے دل میں غزل کہہ نہیں سکتا

ہم کو بھی درد کی بھٹّی میں جلے دیر ہوئی
آج پُروائی ذرا جلد چلے ، دیر ہوئی

اور کیا کہتے ہیں ساقی کو؟ یہی کہتے ہیں
اب تو ساغر چلے ، شمشیر چلے دیر ہوئی

اس سے بڑھ کر بھی کوئی اور قیامت ہوگی
مُردے اُٹھتے نہیں اور حشر اُٹھے دیر ہوئی

بادہ کش ہاتھ پہ کیوں ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
دورِ مئے چلتا نہیں ، رات ڈھلے دیر ہوئی

اور ہیں کام بہت ، ہم تو اُٹھے اے قاتل
سرکو رکھے ہوئے شمشیر تلے دیر ہوئی

ہم نے سب دے ہی دیا تم نے بھی سب لے ہی لیا
اب بھی کیوں روٹھے ہو؟ مل جاؤ گلے دیر ہوئی

دیکھیں آتی ہے یہاں تک کہ نہیں آتی ہے
نکہتِ بادِ بہاری کو چلے دیر ہوئی

آج کی شام کو بھی شامِ غزل کردے کلیمؔ
تو چراغ اپنا جلا شمع جلے دیر ہوئی

اضافہ شدہ غزلیں

('وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کی وہ غزلیں جن میں اشعار کا اضافہ کیا گیا)

کتنا دُکھ، کتنی جفا کتنا ستم دیکھا ہے
ہم نے اس عمر میں اِک عمر کا غم دیکھا ہے

ہم نے اس دُنیا میں جو دیکھا کبھی دُنیا نے
ایسا کافر نہ برہمن نہ صنم دیکھا ہے

کیا قیامت تھا وہ سرتا بہ قدم مت پوچھو
ہم نے اس شوخ کو سرتا بہ قدم دیکھا ہے

کیا بتائیں کہ رہِ مہر و فا میں ہم نے
ڈگمگاتے ہوئے کس کس کا قدم دیکھا ہے

.......…….....

زُلف بل کھائی نہ تھی تا بہ کمر آئی نہ تھی
وہ زمانہ بھی ترے سر کی قسم دیکھا ہے

ایک مدّت سے مری صبحِ مسرت گم ہے
تو نے رستے میں کہیں اے شبِ غم دیکھا ہے

زخمِ دل مانگتے ہیں اور دُعا دیتے ہیں
ہم سا سائل کوئی اے اہلِ کرم دیکھا ہے؟

دیکھئے میری غزل میں کبھی صورت اپنی
یہ وہ آئینہ ہے جو آپ نے کم دیکھا ہے

کیسے سمجھے کوئی دُکھ درد ہمارا عاجزؔ
ہم نے جو دیکھا ہے اوروں نے وہ غم دیکھا ہے

زہرِ غم سے نہیں انکار کہ پینا ہے یہی
ہم غریبوں کا تو مرنا یہی جینا ہے یہی

شہر میں ہر در و دیوار پہ روشن ہیں چراغ
میرا گھر جس میں جلا تھا وہ مہینہ ہے یہی

پھاڑتا ہوں میں گریباں لو زیارت کرلو
عمر بھر تیر لگا جس پہ وہ سینہ ہے یہی

ہم بھی چلو میں لہو دل کا لیے بیٹھے ہیں مری مئے ہے یہی ساغر یہی مینا ہے یہی

....

درد کو اس لیے سینے سے لگا رکھا ہے زندگی ایک انگوٹھی ہے نگینہ ہے یہی
کتنی مدّت ہوئی آنسو نہیں تھمتے اپنے اب یہ برسات نہ جائے گی قرینہ ہے یہی
ناز کیوں کر نہ کریں دولتِ خود داری پر ہم نے اے وقت ترے ہاتھ سے چھینا ہے یہی
ہم تو مزدورِ محبت ہیں غزل کہتے ہیں ایک فنکار کے ماتھے کا پسینہ ہے یہی
چھیڑتے جاؤ محبت کا ترانہ عاجزؔ
نفرتوں سے بھرے دریا میں سفینہ ہے یہی

یہ سمندر ہے کنارے ہی کنارے جاؤ عشق ہر شخص کے بس کا نہیں پیارے! جاؤ
تم ہی سوچو بھلا یہ شوق کوئی شوق ہوا آج اونچائی پہ بیٹھو کل اُتارے جاؤ
ہم تو مٹّی سے اُگائیں گے محبت کے گلاب تم اگر توڑنے جاتے ہو ستارے، جاؤ
ڈوبنا ہوگا اگر ڈوبنا تقدیر میں ہے چاہے کشتی پر رہو چاہے کنارے جاؤ
رائیگاں درد کی آواز نہیں جائے گی وہ سنے یا نہ سنے تم تو پکارے جاؤ
اُن کی زُلفوں کو بکھرنا ہے بکھرتی جائیں تم نے سو بار سنوارا ہے سنوارے جاؤ

....

یوں تو مقتل میں تماشائی بہت آتے ہیں آؤ اُس وقت کہ جس وقت پکارے جاؤ
دل کی بازی لگے پھر جان کی بازی لگ جائے عشق میں ہار کے بیٹھو نہیں، ہارے جاؤ
کام بن جائے اگر زُلف جنوں بن جائے اس لیے اس کو سنوارو کہ سنوارے جاؤ
کوئی رستہ کوئی منزل اِسے دُشوار نہیں جس جگہ چاہو محبت کے سہارے جاؤ
موت سے کھیل کے کرتے ہو محبت عاجزؔ
مجھ کو ڈر ہے کہیں بے موت نہ مارے جاؤ

اوروں کا دُکھ درد اپنا کر نکلے ٹھوکر کھانے ہم
سب سے دیوانہ تھا مجنوں اُس سے بھی دیوانے ہم
بیٹھے ہوئے ہیں ذات میں اپنی کھولے ہوئے میخانے ہم
پیرِ مغاں ہم ساقی بھی ہم شیشے ہم پیمانے ہم
شاعر ہی کے فکروفن میں دُنیا سنورا کرتی ہے
سب چہروں کے آئینے ہم سب زُلفوں کے شانے ہم
سب سے بڑے فنکار نے ہم کو اپنا ہنر سکھلایا ہے
اُلجھی ہوئی زُلفوں کے لیے ہیں آئینے ہم شانے ہم
عشق نے ہم کو خواب میں اپنا شیش محل دِکھلایا ہے
رستے سے گرچہ نہیں واقف، منزل ہیں پہچانے ہم

.....…..........

گلشن گلشن آئے گئے لیکن نہ گئے پہچانے ہم
کس گل کے ہیں بلبل ہم کس شمع کے ہیں پروانے ہم
وہ جو سب میں ناکارے ہیں ہم کو سب سے پیارے ہیں
محفل محفل ڈھونڈ رہے ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے ہم
خون کے پیاسے دل میں ٹھنڈک سوزِ محبت سے ہوگی
دُنیا پانی مانگ رہی ہے آگ چلے بھڑکانے ہم
اب تک ہشیاروں نے ہم کو زنجیریں پہنائی ہیں
اب جائیں گے ہشیاروں کو زنجیریں پہنانے ہم
عاجزؔ یہ البیلی باتیں بے سمجھی کی بات نہیں
خود سمجھا ہے تب نکلے ہیں دُنیا کو سمجھانے ہم

جب کبھی عالمِ مستی میں غزل کہتے ہیں
آج کہہ دیتے ہیں ہم لوگ جو کل کہتے ہیں
اس جگہ بیٹھ کے پیاسوں کی کہانی مت پوچھ
اُٹھ مئے و جام کی صحبت سے نکل، کہتے ہیں
دنیا پیچ و خمِ تقدیر جسے کہتی ہے
ہم اُسے آپ کے گیسوؤں کا بل کہتے ہیں
باغ میں اس طرح گزری کہ نہ جانا اب تک
پھول کہتے ہیں کسی اور کسے پھل کہتے ہیں

....

اِک نئی شاعری آغاز قدم کرتی ہے
اہلِ دل جب غمِ دل پہلے پہل کہتے ہیں
ہاتھ رکھے کوئی اور اس کا بھٹکنا دیکھے
دل اِسے کہتے ہیں یا زخمِ بغل کہتے ہیں
دردمندانِ محبت کا نہ دل توڑ اے دوست!
تاج محلوں کا اِسے تاج محل کہتے ہیں
مرنا جینا ہو محبت کے لیے اِس کے سوا
اور کیا ہے کہ جسے حسن عمل کہتے ہیں

آزمانا ہو تو آ بازو و دل کی قوت
تو بھی شمشیر اُٹھا ہم بھی غزل کہتے ہیں

دن ایک ستم، ایک ستم رات کرو ہو
وہ دوست ہو، دُشمن کو بھی تم مات کرو ہو
میری ہی لہو پر گزر اوقات کرو ہو
مجھ سے ہی امیروں کی طرح بات کرو ہو
یوں تو کبھی منہ پھیر کے دیکھو بھی نہیں ہو
جب وقت پڑے ہے تو مدارات کرو ہو
کیا ہوگیا تم کو نشۂ حسن میں صاحب
جو بات نہ کرنی ہے وہی بات کرو ہو
آہنگ زباں ٹھیک نہ اسلوبِ سخن ٹھیک
دل توڑو ہو یا پرسشِ حالات کرو ہو

....

ہم خاک نشیں تم سخن آرائے سرِ بام
پاس آ کے ملو، دور سے کیا بات کرو ہو
ہم کو جو ملا ہے وہ تمھیں سے تو ملا ہے
ہم اور بھلا دیں تمھیں؟ کیا بات کرو ہو
دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

بکنے بھی دو عاجزؔ کو جو بولے ہے بکے ہے
دیوانہ ہے، دیوانے سے کیا بات کرو ہو

کلیمؔ آئے بھی اپنا ہنر دکھا بھی گئے
الاپ بھی گئے، رو بھی گئے، رُلا بھی گئے

دل اپنا کھو کے مزہ دلگی کا پا بھی گئے
بگاڑ بھی گئے کچھ، بات کچھ بنا بھی گئے

چہل پہل تھی محبت کے شہر میں جن سے
وہ اہلِ دل بھی سدھارے، وہ دل رُبا بھی گئے

کہاں لگاؤ گے دل، کس سے دل لگاؤ گے
رہِ وفا بھی گئی، صاحبِ وفا بھی گئے

کلیمؔ جس کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں
وہ درد بھی گیا، درد آشنا بھی گئے

....

غزل بھی پڑھ گئے، محفل کو سنسنا بھی گئے
اِک آگ لائے بھی، لے بھی گئے، لگا بھی گئے

وہ چوٹ کھائی جگر پر کہ تلملا بھی گئے
مگر تھے وضع کے پابند مسکرا بھی گئے

سنا گئے کسی پردہ نشیں کا افسانہ
وہ شوخ پردہ نشیں کون ہے، بتا بھی گئے

وفا شعاروں کو کیا پوچھو ہو، زمانہ ہوا
وہ چھوڑ بھی گئے بستی کو، گھر جلا بھی گئے

زمانہ دنگ ہے عاجزؔ کہ اس زمانے میں
جو کہہ رہے تھے وہی کر کے ہم دکھا بھی گئے

منہ فقیروں سے نہ پھیرا چاہیے
یہ تو پوچھا چاہیے کیا چاہیے

چاہنا آفت ہے لیکن کیا کریں
دل ہی چاہے ہے کہ چاہا چاہیے

تم ہو بے شک چاہ کے قابل مگر
چاہنے والا بھی ہم سا چاہیے

آپ کو سب چاہیے دل کے سوا
ہم کو دل کے ماسوا کیا چاہیے

کون اُسے چاہے جسے چاہو نہ تو تم
تم جسے چاہو اُسے کیا چاہیے

....

چاہ کا معیار اونچا چاہیے
جو نہ چاہیں اُن کو چاہا چاہیے

کون چاہے ہے کسی کو بے غرض
چاہنے والوں سے بھاگا چاہیے

ہم تو کچھ چاہے ہیں تم چاہو ہو کچھ
وقت کیا چاہے ہے دیکھا چاہیے

چاہتے ہیں تیرے ہی دامن کی خیر
ہم ہیں دیوانے ہمیں کیا چاہیے

بے رُخی بھی ناز بھی انداز بھی
چاہیے لیکن نہ اتنا چاہیے

ہم جو کہنا چاہتے ہیں کیا کہیں　　　آپ کہہ لیجیے ، جو کہنا چاہیے
بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیمؔ
بات کہنے کا سلیقہ چاہیے

دل وہ کمبخت کہ بے اس سے لگائے نہ بنے　　　وہ تو بے درد ہے ایسا کہ بتائے نہ بنے
کیا ستم ہے کہ وہ ظالم بھی ہے، محبوب بھی ہے　　　یاد کرتے نہ بنے اور بھلائے نہ بنے
ہائے وہ بات کہ دل تڑپے بتانے کے لیے　　　اور بتانے کو جو بیٹھو تو بتائے نہ بنے

....

عالم ایسا نہیں دیکھا کسی میخانے کا　　　سامنے جام ہو اور ہاتھ بڑھائے نہ بنے
حسن خود ساز بہت ، عشق خود آ گاہ بہت　　　ان سے مانے نہ بنے، ہم سے منائے نہ بنے
یوں اُٹھائے ہوئے ہیں دل پہ ترے غم کا پہاڑ　　　کہ اب اِک پھول بھی رکھ دو تو اٹھائے نہ بنے
لوگ ایسے کہ لگانے کو ہیں نشتر تیار　　　زخم ایسا کہ ذرا ہاتھ لگائے نہ بنے
تھامتے ہی نہیں ہم وقت کا دامن عاجزؔ
ہم اگر تھام لیں دامن تو چھڑائے نہ بنے

نہیں کوئی درد آشنائے دلِ من　　　بس اپنے ہی آنسو، بس اپنا ہی دامن
یہی ہے جوانی ، یہی تھا لڑکپن　　　ہمارے ہی آنسو ہمارا ہی دامن
یہی ہیں مری زندگی بھر کا حاصل　　　محبت کی آگ اور دل کا جلاون

....

مبارک تمھیں سیرِ گلزار و گلشن　　　فقیروں کا تو کوئی گھر ہے نہ آنگن
کوئی اس طرح بھی بدلتا ہے چتون　　　تمھیں دوست تھے کل، تمھیں آج دشمن
گنہگار ہم ، تم بڑے پاک دامن　　　ملاؤ تو آنکھیں اُٹھاؤ تو گردن
حسیں کیا ہوئے تم قیامت ہوئے ہو　　　جفا ڈیوڑھی ڈیوڑھی ستم آنگن آنگن
یہ کیا حال غم سے ہوا تیرا عاجزؔ
وہ چہرہ نہ چہرے کا وہ رنگ ، روغن

تم گل تھے ہم نکھار ابھی کل کی بات ہے ہم سے تھی سب بہار ابھی کل کی بات ہے
ملتے تھے بار بار ابھی کل کی بات ہے ہم تھے گلے کا ہار ابھی کل کی بات ہے
آتا نہ تھا قدم بھی اُٹھانا زمین پر اے میرے شہسوار ابھی کل کی بات ہے
بیٹھے ہوئے ہو ساقیِ محفل بنے ہوئے پیتے تھے مئے اُدھار ابھی کل کی بات ہے

....

بیگانہ سمجھو ، غیر کہو ، اجنبی کہو اپنوں میں تھا شمار ابھی کل کی بات ہے
آج اپنے پاس سے ہمیں رکھتے ہو دُور دُور ہم بِن نہ تھا قرار ابھی کل کی بات ہے
اِترا رہے ہو آج پہن کر نئی قبا دامن تھا تار تار ابھی کل کی بات ہے
آج اس قدر غرور یہ انداز یہ مزاج پھرتے تھے میر خوار ابھی کل کی بات ہے

انجان بن کے پوچھتے ہو، ہے یہ کب کی بات؟
کل کی ہے بات یار ، ابھی کل کی بات ہے

اس ناز اس انداز سے تم ہائے چلو ہو روز ایک غزل ہم سے کہلوائے چلو ہو
زُلفوں کی تو فطرت ہی ہے لیکن مرے پیارے زُلفوں سے زیادہ تمھیں بل کھائے چلو ہو
نفرت کی تو ہم آگ بجھانے میں لگے ہیں اور تم ہو کہ اُسے اور بھی لہکائے چلو ہو
ماحول نہ موقع نہ محل کی ہے رعایت جو آئے ہے جی میں وہی فرمائے چلو ہو

....

رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں چلنا ذرا آیا ہے تو اِترائے چلو ہو
دیوانۂ گل قیدیِ زنجیر ہیں اور تم کیا ٹھاٹ سے گلشن کی ہوا کھائے چلے ہو
مئے میں کوئی خامی ہے نہ ساغر میں کوئی کھوٹ پینا نہیں آئے ہے تو چھلکائے چلو ہو
ہم کچھ نہیں کہتے ہیں ، کوئی کچھ نہیں کہتا تم کیا ہو تمھیں سب سے کہلوائے چلو ہو

وہ شوخ ستم گر تو ستم ڈھائے چلے ہے
تم ہو کہ کلیم اپنی غزل گائے چلو ہو

(’جب فصل بہاراں آئی تھی‘ کی وہ غزلیں جن میں اشعار کا اضافہ کیا گیا)

نہ پوچھو دوستو ! احوال دل کے — تمھارا دل بھی رہ جائے گا ہِل کے
طبیعت اپنی قابو میں نہیں ہے — ابھی ہم آئے ہیں عاجزؔ سے مِل کے
وہی عاجزؔ کہ جس کو دیکھتے ہی — سبھی دروازے کھل جاتے تھے دِل کے
اب ایسا ریزہ ریزہ ہوگیا ہے — قبا جیسے اُدھڑ جاتی ہے سِل کے
کچھ ایسا درد ہے اس کی صدا میں — لرز کر رہ گئے سب تار دل کے
غزل کمبخت بیٹھا گا رہا تھا — اُسی مخصوص لَے میں سوزِ دل کے

……..…………

بہاروں میں جو منصوبے تھے دل کے — سب آخر رہ گئے مٹّی میں مل کے
ہوئے ظلم آب وگِل پر آب وگِل کے — چمن لوٹا چمن والوں نے مل کے
کلیجہ رہ گیا پھولوں کا ہِل کے — نہ جانے کیا کہا غنچے نے کِھل کے
زباں کے موم ہیں، پتھر ہیں دل کے — بڑا صدمہ ہوا یاروں سے مل کے
جگر خستہ ہیں خود ہی پھول کِھل کے — یہ کیا مرہم بنیں گے زخمِ دل کے
طبیعت پھول ہوجائے گی کِھل کے — ذرا دیکھو تو دیوانے سے مل کے
سنانے سننے جو بیٹھے ہیں مل کے — یہ سب مارے ہوئے ہیں دردِ دل کے

ہم اے عاجزؔ غزل کہتے نہیں ہیں
پھپھولے پھوڑتے رہتے ہیں دل کے

اس کی فکر نہ کیجیو عاجزؔ کون یہاں کیا بولے ہے
کرنے والا کام کرے ہے بولنے والا بولے ہے

بنسی تو اِک لکڑی ٹھہری لکڑی بھلا کیا بولے ہے
بنسی کے پردے میں پیارے کرشن کنہیا بولے ہے

گھر کی باتیں گھر کے باہر بھیدی گھر کا بولے ہے
دل تو ہے خاموش بچارا لیکن چہرا بولے ہے

وقت آئے تو اہلِ چمن بھی اہلِ زباں بن جاتے ہیں
ڈالی ڈالی جو بیتی ہے پتّا پتّا بولے ہے

اب تک شعر وغزل میں ان کی گونج رہی ہیں آوازیں
صحرا سے مجنوں بولے ہے شہر سے لیلیٰ بولے ہے

ہم نے سسک کر دم توڑا ہے جس قاتل کے پاؤں تلے
آج اُسی کے سر پر چڑھ کر خون ہمارا بولے ہے

....

کبھی کبھی محروم زباں بھی اہلِ زباں بن جاتے ہیں
ڈالی ڈالی جو بیتی ہے ، پتّا پتّا بولے ہے

کس کس کے ہونٹ سیوگے ، کس کس کو روکو گے
پہلے ہم ہی بول رہے تھے ،اب تو زمانہ بولے ہے

عاجزؔ کا دل بہت بڑا ہے ، ظرفِ زمانہ چھوٹا ہے
ڈھیروں ڈھیروں بات ہے لیکن ،تھوڑا تھوڑا بولے ہے

ہر التجا پہ کہے ہے خدا سے کہیے	کوئی کہو کہ کوئی یوں کہے تو کیا کہیے
زبانِ اہلِ محبت یہی ہے ، کیا کہیے	جو دل کا خون کرے اس کو دل رُبا کہیے
شباب اُن کا ابھی آیا ہے ، یہ کیا کہیے	اس ابتدا کو مصیبت کی انتہا کہیے
ہر اِک زخم کچھ اپنی زباں میں کہتا ہے	یہ دل کا حال ہو تو دل کا حال کیا کہیے

....

جب اس کو پیار کیا ہے جب اس کو چاہا ہے	وہ بے وفا سہی ،کیا اس کو بے وفا کہیے
سجی ہے خنجر و شمشیر و دار سے محفل	یہاں غزل نہیں کہیے تو اور کیا کہیے
جفا پرست عدو دوست آشنا دُشمن	ہم اس کو کیا نہیں کہہ سکتے ، پھر بھی کیا کہیے
میری نظر میں دونوں کا ایک عالم ہے	ترا کرم کسے کہیے ، کسے جفا کہیے
کرے ہے وار اس ادا سے کہ جی یہ چاہے ہے	ہر اِک وار پہ قاتل کو مرحبا کہیے

بدلتی جاتی ہے تیزی سے بھیس یوں دُنیا
کہ آشنا کو بھی مشکل ہے آشنا کہیے

تجھے کلیم کوئی کیسے خوش کلام کہے	جو دن کو رات بتائے سحر کو شام کہے
پیئے بغیر کہو تو یہ تشنہ کام کہے	وہ راز مئے جو صراحی کہے نہ جام کہے
نہ جانے روٹھ کے بیٹھا ہے دل کا چین کہاں	ملے تو اُس کو ہمارا کوئی سلام کہے
کہوں جو برہمن و شیخ سے حقیقتِ عشق	خدا خدا یہ پکارے وہ رام رام کہے
میں غم کی راگنی بے وقت بھی اگر چھیڑوں	زبانِ وقت مجھے وقت کا امام کہے

....

خرد کی مان کے جینا تو بے حیائی ہے	جنوں کی مان جو مرنے کو صبح و شام کہے
گریباں چاک تو ہونا ہی ہے محبت میں	اگر کہے کوئی بے فکر ننگ و نام کہے

تو سننا چاہے تو اس میکدے میں اے ساقی
شکستِ دل کی خبر پر شکستِ جام کہے

ہے عجیب غم کہ اِک عمر سے ہے قرار دُھوپ نہ چھاؤں میں
کبھی گاؤں سے چلے شہر میں کبھی شہر سے چلے گاؤں میں

مجھے اطمینان سے چھوڑ دو غزل آفرینی کی چھاؤں میں
کہ مرے مرض کا علاج ہے نہ دواؤں میں نہ دُعاؤں میں

یوں نمایاں اپنی غزل میں ہوں، یوں چھپا ہوں اپنی نواؤں میں
کوئی سننا چاہے تو سن سکے، یہ صدا ہزاروں صداؤں میں

……..…………

جنھیں اہلِ شہر ستمگراں نہیں یاد کرتے دعاؤں میں
مرا گھر بھی تھا کبھی دوستو اُنھیں مرنے والوں کے گاؤں میں

اُنھیں دُشمنی ہے وفاؤں سے میری عمر گزری وفاؤں میں
مرا دل اِک ایسا چراغ ہے کہ جلا کیا ہے ہواؤں میں

یہ غبار کیسا بدن پہ ہے یہ پھپھولے کیسے ہیں پاؤں میں
مرے حال کی اُنھیں کیا خبر جو کھڑے ہیں پھولوں کی چھاؤں میں

اُنھیں کیوں نہ جانِ غزل کہوں انھیں کیسے بھولوں دُعاؤں میں
مجھے شاعری جو سکھا گئی اِک ادا تھی اُن کی اداؤں میں

غزل ان کے سامنے چھیڑیئے کبھی داد اُن سے بھی لیجیے
یہ خطا اگر ہے تو کیجیے کہ مزا ہے ایسی خطاؤں میں

کلیمؔ حال تو اپنا سناؤ کیسا ہے
ہے درد کم کہ بہت ، دل کا گھاؤ کیسا ہے
بچی کہ ٹوٹ کے کشتیِ دل بھی ڈوب گئی
اب آنسوؤں کی ندی کا بہاؤ کیسا ہے

....

کلیجہ غم سے پھٹا جارہا ہو ٹھیک اس وقت
کسی کا کہنا ، ذرا مسکراؤ ، کیسا ہے
وہ راگ درد کا جو چھیڑتے ہو خلوت میں
ہمارے سامنے بھی گنگناؤ کیسا ہے
جو بوجھ سینے پہ رہتا تھا کیا وہ اب بھی ہے
جگر پہ سنگِ ستم کا دباؤ کیسا ہے
بہار آئی ہے ، یہ ہم بھی جانتے ہیں مگر
یہ غل کہ آگ لگی ہے بجھاؤ کیسا ہے
کلام میرؔ میں کس کو کلام ہے لیکن
سخن ہمارا بھی تو آزماؤ کیسا ہے
مشاعرے میں تو چلے آرہے ہو تیور سے
مگر جناب قدم کا جماؤ کیسا ہے
بہت سنا چکے زخموں کو استعاروں میں
کلیجہ چیر کے ہم کو دکھاؤ کیسا ہے
یہ شعروعر نہیں چاہیے غزل نہ پڑھو
میں حال پوچھ رہا ہوں سناؤ کیسا ہے
ارے یہ کیا ہوا ؟ تم دل پکڑ کے رونے لگے
چلو سمجھ گیا اندر کا گھاؤ کیسا ہے

سینے کے زخم ، پاؤں کے چھالے کہاں گئے؟
اے حسن تیرے چاہنے والے کہاں گئے؟
اندھیرا ہے جہاں میں اُجالے کہاں گئے؟
دیکھو تو بڑھ کے آنسوؤں والے کہاں گئے؟
دو چار جام ہی میں بہکتے ہیں لوگ اب
پیتے تھے جو بغیر پیالے کہاں گئے؟
جس گھر میں دُور دُور سے آتے تھے میہماں
اس گھر کے میزبان نکالے کہاں گئے؟

....

شانوں کو چھین چھین کے پھینکا گیا کہاں
آئینے توڑ پھوڑ کے ڈالے کہاں گئے؟
خلوت میں روشنی ہے نہ محفل میں روشنی
اہلِ وفا چراغِ وفا لے کہاں گئے؟
بت خانے میں بھی ڈھیر ہیں ٹکڑے حرم میں بھی
جام و سبو کہاں تھے اچھالے کہاں گئے؟
آنکھوں سے آنسوؤں کو ملی خاک میں جگہ
پالے کہاں گئے تھے نکالے کہاں گئے؟

بربادِ روزگار ہمارا ہی نام ہے آئیں تماشہ دیکھنے والے کہاں گئے؟
چھپتے گئے دِلوں میں وہ بن کر غزل کے بول میں ڈھونڈتا رہا مرے نالے کہاں گئے؟
اُٹھتے ہوؤں کو سب نے سہارا دیا کلیمؔ
گرتے ہوئے غریب سنبھالے کہاں گئے؟

جسے دیکھو شراب درد سے بیگانہ بنتا ہے مرا ہی دل ہے جو ہر بزم میں پیمانہ بنتا ہے
کبھی یہ شمع بنتا ہے اندھیرا دُور کرنے کو کبھی یہ رقص کرنے کے لیے پروانہ بنتا ہے
یہی زنجیر بن جاتا ہے لے جاتا ہے زنداں میں یہی خوشبوئے گیسوئے رُخِ جانانہ بنتا ہے
محبت کے عمل سے پھول کھل جاتے ہیں صحرا میں نہ ہو یہ کام تو گلزار بھی ویرانہ بنتا ہے
جگر جتنا جلے اتنا زیادہ رقص کرتا ہے ہم اس مٹّی سے ہیں جس مٹّی سے پروانہ بنتا ہے
دل روشن ہو سینے میں تو ہو جائے جہاں روشن چراغِ انجمن پہلے چراغِ خانہ بنتا ہے
ہمیں تو خیر کچھ باتیں خرد والوں سے کہنی تھیں وگرنہ کون اب اس دَور میں دیوانہ بنتا ہے

....

غمِ دل ہی غمِ دوراں، غمِ جانانہ بنتا ہے یہی غم شعر بنتا ہے، یہی افسانہ بنتا ہے
اسی سے گرمیِ دار و رسن ہے انقلابوں میں بہاروں میں یہی زُلف وقدِ جانانہ بنتا ہے
سروں کے خم، صراحی گردنوں کی جام زخموں کے مہیّا جب یہ ہو لیتے ہیں تب میخانہ بنتا ہے
بگڑتا کیا ہے پروانے کا جل کر خاک ہونے میں کہ پھر پروانے ہی کی خاک سے پروانہ بنتا ہے
نگاہِ کم سے میری چاک دامانی کو مت دیکھو ہزاروں ہوشیاروں میں کوئی دیوانہ بنتا ہے
خریدا جا نہیں سکتا ہے ساقی ظرف رندوں کا بہت شیشے پگھلتے ہیں تو اِک پیمانہ بنتا ہے
مرے ہی دونوں ہاتھ آتے ہیں کام ان کے سنورنے میں دِکھاتا ہے کوئی آئینہ کوئی شانہ بنتا ہے
بڑا سرمایہ ہے سب کچھ لٹا دینا محبت میں فقیرانہ لباس آتے ہیں دل شاہانہ بنتا ہے
محبت میں یہ کیا حالت تمھاری ہوگئی عاجزؔ
سمجھ دار آدمی بھی اس قدر دیوانہ بنتا ہے

میں بزم میں جب آؤں تم اُٹھ کے چل نہ دینا　　سن لینا غزل میری مت داد غزل دینا
یہ زندگی مشکل ہے مشکل کا یہ حل دینا　　رونے کو لہو دینا ، گانے کو غزل دینا
ہاں زُلفوں میں خم دینا، ہاں اَبرو پہ بل دینا　　کہنی ہے غزل مجھ کو سامان غزل دینا
ہم اہلِ محبت کو مت تاج محل دینا　　ممکن ہو تو عاجزؔ کا دیوانِ غزل دینا
یہ جامِ غزل پی کر احباب پکار اُٹھے　　اِک اور غزل دینا اِک اور غزل دینا

……………

منظور ہو محفل کا گر رنگ بدل دینا　　اِک اچھے مغنّی کو عاجزؔ کی غزل دینا
جو آج دیا پیارے وہ درد نہ کل دینا　　ہر روز کوئی تازہ مضمون غزل دینا
یہ وضع وفاداری عاجزؔ نہ بدل دینا　　وہ زخم تجھے دیں گے تو اُن کو غزل دینا
دیوانے پہ اتنا بھی احسان بہت ہوگا　　جب موسمِ گل آئے زنجیر بدل دینا
یہ اہلِ خرد آخر کیوں ڈوبنے جاتے ہیں　　آواز ذرا اُن کو اے اہلِ غزل دینا

بھولے ہیں نہ بھولیں گے اُن کی وہ ادا عاجزؔ
دل پہلے پہل لینا ، غم پہلے پہل دینا

چھری جن کے ہاتھوں سے کھانا پڑے ہے　　غزل بھی اُنھیں کو سنانا پڑے ہے
طبیعت کو قابو میں لانا پڑے ہے　　اُٹھے ہے کہاں غم اُٹھانا پڑے ہے
خبر ہے کہ ہیں دُشمنِ جان و دل وہ　　مگر دل اُنھیں سے لگانا پڑے ہے
عجیب چیز ہے کاروبارِ محبت　　کمانا پڑے ہے ، لٹانا پڑے ہے
نہ آ دردمندوں کی محفل میں پیارے　　یہاں عمر بھر دل جلانا پڑے ہے
ہمیں جب لگے ہے جھڑی آنسوؤں کی　　وہی فصلِ گل کا زمانہ پڑے ہے
بس اِک بات اُن کی چھپانے کی خاطر　　ہمیں بات کیا کیا بنانا پڑے ہے

……………

کیا ہم کو آوارہ اس دردِ دل نے — جہاں لے کے جائے ہے جانا پڑے ہے
الگ ہی رہو کاروبارِ غزل سے — بہت خوں دل کا بہانا پڑے ہے
بسی ہے جہاں تشنہ کاموں کی بستی — اسی راہ میں بادہ خانہ پڑے ہے

وہ پوچھے ہیں جب خیریت سے ہو عاجزؔ
جگر تھام کر مسکرانا پڑے ہے

کاش اب بھی ذرا چین پاتے — عمر گزری غزل گاتے گاتے
سنتے ہیں جب غزل ہم کو گاتے — لوگ رُک جاتے ہیں آتے جاتے
مکتبِ عشق میں گر نہ آتے — لوگ کیا کیا سکھاتے پڑھاتے

……..…………

پیاسی نظریں اگر ہم اُٹھاتے — کتنے جام و سبو ٹوٹ جاتے
غم سے دیوانے گر بن نہ جاتے — تم خدا جانے کیا کیا بناتے
سب جفا سب ستم بھول جاتے — تم بلاتے تو کیا ہم نہ آتے
تم ہو جلّاد بھی دل ربا بھی — جان جاتی اگر دِل بچاتے
کیا کہیں دل کے زخموں کا عالم — تم اگر دیکھتے ہم دِکھاتے
کہتے رہیو ہماری کہانی — دل یہ کہتا گیا جاتے جاتے
اشک بھی اب سلگنے لگے ہیں — آگ دل کی بجھاتے بجھاتے
غم نے گانا بجانا سکھایا — جان دے دیں گے گاتے بجاتے

کیا غزل تم نے عاجزؔ پڑھی ہے
حضرتِ میرؔ بھی جھوم جاتے

وقت کا ہے یہ تقاضہ تجھے چپ رہنا ہے
دل یہ کہتا ہے ، مجھے روزِ غزل کہنا ہے

دردمندانِ محبت کا یہی گہنا ہے
ہم نے زخموں کو بھی زیور کی طرح پہنا ہے

دو گھڑی بیٹھ کے کہہ سن لیں جو کچھ کہنا ہے
نہ ہمیں رہنا ہے پیارے نہ تمھیں رہنا ہے

تم جو چاہو سو کہو جی میں جو آئے سو کرو
ہم کو تو پیارے جو کرنا ہے وہی کہنا ہے

بوریا کاندھے پہ ہر وقت اٹھائے رکھیو
کس کو معلوم ہے کس وقت کہاں رہنا ہے

....

رنج و غم تھوڑا بہت سب کو یہاں سہنا ہے
عمر بھر پھولوں کے بستر پہ کسے رہنا ہے

صورتِ حال بہرحال یہی ہے فی الحال
تم کو کرنا ہے ستم ، ہم کو ستم سہنا ہے

عمر اس قتل گہہ زیست میں گزری ہے یوں ہی
روز اُتارا ہے کفن روز کفن پہنا ہے

نہ ہماری نہ تمھاری یہ خدا کی ہے زمیں
آج ہم تم ہیں کل اوروں کو یہاں رہنا ہے

نقش ہے ہر در و دیوار پہ انجام غرور
تم بھی مغرور نہ ہو ہم کو یہی کہنا ہے

درد سے لوٹئے اور خوب غزل کہئے کلیمؔ
آپ شاعر ہیں بھلا آپ کا کیا کہنا ہے

شانے کا بہت خونِ جگر جائے ہے پیارے
تب زُلف کہیں تا بہ کمر جائے ہے پیارے

جس دن کوئی غم مجھ پہ گزر جائے ہے پیارے
چہرہ ترا اس روز نکھر جائے ہے پیارے

دامن پہ ترے کس کی نظر جائے ہے پیارے
سب جرم تو دیوانے کے سر جائے ہے پیارے

میں لاکھ غزل کہہ لوں غزل باتیں ہی تو ہیں
باتوں سے کہیں دردِ جگر جائے ہے پیارے

....

بڑھ جائے ہے جس دن میری آشفتگیِ حال
اس دن تری زُلف اور سنور جائے ہے پیارے

اِک گھر بھی سلامت نہیں اب شہرِ وفا میں
تو آگ لگانے کو کدھر جائے ہے پیارے

رہنے دے جفاؤں کی کڑی دُھوپ میں مجھ کو　　سائے میں تو ہر شخص ٹھہر جائے ہے پیارے
وہ بات ذرا سی کہتے ہیں غم دل　　سمجھانے میں اِک عمر گزر جائے ہے پیارے
ہر چند کوئی نام نہیں میری غزل میں　　تیری ہی طرف سب کی نظر جائے ہے پیارے
کیا بات ہے کیا بات ہے کیا بات ہے عاجزؔ
ہر بات تری دل میں اُتر جائے ہے پیارے

ہے نظر سب کی عرب کیسے عجم کیسے ہیں　　کوئی آئینہ نہیں دیکھتا ہم کیسے ہیں
لوگ تو ذکرِ ستم سنتے ہی ڈر جاتے ہیں　　ہائے وہ لوگ جو سہتے ہیں ستم ، کیسے ہیں
اہلِ شمشیر ہو تم کیسے بہت دیکھ لیا　　ہم دکھاتے ہیں تمھیں اہلِ قلم کیسے ہیں
جب سے شاعر ہوئے ہم دونوں ہی بے پردہ ہوئے　　ہر غزل کہتی ہے کہ تم کیسے ہو، ہم کیسے ہیں
جو گرفتارِ محبت نہ ہوئے کیا جانیں　　پیچ کیسے ہیں تیری زُلف میں، خم کیسے ہیں

……..………

غمِ مجنوں غمِ فرہاد کا لیتے ہیں جو نام　　اُن کو معلوم نہیں آج کے غم کیسے ہیں
میرے احوال سنو اور پھر اندازہ کرو　　شہر کے اہلِ وفا اہلِ کرم کیسے ہیں
برہمن دیکھ مرے خونِ وفا کی تاثیر　　کل صنم کیسے تھے اور آج صنم کیسے ہیں
وقت کے آئینہ خانے میں ہے چھپنا دُشوار　　سب کو معلوم ہے تم کیسے ہو ہم کیسے ہیں
تلخ ہیں میرے خیالات زباں شیریں ہے　　سخت حیرت ہے کہ یہ دونوں بہم کیسے ہیں
تم تو پھولوں پہ خراماں ہو تمھیں کیا معلوم　　وہ جو انگاروں پر رکھتے ہیں قدم کیسے ہیں
ہم نے اوروں سے زیادہ لہو چھڑکا ہے کلیمؔ
ہم گلستاں میں کسی اور سے کم کیسے ہیں؟

گزر کرنا یہاں آساں نہیں ہے یہ دُنیا کوچۂ جاناں نہیں ہے
محبت پر جسے ایماں نہیں ہے فرشتہ ہو تو ہو انساں نہیں ہے
دل وجاں والے بھی یوں ہوگئے ہیں کہ جیسے دل نہیں ہے، جاں نہیں ہے
غمِ دوراں نہیں ہے ، بے غمِ دل غمِ دل بے غمِ دوراں نہیں ہے
محبت ہے سروسامانِ عالم محبت بے سروساماں نہیں ہے
چمن میں فصلِ گل ممکن ہے آئے مگر فی الحال یہ امکاں نہیں ہے
کوئی ایسا نہیں جس کو چمن میں ملالِ تنگیِ داماں نہیں ہے

....

یہی دیتا ہے جینے کا سلیقہ دلِ ناداں دلِ ناداں نہیں ہے
دلِ پُر درد و چشمِ نم سلامت یہ ساماں ہے تو کم ساماں نہیں ہے
کہیں گے اور مکرر ہم کہیں گے وفا تجھ میں نہیں ہے ہاں نہیں ہے
ہر اِک مشکل کا حل دیوانگی ہے مگر دیوانگی آساں نہیں ہے

کلیؔم آخر نکالا جائے ہے کیوں؟
یہ اہلِ خانہ ہے مہماں نہیں ہے

اے کاش کلیؔم آتا اِک گیت سنا جاتا جی اپنا بہل جاتا کمبخت کا کیا جاتا
اِک شور اُٹھا جاتا ، ماحول پہ چھا جاتا کچھ ایسی غزل گاتا دیوانہ بنا جاتا
اشعار کا اشکوں سے رشتہ ہے تو کیسا ہے کچھ ہم بھی سمجھ لیتے اتنا تو بتا جاتا
کیا کشمکشِ غم ہے کیا سوزشِ پیہم ہے کہتے بھی نہیں بنتا چپ بھی نہ رہا جاتا
ہم ٹھوکریں کھا کر بھی پھرتے ہیں غزل گاتے تم ہوتے تو یوں گرتے کہ پھر نہ اُٹھا جاتا

بدقسمتی سے شاعر ہوتا نہ اگر عاجؔز
تو سادھوؤں میں ہوتا ،سنتوں میں گنا جاتا

یہ رنگ اشکوں کا جولال لال ہے پیارے
بتا رہا ہے کہ کیا دل کا حال ہے

میں کیسے کہہ دوں مجھے کیا ملال ہے پیارے
یہ راز ہی تو غزل کا کمال ہے پیارے

ترے سبب ہے جو کچھ میرا حال ہے پیارے
تو بھی تو کہہ کہ ترا کیا خیال ہے پیارے

تو خود ہی صاحبِ شہر خود ہی صاحبِ فتویٰ
حرام بھی تیری خاطر حلال ہے پیارے

بہائے جا کہ ہمارا لہو ہمارا نہیں
لٹائے جا کہ یہ تیرا ہی مال ہے پیارے

....

سجا ہوا جو ترا بال بال ہے پیارے
زمانہ اور بھی آشفتہ حال ہے پیارے

اب اور چاہیے سامان کیا غزل کے لیے
میں خوش بیان ہوں تو خوش جمال ہے پیارے

خبر نہ تھی کہ میری اتنی قدر و قیمت ہے
مجھے مٹا کے تو کتنا نہال ہے پیارے

وہی تو عمر میرے دردِ دل کی بھی ہوگی
ترے شباب کا یہ کون سال ہے پیارے؟

سنا ہے جلتے ہی رہنا ہے زندگی دل کی
تو صبح و شام کا پھر کیا سوال ہے پیارے

مرے علاوہ بھی ہیں تجھ کو چاہنے والے
یہ واقعہ نہیں تیرا خیال ہے پیارے

ہوا کے دوش پہ اُڑنا کوئی بڑائی نہیں
کسی کے دل میں اُترنا کمال ہے پیارے

نہ جانے کیا کیا سکھاتے پڑھاتے رہتے ہیں
وہ لوگ جن سے تری بول چال ہے پیارے

ابھی کلیم کو پہچانتا نہیں کوئی
یہ اپنے وقت کی گدڑی میں لال پیارے

ڈگمگاتا ہے لڑکھڑاتا ہے
دل کو تھامے یہ کون آتا ہے

غم سے جب تھک کے بیٹھ جاتا ہوں
درد اُٹھ کر مجھے اُٹھاتا ہے

زندگی تلخ ہے محبت میں
اور مزا بھی اسی میں آتا ہے

ہم سرِ رہ گزر ہی بیٹھے ہیں
وقت آتا ہے وقت جاتا ہے

جب بھی تنہائی ہوتی ہے تو یہ دل
مری غزلیں مجھے سناتا ہے

....

ہائے بیچارے کو خبر ہی نہ تھی — پیار میں دل بھی ٹوٹ جاتا ہے
اُن کا غم جاں کا غم، جہاں کا غم — کس قدر بوجھ دل اُٹھاتا ہے
رات دن صبح شام کا رونا — اتنا آنسو کہاں سے آتا ہے
آدمی دانا ہے نہ دیوانہ — وقت جو چاہے سو بناتا ہے
شہر خالی ہوا نہ قاتل سے — ایک جاتا ہے ایک آتا ہے
جان دے دیتے ہیں محبت میں — بس یہی کام ہم کو آتا ہے

جو بھی سنتا ہے سرگزشتِ کلیمؔ
داستاں اپنی بھول جاتا ہے

اس کے سوا اوروں کی سن کر خود کو رُسوا مت کرنا
دل کی ہر اِک دھڑکن کہہ دے گی کیا کرنا کیا مت کرنا

ہم نہیں مانے سب کا یہ کہنا درد کا سودا مت کرنا
مفت ملے تو مجبوری ہے ورنہ خریدا مت کرنا

رونے والے ایک نہ اِک دن کام ضرور آجائیں گے
ہنس ہنس کے جو بات کرے ہے اس پہ بھروسہ مت کرنا

ہمت والے بولتے کم ہیں کام زیادہ کرتے ہیں
اپنی قسمت آپ بنانا غیروں کا شکوہ مت کرنا

……..…………

مشعلِ جاں روشن کرنے میں شام سویرا مت کرنا
جلنے کا جب وقت آجائے کوئی بہانہ مت کرنا

خونِ تمنّا سے مت ڈرنا ، ترکِ تمنّا مت کرنا
گھر میں اندھیرا ہو تو بلا سے شہر اندھیرا مت کرنا

اُن سے محبت کرنا لیکن حد سے زیادہ مت کرنا
ہم نے جیسا حال کیا ہے ، اپنا ایسا مت کرنا

ہم نہ رُکے گو شہر کے سارے لوگ ہمیں سمجھاتے رہے
عشق کی منڈی میں مت جانا درد کا سودا مت کرنا

آخر میں یہ بات بھی کہہ دیں تم ہو نازک لوگ میاں
شعر ہمارے پڑھتے رہنا کام ہمارا مت کرنا

ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا اِک دن دھوکا کھاؤ گے
سب کو تم عاجزؔ نہ سمجھنا سب پہ بھروسہ مت کرنا

وہ جس پہ تیرا مسلسل عتاب ہے پیارے
یہی وہ عاجزؔ خراب ہے پیارے

میں دل لگا کے بھی ناکام ہوں زمانے میں
تو دل کو توڑ کے بھی کامیاب ہے پیارے

نہ اہلِ غم کوئی مجھ سا نہ تجھ سا اہلِ ستم
میں بے مثال ہوں تو لاجواب ہے پیارے

کسی کو عہدِ وفا کیا وفا بھی یاد نہیں
اس عہد کا یہ بڑا انقلاب ہے پیارے

تو گل بدست تھا خنجر بکف تو کیسے ہوا
یہ خواب ہے کہ یہ تعبیر خواب ہے پیارے

ذرا بتا کہ یہ میرا لہو بھرا دل ہے
کہ تیرے ہاتھ میں جام شراب ہے پیارے

کہہ دو کلیمؔ سے کہ اُسے آنا چاہیے — محفل اُداس ہے کوئی دیوانہ چاہیے
گلیوں میں حسن والوں کی کہتا پھروں ہوں میں — آئینہ چاہیے کسی کو شانہ چاہیے
رہرو نہیں ہیں راستے کے رہنما ہیں ہم — کوئی جدھر نہ جائے اُدھر جانا چاہیے
مری غزل تلاش غزل آشنا میں ہے — جیسا چراغ ویسا ہی پروانہ چاہیے

....

چھیڑا ہے پھر ستم کا نیا ساز وقت نے — تازہ غزل پھر اُس سے کہلوانا چاہیے
اب ایسے بادہ نوش کی ہے وقت کو تلاش — جو چڑھ کے دار پر کہے پیمانہ چاہیے
ساقی سے بھیک مانگتے ہو کیا شراب کی — اے دوست کچھ تو جرأتِ رندانہ چاہیے
سامانِ زندگی جو فقیرانہ ہے تو ہو — تیور ہر ایک حال میں شاہانہ چاہیے
اہلِ جنوں سے بڑھ کے کوئی محترم نہیں — دامن ہے چاک اگر تو نہ شرمانا چاہیے
برہم ہیں میرے طرزِ سخن سے کچھ اہلِ بزم — اور کہہ رہے ہیں اس کو نکلوانا چاہیے

بے باک جس طرح تو ہے پٹنہ میں اے کلیمؔ
ایسا ہر ایک شہر میں دیوانہ چاہیے

فکر جب صاحبِ ارادہ تھی — یہ زمیں کس قدر کشادہ تھی؟
شیشہ تھا جام تھا نہ بادہ تھی — بے پئے کیفیت زیادہ تھی
چاند میں کل چمک زیادہ تھی — کیا کسی کی وہ شامِ وعدہ تھی؟
اب جو سر پر سوار ہے دُنیا — کل بہت دُور افتادہ تھی

....

جب یہ تہذیب بے لبادہ تھی — کتنی معصوم کتنی سادہ تھی
دوستی کم تھی یا زیادہ تھی — بے تکلف تھی بے ارادہ تھی
اس لیے سب میں معتبر ہم تھے — دعویٰ کم تھا سند زیادہ تھی

اپنے عزمِ بلند کے آگے کامیابی سپر نہادہ تھی
ہائے کیا شاعری کا دَور تھا وہ طبع رنگیں زبان سادہ تھی
بات کم بات کرنے والے کم بات میں چاشنی زیادہ تھی
جس کا دل تھا وفا سے تھا معمور جس کی آغوش تھی کشادہ تھی
فرش سے عرش پہلے دُور نہ تھا
زندگی گرچہ پاپیادہ تھی

جب تک تو کلیمؔ اپنی غزل گائے نہیں ہے ہم کیا کریں ہم کو تو مزا آئے نہیں ہے
ہر چند ترا درد سنا جائے نہیں ہے لیکن بے سنے بھی تو رہا جائے نہیں ہے
وہ گل ہے غزل تری جو مرجھائے نہیں ہے ہم لوگوں کا یہ فیصلہ ہے رائے نہیں ہے
تم آؤ تو رنگ آئے بہار آئے غزل آئے تم آؤ نہیں ہو تو کوئی آئے نہیں ہے
ہر شعر پہ ہو جاتا ہے دل خونِ جگر خون کہتے ہیں غزل گرچہ کہا جائے نہیں ہے
تو بے وفا تھا لے ہوگئی اب بے وفا یہ بھی اب یاد بھی تیری مجھے بہلائے نہیں ہے
سوچا تھا کہ دل جائے تو راحت سے جئیں گے اب دل جو گیا ہے تو جیا جائے نہیں ہے

....

آرام طلب ہوگئے ہم میرؔ کی مانند جب تک نہ اُٹھے درد اُٹھا جائے نہیں ہے
اب صبر ہی اِک مونسِ تنہائی ہے اپنا وہ بھی کبھی آئے ہے کبھی آئے نہیں ہے
اللہ رے نظر اُس کی کہ بس ایک نظر میں کیا کیا سر عالم پہ گزر جائے نہیں ہے
بیٹھا ہے ڈھٹائی سے سر بزم وہ قاتل آئینہ دِکھاؤں ہوں تو شرمائے نہیں ہے
میں کہتا ہوں دامن پہ کلائی پہ لہو دیکھ وہ بولے ہے مجھ کو تو نظر آئے نہیں ہے
چین آئے ہے اس کو نہ مجھے آئے ہے عاجزؔ
جب تک وہ غزل مجھ سے کہلوائے نہیں ہے

ہے اُنھیں دوناموں سے ہر اِک افسانے کا نام | ایک تیرا نام ہے اِک تیرے دیوانے کا نام
وہ تو کہیے ہم نے شامل کردیا اپنا لہو | ورنہ مئے کا نام رہتا اور نہ پیمانے کا نام
تیری چشم وزُلف ورُخ کا نام ہے میری غزل | تیرے گھنگھرو کی صدا دے غزل گانے کا نام

....

تجھ سے روشن ہے چراغِ محفلِ دار و رسن | مجھ سے بھی اس دَور میں زندہ ہے پروانے کا نام
چل اسی انداز سے ہاں چل اسی انداز سے | شوخیِ بادِ صبا ہے تیرے اِٹھلانے کا نام
موجِ خوشبوئے غزل بے رنگیِ روئے غزل | اِک ترے آنے کا ہے نام اِک ترے جانے کا نام
زندۂ جاوید میری شاعری نے کردیا | نام تیرے گیسوؤں کا اور مرے شانے کا نام
پھول توڑے کوئی پتھر ہم کو مارا جائے ہے | تو نے اتنا کردیا بدنام دیوانے کا نام

ہم ہیں عاجزؔ آبروئے بزمِ یارانِ غزل
اب اسی آئینے سے ہے آئینہ خانے کا نام

غزل کس کی ہے؟ یہ اندازِ بے باکانہ کس کا ہے؟
اِسے محفل میں لایا کون یہ دیوانہ کس کا ہے؟

یہ بے پروا صدائے ساز سے آواز کس کی ہے؟
یہ نغمہ وقت کے آہنگ سے بے گانہ کس کا ہے؟

لہو روتے ہی رہنا ہے، غزل کہتے ہی رہنا ہے
یہ جرأت یہ ثبوتِ ہمّتِ مردانہ کس کا ہے؟

نئے انداز سے زُلفِ غزل کس نے سنواری ہے
اب ایسا آئینہ کس کا ہے ایسا شانہ کس کا ہے؟

یہ کون اُجڑا ہے ارمانوں کی محفل لٹ گئی کس کی؟
کبھی آباد دل کس کا تھا؟ اب ویرانہ کس کا ہے

تغزل کا چمن اُبھرا ہے کس کے خوں شدہ دل سے؟
لہو کا ایسا استعمال فنکارانہ کس کا ہے

……..…………

یہ کس کو مل گئی بوتل شرابِ میرؔ و آتشؔ کی
خرد کے دَور میں یہ نعرۂ مستانہ کس کا ہے؟
یہ پھر سے داستانِ عشق رنگیں کس نے کر دی ہے
لہو کا بارگاہِ حسن میں نذرانہ کس کا ہے؟
کلیجہ کس کا جلتا ہے یہ کیسی آنچ آتی ہے
یہ کس کا ہے غمِ جاں، یہ غمِ جانانہ کس کا ہے؟
یہ کیا شئے ٹوٹنے کی مستقل جھنکار آتی ہے
یہ دل کس کا ہے دل سے شغل بے دردانہ کس کا ہے؟
ستم ڈھایا ہے کس کافر صنم کی زُلف برہم نے
شکستہ آئینہ ٹوٹا ہوا یہ شانہ کس کا ہے؟
لہو کی مئے، صراحی گردنوں کی جام زخموں کے
یہ کس قاتل نے کھلوایا ہے یہ میخانہ کس کا ہے؟
لہو روتے ہی رہنا ہے؟ غزل گاتے ہی رہنا ہے؟
سزا یہ کس نے دی، کیا جرم ہے جرمانہ کس کا ہے؟
غزل کے آئینے میں زندگی کس کی جھلکتی ہے؟
غزل خواں سے کوئی پوچھو کہ یہ افسانہ کس کا ہے؟
جی کیا فرمایا؟ عاجزؔ ہند سے تشریف لائے ہیں؟
وہی تو میں کہوں یہ طرزِ درویشانہ کس کا ہے؟
سبوئے کہنہ میں صہبائے تازہ اور کس کی ہے
یہ رشک جام جم ٹوٹا ہوا پیمانہ کس کا ہے؟
اُسی نے ابتدا کی ہے اُسی پر انتہا ہوگی
فقیری میں بھی ایسا لہجۂ شاہانہ کس کا ہے؟

عاجزؔ یہ کسی اور کا چہرہ ہے کہ تم ہو؟
اس دَور کے غم کا کوئی پتلا ہے کہ تم ہو؟

یہ سحر ہے جادو ہے فسوں ہے کہ غزل ہے
یہ کوئی فسوں گر پسِ پردا ہے کہ تم ہو؟

یہ پچھلے پہر کس کے کوکنے کی ہے آواز
کوئل ہے، کبوتر ہے، پپیہا ہے کہ تم ہو؟

گوکل کی ہے بانسری عاجزؔ کہ غزل ہے
اُردو کا کوئی کرشن کنہیّا ہے کہ تم ہو؟

سیلاب میں بہتی ہوئی کشتی ہے کہ دل ہے
اشکوں کا اُمنڈتا ہوا دریا ہے کہ تم ہو

……..…………

یہ آبلہ ہے زخم ہے پھوڑا ہے کہ تم ہو؟
ٹوٹا ہوا بکھرا ہوا شیشہ ہے کہ تم ہو؟

شہرِ دلِ برباد کا نقشہ ہے کہ تم ہو؟
خود میرؔ ہیں یا میرؔ کا چربا ہے کہ تم ہو؟

تم ہو کہ کرشمہ ہے شہیدوں کے لہو کا؟
اس دورِ ستم کا کوئی تحفہ ہے کہ تم ہو؟

کچھ ہم نے بہت درد بھرے شعر سنے ہیں
اشعار تو سن کر یہی لگتا ہے کہ تم ہو؟

''دن ایک ستم ، ایک ستم رات کرو ہو''
یہ میرؔ ہیں ؟ یہ میرؔ کا مصرع ہے کہ تم ہو؟

متفرق اشعار

('وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کی وہ غزلیں جن میں ایک یا دو شعر کا اضافہ کیا گیا)
(پاکستانی ایڈیشن)

غمخوار مجھے رونے سے کیوں روک رہے ہیں
دُنیا تو ابھی لعل و گہر مانگ رہی ہے

....

کوئی خم لے کے بیٹھا، کوئی شیشہ، کوئی پیمانہ
ہلاتے رہ گئے ہم تشنہ لب زنجیر مے خانہ

....

ہمیں اس دَور کے پھولوں پہ بھی تکلیف ہوتی ہے
جو کانٹوں پر بھی تھا پہلے وہ اب آرام کیا ہوگا
فقط آرائشِ مے خانہ کے قائل نہیں ہیں ہم
شراب اچھی نہیں ساقی تو اچھا جام کیا ہوگا

....

یہ جو ماجرا مرے گھر کا ہے یہ جو حالِ دل کا جگر کا ہے
یہ کرم اُسی کی نظر کا ہے جو ابھی بچا کے نظر گیا

....

بس ایک ہی زخم کی مسافت سپہ گری سے ہے شاعری تک
اگر نہ مانے گا کوئی اس کو تو لوگ میری مثال دیں گے
یہ پہلے ہی عشق نے کہا تھا کہ حسن کی انجمن میں عاجزؔ
نظر تجھے حسبِ شوق دیں گے زباں تجھے حسبِ حال دیں گے

....

سمجھ کر پاؤں رکھ کوئے وفا میں
کہ یہ مقتل ہے پھلواری نہیں ہے
یہ مانا ہم نے بے چارہ ہے عاجؔز
غزل عاجؔز کی بے چاری نہیں ہے

....

جنوں کا تجربہ بھی کم نہیں ہے
بیاباں ہم نے بھی چھانے بہت ہیں
جہاں خالی نہیں اہلِ وفا سے
چراغ آئے تو پروانے بہت ہیں

....

دنیا انھیں کیا کہتی ہے اس کا نہیں احساس
ہم نے جو غزل پڑھ دی تو کہرام بہت ہے

....

اگر نہیں تو نہ ہو تجھ کو اے صبا معلوم
مجھے تو حالِ چمن ہے ذرا ذرا معلوم
نہ جانے ٹھوکریں کھا کر پلٹ گئے کتنے
ہر ایک کو نہیں رسم و رہِ وفا معلوم

....

دُنیا نے بوند بوند جگر سے نچوڑ لی
افسوس ہے کہ آپ ملے بھی تو کب ملے

....

ہم کو تو انقلابِ جنوں پر یقین ہے
دُنیا پھرے گی ، شام پھرے یا سحر پھرے

....

اپنے زخمِ جگر کی کہانی رہی یا انھیں کی نظر کا فسانہ رہا
وہ ہزار اپنے تیور بدلتے رہے، ہم سنا ہی گئے جو سنانا رہا
میرا سرمایۂ شعر خوانی سنو، ایک مصرع میں ساری کہانی سنو
صبح ہوتے ہی وہ دُشمنی کر گئے جن سے دن رات کا دوستانہ رہا

....

فصلِ گل کی آمد تھی پھول کھلنے والے تھے
جب چمن میں چھوڑا تھا ہم نے آشیاں اپنا

....

یہ بیانِ حال یہ گفتگو ہے مرا نچوڑا ہوا لہو
ابھی سن لو مجھ سے پھر کبھو نہ سنو گے ایسی کہانیاں

....

مسلسل یاد ہم آئیں گے، پیہم یاد آئیں گے
کوئی موسم رہے بے قیدِ موسم یاد آئیں گے

....

تیرے پاس مال خزانہ ہے جسے چاہے مال خزانہ دے
غمِ دل متاعِ فقیر ہے یہ کسی کو میرے سوا نہ دے
یہ کبھی نہ عرض کریں گے ہم، کہ سزائے جرمِ وفا نہ دے
مگر اتنی عرض ضرور ہے، وہ سزا نہ دے جو مزا نہ دے

....

بہت ہشیار ہیں اس مطلبی دُنیا کے لوگ اے دل
نہ سن لوگوں کی باتیں لوگ دیوانہ بنا دیں گے
بہت معصوم صورت بن کے عاجؔز آئیں گے لیکن
غزل ایسی سنائیں گے کہ دیوانہ بنا دیں گے

....

دل کسی کی نہیں سنتا تھا مگر تو نے اسے
ایسا شیشے میں اُتارا ہے کہ جی جانے ہے

....

بنایا ہے عجب ماحول اس نے
کہ گھر کس کا ہے اور کس کا لگے ہے
ہمیں پہلے ہی کچھ ایسا لگا تھا
کہ وہ ایسا نہیں ، جیسا لگے ہے

………………

تمھیں سے تو ہے درد کا رکھ رکھاؤ
سناؤ میاں ، ہاں میاں کچھ سناؤ

………………

سب اپنی اپنی بات بنانے کی دُھن میں ہیں
پوچھے نہیں ہے کہ کوئی کسو سے کسو کی بات

………………

سب کو اپنا اپنا کوئی واقعہ یاد آ گیا
چھیڑ دی ہم نے غزل اپنی تو اِک کہرام ہے

………………

یہ وفا کا ذکر جو عام ہے، بڑے حوصلے کا یہ کام ہے
ہر اِک آدمی کا جگر نہیں، کہ چراغ بن کے جلا کرے

………………

یہ جو زخم زخم ہیں دل وجگر، یہ کبھی نہ جائیں گے بے اثر
تجھے اِک دن اے بت بے خبر یہ پتہ چلے گا خدا ہے کیا

………………

میں کہوں گا وعدہ نبھایئے تو بہانے کتنے بنائیں گے
کبھی یہ سوال اُٹھائیں گے، کبھی وہ سوال اُٹھائیں گے
وہ بھی آئیں تیغِ ستم بہ کف، یہاں ہم ہیں شعر وغزل بہ لب
وہ جہاں بھی زخم لگائیں گے، وہیں ہم بھی پھول کھلائیں گے

………………

ہمیں اپنی حالت پہ چھوڑو ہٹاؤ
تم اپنے کو تھامو ، سنبھالو تو جانیں

……………

اُنھیں پھولوں سے خوشبو بن کے نکلی ہے غزل میری
میرا ہر زخمِ دل شمشیرِ قاتل کو دُعا دے ہے
پڑھے ہے جب غزل عاجزؔ تو دونوں ہاتھ اٹھا دے ہے
خدا جانے دعا دے ہے اُسے یا بد دعا دے ہے

……………

نکہتِ زُلف جفا ہر شہر میں
پھر رہی ہے آپ کا چرچا کیے
شمع کی مانند چپ ہیں کیا کہیں
حال جو محفل کا ہم دیکھا کیے

……………

آئی نہیں ہے آج تو کل آئے گی بہار
غنچو! خزاں کا غم نہ کرو مسکرائے جاؤ

……………

کسی حادثے کا رہے ہے اشارہ
مروّت جو وہ بے مروّت کرے ہے

……………

جو گل مرجھا کے ناکارہ لگے ہے
وہ میری آنکھ کا تارا لگے ہے

……………

(جب فصلِ بہاراں آئی تھی، کی وہ غزلیں جن میں ایک سے تین شعر کا اضافہ کیا گیا)

ہائے وہ دل پر کسی دن چوٹ کھا جانے کی بات
بن گئی وہ بات ساری عمر دُہرانے کی بات
ہوگئی کعبے میں بھی جو تھی صنم خانے کی بات
حضرتِ زاہد کریں گے اب کہاں جانے کی بات

....

دل جلے تو جلے اُن کا جو ہے کام چلے
اِک طرف آگ لگے ایک طرف جام چلے
گردنوں پر یوں تری تیغِ جفا چلتی ہے
جیسے بل کھاتی ہوئی کوئی گل اندام چلے

....

کبھی سر پر رہا ہوں تاج بن کر
کبھی قدموں سے ٹھکرایا گیا ہوں
ابھی کیا پوچھنا کب تک جلوں گا
ابھی تو یار سلگایا گیا ہوں

....

مرے تن بدن میں نہ دیکھئے، میرے آنسوؤں میں نہ ڈھونڈھئے
جو میرے لہو میں تھی سُرخیاں ، وہ ملیں گی اب رُخِ یار پر

....

ہمیں معلوم ہے نازک بہت ہے دل کا آئینہ
مگر اس آئینے کو ٹوٹنے سے مت بچا رکھیو

....

آنکھیں تیار نظر آئیں گی بھر آنے کو
جس جگہ سے بھی شروع کیجیے افسانے کو

....

زبان اہلِ محبت یہی ہے کیا کہیے
جو دل کا خوں کرے اس کو دل رُبا کہیے
ہر اِک زخم کچھ اپنی زباں میں کہتا ہے
یہ دل کا حال ہوتو دل کا حال کیا کہیے

....

عاجؔز پر ستم بھی عام کیا اور خوب اسے بدنام کیا
پھر بیٹھ کے ہر محفل میں غزل سنتے ہیں اسی بدنام سے ہم

....

اُٹھوں لہو چراغوں میں کچھ اور ڈال دو
سورج نہیں اُگا ہے ،ابھی رات ہے میاں
پینے کو جب لہو ملے پھر کیا غم شراب
اِس کے نشے سے اُس کا نشہ مات ہے میاں

....

حالات کے بادل ہیں یا دل کا اندھیرا ہے
معلوم نہیں ہوتا شب ہے کہ سویرا ہے
بس دھوکہ ہی دھوکہ ہے، بس پھیرا ہی پھیرا ہے
کل غیروں کا نرغہ تھا، اب یاروں کا گھیرا ہے

....

ہم سمجھتے تھے غمِ دل بس سمجھنے کی ہے چیز
لوگ کہتے ہیں کہ شاعر ہوتو سمجھانا بھی ہے

....

یہ مشاعرے یہ جلسے تو رہا کریں گے عاجزؔ
تم اگر نہیں رہوگے تو بڑی کمی رہے گی

……..………

کیا فیصلۂ گردش ایام ہے پیارے
ہم خاک نشیں ہیں تو سربام ہے پیارے
ہاں پیار کے بدلے تو مجھے زہر دیئے جا
یہ زہر مجھے بادۂ گلفام ہے پیارے
سنتے ہی غزل میری سمجھ جاتے ہیں سب لوگ
تو کون ہے پیارے ترا کیا نام ہے پیارے

……..………

لہو جس کا چراغوں کے ہے اندر وہ گر محفل سے باہر ہے تو کیا ہے
میں شاعر ہوں، مرا جوہر غزل ہے تمھارے پاس جوہر ہے تو کیا ہے؟

……..………

سنا ہے قتل کا بازار گرم رہتا ہے
اور یہ سنا کہ یہ تیرا ہی کام ہے پیارے
غلط ہیں جو تجھے کہتے ہیں بے وفاؤں میں
ترا تو اور بھی اونچا مقام ہے پیارے

……..………

کہاں ہے وہ اب دَور ناز و نیاز وہ روٹھیں گے کیا ہم منائیں گے کیا
تخیل کہاں ہے غزل تیر ہے نشانے سے بچ کر وہ جائیں گے کیا

……..………

تو سینہ تانے ہوئے کیوں پھرے نہ اتراتا
کہ چوٹ ابھی تیرے دل کو لگی نہیں پیارے

……..………

جہاں ہم ہیں بستر جمائے ہوئے　　قیامت کی وہ رہ گزر ہے میاں
جسے کہتے صدیاں گزر جائیں گی　　وہ قصّہ بہت مختصر ہے میاں

……………

دن کو کرتے ہیں یہی تیری گلی میں چھڑکاؤ
رات کو ہیں یہی پلکوں پہ چراغاں والے

……………

مرے دل کے محرم راز کا یہی حکم اب ہے برائے دل
اگر چراغ نہیں رہے تو کلیؔم اپنا جلائے دل
تو ہی سر پھروں کا امام ہے، یہ کلیم تیرا ہی کام ہے
کسی اور کا یہ جگر نہیں کہ وہ دُشمنوں سے لگائے دل

……………

بارہا گفتگو ہوتی رہی لیکن مرا نام
اس نے پوچھا بھی نہیں ، میں نے بتایا بھی نہیں

……………

کہیو غمِ دل خوب سمجھ بوجھ کے عاجزؔ
قاتل بھی مسیحا کے نقابوں میں ملیں گے

……………

میں مری شاعری تمھارے لیے
کاش تم بھی مرے لیے ہوتے

……………

دریائے غزل کے ٹھہرے ہوئے موجوں میں اُبال آ جاتا ہے
جب طنز وہ ہم پر کرتے ہیں ہم کو بھی جلال آ جاتا ہے

……………

ختم شد